زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

افسانہ نمبر

شمارہ ۱۱۰

نومبر ۱۹۶۸ء

مدیر

محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو ○ لاہور



ترتیب

نئے افسانہ نگار

انتظاریہ

(وہ تخلیقات جو بروقت نہ ملیں)

رپورتاژ

ڈرامے

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

وہ نڈر تھا۔ بے باک تھا مگر میرا دوست تھا۔

دوست اس معنی میں نہیں کہ میں اُس کا ہم پیالہ ہم نوالہ تھا۔ بس یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے تھے اور ہم میں وہ خوبی نہ تھی۔ جو آج کل کے دوستوں میں ہے۔ یعنی پیٹھ پیچھے بُرائی!

اتفاق کی بات کہ میرا اُس کا ساتھ زندگی کے آخری دنوں میں ہُوا۔ کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ جیسے جیسے قریب ہوتے گئے۔ ویسے ویسے ایک دوسرے سے ڈرنے لگے میں تو اُس کی ضرورت سے زیادہ صاف گوئی سے ڈرتا تھا۔ وہ مجھ سے کیوں ڈرتا تھا۔ یہ میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

میں تیری خاموشی سے ڈرتا ہوں۔ میں تیرے من کی بات نہ جان سکنے کی وجہ سے ڈرتا ہوں۔

بھلا یہ بھی کوئی ڈرنے والی بات ہے۔

میرے نزدیک دوستی میں سب سے خطرناک ہتھیار مقفل زبان ہے۔

پھر ہم اتنے قریب کیوں ہیں؟

بس ہیں۔

باتوں ہی باتوں میں وہ مجھے کبھی امرتسر لے جاتا۔ کبھی دلّی، کبھی بمبئی، اس کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ دل اُکتاتا نہ تھا۔

اس میں ایک دو کمزوریاں بھی تھیں مگر وہ دل کا اتنا اچھا تھا کہ مجھے اس کی کوتاہیوں سے غرض نہ تھی۔

یونہی دن گزرتے رہے۔

پھر وہ دن آگیا۔ جب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگیا۔

وہ عجیب آدمی تھا۔

اُس نے انگریز کو "نیا قانون" پڑھوایا۔ اُس نے تقسیمِ ملک پر "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جیسی یادداشت چھوڑی۔ اُس نے فسادات کے ایلیے پر "کھول دو" ایسے انکشافات کیے۔ اُس نے دریاؤں کے پانی بند ہونے پر "یزید" کو یاد کیا۔

میرا دل کہتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو وہ خاموش نہ رہتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس نسل کے ادیب کو بے ضمیری کے طعنہ سے ضرور بچا لیتا۔

محمد طفیل

اِس شمارے میں

میں نے آخری افسانہ نمبر ۱۹۶۰ء میں چھاپا تھا۔ ہے نا یہی بات! اس اعتبار سے آٹھ برس کے بعد یہ نمبر چھاپ رہا ہوں۔ ہر چند کہ موضوع لذیذ ہے۔ چاہیے تھا کہ ہر سال ایک افسانہ نمبر پیش کرتا۔ مگر یوں سوچا جا سکتا ہے۔ یوں کیا نہیں جا سکتا۔ لوہے کے چنے چبانے پڑ جاتے ہیں۔

اس نمبر میں آپ کو بڑے بڑے نام نظر آئیں گے۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ نام بڑے اور درشن تھوڑے ہوں۔ اس میں صد فی صد نہ سہی، اسی پچاسی فی صد تخلیقات ضرور قدرِ اوّل کی ہوں گی۔ اس کے باوجود مجھے اپنی رائے پر اصرار نہیں۔ آپ ہی کا فیصلہ برحق!

اگر میں اس نمبر میں شامل تمام تخلیقات کی جزویات میں چلا گیا تو بات طول پکڑ جائے گی۔ مجھے طولِ کلام کی نہ عادت ہے نہ فرصت! مختصراً بات کو یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ یہ نمبر آج کے اُردو افسانہ کی میزان نہیں تو عکس ضرور ہے۔

افسانہ کے آس پاس جو چیز بھی پھٹکتی تھی۔ میں نے اسے اس نمبر میں پیش کیا ہے تاکہ تنوع رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں افسانوں کے علاوہ ناول بھی ہے۔ رپورتاژ بھی، خاکے بھی، ڈرامے بھی!

آپ ہی سوچیں کہ میں ان میں سے کس تخلیق اور کس افسانہ نگار کا ذکر کروں اور کس کا نہ کروں۔ اس لیے میرے لیے عافیت کا راستہ یہی ہے کہ چپ رہوں۔ بولنے کے لیے نقوش کے صفحات جو ہیں۔

ہاں ایک بات کرنے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ اس نمبر میں اُردو افسانہ پر ایک مذاکرہ بھی ہے۔ اسی طرح کا ایک مذاکرہ تقریباً پندرہ برس پہلے بھی پیش کیا تھا۔ کچھ کام کی باتیں اُس میں تھیں۔ کچھ کام کی باتیں اِس میں ہیں۔ حرفِ آخر نہ وہ تھا۔ نہ یہ ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ چونکایا اُس نے بھی تھا۔ چونکائے گا یہ بھی!

اس شمارے میں نقوش کی بیسویں سالگرہ کی روئیداد بھی ہے۔ جی چاہے تو پڑھ لیجیے۔ ورنہ افسانے پڑھیے۔ مجھے کسی صورت میں شکایت نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ بھی میری روئیداد ہے۔ وہ بھی میری روئیداد ہے۔

(محمد نقوش)

احوال ایک تقریب کا

دعوتی کارڈ بٹ رہے ہیں۔ کارڈوں کا مضمون یہ ہے "نقوش کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر آپ کی شرکت ہمارے لئے باعث عزت ہوگی۔"
صدارت کے لیے خواجہ شہاب الدین وزیر اطلاعات و نشریات کا نام ہے۔
مضمون نگاروں میں نام ہیں مسعود مفتی، سیدوقار عظیم، کرنل محمد خان، ڈاکٹر وحید قریشی، خدیجہ مستور، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور مقررین میں نام ہیں سیّد قاسم رضوی، حکیم احمد شجاع، سید وزیر الحسن عابدی، سید امتیاز علی تاج اور سیّد ضمیر جعفری کے۔

تاریخ ۱۱ رمئی ۱۹۶۸ء بوقت ½ ۵ بجے شام، مقام انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل!

(کارڈ دیکھنے والا سوچ سکتا ہے۔ اتنے ادیبوں کے نام ایسے ہی لکھ دیئے ہوں گے۔ کیوں آئیں یہ سب؟ نقوش کا بلاوا ہے۔ کوئی آرڈیننس تھوڑا ہے کہ تعمیل ضروری ہو۔ پھر ان دنوں خواجہ صاحب کا آنا اور مشکل ہوگا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس ہو رہے ہیں۔ بجٹ کے معاملات زیر بحث ہیں)

۱۱ بجے کا وقت ہے۔ خواجہ شہاب الدین صاحب بالقابہٗ راولپنڈی سے بذریعہ ہوائی جہاز تشریف لے آئے ہیں۔ ان کے استقبال کے لئے مدیر نقوش کے علاوہ حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگِ خیال، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، اشرف صبوحی، سید قاسم محمود کے علاوہ افسران میں مسعود الرؤف سیکرٹری انفارمیشن ، ڈائریکٹر انفارمیشن، ڈائریکٹر ٹیلیویژن، ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان اور ڈپٹی کمشنر بھی موجود ہیں۔ خواجہ صاحب کے ساتھ راولپنڈی سے مجید مفتی ڈائریکٹر جنرل انفارمیشن بھی آئے ہیں۔ خواجہ صاحب سوٹ میں ملبوس ہیں اور حسب معمول مسکراتے ہوتے ہیں۔ سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ مل رہے ہیں۔ خیر خیریت پوچھ رہے ہیں۔ اب وہ وی۔ آئی۔ پی روم کی طرف آ رہے ہیں۔ کھڑے ہی کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ اب موٹر میں بیٹھ کر گورنر ہاؤس چلے گئے ہیں۔

(استقبالیہ کمیٹی کے ارکان، استقبالیہ کمیٹی کیا، طفیل صاحب کے دوست اور کرمفرما واپس دفتر نقوش آ گئے ہیں۔ کسی نے کہا۔ وہاں "تقریب گاہ" میں نقوش کا بورڈ بھی تو لگانا چاہیئے۔ تقریب میں صرف چند گھنٹے باقی ہیں اور یہ بورڈ کی بات نکالی گئی ہے۔ خیر وقت کے وقت یہ کام بھی ہو گیا۔

کسی نے کہا۔ وہاں نقوش کی نمبروں کی نمائش بھی کرنی چاہیئے مگر طفیل صاحب نے کہا۔ ہٹاؤ یار! اگر لوگ نقوش کے کام سے واقف نہیں تو آج انہیں واقف کرانا بھی نہیں چاہیئے۔

کسی نے کہا۔ چیف جسٹس ایس اے رحمٰن کو بھی بلایا ہے؟ طفیل صاحب نے کہا۔ بلایا تو ہے مگر ان دنوں ان کی طبیعت خراب ہے۔ طے ہوا کہ سب انہیں ابھی چل کے دیکھ آتے ہیں۔ چنانچہ پہنچے وہ خندہ پیشانی سے ملے مگر ان کی صحت زیادہ اچھی نہ تھی۔ انہوں نے کہا۔ ابھی تو تقریب میں چند گھنٹے باقی ہیں۔ کچھ اور طبیعت سنبھلی تو حاضر ہو جاؤں گا مگر پکا وعدہ نہیں کرتا۔ سب ان کے کچے وعدے پر ہی خوش ہو گئے)

اب پانچ بجے ہیں۔ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں مہمانوں کی آمد آمد ہے۔ وہ دیکھئے ملک خدابخش وزیر خوراک تشریف لا رہے ہیں۔ مسکراتے ہوئے سب سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ حال احوال پوچھ رہے ہیں۔

وہ خدیجہ مستور چلی آرہی ہیں - لئے دیئے انداز میں ظہیر بابر بھی ان کے ساتھ ہیں - وہ آج بہت خوش معلوم ہوتی ہیں - شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ تقریب ان کے بھائی کی ہے -

وہ دیکھئے سپریم کورٹ کے جج سجاد احمد جان آرہے ہیں - ان کے ساتھ اسلم خٹک ہیں - جو کابل میں پاکستان کے سفیر رہ چکے ہیں یا کہیں اور ! جان صاحب بڑے علم دوست ہیں - ادبی محفلوں کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیتے ہیں -

وہ سید وقار عظیم چلے آرہے ہیں - حسب عادت مسکرا رہے ہیں - انھیں نرا ستہ چلنا دشوار ہو رہا ہے - دوست جو کھڑے ہیں ادھر اُدھر ، سبھی سے علیک سلیک اور خیریت پوچھی جا رہی ہے - یہاں ان کا کوئی شاگرد ہے اور کوئی مداح !

وہ دیکھئے حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال بھی چلے آرہے ہیں - چھڑی ہاتھ میں ہے - جیسے سمجھا رہے ہوں - سمجھ جاؤ - ورنہ سمجھانا پڑے گا - مگر اب وہ کسی کو کیا سمجھائیں گے - ان کا وقت قریب آرہا ہے - ۷۰ برس کی عمر ہے -

پیچھے حکیم احمد شجاع اور مولانا حامد علی خان چلے آرہے ہیں - حکیم صاحب بزرگ ادیبوں میں بڑا درجہ رکھتے ہیں - علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور محمد عبداللہ ٹونکی ایسے اساتذہ فن کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں - مولانا حامد علی خان نامور رسالہ مخزن کے ایڈیٹر ہیں - مولانا ظفر علی خان کے بھائی !

وہ دیکھئے سید احمد سعید کرمانی آرہے ہیں - یہ وزیر خزانہ بھی ہیں اور وزیر اطلاعات بھی ، پہلے اپوزیشن میں تھے - حکومت کے خلاف تقریریں کرتے تھے - اب خود وزیر باتدبیر ہیں - اس لئے حق میں تقریریں کرتے ہیں - جوان ہیں مستعد ہیں - خوب کام کرتے تھے - خوب کام کرتے ہیں - بندہ ان کا بڑا معتقد ہے -

وہ حجاب امتیاز علی تاج چلی آرہی ہیں - ان سے کسی نے پوچھا ہے : تاج صاحب نہیں لائے - جی وہ تو آج راولپنڈی چلے گئے ہیں - ورنہ ضرور آتے -

لیجئے کمشنر لاہور ڈویژن مختار مسعود بھی آرہے ہیں - یہ صاحب کمشنر ہی نہیں - بہت بڑے مقرر بھی ہیں - ویسے ادیب کہلانا بھی پسند کر لیتے ہیں -

وہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی چلے آرہے ہیں - بزرگ ادیبوں میں ان کا دم بڑا غنیمت ہے - ادبی ریاضتیں ان پہ ختم ہیں - شرافت میں نیکی میں - ان کا کوئی کیا مثیل ہو گا - ان کے ساتھ ساتھ اشرف صبوحی اور نواب مشتاق احمد خان ہیں - نواب صاحب پاکستان میں حیدرآباد دکن کے سفیر تھے - جب سے حیدرآباد کے سفیر نہیں رہے - تب سے ادب کے سفیر بن گئے ہیں -

وہ قیوم نظر آرہے ہیں - ان کے ساتھ ایک شوخ کالم نویس انتظار حسین ہیں - جن کا صوبائی محبت پھیلانے میں جواب نہیں -

لیجئے مسعود مفتی صاحب بھی آن نکلے - انھیں سب سے پہلے آنا چاہئے تھا - کیونکہ مضمون سب سے پہلے پڑھیں گے -

پانچ بج کر دس منٹ ہونے کو آئے ہیں - لیجئے اس تقریب کے مہمانِ خصوصی خواجہ شہاب الدین تشریف لا رہے ہیں آہستہ آہستہ چلے آرہے ہیں - خواجہ صاحب اکیلے نہیں - ارادت مندوں کا ایک حلقہ ساتھ ہے -

(دعوتی کارڈوں پہ تو وقت ساڑھے پانچ کا چھپا ہے - مگر آج صبح راولپنڈی سے ٹیلیفون آیا تھا کہ خواجہ صاحب محترم صرف نقوش کی تقریب کے لئے لاہور پہنچ رہے ہیں - ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ آج ہی رات کو راولپنڈی میں بھی ایک جلسہ ہے - جس کی صدارت بھی خواجہ صاحب ہی کریں گے - لہٰذا کوئی ایسی صورت ہونی چاہئے کہ وہ آٹھ بجے کے جہاز سے واپس راولپنڈی پہنچ سکیں)

مہمانِ خصوصی کے پہنچنے کے بعد اب یہ معلوم نہیں ہو رہا ہے کہ کون آرہا ہے - کون نہیں - ہال بھرا ہوا ہے - اب بجائے دروازے

کی طرف دیکھنے کے اسٹیج کی طرف دھیان دینا پڑ گیا ہے۔ مجبوری کی بنا پر جلسے کی کارروائی آدھ گھنٹہ پہلے شروع ہو رہی ہے۔ اسٹیج سیکرٹری نے کہا :۔

"مہمانِ خصوصی عزت مآب خواجہ شہاب الدین صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ اس لئے جلسے کی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ یہ تقریب رسالہ نقوش کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر منعقد ہو رہی ہے۔ نقوش کا ادبی مرتبہ کیا ہے۔ یا یہ کہ طفیل صاحب نے اسے کن مشکلوں سے پروان چڑھایا۔ اس کے بارے میں ابھی اُردو زبان کے نامور لکھنے والے آپ سے باتیں کریں گے۔

مجھے اس وقت آپ سے یہ کہنا ہے کہ نقوش نے جیسا اور جس نوعیت کا کام کیا ہے۔ وہ اس اہمیت کا حامل ہے کہ ہم سب اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ ایک انسان کی لگن نے ادبی راستوں کی کتنی ہی کٹھن منزلوں کو آسان بنایا اور کتنی ہی نئی منزلوں کا سراغ لگایا۔ یہ ہمارا آج کا موضوع ہے۔

ابتدا خدائے برتر کے پاک کلام سے ہو گی۔"

تلاوت کے بعد مدیر نقوش کو پکارا گیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی سفیر ہے تو مجھے کیا۔ کوئی وزیر ہے تو مجھے کیا۔ اس فقرے پر سفیروں اور وزیروں کے علاوہ بہت سے لوگ چونکے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک کسی کا بڑا عہدہ پالینا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ بڑی بات اس کی انسانیت، اس کا خلوص اور اس کے اوصاف ہیں۔ اسی معیار کے پیشِ نظر جب انہوں نے یہ کہا کہ میں خواجہ صاحب کی انسان دوستی، ان کے خلوص، ان کے تدبر اور ان کی ادب سے لگن کی وجہ سے متاثر ہوں تو جان میں جان آئی بہرحال وہ کچھ اپنے بارے میں اور کچھ مہمانِ خصوصی کے بارے میں کہہ کر بیٹھ گئے ہیں۔

اب مسعود مفتی صاحب کو پکارا گیا ہے۔ پھر سید وقار عظیم کو، پھر خدیجہ مستور کو، پھر کرنل محمد خان کو، پھر عبدالسلام خورشید کو، ان میں سے ہر ایک نے نقوش کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا اور بڑی ہی فراخ حوصلگی کے ساتھ نقوش کی خدمات کو سراہا۔

(طفیل صاحب کو اس وقت جتنا خوش ہونا چاہئے تھا۔ اتنا نظر نہیں آ رہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ بات اس وقت ان سے پوچھی نہیں جا سکتی۔)

اس کے بعد اسٹیج سیکرٹری نے کہا "اس تقریب کا انعقاد خطوط نمبر کی وجہ سے ظہور میں آیا ہے۔ اس لئے اب کچھ اس کے بارے میں بھی باتیں ہو جائیں۔ پہلے سید قاسم رضوی صاحب آپ سے خطاب کریں گے۔"

رضوی صاحب قائدِ اعظم کے خطوط پر روشنی ڈال رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جس طرح قائدِ اعظم کے سوچنے کا انداز تھا۔ وہی دو ٹوک انداز خطوط میں بھی ملتا ہے۔ — قائدِ اعظم کے نام میں بھی جان ہے۔ تقریر بھی زوردار ہے!

اب سید وزیر الحسن عابدی غالب کے خطوط پر بات کر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ غالب اپنے زمانے کے وزیرِ اطلاعات تھے۔ وہ دلی سے خط لکھتے تھے تو اس کے مندرجات کی خبر ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچ جایا کرتی تھی۔

عابدی صاحب کے بعد حکیم احمد شجاع کی باری آئی ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ حکیم الامت ڈاکٹر سر محمد اقبال کے سارے ہی خطوط کو سچ نہ سمجھا جائے۔ اس لئے کہ وہ شاعر تھے۔ ترنگ میں آکر وہ باتیں بھی لکھ جایا کرتے تھے جو انھیں نہیں لکھنی چاہئے تھیں۔ پھر وہ انسان تھے۔ لازوال قسم کے حسن کو دیکھ کر وہ بھی متاثر ہو سکتے تھے وغیرہ وغیرہ!

اسٹیج سے اعلان ہو رہا ہے :۔

اُردو ادب کے بارے میں ادبی رسائل کے بارے میں نقوش کے بارے میں اور طفیل صاحب کے بارے میں اور بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ چونکہ وقت کم ہے۔ اس لئے میں اِس تقریب کے مہمانِ خصوصی عزت مآب خواجہ شہاب الدین سے درخواست کروں گی کہ وہ اپنے ارشاداتِ عالیہ سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔ یہ کہنا تھا کہ فوٹو گرافروں کا ہجوم اُمڈ پڑا۔ ٹیلیویژن والوں کی ریل چل پڑی ہے۔

خواجہ صاحب فرما رہے ہیں کہ "کہنے کو نقوش ایک ماہنامہ ہے۔ لیکن ادب کے مختلف موضوعات پر اس کے ضخیم خاص نمبر مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل نمبر، افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، یہ تمام خاص نمبر علم و ادب کے ایسے انمول ذخیرے ہیں۔ جن سے نہ صرف دورِ حاضر کے ادیب، نقاد اور طالب علم استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان میں تاریخی اہمیت کی جو بیش قیمت معلومات یک جا کر دی گئی ہیں۔ ان سے آنے والی نسلوں کے لکھنے والے، ریسرچ اسکالر اور مبصر، تذکرہ نگار اور مورّخ بھی مسلسل فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ یقیناً یہ اُردو ادب کی عظیم خدمت ہے اور اپنے تاریخی کارناموں کی وجہ سے نقوش کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔"

ایک تو خواجہ صاحب کی تقریر بڑی پُرمغز اور موثر ہے۔ پھر ان کا تلفظ اتنا صحیح ہے کہ لُطف آ رہا ہے۔

خواجہ صاحب کی تقریر کے بعد، سب کو چائے کے دو گھونٹوں کے لئے کہا جا رہا ہے۔

ہاں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض ایک مقامی کالج کی لیکچرر نے انجام دیئے ہیں نام کوئی بھلا سا ہے مگر اب یاد نہیں آ رہا۔

اب احباب چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے بڑے بھلے لگ رہے ہیں۔ چائے کا انتظام ہوٹل کے تالاب کے ساتھ ہے۔ جس میں غیر ملکی عورتیں اور مرد نہا رہے ہیں۔ چائے کا بھی مزا آ رہا ہے۔ ماحول بھی "غڑاپ" قسم کا ہے۔

لیجیے مہمانِ خصوصی تو چل دیئے۔ اس لئے کہ سوا سات بج رہے ہیں۔ خواجہ صاحب فرما رہے ہیں۔ ایسی اچھی ادبی نشستیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔

طفیل صاحب خواجہ صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کو دروازے تک تو رخصت کراؤں مگر خواجہ صاحب فرما رہے ہیں۔ مہمان بیٹھے ہیں۔ آپ یہیں رُک جائیں۔ خواجہ صاحب نے ایک بار پھر بڑائی کا ثبوت دیا۔

اب طفیل صاحب راستے میں کھڑے ہو گئے ہیں اور مہمانوں کو رخصت کر رہے ہیں۔ اس سارے عرصے میں اب جا کے کچھ ان کے چہرے پر رونق آئی ہے۔

میری باتیں ختم ہوئیں۔ اب آپ وہ مضامین پڑھ لیں۔ جو پڑھے گئے۔ وہ لوگ دیکھ لیں جو موجود تھے۔ البتہ اس ضمن میں ایک بات عرض کرنے کی ہے کہ فوٹو گرافروں کو نہ جانے خواتین سے کیا کد تھی کہ انہوں نے اس سمت کی کوئی تصویر نہیں کھینچی۔ یہ بات بھی میں شاید بھول جاتا۔ مگر مجھے ایک خاتون کا فقرہ نہیں بھولتا۔

"اگر یہاں کوئی خاتون فوٹو گرافر ہوتی تو ہماری بھی "پھوٹو" کھنچ جاتی۔"

نقوش

۲۰ ویں سالگرہ



مدیر نقوش نے خواجہ شہاب الدین بالقابہ کی خدمت میں خطوط نمبر پیش کیا



مسعود مفتی نے کہا :—

بیس سال کا یہ سفر مہم جوئی کی کٹھن داستان ہے ۔ جس میں کئی ہم سفر دائیں بائیں گر کر ٹھنڈے ہوگئے ۔ مگر ان کا سفر جاری رہا ۔ نہ صرف رہا بلکہ اب بھی ہے اور لمبی مسافت کی تھکن کے باوجود ہر نیا قدم نئے انداز میں اٹھتا ہے ۔

حاضرین جلسہ





سید وقار عظیم نے کہا:—

اب مجھے محمد طفیل اور محمد نقوش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا - ہم دونوں کے ممنون احسان ہیں - اگلی نسلیں بھی اس احسان کا بار محسوس کریں گی اور یہ دونوں نقش جو باہم ایک دوسرے کا عکس ہیں ہمیشہ قائم رہیں گے -

حاضرین جلسہ





خدیجہ مستور نے کہا:۔

نقوش کے ان ضخیم علمی و ادبی اور تحقیقی نمبروں کو جب میں دیکھتی ہوں تو مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی ترتیب و تدوین میں بھائی طفیل کو کیا کچھ نہ جھیلنا پڑا ہوگا۔ ان ادبی خزانوں میں ان کی بے شمار راتوں کی نیندیں، اور ان گنت دنوں کی بے چینیاں پوشیدہ ہیں۔



ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے کہا

اتنی جامعیت، اتنی خصوصیات کے حامل اور اتنی ضخامت کے رسائل دنیا کے کسی ملک میں موجود نہیں۔ اس لئے میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ نقوش دنیا بھر میں اپنی قسم کا پہلا مجلہ ہے



حکیم احمد شجاع نے کہا

اقبال کے خطوط کو پڑھ کر آپ خدا جانے کیا کیا اندازے لگا رہے ہوں ۔ اقبال قلبی اور جسمانی کیفیت کے لحاظ سے ذکی الحس انسان تھے ۔ جو لکھنے کی باتیں نہ ہوتی تھیں اقبال وہ بھی لکھ جاتے تھے ۔

جو خطوط انہوں نے ملکی سیاست یا اپنے فلسفے یا اپنے نظریۂ خودی کے متعلق لکھے ہیں ۔ فقط وہی خطوط ہیں ۔ جن کو آپ کو چاہیے کہ مدنظر رکھیں ورنہ وہ کون ایسا شخص ہے اس دنیا میں ، جس کا بیوی جھگڑا نہیں ہو جاتا ۔ وہ کون ایسا شخص ہے جو اپنی اولاد کو بگڑتے دیکھ کر ناراض نہیں ہو جاتا یا وہ کون ایسا شخص ہے جو لا زوال حسن کو دیکھ کر چند لمحوں کے لئے پریشان نہیں ہو جاتا ۔ اب اگر کوئی ان سے اقبال کی تاریخ لکھنا شروع کر دے تو یہ اقبال جیسے فرشتہ سیرت انسان پر سب سے بڑا ظلم ہوگا ۔



سید قاسم رضوی نے کہا

خطوط اگر دیانت داری سے لکھے جائیں ۔ خلوص سے لکھے جائیں تو یقیناً ہر اظہار کی طرح یہ بھی انسان کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ۔

قائداعظم کے خطوط میں آپ کو ادبی جواہر پارے نہ ملیں ۔ لیکن ان میں آپ کو تاریخ کے بڑے بڑے موڑوں پر درج ہدایات کے نشان ضرور ملیں گے ان کا انتہا سے زیادہ گرم اور نرم دل مسلمان قوم کے لئے ہمیشہ کڑھتا رہا ۔ ان کی اصول پرستی اور ان کی دیانت داری ، ان کا ہر بات میں دو ٹوک انداز ، ان کے خطوں کی سطر سطر میں محفوظ ہے ۔



خواجه شہاب‌الدین نے فرمایا :—

نقوش نے بیس سال تک اردو ادب کی جو گراں مایہ خدمات انجام دی ھیں ۔ میں ھی نہیں پوری ادبی دنیا اس کی معترف ہے — اور اپنے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے نقوش کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ھمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا ۔

خطبۂ صدارت

عزت مآب خواجہ شہاب الدین بالقابہ

محترم طفیل صاحب، معزز خواتین و حضرات!

میرے محترم جناب طفیل صاحب نے میری نسبت جو ستائشی کلمات ارشاد فرمائے وہ خود ان کی عالی ظرفی اور نیک خیالی کا ثبوت ہیں۔ میں اس قدر افزائی کا ممنون ہوں۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ میں ادیبوں اور دانشوروں کی اس مجلس میں ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں۔ ایک عرصہ کے بعد حقیقی معنوں میں ایک خالص ادبی مجلس میں شرکت نصیب ہوئی۔ جو میرے لئے بذاتہٖ ایک سعادت ہے۔

عزیز محترم طفیل صاحب نے جو میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ اپنے مؤقر جریدے نقوش کی بیسویں سالگرہ کی اس تقریب میں شرکت کی دعوت بھی کچھ ایسے محبت بھرے انداز میں پیش کی کہ مجھے انکار کی مجال نہ ہو سکی۔ اپنے مخصوص دلفریب انداز میں فرمایا:۔

"مجھے آپ سے محبت ہے۔ کیونکہ آپ کو ادب سے محبت ہے۔ آپ کو
بھی مجھ سے اور نقوش سے تعلقِ خاطر ہے۔ اس لئے اپنے 'نقوش' کی
بیسویں سالگرہ کی تقریب میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔"

اس دل پذیر فرمائش نے مجھ پہ یہ لازم کر دیا کہ اپنے دیگر مشاغل کے باوجود، اس تقریب میں حاضر ہو کر ادب سے اپنے تعلق کا عملی ثبوت دوں اور آپ جیسے ذی قدر اہلِ علم و دانش کا ہمنوا بن کر نقوش کی بیسویں سالگرہ پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کروں۔

بیس سال اُردو کے ادبی رسائل کے لئے عمرِ طبعی سے کچھ زیادہ ہی مدت ہے۔ اِس افسوسناک صورتِ حال کی وجوہ کا ہم سب کو بخوبی علم ہے اور ہم سے زیادہ خود ان رسائل کے مدیروں کو علم اور ذاتی تجربہ ہے۔ اس کے باوجود ان عوارض کا کوئی تیر بہدف علاج آج تک دریافت نہ ہو سکا۔ اس کا سبب شاید یہ بھی ہو کہ جس قدر یہ عوارض پیچیدہ ہیں۔ اسی قدر ان کے علاج بھی پیچیدہ ہیں اور دیر طلب بھی۔ ہمارے اَن گنت بلند پایہ رسالے اِسی کشمکش کا شکار ہو گئے۔ اس خوشی کی تقریب میں ان ناگوار باتوں سے آپ کو مکدر کرنا مقصود نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ ایسے صبر آزما حالات میں کسی خالص ادبی رسالے کا بیس سال تک مسلسل جاری رہنا معجزہ ہو یا نہ ہو، اس بات کا

واضح ثبوت ہے کہ اس کے مدیر غیر معمولی قوتِ ارادی اور استقامت کے مالک ہیں طفیل صاحب میں ان سب خوبیوں کے علاوہ خلوص اور ادب کی سچی لگن اور خدمت کا جذبہ بھی بدرجۂ وافر ہے۔ یہی ان کی کامیابی کا ضامن ہے۔

نقوش نے بیس سال تک اُردو ادب کی جو گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔ میں ہی نہیں پوری ادبی دنیا اس کی معترف ہے۔ ملک میں جتنے ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں یا ہوتے رہے ہیں ان سب نے، اپنے اپنے طور پر، اُردو ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ملک میں ادب و فن کا جو شعور آج پایا جاتا ہے۔ یہ ہمارے ادبی رسائل ہی کا مرہونِ منت ہے۔ ہر رسالہ اپنی جداگانہ خوبیوں کا حامل ہے۔ ادب کے مستند ناقدین نے نقوش کو اس لحاظ سے منفرد قرار دیا ہے کہ اس کے خاص نمبروں نے نہایت اہم تاریخی اور دستاویزی مواد فراہم کیا ہے۔

کہنے کو نقوش ایک ماہنامہ ہے۔ لیکن ادب کے مختلف موضوعات پر اس کے ضخیم خاص نمبر مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل نمبر، افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، یہ تمام خاص نمبر علم و ادب کے ایسے انمول ذخیرے ہیں۔ جن سے نہ صرف دورِ حاضر کے ادیب، نقاد اور طالب علم استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان میں تاریخی اہمیت کی جو بیش قیمت معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ ان سے آنے والی نسلوں کے لکھنے والے ریسرچ اسکالر اور مبصر، تذکرہ نگار اور مورخ بھی مسلسل فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ یقیناً یہ اُردو ادب کی عظیم خدمت ہے اور اپنے ان تحقیقی کارناموں کی وجہ سے نقوش کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

نقوش کا تازہ شمارہ 'خطوط نمبر' ہے۔ جس میں غالبؔ، سر سید احمد خان، محسن الملک، وقار الملک، علامہ اقبالؔ، قائداعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہرؔ، نواب بہادر یار جنگ، حالیؔ اور شبلیؔ سے لے کر دورِ حاضر کی ممتاز ہستیوں اور نامور ادیبوں اور شاعروں تک، جن کی فہرست خاصی طولانی ہے۔ ان سب کے دو ہزار دو سو ترپن (۲۲۵۳) غیر مطبوعہ خطوط درج کئے گئے ہیں۔ بعض خطوط سو سال پرانے ہیں۔ بعض اس سے کچھ زیادہ اور بعض کچھ کم، ایسے نادر و نایاب خزانے کو بیہم تلاش اور مسلسل کاوش سے جمع کرنا پھر ان کرم خوردہ تحریروں کو اس قدر نفاست کے ساتھ طبع کر کے پیش کرنا بہت بڑی خدمت ہے۔ جس کی قدر و منزلت اہلِ نظر جانتے ہیں۔

ایسے خطوط سے مشاہیر کی شخصیت اور ان کے حالات کے بارے میں ہماری معلومات میں بیش قیمت اضافہ ہوگا۔ متعدد ایسے اہم خطوط بھی ہیں جن سے اسلامیانِ برصغیر کی تاریخ کے اس دور کے بہت سے گوشے روشن ہوں گے۔ جسے اکثر ہماری لاعلمی کے باعث تاریک دور سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں مسلمان چاروں طرف سے شدید خطرات میں محصور تھے لیکن اللہ تعالےٰ کے فضل سے اس تاریک دور میں بھی ملت مخلص اور دردمند ہستیوں سے خالی نہ تھی۔ قوم کے چند غیور فرزند ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے شدید خطرات کے باوجود اپنے اپنے فکر و نظر کے مطابق حریت کی شمعیں روشن رکھیں۔ بڑی بڑی قربانیاں دے کر انھیں فرنگستانی بادِ سموم کے تھپیڑوں سے بچاتے رہے

اور اس شدید ظلمت میں ٹمٹماتی شمعیں لئے آگے بڑھتے رہے۔ اس وقت کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ ان کی یہی ٹمٹماتی ہوئی شمعیں ایک دن وہ چراغ روشن کر دیں گی، جو آج خورشید جہاں تاب بن چکا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ایسے اہم خطوط سے جو پہلی بار منظر عام پہ آ رہے ہیں۔ ہمیں اپنی ملی تاریخ کی بعض گم شدہ کڑیوں کو ملانے میں بڑی مدد ملے گی۔ ان سے ہمیں اپنی قومی سرگزشت کے ایسے مستند مآخذ کا سراغ بھی ملے گا۔ جن سے تحریکِ پاکستان کا صحیح تاریخی پس منظر بھی مرتب کیا جا سکے گا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ مستند مآخذ کے فقدان اور صحیح حالات کے بعض اہم اجزا کی لاعلمی کے باعث ہماری قومی سرگزشت ابھی تک باضابطہ تدوین کے لئے ترس رہی ہے اور ہمارے اہلِ قلم اور اہلِ فکر کی توجہ کی محتاج ہے۔ آپ جیسے دانشوروں کے سامنے مجھے اس کی مزید تصریح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مستند ماخذ کا جمع کرنا اور ان محرکات و عوامل کا احاطہ کرنا جن سے برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی تشکیل ہوئی۔ پھر ان عوامل کے نتائج کو مربوط کر کے مکمل حالات کی صحیح روداد قلمبند کرنا۔ ہماری قومی تاریخ کے لئے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کام جس قدر مشکل ہے اس سے زیادہ ضروری بھی ہے۔ ہمارے اہلِ قلم حضرات کے علاوہ اور کون ہے جو اس اہم قومی فریضے کو انجام دے سکے؟ زمانے نے انہی کو ہماری تاریخ کے اس عظیم دور کی ترجمانی کرنے کے جلیل منصب پر فائز کیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر احباب نے اس عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ تاریخ بنائی ہے۔ اگر یہ حضرات اس فرض کی ادائیگی سے غافل رہے تو آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔

مجھے یقین ہے کہ ملک کے تمام اہلِ قلم اس نیک اور اہم فریضے کی ادائیگی میں اپنی خداداد لیاقت اور محنت کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے ـــــ طفیل صاحب نقوش کا ایک اور ضخیم اور عظیم تر نمبر مرتب کریں گے اور ملک کے دیگر جرائد اور ناشرین کتب بھی اس اہم دستاویزی مواد کو آب و تاب سے شائع کریں گے۔ جس سے ہماری قومی تاریخ صحیح خطوط پہ منضبط ہو سکے گی اور آنے والی نسلیں اس تاریخ کو دیکھ کر فخر سے اپنا سر بلند کر سکیں گی۔

میں مدیرِ نقوش کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے آج مجھے اس پُر لطف صحبت میں شامل ہونے کا موقع دیا اور مجھے سیاست کے خارزار سے ہٹ کر چند لمحوں کا سکون میسر آیا۔

خدا انھیں اپنی کوششوں میں کامیاب کرے۔

بیسویں سالگرہ پر

مسعود مُفتی

صدرِ گرامی قدر ـــــ خواتین و حضرات!

چند روز پہلے جب معلوم ہوا کہ نقوش کی بیسویں سالگرہ پر مجھے بھی کچھ کہنا ہے تو میں بہت پٹپٹایا۔ کیونکہ میں عادتاً سالگرہ کے ہنگاموں سے گھبراتا ہوں۔ وجہ یہ کہ اس میں عموماً سطحی تعلقات کو رنگین پیکیٹ کی شکل دی جاتی ہے ـــــ پھر مصلحت کی ڈوری میں لپیٹ کر چمکیلا تحفہ بنایا جاتا ہے ـــــ اور بالآخر اندیشہ ہائے سود و زیاں کے ہجوم میں پیش کیا جاتا ہے۔ ـــــ لیکن پھر سوچا کہ ایسی سالگرہ تو بڑی باقاعدگی سے ہر سال اور بعض اوقات سال میں دو تین مرتبہ بھی ہوتی ہے اور طفیل صاحب تو غالباً بیس سال میں ایک دفعہ سالگرہ منا رہے ہیں۔ تو کچھ تسلی ہوئی اور میں اپنے وسوسے بھول کر چلا آیا ـــــ دوسری تسلی یہ تھی کہ غالبؔ کے برعکس طفیل صاحب اپنے ساتھ نوحہ گر رکھنے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ اس لئے مجھے غالبؔ کے قصائد کے انداز میں یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ ؎

دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

اتنا افسوس البتہ ضرور ہوا کہ طفیل صاحب ذرا لیٹ ہو گئے ہیں۔ اور بیسویں سالگرہ پر جو نکے۔ ورنہ اُردو ادب سے اِن جیسا والہانہ عشق کرنے والا بھول نہیں سکتا کہ اردو شاعری میں اصل اہمیت سولہ برس کے سن کو ہے۔ اس سے انحراف تبھی ممکن ہے اگر وہ جدید شاعروں کی طرح روایت سے بغاوت کرنا چاہتے ہوں ـــــ ویسے یہ ہے بھی ٹھیک ـــــ آخر اُردو ادب کی کونسی صنف ہے جس پر انہوں نے تحقیق و تبصرے کا لاجواب نمبر نہیں نکالا۔ اگر تھوڑی سی جدید شاعروں کی بھی مان لی تو کیا حرج ہے۔ گو یہ ضروری نہیں کہ جدید شاعر بیسویں برس کو کوئی خاص اہمیت دیں۔ وہ تو غالباً ایک سولہ برس کے سن کو پوجیں گے ـــــ ذاتی معاملہ جو ہوا ـــــ بہر حال طفیل نقوش کی بیسویں سالگرہ پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ بیس سال کا یہ سفر مہم جوئی کی کٹھن داستان ہے۔ جس میں کئی ہم سفر دائیں بائیں گر کر ٹھنڈے ہو گئے۔ مگر اِن کا سفر جاری رہا ـــــ نہ صرف رہا۔ بلکہ اب بھی ہے اور لمبی مسافت کی تھکن کے باوجود ہر نیا قدم نئے انداز میں اٹھتا ہے۔ بقول غالبؔ ؏

مستانہ طے کروں ہوں رہِ منزلِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

مدیرِ نقوش کی جواں ہمتی کا وصف ہی یہی ہے کہ سایۂ دیوار میں بیٹھ کر بازگشت پر فخر کرنے کی بجائے مستقبل پر

مستانہ وار کمندیں ڈالتے جاتے ہیں۔ ایسے سفر کے لئے غالب نے شرط رکھی ہے کہ ؎

شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

ان کے شوق اور جرأت نے جو نقشِ پا بنائے ہیں۔ وہ ادبی تواریخ بن گئے ہیں۔ نہ صرف ان کی مدیرانہ کاوشیں بلکہ "آپ"، "صاحب" اور "محترم" کی شکل میں ان کی تخلیقی کوششیں بھی تواریخی اعتبار سے اہم تحریریں ہیں۔ خوبصورت اسلوب اور دوسرے محاسن اس کے علاوہ ہیں۔

خواتین و حضرات ——— ابھی ابھی میں نقوش کے خاص نمبروں کا ذکر کر رہا تھا۔ کہ وہ اردو ادب میں ایک لاجواب اضافہ ہیں۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رہتی۔ طفیل صاحب کی ادبی دکان ایسی ہے کہ بقولِ غالب یہاں ؏

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

اور ان کے عام نمبر بھی سنگِ میل سے کم ثابت نہیں ہوتے۔

بار بار غالب کا ذکر کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ میں یقیناً غالب کا طرف دار نہیں۔ مگر بدقسمتی سے سخن فہم ہونے کا بھی جواز پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جدید تر سخن میری فہم سے باہر ہے ——— غالب کا سہارا اس لئے لیا کہ اس کی بات میں بھی سمجھ جاتا ہوں اور آپ بھی۔ لیکن اگر جدید نمونوں کا سہارا ڈھونڈتا تو سمجھنے سمجھانے والا قصہ ختم ہو جائے گا ——— ویسے تو ایک دفعہ غالب نے بھی کہا تھا کہ ؏

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

لیکن وہ خامشی کے فائدے کے تعلق سے کہا تھا۔ اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔

اس مرحلے پر ایک اور وضاحت بھی کر دوں۔ آپ پوچھیں گے کہ بیسویں سالگرہ تو نقوش کی ہے اور میں بار بار طفیل صاحب کا ذکر کر رہا ہوں ——— آپ کا اعتراض درست۔ مگر میرا اصرار بھی بجا ہے۔ اس لئے کہ ان برسوں میں طفیل نے اپنی ذات کو نقوش میں اس طرح تحلیل کر دیا ہے۔ کہ انجمن ترقی اردو ایک کلاسیکی ضرب المثل میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اور آئندہ مرغی پہلے یا انڈہ پہلے والی پہیلی کی بجائے طفیل پہلے یا نقوش مستعمل ہو جائے گا۔ اس سے ایک تو پہیلی کی فرسودگی ختم ہو جائے گی اور دوسرے یار لوگوں کو اپنے آپ کو انٹلکچوئل ظاہر کرنے کا آسان نسخہ مل جائے گا۔

طفیل اور نقوش کے منطبق ہونے میں طفیل صاحب کی محتاط، متوازن اور ہموار طبیعت کو بھی بہت دخل ہے۔ نقوش کا سرورق ہو۔ یا پرچے کی خوبصورت طباعت ہو۔ یا مضامین کے انتخاب کا سلیقہ ہو۔ اور یا پھر مدیرانہ پالیسی ہو۔ وہ ایک بنی تلی چال سے قائم ہیں۔ جیسے کوئی تنی ہوئی تار پر دو چھتریاں پکڑ کر چلتا ہے ——— گھماتا۔ ہلاتا۔ اٹھاتا اور گراتا ہوا ——— وہ اتنے محتاط ہیں کہ اردو ادب کے قدیم رہنموں کے عقیدت مندانہ طواف میں بھی جسم دچال چرا کر اور نظر بچا کر چلتے ہیں۔

اس معاملے میں میرا اُن سے کبھی اختلاف بھی ہوا ہے۔ کیونکہ میرا ایمان ہے کہ اس ملک کو سر پھروں کی سخت

ضرورت ہے۔ سارتر اور رسل جیسے سرپھروں کی ——— یہ علیحدہ بات ہے کہ میں کبھی گفتار کا غازی ہوں اور سرپھرا بننے کی ہمت اپنے بال و پر میں نہیں پاتا۔ کیونکہ "ایں سعادت بزورِ بازو نیست"۔ لیکن اگر کبھی بھولے سے پاسبانِ عقل سو جائے۔ تو طفیل صاحب نقوش کی اوٹ سے نکل کر خضر کے انداز میں ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔

ہم ہوش ترمذی کی آواز میں لاکھ احتجاج کریں کہ ؎

ہر جنبشِ دامانِ جنوں، جانِ ادب ہے
اِس راہ میں آداب سکھائے نہیں جاتے

لیکن یہ بھی کمال صبر سے اُسی آواز میں سمجھاتے ہیں ؎

کچھ زخم ہیں ایسے کہ دکھائے نہیں جاتے[1]

اور ساتھ ان کی زیرِ لب مسکراہٹ کہتی ہے کہ میں بھی اپنے زخموں کو نقوش کی موٹی موٹی جلدوں کے نیچے چھپا لیتا ہوں۔ تم بھی یہ گُر سیکھو۔

چھوٹے اپنی لغزشِ پا سے ٹھوکر کھاتے ہیں۔ تو نانیاں دادیاں "بسم اللہ" پکار اٹھتی ہیں ——— اس میں دعا بھی ہوتی ہے۔ اور تنبیہہ بھی ——— یہی کردار آج کل کبھی کبھار طفیل صاحب کو ادا کرنا پڑتا ہے ——— مصلحت کی ٹھوکروں۔ ادبی لغزشوں اور ذہنی بے راہ روی کے اِس دَور میں ایسے بزرگ کی ذات ایک قومی اثاثہ بن جاتی ہے ———

خدا کرے اِن کا فیض جاری رہے اور نقوش کی دکان چلتی رہے۔

---

[1] اور آج تو اِس سلسلے میں انہوں نے ایک حدیث بھی سنا دی۔

نقوش اور طفیل

سید وقار عظیم

مجھے بڑے اختصار کے ساتھ، نقوش اور طفیل کے متعلق یا ان دونوں کے باہمی رشتے کے متعلق جو کچھ عرض کرنا ہے اس سے پہلے کچھ اعداد و شمار پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آج ہم نقوش کی بیسویں سالگرہ منانے کے لیے یکجا ہوئے ہیں، اس لئے کہ نقوش کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۴۸ء میں چھپا تھا۔

۱۔ اُس وقت سے اس وقت تک اس کے ۱۰۹ شمارے چھپے۔

۲۔ ان میں سے ۴۸ شمارے خاص نمبر ہیں اور ۶۱ شمارے عام نمبر۔

۳۔ ان سب شماروں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۱۳۵۸ ہے۔

۴۔ ان ۲۱۳۵۸ صفحوں میں مختلف اصناف سے تعلق رکھنے والی نگارشات کی تعداد یہ ہے:

ڈرامے	۲۶	
ناولٹ	۱۲	
افسانے	۹۲۸	
نظمیں	۷۴۵	(کل مشمولات ۸۹۵۵)
غزلیں	۲۰۸۴	
مضامین	۱۴۷۱	
خطوط	۳۶۸۹	

ان اعداد سے محترم قاضی عبدالودود صاحب اور عزیزی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب جو نکتے پیدا کریں گے ان تک میرے ذہن کی رسائی نہیں، البتہ بعض بدیہی نتائج میں نے بھی نکالے ہیں۔ ۲۱ ہزار سے زیادہ صفحوں کا یہ ضخیم دفتر، (کہ جس کے ہر صفحے میں ۲۷ سطریں اور ہر سطر میں اوسطاً ۲۵ لفظ ہیں) اگر ایسے زمانے میں مرتب ہوا ہوتا جب کوئی بڑی مہم سر کرنے والوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں بٹھا کر سونے میں تول دیا جاتا تھا تو محمد طفیل کو ان کی جان کاہی کا صلہ مل جاتا اور وہ ہنسی خوشی گھر لوٹ کر آتے۔ اب جو کچھ ہوا ہے اس کی داستان بڑی دردناک ہے۔ نقوش ۱۹۴۸ء میں چھپنا شروع ہوا اور اسی سال طفیل اتنے بیمار پڑے کہ وہ اچھے ہوئے تو سب نے جانا کہ آج انھیں نئی زندگی ملی ہے۔ طفیل کا سر جان آفریں کے آگے جھک گیا اور انھوں نے نئی زندگی کا سفر احسان مندی کے ایک تازہ جذبے اور احساس کے ساتھ شروع کیا۔

کچھ کرنے اور کچھ کر کے زندہ رہنے کی آرزو اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سفرِ شوق میں خلوص، انہماک، عزمِ راسخ، مروت ایثار، حق پسندی، یقین اور خود اعتمادی نے زادِ راہ کا کام دیا ہے اور شوق کی بلندی اور ہمت کی استقامت نے برابر کا حصہ لے کر دس برس کی مدت میں نقوش کو اردوئے معلّیٰ، مخزن، صلائے عام، زمانہ، ساقی، ہمایوں اور نیرنگِ خیال کا حریف بنا دیا۔ آزادی نمبر، امن نمبر، ناولٹ نمبر، افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، مکاتیب نمبر اس دور کے خاص نمبر تھے۔ ان نمبروں نے خاص نمبر کے مفہوم اور معنی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ نمبر ہمیشہ کے لئے ادیب سے شناسائی اور معرفت کا وسیلہ بنے، انہوں نے اہم ادبی اصناف کی ابتدا اور ارتقا کی داستان بھی سنائی اور ادب کے تخلیقی عوامل کی نشان دہی کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ان خاص نمبروں کی حیثیت ادب اور ادیب پر کام کرنے والوں کے لئے ناگزیر، مآخذ اور منابع کی ہو گئی۔ ان کے ذریعے ماضی اور حال کے باہمی رشتوں کا سراغ لگانے کے راستے کھل گئے۔ ان میں عہدِ حاضر کے انسان کا قلب اور ذہن محفوظ ہو گیا۔ زندگی سے محبت اور اس کی ترجمانی، تفسیر، تنقید، اصلاح اور رہنمائی کا جو فریضہ ادیب نے انجام دیا، ان خاص نمبروں کے اوراق اس کی دستاویز بن گئے۔ جن ادیبوں کا رشتہ ادب کے ساتھ اب محض وضع داری کا رشتہ ہے نقوش نے ان کے غیر فانی مرقعوں کو محفوظ کیا اور جن ادیبوں نے پہلے پہل افسانے اور غزل کی دنیا میں قدم رکھا۔ وہ ان کے نقش اول کا امانت دار بنا ...... نقوش کے ان نمبروں میں سے اور بھی بے شمار چیزیں نکلتی اور ابھرتی ہیں اور ان سب چیزوں کے لئے قیام اور بقا ہے، لیکن جو کچھ میری اپنی نظر میں سب سے زیادہ ابھرتا ہے وہ اس کا مدیر ہے اور اس مدیر کے پیکر میں چھپا ہوا ادیب اور انسان، جو پہلے محمد طفیل تھا اور اب نقوش کے ازلی اور ابدی رشتے کی بدولت محمد نقوش تک کا سفر، اس سخت کوش اور سخت جان انسان نے نہ جانے کتنے صحراؤں میں سے گزر کر، کتنی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر، کتنے سمندروں میں ڈوب کر اور کتنے پہاڑوں پر چڑھ کر طے کیا ہے۔

۱۹۴۸ء کی طرح ۱۹۶۰ء میں ایک مرتبہ پھر وہ حیات و ممات کی کشمکش میں مبتلا ہوا۔ میری آنکھوں نے دیکھا کہ اس نے چائے کی پیالی کو منہ لگایا اور چائے کے چند قطرے اسے ہوش کی دنیا سے کہیں اور لے گئے ...... بے ہوشی، نبضوں کا غائب ہو جانا اور پھر امید و بیم کے کئی مہینے، لیکن محمد طفیل نے بڑی رازداری کے انداز میں اپنے اللہ سے محمد نقوش بننے کا جو عہد کیا تھا اس عہد کی خاطر اللہ نے اسے ایک زندگی اور دی اور اس نئی زندگی میں اس نے نقوش کو زندۂ جاوید بنا دیا ...... اور اب مجھے محمد طفیل اور محمد نقوش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ اگلی نسلیں بھی اس احسان کا بار محسوس کریں گی اور یہ دونوں نقش جو باہم ایک دوسرے کا عکس بن گئے ہیں ہمیشہ قائم رہیں گے ...... لیکن میں ایک بات اور بتانا چاہوں۔ نقوش سے طفیل کا پہلا رشتہ مدیر کا ہے۔ اس رشتے کی نشانیاں وہ چھوٹے چھوٹے اداریے ہیں جنھیں طفیل نے "طلوع" کا نام دیا۔ طلوع کے لہجے اور انداز پر جو جو اعتراض ہوئے ان کی فہرست بڑی طویل ہے، لیکن ان کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ ان اداریوں نے ان سے بہت سے دوستوں کی دوستی چھین لی اور سیدھی سادی رنجشیں طول کھینچ کر سر گرانیاں بن گئیں، لیکن سچ پوچھئے تو طلوع کی شکل میں اداریوں کا یہ مخلصانہ سرمایہ

نقوش کے سارے اونچ نیچ کی کہانی ہے اور نقوش کی طویل داستان میں معنویت انہی بے باکانہ اداریوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اب نقوش کے تازہ اداریوں کو غور سے دیکھئے تو ان کے لہجے میں گلہ شکوہ کہیں نہیں، دل پہ چوٹ لگانے والی دل سوزی اور دردمندی البتہ ہے ...... لہجے کا ذکر آیا تو محمد طفیل کے لکھے ہوئے وہ خاکے یاد آ گئے جو صاحب، آپ اور جناب کی شکل میں محفوظ ہیں۔ خاکہ نگاری کے متعلق خاکہ نگار کے اپنے نظریات ہیں۔ وہ انسان کو فرشتہ سمجھ کر ذلیل نہیں کرنا چاہتا، وہ اسے دیوتا اور اوتار تصور نہیں کرتا اور اس لئے بڑی صاف گوئی اور بے خوفی سے بزرگی کا لحاظ کئے بغیر، جاننے والوں کے متعلق سچی باتیں کہتا ہے اور ایسے لفظوں میں کہتا ہے جنہیں سن کر آدمی چونک پڑتا ہے۔ ان لفظوں میں پڑھنے والے کو احتیاط کی کمی کے علاوہ کہنے والے کی انا کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے ـــــ وہ انا جس کے زیرِ اثر وہ عبدالحق، رشید احمد صدیقی، پطرس، شاہد احمد دہلوی اور عصمت کی خاکہ نگاری میں کوئی نہ کوئی عیب دیکھ لیتا ہے۔ شکر ہے کہ خاکہ نگار محمد طفیل کے انا پر اب عجز و انکسار کا رنگ چڑھ رہا ہے اور اس کی بیباکی احتیاط کی پابند ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ ان دونوں باتوں میں بیان کی لطافت اور نزاکت بھی شامل ہوتی رہی تو اس کے لکھے ہوئے خاکوں میں جو بیشتر ایک منفرد اسلوب کے حامل ہیں، عبدالحق کے نام دیو مالی، رشید احمد صدیقی کے ایوب، پطرس کے مرحوم مرزا، عصمت کے دوزخی، منٹو کا گنجا فرشتہ اور شاہد احمد دہلوی کے اُستاد بندو خاں کی جھلکیاں بھی دکھائی دینے لگیں گی۔

محمد طفیل نے بیس سال تک نقوش نکال کر کیا کھویا اور کیا پایا ـــــ اگر ہم زندگی کے عام رواج کے مطابق نفع نقصان، سود و زیاں اور واجبات و واصلات کو کھونے اور پانے کا معیار بنائیں تو میرا اندازہ یہ ہے کہ ۲۲۵۲ غیر مطبوعہ خطوں کے اس شمارے کی تکمیل اور تقسیم کے بعد نقصان کے کھاتے میں ان کا شمار لکھ پتیوں میں ہوگا ـــــ نقصان کے اس سودے کو محمد طفیل نے بجا طور پہ نفع کا سودا سمجھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شوق کی سربراہی میں انہوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا وہ شوق، شیفتگی، وارفتگی اور دیوانگی کے مرحلوں سے گزرتا ہوا اب جنون کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اور مجھے میر کے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

قیس کا ذکر مری شانِ جنوں کے آگے ‏ ‏ اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہو گا

لیکن اپنے جنون کا ذکر طفیل اب جس عجز و انکسار اور جاں سوزی کے ساتھ کریں گے اس کا لہجہ یہ ہو گا: ؎

دل تڑپے ہے، جان کھپے ہے، حال جگر کا کیا ہو گا ‏ ‏ مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں، مجنوں کیا ہم سا ہو گا

طفیل نے نقوش بن کر ادب اور صحافت کی دنیا میں جنون کی جس نئی رسم کی طرح ڈالی ہے وہ قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ داد بھی اور ہماری رسم نے ہمیں جنون کی داد دینے کا صرف ایک طریقہ سکھایا ہے کہ ہم اپنے سینوں کو سدا اپنے مجنوؤں کی یاد سے آباد رکھتے ہیں۔

نقوش کے خاص نمبر

خدیجہ مستور

بہت سے ادبی رسائل معرض وجود میں آئے اور تھوڑے ہی عرصے میں طرح طرح کی مشکلات جھیل کر ختم ہو گئے۔ ان کا کوئی یاد کرنے والا نہیں رہا اور نہ ہی انھوں نے اپنی چھوٹی سی ادبی زندگی میں کوئی ایسا نقش چھوڑا جس کی بنا پر ان کا تذکرہ ہوتا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار نقوش ہاجرہ مسرور اور ندیم بھائی کی ادارت میں شائع ہوا اور صرف تین عام نمبروں کے بعد، اس وقت کی ادب نواز حکومت نے اسے منٹو کا افسانہ چھاپنے کے جرم میں چھ مہینے کے لئے بین کر دیا۔ تین عام نمبروں کی اشاعت کسی ساکھ کی ضامن نہیں ہوتی مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف ادیبوں بلکہ عام قاری نے بھی نقوش کی اس قید کو بری طرح محسوس کیا۔ چھ ماہ کی قید بھگتنے کے بعد جب نقوش دوبارہ شائع ہوا تو چھ سات نمبر مرتب کر کے ندیم بھائی اور ہاجرہ بعض مجبوریوں کی بنا پر ادارت سے دستبردار ہو گئے۔ ان کے بعد ادارت کے فرائض سید وقار عظیم صاحب نے سنبھال لئے۔ ایک سال نہیں گزرا کہ وہ بھی یونیورسٹی کی طرف سے اجازت نہ ملنے کی بنا پر نقوش سے الگ ہو گئے۔ وقار صاحب کے جانے کے بعد میں سوچ ہی رہی تھی کہ طفیل بھائی ضرور کوئی بہتر نام تجویز کریں گے مگر اطلاع ملی کہ موصوف اب خود ہی نقوش کے اڈیٹر بن گئے ہیں۔ دوسروں کی بات نہیں کرتی، اپنی کہتی ہوں کہ اس اطلاع نے مجھے سخت مایوس کیا۔ نقوش جس آن بان سے سامنے آیا تھا اس کی اتنی ہی عبرتناک موت میری نظروں کے سامنے گھوم گئی اور ساتھ ہی بھائی طفیل کی صورت بھی۔ طفیل بھائی مجھے ہمیشہ سے بہن کہتے ہیں اور میں انھیں اپنا بے حد مخلص بھائی سمجھتی رہی ہوں مگر مدیر سمجھنے کو کسی طرح تیار نہ تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان سے مل کر مجھے عجیب سا احساس ہوتا بس کچھ ایسا لگتا کہ یہ بیٹھے بیٹھے ایک دم اٹھیں گے اور میرا آنچل تھام کر کہیں گے۔ "بہن بھوت لڈی ہے لوتی دو" ان کی باتیں صرف جی ہاں اور جی نہیں پر ختم تھیں۔ مجھ سے قسم لے لیجیے جو اس زمانے میں ان کی زبان سے کبھی کوئی ادبی قسم کی بات سنی ہو۔ اب بھلا بتلایئے کہ میں اس کے سوا اور کیا سوچتی کہ یہ ہمارے بھائی طفیل اپنا سرمایہ بھی ڈبوئیں گے اور بیچارے نقوش کو جانے کیسی کیسی اذیتیں دے دے کر ماریں گے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ حکومت اس غریب رسالے کو پھانسی کی سزا ہی دے دیتی۔

بہرحال چند نمبر تو طفیل بھائی کی جی ہاں جی نہیں قسم کے تھے مگر پھر انہوں نے سب کے ساتھ مجھے بھی حیرت زدہ کر دیا۔ ان نمبروں کے بعد کے پرچے کچھ اس طرح مرتب کئے گئے تھے کہ اعتراض کرتے نہ بن پڑتی۔ ہاں پرچے میں ان کی بعض تحریروں سے اتفاق نہ ہوتا۔ جب وہ ملتے میں کہتی۔ "یہ کیا لکھا ہے آپ نے؟" اور وہ دو چار بڑے اچھے

پرچے مرتب کرنے کے عرصہ میں حل کر سکتے ہیں۔ صرف آپ کہتی ہیں اور تو کوئی نہیں کہتا۔ میں جواب میں کیا کچھ کہتی اس کا ذکر اس بھری محفل میں نہ کروں گی۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ بھائی طفیل نے میری جا و بیجا باتوں کو اس قدر برداشت کیا ہے کہ شاید اس جگہ میرا سگا بھائی ہوتا تو کبھی میری صورت نہ دیکھتا۔

مگر پھر یہ اختلافات بھی ختم ہو گئے اور وہ اس طرح کہ انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر ایسے ایسے خاص نمبر مرتب کئے کہ میں چکرا کر رہ گئی اور یہی نہیں انہوں نے تو شخصیت نگاری بھی شروع کر دی۔ یا اللہ یہ طفیل بھائی کو اتنی زبردست ذہانت کا مرض کیسے لگ گیا۔ ایک شبہ کو یہ سوچ کر میں نے اپنے تصور کے اس بھوت لدی ہے کہنے والے بھائی کی انگلیوں سے اپنا آنچل چھڑا لیا اور اس کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہی خاص نمبروں سے اپنے علمی و ادبی تجسس کی تسکین پائی۔

آج جب نقوش کی بیسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے تو میں بڑے خلوص سے سوچ رہی ہوں کہ نقوش کے لئے کیا کہوں۔ اس وقت میرے سامنے نہ صرف قیمتی خطوط نمبر ہے بلکہ وہ تمام نمبر ہیں جن کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو گا کہ اگر کبھی ادبی رسائل کے نمبروں کی تاریخ مرتب کی گئی تو نقوش کے یہ خاص نمبر سرفہرست ہوں گے۔ یہ وہ نمبر ہیں جنھیں حال نے خوش آمدید کہا اور مستقبل انھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کا منتظر ہے۔ نقوش کے یہ نمبر اور ان کے مرتب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

نقوش کے ان ضخیم علمی و ادبی اور تحقیقی نمبروں کو جب میں دیکھتی ہوں تو مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی ترتیب و تدوین میں بھائی طفیل کو کیا کچھ نہ جھیلنا پڑا ہو گا۔ ان ادبی خزانوں میں ان کی بے شمار راتوں کی نیندیں اور ان گنت دنوں کی بے چینیاں پوشیدہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی ادب سے وہ انتھک محبت اور خلوص بھی شامل ہے جس کے طفیل انھیں صرف اپنے جذبے کی تسکین ملی مگر نفع کبھی نہ کما سکے۔ شاید وہ نفع کی بات سوچتے ہی نہیں۔ انہوں نے تو اپنا سکھ نقوش میں اور اپنے قلم میں تلاش کر لیا ہے۔ مصنف طفیل اور ایڈیٹر طفیل کی یہی سب سے بڑی دولت ہے۔

مجلّاتی صحافت میں "نقوش" کا مقام

ڈاکٹر عبدالسّلام خورشید

ہم قومی سطح پر سوچیں یا بین الاقوامی سطح پر، جب مجلّاتی صحافت کی اصطلاح سامنے آتی ہے۔ تو تصور کے پردے پر صرف ادبی رسائل نمودار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تمام عوام پسند ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہانہ اور سہ ماہی رسائل بھی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ جو اگرچہ علم و ادب کے فروغ میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن ایسا خیال افروز مواد بہت کم پیش کرتے ہیں۔ جو اہلِ دانش اور اہلِ علم کے لئے بھرپور علمی غذا کا کام دے، بہرحال اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجلّاتی صحافت میں عوام پسند رجحانات نے خالص علمی و ادبی رسائل کو پسپائی پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسے رسائل دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اہلِ علم انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن اہلِ علم کی تعداد ہر معاشرے میں کم ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے رسائل کی اشاعت بھی محدود ہوتی ہے۔ اس سے یہ مطلب اخذ کرنا درست نہیں کہ اشاعت کم ہونے کی وجہ سے ان کا دائرۂ اثر بھی محدود ہے۔ چونکہ ان کے قارئین اہلِ علم اور اہلِ دانش ہوتے ہیں اور وہی ہر معاشرے میں رہنمائی کا فرض سرانجام دیتے ہیں۔ اس لئے محدود اشاعت کے باوجود ان رسائل کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہوتا ہے۔

مجلّاتی صحافت میں "نقوش" کے مقام کا تعین کرنے کے لئے ہمیں اس کا مطالعہ عوام پسند رسائل کی روشنی میں نہیں خواص پسند رسائل کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ ایسے رسائل کے لئے دنیا میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں ان رسائل کے لئے "کوالٹی میگزین" کی اصطلاح رائج ہے اور اشتراکی دنیا میں "کلچرل میگزین" کی بعض مغربی ممالک میں انھیں HIGH-BROW ہائی برو میگزین بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ رسالے جو بلند ذہنی سطح کے لوگ پڑھتے ہیں۔ اپنے ہاں رسمی طور پر ایسی تمیز کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ لیکن جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کون سے رسالے عوام پسند ہیں اور کون سے خواص پسند۔ کون سے کم و بیش تفریحی مواد پیش کرتے ہیں اور کون سے خیال افروز تحریریں مہیا کرتے ہیں۔ پس اس مقالے میں میں صرف خیال افروز علمی و ادبی صحافت کی روشنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ "نقوش" کا مقام کیا ہے۔

برِعظیم میں مجلّاتی صحافت کا آغاز خالص علمی رسائل سے ہوا۔ جو کم و بیش سوا سو سال پہلے انجمنوں کی سرپرستی میں جاری ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ برِعظیم کے پڑھے لکھے لوگوں کو بتایا جائے کہ جس اجنبی طاقت کے زیرِ سایہ وہ زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ایک علمی نشاۃِ ثانیہ کی نقیب ہے۔ ہمارا پہلا آزاد رسالہ "تہذیب الاخلاق" تھا۔ جسے سرسید نے جاری کیا۔ اور اس کے ذریعے سے نہ صرف اسلامی معاشرے میں علمی تجدد کو فروغ دیا۔ بلکہ اردو زبان میں ایک ایسے مقصدی ادب کی بنیاد رکھ دی جس نے آگے چل کر اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اسے جمود سے نجات دلا کر اس قابل کر دیا کہ وہ نئے خیالات اور نئے اسالیب کو اپنے آپ میں سمو سکے۔ اور اس طرح معاشرے کی خدمت کا فرض سرانجام دے سکے۔ "تہذیب الاخلاق" کی تقلید میں کئی رسالے نکلے۔ اور انھوں نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اس تحریک کو آگے بڑھایا۔

ہماری مجلّاتی صحافت میں "مخزن" کو دوسرے سنگِ میل کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ بھی محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا علمبردار تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو ادب کو نئی اصناف سے آشنا کیا جائے نثر اور شاعری میں نئے تجربے کئے جائیں اور مغربی ادب کے شہپارے

اُردو میں منتقل کیے جائیں۔ اس دور میں کچھ اور رسائل بھی نکلے۔ جن میں عبدالحلیم شرر کا "دلگداز"، اکبر شاہ نجیب آبادی کا "عبرت"، محمد دین فوق کا "کشمیری میگزین" اور مولانا ظفر علی خان کے دو رسالے "دکن ریویو" اور "پنجاب ریویو" نمایاں تھے۔

اس صدی کے آغاز میں جب سیاست منظر عام پر آئی تو چند ایسے رسائل نکلے، جو ادب اور سیاست کا امتزاج پیش کرتے تھے۔ وہ ادب کی کلاسیکی روایات کے عکاس تھے اور سیاست کے جدید رجحانات کے۔ ان میں حسرت موہانی کا "اُردوئے معلّی"، بدرالزمان بدر کا "شمس بنگالہ"، ظفر الملک علوی کا "الناظر"، دیانرائن نگم کا "زمانہ"، سید سلیمان ندوی کا "معارف" اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا "جامعہ" اور انجمن ترقی اُردو کا "اُردو" شامل ہیں۔ موخرالذکر رسالہ سیاست سے خالی تھا۔ لیکن باقی رسائل میں سے بعض میں سیاست نمایاں تھی اور بعض میں علم السیاست، تاریخ اور عمرانیات۔ ان رسالوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک تو نئی کتابوں پر مخصوص تبصرے کیے جاتے تھے، دوسرے، علمی اور تہذیبی خبریں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کی جاتی تھیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد عوام پسند ادبی رسائل کا دور دورہ ہوا۔ ان میں "کہکشاں"، "ہزار داستان"، "خیالستان"، "رومان" اور بعض دوسرے رسالے تو شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے لیکن "نگار"، "ساقی"، "نیرنگِ خیال"، "عالمگیر"، "ہمایوں"، "ادبی دنیا" اور "ادبِ لطیف" نے طویل زندگی پائی اور ماشاءاللہ ان میں سے چند رسائل اب بھی زندہ ہیں۔ ان رسائل نے نئے ادیبوں کے فن کو نکھارنے اور اُن کی حوصلہ افزائی میں اتنا نمایاں کردار ادا کیا کہ نہ صرف مجلاتی صحافت کی تاریخ میں بلکہ اُردو ادب کی تاریخ میں بھی انھیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ یہ رسالے صرف عوام پسند نہیں تھے خیال افروز بھی تھے اور یہ علم و ادب کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتے تھے کہ اہلِ دانش انھیں قدر کی نظروں سے دیکھتے رہے۔

اسی دور میں یہ کوشش ہوئی کہ رسالوں کے خاص نمبر نکالے جائیں جن میں کسی مخصوص موضوع پر بھرپور مواد پیش کیا جائے۔ "نیرنگِ خیال" نے سالناموں کا آغاز کیا۔ جو اگر اس زمانے کی پروڈکشن کے معیار کی روشنی میں دیکھے جائیں تو ایک عظیم کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی مخصوص موضوع پر خاص نمبر کا آغاز بھی "نیرنگِ خیال" سے ہوا۔ جس نے پہلی مرتبہ بڑے سائز پر ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل "اقبال نمبر" شائع کیا۔ "زمانہ" نے ایک ضخیم "پریم چند نمبر" چھاپا۔ "عالمگیر" نے "روسی ادب نمبر" پیش کیا اور "ہمایوں" نے "روسی ادب نمبر" اور "فرانسیسی ادب نمبر" شائع کیے۔ اور لاہور سے مجید ملک مرحوم نے "نرگس" کا "نظم نمبر" مرتب کر کے ایک نئی طرح ڈالی۔

میرے نزدیک "نقوش" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام ہمیشہ اِکّا دُکّا رسالے کبھی کبھی اور نامکمل اور جزوی انداز میں کرتا تھا۔ وہ اس نے ایک بہت بڑے پیمانے پر، ایک منظم انداز میں اور جامعیت کے تمام تقاضوں کے ساتھ کر کے مجلاتی صحافت کو ایک انسائیکلوپیڈیائی رنگ بخش دیا۔ شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، لاہور نمبر، پطرس نمبر، شوکت تھانوی نمبر، سعادت حسن منٹو نمبر اور اسی قسم کے دوسرے نمبر ایسے اہم اور نادر مواد پر مشتمل ہیں۔ جو اگر شائع نہ ہوتا۔ تو اُردو ادب کا بہت بڑا ضیاع ہوتا۔ ان نمبروں کی ترتیب میں جس ریاض سے کام لیا گیا ہے۔ مجلاتی صحافت میں اس کی مثال نہیں ملتی اور اس کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ محققین کا کام آسان ہو گیا ہے۔ کیوں کہ انھیں جتنا ماخذی مواد "نقوش" کے خصوصی نمبروں میں ایک جگہ اور ایسی اور مستند صورت میں مل جاتا ہے۔ اتنا بے شمار کتابوں، دستاویزوں اور ورقوں میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔ "نقوش" نے جن موضوعات پر خاص نمبر چھاپے ہیں۔ ان پر مزید تحقیق کا کام سہل ہو گیا ہے اور اس کے لیے محققین یقیناً "نقوش" کے احسان مند ہیں۔

یہ نمبر اپنے اپنے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ضخامت کو محدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی

تو ان کی جامعیت میں فرق آجاتا۔ ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کام "نقوش" نے کر دکھایا ہے۔ وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ کتاب، انسائیکلوپیڈیا اور مجلّے کو ایک جگہ سمو کر اور اسے حسن بخش کر "نقوش" نے مجلاتی صحافت کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ کام کرنے کی نیت ہو، خلوص اور لگن ہو، تو جو کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکتے۔ وہ فردِ واحد سر انجام دے سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں "نقوش" کے عام نمبر بھی خاص نمبر ہوتے ہیں۔ اور وسیع ضخامت کی وجہ سے اس میں طویل مختصر افسانے، ناولٹ، طویل مقالے اور کلاسیکی شہپارے بغیر کسی تکلف کے دیئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لکھنے والے تنگ دامانی کی قید سے آزاد ہو کر لکھتے ہیں اور اس طرح اپنے موضوع سے پورا انصاف کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ رسم اب چل نکلی ہے۔ پہلے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے "ادبی دنیا" کو یہی رنگ دیا اور اب "اوراق" اور "فنون" بھی اسی خصوصیت کے حامل ہیں۔

"نقوش" کی ایک اور ادا جو مجھے بھاتی ہے۔ یہ ہے کہ یہ صرف ادب پیش نہیں کرتا۔ علم کے ہر شعبے پر بھر پور مواد پیش کرتا ہے۔ یہ ہماری مجلاتی صحافت کی کلاسیکی روایت ہے۔ جسے بعد کے ادوار میں بہت سے رسالوں نے ترک کر رکھا تھا۔ حالانکہ نصف صدی قبل کے مقابلے پر آج اس بات کی اور بھی ضرورت ہے۔ کہ مجلاتی صحافت محض سکہ بند ادب کی ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ آج کے زمانے کے اہلِ دانش کی دوسری ذہنی ضروریات کی تکمیل کا بھی سامان فراہم کرے۔

"نقوش" کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ مجلہ کسی ایک دبستانِ ادب یا دبستانِ خیال سے وابستہ نہیں۔ ہر دبستانِ خیال کا ادیب اور شاعر اس کے صفحات پر اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ "نقوش" کو کلاسیکی روایات عزیز ہیں۔ لیکن یہ تجدد کا مخالف نہیں۔ لہٰذا یہ کلاسیکی اور جدید روایات کے درمیان ایک پل کا کام دیتا ہے۔

چونکہ ہمارے ہاں نئی باتیں عام طور پر مغربی ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں اس لیے میں نے سوچا شاید "نقوش" نے جو رنگ دے رکھا ہے۔ وہ بھی کسی دوسرے ملک کی تقلید پر مبنی ہو۔ چنانچہ میں نے مقالہ لکھنے سے پہلے مختلف ممالک کی مجلاتی صحافت پر کتابیں اور مقالے پڑھے اور برطانیہ، امریکہ، سوویت یونین، فرانس اور جرمنی کے بہت سے علمی اور ادبی رسالے دیکھے اور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنی جامعیت، اتنی خصوصیات کے حامل اور اتنی ضخامت کے رسائل دنیا کے کسی ملک میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ "نقوش" دنیا بھر میں اپنی قسم کا پہلا مجلہ ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ میں نے اس مقالے میں دیدہ و دانستہ محمد طفیل صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بہت شرمیلے ہیں اور تعریف سے اور بھی شرمائیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب کسی کی تعریف کی جائے۔ تو وہ "خلیفہ" بن جاتا ہے اور محض ماضی کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے اور میری خواہش یہ ہے کہ محمد طفیل "خلیفہ" نہ بنیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کسی کی تعریف کی جائے۔ لوگ تعریف کرنے والے سے محرکات وابستہ کرتے ہیں اور میری ذات سے پہلے ہی مختلف امور میں اتنے محرکات وابستہ کر دیئے گئے ہیں کہ مزید محرکات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی یہ پرانی روایت ہے کہ ہم کسی شخصیت کی اس کی زندگی میں تعریف نہیں کرتے۔ مبادا کہ ہماری اپنی عظمت میں فرق آجائے۔ پس ان حالات میں معذرت خواہ ہوں کہ جناب طفیل کی خدمت میں کوئی خراجِ تحسین ادا نہیں کر سکا۔

سیلوٹ

کرنل محمد خاں

طفیل صاحب سے بے شک میرا تعارف نہیں لیکن نقوش سے میری پرانی واقفیت ہے۔ واقفیت ہی نہیں؛ خاصا گہرا یارانہ ہے اور بالواسطہ طفیل صاحب سے بھی عقیدت ہے کہ نقوش اور طفیل میں کوئی فرق نہیں۔ نقوش طفیل کی شخصیت کا عملی مظہر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس شخصیت کا مظہر نقوش ہو وہ بہر حال غیر معمولی اور قابلِ محبت شخصیت ہوگی۔ جسے نقوش پسند ہے، اُسے طفیل سے محبت کئے بغیر چارا نہیں۔ آپ نقوش پسندوں کا شمار کرلیں اور آپ کو طفیل پرستوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ ایسی ہمہ گیر محبوبیت ہر کسی کا نصیب نہیں۔

بحیثیت سپاہی مجھے نقوش خاص طور پر عزیز ہے کہ اس کے چند واضح سپاہیانہ انداز ہیں۔ فوج میں سپاہی کی ٹرن آؤٹ (Turn out) یعنی یونیفارم کے بانکپن اور قد و قامت کی دلآویزی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ مجھے نقوش کے ہر شمارے کی آن بان دیکھنے سے یہی احساس ہوتا ہے جیسے ہماری فوج کا کوئی جوانِ رعنا ایک بے عیب وردی میں پریڈ کے میدان میں انسپکشن کے لئے آکھڑا ہوا اور کمپنی کمانڈر نے دیکھتے ہی کہہ دیا ہو۔ اے ون۔ کیری آن سرجنٹ میجر (A. One. Carry on Seargent Major)

رسالے اور بھی ہیں۔ اچھے بھی ہیں، لیکن ان میں وہ دوگونہ شان دلربائی نہیں جو نقوش سے مخصوص ہے۔ نقوش فقط جمال ہی نہیں جو تقریباً ہر رسالے نے کم از کم سرورق کی حد تک پیدا کر لیا ہے۔ نقوش کا ایک اندازِ جلال بھی ہے جو کسی دوسرے جریدے کو میسر نہیں۔ نقوش کے نئے شماروں اور خصوصاً خاص نمبروں کی دید سے جہاں جگرِ لالہ کو ٹھنڈک پہنچتی ہے وہاں اُن کی ورق گردانی سے دریاؤں کے دل بھی دہلتے ہیں اور یہ سراسر مجاہدانہ شان ہے۔

مجھے بعض اوقات شبہ ہونے لگتا ہے کہ طفیل صاحب کہیں خفیہ طور پر ہمارے سٹاف کالج کوئٹہ کا کورس تو نہیں کر آئے کیونکہ ان کی تدوینِ نقوش کی پالیسی اُس جنگی سٹریٹجی (Strategy) سے بے حد مشابہ ہے جس کی تعلیم اس مشہور فوجی درس گاہ میں دی جاتی ہے — ماہرینِ حرب کے نزدیک جنگ کے آٹھ مسلمہ اصول ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کوئی جرنیل ان سے انحراف کر کے جنگ نہیں جیت سکتا۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ طفیل صاحب نقوش کی ترتیب میں ان اصولوں کے کئی جرنیلوں سے بھی زیادہ پابند اور دلدادہ نظر آتے ہیں۔

مثلاً پہلا اصول جنگ ہے: Maintenance of objective یعنی مقصد کے تعین کے بعد اپنی تمامتر توجہ اسی پر مرکوز رکھنا اور کسی دوسرے کام میں نہ الجھنا۔ اقبال کی اصطلاح میں آپ اسے جنون کہہ سکتے ہیں۔ میں

گزشتہ کئی سال سے دیکھ رہا ہوں کہ طفیل صاحب کے سامنے فقط ایک ہی مقصد ہے یعنی نقوش کو خوب سے خوب تر بنانا۔ مجھے معلوم نہیں انھیں اس جنون میں کس قدر مالی نفع یا نقصان ہوا ہے ——— اللہ کرے کچھ نفع ہی ہوا ہو ——— بہرحال اُن کی تگ و دو میں یہ نفع و نقصان محض ضمنی سے حادثے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جس یکسوئی سے وہ تلاشِ خوب تر میں مصروف ہیں۔ وہ اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ہی ممکن ہے۔ اگر ان کا مقصد پیسہ کمانا بھی ہوتا تو نقوش کے ساتھ ساتھ شاید بناسپتی گھی کی ایجنسی بھی کھول لیتے۔ لیکن یہ سٹاف کالج کوئٹہ کی تعلیم کے سراسر منافی ہوتا کیونکہ پہلے اصولِ جنگ یعنی Maintenance of objective. کے تحت آپ یا تو گھی بیچ سکتے ہیں یا نقوش جیسا رسالہ چلا سکتے ہیں۔ دونوں کام نہیں کر سکتے۔

فنِ حرب کا دوسرا اصول Offensive Action ہے یعنی جارحانہ کارروائی اور میرے تصور کے مطابق طفیل یقیناً گوشہ نشینی یا ستیہ گرہ کے قائل نہیں۔ بلکہ وہ ہر لحظہ مائل بہ پیکار نظر آتے ہیں۔ تکمیلِ نقوش کے سلسلے میں جہاں کسی فتنے نے سر اٹھایا یہ حملہ اسلحہ سے لیس ہو کر اُس کی سرکوبی کو جا پہنچے ہیں۔ میں نے ذاتی طور پر طفیل صاحب کو in action نہیں دیکھا لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر نئے شمارے کی تیاری کی ابتدا وہ ایک نپے تلے منصوبے سے کرتے ہیں یعنی بالکل اسی طرح جیسے ایک جرنیل حملے سے پہلے ایک تفصیلی پلین (Plan) تیار کرتا ہے۔ جس طرح جرنیل اپنی مخالف افواج اور اُن کے کمانڈروں کا جائزہ لیتا ہے اور انھیں زیر کرنے کی تدابیر کا خاکہ بناتا ہے، اسی طرح طفیل صاحب بھی جملہ شاعروں اور ادیبوں کا احاطہ کر لیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے ان کو حلقۂ کمند میں لاتے ہیں۔ بلکہ شاید طفیل صاحب کو اپنی تیغِ دلنوازی کے طفیل تلوار کو بے نیام ہی نہیں کرنا پڑتا۔ یعنی محض اپنے حسنِ طلب کے طفیل ہی بیک کف بُردن صد دل کا عمل کرتے ہیں۔ لیکن چند شاعر اور ادیب بلاشبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تسخیر مسلح افواج کی تسخیر سے بھی مشکل ہوتی ہے۔ ان حالات میں طفیل صاحب کی جارحانہ صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں اور وہ سنگین سے سنگین مہم بھی سر کر کے دم لیتے ہیں۔ نقوش کے صفحات ایسی کئی فتوحات کے گواہ ہیں۔

جنگ کے چند اصول اور بھی ہیں لیکن میں صرف ایک اور کا ذکر کروں گا۔ جسے انگریزی میں Surprise کہتے ہیں۔ یعنی ناگہانیت۔ ایک جرنیل کے لئے لازم ہے کہ دشمن کو بے خبری میں جا لے۔ جس کمانڈر کے منصوبے کا دشمن کو پیشگی علم ہو گیا، اس کی جرنیلی کچی ہے۔ طفیل صاحب بہت پکے جرنیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سرپرائز کا شکار صرف اُن کے ہمعصر ہی نہیں۔ بلکہ ہم قارئین بھی ہیں۔ ہم ایک شمارے کے طلسم سے سنبھل نہیں پاتے کہ ایک بالکل نئے اور غیر متوقع موضوع پر ایک اور ضخیم نمبر تمکین و ہوش پر ڈاکہ ڈالنے وارد ہوتا ہے۔ ان نمبروں میں سے کس کس کا ذکر کیا جائے۔ سب کے سب دامنِ دل کھینچتے ہیں لیکن ایک شمارہ جس نے دل میں مستقل گھر کر لیا، پطرس نمبر تھا اور اسے ہم نے آج تک حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ ایک اور شمارے کو جس میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کا احاطہ کیا گیا تھا، ہم داستانِ دل سمجھتے ہیں ——— مجھے یقین ہے کہ نقوش آئندہ بھی اسی شانِ یکتائی کے ساتھ کتابِ دل کی تفسیریں پیش کرتا رہے گا اور اپنے جرنیل مدیر کی کمان میں قارئین کے دل و نگاہ کو مسخر کرتا رہے گا۔

———



اختر ریاض الدین



حکیم یوسف حسن



سعادت حسن منٹو



اوپیندر ناتھ اشک

بڑی بڑی آنکھیں

(ناول)

○

اُپندرؔ ناتھؔ اشکؔ

○ بڑے سپنے دیکھنے کے لیے
من کی بڑی آنکھیں
درکار ہیں۔

○ سمجھوتہ زندگی کی شرط سہی
لیکن آدمی کے پاس
کچھ تو ہو جس کے لیے
وہ کسی سے
کسی قیمت پر سمجھوتہ
نہ کر سکے۔

○ زندہ روح ہی زخمی
ہو سکتی ہے
مُردہ روح کو تو کچوکے
بھی نہیں لگتے۔

انجانی لڑکی

سردی اُتر آئی تھی۔ صبح کاذب کا وقت تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمبل کھسک گیا تھا اور اوپر سے چادر ہٹ جانے کے باعث سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کمبل درست کرنے کے لئے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بائیں جانب کی کھڑکی کے شیشے شبنم سے بھیگ کر دھندلے ہو رہے تھے۔ اُن میں سے سامنے کنوئیں کا برگد ایک بڑا سا گیلا گیلا سیاہی کا دھبہ معلوم ہو رہا تھا اور چاند کی سنہری تھالی قریب کے ٹیڑھے میڑھے کُبڑے کیکر کی ایک لرزاں شاخ کے ہاتھوں میں کانپتی سی نظر آ رہی تھی۔

پھر بیٹھنے کی بجائے مَیں نے قریب ہی رکھی ہوئی کُرسی سے گرم چادر اُٹھائی اور اُسے اپنے گرد لپیٹتا ہوا باہر برآمدے میں آ گیا۔ سامنے کا نظارہ نہایت حسین تھا ـــ دور بنولی کے گھروں اور درختوں کی اُونچی نیچی لکیر کے اُوپر ماہتاب سنگترے کا سا رنگ ہر چہار اطراف بکھیرتا غروب ہو رہا تھا۔ اُس کی سفیدی غروب ہوتے وقت سمٹ کر سنہری ہو گئی تھی۔ لمحہ بھر میں ساکت و صامت کھڑا گویا اُس تمام حسن کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ پھر قربِ فطرت کی اُس ناقابلِ بیان مسرت یا جانے کس ناگفتہ غم کے زیرِ اثر میرے دل کی گہرائی سے بے اختیار ایک لمبا سانس نکل گیا۔ مَیں واپس اندر آیا۔ گرم چادر کو کرسی پر رکھ کر بالوں کے ڈھیلے جُوڑے کو ایک بار پھر کسا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

لیٹ تو گیا لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ لیٹا لیٹا بھی میں گویا اس منظر کو دیکھنے لگا کس قدر حسین تھا وہ دیو گر ـــ کیچڑ اور دلدل میں خود بخود اُگ آنے والے کنول کی مانند دلکش اور شفاف لیکن مہینہ بھر پہلے جب میں ایک شام وہاں پہنچا تھا تو وہ مجھے اتنا دلفریب نہ معلوم ہوا تھا۔ شہر سے گورے شاہ تک بارہ میل ایک ٹھسا ٹھس بھری بس میں پھر وہاں سے پتھر چٹی تک دس میل لمبی کچی پکی سڑک پر ایک بے تحاشا ہچکولے لیتے ہوئے تانگے میں بیٹھ کر اور اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ میل کا ناہموار راستہ ایک دیہاتی کے سر پر سامان اُٹھوائے پیدل

پی کر میں دیونگر پہنچا تھا۔ گورے شاہ کے اڈے پر باقی تین سواریوں کے انتظار میں مجھے ایک بجے تک بیٹھنا پڑا تھا۔ دیونگر تک پہنچتے پہنچتے پانچ بج گئے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا۔ گاؤں کی شام اپنے ساتھ بے کنار سونا پن اور اداسی لئے ہوئے اتر آئی تھی۔ میں خستہ و مضمحل بیزار اور بھوکا تھا اور اس عالم میں دیونگر کی وہ ایک جیسی کوٹھیوں کی قطار مجھے ویرانے میں بے مقصد اپنا حسن و شباب لٹا کر افسردہ بیٹھی کسی دیہاتی دوشیزہ سی اداس اور بے رونق دکھائی دی تھی۔

غالباً وہاں میری آمد کا انتظار تھا۔ کیونکہ پہلی کوٹھی کے برآمدے میں ہی مجھے تیرتھ رام مل گیا۔ ان دنوں اس کے ذمہ مہمانوں کی خاطر مدارت کا انتظام تھا۔ جب میں نے اسے اپنے آنے کا سبب بتایا تو وہیں برآمدے میں میرا بستر اُتروا کر وہ مجھے درمیان کی ایک کوٹھی میں لے گیا۔ اس کوٹھی کے بائیں کمرے کے دروازے پر نیلے رنگ کا پردہ پڑا تھا، جو اس وقت ایک طرف کو قدرے ہٹا ہوا تھا۔ پردے کی اُس درز میں سے دیونگر کے بانی 'دیوبانی' کے ایڈیٹر دیومنڈل کے مہتمم اور 'دیوسینا' کے سالار دیواجی (سردار دیویندر سنگھ، جو اپنے ناظرین اور عقیدت مندوں اور پیروؤں میں اسی نام سے مشہور تھے) ایک ڈیسک پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ اُن کی پشت ہماری جانب تھی۔ وہ دودھ سی سفید پوشاک میں ملبوس تھے۔ میں نے انہیں کبھی دیکھا نہ تھا لیکن والد صاحب کے مصوّر دوست سردار نرنجن سنگھ سے اُن کی بہت تعریف سن رکھی تھی۔ تیرتھ رام نے برآمدے میں آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دیواجی لکھنے میں محو تھے۔ انہوں نے سنا نہیں۔ دوبارہ دستک پر انہوں نے سر اُٹھایا اور گھوم کر ہماری طرف دیکھا۔

غالباً مجھے پہچاننے میں انہیں کچھ دقت ہوئی چنانچہ انہوں نے ڈیسک پر پڑا ہوا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا۔ اس اثنا میں تیرتھ رام اندر چلا گیا۔ اس نے سرگوشی میں اُن سے کچھ کہا اور دوسرے ہی لمحے میں دیواجی کے پاس کوچ پر بیٹھا تھا اور وہ مجھ سے میری خیر و عافیت پوچھ رہے تھے۔

سفید چوڑی دار پاجامہ اور اچکن میں ملبوس پتلا چھریرا (لیکن اب قدرے فربہی کی طرف مائل) سڈول اور گٹھا ہوا جسم تیکھی ٹھوڑی، چھوٹی چھوٹی خوشنما مونچھیں، گہری حساس آنکھیں اور سر پر بڑی محنت سے سجی دستار — امریکہ جانے سے قبل دیواجی داڑھی بھی رکھتے تھے اور کیس (بال) بھی لیکن امریکہ سے واپسی کے بعد (یا شاید وہیں) انہوں نے دونوں سے نجات حاصل کر لی تھی۔ ممکن ہے وہ امریکہ میں ٹوپ پہنتے ہوں مگر ہندوستان آنے پر تو وہ دستار ہی سجاتے تھے —— پہلی نظر میں وہ مجھے بہت اچھے اور مخلص انسان معلوم ہوئے۔

”راستے میں کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

اس سوال کے ساتھ انہوں نے فاؤنٹین پن کا ڈھکن بند کیا اور کرسی میرے قریب سرکا لی۔

”پہنچ ہی گیا ہوں“ ایک مجبور سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

”پتھر چیتی تک تو غنیمت ہے“ وہ بولے۔ ”یہ ڈیڑھ میل کا راستہ ذرا پریشان کرتا ہے۔ بارشیں ختم ہو گئی ہیں۔ ان سردیوں میں ہم ضرور سڑک بنوا دیں گے۔“

”جی ہاں سڑک بن جائے تو یکہ تانگہ براہ راست یہاں تک آ سکتا ہے۔“

"یہاں آنے والے تو شہر سے صبح چلتے ہیں"۔ وہ بولے۔

"چلا تو میں بھی صبح ہی تھا"۔ میں نے کہا "مگر گوسئے شاہ کے اڈے پر دیر لگ گئی۔ ایک بجے تک یکے پر بیٹھا رہا۔"

"تو کچھ کھانا وانا کھایا ہے یا نہیں آپ نے؟" اور پھر میرا جواب سنے بغیر انہوں نے اندر کی طرف رُخ کر کے غالباً اپنی لڑکی کو آواز دی۔ "ویتی!"

دوسرے ہی لمحے چھوٹی چھوٹی دو لڑکیاں دروازے میں آن کھڑی ہوئیں۔ بلایا تو ایک ہی کو گیا تھا لیکن اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے بیقرار تھیں۔

"ان کے لئے کچھ ناشتے واشتے کا انتظام کرو وانّو۔"

وانّو ... ویتی یعنی وینا۔ میں نے سوچا۔ یہ تو ہندوانا سا نام ہے۔ بلونت یا ستونت کی طرح تذکیر کے ساتھ "کور" لگا کر تانیث بنا لئے جانے والے ہماری سکھ لڑکیوں کے ناموں کی طرح بالکل نہیں۔ "وانی کور" تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا ہندوانا نام غالباً انہوں نے اپنے اسی عقیدے کے مطابق رکھا ہے، جس کے تحت بال کٹوا دیئے ہیں ——— جو عقیدہ انسانوں کے درمیان ناموں، ذاتوں اور لباسوں کی خلیجیں پسند نہیں کرتا۔

معاً انہوں نے سوال کیا۔ "آپ 'دیوبانی' پڑھتے ہیں؟ دیوبینیا کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔؟"

"جی نہیں، باقاعدہ تو نہیں پڑھتا رہا۔ ادھر نرنجن سنگھ جی نے کچھ پرچے دیئے تھے اور میں آپ کی تحریروں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"

"یہاں تو ابھی آپ کو ویرانی کا احساس ہوگا۔ آپ شہر کی گہما گہمی کے عادی ہیں۔"

"جی، کبھی کبھی دل کی ایسی کیفیت بھی ہوتی ہے جب شہر اپنی تمام گہما گہمی کے باوجود ویران دکھائی دیتا ہے۔" میں نے کہا "میرا دل بہت پریشان ہے۔ میں سکونِ قلب کی تلاش میں گاندھی آشرم جا رہا تھا۔ کانگریس کے ایک دو لیڈروں سے میری خاصی واقفیت ہے۔ وہاں جو نئی تعلیمی سکیم شروع ہونے والی ہے اس میں میرے کام کرنے کی بات بھی طے ہو گئی تھی لیکن جب میں نے نرنجن سنگھ جی سے اُس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ سکون کی تلاش میں اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ قریب ہی دیوناگر آباد ہو رہا ہے وہاں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں نہ صرف دلی سکون حاصل ہوگا بلکہ حقیقی روحانی مسرت بھی ملے گی۔ نرنجن سنگھ جی والد صاحب کے دوست ہیں لیکن میرے ساتھ بھی ان کا سلوک دوستوں جیسا رہا ہے۔ انہوں نے مجھے آپ کے اور منڈل کے سلسلے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ 'دیوبانی' کے پرچے بھی انہی نے پڑھنے کو دیئے اور میرے دل میں آپ کے آدرشوں پر چلنے کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اگرچہ میرا ذہنی انتشار ابھی دور نہیں ہوا لیکن اس کی توقع پیدا ہو گئی ہے۔ آپ مطمئن رہیں، شہر کی گہما گہمی مجھے اپنی طرف نہ کھینچ سکے گی۔

بیوی کے انتقال کے بعد یکایک جو میرا دل شہر سے بیزار ہوا اٹھا تو اس کا سبب محض یہ نہ تھا کہ مجھے اپنی بیوی سے بیحد محبت تھی اور نہایت تکلیف دہ اور طویل بیماری کے بعد اس کا انتقال ہوا تھا، بلکہ ایک بہت ہی معمولی اور بظاہر نظر انداز کر دی جانے والی

بات تھی، جسے میں فراموش نہ کر سکا تھا۔

اس کے مرنے کے تین روز قبل جب میں اس کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھا، اس کے بالوں پر محبت اور ہمدردی سے ہاتھ پھیر رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ اس طویل اور کرب ناک علالت نے کس طرح کا زخم کئے بغیر اپنے غیر مرئی دانتوں سے اندر ہی اندر اسے کھا ڈالا ہے۔ اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں خوشحال ہوتا تو کیا اسے سوئٹزرلینڈ نہ لے جاتا...... کہ اچانک اس نے اپنی بے آواز منفی کے ساتھ نہایت دھیمے دھیمے میں پوچھا۔ "دارجی[1] نرک اور سورگ میں کیا آپ کا ذرا بھی یقین نہیں؟"

سوئٹزرلینڈ کی دلفریب وادیوں اور سائنس کے جدید ترین سازوسامان سے آراستہ اس کی صحت گاہوں پر منڈلاتا ہوا میرا دل جیسے ایک ہی جھٹکے سے واپس آ گیا۔ مجھے فوراً کوئی جواب نہ سوجھا۔ میں چپ چاپ اُن ہنستے ہوئے دانتوں، خون سے عاری نیلے نیلے ہونٹوں، جبڑے کی اُبھری ہوئی ہڈیوں، گہرے دھنسے ہوئے گالوں، فراخ پیشانی اور ان پر بکھرے ہوئے الجھے بالوں کو دیکھتا رہا۔

میری بیوی نے موت کا ہیبت ناک سایہ دیکھ لیا تھا۔ میرے قریب ہو کر بھی وہ مجھ سے کوسوں دور، زندگی اور موت سے پرے، جنت اور جہنم کی نہ جانے کن انجانی وادیوں میں بھٹک رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کی بجائے تجسس تھا۔ میرا تسلی آمیز جواب سننے کی اشتیاق آمیز گہرائی تھی۔ مجھے محسوس ہوا گویا وہ کسی غیر مرئی ڈور کو پکڑے ایک گہرے غار کے دہانے پر لٹک رہی ہے۔ خوف و دہشت کی منزل کو وہ پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ اپنے مقدر سے اس نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ مگر وہ جاننا چاہتی ہے کہ گہرے تاریک غار کی تہ میں اُسے اُبلتا لاوا ملے گا یا نرم نرم مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو والی پُر سکوں آغوش اور گویا میں اُسے جو کچھ بتاؤں گا وہ بالکل درست ہوگا۔ اور وہ اس ڈور کو چھوڑ کر میرے اس دلاسے کے سہارے آرام سے اس غار میں ڈوبتی چلی جائے گی۔

...... لیکن میں اسے ایسی کوئی تسلی نہ دے سکا۔ میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے جنت و دوزخ دونوں پر اعتقاد نہیں، میں ان دونوں کو اسی دنیا کی چیز مانتا ہوں لیکن جس نے یہاں طویل بیماری کی اذیتوں کا جہنم دیکھا ہو وہ دوسری دنیا میں کچھ سہارا چاہتا ہے اور بہشت ایک خواب نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت بن کر اس کے سامنے آتا ہے...... اسی لئے میں خاموش رہا تھا۔ لیکن جب اس کی سوالیہ نظریں میرے چہرے سے نہ ہٹیں تو میں نے کہا۔

"تم سورگ اور نرک کے بارے میں تم میرے خیالات سے واقف ہو۔ لیکن تم نے اس زندگی میں اپنے تمام فرائض نہایت ایمانداری سے نبھائے ہیں اس لئے اگر جنت کوئی حقیقت ہے، تو وہ تمہیں ضرور ملے گی۔"

اور تیسرے دن موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے اپنا شکار بنا لیا تھا۔ اسے چتا کے حوالے کر کے جب میں گھر آیا اور عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں اور دشمنوں کی تعزیت کے مظاہروں سے نجات پا کر بستر پر بیٹھا تو دوسری بہت سی یادوں کو پیچھے دھکیل کر وہی تین دن پہلے کی اُس کی شکل میری آنکھوں میں گھوم گئی اور وہی سوال کانوں میں گونج اُٹھا — "دارجی کیا سورگ اور نرک میں آپ کا ذرا بھی یقین نہیں؟"

---

[1] سردار جی۔

اور اس وقت مجھے احساس ہوا مجھ سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوگئی ـــ یہ صحیح ہے کہ وہ دو سال سے بیمار تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میرے اور اس کے گھر والے، وہ خود اور میں۔ سب جانتے تھے کہ اس کا مرض لاعلاج ہے اور اس کی دوا اب موت کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ تاہم مجھے اس سوال کا کچھ اور جواب دینا چاہیئے تھا۔ مجھے کہنا چاہیے تھا تم ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو پتنی! تم اچھی ہو جاؤ گی اور ہم یہیں ہنستے ہوئے سورگ سی سندر دنیا بسائیں گے......

اور میرا دل ندامت اور ملامت سے بھر آیا تھا۔ در اصل اس کی حالت اس حد کو پہنچ گئی تھی، جہاں تمام حیلے بہانے بیکار ہو جاتے ہیں۔ اور میرے منہ سے سچی بات نکل گئی تھی۔ اس وقت محسوس ہوا تھا کہ میری اس بات سے اسے تھوڑی تشفی بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے انتقال کے بعد وہی بات میرے دل و دماغ کو پریشان کرنے لگی۔ وہ سچ کس قدر بے رحم تھا۔ میں نے سوچا ـــ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ میں اس بے رحم سچ کی جگہ کوئی پیارا سا، میٹھا سا جھوٹ بول دیتا اور اس کا دل اسی دنیا میں لگائے رکھتا۔ میرے اس جواب سے اس نے ہر لمحہ اپنی موت کو سامنے دیکھا ہوگا۔ تل تل کر وہ مری ہوگی۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ میری ملازمت تو بیوی کی بیماری کے دوران ہی ختم ہوگئی تھی۔ گھر سے جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ لیکن ان یادوں سے پریشان ہو کر میں نے قصبہ کو خیر باد کہا اور شہر آ گیا۔ خیال تھا کہ شہر کے ہنگاموں میں اپنے غم کو فراموش کر دوں گا لیکن شہر کے تمام شور و شغب اور گہما گہمی نے میرے دل کی ویرانی اور دماغ کی پریشانی کو کئی گنا بڑھا دیا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آواز کو دبانے کے لئے دوسری آواز اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔ شہر کے اس شور و شغب میں میرے دل کی ملامت کی وہ آواز بلند سے بلند تر ہوگئی۔ اس آواز کو دبانے اور اپنے دل کو بیوی کی بیماری موت اور گذشتہ دنوں کی یادوں سے بچانے کے لئے میں نے گاندھی آشرم جانے کی ٹھان لی۔ کانگریس کے جن رہنماؤں سے میری واقفیت تھی انہوں نے وہاں کے پُرسکون ماحول، بانس اور پھوس سے چھائی ہوئی وہاں کی چھتوں اور مٹی سے لپی پتی صاف ستھری، مندروں جیسی پاکیزہ جھونپڑیوں، وہاں کی سادہ زندگی اور بلند خیالات ـــ غرضیکہ وہاں کے تمام ماحول کی بے حد تعریف کی تھی۔ "زندگی کی افادیت وہیں رہ کر محسوس ہوتی ہے۔" انہوں نے کہا اور خط و کتابت کے ذریعے وہاں میرے لئے رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے نرنجن سنگھ جی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ تصویر بناتے بناتے رک کر برش کی پچھلی نوک دانتوں میں لئے چند لمحے خاموش بیٹھے رہے۔ اگرچہ وہ میرے والد کے دوست تھے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ والد صاحب کے دوسرے دوستوں کی طرح ان سے ملنے یا گفتگو کرنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہ ہوتا۔ بڑے بھائی یا چچا کے سامنے جو لحاظ ہوتا ہے وہ ان کے سامنے مطلق نہ ہوتا تھا۔ میرے ساتھ ان کا سلوک کچھ عجیب سا دوستانہ تھا اور میں ان سے اپنے دل کی ساری باتیں بے جھجک کہہ دیتا تھا اور وہ بھی ایک ہمدرد اور تجربہ کار دوست کی طرح مجھے اپنے مشوروں سے نوازتے تھے۔

چند لمحوں تک برش کی پچھلی نوک دانتوں میں لئے وہ سوچتے رہے پھر اچانک کہنے لگے: "تم دیونگر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"دیونگر؟" میں نے استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"تم نے دیونگر کا نام نہیں سنا؟" انھیں میری اس لاعلمی پر حیرت ہوئی۔ بولے۔ "اپنے صوبے کے تعلیم یافتہ طبقہ پر تو دیونگر کے بانی کا بہت اثر ہے"۔ اور انہوں نے الماری سے 'دیوبانی' کے کچھ شمارے نکال کر میرے سامنے پھینک دیئے۔ "یہ لو اس رسالے کے کچھ ایشوع پڑھو۔ دیونگر کا ماحول تمھیں بہت پسند آئے گا۔ گاندھی آشرم بہت دور ہے اور وہاں ضبط و نظم کی جن سختیوں کے بارے میں میں نے سنا ہے ان کی پابندی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ پھر وہاں مہاتما گاندھی کی عظیم شخصیت کے سامنے تم خود کو بے حد حقیر محسوس کروگے۔ تم دیونگر جاؤ۔ وہاں تمھاری شخصیت کی نشوونما کے لئے بہت گنجائش ہے۔ یہاں سے قریب بھی ہے صرف بائیس میل کا فاصلہ ہے۔ راستے میں تکلیف ضرور ہوگی۔ لیکن ایک بار پہنچ جاؤگے تو وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہے گا۔"

"مگر میں وہاں کروں گا کیا؟" میں نے پوچھا تھا۔

"وہاں کام کی کمی نہیں۔" رنجن سنگھ جی بولے۔ "میں پچھلے دنوں وہاں گیا تھا۔ دیواجی سے ملا تھا۔ وہ تو مجھے بھی وہاں چلنے کو کہتے ہیں۔ جگہ اتنی اچھی ہے کہ میں خود بھی وہاں رہنا ——— چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی چند سال تک میں یہاں سے نہیں ہل سکتا۔" پل بھر کو وہ رکے۔ پھر بولے۔ "باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ دیوبانی سیریز کی کچھ کتابیں ہندی اور اردو میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ تم نے الہ آباد میں تعلیم پائی ہے دونوں زبانوں سے واقف ہو۔ اس سیریز میں ان کا ہاتھ بٹا سکتے ہو۔ اس کے علاوہ دیبیوں اور کام ہیں۔ ان کے ذہن میں 'دیوبانی' کے ہندی اردو ایڈیشن شائع کرنے کی سکیم بھی ہے۔ وہ جدید طرز کا ایک پریکٹیکل اسکول بھی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خواب بہت بڑے ہیں۔ اور انھیں عملی شکل دینے کے لئے ساتھیوں کی ضرورت تو ہوگی ہی۔"

"مجھے تو وہ جانتے بھی نہیں اور میں بھی وہاں کے بارے میں قطعی ناواقف ہوں۔" میں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"دیوبانی کے پرچے پڑھ لو۔ بہت کچھ جان لوگے۔ رہے دیواجی تو میں انھیں خط لکھ دوں گا۔ ان کے نام ایک خط تمھیں بھی دے دوں گا۔"

اس شام میں تذبذب کے عالم میں واپس آگیا۔ لیکن جوں جوں میں 'دیوبانی' کے ایشوع پڑھتا گیا میرا تذبذب ختم ہوتا گیا۔ دیواجی کا فلسفہ اُن کے سماجی اور سیاسی خیالات اور اُن کی بود و باش کا انداز مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ وہ کورانہ تقلید، دقیانوسی خیالات، ٹونے ٹوٹکے، تقدیر اور بھگوان، بھیک یا خیرات کے خلاف تھے۔ قدرت کو ایک عظیم ترین طاقت ماننے کے باوجود وہ کسی شخص خدا یا بھگوان کے قائل نہ تھے۔ قسمت کو ماننا انھیں انسانی انا کی توہین محسوس ہوتا تھا۔ ظاہرداری انھیں قطعی پسند نہ تھی۔ میں کئی قوم پرست لیڈروں سے واقف تھا جو ستیہ اور اہنسا پر عمل کے سلسلے میں خواہ مہاتما گاندھی سے کتنے ہی پیچھے ہوں، مگر جہاں تک ظاہرداری کا تعلق تھا۔ وہ ان سے کہیں آگے تھے۔ ایک صاحب صرف سنگھاڑے اور دہی کھاتے تھے۔ دوسرے محض پھل اور دودھ۔ تیسرے ساگ سبزی پر گذر کرتے تھے۔ ایک چوتھے تھے جو صبح اٹھتے ہی رام نام لینے کے بعد کسی قسم کا بھی گناہ یا برائی نہ کرنے کے باوجود محض تزکیہ نفس کے لئے اپنے منہ پر سات تھپڑ مارتے تھے اور ہمیشہ سر کے بل کھڑے ہو کر شیرش آسن کرتے تھے۔ وہ مسافروں سے بھری ہوئی گاڑی میں بھی سفر کے دوران بلا تکلیف سر کے بل کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک پانچویں بزرگ تھے جو دن کا بیشتر وقت تکلی کاتنے میں گذار دیتے تھے۔ اور جب

تکلی کاتتے تھے تو کسی سے بولتے نہ تھے ـــــ ان سب کے مقابلے میں دیواجی کا فلسفہ مجھے زیادہ عملی اور بہتر محسوس ہوا۔۔۔۔۔۔۔
... ساتویں روز میں نے نرنجن سنگھ جی سے کہا۔ "مجھے خط لکھ دیجئے۔"

انہوں نے خط لکھ دیا اور لفافہ مجھے دیتے ہوئے بولے: "میں نے دیواجی کو تو اُسی روز لکھ دیا تھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا ہے کہ میں تمہیں بھیج دوں۔ آج میں تمہارے جانے کے بارے میں لکھے دیتا ہوں۔ تم بے جھجک جاؤ اور اپنی خدمات 'دیو سینا' کے لئے وقف کر دو۔ گاندھی آشرم کی سی خشکی اور سختی تمہیں دیونگر میں نہ ملے گی مگر مقصد کی بلندی، ماحول کی پاکیزگی، فنکاری اور سماج سیوا کی لگن تم وہاں بھرپور پاؤ گے۔ 'دیو سینا' کی سرگرمیوں میں حصہ لوگے تو تمہارے دل کا اضطراب دھیرے دھیرے یکسر مٹ جائے گا۔"

چائے پیتے پیتے جب میں نے یہ سب دیواجی کو بتایا تو وہ مسکرائے۔ انہوں نے نرنجن سنگھ جی کے آرٹ، اُن کی محبت اور شرافت کی بڑی تعریف کی اور مجھ سے بولے: "دیونگر آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ جب تک آپ کا جی چاہے رہیئے۔ اس کے کاموں میں ہاتھ بٹایئے ہمارے سکھ دکھ میں حصہ لیجئے۔ لیکن بھائی، جہاں تک دلی سکون کا تعلق ہے اس کا سرچشمہ نہ گاندھی آشرم میں ہے نہ دیونگر میں۔ وہ تو خود آپ کے اندر ہے اور آپ کو وہیں اُسے تلاش کرنا ہوگا۔ گاؤں سے بھاگ کر شہر اور شہر سے بیزار ہو کر گاؤں میں رہنے، سلطنت چھوڑ کر سنیاس لینے یا سنیاس چھوڑ کر سلطنت حاصل کرنے سے سکون نہیں ملتا۔ زندگی کے یہ انقلابات ہمارے اضطراب کے اسباب کو دور نہیں کرتے، ہاں انھیں آگے پیچھے کر دیتے ہیں۔ انتشار کا سبب ہے ناتجربہ کاری، عزم و حوصلہ کا فقدان، تذبذب اور انا کی زیادتی۔ بادشاہ اگر تخت و تاج کو خیرباد کہہ کر جھونپڑی کو اپنا لیتا ہے تو اپنی انا کو ساتھ ہی لے جاتا ہے۔ اس لئے اس کو سکون نہیں ملتا۔ ذی فہم انسان اضطراب کے اسباب کو سمجھتا ہے اور ہر حال میں مسرور و مطمئن رہتا ہے۔"

دیواجی کی باتوں نے میرے بے چین دل پر ٹھنڈے مرہم کا سا کام کیا۔ "میں آپ کی ہر بات تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو آپ کے مقابلے میں ابھی بچہ ہوں۔ میرا تجربہ ہی کیا ہے۔ چند برس اپنے ساتھ گذارنے کا تجربہ حاصل کرنے کا موقعہ دیجئے۔ دل کو خود بخود سکون حاصل ہو جائے گا۔"

"نرنجن سنگھ جی نے آپ کو سینا میں لینے کی سفارش کی ہے۔" وہ بولے۔ "فی الحال یہاں رہیے۔ دیو منڈل کے بارے میں واقفیت حاصل کیجیے۔ پھر اگر آپ نے چاہا تو آپ کو سینا میں بھی شامل کر لیں گے۔ فی الوقت آپ جو کچھ چاہیں گے آپ کو مل جائے گا۔" پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔ "سر دست کتنے میں آپ کا کام چل جائے گا؟"

بیوی کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ یوں بھی میرے لئے کچھ خاص اہم نہ رہ گیا تھا اس لئے میں نے کہا۔ "آپ جو کچھ بھی دے سکیں گے مجھے منظور ہوگا۔"

"رہنے اور کھانے کا انتظام ہم کر دیں گے اور پچاس روپے آپ کو بطور جیب خرچ مل جائیں گے۔ اتنا کافی ہوگا؟"

"جی ہاں۔ بہت کافی۔"

"تو ٹھیک ہے آپ کافی تھکے ہوئے ہیں۔ اب جا کر آرام کیجئے۔"

اور انہوں نے تیرتھ رام کو بلا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا۔

دیونگر میں ایک جیسی دس کوٹھیوں کے علاوہ ایک ڈیوڑھی ایک کمیونٹی کچن، ایک ڈائننگ ہال اور ایک ہشت پہلو گنبد بھی تھا۔ ڈیوڑھی تو کوٹھیوں کے بعد تھی۔ کوٹھیوں کے نمبروں کی ترتیب اُلٹی تھی۔ پتھر چٹی سے دیونگر پہنچنے پر پہلے ۱۰ نمبر کی کوٹھی ملتی تھی۔ گنبد کوٹھی نمبر ۱ کے پیچھے تھا۔ مجھے تیرتھ رام سے معلوم ہوا کہ چھٹی کا دن نہ ہو تو دیوا جی وہیں بیٹھتے ہیں۔ چھٹی کے دن وہ عموماً گھر ہی پر کام کرتے ہیں۔

ڈیوڑھی سے پرے صرف ایک کوٹھی تھی۔ نمبر ۱۔ جس کے بعد کھیت تھے اور راستہ ایک طرف نہر کو اور دوسری طرف موضع بنولی کو نکل جاتا تھا۔ ڈیوڑھی کے پیچھے سے ایک راستہ جس کے دونوں جانب حنا کی ترشی ہوئی باڑ تھی، کمیونٹی کچن کو چلا جاتا تھا۔ کچن کے ساتھ پھوس کی چھت کا ایک بڑا سا منڈوے جیسا ہال تھا۔ جو شام کے دھندلکے میں اس جگہ کو اور بھی سنسان بنا دیتا تھا۔

کھانا کھانے کے لئے تیرتھ رام مجھے اس بڑے منڈوے میں لے گیا۔ وہ عرفِ عام میں تو لنگر کے نام سے مشہور تھا لیکن تھا بالکل جدید طرز کا ڈائننگ ہال۔ اس وقت اس میں صرف ایک گیس روشن تھا۔ رات کی اس تاریکی میں برقی روشنی کی عادی میری آنکھوں کو وہ ہال تاریک ویران اور اداس نظر آتا۔ سامنے ایک پختہ پینٹری بنی ہوئی تھی جس پر خالی تھالیاں کٹوریاں چمچے وغیرہ رکھے تھے۔ برابر کے کچن سے کھانا پک کر وہاں آجاتا تھا۔ کھانے والے پینٹری سے تھالی کٹورے لے لیتے۔ پینٹری کے پیچھے کھڑی عورتیں کھانا نکال دیتیں اور لوگ اپنی اپنی میزوں پر آ بیٹھتے۔ دوسری بار عورتیں خود روٹیوں کی تھالی، یا سبزی دال کے ڈونگے لئے ہر میز پر جاتی تھیں۔

کھانا کھاتے وقت تیرتھ رام نے بتایا کہ دیوا جی نے مستورات کو باورچی خانے کی غلامی سے نجات دلا دی ہے۔ دیونگر میں ایک دو گھروں کے علاوہ بقیہ سبھی لوگ اس مشترکہ کچن میں کھانا کھاتے ہیں۔ پکانے والے باورچی ہیں اور کھلانے والی عورتیں ——— دیونگر کی خواتین باری باری یہ فرض انجام دیتی ہیں اور اپنا بقیہ وقت دیگر مفید کاموں میں صرف کرتی ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد تھالیاں اُٹھا کر ہم کچن کے نل پر رکھ آئے اور تیرتھ رام مجھے ڈیوڑھی کی چھت پر سونے کے لئے لے گیا۔ وہ دراز قد اور جسیم شحیم جوان تھا۔ لیکن اُس تندرست اور توانا جسم میں دل ایک شاعر کا ہے، اس بات کا اندازہ مجھے اُس کی باتوں سے فوراً ہو گیا۔ لنگر سے آنے اور سونے کی تیاری کرتے ہوئے اُس نے مجھے بتایا کہ دیونگر جس سرزمین پر واقع ہے وہ کبھی مغلوں کے عہد میں ایک بڑی جاگیر تھی۔ اس ڈیوڑھی کے ساتھ ایک اُونچی فصیل کے کھنڈر تھے اور لوگوں کا بیان تھا کہ وہاں بھوت پریت رہتے تھے اور لوگ دن میں بھی اُن کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ جاگیر کا مالک دِلّی کا ایک پنڈت تھا جس نے اپنی تمام جائداد شراب اور طوائفوں کی نذر کر دی تھی۔ کسی نے کچھ دوستوں کے اکسانے پر وہاں ٹیوب ویل لگایا تھا کہ فارم چلائے گا۔ لیکن اُسے نہ زراعت کا تجربہ تھا نہ تجارت کا۔ محنت کا عادی نہ تھا اور شراب میں دھت پڑا رہتا تھا۔ چنانچہ فارم نہ چل سکا، اُجڑ گیا اور وہاں بھوتوں کے وجود پر لوگوں کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ دیوا جی نے اس سے یہ زمین سستے داموں خرید لی اور فصیل کی اینٹوں سے۔ باہر سے پختہ اور اندر سے کچی دیواریں کھڑی کر کے بہت کم لاگت میں یہ دس کوٹھیاں اور لنگر بنوا لیا۔ ڈیوڑھی اور گنبد کی مرمت کر کے انہوں نے نہر کی مٹی سے کوٹھیوں کے

اُگے گھاس کے قطعے، جنا کی باڑیں اور باقی کھلی جگہ میں باغ لگوا دیئے۔ نئی کھاد ڈال کر انہوں نے بنجر زمین کو زرخیز بنا دیا۔ اور بھوتوں کو تو ایسا بھگایا کہ پھر انہوں نے کبھی اس طرف کا رُخ نہیں کیا۔

لیکن مرمت کے باوجود ڈیوڑھی کی بے منڈیر چھت آسمان کی طرف پھیلی ہوئی کھلی سپاٹ ہتھیلی کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ شہری مکانوں کی چھتوں پر جو ایک پردہ سا ہوتا ہے یہاں ویسا کچھ نہ تھا۔ دیوا جی نے ڈیوڑھی میں کوئی توسیع نہ کی تھی۔ صرف سیمنٹ کی تہ اور سفیدی کے دودھ نے اُس کا رنگ بدل دیا تھا۔ اس شام کے ملگجے اندھیرے میں مجھے کم سے کم ایسا ہی معلوم ہوا۔

تیرتھ رام شاعر تھا۔ اُس وقت نہایت اچھے موڈ میں تھا اور اگر میں بے حد تھک نہ گیا ہوتا اور کمبل نہ تان لیتا تو شاید وہ مجھے اپنی دو ایک نظمیں بھی سناتا۔ لیکن بس اور یکے کے سفر نے میرے جوڑ جوڑ کو جھنجھوڑ ڈالا تھا چنانچہ میں دیونگر کی تعمیر کے سلسلے میں تیرتھ رام کی شاعرانہ گفتگو کے باوجود لیٹتے ہی سو گیا۔

لیکن مجھے گہری نیند سونا نصیب نہ ہوا۔ رات بڑے زوروں کی آندھی آئی اور ہمیں محسوس ہوا کہ ہم مکمل سمت اُڑ جائیں گے۔ تیرتھ رام غالباً ویرانے کی اُن آندھیوں کا عادی تھا۔ چنانچہ پہلا جھونکا آتے ہی وہ چارپائی اُٹھا کر بیرجھیوں میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب میں بستر سمیٹ اور چارپائی اٹھا کر چلا تو آندھی کے تیسرے جھونکے سے تقریباً اُڑ کر چھت کے کنارے جا پہنچا۔ چارپائی چھت سے نیچے جا رہی اور میں .... نہ جانے میرے منہ سے کیسی دہشت ناک چیخ نکلی کہ تیرتھ رام نے بھاگ کر مجھے تھام لیا۔ میری آستین پکڑ کر وہ مجھے گھسیٹ نہ لیتا تو چارپائی کے ساتھ میں بھی نیچے جا پہنچتا۔

دیونگر کی پہلی رات کا وہ لمحہ میرے ذہن پر کچھ ایسا منقش ہوا کہ بعد میں برسوں تک جب میں بستر پر لیٹتا ایک نہ ایک بار ضرور میری نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ——— طوفان کی شدت سے شائیں شائیں کرتے ہوئے، شیش ناگ کے خوفناک پھنوں جیسے۔ ہزاروں کے گہرے سیاہ درخت؛ گرد و غبار کے پیچھے چھپے چاند کی زرد روشنی میں پاگل آندھی کے رقص جھپاکے۔ اور ہر چہار جانب چھائی ہوئی تاریکی کی آغوش میں جیسے چیختی ہوئی سی ڈیوڑھی کی وہ چھت ——— انسان کتنا باعقل کتنا شہ زور لیکن کس قدر مجبور اور حقیر ..... جب کبھی مجھے اپنی اس بے بس چیخ کا خیال آتا میری آنکھوں کے سامنے ویسا ہی ایک اور لمحہ گھوم جاتا .....

...... سولن کی ایک پہاڑی پگڈنڈی پر میں ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہ نہایت متین اور سنجیدہ، عالم اور فلسفی تھے۔ مہارشی رمن کے آشرم میں ہو آنے کے بعد موت پر فتح حاصل کرنے کے لئے یوگ سادھنا کیا کرتے تھے اور اُن کے عقیدت مند یہ پرچار کرتے تھے کہ اُنہوں نے واقعی موت کے خوف پر فتح حاصل کر لی ہے ——— باتیں کرتے ہوئے میرے ساتھ چلتے چلتے وہ ایک دم دہشت زدہ آواز میں چیخ کر اچھلے۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے سرسراتا ہوا ایک سانپ ہمارے سامنے سے گذر گیا۔ شاید ان کا پیر سانپ پر آ گیا تھا۔ ان کی وہ چیخ میری ہی چیخ کی طرح ناقابلِ بیان تھی۔ اسے الفاظ یا استعارے کی گرفت میں لینا قطعی ناممکن ہے ——— دل کی گہرائیوں کے بھی کہیں بہت نیچے سے نکلی ہوئی خوف زدہ غیر انسانی آواز!

لیکن دوسرے روز صبح کے اُجالے میں دیونگر کو دیکھا تو ایک جیسی کوٹھیوں کی وہ قطار نیند کے صحرا میں خوابوں کے نخلستان سی حسین نظر آئی۔ وہ عجیب ڈیوڑھی شاندار دکھائی دی اور موزیک کے فرش پر نگینوں کی طرح چمکتے ہوئے رنگ برنگے پتھر نمو

کو خیرہ کرنے لگے۔ ڈیوڑھی سے کچن کو جاتی ہوئی چوڑی روش جس کے دونوں جانب حنا کی بہت خوبصورت باڑ تھی دل کو لبھانے لگی۔ کچن کے ساتھ کا وہی ڈائننگ ہال جس کا فرش پنیڑی اور میزیں سب اُسی نگینوں جڑے سیمنٹ کی بنی تھیں۔ ایسی شفاف تھیں کہ نگاہیں پھسل جاتی تھیں ــــ مختصر یہ کہ سارے کا سارا ڈیوڑھی مجھے نہایت دلفریب معلوم ہوا۔

ڈیوڑھی دراصل پرانی جاگیر کا صدر دروازہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے گرد اُونچی فصیل تھی جس کے چاروں کونوں پر چار بُرج بنے تھے۔ ــــــــ تین برج ٹوٹ گئے تھے۔ چوتھے کو ڈیوڑھی کے ساتھ ساتھ دیواجی نے نئی شکل دے دی تھی۔ اس میں دو کھڑکیاں اور دو روشن دان بنوا دیئے تھے۔ پردوں، قالینوں اور فرنیچر کی مدد سے اُسے بہت ہی خوبصورت بنا دیا تھا۔

ڈیوڑھی میں دیوسینکوں کے ملنے کی جگہ اور دیومنڈل کے دفاتر کا انتظام تھا۔ دفتر بالائی منزل ــــــ منزل کیا میانے میں تھا۔ وہاں کبھی پہریدار دیوار کے سوراخوں میں سنگینیں تانے مستعد کھڑے رہتے ہوں گے لیکن اب دیواجی نے چاروں طرف کھڑکیاں لگوا کر اُسے سکریٹریٹ کا درجہ دے دیا تھا۔ نچلی منزل میں ایک بڑا سا ہال بن گیا تھا۔ دفتر کی کھڑکیوں سے نیچے ہال میں ہونے والے ہر جلسے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

وہاں دیوسینک ہر اتوار کی صبح جمع ہوتے تھے اور دیواجی تقریر فرماتے تھے۔

ڈیوڑھی کے پرے جو تنہا کوٹھی تھی۔ میرا اُس میں مجھے ایک کمرہ مل گیا کھلا اور ہوادار۔ کوٹھی کے آگے دیگر کوٹھیوں کی طرح نیم دائرے میں لان تھا جس میں بڑی اچھی گھاس اور پھولوں کے پودے لگے تھے۔ سامنے حنا کی قد آدم باڑ سڑک سے آنے والی گرد کو روکتی تھی۔ کھڑکی کے باہر ببول کا ایک بڑا سا درخت تھا۔ اس سے پرے شرون سنگھ کے کھیت، رہٹ، برگد اور موضع بنولی تھا ــــ اس پہلی رات کے تلخ تجربے کے باوجود سورج کی روشنی میں چمکتا دمکتا ڈیوڑھی مجھے بہت پسند آیا۔ میں شہر جا کر اپنا سامان لے آیا۔ دیواجی نے ایک کتاب مجھے ترجمے کے لئے دے دی اور میں جم گیا۔

"سنگیت جی . . . . . سنگیت جی!" میرے سوئے ہوئے کانوں میں آواز آئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا کوئی میرا دروازہ توڑ رہا ہے۔

میں گھبرا کر اُٹھا۔ نہ ببول کی شاخ ویسی خوب صورت تھی نہ اس میں چاند آویزاں تھا نہ باہر خوفناک ماحول تھا نہ اندر پیارا پیارا دھندلکا۔ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں سارے کمرے میں اُدھم مچا رہی تھیں اور کمبل کی وجہ سے ہلکا سا پسینہ آ گیا تھا۔ اور باہر تیرتھ رام کی رٹ جاری تھی ـــ "سنگیت جی سنگیت جی!ــــ"

"چلے اُو تیرتھ رام!" میں نے بالوں کو ایک بار کھولا۔ الجھی بکھری لٹوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے اور سرہانے تپائی پر رکھی ہوئی پگڑی کو سر پر سجاتے ہوئے کہا۔ "دروازہ کھلا ہے۔"

تیرتھ رام اندر آ گیا۔ میں نے ذرا کھسک کر اُس کے بیٹھنے کو جگہ بنا دی۔ "اُٹھو بھائی! کب تک یوں مُردہ بنے لیٹے رہو گے؟" وہ تپاک سے بولا۔ "میں تو نہر تک ہو آیا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ قدرے تامل کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بے ساختہ بیٹھتا تو شاید ٹیڑھی دو ہو جاتی۔

"میری آنکھ بہت سویرے کھل گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "پھر بہت دیر تک نیند نہیں آئی اس لئے......"

لیکن اپنا جملہ پورا کرنے سے پہلے میں اُچک کر اٹھا اور، چند منٹ میں آیا۔ کہتا ہوا غسل خانہ میں چلا گیا۔

دیونگر کی کوٹھیوں کے غسل خانے اتنے کشادہ تھے جتنے شہروں کے گول کمرے ہوتے ہیں۔ اگرچہ شہر میں جہاں میں رہتا تھا، فلش نہیں تھا۔ لیکن یہاں دیواجی نے فلش جیسا ہی انتظام کر رکھا تھا۔ دس منٹ میں حوائج ضروری سے فارغ ہو کر میں غسل خانے میں واپس آیا اور جب میں برش کر رہا تھا میں نے سنا تیرتھ رام آہستہ آہستہ غالباً اپنا نیا گیت گنگنا رہا تھا۔

من امبر میں جاگ اُٹھا ہے ایک نیا ہی تارا رے
کتنا سُندر کتنا دلکش کتنا پیارا پیارا رے
سبھی اُداسی بھاگ گئی
آگ انوکھی جاگ گئی
آگ لگی لگ بھگ یہیں جس دم شعلہ لپکا نیارا رے
من امبر میں جاگ اُٹھا ہے ایک نیا ہی تارا رے

ہاتھ منہ دھو کر میں باہر آیا۔ میں نے کپڑے بدلے اور کمرہ بند کر کے ہم باہر نکلے۔ ہلکی خوشگوار دھوپ دیونگر کی کوٹھیوں، ڈیوڑھی، ڈائننگ ہال اور آس پاس بکھرے ہوئے کھیتوں اور میدانوں کو نیا حُسن عطا کر رہی تھی۔ ہرگوبند باورچی گرم دودھ کی بالٹی بھر کر کوٹھیوں کی طرف چل پڑا تھا۔ ہم دونوں اپنے کمروں کی بجائے کمیونٹی کچن میں جا کر گرم گرم دودھ کی چسکیاں لیتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔

تیرتھ رام شاعر تھا۔ دیواجی کا عقیدت مند تھا اور انہیں کی طرح افلاطونی محبت کا قائل۔ دیواجی اس محبت کے، جسے وہ پریم یا پیار کی بجائے پریت کہتے تھے، زبردست حامی تھے۔ میٹھی میٹھی ہلکی ہلکی آنچ کی سی گرمی پہنچانے والی، ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے والی، ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرنے والی پریت باشعلہ افشاں ہو کر، خود کو یا محبوب کو جلا دینے والی محبت میں دیونگر کے بانی کا اعتقاد نہ تھا۔ یہ دیوتاؤں کا نہیں راکششوں کا پریم ہے وہ کہا کرتے۔ غیر مہذب وحشی اُجڈ!! پریت کا کام، اُن کے خیال میں، جلانا نہیں میٹھی میٹھی حرارت بخشنا تھا۔ دیونگر کے سینک اسی پریت لڑی کے منکے بن جائیں یہی ان کا نصب العین تھا اور دیونگر کے باشندے اسی مقصد کی مالا جپتے تھے۔

تیرتھ رام کی نظموں میں اسی پریت کا ذکر تھا۔ اُس کے پریم کا پنچھی پھڑ پھڑاتا ہوا اپنے محبوب کے گرد گھومتا، بادل کی طرح اُمنڈ گھمنڈ کر اس پر چھا جانا چاہتا، مگر اس خوف سے کہ مبادا اس کا جسم اس سے مَس ہو جائے، وہ دور ہی رہتا۔ کم از کم اپنی نظموں میں تیرتھ رام محبوب کے جسم سے نہیں روح سے پیار کرتا تھا۔

کچن کے برآمدے کی کرسی یا ڈائننگ ہال کی کسی کھلی کھڑکی کی سل پر بیٹھ کر یا یوں ہی کھڑے کھڑے میں تیرتھ رام کی نظمیں سنا کرتا۔

نظم سناتے سناتے افلاطونی محبت کے اس باریک پردے کو پھاڑ کر کبھی کبھی دُور اُفق کی تاریکی میں کوند اُٹھنے والی بجلی کی مانند اُس کی آنکھوں میں نفسانی خواہش چمک جاتی اور نظم سنانے کے بعد وہ ہمیشہ بہت لمبا اور گہرا سانس چھوڑتا ۔

دیوگڑھ کے اپنے ان سات آٹھ دنوں کے قیام میں تیرتھ رام کے علاوہ مَیں کسی سے کھل نہ سکا تھا ۔ دیوگڑھ ایک بہت اُونچے آدرش کو لے کر وجود میں آیا تھا اور وہاں کے مکینوں کو اچھی طرح جانے بغیر اُن سے گھُل مِل جانا میرے لئے ناممکن تھا ۔ میرے دل پر کچھ عجیب سی دہشت طاری رہتی تھی ۔ دیو سیکوں کے بیٹھے بول، ان کا تکلف، محبت اور رواداری اچانک مجھے محتاط اور ہوشیار کر دیتی، لیکن تیرتھ رام سے میں کھل گیا تھا اور کافی رات تک اُس کے ساتھ گھومتا رہتا تھا ۔

چاندنی راتیں تھیں ۔ نہر کی جانب آم کی گھنی شاخوں کے پیچھے سے بڑا سا سنہرا چاند اپنا جادو بکھیرتا ہوا طلوع ہوتا ۔ مانجھے میں بیٹھی کسی گوری دلہن کی طرح زرد ہوتا ہوا وہ جوں جوں اُوپر اُٹھتا اُس کی زردی گھُل کر دُودھیا ہو جاتی ، حتیٰ کہ دس بجتے بجتے اُس کی چاندنی اُس بستی کے اندھیرے گوشوں کو بھی منور کر دیتی ۔ دیوگڑھ کی وہ ڈیوڑھی اس اُجلی چاندنی میں یوں جگمگا اُٹھتی کہ ہم دونوں اُسے دیکھتے رہ جاتے ـــــ اُس عظیم ویرانی میں وہ شاندار ڈیوڑھی وہ چند نئی بنی کوٹھیاں اور بس ـــــ خواب بھی اتنے نازک اور لطیف نہیں ہوتے ۔

دیوگڑھ کے دیوتا سرِ شام ہی اپنی کوٹھیوں میں بند ہو جاتے ۔ نو ساڑھے نو تک چراغ بھی بجھ جاتے ۔ مگر ہم دونوں رات گئے تک دیوگڑھ کی سڑکوں اور روشوں پر آوارہ گھومتے ۔ کبھی جب اس کا موڈ ہوتا تیرتھ رام میرے ساتھ مل کر بے تحاشا قہقہے لگاتا ۔ اپنے بازوؤں کے پٹھوں پر گھونسے مارتا ہوا وہ میرے پتلے چھریرے جسم کا مذاق اُڑاتا کبھی جب میں ننگے سر ہوتا یا بال سنوارتا تو کہتا ۔ تمہیں عورت ہونا چاہئیے تھا ۔ ایسے سنہرے ریشمی اور لمبے بال تو عورتوں کے بھی نہیں ہوتے ۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایک دم خاموش ہو جاتا اور اگر مَیں اپنے کسی مذاق پر ہنستا تو میری وہ ہنسی یکسر اکیلی رہتی ۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تک نہ آتی ۔ آخر میں بھی خاموش ہو جاتا ۔ تیرتھ رام بار بار آہیں بھرتا ۔ میں سبب پوچھتا تو وہ خاموش رہتا یا محض مسکرا دیتا ـــــ ایک خفیف سی مسکراہٹ! میرے بہت پوچھنے پر ایک روز اس نے اشارتاً کہا کہ گاؤں میں اسے ایک لڑکی سے عشق ہے اور چاندنی راتوں میں کبھی کبھی اس کی یاد اسے بہت بے چین کر دیتی ہے ۔

کچن سے دودھ کے گلاس لے کر ہم ڈائننگ ہال کی ایک کھڑکی کے پاس جا پہنچے ۔ میں چوکھٹ پر بیٹھ گیا اور وہ کھڑا رہا ۔ دودھ ختم کر کے چلغوزے کھاتے ہوئے تیرتھ رام بولا " میں رات بھر بالکل نہیں سویا ۔ کمبخت چاندنی ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کہیں کچھ بھی چھپا نہیں ہے ۔ دل کا تاریک سے تاریک گوشہ روشن ہو اٹھا ہے ۔ سب کچھ یکدم کھلا اور عریاں ہے ۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا " جانے مجھے ان راتوں میں کیا ہو جاتا ہے ۔ نیند بالکل غائب ہو جاتی ہے ۔ سنتا ہوں پاگل پن کے ساتھ چاندنی کا گہرا تعلق ہے ۔ اس لئے انگریزی میں پاگل کو لیونیٹک یعنی چاند مارا کہتے ہیں ۔ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں ۔"

اور وہ زور سے ہنسا ۔ خالی کھوکھلی ہنسی! پھر چند لمحے خاموش رہ کر اچانک بولا ۔ " جب آنکھیں زور سے بند کرنے اور ان پر تولیہ رکھنے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی تو میں نے اُٹھ کر ایک نظم لکھی ۔"

" پلیدی ؟ "

"ہاں۔ نیند ہی نہ آئی۔ ختم کر کے ہی سویا۔"

اور وہ نظم سنانے لگا۔

"دیکھو تیرتھ رام۔" نظم سن کر میں نے کہا۔ "تمہیں جس سے محبت ہے وہ یہیں کہیں ہے۔"

تیرتھ رام نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا۔ "ارے نہیں یار۔ یہاں کیا ہے سوائے باہر اور اندر کی ویرانی کے۔" اور اندر کہتے ہوئے اس نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لمبا سانس بھر لیا۔

لیکن مجھے نہ اس کے قہقہے سے یقین آیا اور نہ دل کی ویرانی کے بارے میں اس کی گپ سے۔ میں نے کہا۔ "تم نہ بتاؤ گے تو میں خود تلاش کر لوں گا۔"

پھر اس نے کچن سے واپس آتے ہوئے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کی کہانی سنائی جو اُس سے محبت کرتی تھی، لیکن جس کی شادی کہیں اور ہو گئی تھی۔ تیرتھ رام جب بھی گاؤں جاتا اس سے ملنے کو تڑپتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ میکے میں ہوتی تو نگاہوں کا تبادلہ ہو جاتا لیکن تیرتھ رام کی بیوی اس کا وہاں جانا پسند نہ کرتی۔

"تمہاری بیوی بھی ہے؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

"ہاں میری شادی تو لڑکپن ہی میں ہو گئی تھی۔"

"بچے بھی ہیں۔؟"

"ہاں۔"

"کتنے۔؟"

"دو — دونوں لڑکے — ایک دس سال کا ایک چار کا۔"

"تم انھیں یہاں کیوں نہیں لاتے۔"

"ابھی جگہ نہیں ہے۔ یہاں دس کوٹھیاں ہیں۔ ایک شادی شدہ میتک اور اس کے ساتھ ایک کنوارا یا میرے جیسا بیوی کو گھر چھوڑ آنے والا۔ اس طرح ڈیڑھ کنبہ ہر کوٹھی میں رہتا ہے۔ کچھ اور کوٹھیاں بنیں تو لے آؤں گا۔"

اور ہم کوٹھی تک واپس آ گئے۔ ابھی بمشکل دروازہ کھولا ہو گا کہ دیوا جی ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔

ہم گھبرا کر اٹھے۔ انہوں نے لان کی گول سڑک ہی سے مجھے اشارے سے بلایا۔

میں نمسکار، کرتا ہوا اُن کے پاس چلا گیا۔ دائیں ہاتھ سے مجھے اپنی بغل میں لیتے ہوئے انہوں نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔

"دیکھئے بھائی، آپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں میرے کان میں پڑتی ہیں۔ ابھی سیکریٹری نے آپ کی شکایت کی ہے کہ آپ تیرتھ رام کے ساتھ آدھی آدھی رات تک دیوانوں کی طرح باہر گھومتے رہتے ہیں۔ یہاں صرف اٹھارہ بیس گھر ہیں۔ ان سب سے مل کر نہ رہیئے گا تو یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ لوگ تیرتھ رام کو نیم پاگل سمجھتے ہیں۔ وہ اس سے خوش بھی نہیں ہیں۔ آپ اس سے ملیں گے اور اُن سے نہ ملیں گے تو وہ آپ سے بھی ناراض ہو جائیں گے۔ آپ سب سے مِل جُل کر رہیئے۔"

"جی، بہت اچھا۔"

اور مجھے محبت سے ذرا سا بھینچ کر، میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے، گویا اپنے مقصد کی کامیابی سے مسرور و شاداں دیوا جی چلے گئے۔

اسی شام میں کسی سے دیا سلائی کی ڈبیہ کسی سے سوئی دھاگا، کسی سے بٹن اور کسی سے بلاٹنگ لینے غرضیکہ کسی نہ کسی بہانے ساری کوٹھیوں میں حاضری دے آیا۔ اور دیونگر کی خواتین سے بہن، بھابی، چاچی اور تائی کے رشتے بھی قائم کر آیا۔

لیکن دیوا جی کے مشورے سے زیادہ یہ اشتیاق مجھے اُن اٹھارہ بیس گھروں میں لے گیا کہ دیکھیں وہ کون سی لڑکی ہے جس سے تیرتھ رام کی پیاری پیاری نظمیں اُس کی آہیں اور لمبے سانس وابستہ ہیں۔

ونڈ موتیاں دے دانے

سارے دیونگر میں تین قبول صورت عورتیں تھیں جن سے محبت کی جا سکتی تھی۔ "خوبصورت" میں اس لئے نہیں کہتا کہ مجھے اُن تینوں میں سے ایک بھی ایسی نظر نہ آئی تھی۔

اُن میں سے ایک ڈیوڑھی کے ساتھ والی کوٹھی میں رہنے والے دیوبینا کے سکریٹری گوربچن سنگھ کی بیوی تھی۔ جیت! عمر زیادہ نہ تھی۔ ابھی کوئی بچہ بھی نہ ہوا تھا۔ تھی بھی کھلی طبیعت کی۔ ناک نقشہ تیکھا نہ سہی مگر ایسا برا بھی نہ تھا۔ وہ یقیناً حسین معلوم ہوتی، اگر بات کرکے نیم پاگلوں کی طرح نہ ہنس دیتی۔ اُس کی وہ ہنسی کچھ عجیب سی تھی۔ ہمیشہ یہ احساس ہوتا کہ اُس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔

اُسی بنگلے کے ایک کونے میں سُندر شن سنگھ رہتا تھا۔ پست قامت گورا چٹا نوجوان، جس کی پیٹھ پر بہت خفیف سا کُوبڑ تھا۔ عورتوں کی طرح رخساروں پر بال نہ تھے۔ صرف اُس کی ٹھوڑی پر بکرے کی سی داڑھی تھی۔ دیونگر میں اُس کا شمار خوب صورت مردوں میں ہوتا تھا اور سردار بالا سنگھ آرٹسٹ کی بیوی سے اُس کی دیوتاؤں جیسی محبت تھی۔

دوسری عورت جسے کچھ قبول صورت کہا جا سکتا تھا اور جو دیونگر میں خاصی حسین سمجھی جاتی تھی انہی بالا سنگھ آرٹسٹ کی رفیقۂ حیات تھیں، عمر تو ان کی پچیس تیس کے اندر ہی اندر تھی لیکن کچھ تو آرٹسٹ کی بیوی ہونے اور پھر بوڑھے آرٹسٹ (بوڑھے تو نہ تھے لیکن جوان بھی نہیں۔ ان کی عمر پچاس کے قریب ہو رہی تھی۔) کی دوسری بیوی ہونے کے باعث اُن کے نخرے بہت تھے۔ دیہات کی کھلی فضا میں پرورش پانے والی صحت مند عورت ـــــ گدرایا گدرایا جسم، گول گوشت جیسا جسم اور دیونگر کی پریت بھری فضا میں سانس لے کر اڑتے اور رومانی سپنے دیکھنے والا دل ـــــ آرٹسٹ صاحب رات کو سوتے وقت چہار مغز، خشخاش اور بادام کا حریرہ پیتے تھے ـــــ بظاہر دماغی قوت بڑھانے کے لئے لیکن اگر دماغ کے ساتھ ساتھ جسم بھی کچھ قوت حاصل کرے تو کیا برا ہے۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان سے دس سال کی ازدواجی زندگی میں تین بچے تھے۔ لیکن وہ گود میں رہنے کے سٹیج کو پار کر گئے تھے۔ ماں بھی شیخوپورہ کے تنگ و تاریک ماحول سے نکل کر دیونگر کی آزاد فضا میں سانس لینے لگی تھیں۔ پڑھی لکھی بالکل نہ تھیں۔

لیکن بات چیت یوں کرتی تھیں گویا کافی تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوں۔ سدرشن سنگھ چائے کے وقت عموماً وہیں آیا کرتا تھا۔

تیسری خاتون، جن کی طرف کسی کی نظر جا سکتی شعبہ تعمیرات کے انچارج نندلال کی بیوی ساوتری تھیں۔ دو بہت ہی خوب صورت بچے تھے اُن کے۔ ایک کا نام مدن تھا اور دوسرے کا ریتا۔ دیواجی کی ایک کہانی کے ہیرو ہیروئن سے انہوں نے یہ نام لئے تھے۔ ساوتری پتلے چھریرے جسم کی دراز قامت خاتون تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھوری اور جاذبِ نظر تھیں۔ لبوں پر ہر وقت ہلکا سا تبسم رہتا۔ لیکن اوّل تو ان کے گلے ضرورت سے کچھ زیادہ اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور نچلا ہونٹ کچھ زیادہ لٹکا رہتا تھا دوسرے نہ صرف ان کے بچے خوبصورت تھے بلکہ شوہر بھی مردانہ حسن سے معمور تھا۔ چنانچہ وہ گھر ہی میں مکمل آسودگی کے ساتھ رہتی تھیں۔ بقیہ دس گھروں میں گیانی دلاور سنگھ کی بیوی تھی، اوتار سنگھ کی بیوی تھی، مدھوار صاحب کی بیوی تھی، رکھوسلہ صاحب کی بیوی تھی ہرنام سنگھ کی بیوی تھی اور خود دیواجی کی بیوی تھیں ـــ لیکن وہ جانے کب کی اُس حد کو پار کر آئی تھیں جب کسی شاعر کی آہوں اور لمبے سانسوں کا سبب بن سکتی تھیں۔ وہ عموماً گھروں ہی میں رہتیں ڈائننگ ہال میں کھانا پروسنے پر بھی اُن کی ڈیوٹی نہ لگتی۔ دو ایک تو کھانا بھی گھر ہی پر پکاتی تھیں۔ لڑکی دیونگر میں کوئی نہ تھی ـــ رانی اور مدھو ـــ دیواجی کی دو لڑکیاں تھیں اور ایک مدھوار صاحب کی لڑکی شیاما ـــ لیکن وہ تو بچیاں تھیں۔

اور مجھے ان سب میں ایک بھی ایسی نظر نہ آئی جو تیرتھ رام کی آہوں، اور شب بیداریوں کا باعث ہوتی۔ تو کیا تیرتھ رام ٹھیک کہتا تھا ـــ اُس کے گاؤں کے ماضی میں کھوئی ہوئی اُس کی محبت دیونگر کی ان چاندنی راتوں میں اس کے دل کو مضطرب رکھتی تھی۔

لیکن نہیں تیرتھ رام کی محبت وہیں آباد تھی۔ یہ حقیقت مجھ پر دو ماہ بعد اچانک منکشف ہو گئی۔

دسمبر میں بڑے دن کی شام تھی۔ تیرتھ رام سے معلوم ہوا کہ دیونگر میں بڑے دن کی شام کو خوب جشن ہوتا ہے اور اُس نے اصرار کیا کہ میں اس میں ضرور حصہ لوں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس موقعہ کے لئے اس نے خاص طور پر ایک نظم لکھی ہے اور وہ اسے سنائے گا۔

"نظم یہاں کوئی نہیں سمجھتا" اس نے کہا "تم اکیلے آدمی ہو جسے اپنی چیز سنا کر مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔"

جانے کیوں میرا جی کہیں بھی جانے کو نہ چاہتا تھا۔ دسمبر کے انہیں ایام میں میری بیوی بیمار ہوئی تھی۔ شہر میں نمائش ہو رہی تھی۔ وہ کئی دن سے نمائش میں چلنے کا اصرار کر رہی تھی لیکن نمائش دسمبر کے تیسرے ہفتے میں شروع ہوئی تھی اور میری کل تنخواہ تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اُس کے پاس چند روپے جمع تھے لیکن انہیں یوں خرچ کر دینا مجھے گوارا نہ ہوا۔ تنخواہ کچھ تاخیر سے ملی۔ لیکن جس دن ملی اُسی شام گھر پہنچتے ہی میں نے کہا "پریتم بس تیار ہو جاؤ میری جان۔ آج نمائش چلیں گے۔"

"میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے پریتم نہ کہا کرو" وہ تنک کر بولی "پریتم تو میرے تم ہو۔"

"یہ تو تم اپنے ماتا پتا سے کہو جنہوں نے تمہارا یہ نام رکھا۔ میں ان کے دیئے ہوئے نام کو بگاڑنے والا کون ہوں۔"

"تم مجھے پیتو کہا کرو بس۔"

"پیتو تو کہتا ہی ہوں۔ مگر کبھی کبھی پریتم کہنے کو جی چاہتا ہے۔ پریتم کا مطلب ہے محبوب۔ اور اس لفظ میں مرد عورت دونوں ہی

آجاتے ہیں۔ لیکن تم نام کی بحث چھوڑو۔ بس پلک جھپکتے تیار ہو جاؤ۔۔۔۔۔"

"تھکے ہوئے آئے ہو۔ ایک پیالی چائے۔۔۔۔۔"

لیکن میں نے اسے بات پوری نہ کرنے دی۔ اُس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کر تقریباً جھلاتا ہوا میں اُسے اندر لے گیا اور ٹرنکوں پر ٹکے ہوئے بڑے آئینے کے آگے اُسے جا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اُس کے بالوں کو ہلکے سے چومتے اور آئینے میں اس کے عارضوں کو گلاب بنتے دیکھ کر میں نے کہا۔ "چائے وائے سب وہیں ہو گی۔ بس تم تیار ہو جاؤ۔"

میری بیوی چھوٹے سے قد کی تھی مگر اُس کا رنگ گورا اور جسم سڈول تھا۔ انگ انگ گویا سانچے میں ڈھلا تھا۔ کھڑی ہوتی تو کمر میں ہلکا سا خم آجاتا۔۔۔ ایسا کہ کولہے اور سینہ دونوں الگ الگ دکھائی دیتے۔۔۔ بالکل جیسے اجنتا کی کوئی حسینہ ترچھنگی مدرا میں کھڑی ہو۔ اس کی مسکراہٹ اور ہنسی دونوں بہت پیاری تھیں کیونکہ دانت پیارے تھے۔۔۔ نہ کوئی اونچا نہ نیچا اور بالکل موتیوں جیسے سفید و شفاف۔ وہ ہنستی تو میں اکثر تان لگاتا۔:

دند موتیاں دے داتے
نہ ہس جان ڈگ جان گے

وہ اور بھی زور سے قہقہہ لگاتی اور اُس کے دونوں کانوں میں ہلکے ہلکے گڑھے بن جاتے اور میں پیار سے اُسے ڈمپل[1] یا ڈمپی کہہ کر پکارا کرتا۔

وہ مجھے بے حد پیار کرتی۔ اس کے پیار میں کچھ عجیب سی ممتا تھی۔ قد میں مجھ سے چھوٹی تھی۔ مگر اُس وقت اچانک بڑی ہو کر وہ گویا میرے سارے وجود پر چھا جاتی۔ میرے ریشمی سنہرے بال اور میرے پتلے ہونٹ اسے بڑے پیارے لگتے تھے۔ کئی بار وہ میرے بال کھول دیتی اور بازوؤں میں بھر لیتی۔ کہتی۔ "اتنا ریشم تمھیں کہاں سے مل گیا" اور مذاق کرتی کہ میرے دادا یا نانا ضرور ریشم کا بیوپار کرتے ہوں گے۔ اُسے افسوس تھا کہ اُس کے بال نہ ملائم تھے نہ سنہرے نہ گھنگھریالے۔۔۔ ایک دم روکھے اور گھنے تھے، جن میں منوں تیل لگایا جائے تو بھی اس ملائمیت کا بیسواں حصہ تک نہ آسکے جو میرے خشک بالوں میں ہوتی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے بالوں کا ذکر کرتی جن میں سے کسی کے بال بھی میرے جیسے نہ تھے اور کبھی کبھی اپنی دو انگلیوں سے وہ میرے ہونٹوں کو پیار سے بالکل اسی طرح چھوتی جیسے کسی ننھے سے بچے کے۔۔۔۔۔۔

وہ تیار ہو گئی تو میں ایک لمحہ کے لئے کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے کانوں میں کوئی زیور نہ پہنا تھا اس ڈر سے کہ بھیڑ میں زیور کے ساتھ کہیں کوئی کان بھی کھینچ کر نہ لے جائے۔ صرف کالے پیلے موتیوں کے کرن پھول اُس کے کانوں میں لٹک رہے تھے۔ اُس کے گورے گورے چہرے پر سیاہ موتیوں کے کرن پھول۔۔۔۔ میں نے چلتے وقت کہا۔۔۔ "پتہ میں تمھارا شوہر ہوں۔ تمھیں دیکھ کر جب میرا دل دھڑک اٹھتا ہے تو دوسروں کے دلوں پہ جانے کیا گذرے گی :

"شرم نہیں آتی تمھیں ایسی باتیں کرتے۔" مجھے ٹہوکا دے کر وہ آگے نکل گئی۔

---

[1] ہنستے وقت گالوں میں پڑ جانے والا ہلکا سا گڑھا۔

"میری جان! نظر نہ لگ جائے، بس اسی سے ڈرتا ہوں۔" میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے تو پیلے موتیوں کے ساتھ کالے پہنے ہیں۔" وہ ہنسی۔

لیکن جانے کتنی نظریں اس حسین چہرے پر پڑیں کہ وہ کالے موتی اُسے نظرِ بد سے نہ بچا سکے۔ تقریباً نصف تنخواہ نمائش کی نذر کر کے، کھا پی کر اور پسندیدہ چیزیں خرید کے، جی بھر خوشی منانے کے نشے میں چور اور ایک دوسرے کی پیار بھری نظروں پر جیسے جھومتے ہوئے جب ہم گھر پہنچے تو تیتو نے دردِ سر کی شکایت کی۔ "میرا جی کچھ گھٹ سا رہا ہے۔" اس نے کہا اور انھیں کپڑوں سمیت وہ بستر پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اُسے قے ہوئی۔ میں نے کلائی پر ہاتھ رکھا تو وہ بری طرح جل رہی تھی۔

اور جیسے پیالہ جب لبریز ہو جاتا ہے تو چھلک اٹھتا ہے میری خوشی کا پیالہ بھی چھلک اٹھا۔ اس رات بیمار ہو کر جو وہ بستر پر پڑی تو پھر نہ اٹھ سکی۔

دسمبر کی اُن راتوں میں بار بار میرے سامنے بیتے ہوئے دنوں کے مسرت بخش نظارے گھوم جاتے اور دل کچھ عجیب اُداسی سے بھر اُٹھتا۔ تیرتھ رام کے زور دینے پر میں کہنا چاہتا تھا کہ بھائی مجھے نہ چھیڑو۔ اپنے اس گوشۂ تنہائی میں پڑا رہنے دو — یہ پھول باغ میں کھلا ہے، شوخ ہواؤں کے ساتھ مست ہو کر جھوما ہے، اس نے رنگین تتلیوں کے لبوں کے بوسے لئے ہیں، شبنم کی آنکھوں میں جھانکا ہے اور شفق کی دھڑکنوں سے اپنے دل کی دھڑکنیں ملائی ہیں۔ لیکن اب یہ شاخ سے ٹوٹ کر مرجھا گیا ہے اس پر مستقبل کا گہرا کہرا چھا گیا ہے۔ اسے خاموش پڑا رہنے دو۔ تنہائی کے کہر آلود اندھیروں کو اس پر چھا جانے دو...... لیکن میں شاعر نہیں تھا کہ اپنی اُداسی کا سبب اس طرح واضح کر سکتا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ "تیرتھ رام میرا جی نہیں چاہتا کہیں جانے کو۔ تم جاؤ۔"

لیکن تیرتھ رام کب ماننے والا تھا۔ وہ مجھے زبردستی ڈیوڑھی میں لے گیا اور میں بے دلی سے کونے میں بچھی ہوئی آرام کرسی پر جا بیٹھا۔

کھانا چونکہ ختم ہو چکا تھا اس لئے ڈائننگ ہال میں جلنے والا گیس ڈیوڑھی میں آ گیا تھا۔ ویونگر کے تمام مکین آہستہ آہستہ اس میں آن جمع ہوئے۔ لیکن پروگرام اس وقت تک شروع نہ ہوا جب تک دیوا جی نہ آ گئے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ایک آدھ گھنٹہ ویونگر کی روشوں پر گھوما کرتے تھے۔ وہ عموماً پہلی صف میں کھانا کھا لیتے تھے اور جب تک تیسری صف کھانا ختم کرتی وہ سیر سے فارغ ہو کر آ جاتے تھے۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اب بھی دلجیت کا انتظار کر رہے ہیں۔ دلجیت اُن کا لڑکا تھا۔ شہر کے گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ بڑے دن کی تعطیل میں آ رہا تھا اور انھیں ہر لمحہ اس کا انتظار تھا۔ صبح سے ماتا جی اس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ لیکن نہ جانے وہ دوستوں میں اُلجھ گیا تھا یا کوئی ضروری کام اُسے درپیش آ گیا تھا کہ اُس وقت تک نہ آیا تھا۔

ولیہ سینک اپنے بچوں کے ساتھ جمع ہو گئے تھے۔ مگر دیوا جی ابھی تک تشریف نہ لاتے تھے۔ میں کونے کی اپنی آرام کرسی پر نیم دراز خاموشی سے اُن سب کو دیکھ رہا تھا۔ اتنی عورتیں اور اتنے مرد کسی دوسری جگہ تیوہار کے موقع پر جمع ہوتے تو زبانیں کیسے

ہنسی مذاق سے ہال گونج اٹھتا۔ مگر دیونگر کے ہال کو یہ توقع نہ تھی اس قسم کا ہنسی مذاق تو شیطانی ہوتا ہے دیونگر کے باشندوں سے تو شائستہ جذبوں دیوتاؤں جیسے ہنسی مذاق کی توقع تھی۔ غالباً یہی سبب تھا کہ دیوا جی کی آمد سے قبل وہاں جو گفتگو اور مذاق ہو رہے تھے وہ بہت ہی تلے تلے اور پُر تکلف تھے۔ کہیں اگر ناشائستگی بھی آ جاتی تو معلوم ہوتا کہ یہ بھی دیوبانی کا ایک حصہ ہے۔ اتنی احتیاط سے بات کہی جاتی تھی۔ . . . . . .

"کہیے جیت جی" سکریٹری صاحب کو اپنی بیوی کے ساتھ زینے پر چڑھتے دیکھ کر سدرشن سنگھ نے کہا "کیا آپ دوجی رایں گے تین ہونے کا ارادہ نہیں ہے؟"

جیت جی نیم پاگلوں کی طرح ہنس دیں، لیکن اُن کے شوہر محترم ذرا بھی شرمائے بغیر آیور وید کے پریمی کھوسلہ صاحب کی طرف دیکھ کر بولے "کھوسلہ صاحب اگر ہمیں روز ایک ماشہ سدھ مکر دھوج کھلائیں تو ہم دو سے تین کیا، چار ہو جائیں۔"

اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا اور — سدھ مکر دھوج کھاؤ تو دو سے چار کیا دس ہو جاؤ۔ — کھوسلہ صاحب کا یہ جواب کسی نے نہیں سنا۔

کہیے چکرورتی جی" ہرنام سنگھ جی نے اُن کی گنجی چاند کی طرف اشارہ کیا "بھرنگراج تیل سے کچھ فائدہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ کھوسلہ صاحب نے تو جان لگا دی اِسے تیار کرنے میں۔"

"کنپٹیوں کے پاس تو بال سیاہ ہو رہے ہیں" سدرشن سنگھ نے کہا اور ہرنام سنگھ کو آنکھ ماری۔

"بس اب ایک شیشی سدھ مکر دھوج کی کھا لیں تو بال آنے بھی لگیں گے" سکریٹری صاحب بولے۔

اس پر پھر ایک ہلکا سا قہقہہ پڑا۔

اس ٹولی سے ہٹ کر چند دوستوں کے ساتھ کپتانی دلاور سنگھ شیلانگ کے اپنے فارم کے قصے سنا رہے تھے۔ وہ پہلے دیومنڈل کے سکریٹری تھے۔ پھر دیوا جی سے آشیرواد لے کر آسام میں (جہاں اُن کے ایک عزیز کی زمین تھی) دیومنڈل کی شاخ قائم کرنے کا اعلان کر کے چلے گئے تھے۔ لیکن ملیریا نے چار ہی مہینوں میں اُن کا سارا جوش سرد کر دیا تھا اور آسام والوں کو دیوتا بنانے کی فکر چھوڑ کر وہ واپس آ گئے تھے۔ سنا جاتا تھا کہ وہ پھر اپنا پرانا عہدہ پانے کے لئے بے چین ہیں اور صبح شام دیوا جی کی اردل میں سیر کو جاتے ہیں۔ آسام کا سفر اُن کا محبوب موضوع تھا اور اُنھیں جب بھی موقع ملتا اُس کا کوئی نہ کوئی واقعہ سنانے لگتے تھے اور جب کبھی ہنستے تھے تو اپنے دونوں طرف بیٹھے ساتھیوں کو بغلوں میں ہاتھ دے کر زور سے "ہیں ہیں ہیں ہیں" کرتے ہوئے انھیں ایسے جھٹکے دیتے تھے کہ اُن کے ساتھیوں کو اپنے بازو شانوں سے اکھڑتے معلوم ہوتے۔

اُن سے ذرا ہٹ کر دیونگر کے اکاؤنٹنٹ مدھوار صاحب کسی جوگی کی طرح بے فکر و بے نیاز سے بیٹھے تھے اور نندلال و بلبیر سنگھ سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

تیر تھ رام مجھے وہاں بٹھا کر چلا گیا تھا۔ ڈیوڑھی میں بیٹھ کسی ٹولی کے ہنسی مذاق یا سرگوشی میں وہ شامل نہ ہوا تھا۔ ایک دو بار میں نے دیوڑھی سے باہر اُسے اِدھر سے اُدھر چکر لگاتے دیکھا تھا۔ اس کی رفتار سے بے چینی ظاہر ہوتی تھی۔ شاید وہ اپنی نظم دُہرا رہا تھا۔

اُسی وقت دیواجی اپنی بیوی بچیوں، دیونگر کے سابق مالک پنڈت ہزاری لال مشر، کچن اور ڈیری کے انچارج ہر موہن سنگھ کے ساتھ تشریف لائے۔ ہر موہن سنگھ دور کے رشتے سے اُن کا بھتیجا ہوتا تھا لیکن اُن کی طرح 'موٹا' نہ تھا۔ وہ بھی سنوری داڑھی اور بے بلیے کیس رکھتا تھا جو بڑی محنت سے باندھی ہوئی دستار میں بند رہتے تھے۔ داڑھی پر کہیں کہیں وہ (اگرچہ یہ بات مذہب کے خلاف تھی) قینچی کا استعمال کر لیتا تھا اور اس نئی نگری میں یہ بات لائق درگذر تھی۔ دیواجی کے آتے ہی سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ وہ درمیان میں آکر بیٹھ گئے۔ اُن کی بیوی جو فربہی کی طرف مائل متوسط قد و قامت کی گوری گوری خاتون تھیں اور خود کو دیونگر کی سلطنت کی بلاشرکت غیرے ملکہ سمجھتی تھیں، اپنے شوہر کے پاس بیٹھ گئیں اور پھر سب کے بعد تیرتھ رام اندر آیا اور ہال کے ایک ستون سے لگ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

میرے ساتھ ایک آرام کرسی خالی پڑی تھی۔ میں نے تیرتھ رام کو اشارہ کیا کہ وہ میرے پاس آ بیٹھے۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہی کہا کہ میں بیٹھا رہوں۔ وہ وہیں آرام سے ہے۔

اُس وقت جب کارروائی کا ایجنڈا بن رہا تھا دیواجی کی بڑی لڑکی وانی یکایک اپنی جگہ سے اُٹھی اور میرے برابر کی خالی کرسی پر آن بیٹھی۔ میں قدرے چونکا اور ذرا سا پرے ہٹ گیا۔

وہ میری کرسی کے بازو پر جھک گئی اور بڑے پیارے میٹھے لہجے میں آہستہ سے کہنے لگی "سنگیت جی آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔"

"میں بہت اچھا گاتا ہوں؟" میں نے گویا اُسی سے سوال کیا۔

میرا خیال تھا کہ دیونگر میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں گاتا بھی ہوں۔ کبھی کسی کے سامنے گانا تو کجا میں گنگنایا تک نہ تھا۔ اور تو اور تیرتھ رام تک کو میرے گانے کا علم نہ تھا۔

میرا دایاں ہاتھ کرسی کے دستے پر ٹکا تھا اور وانی کے یوں اپنے قریب آ بیٹھنے پر میں کچھ ایسا مبہوت ہوا کہ وہ ہاتھ وہیں ٹکا رہ گیا تھا۔ وانی نے اپنا ننھا سا، پتلی پتلی نازک انگلیوں والا، کسی کامل فن کار کے خوبصورت سکیچ جیسا ہاتھ اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ہاتھ کے اتنے قریب آ گیا کہ مجھے محسوس ہوا اگر میں نے ایک دم اُسے ہٹا نہ لیا تو میں اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

اور میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اُسے اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا۔

ایسا کرتے ہوئے میں پیچھے کو جھک گیا اور میری آنکھیں اوپر کو اُٹھ گئیں۔ ایک ساتھ میری نظریں دیواجی، ہر موہن اور تیرتھ رام سے ملیں۔ وانی کے پتا، چچازاد بھائی اور تیرتھ رام تینوں کو اُس کے یوں میرے قریب آ بیٹھنے پر حیرت تھی۔ دیونگر کی آزاد فضا میں یہ بات قطعی حیرت انگیز نہ تھی، لیکن انھیں اُس کے یوں میرے قریب آ بیٹھنے پر حیرت ہوئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ مجھے دیونگر آئے ہوئے تین ماہ ہو گئے تھے اور میں دیواجی کی ہدایت کے مطابق دوسرے گھروں میں آنے جانے بھی لگا تھا۔ لیکن نندلال کے گھر کے علاوہ میں کہیں نہ جاتا تھا اور وانی سے تو میری کبھی ملاقات بھی نہ ہوئی تھی۔

یہ سب گویا چشم زدن میں ہو گیا۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی جب انھوں نے نظریں جھکا لیں، اور میں نے پھر نگاہیں نیچی کیں تو وانی نے میرے سوال کے جواب میں میری طرف دیکھا۔

اُس کی وہ نگاہ کیسی تھی؟ سر قدرے دائیں طرف اور منہ نیچے کو جُھکا تھا — وہیں سے وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں — نیچے کو جھکے چہرے کی وہ اُوپر کو اُٹھی نگاہ نہ جانے کیسے میرے دل کی گہرائیوں تک اُترتی چلی جا رہی تھی۔

"اس نے اس چھوٹی سی عمر میں کہاں سے یوں دیکھنا سیکھ لیا" — دھڑکتے ہوئے دل سے میں سوچ رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔ "میں نے کئی بار سنا ہے آپ کو گاتے۔ اِس اُمید میں کہ آپ گائیں گے میں اکثر رات گئے تک جاگا کرتی ہوں۔" اور پھر اچانک جھکی رہ کر بھی اُٹھی ہوئی اس نگاہ کا تیر میرے دل میں پیوست کرتے ہوئے اُس نے کہا: "آپ دن کو کبھی کیوں نہیں گاتے؟"

میں ہنسا۔ "میں کوئی گویا نہیں۔" میں نے کہا۔ "یوں ہی جب کبھی نیند نہیں آتی تو ایک آدھ بول آلاپ لیتا ہوں۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ کوئی سنتا بھی ہے تو شاید نہ گاتا۔"

وہ ہنسی۔ "کیوں؟"

لیکن قبل اس کے کہ میں اسے اس 'کیوں' کا جواب دیتا دیوا جی بولنے لگے تھے۔

"آج سے سال بھر پہلے اس جگہ جہاں ہم سب مل کر جشنِ دن کی خوشی منا رہے ہیں"۔ اُن کی سنجیدہ اور پُروقار لیکن شیریں اور اعتماد بھری آواز گونجی — "دن کو بھی یہاں کوئی نہ آتا تھا اور اس ڈیوڑھی کے کھنڈر شکستہ و بوسیدہ فصیل کے ساتھ خوفناک انداز میں بھائیں بھائیں کیا کرتے تھے۔ اُن دِنوں جب میں نے 'دیوپانی' کی کچھ اشاعتوں میں 'دیومنڈل' اور 'دیوسینا' کی تجویز پیش کی تھی تو پریمیوں نے اس کی تائید بھی کی تھی اور مخالفت بھی۔ میں نے اپنے مقصد کی مزید وضاحت کی تو انھوں نے بڑے جوش سے اُس کا خیر مقدم کیا تھا۔ مجھے آج ایک سال بعد بھی ایک پریمی کا خط یاد آتا ہے۔ میں نے اِتنے دوستوں کو وہ خط سنایا ہے کہ مجھے تقریباً زبانی یاد ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے لکھا تھا — "آپ کا خط ملا۔ شبہات دور ہوئے۔ براہ کرم دیو منڈل کا پرچم جلد سے جلد بلند کر دیجیے۔" اور انہوں نے نہ صرف دیو منڈل کے فی الفور قیام کی خواہش ظاہر کی تھی بلکہ بڑے ارمانوں کے ساتھ اُس کا خاکہ بھی تحریر کیا تھا۔ "دل میں بڑے ارمان ہیں۔" اُنہوں نے لکھا تھا — "بڑی حسرتیں ہیں۔ مذہبی اور فرقہ دارانہ تنازعات دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ کمر کس کر اُٹھ کھڑے ہوں اور انسان کو انسان کی پہچان کرائیں۔ چاروں طرف کورانہ اعتقادوں کی بیلیں پھیلی ہوئی ہیں۔ لوگ نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی فریب دیتے ہیں۔ تجارت میں کوئی اصول اور دیانت داری ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے۔ غلط ووٹ ڈالتے ہیں۔ تعلیم ایسی دیتے ہیں کہ وہ ہمارے دماغوں کو روشن کرنے کی بجائے تاریک بناتی ہے۔ دلوں کو کشادہ کرنے کی جگہ تنگ کرتی ہے۔ اگر ہماری فہم و فراست اور دوسری فطری قوتوں کی صحیح نشو و نما کے مواقع فراہم ہوں تو ہم یقیناً زیادہ سمجھ دار روشن دماغ اور فراخ دل ہوں۔ پھر تنگ مکانوں کے پاس گندی نالیاں نہ بہیں، باغوں کے درمیان خوب صورت مکانات ہوں۔ مفلسوں میں گھرا ہوا کوئی تنہا مالدار سونے کی اینٹوں کو چھپائے چوروں سے بچتا نہ پھرے۔ بلکہ سبھی شکم سیر ہو کر کلا اور ترقی کے خواب دیکھیں۔ ہر دن چڑھتے کرنوں کے نرم و نازک لمس سے لوگ بیدار ہوں۔ کشادہ پیشانی، مسکراتی آنکھوں اور پھیلے بازوؤں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کریں۔ صبح دم بیدار ہونے والی چڑیوں کی طرح ایک دوسرے کو بلائیں۔ ہنسیں کھیلیں اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق مقصدِ حیات تلاش کریں......"

دیوا جی کی تقریر سنتے سنتے نادانستہ طور پر میرا ہاتھ پیٹھ کے پیچھے سے پھر کُرسی کے دستے پر آ گیا۔ اچانک میں نے خفیف سا

لمس اور اس لمس سے اپنے جسم میں بجلی کی سی رَو دوڑتی محسوس کی۔ میری توجہ دیواجی کی تقریر سے ہٹ گئی۔ میں نے دیکھا دانی مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ پھر پیچھے کر لیا۔ سامنے ستون کے سہارے کھڑے تیرتھ رام سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ برابر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ تیور چڑھے اور آنکھیں شعلہ فگن اس کے چہرے پر سیاہ بادل گھر آیا تھا۔ اور دیواجی کہہ رہے تھے۔

"جنت اِس دنیا میں اُتر آئے، یہی سورگ بن جائے اور اس کی پاکیزہ مسرت ہی سے وہ سرخوشی حاصل ہو جسے ہمارے شاستروں میں 'پرم آنند' کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن پرم آنند اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب پیار کی اضافی پابندیاں نہ ہوں۔ نہ ظاہرداری ہو، نہ دھوکا فریب جب اپنے آپ سچی محبت اور بھگتی کی ترنگیں اُٹھیں خوب فرصت ہو، فرصت میں آرام و سکون ہو۔ ایسی ہی آسودگی میں جوتش، حکمت، فلسفہ، علوم و فنون پروان چڑھ سکتے ہیں۔"

"اس محبتی کا خطہ" دیواجی نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد کہا "میرے ہی ارمانوں کا پرتو تھا۔ میں نے دیومنڈل قائم کر دیا۔ لیکن اپنے اور اپنے ہمدردوں کے جوشوں کے باوجود میں اس امر سے ناواقف نہ تھا کہ ہمارے ملک میں برساتی کھمبیوں کی طرح سر نکال کر غائب ہو جانے والے منڈلوں، سنگھوں، سبھاؤں، سماجوں اور سوسائٹیوں نے عوام کو کافی شکی بنا دیا ہے۔ پاٹھ شالاؤں، مندروں، گؤشالوں اور اناتھالیوں کو چندے دیتے دیتے لوگ تھک گئے ہیں اور اسی لئے ہر نئی تحریک کو شبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی میں جانتا تھا کہ جو شخص دیومنڈل کے خاکے، اس کے مقاصد اور اس کے اصولوں پر غور کرے گا وہ جان لے گا کہ منڈل کی دعوت انہیں آتماؤں کے لئے ہے جو محبت کے پنکھوں پر اُڑ کر آسمان کو چھونے کا حوصلہ رکھتی ہیں اور میں جانتا تھا کہ جو ایک بار بھی خود غرضی کی سنگلاخ سرزمین سے اڑ کر پریت کے آکاش میں دو چکر لگا آئیں گے، وہ بیقرار ہو جائیں گے کہ دنیا میں جکڑے غربت و افلاس کی دلدل میں پھنسے بھائیوں کی آنکھیں مٹی سے ہٹا کر ستاروں کی طرف لگا دیں۔ اور اگر اس کارِ خیر میں انہیں کچھ دینا بھی پڑے تو اسے وہ اپنی خوش قسمتی خیال کریں۔ اس وقت میں نے لکھا تھا کہ اس منڈل کو چندے کی فکر نہیں۔ ہمیں ایک ایسا منڈل بنانا ہے جس کی ہوا ہلکی اور پاک ہوگی جس کے دروازے کھلے اور کشادہ ہوں گے، جس میں سانس لینے والوں کے دل وسیع اور سینے فراخ ہوں گے۔ اگر منڈل میں کوئی کشش ہوگی تو آنے والا ٹھہرے گا ورنہ کسی دوسری معقول انجمن میں جا شامل ہوگا۔ اور جو رہے گا وہ جو چاہے دے دے اور جو چاہے لے لے۔ میری اپیل پر پریت کے شیدائیوں نے، شیطانی بستیوں میں دیونگر قائم کرنے کے خواب دیکھنے والوں نے مجھے اپنے تعاون کی طاقت عطا کی اور آج آپ کی آنکھوں کے سامنے اِس ملک میں — جس کا ہر گوشہ فردوس تھا، اِس ملک میں جس کا ہر گوشہ اب دوزخ ہے پہلا دیونگر قائم ہو گیا ہے۔ آج اِس سنسان کھنڈر میں میرے اور آپ کے خواب مجسم ہو اُٹھے ہیں....."

میں نے سنا تھا کہ دیواجی کے قلم میں جادو ہے، لیکن انہیں بولتے سنا تو معلوم ہوا کہ ان کی زبان میں بھی جادو ہے۔ وہ اپنے اسی گہرے سنجیدہ مگر شیریں اور پُراعتماد لہجے میں بولے جا رہے تھے اور دیو سینک گویا اُن کے ہونٹوں سے نکلنے والے ہر لفظ کو آنکھوں اور کانوں

لہ یتیم خاتون۔

سے ذریعے دل و دماغ میں محفوظ کرتے جا رہے تھے۔

لیکن رانی کی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی تھیں اور نیر تھ رام مسلسل اُس کے چہرے پر ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔ رانی کی اُن جھکی جھکی آنکھوں کی اس اوپر کو اُٹھی نگاہ میں نہ جانے کیسی کشش تھی کہ میں اُس کا لمس تک محسوس کر رہا تھا۔ اُسی نظر کے لمس سے مجبور ہو کر آخر میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

مجھے یوں اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر دینے کی خوشی میں اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر ہویدا ہو کر اُس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔

"دار جی کی تقریر کے بعد آپ گائیں گے؟" اُس نے میری نگاہ کو اپنے سوال میں سمو لیا۔

لیکن میری نظریں تیر تھ رام کی طرف اُٹھ گئیں۔ اُس کے چہرے پر چھایا ہوا ہلکا سیاہ بادل گہری گھٹا بن چکا تھا۔

..... اور دیوا جی بتا رہے تھے کہ کس طرح اپنے قارئین سے چندہ مانگنے کی بجائے جب انھوں نے ان کے سامنے عملی اسکیم رکھی کہ انھیں ایسے پانچ سو ہمدردوں کی ضرورت ہے جو اپنے سو سو روپے اُن کو دس سال کے لئے دے دیں اور اُس کے عوض وہ انھیں دس سال تک نہ صرف "دیوبانی" مفت پڑھنے کو دیں گے بلکہ سال بھر کتابیں بھی دیں گے تو کس طرح تین ماہ کے اندر اندر انھیں پانچ سو کی جگہ چھ سو ایسے ہمدرد مل گئے تھے۔ اُن کا روپیہ ڈوبے گا نہیں، اپنے ہمدردوں کو یہ یقین دلانے کے لئے دیوا جی نے ساٹھ ہزار کا بیمہ کرا لیا — اس شرط کے ساتھ کہ اگر دس سال سے قبل وہ مر گئے تو اس کا روپیہ اُن لوگوں کو مل جائے۔

اُس وقت دیوا جی کا ارادہ شہر میں ایک پریس کھولنے اور 'دیو لٹریچر' کی نشر و اشاعت کرنے کا تھا۔ لیکن اُن کے ہاتھ میں جب ساٹھ ہزار روپے آ گئے تو ایک دوسرا خواب اُن کی آنکھوں میں لہرا گیا — دیو منڈل کو محض لٹریچر کے ذریعے ہی اپنے خیالات کی اشاعت نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ایک ایسا نگر بسانا چاہیے جہاں دیو منڈل کے خوابوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ دِلّی کے ایک بگڑے رئیس سے صرف بائیس ہزار روپے میں انھوں نے وہ بنجر زمین خرید لی پھر کوٹے کی اینٹوں سے (باہر پختہ لیکن اندر سے کچی مگر خوب صاف ستھری) دس کوٹھیاں تعمیر کروالیں۔ اُن کی تصاویر 'دیوبانی' میں چھاپ دیں اور 'دیوبانی' کے ذریعے افریقہ، امریکہ، ملایا اور برما کے امیر لیکن وہاں کی خود غرض سرمایہ دارانہ فضا سے بیزار اپنے ہندوستانی قارئین سے اپیل کی کہ وہ دیو نگر کے آدرشی ماحول میں ایک ایک کوٹھی جوائیں تعطیل کے ایام وہیں گذاریں اور ریٹائر ہو کر وہیں قیام کریں۔

"ہمارے کاندھوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔" دیوا جی کہہ رہے تھے۔ "دیو نگر میں ہمیں ایک ایسا مثالی ماحول پیدا کرنا ہے کہ باہر کا جو ہمدرد ایک بار یہاں آ کر کچھ دن قیام کرے وہ ان چند دنوں کی یاد کو پھر کبھی فراموش نہ کر سکے۔ آؤ آج کے مبارک دن ہم پھر عہد کریں کہ اس دنیا میں سچ مچ کا دیو نگر بسانے کے اپنے خواب کو ہم عملی جامہ پہنا کر رہیں گے۔"

اور وہ تالیوں کے شور میں بیٹھ گئے۔

اس کے بعد گیانی دلاور سنگھ اور سبھا کے سیکریٹری گوربچن سنگھ نے دیو منڈل کے بانی کو یہ یقین دلایا کہ دیو سینک اس خواب کو حقیقت بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھیں گے۔ جس نگر کی بنیاد اُن جیسی عظیم ہستی کے ہاتھوں سے پڑی ہے وہ کیوں نہ ملک میں ایک مثالی نگر

ثابت ہوگا۔

ان تقریروں کے بعد سکریٹری نے تیرتھ رام سے درخواست کی کہ وہ اپنی نظم سنائے۔ لیکن تیرتھ رام نے کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ بدستور ستون سے لگا کھڑا رہا — اُکھڑا اور گھبرا ہوا۔

سیکریٹری نے زور دیا کہ اُس نے تو اسی موقعہ کے لئے نظم لکھی تھی۔

"لکھی تھی مگر میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔" تیرتھ رام نے کہا اور اُس نے وانی کی طرف رقت آمیز نظروں سے دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وانی ایک بار بھی کہہ دیتی — "تیرتھ جی آپ سنائیے نا اپنی نظم!" تو تیرتھ رام کے چہرے پر گھری ہوئی گھٹائیں یکلخت چھٹ جاتیں اور وہ شگفتہ ہو کر چہکنے لگتا۔ لیکن وانی نے اُس سے نظم سنانے کا اصرار کرنے کی بجائے اپنے باپ سے کہا۔ "دار جی سنگیت جی سے کہیے گانا سنائیں۔ یہ بہت اچھا گاتے ہیں۔"

ایک لمحہ کے لئے میری نگاہیں تیرتھ رام کی طرف اٹھیں۔ میں اُس کی نظروں کا مقابلہ نہ کر سکا اور پھر میں نے اپنے آپ کو تقریباً تمام حاضرین کی نگاہوں کا مرکز پایا۔

"دار جی، سنگیت جی سے آپ کہتے کیوں نہیں گانے کو؟ یہ بہت اچھا گاتے ہیں۔" وانی جا کر اپنے پتا سے چمٹ گئی۔

اور اُسی وقت تیرتھ رام ستون چھوڑ کر ہٹا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

دیوا جی نے کہا۔ "ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا کہ آپ گاتے بھی ہیں۔ سنائیے نا کوئی گانا۔"

میں کرسی سے اُٹھا۔ "جی میں تو بالکل نہیں گاتا۔"

"نہیں دار جی، یہ گاتے ہیں، میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ پرسوں رات اپنے کمرے میں گا رہے تھے۔ بہت میٹھی آواز ہے ان کی۔"

میں صرف وہی ایک گانا —

ونڈ موتیاں دے دانے

کبھی کبھی گایا کرتا تھا۔ اُسے ان سب کے سامنے گانا اپنے زخم کو بھرے بازار میں کریدنا تھا۔ مجھے محسوس ہوا گویا میں اپنے ذاتی راز کو ان سب کے سامنے افشا کرنے جا رہا ہوں۔ لیکن میں ملازم تھا۔ وہ بھی نیا نیا۔ دیوا جی نے پھر اصرار کیا۔ چنانچہ تقریباً ہکلاتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں کبھی گاتا نہیں۔ کم از کم دوسروں کے سامنے تو بالکل نہیں۔ لیکن آپ دونوں کا اصرار ہے تو میں سنائے دیتا ہوں۔ مجھے ایک ہی گانا آتا ہے۔ عموماً شہر کے غنڈے اور شہدے اسے گاتے ہیں اس لئے مجھے اسے گانے میں اور بھی جھجک ہے۔ لیکن اس گیت کے بول ایک دم میرے اپنے بن گئے ہیں اور اپنی ضرورت کے مطابق میں نے اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ بھی کر لی ہے۔"

اور میں گانے لگا:

ونڈ موتیاں دے دانے
نہ ہس جان ڈھگ جان گے

او، تیرے دند موتیاں دے .....[1]

لائی اے نظر کس ڈاڈھی

صفنیاں چ زہر بو وِتا

او جان، لائی اے نظر کس[2]

توڑکے پریتاں جانیئے

مینوں بھی تاں راہ دس جا

او توڑکے پریت ں .....[3]

پریتم کی ہنستی ہوئی موتیوں کی وہ تبیسی میری آنکھوں میں گھوم گئی اور پھر آہستہ آہستہ انھیں موتیوں کو میں نے اپنی آپ کھوتے پایا— میری وہ سنہری دنیا کیسے اُجڑ گئی کیونکر اُجڑ گئی...... اور میں درد بھری آواز میں چیخ اُٹھا۔

تیرے ہتھ کی رتا آیا دس دے

اُجاڑ میری سون دُنیا

او تیرے ہتھ کی رتا آیا .....[4]

گیت ختم ہوگیا۔ میں نے وانی کو رومال سے اپنے آنسو پونچھتے دیکھا۔ لیکن میں وہاں رک نہ سکا۔ مڑا اور ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔ اگر میں وہاں رکتا تو یقیناً رو پڑتا۔

باہر آدھا چاند آسمان میں ہنسا اپنی مٹیالی چاندنی پھیلا رہا تھا۔ آسمان سے زمین تک چھاتے ہوئے ہلکے ہلکے کہرے نے اُس کی ضیا کو اور بھی ماند کر دیا تھا اور سامنے بنولی کے درخت اندھیرے کی مٹیالی دیوار پر بڑے بڑے دھبے سے معلوم ہو رہے تھے۔ سردی غضب کی تھی اور دیونگر کے پیڑ پودے اور رستے جیسے سن ہو کر سردی میں ٹھٹھر گئے تھیں۔

میرا خیال تھا کہ تیرتھ رام اپنی بے چینی اور اضطراب کو دور کرنے کے لئے ان روشوں پر گھوم رہا ہوگا۔ لیکن جب پورے دیونگر کا چکر لگانے پر بھی کہیں اُس کا نشان نہ ملا تو میں اُس کے کمرے پر گیا۔ دروازہ بند تھا مگر کنڈی نہیں لگی تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر میز پر لیمپ جل رہا تھا اور تیرتھ رام اپنی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔

"تیرتھ رام!"

---

[1] تیرے دانت موتیوں کے دانوں جیسے ہیں اے میری جان بنس مت یہ گر جائیں گے۔

[2] یہ کس نے سخت نظر بد سے دیکھا خوابوں تک کو زہر آلود کر دیا۔

[3] او محبت کو توڑ کر جانے والی ہمیں بھی کوئی راستہ سمجھا جا۔

[4] اے خدا بتا تیرے ہاتھ کیا آیا میری سنہری دنیا کو اُجاڑ کر۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں سنگیت اِس وقت تم جاؤ۔"

اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا چارپائی پر بیٹھ کر اس کی پیٹھ تھپتھپاؤں اُس کا سر دباؤں۔ اُس کی کوئی خدمت کروں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میری ہمدردی اُس کے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہوگی۔ میرا اپنا دل بے چین تھا۔ اور اس وقت مجھ میں اُس کی ذرا سی بات بھی برداشت کرنے کی سکت نہ تھی۔ تاہم میں نے ایک بار پھر کہا "کہو تو اسپرین لاؤں؟"

اُس نے جواب نہ دیا۔ بدستور اوندھے منہ لیٹا رہا۔

میں پلٹا ——— دروازے آہستہ سے بند کئے اور باہر نکل آیا۔

چاند اُوپر اُٹھ آیا تھا۔ شبنم کی مانند چاندنی بے آواز برس رہی تھی۔ ہر چہار طرف گہری خاموشی طاری تھی۔ کسی پتے کے گرنے یا کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہ آرہی تھی۔ ڈیوڑھی خالی ہو چکی تھی۔ وید تو اپنے اپنے بستروں کی نرم گرم آغوش میں دبک گئے تھے لیکن میں اوور کوٹ کو اپنے سینے سے دبائے خاموشی سے سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جانے اُس وقت کوئی جاگ بھی رہا تھا یا نہیں۔ شاید تیرتھ رام جاگ رہا تھا۔ اپنی چارپائی پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ یا شاید لیمپ کے آگے جھکا کاغذ پر اپنے دل کا غبار نکال رہا تھا۔ اور شاید دانی ...... کیا دانی جاگ رہی ہے؟ جاگ رہی ہے تو کیا کر رہی ہے؟ ..... شاید اپنے بستر پہ لیٹی خاموشی سے چھت کو تک رہی ہے ..... شاید اس کے کان میری آواز کی طرف لگے ہیں ...... اور رات کے اُس سناٹے اُس چھپتے کہرے اور سمٹی چاندنی میں اچانک میں گا اُٹھا ——— دل کے تمام درد اور گلے کی پوری آواز کے ساتھ ———

ونڈ موتیاں دے دانے

نہ ہس جان ڈِگ جان گے

لیکن جس طرح اچانک میں گانے لگا تھا اسی طرح دفعتاً خاموش ہو گیا۔ پتو کے ہنستے ہوتے موتی میری آنکھوں کے سامنے کوند گئے۔

فضا میں میری آواز کی گونج ابھی تھرتھرا رہی تھی کہ میں مڑا اور اپنی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

بیمار سی کلی

دانی، جسے میں محض بارہ تیرہ سال کی سمجھتا تھا، درحقیقت پندرہ سولہ برس کی لڑکی تھی۔ چھوٹے قد کی پتلی دبلی بیمار بیمار سی۔ نخر شبی نے جب لکھا تھا۔ "مجھے تو کچھ انھیں بیمار کلیوں سے محبت ہے۔" تو غالباً اُس جیسی کسی لڑکی کو "بیمار کلی" کی تشبیہہ دی ہوگی۔ اس پہلے دن جب میں ویدکو آیا تھا اور اپنے پتا کے حکم کی تعمیل کے شوق میں دانی پھدکتی ہوئی سی اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ دروازے میں آن کھڑی ہوئی تھی تو میں نے اُس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی تھی۔ وہی چائے لائی تھی لیکن اُس میں ایسی کوئی جاذبیت نہ تھی کہ دیوا جی سے گفتگو کرتے وقت میرا دھیان اُس کی طرف بھٹکتا۔ اس لئے یہ درست ہی تھا کہ جب میں اس بات کی تلاش کرتے ہوئے کہ اس چھوٹی سی نگری میں کون لڑکی ہے

جو تیرتھ رام کی آہوں کا باعث ہے دیونگر کے گھر گھر گھوم آیا تو وآنی کی طرف میرا دھیان بھی نہیں گیا، لیکن اس شام کے بعد وہ ننھی بیمار سی کلی اپنے آپ میری توجہ کا مرکز بن گئی۔

ڈائننگ ہال میں پہلے بھی میں کھانا کھاتا اور کئی بار میں اس صف میں بھی بیٹھتا تھا جس میں دیوا جی اور اُن کے کنبے کے افراد بیٹھے ہوتے لیکن اس واقعہ کے بعد دوسرے دن جب میں دوپہر کا کھانا کھانے گیا تو اچانک میری نظریں اگلی میزوں کی طرف اُٹھ گئیں، جہاں عموماً دیوا جی آکر بیٹھتے تھے۔ دیوا جی نہیں تھے۔ نہ اُن کی بیوی تھیں۔ غالباً وہ پہلی صف میں کھانا کھا گئے تھے — لیکن دوسرے بچوں میں گھری وآنی بیٹھی تھی۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو اُسے خاموشی سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ نظریں ملتے ہی اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ لیکن جب میں نے پھر اُس کی طرف دیکھا تو ہماری نظریں پھر ایک دوسری سے جا ملیں۔

کھانا ختم کرتے کرتے کئی بار میری اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں لیکن جب کھانا ختم کر کے میں اپنی پلیٹ کو باورچی خانے کے باہر نل پر رکھ کر چلا تو مجھے اپنی حماقت پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ تیرتھ رام کے مرض کا علاج کرتے کرتے یہ میں خود کس بیماری میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا؟ اور ڈائننگ ہال سے اپنے کمرے تک آتے آتے میں نے طے کر لیا کہ یہ سب میں تیرتھ رام ہی کے لئے چھوڑ دوں گا۔ میں سکون چاہتا ہوں تاکہ کچھ پڑھ سکوں، سمجھ سکوں — یہ عشق و عاشقی — وہ بھی اس ذہنی حالت میں میرے بس کا روگ نہیں۔

میں نہیں جانتا کہ پتو جیسی حسین لڑکی ہوتی تو میرا دل کیا کرتا۔ کیا یونہی ٹھنڈے دل سے بے نیازی کے ساتھ سوچتا رہتا شاید نہیں یا شاید ہاں۔ کیونکہ اول تو پتو جیسی خوبصورت لڑکیاں عام نہیں ہوتیں، پھر کوئی ویسی خوبصورت ہو بھی تو کیا ضروری ہے کہ اتنی ہی سمجھدار بھی ہو۔

لیکن اُدھر سے دھیان ہٹا لینے پر بھی دل کسی اور طرف نہیں لگا۔ لمحہ بھر بعد ہی میں پھر سوچنے لگا کہ وآنی میری طرف کیوں کھنچی۔ میں تو اس کے گھر بھی زیادہ نہیں گیا۔ کہیں ایسی جگہ بیٹھا نہیں جہاں وہ بھی ہو۔ تو کیا رات کی تنہائیوں میں میرے وہ درد بھرے بول ہی تو اُسے متوجہ کرنے کا سبب نہیں بنے۔ ممکن ہے ایسا ہو۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس میں میری صورت کو بھی کم دخل نہیں ہے۔ تیرتھ رام میرے پتلے چھریرے جسم پر خواہ کتنا ہی ہنستا رہے مگر میری بیوی اسی پر بُری طرح فدا تھی — لیکن بیویاں تو موٹے بیڈول شوہروں پر بھی مرتی ہیں — دانستہ یا نادانستہ بھی خوشی سے بھی اور مجبوری سے بھی مگر پتو کی سہیلیاں . . . . وہ جب آتی تھیں تو ہمیشہ اُن کی آنکھوں میں پتو کے لئے جذبۂ رشک ہوتا تھا۔

میں سیدھا کمرے میں گیا اور جا کر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہی گہری بھوری بھوری آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ، گورا رنگ، ذرا ذرا سے دھنسے گال اور چھوٹی چھوٹی داڑھی مونچھیں جنھیں میں نے بڑے جتن سے بڑھا رکھا تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں محویت سے اپنی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اچانک میں نے سر سے پگڑی اُتار کر چارپائی پر پھینک دی۔ میرے سنہرے بالوں کا جوڑا دھوپ میں چمک اُٹھا۔ پیشانی پر پگڑی کی وجہ سے ایک نشان بن گیا تھا۔ دو چار بار میں نے اُسے ملا۔ سکھ اگر ننگے سر ہوں اور بال بھی سنورے نہ ہوں تو اتنے اچھے نہیں لگتے۔ داڑھی مونچھیں بھی سب کو نہیں زیب دیتیں۔ لیکن میرے گورے رنگ اور تیکھے خدوخال پر سب کچھ اچھا لگتا تھا۔ منہ پر، پیشانی پر اور سر پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے ایک لمبا سانس بھرا، زور کی انگڑائی لی اور چارپائی پر جا بیٹھا۔ اس لڑکی نے ایک ہی نگاہ سے مجھے کیسی مصیبت میں ڈال دیا تھا . . . . . .

لیکن میں اپنے فیصلے پر سختی سے قائم رہا۔ رات میں سب سے آخری صف میں کھانا کھانے بیٹھا، وہ بھی ایسی جگہ جہاں گیس کی روشنی کم جاتی تھی۔

اس کے بعد میں مسلسل تیسری صف میں کھانے لگا اور سب سے آخر میں بیٹھنے لگا۔ لیکن شام کو کوٹھیوں کے سامنے کی نسبتاً پختہ سڑک پر یا باغ کی روشوں پر بے اختیار وانی میرے سامنے آجاتی۔ میں نظریں جھکا لیتا یا دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ اپنی توجہ اُدھر سے ہٹانے کے لئے میں نے کام زیادہ کرنا شروع کر دیا۔ دیوا جی کی آٹھ دس کہانیوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ اُن کہانیوں کو پڑھتے اور اُن کا ترجمہ کرتے وقت یکایک ایک بات مجھ پر واضح ہوگئی۔ کئی روز سے میں سوچتا آ رہا تھا کہ اس ذرا سی لڑکی نے اِس عمر میں اِن آنکھوں سے دیکھنا، اِن شیریں الفاظ میں بولنا، اِس دلفریب انداز میں مسکرانا کہاں سے سیکھ لیا۔ 'دیوبانی' کی فائلوں کا مطالعہ کرتے کرتے یہ راز مجھ پر منکشف ہوگیا کہ وانی نے اپنے پتا کے افسانوں سے یہ سب سیکھا تھا۔ دیوا جی نے بیسیوں فلسفیانہ سماجی اور سیاسی مضامین لکھے تھے۔ ایسی پُر تاثر دل نشیں طرزِ تحریر اور رواں دواں زبان میں کہ اُن سے اختلاف رکھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ لیکن ان مضامین کے علاوہ انھوں نے بیس تیس افسانے بھی لکھے تھے۔ —— نہایت جذباتی، رومانی اور مثالی محبت سے بھرپور —— آج اتنے عرصے کے بعد بھی میں دیوا جی کے قلم کی طاقت اور طرزِ تحریر کی بے مثل جاذبیت کا معترف ہوں۔ اُن میں الفاظ کے صحیح انتخاب اور نازک جذبات کے اظہار، قاری کو اپنے ساتھ بہائے جانے والی مثالی محبت، بلند، لطیف اور تاثر آفریں ماحول میں اُٹھائے جانے اور قاری کے پاؤں زمین سے اکھاڑ دینے کی بے مثل قوت تھی۔ ثقیل اُردو اور ہندی الفاظ کو بھی نرم اور آسان بنا کر انہوں نے پنجابی میں یوں ملا دیا تھا کہ اُس زبان میں ایک عجیب لطافت اور حلاوت پیدا ہوگئی تھی۔ اُن کے ہیرو اپنی ہیروئنوں کو ہمیشہ نہایت شیریں الفاظ میں مخاطب کرتے تھے —— 'بُتّیے'، 'چننیئے'، 'سوہنئے'، 'گوریئے' —— اور جب وہ جذبۂ محبت سے سرشار ہوتے تھے تو بڑے پیار اور احترام کے ساتھ صرف ان کا ہاتھ چومتے تھے اور عموماً جب اپنے آدرش یا فرض سے تحریک پاکر (اپنی محبوبہ کے عزیزوں یا اپنے والدین کے دکھوں یا مخالفتوں کے باعث) اپنی محبوبہ سے شادی نہ کر سکتے تھے تو تاحیات کنوارے رہ کر اپنی کنواری محبت کی حفاظت کرتے تھے۔ دیوا جی کی اُن کہانیوں کا عشق نرالا تھا —— حقیقت سے کہیں دور جذبات کے سارے بحرِ بیکراں میں تیرنے اور کبھی غوطے نہ کھانے والا، مستحکم مضبوط اور ناقابلِ شکست!

وانی نے لڑکپن سے یہ کہانیاں پڑھی تھیں اور اسی وقت سے اُس نے اس عشق کے خواب دیکھے تھے۔ انھیں کہانیوں کی ہیروئنوں سے اُس نے دیکھنا، بولنا، دلی جذبات کو آنکھوں میں بھرنا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے دل میں اپنی نگاہوں کو اتار دینا سیکھا تھا۔

اس لڑکی نے یقیناً کبھی تیرتھ رام کو دانستہ یا نادانستہ اپنی انھیں بے پناہ نگاہوں سے دیکھا ہے اور اُس کے دل میں (جو جسمانی طور پر لحیم شحیم ہونے کے باوجود ایک شاعر کا نازک جذباتی دل ہے) ایسا میٹھا زخم لگا دیا ہے کہ وہ سب کی نظروں سے چھپا کر اُس کی پرورش کر رہا ہے —— میں نے سوچا۔ . . . . . یہ عجیب بات ہے کہ بڑے دن کی اُس شام کے بعد تیرتھ رام نے میرے یہاں آنا بالکل بند کر دیا تھا۔ میں اُس کے ہاں دوسرے ہی دن گیا تھا، لیکن وہ اُس سے بھی پہلے غالباً نہر کی سیر کو نکل گیا تھا۔ دیونگر کے شمال مشرق میں ایک بڑا راجباہا تھا۔ سب اسے نہر کہتے تھے۔ تیرتھ رام دیونگر کی روشوں پر گھومنے کی بجائے صبح شام اُسی نہر پر گھومتا، گیت بُنتا اور لمبے لمبے سانس بھرتا۔ نہ جانے زندگی کے اس ویران ساحل پر اُس کی کتنی گرم آہیں آوارہ پھر رہی تھیں؟ ایک روز صبح وہ مجھے مل گیا۔ میں دودھ

پینے کچن کی طرف جا رہا تھا۔

"آؤ چلیں۔" میں نے اُسے دعوت دی۔

"میں نے دودھ پینا چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"بہت موٹا ہوا جا رہا تھا اور آج کل زمانہ پتلے چھریرے جسم والوں کا ہے۔" اور لمبے سانس کو دباتے اور میری طرف کچھ عجیب طنز آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ چلا گیا۔

بیچارہ تیرتھ رام..... لیکن اُس کی بیچارگی پر غور کرتے ہوئے معاً مجھے اپنی حیثیت کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ اگر تیرتھ رام کو وآنی سے محبت نہ ہوتی اور وانی نے کبھی اُس کی طرف اپنی ان دل و جگر کے پار ہونے والی نگاہوں سے نہ دیکھا ہوتا تو وہ یوں اچانک میرے ہاں آنا نہ چھوڑ دیتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تیرتھ رام اور وآنی میں تھوڑی ـــــ وہ خواہ نظروں اور مسکراہٹوں کے تبادلے ہی تک محدود ہو۔ محبت رہی ہو اور تیرتھ رام کو پہلے ہی یہ احساس ہو گیا ہو کہ وآنی میری طرف مائل ہے۔ ممکن ہے وآنی نے اُس سے میرے بارے میں کچھ پوچھا ہو اور اس لئے سارے دیونگریوں میں وہی مجھ سے چِڑا رہتا ہو۔ میرے جسم کے چھریرے پن یا میرے بالوں کی گھنگھرالوں کی سی درازی یا میرے ہونٹوں کے عورتوں کے سے کٹ کو لے کر اُس کے مذاق کرنے کی تہ میں کیا اُس کا اپنے آپ کو یہ تسلی دینا تو نہ تھا کہ وآنی اُس کے اس تندرست و توانا، کسرتی سڈول جسم کو چھوڑ کر مجھ جیسے پتلے سے سکڑے کی طرف مائل نہیں ہو سکتی اور جب بڑے دن کے اس جشن کی رات کو اس نے دیکھ لیا کہ وانی میری طرف مائل ہے تو اس نے اچانک میرے ہاں آنا چھوڑ دیا۔

میرے متعلق دیونگر میں جو طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی تھیں کہیں انھیں پھیلانے میں تیرتھ رام ہی کا ہاتھ تو نہ تھا؟..... اور یہ خیال آتے ہی میرے منہ کا ذائقہ تلخ ہو گیا۔ میں کب دودھ پی گیا، وہ میٹھا تھا یا پھیکا، گرم تھا یا ٹھنڈا، اس کا مجھے ذرا ہوش نہ رہا۔ صبح کی سردی میں ڈائننگ ہال کے برآمدے میں دھوپ کی طرف بیٹھ کر کے گرم دودھ پینا، چلغوزے یا مونگ پھلی کھانا مجھے بہت مرغوب تھا۔ لیکن اُس دن ایسا محسوس ہوا گویا احساسات کی تمام قوتیں اس فکر کے آگے سلب ہو گئی ہیں۔ گلاس کو کچن کے باہر نل کے آگے پھینک کر جب میں چلا تو تیرتھ رام کی کئی باتیں نئی شکل میں میرے سامنے آئیں جن کی طرف میں نے پہلے کبھی توجہ ہی نہ کی تھی اور میں پریشان ہو اُٹھا۔ لیکن کمرے میں پہنچ کر میں نے زبردستی اپنے ذہن کو اس طرف سے ہٹایا اور دیوا جی نے جو نئے مضامین دیئے تھے اُن میں سے ایک کا ترجمہ کرنے میں محو ہو گیا۔ ایک دو بار ذہن بھٹکا لیکن پھر دیوا جی کے قلم کی روانی میں بہ نکلا.....

"جو سکھ چھجو دے چوبارے
وہ نہ بلخ نہ بخارے"

مشہور پنجابی صوفی شاعر چھجو کے بول سے مضمون شروع کر کے دیوا جی نے لکھا تھا۔

"بلخ اور بخارے میں کیوں چھجو کو اپنے چوبارے جیسا سکھ نہیں ملتا؟ کیونکہ بلخ یا بخارے میں چھجو یا غلام ہو گا یا مہمان مگر اپنے چوبارے میں اُس کا اپنا راج ہے۔ اس چوبارے میں بلخ کے قالیچے نہیں اور نہ بخارے کی مہمان نوازیاں ہیں مگر اس میں چھجو جب چاہے

آسکتا ہے جس دیوار پر چاہے کھونٹیاں گاڑ سکتا ہے اور جس کھڑکی میں سے چاہے جھانک سکتا ہے۔ اُسے اِس چوبارے کی کنجی کسی سے نہیں لینا اور نہ اس میں رہنے کے لئے کسی کا ممنون ہونا ہے۔"

"انگریز کہتا ہے تمہارا چوبارہ ٹھیک نہیں میں اسے اینٹ پتھر کا نہیں سنگِ مرمر کا بنا کر تمہیں دوں گا۔ اِسے ڈاکوؤں کا ڈر ہے مَیں نہ رہا تو تم لٹ جاؤ گے ۔۔ میں اِسے مضبوط اور مستحکم بنا کر تمہارے حوالے کروں گا۔ ہم کہتے ہیں حضور والا یہ بوسیدہ ہے تو اور شکستہ ہے تو بہر حالت میں یہ ہمیں پسند ہے، ہم اِسے ٹھیک کر لیں گے۔ حملہ آوروں کے خطروں کا ہم مقابلہ کر لیں گے، آپ کو اس کی فکر کیوں ہے۔ کیا گھنے جنگلوں میں وہاں کے چرندوں کو بھوک یا درندوں کا خطرہ نہیں ہوتا، لیکن کب وہ اپنے غیر محفوظ مسکنوں کو چھوڑ کر آپ کے دانے چارے سے بھرے محفوظ مویشی خانوں کو پسند کرتے ہیں؟ کوئی بڑے سے بڑا تحفظ یا پناہ بھی غلامی کو مسرت بخش نہیں بنا سکتا۔ اِنسان کی روح جسم تک کی پابندیوں کو قبول نہیں کرتی۔ اُس کا آخری مطالبہ آزادی ہے مُکتی ہے، نجات ہے۔"

اس طرح سوراجیہ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے دیواجی نے اُن تحاریک کا ذکر کیا تھا جو ملک کی اعتدال پسند یا انتہا پسند پارٹیاں چلا رہی تھیں اور لکھا تھا کہ سنہرے خوابوں نے اُن کا اپنا دل بھی موہ لیا ہے۔ وہ بھی ملک کو آزاد اور خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کا راستہ دوسرا ہے۔ کانگریس اور انقلابی جماعتوں نے اپنی اپنی تحریکیں چلائیں لیکن اُن کا اپنا خیال یہ ہے کہ اہلِ وطن ابھی آزادی کے قابل نہیں اور انھیں اس کا اہل بنانے کا کام بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا آزادی کا حصول۔

"سیاسی تحریکیں بھی چلتی رہیں۔" انھوں نے لکھا تھا "مگر ایک گروپ آزادی کے ایسے دیوانوں کا بھی ہونا چاہیئے، جو پنڈ کھائیوں میں جا کر ترقی کا پیغام دیں ان کی زندگی کو سنواریں آسان اور قابلِ فہم ادب شائع کریں، غلط فہمیاں رفع کریں، جدائی کو جدائی سے، تنگ کرنے والے مذہب کی جگہ ایسے دھرم کا پرچار کریں جو اختلاف کی جگہ اتفاق اور تفریق کی جگہ اتحاد پیدا کرے۔ ہماری بیماریاں بیشمار ہیں ۔۔ بری رسمیں جہالت، فرقہ پرستی، غلامانہ ذہنیت، ذات پات، چہار دیواری میں نکمی بنا کر بند کر دی جانے والی عورتیں، بے پروائی کا شکار روتے بلکتے بچے ۔۔ یہ فہرست بہت طویل ہے لیکن ہمیں کام میں لگ جانا ہے اور جتنی برائیاں بھی ہم دور کر سکیں انھیں دور کر کے اہلِ وطن کو آزادی کا اہل بنانا ہے۔ یاد رکھئے کہ آپ بہت عقلمند ہوں، یا آپ کے پاس بیشمار دولت ہو آپ بے خوف اور بیباک ہوں یا شخصی طور پر آزاد لیکن جب تک آپ کے ارد گرد بھوک، تنگ دستی، جہالت اور مفلوک الحالی ہے آپ کبھی خوش نہیں رہ سکتے......"

اور میرے سامنے دیونگر کی شکل میں دیواجی کا سپنا گھوم گیا۔ واقعی اُنہوں نے اپنے آدرشوں کے مطابق دیونگر کی تعمیر کی تھی ۔۔۔ کھلی کھلی فضا، کھلے دل سے ایک دوسرے کی امداد، ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کے لئے مشتاق باشندے، عورتوں کو چولہے چکّی کی غلامی سے انھوں نے نجات دلا دی تھی۔ وہ اپنے وقت کو مفید کاموں میں صرف کر سکتی تھیں۔ بچوں کے لئے وہ پریکٹیکل سکول کھولنے جا رہے تھے جہاں بچے اپنے رجحان کے مطابق عملی تعلیم حاصل کریں۔ جہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شہر یا اُس تجارتی ادارے میں ٹھوکریں کھانے کی بجائے کسی قسم کی الجھن یا پریشانی کے بغیر اپنے پسندیدہ محکمے یا تجارتی ادارے میں معقول جگہ پائیں اور ملک کی زندگی کو بگاڑنے کی بجائے اُسے سجائیں، سنواریں اور خوشحال بنائیں۔ سکول کی بنیاد پڑ چکی تھی اور نئے سال ہی سے دیواجی اُسے چلانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

.... ان مضامین کو پڑھتے پڑھتے دیونگر مجھے تخیل کی آفاقی فضاؤں میں پرواز کرتے کرتے زمین پر اتر کر بس جانے والا ایک خواب سا معلوم ہوا۔ جب ملک آزاد ہو گا تو ہر صوبے میں ایسے کئی نگر آباد ہو جائیں گے اور زندگی صحت مند، متمدن، بھلی اور کشادہ ہو گی۔

کھانے کی گھنٹی دوبارہ بج چکی تھی مگر میں کام میں ایسا مستغرق تھا کہ اُٹھا نہیں۔ تیسری اور آخری صف کی گھنٹی بجنے لگی تو میں اُٹھا۔ دماغ میں ابھی تک دیوا جی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ایک ضعیف العمر کو، جو دیو منڈل میں آنا چاہتا تھا مگر اپنی پیری کے باعث ڈرتا تھا انہوں نے لکھا تھا:

"دیو منڈل واقعی جوانوں کا منڈل ہے مگر جوانی صرف کم عمری کا نام نہیں۔ جوانی اُس ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں سے جدت کا شوق ختم نہ ہو گیا ہو۔ سیاہ بالوں کی کوئی شرط نہیں مگر گرم خون کی شرط ضرور ہے۔ سرد خون اس منڈل میں حرکت نہ پیدا کر سکے گا۔ خطرات سے بے خوفی ہونہار سے ملنے کا حوصلہ، دولت اور جسمانی آرام کی طرف سے بے نیازی اور بے فکری ہوائی قلعوں میں اعتقاد۔ خوابوں سے محبت، مسرور دل اور متبسم لب ــــ دیو منڈل کے ساتھ چلنے کی پہلی شرط ہے ....."

اور مجھے محسوس ہوا گویا میری رگوں میں نیا ــــ ایک دم گرم لہو دوڑنے لگا ہے میرا ذاتی غم لمحے بھر کے لئے اُس گرم خون کی روانی میں بہ گیا ہے اور میں دیوا جی کے ساتھ ہی خواب دیکھنے لگا ہوں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا ہوں......

..... سامنے سے تیرتھ رام آ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبئے، سر جھکائے، جانے کن تفکرات میں غرق! اس کے دل کی مسرت کہاں گئی۔ دیونگر کی کھلی فضا میں یہ کیوں اپنے آپ میں سکڑ گیا ہے؟ میں نے دل ہی دل میں کہا اور جب وہ میرے پاس سے گذرا تو میں نے سرخوشی سے اپنے اسی موڈ میں پکارا۔ "ست سری اکال تیرتھ بھائی!"

وہ رُکا اور جیسے کہیں بہت دور سے اُس نے میرے 'ست سری اکال' کا جواب دیا۔

"کس سوچ میں غرق ہو؟ کدھر رہتے ہو۔ تمہارے ہاں جاتا ہوں تو ملتے نہیں میرے ہاں آتے نہیں۔" میں اپنے اسی جوش میں پوچھ گیا۔

"ادھر مہمان کچھ زیادہ آ گئے ہیں۔ انھیں کی آؤ بھگت میں لگا رہتا ہوں۔ آؤں گا۔" اور اس نے قدم بڑھائے لیکن میرا جوش اُس ایک ہی ٹھنڈے چھینٹے سے بیٹھ گیا۔ میں نے مُڑ کر پوچھا "شاعری کا کیا حال ہے آج کل؟"

"لکھ رہا ہوں۔ سنا دوں گا۔"

اس بار تیرتھ رام نے مڑنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ گہرے، گھمبیر، اُمڈتے گھرتے بادل کی مانند وہ بڑھتا چلا گیا۔

دیوا جی کے مضامین کے آفاقی خوابوں میں پرواز کرتا ہوا میرا دل اُس ہوائی جہاز کی مانند جس کا انجن خراب ہو گیا ہو، تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگا۔

لیکن کسی بہت ہی ماہر ہوا باز کی طرح میں نے اُسے روک لیا۔ دیوا جی نے تو کہا تھا کہ تیرتھ رام کو لوگ پسند نہیں کرتے۔ میں نے

سوچا۔ شاید یہ کھلی فضا اُس کی نشوونما کے لئے راس نہیں آ رہی ہے اسی لئے وہ گھُٹا گھُٹا سا رہتا ہے۔ وآنی اپنے پتا کی تحریک سے پڑھ رہی ہے۔ اُسے گھر کی چہار دیواری میں بند رہ کر گھٹی نہیں بننا ہے ——— وہ آزاد فضا میں تتلی کی طرح اُڑے گی اور جب بڑی ہوگی تو نہ جانے وہ کیا بنے ——— بڑی ادیبہ، فنکارہ، مغنیہ، مفکرہ، فلسفی یا سائنس دان۔ اُسے کسی دوسرے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھتے ہوئے۔ تن کر بیٹھ گیا ہے گھُٹ کر رہ گیا ہے۔ نہ جانے اس کے دل میں میرے لئے کس قدر غصّہ ہے .... اور یہ دیونگر میں ایک بہت وسیع، عظیم اور پاکیزہ زندگی کے خواب لے کر آیا ہے .... اور تیرتھ رام کی تنگ دلی پر مجھے دل ہی دل میں ہنسی آ گئی۔

سامنے کچن کی طرف سے دیوا جی کھانا کھا کر اپنی بیوی کے ساتھ آ رہے تھے۔ ڈیوڑھی سے جو روش ڈائننگ ہال کو جاتی تھی اس میں دیوا جی کی کوٹھی سے گھوم کر آنے والی ایک دوسری پگڈنڈی مل جاتی تھی۔ دیوا جی عموماً اسی سے آتے جاتے تھے۔ دور سے ہاتھ جوڑ کر میں نے دونوں کو نمسکار کیا۔ عادت تو میری ست شری اکال کہنے ہی کی تھی، مگر دیوا جی کی بیوی 'نمسکار' ہی پسند کرتی تھیں۔ میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ مڑ گئے۔ اُس وقت اُن کے ساتھ صرف مدھو تھی، وآنی نہیں تھی۔ میں نے سامنے ڈائننگ ہال کی طرف دیکھا۔ دوسری صف میں کھانے والے تقریباً جا چکے تھے۔ تیسری صف والے تمام کے نل سے ہاتھ دھو کر اندر جا رہے تھے۔ وانی وہیں مدھوار صاحب کی لڑکی شیلا کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ میں گذرا تو باتیں کرتے کرتے اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے نگاہ نہیں اٹھائی بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں نمسکار کرتے ہوئے میں مسکرا دیا۔ وآنی کا چہرہ یکدم کھل گیا اور شیلا سے اُس کی باتوں میں اور بھی سرگرمی آ گئی۔ نل سے ہاتھ دھو کر اُن کے قریب سے گذرا تو پھر اُس نے مجھ پر ایک اُڑتی سی نظر ڈالی اور یوں مسکرائی گویا شیلا کی بات پر مسکرائی ہو۔

میں ڈائننگ ہال میں گیا۔ تیسری صف میں عموماً ملازمت پیشہ لوگ پریس کے کارکن جن کے گھروں میں کھانا نہ پکتا تھا اور ریسٹ لطیف قسم کے ویزیٹنگ آتے تھے۔ میں نے پینٹری سے اپنی تھالی کٹوری اُٹھالی اور کونے میں اپنی میز پر جا بیٹھا۔ ساوتری اور جینت کھانا لگا رہی تھیں۔ میری میز پر پریس کے منیجر آن بیٹھے تھے۔ میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ ساوتری جب دال کا ڈونگا لئے آئی تو میں نے سر اُٹھایا ——— دل دھک سے رہ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اگلی قطار کی میز پر وآنی بیٹھی تھی۔ اس طرح کہ میں سر اُٹھاؤں تو بے اختیار اُس پر نظر پڑ جائے۔ شاید وہ باہر کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اتنے دنوں سے غالباً وہ میری ہر نقل و حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ میرے بیٹھنے کے بعد ہی شاید وہ اس میز پہ بیٹھی تھی۔ مجھے اتنے دن یہاں آئے ہوئے ہو گئے تھے، لیکن میں نے اُسے اس صف میں کھانا کھاتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

بلکہ میں گھبرایا نہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ یہ چوری چھپے دیکھنا دیونگر کے قواعد کے خلاف ہے۔ کیوں نہ میں وآنی سے کھل جاؤں، تاکہ میرے متعلق اس کا سارا تجسس سارا اشتیاق ختم ہو جائے اور وہ اپنی توجہ دیگر مفید کاموں میں لگائے۔ دیوا جی کے ایک مضمون میں میں نے پڑھا تھا کہ نچلے متوسط طبقہ کی محبت اس لئے دبی دبی گھُٹی گھُٹی اور بیمار بیمار سی رہتی ہے کہ لڑکے لڑکیوں میں کھل کر باتیں کرنا تو دور رہا نگاہوں کا تبادلہ بھی ممنوع ہے۔ لڑکے لڑکیاں آزادی سے ملیں جلیں تو محبت سے لڑکے لڑکیاں جو دور سے ایک دوسرے کو بہت اچھے لگتے ہیں قریب سے مشاہدے کے بعد، بیکار ثابت ہوں اور محبت اچھی، اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو۔ سنے کیوں نہ میں اس لڑکی سے مل کر بتا دوں کہ میں اُس کے لائق نہیں ہوں۔ (حالانکہ میں نے دل میں سوچا کہ وہ میرے لائق نہیں ہے؟)

کھانا کھانے کے بعد تھالی لے کر جب میں باہر نکلا تو کچھ ویسا اتفاق ہوا کہ واتی اور میں تقریباً ایک ساتھ نل پر پہنچے۔ میں تھالی رکھ کر حمام کے نل کے نیچے ہاتھ دھونے جا ہی رہا تھا کہ واتی بھی تھالی رکھ کر آگئی۔ میں پیچھے ہٹ گیا کہ وہ پہلے ہاتھ دھوئے۔ اسی وقت میری نظر سامنے ڈیوڑھی کی طرف چلی گئی جہاں تیرتھ رام اسی طرح بغلوں میں ہاتھ دبائے گھوم رہا تھا۔ اُس کی نظریں ہماری طرف اٹھیں مگر مجھے دیکھتے ہی وہ سر جھکا کر مڑ گیا۔

نہایت شیریں لہجے میں 'تھینک یو' کہتے ہوئے واتی ہاتھ دھونے لگی۔ صابن ملتے اور ہاتھ دھوتے ہوئے اُس نے اپنی شوخ مگر گہری نظر مجھ پر ڈالی اور ذرا سا مسکراتے ہوئے بولی "آپ اُس دن گاتے ہی باہر کیوں چلے گئے تھے؟"

ہاتھ دھو کر وہ پیچھے ہٹ گئی اور رومال سے انھیں پونچھنے لگی۔ میں ہاتھ دھونے لگا۔ اس دوران میں برابر اس کے سوال کا جواب سوچتا رہا۔

"بتائیے ناشگیت جی!" اس نے اصرار کیا۔

میں ہاتھ دھو کر اسی تذبذب کی حالت میں چلنے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ بڑھی۔

"میں تمھیں کیا بتاؤں۔" آخر میں نے کہا "وہ بول بیتے دنوں کی کچھ ایسی یادیں تازہ کر دیتے ہیں کہ دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ دل کے زخم کو دوسروں کے سامنے کریدنا یوں بھی کوئی اچھی بات نہیں اور اگر کرید ہی دیا تو مسلسل رستے ہوئے اُسے دوسروں کی آنکھوں میں رکھنا اُن کے اور اپنے ساتھ ظلم کرنا ہے۔"

میں چپ ہو گیا اور ہم خاموشی سے چلنے لگے۔ پھر وہ موڑ آ گیا جہاں سے دیوا جی کی کوٹھی کو راستہ جاتا تھا لیکن وہ اُس طرف نہیں مڑتی۔

"اچھا تو واتی میں پھر شام کو آؤں گی۔ نمستے!" ہمارے عقب میں پتلی سی آواز آئی۔ ہم مڑے۔ دیکھا کہ شیاما ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔

واتی چونکی، لیکن فوراً ہی اپنی انھی بڑی بڑی پیاری گہری آنکھوں میں اُس کو ٹٹولتے ہوئے بولی "اچھا آنا۔"

وہ چپ بھی نہیں رکی میرے ساتھ چلتی رہی۔

چند قدم چلنے کے بعد اس نے کہا "میں نے اُس روز ناحق آپ پر گانے کے لئے اتنا زور دیا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچے گی تو ہرگز ایسا نہ کرتی۔"

یہ کہتے کہتے اس نے مجرمانہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ اُس کا ننھا سا چہرہ زرد سا ہو گیا اور آنکھوں میں پشیمانی جھلکنے لگی۔ بس کے اُس چہرے میں شعرا کی بیان کردہ کوئی خوبی نہ تھی لیکن اُس زرد، بیلے، پشیمان ننھے سے چہرے اور اُن غمناک آنکھوں کو دیکھتے ہوئے میرے دل کو کچھ ہونے سا لگا۔

میں نے کہا "تمھیں کیونکر معلوم ہوتا۔ میں نے تو کسی سے کچھ کہا ہی نہیں۔ پھر گیت کے بولوں میں تو درد ہے نہیں۔ اس کا ہلا بول

تو کئی بار میں انتہائی خوشی کے موقعوں پر گایا کرتا تھا۔"

اور اپنے کسی قریبی عزیز کی طرح میں اس لڑکی کو اپنی زندگی کی وہ مکمل داستانِ غم سنا گیا۔ کیسے جب میری بیوی ہنستی تھی اور اس کے دانتوں کے موتی جگمگانے لگتے تھے تو میں مست ہو کر گانے لگتا تھا۔

ترے دند موتیاں دے دانے ہسیں جان ڈگ جان گے

پھر کس طرح انہی جگمگاتے دانتوں کو میں نے قبر کے بجھتے چراغوں کی طرح ٹمٹماتے دیکھا اور پھر کس طرح ان کی وہ آخری لو میرے سینے میں ہمیشہ کے لئے زخم کرتی ہوئی بجھ گئی اور وہ بول جو خوشی کے کسی البیلے لمحے کی یادگار تھے میرے لئے ایک نوحہ بن گئے۔ وہی بول جن کو گاتے ہوئے میں مسرت سے سرشار ہو اٹھتا تھا مجھے خون کے آنسو رلانے لگے۔ گاتے ہوئے میں نے ان میں کچھ اور مصرعے جوڑ دیئے میں کوتا نہیں نہ کسی نے — علاوہ میری بیوی کے — میرے گانے کی کبھی خاص تعریف ہی کی ہے۔ لیکن جب کبھی رات کو نیند نہیں آتی اور میرا تخیل گذشتہ چند برسوں کی اونچی نیچی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے تو میں یہ ٹپے گاتا ہوں۔ جانے کیوں اور کیسے دو ایک بار ان کو گانے کے بعد مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہوتا ہے اور میری پلکیں جھپ آتی ہیں۔

ہم جا کر ڈیوڑھی میں ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے اور میں اُسے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ وانی کا چہرہ میری باتیں سنتے سنتے ایکدم سفید ہو گیا اور اس کی آنکھیں جانے کیسے بڑی بڑی سی ہو گئیں۔ لمحہ بھر میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس ننھے سے سفید چہرے کو دیکھتے دیکھتے میرے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہونے لگی لیکن اس سے پہلے کہ کچھ ہوتا میں اٹھا ڈیوڑھی کے چمکیلے رنگین فرش پر اپنے جوتوں کی آواز کرتا ہوا گھومنے لگا۔

یکایک میری نظریں اٹھیں — سامنے بڑے دروازے کے باہر روش پر تیرتھ رام ٹہل رہا تھا۔ اُس نے کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھا اور پھر سر جھکائے ہوئے چلتا گیا۔ میرے دل میں ایک عجیب سی نفرت کا جذبہ ابھر آیا۔ جب ہم کچن کے باہر کھڑے تھے اُس وقت بھی میں نے اُسے ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے اپنی طرف گھورتے پایا تھا۔ مجھے جھنجھلاہٹ ہوئی۔ کیا اس دیونگر میں بھی وہی ازلی تثلیث ہمارا پیچھا نہ چھوڑے گی جو فلموں سے لے کر ناولوں اور افسانوں تک میں ہیرو ہیروئنوں کو جکڑتی آئی ہے اور کیا میں بھی اُس مثلث کا محض ایک زاویہ بن کر رہ جاؤں گا۔ لیکن نہیں میں اُس مثلث کو توڑ کر نکل جاؤں گا — میں نے جھنجھلا کر اپنے دل میں کہا اور جس اضطراب کے تحت میں بینچ سے اٹھ کر اس بڑے محراب دار دروازے تک بڑھ آیا تھا اُس جذبے کے تحت میں پھر مڑا .....

وانی میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ آئی تھی۔ "کیوں سنگیت جی آپ کی بیوی کا انتقال کب ہوا؟" میری دلی کیفیت سے قطعی ناآشنا وانی میری زندگی کی پیچیدگی ہی میں الجھی ہوئی تھی۔ اُس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

تیرتھ رام کو جاسوسوں کی طرح اپنی نقل و حرکت پر نظر رکھتے دیکھ کر میرے دل میں جو غصہ پیدا ہوا تھا اُس نے مجھے وہاں پہنچا دیا تھا جہاں سے پھر وانی سے بات شروع کرنے کی عام سطح تک واپس آنا میرے لئے ایکدم ناممکن ہو گیا۔ میں جواب دیئے بغیر اُس کے پاس سے نکل کر ڈیوڑھی کے دوسرے سرے تک آ گیا۔ اس عرصہ میں میں نے اپنی ذہنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ وانی میرے پاس پہنچی تو میں نے کہا "یہی تقریباً چار ماہ ہوئے۔ میرے یہاں آنے سے ایک ماہ پہلے۔"

ہم باہر نکل آئے۔ تیرتھ رام گھوم کر سامنے ڈائننگ ہال کو جانے والی روش پر ہو لیا۔

"اسی لئے آپ اتنے اُداس اُداس اور کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔" تیرتھ رام کی طرف دھیان دیئے بغیر واقی نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں کہا: "آپ ہمارے ہاں آیا کیجئے۔ ریڈیو سنا کیجئے۔ چلئے ان سہگل کے گانے ہونے والے ہیں۔ آپ کو سنوائیں۔"

میں ترجمہ کے لئے مضامین یا افسانے لینے یا ترجمہ شدہ چیزیں دینے کے سلسلے میں ایک یا دو بار دیوا جی کے پاس گیا تھا — وہ بھی اُن کے دفتر میں۔ اُن کے گھر بس صرف پہلے دن گیا تھا پھر نہیں گیا۔ کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ ایک آدھ بار کوٹھی کے پاس سے گزرتے وقت اُن کی اہلیہ سے 'نمسکار' کا تبادلہ ہوا تھا بس۔

واقی کے ساتھ ساتھ جب میں کوٹھی پر پہنچا تو دیوا جی کے کمرے سے ریڈیو پر سہگل کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ جھلنا جھلاؤ...؛ برآمدے میں واقی کی ماں کھڑی اپنے ملازم وچتر سنگھ سے جوتوں پر پالش کرا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بوٹ پالش کا نہیں کسی فوجی محاذ کا معائنہ کر رہی ہوں۔

"تپیا ماں کدھر ہے؟" اُنھوں نے واقی سے پوچھا۔

"پھرا نے کو کہہ گئی ہے۔ آج سہگل کے گانے ہو رہے ہیں دِلّی سے۔ سنگیت جی کو گانے کا بہت شوق ہے، میں انھیں لے آئی۔"

اُنھوں نے میری طرف نگاہ اُٹھائی اور میں نے ایک قدم بڑھ کر کہا: "نمستے ماں جی۔"

"ماں جی!" واقی کی ماں نے حیرت اور قہر بھری ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ بولیں: "کیا میں اتنی بوڑھی ہوں کہ ماں جی کہلاؤں؟"

غصہ اور ہنسی۔ دونوں ہی جذبے بجلی کی ایک دوسری کو کاٹتی لہروں کی مانند میرے ذہن میں کوند گئے۔ میں اپنی ماں کو جو غالباً ان دیوی سے عمر میں ایک دو سال چھوٹی ہی ہوں گی، محبت سے ماں جی کہتا تھا اور اس وقت سے کہتا آیا تھا جب اُن کی عمر بیس پچیس سال ہی کی ہو گی۔

"مجھے یہاں سب ماتا جی کہتے ہیں۔" اُنھوں نے کہا۔

"جی! میں تو اپنی ماتا جی کو بھی ماں جی کہتا ہوں۔"

مگر انھوں نے یہ نہیں سنا اور وچتر سنگھ کو صابن سے برش دھو کر دھوپ میں رکھنے کی ہدایت کی۔

اُن کا پہلو کاٹ کر واقی دیوا جی کے کمرے کی طرف بڑھی اور اُس نے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اندر کمرے میں دیوا جی ریڈیو کے نزدیک لمبے کوچ پر آرام سے دراز تھے۔ اُن کے پیر قریب رکھی تپائی پر ٹکے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور سہگل کا نغمہ کانوں میں مسلسل رس گھول رہا تھا۔

ہمارے جانے پر اُنھوں نے آنکھیں کھولیں۔ واقی نے وہی بات دہرا دی۔ اُنھوں نے قریب کے کوچ کی طرف اشارہ کیا اور حسبِ سابق آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت دوسرا گیت شروع ہوا۔

"سنو سنو رے کرشن کالا"

اور اُس کے ساتھ ہی گویا دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں نہیں نہ کرشن کا بھگت تھا نہ راس لیلاؤں کا قائل۔ میں گرو نانک کی بانی اور دسویں پادشاہ کے احکامات پر ایمان رکھنے والا۔ اپنی ہلکی سی لامذہبیت کے باوجود پانچوں ککوں (کچھا، کڑا، کیس، کرپان، کنگھا) کے استعمال میں کبھی کوتاہی نہ کرنے والا — کرشن لیلا میرے لئے قطعی بے کشش تھی مگر جانے کیوں تب بھی نے لوچ، درد اور حلاوت سے بھرپور سہگل کی لہری، بھری لرزتی سی آواز میں "سنو سنو ری کرشن کالا" سنتا تو جانے مجھے کیا ہو جاتا۔ میں بازار میں چلتا چلتا رک جاتا اور پورا گیت سنے بغیر آگے نہ بڑھتا۔ ایک بار میں نے اُس کے بول بھی لکھے تھے۔ کاغذ پر لکھے اِن بولوں میں نہ وہ رس تھا نہ جادو۔ سنو سنو ری کرشن کالا بھی ہوئی یہ بات اچھی نہ لگتی تھی۔ 'رے' کی جگہ 'او' اور 'کالا' کی جگہ 'کالے' ہوتا تو شاید میرے پنجابی کانوں کو وہ بول اچھا لگتا لیکن سہگل کے منہ سے چار چھ بار سن کر اب یہی اچھا لگنے لگا تھا۔

گانا جاری تھا:

کیے رادھا بھی موہے لکنکن
کیے رادھا بھی موہے......

گیت میں کلنکی جیسا لفظ...... مگر اُس شیریں آواز میں وہ بھی کتنا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ جی چاہتا تھا وہ بار بار دھرائے جائے۔ اُسے سن سن کر دل نہ بھرتا تھا۔

اور پھر وہ "تان" — وہ لرزتی کانپتی دل کو چیرتی ہوئی "تان":

چنڈی داس کہے — سکھی ہے
جس تن لاگے وہ تن یہ دکھڑا جانے

گیت جاری رہا اور جی چاہتا رہا کہ وہ تان وہ سوز وہ ارتعاش ابدی ہو جائے۔ سہگل گاتا رہے اور میں سنتا رہوں۔

مگر گیت تو ختم ہو گیا ہاں اُس کا سحر فضا پر طاری رہا۔ میں نہیں جانتا کوئی گانا کبھی مجھے اتنا اچھا لگا ہو گا یا سہگل نے خود بھی اتنا اچھا گایا ہو گا۔ تبھی سنا ریڈیو میں اناؤنسر اعلان کر رہا تھا۔

"ہم لاہور سے بول رہے ہیں۔ اب ہمارا تعلیمی پروگرام شروع ہوتا ہے۔"

دیوا جی نے ریڈیو کا سوئچ گھما دیا۔

میں اُٹھا، اسی طرح سحرزدہ سا۔

"کیوں؟" واٹی نے ہونٹوں میں پوچھا۔

"گاتے تو شاید......" میرے ہونٹوں سے بھی اسی لہجے میں نکلا۔

"دیا جی ولی ہو لگا وہ۔ ابھی سہگل کے گانے ہو رہے ہیں۔" میری بات پوری سنے بغیر وہ اپنے پتا سے تقریباً چمٹ گئی۔

دیوا جی کی پیشانی پہ خفیف سی شکنیں ابھر آئیں۔ انہوں نے مجھ پہ ایک ایسی نظر ڈالی جس میں ہلکی سی چڑچڑاہٹ اور بے بسی تھی۔ پھر اُن پہ قابو پا کر انہوں نے ریڈیو کا سوئچ گھما دیا اور اچانک سہگل کی وہی شیریں لرزاں آواز کمرے میں گونج اُٹھی اور دانی کے زور دینے

پر کچھ عجیب سی بیزاری اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میں پھر بیٹھ گیا۔

باتیں.... باتیں.... باتیں

مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی عار نہیں کہ ان چار مہینوں میں دیونگر سے مجھے بیحد پیار ہو گیا تھا۔ وہاں وانی تھی اور اُس کی سحر زدہ حیران آنکھوں میں میرے لئے بیکراں محبت اور ہمدردی تھی یا وہاں دیواجی تھے۔ جو میرے غمزدہ دل کو سکون عطا کرتے تھے یا پھر دیونگر کے مکینوں میں ایسی رواداری، محبت اور پیار تھا جو کہیں اور نظر نہیں آتا ـــ نہیں، ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ وانی کی اُس محبت اور ہمدردی نے میرے اُس عارضی سکون کو جو دیونگر کے ابتدائی قیام میں مجھے حاصل ہوا تھا کچھ عجیب سی بیقراری میں بدل دیا تھا۔ دیواجی کے مصاحبین کی بڑی بڑی باتیں بھی میرے من کے ساگر پہ بے ڈنٹھل کنولوں کی طرح تیرتی ہوئی بہ جاتیں اور دیونگر کے مکین! ـــ جوں جوں میں اُن سے واقف ہوتا گیا۔ مجھے محسوس ہوتا گیا نہ اوپر سے نظر آنے والی مسکراہٹوں اور ظاہری محبت اور باہم حوصلہ افزائی کے دعووں کے پس پردہ اسی رشک و حسد اور رقابت و عداوت کا زہر کار فرما ہے جس نے عام شہری زندگی کو مسموم کر رکھا ہے۔ لیکن دیونگر کے قرب و جوار کی خوبصورتی، اُن دیہاتی صبحوں اور شاموں کی وہ سونے گلاب اور زعفران سے کھلی ملائی رحمت، ندی کنارے کی وہ تنہائی کیریر کی اُن ٹھگنی جھاڑیوں کے پھولوں کی وہ جلتے انگاروں کی سی سرخی ـــ ان سب نے میرے دل کو کچھ یوں جکڑ لیا تھا کہ جب بھی دماغ کہتا کہ میں نے دیونگر آ کر غلطی کی تو دل وہاں سے جانے کے محض خیال سے بھی ملول ہو جاتا۔

دیونگر میں میرا قیام مسلسل ہے، یہ خیال اچانک اُس دوپہر کو پہلی بار میرے ذہن میں آیا جب وانی ریڈیو سنانے کے بہانے مجھے اپنے گھر لے گئی تھی ـــ اُس کی ماں نے 'ماں جی' کہنے پر مجھے ڈانٹ دیا تھا وانی نے سہگل کے گانے پھر سے لگانے کے لئے اپنے باپ سے اصرار کیا تھا تو اپنی لڑکی کے اس طرح زور دینے پہ دیواجی نے اگرچہ ریڈیو کا سوئچ گھما دیا تھا مگر میری طرف دیکھتے ہوئے اُن کی پیشانی پہ چڑچڑاہٹ کے باعث شکنیں اُبھر آئی تھیں۔ اور دیونگر کے اُس کھلے پن پہ پڑنے والے غیر مرئی دباؤ اور اس ظاہری وسعت کی تہ میں چھپی تنگ نظری کی ایک جھلک مجھے نظر آ گئی تھی۔

دیواجی کے ہاں میں پھر کبھی نہ گیا۔ یہ صحیح ہے کہ وانی ڈائننگ ہال میں ضرور اسی میز پہ بیٹھتی ـــ اسی کرسی پر جہاں سے وہ میری طرف دیکھ سکے اور کوشش کرتی کہ سب اُٹھتے ہی اُٹھے مگر اُس روز کی طرح میں نے پھر کبھی اُسے ملنے کا موقعہ نہ دیا تھا۔ شام کو کوٹھیوں کے سامنے کی سڑک پہ ٹہلنا چھوڑ کر میں ندی کنارے جانے لگا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ ندی کنارے کی وہ تنہا سیریں دیونگر کے اُس قیام کی حسین ترین یادگار ہیں۔

پتّو کی موت کے بعد شہر کے ہنگاموں سے میرا دل گھٹنے لگا تھا۔ دراصل پتّو جب تک زندہ تھی اُس وقت تک شہر کے شور و شغب ہنگاموں اور تنہائی کا کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ اس سارے شور و شغب کے اوپر جیسے پتّو کی پیاری پیاری باتیں میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں اور وہ ساری گہما گہمی پتّو کی موہنی صورت کے آگے ایک دم غائب ہو جاتی تھی۔ دفتر میں کام کرتے ہوئے دوستوں، دشمنوں، افسروں یا چپراسیوں

سے باتیں کرتے ہوئے بھی آنکھیں اُس کو دیکھتی رہتی تھیں۔ دو چار بچے ہو جاتے تو ممکن ہے نون تیل لکڑی کی فکر شادی کے ابتدائی ایام کی اس پُر نشہ رومانیت کو ختم کر دیتی لیکن تین برسوں کے ان تین پل بن کر گذر جانے والے دنوں کی رفاقت کے بعد جب وہ شیریں ادا اور دل نشیں صورت بیماری کے ہاتھوں لاغر ہوتے ہوتے ایک دم نحیف و نزار اور مسخ ہو کر موت کی گود میں چلی گئی تو محسوس ہوا گویا شہر کا شور میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہا ہے اور بھیڑ میرا گلا گھونٹے دے رہی ہے۔ دیونگر کے ویرانوں کی وہ خاموشی مجھے اتنی اچھی لگتی کہ کبھی کبھی جی چاہتا اسی میں تحلیل ہو جاؤں — جسم کو چھوڑ کر اُس کے ذرے ذرے میں سما جاؤں۔

کبھی نہر بھری ہوتی۔ پل کے پاس پانی قیامت کا شور کر رہا ہوتا۔ لیکن میل بھر آگے وہ یوں بہتا کہ بہتا دکھائی نہ دیتا۔ میں پیر نیچے ڈال کر اُس کے کنارے بیٹھ جاتا۔ درختوں کے سائے لہروں کی روانی پر تیرتے ہوئے کانپتے اور میں بیخود سا دیکھتا رہتا۔ پھر مغربی اُفق میں غروب ہوتا ہوا سورج پانیوں کو گلابی کر دیتا اور وہ رنگ لہروں پر چمک اُٹھتا۔

کبھی نہر کا پانی بند ہوتا۔ ریتیلی سطح شام کے جھٹپٹے میں چمکتی تو میں نیچے اُتر جاتا۔ ٹھنڈی ریت پر بہت دور چلا جاتا۔ کبھی کنارے پر بیٹھا بیٹھا گانے لگتا یا بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو اس پار سے اُس پار جاتے ہوئے دیکھتا۔ اگلی بھیڑیں جدھر کو جاتیں باقی سب انہیں کے پیچھے اسی طرف کو چل پڑتیں۔ اور کبھی اگلی بھیڑوں کو غلط راستے پر چلتے دیکھ کر گڈریئے کان پکڑ پکڑ کر انہیں صحیح راستے پر چلاتے۔ ڈنڈے سے پیٹ دیتے تو وہ "با ..... با" کرتی ہوئی بھاگتیں۔

لیکن کچھ دن بعد مجھے نہر کی سیر چھوڑنی پڑی اور وہ رنگین تنہا اُداس اُداس شامیں اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ صرف میرے حافظہ کی زینت بن کر رہ گئیں۔

شام کا وقت تھا۔ نہر پر پہنچا تو مغرب میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ سردی سر شام ہی اُتر آئی تھی اور میں اونی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ دفعتاً مغرب کی سمت نظر اُٹھاتے ہی دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی۔ کتنا حسین اور ناقابل بیان منظر تھا۔ — دور بہت دور کھجور کے تنہا درخت کے پیچھے جو اس بیابان کے سینے پر کھینچ دیا ہوا سا کھڑا تھا آفتاب غروب ہو رہا تھا — بڑا بڑا اور پیلا پیلا — درخت کا اُوپری سرا یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس پیلی کندنی تھالی پر نقش ہو۔ نہر کے پانیوں پر سورج کا عکس، اوپر آسمان پر چھائے ہلکے سفید بادلوں پر اُس کا رنگ اسی رنگ سے رنگی ہوئی دور تک پھیلی نہر کی پٹڑی اور تنہا میں ...... کچھ دور چل کر بیٹھ گیا اور اچانک گانے لگا۔ اپنا وہی پرانا پسندیدہ گیت "وندھ موتیاں دے دانے، نہیں سہگی کی شہد آگئیں آواز میں بستی ہوئی وہ کرشن کے پریم میں پاگل گوپی کی پکار — جو یقیناً لہر رہی ہوگی، چھوٹی عمر کی ہرنی — گیت ہجر کا تھا لیکن جانے کیوں مجھے وہ درد آگیں معلوم نہ ہوا۔ دل کی اُمنگ میں جیسے بیابان کی اس ویرانی کو بھرتا ہوا میں گا اٹھا۔

سنو سنو رے کرشن کالا

سنو سنو رے کرشن کالا

معاً کہیں قریب ہی قہقہے کی آواز آئی — خاموش فضا میں یکایک بج اُٹھنے والی نقرئی گھنٹیوں کی مانند جوان لڑکیوں کے قہقہوں کی آواز

میں چونک اُٹھا۔ نہر کی پٹری پر وانی، شیاما اور مدھو جانے کس بات پر ہنستی ہنستی دُہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ایک اٹھارہ بیس سال کا نوجوان تھا۔

اُنھیں گذارنے کے لئے راہ دینے کو میں ایک طرف ہٹ گیا۔ لیکن ان کی ٹولی میرے قریب آ کر رک گئی۔

"دلجیت یہ ہیں سنگیت جی — بہت ہی اچھا گاتے ہیں۔" اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلاتے اور نفاذ کے ساتھ ذرا سے جھوٹے ہوئے وانی نے اپنے ساتھی نوجوان سے میرا تعارف کرایا اور پھر مجھ سے بولی "یہ ہے دلجیت میرا بھائی، گورنمنٹ کالج میں پڑھتا ہے چھٹیوں میں آیا ہے۔"

لمحہ بھر کو میں وانی کی اُن ایک دم پھیل جانے والی بڑی بڑی آنکھوں کو اور بہت ہی اچھا گاتے ہیں، کہتے ہوئے دونوں طرف جھول جانے کو دیکھتا رہا۔ کتنا پیارا تھا۔ دل جیت تو تمہارا نام ہونا چاہیے تھا — وانی — یہ بھی کوئی نام ہے — لیکن میں نے کچھ کہا نہیں، محض مسکرا کر ہاتھ بڑھا دیا۔

"آپ تو آگے جا رہے ہوں گے۔" میں نے مسکراتے اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں کنی کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔"

"ہم بھی مڑ رہے ہیں۔" وانی نے خود مڑتے ہوئے اور اپنے ساتھ ہی اپنی بہن اور سہیلی کو موڑتے ہوئے کہا۔

کچھ دور ہم خاموش چلتے رہے۔ یکایک سامنے تیرتھ رام آتا دکھائی دیا۔ "آؤ بھائی تیرتھ رام!" قریب آنے پر میں نے اس سے کہا۔

"آپ لوگ چلئے۔ میں ابھی آگے جاؤں گا۔"

اچانک دلجیت نے وانی سے کہا۔ "سنگیت جی سے گانا ہی سنواؤ۔"

وانی کیا جواب دیتی۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہرہ اداس ہو گیا۔ زبان حال سے گویا کہہ رہی تھی ——— میں جانتی ہوں آپ کو دکھ ہو گا۔ میں کیسے درخواست کروں۔ مگر میرا دل یہ کہہ رہا ہے۔ کاش آپ گا سکتے!

اور میں گانے لگا۔

لیکن دوسرے دن سے میں نے نہر پر جانا چھوڑ دیا۔ سردیوں کی شام وقت سے پہلے ہی اتر آتی۔ دن بھر کام کرتا۔ شام کو کمرے میں بیٹھنے سے جی گھبراتا۔ سڑک پر چہل قدمی پہلے ہی ترک کر چکا تھا۔ اب نہر پر جانا بھی چھوڑ دیا تو سوال پیدا ہوا کہ آخر شام کو کہاں جائیں۔ چنانچہ میں نے شام کو نندلال کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ تمام گھروں میں صرف نندلال کے ہاں جانا مجھے کیوں پسند آیا شاید اس لئے کہ وہی ایک ایسا گھر تھا جہاں درحقیقت مجھے کھلا پن نظر آتا۔ ساوتری نے جو ایک بار مجھے "ویر جی" کہا تو پھر ہمیشہ بہن اور وہ بھی بڑی بہن کی طرح پیش آتی رہی۔ شام کو جب میں وہاں جاتا تو وہ فوراً سٹوو جلا کر چائے بنا دیتی۔ اگر مجھے چائے کے وقت پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو وہ نندلال کو مجھے بلانے بھیج دیتی۔ وقت گذارنے اور کچھ اس احسان کے بار کو ہلکا کرنے کی غرض سے میں اُسے انگریزی پڑھانے لگا تھا۔ بھرا پُرا کنبہ تھا۔ کسی قسم کی گھٹن نہیں تھی۔ تپتے جلتے صحرا میں اچانک ہریالی اور پانی دیکھ کر اس کی ٹھنڈک میں جسم کو ڈھیلا چھوڑ دینے میں جو راحت ملتی ہے، وہی مجھے اس گھر میں کچھ پل گذار کر ملتی۔ دلنگر کے ریگستان میں نندلال کا گھر میرے لئے نخلستان تھا۔

لیکن مجھے اور ساوتری کو — اور یوں مجھے اور نندلال کو — قریب لانے والی ایک دوسری چیز تھی — دیونگر کی ماتاجی یعنی دیواجی کی اہلیہ محترمہ سے گہری نفرت۔ ساوتری، اس کا شوہر اور میں وانی کی ماں کی نظروں میں کوئی بلند درجہ نہ رکھتے تھے۔ اپنے متعلق اُن کے جذبات کا مجھے اسی روز علم ہو گیا تھا جب میں وانی کے ساتھ ریڈیو سننے چلا گیا تھا بلکہ بعد میں مجھے دیکھتے ہی اُن کی پیشانی پر جو شکن پڑ جاتی تھی اس سے میرا شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔ ساوتری کی باتوں سے بھی اندازہ ہوا کہ انھیں بھی ماتاجی کچھ اتنا اچھا نہیں سمجھتیں۔

ماتاجی اروڑہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک متوسط طبقے کے تاجر کی بیٹی تھیں۔ دیواجی جب رڑکی سے امتحان میں کامیاب ہو کر انجینئر ہوئے تو ان کے مکان کا ایک حصہ کرائے پر لے کر رہنے لگے تھے۔ وہیں ان میں محبت ہو گئی۔ اگرچہ دیواجی کے لئے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آتے تھے اور وہ تاجر اپنی لڑکی کسی سکھ نوجوان سے بیاہنے کو تیار نہ تھے پھر بھی دیواجی نے تمام مشکلات پر قابو پا کر اُن سے شادی کر لی تھی۔ ساوتری کہتی تھی کہ ماتاجی کے اثر سے ہی دیواجی نے بال کٹوا دیئے تھے اور ماتاجی کی وجہ سے ہی انہوں نے لڑکیوں کے نام وانی اور مدھو رکھے تھے — "دیواجی جب کبھی رنجیت کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو پیار سے اُسے رنجیت سنگھ کہتے ہیں۔" ساوتری نے ایک روز بتایا۔ "ماتاجی اُسے ہمیشہ رنجیت کمار کہہ کر پکارتی ہیں۔" ...... اگرچہ یہ بات اُسے پسند آنی چاہیے تھی مگر معلوم ہوتا تھا کہ ساوتری کو اس بات کا افسوس ہے کہ دیواجی نے بال کیوں کٹوائے یا کیوں انہوں نے لڑکے لڑکیوں کے نام ہندوانہ رکھے۔ اسے دیواجی پر اُن کی بیوی کے اس تسلط سے چڑ تھی۔

"دیواجی تو بہت بھلے آدمی ہیں — بڑے بڑے آدرشوں کے خواب دیکھنے والے لیکن یہ ماتاجی انھیں ہمیشہ اسی کیچڑ میں لا گھسیٹتی ہیں جہاں سے وہ اُٹھ کر اُڑنا چاہتے ہیں۔" ایک دن ساوتری نے مجھ سے کہا — "دیواجی نے دیونگر بسایا، کہ وہ دنیا کے سامنے ایک ایسا آدرش نگر پیش کر سکیں جہاں انسانوں کے درمیان کوئی نفاق و تفریق نہ ہو، چھوت چھات نہ ہو، نفرت و کدورت نہ ہو، نہ رو رعایت ہو اور نہ خوشامد و چاپلوسی — لوگ کھلے پاکیزہ ماحول میں رہیں اور بلند آدرشوں کے لئے کام کریں۔ اگر دیواجی کی چلتی تو شاید سچ مچ ایسا نگر بس جاتا لیکن یہاں چلتی تو ماتاجی کی ہے اور انھیں جو صبح اُٹھ کر نمستے نہ کرے، دن میں دو ایک بار جا کر ان کے دربار میں حاضری نہ دے، وہ اس کی دشمن بن جاتی ہیں۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ اٹھ سینک اس سے استعفیٰ دے کر جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ دیواجی نے انھیں ماتاجی کے کہنے پر اپنے رشتہ دار بھرے ہیں۔ دیونگر 'دیوبانی' کے خریداروں اور دیومنڈل کے ممبروں کے پیسوں سے بنا ہے مگر ماتاجی اپنے آپ کو اس کی بلا شرکت غیرے مالکہ یا اس سلطنت کی ملکہ سمجھتی ہیں۔ اس وقت بھی مدھوار صاحب اور کلبیر سنگھ ان کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ساوتری بولی "ہم میں سے کسی کو بھی نہ تو تیجو آتی ہے نہ خوشامد بھاتی ہے۔ یہاں وہی رہ سکتا ہے جو ان سب باتوں میں ماہر ہو۔ سو وہ ہم سے ناراض ہیں اور وہ جنم جنم کا بھوکا تیرتھ رام سارا دن وہیں پسارا رہتا ہے۔ اتنا بڑا سکینڈل ہو گیا لیکن ......"

"سکینڈل؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں آپ کے آنے سے کچھ ہی دن پہلے یہاں دیونگر کا سالانہ جلسہ ہوا تھا۔ اس میں دیواجی کا لکھا ہوا ڈرامہ 'راج کماری دیما' سٹیج کیا گیا۔ تیرتھ رام راجہ بنا تھا اور وانی راج کماری۔ اس ڈرامے کے بعد ہی وانی اور تیرتھ رام کے متعلق کئی طرح کی باتیں ہونے لگیں۔

اچھا خاصا سکینڈل ہو گیا۔ سب نے بہت برا مانا۔ اسے سیناسے نکالنے کی تجویز بھی رکھی گئی۔ لیکن وہ جا کر ماتاجی کے چرنوں پہ گر پڑا کہ وانی تو میری لڑکی جیسی ہے۔ میں نے بچی سمجھ کر اُسے گود میں لیا تھا۔ اور ماتاجی کے کہنے سے دیواجی نے یہ تجویز منظور نہ ہونے دی۔"

چند لمحے ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ساوتری بولی۔ "اور اُس وقت سے تیرتھ رام کسی دوسرے گھر میں زیادہ آتا جاتا نہیں۔ نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیسا ندیدہ پن ہے کہ کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔ بس ماتاجی کی خوشامد میں لگا رہتا ہے یا بھوت پریتوں کی طرح آوارہ سڑکوں پر گھومتا رہتا ہے۔

لیکن دیواجی کے گھر زیادہ حاضری دینے میں تیرتھ رام کا یہی مقصد نہ تھا کہ وہ اپنی خدمت کی دھاک بٹھا کر رہے بلکہ وہ ماتاجی اور دیواجی کو میرے خلاف بھڑکا کر وانی کے بہی خواہ کی حیثیت سے اپنا کھویا ہوا اعتماد بھی بحال کرنا چاہتا تھا۔

یہ بات مجھے مدھوار صاحب سے معلوم ہوئی۔ نندلال سے میں نے کبیر سنگھ اور مدھوار صاحب کی اتنی تعریفیں سنی تھیں کہ دیوا جی ماتاجی اور چند دیگر سینکوں کی خفگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی میں مدھوار صاحب کے ہاں آنے جانے لگا تھا۔ نندلال کے گھر آتے جاتے میں جان گیا تھا کہ دیو سینکوں میں، جو بظاہر فوجی سپاہیوں کی طرح ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں، درحقیقت رفتہ رفتہ ایک خلیج پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ دو پارٹیاں ہو گئی ہیں۔ ایک کی اکثریت ہے اور دوسری اقلیت میں ہے۔ اکثریت میں دیواجی اندراں کے خوشامدی شامل ہیں، جو دیو سینا کے اصولوں کا نہیں، دیواجی یا دیوی جی (نندلال مذاق میں ماتاجی کو دیوی جی کہا کرتا تھا) کی خواہشات کا خیال رکھتے ہیں۔ اقلیت میں وہ سینک ہیں جو دیو منڈل کے اصولوں پر عمل کرنا اور اُن کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور مدھوار صاحب اس اقلیت کے لیڈر ہیں۔

ایک روز میں اُن سے ملنے گیا تو وہ پھٹ پڑے۔ "بڑے بڑے ارادے اور بڑی بڑی امیدیں لے کر ہم دیو منڈل کے ممبر بنے تھے۔ ہمیں دولت یا عزت کا لالچ نہیں تھا۔ ہم تینوں اچھی ملازمتوں پر تعینات تھے۔ لیکن اپنی کم سے کم ضروریات سے قطعی بے فکر ہو کر بلند آدرشوں کے لیے زندگی کو وقف کر دینا اور ایسی فضا میں سانس لینا جہاں مخلص ساتھیوں کی رفاقت ہمارے دلوں کو کشادہ اور شخصیتوں کو مضبوط بنائے ـــــ اسی آدرش نے ہمیں اس ویرانے کی طرف کھینچا تھا۔ لیکن یہاں سال بھر گزارنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ بظاہر یہ نگر بہت حسین سہی، مگر اُس کی روح ویسی ہی تنگ، مرطوب اور گندی ہے۔"

"میں روح کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ یہاں کے لوگوں سے میرا کوئی خاص ربط ضبط نہیں۔ لیکن اس کا ظاہر تو بہت ہی حسین اور پاکیزہ ہے۔"

"اس لیے تو پڑے ہیں۔" وہ بولے۔ "ورنہ کب کے چلے جاتے۔ دیو بانی کے مضامین پڑھ کر ہم سمجھتے تھے کہ دیواجی بڑے پیمانے پہ سینک چاہتے ہیں جو ہمارے ملک ہی میں نہیں، دنیا بھر میں کردار کی تعمیر کا آدرش رکھیں گے۔ انسانوں کو باہم سمجھنے میں مدد دیں گے۔ دماغوں کا گوڑا کرکٹ دور کر کے اُن میں نئی روشنی بھر دیں گے۔ لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ نہیں ہو گا۔ ممکن ہے اس ویرانے میں ہم ایک بڑا شہر آباد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ جہاں نئی دلّی کے تمام عیش و آرام بھی میسر ہوں۔ لیکن وہ نصب العین جسے پیش نظر رکھ کر یہ شہر بسانا شروع کیا گیا تھا، غالباً اس کی بنیادوں ہی میں دفن ہو جائے گا۔"

مدھوار صاحب خاصے دلا ٹند تھے۔ پینتالیس پچاس کی عمر، گورے چٹے مگر انھیں خوبصورت نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کا ماتھا بہت چھوٹا تھا۔ اگرچہ وہ بالوں کو پیچھے کی طرف سنوارتے تھے، تاہم پیشانی ڈیڑھ دو اِنچ سے زیادہ نہ نکلتی تھی۔ تیکھی ناک، اُبھرے تھے۔ بلند قد اور گھونگریلے، کھچڑی بال۔ وہ دھوتی پر قمیص پہننے کے عادی تھے۔ اُن کے چہرے پر سیب سیلوں جیسی خشکی اور رو کھا پن تھا۔ اُن کے والد کے پاس کاٹیلس کی ایجنسی تھی —————— انہوں نے خوب دولت کمائی تھی۔ اُن کے والد کی خواہش تھی کہ مدھوار صاحب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر کاروبار دیکھیں مگر مدھوار صاحب ۱۹۲۱ء کی تحریک آزادی میں جو ایک بار جیل گئے تو تلاشِ حق میں کئی اداروں اور آشرموں سے ہوتے ہوئے دیونگر آ پہنچے۔ دیو منڈل کے حساب کتاب کی دیکھ بھال اُن کے ذمہ تھی جس میں کلبیر سنگھ اُن کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ زندگی کی بیشمار ٹھوکریں کھانے اور ایک کے بعد دوسرا ادارہ چھوڑنے کے باوجود اب بھی اُن کے اندر کی آگ ویسی ہی شعلہ فگن تھی۔ اب بھی وہ پرانے آدرش وادی، جذباتی، مستعد اور جوشمند تھے۔ کہیں کوئی وسوسہ نہیں، کہیں کذب و افترا نہیں۔ سکھ دکھ سے بے پروا وہ جو راستہ بھی پسند کرتے، اُس پر بڑھتے جاتے۔ مگر کورے آدرش شعرا کے تخیل میں ہوں تو ہوں، دنیادار کے تخیل میں نہیں ہوتے۔ پھول تک پہنچنے کے لئے کانٹوں سے ہاتھ بچانا ناممکن ہے۔ لیکن مدھوار صاحب کو اس کی فکر نہ تھی کہ ان کے ہاتھ کانٹوں سے چھلنی ہو جائیں گے —— جہاں پھول کی خواہش ہی کمزور ہوئی یا جہاں آدرش کے رنگ میں رنگے پھولوں کی جگہ کاغذی پھولوں سے گلدان سجانے کا آدرش بنا، انہوں نے ادارے کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ آدرش کے پھول کی تلاش میں یکے بعد دیگرے انجمنوں اور اداروں کو چھوڑتے چلے آئے تھے۔

مَیں نے مدھوار صاحب سے ملاقات کے بعد کچھ ایسے ہی خیالات اُن کے بارے میں قائم کئے۔

"یہ اچھے سیوکوں کو اور کارکنوں کو نہیں چاہتے۔" مدھوار صاحب نے کہا تھا۔ "آپ خود کو دیکھئے۔ آپ آئے تھے تو دیوا جی نے آپ کے کام اور مزاج کی تعریف کی تھی۔ مگر ابھی جنرل میٹنگ میں آپ کے خلاف تجویز آئی ہے۔"

"میرے؟"

"ہاں تیرتھ رام اور ہرموہن نے تجویز پیش کی ہے۔"

"میرے خلاف کیا شکایت ہے؟"

"یہی کہ آپ دیو منڈل کی آزاد فضا کے لائق نہیں اپنے ہی خول میں بند رہتے ہیں۔ دیو منڈل کی سرگرمیوں میں حصّہ نہیں لیتے۔"

"پھر کیا طے ہوا؟"

دیوا جی نے اس تجویز کو آئندہ کبھی غور کرنے کے لئے ملتوی کر دیا۔ ملتوی تو کر دیا ہے، لیکن کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی آپ سے خوش نہیں ہیں۔ شاید آپ نے اُن کے ہاں حاضری کم دی ہے یا ان کی اہلیہ آپ سے ناخوش ہیں۔" پھر انہوں نے خاص طور پر نصیحت کی۔ "دیکھئے، اگر آپ کو یہاں رہنا ہے تو آپ کو ماتا جی، ہرموہن سنگھ، تیرتھ رام، سدرشن سنگھ وغیرہ سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ نند لال یا ہم سے وہ اتنے خوش نہیں ہیں۔"

میری طبیعت نہایت مکدر تھی - یہ تو میں جان گیا تھا کہ تیرتھ رام مجھ سے کیوں ناراض ہے، لیکن اس کی شکایت کو دور کرنا میرے امکان میں نہ تھا - ماتاجی کو یوں بھی نمسکار کرنا مجھے پسند نہ تھا - اُس عورت کا گھمنڈ مجھے بہت چھچھورا اور اوچھا معلوم ہوتا تھا -

ملازموں کے کوارٹروں میں ایک روز پریس کے فورمین منیجر سنتوکھ سنگھ کے پاس بیٹھا تھا کہ ماتاجی کا ذکر آ گیا۔ سنتوکھ سنگھ نے کہا "ماتاجی کو تو تھاپا نے ٹھیک کیا تھا "

"تھاپا نے، کون تھاپا ؟"

"راما تھاپا!"

"چوکیدار ؟"

"ہاں ہاں ــ ماتاجی یہاں کے سب دیوسینکوں اور ملازموں کو اپنا ذاتی ملازم سمجھتی ہیں -" سنتوکھ سنگھ نے کہا "اور امید کرتی ہیں کہ جب وہ اُن کے سامنے آئیں تو انھیں نمسکار کریں ـــ ایک بار نہیں جتنی بار بھی ملیں - چاہتے تو دیواجی بھی یہی ہیں - مگر اُن کا طریقہ دوسرا ہے - اگر کوئی سینک یا ملازم انھیں نمسکار نہ کرے تو وہ خود اُسے پہلے نمسکار کرتے ہیں - بار بار اُسے نمسکار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ انھیں دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ دیتا ہے - لیکن اگر ماتاجی کو کوئی نمسکار نہ کرے تو اُن کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں - سینکوں یا بڑے ملازموں سے تو وہ کچھ نہیں کہتیں مگر چھوٹوں کو ڈانٹ دیتی ہیں - راما تھاپا کو ایک روز انہوں نے ڈانٹ دیا کہ تو اپنے آپ کو نواب سمجھتا ہے سلام نہیں کرتا تب تھاپا نے تڑسے جواب دیا کہ ہم کام کا نوکر ہے سلام کا نہیں - اس کے بعد ماتاجی نے پھر کسی کو اس بات کے لئے نہیں ڈانٹا لیکن جو انھیں نمسکار نہیں کرتا اُس کے خلاف ہو جاتی ہیں - انہوں نے تو راما تھاپا کو نکلوانے کی بڑی کوششیں کیں - کئی بار آدھی آدھی رات کو جاسوس چھوڑے کہ دیکھیں وہ سوتا تو نہیں - مگر وہ فوجی ڈسپلن میں پلا ہوا آدمی ہمیشہ اپنی ڈیوٹی پہ مستعد پایا گیا - ایک بار وہ ایک ماہ کی رخصت پہ گیا تو انہوں نے ایک سکھ جوان کو رکھ لیا - اُسی ماہ دو چوریاں ہو گئیں - تھاپا اب بھی ماتاجی کو کبھی نمسکار نہیں کرتا، لیکن جب تک اُس کے جسم میں جان اور ہاتھوں میں بندوق ہے وہ یہاں ہے اور رہے گا -

راما تھاپا کے اس رویہ سے میں ایسا متاثر ہوا کہ اسی دن سے میں نے ماتاجی کو نمسکار کرنا ترک کر دیا - وہ دیواجی کے ہمراہ ہوتیں تو میں دونوں کو ایک ساتھ ہاتھ جوڑ دیتا، لیکن اگر وہ تنہا سامنے پڑ جاتیں تو میں بغیر اُدھر دیکھے نظریں جھکائے یا دوسری طرف دیکھتا ہوا گذر جاتا - رہا ہرموہن سنگھ تو ادھر تیرتھ رام اُس کے ساتھ ہر وقت چپکا رہتا تھا - ہرموہن کے حقیقی قہقہے (کیونکہ وہ اکثر تیرتھ رام سے مذاق کیا کرتا) اور تیرتھ رام کے کھوکھلے قہقہے (کیونکہ وہ ہرموہن کو خوش کرنے کے لئے ہنستا) بھی کبھی کبھار سنائی دے جاتے - چنانچہ مجھے ہرموہن سے ملنے اور اُن ملاقاتوں کو قربت میں تبدیل کرنے میں بہت جھجک ہوتی -

ہرموہن سنگھ خاصا خوب صورت آدمی تھا - اوسط قد، گورا رنگ، دھکتے ہوئے رخسار اور توانا جسم - لیکن وہ تقریباً جاہل تھا ہمیشہ بھونڈے مذاق کیا کرتا تھا اور چونکہ دور کے رشتہ میں وہ دیواجی کا بھتیجا ہوتا تھا اور ڈیری کا انچارج تھا - اس لئے اس کی حیثیت اس سلطنت کے صوبہ دار سے کم نہ تھی - ویسا ہی اس کا دماغ بھی تھا - رہی اُس کی سردارنی تو جتنا ہرموہن خوب صورت تھا اُتنی ہی وہ بدصورت تھی - قد میں ہرموہن سے ایک ڈیڑھ بالشت لمبی، اُسی مناسبت سے موٹی، باہر کو نکلے ہوئے بڑے بڑے دانت اور

چندھی آنکھیں۔ دن میں کسی وقت بھی دیکھئے، یہی محسوس ہوگا کہ ابھی سو کر اُٹھی ہے۔ ایک دو بار میں اُن کے ہاں گیا بھی مگر سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اُن محترمہ سے کیا باتیں کروں۔ چنانچہ ہر مومن سے بھی رابطہ بڑھانا مشکل تھا۔ مدھوار صاحب کی بات میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ اس لئے میں نے طے کیا کہ اگر یہ لوگ نہیں چاہتے تو میں یہاں کیوں رہوں؟ کیوں نہ میں واپس چلا جاؤں۔ اول تو اس ماحول سے شہر کا ماحول برا نہیں، پھر اگر وہاں جی نہ لگا تو گاندھی آشرم چلا جاؤں گا۔ روپے کی ویسی فکر نہیں۔ وہ کام نہ رہا تو دوسرا کر لوں گا۔

لیکن جب میں نے یہ طے کیا اور میں دیواجی سے ملنے چلا تو معاً میرا جی اُداس ہو گیا۔ دیونگر کے ان ویرانوں کا سکون بخش حسن مجھے چاروں طرف سے باندھنے لگا۔ برسات کے بعد کی رنگین صبحیں شامیں، چاندنی راتوں کا جادو اور اندھیری راتوں کا سناٹا اور پھریریوں کے دھندلے آسمان پر سورج کی زرد زرد دھوپ اور صبح شام شبنم سے بھیگی بھیگی پگڈنڈیاں — انہیں چھوڑ کر پھر اس ہنگامہ خیز ماحول میں جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں توہین برداشت کرتا ہوا یہاں رہا تو یہی سب حسن و دلکشی میرے لئے سوہانِ روح ہو جائے گی اور میری راتوں کی نیند حرام کر دے گی۔۔۔۔۔۔ اور میں دیواجی سے ملنے کے لیے چل پڑا۔

دیواجی اس وقت گنبد میں بیٹھے تھے۔ گنبد کے دروازے پر پردہ پڑا تھا، نیچے فرش پر ٹاٹ، اس پر دری، اس پر قالین اور قالین پر کوچ۔ میں نے پردہ ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ دیواجی اپنی کرسی پر سیدھے بیٹھے لکھنے میں مشغول تھے۔ مدھوار صاحب نے اُن کے مضامین کے پیارے پیارے موضوعات کے سرچشموں کا راز بھی مجھے بتا دیا تھا۔ وہ عموماً "ریڈرس ڈائجسٹ" اور اسی طرح کے مغربی رسائل سے مضامین ترجمہ کر کے "دیوبانی" میں دیا کرتے تھے۔ "ڈیل کارنیگی" بھی انہیں پسند تھا جس نے دوستوں ہمسایوں اور سماج کو مسخر کرنے کے نفسیاتی نکات بتائے ہیں۔

پردہ چھوڑ کر میں ایک لمحہ کو وہیں رکا رہا۔ دیواجی کے ڈرائنگ روم یا دفتر میں جانے میں مجھے بڑی جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ماتاجی کو صفائی کا خبط تھا۔ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے ملازم موجود تھا۔ وہ دن کا بیشتر وقت کمروں، دروازوں، کپڑوں، برتنوں، غرضیکہ کسی نہ کسی چیز کی صفائی میں مشغول رہتی تھیں۔ دیواجی کے آفس کی صفائی تو وہ دن میں دو بار خود کرتی تھیں۔ دری پر اگر کوئی جوتوں کے ساتھ جاتا تھا تو اُن کی پیشانی پہ شکن آجاتی تھی۔ ایک بار پتمر جیٹی کے نمبردار دیواجی سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے اگرچہ جوتے باہر اُتار دیئے تھے، تاہم دری پر اُن کے قدموں کے نشان بن گئے۔ اس بات کو لے کر ماتاجی مہینوں اُن کا مذاق اڑاتی رہیں۔ انہیں وجوہ کی بنا پر مجھے وہاں بیٹھنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔

آخر آگے بڑھ کر میں نے پردہ اُٹھایا اور جوتے اُتارتے ہوئے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

دیواجی نے میری طرف دیکھا۔ غالباً وہ بہت مصروف تھے۔ اُن کی پیشانی پر خفیف سی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ مگر میں جوتے اُتار کر اندر بڑھ گیا تھا۔ میرے چہرے پر یقیناً میرے دل کے غم و غصہ کی جھلک ہو گی۔ میں نے دیکھا کہ اُن کی پیشانی کی شکنیں مٹ گئیں اور ایک بہت ہی پیاری سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

"فرمایئے کیسے آئے؟"

پل بھر میں خاموش کھڑا رہا۔ جذبات کی اتنی شدت تھی کہ اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"بیٹھیے بیٹھیے۔"

میں بیٹھ گیا۔

"کہیے کیسے آئے؟"

"میرے خلاف میٹنگ میں کوئی تجویز منظور ہوئی ہے؟" میں نے گویا بم پھینکا۔ دیوا جی خاموش رہے اور میری طرف دیکھتے رہے۔

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ دیو سینک مجھے پسند نہیں کرتے اور میری موجودگی یہاں اچھی نہیں سمجھی جاتی۔"

میں لمحہ بھر رکا۔ دیوا جی بدستور خاموش رہے۔

"میں نے آپ کو پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ نرنجن سنگھ جی نے آپ کی اور دیو نگر کی بے حد تعریف کی تھی اور میں سکون کا متلاشی تھا۔ میں اپنے کام میں سستی یا کوتاہی نہیں کرتا۔ آپ نے جو بھی کام دیا اُسے جلد از جلد اور بہتر سے بہتر طور پر کرنے کی میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے۔ رہی یہ بات کہ میں اپنے ہی خول میں بند رہتا ہوں، مغرور ہوں یا بدکردار ہوں تو یہ تمام الزامات جھوٹے اور غلط ہیں۔ تاہم میں آپ کو اپنی وجہ سے کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ مجھ سے مطمئن نہیں ہیں تو میں کل ہی چلا جاؤں گا۔"

دیوا جی کے لبوں پر ایک اور بھی پیاری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں، ایک قرارداد کمیٹی کے سامنے آئی تو ہے۔" وہ بولے۔ "لیکن قرارداد آنے ہی سے تو پاس نہیں ہو جاتی۔"

"مگر سینکوں کے عتاب کی تلوار تو میرے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہے گی۔" میں نے کہا۔ "ایسے ماحول میں سکون سے کیسے کام ہو سکتا ہے۔"

دیوا جی کی مسکراہٹ کچھ اور پھیلی۔ "بھائی آپ کہیں بھی جائیں سکون آپ کو پڑا ہوا نہیں ملے گا۔ آپ کو اُسے خود اپنی کوشش سے حاصل کرنا ہوگا۔ آپ جنگل میں بھی چلے جائیں، جہاں آپ کو انسان کی شکل تک دکھائی نہ دے تو بھی آپ کو بلا ترد د سکون نہ ملے گا۔ فطرت سے سمجھوتہ کر کے یا اُس پر فتح پا کر آپ کو سکون پانا یا جیتنا ہوگا۔ پھر انسانوں کی بستی میں، جہاں ہر ایک اپنی شانتی کے لئے جد و جہد کرتا ہے اور سب کی کوششیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں آپ کو بھی کوشش کرنی پڑے گی۔"

وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے ایک لمحہ کو رُکے۔ لیکن میں خاموش سنتا رہا۔

"میں نے آپ سے ایک دن پہلے بھی کہا تھا کہ یہاں اٹھارہ بیس گھر ہیں۔ آپ کو سب سے مل جل کر رہنا پڑے گا۔ ورنہ آپ کا رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں نے کوشش تو کی۔ نند لال کے ہاں میں جاتا ہوں۔ ایک دو بار دوسرے لوگوں کے ہاں بھی گیا ہوں۔ لیکن یہ تو آپ بھی مانیں گے کہ دوستی یک طرفہ نہیں ہو سکتی۔ کوئی مجھے چاہے گا تو میں بھی اُسے کیوں نہ چاہوں گا۔"

دیوا جی آہستہ سے ہنسے۔ بہت ہی آہستہ سے کہ اُن کی ہنسی کمرے کے باہر سنائی نہ دے۔

"نہیں تو آپ غلطی پر ہیں۔ کوئی آپ کو چاہے...... میں اُسے اُلٹ دیجیے تو...... آپ کسی کو چاہیں تو کیا آپ کو وہ نہ

جاہیے گا؟

مجھے فی الفور کوئی جواب نہ سوجھا۔ لیکن میں نے کہا "میں تو باہر سے آیا ہوں۔ دیو منڈل اور دیو نگر کے لئے بالکل نیا ہوں۔ دیو نگر کا تو اصول ہی پریت اور پیار کے حلقے کو وسیع کرنا ہے۔ اگر دیو نگر کے رہنے والے تعصب اور نفرت سے کام لیں گے تو اُن کا مشن کیونکر کامیاب ہوگا۔ انھیں تو ہر آنے والے کو اپنے حلقے میں لینا چاہیئے۔ میری بات چھوڑیئے میں تو باہر والا ہوں۔ یہاں تو میں دیو منڈل کے ممبروں میں بھی وہ پیار و محبت نہیں دیکھتا جو دیو منڈل کا نصب العین ہے۔"

میری بات سن کر دیوا جی کے چہرے پر ہلکی سی سیاہی دوڑ گئی اور اُن کی پیشانی پر نہایت خفیف سی لکیریں اُبھر آئیں جو اُن کے چڑچڑے پن کی مظہر تھیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُن کے لبوں پر پھر وہی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"دیکھو بھائی" انہوں نے کہنا شروع کیا۔" دیو نگر کے رہنے والے درحقیقت تو کسی دیو نگر سے آتے نہیں۔ اسی تنگ، اندھیری گلیوں اور محلوں سے آتے ہیں جہاں سارا ہندوستان بستا ہے۔ وہی عصبیت اور نفرت، وہی رشک و حسد، عداوت اور کدورت، خوشامد اور غیبت، انا اور پندار اُن میں بھی ہے —— یہ سب برائیاں پلک جھپکتے تو رفع نہ ہوں گی۔ انھیں رفتہ رفتہ دور کرنا ہوگا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ جیب سے رومال نکال کر انھوں نے اپنے چشمے کو پونچھا پھر وہ میز کی طرف مڑے اور انہوں نے فاؤنٹین پن اُٹھا لیا۔

لیکن میں ابھی بیٹھا تھا۔ وہ پھر میری طرف مخاطب ہوئے "آپ جائیے اور سکون کے ساتھ کام کیجیے"۔ وہ بولے۔ "کمیٹی میں کیا ہوتا ہے کیا نہیں ہوتا، اس کی فکر نہ کیجیے۔ سب سے مل جل کر رہئے۔ سیوا کی سرگرمیوں میں دل سے حصّہ لیجیے۔ آپ ریڈیو سننے آنے لگے تھے۔ میں خوش ہوا تھا۔ پھر آیا کیجیے۔ تیرتھ رام وغیرہ کے ساتھ آپ خوش نہیں ہیں تو یہاں چلے آیا کیجیے۔ وجیت آرہا ہے، وانی ہے، مدھو ہے اُن کے ساتھ کھیلیے۔ اپنے خول سے باہر نکلئے۔ ایک دوسرے کے خلاف لوگ کیا کہتے ہیں، اسے نہ سنئے۔ ایک دوسرے کی تعریف میں جو کہا جائے اس پر توجہ دیجیے۔ عیبوں کی بجائے ساتھیوں کی خوبیاں دیکھئے انھیں دل سے پیار کرنا، رواداری برتنا اور اُن کے کام آنا سیکھئے۔ یقیناً اس سے آپ کو خوشی بھی حاصل ہوگی اور سکون بھی۔"

اور وہ اپنے آگے رکھے ہوئے مسودے کو دیکھنے لگے۔ میں اُٹھا اور بولا "میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں۔ آپ کی باتوں سے میرے دل کو بے حد اطمینان حاصل ہوا ہے میں آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

گنبد سے باہر نکلا تو میرا دبی تکدر تقریباً مٹ گیا تھا اگرچہ دیوا جی کی باتوں سے میری پوری تشفی نہ ہوئی تھی — میری حالت سردیوں کے اُس آسمان کی مانند تھی جس پر صبح گہرے سیاہ بادل اور دھند چھائی ہو لیکن دوپہر ہوتے ہوتے بادل چھٹ جائیں دھند صاف ہو جائے اور بہت ہلکی دھوپ آفتاب کے وجود کی شہادت دے ...... سامنے نئے بنے ہوئے بیڈمنٹن کورٹ میں کھیل پورے زور شور سے جاری تھا اور یہ موہن و گوبند میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ شٹل کاک جال کے اُوپر ہی اُوپر اِدھر سے اُدھر اڑ رہی تھی۔ ساتھ کے کورٹ میں وانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ وہاں جاؤں لیکن معاً میری نظر تیرتھ رام پر گئی جو خاموش کھڑا تھا۔ اور میں

ٹھٹک گیا۔ پل بھر کو اپنی مسکراہٹ کی جھلک دکھانے والے سردیوں کے آفتاب پر پھر دہی دھند اور بادل چھا گئے۔

اسی وقت ایک یکہ دربان کی کوٹھی کے پاس آکر رُکا اور بیڈ منٹن کورٹ میں کھیل ہوتے دیکھ کر خوشی سے قہقہہ لگاتا ہوا دلجیت اس میں سے کودا۔ ماتاجی اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کھڑی شاید اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُس کے اُترتے ہی وہ اس طرف بھاگیں۔ مگر دلجیت ماں کی طرف نہیں گیا، بلکہ بانہوں سے کوٹ اُتارتا ہوا سیدھا بیڈ منٹن کورٹ کی طرف بھاگا۔

اور میں نے حیران ہو کر دیکھا کہ دیونگر کو اپنی سلطنت اور دیونگر کے رہنے والوں کو اپنا غلام سمجھنے والی وہ مغرور عورت بالکل لونڈیوں کی طرح آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کا اترتا ہوا کوٹ تھامنے کو بڑھی اور اس کا کوٹ لیتے لیتے وہ کئی قدم اُس کے ساتھ بھاگتی چلی گئی۔

کوٹ اپنی ماں کو سونپ کر دلجیت رکا نہیں، بلکہ بھاگتا چلا گیا۔ ہر موہن نے آگے بڑھ کر اسے اپنا ریکٹ دے دیا اور اب گوربچن اور دلجیت میں کھیل شروع ہو گیا۔ شٹل کاک اور بھی تیزی سے جال کے اُوپر اڑنے لگی تھی۔

"ناشتہ کر لو، پھر کھیلنا۔ ناشتہ کر لو پھر کھیلنا۔" کہتے ہوئے ماتاجی ذرا فاصلے پر کھڑی اصرار کرتی رہیں، مگر پھر دلجیت کو کھیل میں محو دیکھ کر کوٹ کو جھاڑتی ہوئی واپس آ گئیں۔

جانے کیوں میرا دل خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے بھر گیا۔ سردیوں کا وہی آسمان اور وہی دھند کے مہین پردے میں سے جھانکتے ہوئے آفتاب کی درخشانی ۔ ۔ ۔ ۔

پریس اور ٹیوب ویل ہوتا ہوا، دیونگر کے سامنے کی بنجر زمین پر تنہا کھڑے عظیم برگد کے نیچے سستاتا ہوا کپاس کے بھرے کھیتوں کا طواف کرتا ہوا ——— غرضیکہ سارے دیونگر کا چکر لگا کر جب میں لوٹا تو کھیل میں اور بھی سرگرمی آ گئی تھی۔ گوربچن دیونگر کا بیڈ منٹن چیمپین تھا مگر دلجیت بھی شہر کے گورنمنٹ کالج کا کھلاڑی تھا۔ وہ کھیل میں گوربچن سے ذرا بھی کمتر نہ تھا۔ دیواجی بھی پہنچ گئے تھے اور نئی دیگر دیوسینک بیڈ منٹن کورٹ کے گرد کھڑے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا۔ دلجیت کے شاٹ یا پلیسنگ پر جو شور ہوتا گوربچن کے کھیل پر اُس میں کمی آ جاتی۔ حوصلہ افزائی کی دھنکی ایک کے سے اپنی جھنکار سے روئی کو چھت تک اُڑا دیتی، مگر دوسرے کی باری پر واہ واہ کے پھاہے کچھ ہی بلندی تک اُڑ کر رہ جاتے۔

میں خاموش ایک طرف کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے بازو کو چھوا۔

میں چونک کر مڑا۔ پروانی تھی ——— ہاتھ میں ریکٹ اور آنکھوں میں وہی وسعت گہرائی اور دعوت!

"آئیے ناشگیت جی۔ ہماری بازی ختم ہو گئی۔ اب آپ کھیلئے۔"

"لیکن مجھے تو بیڈ منٹن کچھ خاص آتا نہیں۔ ریکٹ بھی میرے پاس ۔ ۔ ۔ ۔" لیکن وانی نے میری ایک نہ سنی اور میری آستین تھامے آہستہ سے مجھے کھینچتی ہوئی لے گئی۔

کورٹ میں پہنچ کر اپنا ریکٹ اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک طرف کھڑی ہو کر، میرے بیڈ منٹن کھیل پر میری

حوصلہ افزائی کرنے لگی۔

شاید دوسری بازی شروع تھی کہ میرا دھیان دور برگد کی طرف چلا گیا۔ جانے کب تیرتھ رام وہاں سے کھسک گیا تھا اور دور کہیں اُفق پر ڈراتی سی کالی گھٹا سا گھیرا تھا۔

کرشمہ

جاڑوں کی ٹھنڈ اور پالے کے باعث ڈیری کی بھینسوں اور گایوں کا دودھ سوکھ گیا۔

دودھ کے ساتھ مکھن کی مقدار بھی کم ہو گئی۔ کچن میں ہر دوسرے تیسرے شلجم کی ترکاری پکتی تھی۔ دلو سینا آٹھ روپے ماہوار فی کس کھانے کے لیتی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کا ابھی آغاز ہی تھا اور قیمتیں اتنی چڑھی نہ تھیں۔ آٹھ روپے میں دو روپے فی کس بہنا بچا لیتی تھی، کیونکہ جو سبزی دیونگر کے کھیتوں میں پیدا ہوتی وہی کچن میں پکتی تھی۔ اُن دنوں شلجموں کی افراط تھی اور دیوتاؤں کو ہر دوسرے تیسرے بھی حیاتین سے پُر ترکاریاں کھانے کو ملتی تھیں۔ شروع شروع میں جو بھی چاہتا ایک آدھ پیالہ اور مکھن کی ایک ٹکیہ لے لیتا۔ شلجم کی ترکاری بالکل حلوے کی طرح پکتی تھی۔ میں نے بھی پہلی بار دوسروں کی دیکھا دیکھی اُس میں مکھن کی ایک ٹکیہ ڈالی تو واقعی بڑی لذیذ ہو گئی۔ پھر تو میں ہر بار جب بھی شلجم کی ترکاری پکتی اُس میں مکھن ضرور ڈالتا۔ لیکن جوں جوں بھینسوں اور گایوں کا دودھ گھٹتا گیا مکھن کی ٹکیاں کم ہونے لگیں۔ کسی کسی کو انکار بھی ہونے لگا۔ جبھی نند لال اور مدھوار صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب مکھن کی تقسیم ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ کون دیوا جی کے قریب ہے اور کون دور۔ جو قریبی لوگ تھے انھیں مکھن کی ٹکیہ (اگر ہوتی) ضرور ملتی۔ پہلے دیوا جی اور ان کا کنبہ، پھر ہر موہن سنگھ، پھر گوبچن سنگھ پھر، ہرنام سنگھ پھر تیرتھ رام — کچھ اس ترتیب سے مکھن کی تقسیم ہوتی۔

آہستہ آہستہ دودھ بھی کم ہو گیا۔ جسے سیر بھر ملتا تھا اُسے تین پاؤ ملنے لگا — تخفیف کی زد میں پہلے وہی لوگ آئے جو اقلیت میں تھے — بالفاظِ دیگر جن سے ہر موہن سنگھ اور اس کے خوشامدی خوش نہ تھے۔

باتیں چھوٹی چھوٹی تھیں — دودھ مکھن سبزی ترکاری کھیل کود — لیکن انہی ذرا ذرا سی باتوں سے دلوں میں شگاف پڑتے جا رہے تھے اور منڈل کے نصب العین پر سے سینکوں کا اعتقاد اُٹھتا جا رہا تھا۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہ تھی مگر واقعہ تھا کہ دیونگر میں ایسی تفریق تھی اور جن مقاصد کے پیشِ نظر دیونگر کا قیام عمل میں آیا تھا وہ ریگستان میں خشک ہوتی ہوئی پانی کی دھاروں کی مانند نظر آتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ میں ناحق دیونگر آیا۔ نرنجن سنگھ جی کچھ دن وہاں جا کر قیام کرتے تو انھیں بھی دیونگر کے پریم اور پریت کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ اور یوں رفتہ رفتہ میری ہمدردی اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی جا رہی تھی جنھیں دیونگر میں اچھا نہ سمجھا جاتا تھا جو دیوا جی اور اُن کے خوشامدی رشتہ داروں اور سینکوں کی عنایات سے محروم تھے، لیکن جو اصولوں پر جمے رہنے کو سمجھوتے بازی سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔

لیکن دیونگر کے بانی اور اُن کے پیارے سینک جہاں میرے دل سے دور ہوتے گئے وہیں اُن کی بیٹی آہستہ آہستہ — غیر شعوری طور پر — میرے قریب آتی گئی۔ پھر ایک ایسی بات ہوئی کہ اُس کے اور اپنے درمیان جو فاصلہ میں نے اپنی کوشش سے قائم کر رکھا تھا، یک ختم ہو گیا۔

ہوا یہ کہ انھیں دنوں میں نے ایک مسلمان لڑکا ملازم رکھا۔ یوں مجھے ملازم کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن دیواجی نے 'دیوبانی' کا اُردو ایڈیشن بھی نکالنا شروع کر دیا تھا اور مجھے اُس کا ایڈیٹر بنا دیا تھا۔ ایڈیٹر تو کیا میں دراصل مترجم تھا کیونکہ میرا کام زیادہ تر اُن کے پرانے مضامین کے ترجمے کر کے ایک آدھ اُردو نظم یا افسانے کی چاشنی کے ساتھ اُنھیں دیوبانی کے اُردو قارئین کے سامنے پیش کر دینا تھا کہ اگر دیواجی کے شیریں مضامین کی کثرت سے قاری کا جی بھر جائے تو وہ ان سے اپنے منہ کا ذائقہ بدل لے۔

دیو منڈل اور دیوبانی کا دفتر ڈیوڑھی کے درمیان کی میانی میں تھا۔ دفتر میں میرے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ کاتب بھی نیچے کے تہ خانے میں بیٹھتا تھا جس میں دیواجی نے روشن دان بنوا دیا تھا۔ اُس روشندان کے باوجود روشنی کے لئے وہاں دن کو لیمپ جلانا پڑتا تھا۔ اس لئے میں اپنے کمرے میں ہی ترتیب اور ترجمے کا سارا کام کرتا تھا۔

سردی اپنے شباب پر تھی — دھند، ہوا اور بوندیاں نہ ہوں تو کہرا اور شبنم۔ صبح اُٹھتے تو برآمدے بھیگے ہوتے اور پگڈنڈیوں پر پاؤں پھسلتے۔ کئی بار دن دن بھر جھڑی لگی رہتی۔ مجھے دیواجی سے مضمون لینے کے لئے کوٹھی نمبر ۱ کے گنبد تک جانا پڑتا تھا۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر مسودہ تیار کر کے کاتب کو پہنچانا؛ لکھی جانے پر کاپیوں کو پڑھنا اور تقسیم کے بعد انھیں جا، فرلانگ کے فاصلے پر ٹیوب ویل کے پاس پریس میں پہنچانا پڑتا۔ ان سب میں مجھے بڑی پریشانی ہوتی اور ایسے وقت میں اکثر سوچتا کہ اگر کوئی چپراسی چھوکرا ہوتا تو میرا بہت سا وقت بیکار ضائع ہونے سے بچ جاتا۔ میں نے ایک روز نندلال سے اپنی اس مشکل کا ذکر کیا۔ وہ بولا "آج کل دفتر کا انتظام بھی ہر موہن کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ تم پر مہربان ہوتا تو اس کا کچھ نہ کچھ انتظام کر دیتا۔ لیکن اب ایسا ہونا مشکل ہے۔ ہاں تم چاہو تو ایک دیہاتی چھوکرا اس کام کے لئے رکھ لو۔ دو تین روپے ماہوار پر مل جائے گا۔"

"صرف دو تین روپے پر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا۔"

"تو بھئی انتظام کر دو۔ بڑا احسان ہو گا۔"

اگرچہ میں نندلال سے کہہ چکا تھا لیکن جانے کیوں مجھے اس کی بات پر یقین نہ ہوا یا مجھے ملازم کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی اس لئے وہ بات میرے ذہن سے اُتر گئی۔

جنوری کے شاید آٹھ دس روز گذر چکے تھے۔ اُن دنوں آسمان عموماً ابر آلود رہتا تھا۔ صبح کے وقت آسمان پر بادل اور زمین پر کہرا چھایا ہوتا۔ دوپہر کے قریب دھند اور بادل چھٹ جاتے مطلع صاف ہو جاتا اور سورج کسی مدقوق کی سی سفید مسکراہٹ، ہونٹوں پر لئے جیسے تھوڑی دیر کے لئے جھانکتا اور پھر اُنھیں بادلوں میں روپوش ہو جاتا۔ دیہاتی کہتے کہ سورج نکلتا بعد کو ہے، ڈوب پہلے جاتا ہے۔ دن کے دس بجے ہوں گے۔ میں کمرے میں کھڑکی کے قریب بیٹھا لکھ رہا تھا۔ ایک رات پہلے بارش ہوئی تھی مگر دن بھر

پانی بند رہا تھا اور وہ پگڈنڈیاں جن پر صبح پاؤں پھسلنے لگے تھے شام ہوتے ہوتے ٹھیک ہوگئی تھیں۔ رات آسمان صاف ہوگیا تھا۔ اور ایک ڈیڑھ بجے رات کے قریب چاند اور دو ایک تارے بھی نکل آئے تھے۔ لیکن صبح ہوئی تو آسمان پھر ابر آلود تھا۔ سورج کب نکلا یہ معلوم ہی نہ ہوا۔ پھر یکایک مشرق کی سمت آسمان گہرا نیلا ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیلا پن بڑھ کر ہمارے سروں پر چھا گیا۔ اور بارش ہونے لگی۔

میری کوٹھی کے مغرب کی جانب کھیت ہی کھیت تھے۔ نزدیک ہی بیتھر جیٹی کا سردن سنگھ نہ جانے کس بارہ ماسی گیت کی صرف ایک ہی کبت بار بار گا رہا تھا:

ماگھ ماریا دشرتھ پھرسے بھوندا

کتھوں لیائے تے اُنہاں پلائے پانی

لیکن پانی زور سے گرنے لگا اور راجہ دشرتھ کی مصیبت بھول کر وہ بیلوں کو پناہ کی تلاش میں ہانک لے چلا اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاں اُس کے ہل نے لکیریں ڈال دی تھیں وہاں پانی بھر آیا۔

باہر کوٹھی کا لان تالاب بن گیا اور اُس میں بُلبلے پھوٹنے لگے۔ بُلبلے پھوٹنے کے سلسلے میں نندلال کے ماتحت کام کرنے والے کسان مزدور کہتے تھے کہ بُلبلہ اُسی وقت پھوٹتا ہے جب ہوا نہیں ہوتی اور ہوا نہیں ہوتی تو بادل گھس جاتے ہیں اور بادل گھل جاتے ہیں تو جھڑی لگ جاتی ہے اور پانی پر بُلبلے پھوٹنے لگتے ہیں۔

میں کمبل اوڑھے دروازے میں آکھڑا ہوا۔ سامنے بتولی کے، آم، جامن اور بیر سب خاموش کھڑے تھے۔ مشرق کی جانب کنوئیں کے برگد پر مین گدھ اپنی ننگی گردنوں کو پروں میں چھپائے گویا سو گئے تھے۔ برگد کے نیچے ایک بھینس کھڑی خاموش جگالی کر رہی تھی۔ پانی برگد کے گھنے پتوں کو چیر کر اُس کی پیٹھ پر گرنے لگا تھا۔ وہ بھی پھریری لیتی تھی اور کبھی اپنی دُم گھما کر پیٹھ پر جھٹک دیتی تھی۔ لیکن اُوپر سے گرتی ہوئی دھاریں مکھیاں تو تھیں نہیں کہ ہٹ جاتیں اس لئے وہ دُم ہلانا چھوڑ کر پھر جگالی کرنے لگتی۔

میں وہیں کھڑا چوکھٹ سے ٹیک لگائے جاڑوں کی اُس دیہاتی برسات سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ سامنے سڑک پر ہلکی سی خمیدہ کمر والی ایک بڑھیا اور اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بارہ تیرہ سال کا لڑکا آتے دکھائی دیئے۔

بارش میں بھیگتے ٹھٹھرتے ہوئے یہ کس مصیبت میں گھر سے نکل پڑے ہیں —— میں نے سوچا۔ لیکن جب وہ میری کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئے تو میں چونکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ برآمدے میں آ گئے۔ دونوں نے جھک کر سلام کیا۔ لڑکے نے قمیص کے نیچے ململ کے بڑے سے کوٹ کو چھوٹا کرایا ہوا ایک کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی اندر کی جیب سے اُس نے ایک پرچہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

اُس کے بھیگے ہاتھوں سے پرچے کی تحریر کچھ مٹ گئی تھی پھر بھی میں نے پڑھ لیا۔ نندلال نے بھیجا تھا کہ اس چھوکرے کو ملازم رکھ لو۔ تین جماعتیں پڑھا ہے۔ غریب بیوہ کا لڑکا ہے۔ جی لگا کر کام کرے گا۔ تین روپے ماہوار تنخواہ دے دینا۔

ایک لمحے کے لئے میں نے لڑکے کی طرف دیکھا —— گورا چٹا رنگ، تیکھے خدوخال، قدرے خمیدہ گردن اور جھکی ہوئی آنکھیں۔

"کیا نام ہے؟"

"غلام نبی۔"

"آگے کیوں نہیں پڑھتے ؟"

اِس سوال کا جواب ماں نے دیا کہ گھر میں تو کھانے کو بھی نہیں ہے پڑھے کہاں سے ۔

"جو تین روپے ماہوار تم اس کے لئے چاہتی ہو وہ میں دے دوں گا ۔ ہر ماہ پہلی تاریخ کو یہ آ کر لے جایا کرے ۔ مگر تم اسے سکول میں بھیجتی رہو" میں نے کہا ۔

لیکن مسئلہ اتنا آسان نہ تھا ۔ ماں نے بتایا کہ پڑھائی کی فیس اور کتابیں یہ سب کہاں سے لائے گا ۔ اس لئے اچھا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو یہ کمانے لگے ۔

معاً مجھے پولیٹکل سکول کا خیال آیا جو دیوا جی نے باقاعدہ تو نہیں (کیونکہ اُس کی عمارت مکمل نہ ہوئی تھی) مگر بے قاعدہ شروع کر دیا تھا اور اُس میں نہ صرف دیو سینکوں بلکہ ملازموں کے بچے داخل تھے ۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ۔ لڑکا ہونہار ہے کیوں نہ اسے سکول میں داخل کرا دیا جائے ۔ اور میں نے کچھ مطمئن ہو کر بڑھیا سے کہا " ماں تم فکر نہ کرو ۔ اس کی نوکری کا بھی انتظام ہو جائے گا اور پڑھائی کا بھی ۔ کل سے اسے بھیج دینا ۔"

وہ دونوں سلام کر کے مُڑے ۔ بڑھیا نے سلام کے ساتھ دعائیں بھی دیں ۔

"ابھی رُکو ۔ بارش ختم ہو جائے تو جانا ۔"

"ہمیں تو ابھی تین میل جانا ہے سردار جی ۔ اب پانی کچھ کم ہو گیا ہے ۔ بڑھ گیا تو مشکل ہو گی ۔"

اور وہ دونوں چلے گئے ۔

جھڑی لگی ہوئی تھی اور پانی بیحد ننھی ننھی بوندوں میں برس رہا تھا ۔ میں وہیں برآمدے میں کھڑا اُن دونوں کو جاتے دیکھتا رہا اور اُس وقت تک کھڑا رہا جب تک دونوں ماں بیٹے دو سیاہ نقطے سے بن کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے ۔

ڈیوٹر کی سردیوں کی وہ برساتی صبح میرے ذہن پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گئی کیونکہ سردی کی اُس بارش میں اُس ماں اور بچے نے محض تین روپے ماہوار کی ملازمت کے لئے تین میل سے آ کر میری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا تھا ۔ جس طرح شیشوں کی بڑی بڑی کھڑکیوں والے کھلے، روشن، اور ہوادار کمروں میں رہنے والے کبھی تصور نہیں کر سکتے کہ یہ کھڑکیاں ــ معمولی لکڑی اور شیشوں کی کھڑکیاں ــ ٹنڈرا کے برفستان میں چربی کی بتی سے روشن دربوں کے اندھیروں میں رہنے والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی ہیں اسی طرح میرے لئے یہ بات باعث تعجب کی تھی کہ ایک ماہ بعد فقط تین روپے پانے کی امید میں کوئی اس بارش اور سردی میں تین میل کیچڑ بھرا راستہ طے کر کے آ سکتا ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ گرد و نواح کے دیہات سے چھ آٹھ آنے یومیہ پر کام کرنے کو مزدور آتے تھے ۔ کسان صبح کے اندھیرے میں اُٹھ کر کھیتوں کو چل دیتے تھے ۔ میں روز دیکھتا کہ نور کے تڑکے ــ جبکہ ابھی شبنم گر رہی ہوتی اور جاڑوں کا چاند صبح کے کہرے میں اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سکڑا اجڑا سا آسمان میں ٹھٹھرا دکھائی دیتا اور پرندے تک اپنے گھونسلوں کی گرمی میں سمٹے ہوتے تو سردی پختہ دیواروں کو چیر کر اندر چلی

آتی ۔ سرون سنگھ ماگھ مہینے کی مہاگٹا اپنے بیلوں کو لئے ہوئے اپنے کھیت جوتنے آجاتا۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے بہت رومانی معلوم ہوتا ۔ رومانی اور دلکش ۔۔۔ لیکن اس بارش میں صرف تین روپے ماہوار کی خشک (بلا کھانے کپڑے کی) ملازمت کے لئے غلام نبی اور اس کی بوڑھی ماں کے چلے آنے سے جیتے دیہات کی خوفناک عسرت اور غربت کی تصویر نہ صرف پہلی بار میری آنکھوں میں کوندگئی بلکہ دل میں نقش ہو گئی ۔

میرے لئے کمرے میں جاکر کام کرنا دشوار ہو گیا۔ پانی پھر زور سے گرنے لگا تھا۔ وہ دونوں ابھی کہیں راستے ہی میں ہوں گے ۔ میں نے سوچا اور اٹھ کر کمرے میں گھومنے لگا۔ باہر ایک کوا اس گرتے پانی سے بے پروا بھوک سے یا کسی اندرونی بےچینی سے کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر اڑتا۔ لان کی گوندنی میں چھپی ہوئی کوئی چڑیا کبھی زور سے ایک میٹھی سیٹی بجا دیتی ۔ حدِ نظر تک نہیں بوندوں کی چادر، زرد کھیت، ٹھٹھرے سکڑے ہوئے پیڑ پودے، سوتے گڑھے اور جگالی کرتی بھینسیں .....

شام سے کچھ پہلے ہی پانی تھم گیا ۔ میں نے کمبل چارپائی پر پھینک کر سوٹ پہن پتلون کے پائنچے موزوں کے اندر کئے، ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں ٹارچ اٹھائی اور پھسلن سے بچتا ہوا مدھوار صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ وہ پریکٹیکل سکول کے سیکرٹری مقرر ہوئے تھے اور میں نے سوچا کہ دیوا جی سے باتیں کرنے سے قبل ان سے مل لینا زیادہ مناسب ہوگا۔

کوٹھی پر جا کر میں نے دستک دی تو انہوں نے کہا "آجائیے ۔ دروازہ کھلا ہے ۔"

میں اندر گیا۔ وہ طوس اوڑھے اپنی بیٹی کو پڑھا رہے تھے ۔ میرے جاتے ہی انہوں نے کتاب رکھ دی ۔ ان کی بیٹی ذرا پرے ہو گئی ۔

"کہیئے اس وقت کیسے ؟"

میں نے غلام نبی کا ذکر کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ لڑکا ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اگر پریکٹیکل سکول میں داخل کر لیا جائے تو کچھ پڑھ لکھ جائے گا اور اس کی زندگی سنور جائے گی وغیرہ وغیرہ .....

مدھوار صاحب مسکرائے ۔ پھر انہوں نے کہا " پریکٹیکل سکول غلام نبی جیسے لڑکوں کے لئے نہیں ہے ۔"

میں خاموش رہا کہ وہ اپنی اس بات کی وضاحت کریں گے ۔ اس اثنا میں شیاما نے دو ایک بار کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ جب میں غلام نبی کی بات کہہ رہا تھا تو وہ برابر میری طرف دیکھ رہی تھی ۔ آخری بار اسے میری طرف یوں تکتے ہوئے مدھوار صاحب نے دیکھ لیا ۔ لڑکی کی نظریں باپ سے ملیں ۔ وہ بادل ناخواستہ اٹھی اور کاپی کتابیں لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔

چند لمحوں بعد مدھوار صاحب پھر کہنے لگے " دیو منڈل کے پرانے اصول اگر برقرار رہتے اس کا حلقہ وسیع ہوتا شہر شہر اور قصبے قصبے دیوسینک بنتے تو غلام نبی یا اس جیسے ہونہار دیہاتی لڑکوں کو پڑھانا مشکل نہ ہوتا۔ لیکن موجودہ پریکٹیکل سکول میں یہ ممکن نہیں ہے ۔"

لمحہ بھر توقف کے بعد وہ پھر بولے " میں نے تو پچھلے دنوں استعفیٰ دے دیا تھا کہ میں یہاں کوئی مفید کام نہیں انجام دے رہا ہوں ۔ مجھے چھٹی دے دی جائے ۔ لیکن دیوا جی نہیں مانے ۔ انہوں نے کہا کہ میں پریکٹیکل سکول کا سکریٹری بن جاؤں ۔ سکول کے بچوں میں کام کرنے کا ان کے شوق و ذوق کے مطابق ان کو صحیح تعلیم دلوانے کا، والدین کو ان کے بچوں کے سلسلے میں صحیح مشورہ دینے اور یوں

ہندوستان کے مستقبل کے شہریوں کے کردار کی صحیح نشوونما اور تعمیر کا مجھے موقعہ ملے گا۔ میں مان گیا لیکن جو کیڑا دیونگر کی جڑوں کو ان کے جمنے سے پہلے ہی کھا رہا ہے وہ پریکٹیکل سکول کو بھی لگ گیا ہے۔ ماتاجی سکول کے ہوسٹل کی میٹرن بن گئی ہیں اور ٹیچر دوسروں کے بچوں کی بہ نسبت دیواجی کے بچوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتے ہیں۔ انھیں توجہ سے پڑھاتے ہیں۔ کلاسوں کی جتنی کمیٹیاں ہیں اُن کی گدیوں پر یا تو دیواجی کے بچے جمے ہیں یا دیونگر میں کوٹھیاں بنوانے کے لئے زمین خریدنے والے امیر لوگوں کے۔"

"لیکن راما تھاپا کا بچہ تو۔۔۔۔"

"وہ محض دیونگر میں آنے والوں کو دکھانے کے لئے ہے۔ جس طرح لیڈر لوگ کچھ کام محض ووٹروں اور انتخابات کو پیشِ نظر رکھ کر کرتے ہیں اسی طرح پریکٹیکل سکول میں راما تھاپا کے بچے کا داخلہ بھی محض نمائش کے لئے ہے۔ جب باہر کا کوئی امیر آدمی دیونگر دیکھنے آتا ہے تو جہاں دیواجی اپنے بچوں کو دکھاتے ہیں وہیں دُرگا کو بھی آگے لا کھڑا کرتے ہیں کہ پریکٹیکل سکول کیسے کند ذہن بچوں کو بھی ذہین اور ہوشیار بنا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب معزز مہمان پریکٹیکل سکول کو دیکھ کر دیواجی کے پاس گنبد میں جاتا ہے تو وہ اُس کے ہاتھ زمین کے دو ٹکڑے بیچ دیتے ہیں اور اس طرح دیو بینا کے ایک ماہ کے خرچ کا انتظام ہو جاتا ہے۔"

مدھوار صاحب پھر خاموش ہو گئے اور چند لمحوں بعد مسکرا کر بولے۔ "دیواجی کے سامنے اس وقت سب سے بڑا اُدرش اس سستی زمین کو اونچے داموں فروخت کرنا ہے۔ لیکن اس ویرانے میں کوئی کیوں آئے گا اور کیوں جنگلی زمین خرید لے گا۔ اس لئے انہوں نے پریکٹیکل سکول قائم کیا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ جو اپنے بچوں کو شملہ مسوری اور نینی تال نہیں بھیج سکتے یہاں بھیجیں اور ریٹائر ہونے پر یہیں آباد ہو جائیں۔ یہی اُن کا خاص مقصد ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر وہ اس میں کامیاب بھی ہو جائیں تو کیا ہو گا؟ دوسرے ایسے نگروں اور اس میں کیا فرق ہو گا! اس سے ہمارے قرب و جوار کے دیہات کو فائدہ پہنچے گا؟ کیا یہ کوڑے کے ڈھیر پر عطر کی شیشی ناک سے لگا کر بیٹھنا نہ ہو گا؟

کچن میں کھانے کی پہلی گھنٹی بج گئی۔ باتوں میں ہمیں وقت کا ہوش ہی نہ رہا۔ مدھوار صاحب نے اُٹھتے ہوئے کہا۔" آپ یہ فکر چھوڑیئے۔ اس بچے کو نوکر رکھ لیجیے۔ غلام نبی جیسے لکھو کھا بچے ہمارے دیہات میں بڑے بیکار اپنی ذہانت گنوا رہے ہیں۔ ایک پریکٹیکل سکول بنتے یا اُس میں ایک غلام نبی کے داخل ہونے سے کیا ہو گا۔ یہاں تو ہر قصبے اور ہر گاؤں میں پریکٹیکل سکول کھلنے چاہئیں۔ مگر کیا یہ کام کوئی ایک شخص یا ایک جماعت کر سکتی ہے۔ یہ کام حکومت کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے غیر ملکی حکومت کو ختم کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہو سکتا ہے۔ میں تو پھر جا کر جنگِ آزادی میں شامل ہو جانا چاہتا ہوں۔"

لیکن مدھوار صاحب کی باتوں اور اپنے دل میں بڑھتے ہوئے شبہات کے باوجود دیواجی کے عظیم آدرشوں اور ان کی گہری انسانیت دوستی پر میرا اعتقاد تھا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وہ اپنے سکول میں ایک بچے کو داخل نہ کر سکیں گے۔

غلام نبی دوسرے روز صبح ہی صبح ایک پوٹلی میں سوکھی روٹی اور اچار باندھے آ گیا۔ اُسے صفائی کا سب کام سمجھا کر میں نیا مضمون دینے کے بہانے گنبد میں پہنچا اور مضمون دینے کے بعد میں نے غلام نبی کا ذکر چھیڑ دیا۔

نہ ہوں گے ہم سکھی نہیں ہو سکتے۔"

دیواجی میری بات سکون سے سنتے رہے۔ لیکن بے صبری اور ناگواری کے اثرات ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھے۔ پریکٹیکل سکول کی تعمیر پر اُنھیں بہت ناز تھا۔ 'دیوبانی' میں اس کی تعریف میں اُنہوں نے کئی مضمون لکھے تھے۔ امریکہ کے اس قسم کے کئی سکولوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ پریکٹیکل سکول اُن سے کسی لحاظ سے کم نہ ہوگا۔ جس طرح فنکار کو اپنی تخلیق کی برائی پسند نہیں ہوتی اسی طرح دیواجی کو میری تنقید اچھی نہ لگی۔ پھر میں ان کا ایک ادنیٰ ملازم۔ مجھے آن پر تنقید کرنے کا کیا حق تھا؟ لیکن بڑی کوشش سے انہوں نے اپنے غصّہ کو ضبط کیا اور جب بولے تو اُن کی پیشانی پر ایک بھی شکن نہ تھی اور وہ مُسکرا رہے تھے۔

"پریکٹیکل سکول کی اہمیت کو آپ سمجھے نہیں۔" اُنہوں نے کہنا شروع کیا۔ "ہمارے شہری باشندوں کو دیہات کی حقیقی زندگی کا کوئی علم نہیں ہے اور شاید آپ نہیں جانتے کہ حقیقی ہندوستان دیہات ہی میں بستا ہے۔ آنے والی تعلیم یافتہ پود کے لئے دیہات کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ پریکٹیکل سکول کے بچے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ گاؤں کے دیہات میں جائیں گے وہاں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے اور ملک کی خدمت زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکیں گے۔ میں سکیم بنا رہا ہوں کہ دیہات کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ بچے دیہات میں جا کر سیوا بھی کریں۔"

دیواجی بات کرنے میں ماہر تھے اور پریکٹیکل سکول اُن کا محبوب موضوع تھا۔ وہ اس موضوع پر بے تکان بولتے گئے۔ لیکن میرے کانوں نے جیسے اُن کی باتیں نہیں سنیں۔ پریکٹیکل سکول کی فضا میں دیش بھگت پیدا ہوں گے اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ ہوں گے تو دیہات کے متعلق سطحی معلومات حاصل کر کے وہ اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکیں گے اس میں بھی مجھے شبہ تھا۔ میرے خیال میں اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ دیواجی دیہات کے لڑکوں کا ایک سکول کھولتے۔ باہر سے آ کر دیہات کا سطحی مطالعہ کرنے والے طلبا کی بہ نسبت دیہات کی آب و ہوا میں پرورش پانے والے طلبا دیہات کو زیادہ فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لیکن میں نے اپنے اس شبہ کو ان کے سامنے ظاہر نہ کیا۔ صرف اتنا کہا کہ اگر میری ناچیز رائے کی کوئی وقعت ہو تو گرد و نواح کے دیہات کا ایک نہ ایک طالب علم پریکٹیکل سکول میں داخل کر لینا چاہیے اور غلام نبی میرے خیال میں بہت اچھا طالب علم ثابت ہوگا۔

میری ضد دیکھ کر بھی یہ دیواجی کی جھنجھلاہٹ پھر اُن کی پیشانی پر نئی شکنوں کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ لیکن زبردستی اپنے اُوپر جبر کر کے وہ بولے۔ "سکول کی تو ایک کمیٹی ہے بھائی — پرنسپل، سیکرٹری، میٹرن اور دو پروفیسر — سب کچھ انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ تنہا میرے کرنے سے تھوڑی کچھ ہوگا۔"

اور لیجئے وہ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس طرح ٹالے جانے پر بھی گویا مجھے اپنی شکست گوارا نہ ہوئی۔ میں نے کہا۔ "جی میں سکریٹری صاحب سے بات کروں گا۔" اور نمسکار کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

کتنی ہی دیر سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وانی میری طرف مسلسل دیکھ رہی ہے۔ لیکن جانے کیوں مجھے اُس سے آنکھ ملانے میں بڑی خفت کا احساس ہوا۔ دروازے پر جا کر جوتوں سے موزے نکال کر میں پہننے لگا۔ اُسی وقت وہ باہر جانے کے لئے آئی اور مجھے راستے میں دیکھ کر رُک گئی۔ موزے پہنتا پہنتا میں ایک پیر کے سہارے پھدک کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ وہ بدن بچا کر میرے پاس سے نکل گئی۔

گنبد سے چلا تو میں سوچ رہا تھا کہ میں نے سکریٹری سے ملنے کی بات دیواجی سے کیوں کہی سکریٹری تو دھوار صاحب ہیں اور دھوار صاحب سے میں مل آیا ہوں۔ پھر اگر دیواجی چاہیں تو غلام نبی کو سکول میں داخل کرنے سے انہیں کون روک سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کی بیوی کا ان پر بہت اثر ہے۔ مگر دیواجی جب چاہتے ہیں اُس سے اپنی بات منوا لیتے ہیں راما تھاپا کے بچّے کو انہوں نے داخل کر دیا تو غلام نبی کو کیوں نہیں داخل کرا سکتے؟ لیکن جب وہ نہیں چاہتے تو میں کیوں اَڑ گیا۔ اس کا سبب وانی کی موجودگی تو نہیں تھا کیا؟ اُس کے سامنے اپنی شکست ہی تو میرے لئے قابلِ برداشت نہ تھی۔

جب دھوار صاحب نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ پریکٹیکل سکول غلام نبی جیسے بچّوں کے لئے نہیں ہے، تو میں کیوں گیا دیواجی کے پاس — یکایک میرے خیالات نے پلٹا کھایا . . . . . لیکن میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی تھا کہ شاید مخالف پارٹی میں ہونے کے باعث دھوار صاحب مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ دیواجی ایک بچّے کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کریں گے۔ دیواجی پر اور کبھی اپنے آپ پر جھنجھلاتا، کھسیاتا میں چلا جا رہا تھا کہ میرے کانوں میں بانسری کے دھیمے دھیمے بول جیسی آواز آئی۔ "سنگیت جی"

میں چونکا۔ دیکھا۔ اپنی کوٹھی کے پیچھے راستے سے ہٹ کر وانی کھڑی ہے۔ شاید وہ میرے آگے آگے آ کر وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس دن سے کہ جب اُس نے زبردستی میرے ہاتھ میں بیڈمنٹن کا ریکٹ تھما دیا تھا اور میں نے اُس سے دو ایک بازیاں کھیلی تھیں اُس میں اور مجھ میں کچھ زیادہ میل جول نہ بڑھا تھا۔ اور ہمارے تعلقات میں گہرائی نہ آئی تھی۔ یک دو بار میں اور بیڈمنٹن کھیلنے گیا تھا، ور دو ایک بار چلتے چلتے سرِ راہ اس سے صاحب سلامت ہوئی تھی۔ اور ہم جتنی دور پہلے تھے اب بھی اُتنی ہی دور تھے۔ اگر میں اُن کے گھر آتا جاتا، ماتا جی مجھ سے خوش ہوتیں، تیرتھ رام کے رشک و حسد کا سایہ ہمہ وقت سر پر نہ منڈلایا کرتا اور میں نے اپنی بیوی کی موت کو اتنے نزدیک اور اتنی تکلیف دہ حالت میں نہ دیکھا ہوتا تو شاید ہمارے درمیان کا فاصلہ کچھ کم ہو گیا ہوتا۔ لیکن اس وقت ایک طرف ایک ایسے شخص کا مایوس دل تھا جس کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہو چکا ہو اور دوسری طرف کچی عمر کی ایک لڑکی کی سحرزدہ اور حیران محبت تھی — اور ہم دونوں کے درمیان فاصلہ جوں کا توں برقرار تھا۔

وانی کی آواز سے میں رُک گیا مگر اُس کی طرف بڑھا نہیں۔ وہ جھجکتی جھجکتی چند قدم آگے آ گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُس نے میری طرف اُٹھائیں۔ بارش ختم ہو گئی تھی، لیکن پورے آسمان پر بکھرے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ اس ٹھنڈی میلی روشنی میں وانی کا چہرہ مجھے بالکل سپید نظر آیا۔ کچھ اندرونی جوش کچھ ٹھنڈ سے اُس کے گلے پر مسام اُبھر آئے تھے۔ اس یک دم سپید اور پریشان چہرے کو دیکھتے دیکھتے میرے دل میں بے پناہ ہمدردی کا سمندر اُمنڈ آیا۔ اور اُس کی بات سننے کے اشتیاق میں میں رُک رہا۔

"آپ گھبرائیے نہیں۔" میرے قریب آ کر اس نے بہت آہستہ سے، گویا اپنے آپ ہی سے کہا۔
"میں وارجی سے کہہ کر اُس لڑکے کو سکول میں داخل کرا دوں گی۔"

ایک لمحہ کو وہ رکی۔ اپنی ان بڑی بڑی گہری اور معصوم آنکھوں کو میرے دل کی گہرائیوں میں اتارتے ہوئے اُس نے کہا: "آپ کتنے اچھے ہیں سنگیت جی! ایک اجنبی دیہاتی چھوکرے کے لئے اِس سردی میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مجھے نیلیمانے بتایا تھا کہ آپ ملھوار صاحب کے پاس بھی گئے تھے۔"

اگر وہ لمحہ ذرا طول کھینچتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ یقیناً میں اس لڑکی کو دونوں بازوؤں میں بھر کر اُٹھا لیتا۔ لیکن پورے ضبط اور کوشش سے اُن بڑی بڑی آنکھوں کے طلسم سے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہوئے میں نے اپنی اُس کمزوری پر قابو پا لیا۔ اگرچہ میں اس کوشش میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

"میں بہت شکر گزار ہوں۔" نہایت دھیمی آواز اور تقریباً خشک گلے سے میں نے کہا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی پر سے جاتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں چل دیا۔

سامنے ہر موہن سنگھ کے کمرے کی کھڑکی میں تیرتھ۔ ام کہ اہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں اُٹھتے ہی وہ کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ وانی پگڈنڈی سے ہٹ کر کوٹھی کی دیوار سے کیوں لگی کھڑی تھی۔

رات کافی گزر گئی تھی۔ سونے کی ناکام کوشش کر کے میں برآمدے میں چلا آیا۔

مطلع ایک دم صاف تھا اور تارے ٹمٹما رہے تھے لیکن زمین اور آسمان کے درمیان چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ مشرق کی جانب آسمان میں چاند کی بھی چوتھائی ٹکیہ روشنی کے دو ہالوں کے درمیان چمک رہی تھی۔ ایک حلقہ قدرے گلابی اور دوسرا نیلا سفید اور اُس کے بعد مٹیالی دھند۔ دور کنوئیں کا برگد اس دھند میں لپٹا تھا اور کھڑکی کے پاس کا ببول ٹھٹھرا ہوا کھڑا تھا اور چاند کی کرنیں دھند کو چیر کر زمین پر بکھرے برساتی پانی میں لرزاں تھیں۔

میں چپ چاپ برآمدے میں گھومنے لگا اور میرے دماغ میں بار بار وہی باتیں چکر کاٹتے گئیں۔ وہی منظر، وہی بحث، سپید گردن پر اُبھرے ننھے باریک مسام۔

میں سوچ رہا تھا کہ پہلے کبھی میرے دل میں غریبوں کے لئے اِس طرح ہمدردی کا جذبہ کیوں نہیں اُبھرا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں دیہات سے ناواقف ہوں، لیکن میرے قصبے میں غربت اور افلاس کی کمی نہ تھی۔ میرے اپنے محلہ میں اتنے غریب نہ سہی مگر کافی تنگ دست لوگ رہتے تھے۔ اور انھیں میں نے اکثر مصیبتوں میں مبتلا دیکھا تھا۔ پھر کیوں اچانک غلام نبی اور اُس کی ماں کو اس طرح پانی میں بھیگتے دیکھ کر میں ایک دم پسیج گیا۔

لیکن شاید میں پہلے دیکھ کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ اپنی خوشی میں مست میری آنکھوں کو اپنے اردگرد اپنے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مگر پتّو کی موت نے کبھی دور نہ ہو سکنے والی اس بے پناہ محرومی نے، مجھے اچانک وہ آنکھیں دے دی تھیں جو دوسروں کا غم بھی دیکھ سکیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ آنکھیں ہوتے ہوئے بھی انسان بہت کچھ نہیں دیکھتا۔ لوگ مرتے ہیں، بھوک سے بلکتے ہیں، بیماری سے تڑپتے ہیں، کمر توڑ مشقت میں مصروف رہتے ہیں، لیکن ہم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی یہ سب نہیں دیکھ پاتے۔ پھر اچانک کوئی ذاتی غم یا محرومی ہماری آنکھوں پہ چھایا ہوا پردہ اُٹھا دیتی ہے اور غریبی بھوک اور موت کو رومانی نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہماری آنکھیں رومانی مناظر کے پس پردہ غم واندوہ کو دیکھنے لگتی ہیں۔ ...... یا شاید یہ نیوگر کی فضا دیوا جی کے مضامین یا اُن کی تقریروں کا اثر تھا کہ میں وہ سب کچھ دیکھنے لگا جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ سوچنے لگا تھا جو پہلے کبھی نہ سوچتا تھا ...... دیوا جی نے کہا تھا۔ جیسے خواب دیکھنے کے لئے بڑی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ تو کیا مجھے وہ بڑی آنکھیں مل گئی تھیں کہ میں ملک کی غربت کو دور کرکے اس کی جہالت کو مٹانے، غلامی سے نجات دلا کر اُسے خوشحال اور ترقی یافتہ بنانے کے خواب دیکھنے لگا تھا اور وہ زبردست غریبی مجھے کھلنے لگی تھی۔

..... یا یہ دھوار صاحب کے پاس بیٹھنے کا نتیجہ تھا۔ حق کی جستجو میں بھٹکنے والے اس لا ابالی کی صحبت کا نتیجہ تھا کہ میں نیوگر اور اُس کی سرگرمیوں کا نکتہ چین بن گیا تھا۔ میں (جس نے کبھی اِن باتوں کی طرف توجہ بھی نہ کی تھی قوم پرست رہنماؤں کے درمیان رہ کر بھی جو ملک کے مسائل سے یکسر بے بہرہ تھا۔) اب اچانک ان سب کے بارے میں حساس ہو کر حق کی جستجو کرنے لگا تھا؟

..... یا یہ وانی کی اُن بڑی بڑی آنکھوں ـــ اُن گہری معصوم آنکھوں کا کرشمہ تھا جو ہمیشہ کچھ عجیب سی عقیدت اور اپنائیت سے مجھے دیکھتی تھیں؟ کیا اُن بھولی بھالی ٹھہری نتھری جھیل کی سی خاموشی، لیکن اُس کے باوجود زبانِ حال سے سب کچھ بتاتی ہوئی سی اُن پیاری پیاری آنکھوں نے میرے احساس کی خنکی کو دور کرکے بیدار اور ہوشیار کر دیا تھا؟ کیا اُن آنکھوں میں بلند مقام حاصل کرنے کی آرزو ہی تو میرے لاشعور میں نہ سما گئی تھی؟ .....

ہر محبت کی تہہ میں کہیں نہ کہیں نفسانیت کی ہلکی سی رمق ضرور ہوتی ہے لیکن ایسی محبت بھی ہوتی ہے جو گراتی نہیں اُٹھاتی ہے جو دل کو وہ بصیرت عطا کرتی ہے جس سے انجانے راز افشا ہو جاتے ہیں اور جسم کو وہ قوت بخشتی ہے کہ انسان ہنستے ہنستے ناگہانی مصیبتوں سے ٹکر لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ...... تو کیا یہ وانی کی محبت تھی جو مجھے بلندی پہ لے جا رہی تھی؟

..... بیل درخت کا سہارا لینے اور اُس سے لپٹ جانے کو مجبور ہے۔ اُس کی اس مجبوری سے درخت اپنی اہمیت پہ فخر کر سکتا ہے مگر اس سے لپٹ کر وہ مجبور اور بے بس بیل درخت کو کتنی خوبصورتی اور لطافت عطا کرتی ہے اُسے کس قدر مکمل بنا دیتی ہے یہ بات تو کچھ وہ ٹھونٹھ ہی جانتا ہے جس سے لپٹی ہوئی بیل کو بے رحم آندھیوں نے اڑا دیا ہو...... اور اس برآمدے کی ہلکی تاریکی میں، میرے وجود کو اپنی محبت آمیز لطیف اور سرگرم عقیدت میں سرشار کرتا ہوا سا اُن بڑی بڑی آنکھوں کا سحر مجھے مسلسل چھونے لگا۔

عین اُسی وقت راما تھا پانے ۱۲ کا گجر بجایا۔ گھڑیال کی ٹن ٹن ..... ٹن ٹن ..... سردیوں کی رات کے اُس ٹھٹھرے سکڑے سناٹے کو جھنجھوڑتی ہوئی فضا میں چاروں طرف گونج گئی۔

لیکن دھند گہری ہو کر ہالے کے اس گلابی پن کو نگل گئی اور ٹھونٹھ سا چاند آسمان میں ٹکر ٹکر تکنے لگا ..... ایک لمبا سانس کھینچ کر میں اندر چلا گیا اور لحاف پہ ایک اور کمبل ڈال کر لیٹ گیا۔

دانی نے اپنی بات پوری کر دی۔ دو دن بعد جب میں کھانا کھانے جا رہا تھا تو دیوا جی نے راستے میں روک کر مجھے بتایا کہ انہوں نے سکول کے سکریٹری ہ سوار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحبہ (انہوں نے مسکراتے ہوئے ماتاجی کی طرف دیکھا) سے غلام نبی کی سفارش کر دی ہے۔ غلام نبی کا تمام دن وہاں رہنا ضروری نہیں۔ انگریزی، اردو، جغرافیہ، تاریخ اور حساب کے پیریڈ وہ پڑھ لیا کرے گا۔ جغرافیہ اور تاریخ ایک ایک دن کے وقفہ سے باری باری آتے ہیں اس لئے اُسے چار ہی پیریڈ پڑھنے ہوں گے۔ دو قمیصوں اور دو نیکروں سے اُس کا کام چل جائے گا۔ جب وہ کچھ پڑھ لے گا تو اُسے دستکاری سکھا دی جائے گی۔" باقی وقت آپ اس سے کام لیجئے۔" انہوں نے کہا۔ "تاکہ اُسے یہ احساس ہو کہ وہ کسی کی مہربانی سے نہیں، بلکہ اپنی محنت سے پڑھ رہا ہے۔ چار پیریڈ دو گھنٹوں کے ہوتے ہیں۔ دن میں دو گھنٹے بھی پڑھ لے گا تو کافی ہوگا۔"

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور پہلی بار ماتاجی کو خلوص دل سے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

دانی میری ہی صف میں کھانے کو بیٹھی۔ وہ اُس روز بہت خوش تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ بڑی سرگرمی سے باتیں کرتی، ہنستی ہنساتی اور کھانا کھلانے والیوں سے مذاق کرتی رہی۔ اس درمیان اُس کی نگاہوں کا وہ التفات آمیز عقیدت سے شرابور لمس مجھے برابر محسوس ہوتا رہا۔

جب میں اپنی تھالی لے کر نل پر پہنچا تو وہ بھی آگئی۔ میں نل کے نیچے ہاتھ دھونے لگا مگر اُس کے لئے جگہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔

"تھینک یو!"

جب وہ ہاتھ دھو رہی تھی تو میں نے آہستہ سے کہا: "غلام نبی کے لئے تم نے جو کچھ کیا اُس کے لئے میں شکرگذار ہوں۔"
وہ رومال سے ہاتھ پونچھ رہی تھی اور اُس کا گورا گورا سا مکھڑا ایک دم سرخ ہو رہا تھا۔

آہ وہ صبحیں وہ شامیں!

غلام نبی کے آنے کے بعد کا مہینہ ڈیڑھ مہینہ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش دنوں میں سے ہے۔

ڈائننگ ہال کی میزوں پر بیٹھے بیٹھے دانی اور مجھ میں نگاہوں کا تبادلہ خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہوتا ہو اور دیونگر کی روشوں پر ایک دوسرے کے قریب سے گذرتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو خواہ کتنی بار کیوں نہ دیکھتے ہوں، مگر ہم میں بات چیت بہت کم ہوتی تھی۔ لیکن غلام نبی دانی کو میرے قریب لانے کا گویا ایک ذریعہ بن گیا اور اُس باریک سے دھاگے کو تھامے ہوئے دانی میری طرف کھنچتی چلی آئی۔ اُس نے اس التفات نے، جو باتوں کی نسبت اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے جھلکتا تھا غیر شعوری طور پر اپنی آنچ سے میرے دل کے انجماد کو آہستہ آہستہ پگھلا دیا۔

جاڑوں کی اُن دھندلی تاریک شاموں میں ـــ جب سیر کرنا مشکل تھا ـــ میں کھانے سے قبل اور بعد کا زیادہ وقت نندلال کے ہاں ہی گذارتا تھا۔ ساوتری کو پڑھاتا، اُس کے بچوں سے کھیلتا، نندلال سے دیونگر کی سیاست کی باتیں سنتا۔ اَور کچھ نہ ہوتا تو خاموش اُن کے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ بھرے پُرے کنبے والے کسی گھر کا خالی کمرہ بھی کتنا بھرپور رہ سکتا ہے اُور کسی کی موجودگی کے بغیر بھی میرے جیسے کسی تنہا شخص کے لئے کس قدر باعث تسکین ہو سکتا ہے اِس کا اندازہ سب سے پہلے مجھے وہیں جاکر ہوا۔

دانی پہلے کبھی وہاں نہ آتی تھی۔ مگر غلام نبی کے سکول میں داخلے کے دوسرے ہی دِن وہ گھومتی گھامتی اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ وہاں آئی اور ساوتری آنٹی اور انکل نندلال سے دو چار مذاق کرنے کے بعد چلتے وقت گویا اچانک یاد آنے پر اُس نے غلام نبی کا ذکر چھیڑ دیا اور بتایا کہ وہ سکول میں داخل ہو گیا ہے اُور ایک پیریڈ خالی ہونے پر اُس نے خود اُسے پڑھایا ہے اور آئندہ بھی وہ یونہی اسے پڑھایا کرے گی اور یہ کہ جہاں تک اُس کی تعلیم کا تعلق ہے میں اُس کی طرف سے ایک دم بے فکر ہو جاؤں۔

اُس روز کے بعد تقریباً ہر روز چند منٹ کے لئے وہاں آنا اُس کے معمول میں داخل ہو گیا۔ ساوتری یا نندلال سے باتیں کرتے کرتے، یا بچوں سے کھیلتے کھیلتے وہ یونہی مجھ سے باتیں کرنے لگتی.....۔

"آپ نے دیکھا نبی کیسا پڑھ رہا ہے؟" وہ پوچھتی..... اُور بات شروع ہو جاتی۔

"آج نبی نے ہوم ورک نہیں کیا۔" وہ کہتی "کیا آپ کے ہاں کام زیادہ تھا یا اُس نے خود توجہ نہ کی۔ اور بات شروع ہو جاتی۔

یا اعلان کرتی "نبی کا خط تو بہت اچھا ہے سنگیت جی"... "ایسی ہینڈ رائٹنگ تو میری بھی نہیں۔ ماسٹر جی بہت تعریف کر رہے تھے"..... اور بات شروع ہو جاتی۔

نندلال کے گھر کی وہ مختصر اور سرسری ملاقاتیں یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں کہ اُن میں ایسی کیا بات تھی جو انہیں اتنا شیریں بنا دیتی تھی! دانی زیادہ دیر نہ رکتی۔ دو چار باتیں کر کے جانے کی جلدی مچانے لگتی۔ اس جلدی میں جو باتیں ہوتیں اُن میں نہ پیار ہوتا نہ محبت...... نبی کیسے آیا؟..... کس طرح اُسے تعلیم دلانے کا مجھے خیال آیا...... اچھا ہی کیا جو میں نے اُسے پڑھانے کی سوچی... گاؤں میں ایک بھی لڑکا پڑھ جائے تو وہ گاؤں کی قسمت پلٹ سکتا ہے..... وغیرہ وغیرہ..... لیکن یہی باتیں دل کی دھڑکنیں کچھ اور تیز کر دیتیں اُور وہ چلی جاتی تو تلخی کے ساتھ ساتھ ڈھیروں مٹھاس چھوڑ جاتی"۔

"تلخی کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ آتی تو جلدی ہی چلی جاتی بلکہ یہ کہ وہ آتی تو کچھ ہی دیر بعد تیرتھ رام یا ہرموہن۔" کہتے ساوتری جی کچھ چائے وائے ہمیں بھی پلوائیے۔" یا "اچھا ساوتری جی اکیلے اکیلے!" کہتے ہوئے آجاتے۔ دانی خوفزدہ ہرنی کی طرح چونک پڑتی اور پھر اُس کے چہرے پر غم و غصّہ کا بادل سا چھا جاتا اُور وہ ساوتری آنٹی کو نمسکار کر کے یا بچوں کے گالوں پر چٹکیاں لیتی یا چومتی ہوئی بھاگ جاتی۔

دانی تو شاید تیرتھ رام اور ہرموہن سنگھ کے باوجود آتی رہتی مگر میں نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔

ہوا یہ کہ ایک دن ساوتری نے کہا "بھرا جی، آج کل دانی بہت آنے لگی ہے یہاں" اور اُس نے میری طرف بہت معنی خیز

شوخ اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ مگر میں بالکل جذبات سے عاری بنا بیٹھا رہا۔ ہونٹوں پر تو کجا میں نے آنکھوں تک میں تبسم کی رمق نہ آنے دی۔ پھر ساوتری نے خود ہی کہا۔ ”اور وانی آتی ہے تو تیرتھ رام یا ہر موہن بھرا جی بھی ضرور آتے ہیں۔“

میں نے اُس کا جواب بھی نہ دیا۔ صرف یہ کیا کہ شام کو نند لال کے یہاں جانا بند کر دیا۔

دو چار دن یونہی بھٹکتا رہا۔ اس عرصہ میں گیانی دلاور سنگھ سے میں نے آسام کے اُن کے فارم کی کہانیاں سنیں، کھوسلہ صاحب سے مقوی ادویات اور بال سیاہ رکھنے والے تیل کی مدح سرائی میں قصیدے سنے۔ مدھوار صاحب سے سیاسی اور سماجی مسائل کے حل معلوم کئے، لیکن کہیں بھی مجھے آسودگی حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح میں کہیں نہ جا پایا جس طرح نند لال کے یہاں جاتا تھا۔ مدھوار صاحب کے ہاں ذہنی بھوک بڑی حد تک مٹ جاتی اُن کی باتیں دل کو متاثر بھی خوب کرتیں ان کے تئیں دل میں عقیدت کے جذبات بھی خوب پیدا ہوتے مگر جانے کیوں ان کے ہاں کچھ ایسا روکھا پھیکا ماحول ملتا کہ دل آسودہ نہ ہوتا۔ پھر بھی میرا زیادہ وقت وہیں گذرتا تھا۔

لیکن اُسی وقت وہ ٹوٹا ہوا تار وانی نے پھر جوڑ دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ایک شام میں نے دیکھا کہ جہاں میں کھانا کھانے کو بیٹھا کرتا تھا وہیں پنٹری پہ وہ ریڈیو آ گیا، جو دیواجی کے کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ پنٹری پہ آگے سبزی ترکاری کے ڈونگے روٹیوں کی چنگیر، تھالیاں، کٹوریاں، چمچے وغیرہ پڑے رہتے تھے۔ اس لئے ریڈیو پچھلی میزوں کے قریب رکھا گیا تھا۔ ابھی میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ وانی کھانے وانے سے فارغ ہو کر تھالی وغیرہ حمام پر رکھنے کے بعد ہاتھ منہ دھو کر آ گئی۔ اُس نے ریڈیو لگا دیا اور دوسرے ہی لمحے سہگل کے سُریلے گلے سے نکلا ہوا وہی گیت رات کے سناٹے میں گونجنے لگا۔

سنو سنو ہے کرشن کالا
آئی تیرے دوار
سنو موری پکار
سنو سنو ہے بانسری والا

ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ تھالی وہیں سامنے رکھے، دھڑکتے دل سے میں گانا سنتا رہا۔ کب باہر بوندیں گرنے لگیں اس کا کبھی پتہ نہ چلا۔ جب ریکارڈ ختم ہوا تو باہر زور سے بارش ہو رہی تھی۔

گانا ختم ہوتے ہی دوسرا ریکارڈ بجنے لگا شمشاد بیگم ڈھولک پہ پنجابی گیت گا رہی تھی۔

اسی وقت وانی میرے قریب والی کرسی پر آ بیٹھی۔ ”اب ریڈیو یہیں رہا کرے گا۔“ اُس نے کہا۔ ”آج ہسٹری میں میں نے دیکھا کہ آپ کے پسندیدہ گانے کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ چونکہ دار جی فیصلہ کر چکے تھے اس لئے ریڈیو تو ڈائیننگ ہال میں آتا ہی میں نے سوچا کیوں نہ آج ہی آپ کو سنوا دیا جائے۔“

خاموش رہنا چاہتا تھا مگر منہ سے نکل گیا۔ "بہت بہت شکریہ۔"

لیکن دوسرے ہی روز ریڈیو وہاں سے اٹھ گیا۔

ہوا یہ کہ بارش کی وجہ سے وانی وہیں بیٹھی رہی۔ جن کے پاس چھاتے اور برساتیاں تھے، وہ تو چلے گئے مگر جن کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں تھیں وہ وہیں بیٹھے ریڈیو سنتے رہے۔ گھنٹے پون گھنٹے بعد جب ہرموہن چھاتے اور برساتیاں لئے ہوئے تیرتھ رام کے ساتھ آیا تو وانی کو میری میز پہ بیٹھے دیکھ کر آگ بھبھوکا ہو گیا۔

"چلو دیر ہو رہی ہے۔ ماتاجی پریشان ہیں۔" اُس نے کہا۔

اور وانی چلی گئی..... دوسرے روز صبح ہی ریڈیو کھانے کے کمرے کی جگہ ڈیوڑھی میں رکھ دیا گیا۔

جاڑوں کے اُن دنوں میں جب سورج پانچ سوا پانچ بجے غروب ہو جاتا اور چھ بجے اندھیرا چھا جاتا تھا دیوسینک شامیں عموماً اپنے گھروں میں ہی گذارتے..... دیواجی اُن دنوں ٹھیک چار بجے لکھنا بند کر دیتے۔ چائے پینے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹے سیر کرتے۔ سیر کے وقت اُن کے ساتھ دیونگر دیکھنے کے لئے باہر سے آئے ہوئے مہمان یا دوسرے دو چار خوشامدی ہوتے۔ دیواجی کو اپنی آواز بہت پیاری لگتی تھی۔ وہ سیر کو جاتے تو اُن کے سوا کوئی نہ بولتا۔ اپنے بچپن کے یا سکول، کالج کے دنوں کے یا سمندری سفر کے یا ولایت کے قصے وہ روزانہ سنایا کرتے۔ شروع شروع میں میں بھی اُن کے ساتھ جایا کرتا تھا اور میں نے دیکھا تھا ــ کئی بار وہ بھول جاتے تھے کہ وہ قصہ وہ دو دن پہلے ہی سنا چکے ہیں اور سننے والے بھی تقریباً وہی پرانے لوگ ہیں۔

اُن کے قصے محبت کے حقوق کے بارے میں ہوتے اور اس بات پر وہ زور دیتے تھے کہ حق جسم کا نہیں دل کا ہونا چاہیے۔ صفائی کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ یہ تہذیب کی پہلی شرط ہے۔ سچے دھرم، سچی انسانیت، رواداری، خودداری، انصاف، صداقت، عدم تشدد، اور روزمرہ کی زندگی میں انسان کو آگے بڑھانے والے اوصاف کے متعلق وہ باتیں کرتے۔ انھیں سب کے سلسلے میں شان کے طور پر وہ قصے سنایا کرتے۔ اُن کا اندازِ بیان ایسا ہوتا کہ اُن کے معتقد ہمیشہ اُن قصوں کے ہیرو سے دیواجی کا رشتہ جوڑ لیتے۔ ایک بار میں اُن سے مضمون لینے گنبد میں گیا۔ وہ دفتر میں نہیں تھے۔ کوئی بڑا افسر آیا ہوا تھا۔ جسے وہ دیونگر دکھلانے لے گئے تھے۔ ان کی میز پر ایک امریکی رسالہ کھلا پڑا تھا۔ وقت گذارنے کے لئے میں اُسے پڑھنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہی قصہ اُس میں پڑھا جو انہوں نے دو روز قبل اپنے نام سے سنایا تھا اور جسے اُن کے معتقدین نے دوسروں کو سنانا شروع کر دیا تھا۔

دوسرے ہی دن سے میں نے اُن کے ساتھ شام کی سیر کو جانا ترک کر دیا۔

سیر سے واپسی پر دیواجی کچھ دیر آرام کرتے۔ اتنے میں کھانے کی گھنٹی بج جاتی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پر لیٹے لیٹے کچھ دیر مطالعہ کرتے یا اگر کچھ خوشامدی آ جمع ہوتے تو اُن سے باتیں کرتے۔ باتیں کرنے کا مطلب یہ کہ انھیں اپنی زندگی کے قصے سناتے۔ جب تک ریڈیو اُن کے کمرے میں تھا وہ کبھی کبھار کوئی تقریر سن لیتے۔ لیکن ڈیوڑھی میں وہ کبھی نہیں گئے

...... مدھوار صاحب شام کو اپنی بیٹی کو پڑھاتے تھے یا ہرموہن سنگھ اور دیواجی کے چاپلوسوں کی حرکتوں

سے تنگ آئے ملازموں یا دیوسیکوں کی شکایتیں سنتے اور سچائی پر اڑے رہتے، اخلاقی قوت پیدا کرنے، شیریں لب و لہجہ اور میٹھے میٹھے الفاظ میں پنہاں جھوٹ کو پہچاننے، خوشامد کر کے پیٹ بھرنے کی بجائے خود داری کے ساتھ بھوکے رہنے اور ایسے ہی موضوعات پر لیکچر دیتے۔ دیواجی اگر امریکی اور انگریزی اخبارات اور رسالوں سے مسالہ لیتے تو مدھوار صاحب رامائن، مہابھارت، گیتا، اپنشدوں اور مہاتما گاندھی کی زندگی سے نظیریں پیش کرتے۔ سننے والوں میں سے کچھ دوسرے ہی لمحے جا کر ہرموہن کے کان بھر دیتے اور اس خدمت کے عوض کوئی چھوٹی موٹی سہولت حاصل کر لیتے اور کچھ اس ملاقات کے بعد گھنٹوں جا کر سلگتے رہتے۔

ان دوسری قسم کے لوگوں کا تماشا اس وقت دیکھنے میں آتا جب کوئی باہر سے دیونگر دیکھنے آتا اور دکھانے کا کام انھیں سپرد کیا جاتا۔ وہ دیونگر کے نظام، اس کے ظاہری حُسن اور فن کاری کے اندر چھپی بدصورتی اور خامکاری کی جی بھر خدمت کرتے۔ سرگوشیوں میں ـــ محض سننے والوں کے مفاد کی خاطر۔ انھیں سمجھاتے کہ یہ سب دھوکا ہے، فریب ہے، اپنے گھٹے ہوئے تنگ ماحول سے اکتائے ہوئے اور شہر بھی بھوکے بھالے لوگوں کو ٹھگنے کا محض ایک ذریعہ ہے..... لیکن ایسے موقعہ پہ کہیں دیواجی ہرموہن یا اُن کا کوئی چاپلوس سیلنگ قریب سے گذرتا یا اتنے قریب ہوتا کہ اُن کی باتیں سن سکے تو وہ فوراً قدرے بلند آواز میں دیواجی کی فہم و فراست اور اُن کے آدرشوں کی تعریف شروع کر دیتے..... ''چودہ سو روپے'' وہ کہتے ''چودہ سو روپے میں تو شہر میں ایک کمرہ تک نہیں بنتا، لیکن دیواجی نے یہ دس گوٹھیاں چودہ چودہ سو میں بنوا دی ہیں۔ ابھی اسّی سَو کوٹھیاں بنوانے کا اُن کا ارادہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اپنے سماج کی گھٹی ہوئی فضا سے تنگ آئے ہوئے متوسط طبقے کے لوگ یہاں کھلی فضا میں آ کر آباد ہوں اور نئے سماج کی بنیاد رکھیں.....'' اور جب سننے والے دور نکل جاتے تو وہ آواز دھیمی کر کے پھر کہنے لگتے ''یہی دھوکے کی ٹٹیاں ہیں جن کے پیچھے سے دیواجی شکار کھیلتے ہیں۔ یہاں ایک فصیل تھی اُس کی اینٹوں سے یہ کوٹھیاں بنی ہیں۔ دیواروں کے باہر ایک اینٹ پختہ ہے، اندر سے سب کچی ہیں۔ لیپ پوت کر خوب صورت بنا دی گئی ہیں۔ دو تین برساتوں کے بعد مٹی نمک بن کر بھر جائے گی اور اگر کوئی مالک مکان گھر میں نہ رہا اور دو برس بعد آیا تو کوٹھی کی جگہ اُسے مٹی کا تودہ ملے گا۔ اس ویرانے میں کون رہے گا کیا کھائے گا؟ کیا کام کرے گا؟..... آپ ابھی زمین نہ لیجیے۔ زمین خریدی تو آپ پھنس جائیں گے۔ اسے کچھ آباد ہونے دیجیے..... ہم آپ ہی کی طرح یہاں بڑے بڑے خواب لے کر آئے تھے۔ سب ہوا ہو گئے۔ ہم تو محض اس لئے یہاں برقرار ہیں کہ دوسرے بھائیوں کو اس پھندے میں نہ پھنسنے دیں......''

مدھوار صاحب کے ساتھ پال سنگھ آرٹسٹ رہتے تھے۔ سکول کی لڑکیوں کو وہ اپنے نگار خانہ ہی میں تعلیم دیتے تھے۔ انھیں دیونگر کی سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں ـــ اُن کی بیوی اور سدرشن سنگھ سوپ کی بازیاں لگاتے، بچے پیرم کھیلتے اور آرٹسٹ صاحب کسی خیالی پری کی تصویر کینوس پہ اُتارا کرتے۔

..... اُن کے برابر کوٹھی میں اس جگہ کے سابق مالک اور جاگیردار (اب محض ایک سیلنگ) پنڈت ہزاری لال مشر رہتے تھے۔ دیواجی پہلے پہل اُن سے ملنے آئے تھے تو انہوں نے بڑے پیارے میٹھے ڈھنگ سے مشر جی کو یقین دلایا تھا کہ یہ زمین ایک عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے چاہیے۔ زمین کا اس سے زیادہ بہتر استعمال ہو ہی نہیں سکتا اور خود مشر جی کو اس عظیم کام میں دیواجی

کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کا انتظام کر دیں گے کہ پنڈت ہزاری لال مشرا اور اُن کے بیٹے دیو بینا کے مائنڈ میں بیٹھے رہیں۔ — مشرجی اُس وقت پئے ہوئے تھے۔ اپنے آبا و اجداد کی فراخدلی کا بکھان کرتے ہوئے انہوں نے دیوا جی کو بہت ارزاں داموں یہ زمین دے دی اور لال پری کی صحبت میں اُن کا زیادہ وقت گزرنے لگا۔ دن میں وہ کچھ دیر کے لئے برائے نام دفتر بیٹھتے، کچھ کام دام بھی دیکھتے، مگر شام کو گھر میں بوتل کھول کر بیٹھ جاتے۔ زیادہ پی لیتے تو زور سے چلاتے کہ انھیں لوٹ لیا گیا ہے۔ دیوا جی نے اُن کی سونے کی دھرتی کوڑیوں کے مول اُن سے چھین لی ہے اور گالیاں بکتے۔ جب اُن کا نشہ اُتر جاتا تو ہر موہن انھیں ڈانٹتا کہ دیوا جی انھیں رحم کھا کر رکھے ہوئے ہیں ورنہ قانوناً اُن کا کوئی حق نہیں۔ وہ یوں کہیں گے تو منڈل انھیں نکال دے گا۔ چنانچہ وہ اگلے دو چار دن شام کو وہاں پینے کی بجائے پتھر ہٹی اور گورے شاہ چلے جاتے اور کبھی ایک کی اور کبھی دوسرے کی نالیوں میں نشے میں دھت بے ہوش پڑے ملتے۔

...... رہے گیانی داد ر سنگھ، کھوسلہ صاحب اور ہر موہن وغیرہ تو سکریٹری ہونے کی حیثیت سے انہوں نے پھر اپنا پرانا عہدہ پالیا تھا۔ گیانی جی یا تو دیوا جی کی چاپلوسی میں لگے رہتے تھے یا پھر اپنی کوٹھی میں بیٹھے اپنے گرو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بالکل انھیں کی طرح پولیس کے ملازموں، ٹھیکے داروں اور دوسرے ملازمت پیشہ معتقدوں کے سامنے اپنے قصے سناتے اور لیکچر دیتے اور کبھی جب وہ ہنستے تو اپنے ارد گرد بیٹھنے والوں کی بغلوں میں ہاتھ دے کر خوب دل سے بھبکوں میں نکلنے والے پانی کی مانند قہقہے لگاتے۔ اُن قہقہوں کے درمیان وقفوں کے طور پر ایسے جھٹکے دیتے کہ معتقدین کو اپنی باہیں جوڑ سے اکھڑتی محسوس ہوتیں۔ کھوسلہ صاحب آیوروید کی نشاۃ ثانیہ کرنے، مفت دوائیں تقسیم کرنے اور آیوروید کی خوبیوں سے دیونگر کے ناواقف لوگوں کو واقف بنانے کے کام میں مصروف رہتے اور ہر موہن اور اُن کے ساتھی ایک دوسرے کے گھر جا کر پیتے، رمی اور وہسٹ ڈرائیوں کا انتظام کرتے اور موج اُڑاتے۔

سرما کی اُن شاموں میں ڈیوڑھی اور بھی سرد ہو جاتی۔ پورب پچھم بڑے بڑے محرابدار دروازے، اُتر دکھن کھڑکیاں اور موزیک کا فرش — ہوا بے روک ٹوک آتی اور فرش یخ ہو جاتا۔ اُس سخت سردی میں اپنے آرام دہ کمروں کو چھوڑ کر ڈیوڑھی میں ریڈیو سننا دیونگر والوں کے بس کی بات نہ تھی۔ کبھی کوئی پریس کا ملازم، جلد سازی یا پبلشنگ کے شعبہ کا کوئی دفتری کا ڈرائیور یا کلینر اور اسی قسم کا کوئی شخص ریڈیو سننے یا لائبریری میں (ڈیوڑھی میں ایک طرف بڑی میز پر کچھ اخبار اور دیوبانی کے تازہ شمارے پڑے رہتے اور وہ میز لائبریری کہلاتی تھی۔) کوئی اخبار یا رسالہ پڑھنے آ جاتا۔

دوسری شام جب میں کھانا کھا کر بنگلے سے باہر نکلا تو سوچنے لگا کہ کدھر جاؤں۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ اندھیرے میں سیر کرنا مشکل تھا۔ نندلال کے گھر جانا چاہتا تھا مگر وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر معہ بیوی بچوں کے باہر گیا ہوا تھا اور کھانا کھاتے ہی جا کر لیٹ رہنے یا لکھنے پڑھنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ اسی پس و پیش میں کھڑا تھا کہ وانی نے آ کر اپنی دو سہیلیوں سے میرا تعارف کرایا۔ ڈیوڑھی کی طرف چلتے چلتے اُس نے بتایا کہ اُن کے والدین نے دیونگر میں زمین خریدی ہے۔ بڑی کوٹھیاں بنائیں گے اور وہ ابھی کچھ دنوں کے لئے آئی ہیں۔ اور جب افتتاح کے بعد سکول باقاعدہ چلنے لگا تو نئے سیشن سے وہ پڑھنے

لگیں گی۔ اُس نے میری تعریف بھی کی — میرے گلے اور میرے مزاج کی اور جب ڈیوڑھی کے قریب پہنچ کر میں اپنی کوٹھی کی طرف مڑنے لگا تو اس نے بڑے التجا آمیز لہجے میں کہا: "ڈیوڑھی میں نہ بیٹھیے گا تشریف جی چند منٹ کے لئے۔"

"نہیں میں چلوں گا۔"

"آئیے نا۔ پانچ سات منٹ بعد چلے جائیے گا۔" اور اس نے میرا ہاتھ ذرا سا کھینچا۔

پہلی بار اُس کی نرم نرم ٹھنڈی یخ انگلیاں رات کی اس تاریکی میں میرے ہاتھ سے مس ہوئیں۔ اُس مس میں جانے کونسی طاقت تھی کہ ایک میٹھی سی سرسنسنی میری رگوں میں دوڑ گئی۔ چاہتے ہوئے بھی میں آگے نہ جا سکا۔

ہم ڈیوڑھی میں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ وانی نے آگے بڑھ کر ریڈیو لگا دیا۔ کوئی صاحب اٹک اٹک کر تقریر کر رہے تھے۔ تحریر شاید صاف نہ تھی یا ان کی پہلی پہلی تقریر تھی۔ معلوم ہوتا تھا گلا خشک ہوا جا رہا ہے۔ چار سطریں پڑھنے پر ہکلا جانے۔ وانی نے سوئچ گھما دیا۔ ریڈیو بند ہو گیا۔ وہ میرے قریب آ بیٹھی۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ باہر ڈیوڑھی کے دروازے کے سامنے سے کوئی سایہ گزر گیا۔

اور پھر بہت جھجکتے ہوئے۔ ایسے کہ اس کوشش میں وانی کا چہرہ تک سفید ہو گیا اس نے کہا کہ اس کی سہیلیوں کی بڑی خواہش ہے کہ میں ایک . . . . .

میں نہ جانے دروازے کے باہر اُس سایے کے گزر جانے کے باعث یا وانی کے یوں مجھے زبردستی وہاں لے جانے کے باعث یا جانے کس وجہ سے چڑ گیا تھا۔ اُس نے جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میں بول اُٹھا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

وانی کا منہ اور بھی اُتر گیا۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ اپنی اُنہی بڑی بڑی اُداس آنکھوں سے اُس نے میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہو — میں آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتی۔ مگر یہاں رکنے کا میرے پاس کوئی بہانہ نہیں۔ آپ ناراض نہ ہوں میں چلی جاتی ہوں — اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی کی طرف لے جاتے ہوئے وہ چلنے لگی۔

اور اُس وقت جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے روک لیا۔ "آپ ناراض ہو گئیں میری طبیعت واقعی اچھی نہیں ہے۔"

ایک لمحہ کو وہ بڑی بڑی نمناک آنکھیں میری طرف اُٹھیں۔ گیس کی روشنی میں ان میں تیرتے ہوئے آنسو چمک اُٹھے۔ دوسرے ہی لمحے انہیں میری نظروں سے ہٹانے کے لئے منہ دوسری طرف موڑتے ہوئے وہ بولی۔ "جبھی تو جا رہی ہوں۔ آپ آرام کیجئے۔"

میں نے اُسے زبردستی پھر بٹھا لیا اور اُس کے ساتھ ہی اُٹھ جانے والی اُس کی سہیلیوں سے معافی مانگتے ہوئے کہا: "آپ معاف کیجئے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی بہر حال آپ تشریف رکھئے۔ میں سناتا ہوں۔"

اور میں گانے لگا۔ دروازے کے باہر کسی بے چین روح کی مانند وہ سایہ برابر چکر لگاتا رہا۔ وانی اور اُس کی سہیلیاں اور اخبار پڑھتے ہوئے وہ ایک اشخاص ایک ٹک میری طرف دیکھتے رہے اور میں گاتا رہا۔

اپنے کمرے کی تنہائی میں جب میں سوچتا تو مجھے بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی کہ میں کیوں وانی کے سامنے بے بس ہو جاتا ہوں۔ اُس کی طرف نہ دیکھنے کے میرے سارے ارادے، اُسے بات کرنے کا موقعہ نہ دینے کے تمام عزائم کیوں ہوا ہو جاتے ہیں؟ کوئی ایسی حسین بھی نہیں۔ میری بیوی کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر آخر کیوں وہ مجھے اپنی طرف یوں راغب کر لیتی ہے؟ اگر میں وانی کی طرف دیکھنا قطعی بند کر دوں" وہ میری طرف کیسے دیکھے گی۔ جب میں اُدھر نظریں اُٹھاؤں گا ہی نہیں تو اُس کی آنکھیں کیوں کر میری آنکھوں سے چار ہوں گی۔ دو آنکھیں ایک طرف دیکھتی ہیں تو خود بخود تو چار ہوں گی نہیں۔ چار ہونے کے لئے چار ہی آنکھوں کی ضرورت ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ ڈائننگ ہال میں اُس کی طرف قطعی نہ دیکھوں گا۔

...... میں نہ دیکھتا۔ چپ چاپ نگاہیں نیچے کئے کھانا کھاتا لیکن بہت دیر تک اُدھر نہ دیکھنے سے میں سمجھ لیتا کہ اب وہ میری طرف نہیں دیکھتی۔ (یا تجسس ہوتا کہ دیکھوں وہ دیکھ رہی ہے یا نہیں) اور میں مڑتا اور چار ہی آنکھیں چار ہو جاتیں۔

...... کبھی میں بالکل اُدھر نہ دیکھتا۔ دوسری طرف منہ کئے تنا بیٹھا رہتا یا کسی ساتھی سے باتیں کرتا۔ لیکن محسوس ہوتا گویا میری کنپٹی میں بڑی بڑی دو آنکھیں سوراخ کر کے دوسری طرف نکل جائیں گی اور میں مڑتا اور میری آنکھیں اُس سے چار ہو جاتیں۔

اپنے کمرے کی اُس تنہائی میں میری بیوی کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی اور میں جھنجھلاتا کہ کیوں وہ ذرا سی دو بالشت کی بیمار بیمار سی لڑکی برمے کی طرح میری سوچ تک میں سوراخ کئے جا رہی ہے۔ جب دیکھئے اس کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں اور میں پھر اپنی مرحوم بیوی سے اُس کا موازنہ کرنے لگتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ میں جھک مار رہا ہوں۔ سکون کی تلاش میں یونگر آ کر میں انتشار مول لے بیٹھا ہوں اور ــ مجھے دیونگر چھوڑ کر شہر چلے جانا چاہیئے اور سخت قسم کے کام میں خود کو لگا دینا چاہئے تاکہ میں اتنا تھک جاؤں کہ رات کو سوؤں تو نہ پتو کے بارے میں سوچوں اور نہ وانی کے بارے میں اور پتھر کی طرح پڑا رہوں...

... ایک دن اسی قسم کی الجھن میں میں دیواجی کے پاس پھر چلا گیا اور بولا "میں جانا چاہتا ہوں"

وہ مجھے میں رخصت پر جانا چاہتا ہوں۔ بولے "کتنے دن کے لئے؟ یہاں پانچ اپریل کو پریکٹیکل سکول کا افتتاح ہونے والا ہے۔ اس وقت تک ......"

"جی نہیں میں جانا چاہتا ہوں"

دیواجی چپ چاپ میری طرف دیکھتے رہے۔

"جی میرا جی یہاں نہیں لگتا۔ آپ جانتے ہیں میں یہاں سکون کی تلاش میں آیا تھا"

"دِل تو بھائی لگانے سے لگتا ہے اور سکون تعب بھی باہر سے نہیں آتا" انہوں نے کہا۔ "اسے اپنے اندر تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اپنے آس پاس کی زندگی کو پاک و صاف آسودہ و خوشحال رکھ کر حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسروں کی خوشی و غم میں حصہ لینا سیکھئے آپ کا دل لگ جائے گا" اور انہوں نے بتایا کہ دیونگر میں بجلی نہ ہونے کے باعث سردیوں کی شامیں بہت طویل ہو جاتی ہیں اندھیرا یا کم تو اور بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جہاں سردیاں گذریں بہار آئی، دن بڑے بڑے ہوئے کہ دل خود بخود لگ جائے گا۔ چند لمحے خاموش رہ کر انہوں نے کہا۔ "اور کہیں جی نہ لگے تو ہمارے یہاں آ جایا کرو۔ کتابیں پڑھو۔ باتیں کرو۔ وانی کو

بھی گانے کا بہت شوق ہے۔ مدھو بھی سیکھ رہی ہے۔ کچھ انھیں سے سنو سناؤ۔ بسنت کے بعد کے دو ماہ بھی دیکھ لو۔ سکول کا افتتاح بھی ہو جائے گا۔ پھر جی نہ لگے تو چلے جانا۔ دیوگڑھ سے دوسری جو شکایتیں بھی ہوں، مگر جی نہ لگنے کی شکایت کبھی کسی نے نہیں کی۔"

اور میں چلا آیا تھا اور وانی کے اور میرے تعلقات بدستور تھے۔ نہ اتنی دوری نہ ویسی قربت راستے میں آتے جاتے، ریڈیو کے پاس بیٹھے، روشوں پر سیر کرتے، وانی غلام نبی کے بارے میں پوچھ لیتی۔ غلام نبی کیسی ترقی کر رہا ہے، یہ بتانے کے بہانے وہ لمحہ بھر کو رک جاتی اور اپنی نگاہوں کو میرے سینے میں دور تک اتار دیتی۔ بات کرتے کرتے اس کا رنگ اڑ اڑ جاتا۔ ڈری ہوئی ہرنی کی طرح وہ چونک چونک جاتی اور جونہی اسے ہر موہن یا تیرتھ رام نظر آتا وہ چل دیتی، اور وہ مختصر سی بے مصرف ملاقات اپنے پیچھے نہ جانے کتنی حلاوت چھوڑ جاتی۔

جب میں نے اس کشش پر مزید غور کیا تو محسوس کیا کہ اس کشش کی تہ میں تین چار باتیں کام کرتی ہیں۔ دیوگڑھ کے غیر معمولی حسن کے باوجود اس کی ویرانی، میری تنہائی اور تیرتھ رام کا رشک و حسد . . . . . اس آخری بات نے درحقیقت اس کے ہلکے سے تجسس کو جو تیرتھ رام کی محبوبہ کو جاننے کے سلسلے میں میرے دل میں پیدا ہوا تھا، اس کشش میں بدل دیا تھا۔

تیرتھ رام کا رشک و حسد روز بروز بڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر موہن کی مخالفت بھی۔ شاید اسی لئے وانی میری طرف زیادہ سے زیادہ کھنچ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھنے کے، مجھ سے ملنے کے، مجھ سے (خواہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو) بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ لیتی تھی۔

اسی درمیان ایک اور بات ہوئی، جس سے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔

ہوا یوں کہ دیوا جی نے مجھے ایک دن بلایا اور پوچھا کہ کیا میں ہندی جانتا ہوں؟

"جی!" میں نے جواب دیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی کہانیوں کا مجموعہ ہندی میں شائع کروں۔"

"جی۔"

"آپ ذرا کچھ کہانیاں ترجمہ کر کے دکھائیے۔ اچھی ہوئیں تو چھاپ دیں گے۔"

اور میں چلا آیا۔ لیکن جب میں اُن کا ہندی ترجمہ کرنے لگا تو مجھے بڑی دشواری ہوئی۔ میں نے الہ آباد میں تعلیم حاصل کی تھی اور ہندی سیکھی بھی تھی۔ مگر اس وقت کیا الہ آباد اور کیا لکھنؤ، سب جگہ اردو کا بول بالا تھا۔ اردو میری اچھی تھی اور ہندی اتنی اچھی نہ تھی۔ مجھے خیال آیا کہ تیرتھ رام سے کیوں نہ مدد لے لوں۔ وہ آریہ سماج کے سکول میں پڑھا تھا۔ ہندی میں بھی شاعری کرتا تھا۔

سنسکرت بھی اُس نے پڑھی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے تعلقات کچھ کشیدہ تھے مگر یہ کام تو دیواجی کا تھا میرا تو تھا نہیں۔ اور میں نے اُس سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن تیرتھ رام کے پاس جانے سے پہلے میں نے ہرموہن سے مناظروری سمجھا۔ اُس سے کہا: "دیواجی نے مجھے کچھ کہانیاں ہندی میں ترجمہ کرنے کو دی ہیں۔ میں نے ترجمہ تو شروع کر دیا ہے لیکن کہیں کہیں مشکل پیش آ رہی ہے۔ ڈکشنری تو ہندی اُردو کی یہاں ہے نہیں۔ آپ ذرا تیرتھ رام سے کہہ دیجیے کہ وہ میری مدد کر دے۔"

ہرموہن لمحہ بھر میری طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا: "آپ اس سے میرا نام لے کر کہیے گا، وہ فوراً کر دے گا۔" پھر ذرا سا رک کر بولا: "میں بھی اُس سے کہہ دیتا ہوں۔"

دوپہر بعد میں تیرتھ رام کے گھر گیا۔ میں نے اُس سے مدد کی درخواست کی اور ہرموہن کا نام لے کر پوری بات اُسے سمجھا دی۔

"گیت لکھنا اور بات ہے اور ترجمہ کرنا اور۔" تیرتھ رام بولا: "ہرموہن مجھ سے ملے تھے۔ میں نے اُن سے بھی کہہ دیا تھا کہ ترجمہ میرے بس کا نہیں۔"

"آپ کو ذرا زبان ہی دیکھنی ہے۔ ترجمہ تو میں نے کر لیا ہے۔"

وہ اٹل رہا۔

میں دل ہی دل میں غصے سے کھول کر مرنے لگا تھا کہ اُس نے کہا: "اگر دانی کہہ دے تو میں کر دوں گا، بلکہ آپ چاہیں گے تو ساری کہانی خود ہی ترجمہ کر دوں گا۔"

"ساری کہانی کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ترجمہ کر لی ہے۔ آپ صرف میرے ساتھ دیکھ لیجیے۔"

"اگر دانی کہہ دے تو ......"

"مگر دانی سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"تعلق کیا ہوگا، مگر وہ کہے تو میں کر دوں گا۔"

"یہ کام دیواجی کا ہے۔"

"مگر میرا نہیں۔ میں دیو سینک ہوں نوکر نہیں۔ دیواجی کہیں گے تو کہہ دوں گا مجھے ہندی نہیں آتی۔"

اور وہ بے باکی سے ہنسا۔

غصے سے تلملاتا اور پیر پٹکتا میں چلا آیا۔

شام کو دانی ملی تو میں نے اُس سے اس بات کا ذکر کیا۔ "تیرتھ رام نے یہ کیوں کہا؟" میں بولا: "یہ میں نہیں جانتا مگر مجھے اس کی فکر ہے کہ کام اچھا ہو جائے۔ اگر مناسب سمجھو تو اُس سے کہہ دینا۔"

"تیرتھ رام غنڈے ہیں۔" اچانک دانت پیستے ہوئے دانی نے زیر لب کہا۔

وہ غنڈہ کیسے ہے؟ یہ بات میں اُس سے نہ پوچھ سکا، کیونکہ وہ فوراً چلی گئی۔ مگر دیونگر کے ماحول میں دیواجی جیسے

تعلیم یافتہ اور مہذب باپ کے زیرِ سایہ پرورش پانے والی اُس لڑکی کے منہ سے ایک دیو سینک کے لیے کیوں گالی نکل گئی ؟ "تیرتھ رام" میں اور اُس میں کیا بات ہوتی ہے ؟ اس پر میں گھنٹوں غور کرتا رہا...... شاید اسی وجہ سے وہ ننھی سی بیمار بیمار، بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی میری سوچ میں دھنستی چلی گئی۔

جاڑے کی وہ تیز لہر گویا زور سے کچھ جھکولے کھا کر نکل گئی۔ زمین نے قولنج کے اس مریض کی مانند آرام کا سانس لیا جس کا درد لہریں کھا کر آہستہ آہستہ کم ہو گیا ہو۔ دن بڑے ہونے لگے۔ کچن کے سامنے کے انار کے خشک پودوں میں شگوفے آ گئے تھے۔ کالک میں بوئی ہوئی گندم بالیاں لے آئی۔ سرسوں کی زرد چنری سردن سنگھ کے کھیت میں لہرا اٹھی۔ برسات کے زیادہ دن تک ٹکے رہنے کے باعث ہوا میں اگرچہ ٹھنڈک تھی مگر سردیوں کی وہ سکڑن گھٹن اور سیلن ختم ہو گئی تھی۔ دھرتی جیسے انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی اور صبحیں شامیں ناقابلِ بیان اداسی کی جگہ دل میں نئی امنگیں اور نئے ولولے پیدا کرنے لگی تھیں۔ میں نے شام کو نندلال کے ہاں جانا یا ڈیوڑھی میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ اور نہر پر مغرب کے بنجر میں جوگی کی مانند کھڑے اس عظیم برگد کے نیچے یا کسی قریبی کارن میں جانے لگا۔

دیونگر کے اُس قیام میں وہاں کی صبحوں اور شاموں سے میرا گہرا تعلق رہا تھا۔ اُس ویرانے کے تنہا دنوں میں صبح شام کی اُن دوشیزاؤں نے میرا جی خوب بہلایا اور اُن کی ہر ادا اُن کے ساز و سنگھار اور ناز و انداز کے ہر پیچ و خم سے میں بخوبی واقف ہو گیا۔

...... آخری برسات کی وہ صبحیں میرے دل پر نقش ہیں جب برس چکنے کے بعد خواب جیسی ہلکی دھند کھیتوں پر چھائی ہوتی اور شفق نارنجی رنگ کی ساڑھی پہنے مشرق کے تخت پر فروکش ہو جاتی...... اور شامیں جب بنجر کے اُن کھجوروں کے پیچھے سے سیندوری شراب لٹاتیں تو نیلے نیلے ابرپارے جیسے اُسے پینے کے لیے بیتاب قطار اندر قطار آ کھڑے ہوتے۔ گردوانلی شوخ و سرمست دوشیزائیں اُن کے سروں پر شراب منڈھاتی ہوئی دور مشرق کے پیاسوں تک پہنچا دیتیں اور سیندوری شراب کی اس بارش سے پورے آسمان کی رگ رگ میں جیسے نشہ کی سرخی دوڑ جاتی۔

...... آغازِ سرما کے دن مجھے یاد ہیں، جب آگ کے شعلوں جیسی چمک لے کر صبحیں بیدار ہوتیں تو اُن کی لَو مشرق کے نیلے بادلوں تک کو تپا دیتی اور جب دن ڈھلتا تو غروبِ آفتاب سے قبل افق کے نیلے بادلوں میں سفیدی چھا جاتی اور اُس میں اپنی قرمزی آنکھیں جھپتھپاتا کر سورج ڈوب جاتا۔ آسمان میں جہاں جہاں بادل ہوتے پہلے قرمزی پھر نارنجی پھر زرد سا رنگ کافی دیر تک رہتا۔ پھر جب سارا آسمان بادلوں میں چھپ جاتا، جب بھی وہ اُجلی اُجلی سفیدی مغرب میں بہت دیر تک اُس جگہ چھائی رہتی جہاں سورج اوجھل ہوا تھا۔ معلوم ہوتا گویا شام اب بھی سورج کی راہ دیکھ رہی ہے کہ وہ پھر لوٹے گا...... پھر آئے گا.... اور اُس جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔

...... اور سخت سردی میں جب سنترے اور سیندوری سونا آتا تو دوشیزۂ صبح سونا لٹاتی رہٹ کے برگد کے پیچھے سے نمودار ہوتی۔ رہٹ کے کردیوں کے چلنے سے جو دھول اٹھتی وہ ایک سنہری بھاپ کی مانند دکھائی دیتی اور رہٹ کے بوجھ میں جہاں جہاں اُس کی کرنیں پڑتیں پانی سیال سونے کی طرح چمک اٹھتا اور شام کو کبھی جب مغربی افق کچھ صاف ہوتا اور بادل

برگد پر چھائے ہوتے تو ڈوبتے سورج کی گہری سرخ روشنی چھن چھن کر برگد کے گھنے پتوں سے آتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے سیال سونے کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا اس عظیم برگد تک آتا ہے مگر اسے عبور نہیں کر پاتا۔

صبح اٹھتے ہی میں ہمیشہ اپنے برآمدے میں آجاتا اور افق کے سنگھاسن پر براجنے والی دوشیزۂ صبح کا خیر مقدم کرتا اور دن ڈھلے نہر پر یا ویرانے میں برگد کے نیچے جا کر شام کو وداع کرآتا۔ رانی میری اس عادت سے جانے کب سے واقف ہو گئی تھی۔ اُن صبحوں شاموں میں (اپنی بہن یا سہیلیوں یا دکھیت یا ممی اور پاپا کے ساتھ جاتے ہوئے) اُس کی ایک نہ ایک جھلک مجھے ضرور نظر آجاتی اور شاید اسی لئے وہ صبحیں اور شامیں اور بھی رنگین اور پُرکیف ہو جاتیں۔

لیکن یہ تو میں اب سوچتا ہوں۔ اُس وقت تو وہ جتنا میری طرف کھنچتی میں اس سے بچنے کی کوشش کرتا۔ میں ایک رنڈوا پردیسی اور وہ ایک ننھی دوشیزہ جس کی ماں جس نے جنانی اور دوسرے رشتہ دار میرے مخالف اُس میں اور مجھ میں کیسی پریت۔ کیسا پریم؟ محبت کا وہ جال جتنی جلدی ٹوٹ جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ دیونگر میں کوئی خود دار انسان نہیں رہ سکتا۔ مدھوار صاحب کے اس قول سے میں متفق تھا اور اگرچہ میں وہاں مقیم تھا، کام کرتا تھا مگر میرا دل وہاں سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرا دل وہاں سے بالکل اُچاٹ ہو جائے۔ اس کا کوئی حصہ وہاں نہ پڑا رہ جائے، مجھے اس کا خیال رہتا تھا اور اسی لئے جب بہار کی اُن شاموں میں میں نے پھر سیر کے لئے جانا شروع کیا تو اس بات کا خیال رکھا کہ میں جس طرف ایک روز جاؤں دوسرے روز اُدھر نہ جاؤں اور یوں رانی سے ملاقات کے مواقع کم سے کم تر ہو جائیں، اُس کی محبت ختم ہو جائے اور وہ میرا خیال چھوڑ دے۔

کچھ دنوں ایسا معلوم ہوا کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اپنی اس فتح پر افسوس بھی ہوا لیکن دل کو کچھ سکون بھی ملا۔ اضطراب کے اُس ہلکے سے احساس کے باوجود جو اُن بڑی بڑی آنکھوں کو نہ پانے سے ہوا، دل کی گہرائیوں میں کہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ میں نے صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ الفت کے اس جال کو بے رحمی سے توڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

لیکن اب رانی بچوں کو لے کر ڈیوڑھی کی چھت پر جانے اور یہ دیکھنے لگی کہ میں کس طرف سیر کو جاتا ہوں۔ پھر ساتھ میں نیچر کو لے کر بچوں کو سیر کرانے کے بہانے وہ بھی اُدھر ہی کو چل پڑتی۔ واپسی پر میرا اُس کا ضرور سامنا ہو جاتا۔ جہاں میں ٹھہرتا عموماً وہیں سے وہ کسی نہ کسی بہانے پلٹ جاتی۔ میرے آگے آگے یا میرے پیچھے پیچھے وہ بچوں سے سہیلیوں سے یا ماسٹر صاحب سے باتیں کرتی ہوئی آتی۔ اُس کے ننھے ننھے قہقہوں کی نقرئی گھنٹیاں برابر میرے کانوں میں بجتی رہتیں۔ اُس کی نگاہیں اپنے غیر مرئی جال میرے گرد بُنتی رہتیں اور میں سوچتا — کیا میں دیونگر سے جا سکوں گا ان جالوں کو توڑ سکوں گا؟

اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اُس دن جب میں نے دیدا جی سے کہا تھا کہ میں جانا چاہتا ہوں تو اُن کی باتوں کے جادو میں آ کر وہاں پھر رہ جانے کی بجائے اگر میں چلا جاتا تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ پھر مجھے یا رانی کو غالباً وہ اذیت نہ برداشت کرنی پڑتی جس کا سامنا ہمیں وہاں کرنا پڑا۔

صرف ایک نقطہ —— وانی

پانچ اپریل کو سکول کا افتتاح اور دیو سمیلن ہونے والا تھا مگر دیونگر میں کئی روز پیشتر سے ہی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ پریکٹیکل سکول کی عمارت ابھی پوری کیا، نصف بھی نہ بنی تھی۔ دیواجی کی کوشش تھی کہ کانفرنس کے موقعہ پر کم از کم عمارت اتنی بن جائے کہ دیکھنے والوں کے سامنے اس کا خاکہ واضح ہو سکے۔ بننے پر اس کی شکل انگریزی کے اُلٹے حرف "وائی" کی طرح ہوتی۔ دیواجی چاہتے تھے کہ سامنے کا حصہ یعنی دو ونگ بن جائیں تاکہ کانفرنس میں آنے والوں کو اس کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ نندلال اُن دنوں صبح سے شام تک مصروف رہتا۔ شام کو آتا تو اتنا تھکا ہوتا کہ اُسے موزے اُتارنا اور ہاتھ منہ دھونا بھی مشکل معلوم ہوتا۔ وہ دہلیز سے زمین پر بچھے جاجم پر بیٹھ جاتا، موزے اُتار کر ایک طرف پھینک دیتا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ جاتا اور بے خبر سو جاتا۔ ساوتری انگوٹھے اور انگلی کی چمٹی بنا کر مرے ہوئے چوہوں کی طرح اُن موزوں کو اٹھاتی اور کراہت سے انھیں غسل خانے کے کونے میں پھینک کر صابن سے ہاتھ دھو لیتی۔ نندلال لنگر میں کھانا تک کھانے نہ جاتا۔ ساوتری وہیں سے آتی اور اُسے اُٹھا کر بچوں کی طرح کھلاتی اور کپڑے بدلوا کر سلا دیتی۔

باہر کے لوگ کانفرنس میں شامل ہونے کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ دیو سیلکوں کے کچھ عزیز و اقارب آ بھی گئے تھے اس لئے ہیڈ رام آؤ بھگت میں اور ہر موہن مہمانوں کے لئے پلنگ، دودھ، ناشتے اور کھانے پینے کا انتظام کرنے میں منہمک تھا۔

گیانی دلاور سنگھ کے ذمے نو واردوں کو دیواجی کی جگہ دیونگر کی سیر کرانے اور دیو منڈل کے منصوبے اور اصول سمجھانے کا کام تھا۔ دیواجی صرف مخصوص مہمانوں کو خود دیونگر دکھاتے، باقی لوگوں کو گیانی جی سنبھالتے۔

پالا سنگھ آرٹسٹ تھے اس لئے انھیں دیونگر اور کانفرنس کے پنڈال وغیرہ سجانے کا کام سونپا گیا تھا۔ کوٹھیوں کے آگے مہندی کی اونچی اونچی باڑیں اس طرح تراشی گئی تھیں کہ اُن میں چھوٹے چھوٹے محراب بن گئے تھے۔ ہر کوٹھی کے برآمدے میں گملے رکھوا دیئے گئے تھے۔ کچن کو جانے والی روشوں کی باڑیں بہت سلیقے سے ترشوا دی گئی تھیں۔ گڑھے بھروا دیئے گئے تھے۔ سکول کا گیٹ نہایت فنکاری سے بنایا جا رہا تھا اور اُس پر سردار پالا سنگھ کے آرٹ کا واضح نقش تھا۔

سکول کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنے تمام اختلافات کے باوجود مدھوا صاحب نیم تعمیر شدہ کمروں کی لیپا پوتی کے بعد انھیں سنوارنے اور سجانے میں منہمک تھے۔

"بچوں کو پیٹنا ان کی روح کو ہمیشہ کے لئے کچل دینا ہے۔"

"بچوں کی سمجھ کا علاج کرنے سے پہلے اپنی سمجھ کا علاج کیجئے۔"

"مسئلے بچوں ہی سے نہیں والدین کی وجہ سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔"

"اپنی پسند بچے پر نہ لا دیئے۔"

"بچہ انسان کا باپ ہے۔"

سُرخ کپڑوں پر سنہرے اور روپہلے حروف میں لکھے ہوئے اس قسم کے مثالی نعرے مختلف کمروں کی دیواروں اور جلسہ گاہ کے برآمدوں میں چسپاں رہے تھے۔ ایک ونگ میں کلاسیں تھیں، دوسرے میں عملی تعلیم کے لئے کھڈیوں، نجاری، مصوری، بچوں کے اپنے بینک، ڈاک خانے اور کوآپریٹو سٹور کا انتظام تھا۔ کمروں کے باہر خوبصورت حروف میں اُن کے ناموں کی تختیاں لکھوا کر لگوائی جا رہی تھیں۔ زمین چونکہ بنجر تھی اس لئے نہر سے مٹی منگا کر سکول کے باہر کے احاطے میں پھولوں کی روشیں بنا دی گئی تھیں۔ صبح سے شام تک مدھوار صاحب پوری سنجیدگی اور مستعدی کے ساتھ ان انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔

سکول کے استاد اِس عظیم مظاہرے کے لئے طلبا کو پوری طرح تیار کرنے میں مصروف تھے۔ دیوا جی چاہتے تھے کہ جب کانفرنس ہو تو حاضرین کو لڑکے بینک اور کھڈیوں وغیرہ میں کام کرتے نظر آئیں، اس لئے جلدی جلدی کچھ لڑکے تیار کر لئے گئے تھے۔ بچوں کا چھوٹا سا بینڈ بھی تیار کیا گیا۔ کسی نہ کسی طرح ایک مارچ گیت کی دھن سکھا دی گئی تھی۔ کوٹھیوں کے سامنے ویرانے میں زمین ہموار کر کے ایک گراؤنڈ بنا دی گئی تھی۔ لڑکوں کے لئے ہاکیاں آ گئی تھیں۔ شام کو وہاں کھیل ہوتا۔ صبح باقاعدہ قواعد ہوتی۔ دو تین بار بڑے لڑکے دیہات میں جا کر بیلچے پر گئے کاریں نکلتے اور بچے کیڑا جوہڑ میں گڑ بنتے دیکھ آئے تھے۔ ان سب باتوں کے سلسلے میں ٹیچروں نے انھیں بڑے اچھے نوٹ لکھا دیئے تھے اور وہ سب کاپیاں نمائش کے لئے رکھ دی گئی تھیں۔ ڈرائنگ اور کنڈرگارٹن کے کمروں کی دیواروں پر پالا سنگھ آرٹسٹ کی مدد سے بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں ٹانگ دی گئی تھیں جن میں بچوں کی کوششوں سے زیادہ پالا سنگھ کی محنت کا دخل تھا۔ اُن میں ایک تصویر راما تھاپا کے بچے کی بھی تھی۔ تصویر اور راما تھاپا کا بچہ دونوں کانفرنس کی قابلِ دید چیزیں تھیں اور ٹیچروں کو ہدایت تھی کہ آنے والوں کی توجہ اُن دونوں کی طرف خاص طور پر مبذول کریں۔

اُن دنوں غلام نبی کی بھی بڑی پوچھ تھی۔ اُسے معماری کا کام آتا تھا۔ اُس نے پرانی فصیل کی کچی پکی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی مدد سے پریکٹیکل سکول کا ایک قدِ آدم ماڈل باہر سکول کے احاطے میں بنا دیا تھا۔ جو شخص بھی دیکھنے آتا اسے پریکٹیکل سکول اُس کے بچوں کی سرگرمیاں، راما تھاپا کے بچے کی تصویر، غلام نبی کا ماڈل اور ساتھ ہی اُن دونوں بچوں کو بھی دکھایا جاتا۔

دیوا جی نے اس موقعہ کے لئے دیوبانی میں خاص طور پر کچھ مضمون لکھے تھے جنھیں وہ ٹریکٹوں کی صورت میں ہندی، اُردو اور گورمکھی تینوں زبانوں میں چھپوانا چاہتے تھے۔ اُن سبھی مضامین کا واحد مقصد یہ تھا کہ دیومنڈل کے پیرو اور دیوبانی کے قارئین دھڑا دھڑ اپنے بچوں کو پریکٹیکل سکول میں داخل کرائیں کہ اسی میں اُن کی فلاح ہے۔ ان مضامین کو اُردو، ہندی میں تیار کرنے کا کام مجھے سپرد ہوا اور میں دن رات ان کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

کوٹھی نمبر ۱ کے بڑے حصے میں ایک نئے دیوسیوک جو نئے نئے وکیل ہوئے تھے آ گئے۔ دیومنڈل کی قانونی سرگرمیوں کا کام انھیں سونپا گیا تھا۔ اُن کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے مگر اُن کے کوئی بچہ نہ ہوا تھا اور اُن کی بیوی کی آنکھوں میں سب کے لئے جوش و خروش اُمڈ پڑتا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا وہاں رہنا انھیں اچھا نہ لگا۔ تیرتھ رام اور ہر موہن نے آتے ہی انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ایک دن دیوا جی نے کہا کہ میں گیانی ونود سنگھ کے ہاں اُٹھ جاؤں کیونکہ نونہال سنگھ (نئے وکیل صاحب) چاہتے ہیں کہ تیرتھ رام ان کے قریب رہے۔ وہ نئے نئے دیوسیوک بنے تھے۔ اُن کے والد نے دیونگر میں دو کوٹھیوں کے لئے زمین خریدی تھی۔ اُن کی دو بہنیں

اُور دو بھائی پریکٹیکل سکول میں داخل ہوئے تھے اور اس لئے ان کی خواہش حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ میں اپنا بوریا بستر اُٹھا کر کوٹھی نمبر ۹ میں گیانی دلاور سنگھ کے ساتھ آ گیا۔ سکول وہاں سے بہت قریب پڑتا تھا۔ کام کرتا کرتا میں ایک آدھ چکر وہاں بھی لگا آتا اور ضرورت پڑے مدھوار صاحب کا ہاتھ بٹا آتا۔

رانی اُن دنوں بہت مصروف تھی۔ دیواجی کی بڑی لڑکی اُور سکول کی بڑی طالبہ ہونے کے باعث اُس کی سرگرمیوں کی انتہا نہ تھی۔ ہر وقت ہر جگہ وہ دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اُن مصروفیات کے باوجود وہ مجھے غلام نبی کی حرکات و سکنات سے آگاہ کرنا نہ بھولتی تھی۔ اُس کے بنائے ہوئے ماڈل کی ایک ایک اینٹ کیسے رکھی گئی اس کی پوری پوری تفصیل اُس نے مجھے بتائی تھی۔ اُن دنوں میرے اپنے دل میں نہ جانے کیسا جوش پیدا ہو گیا کہ میں اپنے کام کے علاوہ دوسرے سبھی کاموں میں حصہ لینے لگا تھا اور ظالم شکی آنکھوں کے خوف سے صبح شام کے دھندلکوں میں ملنے والی نگاہیں اس عام جوش و خروش کی روشنی میں آزادی سے ملنے لگی تھیں۔

لیکن تبھی اُن کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر دیوار آ کھڑی ہوئی۔

کانفرنس میں ابھی پانچ دن باقی تھے۔ اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔ میرے قصبے سے دو ایک واقفکار اُور دوست میرے بھائی کے ساتھ دیونگر دیکھنے آ گئے۔ ان کی آمد نے میرا جوش اُور بھی بڑھا دیا۔ میں انھیں اپنے ساتھ دیونگر، اس کی کوٹھیاں، ڈیوڑھی، لنگر، پریس، گنبد، اس میں بیٹھنے والے دیواجی، پریکٹیکل سکول، اس میں غلام نبی کا ماڈل اور رانا پرتاپ کے بچے کی تصویر سب دکھاتا پھرا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیواجی کی دونوں لڑکیوں کے ہاتھوں بنی بیحد خوبصورت تصویریں بھی وہاں لگی ہوئی تھیں اور امیروں کے جتنے بچے سکول میں آئے تھے ان کا ایک نہ ایک قابلِ دید کارنامہ وہاں موجود تھا۔ میں نے اپنے قصبے کے احباب کو ایک ایک چیز دکھائی ——— دیونگر کے غیر مطمئن لوگوں کی طرح نہیں، بلکہ دیونگر کے مداح دیوسینکوں کی طرح بے اطمینانی اگر کہیں تھی تو وہ اس جوش میں دب گئی تھی۔ زبان پر نہیں آئی۔ میرے قصبے کے احباب اتنے خوش اور متاثر ہوئے کہ انہوں نے پانچ تاریخ کو کانفرنس میں آنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور ایک نے تو دیواجی کو اس بات کا یقین بھی دلایا کہ وہ اپنے والد سے کہہ کر دیونگر میں ایک کوٹھی بنوائیں گے۔

صبح کا وقت تھا۔ دس بجے ہوں گے۔ نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے میں لبس پر اپنے دوستوں کو چھوڑنے جا رہا تھا کہ سامنے ہر موہن کے ساتھ پتھر ہٹی کے تھانے کا ہیڈ کانسٹیبل آتا دکھائی دیا۔ دیواجی ہمیشہ اس بات کا اعلان کرتے تھے کہ وہ پولیس کو رشوت دینے کے خلاف ہیں۔ پولیس کی طرف سے گاؤں والوں پر جو ظلم و زیادتی ہوتی تھی، وہ ان کا مقابلہ کرنے اور بشرطِ ضرورت انصاف کے لئے ہر قربانی کرنے کی بھی نصیحت فرمایا کرتے تھے لیکن دیونگر کا کوئی بھی تیوہار یا تقریب ہو، وہ پتھر ہٹی کے تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل کو مدعو کرنا نہ بھولتے تھے۔ دیو ہیلن سے پانچ دن پہلے پتھر ہٹی کے ملک امرت کو دیونگر میں دیکھ کر میں مسکرایا اور مجھے یقین ہو گیا

نہ کانفرنس کے موقعہ پر پورا اٹھانا ضرور ہے گا۔

میں اُن کے پاس سے نکلا جا رہا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔ "آپ کا نام بسنت سنگھ ہے؟"

میں رک گیا۔

"آپ کے نام کا ایک وارنٹ ہے۔"

"وارنٹ؟ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیسا وارنٹ؟"

"آپ پر ایک لڑکی کے اغوا کا الزام ہے۔"

"کیا؟"

آپ جائیے۔ ہر موہن نے مجھ سے کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو بس پر چھوڑ آئیے۔ میں سارجنٹ صاحب کو ڈیوڑھی میں بٹھاتا ہوں۔"

"لیکن میرے نام وارنٹ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کسی دوسرے کے نام ہو گا غلطی سے ادھر آ گیا ہو گا۔"

"یہی میں نے ان سے کہا ہے۔" ہر موہن بولا۔ "ضرور غلطی ہوئی ہے۔ آپ دوستوں کو سوار کر آئیے بس پر۔"

"جی نہیں۔ سارجنٹ نے کہا۔ یہ دیکھئے بسنت سنگھ دیو نگر لکھا ہے۔"

"ہاں ہاں . . . . . ." ہر موہن نے ہیڈ کانسٹیبل کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ان کے دوست آئے ہیں انہیں بس پر چھوڑ آنے دیجئے۔ یہ کہیں جائیں گے نہیں۔ اس کی میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

میں نے ایک سرسری سی نگاہ وارنٹ پر ڈالی۔ میری آنکھوں نے اپنا نام ضرور دیکھا، مگر اس کے بعد کچھ اندھیرا سا چھا گیا۔ چہرہ شاید اتر گیا۔ خشک گلے سے اپنے دوستوں سے کہا۔ "آپ چلئے بس نکل جائے گی۔" اور میں مڑا۔

"نہیں نہیں۔ آپ انہیں بس پر چھوڑ آئیے۔" ہر موہن نے کہا۔ "میں سارجنٹ صاحب کو بٹھاتا ہوں۔ اپنے ہی آدمی ہیں۔"

لیکن نہ جانے کیوں دوستوں کے سامنے آنکھ اٹھانا تک میرے لئے دشوار ہو گیا۔ اُن کی طرف دیکھے بغیر میں نے کہا۔ "آپ چلئے، بس نکل جائے گی۔ میں ذرا ان سے نمٹ لوں۔"

اور میں اُن کے ساتھ لوٹ پڑا۔

غالباً میرے اُترے ہوئے چہرے یا سارجنٹ کی موجودگی کے باعث میرے ساتھی گئے نہیں۔ کچھ فاصلے پر پیچھے پیچھے آنے لگے۔ لیکن میں نے ان کی طرف پھر نہیں دیکھا۔ چلتے چلتے دو ایک بار میں نے وارنٹ پر نظر ڈالنے کی کوشش کی مگر ہر بار آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

اب اتنے دنوں بعد سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ اس وقت میرا دماغ کہاں گھاس چرنے چلا گیا تھا کیوں میں نے غور سے وارنٹ کو نہیں پڑھا۔ مگر قصبے کی فضا میں پلنے اور ہمیشہ پولیس کے مظالم کے قصے سنتے رہنے کے باعث شاید غیر شعوری طور پر دل پر

ایسی دہشت طاری ہوئی تھی کہ وارنٹ کا نام سنتے ہی دل دھڑکنے لگا اور سوچ سمجھ کی تمام قوتیں سلب ہو گئیں۔ میرے بھائی اور قصبے کے دیگر دوستوں کی موجودگی بھی غالباً میری اُس گھبراہٹ کا سبب تھی۔ میں اطمینان کے ساتھ کمرے میں بیٹھا ہوتا اور سارجنٹ آتا تو میں نہایت صبر و سکون کے ساتھ وارنٹ کو پڑھتا۔ مگر خوشی کے اُس موڈ میں جب اپنے قصبے کے احباب کو رخصت کرنے جاتے ہوئے یہ اعلان کہ مجھ پر ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا الزام ہے۔ اتنا غیر متوقع تھا کہ میں ایک دم گھبرا گیا۔

مَیں نے ڈیوڑھی کے راستے میں چلتے چلتے ایک دو بار پھر وارنٹ پر نظر دوڑانے کی کوشش کی مگر اپنے نام سے آگے میری نگاہیں نہیں گئیں۔

”کس لڑکی کے بھگانے کا الزام ہے؟“ مَیں نے کچھ رُک کر پوچھا

”یہ تو آپ جانتے ہوں گے۔“

”جانتا تو پوچھتا کیوں؟“

”تیرہ چودہ برس کی چھوٹی، پتلی، چھریری، نابالغ لڑکی ہے۔ نام لکھا ہے۔“

”مَیں نے لڑکی کا نام پڑھنے کی کوشش کی مگر آنکھوں کے آگے پھر تاریکی چھا گئی۔

ڈیوڑھی میں پہنچ کر میں ریڈیو کے پاس والی بنچ پر بیٹھ گیا اور پھر مَیں نے ایک بار وارنٹ پڑھنے کی کوشش کی لیکن پھر ناکام رہا۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مَیں نے جو کہنا چاہا اُس کا مطلب کچھ یہ تھا کہ کسی نے غلط رپورٹ لکھا دی ہے۔ مَیں کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔

”اگر کوئی آپ کی ضمانت دے دے تو یہ بعد میں طے ہو جائے گا۔ ورنہ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“

”اور اُسی وقت میری نظر دروازے پر کھڑے اپنے دوستوں پر پڑی جو واپس آ گئے تھے۔ میری ہمت بندھی۔“ میرے دوست میرے گاؤں سے آئے ہوئے ہیں۔ بڑے امیر گھرانے کے ہیں۔“ مَیں نے کہا ”یہ ضمانت دے دیں گے۔“

”مگر ہم انھیں نہیں جانتے۔ دیوا جی یا ہر موہن ضمانت دے دیں تو ٹھیک ہے۔“

مَیں کچھ لمحوں کو دونوں ہاتھوں میں سر دے کر بیٹھ گیا

جب کچھ دیر بعد مَیں نے سر اُٹھایا کہ ہر موہن سے ضمانت دینے کو کہوں اور دیکھوں کہ اُس کی آنکھوں میں ہمدردی ہے یا بے پروائی ...... تو میں نے دیکھا کہ پورا دیوگر آہستہ آہستہ آ کر ڈیوڑھی میں جمع ہو گیا ہے۔ نہ صرف سب دیو بینک ہیں بلکہ اُن کی گھر والیاں بھی ہیں۔ اور تو اور گیانی دلاور سنگھ اور پنڈت ہزاری لال کے گھر سے بھی عورتیں آ گئی ہیں اور عجیب سی کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ اگر وانی بھی اُن میں ہوئی ...... اور اس خیال ہی سے کہ وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر کیا سوچے گی، میرا دل بیٹھ گیا۔ مگر ایک نظر دیکھنے پر مجھے اطمینان ہو گیا۔ ان سب تماشائیوں میں وانی موجود نہ تھی۔

تبھی ماتا جی سے میری نگاہیں چار ہو گئیں۔ اُن میں عجیب سی مسرت آگیں چمک تھی۔ اور ساوتری — اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت تھی ...... مَیں نے جس جس چہرے کو دیکھا اُسے اپنے ساتھ ہمدردی رکھنے کی بجائے مسکراتے پایا، حتّٰی کہ سارجنٹ کی آنکھوں میں بھی خفیف سی مسکراہٹ تھی ...... نہ جانے اُس گھبراہٹ میں کب تیرتھ رام نے میرے ہاتھ سے وارنٹ لے لیا تھا۔

جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بلند آواز سے تمام حاضرین کو وارنٹ کی دفعہ اور الزام سنا سنا کر اس کی تشریح کر رہا تھا۔
پھر جانے کیسے دفعتاً بجلی کے کوندے کی طرح سب کچھ میرے سامنے واضح ہو گیا۔ میں ایک دم اٹھا اور میں نے سارجنٹ کو ڈانٹا کہ اس مذاق کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑے گا۔ میں سپرنٹنڈنٹ سے رپورٹ کروں گا۔ اور میں بگولے کی مانند ڈیوڑھی سے نکلا۔ باہر میرے ساتھی اور احباب کھڑے تھے۔ ان کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے۔ "یہ سب مذاق ہے۔ آپ لوگ جائیے۔ آپ کی بس چلی جائے گی۔" یہ کہتا ہوا میں اسی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اپنے پیچھے میں نے 'اپریل فول' 'اپریل فول' کی آوازیں سنیں۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بڑھتا ہوا میں اپنی کوٹھی میں آیا اور دروازے کی چٹخنی چڑھا کر دھم سے کرسی پر جا بیٹھا۔
دیر تک دبو بینک میرے کواڑ کھٹکھٹاتے اور 'اپریل فول' 'اپریل فول' چلاتے رہے۔ میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ میز پر بازو رکھے ان میں سر کو ٹکائے اوندھے منہ جھکا بیٹھا رہا۔

میں دوپہر کا کھانا کھانے نہیں گیا۔ گیانی دلاور سنگھ ایک دو بار آئے مگر میں نے دروازے نہیں کھولے۔ اپنے قصبے کے دوستوں کے سامنے مجھے وہ مذاق نہایت واہیات معلوم ہوا۔ پھر اپنے کمرے کی تنہائی میں میز پر بیٹھے بیٹھے اس الزام کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ تیرہ چودہ سال کی پتلی سی چھوٹی سی لڑکی......
ان کا اشارہ یقیناً دانی کی طرف تھا۔ یقیناً یہ سازش تیرتھ رام اور ہر موہن نے مل کر کی تھی...... اور مجھے یاد آیا کہ ڈیوڑھی میں جمع ہونے والوں میں اور سب تھے لیکن دانی نہیں تھی...... پہلی اپریل کو انھیں میرا مذاق اڑانا تھا تو وہ کوئی دوسرا الزام لگا سکتے تھے لیکن اپنی دلی خباثت اس الزام کے ذریعے انہوں نے ظاہر کر دی تھی...... تیرہ چودہ سال کی پتلی چھریری، نابالغ لڑکی...... اور مجھے تیرتھ رام کی تشریح یاد آئی —— سنگیت جی کو چھوٹی چھوٹی نابالغ لڑکیوں کو ورغلانا خوب آتا ہے۔ کمرے میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں اٹھا۔ دروازے میں تالا لگایا اور باہر نکل کر اس عظیم برگد کے نیچے پہنچا جہاں سناٹا تھا اندھیرا تھا اور سکون تھا۔ گھنے سایوں میں نمی کی کچھ عجیب سی بو بسی ہوئی تھی۔ پتے بکھرے پڑے تھے۔ لمبی لمبی داڑھیاں لٹک رہی تھیں۔ نیچے زمین پر خانہ بدوشوں نے اینٹیں اکٹھی کر کے جگہ جگہ چولہے بنا رکھے تھے۔ نہ جانے ان میں آگ کب جلی تھی۔ راکھ اڑ چکی تھی صرف اس کی سیاہی باقی تھی۔ اوپر گھنی شاخوں میں بے شمار چمگادڑ الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ میرے جانے سے وہ ایک ساتھ شاں شاں کر کے چیخ اٹھے۔ دو ایک طوطے اپنے گھونسلوں سے باہر نکلے اور اڑ گئے۔ بڑی دیر تک میں دل ہی دل میں سلگتا جلتا گھومتا رہا۔ برگد کے پرے کپاس کا کھیت بالکل سوکھ گیا تھا۔ کپاس جھڑ چکی تھی۔ صرف خشک ڈنٹھل کاٹے جانے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ لیکن دور تک کاتک میں بوئی ہوئی گیہوں کی فصل پکی کھڑی تھی۔ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے سنہری بالیاں جڑوں سمیت لرز جاتیں اور ہوا کا تیز جھونکا آتا تو اس کے رخ کو جھک جاتیں اور حد نظر تک پھیلے وہ سنہرے سبز کھیت اجوار بھاٹے پر آئے سمندر کا نظارہ پیش کرتے۔ ایک لہر آتی اور سارے کھیتوں کی بالیاں جھکتی چلی جاتیں۔ جب تک وہ اپنی جگہ آتیں کہ ہوا کی دوسری لہر آ جاتی۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک گھومتا رہا لیکن سوچ برگد کے اوپر تھا کہ مغربی اُفق پر گہرا زرد بادل اُٹھا۔ شاید آندھی ہے۔ میں نے سوچا۔ لیکن آندھی کے تیور تو نہیں ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ بادل کا وہ ٹکڑا تیز ہوا کے پروں پہ اُڑتا ہوا سارے آسمان پر چھا گیا۔ یہ تو اولوں کا بادل ہے۔ سوچتا ہوا میں تیزی سے پلٹا۔ کوٹھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ بن برسات ژالہ باری ہونے لگی، دیکھتے ہی دیکھتے ساری زمین سفید ہو گئی۔ کبھی کبھی کوئی موٹا پتھر برآمدے کے فرش پر زور سے آگرتا اور چور چور ہو کر بکھر جاتا۔ ہوا تیز تھی اور خاصی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک میں برآمدے میں کھڑا ژالہ باری دیکھتا رہا پھر اندر کمرے میں چلا گیا۔

ابھی مشکل بیٹھا ہوں گا کہ دیوا جی کا ملازم جیتا تا نے ایک خط دیا۔

"وانی بی بی نے دیا ہے!" اُس نے کہا۔

"وانی کا خط! میرا دل دھڑک اُٹھا۔ میں نے خط لے لیا۔ ملازم چلا گیا —— چھوٹے چھوٹے مگر بہت صاف حروف میں تحریر تھا۔

سنگیت جی

آج دیونگر میں آپ کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے اُس کے لئے بے حد افسوس ہے۔ دُنیا بیدار نہیں دُنیا نہیں جانتی کہ جدھر سے وانی گذرتی ہے اُدھر سے سنگیت جی گذریں۔ یا وہ وانی جیسی ناچیز ہستی سے دو بازیاں بیڈمنٹن کھیلیں۔ اس نگر کا نام اگرچہ دیونگر ہے مگر یہ دیوتاؤں کا نہیں۔ اکشسوں کا نگر ہے۔ واہ جی کی نصیحتیں بنجر زمین میں بوندوں کی مانند بیکار جاتی ہیں۔ خواہ آپ نے مجھے جو محبت بخشی ہے وہ قطعی پاک ہے لیکن جن کے دلوں میں میل ہے وہ اُسے ناپاک سمجھتے ہیں۔ آج سے ہر موہن بھرا جی ندرشن سنگھ اور تیرتھ رام جی ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ نے اب تک جو رویہ اپنا رکھا ہے وہی دو تین سال اور اپنائے رکھیں۔ آپ کی اور اپنی عزت کے خیال سے میں یہ چند سطریں لکھ رہی ہوں۔ اس خط کو پڑھ کر پھاڑ ڈالیں۔

آپ کی

وانی

خط کو پڑھ کر میں سچ کی اپنی ساری تکلیف اور توہین بھول گیا۔ لیکن ساتھ ہی کچھ عجیب سے غم و غصہ سے دل اُبل اُٹھا۔ یہ دیوتاؤں کا نہیں راکشسوں کا نگر ہے۔ جب دیونگر کے بانی کی لڑکی یہ کہہ سکتی ہے تو اوروں کا ذکر ہی فضول ہے۔ پھر ہر موہن تیرتھ رام اور کبرے کی داڑھی والے دیونگر کے اس یوسف کی وہ سفاکانہ سازش۔ . . . . دیوا جی وہاں نہیں تھے۔ ورنہ شاید میں اسی وقت جا کر اپنا استعفیٰ دے آتا۔

جب شام کو بھی میں کھانا کھانے نہیں گیا اور سوکھے رسک کھا کر اور پانی پی کر لیٹ گیا تو گیانی جی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اُٹھنا نہ چاہتا تھا۔ نہ کوئی بات ہی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُن کی متواتر دستک پر اُٹھا۔ وہ میرے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ صبح کے واقعہ کا ذکر کر کے انہوں نے کہا "تم نے نہ صبح کھانا کھایا نہ شام۔ مجھے بہت فکر ہو گئی ہے بھائی تمہیں مذاق میں یوں برا نہ ماننا چاہیے۔"

"میں مذاق کو برا نہیں مانتا" یکایک میں بول اُٹھا "لیکن اُس مذاق کی تہہ میں جو جذبہ ہے وہ بے حد افسوسناک ہے۔"

"کیا بات ہے؟" گیانی جی میرے قریب ہو بیٹھے اور اُنہوں نے میری پیٹھ بڑی محبت سے تھپتھپائی۔

میں خاموش رہا۔

"کیا بات ہے؟" اُنہوں نے پھر میری پیٹھ تھپتھپائی۔

اور نہ جانے مجھے کیا ہوا! گیانی جی کے اس سوال میں کتنی سفید داڑھی مونچھوں سے بھرے اُن کے اس چہرے میں اُن کی بڑی متجسس آنکھوں میں کیا بات تھی کیسی پُرخلوص شفقت تھی یا پھر جانے میرا دل ہی کیسا بھرا ہوا تھا کہ چھلک اُٹھنے کو بیقرار تھا۔ میں نے اوّل سے آخر تک تیرتھ رام اپنے اور دانی کے متعلق ساری باتیں انہیں بتا دیں۔ کہیں کوئی بات نہ چھپائی۔

گیانی جی، دیوا جی کے اندھے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اُن کی بڑی لڑکی نے نہ صرف مجھ جیسے ادنیٰ ملازم کو چاہا ہے بلکہ اُسے دیونگر کے بارے میں ایسا خطرناک خط لکھا ہے یہ سن کر اُن کے چہرے پر فکر کے گہرے بادل چھا گئے۔ چند لمحے وہ خاموش رہے پھر انہوں نے نہایت متین اور سنجیدہ لہجے میں کہا "آپ کی باتیں ۸۰ فیصدی درست ہیں۔۔۔۔"

"میں نے ایک فی صدی بھی جھوٹ نہیں بولا۔" میں نے بات کاٹ کر کہا

"آپ نے جھوٹ نہیں کہا۔ آپ کا قیاس غلط تھا۔"

میں خاموش رہا۔

چند لمحوں کے بعد گیانی جی پھر بولے "تیرتھ رام رشک و حسد کی وجہ سے آپ کے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ ہر موہن نے اُسے تعینات کر رکھا تھا۔۔۔۔"

"میرے خلاف غلط سلط باتیں کہہ کر اُس نے اپنے آپ کو تعینات کرا لیا تھا یوں کہئے۔"

گیانی جی نے میری بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے کہا "آپ وہ خط مجھے دکھا سکتے ہیں؟"

"میں آپ کو دکھا سکتا ہوں۔"

"دکھائیے؟"

اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں خط تھام کر اُنہیں جلدی جلدی پڑھا دیا اور اگرچہ اس کا ذرا بھی امکان نہ تھا، تاہم میں نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ وہ چھین نہ لیں۔

"یہ خط آپ کو مجھے دے دینا چاہیے"۔ انہوں نے پھر اصرار کیا اور لمحہ بھر بعد بولے۔ "اور آپ کو استعفیٰ دے دینا چاہیے۔"

"یہ میرا ذاتی خط ہے۔ میں آپ کو کیوں دوں؟" میرے لہجے میں ہلکی سی جھنجھلاہٹ تھی۔ "میں اس کا کوئی بیجا فائدہ نہ اٹھاؤں گا۔"

یہ وعدہ کرتا ہوں۔ رہا استعفیٰ تو میری کیا غلطی ہے کہ میں استعفیٰ دوں؟"

گیانی جی پھر خاموش ہو گئے۔ دراصل وہ اس خط کو دیکھ کر بہت متفکر ہو گئے تھے۔ بہت دیر تک وہ مجھ سے خط مانگتے رہے مگر میں نے خط دینے سے ایک دم انکار کر دیا۔ انھیں فکر تھی کہ دیو کانفرنس ہونے جا رہی ہے اگر اس خط کے بارے میں مخالف گروپ کو علم ہو گیا تو جانے وہ کیا گل کھلا دیں۔ آخر تقریباً بارہ بجے رات، مجھ سے یہ وعدہ لے کر کہ میں کسی سے بھی اس خط کا ذکر نہ کروں گا، وہ چلے گئے۔

لیکن صبح ہی پھر آ گئے۔ میں رات بھر سو نہ سکا تھا۔ لیکن انھیں بھی نیند نہ آئی تھی۔ آتے ہی انہوں نے پھر وہی رٹ لگا دی۔ میں نے رات اس خط کی ایک نقل کر کے رکھ لی تھی۔ میں نے ان سے کہا: "میں خط آپ کو دوں گا نہیں، مگر آپ کو یہ بتانے کے لئے کہ میرا ارادہ نہ تو اسے مخالفوں کو دکھانے کا ہے اور نہ کسی اور کو دینے کا، میں اسے جلائے دیتا ہوں۔"

"ہاں آپ اسے جلا دیجیے۔" انہوں نے جیسے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

اور میں نے اس خط کو دیا سلائی دکھا دی۔ چند لمحوں تک وہ جلتا اور مڑتا ہوا خط میرے ہاتھ میں رہا۔ پھر جب میری انگلیاں جلنے لگیں تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور جلتا ہوا وہ سرخ سیمنٹ کے فرش پر جا گرا۔

گیانی جی مطمئن ہو کر چلے گئے تو میری نظر اس جلتے ہوئے خط پر گئی۔ کاغذ کا ایک کونہ راکھ سے الگ ہو کر مڑا پڑا تھا اور راکھ کمرے میں اڑ رہی تھی۔ میں نے وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا۔ صرف ایک لفظ جلنے سے رہ گیا تھا — وانی۔

دل ہے پرائے بس میں

دل میں ایک طوفان برپا تھا۔ جوش تھا کہ قلم سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ الفاظ خیالات سے کہیں آگے بھاگ رہے تھے اور انھیں پکڑنے کی کوشش میں قلم ان کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ میں آدھی رات کے سناٹے میں لیمپ جلائے اپنے کمرے کی تنہائی میں صفحے پر صفحے سیاہ کر رہا تھا...... چار دن پہلے گیانی جی نے مجھے استعفیٰ دینے کو کہا تھا تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ "میں کیوں استعفیٰ دوں؟ میری کیا غلطی ہے؟" میں نے کہا تھا۔ لیکن اب گیانی جی کے مسلسل اصرار پر یہ وعدہ کرنے کے باوجود کہ استعفیٰ نہ دوں گا میں بستر چھوڑ کر اور لیمپ جلا کر استعفیٰ لکھنے بیٹھ گیا تھا۔

اب خیال آتا ہے کہ اگر گیانی جی پہلی اپریل کو مجھے استعفیٰ دینے کو نہ کہتے تو شاید میں خود بخود نوکری چھوڑ دیتا لیکن جب انہوں نے وانی کے خط کو پڑھ کر کہا کہ مجھے استعفیٰ دے دینا چاہئے تو مجھے ان کا یہ مطالبہ سراسر زیادتی معلوم ہوا اور میں چلّا اٹھا— "میں کیوں استعفیٰ دوں، میری کیا غلطی ہے؟"

لیکن ملازمت سے دستبردار نہ ہونے کے باوجود اس واقعہ کے بعد میرا دل دیو نگر سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ وہاں رہ کر بھی جیسے میں وہاں نہیں تھا۔

دوسری صبح ہی پتھرچٹی، بنولی چک، ہاشم مستری اور ٹھاکر سے گندم کی فصل کے برباد ہو جانے کی خبریں آنے لگیں۔ پریکٹیکل سکول کی افتتاحی تقریب پر آنے والوں کی تفریح کے لئے دیوا جی نے قرب و جوار کے دیہاتیوں کے رقص و سرود اور کھیلوں کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کا انتظام پتھرچٹی کے تھانیدار کی مدد سے خود ہرموہن نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ لیکن جب شام کو ہرموہن واپس آیا تو معلوم ہوا کہ اولوں کا بادل جس جس گاؤں کے اوپر سے ہو کر گذرا اُسے برباد کرتا گیا۔ پکی کھڑی فصل ژالہ باری سے تباہ ہو گئی تھی۔ دیہات میں صف ماتم بچھ گئی۔ ایسے میں بھلا ناچ گانے اور کھیل کود کی کسے سوجھتی ہے۔ ہرموہن شاندار پروگرام کی جو سکیم بنا کر گیا تھا، وہ ایک دم ناکام ہو گئی۔ دن بھر دوڑ دھوپ کے بعد پتھرچٹی کے تھانیدار کی دھمکیوں اور کافی پیسوں کے لالچ کی مدد سے وہ کچھ ٹوٹی پھوٹی منڈلیاں تیار کر پایا۔

یہ حالات دیکھ کر مدھوار صاحب نے مشورہ دیا کہ افتتاح کی تقریب ایک ماہ کے لئے ملتوی کر دی جائے۔ "قرب و جوار کے دیہات میں جب ہائے ہائے مچی ہوئی ہے تو ہمیں اس قسم کے جشن کا اہتمام کرنا زیب نہیں دیتا۔" اُنہوں نے کہا تھا۔ دیوا جی پہلے تو مدھوار صاحب سے متفق دکھائی دیئے اور انہوں نے ایک نہایت جذبات انگیز مضمون بھی "قدرتی آفات سے دیہات کی تباہی" پر لکھا اور ایسی حالت میں نقصان زدگان کی امداد کے لئے کچھ بھی نہ کر سکنے پر کانگریس اور حکومت دونوں کی مذمت کی، مگر شاید دیوسینگ تیار نہ ہوئے۔ (کم از کم مدھوار صاحب سے انہوں نے یہی کہا) یا شاید انہوں نے خود ارادہ بدل دیا۔ مضمون چونکہ تیار ہو گیا تھا اس لئے اُنہوں نے آخر میں ایک پیراگراف اور جوڑ دیا۔

"دیہات کی اس تباہی کو دیکھ کر جی نہیں چاہتا کہ ہم پریکٹیکل سکول کا جشن افتتاح منعقد کریں۔ لیکن موت کا ایک ہی جواب ہے — زندگی! تخریب کا ایک ہی جواب ہے — تعمیر!! اس لئے ہم قرب و جوار کی اس تباہی میں گھرے رہ کر بھی زندگی اور تعمیر کی اس تقریب کو ملتوی نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس خوشی میں ہماری تمام تر ہمدردیاں اپنے انہیں بھائیوں، ساتھیوں اور پڑوسیوں کے ساتھ ہیں جو اس خدائی قہر میں اپنی محنت کی ساری کمائی لٹا بیٹھے ہیں . . . . ."

اور اُس وقت جب گرد و نواح کے دیہات اُس مصیبت میں گریہ کناں تھے اور دیونگر میں جشن کا اہتمام ہو رہا تھا، میرا دل مسلسل اُنہیں دیہاتیوں کے متعلق سوچ رہا تھا، جنہوں نے دن رات جوت گوڑ کر ماگھ پوس کی سردی میں سنچائی کر کے سونا اگایا تھا اور جن کی اتنے دنوں کی محنت و جانفشانی کو قدرت نے یوں چند لمحوں میں تباہ و برباد کر دیا تھا۔

میں دیوا جی سے مضمون لینے گیا تو اُن کے پاس پتھرچٹی سے کچھ کسان آئے ہوئے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ نہ صرف گندم کی بالیاں اولوں کی مار سے بچھ گئی ہیں بلکہ ڈنٹھل بھی سڑ رہے ہیں اور نہ صرف انہیں بلکہ اُن کے مویشیوں کو بھی فاقوں کا سامنا ہے اور وہ غریب دیہاتی دیونگر کے بادشاہ سے مدد مانگنے آئے ہیں۔

بادشاہ نے اُن کی حالت پر نہایت شیریں الفاظ میں نہ صرف اپنی طرف سے، بلکہ پورے دیونگر کی طرف سے اظہار ہمدردی کیا۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی اُن کی کچھ فوری امداد کے سلسلے میں یکسر معذوری ظاہر کی۔ اُنہوں نے کہا۔ "دیو منڈل کے مستقل فنڈ کا بہت سارا روپیہ پریکٹیکل سکول کی تعمیر میں خرچ ہو گیا ہے۔ پانچویں تاریخ کو سکول کا افتتاح ہو رہا ہے۔ اُدھر سے فرصت پائیں

تو آپ کے لئے کچھ مدد کا انتظام کریں گے۔"

اور کسان چلے گئے تھے۔ میں دیوا جی کو ترجمہ سنا کر اور نیا مضمون لے کر واپس آ گیا تھا۔ میں جانتا تھا انہوں نے صرف ٹالنے کے لئے میٹھے الفاظ میں اُن تباہ حال دیہاتیوں کو دلاسا دے دیا ہے۔ اُن کسانوں کی بربادی سے متاثر میرا دل نہ جانے کیوں ایک دم دیو سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دیوا جی بظاہر بڑے اُونچے آدرش وادی بڑے شیریں زبان اور بہت ہی شریف انسان تھے۔ مگر جب میں اُن کے شیریں الفاظ کے پس پردہ عمل کے نام پر ایک بڑا خلاء پاتا تو دل ایک دم مکدر ہو جاتا اور محسوس ہوتا کہ یہ سب ڈھونگ ہے اور وہاں کام کرنا اُس ڈھونگ میں تعاون کرنا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ملازمت کے سلسلے میں اچھے بُرے مقاصد کی بات میں نے پہلے کبھی نہ سوچی تھی۔ اُسی طرح جیسے میں نرجی کے سلسلے میں پہلے کبھی نہ سوچ پایا تھا۔ لیکن پہلے شاید میں یہ سب سوچنے کے قابل ہی نہ تھا۔ دیوا جی کے مضامین نے ہی مجھے اس طرح سوچنا سکھایا تھا، مگر جب میں اُن مضامین سے سیکھی ہوئی باتوں کا موازنہ دیو سیٹکوں کے عمل سے کرنے لگا تو مجھے مایوسی ہونے لگی — نرجی دانی . . . . اُس کی نظروں میں بلندی حاصل کرنے کی تمنا لاشعوری طور پر میرے دل میں آن بسی تھی۔ شیاما سے پتہ لگنے پر اُس نے جب غلام نبی کو سکول میں داخل کرانے کا وعدہ کیا اور کسی غریب دیہاتی کے لئے اس طرح فکرمند ہونے پر میری تعریف کی تو اگرچہ میں نے اپنے چہرے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا لیکن فخر سے میرا سینہ پھول گیا اور اس لڑکی کی نظر میں ہمالیہ کی طرح بلند ہو جانے کی خواہش بے ساختہ میرے دل میں بس گئی۔

دانی کا وہ خط اگرچہ میں نے گیانی کو دکھا دیا تھا اور انہوں نے اسے پڑھ بھی لیا تھا لیکن میں نے اس کا کسی سے بھی ذکر نہ کیا تھا۔ یہ بل فول کے سلسلے میں اپنی اس توہین کے بعد غصہ کے پہلے جوش میں اگرچہ میں دیوا جی کو تمام واقعات سے آگاہ کر دینا چاہتا تھا تاہم جب وہ دوسرے دن آ گئے تو میں نے ان سے کچھ نہ کہا۔ میں نے تو ان پر یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے دل میں کتنا شدید غم و غصہ ہے۔ میں چپ چاپ مضمون لے آیا ان کی ہدایات سن لیں "جی ہاں جی ہاں" کہا اور بس — غالباً گیانی جی کو سب کچھ بتا دینے پر غصہ کی شدت ختم ہو گئی تھی۔

لیکن اس واقعہ کے بعد میں دیو نگر کے اس عام جوش و خروش میں حصہ نہ لے سکا دیو نگر کی ہنسی خوشی میں شامل نہ ہو سکا اور نہ جانے کیوں دانی سے بھی آنکھیں نہ ملا سکا۔ اگرچہ گیانی جی نے بہت اصرار کیا لیکن میں ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے نہیں گیا۔ گیانی جی دونوں وقت کھانا لا کر دیتے رہے اور میں کوٹھی ہی میں کھاتا رہا۔ آخر جب میں نے چوتھے روز خود کو نسبتاً نارمل محسوس کیا تو شام کو کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔

لیکن یہ محض میرا وہم تھا۔ میرا زخم بھرا نہ تھا۔ اگرچہ اس پر اوپر سے ہلکا سا کھرنڈ آ گیا تھا۔ اندر سے وہ بدستور کچا تھا۔ ذرا سی ٹھیس پر دکھ اٹھنے اور رس پڑنے والا اور اسی شام میرا غصہ پھر بھڑک اُٹھا۔

اندھیرے پاکھ کی تاریک شام تھی۔ نیم ہی جنگ کی گھنٹی بجی تو باہر کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں سب لوگوں کے بیٹھ جانے کے بعد

ہال میں پہنچا۔ کسی سے آنکھ ملائے بغیر تھالی کٹوری اُٹھا کر پچھلی قطار میں اپنی میز پر جا بیٹھا اور جلدی جلدی کھانا ختم کر کے سب سے پہلے اُٹھ گیا۔ پھر اسی عجلت سے حمام میں ہاتھ دھو کر اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی چند ہی قدم بڑھا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے ایک بھرائی اور گھٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ "سنگیت جی"

یہ وانی کی آواز تھی۔ تیز چلنے کے باعث اس کی سانس قدرے پھول آئی تھی یہ مجھے بغیر مڑے محسوس ہوا۔

"سنگیت جی"

وہ بھرائی ہوئی التجا بھری آواز سن کر چاہتا تھا کہ بغیر مڑے بغیر رکے بڑھ جاؤں لیکن قدم گویا وہیں جم گئے آگے نہیں اُٹھے۔ وانی میرے برابر آ گئی۔ پیچھے سے آنے والی ڈائننگ ہال کی دھیمی روشنی میں اس کا ہلکا سا سایہ ہی نظر آیا۔

"سنگیت جی آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں"

میں خاموش رہا۔ ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"چار دن ہو گئے۔ میں آپ سے دو باتیں کرنے کو ترس رہی ہوں، مگر آپ کی شکل تک نظر نہ آئی۔ میں جانتی ہوں آپ کے دل میں بہت غم ہے غصہ ہے۔ لیکن دوسروں کا چھوٹا پن دیکھ کر کیا آپ اپنا بڑا پن چھوڑ دیں گے؟ تیرتھ رام، ہر موہن اور سدرشن بھرا جی نے جو کچھ کیا ہے اُس کے لئے آپ مجھے معاف کر دیں۔"

اُس کی آواز بھرا گئی تھی، گلا بھر آیا تھا۔ اس اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا مگر میری آنکھوں کے سامنے اُس کی بڑی بڑی ڈبڈبائی آنکھیں، سفید اُڑا اُڑا چہرہ اور اُبھرے مسام گھوم گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ہمارے پیچھے سے تیز تیز چلتے اور باتیں کرتے تیرتھ رام، ہر موہن اور سدرشن سنگھ آئے اور اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہم سے ذرا فاصلے پر آگے آگے چلنے لگے۔ وانی چپ ہو گئی، جواب سُنے بغیر ذرا آگے بڑھ گئی گویا وہ میرے ساتھ نہ چل رہی ہو...... آج سے تیرتھ رام، ہر موہن اور سدرشن بھرا جی ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ وانی کے خط کا یہ جملہ میرے دماغ میں کوند گیا اور غصہ کی لہر میرے دل سے اُٹھ کر میرے دماغ کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ پہلے وانی اور پھر تیرتھ رام اور سدرشن کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں آندھی کی طرح چلتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ لیمپ جلایا پیڈ اُٹھایا اور دیوا جی کے نام خط لکھنے بیٹھ گیا......

"کہو بھائی، کیا ہو رہا ہے؟" مجھے آیا ہوا سمجھ کر گیانی جی دروازے میں نمودار ہوئے۔

میں اپنے جوش میں دروازے بند کرنا بھول گیا تھا۔ سر اُٹھائے بغیر میں نے کہا "استعفیٰ لکھ رہا ہوں"

"استعفیٰ؟" وہ حیرت سے میرے سامنے کرسی پر آ بیٹھے۔

"جی!" میں نے ایک پل کے لئے قلم روک کر کہا "آپ نے مجھ سے استعفیٰ دینے کو کہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ درست کہتے ہیں۔ مجھے استعفیٰ دے دینا چاہیئے"

گیانی جی خاموش میری طرف دیکھتے رہے۔ لیکن میں بولتا گیا: "اُس وقت میں نے سوچا تھا میری کیا غلطی ہے، میں کیوں استعفیٰ دوں مگر اب میں سوچتا ہوں میری غلطی ہے کہ میں ایسی جگہ پر رہوں جہاں کسی آزادی پسند انسان کے لئے کوئی گنجائش نہیں جہاں

درحقیقت رشک و حسد تنگ دلی اور کمینگی کا راج ہے، جہاں محبت کی جگہ نفرت اور اعتماد کی جگہ اشتباہ ہے۔" اور میں نے طے کیا ہے کہ میں دیونگر کے مکینوں اور اپنے آپ پر بھی رحم کروں اور استعفیٰ دے دوں۔"

دیونگر کی مذمت سننے پر گیانی جی کا چہرہ سرخ ہوگیا تاہم اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے انہوں نے کہا" تو آپ یہ سب کچھ استعفیٰ میں لکھنے جارہے ہیں؟"

"بے شک!"

"آپ یہ نہیں سوچتے کہ اس سے دیوا جی کو کتنا صدمہ ہوگا۔ کل افتتاح کی تقریب ہے باہر سے اتنے لوگ آئے ہیں۔ آپ کے اس استعفیٰ کو پاکر دیوا جی کتنے پریشان ہوں گے۔"

"میرے لئے اب یہاں ایک دن رہنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔"

اور میں نے گیانی جی کو کچھ دیر پہلے کا واقعہ سنا دیا۔

گیانی جی پل بھر بیٹھے چپ چاپ سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے بڑے ضبط کے ساتھ کہنا شروع کیا: "اول تو یہ آپ کا وہم ہے کہ لوگ آپ کے پیچھے لگے ہیں۔ دانی بچی ہے۔ اس نے اگر بچپنے میں ویسا لکھا ہے، تو یہ کیا ضروری ہے کہ وہ سو فیصدی سچ ہو۔ تیرتھ رام اور سدرشن خواہ یونہی کھانا کھا کر نکلے ہوں، لیکن چونکہ آپ کے دل میں شک ہے اس لئے آپ کو یہ محسوس ہوا کہ وہ آپ کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"وہم کی بات نہیں یہ حقیقت ہے اور اسے میں ہی جان سکتا ہوں۔"

"یہ سچ بھی ہو" گیانی جی نے اسی سنجیدہ لہجے میں کہا "تو بھی آپ کو اتنا تنگ نظر نہ ہونا چاہیئے۔ دیونگر تیرتھ رام، ہرموہن اور سدرشن سنگھ ہی کا نہیں دیوا جی کا اور ہمارا سا جھا سپنا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے ان کو نہیں ہمیں بھی دکھ ہوتا ہے۔ آپ یہ سب لکھیں گے تو آپ نہیں جانتے دیوا جی کو کتنی تکلیف ہوگی۔ آپ کو تیرتھ، ہرموہن یا سدرشن سے شکایت ہے دیوا جی سے تو نہیں۔ پھر آپ ان کا دل کیوں دکھائیں۔ اول تو میں آپ سے یہی کہوں گا کہ اب استعفیٰ دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ مجھے سب بتاتے رہیں تو آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ لیکن اگر آپ کو یہاں کسی حالت میں بھی رکنا منظور نہ ہو تو آپ یوں دکھ پہنچا کر کیوں جائیں؟ رنگ میں بھنگ ڈال کر کیوں جائیں۔ افتتاح کا جشن ہو جانے دیجیے۔ تہ جی لگے تو خاموشی سے براہ راست استعفیٰ دے کر چلے جائیے گا۔ اس واقعہ کے بارے میں دیوا جی کو کچھ معلوم نہیں۔ انہیں یہ سب بتا کر آپ کو کیا ملے گا؟"

اور میں خاموش رہ گیا۔ گیانی جی کو اس بات کا کوئی جواب مجھ سے نہ بن پڑا۔ دشمن بن کر الگ ہونے سے دوست بن کر بچھڑنا اچھا ہے۔ انگریزی کی یہ کہاوت میرے کانوں میں گونج گئی۔ سنسکرت کی ایک کہاوت بھی یاد آئی — سچ بولو —— لیکن میٹھا اور اور میں نے لکھا ہوا کاغذ پھاڑ دیا اور گیانی جی سے وعدہ کیا کہ میں استعفیٰ نہ دوں گا۔ دوں گا بھی تو جشن کا موقعہ گذر جانے کا انتظار کروں گا۔

گیانی جی دیر تک دیونگر کے بارے میں اپنے خوابوں، اُن خوابوں کو حقیقت بنانے کے راستے کی رکاوٹوں، دیو بینکوں کی غلطیوں اور اُن غلطیوں کے ہوتے ہوئے بھی دیونگر کے خواب کو حقیقت بنانے میں دیوا جی کے عزم راسخ کا ذکر کرتے رہے۔ اُنھوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میرے جیسا سمجھ دار آدمی کم از کم اُن دشواریوں کو بڑھائے گا نہیں۔

گیانی جی مطمئن ہو کر چلے گئے تو میں لیمپ بجھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیٹ گیا، لیکن سو نہ سکا۔ لیٹتے ہی گیانی جی کے ساتھ اپنی ساری بات چیت پھر سے میرے کانوں میں گونج گئی اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ لوگ صحیح حالات سے دیوا جی کو ہمیشہ بے خبر رکھتے ہیں۔ دیونگر کے عظیم خواب کی تبس چوٹی پردہ بیٹھے ہیں، انھیں معلوم نہیں کہ اُس کی بنیاد اُن کی لاعلمی میں نیچے سے کھسکی جا رہی ہے۔ انھیں معلوم نہیں کہ اُن کی ناک کے نیچے اُن کے پیارے دیونگر میں نفرت اور عناد کا بازار گرم ہے اور اُنھوں نے جو اصول وضع کئے ہیں وہ ان کے سامنے ہی توڑے جا رہے ہیں۔ انھیں علم نہیں کہ اُن کی اپنی لڑکی پنجرے میں چڑیا کی مانند تڑپتی ہے دانی کے خط کے الفاظ بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ڈائننگ ہال سے ہٹتے آتے ابھی کچھ گھنٹے پہلے اُس نے کہا تھا "چار دن ہو گئے ہیں میں آپ سے دو باتیں کرنے کو ترس رہی ہوں .....؟"

اور میں اُچھل کر چارپائی سے اُٹھ بیٹھا.....

.....نہیں یہ نہیں ہوگا دیوا جی کو سب کچھ بتانا ہوگا۔ بتانا ہوگا کہ اُن کا دیونگر راکشس نگر بن رہا ہے۔ اُن کی اپنی لڑکی اُن راکشسوں کے چنگل میں پھنس کر لمحہ بہ لمحہ گھٹتی جا رہی ہے ...... نہ بتانا بزدلی ہوگی، بددیانتی ہوگی..... جشنِ افتتاح ..... وہ بڑے بڑے لیکچر دیں گے اور اُن کی اپنی لڑکی دل میں اُن پر ہنسے گی۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہوگی؟ اس ستم ظریفی سے انھیں بچانا ہوگا۔ میٹھا سچ، لیکن سچ کیا کبھی میٹھا بھی ہوتا ہے۔ سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے اور دیانتدار اور صداقت پسند آدمی کو اس سے گریز نہ کرنا چاہیے۔ ایسا گریز بددیانتی ہی نہیں بزدلی کے بھی مترادف ہوگا..... اور میں نے اُٹھ کر لیمپ جلایا چادر اوڑھی، میز پر جا بیٹھا اور کاغذ قلم اُٹھا کر لکھنے لگا۔

"محترم دیوا جی،

نیم شب کے سناٹے میں دل کا گلا گھونٹ دینے والے جوش سے مجبور ہو کر میں آپ کو چند سطور لکھنے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں انھیں پڑھ کر آپ کو رنج ہوگا۔ گیانی جی نے ابھی مجھے یہ سب لکھنے سے روکا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب نہ لکھنا آپ کو اور خود اپنے کو فریب میں مبتلا رکھنا ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے۔ اتنا کہ میری رات کی نیند حرام ہو گئی ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو حالات ہیں اُن میں ایک دن بھی اور یہاں رہنا میرے لئے ناممکن ہے۔ مجھے فوراً اپنا استعفیٰ پیش کر دینا چاہئے اور آپ سے درخواست کرنی چاہیئے کہ آپ مجھے ایسی حالت میں ایک دن بھی اور یہاں رہنے کو مجبور نہ کریں لیکن قبل اس کے کہ رخصت طلب کروں میں اس استعفیٰ کا سبب لکھنا چاہوں گا۔

گیانی جی فرماتے ہیں، اس سے آپ کو دُکھ ہوگا یہ میں جانتا ہوں لیکن حقیقت تلخ اور یہ تلخ حقیقت مجھے آپ کے سامنے رکھنی ہے۔ اس لئے کہ میں اِسے اپنا ایک اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔"

اور یوں شروع کرکے میں نے دیونگر میں اپنے آنے، تیرتھ رام سے ملنے، سب سے پہلے اُس کی محبت پانے اُس کی آہوں اور تنہائی پسندی کا سبب جاننے کی جستجو سے لے کر بڑے دن کی شام اور اُس کے تمام واقعات بیان کر دیئے، حتیٰ کہ داتی کا خط اس سے دِل میں اٹھنے والے ہیجان اور اُسی شام کھانے کے کمرے کے واقعہ کو بھی نہیں چھپایا اور آخر میں لکھا۔

"آپ نے ایک بار دیونگر کی زندگی کا خواب بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر تنگ مکانوں کے پاس گندی نالیاں نہ بہیں یا غزل کے سائے میں خوبصورت مکان ہوں، غریبوں میں گھرا کوئی اکیلا امیر سونے کی اینٹوں کو چھپائے، چوروں سے ڈرتا نہ پھرے۔ بلکہ سبھی پیٹ بھر کھائیں اور ترقی کے خواب دیکھیں۔ دن چڑھے کرنوں کے لمس سے لوگ جاگیں، خندہ پیشانی مسکراتی آنکھوں اور پھیلی بانہوں کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں، علی الصبح بیدار ہونے والے طیور کی طرح ایک دوسرے کو بلائیں اور اپنے مزاج کے مطابق زندگی کا نصب العین تلاش کریں ...... میں پوچھتا ہوں کیا دیونگر میں یہ سب ہے؟ کیا اِردگرد کی مفلوک الحال دنیا میں دیونگر کا وجود سونے کی اینٹوں کو چوروں سے چھپائے خوفزدہ دولتمند جیسا نہ ہوگا؟ کیا باہر کی تمام تنگ دلی تنگ نظری، رشک و حسد، بغض و عناد کدورت و نفرت، خوشامد پسندی اور چاپلوسی یہاں نہیں ہے؟ جب آپ کی اپنی لڑکی اسے راکشس نگر سمجھتی ہے تو ہمارا ذکر فضول ہے۔ ایسی حالت میں میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے فوراً چھٹی دے دیں تاکہ اِس گھٹے گھٹے ماحول سے نکل کر میں آزادی کے دو سانس لوں اور زندگی کا جو وسیع نظریہ میں نے آپ سے پایا ہے باہر جاکر اُس کے مطابق زندگی گذارنے کی کوشش کروں۔"

صبح دیونگر میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ دس بجے دیو کانفرنس تھی اور شام کو جشنِ افتتاح دیونگر کے سبھی باسی کانفرنس کو کامیاب بنانے میں مصروف تھے۔ جہاں وہاں سے واپس ہوں تو دیونگر کی فضا، اُس کے باشندوں کی خوش اخلاقی، شرافت اور رواداری کے گن گاتے ہوئے جائیں، ہر ایک کو اس کی فکر تھی۔ لیکن میں اپنے کمرے سے باہر تک نہ نکلا۔ جلسہ گاہ میں کیا ہو رہا ہے، دیوا جی اور گیانی جی کیسی تقریریں کر رہے ہیں، آنے والے لوگوں میں کون کون بول رہا ہے، کون شاعر اور گانے والا دیونگر یا اُس کے بانی کی تعریف میں رطب اللسان ہے، مجھے یہ جاننے کی مطلق خواہش نہ ہوئی۔ بستر سے اُٹھ کر میں نے سب سے پہلے رات کے لکھے استعفیٰ کو دوبارہ لکھا۔ ترمیم و تنسیخ کر کے اور بھی پُراثر بنایا اور صفائی سے تہ کر کے ایک لمبے لفافے میں بند کر دیا۔ پھر نہا دھو کر کپڑے بدل، میں کھانا کھانے کے لئے چلنے کو تیار ہو گیا۔ جاتے وقت میں نے لفافے پر سرخ روشنائی سے انگریزی کے دو لفظ، 'ارجنٹ' اور 'پرسنل' یعنی 'اشد ضروری' اور 'ذاتی'

لگے اور چہرے کو حتی الامکان جذبات سے عاری بنا کر میں ڈائننگ ہال کی طرف چل دیا۔

ہال کے باہر بڑی رونق تھی۔ سبھی نو وارد ٹولیوں کے ساتھ ایک نہ ایک دیو سینک یا کارکن چپکا تھا۔ متمول یا افسر قسم کے مہمانوں کو دیواجی، گیانی جی، سردار پال سنگھ آرٹسٹ، مدھوار صاحب یا ہرموہن سنبھالے ہوئے تھے۔ اندر میزیں اٹھا دی گئی تھیں۔ موزیک کے چمکیلے فرش پر سفید براق چادروں کی صفیں بچھی تھیں اور مہمانوں کو براتیوں کی طرح کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ میں نہ کسی ٹولی میں شامل ہوا نہ کسی مہمان کے ساتھ باتوں میں لگا۔ اگر کسی نے کچھ پوچھا بھی تو میں نے نہ صرف بہت میٹھے دیونگری انداز سے اسے ٹال دیا، بلکہ اسے کسی نہ کسی دوسرے کارکن کی طرف بھیج دیا اور خود ذرا ہٹ کر دیواجی کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک متمول لحیم شحیم سردار صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ہال میں پہنچے۔ میں بھی اس صف میں جا بیٹھا اور جلدی جلدی کھانے سے فارغ ہو کر باہر آ گیا اور ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

دیواجی نپا تلا کھانا کھاتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کھانا محض زندگی کے لئے اور زندگی اونچے مقاصد کے لئے ہے۔ مگر ان کے ساتھ دیوتا بننے کے ارادے سے بیٹھے ہوئے سردار جی، زندگی کا مقصد غالباً کھانا پینا سمجھتے تھے۔ دیواجی کب کے کھانا ختم کر چکے تھے۔ لیکن وہ سردار صاحب بدستور ڈٹے تھے۔ دیواجی اخلاقاً ان کا ساتھ دے رہے تھے اور جب ان کے دوست لذیذ کھانوں پر ہاتھ صاف کر رہے تھے وہ انھیں اپنی زندگی کے دلچسپ قصے سنا رہے تھے اور کھانے کے نام پر کبھی روٹی کا ذرا سا ٹکڑا کتر لیتے تھے، کبھی ترکاری چمچے کی نوک پر رکھ کر منہ میں ڈال لیتے تھے۔

ان کے انتظار میں کھڑے کھڑے میں تقریباً اکتا گیا۔ کچھ دیر بعد دروازے میں جا کر ان سردار جی کو کھانے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھ آتا اور پھر باہر آ کر انتظار کرنے لگتا۔ آخر محسوس ہوا گویا ایک زمانے کے بعد وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ اس بات پر بحث کرتے ہوئے ہال کے دروازے سے نمودار ہوئے کہ وہ اپنے مہمان کی تھالی اٹھائیں یا مہمان ان کی۔ کچھ دیر کی پُر تکلف چھینا جھپٹی کے بعد آخر دونوں اپنی اپنی تھالیاں لے کر حمام کی طرف بڑھے۔

دراصل دیواجی اور ان کے سیوکوں کا یہ پرانا طریقہ تھا۔ باہر سے آنے والوں کو کھانا کھانے کے بعد اپنی تھالی اٹھا کر نل پر لے جانا ناگوار نہ ہو اس خیال سے وہ ہمیشہ ان کی تھالی اٹھا کر چل دیتے تھے۔ سمجھدار مہمان اپنی تھالی لے لیتے تھے اور اگر کوئی ایک بار نہ سمجھتا تو دوسری بار سمجھ جاتا۔ ہاتھ دھو کر دیواجی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بدستور باتیں کرتے چلے۔ تبھی میں نے بڑھ کر لفافہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے اوپر تحریر شدہ دو لفظ پڑھے اسے جیب میں رکھتے ہوئے سر ہلایا کہ اچھا اور اپنی گفتگو کا سرا جہاں سے انہوں نے چھوڑا تھا وہیں سے پکڑ لیا۔

دور گھرے طوفان کی بو پا کر جس طرح کوئی ننھا سا پرندہ اس کے پہلے جھونکے کو جھیلنے کے لئے اپنے آشیانے کی خاموشی میں بجیبی و بیقرار سا بیٹھا ہو اسی طرح میں اپنے کمرے کی خاموشی میں کرسی پر تنا بیٹھا تھا۔ دو بجنے کو تھے۔ دیونگر کی چہل پہل اور شور بھی کچھ دیر کو تھم گیا تھا۔ لوگ اپنی آرام گاہوں میں گپ شپ کر رہے تھے یا دیو منڈل کے حال اور مستقبل پر تبادلۂ خیال میں مصروف

تھے یا دیوِنگریوں کی باتیں سُن رہے تھے۔ جو عموماً دیوا جی کی باتوں کی کاربن کاپی ہوتی تھیں ۔ یا سرگوشیوں میں دیونگر یا دیونگر والوں پر تنقید کر رہے تھے یا پھر محض سستا رہے تھے۔ میں عموماً دوپہر کو ایک آدھ گھنٹہ ضرور سو لیتا تھا مگر اُس روز سونا دور رہا، مجھے لیٹنے تک کا خیال نہ آیا۔ کُرسی پر بیٹھا میں بظاہر دیوا جی کے مضمون کا ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن میری آنکھیں بار بار کھڑکی کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ اور کان دروازے کی طرف لگ جاتے تھے۔ دیوا جی ۔ جیسا کہ مَیں اس عرصہ میں اُنھیں جان گیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس خط کو پڑھیں گے۔ پڑھیں گے تو ضرور آئیں گے۔ اُن کا رَدِ عمل کیا ہو گا یہ بھی مَیں جانتا تھا اور وہی دیکھنے کا مجھے اشتیاق تھا۔

دیر تک بیٹھے بیٹھے مجھے اچانک خیال آیا کہ مَیں نے اُن سے فوراً رخصت چاہی ہے اگر انہوں نے میرا استعفیٰ منظور کر لیا تو!

...... اور مَیں کرسی سے اُٹھا۔ ...... مجھے اپنا سامان تیار کر لینا چاہیئے ...... اور میں تیزی سے سامان سمیٹنے لگا۔ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی چستی آ گئی ۔ مَیں نے اپنی کتابیں اور کاغذات سمیٹے ۔ دیونگر کی کتابیں اور رسالے الگ کئے ۔ کپڑے تہ کر کے ٹرنک میں رکھے ۔ رات خواہ مجھے گورے شاہ میں گذارنی پڑے ، مگر میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا ۔ بار بار میں دل ہی دل میں اِس بات کا قسم ارادہ کرتا رہا۔

مَیں اپنا بستر باندھ رہا تھا جب دروازے پر ٹک ٹک ہوئی ۔ میں تیاری میں اس قدر منہمک تھا کہ باہر دیکھنا یا دروازے کی طرف متوجہ ہونا ایکدم بھول گیا تھا۔ پھر ٹک ٹک ہوئی ۔ "آ جائیے!" میں نے بستر باندھتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلا۔ دیوا جی پیشانی پر ہلکی سی شکنوں کے ساتھ کھڑے تھے ۔ بستر کا ایک سٹریپ بندھا کا بندھا رہ گیا اور مَیں بستر پر گھٹنا ٹکائے آدھا مجسم بت بنا کھڑا رہا۔

دیوا جی مجھے بستر باندھتے دیکھ کر مسکرائے۔ اُن کی پیشانی کی شکنیں مٹ گئیں۔ بڑھ کر اُنہوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ "آپ کو نہ بستر باندھنے کی ضرورت ہے نہ سامان تیار کرنے کی آپ یہاں رہئے۔ وانی آپ کو یا آپ وانی کو پیار کرتے ہیں تو کوئی برائی نہیں کرتے ابھی وہ نابالغ ہے۔ بالغ ہونے پر وہ جس کسی سے بھی شادی کرنا چاہے گی مجھے اعتراض نہ ہو گا۔ آپ تو سکھ ہیں وہ چاہے تو کسی مسلمان سے شادی کر سکتی ہے ۔"

"ماتا جی کے ہوتے وہ صرف ہندو ہی سے شادی کرے گی۔" میرا لہجہ تلخ تھا۔

دیوا جی کی پیشانی پر پھر ہلکی سی شکنیں اُبھر آئیں مگر انھوں نے فوراً انھیں مسکراہٹ میں بدل لیا اور بولے "آپ ہمارے ہاں آنے لگے تھے مَیں خوش ہوا تھا۔ آپ آیا کیجیے۔ کوئی آپ سے جلتا ہے تو جلنے دیجئے ۔ وہ خود اپنا ہی خون جلائے گا۔ آپ کیوں پریشان ہوں۔ سیدھے راستے چلتے جائیے اور مجھ پر یقین رکھئے ۔ آپ کو تکلیف نہ ہو گی ۔"

اور میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے وہ چلے گئے۔ دروازے پر کچھ یاد آ جانے سے وہ مڑے ۔ "آپ کو وانی کا خط کسی دوسرے کو نہ دکھانا چاہیے تھا۔" انہوں نے اچانک کہا۔

"مجھے جتنی اذیت دی گئی، اُس میں دماغ کیسے ٹھیک کام کرتا؟" مَیں بولا۔ تناؤ کے یکایک ہٹ جانے سے میرا گلا ایک دم بھر آیا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دیوا جی پھر مڑ آئے۔ اُسی طرح بھرے گلے اور بہتے آنسوؤں سے مَیں نے

کہا۔"میں نے وانی کی بجائے اپنے فرض کو مقدم سمجھا اور وہ خط جلا دیا۔"

"اسی کا مجھے افسوس ہے۔" سامنے خلا میں دیکھتے ہوئے دیواجی نے کہا اور پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولے۔"خیر آپ آیا کیجیے۔ وانی سے پہلے کی طرح ملا کیجیے۔"

"میں تیرتھ رام نہیں۔" میں بولا۔"میں وانی کا راستہ بھی نہ کاٹوں گا۔ اُسے یا آپ کو ماتاجی ہر موہن یا تیرتھ رام — کسی کو بھی میں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ بس میں سکون چاہتا ہوں۔ کوئی مجھے نہ چھیڑے نہ پریشان کرے، چپ چاپ کام کرنے دے۔"

"آپ کو کوئی پریشان نہیں کرے گا۔" اور میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے دیواجی چلے گئے۔

نہ جانے کیا کیا سوال جواب میں نے دل میں سوچ رکھے تھے کیسی تنقید اور کیسے غصہ اور تلخی سے بھرے مکالمے تیار کر رکھے تھے۔ مگر دیواجی نے مجھے ایک لفظ بھی کہنے کا موقعہ نہ دیا۔ چپ چاپ آنسو پونچھتا میں بستر پر بیٹھا رہ گیا۔

اگرچہ ایسی اُمید نہ تھی تاہم اُن کے آنے سے پہلے کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ وہ ناراض ہوں گے، میرے یا تیرتھ رام کے تئیں غصہ کا اظہار کریں گے۔ لیکن اُنہوں نے اپنے جذبات پر پورا قابو پا رکھا تھا۔ شاید وہ میری طرف آنے سے پہلے اپنے ہر ایک جملے اور اس کے اظہار تک کے بارے میں سوچ کر چلے تھے۔ میرے کمرے سے جاتے وقت غصہ کو یوں ضبط کر سکنے کی اُس صلاحیت پر دل ہی دل میں انھیں اطمینان ہوا ہوگا۔ لیکن میں بڑی دیر تک جلتا بھنتا بستر پر بیٹھا رہا۔

اچھا ہوتا اگر وہ میرا استعفیٰ منظور کر لیتے۔ اُس شدید اذیت سے مجھے نجات مل جاتی، وہ تناؤ ختم ہو جاتا اور میں گونہ آزادی کا سانس لیتا۔ دیواجی کے چلے جانے کے بعد بار بار میں سوچنے لگا کہ اگرچہ اُنہوں نے میرا استعفیٰ منظور نہیں کیا، مجھے ہوا میں معلق چھوڑ دیا، مگر مجھے اس ڈور کو کاٹ کر آزاد ہو جانا چاہیے۔ اس سارے سکینڈل کے بعد میرا وہاں رہنا کیسے ممکن ہوگا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں سوچتا — سکینڈل ہونے کا امکان کہاں ہے؟ کیا گیانی جی اور دیواجی میری اور وانی کی بات ہر ایک سے کہتے پھریں گے۔ میرے ہیجان آمیز دماغ نے نہ جانے کیا سے کیا سوچ لیا۔ گیانی جی خواہ کتنے ہی کیوں گھبرائے ہوئے نہ ہوں مگر دیواجی نے تو اُس سارے واقعہ کو کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ تو کیا اس طرح چلے جانا ٹھیک ہوگا؟ بغیر وانی سے ملے، بغیر اسے دیکھے؟

لیکن وانی کا خیال آتے ہی دل میں دور تک کچھ اُترتا چلا جاتا۔ اُس کے تئیں میں نے کتنا ظلم کیا ہے یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا اُس نے لکھا تھا، اس خط کو پڑھ کر پھاڑ دینا مگر میں نے وہ گیانی جی کو دکھا دیا تھا دیواجی کو پڑھا دیا تھا۔ اُسے جلا دینے پر جب دیواجی نے افسوس ظاہر کیا، تو پہلی بار اپنی یہ مذموم حرکت اپنی تمام نامعقولیت کے ساتھ میرے سامنے واضح ہو کر آ گئی۔ دل کی گہرائی میں کہیں میں سمجھتا تھا کہ گیانی جی یا دیواجی کو خط دکھا کر، اپنا فرض ادا کر کے، میں نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اُس کی محبت کو کچل کر وہ سب لکھ کر میں نے دیوا جی کی آنکھیں گویا کھول دی تھیں۔ اور اُس فرض کی ادائیگی کے لئے ملازمت قربان کرنے کو تیار ہو کر، گویا میں اپنی نظروں میں کہیں اونچا اُٹھ گیا تھا۔ لیکن دیواجی کی اُس ہلکی سی ڈانٹ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وانی کا وہ خط گیانی جی کو دکھا کر اُس کے راز کو اُن سب پر افشا کر کے میں نے بہت بُرا کیا ہے۔ اُس کے تئیں بھی تو میرا کچھ فرض تھا مجھے چاہیے تھا کہ میں گیانی جی کی بات مان لیتا اور چپ چاپ استعفیٰ دے کر چلا جاتا۔ اُس کے دل میں کسک ہوتی میرے دل میں کسک ہوتی۔ مگر وہ کسک کتنی میٹھی ہوتی اور اُس درد بھری یاد میں کتنی خوشی، کتنی مسرت ہوتی!

لیکن محبت کے اس فرض کو میں نے فرض نہ سمجھا۔ اپنی حقیر اور بے بضاعت انا کو لے کر میں تن گیا۔ شاید میرے دل کا ظرف بہت ہی چھوٹا تھا، محبت کے آبِ حیات کو اس میں رکھنے اور محفوظ کر لینے کی سکت اس میں نہ تھی اور اسی باعث اس نے اسے چھلکا دیا تھا۔۔۔۔۔ اس سب کے بعد میں دانی سے کیونکر آنکھ ملا پاؤں گا لیکن اس حرکت کے لئے اس سے معافی مانگے بغیر میں زندہ بھی کیوں کر رہ سکوں گا۔۔۔۔۔۔ اور اچانک وہیں بستر پہ بیٹھے بیٹھے میں اپنی نظر میں آپ ہی نہایت حقیر ہو گیا اور میرا جسم گویا بستر سے چپک گیا اور باہر شام آہستہ آہستہ پڑھتی گئی۔

پریکٹیکل سکول میں پروگرام شروع ہو گیا، لیکن میں اپنے کمرے میں بندھے بستر سے جیسے چپکا سا بیٹھا رہا۔

نہ جانے میں کب تک ویسے ہی بیٹھا رہتا اگر گیانی جی دروازہ کھول کر اپنی لمبی ڈاڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اندر نہ آ جاتے۔

"ارے بھائی سنگیت، تم یہیں بیٹھے ہو اور وہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میرا؟"

"ہاں تمہارا۔" اپنی لمبی کھچڑی داڑھی پہ پھر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "پچھلے دسمبر میں کچھ لوگوں نے تمہارا گانا سنا تھا۔ اُن کا اصرار ہے کہ تم ضرور ایک گانا معزز مہمانوں کو سناؤ۔"

"میرا جی ٹھیک نہیں ہے، میں گا نہ سکوں گا۔ میں واپس شہر جانے کی سوچ رہا ہوں۔"

"دیوا جی سے بات کرنے کے بعد بھی؟"

"دیوا جی نے آپ سے بات کی؟"

میری بغل میں ہاتھ دے کر مجھے اٹھاتے، میرے بازو کو پکڑے، زور سے ہنستے اور ہنسی کے جوش میں نہایت بے تکلفی سے جھٹکے دے کر اسے کندھے سے اکھاڑتے ہوئے گیانی جی بولے۔ "تم دیوا جی کو ذرا بھی نہیں جانتے۔ اُن کا سا وسیع اور فراخ دل شاید ہی کسی کے پاس ہو گا۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اگر پروگرام میں حصہ نہ لو گے تو انہیں صدمہ ہو گا۔ خود انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

میں نے دو ایک بار پھر بھی انکار کیا۔ لیکن دیوا جی کے حکم کی تعمیل کئے بغیر گیانی جی کیسے جاتے اُنھیں خوش کرنے کا کوئی بھی موقعہ کیونکر ہاتھ سے جانے دیتے مجھے لئے بغیر انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ "میرا وہاں رہنا نہایت ضروری ہے۔" وہ بولے۔ "تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤں گا اور جو ہرج ہو گا اس کا سارا الزام تمہارے سر ہو گا۔"

ہار کر میں تیار ہو گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر اُن کے ساتھ چل پڑا۔ افتتاح ابھی نہیں ہوا تھا۔ جن افسرِ اعلیٰ کو افتتاح کرنا تھا وہ غالباً ابھی لنچ کے بعد آرام فرما رہے تھے۔ اس دوران معزز مہمانوں کو محظوظ کرنے کے لئے کنسرٹ قسم کی کوئی چیز ہو رہی تھی۔

میں گیانی جی کے ساتھ ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے پریکٹیل سکول کی لڑکیوں نے ایک ارکسٹرا بجایا۔ میں نے غور سے دیکھا — دانی اُن میں نہ تھی حالانکہ وہ ہمیشہ اگلی دو لڑکیوں میں ہوتی تھی۔ پھر ایک کورس ہوا اُن میں بھی وہ نہ تھی حالانکہ

ہمیشہ وہ پہلی صف میں ہوتی تھی۔ پھر ایک دو نظمیں ہوئیں۔ تیرتھ رام نے دیونگر کے اغراض و مقاصد پر ایک نظم پڑھی جس میں دیونگر کے بانی کی بے حد تعریف و توصیف تھی اور جس کے دوران مہمانوں نے کم لیکن دیونگری میزبانوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ پھر اچانک کسی نے میرا نام لیا میں بھول گیا تھا کہ مجھے بھی گیانی جی گانے کے لئے ہی لائے ہیں۔ میں نے ناسازئ طبع کا حوالہ دے کر معذرت چاہی مگر گیانی جی نے مجھے آگے دھکیل دیا۔

"میں کون سا گانا گاؤں ؛ اِس موقعہ کے لئے موزوں کوئی بھی گیت میرے پاس نہیں" میں نے آگے بڑھے بغیر کہا۔

"آپ کوئی بھی گا دیجیئے" یہ کہتے اور دھکیلتے ہوئے گیانی جی مجھے سٹیج پر لے آئے۔

"آپ گائیے ۔ سنو سنو رے کرشن کالا"

میں نے سامنے دیکھا۔ سٹیج کے سامنے نیچے دری پہ بیٹھے مہمانوں میں دلجیت بیٹھا تھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی وانی بھی تھی۔ اُس کا چہرہ ایک دم سفید تھا۔ معلوم ہوتا تھا گویا مہینوں سے بیمار ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے گڑھے تھے اور اُترا ہوا چہرہ نیچے کو جھکا تھا۔ ماتا جی یا ہرموہن یا دیوا جی نے اُسے ضرور پریشان کیا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ وہیں سے اُس نے اسی طرح سر جھکائے جھکائے اُوپر کو میری طرف دیکھا۔ جانے اُس نگاہ میں کیا تھا جو دور تک دل میں اُترتا چلا گیا ..... اور میں گانے لگا۔

سنو سنو ہے کرشن کان
آئی تورے دوار
سنو میری پکار
سنو سنو ہے بانسری والا

مہیش کا وہ امرت گھلا لحن، وہ مسحور کُن آواز، وہ لوچ، وہ لے — کچھ بھی میرے پاس نہ تھا۔ لیکن نہ جانے وانی کو حاضرین میں پاکر کون سا سحر مجھ پر طاری ہو گیا کہ میں پورے جذبے سے ماضی، حال، مستقبل، سے یکسر بے خبر ہو کر گاتا رہا۔

جیسی جو چاہیں باتیں بنائیں
باتیں بنائیں جیسی جو چاہیں
کہے رادھا بھی موہے کلنکی .....

کہ ہلکی سی سسکی مجھے سنائی دی۔ دیکھا رومال سے آنکھیں پونچھتی اور ناک صاف کرتی وانی اُٹھی اور چپ چاپ نکل گئی۔

کسی نہ کسی طرح گیت ختم کر کے میں سٹیج سے ہٹا۔ میری اب کچھ خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ گیانی جی نے مجھے مشورہ دیا کہ تم تھک گئے ہو تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ اب تم آرام کرو۔ اور میں چپ چاپ اپنی کوٹھی کی طرف بڑھا۔ لیکن جلسہ گاہ کے باہر ہی ہرموہن نے میرا کندھا تھام لیا۔

"کدھر چلے یار؟"

اچانک پہلی بار ویسی بے تکلفی سے اُس نے مجھے پکارا۔ میرے رکنے پر میری گردن میں بالکل جگری دوستوں کی طرح ہاتھ ڈالے

وہ مجھے سکول کے پچھواڑے لے گیا۔

"مجھے تمہارے جانے کی خواہش کا علم ہوا ہے۔" اُس نے کچھ دور جا کر کہا۔ "تم کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔ میں نے وانی سے پوچھا ہے۔ تمہاری کوئی بھی غلطی نہیں۔ تم اپنا کام کرو اور مست رہو۔" کچھ قدم اور چل کر وہ یکایک بولا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

میں نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تمہیں بھی وانی سے محبت ہے؟"

اگر جواب کے لئے ہرموہن میرے ہونٹوں کی طرف دیکھنے کی بجائے میرے دل پہ ہاتھ رکھتا تو اُسے فوراً صحیح جواب مل جاتا۔ مگر وہ تو میرے ہونٹوں کو تک رہا تھا۔

"اگر میں اس سے واقعی محبت کرتا تو کیا میں اس کا خط گیانی جی کو دکھا دیتا یا اُسے آگ کی نذر کر دیتا؟"

ہرموہن مطمئن ہو گیا۔ حالانکہ وہ صبح مجھ سے یہی سوال کرتا تو میں کبھی یہ دلیل نہ دے پاتا۔ یہ تو دیوا جی نے ہی مجھے سمجھا دی تھی اور میں دل ہی دل میں اس پر خوش ہوا۔ میں نے مزید رد جماتے ہوئے کہا۔ "سوال یہ نہیں ہے کہ میں وانی سے محبت کرتا ہوں، اپنے دل میں تو کوئی ملکہ معظمہ سے محبت کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میرا فعل اُس کے یا دیوسینا کے تئیں قابلِ اعتراض تو نہیں۔"

"ہاں ہاں یہ تو ہے ۔۔ یہ تو ہے۔" ہرموہن نے کہا۔ "تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ اپنے کام سے کام رکھو اور مست رہو۔"

اور اُس نے مڑ کر سردار پالا سنگھ آرٹسٹ کے بنوائے ہوئے گیٹ کے پاس مجھے چھوڑ دیا۔

رومال سے سسکی کو دباتی اور آنکھیں پونچھتی، وانی میرے گانے کی پہنچ سے باہر گئی تو جیسے پھر نہیں لوٹی۔ اُس کی اُن آنکھوں میں جھانکنا پھر مجھے نصیب نہ ہوا اس کی وہ دور جاتی ہوئی پیٹھ ہی مجھے ہمیشہ نظر آئی۔

جشنِ افتتاح کے دوسرے دن ہی ماتا جی اُسے اور مدھو کو سکول کے ہوسٹل میں لے گئیں۔ وہ ہوسٹل میں رہنے والے دوسرے بچوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتی اُن کے ساتھ ہی سوتی اور کھیلتی۔ دور سے اُس کی جھلک دیکھنا بھی مشکل ہو گیا۔ سکول کا احاطہ بہت کشادہ تھا احاطے کے گرد چہار دیواری تھی۔ اُس میں بچے کھیلتے تھے۔ کبھی جب وہ صبح سیر کو جاتے یا شام کو ہاکی کھیلتے تو وانی بھی چہار دیواری کے باہر نکلتی مگر وہ کوٹھیوں کی طرف نہ آتی۔ وہیں گراؤنڈ کے پرے اپنی کسی سہیلی کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی ٹہلا کرتی۔

اب مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میرا کیا کچھ کھو گیا ہے۔ دوپہر اور شام کو ڈائننگ ہال کی وہ گہما گہمی اور شور دل کی ویرانی کو اور بھی شدید کر دیتا۔ آنکھیں بار بار پہلی میزوں کی طرف اُٹھ جاتیں مگر ہمیشہ ناکام لوٹتیں اور کھڑکیوں دروازوں اور اُن کے باہر دیودار کی روشوں پر بیقرار بھٹکتیں۔ روشن صبحیں آنکھوں میں چبھنے لگتیں اور گرم شامیں اپنے بوجھ سے سینے کو یوں دباتیں کہ جی گھٹنے لگتا۔

اُس دن کا گیا دلجیت پندرہ دن بعد پھر آیا تو وانی بھی اُس قید خانے کی چہار دیواری سے باہر نکلی۔ شام کے وقت کوٹھیوں کے باہر سڑک پر اپنے بھائی کے ساتھ ساتھ آتی ہوئی وہ مجھے مل گئی۔ دلجیت نے 'نمسکار' کیا۔ وہ رُکا لیکن وانی بڑھتی گئی اور کچھ دور پہ ہماری طرف پیٹھ کئے جا کھڑی ہوئی . . . میں پھر سیر نہ کر سکا۔ چُپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ دوسرے دن میں نے دیوا جی سے درخواست

کی کہ کچن کے پرے تین تین کمروں کی جو نئی چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بن رہی ہیں اُن میں سے مجھے ایک دے دیں۔

اب تک کمرے کا کرایہ مجھ سے نہ لیا جاتا تھا۔ جب مَیں نے وہ چھوٹی سی کوٹھی مانگی تو مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اُس کا آٹھ روپے ماہوار کرایہ دینا ہوگا۔ باہر کے لوگ دیونگر میں کوٹھیاں متوار ہے ہیں اُنھیں اُن کے روپے کا کم سے کم سود ضرور مل جائے یہ ذمہ داری دیوسینا کی ہے اور دیوا جی کی سکیم ہے کہ سکول کے ٹیچر وغیرہ سب نئی کوٹھیوں میں رہیں۔ جوں جوں نئی کوٹھیاں بنتی جائیں دیونگر کی سرگرمیاں بڑھا دی جائیں تاکہ اُن کوٹھیوں میں لگا ہُوا روپیہ ڈوب نہ جائے۔

مَیں نے آٹھ روپے دینا منظور کر لیا اور دور اُس اکیلی کوٹھی میں اُٹھ گیا۔ پہلے کبھی کبھی گیانی جی آ جاتے تھے لیکن اتنی دور وہ کیا آتے! مَیں ایک دم اکیلا پڑ گیا۔ خوب کام کرتا اور خوب سوچتا۔ شام کو سیر کرتے کرتے کبھی وانی کی ایک آدھ جھلک نظر آ جاتی لیکن دنوں اُس کی صورت دکھائی نہ دیتی۔ اُس کی شوخی جانے کہاں چلی گئی۔ نہ جانے اُن چند دنوں میں وہ کتنی سیانی اور سنجیدہ ہو گئی۔ بچوں کو سیر کے لئے لے جاتے وقت کبھی نہر کے راستے میں وہ نظر آ جاتی ــــ تنا تنا، گمبھیر چہرہ، گہری اُداس آنکھیں۔ وہ میری طرف نہ دیکھتی۔ منہ پھیر لیتی اور اُس کے بعد دنوں تک دیونگر کا وہ آباد ویرانہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑا کرتا۔

پہلے کبھی مَیں نند لال کے ہاں چلا جاتا۔ لیکن اُس واقعہ کے بعد نہ جانے کیسی جھجک میرے دل میں سما گئی کہ مَیں نے وہاں جانا قطعی چھوڑ دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ مَیں وہاں جاؤں گا تو ساوتری مجھ سے استعفیٰ کے بارے میں پوچھے گی۔ اُس کے ہمدردانہ تجسس کو کسی جھوٹ سے رفع کرنا میرے بس میں نہ ہوگا اور سچی بات کہنا وانی کے راز کو اور پھیلانا ہوگا۔ وہ پہلے ہی کتنی خاموش، کتنی اداس، کتنی سنجیدہ ہو گئی تھی! نہ جانے اُسے مجھ پر کتنا غصہ تھا! ایک بار بھی تو اُن بڑی بڑی آنکھوں سے اس نے میری طرف نہ دیکھا تھا۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ چاند دھیرے دھیرے سلگتا ہوا اپنی بےچین آنکھیں پھاڑے اُس ویرانے کو تکا کرتا اور مَیں اپنی بےخواب آنکھوں سے صدہا سوال لئے اُن سنسان روشوں پر گھوما کرتا۔ کبھی کبھی تیرتھ رام مجھے مل جاتا مگر ہم میں سلام دعا تک نہ ہوتی۔ وہ اپنی راہ چلا جاتا اور مَیں اپنی۔

مَیں نے گانا تک چھوڑ دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ گانا اوچھا پن ہے اور میری انا کو یوں اوچھا ہونا منظور نہ تھا۔ اپنے دل کی ٹیس کو دل میں دبائے، اپنی تنہائی کو گویا چادر کی مانند اپنے اوپر اوڑھے، مَیں اس سونی کوٹھی میں جا بیٹھا۔

بڑی بڑی آنکھیں

افتتاحی تقریب کا دکھاوا ختم ہو جانے کے بعد راما بھتا پا کے بچے درگا اور غلام نبی کا وجود ماتا جی کو پریکٹیکل سکول کے کمتن میں بال جیسا کھٹکنے لگا۔ پریکٹیکل سکول میں داخل ہونے والے بچے اعلیٰ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے ــــ ڈاکٹروں، افسروں، ٹھیکیداروں اور تاجروں کے بچے ــــ چست چالاک، چاک چوبند، صاف ستھرے اور لاڈ پیار میں پلے ہوئے، ان میں بیشتر بگڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں غریب بچے ان سے پٹ جاتے، ذلیل ہوتے اور ماتا جی دوسرے بچوں کو سمجھانے کی بجائے انھیں پر ناراض ہوتیں اور دیوا جی سے برابر اصرار کرتیں کہ وہ درگا

کو سکول سے ہٹا دیں۔ جب دیوا جی کسی طرح تیار نہ ہوئے تو ماتا جی نے انھیں کی زبان میں کہا کہ بچہ زندگی بھر احساس کمتری کا شکار رہے گا اس کی شخصیت ابھر نہ پائے گی آپ خواہ سکول کے کسی ٹیچر کو اسے علیحدہ پڑھانے کے لئے مقرر کر دیں مگر سکول میں اسے نہ رکھیں۔

دیوا جی ماتا جی کے اس مسلسل اصرار سے پریشان ہو گئے تھے۔ سکول سے جو وہ چاہتے تھے انھیں مل گیا تھا۔ کافی بچے آ گئے تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے سامنے کرانے کے خیال سے بعض بچوں کے سرپرستوں نے وہاں پلاٹ بھی خرید لئے تھے اور چھوٹی بڑی کوٹھیاں دن رات تعمیر ہو رہی تھیں۔ دیوا جی کا دماغ اب ایسی سکیموں میں لگا ہوا تھا جن سے وہ اس ویرانے میں رہنے والوں کے لئے روزگار فراہم کر سکیں۔ ماتا جی نے اس بچے کے لئے علیحدہ ٹیوشن کا مشورہ دیا تو دیوا جی خوش ہوئے اور انہوں نے رام تھاپا کو بلا کر بڑے پیار سے سمجھا دیا کہ وہ درگا کی ترقی سے خوش ہیں، سکول میں ٹیچر ذاتی طور پر اس پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتے اور وہ چاہتے ہیں کہ درگا سب لڑکوں کو پیچھے چھوڑ جائے اور دیونگر کا نام روشن کرے۔ اس لئے انہوں نے یہ سوچا ہے کہ ایک ماسٹر خاص طور پر اسے گھر پہ پڑھائے۔ "گھر پہ شاید جگہ نہ ہو۔" انہوں نے کہا۔" میں دوپہر کو ڈیوڑھی میں اس کے پڑھنے کا انتظام کر دوں گا۔"

اور ایک ٹیچر درگا کو ڈیوڑھی میں پڑھانے لگا۔ ہفتہ بھر وہ ڈیوڑھی میں پڑھتا رہا پھر دیوا جی نے کہا کہ وہاں اس کے پڑھنے سے لائبریری میں بیٹھنے والے ویدیسنکوں کا ہرج ہوتا ہے اور بچے کی پڑھائی میں خلل پڑتا ہے اور یہ کہہ کر اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ دو چار دن ماسٹر اسے گھر پہ پڑھانے جاتا رہا، پھر وہ بیمار پڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی درگا کی ذہانت کے سلسلے میں دیونگریوں کا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

ادھر غلام نبی کے بارے میں دبی دبی یہ افواہ پھیلی کہ اسے چوری کی عادت ہے۔ وانی نے تو کبھی ایسی شکایت نہ کی تھی مگر افتتاحی تقریب کے بعد ہی ماتا جی نے اسے نبی کو پڑھانے سے روک دیا تھا۔ محبت اور شفقت کی محرومی کے باعث غالباً وہ بھٹک گیا اور بالآخر ایک دن وہ کتابیں لے کر صبح صبح چلا آیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ماتا جی نے اسے سکول سے نکال دیا ہے۔

ماتا جی سے میرا نمسکار کا ناطہ بھی نہ تھا کہ میں ان سے جا کر پوچھتا۔ دیوا جی سے مضمون لینے گیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ نبی کو سکول سے کیوں نکال دیا گیا ہے؟ سکول کا تو مقصد ہی بچوں کی اصلاح کرنا ہے۔ کیا نبی کی اس عادت کی اصلاح نہ کی جا سکتی تھی۔

"اس بچے کے لئے خود میرے دل میں بہت ہمدردی ہے۔" دیوا جی بولے۔" میں سکول کا پرنسپل ہوتا تو اسے کبھی سکول سے نہ نکالتا اور اسے سدھار کر سب کو دکھا دیتا۔ پیار نہ ملنے پہ بچے چوری کرنے لگتے ہیں۔ میں یقیناً اس کی عادت چھڑا دیتا۔ لیکن سکول کے موجودہ پرنسپل اور تمہاری ماتا جی کے بس کا یہ روگ نہیں اور نبی کی بری عادت کا دوسرے لڑکوں پہ اثر پڑنا ضروری ہے اس لئے تمہاری ماتا جی نے سفارش کی ہے کہ اسے گھر پہ پڑھایا جائے۔ میں نے ایک ٹیچر کو ہدایت کر دی ہے کہ اسے دو گھنٹے پڑھا دیا کرے۔

"خیر اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں دو گھنٹے تو میں بھی پڑھا سکتا ہوں۔" اور اس دن سے میں نبی کو پڑھانے لگا۔ دو تین دن بعد درگا بھی آ گیا اور میری شاموں کی تنہائی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ وانی کے ہوسٹل چلے جانے کے بعد جی کا گھٹا گھٹا سا رہنا اداسی بے سبب اور بے مقصد زندہ رہنے اور ویران سے ویران تر ہونے کا جو احساس دل و دماغ پہ حاوی ہوتا جا رہا تھا وہ بالکل دور ہو گیا۔ میں جی جان

سے دونوں بچوں کو پڑھانے لگا۔ جب وہ چلے جاتے تو میں اُنھیں کے بارے میں سوچتا۔ شہر جا کر میں بچوں کے طریقہ تعلیم پر کتابیں خرید لایا اور مشنریوں کے جوش سے ان دونوں بچوں کو پڑھانے لگا۔

لیکن نبی کو واقعی چوری کی عادت تھی۔ پہلے تو میں نے سمجھا تھا کہ ماتاجی نے اسے نکالنے کے لئے اس پر یہ الزام لگایا ہے لیکن جب نبی پورے دن کوٹھی میں رہنے لگا تو کچھ ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ خواہ یہ عادت اسے بری صحبت کے باعث پڑ گئی ہو خواہ پیار اور ہمدردی کی کمی سے، مگر وہ تھی اس میں ضرور۔ میں کھانے کے لئے کبھی چلغوزے کبھی مونگ پھلی کبھی بادام اور کبھی رسک لاتا۔ نبی ان میں سے کچھ اڑا لے جاتا۔ جس غریب بچے نے یہ سب نہ دیکھا ہو، کھلی چیزیں پانے پر اس کا جی للچا جانا قدرتی ہے۔ جب تک اسے یہ تعلیم نہ دی گئی ہو کہ چوری گناہ ہے اور اس سے آدمی کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ماتاجی کے الزام کو سن کر میں نے طے کر لیا تھا کہ یہ تعلیم میں اسے دوں گا اس کی عادت سدھار دوں گا اور پہلے ہی دن سے میں محتاط ہو گیا تھا۔

'دیو بانی' میں بچوں کی اس عادت کے سلسلے میں خود دیواجی کے کئی مضامین میں نے پڑھے تھے ان کی لائبریری سے لے کر بچوں کی نفسیات پر کچھ کتابیں بھی میں نے دیکھی تھیں اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس بچے کی عادت سدھر سکتی ہے۔ احتیاطاً میں ہر چیز گن لیتا۔ اگر میں اس ہوشیاری سے کام نہ لیتا تو میں نبی کو نہ پکڑ پاتا کیونکہ وہ بڑی صفائی سے چوری کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ پورا فنکار تھا.....

ایک دن میں ایک سیب کھا رہا تھا کہ دیواجی نے مجھے بلا بھیجا۔ آدھا سیب میز پر ہی چھوڑ کر میں ان سے ملنے چلا گیا۔ وہ ایک مضمون کے بارے میں مجھے کچھ سمجھانا چاہتے تھے مگر کافی تلاش کرنے کے بعد انھیں یاد آیا کہ وہ مضمون مجھے پہلے ہی دے چکے ہیں۔ انہوں نے مجھے وہ مضمون لانے کے لئے کہا: کہ وہ سمجھا سکیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

میں الٹے پاؤں واپس آیا۔ کوٹھی پر آ کر میں نے مضمون اُٹھایا۔ چلتے چلتے میز پر پڑے سیب پر نظر گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک طرف کا حصہ کچھ کم ہے۔ میں نے بالکل درمیان سے کاٹا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر محسوس ہوا گویا ایک طرف سے کسی نے ذرا سی پھانک کاٹ لی ہے۔ لیکن میں جلدی میں تھا اس طرف توجہ نہ دی۔ جب میں مضمون سمجھ کر واپس آیا اور میز پر بیٹھ کر سیب کھانے لگا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں طرف سے برابر ہے۔ میں نے اسے اُٹھا لیا۔ وہ نصف سے کچھ کم تھا جب کہ میں نصف سے کچھ بڑا چھوڑ گیا تھا۔ نبی نے دونوں طرف سے بڑی صفائی سے برابر ٹکڑے کاٹ لئے تھے۔ بادام اور چلغوزے بھی وہ ایک ساتھ زیادہ نہ چراتا تھا۔ کبھی چار کبھی چھ۔ اس کے صبر و ضبط کی میں داد دیتا ہوں۔ سامنے پڑی چیز کو دیکھ کر، اگر چوری کی عادت ہے تو، اس قدر ضبط سے کام لینا نہایت دشوار ہے۔ میں ایک کاغذ پر روزانہ نوٹ کر لیتا کہ آج اُس نے اتنے بادام چرائے ہیں، آج اتنے چلغوزے، اتنے رسک یا اتنے مونگ پھلی کے دانے۔ چند دن تک میں یہ حساب لکھتا رہتا۔ ساتویں دن بڑے پیار سے اسے سمجھاتا کہ اسے چوری نہ کرنی چاہیئے۔ جب وہ قسمیں کھاتا اور کہتا کہ وہ کبھی چوری نہیں کرتا تو میں اسے بتا دیتا کہ اس نے کس دن کیا چوری کی ہے۔ نبی کی آنکھیں حیرت سے کھل جاتیں۔ میں اس سے کہتا: تم جب چوری کرتے ہو تو، مجھے پتہ چل جاتا ہے۔ پھر تم کیوں چوری کرتے ہو؟ اور اسے چلغوزے بادام رسک یا مونگ پھلی — جو کچھ اس وقت ہوتا — کھانے کو دے دیتا۔

کچھ دن نبی چوری نہ کرتا۔ لیکن میں برابر چیزیں گنتا رہتا — اور پھر پانچویں چھٹے روز دیکھتا کہ چیزیں غائب ہونے لگی ہیں۔ میں پھر اسی

طرح نوٹ کرنا شروع کر دیتا۔ اس کے ساتھ ہی میں کونوں کھدروں میں پیسے پھینک رکھتا اور دیکھتا کہ کس دن وہ غائب ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر مصری کی ڈلیاں رکھ دیتا اور خیال رکھتا کہ کس دن کون ڈلی اٹھی اور اس کی ساری چوریاں میں ساتویں دن اسے بتا دیتا۔ اس کے ساتھ ہی پڑھائی کے وقت میں اسے ایسے بڑے بڑے لوگوں کی باتیں سناتا جو بہت ہی غریب گھرانوں میں پیدا ہو کر بڑے کہلائے۔ آہستہ آہستہ نبی کی چوری کی عادت کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی۔ میں بہت خوش ہوا اور فخر کے ایک ناقابلِ بیان جذبہ سے میرا دل معمور ہو گیا۔

مئی کا دوسرا ہفتہ جا رہا تھا۔ دن تپ اٹھے تھے اور دوپہر لُو میں بگولے اُٹھنے لگے تھے۔ دیونگر میں گرمیاں گذارنے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ آٹھ بجے ہی دھوپ اس طرح دہکنے لگتی کہ آنکھیں کھولنا مشکل ہو جاتا۔ پریس اور دفتر تو نبی ہی جاتا، لیکن دیوا جی سے مضمون لینے مجھے ہی جانا ہوتا۔ کئی بار جب کاتب یا کمپوزیٹر تحریری ہدایت نہ سمجھتے تو انھیں سمجھانے کے لئے دفتر اور پریس جانا پڑتا۔ نہ جانے دھول پڑ گئی یا دھوپ لگ گئی کہ میری آنکھیں آشوب کر آئیں۔ پتھر چٹّی کے حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ انہوں نے رسونت دھنیا مشک کافور وغیرہ کی پوٹلی بنا کر پانی میں بھگو کے آنکھوں پر ٹکور کرنے کو کہا اور ہدایت کی کہ رات کو روئی کے پھاہوں پر بالائی رکھ کر باندھوں۔ دیونگر کی کوٹھیاں اور اُن کے کمرے کافی ہوادار اور روشن تھے۔ دکھتی آنکھیں، چمکتی، دہکتی، جلتی تپتی دوپہریں۔ . . . اُن میں سے کسی کمرے میں بھی بیٹھنا مشکل نظر آتا۔ میں غسل خانے میں (کیونکہ وہی نسبتاً ٹھنڈا اور اندھیرا تھا) چٹائی بچھا کر ساری دوپہر لیٹا رہتا اور آنکھوں پر ٹکور کیا کرتا۔

اس روز صبح میرے گاؤں سے کچھ مہمان آ گئے۔ اُنہوں نے دو چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کے لئے جگہ لی تھی اور انھیں بنوانے کے سلسلے میں وہ نندلال سے کنٹریکٹ کی بات کرنے آئے تھے۔ وہ سیدھے میرے ہاں آئے اور ہینڈ بیگ ڈرائنگ روم میں رکھ کر نندلال سے ملنے چلے گئے۔ میں دس بجے ہی غسل خانے میں چٹائی پر جا لیٹتا۔ کھانا میرا نبی لے آتا اور میں وہیں غسل خانے میں کھانا کھاتا۔ ان کے ساتھ میں نہ جا سکا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آئے اور مجھ سے اجازت لے کر اپنا بیگ اٹھا کے چلے گئے۔

نبی عموماً مجھے کھانا کھلا کر باہر کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔ اس روز وہ میرے پاس آ بیٹھا۔ میری آنکھوں پر ٹکور اسی نے کی۔ "باہر کھڑکی کھلی ہے۔" یکایک ٹکور کرتے کرتے اس نے کہا۔ "کوئی اس راستے باہر سے آ کر کچھ اُٹھا نہ لے جائے۔"

میں ہنسا۔ "میں دروازہ کھلا چھوڑ کر چلا جاتا ہوں کبھی ایک پیسے کی چیز بھی نہیں گئی۔ ہمارے اندر رہتے ہوئے کون اٹھا لے جائے گا۔"

مگر وہ اٹھا اور کھڑکی بند کر آیا۔ وہ مجھ سے کچھ ڈرتا تھا اور میرے پاس کم ہی بیٹھتا تھا مگر کھڑکی بند کر کے وہ پھر آ بیٹھا اور ٹکور کر کے اُس نے میرے پیر بھی دبائے اور مجھے ایک پنجابی دیہاتی گیت بھی سنایا۔ حتیٰ کہ میری آنکھوں میں غنودگی چھانے لگی اور میں سو گیا۔ جاگا تو نندلال میرے سرہانے کھڑا تھا۔ شاید اسی نے مجھے جگایا تھا۔

"میں تمھیں ہرگز نہ جگاتا۔" اس نے کہا۔ "تم ایسی گہری نیند سوئے تھے، مگر بات کچھ ایسی ہو گئی ہے۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جسونت سنگھ تمھارے گاؤں سے آئے ہوئے تھے نا۔ . . ."

"ہاں ہاں میرے ہی یہاں تو آئے تھے۔ میری آنکھوں میں تکلیف تھی ورنہ میں انھیں خود لے کر آتا۔" میں نے بے صبری سے کہا۔

"انہوں نے اپنا بیگ تمہارے ہاں رکھا تھا۔ چلتے وقت تمہارے یہاں سے بیگ لے کر گئے تو اُنھیں معلوم ہوا کہ اس میں سے منی بیگ گم ہے۔ پچاس روپے تھے اس میں۔ وہ تو بڑے مخمصے میں پڑے تھے۔"

اچانک مجھے نبی کا کھڑکی بند کرنا، میری آنکھوں پر اپنے آپ ٹکور کرنا، میرے پیر دبانا اور مجھے گانا تک سنانا یاد آ گیا اور میں نے کہا۔ "نبی نے اٹھائے ہوں گے۔ کہاں ہے وہ؟"

نندلال نے آہستہ سے کہا "مجھے خود اس پر شک ہوا تھا۔ اسے پکڑ منگوا کر میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے مان لیا کہ اس نے اٹھائے تھے، مگر ایک مزدور نے اس سے لے لئے۔ میں نے گھنٹہ بھر سے سب مزدوروں کو بٹھا رکھا ہے۔ وہ کبھی کسی کا نام لیتا ہے کبھی کسی کا۔ سب قسمیں کھاتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ کسی اور نے نہیں اٹھائے۔ اسی کی حرکت ہے۔"

میں نے کہا "ذرا اسے بلا دیجئے۔"

میں اُٹھ کر باہر بیٹھک میں آیا۔ نبی باہر برآمدے میں ہی تھا۔ نندلال نے اسے آواز دی۔ وہ اندر آیا۔ چہرہ سُتا ہوا تھا اور آنکھوں میں خوف سمایا تھا۔

"بھئی نبی تم نے بٹوا اٹھا لیا۔ وہ آدمی ہمارے مہمان ہیں اُن کی چیز نہ اُٹھانی چاہئے تھی۔ لاؤ دے دو۔

وہ میرے قدموں پر گر پڑا۔ ایک سانس میں کئی قسمیں کھا گیا "خدا کی سونہہ بابو جی، رب دی سونہہ بابو جی، ماں دی سونہہ بابو جی، قرآن مجید دی سونہہ بابو جی، میں نے نہیں اُٹھائے۔

وہ قسمیں کھاتا کہ اس نے روپے اٹھائے ہوں تو وہ کھڑا کھڑا مر جائے، اس کی ماں مر جائے، اسے سانپ سونگھ جائے۔ اور میں چپ چاپ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کھڑکی سے آنے والی روشنی کی چمک سے انھیں بچاتا ہوا اس کے منہ کی طرف تکتا رہا۔ پھر میں نے انگریزی میں نندلال سے کہا کہ وہ مجھے اکیلے اس سے بات کرنے دے۔

نندلال چلا گیا تو میں نے نبی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "دیکھو بھائی مجھے تو پہلے ہی سے پتہ ہے کہ تم نے آج کچھ اُٹھایا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم نے میری کوئی قیمتی چیز اُٹھائی ہے۔ لیکن کسی مہمان کا بٹوا اُٹھا لیا ہے، یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا......"

"بابو جی قسم کھاتا ہوں، میری ماں مر جائے اگر......"

"دیکھو نبی قسمیں نہ کھاؤ۔ چپ چاپ بٹوا لا دو۔ خود پریشان ہوئے، مجھے پریشان کر دو گے۔ تمہاری بڑھیا ماں ہے وہ پریشان ہو گی۔ اپنے ساتھ اسے دھکے کھلواؤ گے تمھیں شرم نہ آئے گی۔"

لمحہ بھر نبی چپ رہا۔ اس نے اور قسم نہیں کھائی بس فرش کو تکتا رہ گیا۔

میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا "دیکھو جب بٹوا اس کمرے سے گیا ہے تو یا تم نے اُٹھایا ہے یا میں نے۔ میں تو تم جانتے ہو اُن کے آنے کے پہلے ہی سے اندر بیٹھا ہوں۔ بٹوا نہ ملے گا تو میری بھی بدنامی ہو گی۔ تمہارے ساتھ جو میں نے تھوڑی بہت نیکی کی ہے اُس کا تم یہی انعام دو گے مجھے؟"

وہ پھر چپ رہا۔ میں نے پھر کہا۔ "دیکھو تم نے جب جب چوری کی ہے مجھے پتہ چل گیا ہے۔ آج بھی پتہ چل گیا کہ روپے تم نے چرائے ہیں۔ تمہارے دل میں صبح سے ہی چور تھا۔ کھڑکی روزانہ کھلی رہتی ہے مگر تمھیں کبھی اسے بند کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ تم میرے پاس بھی یوں کبھی نہیں بیٹھے۔ تمہاری ان حرکتوں کو دیکھ کر مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ تم نے ضرور چوری کی ہے۔"

نبی پھر خاموش رہا۔

"تم تو بہت چھوٹے ہو۔ پولیس بڑے بڑوں سے اقبال کروا لیتی ہے۔ ایسی سزا دیتی ہے کہ آدمی بلبلا اٹھتا ہے اور برسوں کے لئے بیکار ہو جاتا ہے۔ تمھاری ماں تمھیں اس مصیبت میں دیکھ کر ہی مر جائے گی۔"

نبی چپ رہا اور پاؤں کے انگوٹھے سے سیمنٹ کا فرش کریدتا رہا۔

"ڈیونگر ہی میں نہیں، تمھیں کہیں بھی نوکری نہ ملے گی۔ تم تو سمجھدار ہو، جانتے ہو کہ تمھارے گھر کا خرچ تمھاری تنخواہ سے چلتا ہے۔"

لمحہ بھر کو ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر میں نے اُس کے کندھوں کو تھپتھپایا اور کہا۔

"دیکھو نبی مجھے بٹوا دے دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں نوکری سے نہیں نکالوں گا تمھاری ماں سے بھی نہیں کہوں گا اور ڈیونگر والے خواہ کتنا ہی شور مچائیں تمھیں اپنے پاس رکھوں گا۔"

"میں کل دے دوں گا۔" اچانک اس نے کہا۔

"گھر تو تم گئے نہیں، تم نے یہیں کہیں چھپایا ہے۔ دیکھو بٹوا دے دو۔ تمھیں کوئی گھر نہ جانے دے گا۔ سیدھے یہاں سے تھانے لے جائیں گے —— تمھاری ماں رو رو کر مر جائے گی۔ مجھے بٹوا دے دو گے تو تم پر ذرا بھی آنچ نہ آنے دوں گا۔"

"چلیئے۔"

"کہاں؟"

"وہاں کھیت میں چھپا رکھا ہے۔"

باہر دوپہر ناچ رہی تھی۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ آنکھیں نہ اٹھتی تھیں۔ ویرانے میں بہرئیے بنتے اور دھول اڑتی۔ اچھی بھلی آنکھوں والے انھیں ڈھک کر چلتے۔ میری آنکھیں یوں بھی آئی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک روئیں دار موٹا تولیہ اٹھا کر سر اور آنکھوں کو ڈھک لیا اور نبی کے پیچھے ہو لیا۔

سکول کی گراؤنڈ کے پار، جنگل کی طرف کھڑے گیہوں کے ایک کچے کھیت میں، جو ابھی کٹا نہ تھا، نبی مجھے لے گیا۔ وہیں ایک کونے میں ذرا سی مٹی کھود کر اس نے بٹوا نکالا اور اپنی قمیض کے دامن سے صاف کر کے اس نے مجھے دے دیا۔ اسے تولیے کے اندر بچا کر اپنی آنکھوں کو دھوپ سے بچاتے ہوئے اسے کھول کر میں نے نوٹ گنے۔ پانچ پانچ کے دس نوٹ تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور یکایک نبی کو بغل میں لے کر محبت سے دبا لیا۔ "گھبراؤ نہیں تمھیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔" اُسے شاباش دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "نہ میں تمھیں نوکری سے جواب دوں گا، نہ تمھاری ماں سے کہوں گا اور نہ تم پڑھنا بند کر دو گے۔"

لیکن میرے عہد کی آزمائش کا وقت جلد ہی آ گیا۔ اتنی جلدی کہ مجھے تصور بھی نہ تھا۔

تیسرے ہی دن دوپہر کو ہرموہن پتھر چٹی کے حکیم صاحب کے ساتھ آیا۔

"حکیم صاحب دلجیت کو دیکھنے آئے تھے چلتے وقت میں نے کہا کہ سنگیت جی کو بھی دیکھتے چلیئے ......"

"دلجیت کو کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں صفرا کی زیادتی ہے۔" حکیم صاحب بولے۔ "ٹھیک ہو جائے گا جلد ہی۔" پھر میری آنکھوں کی پلکیں اٹھا کر انہوں نے کہا کہ پہلے سے بہتر ہیں اور مشورہ دیا کہ میں پوٹلی کی ٹکور جاری رکھوں۔

اور وہ چلے گئے۔

ہرموہن لمحہ بھر کے لئے رک گیا اور بولا: "تم نے ابھی تک نبی کو رکھ چھوڑا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے اس کی بات سمجھنے کے باوجود پوچھا۔

"وہ چور ہے۔ تمہیں پھر جلکمہ دے گا۔"

"بچہ ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ارے بھلا یہ عادتیں بھی کبھی جاتی ہیں۔"

"آپ شاید وِیوبانی نہیں پڑھتے۔ دیوا جی تو ہمیشہ اس پہ زور دیتے ہیں کہ بچوں کی یہ عادتیں دور کی جا سکتی ہیں۔"

ہرموہن نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ "ماتا جی نے کہلا بھیجا ہے۔" اس نے کہا "کہ نبی یہاں نہیں رہ سکتا۔"

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

"ایسی جلدی نہیں۔ تمہاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں جب اسے جواب دے دینا۔ لیکن اس کے رہنے سے نہ صرف تمہیں بلکہ ہمیں بھی ڈر ہے۔"

جواب میں میں نے کروٹ بدلی اور منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ تبھی حکیم صاحب نے آواز دی اور ہرموہن ماتا جی کا حکم سناتا ہوا چلا گیا۔

دوسرے دن صبح ابھی میں غسل خانے میں جا کر لیٹا ہی تھا کہ دیوا جی آ گئے۔ میں چوکی پر بیٹھ گیا۔

انہوں نے نبی سے کہا کہ وہ باہر برآمدے میں جا کر بیٹھے اگر کوئی انہیں پوچھنے آئے تو اندر آ کر اطلاع دے۔

نبی چلا گیا تو انہوں نے میری آنکھوں کا حال پوچھا۔ میں نے کہا "دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ پہلے سے آرام ہے۔"

"آرام ہے تو ٹھیک ہے۔" وہ بولے۔ "ورنہ میں سوچتا تھا کہ پتھر چٹی کے ہسپتال سے ڈاکٹر کو بلوائیں۔"

"جی نہیں خیال ہے دو ایک روز میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ ہلکی سی سرخی ابھی باقی ہے۔ آج رات روئی کے پھاہوں پر بلائی

رکھ کر باندھنے کا خیال ہے۔ حکیم صاحب نے کہا تھا، مگر میں باندھ نہیں سکا۔"

"میں ہرگوبند کو کہہ دیتا ہوں۔ شام کو بالائی تمھیں دے جائے گا۔ اس سے آنکھوں میں کیچڑ بھی نہ آئے گا اور ان میں نمی بھی رہے گی۔"

"کام کا ضرور ہرج ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آنکھیں ٹھیک ہو جانے پر دن رات لگ کر پورا کر دوں گا۔"

"کہیں آنکھیں خراب ہو جائیں۔" دیوا جی ہنسے۔ "ارے بھئی، کام کی فکر چھوڑو پہلے اپنی آنکھیں ٹھیک کر لو، کام پھر بھی ہو جائے گا۔"

اور میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے وہ اٹھے پھر جیسے چلتے چلتے انھیں کچھ یاد آگیا ہو انہوں نے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارے کچھ روپے چلے گئے۔"

"جی نہیں میرے گاؤں سے کچھ مہمان آگئے تھے، ان کا بٹوا کھو گیا تھا۔"

"مل گیا نا؟"

"جی ہاں!"

"کتنے روپے تھے اس میں؟"

"پچاس!"

"یہاں تو کبھی چوری ہوئی نہیں۔ کس نے اٹھایا تھا؟"

میں جانتا تھا کہ انھیں سب معلوم ہے لیکن انجان بنتے ہوئے میں نے کہا۔ "آپ نے دیوالی پر بالکل صحیح کہا ہے کہ اگر آپ اپنے روپے پیسے سنبھال کر نہیں رکھتے، ٹرنک یا الماری کو قفل نہیں لگاتے تو نوکروں کو چوری کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جسونت سنگھ جی ہینڈ بیگ کے اوپر ہی منی بیگ رکھ کر چلے گئے۔ نبی کو کچھ اتنا کام تو تھا نہیں، بیٹھے بیٹھے اس نے بیگ کھولا۔ اوپر ہی بٹوا پڑا تھا۔ للچا گیا۔ میں نے سمجھایا تو اس نے بٹوا دے دیا۔"

"چہ چہ۔" انہوں نے اظہارِ افسوس کیا اور بولے۔ "دیونگر میں کبھی چوری نہیں ہوئی۔ باہر والے مہمان کیا کہتے ہوں گے؟ تمہاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں تو تم اس بچے کو جواب دے دینا۔ میں اسے کہیں اور کام دلا دوں گا۔ گھروں میں اس کا رہنا ٹھیک نہیں۔"

اور مجھے جواب کا موقع دیئے بغیر دیوا جی چلے گئے۔

نبی شاید باہر برآمدے میں نہ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم ہی میں تھا۔ اس نے دیوا جی کی بات سن لی یا اسے کسی دوسرے ملازم سے پتہ چل گیا کہ ماتا جی وغیرہ اس کے خلاف ہیں اور اسے احساس ہو گیا کہ دیوا جی اسی کے بارے میں بات کرتے آئے ہیں۔ ان کے جاتے ہی وہ آگیا اور گھٹنوں کے بل میرے پاس بیٹھ کر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"دیوا جی آپ مجھے جواب دے دیں گے؟"

دیوا جی کے جاتے ہی میں پھر لیٹ گیا تھا۔ غصہ سے کچھ ایسا ہیجان دل میں برپا ہوا اور اعصاب کچھ یوں تن گئے کہ میں چپ چاپ آنکھوں پر ٹکور کرنے لگا۔ دیوا جی کے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے، اسی بات پر میرا خون کھول رہا تھا۔ نبی اتنی آہستگی سے آیا کہ میں نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہیں سنی

اس کی آواز سن کر میں نے کروٹ بدلی۔ رومال سے پلکیں صاف کر کے آنکھیں کھولیں۔ بچے کی آنکھوں میں عجیب سا خوف تھا جانے وہ باہر کیا کیا سنتا رہا تھا۔ جانے وہ کتنا ڈر گیا تھا۔

"دارجی میں کبھی چوری نہیں کروں گا۔ آپ مجھے نکالیئے گا نہیں۔"

میرا دل بھر آیا۔ بائیں ہاتھ سے کھینچ کر میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ جب تک میں یہاں ہوں تم میرے ساتھ رہو گے۔"

تیسرے روز میری آنکھیں ٹھیک ہو گئیں اور میں کھانا کھانے ڈائننگ ہال میں گیا۔ نبی نے تو کہا تھا کہ وہ کھانا وہیں لا دے گا مگر میں غسل خانے میں بیٹھا بیٹھا اتنا اکتا گیا تھا کہ میں نے لنگر میں جا کر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ تیسری صف میں اسی اپنی پرانی آخری میز پہ جا بیٹھا۔ لُو چلنے لگی تھی۔ ہال کے سب دروازے بند تھے صرف دو کھڑکیاں کھلی تھیں تاہم ہال میں کافی روشنی تھی۔ موزیک کے چمکتے دمکتے شفاف فرش پہ گرد کی ایک ہلکی سی تہہ جمی تھی جس پہ آنے جانے والوں کے قدموں کے ہلکے سے نشان بن جاتے تھے۔ کچن کا چھوکرا بیٹری کو گیلے کپڑے سے بار بار پونچھ کر چمکا دیتا تھا اس لئے ہال کے فرش کے مقابلے میں وہ بڑی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

گرمی کے باعث بہت سے دیوسینک کھانا ملازموں کے ہاتھ اپنی کوٹھیوں میں ہی منگوا لیتے تھے۔ تیسری صف میں صرف تین چار شخص ہی کھانے کو آئے تھے۔ میں اپنے خیالات میں غرق نبی کے بارے میں سوچتا ہوا کھانا کھا رہا تھا کہ اچانک چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی ایک فوج ہال میں گھس آئی۔ میں نے انہیں دیکھ کر بھی گویا نہیں دیکھا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا اور سوچتا رہا۔ آنکھیں جب ٹھیک ہو گئی ہیں تو نبی کا سوال پھر اٹھے گا۔ ماتا جی جب اس کو نکالنے پر تُل گئی ہیں تو اسے رکھ دیو نگر سے بیر مول لینا ہے۔ نبی کا تو بہانہ ہے مطلب تو مجھے تنگ کرنے سے ہے۔ تیرتھ رام اور رہر موہن نے چوری کے اس واقعہ کے سلسلے میں ماتا جی کے کان بھرے ہوں گے۔ وہ تو پہلے ہی خار کھائے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے اسے نکالنے کا نادر شاہی حکم دے دیا ہو گا۔ جتنے دن نبی میرے ہاں رہے گا دو سیخ کا کباب بنی رہیں گی۔ لیکن اب کچھ بھی ہو، خواہ مجھے دیو نگر چھوڑنا پڑے، میں نبی کو نہیں نکالوں گا......

جبھی کچھ لڑکوں نے آ کر میری میز کو گھیر لیا۔

"چندہ دیجئے سنگت جی پرسوں ہماری کنسرٹ ہونے والی ہے اس میں ہم ایک ناٹک کریں گے۔"

"میں چندہ ونده کبھی نہیں دیتا۔" نبی کے مسئلے میں الجھے اور ان کی طرف دیکھے اور ان کی پوری بات سنے بغیر میں نے کہا۔

لڑکوں نے مڑ کر مایوس نظروں سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ان کے ساتھ بے مقصد میری نگاہیں بھی اٹھیں۔ پرے دروازے میں وانی کھڑی تھی۔

لڑکوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ کچھ نہیں دیتے۔

وانی ہال کے وسط میں آ گئی اور میری آنکھ بچاتے ہوئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ ان سے پھر کہو۔

اگرچہ وانی اپنی آنکھ بچا گئی تھی پھر بھی جس اپنائیت کے ساتھ اس نے لڑکوں کو مجھ سے اصرار کرنے کا اشارہ کیا اس نے

میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا۔

میں نے بچوں سے کہا: "میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ہے۔ شام کو میری کوٹھی پر آؤ گے تو دے دوں گا۔"

ایک لڑکے نے پوچھا: "کتنے دیں گے؟"

میں نے قدرے مسکرا کر کہا: "ایک!"

"آپ بڑے کنجوس ہیں۔"

ابھی لڑکے کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہوں گے کہ وانی نے بڑھ کر اس کے منہ پر ہلکی سی چپت لگا دی۔ "ایسے نہیں بولتے۔" اس نے دانتوں میں کہا اور پھر اس کی نگاہیں مجھ سے ملیں گویا کہہ رہی ہوں: "لڑکوں کی گستاخی کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔"

ایک دوسرے لڑکے نے کہا: "ہم پانچ روپے لیں گے۔"

"چلو چلو۔" کہتے ہوئے وانی انہیں لے چلی۔ میں نے اسی لڑکے سے کہا: "شام کو آنا، جو بھی ہو سکے گا دوں گا۔"

میرا خیال تھا کہ وانی مڑ کر دیکھے گی۔ اس کے مڑنے کی توقع ہی سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر سامنے کچن کے دروازے پر تیرتھ رام نمودار ہوا اور وانی مڑے بغیر لڑکوں کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ دن بھر لو چلتی رہی تھی لیکن دن ڈھلتے ہی ہوا تھم گئی تھی۔ تپش جو دن بھر ہوا کے پر وں پر اڑ رہی تھی گویا ان دیکھی گھٹا کی مانند تمام ماحول پر چھا گئی تھی۔ لیمپ اٹھا کر میں باہر برآمدے میں آیا۔ ابھی چمنی صاف ہی کر رہا تھا کہ گہرے غم میں کسی شیریں یاد کی طرح ہوا کا ایک ہلکا جھونکا آیا۔ پسینے سے تر بدن میں ہلکی سی پھریری دوڑ گئی۔ بتی کاٹ کر چمنی ٹھیک سے رکھ کے میں لیمپ اٹھا کر اندر جا ہی رہا تھا کہ میں نے سامنے کے موڑ پر لڑکوں کا جھنڈ دیکھا۔ وانی ان کے ساتھ تھی۔ دل زور سے دھڑک اٹھا۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ اس کی دھڑکن تو اسی وقت سے تیز تھی جب میں لنچ کے بعد لوٹا تھا اور میں نے وانی کی آنکھوں میں پھر کچھ پرانا سا تاثر دیکھا تھا اور میرے دل نے کہا تھا کہ وہ شام کو ضرور آئے گی۔

میں رکا نہیں۔ ڈرائنگ روم میں گیا۔ میز پر لیمپ رکھا۔ پھر دیا سلائی لینے کے لئے میں چھوٹے کمرے میں گیا۔ پہلے میں چھوٹے کمرے ہی سے لیمپ جلا کر ڈرائنگ روم میں رکھتا تھا، لیکن میں بہت مصروف ہوں اور میں نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں وہ معمول فراموش کر گیا۔ یہ دماغ بھی عجیب شے ہے۔ سخت پریشانی کے عالم میں بھی یہ کئی بار نہایت تیزی سے سکیمیں بنا لیتا ہے۔ دیا سلائی کی ڈبیا میں شاید اسی لئے چھوڑ گیا تھا کہ اسے لینے پھر جاؤں اور جان سکوں کہ وہ لڑکے میری ہی طرف آ رہے ہیں یا کہیں گھومنے جا رہے ہیں۔ میرا خیال صحیح تھا۔ بچے ادھر ہی آ رہے تھے۔ دیا سلائی لے کر بغیر ادھر دیکھے میں واپس آیا۔ لیمپ جلا رہا تھا کہ بچے دھڑ دھڑاتے اندر آ گئے۔ میں خاموشی سے لیمپ جلاتا رہا۔ ایک دو تیلیاں بھی بجھیں مگر لیمپ جلا کر ہی میں نے پیٹھ پھیری۔ جان بوجھ کر وانی برآمدے میں ہی رک گئی تھی۔ جان بوجھ کر وہ شام ڈھلنے کے بعد آئی تھی۔ لمحہ بھر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر میں ڈبیا وہیں چھوٹے کمرے میں رکھنے کے بہانے چل دیا۔ دروازے میں رک کر میں نے کہا: "تم کیوں آئی ہو؟ میں نے کہہ دیا تھا روپے میں پہنچا دیتا۔"

وانی کا رنگ ایکدم سپید ہو گیا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی صرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے ایک ٹک تکتی رہی۔ میں کنی کاٹ کر چھوٹے کمرے میں آ گیا۔ اگرچہ اس بچے نے پانچ روپے مانگے تھے مگر میں نے پانچ کے ساتھ دو کے نوٹ اور ملائے اور واپس آکر وانی کو نہیں اسی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"اِن کو تھینک کہو للونت!" وانی نے اچانک کہا اور لڑکا بولا۔ "تھینک یو"

بچے جیسے آئے تھے دھڑ دھڑاتے چل دیئے۔

ان کے پیچھے ایک لمحہ کو رک کر یکایک وانی نے پوچھا۔ "آپ نبی کو نکال رہے ہیں؟"

"تم سے کس نے کہا؟"

"ماتا جی ہر موہن بھرا جی سے کہہ رہی تھیں۔ نبی کل بہت اُداس تھا۔"

"نہیں میں اسے نہیں نکال رہا۔"

"ہاں اسے نہ نکالئے گا۔" اور اپنی انھیں بڑی بڑی گہری آنکھوں میں لمحہ بھر کو مجھے شرابور کرتے ہوئے وہ بھاگ گئی۔

وانی چلی گئی۔ برآمدے میں رکا میں اسے دیکھتا رہا۔ موڑ پر پہنچ کر اس نے پھر ایک بار مڑ کر دیکھا۔ اتنی دور سے آنکھیں تو نہ دکھائی دیں مگر محسوس ہوا کہ اس نگاہ نے نظر نہ آکر بھی مجھے چھو لیا ہے اور اس کے لمس نے میرے دل کی ساری اُداسی اور ویرانی کو دور کر دیا ہے۔

دن میں گرمی کے باعث کام کچھ زیادہ نہ کر سکا تھا۔ خیال تھا کہ شام کو کچھ ٹھنڈک ہونے پر کوشش کروں گا۔ لیکن لیمپ کے پاس بیٹھنے کو ذرا بھی جی نہ چاہا۔ لنگر میں کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک وہیں کوٹھی کے باہر سڑک پر گھومتا رہا پھر میں نے اندر سے چارپائی نکالی اور باہر بچھا کر لیٹ گیا۔ اندھیرا ہر چہار اطراف سے بڑھ آیا تھا لیکن آسمان میں بے شمار تارے ٹمٹما رہے تھے اور بائیں طرف آم اور جامن کے پیچھے طلوع ہونے والے چاند کی ضیا جھجکی رہ کر بھی اٹھی رہنے والی وانی کی ان نگاہوں کی مانند درختوں کے اوپر سے آسمان کو منور کر رہی تھی۔

شام کو وانی سے ہونے والی وہی وہ باتیں بیسوں بار کانوں میں گونج گئیں۔ اس کی وہ پہلے سہمی سہمی پھر مسرور اور پھر ممنون نگاہیں بار بار دل کے تاروں کو چھیڑتی رہیں۔ سوچتا رہا —— بار بار وہی ایک بات —— کہ وانی کے دانستہ تغافل کو اس کا حقیقی تغافل سمجھ کر میں نے کتنی بڑی غلطی کی۔ اگر وہ درحقیقت مجھ سے نفرت کرنے لگتی تو کیا اس کا یوں اظہار کرتی؟ کیا وہ مجھے دیکھ کر منہ پھیر لینے یا دہیں کھڑے کھڑے اپنی ان نظروں کی ایک ہلکی سی جنبش سے، پیشانی کی خفیف سی شکن سے میرے تئیں نفرت کا اظہار نہ کر سکتی تھی سامنے کسی کو دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا دوسرے کو اس بات کا احساس دلا دینا کہ وہ بے حد حقیر ہے ان آنکھوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اس کے لئے اتنے قدم چل کر مجھ پر پیٹھ پھیرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور وانی کے اس برتاؤ پر، جس سے دل تنگی سے بھر اٹھا تھا، یکایک پیار آ گیا۔ میری اُس حرکت پر اُسے کتنا غصہ نہ آیا ہوگا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی تو حق بجانب ہوتی۔ لیکن وہ نفرت نہ کرتی تھی۔ اس کے دل میں میرے لئے محبت تھی۔ اس لئے وہ جتا دیتی تھی کہ میری بات سے اسے تکلیف پہنچی ہے اور وہ مجھ سے

ناراض ہے۔

.... 'میں نبی کو نہیں نکالوں گا'.... میں نبی کو ہرگز نہیں نکالوں گا — میں دل ہی دل میں عہد کر رہا تھا — میں اسے اور بھی اچھی طرح پڑھاؤں گا۔ اسے قابل بنا کر دیونگر والوں کو دکھ دوں گا کہ ان کا خیال غلط تھا۔ دیوا جی کو بتا دوں گا کہ جو مضامین لکھ کر وہ اپنے فرائض کو مکمل سمجھ لیتے ہیں، میں انھیں پر عمل کرنا انھیں لکھنے سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ وانی کو جتا دوں گا کہ اگر اس نے مجھ پر اعتماد کیا ہے تو میں اس اعتماد کا صحیح معنوں میں مستحق ہوں'.....

دفعتاً خیال آیا کہ وانی سے میں نے کچھ روکھا برتاؤ کیا ہے۔ جانے کیوں دل کی تمام قوتوں سے چاہنے پر بھی زبان سے وہی روکھے سوکھے بول نکلے تھے۔ اب جی محسوس اٹھا کہ وانی آئی اور میں اس سے ڈھنگ کی دو باتیں بھی نہ کر سکا..... نہ جانے میں کب تک اسی طرح سوچتا رہتا، لیکن آسمان میں اندھیرے پا کر کا ایک چوتھائی چاند جھانکنے لگا۔ ہوا میں خنکی آ گئی، پلکیں بھاری ہو گئیں اور میں سو گیا۔

صبح نبی آیا تو میں نے اس سے پوچھا "کیا تم نے وانی سے کچھ کہا تھا؟"

میرے اس اچانک سوال پر وہ ایکدم سہم گیا اور چپ کھڑا رہا۔

میں نے سوال بدلا "کیا تم وانی سے ملتے ہو؟"

وہ پھر خاموش رہا اور ٹکر ٹکر میری طرف تکتا رہا۔

میں نے دوسری طرح سوال کیا "کیا وانی تم سے ملتی ہے؟"

"جی!"

"کیا کہتی ہے؟"

"جی کچھ نہیں۔ پڑھنے لکھنے کے بارے میں پوچھا کرتی ہیں۔"

"دیکھو تم نوکری چھوڑنا نہیں چاہتے تو جی لگا کر پڑھو اور اچھے لڑکے بنو اور دیونگر والوں کو جو تمھیں چور سمجھتے ہیں دکھلا دو کہ تم کتنے اچھے لڑکے ہو۔"

نبی نے اقرار میں سر ہلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ میں نے بڑے جوش سے اسے اور درگا کو اس دن پڑھایا، اور جب دیوا جی سے مضمون لینے گیا تو ایک نئی شگفتگی میری رگ رگ میں دوڑ رہی تھی۔

دیوا جی نے مجھے مضمون دے دیا اور جب میں چلنے لگا تو انھوں نے کہا "بھئی وہ ہر موہن نے تمھارے لئے ملازم چھوکرے کا انتظام کر دیا ہے۔"

"جی ملازم چھوکرے کا؟"

"وہ نبی کو تم نے جواب دے دیا نا؟"

"جی نہیں ۔"

انہوں نے مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

جب میں بیٹھ گیا تو انہوں نے کہا "دیکھو بھائی، میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں یہ بات بری لگتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں خود اسے اچھا نہیں سمجھتا لیکن بڑی برائی کے مقابلے میں اس چھوٹی برائی کو چن لینا بہتر ہے۔"

میرے لئے اب خاموش رہنا مشکل ہو گیا۔ میں نے کہا "یہ چھوٹی برائی ہے یہ کیسے مان لیا جائے؟"

دیوا جی کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں مگر دوسرے ہی لمحے ایک چوڑی مسکراہٹ کا ہینگا[1] ان پر پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا "یہ بات بھائی اضافی ہے۔ تمہارے لئے یہ بڑی برائی ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کے مقابلے میں بڑی برائی تمہیں دکھائی نہیں دیتی مگر مجھے اپنے ساتھیوں کے غیظ و غضب اور عدم تعاون کی شکل میں وہ صاف نظر آتی ہے۔ دیو سینکوں کی اکثریت چاہتی ہے کہ اس لڑکے کو دیونگر میں نہ رہنے دیا جائے۔ اب اگر میں زور دیتا ہوں تو وہ سب کے سب سوچیں گے کہ میں ان کی ایک ذرا سی خواہش بھی پوری نہیں کرتا۔ وہ کہیں گے کچھ نہیں، مگر ان کا کام کرنے کا مجھ سے تعاون کرنے کا جوش سرد پڑ جائے گا اور ان کے تعاون کے بغیر میرے لئے دیونگر کا خواب محض خواب بن کر رہ جائے گا۔"

میں چڑ گیا بولا "دیونگر آپ کیوں بنانا چاہتے ہیں، کیا اینٹیں گارا اور چونا ہی دیونگر ہے؟ اس کی بنیاد اور تعمیر میں کیا کوئی اصول نہیں؟ اُن اصولوں کو قربان کر کے، اینٹ، گارے اور چونے کے چند مکان کھڑے کر لینا آپ بڑی کامیابی سمجھتے ہوں گے، میں اسے سخت ناکامی مانتا ہوں۔ یہ بڑی چیز کے لئے چھوٹی چیز کی قربانی نہیں، بلکہ ایک نہایت ہی چھوٹی چیز کے لئے ایک بہت ہی بڑی چیز کی قربانی ہے۔"

دیوا جی کی پیشانی پر چڑچڑاہٹ کی اتنی بڑی لکیریں نمایاں ہو گئیں کہ مسکراہٹ اور ضبط کا ہینگا بھی انہیں نہ ہٹا سکا۔ کسی طرح اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے اُنہوں نے کہا "میں تو بھائی، تمہارے لئے ہی کہتا ہوں۔ سب لوگوں کو ناراض کر کے، سب کی چھاتی پر مونگ دلتے ہوئے، سب کی مرضی کے خلاف اُس چور چھوکرے کو رکھ کر . . . . ."

"وہ چور نہیں!" میں نے دیوا جی کی بات کاٹتے ہوئے غصے اور جوش سے کہا "اور پھر یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ زیورات یا نقد روپے یہاں کوئی نہیں رکھتا اور جتنا لوگ یہاں رکھتے ہیں، آنا اگر کسی کا چلا جائے تو میں ادا کر دوں گا آپ میری تنخواہ سے کاٹ لیجیئے گا۔"

دیوا جی خاموش رہے بس میری طرف دیکھتے رہے۔

"نبی میرا رشتہ دار نہیں" میں نے اُسی جوش سے کہا "لیکن میں اُس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اسے نہیں نکالوں گا۔ اس کی ماں بہت بوڑھی ہے۔ نبی جو کماتا ہے اُسی سے اُن کا گذر ہوتا ہے۔ اسے نکال دوں گا تو دونوں بھوکوں مر جائیں گے۔"

---

[1] کھیت جوتنے کے بعد اُسے ہموار کرنے کے لئے بیل یا گھوڑے کی مدد سے جو تختہ اُس پر چلایا جاتا ہے اسے دیہات میں ہینگا کہتے ہیں۔

دیوا جی ہنسے "تم بہت بھولے ہو بھائی۔ تنہا نبی ہی یہاں بھوکا نہیں، قرب وجوار کے دیہات میں ایسے بیسیوں بچے اور ان کے والدین بھوک کا شکار ہو رہے ہیں۔ دیونگر کے ذریعے ہم اسی بھوک کی بیماری کا علاج کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ دیونگر بن گیا تو یہاں درجنوں صنعتیں شروع ہوں گی اور یہاں کی بھوک اور غریبی کا قلع قمع ہو جائے گا۔"

میں فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "بات محض بھوک کی نہیں ہے۔ آپ نے دیوانی میں بچوں کی نفسیات پر مسلسل مضامین لکھے ہیں کہ بچے کیوں چوری کرتے ہیں ملازم کیوں چوری کرتے ہیں اور کیونکر ان کی بُری عادتیں دور کی جا سکتی ہیں۔ میں آپ ہی کے مشوروں پر عمل کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں نبی چور نہیں۔ میں ایک کوشش اور کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

دیوا جی قدرے سکوت کے بعد گویا بے بسی کے ساتھ بولے "تمہاری مرضی۔ میں نے تمہارے ہی فائدے کے لئے کہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو ناراض کر کے تم سکون نہیں پا سکتے۔"

اور پیشانی پر گویا تفکر کی کئی شکنیں پیدا کر کے وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

واپس آ کر مضامین کا ترجمہ کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ ممکن ہے سمجھوتہ زندگی کی شرط ہو لیکن انسان کے پاس کچھ تو ایسا ہو، جہاں وہ کسی سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہ کرے۔ گھاس اپنی نرمی اور نزاکت کو طوفان کے نیچے بچھا دیتی ہے اس کے گذر جانے پر پھر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور زندہ رہتی ہے۔ لیکن برگد جھکتا نہیں خواہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تو کیا گھاس برگد سے افضل ہے؟ تھکے ہارے مسافروں کو جب کوئی سایہ دینا اور آرام پہنچانا چاہے گا یا اپنے کسی عزیز اصول پر قائم رہنا چاہے گا تو اسے برگد ہی بننا پڑے گا۔ بادِ طوفان کے مقابلے میں اسے اکڑ کر گر جانا پڑے۔ ورنہ مصلحتوں کے پاؤں اس کی صورت مسخ کر دیں گے۔ وہ زندہ رہے گا لیکن وہ زندگی موت کا دوسرا نام ہو گی۔

سمجھوتہ کرتے ہوئے دیوا جی اپنے آدرش کی بلندی سے جہاں آ پہنچے تھے، اُسے دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوئی۔ کہاں دیوانی کے وہ آدرش وہ انصاف پسند بچے کی کہانی، وہ اپنے حقوق کے لئے لڑ مرنے والے کلرک کا قصہ اور کہاں ہر اصول کو سہولت کے لئے ترک کر دینا۔ میں جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کھلی اور آزاد فضا میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ٹہلتا ٹہلتا میں مدھوار صاحب کی طرف گیا۔ وہ ابھی پرنٹنگ سکول ہی میں تھے۔ میں سکول کی طرف چل پڑا۔

برآمدے میں دانی ایک ونگ سے دوسرے ونگ کی طرف جاتی نظر آئی۔ جاتے جاتے لمحہ بھر کو رُک کر اس نے میری طرف گہری پیار بھری نگاہ سے دیکھا ــــ اُس کا سارا غصہ ہوا ہو چکا تھا۔ مجھے نہ صفائی دینے کی ضرورت پڑی نہ معافی مانگنے کی۔ شاید نبی کے معاملے میں میری ضد کی خبر اس تک پہنچ گئی تھی اور اسی نے میری کھوئی جگہ اُس کی آنکھوں میں پھر بنا دی تھی۔ اسی وقت جیسے اُس کی شلوار کا پائنچہ اس کے ٹخنے میں پھنس گیا۔ وہ اسے الگ کرنے کو جھکی وہیں سے جھکے جھکے مڑ کر اُس نے پیار بھری نگاہوں سے مجھے سرشار کر دیا اور پھر پائنچے کو ٹخنے سے الگ کرتی ہوئی وہ دوسری طرف مڑ گئی اور گویا اپنے اصول پر اٹل رہنے کے میرے عہد کو اور بھی استوار بناتی گئی۔

مدھوار صاحب کسی مہاتما بدھ کی طرح سیدھے اپنی کرسی پر بیٹھے ٹائلیں دیکھنے میں مشغول تھے۔ میرے قدموں کی چاپ سے ان کی

سمادھی ٹوٹی۔ کسی دوسری دنیا سے گویا وہ ـــــ مسکرائے اور آنکھوں کی ہلکی سی جنبش سے انھوں نے پوچھا کہ کہئے کیسے آئے اور انھوں کے اشارے ہی سے مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے نبی کا ذکر چھیڑا۔ ماتاجی، ہرموہن اور دیواجی کے احکامات کا ذکر کیا اور اپنی حالت اور جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اُن سے کہا "یہ ایک معمولی ملازم کو ہٹانے کا سوال نہیں ہے، یہ اپنے عہد اور اصول کی خلاف ورزی اور آدرش سے ہٹنے کا سوال ہے۔ میں نبی کو کیونکر علیحدہ کر سکتا ہوں۔"

"اگر آپ دیونگر میں رہنا چاہتے ہیں، تو اسے علیحدہ کرنا ہوگا۔" انہوں نے جیسے کسی مذہبی کتاب کا حکم سنایا۔

"جب میں معاوضہ دینے کو تیار ہوں، کسی کی چوری ہو جائے تو اس نقصان کی تلافی کی ذمہ داری لیتا ہوں تو پھر آپ لوگوں کو کیا شکایت ہے؟"

مدھوار صاحب کا تناؤ کچھ کم ہوا۔ بدن کو ذرا ڈھیلا چھوڑتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا "مجھے تو بھی کوئی شکایت نہیں، مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ بچہ نہ صرف چوری کی عادت چھوڑ سکتا ہے۔ بلکہ پریکٹیکل سکول کے بیشتر بچوں کے مقابلے میں اول اور ذہین ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمدردی اور پیار بھرے سلوک کی ضرورت ہے۔ جو یہاں ممکن نہیں۔ میں اسے کبھی پریکٹیکل سکول سے نکالنے نہ دیتا مگر جو لڑکا ماتاجی کی نظروں میں معتوب ہو اور وہ کسی امیر آدمی کا بچہ نہ ہو اس کو یہاں رکھنا اُس کی رُوح کو کچل دینے کے مترادف ہے اس لئے میں نے دونوں بچوں کو یہاں سے چلے جانے دیا۔"

اور مدھوار صاحب نے بتایا کہ کس طرح پریکٹیکل سکول کے کھانے اور دکھانے کے دانت الگ الگ ہیں۔ "دیواجی نے دیوبانی میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا ہے۔" مدھوار صاحب نے کہا "کہ سکول میں بچوں کو ہر طرح کی آزادی ہے، اُن کی شخصیت مکمل آزادی کے ماحول میں نشوونما پا رہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بچے گھروں کو جو خطوط لکھتے ہیں وہ کھول لئے جاتے ہیں اور جن خطوط میں سکول کی کوئی شکایت ہوتی ہے وہ کبھی نہیں بھیجے جاتے۔ جس لڑکے کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ وہ مطمئن نہیں ہے، اُس پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور کوشش کرکے اس سے سکول کے حق میں خط لکھوایا جاتا ہے۔"

"آپ کے ہوتے یہ سب ہوتا ہے۔"

"میں نہ رہوں تو نہ جانے اور کیا کیا ہو پرنسپل پورا خوشامدی ہے ایسے ویسے جتنے کام ہیں دیواجی سب اُسی سے کرتے ہیں۔"

"میرا تو دم گھٹ جائے مکر و فریب کے ایسے ماحول میں آپ کیسے رہتے ہیں؟"

"میں گاندھی آشرم میں رہ آیا ہوں۔ کیچڑ میں رہ کر بھی کمل بنے رہنا میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مہاتما گاندھی نے بڑے بڑے سنگدلوں سے دیوتاؤں جیسے کام کرائے۔ جب تک مجھے امید ہے کہ برائی کو بڑھنے سے روک رہا ہوں اس وقت تک ہوں جب دیکھوں گا میرے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، چل دوں گا۔"

اور انہوں نے بالکل دیواجی کی طرح قلم اُٹھایا اور اکڑ کر بیٹھ گئے۔

دیواجی نے سکریٹری بناکر اس شخص کی انا کو مطمئن کر دیا ہے اور یہ سمجھوتوں کے بنے اپنے آپ کو فریب دینے لگا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور نمسکار کر کے مدھوار صاحب کے پاس سے اُٹھ آیا۔

نندلال سے ملنے کو جی چاہتا تھا مگر نہیں گیا۔ نہ جانے طبیعت کیسی منغض ہو گئی کہ دیونگر والوں کی صورت تک سے چڑ ہونے لگی کسی سے بھی ملنے کو جی نہ چاہتا۔ دوپہر کو کھانا کھانے بھی نہیں گیا، نبی کے ہاتھ منگوا لیا۔ بھوک بھی کوئی ایسی خاص نہ تھی۔ دو چار لقمے کھا کر اٹھ گیا۔ کُلی کر کے ہاتھ منہ دھو رہا تھا کہ باہر دستک ہوئی۔ نبی نے دروازہ کھولا۔ گیانی جی تھے۔

"ارے آپ اس جلتی دوپہر میں کہاں؟" غسل خانے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے کہا۔

"آپ آج کھانے کے لئے نہیں آئے۔ نبی کو کھانا لاتے دیکھ کر سوچا کہ دشمنوں کی آنکھ نہ آ گئی ہو۔" اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ قدرے ہنسے۔

میں نے ان کی ہنسی میں ساتھ نہ دیا۔ "دشمنوں کی آنکھیں تو خراب نہیں ہیں مگر مزاج ضرور گرم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

میرے بازو کو شانے سے اکھاڑتے ہوئے گیانی جی نے پھر اپنا مخصوص گرہ دار قہقہہ لگایا۔ "آپ بھی خوب ہیں سنگیت بھائی"۔ اور وہ مجھے ساتھ ہی لے کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ "دشمنوں کا مزاج کیوں گرم ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے نبی کو دوسرے کمرے میں جا کر درگا کے ساتھ پڑھنے کو کہا۔ گیانی جی کو نبی کا قصہ اور دیوا جی کا حکم سنایا اور اپنی پوزیشن سمجھائی۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو بھائی۔" گیانی جی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مگر تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ دیوا جی ایسا چاہتے ہیں۔ دیوا جی تو فرشتہ ہیں۔ ان کا دل بے حد فراخ ہے۔ یہ تو ان کے ارد گرد کچھ چھوٹے دل کے لوگ ہیں۔ انھیں کی وجہ سے دیوا جی یہ سب کرنے کو مجبور ہیں۔" لمحہ بھر رک کر انہوں نے فرمایا۔ "میں تمہیں صلاح دوں گا کہ تم نبی کو ابھی نکال دو۔ میں اسے پھر نوکری دلا دوں گا۔ یہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔"

"اسے تو میں ہرگز جواب نہیں دے سکتا۔"

"میں تمہارے ہی فائدے کے لئے کہتا ہوں۔ جب ماتا جی اس کے خلاف ہیں تو اسے رکھنا دانشمندی نہیں۔ تم رکھوگے تو یہ تمہیں تنگ کریں گے۔ ہر موہن کہہ رہا تھا کہ 'دیو بانی' کے ہندی اردو ایڈیشن بہت خسارہ دے رہے ہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہے تو وہ انھیں بند کر دیں گے اور تمہیں دیونگر چھوڑنا پڑے گا۔"

"مجھے دیونگر خواہ چھوڑنا پڑے مگر میں نبی کو جواب نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"دیکھو بھائی ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہیئے جس سے مخالفین کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ جھک کر جھکاؤ محاورہ تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ کبھی کبھی فتح حاصل کرنے کے لئے جھک جانا چاہیئے۔"

"یہ دیوا جی کی فلاسفی ہے۔" میں نے کہا۔ "میری نہیں۔ میں نے ان کے عمل سے تحریک نہیں حاصل کی۔ عموماً ہر موقعہ پرست کا عمل ویسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے ان کے قول سے تحریک ملی ہے۔ جس نے میری سوئی ہوئی روح کو جگا دیا ہے۔ مجھے بڑی آنکھیں عطا کی ہیں اور ان آنکھوں کو بڑے بڑے خواب دیکھنا سکھایا ہے۔"

گیانی جی مایوس ہو گئے۔ لیکن گئے نہیں - بڑی دیر تک بیٹھے مجھے دنیاداری کی باتیں سمجھاتے رہے اور دیواجی کی صفائی دیتے رہے۔ میں نے کہا "میں یہ نہیں مانتا کہ دیواجی کی کوئی غلطی نہیں ہے - وہ ڈر رہے ہیں اور دوراندیش ہو سکتے ہیں شاید میں بھی مگر اپنے قول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جس عزم و استقلال کی ضرورت ہے، وہ ان میں نہیں ہے - وہ ایک ڈھل مل اور کمزور رہنما ہیں - میں بخوبی سمجھ گیا ہوں کہ وہ اب کیوں دیوسینک نہیں بناتے ہیں اگر دیوسینک ہوتا تو وہ ان ان سے ساتھ کام کو بند کر کے مجھے نکالنے کی کبھی نہ سوچ پاتے۔ تن اور من کی مکمل غلامی ان کے ساتھ کام کرنے کی پہلی شرط ہے - مجھے کسی کی رہنمائی میں تن اور من کو غلام بنا دینا نامنظور نہیں مگر شرط یہی ہے کہ میرا رہنما اپنے اصولوں اور آدرشوں سے گرتا تو نہیں ہے آدرش رہنما کی غلامی میرے بس کی نہیں - بینی کو نکالوں گا تو مجھے محسوس ہو گا کہ میں ایک ایسے رہنما کی غلامی کر رہا ہوں جس کا کوئی آدرش نہیں۔ ..... کہ اس غلامی میں مجھے روٹی ملتی ہے ..... کہ میں وہ غلامی صرف پیٹ کے لئے کر رہا ہوں۔ 'دیوبانی' کو پڑھنے کے بعد میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ دیواجی نے ہی کہا ہے کہ پیٹ تو کتے اور گدھے بھی بھرتے ہیں اور عیش و آرام تو طوائفوں کو بھی میسر ہوتے ہیں۔"

شام کے قریب گیانی جی گئے - ان کے جاتے ہی میں نے بنی کو بلایا - وہ گاجا چاہتا تھا۔ "دیکھو بھائی، یہ سارے لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ میں تمہیں نکال دوں۔" میں نے بڑے پیار سے اُسے سمجھایا۔ "مگر میں وعدہ کر چکا تھا اس لئے میں نے تمہیں نکالنا منظور نہیں کیا۔ میں تمہیں نہیں نکالوں گا، لیکن میں نے طے کر لیا ہے کہ میں خود نکل جاؤں گا۔ کل صبح میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم کل سے نہ آنا۔"

اور میں نے جیب سے پانچ روپے نکال کر اسے دیئے اور اسے بغل میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا "اپنی ماں سے میرا سلام کہنا اور ساری بات سمجھا دینا۔"

بنی کی آنکھیں بھر آئیں - تقریباً روتے ہوئے اس نے کہا "دار جی آپ مجھے ساتھ ہی لے چلیئے۔"

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتا رہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر کہیں مستقل طور پر رہنے لگا تو لکھوں گا چلے آنا۔"

اور میں نے اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے تسلی دی اور پیار کیا۔

بنی نے اپنا بستہ کتابیں اور کاپیاں سنبھالیں دوسرا چھوٹا موٹا سامان لیا اور میرے پیر چھو کر چل دیا -

"ٹھہرو دُنبہ تک میں بھی چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور کوٹھی میں تالا لگا کر میں بھی اُس کے ساتھ ہو لیا۔ چاہتا تھا کہ کسی کو میرے جانے کا علم نہ ہو۔ جب وہ اپنے غصہ میں مجھے نوٹس دینے کی سوچیں تو انہیں معلوم ہو کہ میں جا چکا ہوں۔ بنی سے کوئی فضول سوال نہ پوچھے اس لئے میں نے اس کے ساتھ جانا مناسب سمجھا۔

شام ابھی پوری طرح اُتری نہ تھی لیکن ہوا میں گرمی کم تھی۔ دیونگر چھوڑنے کے خیال سے وہ روشیں، وہ باڑیں، وہ بال، وہ ڈیوڑھی، وہ کوٹھیاں، وہ آم جامن اور برگد کے درخت، وہ بجلی کے مکانوں کی لکیر ـــ سب ایک دم نیا نیا معلوم ہوا۔ جی چاہا کہ دیونگر چھوڑنے سے پہلے ایک بار اچھی طرح گھوم کر دیکھ لوں اس کے ہر نقش کو دل کے پردے پہ اُتار لوں -

نبی کو میں نے کوٹھیوں کے آگے چھوڑ دیا۔ پرے میدان میں سکول کے بچے ہاکی کھیل رہے تھے۔ اور بھی پرے شاید وانی اپنی کسی سہیلی کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ چند لمحے وہیں کھڑا میں نبی کو چپ چاپ سر جھکائے جاتے دیکھتا رہا۔ میری نظر میدان سے پرے کسی سہیلی کے ساتھ ٹہلتی ہوئی وانی پر گئی اور دل کی گہرائی سے ایک لمبا سانس نکل گیا۔

دیونگر کے ویرانے میں آکر کسی چیز نے مجھے باندھ رکھا تھا — اس کے فطری حسن کے علاوہ — تو وہ تھی وانی کی محبت ورنہ میرا خواب کب کا ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اب دیونگر میں مزید قیام کرنے اور وانی کا پیار حاصل کرنے کے لئے جو قیمت ادا کرنی پڑتی وہ اس محبت ہی کو ختم کر دیتی۔ وانی کی اس محبت کا تقاضہ تھا کہ میں اپنے فیصلے پر اٹل رہوں اور فوراً دیونگر چھوڑ دوں۔

میں چپ چاپ سڑک پر ہو لیا۔ خیال آیا کہ جاؤں ذرا نہر کا ایک چکر لگا آؤں۔

سڑک کوٹھی نمبرا کے پاس نہر کی طرف مڑتی تھی۔ ادھر مڑنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر میدان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ معاً میں ٹھٹھک گیا۔ وانی نے نبی کو جاتے جاتے روک لیا تھا اور وہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ نبی کو میں نے اور کسی سے ملنے نہ دیا تھا اور کسی سے اس نے میرے جانے کی بات نہ بتائی تھی — مگر وانی سے وہ ضرور کہہ دے گا اور یہ سوچتے ہی میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں مڑا۔ نہر کی طرف جانے کی بجائے پتھر چٹی گیا۔ وہاں ایک یکہ طے کیا۔ یکہ والے کو ساتھ لاکر اپنی کوٹھی بتا دی اور تاکید کر دی کہ صبح ساڑھے پانچ بجے وہاں آجائے اُسے یہ بھی سمجھا دیا کہ کوٹھیوں کے آگے سے ہوکر ڈیوڑھی کی طرف سے آنے کی بجائے کوٹھیوں کے پیچھے سے آئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوٹھیوں کے آگے سوئے ہوئے دیوسینک یکے کی کھڑکھڑاہٹ سے اٹھ کھڑے ہوں؛ مجھے پھر دیوا جی کا سامنا کرنا پڑے اور ان سے تکلف بھری باتیں کہنی سننی پڑیں۔

یکے والے نے اطمینان دلایا کہ وہ پانچ ہی بجے آجائے گا۔

"بس میں منہ اندھیرے نکل جانا چاہتا ہوں۔" میں نے اسے ایک بار پھر تاکید کی۔

یکے والا چلا گیا اور میں اپنا سامان سمیٹنے میں منہمک ہو گیا۔

صبح جب یکہ گنبد کے پاس سے ہوکر ڈاک خانے کے قریب پہنچ گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب کسی دیوسینک سے ملنے کی امید نہ تھی۔ جب میں یکے پر سامان لاد رہا تھا گنبد کے پاس بچوں کا غول دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ میں ڈرا کہ صبح کے اس دھندلکے میں کہیں وانی بچوں کو سے کر ادھر ہی تو نہیں آرہی۔ مگر وہ دو دو کی قطار باندھ کر فیئٹ رائٹ کرتے ہوئے وہ پہٹے کی طرف چلے گئے۔ ادھر بنجر میں سے ایک پگڈنڈی نہر کو جاتی تھی۔ بچے شاید اُدھر ہی سے نہر کو جا رہے تھے شاید پورا چکر لگا کر کوٹھی نمبرا کے پاس آنکلیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور میری جان میں جان آئی۔

یکہ پتھر چٹی کی طرف بڑھا تو ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے نے دل کا سارا غم دور کر دیا۔ محسوس ہوا کہ مدتوں کے بعد جیل سے چھوٹ کر آزاد فضا میں آیا ہوں۔ سڑک کے دونوں طرف کٹے ہوئے کھیت تھے جن میں کھلیان بنے ہوئے تھے۔ کسان تڑکے ہی اپنے کام پر آکر جٹ گئے تھے۔ کہیں چھاجوں کی مدد سے بھوسا الگ کیا جا رہا تھا، کہیں بیلوں کے کھروں تلے دانے اپنا جامہ اتار رہے تھے۔

کہیں گوں گوں گٹ بن رہے تھے۔ مکر و ریا اور دغا و فریب سے آزاد سیدھی سادی زندگی رواں دواں تھی۔ میں نے سینہ پھلا کر لمبے لمبے سانس لئے اور صبح کی اس تازہ ہوا کو اپنے سینے میں بھر لیا۔

اپنے کمرے کی میز پر میں دیوا جی کی کتابوں اور مضامین کے ساتھ ایک خط بھی ان کے نام چھوڑ آیا تھا۔

"میں باقاعدہ استعفیٰ دیتا۔ میں نے لکھا تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ میں رخصت حاصل کر سکتا۔ اس سلسلے کی میری پہلی دو کوششیں ناکام رہی ہیں اور میں دیونگر ایکدم چھوڑ دینا چاہتا ہوں کیونکہ سکون پانا تو درکنار، مجھے اس قیام کے دوران اتنی اذیت ملی ہے کہ زندگی بھر میری یاد کو زخمی رکھے گی۔ اس لئے میں نے اب کے بار خطرہ مول نہیں لیا۔ آپ مجھے نہیں چاہتے آپ کے سینک بھی نہیں چاہتے۔ پھر اس تکلف سے آپ یا میں کیوں اذیت برداشت کریں۔ دیونگر میں میری موجودگی کا کانٹا آپ ہی کے نہیں میرے بھی چُبھا ہے۔ کیوں نہ اسے نکال کر چین پائیں۔ آپ کے مضامین جو ترجمہ ہو چکے ہیں یا نہیں ہو سکے سب میز پہ رکھے ہیں۔ جو کتابیں آپ سے لی تھیں وہ بھی میز پہ رکھی ہیں۔ رہی میری تنخواہ تو آپ کا جی چاہے رنجن سنگھ جی کے پتے پر بھیج دیجئے گا، نہ جی چاہے، تو نوٹس کے عوض کاٹ لیجئے گا۔

"نامناسب ہوگا اگر میں اپنا کچھ 'کھونے' کی شکایت کرتے ہوئے اس 'پانے' کے لئے اظہار تشکر نہ کروں جو 'دیوبانی' کی فائلیں اور آپ کے مضامین پڑھ کر مجھے ملا۔ میری خوابیدہ روح گویا برسوں کی نیند سے بیدار ہو اٹھی ہے، کیونکہ زندہ روح ہی زخمی بھی ہو سکتی ہے۔ مردہ روح کو تو کچھ کے بھی نہیں لگتے۔ پھر آپ نے اس روح کو آنکھیں عطا کیں، خواب عطا کئے۔ میں اس سب کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں۔

"کچھ جگہوں سے مجھے شفقت و محبت بھی ملی اور اسی نے کسی طرح دیونگر کا قیام قابل برداشت بھی بنائے رکھا۔ یہ ناشکرہ پن ہوگا اگر میں چلتے وقت اسے بھول جاؤں۔ اس محبت کی یاد اس زخمی روح کے لئے ہمیشہ مرہم کا کام دیتی رہے گی اس کی مجھے پوری امید ہے . . . . ."

پیار دینے والوں کا ذکر کرتے ہوئے ذہن میں سب سے پہلے نندلال اور ساوتری کا خیال آیا پھر وانی اور گیانی جی کا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اب جب میں دیونگر چھوڑ رہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ گیانی جی کے دل میں بھی میرے لئے کچھ نہ کچھ شفقت و محبت تھی۔ اگر دیونگر کے سلسلے میں میرے خواب ایکدم پریشان نہ ہو گئے ہوتے، تو میں ان کے اس قدر زور دینے پر ضرور رہ جاتا۔ چار گھنٹے تک وہ مجھے بیٹھے سمجھاتے رہے۔ ممکن ہے وہ صحیح کہتے ہوں۔ دیوا جی واقعی بڑے خواب دیکھنے والے ہوں۔ لیکن دیوا جی کی خواہش اور فراخدلی کے باوجود دیونگر کا کچھ بننے والا نہیں، اس کا مجھے یقین ہو گیا تھا۔ مجھے دیونگر اس ملک کی طرح معلوم ہوتا جس کا وزیر اعظم فراخ دل،

وسیع المنظر، دور اندیش و دُور بین ہو، مگر جس کے معاون موقعہ پرست، مصلحت پسند اور خوشامدی ہوں اور جس کے دفتروں میں رشوت اور کنبہ پروری کا دور دورہ ہو۔ اس وزیرِ اعظم کی خوبیوں دور اندیشیوں اور اعلیٰ حوصلوں کے باوجود اس ملک کا کیا بن سکتا ہے؟ اگر وہ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سارے نظام کو نہیں بدل سکتا تو اُسے یکے بعد دیگرے سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔ اس کے خواب اور آدرش دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور ملک تحت الثریٰ میں چلا جائے گا...... اس لئے ان تمام شفقتوں کے باوجود گیانی جی مجھے دیونگر میں نہ رکھ سکے تھے۔

نندلال اور ساوتری کا گھر اس صحرائے بے آب و گیاہ کا نخلستان تھا، مگر نخلستان کا وجود ہی تو انسان کو صحرا سے باندھے نہیں رہ سکتا۔

رہی دوانی — تو غالباً دیونگر میں اس کی موجودگی غیر شعوری طور پر بھی مجھے وہاں رہنے کے لئے مجبور کئے ہوئے تھی۔ اُن آنکھوں اور اُن میں تیرتے پیار کی یاد دیونگر کی شیریں ترین یادوں میں سے ہے اور اس پیار کو اس معصوم سی لڑکی کے دل میں برقرار رکھنے کی زبردست خواہش کے تحت ہی میں یوں اچانک وہاں سے بھاگ اٹھا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں نے دیونگر میں رہنے کی خاطر نبی کو جواب دینا منظور کر لیا ہے تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتی؟ — اس طرح بھاگنے کے لئے مجھے معاف کر دو دوانی! میں نے دل ہی دل میں کہا۔ 'تم نہیں جانتیں، تمہیں کھو دینے کا خیال کتنا روح فرسا ہے۔ لیکن تم نے جو آنکھیں مجھے عطا کی ہیں، دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی جو قوت بخشی ہے، یہ اس کا تقاضہ ہے کہ میں یوں بھاگ جاؤں۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، تمہاری وہ بڑی بڑی آنکھیں جنہوں نے میری روح کو بصیرت دی ہے، دیوبانی کے آدرشوں پہ چلنے کی تحریک دی ہے، تا زندگی میری راہ روشن رکھیں گی۔'

"ارے وہ سنگیت جی جا رہے ہیں!"

اچانک میں چونکا۔ یکہ پوگانواں کے پل پر سے گذر رہا تھا۔ لبالب بھری نہر کھیتیوں کو زندگی عطا کرنے واند جیتا جاگتا ہو (عجیب بات ہے کہ اس کا نام پانی تھا) اپنے کناروں میں لئے چلی جا رہی تھی۔ کنارے پر قطار باندھے نیک کھڑے تھے۔ شاید بھٹنے کی طرف سے مارچ کرتے ہوئے مجھ سے پہلے یہاں آ پہنچے تھے۔ تبھی نگاہیں اس چھوٹی سی بیمار بیمار لڑکی پر جم گئیں جس کا چہرہ ایک دم سفید تھا، بڑی بڑی پرنم آنکھیں پھیل گئی تھیں اور جس نے مجھے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لئے تھے۔ ایک لمبا سانس میرے دل کی گہرائیوں میں سے نکل گیا۔ لیکن میرے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر چلے گئے اور یکہ پل پار کر گیا۔

سامنے پوگانواں کے گھروں کے پیچھے سورج نکل آیا تھا۔ کرنوں کے تیر آسمان کے اندھیرے کو چھید رہے تھے اور صبح کا نور گویا تاریکی میں چاروں اطراف اپنی تابندگی بھر رہا تھا۔

خاکے

قدرت اللہ اور ممتاز مفتی

ممتاز مفتی

قدرت اللہ کی شخصیت کے متعلق ایک بات یقینی ہے۔ قدرت اللہ کی شخصیت ممتاز مفتی کا المیہ ہے۔

قدرت اللہ سے میں ۱۹۵۸ء میں متعارف ہوا۔ اس کی شخصیت کے صرف چند ایک پہلو تھے جو بہت ہی واضح تھے بالکل نمایاں۔ کوئی تضاد نہ تھا کوئی الجھاؤ نہ تھا۔ صندوق میں تابوت کیا ہوتا وہاں کوئی صندوق ہی نہ تھا۔ کوئی چیز مقفل نہ تھی۔ ہر چیز باہر پڑی تھی۔ چیزوں کے ڈھیر لگے تھے، جیسے اناج منڈی میں اناج کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ اس منڈی میں چار ایک ڈھیر تھے۔ انکساری۔ رواداری۔ سادگی اور ستھراپن۔ ذہانت تو تھی، لیکن اس میں شو مارنے والی چمک نہ تھی جیسے پیتل کی دیگچی پر التزاماً چکنی مٹی کا کوٹ کر رکھا ہو۔ ۱۹۶۰ء تک میں قدرت اللہ کی شخصیت کو کما حقہٗ سمجھتا تھا۔

۱۹۶۱ء میں مجھے شک پڑنے لگا کہ قدرت اللہ کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے۔ جس سے میں واقف نہیں۔ اس شک کے محرکات تھے تو خارجی۔ لیکن بہت مبہم تھے۔ ان مبہم محرکات نے بے نام محسوسات کو جنم دیا۔ یہ محسوسات جتنے بے نام تھے اتنے ہی شدید تھے۔ اتنے ہی پراثر!

۱۹۶۱ء میں آہستہ آہستہ مجھ پر یہ احساس طاری ہوتا گیا کہ میں قدرت اللہ کی شخصیت کے کچھ حصے سے واقف نہیں۔

۱۹۶۲ء میں دفعتہً پیخ شدت سے محسوس کیا کہ میں قدرت اللہ کی شخصیت کے صرف کچھ حصے سے واقف ہوں، ظاہری حصے سے اور اس کی شخصیت کا نیوکلس ایک ایسی سمت میں واقع ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔

اندازہ لگائیے نفسیات کا ایک طالب علم جو تجزیہ شخصیت کا زعم رکھتا ہو اس کے لیے یہ احساس کس قدر تکلیف دہ ہوگا کہ وہ سمجھنے سے نہ سمجھنے کی سمت بہے جا رہا ہے۔

ساری بات ہی عجیب تھی۔ تجزیہ شخصیت کے مسلمہ اصولوں سے ہٹ کر تھی۔ قدرت اللہ کی شخصیت میں دورخی نہ تھی۔ تفریق و تقسیم نہ تھی اس کی مخفی اور آشکار شخصیتوں میں تضاد نہ تھا۔ اس کی ظاہری شخصیت میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔

پھر قدرت اللہ کی شخصیت کا اسرار کیا تھا، جبکہ تجزیہ شخصیت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق اسرار کا کوئی جواز نہ تھا۔ مخفی شخصیت کے وجود کا جواز نہ تھا۔ پھر وہ مخفی شخصیت کیا تھی؟ کیوں تھی؟

عام طور سے ظاہری شخصیت مخفی شخصیت کو چھپانے کا سرپوش ہوتی ہے اور نفس غیر شاعر کے ذریعے اس کی جھلکیاں نشر ہوتی رہتی ہیں لیکن قدرت اللہ کے نفس شاعر اور غیر شاعر میں ایک ان جانا ان ہونا ربط تھا جیسے دونوں کو الگ الگ کرنے والی دیوار منہدم ہو چکی ہو اور اندھیرے اجالے مل کر سحر کا سماں پیدا ہو گیا ہو۔ ہاں ساری بات ہی عجیب تھی۔ ساری بات ہی انہونی تھی، جو ممتاز مفتی کے لیے ہونی بن گئی۔

بدقسمتی سے کچھ عرصہ کے لیے میں ایک ایسے ادارے سے منسلک رہا ہوں، جہاں ہمارا کام تجزیہ شخصیت کی تحقیق تھا۔ اس ادارے

میں تجزیۂ شخصیت کے محققین کے خیالات مفروضات اور تسلیم شدہ اصولوں کو جاننے کے علاوہ مجھے براہِ راست بیسیوں شخصیتوں کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا تھا۔

قدرت اللہ کی شخصیت کے اس اسرار نے میرے زعم کو پارہ پارہ کر دیا۔ آپ کے سینے میں رچے بسے زعم کو ٹھیس لگے تو شخصیت کی ناؤ میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت اللہ کی شخصیت کو سمجھتے سمجھتے میری اپنی شخصیت ڈوب گئی۔ اب میری حیثیت ایک BOSWELL کی سی ہے جو جانسن کو سمجھتا نہیں صرف اسے جانتا ہے۔ مانتا ہے اور مناتا ہے۔

وہ کون کون سے خارجی واقعات تھے جنہوں نے اس احساس کو جنم دیا کہ قدرت اللہ کی شخصیت کا نیوکلس ایک ایسی سمت میں وجود رکھتا ہے جس کا میں احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک طویل داستان ہے، جس کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں ممکن نہیں۔ یہ تفصیلات علی پور کے ایلی کی دوسری جلد ایلی اور الکھ نگری کا موضوع ہیں۔ علی پور کے ایلی کا عظیم EXPERIENCE شہزاد تھی۔ الکھ نگری کے ایلی کا عظیم تر EXPERIENCE قدرت اللہ ہے۔

قدرت اللہ کی شخصیت کے اسرار کے متعلق اس مضمون میں مَیں صرف تین دلائل پیش کروں گا۔

قدرت اللہ کی شخصیت کے متعلق سب سے پہلی بات جو مجھے کھٹکی یہ تھی کہ قدرت ایک جانا اور مانا ہوا ادیب تھا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں واضح تھیں۔ اس قدر شوخ اور واضح کہ اس کے تخلیق کردہ ادب پارے چاند کے سامنے چراغ کی حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود قدرت اللہ قطعی طور پر ادیب شخصیت کا حامل نہ تھا۔

تضاد اور شدت ادیب کی شخصیت کے دو پایہ ستون ہیں، تضاد ایسا جیسے بچے کا جیب جس میں چاک چنے روشنائی رنگین بنٹے خالی گوٹ اور ٹوٹی ہوئی پھرکیاں ایک ساتھ پڑی ہوتی ہیں۔ شدت ایسی جیسے چیونٹیوں کا گھروندا جو اوپر سے ساکن ہے، اندر حرکت کے چکر چلتے ہیں

ادیب کی شخصیت فقیر خانے کے مصداق ہے، ایسا فقیر خانہ جس میں معذور شہنشاہ بستے ہیں، جس میں طرح طرح کی گدڑیوں میں رنگ رنگ کے پیوند ہیں، اپنے دکھ کو بھلانے کے لیے اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے قسم قسم کے ہتھکنڈے عمل میں لائے جاتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ فقیر باہر لنگڑاتا ہے۔ گھر میں دو پاؤں پر چلتا ہے، ادیب باہر دو پاؤں پر چلتا ہے، گھر آ کر لنگڑاتا ہے۔

بنیادی طور پر ادیب کی شخصیت ایک مظلوم شخصیت ہے۔ شدت کا کوڑا چلتا ہے۔ مظلوم جبتی چیختا ہے، قاری جھوم جاتا ہے "پھر عطا ہو" کوڑے کے درد کو بھلانے کے لیے ہر کسی نے اپنا اپنا طریق کار ایجاد کر رکھا ہے۔ یوں ادیب کی شخصیت پر انفرادیت کی چھاپ لگ جاتی ہے۔

کوئی علاج بالمثل پر یقین رکھتے ہوئے ابوالاثر حفیظ کی طرح دکھ کی دکان سجا کر بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی ثناءاللہ کی طرح جٹا دھاری روپ دھار کر لوہے کے گولوں کا تماشا دکھاتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے "ہم ثناءاللہ نہیں ہم میراجی ہیں۔ ثناءاللہ کون تھا ہم اسے نہیں جانتے"۔

کوئی اس عورت کی طرح جس نے محلے والوں کو اپنی انگوٹھی دکھانے کے لیے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ کالی شلوار لہرا کر کہتا ہے "یار میری طرف دیکھو۔ میں پریس برانچ کے ناظم کو یہ شلوار نہ پہنا دوں تو میرا نام منٹو نہیں"۔

کوئی اشفاق احمد کی طرح تلقین شاہیاں ایجاد کر لیتا ہے۔

کوئی سادھو منش انشا کی طرح سندھ باد جہازی کا بھیس بدل کر قہقہے کی قبا اوڑھ لیتا ہے۔

قدرت اللہ میں نہ شدت تھی نہ تضاد۔ نہ اس میں چونٹوں کے گھروندے کے چکر چلتے تھے نہ مظلوم جبشی کراہتا تھا۔ اُس نے کوئی گدڑی نہیں پہن رکھی تھی۔ اس کی شخصیت ایسا گھرانہ نہ تھی جس میں ادیب بستا ہے۔ جیسے کوئی ملا دو پیادہ قصر شاہی میں آ ٹھہرا ہو اور تفریحاً ادیبوں سے دل لگی کرنے کے لیے ادب کی پھلجھڑیاں چلا رہا ہو۔ یا جیسے کوئی بیربل کسی قلندر کے آستانے میں آ رکا ہو۔ اگر وہ شخصیت ادیب کا گھر نہ تھی تو پھر کس کا گھرانا تھی۔ وہ شاہ کون تھا۔ وہ فقیر کون تھا۔ وہاں کون رہتا تھا جو تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود تخلیق کو اہمیت نہ دیتا تھا جو تصنیف سے ذاتی اہمیت اخذ کرنے سے سراسر منکر تھا۔

قدرت اللہ کی شخصیت سے متعلق دوسری بات جو چکرا دیتی ہے بشری شخصیت کے روزمرہ پہلو سے متعلق ہے۔

عام دستور ہے کہ شریف آدمی گھر میں چائے خانے میں ریستوران میں پارک میں اڈے پر یا پلیٹ فارم پر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی بہانے مل بیٹھتے ہیں۔ اور پھر کسی نہ کسی کا تذکرہ چھڑ جاتا ہے۔ شر پسندی کی وجہ سے نہیں غیبت کے خیال سے نہیں ویسے ہی وقت کاٹنے کے لیے۔ بات کرنے کے لیے مل بیٹھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لیے۔

اس اہل کار کی بات چھڑ جاتی ہے جو دام نہیں جام کی رشوت لیتا ہے۔

اس مغز بڈھے کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے شانوں پر سکول کی ٹیڈی مجزیرے کے بڈھے کی طرح سوار ہے۔

ایسی معصوم محفلوں سے کون واقف نہیں، کون ہے جو ایسی رنگین گفتگو میں دلچسپی نہیں لیتا۔ اوّل تو ایسی بیٹھکوں میں ہم آپ ہم سب کو کچھ نہ کچھ کہنا ہوتا ہے اگر کوئی بھلا مانس ٹھنڈے خون کا مریض ہو اور گفتگو میں حصہ نہ لے سکے تو کم از کم وہ غور سے بات کو سننے گا۔ مسکرائے گا اور پھر مزید غور سے سننے لگے گا۔ ایسی محفل میں میں نے کسی کو جمائی لیتے نہیں دیکھا۔ الا قدرت اللہ کے۔

ارے یہ قدرت اللہ کیا شے ہے۔ دانشور ہے رنگین مزاج بھی ہے۔ طبیعت بھی شریفانہ ہے پھر شریفانہ بیٹھک میں بزدلی کیوں۔ صرف جمائیاں ہی نہیں لیتا بلکہ اس قدر جسارت کہ موضوع بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

یار دوستوں کی محفلوں کی بات چھوڑیئے۔ گھر کی بات لیجیے۔ گھر ایک مقدس جگہ ہے۔ مقدس اور اہم بھی۔ گھر میں فرصت کے وقت میاں بیوی دونوں مل بیٹھتے ہیں پھر پڑوسیوں کی بات چل نکلتی ہے۔ اس جوان لڑکی کا تذکرہ چھڑ جاتا ہے۔ جس پر بڑی مُنہ زور جوانی آئی ہے۔ اس بڈھے پنشنر کا ذکر کیا جاتا ہے جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے توں توں نئے دولے سے چوبارے کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر مونچھ مروڑتا اور گلیڈ آئی چپکاتا رہتا ہے متصل رہنے والے جوڑے کی خست کی تفصیلات پر ہنسی کا دور چلتا ہے۔ رشتے داروں کی چھوٹی چھوٹی کمینگیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ میاں کے دوستوں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔

اس چھوٹی سی معصوم تفریح کی وجہ سے میاں بیوی ایک دوسرے سے قریب آ جاتے ہیں، دونوں میں رفاقت کا جذبہ بڑھتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کے بغیر وقت کٹ جاتا ہے۔ گھر میں ایک ربط پیدا ہوتا ہے۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات بڑے عظیم نتائج پیدا کرتی ہے۔ خانہ آبادی کی ضامن بن جاتی ہے۔ گھر میں خوشی پیدا کرتی ہے جینے کی آرزو بڑھاتی ہے۔ مجھے قدرت اللہ پہ ترس آتا ہے اس کا گھر کیسے چلتا ہوگا، وہاں دھول اڑتی ہوگی

قدرت اللہ کے گھر کے چند کوائف ملاحظہ ہوں۔

قدرت اللہ کی بیگم صاحبہ ڈاکٹر عفت شہاب ایم بی بی ایس ہیں لیکن گھر میں کوئی بیمار پڑ جائے تو جوشاندے کا پیکٹ منگوایا جاتا ہے۔ کہ منظر

یہ محترمہ ڈاکٹر صاحبہ کیمسٹوں کی دوکانوں پر استعمال تلاش کرتی ہیں۔ جب ہالینڈ میں مقیم تھیں تو پاکستان سے تر پھلا منگواتی تھیں۔ پانچ روپے کے ترپھلا پر تیس روپے محصول ڈاک کا خرچ آتا تھا۔

محترمہ ڈاکٹر صاحبہ یوں شوقیہ نقل اور نمازیں پڑھتی ہیں جیسے بچے میٹھی گولیاں چوستے ہیں یا دورِ جدید کے مریض وٹامن کھاتے ہیں۔

قدرت اللہ کا ایک بیٹا ہے جس کا نام ثاقب شہاب ہے۔ ماں باپ نے پیار سے بچے کا جو پیٹ نیم PET NAME رکھا ہے وہ ملاحظہ ہو۔ مولوی صاحب!

وہ بچے کو مولوی صاحب کہہ کر بلاتے ہیں اور اس بات پر پھولے نہیں سماتے۔ مولوی صاحب کے جی (K G) میں پڑھتے ہیں عمر کے لحاظ سے ان کی معلومات بہت وسیع ہیں اگر آپ مولوی صاحب کی بات سن کر پوچھیں میاں آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا تو وہ ایک شانِ استغنا سے جواب دیں گے۔ سائنس پڑھتا ہوں کوئی مذاق تھوڑا ہے۔

چند روز کی بات ہے قدرت اللہ درزی کی دکان پر پتلون کا ناپ دینے گئے۔ مولوی صاحب بھی ہمراہ تھے۔ جب قدرت پتلون کی موری کے متعلق ہدایت دے چکے تو مولوی صاحب بولے۔ ابو اگر آپ غرارے پہنیں گے تو میں آپ کو اپنے ساتھ باہر نہیں لے جایا کروں گا۔

بڑی بڑی باتوں کی عظمت سے مجھے انکار نہیں، اونچے اور عظیم مقاصد کردار کے اعلیٰ اوصاف ان سب باتوں کا میں احترام کرتا ہوں — بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی چھوٹی چھوٹی باتوں سے عبارت ہے اور شخصیت کے تمام تر حسن کا دارومدار پھولوں پر نہیں پتیوں پر ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے موہوم دکھ چھوٹے چھوٹے اللہ واسطے کے بغض چھوٹے چھوٹے لاگ چھوٹے چھوٹے لگاؤ چھوٹی چھوٹی بے وجہ دشمنیاں چھوٹی چھوٹی چڑیں ناراضگیاں، چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں خوش فہمیاں کج رویاں۔ یہ سب ایک عام شریف آدمی کے لیے چھوٹی چھوٹی لذتیں ہیں غریبانہ عشرتیں ہیں معصوم عیاشیاں ہیں یہ وہ کھونٹیاں ہیں جن پر دوستی کی گٹھڑیاں ٹانگی جاتی ہیں۔

نور دین سے میرے بڑے گہرے مراسم ہیں۔ ہماری دوستی کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو برکت علی سے بیر ہے اور ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر برکت علی کے عیب گنتے ہیں۔

یار محمد میرا بہت پرانا دوست ہے۔ میں نے اسے اس لیے دوست بنایا تھا کہ وہ بھی گھر والی کے ہاتھوں مظلوم تھا ہم تقریباً روز ملتے ہیں ادھر اُدھر کی بات چھڑ جاتی ہے جو گھوم گھام کر چلتے چلتے کسی نہ کسی طور پر گھر والی پر آ ختم ہوتی ہے اور پھر ہمارا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے کہ گھر والیاں بے وقوف ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کی بات کو چنداں اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ یہ ہماری ملاقات کا نقطۂ عروج ہوتا ہے جس کے بعد محفل برخاست ہو جاتی ہے اور ہم دونوں میں گھر جانے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔

باہمی تعلقات اور دوستی کا پنچھی کردار کے پھولوں پر نہیں بیٹھتا شخصیت کی ٹیڑھی میڑھی شاخوں پر بیٹھتا ہے۔

کردار کی عظمتیں دل میں لگاؤ اور محبت کے دیپ نہیں جلاتیں صرف جذبۂ تحسین پیدا کرتی ہیں، لیکن اس جذبے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا خوف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پھر انجانے میں پیچھے ہی پیچھے اجتناب کی اک رو چل پڑتی ہے۔

قدرت اللہ کے پاس آپ گھنٹوں بیٹھے رہیں وہ کسی برکت علی کی بات نہ چھیڑے گا گھر والی کی بیوقوفی کا ذکر نہ کرے گا۔ اس کی زندگی میں کوئی برکت علی نہیں جس کی نندا کر کے اسے سکون حاصل ہو جسے برا بھلا کہہ کر اسے راحت محسوس ہو جسے نیچا دکھانے کے زبانی منصوبے بنا کر وہ اپنی زندگی

میں تازگی پیدا کرے۔ قدرت اللہ کی زندگی میں کوئی ایسا شخص بھی نہیں جس کے گن گا کر اسے لذت محسوس ہو، اس کا کوئی دشمن نہیں۔

ویسے تو زندگی میں میرا بھی کوئی دشمن نہیں۔ یہ نعمت ہر کسی کا حصہ نہیں، غالباً آپ کا بھی کوئی دشمن نہیں لیکن ہم نے کئی ایک دشمن گھڑ رکھے ہیں۔ دشمن نہ ہو تو ذاتی اہمیت کیسے قائم ہو ــ ذاتی اہمیت چاہے ہو یا نہ ہو اس کا احساس تو ہونا ہی چاہیے۔ یہ خیالی دشمنیاں جو شریف لوگ پیدا کر رکھتے ہیں، دشمنیاں نہیں ہوتیں جینے کے سہارے ہوتی ہیں۔

یہ قدرت اللہ کیسا انسان ہے جو اتنی چھوٹی سی حقیقت کو نہیں سمجھا ویسے بہت بڑا دانش ور ہے۔ سوجھ بوجھ کا مالک ہے۔ لیکن زندگی کے اہم حقائق کو نظر انداز کیے بیٹھا ہے۔

قدرت اللہ سے کسی شخص کی بات کرو۔ جواب میں کہے گا آدمی ہے چاہے وہ سمگلر ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے اس نے قدرت کے خلاف WHISPERING CAMPAIGN چلا رکھی ہو۔

ایک روز ایک شاہ صاحب قدرت اللہ سے ملنے کیلئے تشریف لائے۔ قدرت اللہ شاہ صاحب سے ملنے کے بعد بہت مسرور تھا۔ کہنے لگا خوب آدمی ہے۔ میں نے پوچھا کون تھا۔ بولا ایک زبردست عامل ہے۔ شیطانی قوتیں زیر کر رکھی ہیں، لوگوں سے علانیہ پیسے بٹورتا ہے۔ بلیک میل بھی کرتا ہے مگر کام سب کا کر دیتا ہے ــ خوب آدمی ہے۔

ارے میں نے غور سے قدرت کی طرف دیکھا خوب آدمی۔ قدرت اللہ کے لیے ساری دنیا کے آدمی خوب آدمی ہیں۔

ایمان سے کہیے کیا آپ نے ایسی منطق سنی ہے کبھی، اول درجے کا شیطان ہے لوگوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ لہٰذا خوب آدمی ہے۔ یہ منطق انسان کی منطق تو نہیں ہاں اللہ تعالیٰ کی منطق ضرور ہے۔

اگر یہ منطق انسان کی ہوتی تو زندگی کا حسن ختم ہو جاتا۔ اگر یہ منطق اللہ تعالیٰ کی نہ ہوتی تو دنیا کا شیرازہ بکھر جاتا۔ تو کیا جناب قدرت اللہ صاحب اللہ تعالیٰ بننے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

قدرت کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس کی شخصیت پر روشنی نہ ڈال سکیں بلکہ الٹا ان میں ممتاز مفتی کا ذہن دھندلا گیا۔

اللہ واسطے کو چھوڑیئے قدرت اللہ کے دل میں کوئی جائز بغض نہیں کوئی لاگ نہیں اس کی طبیعت میں کوئی چڑ نہیں کج روی نہیں وہ کسی سے ناراض نہیں ہوتا اسے کبھی غصہ نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ منٹو نے کیا پتے کی بات کی تھی۔ میں کسی کی تعریف میں کچھ کہہ رہا تھا منٹو نے چلا کر کہا مفتی چھوڑ یار کس کی بات کر رہا ہے تو۔ اس سالے کو تو غصہ بھی نہیں آتا۔

مانا کہ غصہ حرام ہے۔ مانا کہ غصہ ایک ایسی چھری ہے جو انسان اپنے ہی سینے میں بھونکتا ہے، مانا کہ غصے کو سبھی قابلِ نفرین سمجھتے ہیں لیکن اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ غصے میں آ کر آپ انسانوں کی صف میں آ شامل ہوتے ہیں، اس سرکار میں پہنچ کر سبھی ایک ہو جاتے ہیں، نہ کوئی محمود رہتا ہے نہ ایاز۔ یہ قدرت کیسا ایاز ہے جو الگ صف بنائے کھڑا ہے جو ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائے بیٹھا ہے۔ حیرت ہے کہ اس کی یہ مسجد چلتی ہے۔ ہمارے علم دربار سے زیادہ چلتی ہے لوگ اس کے گن گاتے نہیں تھکتے۔ لوگوں کی بات چھوڑیئے ــ وہ قدرت سے دور ہیں اس لیے اسے جانتے نہیں۔ میں جو قدرت سے قریب ہوں میں جو اسے قطعی طور پر نہیں جانتا۔ میں بھی اس کے گن گانے پر مجبور ہوں۔

روزانہ بیسیوں لوگ قدرت سے ملنے آتے ہیں۔ جو ملنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، خوشی خوشی گھر لوٹ جاتے ہیں جیسے مل لینا بذاتِ خود تکمیلِ کار ہو۔ جنہیں مسلسل انتظار کے بعد مایوس لوٹنا پڑتا ہے وہ گھر پہنچنے سے پہلے اسے معاف کر چکے ہوتے ہیں۔ جن کے کام ہوجاتے ہیں وہ اس کے گن گاتے ہیں جن کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتے وہ یوں مطمئن جاتے ہیں جیسے ان کا مقصد کام نہیں محض ملاقات تھا۔

آپ قدرت اللہ کے گھر جائیں۔ آپ کو علم ہو کہ وہ گھر پر موجود ہے، اگر نوکر آ کر کہہ دے کہ صاحب گھر پر نہیں تو پتا نہیں کس انجانے اصول کے تحت آپ کا تمام تر غصہ نوکر پر مرکوز ہوجائے گا اور قدرت صاف بچ کر نکل جائے گا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ایک اعلیٰ افسر جو بہت قابل ہے کام کرنے میں انتھک ہے اور جس کے دل میں ملک کا درد ہے قدرت اللہ سے کہہ رہا تھا یار سمجھ میں نہیں آتا ہم بھی ملک کے لیے جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں لیکن جب نکتہ چینی کا موقع ہوتا ہے تو لوگوں کو ہمارا نام یاد آ جاتا ہے اور جب واہ واہ کی محفل جمتی ہے تو تمہارا تذکرہ چھڑ جاتا ہے۔

ہاں مجھے اس افسر سے اتفاق ہے۔ مجھے اس افسر سے ہمدردی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس نے کیا پتے کی بات کہہ دی۔ جس کے مفہوم کو ہم سب کو سمجھنا چاہیے لیکن ہم جانتے بوجھتے ہوئے نہ سمجھنے پر مصر ہیں۔

ظاہر ہے کہ قدرت ایک ایسا بچہ ہے جیسے سونے کا چمچہ عطا ہوا ہے جس کا نیک نامی پیچھا کرتی ہے، حتیٰ کہ اس کے دشمن بھی اس کی تعریف کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔

یہ سونے کا چمچہ اسے کس نے عطا کیا کیوں آپ اور میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں حالانکہ وہ ہماری صف میں شامل نہیں۔ وہ ہمارا دوست نہیں۔ وہ کسی کا دوست نہیں اس کی شخصیت میں وہ کھونٹیاں ہی نہیں جن پر دوستی کی گٹھڑی ٹانگی جا سکتی ہے اس میں وہ عوامی خصوصیتیں نہیں جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں۔

اوصاف ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لاتے کمزوریاں لاتی ہیں نیلے پیلیاں لاتی ہیں، محتاجیاں کم ظرفیاں، کجرویاں لاتی ہیں۔

اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ جو ہم میں سے نہ ہو اسے ہم کبھی معاف نہیں کرتے۔ پھر ہم سب آپ اور میں کیوں اسے معاف کیے بیٹھے ہیں۔

کیوں اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ شاید آپ اس کے جواز میں یہ کہیں اس لیے کہ قدرت اللہ ایک نیک آدمی ہے۔

یقین جانیے میں بھی نیک آدمیوں کی عزت کرتا ہوں۔ انہیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں، لیکن معلوم نہیں کیوں اگر وہ قریب آ جائیں تو گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے اٹھ کر چلا جاؤں دور بھاگ جاؤں۔

معلوم نہیں کیوں مجھے خالص نیک آدمی سے عجیب سی بو آتی ہے۔ کوئی نیک آدمی آ جائے تو میں محسوس کرتا ہوں جیسے اس کا بند بند چلا چلا کر کہہ رہا ہو ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔ بچ جاؤ، نیک آدمی آ رہا ہے۔ پتا نہیں نیکی کی یہ خصوصیت ازلی ہے یا رسمی۔ بہرصورت نیک آدمی سے بو آتی ہے بدبو نہیں خالی بو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خوشبو ہو لیکن وہ اتنی تیز ہوتی ہے اور اس قدر شدت سے آپ پہ حملہ کرتی ہے کہ خوشی کا عنصر ختم ہو جاتا ہے اور بو سے چاروں اور بھر جاتے ہیں۔

معلوم نہیں کیوں خالص نیک آدمی میں نیکی کے اتنے ڈھیر لگ جاتے ہیں کہ آدمی دب جاتا ہے۔

چاہے کوئی خصوصیت ہو جو آدمی کو دبانے چاہے وہ خصوصیت کتنی ہی مثبت کیوں نہ ہو وہ وصف کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اگر وہ آدمی کو دبالے تو عفریت کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ بے شک قدرت اللہ نیک آدمی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں سے بو نہیں آتی اس کے قریب جا کر گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ دور بھاگنا تو درکنار پاس بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ آخر کیوں؟ قدرت اس اصول سے کیوں مستثنیٰ ہے۔ قدرت سے بو کیوں نہیں آتی۔ نیکی کے ڈھیر تو لگے ہیں لیکن آدمی ان ڈھیروں تلے دبنے کے برعکس ڈھیر کے اوپر بیٹھا ہے جیسے وہ ڈھیر اس کا پایہ ستون ہو

قدرت اللہ ہماری صف میں نہیں کھڑا۔ وہ ہمارے مشاغل نہیں اپناتا۔ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں بیٹھا ہے۔ پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے وہ ہم میں سے ہو۔ ایسا کیوں ہے۔ آپ اسے برا سمجھنے کی کوشش کر دیکھیں مگر نہیں۔ اسے برا سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ قدرت کو برا سمجھنے کی کوشش بے سود ہے۔ خواہ مخواہ آپ احساس جرم کے پسینے سے بھیگ جائیں گے۔

قدرت اور میں دونوں خانۂ خدا کے قریب بیٹھے تھے، میں نے پوچھا نیک آدمیوں سے بو کیوں آتی ہے وہ عفریت کیوں بن جاتے ہیں۔ اس نے کہا یہاں کوئی نیک آدمی نہیں یہاں اللہ کے سوا کسی کا چراغ نہیں جلتا۔ یہاں سب انسان ہیں۔ خالی خولی انسان۔ یہ مقام گناہگاروں کی جنت ہے یہ کہہ کر وہ عبادت میں مصروف ہو گیا۔

پھر جو میری نگاہ اس پہ پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز مختلف تھا جیسے تاسف ندامت اور توبہ سے بند بند بھیگا ہوا ہو ارے یہ کیا ڈھونگ ہے۔ جو شخص عام انسانی کمزوریوں سے بھی محروم ہو وہ یوں بیٹھے جیسے مجھ سے بھی بڑا گناہگار ہو۔ اس پر مجھے غصہ آنے لگا۔ اب کیا گنہ گاری میں بھی یہ مجھ سے بازی لے جائے گا۔ میرا ایک ہی امتیاز ہے کیا وہ بھی خاک میں مل جائے گا۔ یہ مقام میری جنت ہے میری! اس کی نہیں۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میں بھی اسی طرح بیٹھوں جس طرح قدرت بیٹھا تھا یقین جانیے میں خالی گنہ گار ہی نہیں مجھے گنہ گار ہونے کا احساس بھی ہے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میں بھی عجز سے بھیگ جاؤں۔ خانۂ خدا کے حضور میرا بھی رواں رواں حاضر ہو جائے۔ میں بھی اس احساس سے بھر جاؤں کہ میں اپنے اللہ کے حضور میں حاضر ہوں — سب بیکار مسلسل کوشش کے باوجود میں قدرت کا سا گناہگارانہ انداز پیدا نہ کر سکا۔ حد ہو گئی وہاں نیک بن کر عزت کمواتا رہا اور یہاں گنہ گار بن بیٹھا۔ ابن الوقتی کی انتہا ہو گئی۔ مجھے طیش آگیا۔ میں نے اللہ کے حضور میں دہائی دی۔ یا باری تعالیٰ یہ شخص جو میرے دائیں ہاتھ بیٹھا ہے جھوٹا ہے۔ بے شک اس میں عجز ہے لیکن یہ گنہ گار نہیں۔ گنہ گار میں ہوں۔ میں!

پندرہ روز اس پاک سرزمین پہ بیشتر وقت ہم دونوں اکٹھے اللہ اور محمدؐ کے حضور میں بیٹھے رہے۔

پندرہ روز وہ شہاب نہیں تھا۔ اہل کار نہیں تھا۔ دانشور اور ادیب کیا ہوتا پڑھا لکھا ہی نہیں تھا۔ باپ نہیں تھا۔ شوہر نہیں تھا۔ صرف انسان تھا۔ ایسا انسان جو احساسِ گناہ سے بھیگا ہوا ہو جسے ابھی ابھی دانۂ گندم کھانے کے بعد بہشت سے زمین پر پھینک دیا گیا ہو اور اللہ اور رسول اللہؐ کے حضور آہ و زاری کرنے کے سوا اسے کوئی کام نہ ہو۔

ان پندرہ دنوں میں وہ مجھ سے بھی زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اسے انجائنا کے کئی ایک دورے پڑ چکے تھے۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑاتا تھا۔

اس کے باوجود روز رات کے ڈھائی تین بجے وہ مجھے جگا دیتا۔ چلو مسجد جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

مسجدِ نبوی کے دروازے رات کے نو بجے بند ہو جاتے ہیں اور صبح تین ساڑھے تین بجے کھلتے ہیں جب باب جبریل کھلتا تو قدرت لڑکھڑاتا ہوا دھکے کھاتا ہوا اندر داخل ہوتا۔ میں دھکے دیتا بھی تھا۔ وہ صرف کھاتا تھا۔ اس لڑکھڑاتے ہوئے نحیف و نزار بڈھے کو دیکھ کر میرے دل میں ترس پیدا ہو جاتا۔

سبز جالی کے قریب وہ ایک جگہ نفل پڑھتا، دوسری جگہ دعا پڑھتا اور پھر فاتحانہ انداز میں مجھ سے کہتا چلو اب مسجد میں چلیں یہیں کیوں نہ بیٹھیں میں نے پہلی مرتبہ کہا نہیں وہ بولا۔ دوسروں کو بھی موقع دینا چاہیے۔

ایک روز رات کے نو بجے سفارت خانہ پاکستان کا ایک اہل کار ہماری قیام گاہ پر آیا۔ کہنے لگا شاہ فیصل نے پاکستان کے معزز مہمانوں کے لیے مسجد نبوی کو رات کے دس بجے کھولنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ آپ اطمینان سے جہاں چاہیں نوافل پڑھ سکیں گے۔ تشریف لے چلیے۔ قدرت پر ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے معذرت کی کہنے لگا آپ کا بہت بہت شکریہ لیکن میری طبیعت اچھی نہیں۔

اس رات ۳ بجے اس کی طبیعت حسب معمول اچھی تھی اور وہ باب جبریل سے داخل ہوتے ہوئے دھکے کھا رہا تھا لڑکھڑا رہا تھا۔

ظاہر تھا کہ اسے گوارا نہ تھا کہ باب جبریل سے آستانہ مبارک میں کسی خصوصی حیثیت سے داخل ہو۔ آستانہ مبارک میں دھکے کھاتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے نحیف و نزار عام انسان کی حیثیت سے داخل ہونا۔ یہی اس کی معراج تھی۔

آپ ہی فیصلہ کیجیے کیا ان تفصیلات سے قدرت اللہ کی شخصیت کی گتھی سلجھتی ہے۔ انسانی کوتاہیوں کی طرف دیکھو تو وہ ہم سے الگ ہے۔ بلندیوں کی طرف دیکھو تو وہ انسان ہے۔

لیکن سرزمینِ حجاز کی یہ باتیں تو ایک الگ موضوع ہے جنہیں شائد میں کبھی ایک الگ مضمون میں پیش کر سکوں۔

قدرت اللہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں۔ اس کے باوجود ہم اسے متبرک سمجھتے ہیں۔

اس بات میں آپ یقیناً مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہر انسان کا جی چاہتا ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرے۔ دوسروں کو نصیحت کرنا ایک انسانی خواہش ہے ایک معصوم سی عشرت۔ ایسی لذت جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ جس کو نصیحت کی جائے اس کا کچھ نہیں بگڑتا چاہے وہ نصیحت پر قطعی طور پر عمل نہ کرے۔ چاہے گھر جا کر اس کا مضحکہ اڑائے۔ چاہے اس کان سُنے اس کان اڑا دے لیکن نصیحت کرنے والے کی چند ساعت کے لیے ایک حیثیت بن جاتی ہے۔

احساسِ برتری کی ایک رَو چلتی ہے۔ خون میں اک گرمی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں روشنی چمکتی ہے۔ چند ساعت کے لیے گزشتہ تلخیاں معدوم ہو جاتی ہیں۔ جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی سی عشرت کس قدر معصوم اور کتنی صحت بخش ہے۔ میرا جی چاہتا ہے ہر کسی کو نصیحت کروں۔ ہر آتے جاتے کو روک کر کہوں نہ بھائی اس طرح نہیں کیا کرتے۔

بچپن میں جب میرے بزرگ مجھے نصیحتیں کیا کرتے تھے تو مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ خود تو کرتے نہیں مجھے کرنے کے لیے کیوں کہتے ہیں۔ پھر مولوی کفایت احمد سے مل کر سارا پول کھل گیا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ مولوی صاحب میرے پڑوسی تھے جب وہ اپنی بیوی سے محلے والوں کی خامیوں پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے اُکتا جاتے تو میرے پاس آ بیٹھتے اور مجھے سمجھاتے کہ دوسروں کی غیبت کرنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔

اگر آپ چند ساعتوں کے لیے اُجلے کپڑے پہن کر میلے لوگوں کو صفائی کی تلقین کریں تو یہ ایک معصوم سی لذت ہے قدرت اللہ اس انسانی لذت سے سراسر منکر ہے۔ وہ کبھی آپ کو نصیحت نہیں کرے گا۔ اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے ظاہر ہو کر وہ دوسروں سے بہتر ہے۔

اس سے کبھی ایسا فعل سرزد نہیں ہوا جس سے ظاہر ہو کہ وہ دوسروں کی طرح میلا نہیں، وہ کبھی اجلے کپڑے پہن کر آپکے پاس نہیں بیٹھے گا۔

اس نے کبھی آپ کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ نامناسب ہے۔ آپ اس کے پاس بیٹھ کر شراب پئیں وہ آپ کو کبھی نہیں ٹوکے گا۔ بلکہ وہ آپ کے اس فعل کو چنداں اہمیت ہی نہ دے گا۔ جیسے آپ شراب نہیں بلکہ شربت پی رہے ہوں۔ آپ اس کی موجودگی میں کفر و الحاد کی باتیں چھیڑ دیں وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہے گا اور نماز کے وقت ہاتھ روم کا بہانہ کرکے خلوص اور خشوع سے سجدہ ادا کرنے کے بعد واپس آکر اسی توجہ سے آپ کی باتیں سننے لگے گا۔ اگر کفر و الحاد کی باتوں میں گستاخی کا عنصر ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ بڑی چابک دستی سے موضوع بدل دے گا اور آپ کو یہ احساس بھی نہ ہوگا کہ موضوع بدلا نہیں بلکہ بدل دیا گیا ہے۔

ہاں ایک مرتبہ قدرت اللہ نے مجھے نصیحت کی تھی اس کے کوائف بھی خاصے سبق آموز ہیں۔ اس نصیحت کو حاصل کرنے کے لیے مجھے گھنٹوں محنت کرنی پڑی، جیسے رس کی ایک بوند کی خاطر سوکھے ہوئے لیموں کو دبا دبا کر انگلیاں تھک جاتی ہیں۔

ہم دونوں مسجدِ نبویؐ میں بیٹھے تھے۔ مسجدِ نبوی میں وہ ہمارا آخری دن تھا۔

میں نے کہا اس مقدس زمین سے کچھ لے کر جانا چاہیے۔

اچھا؟ وہ بولا

ایسی چیز جو زندگی بھر ساتھ رہے۔

ہاں وہ بولا زندگی بھر ساتھ رہے۔

کیا حرج ہے۔

کیا حرج ہے اُس نے جواب دیا۔

کیا لے کر جاؤں؟

کیا لے کر جانا چاہتے ہیں آپ؟

کوئی ایسی چیز جسے میں نباہ سکوں۔

ہاں یہ تو ہے۔

صوم و صلوٰۃ نہیں لے جا سکتا۔

کیوں؟

مجھ سے نبھے گا نہیں۔

اچھا۔

مشکل ہے۔ بے قاعدہ آدمی کے لیے مشکل ہے۔

ہاں بے قاعدہ آدمی کے لیے مشکل ہے۔

کوئی کردار کی بات ہو۔

ہاں کردار کی بات ہو۔

کردار کی بات سب سے بڑی سُنت نہیں کیا؟

ہاں سب سے بڑی سُنت ہے۔

مثلاً کیا ہو میں نے پوچھا۔

کیا ہو۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا ہو سکتا ہے۔

مثلاً یہ کہ دل میں کسی کے بارے میں میل نہ آنے دوں گا۔

کچھ ایسا ہو۔

ہاں کچھ ایسا ہو وہ بولا۔

کوئی واضح بات ہو جس کے خدوخال واضح ہوں۔

ہوں وہ بولا۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔

وہ کیا۔

اگر آپ پسند کریں تو!

وہ کیا میں نے پوچھا۔

یہ کہ دوسروں سے خوش نہ رہا تو کم سے کم کسی سے ناخوش نہ رہوں گا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہی تو قدرت اللہ کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ ہر شخص سے خوش رہتا ہے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کسی سے ناخوش ہو۔

قدرت اللہ کی محبت کے کوائف انوکھے ہیں۔ ویسے تو بظاہر ہر شخص کی محبت کے کوائف انوکھے ہوتے ہیں۔ کوئی محبوبہ کو فرشتوں کی سی پاکیزگی بخش کر اپنے آپ پر حرام کر لیتا ہے اور بقیہ زندگی آہیں بھرنے اور غم کھانے کی لذت کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ کوئی محبوبہ کو بیوا کی حیثیت عطا کر کے روز دل پر تازہ چوٹ کھانے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ کوئی پھول کی خوشبو سے مستی اخذ کرتا ہے۔ کوئی پتیاں نوچنے کی لذت کو اپنا لیتا ہے کوئی کلی کلی رس چوستا ہے۔ لیکن یہ دلچسپ کوائف محبت سے نہیں جنس کی آمیزش سے پیدا ہوتے ہیں۔ محبت بذات خود پھیلے ہوئے ساکن سمندر کی طرح ہمہ گیر جذبہ ہے جب محبت میں جنس کا خمیر اٹھتا ہے تو طوفان چلتے ہیں چھینٹے اڑتے ہیں۔ جھاگ پیدا ہوتا ہے یوں محبت کے کوائف مرتب ہوتے ہیں۔

قدرت ایک ازلی محبوب ہے۔ یہ شمع پروانوں کو دعوت دینے کے لیے جلتی ہے۔ پروانے اکٹھے ہو جائیں تو اس کی تمام تر توجہ اس

بات پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ شعلے کی آگ کو جذب کر کے معدوم کر دے تاکہ صرف روشنی ہی روشنی باقی رہ جائے۔ ٹھنڈی روشنی۔ جو جلاتی نہیں بلکہ منور کر دیتی ہے۔ شعلے کی آگ کو نور میں بدلنے کے عمل میں قدرت اذیت کے جن مراحل سے گزرتا ہے انہیں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

قدرت ایک ایسا انوکھا تپسوی ہے جس کی اپنی خواہش ہے کہ کوئی راج نرتکی اس کے گیان دھیان کو توڑنے کے لیے اس کے گرد ہر لمے کا ناچ ناچے۔

ناچ ناچ کر ہار جائے ——— اور پھر دھیان توڑنے والی تپسوی کے چرنوں میں خود دھیان لگا بیٹھ جائے اور بالآخر تپسوی سے بے نیاز ہو جائے ———

اس لحاظ سے قدرت ایک انیہ چار ہے۔ جو ازلی خواہش سے بے نیاز ہونے کے لیے عورت کو استعمال میں لاتا ہے جو تن کی آگ کو نور میں بدلنے کے لیے نسائی شعلے کو قرب کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایک انوکھا فن کار ہے جو آگ کو آگ سے بجھاتا ہے جو ڈوبنے سے بچنے کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

میں نے ان آنکھوں سے اسے گیان دھیان میں سرشار بدھ بنے دیکھا ہے۔ میں نے راج نرتکیوں کو اس کے گرد ہر لمے کا ناچ ناچتے دیکھا ہے۔ ایسی راج نرتکیاں جن کے ایک آسن کا متحمل ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا۔ آگ کو نور میں بدلنے کی جانکاہ جدوجہد میں میں نے اسے ساحل کی تپتی ریت پر مگر کی طرح تڑپتے دیکھا ہے۔

بیشتر راج نرتکیاں ہار کر انا کے بندھن سے آزاد ہو گئیں اور فریضۂ حج ادا کر کے زندگی کے پُر سکون حجروں میں سما گئیں۔ ایسی بھی تھیں جو اپنی شکست کو برداشت نہ کر سکیں اور خواب آور گولیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئیں۔

میری آخری دلیل بظاہر بے حد بودی ہے۔ یہ دلیل دوسروں کے بیانات پر مبنی ہے۔ یہ بیانات عقل و ادراک سے عاری معلوم ہوتے ہیں لیکن میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ ان سرسری بے مقصد بیانات نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ اگرچہ اب بھی کبھی کبھار بیٹھے بٹھائے مجھے یہ بیانات مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے ہیں۔

یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے جب قدرت اللہ نے مجھ سے ملنا شروع کیا اور ہم تقریباً روز ملتے تھے۔ ان دنوں میں کراچی میں ناظم آباد میں مقیم تھا۔ دو روز کے لیے میرے ہاں ایک مہمان آ ٹھہرے۔ یہ صاحب شورکوٹ کے کسی بزرگ کے بڑے قائل تھے۔ بات بات پر ان کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔ انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں شورکوٹ کے بزرگ کو خط لکھوں اور دعا کے لیے درخواست کروں۔ جان چھڑانے کے لیے میں نے ایک مختصر سا روکھا سا خط لکھ دیا۔ چند روز کے بعد ان کا جواب موصول ہوا لکھا تھا آپ جن صاحب سے آج کل مل رہے ہیں۔ انہیں ہمارا سلام کہیے۔ یہ شخص مدینے کا خاص غلام ہے۔ یہ شخص دنیا بھی لوٹ کر لے گیا اور دین بھی۔

اس خط کو پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیا وہ قدرت اللہ کی بات کر رہے تھے۔ دین کا تو مجھے علم نہ تھا۔ لیکن جو دنیا قدرت اللہ نے لوٹی تھی اس سے میں خاصا واقف تھا۔

ان دنوں قدرت اللہ صدر کا سیکرٹری تھا، لیکن وہ اپنے دفتر میں یوں داخل ہوا کرتا تھا جیسے کوئی جونیئر کلرک چوری آیا ہو اور ڈرتا ہو کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اس کی افسری برائے نام معلوم پڑتی تھی اور وہ خود جیسے اپنی افسری پر معذرت خواہ تھا۔ جب پہلی

مرتبہ میں نے قدرت اللہ کو فون کرتے دیکھا تو مجھے لالہ رام لعل یاد آ گئے۔ لالہ رام لال ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب کبھی لالہ جی کو کسی افسر کا ٹیلی فون آتا تو لالہ جی لپک کر اپنی پگڑی اٹھاتے۔ اسے سر پہ رکھ کر ننگے پاؤں کھڑے ہو جاتے اور فون پہ کہتے جی مہاراج میں لالہ رام لال بول رہا ہوں مہاراج۔

اگرچہ بظاہر قدرت پوری طرح سے سوٹ بوٹ میں ملبوس تھا۔ لیکن انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے پاؤں ننگے ہیں۔ سر پہ بھاری پگڑی رکھی ہوئی ہے اور وہ باادب کھڑا کہہ رہا ہے جی مہاراج میں لالہ رام لال بول رہا ہوں۔

صاحب کے بلاوے پر میں نے قدرت اللہ کو کاپی پنسل اٹھا کر صدر کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ جیسے کسی کلرک کو عارضی طور پر پی اے کا کام مل گیا ہو۔

یہ حال تھا قدرت اللہ کی افسری کا حقیقت یہ ہے کہ اس کی شخصیت میں حکومت یا افسری کا کوئی عنصر نہیں۔ نفسیاتی تحقیق کے ادارے میں جہاں میں کام کیا کرتا تھا۔ امیدواروں کی تجزیاتی رپورٹ میں ایک خانہ ہوتا تھا جس میں لکھا تھا کیا امیدوار میں افسر بننے کی صلاحیت ہے۔ افسر بننے کی صلاحیت کے کوائف کیا تھے۔

(۱) احساس نہ ہو۔ (۲) شدت نہ ہو۔ (۳) پچھتانے کی عادت نہ ہو۔ (۴) طبیعت میں ادبی یا فنکارانہ رنگ نہ ہو۔ (۵) اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھے۔ (۶) فوری فیصلہ کر سکے چاہے غلط ہو۔ (۷) اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ جو میں کرتا ہوں وہی درست ہے (۸) حکومت کی بو ہو۔ (۹) رحم یا ترس کے جذبے سے پاک ہو۔ (۱۰) انصاف کے بجائے ایڈمنسٹریشن کی لگن ہو۔

اگر آئی سی ایس کے امتحان میں قدرت اللہ کی شخصیت کی رپورٹ مجھ سے لکھوائی جاتی تو میں لکھتا کہ امیدوار میں افسر بننے کی صلاحیت نہیں۔ رہا ذہانت کا مسئلہ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قدرت اللہ بےحد ذہین ہے۔ بیشک افسر میں ذہانت کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اتنی نہیں جتنی قدرت اللہ میں ہے۔ اس کے علاوہ افسر میں ذہانت اس قسم کی ہونی چاہیے جو پیچھے پیچھے چلتی ہے آگے آگے نہیں۔

قدرت اللہ اپنی ذہانت یوں چھپا چھپا کر رکھتا ہے جیسے وہ چوری کا مال ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ذہانت چھپانے کی چیز نہیں۔ وہ تو ایک زیور ہے۔ جسے دانشور ماتھے پر ٹیکے کی طرح لگاتے ہیں۔ اس کی نمائش کرتے ہیں اس سے شخصیت کا حسن انذ کرتے ہیں یہ قدرت اللہ کیا چیز ہے کہ ماتھے کا ٹیکا کوٹ کے اندر کی جیب میں چھپا کر رکھتا ہے۔

دنیا لوٹنے کی بھی ایک تفصیل سن لیجئے۔ سکندر مرزا کے دور میں صدر گھر میں رکشے کا داخلہ ممنوع تھا۔ لیکن قدرت اللہ روز رکشے میں دفتر آتا تھا۔ جب قدرت کا رکشا چیختا چلاتا دھول اڑاتا ہوا صدر گھر میں داخل ہوتا تو سب افسروں اور اہل کاروں کو علم ہو جاتا کہ قدرت دفتر آ گیا ہے۔ کہتے ہیں سکندر مرزا اس وقت قلم رکھ کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور پھر آپ ہی آپ مسکرایا کرتے اگرچہ سکندر مرزا میں مزاح کی بڑی صلاحیت تھی لیکن آخر تھے تو بادشاہ وقت۔ ایک روز جب قدرت کے رکشا نے بہت اودھم مچایا تو تالی بجا کر بولے کوئی ہے جو ہمیں اس رکشا سے نجات دلائے۔

سکندر مرزا کی یہ بات سارے صدر گھر میں افواہ کی طرح پھیل گئی۔ پھر مشوروں اور پیش کشوں کا ایک تانتا لگ گیا۔ کسی نے کہا صدر گھر میں موٹریں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ پڑے پڑے زنگ لگ جاتا ہے اگر ایک موٹر آپ کے ہاں بھجوا دیں کیا حرج

ہے۔ دوسرے نے کہا ہر روز صبح ایک کار ادھر جاتی ہے اگر آپ پسند کریں تو واپسی پر آپ کو دفتر سے آیا کرے۔ دھیرے دھیرے بات سیٹھوں تک پہنچی۔ چار ایک سیٹھوں نے قدرت کو کار تحفتاً دینے کی پیشکش کر دی۔ آخر بات کلرکوں تک پہنچی۔ کلرک لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ ہر بات پر رول اور ریگولیشن کا پردہ ڈالنے کی مہارت کو کام میں لاتے ہیں۔ ایک نے کہا حضور آپ پسند کریں تو جی۔ پی فنڈ سے کار کے پیسے قرضے کی عرضی گزار دوں۔ دوسرے نے ہوشمندی سے قدم اٹھایا۔ پہلے قدرت کی پے بل فائل کا مطالعہ کیا۔ بات واضح ہوگئی۔ سیکرٹری ہونے کے باوجود کاٹ کٹا کے بعد قدرت کی نقد تنخواہ دفتر کے سیکورٹی افسر سے کچھ کم نکلی۔ کلرک نے مناسب موقع پا کر کہا سر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کار اڈوانس آج ہی لے لیں اور قسط کی ادائیگی کچھ عرصہ بعد شروع ہو۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے ایک چھوٹی سی کار خریدلی جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے صدر گھر کی کسی کار نے بچہ دیا ہو۔ صدر گھر کے سنتری قدرت کی کار کو ایش ٹرے کار کہا کرتے تھے۔

کیا یہ تھا وہ شخص جس نے دنیا کو لوٹ لیا تھا۔ یقیناً شور کوٹ کے بزرگ بے تکی ہانک رہے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کیا پتا انہوں نے اپنے خط میں کسی اور شخص کے متعلق لکھا ہو۔ لیکن چند روز کے بعد بات واضح ہوگئی۔ شور کوٹ سے ایک اور خط موصول ہوا۔ لکھا تھا۔ ہم آپ کے لیے دعاگو ہیں۔ کیا آپ نے ہمارا سلام قدرت اللہ شہاب تک پہنچا دیا تھا۔

علم نجوم میں میری دلچسپی کو دیکھ کر قدرت نے مجھ سے کہا مفتی صاحب آپ محترمہ سے ملیں، وہ کون ہیں۔ میں نے پوچھا کہنے لگے وہ ایک نیک اور پاکیزہ خاتون ہیں، جنہیں مستقبل یوں دکھائی دیتا ہے جیسے یہ سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی قائد اعظم کی تصویر۔

اگلے روز ہم قافلے کی صورت میں محترمہ کے گھر پہنچے۔ احمد بشیر ابن انشا خلیق ابراہیم، خلیق قیصر اور میں۔ قدرت نے جو کچھ محترمہ کے متعلق کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ محترمہ نیک اور پاکیزہ خاتون تھیں اس کے علاوہ وہ صاحب نظر تھیں۔

کچھ دیر کے بعد وہ خاتون قدرت اللہ کے گھر آئیں۔ کہنے لگیں میرا ارادہ تھا کہ اعتکاف کروں۔ کل رات مجھے اشارہ کیا گیا ہے کہ کسی پاکیزہ مکان میں اعتکاف کرو اور ساتھ ہی آپ کا گھر دکھایا گیا ہے لہٰذا آپ اجازت دیں تو میں یہاں اعتکاف کر دوں۔

کیا ساری کراچی میں صرف قدرت اللہ کا گھر پاکیزہ تھا، کیا قدرت اللہ کے گھر کی اس قدر قدر و منزلت تھی اور قدرت اللہ کا گھر کیا تھا ایک میاں، ایک بیگم اور چاروں طرف پھیلی ہوئی متبرک اداسی۔

پھر قدرت اللہ راولپنڈی میں آ مقیم ہوئے۔ ایک روز قدرت اللہ کے نام ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط خوشاب کے ایک شب بیدار ایڈووکیٹ ملک صاحب کا تھا۔ لکھا تھا۔ میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کے ہاں کوئی بچہ نہیں لہٰذا ہر روز تہجد کی نماز پڑھ کر میں آپ کے لیے دعا مانگا کرتا تھا۔ کل رات چند ساعت کے لیے ایک بچہ میری گود میں ڈال دیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ قدرت اللہ کو خوشخبری دے دو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے ہاں بچہ ہوگا۔

ایک سال کے بعد قدرت اللہ کے گھر بچہ تولد ہوا۔ حالانکہ ڈاکٹری اصول کے مطابق خونی نامناسبت کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے کا امکان بعید از قیاس تھا۔

لندن کے اس ڈاکٹر کا بیان جس نے بچے کی ولادت کے لیے آپریشن کیا تھا:۔

میں مذہبی آدمی نہیں ہوں مشکل کے وقت مجھے خدا کی طرف رجوع کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا معجزہ میرے لیے ایک بے معنی لفظ ہے چونکہ میں حقائق کی دنیا میں رہنے کا عادی ہوں۔ دعا کے مفہوم سے میں آشنا نہیں۔

پتہ نہیں اس روز مجھے کیا ہوا۔ جب میں ڈاکٹر عفت شہاب کے بے جان بچے کو شیشے کے مرتبان میں ڈال کر مسلسل چار گھنٹے اس کے پاس بیٹھا رہا۔ انجانے میں میں نے انگلی پر انگلی رکھ کر صلیب کا نشان بنا لیا۔ میرے دل کی گہرائیوں سے ایک ان سنی انجانی آواز ابھری۔ یا خدا اس بچے کو زندگی دے۔

چار گھنٹے میں یونہی بیٹھا رہا۔ اس بچے کے پاس بیٹھا رہا جس میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ میری انگلیاں صلیب بنی رہیں۔ وہی انجانی آواز میرے دل کی گہرائیوں میں گونجتی رہی۔ پھر چار گھنٹے کے بعد جب پہلی مرتبہ بچے میں حرکت پیدا ہوئی تو پتہ نہیں کیوں میری آنکھیں شکرگزاری کے آنسوؤں سے پُرنم ہو گئیں۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا شب بیدار عابد قدرت اللہ میں کیوں دلچسپی لے رہے تھے۔ پاکیزہ خواتین کو اعتکاف کے لیے قدرت اللہ کا گھر کیوں دکھایا جا رہا تھا۔ دہریئے ڈاکٹر قدرت اللہ کے بچے کے لیے دعا کرنے پر مجبور تھے۔ قدرت اللہ کون ہے۔ میرے سامنے ایک سوال آ کھڑا ہوا۔ پھر بھائی جان نے اس سوال پر گویا مہر ثبت کر دی۔

بھائی جان میرے بھائی نہیں ایک بزرگ ہیں۔ ان میں چند ایک خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ بے حد خلیق ہیں۔ طبیعت میں بلا کا عجز ہے۔ کم گو ہیں، نکتہ چینی سے اجتناب کرتے ہیں، اور انھوں نے دوسروں کی بات میں بھی دخل نہیں دیا۔ انہی خصوصیات کی بنا پر ہم بھائی جان کی عزت کرتے ہیں۔ بھائی جان کے قدرت سے مراسم نہ تھے۔ معمولی سا تعارف۔ خالی علیک سلیک۔

ایک روز بھائی جان کی موجودگی میں اشفاق احمد آ گیا۔ آتے ہی اس نے قدرت کا تذکرہ چھیڑ دیا اور بے تکلفانہ پیار سے قدرت کو برا بھلا کہنے لگا۔ بھائی جان کا منہ سرخ ہو گیا وہ اٹھ بیٹھے اور غیر از معمول جلال میں کہنے لگے مفتی صاحب آپ انہیں سمجھا دیجئے۔ بے شک یہ ان کے بے تکلف دوست ہیں، لیکن ہمارے سامنے ان کے متعلق ایسی باتیں نہ کہا کریں، ہم برداشت نہیں کر سکتے، یہ کہہ کر بھائی جان چلے گئے۔

اشفاق حیران کھڑا کا کھڑا رہ گیا یہ بھائی جان کو کیا ہوا۔ بھائی جان نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ قدرت اللہ کون تھا جس کے بارے میں ایسی ویسی بات بھائی جان نہ سن سکتے تھے۔ میرے لیے قدرت اللہ کے اسرار پر مہر ثبت ہو گئی۔ قدرت اللہ کیا ہے قدرت اللہ کون ہے ساری فضا سرگوشیوں سے بھر گئی۔ پھر قدرت اللہ ہالینڈ میں سفیر بن کر چلے گئے۔

یورپ میں میرا ایک ہم کار دوست صغیر ہے۔ صغیر کو قاضی صاحب سے عقیدت ہے۔ قاضی صاحب ایم ای ایس میں ملازم ہیں۔ ان کا واحد شغل اللہ اللہ کرنا ہے۔ ان کی پاکیزگی اور بے غرض خدمت خلق کی وجہ سے ان کے گھر پر سائلوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ صغیر نے کہا مفتی آؤ تمہیں قاضی صاحب سے ملاؤں۔

قاضی صاحب کے کمرے میں جا بجا اللہ اور محمدؐ کے کتبے لٹک رہے تھے۔ فرش پر تسبیحوں کا ڈھیر لگا تھا درمیان میں ایک سادہ لوح دیہاتی بیٹھا تھا جس کے ماتھے پر نیکی اور عبادت کی محراب بنی ہوئی تھی۔

قاضی صاحب بڑے اخلاق سے ملے اور صغیر سے باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں میں بڑا عجز تھا۔ نہ جانے صغیر کو کیا سوجھی کہنے لگا، قاضی صاحب مفتی صاحب کا ایک دوست ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ دیکھئے تو وہ کب واپس آئے گا۔

آپ کے دوست کا کیا نام ہے قاضی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ قدرت اللہ۔ میں نے جواب دیا۔ جان بوجھ کر میں نے قدرت کے نام سے شہاب حذف کر دیا۔ قاضی صاحب نے آنکھیں بند کر لیں ان کی گردن لٹک گئی۔ کمرے پر خاموشی طاری ہو گئی۔ دفعتاً قاضی صاحب چونکے۔ جیسے انہیں دھچکا لگا ہو۔ بڑی عاجزی سے بولے یہ تم نے کیا کیا۔ بکری کو شیر کے سامنے ڈال دیا۔ حضور جی میں تو ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ بہت چھوٹا۔ چھوٹی چھوٹی خدمتیں کر سکتا ہوں۔ یہ آپ نے کیا کیا۔ مجھ عاجز کو شیر کے سامنے ڈال دیا۔

کیا شیر سے ان کا مطلب قدرت اللہ تھا۔ کیا قدرت شیر ہے۔ قدرت اللہ میری نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے لپک کر پگڑی اٹھائی اسے سر پر رکھا۔ پھر وہ ننگے پاؤں کھڑا ہو گیا اور فون کے چونگے میں منہ ڈال کر بولا نہیں نہیں مہاراج میں تو لالہ رام لال بول رہا ہوں۔ لالہ رام لال ——— مفتی جی۔ بھائی جان غصے میں بولے ان کے متعلق ہم ایسی بات برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ شخص دین اور دنیا دونوں لوٹ کر لے گیا۔

شور کوٹ کے بزرگ نے قہقہہ مارا۔ قدرت اللہ کون ہے کون ہے۔ فضا سرگوشیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں بھائی جان کی طرف بھاگا میں نے کہا۔ بھائی جان ایک بات بتا دیجیے۔ قدرت اللہ کون ہے۔ وہ مسکرائے پھر بولے مفتی جی وہ آپ کے دوست ہیں۔ انہیں سے کیوں نہیں پوچھتے آپ!

پھر میں نے بڑی محنت سے خوشاب کے اس شب بیدار عابد ایڈووکیٹ ملک صاحب کا پتا لگایا جس نے قدرت کو فرزند کی ولادت کی خبر دی تھی۔ لاہور میں ملک صاحب ایک ویران سی کوٹھی میں مقیم تھے۔ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے۔ پیشتر اس کے کہ میں ان سے کچھ پوچھتا انہوں نے خود ہی قدرت کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگے سمجھ میں نہیں آتا ایک سال سے مدینہ منورہ سے شہاب صاحب کی ہالینڈ سے واپسی کی منظوری آ چکی ہے۔ پھر وہ کیوں ہالینڈ سے واپس آنے میں لیت و لعل کر رہے ہیں۔ مدینہ شریف سے منظوری آ چکی ہے۔ میں نے دہرایا ملک صاحب ایک بات بتا دیجیے قدرت اللہ کون ہے میں نے پوچھا۔

ملک صاحب مسکرانے لگے بولے ہمیں پوری طرح علم نہیں، چلیے آپ کو ایک بزرگ کے پاس لیے چلتے ہیں۔ یہ بزرگ قدرت اللہ شہاب میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ جب بھی شہاب صاحب کے متعلق کسی کمیٹی یا کانفرنس میں کوئی مسئلہ زیر غور ہو تو یہ بزرگ لازماً وہاں پہنچ جاتے ہیں اور شہاب صاحب کے حق میں فیصلہ ہونے کے لیے پوری جدوجہد کرتے ہیں۔

میو ہسپتال کے سامنے ملک صاحب ایک گلی میں مڑ گئے۔ گھوم پھر کر سامنے ایک مسجد میں جا داخل ہوئے۔ مسجد سے ملحقہ مزار پر کھڑے ہو کر مجھ سے کہنے لگے فاتحہ پڑھ لیجیے۔

فاتحہ پڑھ کر ہم باہر نکلے۔ یہ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ ہیں۔ ملک صاحب نے کہا جب داتا صاحب لاہور میں داخل ہوئے تھے تو ان کا جنازہ جا رہا تھا جب بھی لاہور آئیں یہاں حاضری دیا کیجیے۔

ارے تو یہ تھے وہ بزرگ۔ میں حیران رہ گیا ——— لیکن یہ سب باتیں بیکار ہیں۔ سب دلائل بودے ہیں۔ میں خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں ——— اب مجھے علم ہوا ہے کہ بات کہنا اور چیز ہے بات کا پہنچنا اور چیز ہے۔ ضروری نہیں کہ کہنے سے بات کھل بھی جائے۔ ہم صرف بات کہہ سکتے ہیں بات کھولنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ گزشتہ سات سال سے میں نے چیخ چیخ کر بات کہی ہے اپنے دوستوں سے کہی ہے قاری سے کہی ہے۔ قدرت کے عزیزوں سے کہی ہے۔ سب میری بات کو سن کر مسکرا دیتے ہیں۔ اب میں نے جانا ہے کہ بات کہنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک پہنچانے والے کو بات کھولنا منظور نہیں۔

حکیم صاحب

محمد طفیل

میں بیک وقت دو شخصیتوں سے متصادم ہونے والا ہوں۔ ایک حکیم یوسف حسن سے، دوسرے نیرنگ خیال سے، دلکشی دونوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں۔ نیرنگ خیال بھی شخصیت ٹھہری؟ میں عرض کروں گا۔ کیوں نہیں؟ جس نے ذہنوں کو نکھارا ہو، شخصیتوں کو جلا بخشی ہو۔ وہ شخصیت ہی نہیں۔ اُس سے بھی بڑی کوئی بلا ہے۔

یہ خدا کی دین ہے۔ کسے معلوم تھا کہ ریلوے کا گڈز کلرک یوسف حسن، کبھی نیرنگ خیال ایسے عظیم رسالے کا خالق ہوگا۔ جو ایک کارِ بلند انجام دے گا اور صاحب روایت شخصیت بنے گا۔ ورنہ ادبی پرچوں کی کہانی تو صرف اتنی ہوتی ہے۔ نکلے، چمکے، غائب!

مضمون شروع کرنے سے پہلے اگر میں یہاں یہ اقرار کر لوں تو مناسب ہوگا کہ ان میں سے، ایک شخصیت کی تصویر کشی میں میں آپ سے کوئی رعایت نہیں چاہتا۔ مگر دوسری "شخصیت" کے سلسلے میں، کچھ چھوٹ کا بھی ملتجی ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ حق کی ترازو میں، مجھے مضمون نویسی سے زیادہ نیرنگ خیال کا دھیان رہنا چاہئے۔ اگر یہ نہیں تو میرا رشتہ گفتگو بیکار!

میں لاہور کا رہنے والا، حکیم صاحب بھی لاہور کے باسی، مگر ہماری ملاقات ہوئی لکھنؤ میں شوکت تھانوی کے ہاں، غالباً ۱۹۴۵ء میں معاملہ علیک سلیک تک ہی رہا۔ اُس وقت حکیم صاحب بہت کچھ تھے۔ اس لئے منہ کیوں لگاتے۔ میں کچھ نہ ہونے پر بھی اُبک ہو کر کیوں ملتا!

حکیم صاحب کی شخصیت میں بڑی موہنی ہے۔ اس کے ساتھ ہنگامہ خیزی بھی، کچھ ایسی ہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے حکیم صاحب کی خدمت میں گزارش کی۔ اپنی سوانح لکھ ڈالیے۔ میری سوچ پر علامہ اقبال کا یہ شعر سوار تھا ؎

تُو اپنی سرگزشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

مگر جواب ملا تو یہ، "میری سوانح میں کیا رکھا ہے؟"

"آپ کی سوانح میں کیا نہیں رکھا۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے۔ ویسا کچھ تو ادبی میدان میں کسی کی بھی گرہ میں نہیں۔"

"اس بڑھاپے میں مجھے غلط رستے پر نہ ڈالو یار!"

لہ سن ولادت ۳ جون ۱۸۹۴ء

میں نے محسوس کیا کہ حکیم صاحب اس فرض سے سبکدوش نہ ہوں گے۔ کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے، کچھ اپنی انکساری کی وجہ سے، یہی وجہ تھی کہ میں نے اُن کی باتیں چرانی شروع کر دیں۔ یہ سوچ کر کہ اگر اس چمن کو میں نے بھی سپردِ صفحات قید نہ کیا تو پھر بات رہ جانے کی عالم میں مبتلا ہوں۔ انجام خدا معلوم، دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں چار کرتا ہوں۔

حکیم صاحب کو اپنی تعلیم کے ادھورے رہ جانے کا بڑا افسوس ہے۔ کہتے ہیں کہ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بے حد ذہین تھا۔ بے حد ذہین، یہی وجہ تھی کہ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو درخواست دی کہ میں ساتویں اور آٹھویں جماعت کا امتحان اکٹھا دوں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اور میرے استاد کے درمیان میرے متعلق کچھ باتیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ نکلا درخواست منظور ہوگئی۔ یہی ذہین میرے لئے تعلیمی تباہی بنی۔ میں نے اپنا وطیرہ یہ بنا لیا تھا کہ استاد کو، اسکول سے یہ کہہ کر چلا جاتا تھا کہ آٹھویں جماعت کی تیاری کرنی ہے۔ لہٰذا ساتویں جماعت میں بیٹھ کر کیا کروں؟ اسکول سے نکلتا۔ سیدھا پنجاب پبلک لائبریری پہنچ جاتا۔ وہاں جاکر پڑھتا کیا؟ طلسم ہوشربا! نو مہینے تک طلسم ہوشربا پڑھتا رہا۔ صبح جاتا تھا۔ لائبریری بند ہونے تک پڑھتا رہتا تھا۔

اس کتاب نے مجھے ایسا پڑا اثر کہ بیان نہ سکا۔ اُس ماحول میں پڑھائی خاک ہوتی۔ شام ہوتی تھی تو صبح کا انتظار۔ نتیجہ! آنکھیں دھنس گئیں۔ چہرہ زرد ہوگیا۔ صورت وحشت زدہ، مگر شوق تھا کہ فزوں سے فزوں تر! پھر یہ ایسی لگی تھی کہ کتاب کے ہر ہر واقعے سے متاثر ہوتا تھا۔ مثلاً نور افشاں جادوگر کو مسلمانوں کا خیر خواہ بتایا ہوا تھا۔ وہ ایک جگہ مر جاتا ہے۔ میرا یہ پڑھنا تھا کہ بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ آنا۔ رویا، اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ جیسے میرا کوئی بھائی بند مر گیا ہو۔

ان حالات میں جب آٹھویں جماعت کا امتحان قریب آگیا تو مجبوراً پڑھائی پر توجہ دی۔ کورس کی کتابیں کچھ کہتی تھیں۔ طلسم ہوشربا کے کردار کچھ، غرض ذہن خوب اُتھل پتھل ہوا۔ کہنے کو تو میں پاس ہو گیا مگر جو میرے ذہن کی چمک تھی۔ وہ ماند پڑ گئی۔ نویں جماعت میں میں نے یہ محسوس کیا کہ باقی لڑکوں سے کمزور ہوں۔ یہ چسکا ایسی تھی کہ پھر کورس کی کتابوں میں دل نہ لگا۔ نویں جماعت بہ مشکل پاس کی۔ دسویں جماعت پاس کرنے کی بجائے، میں نے مناسب یہ سمجھا کہ طلسم ہوشربا پر ہی "پی۔ ایچ۔ ڈی" کر دوں۔ یوں کورس کی کتابیں ہاتھ سے چھوٹ ہی گئیں۔

حکیم صاحب یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے کہا "اس کتاب نے آپ کو بڑا نقصان پہنچایا"

"میں تو پھر کبھی بچ گیا۔ اس کتاب نے ہزارہا آدمیوں کو اندھا کر دیا اور ہزاروں ہی کی زندگی تباہ کر ڈالی۔"

حکیم صاحب کے پڑھنے کا حال سُن لیا۔ اب لکھنے کا بھی سُن لیجیے :۔

یہ بھی ایک عجیب اور دلچسپ قصہ ہے۔ جس نے میری ادبی زندگی کی طرف باگیں موڑ دیں۔ میں "انتخاب لاجواب" پڑھا کرتا تھا۔ مجھے اس کے ایڈیٹوریل پسند تھے۔ اس لئے میں نے ایک افسانہ نما مضمون "پُراسرار عمارت" لکھ کر مدیر "انتخاب لاجواب" کو بھیجا۔ جس وقت میں نے وہ مضمون بھیجا تھا۔ اس وقت میری عمر چودہ برس تھی۔

مجھے امید نہ تھی کہ میرا مضمون چھپے گا۔ نہ صرف مضمون چھپا بلکہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر انتخاب لاجواب کی طرف سے ایک خط

بھی ملا۔ رقم تھا " مجھے آ کر ملئے "۔

پوچھتا کودتا دفتر پہنچا۔ چٹ بھجوائی۔ فوراً بلا لیا گیا۔ مگر وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھا " یہ مضمون جو ہمارے رسالے میں چھپا ہے۔ آپ کا لکھا ہوا ہے ؟"

" جی ہاں "

" کیا کرتے ہیں ؟"

" آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں "

" اچھا تو آپ ابھی اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ مجھے تو اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت تھی "

میں نے دیکھا کہ ان کی میز پر ایک پیپر ویٹ پڑا ہے۔ جس پر لکھا ہے TIME IS MONEY اس لئے میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ " مجھے اجازت دیجئے "۔

اس پر منشی محبوب عالم مسکرائے، کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ میں بڑا خوش ہوا کہ اتنے سے بچے کی اتنی حوصلہ افزائی ! جگہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی۔ میری تحریر کا یہ مقام و مرتبہ، کج طبع تھا۔ کج ذہن تھا۔ جبھی زمین پر پاؤں نہ ٹکے۔"

ان دنوں انتخاب لاجواب کا بڑا مقام تھا۔ اس ادارہ سے " انتخاب لاجواب " کے علاوہ بھی پرچے نکلتے تھے۔ جو بڑے پائے کے تھے، جن میں روزانہ 'پیسہ اخبار'، ہفت روزہ 'پیسہ اخبار' اور ماہنامہ 'شریف بیوی' !

انہی دنوں پیسہ اخبار کے علاوہ دو اور اخبار بھی نکلتے تھے۔ جن میں 'وطن' اور 'اخبار عام' زیادہ مشہور تھے۔ 'وطن' اور 'پیسہ اخبار' کی خوب چپقلشیں چلا کرتی تھیں۔ ایک دوسرے کے خلاف خوب لکھا جاتا تھا۔ صبح اخبار میں جوتیوں میں دال بٹتی نظر آتی مگر شام کو منشی محبوب عالم اور انشا اللہ خاں ایک ہی لینڈو میں بیٹھے، سیر کو جاتے ہوئے نظر آتے۔ عجیب لوگ تھے۔ عجیب کردار تھا ان کا !

'اخبار عام' کچھ اس انداز سے نکلتا تھا کہ اخبار میں " اخبار کی بہار " کے عنوان سے ایک سطر میں پورے اخبار کی چوڑائی کے برابر ایک خبر ہوتی تھی۔ جس میں یہ لکھا ہوتا کہ فلاں جگہ اور فلاں فلاں آدمیوں کے درمیان لڑائی ہوئی اور ان میں سے فلاں شخص مارا گیا۔ پھر اسی سطر میں آخر میں ایڈیٹر کی طرف سے یوں تبصرہ ہوتا! ــ " خدا کی مرضی " !

یا یہ خبر ہوتی۔ فلاں عورت کے فلاں مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ موقع پا کر دونوں بھاگ گئے۔ ایڈیٹر کی طرف سے تبصرہ! ــ بدمعاشی کی انتہا !

یا یہ خبر کہ فلاں دفتر میں، فلاں مجسٹریٹ نے اس وقت چھاپا مارا۔ جب کہ کلرک رشوت لے رہا تھا۔ تبصرہ! ــ پیٹ کی مار.

دیکھی آپ نے یہ کہ منکور آج بھی کوئی اخبار عام کے فائل کھنگالے تو اسے خبروں کے ساتھ ایڈیٹر کی طرف سے بڑے دلچسپ تبصرے ملیں گے۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ منشی محبوب عالم ایسا باہوش ادیب تھے۔ جب حکیم صاحب کو اپنے رسالے کی ایڈیٹری کے

لئے موزوں پاتا ہو تو پھر یہ کیوں نہ دینا پرچہ نکالتے۔ اسی دھن میں یہ شفاالملک حکیم فقیر محمد چشتی کے پاس جارہے تھے کہ راستے میں انھیں عبدالمجید سالک مل گئے۔ انہوں نے پوچھا "حکیم صاحب کدھر؟"

"شفاالملک کی خدمت میں حاضری کا ارادہ ہے۔"

"خیریت؟"

"ایک ادبی رسالہ نکالنے کا خیال ہے۔ مشورے کے لئے جارہا ہوں۔"

"اُن سے مشورہ بعد میں لینا۔ پہلے میرا مشورہ سنو اور وہ یہ کہ ادبی رسالہ نہ نکالنا۔ مارے جاؤ گے۔ ادبی پرچے نہیں چلتے۔ میں نے "فانوس خیال" میں ہزاروں کا نقصان اٹھایا۔ فلاں نے فلاں پرچہ نکالا تباہ ہوگیا۔ فلاں نے فلاں پرچہ نکالا۔ پاگل ہوگیا۔ لہذا حکیم صاحب! آلو چھولے بیچ لیجئے گا۔ پرچہ نہ نکالئے گا۔"

"اب میں نے جو ارادہ کرلیا ہے۔ اس میں تباہی ہو یا بربادی، اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا۔ اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ پرچہ ایسا نکالوں گا کہ اس سے پہلے کے سارے پرچے گرد ہو جائیں گے۔"

سالک صاحب سے رخصت ہوکر، میں شفاالملک حکیم فقیر محمد چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنا عندیہ بیان کیا۔ انہوں نے دعا دی "خدا تمہیں کامیاب کرے۔"

میں نے شفاالملک سے درخواست کی "رسالے کا نام تجویز فرمادیجئے۔"

"کیا کیا نام سوچے؟"

"دلچسپ۔ 'لالہ زار'۔ 'نیرنگ خیال'۔"

شفاالملک بڑے ماہر خطاط تھے۔ انہوں نے فرمایا "اچھا نام وہ ہوتا ہے۔ جو لکھنے میں بھی اچھا لگے۔ میرے نزدیک تو ان میں سے "نیرنگ خیال" سب سے بہتر ہے۔"

چنانچہ نیرنگ خیال کا جو پہلا شمارہ نکلا۔ اس کا ٹائیٹل حکیم فقیر محمد چشتی کا لکھا ہوا ہے۔

۱؎ چار سال بعد سالک صاحب کی رائے :-

"رسالہ نیرنگ خیال جب سے جاری ہوا ہے۔ ادبی رسائل کی دنیا میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہوگیا ہے اس مختصر شذرہ میں اُن جلیل القدر ادبا کے اسمائے گرامی نہیں گنے جاسکتے۔ جن کے نتائج فکر اس رسالے کی زینت ہیں۔ لیکن مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندوستان کے بہترین نثاروں اور شاعروں نے اس کی تزئین میں حصہ لیا ہے۔ ظاہری محاسن بھی اس قدر دلآویز ہیں کہ بہت کم یورپین رسالے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔" (نیرنگ خیال سالنامہ ۱۹۲۸ء)

"سرگزشت سالک" میں بھی سالک صاحب نے حکیم صاحب کی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ محض طوالت کے خوف سے چپ رہنے کا ارادہ ہے۔

اب رسالے کے متعلق، ان کے بنیادی نظریات بھی سُن لیں۔ میں نے ابتدا ہی میں چند باتوں کو دھیان میں رکھ لیا تھا۔ وہ یہ کہ میرا رسالہ دوسرے رسالوں سے مختلف ہو۔ بہتر ہو۔ مفید ہو۔ خوبصورت ہو۔"

تکمیل کی ابتدا یوں ہوئی تھی۔ عبدالرحمٰن چغتائی سے تصویر لی۔ جس کا نام لیلےٰ تھا۔ اُسے پہلے شمارے میں بڑی شان سے چھاپا۔ اہتمام یہ بھی کہ کاغذ اچھا لگایا۔ کتابت عمدہ کرائی۔ چھپائی نفیس کرائی اور پھر یہ کہ مضامین بھی بڑے ادیبوں کے۔ پہلا پرچہ بازار میں آیا تو لوگ ٹھٹھکے۔ ایک شہرِ معارف آباد نظر پڑے میں، ہماشما کا تو ذکر ہی کیا۔ علامہ اقبال نے پہلے پرچے پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا تھا:

"رسالہ نیرنگِ خیال جو لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔ ایڈیٹر دونوں (حکیم یوسف حسن ایڈیٹر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر جائنٹ ایڈیٹر) نوجوان ہیں اور لٹریچر کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔ جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویر تحفۂ لیلیٰ بہت خوب ہے۔ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ دیکھئے اب تحفۂ قیس کب نکلتا ہے۔"

لاہور، ۱۷ر اگست ۱۹۲۴ء — محمد اقبال

۱۹۲۴ء کے بعد پھر ۱۹۲۸ء میں بھی علامہ اقبال نے نیرنگِ خیال کی خدمات کو سراہا:۔

"رسالے کے مضامین اور تصاویر خوب ہیں۔ حکیم یوسف حسنؒ کا انتخاب واقعی قابلِ داد ہے غالباً نیرنگِ خیال کا سالنامہ اُردو رسائل میں سب سے اچھا ہے۔ نیرنگِ خیال کے خاص نمبروں نے تمام اردو رسائل کو اپنا معیار بلند کرنے پر مجبور کیا ہے۔ بالخصوص ان کے ظاہری محاسن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ملک کو حکیم صاحب کی اس مستعدی، بے دریغ زرافشانی اور ذوقِ سلیم کی قدر کرنی چاہیئے۔"

جنوری ۱۹۲۸ء — محمد اقبال

ان کا جو پہلا شمارہ نکلا۔ اس کے سرورق پر بجائے ۸۶ کے ۷۸۶ لکھا ہوا ہے۔ بسم اللہ غلط تھی۔ مگر انجام بخیر ہوا اور ہوگا۔ اب تک جو کچھ سامنے آچکا ہے۔ وہ بھی حیران کُن ہے۔ وہ بھی ناقابلِ تسخیر ہے۔ وہ بھی منقبس کا سرمایہ ہے۔ اس لئے کہ اس کی ہر ہر سطر سے تفکر کی آنچ آتی ہے۔

نیرنگِ خیال کے پہلے شمارے کا جو اداریہ ہے۔ وہ بھی قابلِ توجہ اس لئے ہے کہ اُسی سوچ پر تو ساری "عمارت" کھڑی ہے۔ اُسی پر تو فکر و شعور کا سفینہ رواں ہے۔ اجازت دیجئے تاکہ وہ میں آپ کو پڑھ کر سنادوں:۔

"پنجاب زندہ دلی کے لئے ضرب المثل ہوا اور ہو کر رہ گیا۔ کوئی وقت تھا کہ قومی جدوجہد کے ہر شعبہ میں ہمیں سبقت حاصل تھی، ہر مذہبی، معاشرتی اور ادبی تحریک میں ہمیں پیش روی کا فخر حاصل تھا مگر ملکی انحطاط کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی زوال آ گیا۔ بدقسمتی

ہ ڈاکٹر تاثیر کا نام، صرف پہلے چار شماروں پر نظر آتا ہے۔

پستی کے ساتھ بدل گئی۔

ادبیات کی تاریخ میں پنجاب کا نام تا ابد ایک مخصوص شہرت کے ساتھ زندہ رہے گا اردو پنجاب کے بطن سے پیدا ہوئی۔ قرآنی[1] حملہ آوروں نے پہلے پہل یہیں بود و باش اختیار کی اور بھاشا یہیں نئے سانچے میں ڈھالی گئی۔ مگر حکومت کے تغیر کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ زبان کے مرکز بن گئے اور اردو اپنی سوتیلی ماں کے آغوش میں پرورش پاتی رہی اور یہ موانست یہاں تک بڑھی کہ پنجاب اجنبی قرار دیا گیا اور دہلی لکھنؤ والوں کی زبان ٹکسالی شمار ہونے لگی مگر انقلاب زمانہ نے دہلی حکومت کو تباہ کر دیا۔ اغیار نے قدرتاً بیگانگی برتی اور اس آزمائش کے وقت میں پنجاب مردِ میدان ثابت ہوا۔

دہلی اور لکھنؤ کے اکھاڑا بند ہر چند آوازے کستے رہے مگر پنجاب میں احیائے اردو کی تحریک حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی پکڑتی گئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں بے شمار اخبار اور رسالے شائع ہونے لگے اور تمام ملک نے غیر معمولی سرگرمی کا اظہار کیا یہ علامہ اقبال اور مخزن کا دور تھا۔ مگر اقتصادی اور معاشرتی تغیرات اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ جنگِ یورپ تمام ادبی تحریکات کے لئے پیغامِ قضا ثابت ہوئی۔ لیکن پنجاب پھر بیدار ہوا قومی نشو و نما کے ساتھ ادبی ترقی بھی ہونے لگی اور پھر رسائل جاری ہونے لگے ؎

گرم صد بار سوزی باز بہ گردِ سرت گردم
منم پروانہ کز یک سوختن از دست و پا رفتم

یہ مر مر کے جینے کی سرگزشت پنجاب کی ادبی شگفتگی کی ادنیٰ ترین مثال ہے۔ چاہئے تھا کہ ماہوار رسائل ان تجربات سے کچھ فائدہ حاصل کرتے۔ گزشتہ شب کی گرمیٔ صحبت نے جو پروانوں کا ڈھیر چھوڑا تھا اگر اُسے آنے والی صبح کی تعمیر میں صرف کرنا دشوار تھا تو اس سے شمعِ ہدایت کا کام لینا محال نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے رسائل نے انگریزی میگزینوں کی کورانہ تقلید ترک نہ کی اور محض ادب لطیف کی اشاعت اپنا مقصد بنا لیا۔ یہ روش نہ تو پبلک میں مقبول ہے اور نہ قوم کے لئے مفید اور نہ ہی ادبیات کی خدمت کرنے کا اعلیٰ طریقہ ہے۔ اردو کے مشہور ادیب آزاد، شبلی، حالی، سرسید، محسن الملک، ادب لطیف کے علمبردار نہ تھے۔ ہم ادب لطیف کو معیوب نہیں سمجھتے۔ ہمارے خیال میں ادب لطیف مہذب زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے مگر اسے ادبیات کا واحد نصب العین تصور کرنا کسی طرح روا نہیں ہے ؎

من نگویم فرو بند لب از نکتۂ شوق
ادب از دست مدہ بادہ باندازہ ہوش

ہم نے نیرنگِ خیال کا اجرا اردو ادبیات میں اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے کیا ہے ہمارا مدعا قوم کے احاطہ نظر کو وسعت

---

[1] اردو سلطنت مغلیہ کے عہد میں پیدا نہیں ہوئی۔ اس زبان کی پیدائش کے تمام اسباب پہلے ہی باوجوہ اتم موجود تھے۔ ولی جسے غلطی سے اردو کا پہلا شاعر کہتے ہیں۔ دکنی تھا جس سے اردو کی عالمگیر شہرت کا اندازہ ہو سکتا ہے مگر اس سے پہلے دسویں صدی ہجری میں سلطان محمد علی قطب شاہ دکنی، صاحب کلیات تھا۔

رہا ہے اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہذب دنیا کے ہر شعبۂ خیال کو ادبی لباس میں پیش کیا جائے۔ معاشرتی۔ مذہبی، تعلیمی، تاریخی، غرض ہر قسم کے مضامین ہوں گے مگر اس تنوع کے ساتھ ساتھ ایک مقصدِ وحید ہر وقت پیشِ نظر رہے گا کہ ہر مضمون ایک ادبی تحریر ہو۔"

جولائی ۱۹۲۴ء

یہ ہے وہ پہلی اینٹ جس پر ساری "عمارت" کھڑی ہے۔ یہ ہے وہ فکر و شعور کا انگڑائیاں لیتا ہوا انداز جس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ ہے وہ شاخِ اظہار جس پر طرح طرح کے پھول کھلے۔

حکیم صاحب نے فرمایا "ادارت بڑا مشکل کام ہے بابا! یہ ہر کسی کے بس کا نہیں۔ بعض اوقات نیت اور قابلیت بھی کام نہیں آتی۔ ذاتی سوجھ بوجھ کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ مثال کے طور پر لیلیٰ کے خطوط کا قصہ سنو:۔

یہ خطوط، قاضی عبدالغفار نے سید امتیاز علی تاج کو بھیجے تھے۔ کہکشاں[1] میں اشاعت کے لئے، مگر تاج صاحب نے انھیں نہ چھاپا۔ ان کا خیال تھا کہ فحش ہیں۔ ڈرتے تھے۔ احتساب کی زد میں آ جاؤں گا۔

مجھے تاج صاحب نے وہ خطوط، یہ کہہ کر دیئے تھے "ہمت ہے تو چھاپ دیجئے۔"

میں نے جواب دیا "پڑھ کر عرض کروں گا۔"

میں وہ خطوط لے آیا۔ پڑھ ڈالے۔ جیسے جیسے میں انھیں پڑھتا گیا۔ متاثر ہوتا رہا۔ جب کتاب ختم کر لی تو میں نے سوچا کہ ایسی کتاب اور اس نوع کی کتاب تو پورے ادب میں سرے ہی سے نہیں۔ اندازے یا کہ ضرور ہے۔ سو اس کا کوئی حل سوچنا چاہئے۔ دو چار دن سوچتا رہا۔ بالآخر فیصلہ یہ کیا۔ جو کچھ ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ میں اسے چھاپوں گا ضرور!

حل یہ سوچا تھا کہ ان خطوط پر مفصل نوٹ لکھنا چاہئے اور بس! چنانچہ میں نے پہلی قسط کے طور پر، صرف تین صفحوں میں تو خطوط چھاپے اور ان پر دو صفحوں کا نوٹ لکھا۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ یہ خطوط فحش نہیں ہیں بلکہ عورت کی نفسیات کا نفیس ترین اور نازک ترین مطالعہ ہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ اردو ادب میں اس انداز کی کوئی چیز نہیں۔ وغیرہ وغیرہ!

میرا خیال تھا کہ اگر میں نے وہ خطوط، بغیر کسی نوٹ کے چھاپ دیئے تو پرچہ ضبط ہو جائے گا چونکہ میں نے حصار باندھ دیا تھا۔ اس لئے بے خطر تھا کہ اب کچھ نہ ہو گا بلکہ الٹی واہ واہ ہو گی۔ چنانچہ وہی ہوا۔ حکومت کو اعتراض کا موقع نہ ملا اور ادب میں دھوم مچ گئی۔ اگر میں بھی تاج صاحب کی طرح سوچنے لگ جاتا تو ممکن تھا کہ وہ ادبی شاہکار ہماری مصلحتوں کے چکر میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا۔

حکیم صاحب نے فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جسے اٹھتی جوانی کہتے ہیں۔ اس لئے میں ہر قسم کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہر کسی سے ٹکرا بھی جاتا تھا۔ مجھے ادبی محاذ پر سبقت لے جانے اور دوسروں کو پچھاڑنے میں مزا آتا تھا۔ مگر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میرا پہلا ادبی معرکہ دوستوں سے ہوا۔ وہ یوں:۔

---

[1] سید امتیاز علی تاج کا رسالہ، جو تھوڑا عرصہ نکلا۔ مگر نکلا دھوم سے!

میرے ہاں اٹھنے بیٹھنے والوں میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر، غلام عباس اور بدرالدین بدر تھے۔ کبھی کبھی عبدالرحمٰن چغتائی بھی آن نکلتے تھے۔ خوب گپ بازی ہوتی تھی۔ جلیبیاں اور کباب اُڑتے تھے۔ چائے کے دور چلتے تھے۔ ادب پر باتیں اور بحثیں ہوتی تھیں۔ یعنی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم سب ایک تھے۔

حفیظ صاحب کی دبی دبی خواہش یہ تھی کہ مجھے بھی نیرنگِ خیال کے ادارے میں شامل کر لیا جائے۔ میری سوچ یہ تھی کہ حفیظ صاحب ہمیں اپنے شعری کارناموں سے تو نواز ہی رہے ہیں۔ اس لئے اس تکلف کی ضرورت کیا ہے۔ مگر اس بات کو حفیظ صاحب نے بہت محسوس کیا۔

اُدھر مولانا تاجور مخزن سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ مالکوں نے مخزن بند کر دیا تھا۔ حفیظ صاحب مالکانِ رسالہ سے جا کر ملے۔ انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ مخزن کو دوبارہ نکالا جائے ساتھ ہی اپنے آپ کو ادارت کے لئے پیش کر دیا۔ وہ بھی بغیر تنخواہ کے!

وہ ساری پارٹی جس میں ڈاکٹر تاثیر، بدرالدین بدر، غلام عباس اور چغتائی تھے، سب کے سب نیرنگِ خیال کے دفتر سے اُٹھ کر مخزن کے دفتر پہنچ گئے۔ انہوں نے تہیہ یہ کیا کہ نیرنگِ خیال کا جنازہ نکال دیا جائے۔ ادھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اُدھر جنازہ نکالنے والے کئی تھے۔

یہ لوگ میرا جنازہ ضرور نکال دیتے۔ بشرطیکہ مجھ میں کوئی صلاحیت نہ ہوتی یا میری ادبی موت واقع ہو جاتی۔ میں خود جیتا تھا۔ میرے عزائم جیتے تھے۔ میری لگن جیتی تھی۔ میری سوجھ بوجھ جیتی تھی۔ اس لئے سب کے سب اپنی خواہشوں میں بُری طرح ناکام رہے۔

جن دنوں حفیظ صاحب نے مخزن سنبھالا تھا۔ اُن دنوں حفیظ صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ان کے کلام کی دھوم تھی۔ نہ صرف دھوم تھی بلکہ حفیظ صاحب پُوجے جاتے تھے۔ شاعرِ اسلام جو تھے۔

اُن دنوں نیرنگِ خیال کی ادبی اہمیت کے ساتھ اس کی ایک خوبی یہ بھی گنی جاتی تھی کہ اس میں بہترین مصوروں کی تصویریں چھپا کرتی تھیں، اس کے ساتھ پرچہ فوٹوگرافی کے بھی شاہپاروں سے آراستہ ہوتا تھا۔

حفیظ صاحب نے شہر بہ شہر جا کر، نیرنگِ خیال کی اس رُخ سے مخالفت کی کہ تصویریں چھاپنا خلافِ شریعت ہے۔ اس لئے نیرنگِ خیال کی وجہ سے مذہب خطرے میں پڑ گیا ہے۔

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ اُن دنوں میں نے گیارہ ماہ کے بعد تاثیر کو اپنے دفتر میں دیکھا تھا اور یہ دن وہ تھا جس دن حفیظ صاحب کی ادارت میں نکلنے والا مخزن بند ہوا تھا۔

نیرنگِ خیال کی دھوم، زیادہ تر اُن کے سالناموں کی وجہ سے تھی۔ ظاہری شان و شوکت کچھ ایسی ہوتی تھی کہ دل کھنچتا تھا۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ، متعدد رنگین تصویریں ہوتی تھیں۔ آج بھی اتنے خرچ کا تصور محال ہے۔ چہ جائیکہ اُن دنوں جبکہ لوگ سیدھے سادے انداز میں پرچہ چھاپنے کے عادی تھے۔ یہ اجتہاد انہی کا حصہ تھا۔

حکیم صاحب پرچے کی آرائش پر اس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اُس کا ایک واقعہ انہوں نے یوں سنایا تھا:۔

"پرچے کو مصور بنانے کا شوق، جنون کی حد تک تھا۔ میں نے ایک دفعہ بازار میں رنجیت سنگھ پر انگریزی میں ایک کتاب دیکھی۔ قیمت پوچھی تو اس نے نوّے روپے بتائی میں نے تھوڑے سے تامل کے بعد کتاب خرید لی۔ اُس نوّے روپے کی کتاب میں سے مجھے صرف رنجیت سنگھ کی تصویر مطلوب تھی۔ چنانچہ میں نے کتاب میں سے تصویر پھاڑ کر، کتاب سید امتیاز علی تاج کو دے دی تھی۔"

وہ زمانہ آج کا نہ تھا۔ اُس وقت نوّے روپے کی بڑی قیمت تھی۔ صرف ایک تصویر کے لئے نوّے روپے خرچ کرنا آسان کام نہ تھا۔ واقعی وہ شوق نہ تھا جنون تھا۔ شوق اور جنون میں صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے مگر اسے پھاندنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

اس ٹھاٹھ کا تو تھا اس کا ظاہری حسن، سفید کاغذ، بعض اوقات موجودہ رسالوں سے بڑا سائز، خوبصورت لکھائی، خوبصورت چھپائی۔ اس اہتمام سے اور اتنی تعداد میں اگر آج پرچہ چھاپا جائے تو کم از کم بھی نصف لاکھ روپیہ لاگت آئے گی۔ یہ تو تھی اس پرچے کی ظاہری شان، اب معنوی حیثیت بھی دیکھئے:۔

میرے سامنے اس وقت ۱۹۳۳ء کا سالنامہ ہے۔ اس کے قلمی معاونین ہی سے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ کر لیجئے۔ اس سے زیادہ لکھوں گا تو نقاد حضرات کہیں گے۔ پھر آیا ہماری حدود میں! مختصر جائزہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ آپ حکیم صاحب کے خرچیلے مزاج کے ساتھ، ان کے ادبی رجحان کو بھی جان سکیں۔

مضمون نگاروں میں سے صرف چند نام لکھتا ہوں۔ وہ بھی بغیر کسی ترتیب کے، جنہوں نے سالنامہ ۱۹۳۴ء میں شرکت کی تھی، اور اسے اپنے رشحاتِ قلم سے سنوارا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال، سر عبدالقادر، عشرت لکھنوی، آغا حشر، عبدالمجید سالک، نیاز فتحپوری، ایم اسلم، منشی پریم چند، امتیاز علی تاج، محمود شیرانی، نصیر حسین خیال، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، نور الٰہی محمد عمر، سیماب اکبر آبادی، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر تاثیر، شوکت تھانوی، فراق گورکھپوری، قاضی عبدالغفار، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، صفی لکھنوی، جگر مراد آبادی، ظریف لکھنوی، احسن مارہروی، عظیم بیگ چغتائی، سائل دہلوی، عزیز لکھنوی، ریاض خیر آبادی، ان کے علاوہ بھی بہت سے لکھنے والے تھے۔ سب کے نام کہاں تک گنواؤں۔ ابھی تو ایک لمبی فہرست، اسی ایک شمارہ کے مضمون نگاروں کی باقی ہے۔ جب ایسے ایسے لوگ لکھنے والے ہوں گے اور اتنے زیادہ لکھنے والے ہوں گے تو اس رسالے کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ خود ہی کر لیجئے۔ یہ سب کچھ جنتر منتر کے زور پر نہیں ہو جاتا اور یہ بھی کہ ادبی اسرار کے قفل اُس وقت تک نہیں کھلتے۔ جب تک کہ کوئی عشق پیشہ اپنے لہو کی اِک اِک بوند کو نذر نہ کر دے۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آ رہا ہو تو آئیے میں آپ کو اُس وقت کے نمایاں اکابرینِ ادب کی رائے بھی سنواؤں! حوصلے سے اسے بھی پڑھ لیجیے۔ حکیم صاحب کو زمانہ نے دیا کیا ہے۔ سوائے تحسین کے، سوائے واہ واہ کے جھولے کے!

مولانا ظفر علی خان نے فرمایا:۔

"اُردو ادب پر جو پنجاب نے احسان کئے ہیں وہ زائد از حد شمار ہیں۔ یہ خود ستائی نہیں۔ خود غالب و انیس کے نام لینے والے معترف ہیں کہ جو کام دہلی اور لکھنؤ سے نہ ہو سکا وہ لاہور والوں نے کر کے دکھا دیا۔ صحافت کی موقت الشیوع صنف آج کل ادبیات کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اس صنفِ سخن میں پنجاب روز افزوں ترقی کر رہا ہے اور متعدد بلند پایہ مخالف کا بدیع المنزلت وجود، اس پر گواہ،

یوں تو ان میں ہر ایک گنج شایگاں ہے۔ لیکن میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ نیرنگِ خیال جس کا اہتمام حکیم یوسف حسن کے باسلیقہ ہاتھوں میں ہے۔ ان سب کا سرتاج ہے۔ میرے سامنے اس وقت نیرنگِ خیال کا وہ خاص نمبر ہے۔ جو سالنامہ کے نام سے شائع ہوا ہے اور دو سو صفحوں پر چھپا ہوا ہے۔ اس کی اٹھان کو دیکھ دیکھ کر میں حیران ہوں کہ اس کی ترقی کہاں جا کر رکے گی اور اس کی بے شمار خوبیوں پر نظر ڈال کر لسان الغیب کی زبان میں بے اختیار پکار اٹھتا ہوں کہ ؎

عبارِ خط بپوشاید خورشید رُخش یارب
حیاتِ جاوداں بخشش وہ کہ حُسنِ جاوداں دارد

ان چند سطور میں سالنامہ نیرنگِ خیال کی واجبی ستائش کے حق سے عہدہ برا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ معارف اور حقائق کے رنگارنگ جواہرات کا ایک ڈھیر ہے جس کی چمک دمک نگاہ کو خیرہ کئے دیتی ہے۔ نثر اگر دلکشا ہے تو نظم دلربا، اس پر ایک دو نہیں اکتیس ۳۳ تصویریں، جو صنعت گری کی جان ہیں۔ سونے پہ سہاگہ ہیں اور لطف یہ کہ باوجود ان تمام محاسن کے سالانہ بدلِ اشتراک صرف چار روپے بارہ آنے، آپ خود ہی اسے پڑھئے اور اس کی خوبیوں کا اندازہ لگا لیجیے ؎

ہے جو شوقِ جلوۂ حُسنِ زلیخائے ادب
دیکھئے یوسف حسن سے لے کے نیرنگِ خیال — جنوری ۱۹۲۸ء "

یہ اُس شخص کی رائے ہے جسے لوگ بابائے صحافت کہتے ہیں۔ یہ ادیب ایسے تھے کہ بڑے بڑے ادیب پانی بھرتے تھے۔ شاعر ایسے تھے کہ ہر مصرع پر مرحبا کہنے کو جی چاہتا تھا۔ لیڈر ایسے تھے کہ ساری قوم لبیک کہتی تھی۔ اللہ اللہ کیا شان تھی ان کی، وہ خیبر سے لے کر راس کماری تک ان کے کارناموں کی دھوم تھی، ان کے جوش و خروش کی دھوم تھی۔ مگر ہوا کیا آنکھیں بند ہوتے ہی قوم نے انہیں بھی طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ اے لوگو! ذرا سوچو تو، جو شخص ساری عمر آپ کی بہتری کے لئے سرگرداں رہا ہو۔ کیا اُس کا انعام یہی کچھ ہے؟ زوالِ آدمیت کی حد ہو گئی!

یوں تو نیرنگِ خیال پر سارے ہی بڑے ادیبوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، اُن سب کا بیان کہاں تک ہو مگر میں آپ سے گزارش کروں گا کہ ایک دو نامور ادیبوں کی رائے ضرور سُن لیں۔ آپ کا کچھ حرج نہیں۔ خدمت گزار کی اشک شوئی ہو جائے گی۔

مولانا وحید الدین سلیم نے فرمایا:

" آپ کا ہر رسالہ اپنے سابقہ رسالے سے بہتر اور بہ ترقی رہا ہے اور ہر ایک رسالے میں آپ کسی جدت کے نمایاں کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ بڑا کام جو آپ نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے مضمون نگاروں کا ایک گروہ کھڑا کر دیا ہے۔ جن کی تحریروں میں زندگی اور جذبات کی جھلک ہے۔ میری ابتدا سے یہی رائے تھی کہ نوجوانوں میں مذاقِ ادب پیدا کیا جائے۔ پرانے مضمون نگاروں سے بھیک مانگنے کا شیوہ ترک کر دینا چاہیئے۔ ان میں کام کی قوت اور زندہ دلی کا جوش فرو ہو گیا ہے۔ الحمدللہ کہ آپ نے میرا منشا پورا کر دکھایا۔ فنونِ لطیفہ پر جو خاص توجہ آپ نے کی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ کسی رسالے نے آپ سے

پہلے اس میدان میں قدم نہیں اٹھایا تھا۔"

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے فرمایا :-

"نئے رسالے نکلتے ہیں اور بھانت بھانت کی تدبیریں کرتے ہیں مگر حکیم یوسف حسن صاحب کو کد ہے کہ ان سے کوئی بازی نہ لے جائے اور سچ یہ ہے کہ ان کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔

سال بھر اپنے سالنامے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ شہد کی مکھی کی طرح پھول پھول سے رس جمع کرتے ہیں اور وقت آنے پر ایسا بھاری بھرکم رسالہ نکالتے ہیں کہ تعریف کرتے ہی بنتی ہے۔ مضمونوں کی پوچھئے تو یہ گویا ایک فرش ہے۔ جس پر پچی کاری کی گئی ہے۔ الگ الگ کر کے دیکھئے تو کوئی ٹکڑا ڈھنگ سے تراشا گیا ہے۔ اور کوئی ٹیڑھا بنگا، مگر سب کو ملا کر دیکھئے تو آنکھوں کو راحت معلوم ہوتی ہے۔ نیرنگ خیال کے احسانات اُردو صحافت پر بہت زیادہ ہیں۔ اس کی اشاعت اور مقبولیت ہماری زبان کی ترقی کا باعث ہوگی۔"

ایسا رسالہ جس کی شان میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، وحیدالدین سلیم اور مولوی عبدالحق ایسے اکابر بھی مرحبا کہتے ہوں تو اس کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ بہت بڑے سرمائے سے نکلا ہوگا مگر یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ رسالہ تو سرمائے کی تہمت سے بالکل ہی بے نیاز نکلا۔ سوائے سینے میں روشنی کی دولت کے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ حقیقت حال سنئے گا؟

"ابتدا میں تو آپ نے خوب سرمایہ لگایا ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔"

"پھر بھی؟"

"ایک پیسہ بھی نہیں۔"

"تو پھر پرچہ نکلا کیسے؟"

"قرض سے۔"

"کتنے ہزار کے؟"

"صرف چھ سو سے۔"

"صرف چھ سو؟"

"ہاں صرف چھ سو روپے سے، وہ بھی پرچے کے اجرا کے چوتھے مہینے واپس کر دیئے تھے۔ اُن دنوں میرے پاس اگر کوئی سرمایہ تھا تو وہ صرف میرا عزم تھا۔"

پھر یہ بھی فرمایا اور میں منہ کھولے سنتا گیا! :-

"مالی اعتبار سے پرچے پر کئی بُرے دور آئے مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ مشکلیں آتی رہیں۔ تدبیریں کام کرتی رہیں۔ جب تدبیر بھی کام نہ آئی تو قدرت نے ساتھ دیا۔

"ایک بار یہ ہوا کہ ایک سالنامہ چھپا ہوا بالکل تیار پڑا تھا۔ مگر پریس کے مالک نے پرچہ اٹھوانے سے انکار کر دیا۔ میرا جتنا

بھی سرمایہ تھا وہ تو اس میں لگ چکا تھا۔ مگر میرے لگے ہوئے سرمائے سے، خرچ زیادہ آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پریس کے مالک نے کہا۔" رقم دیجئے جناب!"

"میرا سرمایہ تو اس میں لگ چکا ہے۔ اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو میں کسی صورت بھی آپ کی رقم ادا نہ کر سکوں گا۔"

"پھر ہوا کھائیے۔"

"ہوا کھا تو لوں گا مگر اس سے نہ میرا مسئلہ حل ہوگا نہ آپ کا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔"

فوراً ایک ترکیب سوجھی، "آپ سات ہزار پرچوں کے ایک ایک سو کے ستر پیکٹ بنا لیں۔ میں ایک ایک پیکٹ آپ سے نقد رقم ادا کر کے لیتا رہوں گا اور اس طرح سارا پرچہ اٹھا لوں گا۔"

پریس کا مالک مان گیا۔ میری بھی مشکل آسان ہو گئی۔ اس لئے کہ پرچے کی بے حد مانگ تھی۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔ یوں قرض اتر گیا۔ میں سرخرو ہو گیا۔

ایک اور واقعہ سنو:۔

"جب نیرنگِ خیال کا طوطی بولتا تھا۔ اس وقت بھی میں پریشان حال تھا۔ رسالے سے جتنا روپیہ آتا تھا۔ اس پر میں اس سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر میں یہ سوچتا کہ اس رسالے سے مجھے کچھ کمانا ہے تو پھر میں یہ پرچہ نکال ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر نکال سکتا تو اس شان سے نہ نکال سکتا۔ آج میرے پاس سرمایہ نہیں مگر یہ اطمینان تو ہے کہ میں نے ادب کی دنیا میں آکر اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ بلکہ رسائل کی دنیا میں قابلِ توجہ کام کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی سالنامے کے لئے، ان کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اسے چھاپ سکتے چنانچہ انہوں نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ لاہور سے نکلوں۔ ایجنٹوں سے روپیہ وصول کروں اور سالنامہ چھاپوں، اس خیال سے دلی پہنچے۔ ایجنٹوں سے ملے مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ یعنی جو کچھ ملا۔ اس سے ہوٹل کا کرایہ بھی پورا نہ ہوا۔"

کہا:— "ان حالات میں بھی، میں مایوس نہ ہوا۔ انسانوں نے ساتھ نہ دیا تو بزرگوں کے پاس جا پہنچا۔ پہلے دن نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دی۔ دوسرے دن بختیار کاکیؒ کے مزار پر، تیسرے دن خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر، چوتھے دن سید حسن رسول نماؒ کے مزار پر، پانچویں دن مولانا جمالیؒ کے مزار پر، جب میں ان بزرگوں کے مزار پہ جاتا تو ان سے یہ کہتا۔ آپ میری خدا سے سفارش کریں اور مجھے روپیہ دلوائیں۔"

ان کا بیان ہے کہ جب میں پانچویں دن ہوٹل میں واپس آیا تو ایک تار رکھا تھا۔ جس میں لکھا ہوا تھا" آپ آکر اپنا ایک ہزار روپیہ وصول کر لیں۔"

بعض "روشن خیال" حضرات اس واقعہ کو توہم پرستی سے تعبیر کریں گے مگر میں نے خود یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات علم اور تجربہ بھرا

رہ جاتا ہے اور خدائی کرشمے اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔

انہی کی "توہم پرستی" کی ایک اور بات سنا دوں، جی تو نہیں چاہتا کہ آپ ایسے "عقل والوں" سے ایسی باتیں کروں مگر یوں ہوتا تو ہے۔

ادبی رسالوں کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ جو چاہو مانگو۔ ملے گا مگر ایک چیز نہ مانگنا اور وہ ہے مالی آسودگی! یہی وجہ ہے کہ ہزاروں ہی رسالے، اپنے اپنے خون میں نہا کر بے چارگی کی گھاٹیوں میں جا سوئے۔

قدرت کے اس فیصلے کے مطابق، حکیم صاحب بھی تہی دامن ہی رہے۔ ہمیشہ تہی دامن! چھوٹے موٹے شمارے تو بہ آسانی سے نکال لیتے تھے مگر جب سالنامے کی اشاعت کا موقع آتا تھا تو جیب جتنا ساتھ نہ دیتا تھا۔

ایک بار یہ ہوا کہ یہ ہندوستان بھر کا چکر لگا کے، سالنامے کے لئے مضمون اکٹھے کر چکے تھے۔ سالنامے کی کتابت ہو چکی تھی مگر اتنا سرمایہ نہ تھا کہ کاغذ خرید کر پرچہ چھپوا لیتے۔ بہتیری کوششیں کیں۔ سب ناکام! ادھار مانگا، وہ نہ ملا۔ عموماً ایسے مواقع پر دوست بھی مالی اعتبار سے "ننگے" نکلتے ہیں۔

جب اپنی کوششوں کا جائزہ لے کر، اس کے نتیجے پر سوچا تو ان کے آنسو نکل پڑے انہوں نے کمرہ بند کر کے کنڈی چڑھا لی، سجدے میں گر گئے۔ زار و قطار روتے رہے۔ روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے "اے اللہ! میں اپنی ذات کے لئے روپیہ نہیں مانگتا۔ میں اپنے طور پر جو کام کر رہا ہوں۔ وہ مخلوقِ خدا کی بھلائی کے لئے ہے۔ پھر کیوں تو میرا ساتھ نہیں دیتا؟"

حکیم صاحب کے بیان کے مطابق، یہ کوئی گھنٹہ بھر سجدے میں گرے رہے اور یہی کچھ کہتے رہے۔ بڑے ہی جذب کے ساتھ! اتنے میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ انھیں بڑا غصہ آیا۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت کوئی ان کا اور خدا کا رابطہ توڑے۔

جب کنڈی مسلسل کھٹکتی رہی تو منہ پونچھ کے غصے سے اٹھے "کیا ہے؟"

انہوں نے دیکھا کہ دروازے پر گیلانی پریس کے مالک سفید ریش بزرگ کھڑے تھے اور سڑک پر ان کے نیچے سے گھوڑے والی ننھی سی ٹمٹم کھڑی تھی۔

"آیئے شاہ صاحب!"

"میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں"

"زہے نصیب!"

"آپ کاغذ کہاں سے خریدتے ہیں؟"

"جہاں سے ملے"

"ہم سے لیا کریں"

"میں تو کاغذ ادھار لیتا ہوں"

"ہم بھی ادھار دے دیں گے۔ ہر ماہ کتنا کاغذ درکار ہوتا ہے؟"

"کوئی چار سو روپے کا!"

"بہت اچھا! فی الحال میں آپ کو چار ہزار روپے کا کاغذ بھجوا دیتا ہوں۔ جب جی چاہے اور جتنی رقم دے سکیں۔ وہ دیتے رہیں۔ ہماری طرف سے کوئی شرط نہ ہوگی۔"

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ "میری زندگی کے یہ دو چار واقعات ایسے ہیں جنھیں میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ مادی دنیا کے لوگ اسے محض اتفاق کہیں گے مگر میں یوں سوچ نہیں سکتا۔ میں اتفاقات کو بھی خدائی وسیلہ سمجھتا ہوں۔ کسی کو قدرت خود نواز دیتی ہے۔ کسی کو درخواست کرنی پڑتی ہے۔"

میں نے حکیم صاحب سے کہا "آپ روپے پیسے کے لئے خواہ مخواہ پریشان رہے۔ وہ دور تو ایسا تھا کہ ادب کی سرپرستی امرا اور رؤسا کی "ہوبی" تھی۔ آپ نے کیوں نہ فائدہ اٹھایا؟"

کہنے لگے "یہ وصف مجھ میں نہ تھا۔ میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا بلکہ اکثر یہ ہوا کہ اپنا حق بھی حاصل نہ کرسکا۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ سر عبدالقادر، ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس تھے۔ انہوں نے سوچا بہاولپور میں ایک بڑے پیمانے پر مشاعرہ کرایا جائے۔ صدارت کے لئے نواب صاحب راضی ہو گئے۔ نواب صاحب راضی کیوں نہ ہوتے۔ یہ کیم سر عبدالقادر کی تھی۔ صاد نواب صاحب نے کیا ہوا تھا۔

مجھے خط لکھ کر سر عبدالقادر نے بہاولپور بلایا۔ پہلے مقصد بتایا۔ پھر وزیر تعلیم سے ملوایا اور اُن سے میرے پہنچنے کی غرض وغایت بیان کی۔

غرض وغایت یہ تھی کہ میں نیرنگِ خیال کا مشاعرہ نمبر نکالوں، جس میں اس مشاعرے کا حال بھی ہو اور امرا و وزرا کا تعارف بھی اور نواب صاحب کی صلاحیتوں اور فیاضیوں کا ذکر بھی۔

چنانچہ اس غرض کے لئے تین چار بار بہاولپور گیا۔ پہلے مشاعرے کا حال نوٹ کیا۔ پھر امراء و وزراء کے فوٹو اور حالات اکٹھے کئے۔ غرض خوب محنت کی۔"

حکیم صاحب کے بیان کی روانی میں، میں نے پوچھ لیا۔ "جناب! ذرا مجھے یہ بتاتے چلیں کہ اس مشاعرے میں شرکت کن کن شعرا نے کی تھی؟"

کہنے لگے۔ "مولانا ظفر علی خان۔ دل شاہجہان پوری، سیماب اکبر آبادی، منشی محمد ناظر، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، شعری بھوپالی، روش صدیقی، شکیل بدایونی اور نہ جانے کون کون! غرض شاعر اتنے تھے کہ چار دن تک مشاعرہ چلا تھا۔

شاعروں کی آؤ بھگت بھی ترہی ہوئی۔ شاہی محل میں خود نواب صاحب نے مدعو کیا۔ کھانا ساتھ بٹھلا کے کھلایا۔ غرض وہ مشاعرہ یادگار تھا۔ نہ کبھی ایسا مشاعرہ ہوا ہوگا اور نہ ہوگا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے بڑی محنت کر کے نیرنگِ خیال کا مشاعرہ نمبر چھاپا تھا۔ جب نمبر چھپ گیا تو مجھے سر عبدالقادر نے پھر بہاولپور بلایا۔ اس وقت وزیرِ تعلیم بھی موجود تھے۔ سر عبدالقادر نے کہا: "حکیم صاحب! آپ نے جو اہلِ بہاولپور کی خدمت کی ہے۔ وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ کچھ آپ کی بھی خدمت کریں۔"

میں نے سر عبدالقادر کی باتوں پر سوچا۔ معاً میرے ضمیر نے آواز دی۔ مانگنا ہے تو خدا سے مانگ۔ چنانچہ میں نے ان سے گزارش کی۔

"میرے صرف ساڑھے آٹھ سو روپے خرچ ہوئے ہیں۔"

"صرف ساڑھے آٹھ سو؟"

"جی ہاں!"

"سوچ لیجئے!"

"سوچ لیا۔"

چنانچہ مجھے ساڑھے آٹھ سو روپے ادا کر دیئے گئے۔ بعد میں سر عبدالقادر نے کہا کہ اس موقع پر جبکہ نواب صاحب بھی بے حد خوش تھے۔ آپ کو آٹھ دس ہزار روپیہ مل جانا کوئی بڑی بات نہ تھی مگر آپ نے صرف خرچہ مانگا۔ اپنی زحمتوں اور کارگزاریوں کا کچھ نہ مانگا۔"

جواب میں حکیم صاحب نے کہا: "مانگنے کے لئے میں نے جس کا انتخاب کر رکھا ہے وہ نواب صاحب بہاولپور نہیں۔"

جب میں نے حکیم صاحب کی یہ بات سنی تو وہ خیال بھی آیا کہ حکیم صاحب جو کنڈی بند کر کے خدا سے مانگتے ہیں تو وہ غلط نہیں مانگتے۔

نیرنگِ خیال کے دوسرے رسائل کے ساتھ بھی بڑے معرکے رہے۔ حکیم صاحب کسی زمانے میں تھے جی جیوٹ، ہر ادبی معاملے میں، اپنی چودھراہٹ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ پھر تھے بھی نیرنگِ خیال ایسے عظیم رسالے کے ایڈیٹر، یہ نشہ کچھ کم نشہ نہ تھا۔

ایک چپقلش جو ہمیشہ ہی چلی۔ وہ تھی لکھنؤ اسکول اور دلی اسکول کی۔ ایک اسکول کہتا تھا۔ زبان ہے خیالات نہیں تُف، دوسرا کہتا تھا۔ خیال ہو تو ہو، زبان کا بیڑا غرق ہو گیا۔ تُھو!

ان دونوں اسکولوں کی آپس میں کبھی نہ بنی، مگر جب بھی بنی تو اس بنیاد پر، اہلِ پنجاب کے لتے لینے کو، ادھر بھی حکیم یوسف حسن تھے۔ سو ہنگاموں کے ایک ہنگامہ!

لیجئے رن پڑا۔

یو۔ پی کے دوستوں نے پنجابیوں کی زبان پر اعتراض کیا۔ اعتراض نہیں اعتراضات!

پنجابی بھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہنگاموں کا مرکز حکیم یوسف حسن کا دفتر (بلکہ اڈا) سرخیلوں میں پطرس، تاثیر، سالک اور تاج اس پارٹی کے دستہ تھا۔ اعتراضات کا جواب دینا اور نئے شوشے چھوڑنا۔

ان کے مددگاروں میں تھے حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، غلام عباس، بدر الدین بدر اور حکیم یوسف حسن، ان کے ذمہ تھا ایسا مواد اکٹھا کرنا جو "دشمنوں" کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

جب یہ لوگ اس "کارِخیر" میں شرکت کے لئے اکٹھا ہوتے تھے تو عموماً آپس میں اس قسم کی گفتگو کرتے تھے۔

"پِٹ گئے ہم"

"اب دشمن بھی جانے نہ پائے"

انہی دنوں رسالہ نگار میں ایک سوال چھپا تھا۔ البانیہ کہاں ہے؟ حدود اربعہ کیا ہے؟ آبادی کتنی ہے؟ سیاسی اعتبار سے اس کی پوزیشن کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ!

اس سوال کے چھپنے کے دوسرے مہینے البانیہ پر، ایک بڑا لمبا چوڑا مضمون، نیاز فتحپوری کا نگار میں چھپا۔ سبھی اس معلوماتی مضمون سے متاثر ہوئے۔ مگر "خوجیوں" نے سراغ لگایا کہ یہ مضمون تو حرف بہ حرف ترجمہ ہے امریکن میگزین کے ایک مضمون کا۔ اسی طرح خوجیوں نے نیاز صاحب کی ایک دو چوریاں اور پکڑیں تو نیاز صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ اس ترکیب سے کہ اپنا ایک مضمون نیرنگِ خیال میں اشاعت کے لئے بھیج دیا اور اس کے ساتھ خط اس مضمون کا لکھا۔ "یہ مضمون نہیں ہے۔ خراجِ عقیدت ہے۔"

اس طرح حامد اللہ افسر نے کسی مضمون کا ترجمہ کر کے اپنے نام سے چھپوا دیا۔ اس کو بھی یاروں نے پکڑ لیا کہ یہ فلاں مضمون کا ترجمہ ہے۔ اس کا جواب ادھر سے یوں دیا گیا کہ نیرنگِ خیال میں ایک ڈراما چھاپا گیا۔ دو قسطوں میں، جس میں ڈرامے کے کرداروں کے ذریعے جھوٹ اگلوایا گیا۔ وہ ڈراما کیا تھا۔ چوری پر بڑا اکٹیلا طنز تھا۔ حامد اللہ افسر کی بھد اڑ گئی چنانچہ اس طنز کی تاب نہ لا کر انہوں نے بھی فوراً معذرت چاہی صلح صفائی ہو گئی۔

جس طرح اِدھر کے چودھری حکیم یوسف حسن تھے۔ اُدھر کے چودھری شاہد احمد دہلوی تھے۔ وہ اپنے ساقی میں پنجاب کے اہلِ قلم کی زبان درست کرنے اور کراتے تھے۔ اِدھر یہ ان کی چوریاں پکڑ پکڑ کے رسالوں پر بٹ لکھواتے رہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو کہتے تھے "نیاز مندانِ لاہور" دلی کا رسالہ "ساقی" انہیں کہتا تھا ——— "شلوارانِ ادب"!

واہ واہ کیا دن تھے وہ بھی اور کیا لوگ تھے وہ بھی، ان میں سے پطرس، تاثیر اور سالک چل بسے۔ دوسری پارٹی سے نیاز فتحپوری سیماب اکبرآبادی اور شاہد احمد دہلوی چل بسے، پالی خالی ہو گئی۔ اب بوڑھے خلیفہ کے روپ میں، حکیم صاحب زندہ ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ ادبی رسائل کی ناک ہیں یہ!

وہ جو میں نے ابھی کہا کہ انہیں چودھری بننے کا شوق ہے تو وہ غلط نہ تھا۔ اس شوق میں یہ نہ اپنوں کو بخشتے تھے نہ بیگانوں کو۔ جس نے سر اٹھایا نہیں۔ اُسے نیچا دکھایا نہیں۔

یہ کسی بات پر پطرس سے ناراض ہوئے تو ان کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ براہ راست نام لے کر تو نہ کوسا، مگر یہ لکھا ریڈیو والے بڑا غلط کام کر رہے ہیں۔ (اُن دنوں پطرس ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے) پروگرام بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ریڈیو کے ناخداؤں سے بازپرس کی جائے۔

پطرس ان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ حکیم صاحب کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے۔ انہوں نے انہیں فوراً خط لکھا "میں سارے جہان کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر نیرنگِ خیال کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ اناڑی بلا ہے۔ دوبارہ لکھا۔ لہجہ پہلے

سے بھی زیادہ تند و تیز اختیار کیا۔ اس کے جواب میں پطرس نے پھر لکھا "اگر آپ نے میری مخالفت بند نہ کی تو میں مر جاؤں گا۔"

اگر آپ پطرس کے مزاج سے واقف ہیں۔ ان کے پندار سے آگاہ ہیں تو پھر پطرس کا یہ فقرہ حکیم صاحب کے اثر اور دبدبے کو ظاہر کرنے کے لئے ایک بہت بڑا سرٹیفکیٹ ہے۔ اس لئے کہ پطرس اپنے وقت کے خدا تھے۔

یہ واقعہ بھی معلوم ہوا کہ :۔

مولانا چراغ حسن حسرت دل محمد روڈ پہ رہتے تھے۔ حکیم صاحب کا دفتر فلیمنگ روڈ پر تھا۔ بالکل قریب قریب۔ حسرت صاحب ان دنوں ہفت روزہ "شیرازہ" نکالتے تھے۔ مولانا بلاشبہ بڑے پائے کے ادیب تھے۔ ادب میں اونچا مقام تھا مگر ان میں ایک بات بڑی خراب تھی کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ فرہنگِ حقائق سے بھی آنکھیں چرا لیا کرتے تھے۔ ہر ایک کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے اپنا وہی رنگ ان پر بھی جمانا چاہا۔ یہ بھی ذہن پر غلاف چڑھائے ہوئے نہ تھے۔ بلکہ چڑھے تھے۔ خاموش کیسے رہتے۔

حسرت صاحب نے فرمایا "مولانا اپنے پرچے کو بہتر بنائیے۔ رسالے کو ترقی دیجئے۔ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر حکیم صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے ڈالا۔ "حضرت پہلے اپنے گھر کی تو خبر لیجئے۔ محاوروں کے بنڈل اب نہیں چلتے۔ نیوز ایجنٹوں کے ہاں سے پرچہ سیدھا ردی کے بیوپاریوں کے ہاں پہنچ رہا ہے۔"

حکیم صاحب میں باوجود بڑھاپے کے حد درجہ شگفتگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر محفل میں فٹ نظر آتے ہیں۔ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان، بچوں میں بچے!

۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک صاحب آئے۔ اصل میں وہ نیرنگِ خیال میں کام کرنا چاہتے تھے۔ تھے گُنی۔ سیدھی طرح بات کرنے کی بجائے گھما پھرا کر بات کرنی چاہتے تھے۔ یہ فوراً تاڑ گئے۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ صاحب گویا ہوئے "حکیم صاحب پرچے کو اٹھائیے۔"

"بہت اچھا"

"صرف اچھا کہہ دینے سے بات نہ بنے گی۔ جب تک ـــ"

"محنت کرتا ہوں۔ روپیہ خرچ کرتا ہوں اور کیا کروں؟"

"نہیں صاحب کچھ کیجئے۔"

"جو کچھ میرے بس میں ہے وہ تو کر ہی رہا ہوں۔"

"بہر حال کسی طرح پرچے کو اٹھائیے۔"

"بہت اچھا تین آدمی اور لے آئیے تاکہ اسے اٹھایا جائے۔" یہ سننا تھا کہ وہ صاحب ایسے بھاگے، جیسے شکاری سے شکار۔

باتوں باتوں میں مولانا اظہر دہلوی کا ذکر آیا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ اظہر صاحب بھی عجیب آدمی تھے۔ تھے تو وہ مگر جتنے قابل تھے باتیں اُس سے بھی بڑھ چڑھ کر کرتے تھے۔ جھک جھک، جھک جھک!

ایک بار انہوں نے اپنے پرچے "تحریک" میں نیرنگِ خیال کی چند منظومات پر تبصرہ کر ڈالا۔ تبصرہ کچھ اس قسم کا تھا کہ فلاں نظم اور غزل میں یہ غلطی ہے اور فلاں نظم اور غزل میں یہ، غرض انہوں نے اچھا خاصا تماشا۔ نکو بنایا۔

اُن دنوں نیرنگِ خیال کا دفتر مستی گیٹ میں تھا۔ نیچے دفتر تھا اور اس کے اوپر بیٹھک، میں بیٹھک میں بیٹھا ہُوا تھا کہ مجھے بازار میں جاتے ہوئے اظہر صاحب نظر پڑ گئے۔ میں نیچے اُترا، سلام علیک کہا، ساتھ چل دیا۔ پہلے تو میں نے خیر خیریت پوچھی، پھر احوال، چلتے چلتے میرا لہجہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ مولانا بھانپ گئے۔ وہ کنی کترانا چاہتے تھے۔ میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ غرض وہ میری شکایتوں کی آنچ کی تاب نہ لا سکے۔

جب ہم مستی دروازے سے چل کر چوک شرحِ سنگھ تک آئے تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولانا بھاگ کھڑے ہوئے مگر میں نے ان کے بھاگنے کی ابتدا ہی میں یہ فقرہ جڑ دیا: "آئندہ ایسی حرکت کی تو گردن سے پکڑ کر نالی میں گھسیٹ دوں گا"۔

میں نے کہا: حکیم صاحب! یہ تو آپ نے بڑی زیادتی کی۔ کہنے لگے۔ زیادتی والی بات ٹھیک ہے مگر مولانا بلا وجہ جھک جھک کیا کرتے تھے۔ خواہ مخواہ غصہ آتا تھا۔ سبھی کو جاہل سمجھتے تھے۔ یہی تو ان کا روزمرہ تھا۔ چونکہ مولانا نے شاعری کا بیج کھولا ہُوا تھا۔ جہاں شاعر بنائے جاتے تھے اور شاعری بکتی تھی۔ نرخ تھا۔ تین روپے غزل، چار روپے غزل، مولانا کو چونکہ اپنا رعب گانٹھنا ہوتا تھا۔ اس لئے سب کی غلطیاں نکالا کرتے تھے جیسے سب عقل کو تدفین کئے بیٹھے ہوں اور ایک یہی علامۂ دہر ہوں۔

لو! ایک قصہ اور سنو، پھر تم کچھ فیصلہ کر سکو گے!

اسی طرح یہ مولانا ظفر علی خاں کے دفتر پہنچ گئے۔ علمی باتیں شروع ہوئیں مگر نوبت تُو تکار تک پہنچ گئی۔ اظہر صاحب ایک دم گرم ہو جانے کے مرض میں مبتلا تھے۔ پہل خود کرتے تھے مخاطب کو غصہ آ ہی جایا کرتا تھا۔ غرض اظہر صاحب کی مولانا ظفر علی خاں سے بات اس حد تک بڑھی کہ ظفر علی خان نے مولانا اظہر کے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

اظہر صاحب وہاں سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے: "اب ملاقات تھانے میں ہوگی"۔

مولانا اظہر چلے گئے تو ظفر علی خان کو خیال آیا کہ کہیں واقعی مولانا اظہر تھانے نہ پہنچ جائیں۔ وقتی غصہ مسئلہ نہ بن جائے۔

وہ زمانہ خدمت کا تھا۔ ظفر علی خان کے پاس بے شمار والنٹیئر تھے۔ انہوں نے دس بارہ والنٹیئروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ فلاں جگہ مولانا اظہر دہلوی کا مکان ہے وہاں جاؤ اور ان کے مکان کا محاصرہ کر لو تاکہ مولانا گھر سے نکلنے نہ پائیں۔ چنانچہ والنٹیئروں نے اظہر صاحب کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ کوئی چھ سات دن تک یہ قصہ چلا۔

ایک دن مولانا ظفر علی خان نے دیکھا کہ والنٹیئر واپس چلے آ رہے ہیں۔ مولانا نے وجہ پوچھی تو انہوں نے مولانا اظہر دہلوی کی تحریر دکھائی جس میں لکھا تھا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تھانے نہ جاؤں گا"۔

ایک دن حکیم صاحب تشریف لائے۔ میں دفتر میں موجود نہ تھا۔ مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ دوسرے دن ملاقات ہوئی تو پوچھا۔

"کل کہاں تھے؟"

میں نے عرض کیا: "پڑوسیوں کا جھگڑا تھا۔ انہوں نے میری گواہی لکھوا دی تھی۔ اس لئے عدالت میں گواہی کے لئے گیا ہُوا تھا"۔

کہنے لگے: "میں نے بھی زندگی میں ایک دو گواہیاں دی تھیں۔ جو دلچسپ تھیں۔" پھر گویا ہوئے:

"میں ریلوے میں ملازم تھا۔ میرے پاس دو سکھ آئے۔ ایک کا نام گہنا تھا۔ دوسرے کا نام لہنا۔ انہوں نے کہا۔ کل کے لئے ویگنیں بُک کر دیجئے۔ ہم مویشی لے کر آئیں گے۔"

میں نے کہا: "ہانک لانا۔ ویگنیں مل جائیں گی۔"

مگر دوسرے دن ان میں سے کوئی نہ آیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ پندرہ بیس روز کے بعد لہنا آیا۔ میں نے کہا "گہنا کہاں ہے؟ اور یہ بھی پوچھا کہ تم لوگ پھر آئے ہی نہیں؟"

لہنا نے کہا "بابو جی! یاری کی چوری بن گئی۔"

"سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

لہنا نے بتایا کہ "دوسرے دن، پروگرام کے مطابق ہم ضرور حاضر ہوتے۔ مال بھی بُک کراتے مگر ہوا یہ کہ گہنا پر چوری کا الزام لگا دیا گیا اور وہ پکڑ لیا گیا۔ قصہ یہ تھا کہ گہنا پر ایک لڑکی عاشق تھی۔ اُن لوگوں کی اور تو کوئی پیش نہ گئی۔ انہوں نے گہنا کو چوری کے الزام میں گرفتار کرا دیا۔ یوں ہم لوگ نہ آسکے۔ معاملہ کچھ، بہانہ کچھ!

اب آپ سے عرض ہے کہ آپ ہماری گواہی دیں کہ ہم نے فلاں تاریخ کو مال کی بُکنگ کرائی تھی۔ مگر ہم لوگ وقت پر حاضر نہیں ہوئے تھے۔"

"گواہی سچی تھی۔ میں نے حامی بھر لی۔

عدالت میں پہنچا تو دیکھا کہ کمرہ سکھوں سے بھرا ہوا ہے۔ دو ٹولیاں الگ الگ بیٹھی ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ میں نے ماحول دیکھا تو بے حد گھبرایا۔ مگر اُس وقت سوائے حوصلے سے کام لینے کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

میرا نام پکارا گیا۔ جو واقعہ تھا۔ میں نے عرض کر دیا۔ مخالف وکیل نے جرح کی۔ "آپ گہنا اور لہنا کو پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔"

"پھر آپ کو ان کے نام کس طرح یاد رہ گئے؟"

"ان کے نام ہی ایسے تھے گہنا اور لہنا۔ جو شخص ان کے ناموں کو ایک بار سن لے گا۔ وہ عمر بھر بھول نہیں سکتا۔"

"اچھا تو پھر انہوں نے مال بُک کرانے کے لئے آپ سے کہا؟"

"جی ہاں!"

"آپ کے پاس رجسٹر تو ہوگا۔ جس میں آرڈر بُک کرتے ہیں؟"

"جی ہاں، رجسٹر ہوتا ہے مگر ہم رجسٹر کا استعمال اُس وقت کرتے ہیں۔ جب بے حد رش ہوتا ہے۔ جن دنوں یہ دونوں آئے تھے۔ اُن دنوں کوئی رش نہ تھا۔ جو کوئی بھی مال لے کر آتا تھا۔ بُک ہو جاتا تھا۔"

حکیم صاحب نے کہا: "مخالف وکیل نے مجھے پٹڑی سے اُتارنے کی بڑی کوشش کی مگر میں کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ

میں نے مخالف وکیل کی ایک نہ چلنے دی۔"

اس کے بعد کہنے لگے: "ایک اور گواہی بھی دی تھی۔ جو بے حد دلچسپ تھی، مگر میں وہ آپ کو پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت تھک گیا ہوں —— ہائے ہائے! مر گئے۔ حد ہو گئی گرمی کی بھی، معلوم ہوتا ہے جہنم کے پٹ کھل گئے ہیں۔"

میں نے سوچا۔ یہ بات اب رہ گئی تو پھر ذہن سے اُتر جائے گی۔ بڑی محبت سے پوچھا "حکیم صاحب چائے پیجئے گا یا کوئی ٹھنڈی چیز؟"

"اس وقت کچھ نہیں۔ میری جان چھوڑو!"

"آپ کی جان چھوڑ دوں گا مگر یہ تو بتا دیجئے کہ کیا پئیں گے؟"

"اچھا تو پھر چائے منگواؤ، لوہے کو لوہا کاٹے۔"

چائے آگئی۔ چسکی لی تو میں نے کہا "حکیم صاحب معلوم نہیں کل تک ہم زندہ بھی رہیں گے یا نہیں اس لئے دلچسپ گواہی والی بات آج ہی بتا دیجئے۔"

"بڑے بدمعاش ہو۔"

"جی ہاں!"

سنو، پنڈت ٹھاکر دت لاہور کا ایک مشہور حکیم تھا۔ اکثر دواؤں کے اشتہار دیا کرتا تھا۔ قوتِ مردمی کی دواؤں پر اس کے سارے کاروبار کا انحصار تھا۔ اس نے ایک اشتہار چھاپا حکومت نے اُسے فحش قرار دے کر مقدمہ چلا دیا۔

وہ اشتہار کچھ ایسا تھا:۔

'دو گھنٹے قبل ...... حسبِ خواہش ..... ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ!'

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ اشتہار فحش نہیں ہے۔ پانچ بڑے نامور حکیم گواہی دینے کے لئے عدالت میں حاضر تھے۔ اُن میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی، شفاء الملک محمد حسن قرشی، حکیم ظفر یاب، ڈاکٹر مرزا امام الدین اور پانچواں یہ خاکسار!

اشتہار فحاشی کی ذیل میں آتا تھا مگر ہمارے وکیل نے سبھی گواہوں سے یہ کہا تھا کہ گواہی میں یہ کہنا ہے کہ پنڈت ٹھاکر دت کی مشہور دوا "حب نشاط" مردانہ بیماریوں کا شافی علاج ہے۔ اس کے استعمال سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لئے پبلک کی بہبود کے لئے اشتہار دیا گیا۔ جہاں فحش الفاظ لکھنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وہاں حکیم صاحب نے ڈیش لگا دیئے ہیں تاکہ اعتراض کا محل نہ رہے وغیرہ وغیرہ!'

حکیم صاحب نے کہا "اتفاق کی بات کہ سب سے پہلے مجھے گواہی کے لئے طلب کیا گیا۔"

"آپ کے سامنے جو اشتہار ہے، کیا یہ فحش نہیں ہے؟" حکومت کے وکیل نے کہا۔

معاً مجھے احساس ہوا کہ جو باتیں ہمارے وکیل نے بتائی ہیں۔ اگر میں نے وہ کہہ دیں تو پنڈت جی قانون کی زد سے بچ نہ سکیں گے لہٰذا میں نے کچھ سوچ کر کہا: "اس میں ایک لفظ بھی فحش نہیں۔

"دو گھنٹے قبل کس طرف اشارہ ہے؟"

"حُبِ نشاط دوا کی طرف!"

"حسبِ خواہش سے کیا مطلب ہے؟"

"فائدہ سے۔"

"جو تاویل آپ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب وہ بالکل نہیں۔ بلکہ یہ اشتہار بالکل واضح ہے اور فحش ہے۔ (پھر ذرا رُک کر) بھلا یہ اشتہار خصوصی طور پر کس مقصد کے لئے ہے؟"

"جو دوا مردانہ بیماریوں کے لئے مفید ہوتی ہے وہ عموماً دیگر امراض کے لئے بھی مفید ہوتی ہے۔ مثلاً دل، دماغ، معدہ، جگر وغیرہ کے لئے اور ان سارے ہی امراض کے نام اس اشتہار میں موجود ہیں (اور پھر زور دے کر) جب سارے امراض کے نام اشتہار میں درج ہیں تو میں حیران ہوں کہ ہمارے مخالف وکیل ایک دو امراض کے ناموں سے آگے کیوں نہیں پڑھتے؟ کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"میں کیوں پڑھوں جب کہ بات واضح ہے۔"

"بے ادبی معاف، آپ نے اپنے ذہن میں اپنے مطلب کی بات کو جگہ دے رکھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے سوچنے کا رُخ غلط ہے۔ جو قطعی صحت مندانہ نہیں۔"

جب حکیم صاحب یہ سب کچھ بیان کر چکے تو انہوں نے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا۔ میں نے وہ بیان اس انداز سے دیا تھا کہ جج بھی متاثر ہوا۔ مخالف وکیل بھی گھبرایا۔ میرے بیان کے بعد جب مخالف وکیل نے کہا "اور گواہ پیش کیجیے"۔ تو ہمارا وکیل میرے بیان سے اتنا مطمئن ہو گیا تھا کہ اُس نے کہہ دیا تھا۔ ہم کوئی اور گواہ پیش نہ کریں گے۔ "ہماری یہی ایک گواہی کافی ہے۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ پنڈت ٹھاکر دت مقدمہ جیت گیا۔

یہ واقعہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ کچھ سبک ضرور ہے۔ جی بھی یہ چاہتا تھا کہ اسے گول کر جاؤں۔ اگر یوں کرتا تو ممکن ہے میری قلمی شرافت پر حرف نہ آتا۔ مگر یہ ضرور ہوتا کہ میں حکیم صاحب کی شخصیت کے ایک رُخ کو واضح نہ کر سکتا۔ مجبوریاں بھی بعض اوقات انگلیاں اُٹھوا دیتی ہیں۔

حکیم صاحب ایک نامور رسالے کے ایڈیٹر ہی نہیں، نامور حکیم بھی ہیں۔ انہیں دکانداری نہیں آتی۔ اس لئے اپنے مطب میں بھیڑ نہ لگا سکے۔ دیانت داری سے علاج کرتے ہیں۔ نہ کھال ادھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ مریضوں کو لٹکانے کی۔ غریبوں سے حتی المقدور رعایت کرتے ہیں۔ امیروں سے "ٹکا"* کے پیسے لیتے ہیں مگر کھال پھر بھی سلامت رہنے دیتے ہیں۔

میں ان کی حکیمانہ سوجھ بوجھ کا بڑا قائل ہوں۔ اگر میں ان سے پوچھوں گا کہ آپ نے کون کون سے مہرے کے علاج کئے تو ایران توران کی بہت سنا ہیں گے مگر میں ایران توران کی سنوں کیوں؟ اپنے چشم دید حالات کیوں نہ کہوں!

---

* یہ لفظ پنجابی کا ہے، اُردو میں مجھے اس سے بہتر لفظ نہیں ملا۔

ایک دن ہمارے رسالے کے خوش نویس، دانتوں کے درد سے بے حال بیٹھے تھے۔ درد اتنا شدید تھا کہ انہوں نے ٹھوڑی کے نیچے سے لے جا کر، سر پہ کس کے رومال باندھا ہوا تھا۔ اس پر بھی ہائے وائے کر رہے تھے۔ اتنے میں حکیم صاحب آ گئے۔ "پوچھا کیا تکلیف ہے؟"

"دانتوں میں بے انتہا درد ہے۔ بُری طرح ہل رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ سارے دانت نکلوا دو۔"

"ایسا ظلم نہ کرنا۔ یہ ایک پڑیا کھا لو۔ درد غائب ہو جائے گا۔ ہلنے والے دانت ہتھوڑی سے بھی ہلاؤ گے تو نہ ہلیں گے۔"

چنانچہ صاحب ایسا ہی ہوا۔ چند گھنٹوں میں درد غائب، دانت بھی پختہ!

ان کے اس نوع کے ایک ہزار ایک قصے سنائے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمیں ان کے اس رُخ کو زیادہ اجاگر نہیں کرنا ہے: تاکہ یہ سوال نہ اٹھے کہ یہ حکیم زیادہ بڑے ہیں یا مدیر!

حکیم صاحب پنڈی سے لاہور پہنچے۔ ہمارے دفتر تشریف لائے۔ میں موجود نہ تھا۔ پوچھا تو انہیں معلوم ہوا کہ کل سے طبیعت خراب ہے۔ اس لئے آج دفتر نہیں آئے۔ چنانچہ حکیم صاحب گھر پہنچے۔

جب حکیم صاحب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو ایک صاحبہ سیڑھیاں اُتر رہی تھیں۔ میرے پاس پہنچے تو پوچھا "کیا تکلیف ہے؟"

"دل گھبراتا ہے۔"

"یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔"

میں نے پریشان ہو کر پوچھا "کیوں؟"

"جب ایسی ایسی لڑکیوں سے تمہارا ملنا جلنا رہے گا۔ تو دل ٹھیک رہ ہی نہیں سکتا۔"

"حکیم صاحب وہ تو میری ———"

"میں خوب سمجھتا ہوں۔"

سفر میں ایک دوسرے کی اچھائیوں اور بُرائیوں کا حال خوب کھلتا ہے۔ ایک بار اور دوستوں کے ساتھ حکیم صاحب بھی میرے ہم سفر تھے یا یہ کہ میں ان کا ہمسفر تھا اور ہمارے پاؤں کے نیچے زمین تھی مشرقی پاکستان کی!

سفر میں، حکیم صاحب اتنے اچھے ساتھی ثابت ہوئے کہ لُطف آ گیا۔ جب ساتھیوں میں سے کوئی منہ بسور کے الگ پڑا ہوتا تو حکیم صاحب اپنے تجربات و مشاہدات کے ایسے ایسے واقعات سنانے شروع کر دیتے کہ لطف آ جاتا۔ وقتی بدمزگی کے سارے آثار اُڑن چھو ہو جاتے۔ سب قریب قریب ہو کر بیٹھ جاتے۔

اس سفر ہی کے دوران ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ حکیم صاحب اپنے زمانے میں قیامت تھے۔ جوانی کی کٹھک سے لے کر جوانی کی ڈھلک تک ڈرانہ چلے۔ عورت کی نفسیات اور اس سے لطف اندوز ہونے کے ایسے راز اور ایسے واقعات سنائے کہ مولانا رازق الخیری ایسے ادھیڑ بھی جوان ہو اُٹھے۔ بھرم رکھنے کو مولانا ساتھ ساتھ لاحول ولا قوۃ بھی کہتے جاتے تھے۔ مگر واقعاتِ گرم سُن رہے تھے پوری دلچسپی کے ساتھ، بلکہ ایک حد تک خضوع و خشوع کے ساتھ! سر ہلا ہلا کر اور ہر ٹیپ کے مصرع" پہ لاحول ولا قوۃ!

بے تکلف دوستوں اور بے تکلف سہیلیوں کی محفلیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ خدا ان سے "نہ" بچائے۔ کیونکہ یہ بناوٹ کے پردے چاک کر دیتی ہیں اور ستھرے ستھرے آدمی کو سامنے لے آتی ہیں۔

پھر گناہ، سارے گناہ نہیں ہوتے۔ کچھ معصوم گناہ بھی ہوتے ہیں۔ جن پر قدرت کو بھی پیار آ سکتا ہے اور پھر تھکی ہوئی زندگی میں، بجھی ہوئی دھنک کی کروٹ جرم ہے تو کیوں؟ یہ میں کس سے پوچھوں؟

مولانا رازق الخیری کی طرح، مجھے بھی یہاں لاحول ولا قوۃ پڑھ لینا چاہیئے اس کے بعد کہنا چاہیئے جوانی سب کی دیوانی ہوتی ہے مگر ان کی جوانی کچھ زیادہ ہی دیوانی تھی۔ یہ بڑے کھرے آدمی ہیں۔ تقدس کا لبادہ اوڑھ کے انھیں بزرگ بننا نہیں آتا۔ بلکہ صاف گوئی اور بیلے باکی ان کی کمزوریاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قریبی دوستوں کو، ان کا کچا چٹھا بھی معلوم ہے مگر میں کیا کروں؟ کیسے وہ باتیں لکھوں جنھیں اصولاً مجھے لکھنا چاہیئے۔ اگر لکھنا نہیں چاہیئے تو نظر انداز بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ بعض نستعلیق قسم کے بزرگ مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں زندگی کے اس باب کو گول مول کر جایا کروں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ شخصیت نگاری میرے نزدیک اس مکمل چہرے کی مانند ہے۔ جس کے کان، ناک، منہ اور آنکھیں ہوتی ہیں۔ اگر میں کسی شخصیت کا کوئی پہلو چھپاتا ہوں تو میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس شخصیت کی ناک کاٹ ڈالی۔ یا اس کے کان کاٹ ڈالے۔

میں یہاں سچ کی زد میں تو آ گیا ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اب یہاں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟

سوچتے سوچتے ذہن ابوالکلام کے تذکرے کی طرف جا نکلا۔ دیکھئے مولانا نے اپنی جوانی کے بارے میں کیا خوب لکھا:

"ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اس رندی و ہوسناکی کی تردامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو عین اکیس بائیس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے۔ کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں۔ ولولوں، امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے۔ جب کہیں جا کر اس کوچے میں دم لے سکے۔ جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے"

حکیم صاحب ابوالکلام نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے قلم میں اتنا بوتا ہے کہ میں تلمیحات اور استعاروں میں واقعات کو ڈبو سکوں۔ اس لئے سوئی ہوئی راتوں کو کون جگائے؟

میں لکھنے کو تو یہاں سب کچھ لکھ دوں۔ مگر ڈر ہے تو یہ کہ یہ ذکرِ جمیل طول بہت کھینچے گا۔ کم از کم بھی سو پچاس صفحات ممکن ہے کہ آپ اس کے لئے بھی تیار ہو جائیں مگر میں اس کے لئے تیار نہیں۔ کھٹکتی باتیں، صاحبِ تذکرہ ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ "اہلِ حیا" کے لئے واجب ہے کہ وہ اس ضمن میں، اگر اشاروں سے کام چلا سکیں تو دریغ نہ کریں۔ اس لئے یہاں میں بھی صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ ابوالکلام کی جوانی کو، حکیم صاحب کی جوانی کا دیباچہ سمجھیں۔

نیرنگِ خیال نے گھان کے گھان ادیب بنا ڈالے۔ اس میدان میں بھی ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہاں صرف ایک مثال دوں گا۔ صرف ایک مثال!

غلام عباس جو اُردو کے بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ آٹھویں جماعت پاس کر کے، نیرنگِ خیال کے دفتر میں آنے جانے لگے تھے۔ حکیم صاحب نے دیکھا کہ لڑکا محنتی ہے۔ اس لئے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ لہٰذا ہم غلام عباس کی تحریروں کی تراش خراش میں لگ گئے۔ "چینک کوئی بھی ہو۔ خراج ضرور وصول کرتی ہے"

اُن دنوں ادب پاروں کا رواج تھا۔ سبھی انگریزی کے اچھے اچھے ادب پاروں کو اُردو میں منتقل کرنے کو ہی بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔

بقول حکیم صاحب، غلام عباس اس وقت انگریزی میں معمولی شُدبُد رکھتے تھے۔ بعد میں چھوٹے موٹے امتحان دیئے ہوں گے مگر اُن دنوں آٹھویں جماعت ہی کے طالب علم تھے۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اُن دنوں میں نے جب بھی انہیں کسی ادب پارے کے ترجمے کے لئے کہا تو انہوں نے ڈکشنری سامنے رکھ لی۔ پہلے تمام مشکل الفاظ کے معنی لکھ لئے۔ پھر ایک جملے کے ترجمے کی کوشش کی۔ اس طرح ایک ایک جملے کو کئی کئی طرح سے لکھا۔ یوں وہ ایک چھوٹے سے ادب پارہ کو ہفتوں میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہم میں سے کسی کو دکھاتے تھے۔ اس پر اصلاح ہوتی تھی، تب وہ کہیں جا کر چھپتا تھا۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ ہم لوگ اتنی ریاضت ایک ادیب کو بنانے اور سنوارنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ جب یہ واقعہ حکیم صاحب بیان کر چکے تو ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے تان یہاں پر توڑی "آج اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ غلام عباس کو صدرِ مملکت نے اپنی کتاب کے ترجمے کے لئے چُنا۔ حالانکہ اس ملک میں ایک سے ایک پڑھا لکھا پڑا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پڑے ہیں۔"

تھوڑی دیر رک کر حکیم صاحب پھر گویا ہوئے "میں صرف زبانی حوصلہ افزائی نہیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ روپے پیسے سے بھی دل بڑھایا کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے بیس روپے غلام عباس کی والدہ کو جا کر دیئے تھے اور یہ کہا تھا کہ یہ غلام عباس کے ایک مضمون کا انعام ہے۔ اس وقت میرے ساتھ تاثیر مرحوم بھی تھے۔"

یہ جوہر شناس تو تھے ہی، انہوں نے جب عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں میں ندرت دیکھی۔ فن پایا تو انہوں نے سوچا، چغتائی صاحب کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ تشہیر کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ آئندہ کارہائے نمایاں انجام دے سکیں۔ چنانچہ انہوں نے چغتائی صاحب کی نہ صرف تصویریں چھاپیں بلکہ اُن پر مضامین بھی چھاپے۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ جب چغتائی صاحب کے فن کی زیادہ دھوم نہ تھی۔ بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو ان کی تصویروں کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے یہ تصویریں کیا ہیں! کچھ بھی نہیں!

جب نیرنگِ خیال میں مسلسل مضمون نکلنے لگے۔ تصویریں چھپنے لگیں تو اس وقت کے ایک رسالہ "الکمال" کے ایڈیٹر نازش نیوی نے چغتائی صاحب کی تصویروں کے خلاف اپنے پرچے میں مضمون چھاپا۔ جس میں یہ لکھا کہ چغتائی کو مصوّر کون کہتا ہے؟ تصویر کی تعریف یہ ہے

کہ انسان اُسے دیکھ کر مبہوت ہو جائے۔ چغتائی کی تصویریں صرف بچوں کو ڈرانے کے کام آ سکتی ہیں۔ آنکھیں ایسی جیسے بٹن، انگلیاں ایسی جیسے بھنڈیاں، چہرہ ایسا جیسے طباق!

جب "الکمال" میں ایسا مضمون نکلا تو حکیم صاحب کو فکر ہوئی۔ انہوں نے سوچا کہ بجائے اس کے کہ "الکمال" کے مضمون کے خلاف لکھا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ مضمون نگار سے ملا جائے۔

نازش صاحب نے مجھے بتایا:۔

حکیم صاحب مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے آئے۔ فرمایا: "یہ آپ نے چغتائی کے خلاف کیا لکھ دیا؟"

"جو محسوس کیا، وہ لکھا۔"

"آپ جس انداز کی مصوری کے دلدادہ ہیں۔ وہ مصوری نہیں فوٹو گرافی ہے۔"

"میں تو مصوری کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ مصوری ایک ایسی شراب ہے۔ جو آنکھوں کے رستے پی جاتی ہے۔"

"جس طرح شاعر، نئے اندازِ فکر کو اپناتا ہے کہ اس کی انفرادیت ظاہر ہو۔ اُسی طرح اس مصور نے اپنی تصویروں میں لکیر کا فقیر بننے کی بجائے اپنا الگ راستہ تلاش کیا ہے۔"

"نیا پن وہی بھلا ہو تا گوارِ خاطر نہ ہو۔"

"مجھے بڑی حیرت ہے کہ آپ کو ان تصویروں میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔"

"جی ہاں میرا یہی خیال ہے۔"

نازش صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد حکیم صاحب چلے گئے۔ دو تین مہینوں کے بعد پھر ملے تو کہنے لگے۔ "نازش صاحب مجھے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ہمارے ہاں آ سکیں گے؟"

"میں تو ایک جگہ کام کر رہا ہوں۔"

"وہاں سے چھوڑ دیجئے۔ میں آپ کو دس روپے زیادہ دوں گا۔"

چنانچہ میں نے وہاں سے کام چھوڑ دیا۔ نیرنگ خیال میں آ گیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ نیرنگِ خیال میں جاؤں گا تو ادبی ذوق کو تسکین ملے گی۔ میرے مضمون چھپیں گے مگر مجھے حکیم صاحب نے کبھی بھی کسی چیز کے دینے کے لئے نہ کہا۔ میں حیران تھا۔ ایک دن پوچھ ہی لیا:۔ جناب میں بھی مضمون لکھ سکتا ہوں۔ غزلیں کہتا ہوں۔ ایک سال ہو گیا ہے۔ آپ نے مجھ سے سوائے پروف ریڈنگ کے کبھی کچھ کہا ہی نہیں، آخر کیوں؟"

"ہمیں ضرورت نہیں۔"

"پھر مجھے بلایا کیوں تھا؟"

"صرف اس لئے کہ تم چغتائی کے خلاف نہ لکھ سکو۔"

نازش صاحب کہتے ہیں - اُس وقت تو مجھے بڑا غصہ آیا - پی گیا - خاموش رہا - آج جب مجھے وہ بات یاد آتی ہے تو حکیم صاحب پر بڑا پیار آتا ہے - صرف اس بات کی خاطر کہ میں چغتائی صاحب کے بارے میں کچھ نہ لکھوں - انہوں نے مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لیا تھا -

واقعی کسی فن کار کے ساتھ اس حد تک مخلص ہونا حکیم صاحب ہی کا حصہ ہے - بے شک چغتائی اپنی صلاحیتوں ہی سے آگے بڑھے - اگر چغتائی کے فن میں جان نہ ہوتی تو حکیم صاحب کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے - مگر فن کی پرکھ، پھر فن کار سے اس حد تک محبت انہی کا حصہ ہے -

مجھے یہاں ڈاکٹر اقبال کا وہ واقعہ یاد آ گیا کہ جب علامہ اقبال نے (ابتدا ہی میں) شاعری ترک[1] کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تو سر عبدالقادر نے کہا تھا " اقبال ایسا ظلم نہ کرنا، تمہاری شاعری کی مسلمانوں کو ضرورت ہے "

اگر اس وقت سر عبدالقادر بھی اقبال کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تو آج علامہ اقبال کے نام سے، شاید ہم واقف ہی نہ ہوتے بلکہ اُسی طرح اگر الکمال کے ایڈیٹر کی طرح کے لوگ چغتائی صاحب کے پیچھے پڑ جاتے اور انہیں کوئی حکیم یوسف حسن نہ ملتا تو ہو سکتا تھا کہ چغتائی صاحب بھی بددل ہو کر اپنا راستہ بدل لیتے -

حکیم صاحب نے بتایا کہ پہلے پہل عظیم بیگ چغتائی کی " شریر بیوی " قسط وار نیرنگِ خیال میں چھپی تھی - اس سے پہلے عظیم بیگ کو زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے یا یہ کہ زیادہ شہرت نہ تھی -

شریر بیوی کی دو چار قسطیں چھپی ہوں گی کہ دھوم مچ گئی - خود چغتائی صاحب نے مجھے لکھا کہ " میں اس سے پہلے ہندوستان کے کئی پرچوں میں لکھتا تھا - مجھے کسی نے نہ جانا - میں نے نیرنگِ خیال میں لکھا تو سب نے جان لیا "

شریر بیوی کی اشاعت سے پہلے حال یہ تھا کہ عظیم بیگ چغتائی کے مضامین عدم اشاعت کی بنا پر واپس بھی آ جایا کرتے تھے - جو یہ مدیران کرام کے ریمارکس ہوتے تھے کہ " معیار کے مطابق نہیں " - یوں تیرہ مضامین واپس آ چکے تھے - یہ واقعہ جب عظیم بیگ نے حکیم صاحب کو بتلایا تو حکیم صاحب نے لکھا " وہ سارے مضامین مجھے بھیج دیں "

مضمون آ گئے تو انہوں نے انہیں پڑھا - تین مضامین نیرنگِ خیال کے لئے رکھ لئے - باقی دس مضمونوں کے بارے میں چغتائی صاحب کو لکھ دیا کہ فلاں فلاں رسالے کو بھیج دیجئے - چھپ جائیں گے - انہوں نے مضامین کے معیار اور رسائل کے مدیران کے رجحان کو سامنے رکھتے ہوئے وہ رائے قائم کی تھی - ان کی ریڈنگ صحیح نکلی اور وہ سارے ہی مضامین مختلف رسالوں میں چھپ گئے - چغتائی صاحب بڑے حیران ہوئے - انہوں نے انہیں لکھا " صاحب مان گیا -

انہوں نے یہ بھی بتایا " شوکت تھانوی بھی ادھر اُدھر لکھا کرتے تھے - شگفتہ نگاری کی حیثیت سے پڑھے ضرور جاتے تھے مگر جو شہرت انہیں نیرنگِ خیال نے دی - وہ انہیں کسی اور طرح نہ مل سکتی "

---

[1] اقبال ہی کا یہ شعر ہے :-

توبہ کر لی ہے شعر گوئی سے
اس کی قیمت پڑی نہ اک پائی

"وہ کیسے؟"

کہنے لگے "لوگوں نے شوکت تھانوی کو سودیشی ریل کی وجہ سے پہچانا۔ وہ مضمون پہلے پہل نیرنگِ خیال میں چھپا تھا اور میں نے شوکت صاحب سے مضمون کی اشاعت سے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ اس مضمون کی اشاعت سے آپ آسمان پر پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ میرا اندازہ صحیح نکلا۔"

میں نے پوچھا "کیا وہ مضمون آپ نے لکھوایا تھا۔ جو آپ اتنا اینٹھ رہے ہیں؟"

"ہاں! میں لکھنؤ گیا تھا۔ شوکت سے مضمون لکھنے کو کہا۔ انہوں نے مجھے دو تین پلاٹ سنائے، رائے پوچھی "کس موضوع پر لکھوں؟" میں نے سودیشی ریل کے موضوع کو پسند کیا تھا۔ پھر دُون کی لی۔ اگر کوئی ایڈیٹر یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ ہمیں کس قسم کے مضمونوں کی ضرورت ہے تو وہ ایڈیٹر بننے کے قابل نہیں۔ ایڈیٹر کا کام یہ ہے کہ وہ باصلاحیت لکھنے والوں کو تحت الثریٰ سے اٹھائیں اور آسمان پر پہنچا دیں۔"

حکیم صاحب نے بتایا کہ جب میرے پرچے کو بے اندازہ مقبولیت ہوئی تو ساتھیوں نے سوچا کہ پرچہ تو ہماری وجہ سے، اس مقام پر پہنچا ہے اور حکیم یوسف حسن ہے کہ ہمیں لفٹ ہی نہیں دیتا۔ کیوں نہ اس کا مزاج درست کر دیا جائے۔"

"چنانچہ میرا مزاج درست کرنے کے لئے انہوں نے "کاروان" نکالا۔ چغتائی صاحب کو گانٹھا۔ مجید ملک اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مددگاروں میں تاثیر، پطرس، غلام عباس، قاضی عبدالغفار، سبھی نے ادارۂ "کاروان" کا ساتھ دیا۔ پرچہ بے شک اچھا نکلا۔ مگر انجام کیا ہوا۔ صرف دو پرچے نکلے۔ جذبہ غلط تھا۔ پروان کیسے چڑھتا۔

"جب "کاروان" کے لئے ابتدائی کوششیں جاری تھیں تو انہی دنوں مجھ سے کہلوایا گیا تھا کہ حکیم صاحب اب اپنی خیر منائیں۔ ادھر "کاروان" نکلے گا۔ اُدھر "نیرنگِ خیال" راستے سے ہٹ جائے گا۔

پھر انہوں نے بتایا کہ ایک ایسا ہی بھرپور وار تاجور نجیب آبادی نے بھی کیا تھا۔ انہوں نے "شاہکار" نکالا۔ بڑے ٹھاٹھ سے نکالا۔ تاجور کے پاس اُس وقت کوئی تیس چالیس ہزار روپیہ تھا۔ انہوں نے بہت بڑا اسٹاف رکھا۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار کرائے پر دفتر لیا۔ مضمون نگاروں کو معقول رقم معاوضے میں دینے کا اعلان کیا۔ یہ زمانہ ۲۴-۱۹۲۳ء کا ہو گا۔ سبھی مضمون نگار اُدھر "ڈھل" (اُردو میں ریچ" کا لفظ، قدرے ہم معنی ہے) پڑے۔ پہلا پرچہ جو نکلا تو دھوم مچ گئی۔ نیرنگِ خیال سے سائز دوگنا، کاغذ سفید، ٹائیٹل تو رنگ کا، مضمون نگار اچھے، میں دم بخود رہ گیا۔ قیمت بھی لاگت اور دیگر اخراجات کے مقابلے میں کم رکھی۔ ہر طرف شاہکار ہی شاہکار کی دھوم، یہی وجہ تھی کہ تاجور صاحب آپے میں نہ رہے۔ جب میرے ایک دوست تاجور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے شاہکار کی تعریف کی۔ تعریف کے قابل جو تھا۔ میرے اُس دوست نے بتایا کہ میرے تعریفی کلمات کہنے پر تاجور صاحب کرسی سے اُٹھے۔ سیدھے کھڑے ہو کر جھکے اور اپنی انگشتِ شہادت کھڑی کر کے، زمین سے آسمان کی طرف کرکے اٹھتے ہوئے، بڑے ایکٹرانہ انداز میں پورے زور سے کہا — "مٹا دوں گا"!—

پرچہ دیکھا تھا۔ ایسی باتیں سُنیں۔ گھبرانے والی بات تھی مگر میں بالکل نہ گھبرایا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ اس ٹھاٹھ کا پرچہ سدا نہیں نکل سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس طرح کا پرچہ اور اتنے سرمائے سے، ایک سال تک نکالا جا سکتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس

پرچے کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پرچہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے پرچے کو بجائے بہتر بنانے کے اُسے ترقیِ معکوس کی طرف لڑھکایا۔ سائز چھوٹا کر دیا۔ صفحات کم کر دیے۔ ایک سال تک شاہکار خوب پڑھا۔ میرا پرچہ دبتا رہا۔ اُدھر واہ واہ، اِدھر ہے ہے!

میرے دوستوں نے کہا: "یہ کیا کر رہے ہو۔ لُٹیا ڈبو دی۔"

میں نے کہا: "چپ رہو۔"

میں نے اُن دنوں اپنا نعرہ "ری ٹریٹ" (RETREAT) یعنی پیچھے ہٹ جاؤ۔ بنا لیا۔

میرے خیر خواہ پوچھتے۔ "پرچے کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟"

میں کہتا: "ری ٹریٹ۔"

جب میں نے اندازہ لگا لیا کہ تاجور صاحب کا مال ختم ہو گیا ہے تو میں اپنے پروگرام کے مطابق مستعد ہو گیا۔ ایک دم بڑا سائز کر دیا۔ محنت کی۔ روپیہ خرچ کیا اور ایک ہی حملے میں شاہکار کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ اس کے بعد شاہکار پنپ نہ سکا اور نیرنگِ خیال نے پھر اپنا وہی سابقہ مقام حاصل کر لیا۔ پھر زندگی میں تاجور صاحب کی زبان سے کسی نے یہ نہ سُنا ——— مٹا دوں گا!

بالآخر انجام یہ ہوا کہ جس پرچے پر چالیس ہزار لگائے گئے تھے۔ اُسے چار سو میں بیچ کر گھر بیٹھنا پڑا۔ آغاز وہ، انجام یہ!

کہتے ہیں کہ نیرنگِ خیال کے عروج کے زمانے میں اتنے منی آرڈر آتے تھے۔ اتنے وی۔پی آتے تھے کہ گھنٹوں ہی فارموں پر دستخط کرتے گزر جایا کرتے تھے اور ہاتھ دستخط کرتے کرتے تھک جایا کرتے تھے۔ غرض دولت برستی تھی۔

جن دنوں کی یہ بات ہے اُن دنوں اور بھی کئی اچھے رسالے لاہور سے نکلا کرتے تھے۔ مثلاً عالمگیر، ہمایوں، شباب اُردو، ادبی دنیا وغیرہ! عالمگیر نے بڑی کوشش کی کہ نیرنگِ خیال کو نیچا دکھایا جاتے مگر ان کی آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔ گھٹیا قسم کی ادبی رقابتوں نے انھیں کچھ کر کے دکھلانے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ورنہ شاید یہ بھی ہمچو من دیگرے نیست کہہ کر لنگوٹ کھول دیتے۔

اتنے معرکوں کے ناخدا، حکیم صاحب آج بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ہیں: "اب جا کر ہار گیا ہوں۔ عمر نے ہرایا۔"

واقعی! بڑھاپا تمناؤں اور آرزوؤں کے خون کا نام ہے۔

میرے علم میں یہ تھا کہ حکیم صاحب نے صرف ایک رسالہ نیرنگِ خیال ہی نکالا تھا۔ معلوم ہوا کہ میری معلومات ناقص ہیں وہ ایک رسالے کے نہیں، اکٹھے سات رسالوں کے مدیر رہے۔ نہ صرف مدیر رہے بلکہ مالک بھی، بیک وقت دو دو تین تین پرچے ایڈٹ کئے۔ سبحان اللہ!

نام آپ بھی سُن لیں، نیرنگِ خیال، تازیانہ، بائیسکوپ، بیلئے، کامیابی، اسرارِ حکمت اور مخزنِ حکمت۔ ان میں کوئی ادبی پرچہ تھا، کوئی طبّی، کوئی صنعتی اور کوئی فلمی۔ یہ ہر طرف مار کرتے تھے۔ عجیب دماغ پایا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہر فن مولا کہا جاتا ہے۔ جو اپنی راہیں خود کاٹتے ہیں۔ جو اپنے رستے خود بناتے ہیں۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل کے بھی ادارتی فرائض انجام دیتے رہے جیسے الحکیم، ویش اوپکارک، حامیِ صحت، مسیح الملک؛

تندرستی، ان کے علاوہ ہفتہ وار سیاسی اخبار الخلیل بجنور (یو-پی) غرض اپنے شہر کے پرچوں کے علاوہ دوسرے شہروں کے پرچوں کے بھی ادارتی فرائض انجام دیتے رہے۔ پالیسی مرتب کرتے رہے۔ نوٹ وغیرہ لکھتے رہے۔ یہ سب سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ حکیم صاحب کس بلا کے انسان ہیں۔ کتنی انرجی تھی۔ کیا لگن تھی۔ کیا جنون تھا۔

اور ہاں یہ بھی تو سنیں :-

جن دنوں یہ لائل پور میں تھے۔ ریلوے میں گڈز کلرک "عمریا" بھی ان کی کچھ زیادہ نہ تھی، یہی کوئی اکیس بائیس برس ہو گی۔ اُن دنوں یہ سکھوں کے ایک اخبار 'خالصہ' میں بہ طور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرتے تھے۔ چونکہ سرکاری ملازم تھے۔ اس لئے اخبار پر ان کا نام تو نہ آتا تھا مگر کام اخبار پوری ذمہ داری کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ تنخواہ تھی پچاس روپے ماہوار، جو آج سے پچاس برس پہلے اچھی خاصی تنخواہ تھی۔

اس اخبار کے ایڈیٹر لال سنگھ ایم اے تھے اور مالک ہرچرن سنگھ، دونوں سے حکیم صاحب کی اچھی یاری تھی ملازم اور مالک والا رشتہ نہ تھا۔ بلکہ خوب گھٹتی تھی۔

لال سنگھ کے بارے میں حکیم صاحب کا خیال یہ ہے کہ وہ تھے بے شک ایم اے مگر تھے سکھ، اس لئے اپنی سادگی کی بنا پر جو جی میں آتا تھا۔ لکھ ڈالتے تھے۔ ایک سے ایک لطیفے ہوتے رہتے تھے۔

ہرچرن بڑے شریف آدمی تھے۔ بے حد ملنسار، من موہ لینے والے، مگر وہ کبھی کبھی ایسا لفظ بدل دیتے تھے کہ ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔

مثلاً ایک واقعہ سنو :-

جن دنوں میں اخبار میں کام کرتا تھا۔ انہی دنوں پنجاب کے گورنر لائل پور کے دورے پر آئے۔ ان کا کوئی خاص سواگت نہ ہوا۔ یہی بات لال سنگھ ایم اے کو لکھنا تھی۔ مگر لال سنگھ نے لکھا تو یہ کہ گورنر صاحب لائل پور سے ایسے گزر گئے جیسے ایک چپڑاسی گزر جاتا ہے۔"

اس فقرے پر اخبار کی ضمانت ہو گئی۔ تب ہرچرن سنگھ نے مجھ سے کہا۔ "یوسف صاحب آپ نے بھی نہ ٹوکا کہ لال سنگھ

لہ اور تصنیفات یہ :-

معلوماتی : مکمل معلومات ۴ ایڈیشن

جمالیات : صنفِ نازک ۶۰۰ صفحات

بیوٹی بک ۲۰۰ صفحات

طبی : طبِ مخفی ۶۵۰ صفحات تین ایڈیشن

صنعت اکبر ۳۰۰ " تین ایڈیشن

تاریخی : مصطفےٰ کمال ۱۶۰ صفحات

جنسی : دوشیزہ ۳۰۰ صفحات ۹ ایڈیشن

مجلسِ خلوت ۲۵۰ " ۷ ایڈیشن

جنسیات کی پہلی کتاب ۱۵۰ صفحات

سائنٹیفک برتھ کنٹرول ۱۶۰ صفحات

حفظانِ صحت : ہم کھائیں کیا ۲۰۰ صفحات

ادبی : سوسائٹی ۱۵۰ صفحات ۴ ایڈیشن

جام و مینا ۲۴۰ صفحات ۴ ایڈیشن

فرزانہ ۱۶۰ " ڈرامہ ۲ ایڈیشن

پنکھڑیاں ۱۲۰ "

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں ۱۵۰ صفحات ۲ ایڈیشن

یہ نہ لکھو۔"

"میں کیسے لکھوں سردار جی؟"

"جیسے لکھا جاتا ہے۔"

"جی اُس طرح تو لکھا تھا مگر لال سنگھ جی نے جواب دیا تھا، چپ رہو اس میں بڑا جھگڑا ہے۔"

"ان کے جھگڑے میں ہمارا پتّل ہو گیا۔"

یہ تھے ان کے ادارت کے قصے، پھر ادبی مقابلوں میں بھی شریک۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنا ہفت روزہ "توحید" نکالا تو اس میں اعلان یہ چھپا کہ اس سال جس کا سب سے اچھا مضمون ہوگا۔ اُسے ایک اشرفی انعام میں دی جائے گی۔ چنانچہ اُس سال اشرفی حکیم یوسف حسن کے حصے میں آئی۔ مضمون کا نام تھا: "فرانسیسی ڈیوک کا اکوتا لاڈلا" یہ واقعہ نیرنگِ خیال کی اشاعت سے بھی پہلے کا ہے۔

جب مولانا عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر نے زمیندار سے علیحدہ ہو کر اپنا اخبار "انقلاب" نکالا تو انہوں نے شروع دنوں ہی میں عید نمبر کا بھی اعلان کیا تھا۔ اُن میں اور مضمون نگاروں کے ساتھ حکیم صاحب کے بھی نام کا اعلان تھا کہ وہ بھی مضمون لکھیں گے۔

اِدھر خود حکیم صاحب نیرنگِ خیال کا عید نمبر چھاپ رہے تھے۔ بے حد مصروفیت تھی۔ انقلاب کے لئے مضمون نہ لکھ سکے۔ یہی اطلاع دینے دفتر انقلاب پہنچے کہ میری معذرت قبول کر لی جائے۔

سالک صاحب نے کہا: "اگر آپ کے نام کا اعلان نہ کیا ہوتا تو بات ٹل سکتی تھی۔ موجودہ صورت میں معذرت قبول نہیں کی جائے گی بلکہ آپ اُس وقت تک دفتر انقلاب سے جا بھی نہیں سکتے۔ جب تک کہ مضمون لکھ کر نہ دے جائیں۔"

چنانچہ حکیم صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے، بغیر کتابوں کی مدد کے ایک مضمون لکھا "حربی سیاست" جس میں دنیا کے تمام ممالک کی حربی سیاست پر بحث تھی۔ موضوع ادق تھا۔ کتابیں بھی موجود نہ تھیں مگر اس مضمون کو سالک صاحب نے بھی پسند کیا اور قارئین انقلاب نے بھی، اس واقعہ کا ذکر خود سالک صاحب نے انقلاب کے اُس عید نمبر میں بھی کیا تھا۔ حاضر دماغی کی بھی حد ہو گئی۔ جادو وہی جو سر پہ چڑھ کر بولے!

حکیم صاحب کہتے ہیں۔ "لوگ سمجھتے ہیں کہ پرچہ چھاپنا معمولی کام ہے۔ مضمون حاصل کرنا معمولی بات ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ وزیر بن جانا آسان ہے مگر اچھا پرچہ چھاپنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔"

حکیم صاحب مضمون حاصل کرنے کے لئے، پورے ہندوستان کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ادیبوں سے ذاتی تعلقات بنایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا مثلاً دلی، لکھنؤ، حیدر آباد، بمبئی، کلکتہ، رام پور، علی گڑھ، مدراس۔ غرض ہر جگہ پہنچے پھر خط و کتابت کا لامتناہی سلسلہ! کرب ہی کرب والا مسئلہ!

کہنے لگے کہ لاہور میں بیٹھے ہوئے بھی، لاہور سے کسی اچھے مضمون کا حاصل کرنا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ میں نے ایک مضمون حاصل کرنے کے لئے سید امتیاز علی تاج کے ہاں اٹھائیس چکر لگائے تھے۔ تب جا کر ایک مضمون ملا تھا۔

نہ تو امتیاز علی تاج کو رحم آیا کہ حکیم صاحب اتنی بار آئے ہیں نہ میں نے یہ سوچا کہ میں ایک اتنے بڑے رسالے کا ایڈیٹر ہوں

اس لئے کیوں اپنی جوتیاں گھساؤں۔ غرض جو مضمون جس طرح ملا اُسے حاصل کیا۔ روپے اور وقت کے زیاں میں کوئی ایڈیٹر پڑے گا تو وہ اچھا پرچہ چھاپ نہ سکے گا۔ رسالہ کا تو مطالبہ ہی یہ ہے کہ دولت برباد کرو۔ وقت ضائع کرو۔ غرض رسالہ ایک ایسا ر اکشش ہے۔ جس کے حضور وقت بھی بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے اور دولت بھی جو جتنی زیادہ قربانی دے گا۔ راکشش اس سے اتنا ہی خوش ہوگا۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ چچا چھکن نیرنگِ خیال میں مسلسل چھپتا رہا ہے اور وہ مضامین ایسی ہی تگ و دو کے بعد حاصل کر کے چھاپے گئے تھے۔ اگر میں ہمت ہار بیٹھتا تو بہت ممکن تھا کہ یہ کردار اُردو ادب کے سامنے آ ہی نہ سکتا۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ ایسے مضامین لکھنے کا مشورہ میں نے ہی تاج صاحب کو دیا تھا۔ انگریزی کی کتابیں[1] لا کر دی تھی پھر میں نے اپنے رسالے میں، ایک انگریزی رسالے سے نقل کر کے ایک تصویر چھاپی تھی۔ اُس میں چچا چھکن تصویر ٹانک رہے تھے۔ یہ وہ سارے عوامل تھے۔ جنھوں نے مل کر تاج صاحب سے ایسی شان دار چیز لکھوائی تھی۔

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ میں چاہتا تھا کہ کوئی بڑا شاعر جنگ اور جہاد کے موضوع پر، ساری اسلامی لڑائیوں کو نظم کر دے۔ یہ خیال انھیں اس لئے پیدا ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے پرچے میں ایک نظم فتح قسطنطنیہ[2] چھاپی تھی۔ جو پسند کی گئی تھی۔

انہوں نے یہ بات کئی شاعروں سے کہی کہ اسلامی فتوحات پر، جوش اور ولولے سے مملو، جو آری زبان میں نظمیں لکھی جائیں تاکہ مسلمان سوتے سے بیدار ہوں۔ اپنی اس اسکیم کا ذکر ابوالاثر حفیظ جالندھری سے بھی کیا۔ انھوں نے اس پر سوچا، مزید سوچا۔ تب اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اسلامی تاریخ کو نظم کرنا چاہئے۔ اس طرح جنگ نامہ اسلام تو نہ چھپا مگر شاہنامہ اسلام چھپ گیا یوں چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی والی بات ہو گئی۔

میں بڑا حیران ہوں ہیلے کے خطوط انہوں نے پیش کئے۔ اگر یہ ہمت نہ کرتے تو شاید چھپتے ہی نہیں۔ شریر بیوی انہوں نے لکھوائی اور چھاپی۔ سودیشی ریل کا سہرا بھی انہی کے سر بندھتا ہے۔ پطرس کے مضامین بھی نیرنگِ خیال میں چھپ کر بامِ عروج تک پہنچے۔ چچا چھکن کا بھی کریڈٹ یہ لے رہے ہیں۔ شاہ نامہ اسلام کے بھی محرک یہی بنے۔

تھوڑا بہت ان واقعات میں مبالغہ ہو سکتا ہے۔ دس بیس فیصد، مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اگر اُردو ادب کو حکیم یوسف حسن نہ ملتے تو ان میں سے بیشتر شاہکار منظر عام پر نہ آ سکتے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو اُردو ادب جتنا شاداب اب نظر آتا ہے۔ اتنا کبھی نظر نہ آتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک حکیم صاحب اُردو ادب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس لئے انھیں اگر اکیس توپوں کی سلامی بھی دی جائے تو وہ کم ہوگی۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم، جو ایک دوسری "دف" (فریق) کے آدمی تھے۔ وہ بھی حکیم صاحب کی صلاحیتوں کا اقرار کرتے تھے۔ سچ ہے کہ دقتِ گزراں کے ساتھ واقعات کی صداقت کچھ نکھر جاتی ہے۔ ماند نہیں پڑتی:

"نیرنگِ خیال ایسا رسالہ نکلا کہ اس نے ہمارے ادبی رسالوں کی روش بدل ڈالی۔ حکیم یوسف حسن صاحب نے ایک نئی بات یہ کی کہ پرچے

---

[1] چچا چھکن کے دیباچہ میں خود امتیاز صاحب نے لکھا ہے۔ ماخوذ "جیروم کے جیروم"

[2] نظم نگار تھے سید طالب علی عابد الہ آبادی۔

کی ظاہری خوبیوں کی طرف بھی توجہ دی۔ نیرنگِ خیال سے پہلے رسالوں کے ٹائیٹل بالکل سیدھے سادے ہوتے تھے۔ رسالے کا نام اور ایڈیٹر کا نام بس! حکیم صاحب نے طرح طرح کے ڈیزائن بنوا کر کئی کئی رنگ میں بلاک کی چھپائی شروع کی۔ مضامین لکھنے کے لئے انھیں لاہور کے چند اچھے لکھنے والے مستقلاً مل گئے تھے۔ یہی حضرات بعض میں "نیاز مندانِ لاہور" بن گئے سالک، امتیاز، پطرس، ہری چند اختر، تاثیر اور ایم اسلم کے مضامین نے نیرنگِ خیال کو ایکدم اچھال دیا۔ جب اس کی ساکھ بن گئی تو ہندوستان کے تمام اچھے لکھنے والوں کے مضامین بھی نیرنگِ خیال میں آنے لگے۔ دوسری تبدیلی حکیم صاحب نے یہ کی کہ نیرنگِ خیال کا سائز عام رسالوں سے بڑا کر دیا۔ تیسری اور سب سے بڑی تبدیلی جسے انقلاب کہنا چاہیے یہ کی کہ نیرنگِ خیال کے خاص نمبر اور سالنامے شائع کرنے شروع کر دیئے۔ عام روش سے بچنے کے لئے حکیم صاحب نے نیرنگِ خیال کے خاص نمبروں کا سائز بڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کا ایک خاص نمبر گز بھر لمبا بھی نکلا تھا۔ آسکر وائیلڈ کی تمثیل سلومی کا ترجمہ ڈاکٹر تاثیر کا کیا ہوا اسی خاص نمبر میں چھپا تھا۔ ان کے ہر خاص نمبر میں ایک نہ ایک معرکے کا مضمون ضرور ہوتا تھا۔ مثلاً ایک میں شوکت تھانوی کا مضمون سودیشی ریل چھپا تھا۔ دوسرے میں عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ مضمون "انگوٹھی کی مصیبت"، تیسرے میں قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" ان مضامین کی اشاعت سے نیرنگِ خیال کو شہرت ہوئی اور نیرنگِ خیال کے ذریعے ان مضمون نگاروں کو شہرت ملی۔ حکیم یوسف حسن کو ہماری برادری میں مجتہد کا درجہ حاصل ہے مگر افسوس کہ ادب کے اتنے بڑے خدمت گزار اور محسن کو زمانے کی گردشوں نے ماضی کے دھندلکوں میں محو کر دیا اور ناقدری نے اس عالمِ ضعیفی میں ملازمت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے مگر اس ناداری میں بھی جفاکفا کر کے حکیم صاحب نیرنگِ خیال شائع کر رہے ہیں۔ یہ انہی کی ہمت ہے[۱]۔"

میں نے جن باتوں کا اوپر ذکر کیا تھا کہ حکیم صاحب نے اردو ادب کو بڑی نادر قسم کی تخلیقات سے مزین کیا تھا اور یہ بھی کہ کئی بڑے بڑے مصنفوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا تھا۔ تو وہ کوئی غلط نہ کہا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے بھی تصدیق کر دی۔ تصدیق تو واقعی وہ ہوتی ہے جو اہلِ زبان کریں۔ ہمارا کیا ہے۔

یہ تو اردو کے لئے مرتے رہے۔ تن من دھن نچھاور کرتے رہے مگر کچھ بد باطن ایسے بھی تھے جنہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ حکیم صاحب کیا ہیں۔ لوگ مضمون بھیج دیتے ہیں اور یہ چھاپ دیتے ہیں تو انھیں بڑا غصہ آیا۔ غصے والی بات بھی تھی۔ اس لئے کہ پرچہ چھاپنا اتنا ہی آسان ہوتا تو اور حضرات بھی نیرنگِ خیال قسم کے پرچے نکال بیٹھتے۔ چونکہ اچھا پرچہ چھاپنے کے لئے کسی حکیم یوسف حسن ایسے ہی باہوش، باتدبیر اور صاحبِ قلم کی ضرورت تھی۔ اس لئے کوئی بھی ایسا پرچہ نہ نکال سکا۔ چونکہ غلط باتیں کرنا، حوصلہ شکنی کرنا، ہمارا قومی شعار بنتا جا رہا ہے۔ سو وہ ہم لوگ انجام دیتے رہتے ہیں۔ جزاک اللہ!

غصے میں آ کر انہوں نے یہ سوچا کہ مجھے ایسے نمبر نکالنے چاہئیں، جس میں صرف حکیم یوسف حسن ہی یوسف حسن ہو۔ چنانچہ انہوں نے نیرنگِ خیال کے "تین ایڈیٹر نمبر" نکال ڈالے جس میں صرف حکیم صاحب ہی نے مضامین لکھے اور کسی کی ایک سطر بھی نہ تھی۔ ممکن ہے کہ حکیم صاحب کا خیال یہ ہو کہ خطۂ عاقلاں کے بسنے والوں کو تھوڑی سی عقل بانٹ دی جائے!

---

[۱] نقوش، لاہور نمبر

نہیں صاحب! اوروں کی بھی چند سطریں تھیں جو میں نے ایک ایڈیٹر نمبر میں بطور تعارف دیکھی تھیں۔ سید امتیاز علی تاج نے لکھا تھا:-

"میں نے ایڈیٹر نمبر کے تمام مضامین ذوق و شوق سے پڑھے ہیں اور ان کے مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اس نمبر کے مختلف موضوع بڑی خوش مذاقی سے جمع کئے گئے ہیں اور حکیم صاحب نے اپنے مخصوص و مقبول انداز میں ان پر دل آویز مضامین تحریر فرمائے تھے۔ شاعری اور مصوری کی کمی انتخاب درج کر کے پوری کر دی گئی ہے۔ اس طرح حکیم صاحب نے خریداران نیرنگِ خیال کی ضیافت طبع کے لئے دسترخوان بچھایا ہے کہ اس کے پُر لطف ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر حکیم صاحب کی یہ جدت مقبول ہوئی اور انہوں نے اس طرح زیادہ ایڈیٹر نمبر شائع کرنے شروع کر دیئے اور دوسرے رسائل کے لئے بھی ان کی تقلید کرنے کے سوا چارہ نہ رہا تو ہم مضمون نگار، یوسفِ بے کارواں ہو کر رہ جائیں گے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لکھا تھا:-

"نیرنگِ خیال کی کامیابی کی وجہ یہی ہے کہ اس کا ایڈیٹر مبض شناس ہی نہیں۔ خود اہل و ردیف سے ہے۔ قارئین نیرنگ خیال کو اپنے مضامین سے بھی خوش کر سکتا ہے اور ان کی پسند کا انتخاب بھی کر سکتا ہے۔

حکیم یوسف حسن محض ادبی اشغال میں منہمک نہیں رہے بلکہ سیاسی اور معاشرتی اصلاح کے لئے بھی کوشاں رہے۔ ان کا ہفتہ وار "تازیانہ" اس قسم کی سرگرمیوں کا آئینہ دار تھا۔ ۱۹۲۰ء کا نقشہ بھی اسی قبیل سے ہے اور قارئین کے تخیل کے لئے تازیانہ کا کام دے گا۔ ہر ایک کو نئی نئی باتیں سجھائے گا۔ اس میں قوم پرست، تیعت پرست، انقلابی ہر ایک سیاسی جماعت کے لئے کافی سامان غور و فکر ہے۔ ہنسی ہنسی میں بڑے پتے کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ سیاسیات، ظرافت، افسانہ، ڈراما، تنقید غرض ——— ہر فن میں [illegible] ۔ مجھے کیا نہیں آتا ——— کے پورے پورے مصداق ہیں"

نیرنگِ خیال، جولائی ۱۹۳۰ء

معلوم ہوا کہ ضد میں آ کر یہ ایڈیٹر نمبر کی وبا حکیم صاحب ہی نے پھیلائی تھی۔ جس کی بعد میں تقلید نیاز فتحپوری نے بھی کی۔

یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم کسی کی صلاحیتوں کا اقرار کریں، اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ ہم اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح ٹانگ گھسیٹیں، کس طرح پریشان کریں تُف ہے ایسے افراد پر۔ ایسے ذہنوں پر کہ ہم اشرف المخلوقات میں [illegible] ہیں اور حال یہ ہے کہ بخل کے اس مقام پر ہیں کہ جہاں ایک انسان کو، دوسرے انسان میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ وہ دور اگرچہ تیس چالیس برس پہلے کا تھا۔ مگر ذہنیتوں میں فرق آج بھی نہیں پڑا۔ برائیوں میں بے شرم تھے۔ بے شرم ہیں: خوف خدا نہ تھا۔ [illegible] ہے۔

حکیم صاحب کا نیرنگ خیال کے ساتھ ساتھ "تازیانہ" جیسا بلند پایہ ہفت روزہ اخبار بھی چالو تھا۔ میں نے "تازیانہ" کے پرچے دیکھے ہیں۔ خوب ہیں۔ وہ پرچہ خالصتاً ادبی نہ تھا۔ نیم سیاسی اور نیم ادبی قسم کا پرچہ تھا۔ پانچ برس تک تو ہفت روزہ کی صورت میں نکلا اور دو برس تک ماہانہ۔ اخبار کی ساخت کے سترا سی صفحات پر، جس کی اہمیت کو آج بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر حکیم صاحب یہی پرچہ نکالتے اور کچھ نہ کرتے تو بھی ایک دیانت دار ادبی مورخ کو ان کا نام احترام سے لینا پڑتا۔ چونکہ ادب کے ["ادب" کے اوپر حاشیے کا نشان: ؎] وادی میں کم کشش لوگ بستے ہیں۔ [illegible]

؎ زیادہ پڑھے لکھے لوگ وادی کو مذکر لکھتے ہیں۔

لئے تازیانے کو کون پوچھے گا۔ جب کہ نیرنگ خیال کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔

آپ کہیں گے پوچھتے کیوں نہیں۔ ہم تو اس کا نام سنتے ہی گردن جھکا لیتے ہیں۔ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں۔ حکیم صاحب کو اس جانکاہی کا ملا کیا؟ یہی نا کہ اس عمر میں بھی حالات کے ہاتھوں اپنی روزی آپ کمانے پر مجبور ہیں۔ ورنہ بھوکے مر جاتے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ چاہے اسے اوڑھ لیں۔ چاہے بچھالیں۔ چاہے کفن کے لئے رکھ لیں۔

کچھ ایسی ہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر، میں نے نقوش کا ایک اداریہ بھی لکھا تھا:

پچھلے شمارے میں، میں نے مرحوم رسالوں کا ذکر کیا تھا۔ آج ایک زندہ رسالے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو عوام اور حکومت کی سرد مہری کی بنا پر مرحوم بننے کا فخر حاصل کرنے والا ہے۔ میری مراد نیرنگ خیال سے ہے:

وہ نیرنگ خیال جو ادب کی دنیا میں ایک مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔

کوئی دو ہفتے ہوئے کہ حکیم یوسف حسن نے مجھے ایک اخبار کا تراشہ بھجوایا (جو نیرنگ خیال کی شاندار کارگزاریوں پر مشتمل تھا) اور ساتھ ہی خط میں لکھا تھا کہ اب میری بوڑھی ہڈیاں موجودہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ عوام ناقدرشناس ہیں اور حکومت بے مہر! لہٰذا میرا اور نیرنگ خیال کا اس دور میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔

آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اب جب کہ زندگی کی قندیل بجھنے والی ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہ تراشہ آپ کو بھجوا دوں۔ ممکن ہے اس کی کبھی ضرورت پڑ جائے۔

وہ خط اس وقت میرے سامنے نہیں۔ الفاظ یہ نہ ہوں گے۔ مفہوم یہی تھا۔

حکیم صاحب بھی خوب جانتے ہیں کہ میں مردہ پرست قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ جو جیتے جی تو کسی کو نانِ شبینہ سے بھی محتاج دیکھ کر نہیں پسیجتی مگر مرنے کے بعد اس پر الفاظ ہوتا ہے کہ ایک جوہر قابل مر گیا اور اس خلا کو کوئی پُر نہ کر سکے گا۔

مولانا صلاح الدین احمد کا قصہ سنئے۔ انہوں نے اپنا سب کچھ بیچ کر ادب کی آبیاری پر لگا دیا۔ جب تک زندہ رہے۔ کسی نے منہ نہ لگایا۔ بلکہ ایک جھڑپ میں ان کے ساتھ بڑا نامناسب سلوک کیا گیا مگر جب مولانا مر گئے تو حکومت کو بھی معلوم ہو گیا کہ ایک بڑی قدآور ہستی روٹھ کر چلی گئی ہے —— اور اس وقت اُن کی قبر پر انعام و اکرام کی بارش کر دی گئی۔

اے اللہ! ناقدرشناسوں کی اس دنیا میں تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ اور کیا سوچ کر اپنی زندگیاں ادب کے لئے وقف کریں؟

کیا اس امید پہ کہ مرنے کے بعد کسی امیر وزیر کی طرف سے ایک بیان آجائے گا کہ —— مرحوم کی ادب کے سلسلے میں بڑی خدمات ہیں؟

کاش صاحب اختیار لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا باضمیر ہو جو یہ اقرار کر سکے کہ مرحوم کی صلاحیتوں کو ہم نے کچلا تھا —— اور —— ادب کے قتل میں ہمارا ہاتھ ہے۔

میرے بزرگ حکیم صاحب! یہ قوم اور اس ملک کے صاحب اختیار لوگ تو آپ کے لئے صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ آپ کے

مرنے کا انتظار کریں اور پھر آپ کی قبر پر اپنی قدر شناسی کا بورڈ لٹکا دیں۔"

(شمارہ نمبر ۱۰۶)

ابھی میں نے "تازیانہ" کا ذکر کیا تھا۔ اُس کی اہمیت کیا تھی؟ اس کا دبدبہ کیا تھا؟ اُس کے بارے میں ایک چھوٹا سا واقعہ سُن لیں۔
"زمیندار" سے نکل کر جب عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر انقلاب میں آئے تو یہ ایک دوسرے کے خلاف لکھنے لگے۔ مولانا ظفر علی خان، سالک و مہر کے خلاف، مہر و سالک مولانا ظفر علی خان کے خلاف!

حکیم صاحب "تازیانہ" میں اُس آویزش کا ذکر کچھ اس ڈھب سے کیا کرتے تھے کہ بظاہر اُس سے مولانا ظفر علی خان کی تعریف کے پہلو نکلتے لیکن نظری سے دیکھا جاتا تو وہ مولانا کے خلاف ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ مولانا ظفر علی خان علم کا سمندر ہیں۔ شعر کے بادشاہ ہیں۔ سیاست کے ناخدا ہیں وغیرہ وغیرہ مگر اس کے ساتھ آخر میں حکیم صاحب یوں لکھ دیتے کہ مولانا کو نہیں چاہئے کہ مہر و سالک کے منہ لگیں اس لئے کہ یہ بات ان کے مرتبے سے فروتر ہے۔ بظاہر کچھ بین السطور میں کچھ!

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اُن دنوں مجھے لال دین قیصر نے یہ بتایا تھا کہ جب ملک صاحب نے مولانا ظفر علی خان سے کہا کہ آپ مہر و سالک کو بخش دیں۔ اُن کے خلاف نہ لکھ کریں تو مولانا ظفر علی خان نے کہا۔ میں مہر و سالک کو کیا سمجھتا ہوں۔ وہ میرے پڑھائے ہوئے ہیں۔ وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے مگر میں حکیم یوسف حسن کی تحریروں سے پریشان ہوں۔ اُن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

ہمارے نیاز فتحپوری کی عادت تھی کہ وہ چڑھتے سورج کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر اقبال کے بارے میں بھی پوری دیدہ دلیری سے لکھا:۔

اوّل اوّل جب میں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا تو ان کے خیال کی رفعت اور جذبات کی اثریت کو سامنے رکھ کر جو صورت میں نے ان کی قائم کی تھی۔ وہ یہ تھی:۔

ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور جسمانی ترقی دونوں کا اجتماع میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو متشرع قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا۔ ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہوگا۔ معاشرت نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہو گی۔ بلحاظ اخلاق کے عجز ہوں گے۔ بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی اور بہ حیثیت مجموعی ان میں ایک کشش ہو گی کہ انسان خود بخود اُن کی طرف کھنچ جاتے ہوں گے۔ لباس بالکل مشرقی ہوگا اور نمائش سے بالکل دور۔ لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے کسی قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میری مزعومات کے مطابق نہ تھی۔

یہ باتیں اہل پنجاب کو ناگوار گزریں۔ بھلا لباس سے علمیت کا کیا تعلق؟ اور پھر یہ بھی کہ جثے کا کیا تعلق؟ چنانچہ حکیم صاحب اداریہ لکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو پنجاب کا واحد نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ہر معرکے میں حصہ لینا ان کے مزاج میں داخل ہے۔ لہٰذا چُپ کیسے رہتے۔ لنگوٹ کس کے میدان میں آ گئے۔ جواب میں لکھا:۔

ہم حیران ہیں کہ نیاز صاحب نے علامہ اقبال کے کلام سے ان کے نحیف الجثہ ہونے پر کس طرح حکم لگا دیا۔ علامہ موصوف کے کلام میں ایسا کوئی عنصر نہیں ہے۔ جس سے بانکپن اور نسائیت ٹپکتی ہو۔ نہ ان کے ہاں یاس و حرماں کے مضامین ہیں نہ مایوسی اور ناامیدی کی تلخی

پائی جاتی ہے بلکہ وہاں زندگی کا ایک بحرِ زخار ہے جو جبل پیکر موجیں لئے چلا آتا ہے اور جو چیز سامنے آتی ہے بہائے جاتا ہے۔ وہ خون شدہ آرزوؤں اور منفعل گشتہ حسرتوں کے ماتم گسار نہیں بلکہ تخلیق و تعمیر مقاصد کے مدعی ہیں۔ وہ عرصۂ حیات کو ایک تماشائی کی نگاہ سے مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ وہ ایک امیر الجیش اور سر عسکر کی حیثیت سے اس کی رزم آرائی بیان فرماتے ہیں۔ ان کا رفیع اور پُر وقار تخیل آپ کے ہم جلیس شعرا کی طرح مُردہ ذہن کی پہنائیوں میں سرگشتہ نہیں پھرتا بلکہ وہ رازِ حیات سے آشنا ہو کر بصد صولت و بسالت

تیغ و سناں و خنجر و شمشیرم آرزو است
بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزو است

کے جگر پاش نعروں کے ساتھ بلند ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ اس ہنگامہ آرائی، محشر خیزی، ایک معرکۂ کرب و بلا برپا کرنے کی آرزو کے باوجود اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے۔

حضرت علامہ کے کلام کا پُر وقار اور شاندار ترنم، اس کی بلند آہنگی، سوز و گداز، عمیق تفکر اور وہ تشبیہات سوز آتش ملتہب ہیں کہ بلکن ایک کو وہ آتش افروز بناتا ہے۔ سب نیاز صاحب کے استنباط کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ نیاز کلامِ اقبال کا چند سے اور مطالعہ فرمائیں۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

آگے چل کر آپ ناطقانہ انداز میں یہ حضرت نیاز کی خصوصیت ہے فرماتے ہیں۔ "دماغی ترقی اور صحتِ جسمانی، دونوں کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا۔" بجا ارشاد ہے۔ آپ کے ذہن میں ان دونوں کا اجتماع کیوں آنے لگا۔ یہی غنیمت ہے کہ اس میں "وسعتِ نظر" اور "ندرتِ خیال" کے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شیعہ سنی کی تفریق اور پنجاب و یو۔پی کا امتیاز اور یہ تو آ گیا کہ کیوپڈ اور سائیکی کے ترجمہ کو جبع زاد کہہ کر کس طرح شائع کیا جاتا ہے۔ رہ جسمانی ترقی اور صحت کا اجتماع۔ یہ تو آپ کے دماغ میں اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک آپ دنیا کی عظیم الشان شخصیتوں کا مطالعہ نہ فرمائیں گے۔ ملٹن، شکسپیئر، گوئٹے، ڈاکٹر جانسن، گولڈ سمتھ، کلیمن شو، روزولٹ، لائڈ جارج۔ ایچ جی ویلز، ایچ واڈزورتھ، ولیم جیمس کو نیاز صاحب شاید شعرا اور بڑے آدمیوں میں سے نہ مانیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک زمانہ ان کی دماغی قابلیت کا معترف ہے اور بدقسمتی سے صحتِ جسمانی بھی ان کی دماغی ترقی سے مجتمع ہے۔ نیاز صاحب کا یہ نظریہ ان کے نہاں خانہ کی باریکیوں تک ہی محدود رہ جائے تو شاید صحیح ہو۔ لیکن جہاں تک دنیائے علم و ادب کا تعلق ہے اس کو کلیہ قرار دینا سراسر عند اور جہالت پر مبنی ہے اور داڑھی کے متعلق جو ارشاد ہوا ہے یہ بھی جناب کی عقل کا پھیر ہے۔ اس سے بڑھ کر حماقت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ کے بعد داڑھی اور اس کی نوعیت کے متعلق حکم لگایا جائے اگر ہو سکتا ہے تو ہم نیاز صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے نئے نئے سوانگ بدلنے سے آپ کے اندازِ بیان میں بھی فرق پڑتا ہے۔ جس سے قاری اس امر کا اندازہ لگا سکے۔ اگر نہیں اور ہر حالت میں آپ کا اندازِ بیان اور حسنِ تخیل وہی رہتا ہے۔ خواہ آپ ٹیگور کا بہروپ بدلیں یا اپنی حدود میں رہ کر اور طبیعت کے مطابق حد درجہ شاعرانہ انداز میں مکمل اور ہمہ گیر پسندیدہ دل کی سی صورت بنا لیں جیسا کہ شروع سے آپ کا معمول رہا ہے تو ذرا سوچیے کہ محض داڑھی کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔ علامہ موصوف کی سی منظم اخلاقی ہستی کی پاکیزہ اور سادہ معاشرت

علاوہ اخلاق دلچسپ اور دلآویز انداز تقریر کے متعلق آپ کے سے نقالوں کی ہرزہ سرائی کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان باتوں کو علمائے مشرق و مغرب جنہیں حضرت علامہ سے شرف نیاز حاصل ہوا ہے اور وہ بے شمار مشتاقان جمال جو ہر روز زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ایک بار کیا لاکھ بار آسمان پر تھوکئے لیکن یہ فراموش نہ کیجئے کہ یہ آپ کے حد درجہ شاعرانہ رُخ مبارک پہ ہی آ کر پڑے گا۔ کاش نیاز صاحب اس قسم کی حد درجہ شاعرانہ باتیں لکھنے سے پیشتر اُن آرا کو دیکھ لیتے یا ہم سے منگوا لیتے جو بڑی بڑی شخصیتوں نے علامہ موصوف کی ملاقات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔

علامہ موصوف کے کلام ہی سے ظاہر ہے کہ آپ کے جذبات کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں اور جنہیں حضرت علّامہ سے ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل ہے وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے جب علی گڑھ میں حضرت علّامہ کی موجودگی میں 'صقلیہ' پر آپ کی مشہور نظم ؎

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

پڑھی تو جہاں دیگر سامعین کی آنکھیں اشکبار تھیں وہاں علّامہ موصوف بھی زار و قطار رو رہے تھے لیکن ہمارے خیال میں یہ کبھی نہ آیا تھا کہ قوم کی حالت پر رونے والے فلسفی کو یو۔ پی کے ایک بد خو و غلط ادیب کی ذہنیت پر بھی رونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں نیاز صاحب کی حد درجہ شاعرانہ قطع و برید واقع سزاوار ترحم ہے اور ان کی "دماغی ترقی" 'ندرت خیال' کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ یہ صف ماتم پنجاب کی "حد درجہ غیر شاعرانہ" سرزمین ہی پر بپا کی جائے اور اجی حضرت یہ کشش ہی تھی جو آپ سے منبر اور ہیچ مادیگرے نیست رٹنے والے جو تیاں چٹخاتے یہاں تک آ گئے تھے۔ نیاز صاحب حد درجہ شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں۔ "میں کبھی یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے جو مرد کے لئے حد درجہ غیر شاعرانہ ملبوس ہے اور اونچا کوٹ جو پنجابی یونیفارم کا جزو لاینفک ہے۔ استعمال کرتے ہوں گے جسے کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا۔" دروغ گو را حافظہ نباشد۔ ابھی آپ کو یہ شکایت تھی۔ آپ کی یہ توقع کہ علامہ موصوف کا لباس مشرقی وضع کا اور نمائش سے بالکل دور ہو گا۔ غلط ثابت ہوئی۔ اگر شلوار اور اونچا کوٹ استعمال کرنا جو خود نیاز صاحب کے الفاظ میں پنجابی یونیفارم کا جزو لاینفک ہے مشرقی وضع کے خلاف ہے تو مشرقی وضع سے آپ کی مراد میل اوڑھنے کا وہ حد درجہ شاعرانہ انداز ہو گا جو آپ نے ان دنوں اختیار کر لیا تھا۔ جب آپ پر یونیورسٹی کا بھوت سوار تھا اور جس نے اب آپ کو "جن" کے سے حد درجہ شاعرانہ رسالہ کے اجرا پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ بھی نیاز صاحب کی حد درجہ شاعرانہ فتح پوری منطق ہے۔ جس کا سمجھنا غیر شاعرانہ ذہنیت کے آدمی کا کام نہیں۔

یہ امر واقعی کس درجہ مضحکہ خیز اور حد درجہ شاعرانہ ہے کہ ایک یو۔ پی کا رہنے والا جب دنیا کے کسی خطہ کے باشندے کا تصور کرتا ہے تو عالم خیال میں اسے وہی اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور دو پلّے کی ٹوپی اوڑھے دیکھتا ہے جس کا وہ خود عادی ہوتا ہے اس بھلے آدمی سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ برنارڈ شا، گالز ورتھی اور آنفہ بینٹ یا ارون کوب وغیرہ کو جن کے متعلق آپ بھی زعم رکھتے ہوں کہ فتحپور کے حد درجہ شاعرانہ لباس میں ملبوس ہوں گے۔ حد درجہ غیر شاعرانہ مغربی لباس ہی میں دیکھ کر ستپٹا جائیں تو اس میں ان بیچاروں

کا کیا قصور ہے علامہ اقبال پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنجابی ہیں اور وہ پنجاب کا لباس ترک کر کے یو۔پی معاشرت کیوں اختیار کریں۔ "رہا شلوار کا حد درجہ غیر شاعرانہ ہونا۔" تو جہاں یو۔پی کے دو ممتاز ادیبوں کے اچھے خاصے شگفتہ نام عبدالباری اور حامد اللہ آپ کے نزدیک حد درجہ غیر شاعرانہ ٹھہرتے ہیں تو شلوار کی کیا حقیقت ہے جیسے پنجاب کی حد درجہ غیر شاعرانہ سرزمین سے ایک خاص مناسبت ہے۔ آپ اس کے حد درجہ شاعرانہ ہونے کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ دعا دیجئے اچکن کو جس نے آپ کی پردہ پوشی کر رکھی ہے اور جس کے بغیر آپ شاعرانہ "بیل" نظر آتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں اونچے کوٹ کو کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ فلسفہ سمجھنے کے دعویدار آپ کب سے ہوئے ہیں اور فلسفہ میں پڑھا ہی کیا ہے۔ جو فلسفیانہ ذہنیت جتلانے لگے۔ فارسی کی دو تین کتابیں پڑھنے اور الہلال سے ترجمہ کر کے اپنے نام سے چھپوانے کا نام تو فلسفہ نہیں ہے۔ رسالہ جن کے اجرا کرنے اور بھوت پریت میں ایمان رکھنے والے ڈھل یقین قسم کے لوگ فلسفی ہوئی کب سکتے ہیں۔ آپ کو فلسفہ سیکھنا ہے تو علامہ ممدوح کے ادنیٰ ترین خادموں کے آگے زانوئے ادب تہہ کیجئے۔ فتحپور میں چلے کاٹتے کسی کو فلسفی بنتے دیکھا نہیں آج تک!

علامہ ممدوح کے منظر پر وہی شخص حرف رکھ سکتا ہے۔ جس نے عقل و خرد کو بالکل جواب دے دیا ہو اور جس کے تمام قوی ذہنی کو تعصب نے معطل و ناکارہ کر دیا ہو۔ عجمی اور عربی علما بھی آئے دن حضرت علامہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں لیکن آج تک کسی نے قیام کو کیام نہیں سُنا۔ یہ بھی محض آپ کی سماعت کا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت متناسب الاعضا اور تندرست انسان ہیں۔ موزوں ساخت کے چہرے پر ایک پُر وقار دلکشی اور نُور برستا ہے۔ جسے مردانہ حسن کا شاندار اور مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ نگاہوں میں ایسی دلفریب کشش ہے کہ انسان خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ لیکن نیاز صاحب اپنی فطرت سے مجبور ہو کر فرماتے ہیں "جسم پہلوانی کے لگ بھگ فربہ و تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے آج تک پہلوان دیکھے ہی نہیں اور آپ کا پہلوان کا تصور بھی اس قدر غلط ہے۔ جس قدر آپ فلسفہ سے کورے ہیں۔ وہ کوئی لکھنؤ کا بانکا ہو گا جسے آپ اپنی سمجھ میں پہلوان بنائے بیٹھے ہیں۔ کبھی ٹپ کلو، گونگا اور گاماں (ہر چند آپ کی حد درجہ شاعرانہ طبع پنجاب کی حد درجہ غیر شاعرانہ ناموں کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ لیکن کیا کیا جائے کہ آپ کو پہلوان بھی ضرور دکھانا چاہئے تاکہ آئندہ پھر کبھی ایسی غلطی نہ کر بیٹھیں) کو دیکھ لیتے تو آنکھیں کھل جاتیں کہ اللہ تیری شان پہلوان یہ ہوتا ہے۔ آپ حقیقتاً حضرت علامہ کو پہلوان سمجھنے میں معذور ہیں اور حقے کے متعلق جبی سارا قصور آپ کے متعفن دماغ کا ہے۔ جس میں اس وقت فتح پور کے کسی بھٹیار خانے کا تصور سمایا ہو گا ورنہ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی لاہور کی کشادہ کوٹھیوں میں سے ہے۔ اس کی فضا نہایت پاکیزہ اور لطیف رہتی ہے۔ اس کا گول کمرہ ٹینس کے لان سے کسی طرح کم کشادہ نہیں ع

ایاز قدر خود بشناس

نا جناب حد درجہ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ صاحب! آپ اپنی اوقات پہچانئے اور ڈاکٹر صاحب کے متعلق ہرزہ سرائی کر کے چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مصداق نہ بنئے۔ ایک محدود حلقے میں جو رہی سہی توقیر باقی ہے آپ اُسے بھی ضائع کر بیٹھیں گے۔"

اقتباس طویل ہو گیا ہے۔ اس کی معذرت! مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حکیم صاحب نے ایک بڑے نازک مسئلے کو چھیڑا تھا۔ لہجہ بھی تند و تیز استعمال کیا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں دلی اور یو۔پی کے دوست خفا نہ ہو جائیں مگر انہوں نے اپنا اداریہ اس

طرح ختم کیا :-

"ہم نے حضرت نیاز کی زہریلی تحریر کے اُن جملوں کو نقل کر کے رسالہ کو ناپاک نہیں کیا جو ان کے صحیفہ میں شائع ہوئے تھے ۔ ہم یو۔پی کے سخن فہم اصحاب کو عموماً اور لکھنؤ کے اہلِ الرائے حضرات کو خصوصاً توجہ دلاتے ہیں کہ وہ حضرت نیاز فتحپوری کی اس سفیہانہ تحریر پر سختی سے نوٹس لیں اور پوری کوشش کریں کہ اُمت مرحومہ کے سر برآوردہ اور واجب التعظیم بزرگوں کی اس درجہ توہین پر وہ اظہار ندامت کریں اور اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو اطبائے لکھنؤ ان کے سر پہ جو جن" مسلط ہے۔ اس کے نکالنے کا انتظام فرمائیں ۔"

(نیرنگِ خیال اجنوری ۱۹۳۰ء)

یہ ہے ایڈیٹر کی قابلیت یا اُس کا مقام گفتگو کہ وہ نازک مرحلوں سے بھی سرخرو گزر رہے ۔ ورنہ اس جھگڑے میں اہلِ زبان کا ناحق ہو جانا لازمی امر تھا (ایسے مواقع پر اکثر معقولیت اور نامعقولیت کو بھی دھیان میں نہیں رکھا جاتا ۔) مگر حکیم صاحب نے اس معاملے کو پوری ہوش مندی سے سنبھالا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سُنا تھا کہ اس معاملے میں "اہلِ اُردو" بھی حکیم صاحب کے ہمنوا تھے اور نیاز صاحب کے رویے کو ناپسند کر رہے تھے ۔ اسے کہتے ہیں تلخ نوائی میں شیریں کلامی !

میں نے مندرجہ بالا طویل اقتباس کو (یا اور اقتباسات کو) اس لئے بھی درج کرنا مناسب سمجھا کہ بہانے بہانے سے حکیم صاحب کے اندازِ تحریر اور اندازِ فکر کا بھی سراغ مل جائے یوں میں نے بزعم خود ایک تیر سے دو نشانے کئے ہیں ۔ یہ الگ بات کہ ایک بھی تیر نشانے پر نہ لگا ہو ۔

میں نے حکیم صاحب سے پوچھا "آپ نے اُس وقت علامہ اقبال کی وکالت تو خوب کی تھی ۔ علامہ بھی خوش ہوئے تھے کہ نہیں ؟"

کہنے لگے ۔" وہ ان چیزوں سے بالا تھے ۔ میں نے جب وہ پرچہ علامہ کی خدمت میں پیش کیا تھا تو وہ نوٹ پڑھ کر صرف مسکرا دیئے تھے ۔ زبان سے کچھ نہ کہا ۔ مجھ میں بھی ہمت نہ تھی کہ پوچھ لیتا ۔ کیسا رہا یہ اداریہ ؟"

"آپ کے علامہ سے تعلقات کیسے تھے ؟"

لوگ تو یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہمارے علامہ سے بڑے تعلقات تھے ۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ۔ ہر آدمی یہ کہہ رہا ہے کہ علامہ میرے دوست تھے ، مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے مگر میں اس ضمن میں یہ کہوں گا کہ میں تو ان کے ہاں حاضری پہ ہی فخر کیا کرتا تھا ۔ میری نہ اُن سے دوستی تھی ۔ نہ وہ مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے ۔ علامہ کی مجھ پر یہی مہربانی بہت تھی کہ انہوں نے مجھے اپنے ہاں بیٹھنے کی اجازت دے رکھی تھی ۔ لذتِ بیداری مجھے اُسی چوکھٹ سے ملی تھی ۔ ورنہ میں اس سے آشنا ہی نہ تھا ۔

ایک دن میں نے علامہ سے گزارش کی ۔ نیرنگِ خیال کے لئے کوئی نظم دیجئے ۔ انہوں نے فرمایا " نئی چیز کوئی نہیں ہے ۔"

میں نے یاد دلایا کہ "جب میں پچھلی مرتبہ حاضر ہوا تھا تو آپ نے حاضرین کو ایک نیا شعر سنایا تھا ؂

یہ پنڈت یہ بنئے یہ مُلّا یہ لالے

یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے

اس کے بعد کچھ شعر اور ہوتے ہوں گے۔

کہنے لگے اور کوئی شعر نہیں ہوا۔ وہی ایک ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا۔ اچھا لکھو :-

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے
یہ تکیے یہ مندر یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ بنئے یہ مُلا یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دُنیا میں اللہ والی

وطن کیا ہے اک نوع سرمایہ داری
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
یہ دیکھو وہ چلی آرہی ہے سواری
نئے جال لائے پُرانے شکاری
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

(نیرنگ خیال ۱۹۲۸ء)

جب فی البدیہہ اتنے اشعار لکھوا چکے تو فرمانے لگے " اگر یہ شعر عام آسکیں تو چھاپ دیجئے مگر مجھے اس کی نقل دیتے جائیں"۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں علامہ کی خدمت میں مہینے میں ایک دو بار ضرور حاضری دیا کرتا تھا۔ میں ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولانا ظفر علی خان بے حد گھبرائے ہوئے آئے۔

علامہ نے پوچھا" خیر باشد ؟

" خیریت کہاں ہے ؟"

" کیوں ؟

گورنمنٹ نے ایک سرکلر بھیجی ہے کہ ہم اپنی طرف سے پانچ لاکھ روپیہ دیں گے اور پانچ لاکھ روپیہ مسلمان اکٹھا کریں تاکہ حجاز میں ہسپتال بنوائے جائیں۔ کیونکہ حج کے موقع پر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

" پھر ؟

مولانا پہلے ہی پریشان تھے۔ حد درجہ مضطرب تھے۔ گلوگیر انداز میں جواب دیا" یہ انگریزوں کی چال ہے۔ جس میں وہ مسلمانوں کو بھی شامل کرکے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ انگریز جہاں ہسپتال یا رفاہی ادارے بنواتے ہیں۔ وہاں پہلے اسی قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ پھر اپنا اثر رسوخ استعمال کرکے قبضہ کرلیتے ہیں۔ اس لئے حجاز بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"

علامہ نے فرمایا" معاملہ بے شک سنجیدہ ہے مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ شام کو اپنا چپڑاسی بھیج دیجیے گا۔ میں اُسے چار پانچ

شعر لکھ دوں گا۔ وہ اپنے اخبار میں چھپ دیجیے گا۔ پھر نہ کوئی چندہ دے گا۔ نہ ہسپتال بنیں گے۔ نہ انگریزی چال کامیاب ہوگی۔"

چنانچہ علامہ نے "شفاخانہ حجاز" کے نام سے ایک نظم لکھی۔ جو زمیندار میں چھپی۔ نظم کے چھپنے سے مسلمان خبردار ہوگئے۔ چنانچہ انگریز کی اسکیم دھری رہ گئی۔

حکیم صاحب نے فرمایا "اُس نظم میں بڑا تاثر تھا۔ میں آپ کو ایک دو شعر سناتا ہوں ؎

اِک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا
کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانۂ حجاز

اِس نظم کا ایک اور شعر ہے ؎

دار الشفا حوالیٔ بطحا میں چاہیے
نبضِ مریضِ پنجۂ عیسیٰ میں چاہیے

مگر جب علامہ کا یہ شعر حکیم صاحب نے پڑھا ؎

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈھتا ہوں زمینِ حجاز میں

تو حکیم صاحب رو پڑے۔ بُری طرح روئے۔ عجیب گدازِ دل پایا ہے۔ سرمایۂ دردِ نعمت ہے۔ جسے بھی ملے۔ حکیم صاحب کی جو حالت تھی۔ وہ تو تھی ہی، مجھے بھی اُٹھ کر منہ دھونا پڑا۔

یہ بات مجھے حکیم صاحب ہی سے معلوم ہوئی کہ اس نظم کا پس منظر کیا تھا اور پیشوائے قوم کون تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔ بڑی تاثیر تھی علامہ کے کلام میں' امامِ عاشقانِ دردمند تھے۔ یہ ترکیب علامہ ہی کی ہے۔ جو اُن پر صادق آتی تھی۔

تاثیر کی بات پوچھتے ہو؟ لو ایک قصہ اور سنو:

علامہ اقبال نے جنگِ طرابلس کے دنوں میں ایک نظم لکھی۔ نام تھا اس کا "حضورِ رسالت مآبؐ میں" یہ نظم شاہی مسجد لاہور میں، ہزاروں لاکھوں کے مجمعے میں علامہ نے بڑے ہی دل سوز قسم کے ترنم میں پڑھی۔ ایک تو علامہ نے اُس دن جس سوز سے نظم پڑھی تھی۔ وہ سماں بھی دیکھنے اور سننے والا تھا۔

نظم پڑھنے سے پہلے سر شفیع، سر فضل حسین اور مولوی محبوب عالم ایسے اکابرین نے بڑی آتشیں تقریریں کی تھیں۔ جس میں اٹلی کے خلاف مسلمانوں نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد علامہ نے نظم سنانی شروع کی۔ مجمعے پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ فرش پر سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ علامہ نے جب پوری سرشاری کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

تو لوگوں کا تجسس بڑھا۔ سوال پیدا ہوا۔ بھلا وہ کیا چیز ہو گی جو جنت میں بھی نہیں ملتی اس کے بعد جب علامہ نے یہ شعر پڑھا ؎

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے، نالہ و شیون اور آہ و بکا کا ایسا سماں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جوش اتنا تھا کہ لوگوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ فرش پر تڑپنے لگے۔ آدم کی تڑپ کا وہ سماں، ضمیرِ کائنات میں اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ جو اس چشمِ فلک نے شاذ ہی دیکھا ہو گا۔

حکیم صاحب یہ واقعہ سناتے جاتے تھے اور رُتے جاتے تھے۔ مجھے بھی آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ کہنے لگے اُس دن میرا جی چاہتا تھا کہ غیر ملکی حکومت کے سارے آثاروں کو مٹا دوں اور خود پھانسی پر لٹک جاؤں۔

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے دن میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حاضرین میں سے کسی نے علامہ اقبال کے شاہی مسجد میں پڑھی جانے والی نظم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ اُس دن خیریت ہی گزر گئی۔ ورنہ جو حال پبلک کا تھا۔ اس سے اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ بے قابو ہو کر ہنگامہ برپا نہ کریں۔

اس پر علامہ نے فرمایا: "اچھا ہی ہوا جو مسلمان اپنے آپ میں رہے۔ ورنہ میں چاہوں تو اپنے شعروں سے آگ لگا دوں مگر میں دیکھتا ہوں کہ ابھی میری قوم تیار نہیں ہے۔"

حکیم صاحب سے جب میں نے ایسے ایسے واقعات سُنے تو مزید کرید کی جستجو ہوئی۔ نولائے عاشقانہ کو دل اور مچلا۔ مگر میرے استفسار پر کہ علامہ کا کوئی اور واقعہ بھی سنائیے حکیم صاحب کہنے لگے یار! اب میں تھک گیا ہوں۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ ۷۶ برس کی عمر ہے۔ پھر کبھی سہی!

"پھر کبھی نہیں۔ آج ہی!"

"آج کی بات تو پھر یہ ہے کہ تم شام کو گھر آ جانا۔ میں تمھیں علامہ کا ایک اور قصہ سناؤں گا۔ عجیب قصہ! اللہ اللہ کیا عظمت تھی اُس شخص کی! مشتِ خاک تھا مگر دانشِ حاضر کا امام تھا۔"

میں اپنے کام کاج چھوڑ کے پہنچ گیا۔

حکیم صاحب نے کہا: "میرا خیال نہ تھا کہ تم آ سکو گے۔ کیسے چھوڑ دیا لوگوں نے؟"

دو تین آدمی بیٹھے تھے مگر میں ان سے معذرت کر کے آ گیا ہوں۔ جب کاموں کا ہجوم ہو تو پھر میں یہ دیکھتا ہوں کہ زیادہ ضروری کون سا کام ہے؟

"یہ زیادہ ضروری تھا؟"

"جی ہاں! آپ نے تو علامہ اقبال سے میری شیفتگی بڑھا دی۔ کسک میں کچھ اضافہ ہی کر دیا۔"

اچھا تو سنو:۔

"قیامِ پاکستان سے پہلے، جب ہندوستان پر انگریز حکمران تھا تو اس کا قاعدہ یہ تھا کہ ریاستوں میں وزیرِ اعظم خود نامزد کیا کرتا تھا۔

نوابوں اور مہاراجوں کو اس امر کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کو وزیراعظم بنا سکتے۔ چنانچہ ریاست بہاولپور میں، جسے وزیر اعظم بنا کر بھیجا گیا تھا۔ وہ نواب صاحب کی منشا کے مطابق نہ تھا۔ آپس میں بنتی نہ تھی۔ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ پہلے تو خود نواب صاحب وائسرائے بہادر کو لکھتے رہے کہ موجودہ وزیر اعظم سے میری جان چھڑائی جائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

مجبور ہو کر نواب صاحب نے سوچا کہ میری اس مشکل کو، اگر کوئی حل کرا سکتا ہے تو وہ صرف ڈاکٹر اقبال، چنانچہ نواب صاحب کا آدمی علامہ کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے کو بہ حیثیت بیرسٹر جانچا۔ ہامی بھرلی۔ چار ہزار روپیہ مقدمے کی فیس طے پائی۔

ڈاکٹر صاحب وائسرائے کے پاس پہنچے۔ سیکرٹری کو اپنا کارڈ دیا۔ سیکرٹری نے کہا "قاعدہ یہ ہے کہ ہر ملاقاتی اپنا نام رجسٹر میں لکھتا ہے۔ رجسٹر اندر جاتا ہے۔ جسے بلانا مقصود ہوتا ہے اُسے بلا لیا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ بھی کارڈ دینے کی بجائے رجسٹر میں اپنا نام لکھیں۔"

اس پر اقبال نے کہا "اگر وائسرائے میرے کارڈ پر مجھ سے ملنا نہ چاہیں گے تو میں واپس چلا جاؤں گا مگر عام لوگوں کی طرح رجسٹر میں نام نہ لکھوں گا۔"

مجبوراً سیکرٹری کو کارڈ ہی لے کر اندر جانا پڑا۔ وائسرائے نے کہا "میں ان سے ملوں گا۔ انھیں بٹھایا جائے۔"

تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے ملاقاتیوں کے کمرے میں آئے۔ پوچھا "کیسے آئے؟"

"آپ نے ریاست بہاولپور میں جسے وزیر اعظم بنا کر بھیجا ہوا ہے۔ اُسے تبدیل کر دیں۔ اس لئے کہ اس کا برتاؤ نواب صاحب سے اچھا نہیں ہے۔"

"ضابطے کے مطابق، نواب صاحب کو، اُس وزیر اعظم کو قبول کرنا چاہیئے۔"

"کیا سیاست اسی کا نام ہے کہ آپ ایک فرمانروا کے معمولی سے مطالبے کو بھی نہیں مان سکتے؟ جب کہ نواب حکومتِ برطانیہ کا وفادار دوست ہے۔ پھر مسلمانوں میں بھی اُس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ایسی چھوٹی سی بات بھی نہ مانی گئی تو بڑا انتشار پھیلے گا۔ آپ کا اس میں کچھ حرج نہیں کہ کوئی دوسرا وزیر اعظم بنا دیں۔"

وائسرائے کو ایک تو علامہ اقبال کے مرتبے کا علم تھا۔ دوسرے علامہ نے بات بھی کچھ اس ڈھب سے کی تھی کہ وائسرائے کو انکار کرتے نہ بنی۔ کوئی صاحبِ ادراک ہو تو ایسا!

جب یہ بات طے ہو گئی تو وائسرائے نے کہا "اب آپ پرسوں میرے ساتھ کھانا کھائیں۔"

"میں تو آج واپس جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو کل سہی۔"

"میں تو آج ہی واپس جاؤں گا۔ کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔"

"میری خواہش تھی کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی خوشی حاصل کرتا۔"

"اگر یہ خواہش ہے تو آج ہی کھانا کھلا دیجئے۔"

حکیم صاحب نے اس واقعہ پر تبصرہ یوں کیا کہ یہ شان علامہ ہی کی تھی کہ وہ وائسرائے کی بات کو بھی رد کرنے یا اپنی مرضی کے مطابق

ڈھالنے کی ہمت رکھتے تھے۔ ورنہ کسی والیٔ ریاست تک کی مجال نہ تھی کہ وہ وائسرائے کے حکم کے خلاف زبان بھی کھول سکتا۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ چودھری محمد حسین بھی موجود تھے۔ ایک تار آیا۔ چودھری صاحب نے وصول کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "پڑھ کر سنا دیجئے۔"

چودھری صاحب نے بتایا "تار نواب صاحب بہاولپور کی طرف سے آیا ہے۔ انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے ملاقات کے لئے بہاول پور آئیے۔"

ڈاکٹر صاحب ایک آدھ منٹ خاموش رہے۔ اس کے بعد فرمایا "نواب صاحب نے مجھے اپنا ملازم سمجھ لیا ہے۔"

چودھری صاحب نے کہا "کیا جواب دے دوں نواب صاحب کو؟"

"لکھ دیجئے۔ مجھے فرصت نہیں۔"

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد میں نے کسی دوسرے موقع پر چودھری صاحب سے اس تار کا پس منظر پوچھا تھا تو انہوں نے مجھے وہ ساری تفصیل بتائی تھی۔ جو میں نے آپ کو ابھی سنائی ہے۔ بقول حکیم صاحب وہ موقع ایسا تھا کہ اگر ڈاکٹر صاحب نواب صاحب کے پاس پہنچ جاتے تو وہ انھیں دس پندرہ ہزار روپیہ ضرور دے دیتے۔ مگر اس مرد خود آگاہ کو خرید کون سکتا تھا!

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی مرضی کے مالک تھے۔ انھیں کسی بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے علامہ کا ایک اور واقعہ بھی سنایا۔

ہندوستان کے ایک نواب (شاید نواب جوناگڑھ) لاہور آئے۔ سر عبدالقادر کے ہاں قیام کیا۔ انہوں نے سر عبدالقادر سے کہا "میں دو کاموں کے لئے آیا ہوں۔ ایک تو میں لاہور دیکھنا چاہتا ہوں۔ دوسرے علامہ اقبال سے ان کا کلام سننا چاہتا ہوں۔"

سر عبدالقادر جو علامہ کے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے جواب دیا "لاہور کی سیر تو میں بخوبی کرا دوں گا۔ مگر علامہ اقبال سے کلام سنوانا میرے بس کی بات نہیں۔ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کی خاطر دعوت کروں۔ علامہ کو بھی مدعو کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی صورت از خود پیدا ہو جائے کہ علامہ اپنا کلام سنا دیں ورنہ فرمائش کی جرأت نہ تو مجھ میں ہے اور نہ ہی کسی اور میں!

اس پر حکیم صاحب نے تبصرہ فرمایا "ایک علامہ تھے کہ کوئی ان سے فرمائش کر کے بھی کلام نہیں سن سکتا تھا۔ ایک آج کے شاعر ہیں کہ اپنی بیاض بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ حیلے حوالے سے سامعین کو گھیرتے ہیں۔ پھر انھیں اپنا کلام سناتے ہیں اور اتنا سناتے ہیں کہ سننے والوں کو ادھ موا کر دیتے ہیں۔

حکیم صاحب نے اقبال کے بارے میں جتنی باتیں سنائیں۔ بڑے جذب کے ساتھ سنائیں۔ میں نے بھی انھیں اس لئے محفوظ کر لیا ہے کہ مجھے پھر کون ایسی باتیں سنائے گا۔ وہ بھی اتنے درد کے ساتھ! اتنی لذت شوق کے ساتھ!

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اقبالؒ کے انتقال کی خبر بمبئی میں سنی تھی۔ اُن دنوں مجھے جس وقت بھی وہ حادثہ یاد آ جاتا تھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ میں جتنے دن بھی وہاں رہا۔ روتا رہا۔ میرا بمبئی میں زیادہ دن رکنے کا پروگرام نہ تھا۔ دانستہ رکا۔ میں سوچتا تھا۔ جب میرا یہ حال یہاں ہے تو لاہور جا کر کیا ہو گا۔ جہاں کہ اقبال کے بہت سے دوست

ہیں۔ اقبال کا گھر ہے۔ اقبال کے نیچے ہیں۔

ایک دن حکیم صاحب پھر ترنگ میں تھے۔ میں نے اُس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اُن کی خدمت میں عرض کیا۔ "باہر بارش ہو رہی ہے۔ سردی بھی ہے۔ لہٰذا کوئی گرم مگر دلچسپ قصہ سنائیں۔"

کہنے لگے "میری زندگی میں بے شمار واقعات ایسے ہیں۔ جنھیں لوگ دلچسپ کہہ سکتے ہیں مگر اب میں وہ کیا سناؤں۔ کچھ میری جوانی سے متعلق ہیں۔ کچھ میری افتادِ طبع کے متعلق۔ کچھ میری چو دھراہٹ کے متعلق!"

"پھر بھی کچھ تو فرمائیے؟"

"بارش تو تیز ہو گئی۔ جلد تھمے گی بھی نہیں۔ دھاروں دھار ہے۔"

"جی ہاں!"

"اچھا تو پھر ایک لمبا قصہ سنو، بارش ختم جائے گی۔ یہ قصہ نہ تھمے گا۔"

"بسم اللہ!"

"کلکتے سے ایک ہفت روزہ اخبار نکلتا تھا۔ "پونچ" اس کا نام تھا۔ ایڈیٹر اس کے عنایت حسین تھے یا عنایت علی، بہر حال مجھے صحیح نام یاد نہیں رہا۔ آپ یہی سمجھیں کہ وہ عنایت صاحب تھے اور عنایت دہلوی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

عنایت صاحب کی مشہور اداکارہ گجن سے ٹھن گئی۔ عنایت صاحب گجن کے خلاف اپنے پرچے میں لکھا کرتے تھے۔ گجن نے تنگ آ کر اس پر مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ جب بات بہت بڑھ گئی تو عنایت صاحب نے مجھے خط لکھا کہ کلکتے آیئے اور میرا اور گجن کا جھگڑا طے کرا دیجیئے۔ کیونکہ گجن آپ کا کہا مانتی ہے۔ اس لئے یہ جھگڑا طے ہو سکتا ہے تو آپ ہی کے ذریعے۔

میں عموماً دلی تک ہی آیا کرتا تھا۔ سوچا اب کے کلکتے تک ہو آؤں۔ میرا ایک ڈراما بھی عبدالرشید کاردار کے پاس تھا۔ جو اُن دنوں کلکتے میں تھے۔ کسی فلم کمپنی میں بطور ڈائرکٹر، میرے ڈرامے کا نام تھا "حور بانو"! کاردار نے بھی لکھ ہوا تھا کہ یہاں آ جائیے تاکہ معاملہ طے ہو جائے۔ یہ ساری باتیں سوچ کر میں نے کلکتے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا ایک پنتھ دو کاج!

عنایت صاحب کو تار دیا۔ کلکتے پہنچ رہا ہوں۔ فلاں تاریخ کو اسٹیشن پر ملو۔ پہنچا تو عنایت صاحب اسٹیشن پر موجود تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے بغل گیر ہوئے۔ سامان اٹھایا۔ ٹیکسی میں رکھوایا۔ چل دیئے۔ ٹخ ٹخ ٹخ!

بجائے اس کے کہ مجھے اپنے گھر لے جاتے۔ انہوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ مجھے بغیر بتائے سیدھا آغا حشر کے مکان پر لے گئے۔

اندر جا کر آغا صاحب سے کہا "میں آپ کے لئے ایک شاندار مہمان لایا ہوں۔"

آغا صاحب مجھے کسی دلربا کو لائے ہوں گے۔ آنکھ مار کر پوچھا "کسے لائے؟"

"حکیم یوسف حسن کو!"

"اچھا میں کچھ اور سمجھا تھا۔ مگر حکیم صاحب بھی کسی معشوق سے کم نہیں۔ تم نے بڑا اچھا کیا جو انھیں یہاں لے آئے۔"

واپس جا کر عنایت صاحب نے مجھے کہا "میں آپ کو اپنے مکان سے اچھے مکان میں لایا ہوں اور یہ مکان آغا حشر کا ہے۔"

"آغا حشر کا؟"

"جی ہاں!"

اتنے میں آغا صاحب باہر تشریف لے آئے۔ میں نے مصافے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے ہاتھ جھٹک کر بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا اور پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے اندر لے گئے۔ صوفے پر بیٹھے تو آغا صاحب نے پھر عنایت صاحب کو مخاطب کرکے کہا: "عنایت صاحب میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔"

میں نے سوچا۔ اب حکیم صاحب مجھے یہ بتا کر خاموش ہو جائیں گے کہ میں نے قیام کلکتہ میں جہاں آرہ اگبن کی عنایت صاحب سے صلح کرا دی تھی اور واپس چلا آیا تھا۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں نے حکیم صاحب سے کہا: "ذرا آغا حشر سے بھی ملاقات کرا دیں۔"

"یہ ایک الگ مضمون ہے۔"

"ارے صاحب الگ ہے تو ہوا کرے۔ ہم یہاں کونسی تاریخ ادب اُردو لکھ رہے ہیں۔ جس میں خطرہ ہو کہ ایک شخصیت دوسرے میں مدغم نہ ہو جائے۔ باتیں ہی تو ہو رہی ہیں۔ میری معلومات کے لئے بتلایئے نا کچھ!"

"اچھا تو سنو، عنایت صاحب کے معاملے کو پھر پکڑ لیں گے۔"

آغا صاحب کا منشی ہندو تھا۔ یہ ڈراما بولتے تھے۔ وہ لکھتے تھے۔ ایسے میں آغا صاحب کا حلیہ یہ ہوتا تھا کہ وہ صرف بنیان اور تہہ بند باندھے ہوئے ہوتے تھے تہہ بند ریشمی،

روز لکھواتے نہ تھے مگر جب لکھوانے پر آتے تھے تو الفاظ آبشار کی طرح گرتے تھے۔ چند دنوں میں ڈراما مکمل ہو جاتا تھا۔

قاعدہ یہ تھا کہ صبح آٹھ نو بجے کے قریب خوب پیٹ بھر کے ناشتہ کرتے تھے سارا دن فلم کمپنیوں کے چکر لگایا کرتے تھے کبھی کسی کے ہاں پہنچے، کبھی کسی کے ہاں! کسی سے مذاق، کسی سے معاملے کی باتیں، کسی سے گالی گلوچ، غرض یونہی دن گزارا کرتے تھے۔ چار بجے باہر ہی جائے پی لیتے تھے۔ رات کو گھر آکر کھانا کھاتے تھے۔

ایک دن میں اپنے ڈرامے کی معاملت کے لئے نکل گیا۔ کاردار سے ملا۔ انہوں نے سیٹھ سے ملایا۔ سیٹھ نے ہنس راج ڈائرکٹر سے ملنے کے لئے کہا۔ ہنس راج سے ملا تو اس نے سیٹھ صاحب سے جا کر کہا: "ڈراما اچھا ہے۔ معاملہ طے کر لیجئے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے پانچ سو روپے دیئے اور کہا: "فلم بن جاتے پر اپنی خوشی سے اور بھی دیں گے۔"

جب میں نے یہ بات آغا صاحب کو آکر بتائی تو وہ بڑے ناراض ہوئے۔ کہنے لگے: "صرف پانچ سو روپے لائے ہو۔ اگر مجھے بتا دیتے تو میں تمہیں اسی ڈرامے کے پانچ ہزار روپے دلواتا۔"

آغا صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو میں نے ان سے کہا: "میں گجن سے ملنا چاہتا ہوں۔ گجن کی ماں سے اوائل عمر میں آغا صاحب کے تعلقات رہے تھے۔ اس لئے میری بات سن کر چونکے مگر مجھے وہاں جانے سے منع نہ کیا۔ کہا: "آپ گجن کے ہاں نہ جائیں۔ اُسے یہاں بلا لیں گے۔ یہیں بات ہو جائے گی۔"

میں نے کہا: "مجھے تو کوئی کام نہیں۔ چرنجی والے عنایت صاحب کا کام ہے۔" اس پر آغا صاحب نے بیزاری کے لہجے

میں کہا۔" دیکھا جائے گا۔"

آغا صاحب نے اندازہ لگایا کہ میں گجن سے تفریحاً بھی ملنا چاہتا ہوں۔ اس لئے وہ مجھے شام کو اپنی محبوبہ مختار بیگم کے ہاں لے گئے۔ آغا صاحب نے رات کا کھانا وہیں کھلایا۔ تعارف بھی کرایا۔

دوسرے دن گجن کو پیغام بھجوایا۔ اُس نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ کھانے کے سلسلے میں بے حد اہتمام کیا ہوا تھا۔ تیس بتیس کھانے، چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر گیا۔ کیا امارت تھی ان لوگوں کی اور کیا ٹھاٹھ تھے ان کے، بڑے بڑے راجہ مہاراجہ بھی، ان کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔

کھانے کے بعد گجن نے کہا۔" آئیے آپ کو کلکتے کی سیر کرا دوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بڑی شان دار کار نکلوائی۔ خوب گھومے۔ خوب سیر کی، باغات، بازار، سیر گاہیں سب دیکھیں۔ ایک جگہ پٹرول ختم ہو گیا۔ پٹرول پمپ سے پٹرول لیا۔ بجائے رقم دینے کے، گجن نے بل پر دستخط کر دیئے۔

میں نے کہا۔" روپے دے دیتیں۔ دستخط کیوں کئے؟"

کہنے لگیں۔" کلکتہ کے سارے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ وہ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ ظاہر کریں کہ ہمارا واسطہ گجن سے بھی ہے۔ ان کی خوشی کی ایک شکل یہ بھی ہے۔"

چار بجے کے قریب کلکتے کے ایک شان دار ہوٹل میں چائے پلائی۔ کلکتے سے رخصت ہوتے وقت قیمتی تحائف دیئے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد حکیم صاحب گجن کے تصور میں گم ہو گئے۔ میں نے ٹھوکا دیا۔" حضرت کہاں ہیں؟"

"تو بھی عجیب بدمعاش ہے۔ خواہ مخواہ ہمارے زخموں کو کریدتا ہے۔"

"زخم کھایا تھا کوئی؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔" یہ کہہ کر پھر کھو گئے۔

میں تاڑ گیا کہ اب ان سے کوئی بات کرنا مغز پچی کرنے کے برابر ہو گا۔ لہٰذا چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پی۔ بال بچوں کی خیریت پوچھی۔ پنڈی کے موسم کی بات کی۔ ہاں یہ بتانا تو شاید میں بھول ہی گیا کہ مجھ سے حکیم صاحب کی ملاقات ماہانہ ہے۔ یہ راولپنڈی سے ہر ماہ دو چار دن کے لئے لاہور آیا کرتے ہیں۔ میرے ہاں بھی التزاماً تشریف لاتے ہیں۔

اتنے میں دیکھا کہ حکیم صاحب پھر موڈ میں آ گئے۔ بارش بھی ابھی تھمی نہ تھی لیکن ہلکی ضرور ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ بھی آہستہ آہستہ کہنے لگے۔ گجن مجھ پر بڑا اعتماد کرتی تھی۔ وہ اپنے سارے معاملات میں بذریعہ خط و کتابت مجھ سے مشورے لیا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے لکھا کہ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ اپنا تھیٹر بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے بتایئے کہ میں اس سلسلے میں کیا کیا کروں؟ اور یہ بھی لکھا کہ میں آپ کے بنائے ہوئے پروگرام پر عمل کروں گی۔"

حکیم صاحب نے کہا۔" یہ اس کی عنایت تھی کہ اُس نے مجھ سے یہ سب کچھ پوچھا۔ ورنہ کلکتے میں اس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے۔

میں نے کجن کو لکھا کہ تھیٹر کے پرانے طریقے[1] کو ختم کیا جائے۔ ان دنوں ایک دن میں ایک شو ہوتا تھا۔ میں نے لکھا۔ ایک دن میں دو شو ہونے چاہئیں۔ میں نے تجویز کیا کہ پہلا شو ساڑھے تین بجے شروع ہو کر نو بجے ختم ہو، دوسرا شو دس بجے شروع ہو کر ڈیڑھ بجے ختم ہو۔

جب کجن نے اس تجویز کو دوسرے لوگوں کے سامنے رکھا تو سب نے مخالفت کی۔ ایک آدمی ایسا نہ تھا جس نے میری رائے کی تائید کی ہو۔ سب یہی کہتے تھے۔ تباہ ہو جاؤ گی۔ لیکن کجن نے جواب دیا۔ میں وہی کروں گی جس کا مشورہ حکیم صاحب نے دیا ہے۔ اس لئے کہ میرا ایمان ہے کہ وہ مجھے غلط مشورہ نہیں دے سکتے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ ایک دن میں دو شو ہوں گے تو میں نے ڈراموں کے غیر ضروری حصوں کو حذف کر کے انھیں مختصر کر دیا۔ اس سے یہ ہوا کہ ڈراموں میں اور زور پیدا ہو گیا۔ نئے ڈرامے بھی اسی نہج پر لکھوائے۔ چنانچہ کجن تھیٹریکل کمپنی نے بنارس، لاہور، امرتسر، ملتان، سکھر اور حیدر آباد میں اپنے ڈرامے کھیلے۔ جو بے حد کامیاب ہوئے۔ لاکھوں روپیہ کمایا۔ لاکھوں لاکھ!

لاہور میں اس تھیٹریکل کمپنی کا قیام چار پانچ مہینے رہا۔ ایک دھوم مچی ہوئی تھی۔ کمپنی کی مقبولیت پر میں خوش ہوا کرتا تھا۔

جس دن کجن نئی کمپنی لے کر لاہور پہنچی تھی۔ اس دن لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتنی پبلک تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چنانچہ ہم کجن کو پچھلی طرف سے لے کر نکلے۔ ورنہ وہ کچلی جاتی۔ مر جاتی!

یہاں سے حکیم صاحب نے پھر رُخ بدلا۔ پھر پڑی لی۔ انھیں پھر آغا حشر نے دبوچ لیا۔ ذہنی طور پر، میں چاہتا تھا کہ وہ کجن کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہیں کہہ دیں مگر میں نے ٹوکنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ ڈرتا تھا کہیں سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔ حکیم صاحب تھک چکے تھے۔ میں ڈر رہا تھا۔ ویسے جہاں تک میرا خیال ہے مجھے تو یہ "ڈبل ٹریک" سلسلہ پسند ہے۔

انھوں نے کہا:-

آغا حشر سے تھیٹروں اور ڈراموں پر اکثر بات چیت ہوتی تھی۔ ایک رات میں سویا ہوا تھا۔ مجھے سوتے سے جگایا۔ کوئی بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ اسی وقت باہر سے آئے تھے۔ میرے سامنے پانچ ہزار کے نوٹ ڈھیر کر دیئے۔ کہا "ابھی ایک سیٹھ سے معاہدہ کر کے آیا ہوں۔"

میں نے کہا "پانچ ہزار؟"

"یہ تو پیشگی ہیں۔ جب ایک سین لکھ لوں گا تو اتنے ہی روپے اور لوں گا۔ جب ڈرامہ ختم ہو گا تو سیٹھ مجھے پندرہ بیس ہزار سے نذر دے چکا ہو گا۔"

پھر کہنے لگے۔ آغا صاحب کی ہندوستان تھیٹر پر اتنی مضبوط گرفت تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ جو چاہتے تھے منواتے تھے۔ یہ سیٹھوں کو دھکے دیتے تھے۔ مگر وہ ڈراما آغا حشر ہی کا حاصل کرتے تھے۔

---

[1] تھیٹر کے سلسلے میں حکیم صاحب کی معلومات وسیع ہیں۔ افسوس کہ ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ جوہر اس میدان میں بھی دکھاتے۔ کل دو ہی تو آدمی ہیں۔ جو اس باب میں کچھ جانتے ہیں۔ ایک حکیم احمد شجاع۔ دوسرے امتیاز علی تاج اور بس! (؟)

ایک تھیٹریکل کمپنی کے مالک نے ان سے ازرہ مذاق یہ کہہ دیا: "آغا صاحب، آپ کو اپنے ڈرامے پر ناز ہے۔ ہمیں اپنے روپے پر ناز ہے۔ اگر ہم ایک ناٹک پر دو تین لاکھ روپیہ صرف نہ کریں تو اتنی آمدنی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارا روپیہ ہے جو روپے کو کھینچتا ہے اور آپ کے ڈرامے قبولیت پاتے ہیں۔

آغا صاحب نے غصے میں آ کر کہا: "تمہاری بہن کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ بکواس کر رہے ہیں۔ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ میرا ڈراما ہی ہے جس کی وجہ سے خلقت کھنچی چلی آتی ہے اور آپ کی تجوریاں بھر رہی ہیں۔

انہوں نے کہا: "اب میں ایک ایسا ڈراما لکھوں گا۔ جس میں آپ کا کچھ خرچ نہ آئے گا مگر اس کی آمدنی پہلے ڈراموں سے زیادہ ہوگی۔"

آغا صاحب اُسی وقت غصے میں اُٹھ کر، وہاں سے چلے آئے۔ رات کو ڈراما لکھوانا شروع کر دیا۔ اُس ڈرامے کا نام تھا "دھرمی بالک" یہ کھیل ایک یتیم خانے سے شروع ہوتا تھا۔ جہاں چند یتیم بچے پڑھتے تھے۔ جن کے کھدر کے کپڑے تھے، کھدر کی ٹوپیاں اور معمولی چپلیں!

نہ اسٹیج پر محل بنے۔ نہ بھڑکدار لباس کی ضرورت پڑی۔ نہ طمطراق کی ضرورت تھی نہ شان و شوکت کی مگر پبلک کی پسندیدگی کا یہ عالم رہا کہ وہ کھیل کلکتہ کی اسٹیج پر تین سال تک مسلسل کھیلا گیا اور اس کی آمدنی پہلے کھیلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔

اسی طرح آغا صاحب کی تکرار چند مشہور ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے ہو گئی۔ انہوں نے کہا۔ یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں تو مقبولیت آپ کو ہوتی ہے۔ اگر ہم اتنی جان نہ ماریں۔ اتنی محنت نہ کریں تو آپ کو کوئی بھی نہ پوچھے۔

آغا صاحب نے حسبِ معمول سب کو ماں بہن کی گالیاں دیں اور کہا: "آئندہ جو ڈراما لکھوں گا۔ اُس میں نہ کوئی ڈائرکٹر ہوگا۔ نہ ہیرو، نہ ہیروئن، صرف پردے اٹھانے والے قلی ہوں گے۔"

چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ آغا صاحب نے جو بات کہی تھی وہ سچ بھی کر دکھائی۔ ایک ایسا ڈراما بھی لکھ مارا۔ جس میں بڑے ایکٹروں کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ کھیل بھی حسبِ معمول مقبول ہوا۔ خوب آمدنی ہوئی۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ تھیٹر کی دُنیا میں آغا صاحب ہی سب کچھ تھے۔ وہ جو چاہتے تھے۔ اُس میدان میں کر کے دکھا دیتے تھے۔

پھر حکیم صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اُن دنوں کلکتہ میں کوئی آٹھ روز رہا۔ میں نے آغا صاحب کو خوش دلنوازی میں یکتا، بےحد ملنسار اور خوش گفتار پایا۔ اس کے ساتھ بےحد عالم!

میں نے سوچا، حکیم صاحب آج کی گفتگو کے آخری نکتے پر پہنچ گئے ہیں۔ لہٰذا پوچھا۔ حکیم صاحب باتیں بہت ہوئیں۔ میری معلومات میں اضافہ بھی ہوا مگر اُس غریب جو پنچ کے ایڈیٹر کا کیا بنا؟"

"کچن کو سمجھا دیا تھا۔ اس نے مقدمہ واپس لے لیا تھا۔"

لو بھئی قصہ تو ایڈیٹر جو پنچ کا تھا مگر بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ میں نے تو ان باتوں سے لطف اٹھایا۔ معلومات بھی حاصل

ہوئیں۔ حکیم صاحب بھی گئے مگر اس کے باوجود میں نے "کچھ مزید" والی عادت کو ترک نہ کیا۔ مجھ ایسا بندۂ گستاخ بھی کوئی نہ ہو۔ پوچھ ہی لیا:۔

" حکیم صاحب ہم تو آپ کے بارے میں یہی جانتے تھے کہ آپ ادبی میدان کے سرخیل ہیں مگر یہ ایکٹرسوں سے دوستی کا زمانہ بھی تھا۔"

" میرے تعلقات صرف گجن ہی سے نہ تھے۔ بلکہ سردار اختر، خورشید اور زہرہ سے بھی تھے۔"

میں نے سوچا " لو بھئی یہ معاملہ تو بہت دور تک چلا گیا۔ جبھی تو میں نے حیرت سے کہا ——" سبحان اللہ!"

حکیم صاحب نے کہا: "یہاں سبحان اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ان عورتوں سے بڑے تعلقات تھے۔ اتنے تعلقات کہ جتنا جھوٹ بولا جاسکے۔ مگر میرے تعلقات ان سے شائستہ تھے۔ بازاری عورتوں والے نہ تھے۔ میں نے اپنے آپ کو بچایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان جھمیلوں میں اٹک گیا تو پھر میری ہڈیاں بھی نہ بچیں گی۔ یوں میں نیرنگِ خیال کی وجہ سے سوچتا تھا۔ رسالے نے مجھے بڑا نقصان پہنچایا مگر اس کے تقاضوں نے مجھے ایسی آلائشوں سے بچایا بھی!

پھر حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جن دنوں گجن، لاہور میں تھیٹر کے لئے آئی ہوئی تھی۔ میں ہر روز تھیٹر جایا کرتا تھا۔ تھیٹر کے منیجر نے گجن کی ماں سے کہا" حکیم صاحب روز آتے ہیں۔ گجن بھی حکیم صاحب کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔" اس پر گجن کی ماں نے کہا تھا:۔

" ہم آدمی کی آنکھ پہچانتے ہیں۔ اس لئے ہمیں حکیم صاحب سے کوئی خطرہ نہیں۔"

باتیں کرتے کرتے شام ہو چلی تھی۔ بارش بھی ختم ہو چکی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا: " آج گھر جانے کا ارادہ نہیں؟

" کیوں نہیں؟"

" پھر چلیے۔"

راستے میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے پوچھا: " گجن سے واقفیت کیسے ہوئی تھی؟"

کہنے لگے: " گجن علم دوست تھی۔ مطالعہ تھا۔ نیرنگِ خیال کی خریدار تھی۔ خط و کتابت میں دوستی ہو گئی۔ ہمارے رسالے کا سالانہ چندہ پانچ روپے تھا۔ مگر وہ مجھے پچاس روپے بھیجا کرتی تھی۔"

پھر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ گجن کی والدہ آغا حشر کی محبوبہ تھی۔ بہار کی رہنے والی تھی۔ وہ گجن سے زیادہ خوبصورت تھی۔

پھر حکیم صاحب نے آہ بھری۔ کہنے لگے۔ گجن بے شک ایکٹرس تھی۔ مگر دل و دماغ بڑا خوبصورت پایا تھا۔ اس نے لکھنو کے ایک نواب سے شادی کی۔ جس کی آرزو خود نواب صاحب کو تھی۔ گجن نے بھی یہ سوچ کر شادی کی کہ اچھی زندگی گزارنے کے لئے یہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ مگر نواب جو شریف زادہ تھا۔ ایک ایکٹرس کو دھوکا دے گیا۔ مگر ایکٹرس نے جو کچھ نواب صاحب کے لئے کیا۔ وہ شریف زادی سے شریف زادی بھی نہیں کر سکتی۔ بہر حال چھوڑیئے اس قصے کو! اس معاشرے میں اچھا کون ہے اور برا کون، اس کا فیصلہ خاندانی شرافت یا اُجلے لباس سے نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم صاحب متیں مداں کا جوش و ولولہ نوجوانوں سے کم نہیں۔ جن دنوں ہند و پاک لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ ان دنوں بھی یہ اپنے پروگرام کے مطابق پنڈی سے لاہور آتے رہتے۔ کچھ لوگ لاہور سے پنڈی جا رہے تھے مگر یہ پنڈی سے لاہور آتے رہتے۔

کوئی آ کے کہتا: "ہماری فوج فلاں محاذ پر آگے بڑھ گئی ہے۔ کوئی کہتا فلاں محاذ پر، یہ کہتے تم لوگ یہ کیوں کہتے ہو کہ فلاں محاذ پر بڑھی، فلاں محاذ پر بڑھی۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہر محاذ پر بڑھی"

ساتھ ہی پورے جوش کے ساتھ، "ہندو ہمیں میدانِ جنگ میں شکست نہ دے گا۔ شکست جب دے گا، میز پر بیٹھ کر دے گا"

پاکستان کی فارن پالیسی پر یہ ہمیشہ خوش ہوئے۔ ان کے منہ سے اکثر سننے میں آیا فلاں بیرونی مسئلے پر وہ مارا۔ فلاں مسئلے پر وہ مارا، یعنی ہندوستان کی سیاسی چالوں کو بے نقاب کر دیا۔ ناصر نے پاکستان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ عربوں کے دل جیت لیے۔ روس کو ہمنوا بنا لیا۔ وغیرہ وغیرہ!

یہ صدر ایوب کے بڑے زبردست حامی ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ صدر نے یہ کام اچھا نہیں کیا یا یہ کہ صدر کے فلاں رشتہ دار نے یہ کیا تو یہ فوراً اس پہ چھپٹ پڑتے ہیں "تمہیں کیا معلوم، ساری سنی سنائی باتیں سچی نہیں ہوتیں۔ پھر یہ دلیل دیں، اگر یہ سب کچھ کیا بھی ہو تو ٹھیک ہے۔ اس نے ہمیں موت کے منہ سے چھینا ہے۔ آئے دن کا سیاسی تماشا ختم ہوا۔ دنیا میں ہماری عزت تو بنی وغیرہ وغیرہ!

ایک بات کہنا بھول نہ جاؤں۔ وہ پہلے سن لیجئے۔ اس کے بعد اور باتیں ہو جائیں گی۔ وہ یہ کہ حکیم صاحب ملک کے بڑے بڑے فن کاروں کو "ادبی خطابات" سے بھی نوازا کرتے تھے۔ یہ اپچ بھی انہی کی ہے۔ جسے اہلِ قلم، انگریزوں کے خطابات، سردار خان بہادر سے زیادہ اہم جانتے تھے۔ چند ۱۹۲۵ء میں انہوں نے جنہیں اور جو جو خطابات دیئے۔ وہ عرض کرتا ہوں :۔

علامہ: سر عبدالقادر، ممبر انڈیا کونسل لندن ——— پروفیسر محمد دین تاثیر ایم اے (کیمبرج انگلستان) ——— ڈاکٹر مولوی سید نجم الدین احمد جعفری ایل ایل ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا ——— آنریبل سر تیج بہادر سپرو بی سی۔ بیرسٹر ایٹ لا، الہ آباد۔

ادیب العصر: لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) اکبر آبادی ——— قاضی عبدالغفار مراد آبادی (حیدر آباد) ——— مولانا عبدالمجید سالک روزنامہ انقلاب لاہور۔

ادیب الملک: سید سجاد حیدر یلدرم غازی پوری ——— حجاب اسمٰعیل (مسز تاج) ——— خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی ——— پروفیسر حامد اللہ قادری افسر میرٹھی بی اے (لکھنؤ) ——— مولانا تاجور نجیب آبادی (لاہور)

ملک الشعراء: مولانا ظفر علی خان مدیر زمیندار لاہور۔

لسان العصر: نواب سائل دہلوی ——— پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی ——— جوش ملیح آبادی ——— سیماب وارثی اکبر آبادی (آگرہ)

لسان الملک: یاس عظیم آبادی، جگر مراد آبادی۔

لسان القوم: پنڈت برج چند اختر، ساغر نظامی۔

مدیر اعظم: عزیز حسن بقائی، مدیر پیشوا دہلی ——— لالہ کرم چند مدیر پارس لاہور ——— نصر اللہ خاں عزیز مدینہ بجنور ——— شاہد احمد دہلوی بی اے آنرز مدیر ساقی دہلی ——— حامد علی خاں بی اے مدیر ہمایوں لاہور ——— مولوی سید محمد حسنہ ایڈیٹر دہلی

بہزادِ ہند: عقیل دہلوی ——— اللہ بخش لاہوری

مصورِ قلم: شوکت تھانوی ـــ بلقیس جمال بریلوی ـــ مرزا عظیم بیگ چغتائی ـ شمسی عباد الرحمٰن (علی گڑھ) ـــ صفوۃ اللہ بیگ صوفی دہلوی ـــ ابو طاہر داؤد بی۔ایس۔سی ـــ عبدالرحیم شبلی بی اے (کامرس) ـــ ظفر قریشی بی اے دہلوی ـــ مظہر انصاری بی اے آنرز دہلوی ـــ سید خواجہ وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن ـــ

خطابات کی اپچ کے علاوہ انہوں نے عنوانات قائم کرنے میں بھی ندرت دکھائی مثلاً اختر شیرانی کی نظم کا عنوان "لمعاتِ اختر" جگر مراد آبادی کا عنوان "داغِ جگر" غرض اسی طرح کی اور بہت سی اختراعات!

اسی طرح سالانہ نمبر یا اینول نمبر (ANNUAL NUMBER) کا نام لفظ سالنامہ بھی نیرنگِ خیال کی دین ہے۔

ایک دن کہنے لگے: "ایک تو ہمارے ہاں اناج کی قلت ہے۔ دوسرے ہم لوگ خود بڑے نالائق ہیں۔ چونکہ اسراف ہماری گھٹی میں پڑ چکا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ قیامت تک حل نہ ہوگا۔

"وجہ؟"

"وجہ یہ کہ ہر گھر میں روزانہ ہی ایک ایک دو دو روٹیاں بچ رہتی ہیں۔ بعض حالتوں میں تین تین چار چار، یہ بے تدبیری ہے۔ اگر ہم لوگ آج یہ طے کر لیں کہ اناج ضائع نہ ہونے دیں گے تو ہم کم از کم بھی سال بھر میں، تین مہینے کا تو اناج بچا ہی سکتے ہیں اب ہمیں جتنا نو مہینے کے لئے اناج درکار ہے۔ وہ اصل میں سال بھر کے لئے کافی ہے۔"

"آپ نے حساب لگایا ہے کیا؟"

"ہاں ہاں!"

"آپ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی سوچتے ہیں؟"

"یہ بات چھوٹی تو نہیں۔ اگر آپ حساب کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم ہر سال کھربوں روٹیاں ضائع کر دیتے ہیں۔"

"کھربوں کیا؟"

"جیسی ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں کے بعد جو کھربوں ہوتا ہے وہ!"

حکیم صاحب کی دو بیویاں ہیں۔ دونوں سے ان کے تعلقات نہایت خوش گوار ہیں۔ ایک پنڈی میں رہتی ہیں۔ ایک لاہور میں، بڑی بیگم پنڈی میں ہیں۔ چھوٹی لاہور میں، آج کل خود حکیم صاحب پنڈی میں رہتے ہیں۔ بڑی بیگم کے پاس "اصولاً" تو انہیں چھوٹی بیگم کے پاس رہنا چاہئے، مگر یہ ایسا نہیں کرتے۔ چونکہ ان کی مراد معقولیت کے ساتھ لگی کھاتی ہے۔ لہذا ہوگی اس میں بھی کوئی حکمت!

لاہور والی چھوٹی بیگم کو روزانہ ایک خط لکھتے ہیں اور ہر ماہ کی پہلی تاریخوں میں لاہور کا ایک چکر بھی لگا لیتے ہیں۔ مقررہ تاریخ پر خرچا دونوں کو دیتے ہیں۔ غرض ان کے اس لین دین میں بھی ایک باضابطگی ہے۔ جس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یوں نہ کرتے تو خوشیاں ان کی دشمن بن جاتیں۔

میں نے پوچھا: "دونوں آپس میں لڑتی نہیں ہیں؟"

اوّل تو ایسی کم ہوتی ہیں، کبھی کبھی یوں ہوا بھی تو میں نے ان کے جھگڑوں میں دخل نہیں دیا۔ دونوں سمجھ دار ہیں۔ وقتی رنجش کے بعد دونوں ہی خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں مَیں احتیاط یہ برتتا ہوں کہ ان کے معاملات میں خاموش رہتا ہوں جھگڑا ہوتا رہتا ہے، میں چپ بیٹھا رہتا ہوں۔ سچی کو سچی اور جھوٹی کو جھوٹی نہیں کہتا۔ میرے ان سے خوشگوار تعلقات کا راز یہی ہے۔

ایک دن بڑی لمبی سرد آہ کھینچی۔ کہا: "مجھے ادب نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اگر یہ لت مجھے نہ پڑتی تو آج میرا ہمدرد دواخانہ کے بعد سب سے بڑا دواخانہ ہوتا۔"

میں نے کہا: "اگر آپ ادب میں نہ پڑتے تو آپ لاکھوں روپوں کے مالک ضرور ہوتے مگر آپ کی یہ عزت نہ ہوتی جو آج ہے اور پھر یہ کہ آپ کے ادبی کارنامے تو آپ کو مدتوں زندہ رکھیں گے۔ جب تک اُردو ہے۔"

"میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔"

"مایوسی کی وجہ؟"

"آپ نے اپنے بارے میں جو مضمون لکھا تھا۔ وہ بالکل صحیح ہے کہ زندہ رہے تو ادب کی خاطر ہزاروں قربانیاں دیں۔ آسائشیں تج دیں۔ روپے پیسے نچھاور کئے۔ مر گئے تو ایک فقرہ حصے میں آیا کہ — "مرحوم نے اپنے زمانے میں بڑا کام کیا تھا۔ اچھے اچھے نمبر نکالے۔" کیا یہ فقرہ ہماری تمام اذیتوں اور تمام جانکاہیوں کا انعام ہو سکتا ہے؟"

"جواب دو!"

میں جواب کیا دیتا۔

ایک دن حکیم صاحب میرے پاس تشریف لائے تو پسینے میں شرابور تھے۔ انتہا درجے کی گرمی تھی۔ اس پر مستزاد، شیروانی پہنے ہوئے تھے اور بٹن بھی سارے بند!

میں نے کہا: "اتنی گرمی میں آخر اس شیروانی کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی۔"

"آخر کیوں؟"

"اگر میں اس وقت شیروانی پہنے ہوئے نہ ہوتا تو مجھے پچاس روپے نہیں مل سکتے تھے۔"

"وہ کیسے؟"

"میں اس وقت ایک مریض کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اُس نے مجھ سے فیس پوچھی، میں نے پچاس روپے کہہ دیئے اگر شیروانی پہنے ہوئے نہ ہوتا تو وہ مجھے بیس روپے بھی نہ دیتا۔"

"ایسے سہاروں پر یقین نہ رکھیں۔ اگر آپ میں کوئی جوہر ہے تو وہ قیمت دلوائے گا۔ کپڑوں سے کیا ہوتا ہے۔"

۱؎ اب تو ان میں سے بڑی بیگم اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔ (۹ اپریل ۱۹۶۶ء) نازش رضوی نے تاریخ وفات کہی: گُل ہو گیا ہے چراغِ خانہ ۱۹۶۶ء

"میں جواہر لال نہرو یا گاندھی نہیں ہوں کہ لنگوٹی باندھ کر بھی —"

"بہرحال قیمت اپنی ڈلوائیے - کپڑوں کی نہیں۔"

تم نے شیخ سعدیؒ کی حکایت پڑھی ہو گی - وہ ایک دعوت میں اپنے روزمرہ کے لباس میں چلے گئے تھے۔ ہیئت دیکھی تو دربان نے اندر جانے نہ دیا - چنانچہ وہ واپس ہوئے - دوبارہ اچھے کپڑے پہن کے گئے تو کسی نے نہ روکا، کھانے پر بیٹھے تو شیخ سعدی کپڑوں کو کھانے میں بھگونے لگے - لوگوں نے پوچھا - حضرت یہ کیا؟ کہنے لگے یہ دعوت تو کپڑوں کی ہے - میری تھوڑی ہی ہے۔"

"حکیم صاحب یہ حکایت تو میں نے سُن رکھی تھی - پھر آپ نے پوری تفصیل سے کیوں دہرائی؟"

"اس لئے کہ تمہارے خیالات قابلِ اصلاح ہیں - اس چکر میں پڑے رہے تو پیچھے رہ جاؤ گے - فوراً ایک موٹر خریدو، ہر مہینے ایک دو سوٹ بنواؤ - جتنی زیادہ ٹیپ ٹاپ میں رہو گے لوگ اتنی زیادہ قدر کریں گے - کام کرنے کی بھی ضرورت نہیں - صرف باتیں کرنے کا فن سیکھو، پھر دیکھو تم کہاں سے کہاں پہنچتے ہو۔"

"میں جہاں ہوں - وہیں ٹھیک ہوں۔"

"میں بھی یہی سوچا کرتا تھا - یہی وجہ ہے کہ آج رو رہا ہوں۔"

میں نے سوچا یہ تو بڑی اونچی ہوا میں اُڑ رہے ہیں - قناعت کے بھی دعوے دار ہیں - حالانکہ اوروں کی طرح، انہوں نے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھایا ہو گا - سوال سُوجھا - شیطان نے بھی وسوسے کو تقویت بہم پہنچائی -

"آپ نے ایک دفعہ حیدر آباد (دکن) کے بارے میں بھی تو ایک نمبر چھاپا تھا - جس میں نہ صرف نواب صاحب کے بڑے بڑے فوٹو چھاپے تھے - بلکہ شہزادوں اور شہزادیوں تک کے فوٹو چھاپے تھے - اور پھر وہاں کے رؤسا او امراء کے بھی تو حالاتِ زندگی چھاپے تھے۔"

"ہاں چھاپے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"نواب صاحب تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے اہلِ علم کی خدمت کیا کرتے تھے - ضرور آپ کو بھی نوازا ہو گا - جبکہ آپ نے ان کے بارے میں نمبر بھی چھاپا ہو۔"

"میں نے اپنی عادت کے مطابق، نواب صاحب سے کسی قسم کی درخواست کرنا پسند نہیں کیا تھا۔"

"خود نواب صاحب نے بھی خیال نہ رکھا؟"

"رکھا تھا۔"

"کیا؟"

"میرے پاس ایک خط آیا تھا - جس میں لکھا تھا کہ شاہی فرمان جاری ہوا ہے جس کے مطابق آپ کی خدمت میں سوا چار روپے بطور

سالانہ چندہ ارسال کئے جا رہے ہیں۔"

نقوش کی بیسویں سالگرہ تھی۔ حکیم صاحب بھی مدعو تھے۔ راولپنڈی سے بطورِ خاص آئے تھے۔ پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔ تقریریں ہو رہی تھیں۔ تعریفی جملے پھینکے جا رہے تھے۔

میں نے بھی دیکھا اوروں نے بھی دیکھا کہ حکیم صاحب کرسی پہ بیٹھے ہیں۔ زاویہ یہ ہے کہ چھڑی ہاتھ میں ہے۔ جس کا دوسرا سرا زمین پہ ٹکا رکھا ہے۔ سر جھکائے، چھڑی پہ جھکے بیٹھے ہیں۔ جیسے حد درجہ ملول ہوں۔

میں نے سوچا ـــــ نہ جانے ایسے کیوں بیٹھے ہیں۔

جب میں نے اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے جواب دیا "آپ بھی کیا بھولے بنتے ہیں۔ حالانکہ جانتے سب کچھ ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ وہ سوچتے ہوں گے کہ میں نے بھی اپنے وقت میں کیا کچھ نہ کیا۔ مگر میری اتنی پذیرائی نہ ہوئی۔ صاحب جنوں تو وہ بھی تھے۔ پریشان کیوں نہ ہوتے؟

بات سچی تھی۔ انھیں ایسا سوچنے کا حق تھا۔ پھر حکیم صاحب مجھے ملے بغیر واپس راولپنڈی چلے گئے۔ کوئی ہفتہ بھر بعد خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ سخت بیمار ہوں۔ کمر میں اتنا شدید درد ہے کہ تڑپتا رہتا ہوں۔ اس روز بھی جب کہ 'نقوش' کی تقریب تھی۔ میں ایسی ہی تکلیف میں مبتلا تھا۔ حال یہ تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ تڑپ رہا تھا مگر دل یہ کہتا تھا کہ یہ تقریب دوست کی ہے۔ جیسے بھی بیٹھ سکتے ہو، بیٹھے رہو۔"

خلوص اور اخلاق کا اس نہج پہ بھی ساتھ دینا حکیم صاحب ہی کا کام تھا۔

میں نے حکیم صاحب سے پوچھا "حکیم احمد شجاع نے آپ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ آپ خاکسار بھی رہے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"ایک مدیر اور ادیب، خاکسار؟"

"میں اس تحریک سے متاثر تھا۔ اس میں جو دوسروں کی خدمت کا جذبہ تھا۔ وہ بڑا قابلِ قدر تھا۔ میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے معقول لوگ اس تحریک میں شامل ہو رہے ہیں تو میں بھی شامل ہو گیا ایک سپاہی کی حیثیت سے، اس تحریک کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کوئی کُسکٹ[1] نہ سکتا تھا۔ اگر علامہ نے کسی سے ناراض ہو کر اُس کے دُرّے بھی لگا دیئے تو اُس نے چوں نہ کی۔ بڑے بڑے لوگ بھی اُس سزا کو ہنسی خوشی جھیل گئے۔ ایسی تحریک جس نے آزار کو بھی لذّت کا درجہ دے دیا ہو میں نے نہیں دیکھی۔

علامہ کو علم ہوا کہ نیرنگِ خیال کا ایڈیٹر تحریک میں شامل ہو گیا ہے تو انہوں نے ایک حکم کے ذریعے مجھے بمبئی کا گورنر بنا دیا۔"

---

[1] یہ لفظ پنجابی کا ہے۔ جس کے معنی دم نہ مار سکنے کے ہیں۔

"گورنر؟"

"ہاں گورنر! جب میں نے یہ آرڈر سنا تو ہکا بکا رہ گیا۔ اس آرڈر کے ساتھ حکم یہ بھی تھا کہ بمبئی سے پانچ لاکھ خاکسار بھرتی کئے جائیں۔"

انہی دنوں پشاور کے ایک سپاہی کو بھی یہ حکم ملا تھا کہ آپ کو رنگون کا گورنر بنایا جاتا ہے۔ اُن کا حال تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ میں اتنے بڑے عہدے کو سنبھال نہیں سکتا اس لئے تحریک سے الگ ہو گیا۔ پھر تبصرہ یوں بھی کیا کہ "علامہ حساب کے ماہر تھے۔ اس مضمون کی بڑی بڑی ڈگریاں ان کے پاس تھیں۔ مگر وہ یہ حساب نہ لگا سکے کہ میری تحریک کا کیا ہو گا!"

یہ علامہ مشرقی کے آرڈر پر بمبئی کے گورنر نہ بنے۔ بنتے بھی کیسے؟ یہ تو خود صحافتی ادب کے وائسرائے تھے۔ اس لئے یہ کیوں اپنے مرتبے سے کم عہدے پر راضی ہوتے۔

پھر گویا ہوئے :۔

میری زندگی میں ایک واقعہ ایسا ہے۔ جس کے بارے میں میں آج تک اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ میرا وہ قدم صحیح تھا یا غلط، یہ قصہ اُن دنوں کا ہے کہ جب مسجد شہید گنج کے سلسلے میں لوگ سر سے کفن باندھ کے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دلی دروازے سے لے کر مسجد تک لاکھوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ہر شخص شہادت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

انہی دنوں، اکابرین کا ایک جلسہ راولپنڈی میں ہوا۔ پیر جماعت علی شاہ جو اس جلسے کے صدر تھے انہوں نے اعلان کیا کہ یہاں جتنے خفیہ پولیس کے سپاہی موجود ہیں۔ وہ سب کے سب یہاں سے نکل جائیں۔ ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔"

چنانچہ جتنے سپاہی تھے۔ وہ چپکے سے اُٹھے، باہر نکل گئے۔ تب مسجد کے دروازے بند کر دیئے گئے اور جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ سب بے حد جوش تھا۔ سر کٹانے کا جذبہ بے حد راسخ!

میں اُسی جلسے کے لئے لاہور سے پنڈی پہنچا تھا۔ تقریریں سُنیں تو میرے دل میں بھی یہ آرزو انگڑائیاں لینے لگی کہ جب موت ہر شخص کے مقدر میں ہے تو کیوں نہ کسی مقصد کے لئے جان دی جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو کام آ جانے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ بندۂ خاک تھا۔ باشندۂ آفاق کی جستجو بڑھی۔

جلسہ سُن کر واپس پہنچا تو جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس دفتر کے سامنے سے ایک شخص کبھی اِدھر جاتا تھا کبھی اُدھر، ساتھ ہی وہ مجھے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا جب دو تین مرتبہ یوں ہوا تو میں نے اُسے بلایا اور پوچھا "خیر باشد؟"

"آپ حکیم یوسف حسن ہی ہیں؟"

"جی ہاں!"

"ایک ضروری کام ہے۔"

"فرمائیے۔"

"مجھے لاہور سے ایس۔ پی صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں آج کے جلسے کی صحیح رپورٹ سے آگاہ کریں۔"

"کیا تم نے مجھے مخبر سمجھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر؟"

"بات یہ ہے کہ آپ کی وساطت سے گورنمنٹ تک صحیح رپورٹ پہنچ جائے گی اور مسلمانوں کے جذبات سے حکومت آگاہ ہو جائے گی اور یہ مسلمانوں کی صحیح معنوں میں خدمت ہوگی۔ ورنہ کسی غیر مسلم نے غلط سلط رپورٹ دے دی اور حکومت نے اُسے صحیح جان لیا تو مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔"

یہ باتیں سُن کر میں سوچنے لگ گیا۔ کیا کروں؟ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مسلمانوں کے جذبات، حکومت تک پہنچانا چاہئیں۔ چنانچہ میں نے اس دن کی ساری کارروائی تفصیل کے ساتھ، کوئی دس بارہ صفحوں میں لکھوا دی۔ بیشتر اکابرین کی تقریروں کے صحیح صحیح جملے تک لکھوا دیئے۔

دوسرے دن پھر جلسہ تھا۔ میں جلسے سے فارغ ہو کر اپنے میزبان کے پاس پہنچا۔ اُن سے کہا۔ میں اپنے ایک عزیز کے ہاں فلاں گاؤں جا رہا ہوں۔ دو تین دن تک واپس آؤں گا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ نہ میں یہاں ہوں گا۔ نہ پولیس مجھ سے رپورٹ لے سکے گی۔ میں گزشتہ دن کی کارروائی سے مذبذب میں تھا۔ وسوسے تھے۔

جس دن میں گاؤں پہنچا۔ اُسی رات کوئی گیارہ بجے کے قریب وہی صاحب پھر آن دھمکے۔ "حکیم صاحب ہم آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو گئے ہیں۔"

"آپ سے چھپ کر تو یہاں پہنچا تھا۔ آپ یہاں بھی پہنچ گئے۔"

"یوں نہ سوچیں۔ آپ کی رپورٹ بڑی موثر ثابت ہوئی۔ ہمارے انسپکٹر جنرل پولیس (جو انگریز ہیں) کہتے ہیں کہ تمام رپورٹوں میں یہی رپورٹ درست معلوم ہوتی ہے باقی سب سنی سنائی اور غلط ہیں۔ انہوں نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جس شخص نے کل رپورٹ دی تھی۔ اُسی سے آج رپورٹ حاصل کی جائے۔"

"بات یہ ہے کہ میں اس بات کو مناسب نہیں سمجھتا کہ حکومت کا آلۂ کار بنوں۔"

"آلۂ کار بننے کا سوال نہیں۔ غلط رپورٹ پر غلط کارروائی ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچے گا؟"

غرض میں نے پھر کارروائی کی تفصیل لکھوا دی۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے تبصرہ یوں کیا کہ مجھے معلوم نہیں کہ میرا وہ قدم جادۂ حق کی جانب تھا یا اس کے برعکس، بہرحال اُس واقعہ کی پھانس کو میں آج تک نہیں نکال سکا۔ جب بھی وہ دن یاد آتے ہیں۔ ایک چبھن سی محسوس کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آخر پولیس نے آپ کو اس کام کے لئے چنا کیوں؟"

"ہاں! آپ کا یہ سوال بڑا اہم ہے۔"

"اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا چھوٹا بھائی یعسوب الحسن کٹر کانگریسی تھا۔ حکومت کو اس کے خلاف بڑی شکایتیں تھیں۔ مگر وہ اسے مجھے مجبور کرتے تھے کہ یا تو یعسوب الحسن کو سمجھاؤ یا پھر ایس۔ پی پولیس سے کہو کہ وہ یعسوب الحسن کے بارے میں کوئی سخت قدم نہ اٹھائے۔

چونکہ ان دنوں ایس، پی پولیس محمود نظامی مرحوم کے عزیز تھے۔ اس لئے میری نظامی صاحب کی معرفت اُن سے شناسائی تھی۔"

"کیا آپ بھائی کے مستقبل کی وجہ سے، رپورٹیں دینے پر راضی ہوئے تھے؟"

"بالکل نہیں، اگر مسلمانوں کے مفاد میں میرے بھائی کو پھانسی بھی لگ جاتی تو مجھے ملال نہ ہوتا اور اگر مسلمانوں کے مفاد میں مجھے بھی پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تو بھی ہنسی خوشی لٹک جاتا۔

یہ تھا ایک صاحب روایت شخصیت کا احوال! کچھ میری کچھ اُن کی زبانی!

سعادت حسن منٹو

کی یاد میں

راجو

منٹو کی ایک غیر مطبوعہ کہانی

سن اکتیس کے شروع ہونے میں صرف رات کے چند برفانے ہوئے گھنٹے باقی تھے۔ وہ لحاف میں سردی کی شدت کے باعث کانپ رہا تھا۔ پتلون اور کوٹ سمیت لیٹا تھا، لیکن اس کے باوجود سردی کی لہریں اُس کی ہڈیوں تک پہونچ رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنے کمرے کی سبز روشنی میں جو سردی میں اضافہ کر رہی تھی، زور زور سے ٹہلنا شروع کر دیا کہ اُس کا دورانِ خون تیز ہو جائے۔

تھوڑی دیر یوں چلنے پھرنے کے بعد جب اُس کے جسم کے اندر تھوڑی سی حرارت پیدا ہو گئی، تو وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور سگرٹ سُلگا کر اپنے دماغ کو ٹٹولنے لگا۔ اس کا دماغ چونکہ بالکل خالی تھا، اس لئے اُس کی قوتِ سامعہ بہت تیز تھی۔

کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں، مگر وہ باہر گلی میں ہوا کی مدھم سے مدھم گنگناہٹ بڑی آسانی سے سُن سکتا تھا۔

اِسی گنگناہٹ میں اُسے انسانی آوازیں سنائی دیں۔ ایک دبی دبی چیخ دسمبر کی آخری رات کی خاموشی میں چابک کے اول کی طرح اُبھری۔ پھر کسی کی التجائیہ آواز لرزی — وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور اُس نے کھڑکی کی درز میں سے باہر کی طرف دیکھا۔

وہی — وہی لڑکی یعنی سوداگروں کی نوکرانی میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی۔ صرف ایک سفید بنیان پہنے لیمپ کی روشنی میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے بدن پر برف کی ایک پتلی سی تہہ جم گئی ہے۔ اُس کے بنیان کے نیچے، اُس کی بدنما چھاتیاں، ناریلوں کے مانند لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس انداز میں کھڑی تھی، گویا ابھی ابھی کشتی سے فارغ ہوئی ہے — ایسی حالت میں دیکھ کر سعید کے صناعانہ جذبات کو دھچکا سا لگا۔

اِتنے میں کسی مرد کی بھینچی بھینچی آواز اُس کو سُنائی دی۔ خدا کے لئے اندر چلی آؤ — کوئی دیکھ لے گا تو آفت ہی آ جائے گی۔

وحشی بلی کی طرح اُس نے غرّا کر جواب دیا۔ "میں نہیں آؤں گی — بس ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں آؤں گی۔"

سوداگر بچے نے التجا کے طور پر اُس سے کہا۔ "خدا کے لئے اونچے نہ بولو، کوئی سُن لے گا، راجو۔"

تو اُس کا نام راجو تھا۔ راجو نے اپنی لنڈوری چُٹیا کو جھٹکا دے کر کہا۔ "سُن لے — ساری دنیا سُن لے — خدا کرے ساری دُنیا سُن لے۔ اگر تم مجھے یوں ہی اپنے کمرے کے اندر آنے کے لئے کہتے رہو گے، تو میں خود محلے بھر کو جگا کر سب کچھ کہہ دوں گی۔"

راجو اُسے نظر آ رہی تھی، مگر وہ جس سے مخاطب تھی۔ وہ اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

اُس نے بڑی درز سے راجو کو دیکھا، اور اُس کے بدن پر جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ اگر وہ ساری کی ساری ننگی ہوتی تو شاید اُس کے صناعانہ جذبات کو ٹھیس نہ پہونچتی۔ لیکن اُس کے جسم کے وہ حصے جو ننگے تھے، دوسرے مستور حصوں کو عریانی کی دعوت دے رہے تھے۔ راجو میونسپل کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عورت کے متعلق اُس کے جذبات اپنے کپڑے اتار رہے ہیں۔

راجو کی غیر متناسب باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، نفرت انگیز طور پر لٹک رہی تھیں۔ مردانہ بنیان اور رگوں لگے میں سے اُس کی بڑی بڑی ڈبل روٹی ایسی موٹی اور نرم چھاتیاں، کچھ اِس انداز سے باہر جھانک رہی تھیں، گویا سبزی ترکاری کی ٹوٹی ہوئی ٹوکری میں سے گوشت کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہوں۔ زیادہ گھسا استعمال سے گھسی ہوئی پتلی بنیان کا نچلا گھیرا خود بخود اُوپر کو اُٹھ گیا تھا اور راجو کی ناف کا گڑھا، اُس کے خمیرے آٹے ایسے پھولے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے کسی نے انگلی کھبو دی ہو۔

یہ نظارہ دیکھ کر اُس کے دماغ کا ذائقہ خراب ہوگیا۔ اُس نے چاہا کہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر پر لیٹ جائے، اور سب کچھ بھول بھال کر سو جائے، لیکن جانے کیوں، وہ سوراخ پر آنکھ جمائے کھڑا رہا؟

راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کے دل میں کافی نفرت پیدا ہوگئی تھی — شاید وہ اسی نفرت کی وجہ سے اُس سے دلچسپی لے رہا تھا۔

سوداگر کے سب سے چھوٹے لڑکے نے جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ایک بار پھر التجائیہ لہجے میں کہا "راجو خدا کے لئے اندر چلی آؤ — میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی تمہیں نہیں ستاؤں گا — لو اب من جاؤ — یہ تمہاری بغل میں وکیلوں کا مکان ہے، اُن میں سے کسی نے دیکھ پایا تو بڑی بدنامی ہوگی۔

راجو خاموش رہی لیکن تھوڑی دیر کے بعد بولی "مجھے میرے کپڑے لادو — بس، اب میں تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی — تنگ آگئی ہوں — میں کل سے وکیلوں کے ہاں نوکری کر لوں گی — سمجھے؟ — اب اگر تم نے مجھ سے کچھ اور کہا تو خدا کی قسم شور مچانا شروع کر دوں گی — میرے کپڑے چپ چاپ لا کے دے دو۔"

سوداگر کے لڑکے کی آواز آئی "لیکن تم رات کہاں کاٹو گی؟"

راجو نے جواب دیا "جہنم میں — تمہیں اس سے کیا — جاؤ، تم اپنی بیوی کی بغل گرم کرو — میں کہیں نہ کہیں سو جاؤں گی۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے — وہ سچ مچ رو رہی تھی۔

سوراخ پر سے آنکھ ہٹا کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ راجو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُسے عجیب قسم کا صدمہ ہوا تھا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس صدمے کے ساتھ وہ نفرت بھی لپٹی ہوئی تھی جو راجو کو اُس حالت میں دیکھ کر اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی، مگر غایت درجہ نرم دل ہونے کے باعث وہ پگھل سا گیا۔ راجو کی کٹیلی آنکھوں میں جو شیشے کے مرتبان میں چمکدار مچھلیوں کی طرح سدا متحرک رہتی تھیں، آنسو دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ انھیں تھپکا کر دلاسا دے۔

راجو کی جوانی کے چار قیمتی برس سوداگر بھائیوں نے معمولی چٹائی کی طرح استعمال کئے تھے۔ اِن برسوں میں تینوں بھائیوں کے نقش قدم کچھ اِس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ اُن میں سے کسی کو اِس بات کا خوف نہیں رہا تھا کہ کوئی اُن کے پیروں کے نشان پہچان لے گا، اور راجو کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے قدموں کے نشان دیکھتی تھی، نہ دوسروں کے۔

اُسے بس چلتے جانے کی دُھن تھی، کسی بھی طرف۔ پر اب شاید اُس نے مڑ کے دیکھا تھا۔ مڑ کے اُس نے کیا دیکھا تھا، جو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے — یہ اُس کو معلوم نہیں تھا۔

باہر سن تیس کی آخری رات دم توڑ رہی تھی اور اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔

وہ کہاں گئی؟ — کیا وہ اندر چلی گئی تھی؟ — کیا وہ مان گئی تھی؟ — مگر سوال یہ تھا کہ وہ کس بات پر جھگڑی تھی؟ — راجو کے کانپتے ہوئے نتھنے ابھی تک اُس کو نظر آ رہے تھے۔ ضرور اُس کے اور سوداگر کے لڑکے کے درمیان جس کا نام محمود تھا، کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا، جبھی تو وہ دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی رات میں صرف ایک بنیان اور شلوار کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ اور اندر جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ راجو کو دکھی دیکھ کر اُس کے ایک نامعلوم جذبے کو تسکین پہونچی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں رحم کے جذبات بھی پیدا ہوئے تھے ——— ۔ کسی عورت سے اُس نے کبھی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لئے وہ راجو کو دکھی دیکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اُس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کر سکے۔

اُسے یقین تھا کہ اگر وہ راجو کے قریب ہونا چاہے گا۔ تو وہ جنگلی گھوڑی کی طرح بدکے گی نہیں۔ راجو۔ خاف چڑھی عورت نہیں تھی۔ وہ جیسی بھی تھی، دُور سے نظر آ جاتی تھی۔ اُس کی بھدی اور موٹی ہنسی جو اکثر اُس کے مٹ جیسے ہونٹوں پر بچوں کے ٹوٹے ہوئے گھروندے کے مانند نظر آتی تھی، اچھی ہنسی تھی — بڑی صحت مند — اور اب کہ اُس کی بھونرے جیسی متحرک آنکھوں نے آنسو اُگلے تھے، تو اُن میں کوئی مصنوعی پن نہیں تھا۔

راجو کو وہ ایک مدت سے جانتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے چہرے کے تمام خطوط تبدیل ہوئے تھے، اور وہ غیر محسوس طریق پر لڑکی سے عورت بننے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تین سوداگر بھائیوں کو بجوم نہیں سمجھتی تھی — یہ بجوم اُسے پسند نہیں تھا۔ اس لئے کہ ایک عورت کے ساتھ وہ صرف ایک مرد منسلک دیکھنے کا قائل تھا — مگر یہاں — یعنی راجو کے معاملے میں اُسے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے درمیان رُک جانا پڑتا تھا۔

اس واقعے کے دوسرے روز جب وہ جاگ رہا تھا — لحاف اوڑھے بیٹھا تھا کہ راجو آئی۔ اُس نے کمرہ صاف کیا۔ اُس نے یہ سمجھا کہ شاید جمعدار ہے — جو آج جلدی آ گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے لحاف کے اندر سے کہا۔ "دیکھو بھئی —— گرد مت اڑانا۔"

ایک نسوانی آواز اُس کو سنائی دی "جی میں — جی میں تو —"

اُس نے لحاف اپنے سے جدا کیا اور دیکھا کہ راجو ہے —— وہ بہت متحیر ہوا۔ چند لمحات وہ اُس کو دیکھتا رہا — اس کے بعد اُس سے مخاطب ہوا۔ "تم یہاں کیسے آئی ہو؟"

راجو نے جھاڑن اپنے کاندھے پر رکھ کر جواب دیا۔ "میں آج صبح یہاں آئی ہوں — سوداگروں کی نوکری میں نے چھوڑ دی ہے۔"

اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے — بہرحال اُس نے اتنا کہہ دیا۔ "اچھا کیا —— اب کیا تم نے ہمارے یہاں ملازمت اختیار کر لی ہے؟"

"جی ہاں —" یہ اُس کا مختصر جواب تھا۔

اُس کو راجو سے سخت نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے گھر میں اُس کا کسی قسم کا دخل نہ ہو، لیکن اُس کی والدہ جو بہت جلد

تھیں اور جنھیں نوکرانی کی ضرورت بھی تھی، اس لئے انہوں نے راجو کو ملازم رکھ لیا۔

اُس کو بڑی اُلجھن محسوس ہوئی کہ وہ رات کا تماشا دیکھ چکا تھا۔ اسے اُس سے نفرت تھی — اس قدر نفرت کہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اُس کی نظروں کے سامنے نہ آئے۔

مگر وہ آتی تھی — صبح، ناشتہ لے کر آتی — شیو کا سامان لے کر آتی۔ دوپہر کا کھانا پیش کرتی۔ مگر اُس کو یہ سب باتیں بہت ناگوار گزرتیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجو اُس سے اس قسم کا سلوک کرے۔

چنانچہ ایک دن اُس نے تنگ آکر اُس سے کہا "دیکھو، راجو — مجھے تمہاری ہمدردیاں پسند نہیں — میں اپنا کام خود کر سکتا ہوں — تم مہربانی کرکے تکلیف نہ کیا کرو۔"

راجو نے بڑی متانت سے کہا "سرکار — مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی — میں تو آپ کی باندی ہوں۔"

وہ جھینپ سا گیا "ٹھیک ہے — ٹھیک ہے — تم نوکرانی ہو — بس اس کا خیال رکھو۔"

راجو نے تپائی کا کپڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا "جی مجھے ہر چیز کا خیال ہے — مجھے اس بات کا بھی خیال ہے کہ آپ مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔"

وہ کُٹ پٹ گیا "میں — میں تمہیں اچھی نظروں سے کیوں نہیں دیکھتا — یہ — یہ تم نے کیسے جانا؟"

راجو مسکرائی "حضور آپ امیر آدمی ہیں — آپ کو ہم غریبوں کے دکھ درد کا کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔"

اُس کو راجو سے اور نفرت ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگا کہ یہ لڑکی جو اُس کے گھر میں اُس کی والدہ کی نرم طبیعت کی وجہ سے آ گئی ہے، بہت واہیات ہے۔

راجو بڑی باقاعدگی سے کام کرتی رہی — اُس میں کوئی نقص نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

جب رشید کی شادی کا سوال اُٹھا تو وہ بہت مضطرب ہوا۔ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا — رشید نے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھے یہ جھنجھٹ ابھی نہیں چاہیئے۔ اُس کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ شادی کرے، مگر وہ نہ مانا — اُسے کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی۔

ایک دن وہ گھر سے غائب ہو گیا — اُس کے ساتھ راجو بھی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی بن چکے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

۱۲ جنوری ۱۹۵۵

۱۰

(جب اُس کی شادی کا سوال اُٹھا تو وہ بہت مضطرب ہوا۔ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھے یہ جھنجھٹ ابھی نہیں چاہیئے۔

اُس کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ شادی کرے، مگر وہ نہ مانا۔ اُسے کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی۔

ایک دن وہ گھر سے غائب ہو گیا۔ اُس کے ساتھ راج بھی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی بن چکے ہیں۔)

منٹو مر گیا، منٹو زندہ باد

مظفر حسین شمیم

نپولین کی وفات کے کئی سال بعد جب سینٹ ہیلینا سے نپولین کا جنازہ فرانس لایا گیا تو جنازے کا استقبال کرنے کے لیے جو لوگ ساحل پر جمع تھے، انہوں نے نپولین مرگیا، نپولین زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اس روز جب پہلے پہل مجھے منٹو کے انتقال کی خبر پہنچی تو بلا سوچے سمجھے میری زبان سے نکل گیا، "منٹو مرگیا، منٹو زندہ باد" شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں منٹو کو سالہا سال سے جانتا تھا اور ان کی ادبی زندگی کا سارا ارتقاء میرے سامنے ہوا۔ منٹو جن حالات میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی زندگی جس ماحول میں گزری اسے پیش نظر رکھ کر کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ آئندہ چل کر ان کا اردو کے بہت اچھے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگے گا۔ ٹھیک اسی طرح نپولین کی ابتدائی زندگی کو دیکھ کر اس زمانے میں کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ نپولین کا آنے والے زمانے میں دنیا کے بڑے جنرلوں میں شمار ہوگا۔ ان کی اور نپولین کی زندگی میں ایک چیز اور مشترک تھی۔ جس طرح نپولین کی ساری زندگی اپنے ماحول سے لڑتے بیت گئی، اسی طرح منٹو کو بھی زندگی بھر بہت سی چیزوں سے لڑتے رہنا پڑا۔ یہ میں بطور تشبیہ لکھ رہا ہوں ورنہ ظاہر ہے کہ نپولین اور منٹو کے عملی میدان بالکل مختلف تھے اور اس لحاظ سے دونوں میں مماثلت کا کوئی پہلو نہیں نکل سکتا۔

منٹو سے بیس برس پہلے، عرب ہوٹل میں پہلی ملاقات ہوئی تھی، اب یاد تو نہیں رہا کہ کس شخص نے ان سے تعارف کرایا تھا، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس موقع پر ان کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا، جس میں کچھ کتابیں اور کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے، اور وہ ریشم کی ایک پٹے دار قمیض اور شلوار میں ملبوس تھے۔ اس ملاقات میں انہوں نے مجھے اس بیگ میں سے نکال کر دو افسانوں کے ترجمے پڑھنے کے لیے دیئے اور ان ترجموں کے متعلق میری رائے معلوم کرنا چاہی۔ میں نے ان ترجموں کو پڑھ کر انہیں اپنی رائے بتا دی۔ یہ منٹو کی تحریری زندگی کا آغاز تھا۔ اس زمانے میں وہ امرتسر میں رہا کرتے اور کبھی کبھی لاہور آجایا کرتے تھے۔ اس ملاقات کے کچھ عرصے بعد وہ مستقل طور پر لاہور چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اب ان سے روزانہ ملاقاتیں ہونے لگیں، اور یہ ملاقاتیں اتنی بڑھیں کہ ان کی فرصت کے اوقات زیادہ تر میرے ساتھ بسر ہونے لگے۔

اس زمانے میں وہ بیمار تھے۔ ان کے سینے میں شدید درد کی تکلیف رہا کرتی تھی، بعض ڈاکٹروں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ انہیں دق کا مرض لاحق ہے۔ جب انہوں نے مجھے ڈاکٹروں کی تشخیص کا حال بتایا تو میں نے ان کی پوری مزاجی کیفیت معلوم کی اور حکیم فقیر محمد چشتی سے جا کر ملا، حکیم صاحب نے مجھے دوسرے دن منٹو کو ساتھ لانے کی ہدایت کی۔ حکیم صاحب کے حسب ہدایت میں دوسرے دن منٹو کو لے کر ان کے مطب میں حاضر ہوا۔ تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد حکیم صاحب نے فرمایا کہ انہیں دق نہیں ہے بلکہ سینے کی ایک جھلی میں ورم آگیا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایک نسخہ لکھ کر دے دیا اور میں نے وہ نسخہ حکیم صاحب کے دواخانے سے بنوا کر منٹو کے حوالے کر دیا، اور اب منٹو یہ نسخہ پینے لگے۔ اسی بیچ میں ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ انجمن حمایت اسلام نے اخبار کے ادارۂ تحریر کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے، میں اس جگہ کے لیے کوشاں ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ نہ تو مجھے انجمن کے کاروبار سے واقفیت ہے اور نہ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی ہے، اور نہ اخباری نوٹ اور ایڈیٹوریل

لکھنے ہی آتے ہیں یہ سن کر میں نے کہا کہ تم ان چیزوں کی مطلق فکر نہ کرو، جب ایڈیٹر بن کر کرسیِ ادارت پر بیٹھو گے تو ان میں سے ہر چیز تمہیں خود بخود آ جائے گی۔ مثل مشہور ہے کہ چبوترہ کوتوالی سکھا دیتا ہے۔ میری یہ بات سن کر منٹو کھلکھلا کر ہنس پڑے اور میرے مشورے کے مطابق اس اخبار کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ اسی بیچ میں انہوں نے رسالہ ہمایوں کا ایک فرانسیسی ادب نمبر نکال دیا۔ اس خاص نمبر میں جو ترجمے چھپے تھے وہ انگریزی سے کیے گئے تھے اور زیادہ تر ان ہی کے قلم سے نکلے تھے۔ اس زمانے میں وہ وقتاً فوقتاً امرتسر جاتے رہتے تھے۔ ایک بار وہ اصرار کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ امرتسر لے گئے۔ اس سفر میں پہلی بار ان کی والدہ محترمہ سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد مجھے چند مرتبہ اور ان کے ساتھ امرتسر جانے کا اتفاق ہوا۔ ان ملاقاتوں میں ان کی والدہ مجھ آشفتہ حال پر بہت مہربان ہو گئیں۔ اصل میں منٹو کم عمری ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ مجھے ان سے ان کی والدہ کے جو حالات معلوم ہوئے۔ ان سے میں نے اندازہ لگایا کہ منٹو کے والد کی وفات کے بعد ان کے رشتہ داروں نے ان سے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

اس بیچ میں انہوں نے حافظ محمد عالم سے مل کر عالمگیر کا ایک خاص نمبر نکالنے کا معاہدہ کیا۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے کے پاس ایک ہوسٹل میں ایک کمرہ لے کر رہنے لگے تھے۔ ایک روز شام کو وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ آج آپ کو میرے ساتھ ہوسٹل چلنا اور وہیں سونا پڑے گا۔ میں ان کے ساتھ ہوسٹل پہنچ گیا۔ وہاں انہوں نے اس خاص نمبر کی کاپیاں مجھے دکھائیں اور اس کا پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس نمبر کے کئی افسانے وہ مجھے پہلے دکھا چکے تھے۔ چنانچہ میں نے وہیں بیٹھ کر اس کا پیش لفظ لکھ دیا، اور وہ اس نمبر کے ساتھ شائع ہوا۔

اس زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ انجمن حمایت اسلام نے اپنے سالانہ اجلاسوں میں سے ایک اجلاس "اردو" کے لیے وقف کر دیا اور اس اجلاس کی صدارت کے لیے مولوی عبدالحق صاحب کو دعوت دی۔ خدا جانے منٹو نے انجمن کے اربابِ حل و عقد سے کیا کہہ دیا کہ جس روز یہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا، انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں مولوی صاحب کے تعارف کے سلسلے میں ایک تقریر کروں۔ میں نے انجمن کے ارکان سے کہا کہ مجھ سے زیادہ بہتر مقرر آپ کو آسانی سے مل سکتے ہیں۔ آپ یہ کام ان میں سے کسی کے ذمے کر دیجیے۔ لیکن ان لوگوں نے میری معذرت کو محض میرے "انکسار" پر محمول کیا اور مجھے تقریر کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس موقع پر بلا سوچے ایک تقریر شروع کی۔ یہ مجھے اب یاد نہیں کہ میں رو میں کیا کچھ کہہ گیا، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ تقریر ختم کرتے ہوئے جب میری زبان سے یہ جملہ نکلا کہ "مولوی عبدالحق مسلمانانِ ہند کی اس گذشتہ باعظمت تہذیب کی یادگار ہیں، جس کا آخری چراغ ۱۸۵۷ء کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لا کر ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا" تو ہر طرف سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ غرض کہ اس طرح میں بھرے جلسے میں خفیف ہوتے ہوتے بال بال بچ گیا۔ یہ واقعہ میں نے محض یہ دکھانے کے لیے لکھا ہے کہ منٹو میں اپنی سادگی کی وجہ سے بعض دلچسپ بے ربطیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بے ربطی یہ تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں سے پوچھے بغیر کسی کام کا بھی ان کی جانب سے وعدہ کر لیا کرتے تھے۔ ان کی اس دلچسپ سادگی کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے دوستوں کو خاصا پریشان ہونا پڑتا تھا۔ اسی دوران میں ایک روز لالہ کرم چند مالک و ایڈیٹر پارس نے مجھ سے کہا کہ پارس کے ادارۂ تحریر کے لیے کسی اچھے آدمی کا انتظام کر دو۔ میں نے منٹو کا نام پیش کیا اور لالہ جی نے ان کا نام منظور کر لیا۔ اس کے بعد میں نے منٹو سے لالہ جی کی اس گفتگو کا حال بتایا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ پارس میں چلے جائیں۔ انہوں نے میرے اس مشورے کو مان لیا اور پارس میں آ گئے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور دوسری طرف ان کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ جب تشویش زیادہ بڑھی تو ان کا معائنہ ایک ایسے ڈاکٹر سے کرایا گیا جسے دق کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس ڈاکٹر

نے یہ کہا کہ منٹو کو دق کی ابتدا ہے، انہیں فوراً لاہور سے کسی ایسے مقام پر بھیج دینا چاہیے، جہاں کی آب و ہوا اس مرض کے مریضوں کے لیے خوشگوار ہو۔ جب ان کی والدہ محترمہ کو ڈاکٹر کی اس رائے کا علم ہوا تو انہوں نے انہیں جموں سے ساٹھ میل آگے بٹوت نامی ایک خوشگوار مقام پر بھیجنے کا انتظام کیا اور منٹو لاہور سے بٹوت چلے گئے! بٹوت ایک اجاڑ گاؤں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ وہاں کی تنہائی اور خاموشی میں بیٹھ کر وہ نہایت دلچسپ خطوط لکھا کرتے تھے میں نے ان میں سے دو خطوں کے ان حصوں کو جن میں افسانوی رنگ تھا اپنے نوٹ کے ساتھ اس زمانے کے بعض رسالوں میں شائع کرایا تھا۔ یہ افسانوی مضامین اب اُن کے بعض مجموعوں میں شامل ہیں جو لوگ اس زمانے کے منٹو کی نفسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے ان افسانوی مضامین (میں انہیں افسانوں کے نام سے موسوم نہیں کروں گا) اور منٹو کی ایک ابتدائی کتاب "آتش پارے" میں سے "دیوانہ شاعر" نامی افسانے کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس دور کے منٹو میں جوانی، معصومیت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ بات بات پر لوگوں سے اُلجھتے اور طول طویل لاطائل ادبی بحثیں کیا کرتے تھے۔ ایک بار ساغر نظامی صاحب لاہور تشریف لائے وہ عرب ہوٹل کے قریب، ایک پبلشر کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہیں سے منٹو آ گئے کسی شخص نے ساغر صاحب سے منٹو کا تعارف کرا دیا۔ خدا جانے کیا گفتگو تھی کہ وہ ساغر صاحب سے گرما گرم بحث کرنے لگے۔ بعد میں جب میں آیا تو مجھے اس سانحہ کا علم ہوا اور میں نے انہیں کچھ سخت سُست کہا، انہوں نے میری گفتگو سن کر مسکراتے ہوئے کہا کہ ساغر کو میں ہرگز کوئی بُرا آدمی نہیں سمجھتا۔ وہ تو یوں ہی برسبیل بحث آواز ذرا اونچی ہو گئی تھی۔ میرے علم و اطلاع کے مطابق منٹو کا یہ کردار تادمِ حیات قائم رہا، وہ لوگوں سے لڑتے ضرور تھے۔ لیکن ان کے دل میں ان لوگوں کے لیے کوئی کھوٹ نہ ہوتی تھی۔ وہ نہایت انتہا پسند آدمی تھے۔ وہ ہر شخص میں اپنے خیالات کی جھلک اور اپنے جذبات کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں منٹو کی ان بے اعتدالیوں کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ بچپن میں ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اُٹھ گیا اور یہ بات پردہ نشین بوڑھی ماں اور بہن کے بس کی نہ تھی کہ وہ ان کی طبیعت میں ضبط و نظم قائم کر سکیں، ان کے کردار اور تحریروں میں جس جگہ بھی توازن کی کمی نظر آتی ہے میری رائے میں وہ بچپن کی تربیت کی اسی کمی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ جب وہ جنس کے موضوع پر لکھنے آئے تو اپنی انتہا پسندانہ طبیعت کی وجہ سے انہوں نے اس موضوع پر اس زور شور کے افسانے لکھے کہ ہر طرف سے شور برپا ہوا کہ منٹو فحش نگار ہے، حالانکہ جن لوگوں نے ان کی تحریروں کو غور سے پڑھا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ فحش نگار نہ تھے۔ ان کے جن دو چار افسانوں کو فحش قرار دیا گیا ہے اگر بفرضِ محال انہیں فحش مان بھی لیا جائے تو ان کی دوسری تحریروں نے کیا بگاڑا ہے؟ ان کی داد کیوں نہ دی جائے! منٹو کی انتہا پسندانہ طبیعت کا دوسرا اظہار ان کی شراب نوشی میں ہوا، جب وہ شراب پینے پر آئے تو اس کثرت سے پی کہ آخر کار اس کم بخت نے ان کی صحت کو بالکل تباہ کر دیا، ان کی طبیعت کا ایک اور پہلو ان کی ضد تھی، وہ نہایت ضدی اور ہٹیلے آدمی تھے، جو بات ان کے دل میں سما جائے وہ اُسے کر کے ہی دم لیتے تھے۔ ان کی ان بعض کمزوریوں کے باوجود ان میں ایک خاص قسم کا خلوص تھا جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آتا ہے، وہ ان لوگوں کا بڑا احترام کرتے تھے جن لوگوں نے کسی بھی لحاظ سے ان کی ابتدائی زندگی میں ان سے محبت اور ہمدردی کا سلوک کیا تھا، وہ ان لوگوں کو اپنی حد اور حیثیت کے مطابق فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے ـــــ خواہ ان کی کوششوں سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے مگر وہ اپنا فرض ضرور پورا کرتے تھے۔ ابھی منٹو بٹوت ہی میں تھے کہ مجھے انجمن ترقی اردو کے بلاوے پر اورنگ آباد دکن جانا پڑا۔ اِدھر تین ماہ بٹوت میں قیام کرنے کے بعد منٹو لاہور واپس چلے آئے۔ اب جو ایک ڈاکٹر نے اُن کا معائنہ کیا تو یہ بات ثابت ہوئی کہ انہیں دق نہیں ہے بلکہ "ذات الجنب" کی شکایت ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے اورنگ آباد میں ان کا خط ملا کہ وہ مصور بمبئی کے ایڈیٹر مقرر ہو کر جا رہے ہیں۔"

بمبئی پہنچنے کے بعد ان کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ کچھ روز بعد میں ایک کام سے بمبئی گیا اور منٹو سے ملاقات ہوئی۔ منٹو ناگ پاڑے میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہا کرتے تھے اور مصوّر کی ایڈیٹری کے علاوہ امپیریل فلم کمپنی میں بحیثیت مکالمہ نگار ملازم بھی ہو گئے تھے۔

انہوں نے مجھ سے امپیریل فلم کمپنی کا اسٹوڈیو دیکھنے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن میں نے صاف انکار کر دیا، کیونکہ بمبئی سے پیشتر کلکتے میں بچپن ہی سے مجھے بہت سی ناٹک کمپنیوں اور فلم کمپنیوں کو اندر سے دیکھنے کے مواقع مل چکے تھے۔ علاوہ بریں لاہور کے دوران قیام میں وہاں کے سارے فلمی اسٹوڈیو میں دیکھ چکا تھا۔ میرے انکار کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے کے فلم اسٹوڈیو اندر سے ایسے نہ تھے جیسے وہ آج کل ہیں۔ اس زمانے میں ان کا اندر کا ماحول نہایت تاریک اور گھناؤنا ہوتا تھا۔ اس لیے بہت سی آسانیاں حاصل ہونے اور ڈرامہ نویسی کے شوق کے باوجود کبھی میرے دل میں کسی ناٹک یا فلم کمپنی میں شامل ہونے کا شوق پیدا نہ ہوا۔ لیکن جب مجھے منٹو نے بتایا کہ خان بہادر اردشیر ایرانی مالک امپیریل فلم کمپنی دل کا اچھا آدمی ہے لیکن ذہنی لحاظ سے ایسا ہو رہا ہے کہ جب تک اس کے ادارے میں کام کرنے والے کسی شخص کی باہر کا کوئی آدمی تعریف نہ کرے وہ اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تو میں منٹو کا مطلب سمجھ گیا اور میں نے ان سے کہا کہ تم خان بہادر سے ملاقات کا وقت لے لو، میں ان سے ملوں گا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں منٹو نے ایک فلمی کہانی لکھی تھی اور اس کہانی کو فروخت کرنے کے لیے ایک تجارتی 'سٹنٹ' کی ضرورت تھی۔ اس گفتگو سے تیسرے دن میں منٹو کے ساتھ خان بہادر سے ملنے کے لیے گیا وہ ایک آرام کرسی پر دراز تھے اور پاس چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ منٹو نے خان بہادر سے انگریزی میں میرا تعارف کراتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "قابلِ احترام مولانا مظفر حسین شمیم سیکرٹری آغا حشر میموریل کمیٹی و مہتمم انجمن ترقی اردو اورنگ آباد" خان بہادر نے آرام کرسی سے اُٹھ کر نہایت تپاک سے مجھ سے مصافحہ کیا اور پاس پڑی ہوئی کرسی پر مجھے بٹھاتے ہوئے مزاج پرسی کی اور نوکر کو فوراً چائے لانے کے لیے آواز دی۔ چائے پینے کے بعد میں نے صنعتِ فلم سازی کے ارتقاء پر ایک بے سر پیر کی تقریر شروع کی، جس میں دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ اور مہاتما گاندھی کے ساتھ اس زمانے کی مشہور فلم ایکٹرسوں مثلاً گوہر جوبیر۔ زبیدہ۔ جلو بائی اور جدن بائی وغیرہ سبھی کا تذکرہ آگیا۔ جب میں یہ تمہید باندھ چکا تو میں نے صنعتِ فلم سازی میں منٹو کی اہمیت پر چند جملے کہتے ہوئے یہ کہا کہ منٹو کے پاس فلمی کہانیوں کے ایسے ایسے پلاٹ ہیں کہ اگر یہ سلولائیڈ میں تبدیل ہو کر پردے پر آجائیں تو تمہاری کمپنی کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ جائے۔ میری یہ گفتگو سن کر اردشیر کہنے لگا کہ ہم کو معلوم ہے کہ "منشی" منٹو اچھا ڈائیلاگ لکھتا ہے۔ لیکن انڈسٹری میں یہ نیا آدمی ہے۔ ہم اسٹوری پر اس کا نام کیسے دے سکتا ہے۔ یہ بزنس کا معاملہ ہے۔ ہم مجبور ہے۔" میں نے کہا اس میں مجبوری کی کوئی بات نہیں ہے۔ کل جو نئے تھے وہ آج پرانے ہو چکے ہیں، اور جو آج نئے ہیں وہ کل پرانے ہو جائیں گے دنیا کا کارخانہ یوں ہی چلتا ہے۔ تم منٹو کا اسٹوری بنادو، بڑا سکسیز ہوگا۔"

اس گفتگو کے بعد میں خان بہادر سے رخصت ہو کر واپس چلا آیا اور چند روز اور بمبئی میں قیام کے بعد اورنگ آباد چلا گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ خان بہادر نے وہ کہانی خرید لی اور اُسے "کسان کنیا" کے نام سے فلمایا گیا۔ لیکن اس پر مصنف کی حیثیت سے شانتی نکیتن کے پروفیسر ضیاء الدین مرحوم کا نام دیا گیا۔ شاید اس کی وجہ "بزنس" ہوا کیونکہ شانتی نکیتن کا نام بہر حال منٹو کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ منٹو فلمی آدمی نہ تھے، لیکن جب حالات انہیں فلمی دنیا میں لے گئے تو انہوں نے اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت فلم کی ٹیکنیک پر قابو حاصل کر کے کئی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھ ڈالے۔ ابھی منٹو کا مصوّر اور امپیریل فلم کمپنی سے تعلق قائم ہی تھا کہ اُن کی والدہ صاحبہ امرتسر سے بمبئی تشریف لے آئیں۔ یوں اُن کی ہمشیرہ اور بہنوئی پہلے ہی سے بمبئی میں مقیم تھے۔ ان کی والدہ کے بمبئی پہنچنے کے بعد مجھے منٹو کا خط ملا کہ اب وہ شادی کرنا چاہتے ہیں، اور

ان کی والدہ نے ایک جگہ لڑکی پسند بھی کر لی ہے۔ اس کے بعد جب میں بمبئی گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ افریقہ کے مشہور قومی کارکن خواجہ شمس الدین کی بھتیجی سے ان کی نسبت قرار پائی ہے۔ بمبئی سے اورنگ آباد واپس آنے کے چند ماہ بعد مجھے ان کا خط ملا کہ نکاح کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے اور اس تاریخ کو آپ کا بمبئی میں موجود ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ میں تاریخ مقررہ سے ایک روز پہلے بمبئی پہنچا اور دوسرے دن نکاح کی تقریب میں شریک ہوا۔

شادی کے بعد منٹو کی زندگی میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا۔ منٹو جتنے زیادہ گرم مزاج تھے ان کی بیوی عزیزہ صفیہ اتنی ٹھنڈے مزاج کی ہیں۔ منٹو میں جس قدر نا عاقبت اندیشی پائی جاتی تھی، صفیہ اتنی ہی زیادہ مآل اندیش ہیں۔ منٹو کی طبیعت میں جتنا زیادہ اضطراب تھا، صفیہ کی طبیعت میں اتنا ہی زیادہ سکون ہے۔ میرے خیال میں منٹو کے لیے صفیہ سے بہتر بیوی کا ملنا ناممکن تھا اور یہ ان کی والدہ کا بالکل صحیح انتخاب تھا۔

صفیہ نے منٹو کی بہت سی چیزوں کی اصلاح کر دی، اور انہوں نے ان کے لیے زندگی کے سفر کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ میں اس موقع پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر صفیہ سے منٹو کی شادی نہ ہوتی تو شاید انہیں اپنی تحریری زندگی میں وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جس کے وہ مستحق تھے۔ شادی کے دو ڈھائی سال بعد منٹو کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور اب ان کے سر پر کسی ایسے بزرگ کا سایہ نہ رہا جس سے وہ دبتے۔ فلمی زندگی میں ہر قدم پر شراب کی بوتل دستیاب ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ اس خانہ خراب کا انہیں ایسا چسکا لگا کہ اس کافر نے آخری دم تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ انجمن ترقی اردو کے دکن سے دلی منتقل ہونے کے بعد میں بمبئی چلا گیا۔ جب کبھی ممکن ہوتا میں شراب خواری کے سلسلے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا۔ پرانے مخلصانہ تعلقات اور میرے "پر تکلف مزاج" کی وجہ سے جس کی انہوں نے اپنی ایک کتاب "گنجے فرشتے" میں ایک جگہ شکایت کی ہے وہ میری یہ گفتگو سن تو لیا کرتے تھے، لیکن اس کا کوئی اثر نہ لیتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد منٹو آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو کر بمبئی سے دلی چلے گئے۔ دلی سے آنے جانے والوں سے یہی معلوم ہوتا رہا کہ اس ام الخبائث نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر از سر نو وہ بمبئی آئے تو اس وقت بھی یہ بلا ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ بمبئی میں انہوں نے بعض فلم کمپنیوں کے لیے کہانیاں اور مکالمے لکھے لیکن اب کے مزاج میں کچھ تلخی بڑھ گئی تھی، شاید یہ شراب خانہ خراب کا اثر تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے میں حیدر آباد دکن چلا گیا اور تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے آئے، چونکہ پاکستان کے موجودہ معاشرے کو شاعری۔ ادب۔ علم۔ فلسفہ اور آرٹ کے مقابلے میں سیاست اور تجارت سے کہیں زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لیے وہ بھی دوسرے اکثر لوگوں کی طرح مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ جب میں ۱۹۵۱ء میں لاہور گیا اور ان کے مکان پر حاضر ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے۔ اس وقت مجھے ان کی گرم جوشی میں وہی اخلاص نظر آیا جس کے وہ ہمیشہ سے عادی تھے۔ میں یہاں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے منٹو کے بعض خیالات سے ہمیشہ اختلاف رہا لیکن میں نے اپنی ذات سے متعلق منٹو کے خلوص میں کبھی کوئی کمی نہ دیکھی۔ لاہور کے دوران قیام میں قریب قریب روزانہ ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ لاہور سے جب میں کراچی آ گیا تو اس سفر کے شاید ڈیڑھ سال بعد وہ ایک مقدمے کے سلسلے میں کراچی آئے۔ اس مرتبہ وہ یہاں اپنے ایک عزیز کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ مقدمے سے فارغ ہونے کے بعد وہ مجھے اپنے عزیز کے ہاں لے گئے۔ میں نے ان سے چند روز کراچی میں قیام کرنے کے لیے کہا اس پر وہ راضی بھی ہو گئے۔ جب میں نے ان کے ان عزیز سے اس بات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ لاہور سے انہیں ہدایت وصول ہوئی ہے کہ مقدمہ ختم ہوتے ہی انہیں فوراً واپس بھیج دوں، اس لیے ایسی صورت میں انہیں یہاں رکھنا مناسب نہ ہو گا۔ میں ان کی گفتگو کے مفہوم کو سمجھ کر خاموش ہو رہا اور اب سے چند روز پیشتر جب ان کی وفات کی خبر وصول ہوئی تو مجھے یقین نہ آیا اور میں نے اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کی لیکن جب ہر طرف سے اس کی تصدیق ہوئی تو سوا انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

جیسا کہ منٹو نے بعض مقامات پر خود لکھا ہے وہ کوئی بڑے عالم فاضل نہ تھے اور نہ ہی انہیں بڑے علماء و فضلاء کی صحبتوں سے مستفیض ہونے ہی کا کوئی موقعہ ملا تھا۔ دراصل ان کی کامیابی میں دوسروں کی تربیت سے زیادہ خود ان کے ذاتی شوق، محنت، ہمت اور استقلال کو دخل تھا۔ وہ تحلیلِ نفسی کے ماہر نہ تھے کہ اپنے معاشرے کی جنسی کجروی کے اسباب ڈھونڈ ھ نکالتے اور ان کا کوئی علاج تجویز کرتے نہ عمرانی علوم کے عالم بھی نہ تھے کہ ان کے ذہن میں نظامِ حیات کا کوئی واضح تصور ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ افسانہ نگاروں میں اُن کی مثال ایک ایسے باریک بین فوٹو گرافر کی ہے جو مشاہدہ کا کیمرہ لے کر چور دروازے سے سماج کے رنگ محل میں داخل ہوا اور جس نے اپنی فکر و نظر سے یہاں جنسی گھٹن کے جو مناظر دیکھے۔ ان کے فوٹو کھینچ کر سماج کے آگے پیش کر دیئے۔

ضرورت نے منٹو سے اخبار نویسی کرائی، فلمیں، ریڈیو ڈرامے، ریڈیو فیچر، اسکیچ اور مضامین لکھوائے لیکن ان کا اصل میدان ہمیشہ افسانہ نگاری رہا اور انہیں حقیقی کامیابی اسی میدان میں نصیب ہوئی۔

منٹو کی زندگی اس لحاظ سے نوجوانوں کے لیے پیغامِ عمل ہے کہ اگر انسان میں ہمت، محنت، شوق اور استقلال ہو تو وہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

میرا آقا

غلام رسول

اردو کے مشہور ادیب سعادت حسن منٹو کو میں دسمبر ۱۹۴۷ء سے جانتا تھا جبکہ وہ ممبئی سے اپنا کاروبار ختم کر کے، اپنے نوزائیدہ وطن کی خدمت کا جذبہ لے کر اپنے بیوی بچیوں سے لاہور آ گئے۔ (منٹو کی بیگم منٹو سے دو تین ماہ پیشتر پاکستان آ گئی تھیں) میں ان کے بھانجے، جو کچھ دن بعد منٹو کے ہم زلف بھی ہو گئے، حامد جلال صاحب کے ساتھ دہلی سے لاہور آیا۔ میں حامد جلال صاحب کا باورچی تھا۔ منٹو صاحب کے لاہور آنے کی خبر سے میں بہت مسرور تھا اور بہت بے چینی سے ان کے دیدار کا مشتاق تھا۔ منٹو کے افسانے مجھ کو بہت پسند تھے خصوصاً ان کے لکھنے کا انداز۔ منٹو کی تحریروں سے میں منٹو کے متعلق جو تاثرات رکھتا تھا وہ یہ تھے۔ ملنسار ہوں گے۔ خوش ذوق ہوں گے، شوخی ہوگی۔ میں نے منٹو کو اسی طرح پایا۔ میرا تصور درست تھا۔ منٹو کی بیگم نے جب میرا تعارف کرایا یہ حامد جلال کا پرانا نوکر غلام رسول ہے دہلی سے ساتھ آیا ہے، اور بہت اچھا آدمی ہے۔ یہ سنتے ہی نہایت گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ایک بے دین کے گھر میں دیندار۔ کیونکہ میری وضع مولوی ٹائپ کی تھی، وہ مجھے تھوڑی دیر تک بغور سر سے پیر تک دیکھتے رہے۔ وہ شاید اپنی فنکارانہ آنکھ سے تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ میری بیگم جو اس کے متعلق اچھی رائے رکھتی ہے وہ درست ہے کہ نہیں۔ کیونکہ منٹو کی فطرت تھی وہ دوسروں کی رائے اس وقت تک نہیں مانتے تھے۔ جب تک کہ خود اس پر غور نہ کر لیں۔ اس کے بعد وہ کسی کام میں مصروف ہو گئے۔ نہ جانے انہوں نے میری بابت کیا رائے قائم کی منٹو میرے ساتھ ہمیشہ دوستوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ جب دن کا ایک بجتا وہ سیدھے میرے پاس باورچی خانے میں آ جاتے اور کہتے غلام رسول مجھ کو بھوک لگ رہی ہے۔ دیکھو کتنا وقت ہو گیا ہے۔ حلال مردار کچا پکا جو کچھ ہے مجھ کو بس دے دو۔ یہ کہنے اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بیٹھ جاتے، میں جو کچھ ہوتا پیش کر دیتا۔ میں کہتا رہتا کھانے کے کمرے میں بیٹھ کر کرسی پر کھانا کھائیے۔ اتنے بڑے ادیب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ باورچی خانے میں بیٹھ کر کھائے۔ تو ان کو فوراً غصہ آ جاتا۔ کیا بکواس کرتے ہو۔ یہاں بیٹھ کر تم کھا سکتے ہو میں نہیں۔ تم بھی انسان ہو اور میں بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم زیادہ لوگوں کے برتن صاف کرتے ہو اور میں ان کے پردے چاک کرتا ہوں۔ یہ سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ میں منٹو کو تشکر کی نظروں سے دیکھتا رہا۔

منٹو کو شروع میں کھانے سے رغبت تھی وہ کھانا وقت پر کھانے کے عادی تھے۔ اکثر سادہ کھانا کھاتے۔ پکوڑے۔ اچار، چٹنی، کباب شب دیگ یہ ان کی من بھاتی غذا تھی۔ اکثر چٹنی وغیرہ خود شوق سے بناتے مگر افسوس موت سے دو تین سال پہلے ان کو ان چیزوں سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ کھانا بالکل کم ہو تا گیا۔ منٹو جب اپنی سخت بیماری میں میو ہسپتال میں پڑے رہے تو ڈاکٹر زبردستی غذا دیتے رہے۔

میں منٹو کے خلوص سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ حامد جلال صاحب کی نوکری پر منٹو کی نوکری کو ترجیح دوں۔ میں باقاعدہ منٹو کا نوکر ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ مجھ کو تنخواہ ٹھیک وقت پر نہیں ملے گی۔ اس کے باوجود میں بہت خوش تھا۔ منٹو کی موت سے پانچ سال پہلے منٹو کی زندگی خاصی آسودہ تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کو اپنے گھر سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے چھوٹے کام

کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتے تھے۔ جو کام نوکروں کے کرنے کے ہوتے تھے۔ وہ اکثر خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ منٹو اپنے کمرہ کا فرش میز کرسی اپنی اور اپنے بچیوں کی جوتیاں تک صاف کر لیا کرتے تھے۔ حالانکہ منٹو کے پاس ہمیشہ ایک دو نوکر ہوتے تھے۔ وہ وقت کو ضائع کر کے دوسروں کے بھروسہ پر بیٹھے رہنے کے بالکل قائل نہیں تھے۔ منٹو کسی معمولی گھر کے فرزند نہیں تھے۔ یہ معلوم ہونے پر میری عقیدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک عالی جج کے بڑے ناز و نعم میں پلے ہوئے بیٹے تھے۔ جس کے ثبوت میں منٹو کے سوتیلے دو بڑے بھائی موجود ہیں، دونوں ایڈوکیٹ ہیں، اور ان کے بچے بھی ایڈووکیٹ ہیں، بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ لیکن منٹو کی زندگی ان کے والد کی وفات کے بعد سے ان کی اپنی موت تک تنگ و تاریک گلیوں کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں گزری۔ منٹو بھی کبھی ہوادار اور سبزہ زار کوٹھیوں میں رہتے تھے۔ ان کو اپنے والد کی زندگی میں ہر قسم کی آسائش مہیا تھی۔ اس کے باوجود ان میں یہ سادگی؟ منٹو کے والد کی وفات کے ساتھ یکایک منٹو پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ منٹو کو مزید تعلیم کی ضرورت تھی۔ مگر وہ تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ کم عمری ہی میں ان پر بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے وہ میدان ادب و صحافت میں کود پڑے۔ مگر اس شغل نے ان کو ہمیشہ ننگا ہی رکھا۔ وہ پھر ہوادار گھر کو ترستے ہی رہے وہ اپنے بچوں کے لیے اپنی زندگی میں کچھ بھی تو نہیں دے سکے۔ اپنی ساری زندگی ادب و فن کے لیے وقف کر گئے۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ اس ملک و قوم میں ان کا اپنا گھر بھی ہے اس کا بھی ان پر کچھ حق ہے میرے خیال میں اگر وہ اپنے گھر کے حقوق کو سمجھ پاتے تو شاید اردو کے نذر عظیم افسانہ نگار نہ بن سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قوم و حکومت اس کا صلہ ان کی اولاد کو کیا دیتی ہے۔ وہ خود تو کچھ دے نہ سکے —— میں اور بھی کئی جگہ گھر یلو نوکریاں کرتا رہا تھا۔ کئی صاحب دیکھے تھے میرے خیالات کی دنیا بہت محدود تھی میں اپنے سے زیادہ خوش پوش انسان سے بات کرتے گھبراتا تھا۔ میں نے صرف منٹو کے افسانے پڑھے تھے اور میرے نزدیک قول اور عمل دو جدا جدا چیزیں تھیں۔ میرے نزدیک ادیبوں کی تحریریں اور لیڈروں کے لیکچر کوئی معنی نہیں رکھتے تھے جو غریبوں کی ہمدردی میں لکھا اور کہا گیا ہو۔ میرے ان خیالات کو منٹو نے باطل کر دیا اور مرحوم نے اپنے عمل سے مجھ کو جھنجوڑ کر بتا دیا کہ ادیب کا فعل اور عمل دراصل ایک ہی چیز ہے۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں بھی اپنے آپ کو انسان سمجھنے لگا۔ ایک انسان ہی کی حیثیت سے سوچنے لگا۔ منٹو کی تصانیف کا مطالعہ کرنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا اندرونی سکون کم ہوتا گیا۔ منٹو کی زندگی بے سکون تھی اس کے باوجود مجھ جیسے انسانوں کی ابتر زندگی پر تڑپتے رہنا ان کا معمول ہو گیا تھا۔

وہ ہماری سوسائٹی کی نظروں سے گرے ہوئے انسانوں کے ناسوروں کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے اپنے قلم کو حرکت میں لاتے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کی ساری زندگی مقدمہ بازی میں کٹی اور اس طرح ان کی مالی پریشانیاں بڑھتی ہی رہیں۔ وہ سکون کی تلاش میں رہتے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں سکون کو تلاش کیا وہ ہر طبقہ میں بیٹھے گلی کوچہ۔ بازار۔ امرتسر۔ بمبئی۔ دہلی۔ لاہور سب چھان مارا ان کو سکون کہیں نہ مل سکا۔ ان کی بے چینی بڑھتی ہی رہی۔ ہمارے ملک کی کثیر آبادی کی خستہ حالی اور خود اپنی خستہ حالی ان کو بے چین رکھتی وہ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ ایک فنکار اعظم تھے۔ ہیرا منڈی کے چکلے۔ گندی گلیاں۔ گندے گھر۔ گندے کپڑے۔ گندی گالیاں جو کچھ دیکھتے وہ من و عن کاغذ پر ڈھال لیتے کچھ لوگ پڑھ کر منٹو کی تعریف کرتے نہ تھکتے اور کچھ گالیاں دیتے نہ تھکتے۔ بالآخر منٹو اس زندگی کے جھمیلوں سے تنگ آ کر سکون کی تلاش میں ہر وقت شراب میں مدہوش رہنے لگے۔ جب شراب ان کی ختم ہو جاتی تو ان کی بے چینی بڑھ جاتی۔ ان کے تفکرات اور گہرے ہو جاتے۔ انہی تفکرات کو لیے ہوئے پھر اپنے قلم کو جنبش دیتے۔ اور ایک نیا شاہکار دنیا کے لیے پبلشرز کے حوالے کر کے بوتل خرید لیتے۔ منٹو کو اپنی بیگم اور اپنی تین بچیوں سے بہت پیار تھا۔ مگر میں ان کی زندگی کے آخری تین چار سال میں بہ غور منٹو کا مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ اپنی تین بھولی بھالی لڑکیوں کو پیار کرتے

ہوئے بھی ان سے پیار نہیں کرنا چاہتے تھے وہ بیوی بچوں کو بالکل فراموش کر دینا چاہتے تھے۔ اور ایک حد تک فراموش کر بھی دیا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے آخری دو سال میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر دور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی کے آخری چھ ماہ میں وہ بظاہر بالکل بھول جانے پر مجبور ہو گئے اور بھول گئے۔ منٹو کی بیگم اور ان کی تین لڑکیاں ان کی زندگی میں ہی بیوہ اور یتیم ہو گئی تھیں۔ تین بچیاں باپ کی محبت کو ترستی ہی رہیں، اور اب ان کو زندگی بھر ترسنا ہے۔ اب صرف ان کو شراب یاد تھی جب بوتل بے وفائی کر جاتی تو پھر وہ اپنے قلم کو جنبش دیتے۔ ان کی شراب نوشی کی ابتدا محض سکون کی تلاش سے ہوئی۔ وہ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے کچھ دیر نجات کے متمنی تھے۔ مگر ان کے لیے اس بدنصیب ملک میں سکون کہاں تھا۔ میرے ملک میں ادیب کی تحریروں سے سکون حاصل کیا جاتا ہے لیکن ادیب کو سکون کے ذرائع دینے کی پروا نہیں کی جاتی۔ منٹو اگست ۱۹۵۳ء کے آخر میں بیمار ہو کر میو ہسپتال میں داخل ہوئے۔ بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ ہم سب کو یقین ہو گیا تھا کہ اب رخصت ہوئے۔ اب ہسپتال میں منٹو کے عزیزوں، دوستوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ خدا کا فضل ہوا منٹو خطرے سے باہر ہو گئے۔ روز بروز روبصحت ہوتے گئے۔ ہم سب خوش تھے۔ ہمارے چہروں پر مسرت تھی۔ مگر میں نے دیکھا منٹو کا چہرہ اور افسردہ ہو گیا ہماری خوشی ان کو نہیں بھائی ہماری نصیحت تیمارداری ہمارا سخت گیر کنٹرول (جو کہ ان کے بعض نادان دوستوں سے ملنے بھی نہیں دیتا تھا) ان کو برا لگنے لگا۔ ان کو ہم سے بہت نفرت ہو گئی، خصوصاً مجھ سے زیادہ۔ کیونکہ ساری رات اور دن کا کچھ حصہ میری ڈیوٹی ہسپتال میں ان کے پاس ہی ہوتی تھی، وہ تو زندگی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ ان کا یہ منشا قدرت نے پورا نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا۔ ہسپتال کو چھوڑتے وقت ڈاکٹر محمد اسلم پیرزادہ سے شراب نہ پینے کا وعدہ کیا اور کچھ عرصہ اپنے وعدہ کو نبھاتے بھی رہے۔ مگر افسوس ان کو عارضی سکون ملا مگر ان کی زندگی ایکا ایکی پھر اسی بوتل میں ڈوب گئی؟ اب وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کے افسانے جن کے حرف حرف میں وہ ہماری عوامی زندگی کی ترجمانی کرتے رہے۔ ہمارا دل دھڑک رہا ہے وہ ہمیں دیر تک ان کی فنکارانہ عظمت کی یاد دلاتے رہیں گے۔"

افسانے

منتھن [1]

راجندر سنگھ بیدی

بازار ہی لمبا ہو گیا تھا اور یا پھر کاروبار چھوٹا۔ معلوم ہوتا تھا، پچھم کی طرف جہاں سڑک تھوڑا اٹھتی، آسمان سے لپٹتی اور آخر ایک دم نیچے گر جاتی ہے، وہاں دُنیا کا کنارہ ہے جہاں سے ایک جست کریں گے، اس جینے کے ہاتھوں مریں گے۔

دن بھر سر دُھننے کے بعد مگن ٹکلے کباڑیے کو دو ہی چیزیں ہاتھ لگی تھیں۔ ایک فلورنٹین اور دوسری جیمنی رائٹ۔ فلورنٹین کو تو شاید کوئی سرپھرا قلم پر ڈیوسر کرائے پرے بھی جاتا، مگر جیمنی رائٹ؟ کوئی بات نہیں۔ آج وہ اسے چھپا کر رکھے گا تو کل اس کے پوتے پڑپوتے اس سے کروڑوں کمائیں گے، جیسے آج بھی پچھم میں کسی کے ہاں سے لیونارڈو کے سکیچ نکل آئیں تو آرٹ کے بازار میں ان کی بولی لاکھوں تک جاتی ہے۔ ان لاکھوں کروڑوں کے خیال ہی سے مگن لال کی آنکھوں میں بجلیاں کوندنے لگیں اور وہ یہ بھول ہی گیا کہ وہ چالیس بیالیس سال کا اور ٹکلا۔ کنجا ہونے کے باوجود کنوارہ ہے۔ اس لیے پوتوں پڑپوتوں کی بات ہی نہیں۔ مگن کرتا بھی کیا؟ وہ ایک عام ہندو تھا۔ اتنے بڑے فلسفے کا مالک ہونے کے باوجود جس کے اندر کا بنیاپن نہیں جاتا۔ وہ باتوں میں مایا اِت آدکہہ کر اُسے پرے دھکیل دیتا ہے لیکن بھیتر سے اسے جی جان سے لگاتا ہے۔ دنیا بھر میں پیسے کی اگر کوئی پوجا کرتا ہے تو ہندو۔ آج بھی اس کے ہاں دیوالی کے روز پرات کے نیچے، جیوتی کے ساتھ، دودھ پانی میں نہایا، سندور میں لگایا ہوا روپیہ ملے گا۔ دسہرے کے دن اس کی کاڑی پہ صد برگ کے ہار ہوں گے اور سب نرناری مل کر لکشمی کے مندر کو جائیں گے۔ پوجا کے لیے پیسے کے لیے تو وہ یوسف سا برادر، پدمنی ایسی پتنی کو بھی بیچنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اور سامنے تھا سراجا — ایور ریڈی بیٹری کا ایجنٹ۔ اس کی دکان تھوڑا پیپل کے گیٹ کے نیچے چھپی ہوئی تھی، بھلے ہندو جب پو پھٹے کے وقت آ کر پانی میں ملے دودھ کے لوٹے ڈال جاتے تھے اور دکان اور سڑک کے بیچ کی جگہ کیچ سے اَٹ جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے سراجو کو بھلے ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا۔ البتہ نہیں کرتے تھے تو وہ غلے کتے جو دن بھر ٹانگ اٹھا اٹھا کر اس پیڑ پہ پیشاب کرتے رہتے تھے، جس کے بارے میں بھگوان نے کہا تھا — اور وکشوں میں میں پیپل ہوں۔ ضرور وہ پچھلے جنم میں مسلمان ہوں گے جو سینتالیس کے فسادوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔

سراجا ہمیشہ پیپل کی گولریں کھاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجہ بازار کا مندہ ہونا یا بھوک نہ تھی۔ سراجا ہر اس چیز کو کھاتا تھا جو اس کی دعا و نوشت کو مغلظ کر دے۔ ہاں، مسلمان ننگ کتوں کا یہی ہے نا۔ کھانا، پینا اور بھوگ کرنا۔ وہ دماغی طور پر کوئی ہو بہو، کوئی خانہ بدوش ہیں جو ہندوستان میں رہیں تو پاکستان کی باتیں کریں گے۔ پاکستان میں ہوں گے تو — میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔ انہیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں، مگن ٹکلے نے کئی بار

---

[1] مواصلت۔

اس بارے میں سوچا بھی — ان کا اللہ خوب عیش کرتا ہے - ایک اپنا بھگوان ہے - جو نیچے کی بجائے اوپر ترکُٹی کے آس پاس ہی منزل ہوتا رہتا ہے شاید سراہا جانے پر جیسے بنا، یک تانترک تھا جو بند دُر رکھشا کے لیے کُنڈلنی کو جگاتے اور اوپر کا راستہ بناتے تھے، وہ عورت کے اندر کُرشے پڑے رہتے، لیکن کسی طرح اپنے جوہر حیات کو نہ جلنے دیتے - نجات کو اس خود غرضانہ طریقے سے پانے والوں، عورت کو صرف ایک ذریعہ بنانے والوں نے کبھی یہ سوچا کہ اس بیچاری کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ اسے بھر کا 'پیاسا' رہتا 'تڑپتا' کہہ کر کیسے نروش کو پہونچ سکتا ہے کوئی؟ کس پرماتما کو پا سکتا ہے؟ پھر جو نجات بندو سے چھٹکارہ پا لینے میں ہے - پُرش کے لیے 'استری کے لیے؟ سوتی بوند تو موتی نہیں' نہ سیپی موتی ہے موتی تو بوند کے گرنے اور سیپی کے اُسے اپنے اندر رکھ کر مُنہ بند کر لینے میں ہے -

رات لپک آئی تھی - باہر وہ دنیا کا کنارہ اندھیرے کے ساتھ کچھ اور بھی پاس رینگ آیا تھا - ریشم والے ولایتی رام، کشمیری بڈشاہ حتیٰ کہ اڈپی کے چکرپانی کی دکان بھی بند ہوگئی تھی - ہوسکتا ہے مہینے کا دوسرا سنیچر ہونے کی وجہ سے اس کے سب ادبی دوُسے 'سانبر وڈا' کیسری بک گئے ہوں - صرف سراج کی دکان کھلی تھی - نہ جانے وہ کس مار پہ تھا؟ شاید اس لیے کہ بیڑی کی ضرورت رات ہی کو پڑتی ہے، مگر وہ صبح صبح کاذب ہی کو دکان کھول لیتا تھا، جو رات ہی کا حصہ ہوتی ہے' اس کا آخری حصہ - ورنہ صبح کہاں کسی کی رہی، وہ تو کمیونسٹوں کی ہوئی - شاید سراج ٹورسٹ ایجنٹ مائیکل کی انتظار میں تھا تاکہ وہ دونوں مل کر اگلے روز کہیں آگرے کھجوراہو کا پروگرام بنالیں، تھوڑے پیسے کمالیں - نہیں، سراج پیسے کے پیچھے تھوڑے جاتا تھا، وہ تو جاتا تھا ان پھیمی عورتوں کے پیچھے جو کثیر الازدواجی کی وجہ سے بھوکی پیاسی آتی تھیں، اور یہاں آکر ممتاز کی محبت کو ادھر کے کسی بھی شاہجہاں طبیعت والے مرد پہ آزماتیں اور کھجوراہو کے مِتھن کو زندہ کرتی تھیں -

جبھی سراج کی آواز نے مگن لال کو چونکا دیا -

"ہیلو، سویٹ پائی ۔۔۔"

سراج تقریباً ان پڑھ تھا، مگر ٹورسٹوں کے ساتھ رہنے سے اتنی انگریزی سیکھ گیا تھا - اس کی آواز سے مگن سمجھ گیا - کیرتی آئی ہے -

وہ سچ مچ کیرتی ہی تھی، جو چھوٹے قد، گٹھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی ایک اداس لڑکی تھی - اس کا رنگ پکا تھا - پھر اوپر سے جامنی رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی - جب وہ آئی تو یوں لگا جیسے اندھیرے کا کوئی ٹکڑہ متشکل ہو کر سامنے آگیا - وہ ہمیشہ رات ہی کو آتی تھی، جیسے اسے اپنا آپ چھپانا ہے اور شاید اسی لئے سراج کی دوکان کھلی تھی، وہ ہمیشہ کی طرح سے اس کی طرف دیکھے، اس سے بات کئے بغیر نکل آئی تھی - اس کے باوجود سراج سیٹیاں بجا رہا تھا -

کیرتی بات ہی کہاں کرتی تھی - اس سے، اُس سے، کسی سے بھی نہیں - اس سے بات کرنے کے لیے سوال کچھ یوں وضع کرنے پڑتے تھے کہ ان کا جواب ہاں ہو یا نہ - صرف اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں سر ہلانے سے بات بن سکے - سراج کا اسے چھیڑنا مگن کو بہت ناپسند تھا - اس نے کئی بار مگن سے کہا بھی تھا — تو کہیں عشق کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا؟ جوان لڑکی ہے - کھینچ ڈال - بہت ادھر اُدھر رہا تو کبوتر کی طرح سے تو وہ اُڑ جائے گی - لیکن مگن نے اسے ڈانٹ دیا تھا -

درحقیقت مگن کے لئے کا دھندہ سدا باب ہوتا تھا - کیرتی کوئی ٹکڑی کا کام یا ٹیپ بنا کر بیچنے کی غرض سے اس کے پاس لاتی تو وہ اس میں بہت پڑے نکالتا - کبھی کہتا ایسی چیزوں کی آج مانگ ہی نہیں اور کبھی یہ کہ وہ فن کے معیار و محک پہ پوری نہیں اترتیں - کیرتی اور بھی مُنہ لٹکا لیتی حالانکہ

ان سب باتوں سے مگن لال کا ایک ہی مقصد ہوتا کہ وہ سو کی چیز پانچ دس میں دے جائے اور پھر یہ اسے سینزن کر کے سینکڑوں میں بیچے۔

کیرتی نے یہ کام کسی آرٹ اسکول میں نہ سیکھا تھا۔ اس کا باپ نارائن ایک شلپی تھا جو مجاؤ دابی اور جیمز برگس وغیرہ کے ساتھ نیپال اور جانے کہاں کہاں ہندوستان کی وراثت کو ڈھونڈتا پھرا تھا جو کہ دراصل لندن کے میوزیم، نیویارک اور شکاگو کی اینٹیک کی دوکانوں میں رُل رہی تھی۔ ہر سال ہمارے مندروں اور صنم خانوں سے سینکڑوں مورتیاں غائب ہوتیں اور ہزاروں میل دور کیوریو وغیرہ کی دوکانوں میں جگہ پاتیں۔ نارائن مسلسل سفر سے تنگ آکر لوٹ آیا تھا۔ اور گھر ہی میں شلپ بنانے شروع کر دیئے تھے جنہیں کیرتی بڑے انہماک سے دیکھتی رہتی تھی اور بیچ میں آوزار پکڑانے اور رف ورک کرنے میں باپ کی مدد بھی کرتی تھی۔ یوں گھر بیٹھ جانے میں نارائن اس بات کو بھول ہی گیا کہ کھویا ہوا ورثہ پائے ہوئے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس کے دوگنے چوگنے ہی نہیں سوگنا دام اٹھتے ہیں۔ شاید وہ جانتا بھی تھا لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو پیسے کی ماہیت کو سمجھ جاتے ہیں اور زندگی کو پھیلاؤ میں نہیں دیکھتے۔ وہ شلپ بناتا اور مشکل سے روٹی کماتا تھا۔ آخر ایک دن دو روٹیوں کے درمیان اس کی موت واقع ہوگئی۔ وہ جگدمبا کا بت بنا رہا تھا جبکہ اس کا اپنا ہی چیزل اس کے ہاتھ میں لگ گیا جس سے اسے ٹیٹانس ہوگیا اور قریب کے چھاؤنی کے اسپتال میں مر گیا۔ کہتے ہیں وہ کتے کی موت مرا۔ کیوں نہ ایسی موت مرتا؟ ۔ جب وہ دیوی کا بُت بناتا تھا تو دنوں، مہینوں اس کی چھاتیوں، اس کے کولہوں اور رانوں پہ ٹھہرا رہتا۔ چھوٹے شلپوں میں تو چھاتیاں خلاء میں گھومتے ہوئے لٹو معلوم ہوتی تھیں، لیکن بڑوں میں ٹانگیں اور ٹار سو ایک طرح کی گھڑونچی تھے۔ اصل بات وہ دودھ کے بڑے بڑے مٹکے تھے جو اس پہ رکھے ہوتے تھے اور کولہے بھتنی کے ملکتے کی طرح سے جس کے نیچے سے ایک کی بجائے دو سونڈیں نکلتی تھیں۔ اس نے دُرگا کا شلپ بھی بنایا تھا جو بڑی بھیرجنگ دیوی ہے۔ ایسی دیویوں کے بدن بناتے ہوئے نارائن کتے کی نہیں تو کیا ہماری آپ کی موت مرتا؟ ۔

"کیا لائی ہو؟" مگن ٹھکلے نے کیسرتی سے پوچھا۔

کیرتی نے اپنے دھوتی کے پلو سے لکڑی کا کام نکالا اور دھیرے سے اسے مگن کے سامنے رول ٹاپ کی میز پہ رکھ دیا۔ کیونکہ اوپر کے لیمپ کی روشنی وہیں مرکوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے مگن نے ایک بیروتی کرسی کیسرتی کے سامنے سرکا دی۔ مگر وہ بدستور کھڑی رہی۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟"

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بار پیچھے اس طرف دیکھا جہاں سڑک نیچے گرتی تھی اور جب چہرہ مگن کی طرف کیا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

کیرتی کی ماں وہیں چھاؤنی کے ہسپتال میں پڑی تھی، جہاں اس کے باپ نارائن نے دم توڑا تھا۔ بڑھیا کو مقعد کا سرطان تھا۔ اس کے پیٹ میں سوراخ کر کے ایک نلی لگا دی گئی تھی اور اس کے اوپر ایک بوتل باندھ دی تھی تاکہ بول و براز نیچے جانے کی بجائے اوپر بوتل میں چلے جائیں۔ پہلی بوتل کسی وجہ سے خراب ہوگئی تھی اور اب دوسری کے لیے پیسے چاہئیں تھے۔ اگر وہ مگن کو بتا دیتی تو وہ شاید دوسرے طریقے سے بات کرتا، لیکن اس وقت کو دیکھ کر وہ ویسے ہی بھڑک گیا تھا۔

"پھر وہی" اس نے کہا۔ "میں نے تم سے کے بار کہا ہے۔ آج کل ان چیزوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ بیٹھے ہوئے وشنو، اور شیش ناگ، لکشمی پاؤں داب رہی ہے۔۔۔"

کیرتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے گن کی طرف دیکھا، جن میں سوال تھا —— اور کیا بتاؤں؟

"وہی — جو آج کل ہوتا ہے۔"

"آج کل . . . کیا ہوتا ہے؟" کیرتی نے آخر منہ کھولا۔ مشکل سے اس کی آواز سنائی دی، جیسے کینری (CANARY) کی چونچ ہلتی دکھائی دیتی ہے، مگر آواز سنائی نہیں دیتی۔

گن نے کچھ رکتے، کچھ راستہ پاتے ہوئے کہا "اور کچھ نہیں ہوتا تو گاندھی ہی بناؤ، نہرو بناؤ۔" اور پھر جیسے اسے کوئی غلطی لگی اور وہ اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے بولا "کوئی نیوڈ . . ."

"نیوڈ؟"

"ہاں — آج کل لوگ نیوڈ پسند کرتے ہیں۔"

کیرتی چپ ہو گئی۔ کنواری ہونے کے ناطے وہ شرما سکتی تھی، لجا سکتی تھی مگر یہ سب باتیں اس لڑکی کے لیے تعیش تھیں۔ اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ گن اس کے ڈڈ ورک کو خریدتا، پیسے دیتا ہے یا نہیں؟ کچھ سوچتے، رکتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے نہیں آتا۔"

"کیا بات کرتی ہو؟ تمہارے باپ نے بیسیوں بنائے۔"

"وہ تو — دیوی ماں کے تھے۔"

"فرق کیا ہے؟" گن شکلے نے کہا "دیوی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ تم وہی بناؤ مگر بھگوان کے لیے کوئی دیومالا اس کے ساتھ نتھی مت کرو۔ انہی حرکتوں سے ہی تو تمہارے پتا ایسی موت مر — سرگباش ہوئے۔"

کیرتی نے اپنے جیون کے پچھواڑے میں جھانکا۔ اب جیسے وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ کسی اور خطرے سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، جسے وہی جانتی تھی، کوئی دوسرا نہیں۔ پھر بھی وہ بیرِدق کرسی پر بیٹھی نہیں، اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس طرف سے اس کے بدن کے حسین مگر جارحانہ خط دکھائی دے رہے تھے۔ کیا شلپ تھا، جسے اوپر کے نہیں، نیچے کے نارائن نے بنایا تھا۔ گن لال کے دماغ میں اختیاری اور بے اختیاری آپس میں نبرد آزما ہو رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ برابر والی لڑکی کے اندر بھی وہی جارحہ اور لاچاری آپس میں سر ٹکرا رہے ہیں۔ اس کا منہ سوکھ گیا تھا۔ کوئی گھونٹ سا بھرنے کی کوشش میں وہ بولی —

"میں — میرے پاس موڈل نہیں۔"

"موڈل؟" گن نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا "سیکڑوں ملتے ہیں۔ آج تو کسی بھی جوان، خوب صورت لڑکی کو پیسے کی جھلک دکھاؤ تو وہ ایک دم —"

کیرتی نے کچھ کہا نہیں۔ مگر گن نے صاف سن لیا۔ "پیسے؟" اور خود ہی کہنے لگا "آدمی پیسہ خرچ کرے۔ تبھی پیسہ بنا سکتا ہے نا"

اس بات نے کیرتی کو اور بھی اداس کر دیا۔ اس کی روح زندگی کے اس جبر کے نیچے پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ عورت کا یہی عالم تو ہوتا ہے، جو مرد کے اندر باپ اور شوہر کو جگا دیتا ہے۔ چنانچہ گن نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ اسے بازوؤں میں لے

ے اور چھاتی سے لگا کر کہے — "میری جان، تم فکر نہ کرو... میں جو ہوں —" لیکن کیرتی نے اسے جھٹک دیا۔ ٹمن کٹ گیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ترپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ردی ٹاپ پر سے اس نے وُڈ ورک کو اٹھایا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جب تک کیرتی نے بھی کچھ سوچ لیا تھا۔ اس نے پہلے نیچے دیکھا اور پھر ایکا ایکی سر اوپر اٹھاتے ہوئے بولی "اگلی بار نیو ڈھی لاؤں گی۔ ابھی تم اسے ہی لے لو۔"

"شرط ہے؟" ٹمن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیرتی نے سر ہلا دیا۔ ٹمن ٹھٹکنے کا خیال تھا۔ کیرتی ساتھ ہنس پڑے گی مگر وہ تو کچھ اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے ردی ٹاپ کو اٹھایا اور میز کے اندر دس روپے کا چرمرا سا نوٹ نکالا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھا دیا — "لو۔"

"دس روپے؟" کیرتی نے کہا۔

"ہاں تمہیں بتایا نا، میرے لیے یہ سب بیکار ہے۔ میں اور نہیں دے سکتا۔"

"ان سے تو —" اور کیرتی نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔ اس کے اندر گویائی کے الفاظ سب تھک گئے تھے۔ پر مطلب صاف تھا۔ ٹمن سمجھ گیا۔ "اس سے تو بوتل بھی نہ آئے گی" "دوا کا خرچ بھی پورا نہ ہو گا" "روٹی بھی نہ چلے گی" قسم کے فقرے ہوں گے، سب مجبور اور نادار جن کی تے کیا کرتے ہیں۔ اس نے کیرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے بس دس دن دو تو میں اچھے پیسے دوں گا۔"

اور ایسا کہنے میں اس نے ہاتھ کی دو انگلیوں کا چھلا بنایا، تھوڑی آنکھ ماری جیسی ڈوم، سازندے نائیکہ کو داد دیتے ہوئے مارتے ہیں۔

کیرتی باہر نکلی تو اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، وہ تھوڑا ہانپ رہی تھی۔ لوٹنے پہ کیرتی ہمیشہ الٹی طرف سے جاتی تھی، حالانکہ اس میں اسے میل ڈیڑھ میل کا چکر پڑتا تھا۔ وہ نہ چاہتی تھی سراج سے اس کی ٹکر ہو لیکن آج وہ اسی طرف سے گئی جیسے اس میں کوئی مدافعت ابھر آئی تھی۔ مائیکل چلا آیا تھا اور سراج کے ساتھ مل کر کچھ کھا رہا تھا، جبکہ کیرتی منہ اوپر اٹھائے، ناک پھلائے ہوئے پاس سے گزر گئی۔ سراج نے کچھ کہا جو ٹمن کو سنائی نہ دیا۔ کیرتی میں وہ بغاوت ہی کا جذبہ تھا اور یا پھر وہ ان مصیبت زدہ لڑکوں میں سے تھی جو دشمن کے ساتھ بھی بنا کر رکھنے کی سوچتے ہیں — مبادا انہی سے کوئی کام آ پڑے۔ شاید یہ عورت کی فطرت کا خاصا تھا جو اس مرد کو بھی اپنے پیچھے لگائے رکھتی ہے — جس سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ صرف اس لیے کہ اسے دیکھ کر ایک بار اس نے سیٹی بجائی یا اپنی چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھری تھی۔

سراج اصل میں کوئی "ایفرو ڈیزیاک" کھا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے پائے ہوں جو مائیکل اس کے لیے لایا تھا۔ شاید وہ دونوں مل کر ٹمن جیسے کے پاس آتے اور اسے کچھ داؤ گھات بتاتے، لیکن ٹمن نے دکان ہی بڑھا لی تھی۔ دروازوں کو اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے کیرتی کے وُڈ ورک کو دیکھا جو بہت عمدہ تھا۔ شیش ناگ کا نچلا حصہ تو خوب صورت تھا ہی لیکن اوپر اس کی چھتری نما کھال میں اس نے صرف گودنوں سے رنگ بھر دیے تھے۔ وشنو میں وہی تھا جو کوئی بھی عقیدت مند عورت کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ لکشمی ڈھیر سی پڑی تھی اور

اس کے بدن کے خطوط واضح نہ تھے۔ شاید کیرتی کو اس کے کسی بھی معنی میں نہ جانتی تھی۔ حالانکہ اسے ویدچک بنانا کتنا آسان تھا جب عورت پاؤں دبانے کے لیے جھکتی ہے تو ظاہر ہے اس کے ہاتھ بازو بدن سے الگ ہوتے ہیں اور مخصوص عورت صاف اور سامنے دکھائی دیتی ہے۔ پھر پہلو پہ بیٹھی ہوئی اوپر کی عورت نیچے والی سے کتنی کٹ جاتی ہے اور مرد کی نظروں کو کیا کیا اونچ نیچ سمجھاتی ہے۔ اگر یہ کہیں کیرتی خود عورت تھی اس لیے اسے عورت کی بہ نسبت مرد میں زیادہ دلچسپی تھی تو یہ غلط ہو گا۔ کیونکہ عورت اپنے حسن کے سلسلے میں اوّل اور آخر تک خود پرست ہوتی ہے اور جب اس کی یہ خود پرستی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو کسی بھی مرد کی مدد سے اسے جھٹک دیتی ہے۔

گمن نے کیرتی کے وُڈورک کو ایک ہاتھ میں لیا اور ودیشک میں چاقو لے کر اس پہ "سدہم تمہ" کے الفاظ کندہ کر دیئے اور پھر پچھلے کمرے میں پہنچ گیا جہاں کچی زمین تھی۔ جسے کھود کر اس نے وڈورک کو نیچے رکھا، ایک اور مورتی کو نکالا جو کیرتی ہی کی بنائی ہوئی تھی اور پھر گڑھے پہ مٹی ڈال کر اس پہ کتھے کا پانی چھڑک دیا۔ پرانے بت کی مٹی جھاڑ کر اسے دیکھا تو بڑی بڑی دراڑیں اس میں چلی آئی تھیں اور وہ صدیوں پرانا معلوم ہو رہا تھا۔ اگلے دن وہ جب اسے لے کر ٹورسٹوں کے پاس گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ گمن نے انہیں بتایا کہ اس کا ذکر کالی داس کے رگھوونش میں آتا ہے۔ رگھو جی نے کونکن کے علاقے میں ہرکٹ نام کا ایک شہر بسایا تھا، جہاں سے یہ بت برآمد ہوئے۔ کچھ میسور کے مہاراجہ وڈیار کے پاس ہیں اور کچھ اپنے پاس۔ چنانچہ اس بت کو گمن ٹھکلے نے ساڑھے پانسو روپے میں بیچ دیا۔ جس کے لیے اس نے کیرتی کو پانچ روپے دیئے تھے۔

اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر کیرتی نیوڈ لے آئی۔ وہ بدستور بدحواس تھی۔ اس کی ماں تو بیمار تھی ہی، وہ بھی بیمار ہو گئی تھی۔ اسے قریب قریب نمونیہ ہو رہا تھا۔ وہ کھانس رہی تھی اور بار بار اپنا گلا پکڑ رہی تھی، جس پہ اس نے روئی کا ہوگڑ ایک پھٹے پرانے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

کیرتی نے معمول کی طرح سے شلپ کو گمن ٹھکلے کے سامنے رکھا۔ اب کے اس نے اُسے لکڑی میں نہیں، پتھر میں بنایا تھا۔ اب وہ بیم اُمید و بیم کے ساتھ گمن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گمن اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو بہت بڑا جھوٹ ہوتا۔ اس لیے اس نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ جی بھر کر داد دی۔ اعتراض کیا تو صرف اتنا کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ کاش وہ اُسے قدِ آدم میں بناتی تو نہ صرف اسے بلکہ خود گمن کو بھی بہت فائدہ ہوتا۔

اس نے شلپ یکسی کو ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھا۔ کیرتی پھر بھی سچ مچ کا نیوڈ نہ بنا سکی تھی۔ بت کے بدن پہ کپڑا تھا جو گیلا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اس کپڑے سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کہیں تو بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کہیں علیحدہ۔ بظاہر چھپانے کے عمل میں وہ عورت کے جسم کو اور بھی عیاں کر رہا تھا۔

شاپ پر سے نظریں ہٹا کر گمن ٹھکلے نے کیرتی کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "واہ" ! کیرتی جھینپ گئی اور اس جانی ساری کو آگے کھینچ کر پیچھے سے ڈھانپنے لگی لیکن گمن سب جان گیا تھا کہ وہ برہنہ ہوکر خود کو آئینے میں دیکھتی اور اسے بناتی رہی ہے کہ یہ بار اس نے کپڑا اچھی طرح اپنے بدن پر کسا ہوگا، جس سے اسے بڑی ہوگئی اور اب وہ کھانس رہی ہے۔ یہ صرف پیسے ہی کی بات نہیں۔ عورت میں نمائش اور خود سپردگی کا جذبہ بھی تو ہے۔ گمن سب سمجھ گیا تھا مگر تجاہل برتتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "ماں کیسی ہے ؟"

کیرتی جیسے ایک دم برافروختہ ہوگئی، اسے کھانسی کا دورہ سا پڑا اور خود کو سنبھالنے میں خاصی دیر لگی۔ گمن گھبرا گیا تھا اور شرمندہ بھی تھا اس کے بعد سر ہلاتے ہوئے جو اس نے سوال کیا، وہ بہت غیر ضروری تھا۔ "تو موڈل مل گیا تھا ؟"

کیرتی نے پہلے تو نظریں گرادیں اور پھر دکان سے باہر اس طرف دیکھنے لگی جہاں سڑک آسمان کو چھوتی ہوئی ایکا ایکی نیچے گرتی تھی۔ گمن نے چاہا کہ اسے اس کمزوری کے عالم میں کپڑے اور وہ داد دے جس کی وہ مستحق تھی اور جو شاید وہ چاہتی بھی تھی مگر اس نے سوچا! ایسے میں دام بڑھ جاتے ہیں۔ اس نے اپنے دل میں اب کے کیرتی کو سو روپے دینے کا فیصلہ کیا۔ بوتل اور باقی کی چیزیں شاید سوکی نہ ہوں مگر وہ سو بیس کا اندازہ لگا رہا تھا کہیں کیرتی زیادہ کا مطالبہ نہ پیش کردے۔

"کیا دام دوں اس کے ؟" اس نے یونہی سرسری طریقے سے پوچھا۔

کیرتی نے اچٹتی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "اب کے میں پچاس روپے لوں گی ۔"

"پچاس ؟"

"ہاں۔ پائی کم نہیں ۔"

گمن نے تسکین کے جذبے سے دول کا پٹ اٹھایا اور چالیس روپے نکال کر کیرتی کے سامنے رکھ دئیے اور بولا۔ "جو تم کہو۔ مگر ابھی چالیس ہی ہیں میرے پاس۔ دس پھر لے جانا ۔"

کیرتی نے روپے بڑھ کر لے لیے اور کہا۔ "اچھا"

وہ جانے ہی والی تھی کہ گمن نے اسے روک لیا۔ "سنو"

کیرتی کنت سنے پر گمن کی طرف مڑتے تھام لوسے انداز میں دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر اداسیاں چھٹ جانے کی بجائے کچھ اور گہری ہوگئی تھیں جب گمن نے پوچھا "اتنے پیسوں سے تمہارا کام چل جائے گا ؟"

کیرتی نے سر ہلا دیا اور پھر ہاتھ پھیلا دئیے جس کا مطلب تھا۔ اور کیا کرنا ۔۔۔۔ ؟ پھر اس نے بتایا۔ ماں کا آپریشن آ رہا ہے، جس کے لیے سینکڑوں روپے چاہئیں۔

"میں تو کہتی ہوں" اس نے کہا اور پھر کچھ رک کر بولی "ماں جتنی جلدی مر جائے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔ اور پھر وہ کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ پھر خود ہی بول اٹھی۔ ایسے ایڑیاں رگڑنے سے موت اچھی۔

جب گمن سے اس نے آنکھ نہ ملائی تو کیرتی اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس برس کی بھرپور عورت نظر آنے لگی جو زندگی کو ... اپنے ادر ... ... بیکار کرکے پھینک دیتی ہے۔

"ایک بات کہوں" گن ٹیکلے نے پاس آتے ہوئے کہا "تم مجسمہ بناؤ۔ آپریشن کا سب خرچا میں دوں گا۔"

"مجسمہ؟" کیرتی نے کہا اور لرز اٹھی۔

"ہاں" گن بولا "اس کی بہت مانگ ہے۔ ٹورسٹ اس کے لیے دیوانے ہوتے ہیں۔"

"لیکن ..."

"میں سمجھتا ہوں" گن نے مسکراتے ہوئے کہا "تم نہیں جانتیں تو ایک بار کھجراہو چلی جاؤ اور دیکھ لو۔ میں اس کے لیے تمہیں پیشگی دینے کو تیار ہوں۔"

"تم؟" کیرتی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولی "تم تو کہہ رہے تھے تمہارے پاس اور پیسے نہیں؟"

گن نے فوراً جھوٹ تراش لیا۔

"میرے پاس سچ مچ پیسے نہیں" وہ بولا "میں نے دکان کا کرایہ دینے کے لیے کچھ الگ رکھے تھے ..."

پھر اس نے پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر کیرتی نے اپنے زخم نہیں دیے اور وہاں سے چلی گئی۔ گن ٹیکلے نے لوٹ کر یکشی کو دیکھا اور پھر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی لے کر اس کی ناک توڑی۔ پھر ایک بازو توڑا، پھر ٹانگ توڑی اور اس کے سر کے سنگار پر ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں جس سے کچھ کچھ ریں گریں۔ پھر اندر جا کر اس نے اسے رسی سے باندھا اور نمک کے تیزاب میں ڈبو دیا۔ دھوئیں کے بادل سے اٹھے۔ گن نے رسی کو کھینچا اور یکشی کو نکال کر پانی میں ڈال دیا۔ اب جو اسے نکالا تو یکشی کے خدوخال دھندلے ہو گئے تھے اور کہیں کہیں بیچ میں سوراخ سے پڑے تھے۔ اب وہ ہزار ایک روپے میں بکنے کے لیے تیار تھی۔

اب کے کیرتی جو شلپ لائی وہ مجسمہ ہی تھا۔ اور قد آدم۔ وہ ایک بوری میں بندھا ہوا تھا اور ٹھیلے پر آیا تھا۔ کچھ مزدوروں نے اٹھا کر اسے گن ٹیکلے کی دکان پر رکھا۔ پھر اپنی مزدوری لے کر وہ لوگ چلے گئے۔

کیرتی اور خود کو تنہا پا کر، تیز سانسوں کے بیچ گن ٹیکلے نے بوری کی رسیاں کاٹیں، اور کچھ وارفتگی سے ٹاٹ کو شلپ پر سے ہٹایا۔ اب شلپ سامنے تھا۔ پرفیکٹ... گن نے اسے دیکھا تو اس کے منہ میں لعاب سوکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیرتی اس کے سامنے اس شلپ کو نہ دیکھے گی کہ وہ نہیں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے، کسی بھی زاویہ سے نہیں۔ شلپ میں کی عورت تکمیل کو پہنچ رہی تھی جبکہ مرد خود شلپ کے عالم میں اسے دونوں کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھا، جسے گن ٹیکلے نے توجہ سے نہ دیکھا۔ وہ اسے بعد میں فرصت سے دیکھنا چاہتا تھا۔

"کتنے پیسے چاہئیں، آپریشن کے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"آپریشن کے لیے نہیں۔ اپنے لیے۔"

"اپنے لیے؟ ہاں ... ..."

"مر گئی۔ کوئی ہفتہ ہوا۔"

گُن نے اپنے چہرے پہ دکھ اور افسوس کے جذبے لانے کی کوشش کی، مگر شاید کیرتی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ ویسے ہی بھینچے ہوئے تھے۔ وہ ویسے ہی اُداس تھی جبکہ اس نے کہا۔ "میں اس کا ہزار روپیہ لوں گی۔"

گُن بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی، جب اس نے کہا۔ "اس کے ہزار روپے بھی کوئی دے سکتا ہے؟"

"ہاں" کیرتی نے جواب دیا "میں بات کر کے آئی ہوں۔۔ شاید مجھے زیادہ بھی مل جائیں، لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔"

"میں تو۔۔ میں تو پانسو دے سکتا ہوں۔"

"نہیں" اور کیرتی نے مزدوروں کے لیے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ گُن ٹکلے نے اسے روکا ——— "سو دو سو اور لے لو"

"ہزار سے کم نہیں۔"

گُن نے حیران ہو کر کیرتی کی طرف دیکھا جس کے آج تیور ہی دوسرے تھے۔ کیا وہ مجبور ہو گئی تھی؟ ٹورسٹوں سے مل چکی؟ کسی بھی قیمت پہ کلاکار کو اس کی مارکیٹ سے جدا رکھنا چاہیئے۔۔ مگر خیر۔۔ اس نے رول ٹاپ اٹھایا اور آٹھ سو کے نوٹ گن کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے۔ کیرتی نے جلدی سے بڑھ کے اور اُس کے مُنہ پہ پھینک دئیے۔

میں نے کہا نا۔ میں ہزار سے کم نہ لوں گی۔

"اچھا ——— نو سو لے لو"

"نہیں"

"ساڑھے نو سو۔ نو سو پچھتر۔۔" اور پھر کیرتی کی نگاہوں میں کوئی عزم دیکھ کر اس نے سو سو کے دس نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور نشے کی حالت میں مجسمے کی طرف لپک گیا۔ کیرتی کھڑی تھی ——— جیسے وہ اپنے فن کی داد لینے کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔ گُن نے مجسمے میں کی عورت کی طرف دیکھا جو پھر کیرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے؟ کیا وہ لذت کی گراں باری تھی یا کسی جبر کا احساس؟ کیا وہ دکھ اور سکھ، درد اور راحت کا رشتہ تھا جو کہ پوری کائنات سے ہے؛ پھر اس نے مرد کی طرف دیکھا جو اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بے حد کثیف۔ کیوں، کیرتی نے کیوں مرد — انسان کی "حمایت" پہ زور دیا تھا؛۔۔ یہ محسن ہے۔۔ مگر وہ محسن تو نہیں، جو پُرش اور پرکرتی میں ہوتا ہے۔۔ ؛ ٹھیک ہے۔ اُتنا زیادہ پیسے ملیں گے۔۔ ۔۔ ۔

گُن ٹکلے نے اُوپر کی بتی کو کھینچ کر پھر مرد کی طرف دیکھا اور بول اُٹھا — "یہ — میں نے اسے کہیں دیکھا ہے"

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم —" گُن نے جیسے پتہ پاتے ہوئے کہا "تم سراج کے ساتھ باہر گئی تھیں؟"

کیرتی نے آگے بڑھ کر زور سے ایک تھپڑ گُن ٹکلے کے مُنہ پہ لگا دیا اور نوٹ ہاتھ میں تھامے دوکان سے نکل گئی۔

دو ہاتھ

خواجہ احمد عباس

دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تو سکھا رام کی آنکھ کھل گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کتے کچھ ایسے انداز میں بھونک رہے تھے، جیسے رو رہے ہوں۔ اندھیرا تو جب وہ سویا تھا تب بھی تھا، مگر اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ اماوس کی رات تھی چاندنی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن تارے بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ برسات کا موسم نہیں۔ شام کو اس نے دیکھا تھا کہ آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی کہیں نہیں ہے۔ شاید جاڑے کی دھند تھی جس نے ستاروں کو اپنی کالی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ دھند تھی یا دھواں تھا یا دھول کا بادل تھا اس میں سکھا رام کا گلا گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

شاید یہ اس کا وہم ہی ہو۔ بھلا اندھیرے سے بھی کسی کا گلا گھٹتا ہے؟ شاید جیسے جیسے وقت قریب آ رہا ہے۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکنے والی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ چار بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔ بازار کے چوکیدار ساڑھے چار بجے اپنا پہرہ ختم کر کے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ پو پھٹے گی ساڑھے پانچ بجے۔ اس کو دو دکانوں کا صفایا کرنے میں بس یہی ایک گھنٹہ لگے گا۔

چوری اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھلے تین برس میں کئی بار اس نے جیل کی ہوا کھائی تھی۔ دو بار بمبئی کی پولیس نے اسے تڑی پار کیا تھا۔ اس بار تو انہوں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بمبئی میں اس کی شکل بھی نظر آئی تو سیدھا اس کا چالان کر دیں گے۔ چاہے اس نے کوئی جرم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

سو سکھا رام پونا چلا آیا تھا، مگر یہاں کا موسم چوری کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ رات کو سردی کے مارے سب دروازے کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے۔ پولیس والے کم بخت بھی ہر وقت چکر لگاتے رہتے تھے۔ دو چار حوالدار اس کو پہچانتے بھی تھے۔ "کیوں سکھا رام! بمبئی پولیس نے کر دیا نہ تجھے تڑی پار؟ یاد رکھنا کہ ہم تڑی پار نہیں کرتے۔ ذرا سا شبہ بھی ہو تو سیدھا جیل خانے میں بند کر دیتے ہیں۔" ان حالات میں کوئی شریف آدمی۔ یا شریف چور۔ کرے تو کیا کرے؟ دو چار ہی دن میں جیب میں جو جمع پونجی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ سکھا رام نے سوچا اپنے گاؤں واپس چلا جائے۔ پونا سے سوا سو میل پر ہی تو تھا۔ مگر جائے تو کیسے۔ تین برس کے بعد اپنی بیوی کو کیا منہ دکھائے گا؟ گاؤں چھوڑتے وقت اس نے وٹھوبا کے مندر میں جا کر اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اب وہ اس وقت ہی واپس آئے گا جب اس کے ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے تاکہ ساہوکار سے اپنی زمین چھڑا لیں، اپنے جھونپڑے کی مرمت کرا لیں اور ہل جوتنے کے لیے ایک جوڑی کولہاپوری بیلوں کی خرید لیں۔ بس اتنی سی دنیا تھی ان کی۔ دو بیگھہ زمین۔ ایک جوڑی بیل۔ ایک ہل۔ جھونپڑے کی چار دیواریں اور پھونس کی چھت۔ اور

ساوتری!

بر بار جب اسے اپنی بیوی ساوتری کی یاد آتی تھی تو سکھارام کے دل میں درد کی ایک میٹھی میٹھی سی ٹیس اُٹھتی تھی۔ گاؤں بھر میں ایک چھوکری بھی تو ساوتری جیسی نہیں تھی۔ آم کی کیریوں جیسی آنکھیں۔ یہ لمبے لمبے ریشم جیسے ملائم بال جن کا جوڑا بنا کر اس میں ایک جنگلی پھول لگا لیتی تھی تو سکھارام کے من میں کنول کمل اُٹھتے تھے۔ دُبلی پتلی مگر سڈول جسم جو نوگز کی ساڑھی اور پھنسی ہوئی چولی میں اور بھی غضب ڈھاتا تھا۔ جنس کچھ ایسی کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو پھر بھی ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی کوئی سہیلی ہمدردی جتاتی تو کہتی "مجھے کیا فکر ہے؟ میرے گھر والے کے محنت کرنے والے دو ہاتھ سلامت چاہئیں۔ سب دلدّر دور ہو جائیں گے۔"

ساوتری کا خیال آتے ہی سکھارام اندھیرے میں مسکرا دیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھو کر محسوس کر سکتا تھا مگر وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان دو ہاتھوں نے جو محنت سے کھردرے اور سخت ہو گئے تھے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ ہل چلایا تھا۔ بیج بویا تھا۔ سینچائی کی تھی۔ نلائی اور کٹائی کی تھی۔ اناج کو چھاج کر بوریوں میں بھرا تھا، بوریوں کو اُٹھا کر بیل گاڑی میں رکھا تھا۔ پھر وہ سب بوریاں ساہوکار کے ہاں پہنچا آیا تھا۔ اور ساہوکار نے بہی کھاتہ کھول کر حساب بتایا کہ اناج سے قرضہ پورا نہیں ہوا۔ اس کو اپنا بیل بھی بیاج میں دینا ہوگا۔ ایک بیل تو پہلے ہی بوڑھا اور بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ دوسرا ساہوکار کے حوالے کیا۔ اور گاڑی کو ان ہی دو ہاتھوں سے کھینچتا ہوا گھر واپس لے آیا۔ اُس دن سکھارام نے بمبئی آنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے سُنا تھا کہ شہر میں کام بہت ہے۔ محنت مزدوری کرنے والے دو ہاتھ ہونے چاہئیں۔ ملوں میں تو ان دو ہاتھوں کا کوئی خریدار نہ نکلا۔ سو اس نے ان ہاتھوں سے بوجھا ڈھویا تھا۔ اناج کی بوریاں مال گاڑی سے اتار کر ٹرکوں میں بھری تھیں اور ٹرکوں سے اُتار کر گوداموں میں رکھی تھیں، اور ان بوریوں میں سے اس کو گیہوں کی ایسی جانی بوجھی سوندھی سوندھی خوشبو آئی کہ اس نے سوچا ممکن ہے میرے کھیت سے پیدا ہوا اناج بھی ان بوریوں میں بھر کر آ گیا ہے۔ بعض گوداموں میں خفیہ طریقے سے مال رات کو اتارا جاتا تھا۔ سکھارام جانتا تھا یہ کالا بازار ہے۔ مگر وہاں مزدوری دُگنی ملتی تھی۔ چار رُوپے کے بجائے آٹھ روپے روز۔ شام کو چار آنے کی اوسل پاؤ کھا کر وہ اوپر سے ٹھنڈا پانی پی لیتا اور بس!

سینما کی رنگ برنگی روشنیاں آنکھیں جھپکا کر اس کو بلاتیں، اُن کے رنگین پوسٹروں پر ادھ ننگی میمیں اس کو لبھاتیں، مگر سکھارام سوچتا میری ساوتری ان سب سے خوب صورت ہے۔ میں ان کو دیکھنے کے لیے کیوں اپنی محنت کی کمائی خرچ کر دوں؟ اُس کی انٹی میں پانچ سے دس، دس سے بیس، بیس سے پچاس، سو روپے، دو سو رُوپے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے اور اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کھیت، اس کے بیل، اس کا گاؤں، اس کی ساوتری، اس کے قریب آتے جا رہے ہیں، اور دن بھر محنت کرنے کے بعد جب وہ ان ہی ہاتھوں کا تکیہ بنا کر فٹ پاتھ پہ سو جاتا تو اس کے خواب میں ساوتری کے پیروں کی چھاگل سُنائی دیتی، اور وہ اپنے مچھلی جیسے سڈول جسم کو نوگز کی ساڑھی میں لپیٹے اُس کے لیے بھاکری اور ساگ اور پیاز کی گٹھیاں لاتی اور کھیت کی منڈیر پر ہی بیٹھ کر وہ کھانا کھاتے۔ اور کبھی کبھی بچوں کی طرح ساوتری نوالہ بنا کر سکھارام کو دیتی اور کبھی وہ شرارت سے ساوتری کی اُنگلی کاٹ لیتا اور جب وہ اس پر کھل کھلا کر ہنس پڑتی تو پھر وہ نوالہ بنا کر ساوتری کے مُنہ میں دیتا اور۔ اس کے نازک سفید دانت سکھارام کی مضبوط کھردری انگلی کو نرمی سے اپنی پکڑ میں لے لیتے اور پھر دانتوں کی جگہ ہونٹ لے لیتے۔ ساوتری کے انگوروں جیسے اُودے اور رس بھرے ہونٹ — اور سکھارام کو محسوس ہوتا کہ وہ نرمی اور پیار کی ایک لہر میں ڈوبتا جا رہا

ہے — ڈوبتا جارہا ہے، اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے ڈوبنے سے بچالے!

ایک دن سکھا رام صبح کو دیر سے اُٹھا۔ انگڑائی نے کر رات بھر کی نیند کا نشہ دُور کیا۔ پھر رام کا نام لے کر کھڑا ہو گیا تو اُسے اپنی انٹی جہاں وہ سب رُوپیہ رکھا کرتا تھا ہلکی لگی۔ گھبرا کر جلدی سے کھول کر دیکھا تو سب رُوپیہ غائب تھا۔ چھ مہینے کی محنت پر پانی پھر گیا تھا۔

"کہاں ہے وہ بدمعاش؟" وہ بے تحاشا چلایا۔

"کون بدمعاش؟" کسی نے پوچھا۔

"جو میرے قریب یہاں فٹ پاتھ پر سو رہا تھا۔ رات کو بڑی دیر تک مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُس کو بتایا — ہاں میں نے ہی اُس کو بتایا تھا — کہ میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو چکے ہیں — مگر وہ ہے کہاں؟"

ایک بوڑھا بھکاری جو ایک کونے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا تھا اور اُس فٹ پاتھ کی سب خبریں رکھتا تھا بولا "ارے بھیکو تمہیں اب نہیں ملے گا۔ وہ تو کہیں بیٹھا تمہارے رُوپے سے دارو پی رہا ہوگا۔"

پورے تین دن اس نے شہر کی خاک چھانی۔ ہر دارو بنانے اور دارو بیچنے کے غیر قانونی اڈے پر جو آیا۔ بڑے بڑے عجیب آدمیوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اُن میں سے کئی چاہتے تھے کہ وہ بھی دارو سپلائی کرنے کے دھندے میں لگ جائے۔ ایک ہی مہینے میں اُس کا سارا نقصان پورا ہو جائے گا۔ مگر سکھا رام کو کام نہیں چاہیے تھا اس کو بھیکو سے بدلہ لینا تھا جس نے اُس کی تین مہینے کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ آخر کار چوتھے دن دھراوی کے ایک جھونپڑے میں وہ بھیکو کو پکڑ پایا۔ وہ ایک میز پر بوتل اور گلاس اور بھنے ہوئے چنوں کی ایک پلیٹ رکھے ہوئے دارُو پی رہا تھا۔

سکھا رام نے اُس کو گلے سے پکڑ لیا اور چلایا "نکال میرے رُوپے"

بھیکو نشے میں تھا پھر بھی اُس نے انکار نہیں کیا، صرف اتنا کہا:۔

"گلا تو چھوڑ دیتا ہوں، دیتا ہوں"

سکھا رام نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ بھیکو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مٹھی بھر سکے نکال کر میز پر ڈال دیئے۔ سکھا رام نے جھپٹا مار کر ان کو تو اپنے قبضے میں لیا۔ پھر گن کر بولا "مگر تو نے تو ساڑھے تین سو روپے چرائے تھے۔ یہ تو صرف تین روپے اسی پیسے ہیں۔ باقی کہاں ہیں —؟"

"یہاں" بھیکو نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر بولا:۔

"سب پی گیا۔ بھئی بڑا مزہ آیا۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ دھنیہ واد"

"دھنیہ واد کے بچے!" سکھا رام نے پھر اُس کا گلا پکڑ لیا۔ اس پر دارُو بیچنے والا اور اس کے دو چار ساتھی وہاں آ گئے اور سکھا رام کا ہاتھ چھڑا کر اُلٹا اس کو مارنے لگے۔

"نہیں چھوڑ دو اسے۔" بھیکو نے حکم دیا اور اُن لوگوں نے سکھارام کو چھوڑ دیا۔

"یہ میرا دوست ہے ذرا غصے میں آگیا تھا" اور پھر سکھارام کی طرف دیکھ کر۔ "بیٹھو، بیٹھو۔ تم بھی پیو۔ ابھی ہم دو بوتلیں اور منگا سکتے ہیں"

"میں نہیں پیتا" سکھارام نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے کہ تم پیتے نہیں ہو تب ہی تو انٹی میں اتنے روپے لیے پھرتے ہو اور پھر بھی فٹ پاتھ پر سوتے ہو۔ پیو میرے بھائی۔ دارو تمہارے ہی پیسے سے آئی ہے"

یہ کہہ کر اُس نے گلاس میں دارو انڈیل دی اور گلاس سکھارام کی طرف بڑھایا۔

سکھارام نے سوچا "یہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔ میرے پیسے ہی کی تو دارو پی رہا ہے۔" اُس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ ایک بار تو بڑی بو آئی۔ پھر دل کڑا کر کے وہ پی گیا۔ اُس کو پہلے تو ایسا لگا کہ کسی نے چاقو سے اُس کا گلا اندر سے چیر دیا ہے۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ احساس جاتا رہا۔ اور اس کی جگہ ایک نرم نرم گرمی نے لے لی جو اس کے بدن میں دوڑتی جا رہی تھی۔

بھیکو نے اس کا گلاس پھر بھر دیا تھا۔ "اور پیو میرے یار"

سکھارام نے دوسرا گلاس بھی پی لیا۔

اب اُس نے گلاس واپس میز پر رکھا ہی تھا اور بھیکو اس میں تیسرا پیگ انڈیلنے کے لیے دارو کی بوتل اٹھا ہی رہا تھا کہ اُس کی نظر اس کی کلائی پر پڑی جہاں ایک سُنہری پٹے کی گھڑی چمکا رہی تھی۔

"یہ بھی میرے پیسے سے لی ہے؟" وہ چلایا۔

بھیکو نے کلائی سے گھڑی اُتار کر سکھارام کو دے دی۔ "یہ تو میرے یار آج ہی ایک سمگلر سے پچاس روپے میں لی ہے۔ خالص ولایتی گھڑی ہے، اندھیرے میں بھی وقت بتاتی ہے"

ڈھائی برس کے بعد آج بھی وہ گھڑی سکھارام کی کلائی پر لگی ہوئی اندھیرے میں وقت بتا رہی تھی۔ چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ سکھارام نے سوچا وقت بھی کتنے دھیرے دھیرے گزرتا ہے، ساڑھے چار بجیں تو میں اپنا کام چالو کروں۔ اور پھر اُس کو گھڑی سے بھیکو کی یاد آئی، بھیکو جو اب بھی جیل کی ہوا کھا رہا تھا مگر جس نے سکھارام کے روپے چُرا کر اس کو چوری کا راستہ دکھایا تھا۔

پہلے چھوٹی موٹی چوریاں۔ پھر بڑی چوریاں۔ مگر کبھی سکھارام کے پاس اتنے روپے نہ ہوئے کہ وہ گاؤں واپس جا کر اپنی زمین چھڑا لیتا۔ دو بیل خرید لیتا۔ ساوتری کے لیے دو چار بڑھیا ساڑھیاں اور کچھ زیور خرید لیتا۔ اوّل تو چوری کا مال دوکان داروں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچنا پڑتا تھا۔ دوسرے جو آتا تھا وہ کھانے پینے، پلانے میں خرچ ہو جاتا تھا، جیل میں وہ فضلو ٹھیک کہتا تھا "یار اس حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی ہے"

پونا میں ایک دن شام کو اندھیرا ہوتے ایک عورت کا بٹوہ چھین کر بھاگنا چاہا مگر اس کم بخت نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا

لیا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے تھے۔ سکھارام نے بٹوے میں سے دس بیس روپے کے نوٹ نکال کر بٹوہ زمین پر پھینک دیا، اور خود بھاگتے بھاگتے ایس۔ ٹی۔ کے بس سٹینڈ کی طرف آ نکلا۔ ایک بس جانے کو تیار تھی۔ وہ اس میں سوار ہو گیا۔ بس چل پڑی۔ کنڈکٹر نے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟" سکھارام نے جس کا سانس دوڑنے سے اب تک پھولا ہوا تھا جواب دیا "جہاں بھی یہ بس جا رہی ہے۔"

بس کنڈکٹر نے کسی جگہ کا نام لیا جو بس کی گھر گھراہٹ میں سنائی نہ دیا، پھر اس نے کہا "سات روپے ہوں گے۔" سکھارام نے اُسے چوری کا دس کا نوٹ پکڑا دیا اور تین روپے لے کر جیب میں رکھ لیے۔

صبح سویرے بس اپنی منزل پر پہنچی تو سکھارام آنکھیں ملتا ہوا اُترا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی گاؤں ہو گا۔ مگر یہاں پہنچ کر دیکھا کہ بڑی رونق ہے، اچھا خاصا قصبہ ہے۔ بازار بھی ہے۔ بازار میں دوکانیں بھی ہیں۔ دوکانوں میں سامان بھی ہے۔ چوری کرنے کے قابل سامان!

سکھارام نے فیصلہ کر لیا کہ دو تین روز یہیں گزارنے چاہئیں، کون جانتا ہے اُس کی قسمت یہاں ہی کھل جائے۔ دن بھر وہ بازاروں میں گھومتا، کس دکان میں کیا کیا سامان ہے۔ اس کو دماغ میں یاد کرتا۔ کہاں ساڑھیاں ملتی ہیں، کہاں زیور۔ کہاں ریڈیو۔ کس کس دکان میں تجوریاں ہیں جو یقین ہے روپوں سے بھری ہوں گی۔ رات کو چوکیدار بازار کا گشت لگاتے تھے۔ مگر اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ساڑھے چار بجے صبح وہ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ بس وہی وقت ٹھیک رہے گا، اپنے کام کے لیے۔ دو چار دوکانوں ہی سے اس کا کام چل جائے گا۔ اور دوکانیں کھلنے کے وقت تک وہ وہاں سے بہت دور نکل جائے گا۔

شہر کی ساری رونق بندھ کی وجہ سے تھی، زیادہ تر لوگ وہیں کام کرتے تھے۔ سکھارام نے سوچا کیوں نہ بندھ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ بندھ واقعی بڑا جنگی تھا۔ دو پہاڑیوں کے بیچ میں ندی کے پانی کو روکنے کے لیے بندھ بنایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے بجلی کے کارخانے بھی تھے۔ بندھ پر اب بھی کچھ کام ہو رہا تھا۔ سینکڑوں مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔

ایک مزدور سے سکھارام نے پوچھا "کیوں بھئی یہ اتنا بڑا بندھ کیوں بنایا ہے؟"

اس نے کہا۔ "تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ یہاں پانی اکٹھا کر کے نہریں نکالیں گے جو سوکھے کھیتوں میں پانی پہنچائیں گی۔"

سکھارام نے سوچا "میرے کھیتوں میں بھی پانی آئے گا؟"

وہ مزدور اب کہہ رہا تھا "اور یہ بجلی گھر بھی پانی کی طاقت سے چلتے ہیں۔ یہاں بجلی بنتی ہے اور ان تاروں سے دور دور جاتی ہے۔ جانتے ہو بمبئی بھی بجلی یہیں سے جاتی ہے۔"

اور سکھارام کے دماغ میں بمبئی کی لاکھوں جگمگاتی ہوئی روشنیاں اُبھر آئیں۔ اتنی دور سے بجلی وہاں جاتی ہے! پھر اس نے سوچا کہ میرا گاؤں تو صرف چالیس میل ہے یہاں سے۔ وہاں تک تو یہ بجلی جاتی نہیں ہے۔ مجھے اس بجلی سے فائدہ؟

ایک اونچے ٹیلے پر کسی مزدور نے ٹین کی چھت کا ایک جھونپڑا بنایا تھا۔ وہ خالی پڑا تھا۔ رات کو نظر بچا کر سردی سے بچنے کے لیے سکھارام اُسی میں پڑ رہتا۔ وہاں سے ایک طرف بہت دور بندھ پر لگی ہوئی روشنیاں نظر آتیں، دوسری طرف شہر کے مکانوں اور دکانوں کی بتیاں۔ وہ سوچتا اس روشنیوں کے سمندر میں یہی جھونپڑا ایک اندھیرے کا ٹاپو ہے۔ پھر سوچتا۔ شاید اندھیرا جھونپڑے میں نہیں ہے میرے من میں ہے۔

نہیں یہ اندھیرا کچھ اور قسم کا تھا۔ اس میں تو بندھ کی روشنیاں بھی ڈوب گئی تھیں۔ اندھیرے کے سمندر کی تہہ میں دور کہیں دھندلی دھندلی سی ٹمٹما رہی تھیں، اس کا اپنا گلا ہی گھٹتا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی دنیا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو۔ اس نے سوچا اور ایک بار پھر گھڑی کی اندھیرے میں چمکنے والی سوئیوں کی طرف دیکھا۔ چار بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اب اسے چلنا چاہیے۔ بازار پہنچنے میں کم سے کم دس منٹ تو لگیں گے، یہ سوچ کر وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ زمین کے اندر سے ایک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی جیسے سُرنگ میں کوئی ریل چل رہی ہو یا ہوائی جہاز بہت نیچے اڑ رہا ہو اور چھت پر گرنے ہی والا ہو۔ ساتھ میں اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین جیسے سرک گئی ہو۔ قدم ڈگمگائے تو اس نے اندھیرے میں دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ہاتھ سے چھُوا تو اس کو ایسا لگا جیسے دیوار بھی لڑکھڑا رہی ہے۔ اس نے شام کو شراب پی ہوتی تو وہ سمجھتا یہ سب نشے کا کرشمہ ہے۔ مگر اس نے تو چار دن سے دارو کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ پھر یہ سب کیا ۔۔۔ ۔۔۔

"بھونچال!" دفعتاً یہ خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا اور اگلے لمحے میں جھونپڑے کی لڑکھڑاتی ہوئی دیواریں اور کھڑکھڑاتی ہوئی ٹین کی چھت اس کے سر پر آ رہیں۔

جب اس کو ہوش آیا تو سب سے پہلے جو چیز اس نے محسوس کی وہ گندھک کی تیز بو تھی اور ایک دم گھونٹنے والا دھول مٹی کا بادل۔ اندھیرا اب بھی اتنا گہرا تھا کہ اس کو چاقو سے کاٹ سکتے تھے۔ سکھا رام کو اپنے ماتھے پر پانی کی ایک لکیر چلتی ہوئی معلوم ہوئی ٹٹول کر دیکھا تو منہ سے "سی" نکل گئی۔ سر میں گہرا زخم آیا تھا جس میں سے خون رس رہا تھا۔ ٹانگوں پر، بازوؤں پر، ایک طرف چہرے پر بھی چوٹیں آئیں تھیں۔ مگر یہ وقت ان معمولی زخموں کی پرواہ کرنے کا نہیں تھا۔ زخموں کی ٹیس اس کو جھنجوڑ کر بے ہوشی سے باہر نکال لائی تھی اور اب ایک ہی خیال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ اس جھونپڑے کی طرح بازار میں دکانوں کی دیواریں اور چھتیں بھی گر گئی ہوں گی۔ اس کو تالہ توڑنے کی تکلیف بھی نہ کرنی پڑے گی۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پورے ساڑھے چار بجے تھے۔ بھونچال آئے صرف دس منٹ ہوئے تھے۔

ٹین کا پترا جو اس کے سر پر گرا تھا اس کو ہاتھ سے ہٹا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ چاروں طرف دیواروں کی اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتا۔ لنگڑاتا۔ گرتا پڑتا، وہ اندازے سے شہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اندھیرا اب ایک مٹیالے دھندلکے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ مگر بندھ پر اور شہر میں سب جگہ بجلی کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اب تو اُس کا کام اور بھی آسان ہو گیا تھا۔

سارا شہر ایک دم گر پڑا تھا۔ جیسے گھر نہ ہوں، بچوں کے بنائے ہوئے مٹی کے گھروندے ہوں۔ زمین سے دھول کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ اینٹوں، پتھروں، ٹین کے پتروں کے نیچے دبے ہوئے آدمی۔ مرد، عورتیں، بچے۔ جو مر نہیں گئے تھے یا بالکل بے ہوش نہیں ہو گئے تھے وہ چلا رہے تھے، رو رہے تھے، سسک رہے تھے، بلک رہے تھے، کراہ رہے تھے۔ ایک نے ایک سایہ سا پاس سے گزرتے دیکھا تو چلایا "بھائی۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے اینٹوں کے اس ڈھیر میں سے نکالو۔ شاید میری ٹانگیں جاتی رہی ہیں" مگر سکھا رام کو اس وقت ایک ہی دھن تھی۔ وہ کسی کی جان بچانے کے لیے تیار نہیں تھا، آج بھگوان نے اسے سچ مچ چھپر پھاڑ کر دولت دی تھی۔ ایسا موقع وہ کھونے والا نہیں تھا۔ دو ہاتھوں سے جتنا کچھ سمیٹ سکا وہ لے کر وہاں سے چل دے گا، اور جب تک لوگوں کو ہوش آئے گا وہ اپنے گاؤں، اپنی ساوتری کے پاس پہنچ جائے گا۔

اندھیرے میں گرتا پڑتا، سنبھلتا، ٹھوکریں کھاتا، وہ بازار کی طرف چلا جا رہا تھا، کہیں کہیں مکانوں کی دیواریں بیچ سڑک پر آ رہی تھیں

اینٹ پتھر کے ڈھیروں سے بچنے کے لیے سکھا رام کو گرے ہوئے گھروں میں سے راستہ بنانا پڑتا۔ ایک بار تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کا پیر کسی نرم چیز پر پڑا ہے۔ شاید کسی کی ٹانگ تھی یا ہاتھ تھا۔ ایک ہلکی سی "آہ" سنائی دی اور پھر سکھا رام آگے بڑھ گیا۔

سکھا رام نے صبح کے دھندلکے میں دیکھا کہ بازار میں کسی دوکان کی چھت یا دیوار سلامت نہیں بچی تھی۔ دوکانوں کا سب سامان بکھرا پڑا تھا یا اینٹ پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سکھا رام نے ساڑھیوں کی دوکان سے دس پندرہ ساڑھیاں گھسیٹیں۔ ایک ساڑھی کو دوہرا کر کے زمین پر پھیلایا۔ اس میں سب ساڑھیوں کا ڈھیر لگایا۔ پھر کپڑے کے تھان ڈالے۔ پاس کی دوکان سے دو ریڈیو لے کر ان کو رکھا۔ ایک جیولر کی دوکان کے ملبے میں زیور بکھرے ہوئے تھے۔ سکھا رام نے ٹٹول ٹٹول کر اٹھائے۔ یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا کہ سونے کے ہیں یا چاندی کے۔ ایک تجوری اوندھی پڑی تھی اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایک اور دوکان کا کیش بکس اڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ اس کو کھولنے کی کوشش کی۔ بڑا بھاری تھا۔ ضرور روپے بھرے ہوں گے۔ جب نہ کھول سکا تو بند کا بند ہی ڈھیر میں شامل کر لیا۔ ساڑھی کا گٹھر باندھا۔ اب تو وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس نے سر پر رکھا۔ وزن کافی تھا اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ مگر اس نے جی کڑا کر کے قدم بڑھائے تاکہ سویرا ہونے سے پہلے وہاں سے باہر نکل جائے۔

دھیرے دھیرے آسمان میں سویرا ابھر رہا تھا۔ پورب کی طرف بادل، پہاڑیاں، مینار، ہلکی ہلکی پرچھائیاں سی اب دکھائی دے رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے شہر کے کھنڈر بھی دھرتی پر ابھر رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور تباہی۔ ایسا لگتا تھا شہر مر گیا ہے۔ دنیا مر گئی ہے صرف ایک آدمی زندہ ہے، اور وہ دونوں ہاتھوں سے دنیا کی دولت بٹور کر لیے جا رہا ہے۔۔

نہیں! اس نے سوچا، کوئی اور بھی زندہ ہے! ایک بچے کے رونے کی آواز نے سکھا رام کو چونکا دیا۔ جیسے یہ آواز باہر سے نہ آئی ہو خود اس کے من کے اندر سے آئی ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک گھر کی چھت اور دیواریں ڈھیر ہو چکی تھیں۔ ان ہی میں ایک طرف باپ مرا پڑا تھا۔ پاس ہی ماں، اور ان دونوں لاشوں کے قریب ہی ایک سال ڈیڑھ سال کا بچہ جو کسی معجزے سے بچ گیا تھا۔ اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

سکھا رام نے بچے کو دیکھا پھر ایسے نظر پھیر لی جیسے بچے نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ جلدی جلدی قدم بڑھانے لگا تاکہ دور پہنچ جائے کہ بچے کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچے۔ مگر بچے نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے، اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کا اپنا بچہ ہو جو ہمیشہ اُن کے سپنوں میں آتا تھا۔ مگر جس نے اب تک ساوتری کی کوکھ سے جنم نہ لیا تھا۔

اس نے مڑ کر بچے کی طرف دیکھا۔ سر پہ گٹھڑ اٹھائے اُلٹے پاؤں اس کے قریب گیا۔ سوچا کسی طرح اس گٹھڑی کو بھی لے چلوں اور اس بچے کو بھی اُٹھا لوں۔ مگر ہاتھ دو ہی تھے۔ یا ایک بوجھ کو سنبھال سکتے تھے یا بچے کو گود میں لے سکتے تھے۔

اس نے سر سے گٹھڑی اتار پھینکی۔ دوڑ کر بچے کے باپ کے پاس گیا۔ بے چارے کے سر پر ایک بھاری پتھر گرا تھا۔ کب کا دم توڑ چکا تھا۔ ماں کی نبض پر بھی ہاتھ رکھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے، پھر اس نے بچے کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ بچہ ہمک کر اس کی گود میں آتے ہی خاموش ہو گیا جیسے اسے اپنی منزل مل گئی ہو۔

سکھارام نے ایک نظر اُس گٹھڑی کی طرف دیکھا، جس میں دُنیا کی ہر دولت موجود تھی۔ بچہ دونوں ہاتھوں سے بچے کو سنبھال کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور چل کھڑا ہوا۔

دور بندھ کے پیچھے سورج بادلوں میں سے اپنا سر نکال کر کوشنہ نگر کی تباہی کو دیکھ رہا تھا۔ مگر سورج کی ایک نرم کرن سکھا رام اور اُس کی چھاتی سے لگے ہوئے بچے پر پڑی اور بچہ جس کی آنکھ میں اب تک آنسو تھے، آپ سے آپ مسکرا دیا۔

ہیروشیما کی ایک لڑکی

ل - احمد

سومیکو کا باپ رات کو کام پر سے گھر آیا تو اس وقت سومیکو سو چکی تھی۔ وہ ایک مشین بنانے والے کارخانے میں کام کرتا تھا، کام زیادہ ہوتا تو کئی کئی روز گھر نہ آتا۔ اس دن بھی کئی روز کے بعد آیا اور اپنی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔ سومیکو نہ سو رہی تھی اور نہ جاگ رہی تھی۔ اس حالت میں وہ ماں باپ کی باتیں سنتی رہی۔

"سُنتے ہیں امریکیوں نے ٹوکیو اما پر بھاری بمباری کی ہے: جاپانی زبان میں پرچے بھی برسائے ہیں۔ اور ہمارے شہر پر بھی بم گرانے والے ہیں! آ ہی گئی ہم لوگوں کی بھی باری! سائرن بجے تو بچوں کو فوراً شیلٹر میں لے جانا۔ پچھلی چوک کی سرنگیں دوسروں سے اچھی بنی ہیں۔ اللہ کچھ معلوم نہیں وہاں کب تک رہنا پڑے گا۔ میں وہیں آکر مل جاؤں گا —" شوہر نے کہا

"مشن اسکول کیا بُرا ہے؟" بیوی نے تجویز کیا۔ پھر کچھ چپکے چپکے باتیں ہوئیں اور پھر معمولی آواز میں گفتگو ہونے لگی، "پڑوسی شما نے گیا تھا وہاں سے بورا بھر کے لوکیاں لے آیا؟ اور ہمیں یہ سوکھی سستی گندیاں کھانا پڑ رہی ہیں! تم سے کتنی دفعہ کہا کہ سومیکو کی آنکھیں خراب ہیں: رات کے وقت پڑھ نہیں سکتی ہے؟ اور آمی چان[1] کے جھانسے نکل گئے ہیں۔

"پرسوں سے میرا شفٹ (باری) بدل جائے گا۔"

"آج تو اتوار ہے!" بیوی نے بات کاٹ کر یاد دلایا۔

"فیکٹری میں سگریٹیں بٹنے والی ہیں۔ وعدہ تجھ کو میں سگریٹیں دے کر ادیقو سے کھانے کا سامان بدل لاؤں گا!" باتیں پھر دھیمی آواز میں ہو رہی تھیں۔

"سومیکو کا پائجامہ پھٹ گیا ہے: اور پھٹنا تو نیا: جب دیکھو لڑکوں کی طرح پیڑوں پر ٹنگی رہتی ہے!"

باپ ہنس پڑا اور کہنے لگا:۔

"میری زین کی پتلون ایسی پھٹی ہے کہ مرمت نہ ہو سکے گی، کاٹ کر اس کے لیے پائجامہ سی دینا۔" اُس نے کچھ اور بھی کہا، مگر سومیکو ساری باتیں نہ سن سکی۔ کاغذ کھلنے پھٹنے کی سرسراہٹ آہستہ سنائی دی۔ اور ماں کی آواز کہتی سنی گئی:۔

"تمہارا راستہ دیکھتے دیکھتے سوئی: اب جگاؤں تو اس کی نیند خراب ہوگی۔ بمباری ہوئی تو کسے معلوم سونا نصیب بھی ہوگا یا نہیں!"

"تو میں اب جا رہا ہوں مگر دیر نہ کرنا، سائرن بجتے ہی بچوں کو لے جانا!"

---

[1] جاپان میں پیارے بچوں کے نام کے ساتھ چان لگا دیا جاتا ہے۔ مترجم

جوتوں کا صندوق بند ہوا، پھر دروازہ بھیڑنے جانے کی آواز آئی: سومیکو کا باپ کام پر جا چکا تھا۔

صبح جب ناشتہ ہو چکا تو سومیکو کی ماں نے ایک بستر تیار کر کے لپیٹ لیا اور تھیلے میں ضرورت کی چیزیں رکھ لیں، اور پھر زین کی ٹوپی لگا کر پڑوسن کے ساتھ اپنے کام پر چل دی۔ وہ شہری بچاؤ کے بریگیڈ میں کام کرتی تھیں۔ جانے سے پہلے اس نے سومیکو کو سمجھایا کہ چھوٹے بھائی کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہ جائے اور خطرے کا سائرن بجے تو اے۔ آر۔ پی وارڈن آکر محلے کے سب بچوں کو لے جائے گا۔ "دیکھو یہ تھیلا نہ بھولنا نہیں تو ٹاپاپی کر دگی وال!"

ماں چلی گئی تو سومیکو درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے پھٹے پاجامے کی مرمت کرنے لگی۔ اس کا چھوٹا بھائی دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا: یہ بچے جنگ کا کھیل کھیل رہے تھے۔ کچھ ہاتھوں کو گھما کر دھوں دھوں پکار کے امریکی بمباروں کی نقل اتار رہے تھے۔ دوسرے زمین پر بیٹھے لکڑیاں کھڑی کر کے ہوا مار توپوں کا دھوں دھوں چلا رہے تھے، اور کچھ اور ٹٹ ٹٹ ٹٹ کر کے مشین گنیں چلا رہے تھے اور دشمن کے بمبار پر ٹوٹے پڑ رہے تھے؛ اور اس طرح جاپانی زیرو[1] زصفر بن گئے تھے۔

محلے کا ایک شریر لڑکا جو "بڑے بچے" کا بیٹ لگائے پیچھے سے صحن کی جاری پر آ کھڑا ہوا اور اپنے پستول یعنی بانس کی پچکاری سے سومیکو کو شرابور کر دیا۔ سومیکو اسے پکڑنے کو جھپٹی تو یہ کہتا ہوا بھاگا کہ:-

"کہیں لڑکیاں بھی لڑتی ہیں —— سومیکو گدھی ہے!"

اس لڑکے اور سومیکو کی چونپ آج کی نہ تھی۔ بہت دن کی بات ہے جب اس نے سامنے کی دیوار پر کھریا سے دو بھاری صورتیں بنا کر ایک کے نیچے سومی چان اور دوسری کے ٹلے چان لکھ دیا تھا۔ ٹلے چان ایک لڑکے کا نام تھا جو اپنے ماں باپ کے ساتھ گلی کے نکڑ پر رہا کرتا تھا۔ یہ خاندان روزگار کی تلاش میں نگویا سے آکر یہاں بس گیا۔ اور کاغذ کی تصویریں بنا کر بسر کر رہا تھا۔

سومیکو کی ماں اپنی ڈیوٹی پر سے پلٹ رہی تھی کہ خطرے کا سائرن بولا اور وہ دونوں بچوں کو لے کر شیلٹر میں چلی گئی۔ شام کا وقت تھا اور گھٹن والی گرمی تھی۔ لوگ خندق کے دہانے پر بیٹھے پنکھے ہلا رہے اور نل پر تولیہ بھگو بھگو کر بدن پونچھ رہے تھے۔

قیاس کیا جا رہا تھا کہ دشمن کی بمباری آدھی رات کے قریب ہوگی: اور ہوا بھی یہی کہ ٹھیک دس بج کر بارہ کا گھنٹہ بجا اور سمندر کی طرف سے ہوائی جہازوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ اور پھر سائرن کی پکار شروع ہوگئی۔ جس رُخ سے یہ ہوائی جہاز آرہے تھے۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ پانی کے جہاز پر سے اڑان کر کے آ رہے ہیں۔ ساحل بستیوں پر ان ہوائی جہازوں نے مشین گنوں سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ بالآخر آل کلیر کا سائرن بولا تو سومیکو کے مکان کے برابر والے گھر والی بڑھیا جو اپنی سمرن گھمائے جا رہی تھی کہنے لگی:-

"میں سمجھی تھی کہ نہ جانے کیا طوفان مچائیں گے —— یہ تو کچھ بھی نہ نکلا!"

"تی کے نبینے میں تو انھوں نے طوفان ڈھا دیا تھا!" سومیکو کی ماں نے کودنب سوتے ہوئے بچے کا کمبو درست کرتے ہوئے کہا۔ بڑی بڑھیا مسکرا دی تو اس کے سیاہ روغن کیے ہوئے دانت نظر آئے؛ اور کہنے لگی:-

"جیسا کہا تھا آئے تو ٹھیک ہی۔ پہلے سے خبر دے دینا ان کی بڑی مہربانی ہے۔ بڑے ملنسار معلوم ہوتے ہیں! کس قدر مہذب

---

[1] یعنی جنگ میں جیسے جاپانیوں کو یقینی موت کے بیڑے دشمن پر بنتے تھے۔ زیرو کا لقب دیا گیا تھا۔ مترجم

ہنس دیئے۔

"ساری رات آنکھوں میں کٹی۔" سومیکو کی ماں نے جماہی لیتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پرسوں رات ایندھن کھینچنے چلی گئی اور پوری نیند نہ سو سکی۔ گھر پہنچتے ہی میں تو پڑ جاؤں گی!"

"یہ خالی خولی ڈرانے آئے تھے! اور خطرہ اتنا کہ توبہ بھلی۔ پوری رات جگانے پر بھی تو دو سے نہ گرائے!" ایک سفید مونچھوں والا کہنے لگا۔

"وہ تو آئے اور چلے بھی گئے! اب تو بس جا کر سو جانا ہے!" ایک جوان عورت بولی۔ جس کا بچہ اس کی کمر سے بندھا تھا۔ اور پھر یہ سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے!

(۲)

گھر پہنچ کر سومیکو کی ماں نے بچے کو نہلایا اور اسے لے کر چٹائی پر پڑ گئی۔ بستر کون کھولے بچھائے! سومیکو دروازے پر بیٹھ کر پائنچوں کی کیچڑ چھڑانے لگی۔

گلی میں سناٹا تھا۔ گھروں کی کھڑکیاں بند تھیں یا جھلملیاں گرا دی گئی تھیں۔ سارے لوگ سو رہے تھے۔ کوڑے کی گاڑی چرخ چوں کرتی گزر گئی۔ مگر گاڑی بان اس کا بھی بیٹھا سو رہا تھا۔ اس کے گزر جانے کے فوراً بعد کچھ رنگروٹ وردیاں پہنے اکسٹھ باسٹھ کرتے گزرے جیسے کسی کے عزیز قریب ہی پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے اور ہر ایک نے جھنڈی ہاتھ میں لے رکھی تھی، جس پر ان کے رنگروٹ کا نام لکھا تھا۔

سومیکو نے اپنا پاجامہ دھو کر جافری پر سوکھنے کو ڈالا اور نظر دوڑا کر گلی میں دیکھنے لگی۔ چوڑے چھجے کا ہیٹ لگائے لڑکا بڑے مکان کے سامنے نالی میں اینٹیں پھینکے جا رہا تھا۔ سومیکو کنی اور چپکے سے اس لڑکے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ نالی میں پڑی ہوئی ایک گڑیا کو وہ لڑکا اینٹیں مارے جا رہا اور منہ سے ہوائی جہاز کی گھنگھناہٹ نکال رہا تھا۔ پڑوس گھر کی لڑکی تومیکو رو رو کر کہہ رہی تھی:۔

"میری گڑیا مر جائے گی!"

وہ لڑکا جب ساری اینٹیں جو اسے ملیں پھینک چکا تو سومیکو نے اس کے ایک مکا رسید کیا۔ لڑکے نے پلٹ کر سومیکو کی آستین کھینچی۔ سومیکو اسے دھکیل دینا چاہتی تھی مگر اس نے سومیکو کے پیٹ میں جو دھکا دیا تو اپنے زور میں گر گیا۔ مگر ساتھ سومیکو کو بھی لے گرا۔ اسی سمے تومیکو پکارنے لگی:۔

"ہوائی جہاز!"

لڑکا سومیکو کے بال پکڑے کھڑا ہوا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ سومیکو اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنا چاہتی تھی کہ اس لڑکے نے ڈانٹ دیا:۔

"پڑی رہو! یہ تو نہیں پی ففٹی ٹو (P.52) ہیں۔ نہیں نہیں، بی ٹوئنٹی (B.26) ہیں!"

معلوم نہیں کیوں، خطرے کا سائرن نہیں بجا۔ ان ہوائی جہازوں کی گھن گھناہٹ بہت ہلکی سی سنائی دیتی تھی۔ اس لڑکے نے سومیکو کے بال چھوڑ دیئے اور کہنے لگا۔

"شاید اپنے ہی ہوں!"

سوتمیکو نے گردن کو جھٹکا دے کر چہرے پر سے بال ہٹانے اور ان ہوائی جہازوں کو دیکھنے لگی، مگر وہ غائب ہو گئے تھے، ایک سیاہ دھبہ سا دھیرے دھیرے نیچے اترتا نظر آتا تھا! اس لڑکے نے اپنا سر پیچھے موڑ کر کہا:۔

"ہوائی جہاز سے کچھ گرایا گیا ہے: یہ ہمارے نہیں ہو سکتے!"

"تم تومی چان کی گڑیا کو اینٹیں کیوں مار رہے تھے؟" سوتمیکو نے ہوائی جہازوں کو بھلا کر اس لڑکے سے جواب طلب کیا۔

"اور تم نے میرے منکا کیوں مارا؟" لڑکے نے پلٹ کر سوال کیا۔

اچانک تیز روشنی پھوٹ نکلی اور دبا دبا سا دھماکا سنائی دیا۔ اترتی ہوئی سیاہ چھتری کے گرد سفید دھوئیں کے بادل چھا گئے اور پھر جلتی ہوئی ایک لانبی دم سی چیز نظر آئی۔ سوتمیکو نالی میں منہ اوندھا کے گر گئی، اور منہ کو ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ اسی دم سفید، ہری اور نارنجی رنگ کی بجلی سی چمکی اور وہ چمک جلا دینے والی محسوس ہوئی۔ سوتمیکو کی ہاتھوں سے ڈھکی ہوئی اور بند آنکھیں بھی اس روشنی سے چوندھیا گئیں، اور وہ بدن میں گھس جانے والی گرمی محسوس کرنے لگی۔ پھر ایک قیامت کی گرج ہوئی، زمین اچک پڑی اور پھر چکر کھا گئی۔ اور اسی کے ساتھ ہولناک طوفان اور ہر چیز کو بھسم کر دینے والی قیامت برپا ہو گئی! وہ گرج دوبارہ ہوئی تو ایک بھونچال اٹھ کھڑا ہوا! ایک گرم گرم چمکتا ہوا ڈھیلا سوتمیکو کے شانے پر آ پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

(۲)

سوتمیکو کو ہوش آیا تو دیکھا کہ دو آدمی سیاہ لبادے پہنے اور ناک منہ پر غلاف چڑھائے اسے اٹھائے جا رہے ہیں۔ بس ادھر ادھر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ سب طرف سیاہی برسی ہے۔ راستے کے اینٹ پتھر، ہر چیز کالی پڑ گئی تھی، ہر قسم کی لکڑی کے ٹکڑے، ٹینوں کے کھپرے، ٹاٹ بورے، غرض ہر چیز جل جھلس پڑی تھی: فضا میں کالے رنگ کا دھواں بہہ رہا تھا، تو دھوپ کالی دکھائی دے رہی تھی اور پانی برسنے لگا تو بوندیں کالی تھیں۔

"ماں!" ہوش میں آتے سوتمیکو نے پکارا لیکن خود اسے اپنی آواز سنائی نہ دی! اسے اپنے شانے میں بڑی جلن ہوتی محسوس ہوئی وہ رونے لگی تو رونے میں بھی آواز نہ تھی۔ سوتمیکو پھر غافل ہو گئی، اور جب پھر ہوش آیا تو نظر پڑا کہ ٹرام کی پٹریاں دور تک ٹیڑھی میڑھی ہو گئی اور ترچھی بانکی پڑی ہیں، زمین اسے ایک سیاہ بورا سا پڑا دکھائی دیا، اور پھر اچانک وہ بورا ہلنے لگتا ہے، یہ بورا اصل میں ایک آدمی ہے جو اٹھ جانا چاہتا ہے اور اٹھتے ہی گر جاتا ہے! ذرا اور پرے تھے تو ایک شخص آگ سے جلے ہوئے چیتھڑے پہنے خون سے لت پت ان آدمیوں کی طرف لپکتا ہے جو سوتمیکو کو اٹھائے لیے جا رہے ہیں، وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا بھی ہے مگر کوئی اس کی آواز سنتا معلوم نہیں ہوتا، وہ پھر نظر سوتمیکو کو دیکھتا اور اپنا سر اور سینہ پیٹ لیتا اور پھر بے دم ہو کر گر جاتا ہے!

دس پانچ نہیں، سو پچاس نہیں، ہزاروں انسان ایسے ہی سیاہ رو، سیاہ جسم، جھلسے چیتھڑے لٹکائے، ادھر ادھر ہر طرف بدحواس پھر رہے ہیں اور ہر آدمی ہاتھ برابر ہلائے جاتا ہے، ہر ایک کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ہے۔ جیسے کسی کو پکار رہا ہو، مگر آواز غائب ہو گئی ہے! زمین کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور ہر چیز راکھ بن کر رہ گئی تھی، ثابت چیزیں اور زندہ انسان بھی، راکھ کے تودے ہی معلوم ہوتے تھے! سوتمیکو کا سر چکرانے لگا: اس نے آنکھیں موند لیں، اور پھر غافل ہو گئی۔

غفلت کی حالت میں سوسیکو کو ایسا لگا کہ اسے کسی سخت اور ٹھنڈی چیز پر لٹایا گیا، اور کچھ لوگ اس کے آس پاس کھڑے ہیں ان آدمیوں کے کپڑے میلے جیسے نہیں ہیں، اونچی سفید ٹوپی پر سرخ صلیب کا نشان لگائے ایک عورت سوسیکو کے اوپر جھک جاتی ہے! سوسیکو کے کانوں میں شور سا مچا ہوا تھا، لیکن وہ ان لوگوں کی کھسر پھسر سن سکتی ہے۔ تھوڑی دیر میں کانوں کے اندر کا شور کم ہو جاتا ہے، اور وہ اس عورت کو کہتے سنتی ہے۔

"زخم کہیں نہیں ہے، شانہ جھلس گیا ہے اور انگلوں پر کھرونچیں ہیں!"

"شلوکے کا داغ کافی بڑا اور تیزی سے رنگت بدل رہا ہے!" ایک دوسری عورت کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"یہ کیا شہر کے بیچ کے علاقے سے لائی گئی ہے؟" کوئی تحکمانہ آواز پوچھتی ہے۔

"سانچول سے قریب کہیں سے! یہ دوسرے بہت سے مجلے اور نکویا اسٹور کے قریب سے لائے گئے ہیں!" کسی نے جواب دیا۔ ایک شخص نے جس کی ناک اور منہ پر غلاف چڑھا تھا اپنا ہاتھ سوسیکو کی آنکھوں کے سامنے ہلایا اور کہنے لگا:

"بینائی پر کوئی اثر نہیں ہے!" پھر کسی کو مخاطب کر کے "دیکھو، دریا کنارے کی طرف جاؤ، وہاں بہت سے بچے پڑے بتائے گئے ہیں، کچھ ابھی جیتے بھی ہوں گے! ان کو احتیاط کے ساتھ لے آؤ!" وہ تحکمانہ آواز پھر کہتی سنائی دی۔

سوسیکو کے منہ میں کچھ ٹپکایا جاتا ہے لیکن وہ کھانس کر الٹ دیتی ہے۔ اس کے حلق سے کوئی چیز اترتی نہیں ہے۔ گیلی تولیہ سے اس کا منہ پونچھا جاتا ہے تو تولیہ کالی پڑ جاتی ہے دور سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے۔ سوسیکو کو نرس کا سفید لباس سرخ نظر آنے لگتا ہے، پھر اودا پڑ جاتا ہے اور اسی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ سوسیکو گھبرا کر آنکھیں موند لیتی ہے۔ پھر اسے نیند آ جاتی ہے۔

یہ حالات ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپانی شہر ہیروشیما میں رونما ہوئے تھے۔ اس صبح کو جب سوسیکو، دس سال کی غریب گھر کی بچی جو اسی بدنصیب شہر میں پیدا ہوئی جس پر ایٹم بم پھینکا گیا۔ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ہزار ہا انسانوں کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی اور ماں باپ امریکن سائنس کی ترقی پر بھینٹ چڑھ گئے، اور وہ اس دنیا میں بے والی وارث رہ گئی: اس لیے کہ امریکہ کو اپنی انسانیت سوز اور فنا کار ایجاد کا عملی نتیجہ دیکھنا تھا!

(۲)

کسی کا تھوکا لگ جانے سے سوسیکو اگر جاگ نہ پڑتی تو شاید ابھی سوتی رہتی۔ لیکن آنکھ کھلی تو ماتھے پر برف کی پوٹلی کا احساس ہوا اس سے وہ سمجھی کہ وہ ہسپتالی خیمے میں ہے! پھر اس نے دیکھا کہ ناک منہ پر غلاف چڑھائے اور زرد رنگ کی ٹوپیاں پہنے دو آدمی آئے اور اس لڑکی کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے جو سوسیکو کے برابر والی چٹائی پر چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ پھر ایک نرس ہسپتال کے سفید لباس میں، ناک منہ پر غلاف چڑھائے آئی اور اس چٹائی کو صاف کیا جس پر سے وہ لڑکی لے جائی گئی تھی۔ اور دیوار پر ٹنگی ہوئی تختی پر سے وہ تحریر مٹا دی جو ۲۱۹ کے نیچے لکھی تھی: اور پھر دونوں ہتھیلیاں اپنے منہ کے سامنے لا کر گردن جھکا لی!

نرس کو یہ سب کچھ کرتے دیکھ کر سوسیکو نے آہستہ سے کروٹ لی، اور ویسی ہی ایک تختی اپنے سرہانے ٹنگی دیکھی۔ جس پر ۱۷۷ لکھا تھا، مگر اور کوئی تحریر نہ تھی۔

خیمے کے اندر گھٹن اور بدبو تھی اور زردی مائل غبار چھایا ہوا تھا۔ ادھیڑ عمر کی ہسپتالی خادمہ نے سوسیکو کے اوپر جھک کر پیار سے کہا:

"تم اٹھ بیٹھیں!" پھر بلی تولیہ سے اس کا مونہہ صاف کیا، کپڑے درست کیے اور نرس کو آواز دی۔

نرس نے جیب سے تھرمامیٹر نکال کر اسے جھٹکا اور سومیکو کے منہ میں لگا دیا۔ خیمے کے ایک کونے کی طرف ایک چھوٹی سی بچی تھی جس کے سر سے پٹیاں بندھی تھیں، وہ لڑکی کراہنے لگی اور اُبکائیاں آئیں تو خادمہ نے ایک تسلہ لے جا کر سامنے رکھ دیا۔ اور اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

نرس نے سومیکو کے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر دیکھا اور اسے بتایا:-

"اچھی، اب تم اچھی ہو رہی ہو! چپ چاپ لیٹی رہا کرو، تمہیں خبر ہے کہ تم ایک ہفتہ سوتی رہی ہو؟ ہم تمہیں نیند کی دوائیں دیتے، انجکشن لگاتے اور چاولوں کی پیچ پلاتے رہے اور تم سویا کیں!"

"تم نے مجھے خالی نمبر کس لیے دیا ہے کہ میں مر جاؤں گی!" سومیکو نے نرس سے اپنے خیال کی تصدیق کرنی چاہی۔

"نہیں، اچھی! تم نے بالکل غلط مطلب سمجھا! تمہارا نام پتا نہیں معلوم تھا: اب بتا دو تو ہم لکھ دیں گے۔"

سومیکو نے اپنا نام پتا بتا دیا اور نرس کی طرف دیکھنے لگی۔ نرس ذرا کی ذرا دوسری طرف متوجہ ہوئی اور بڑے پیار سے پوچھا:-

"سومی چان کے رشتے ناطے کے لوگ تو ضرور ہوں گے! یہاں کسی دوسرے مقام پر؟"

اس سوال پر سومیکو کے دانت آپ ہی آپ بھنچ گئے اور وہ خیمے کی چھت کو تکنے لگی۔ دم سانس تک اکھڑی اور حلق میں خراشیں پڑتی معلوم ہوئیں! پھر بدن میں کپکپی دوڑ گئی! سومیکو آنسوؤں کے بغیر رو رہی تھی! نرس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور سومیکو مشکل سے سرگوشی میں بتا سکی:-

"میرے ایک ماموں ہیں ——— کسی گاؤں میں رہتے ہیں!"

"کس گاؤں میں ہیں؟ تحصیل کونسی لگتی ہے؟ کچھ معلوم ہے؟" نرس نے پوچھا۔

"یاد نہیں آ رہا ہے!" سومیکو نے پیشانی سیکڑ کر یاد کرنا چاہا مگر گاؤں کا نام یاد نہیں آیا تو کہا "بہار کا موسم آتا تھا تو میری ماں اپنے بھائی سے ملنے جایا کرتی اور وہاں سے ڈھیر سی سیمیں لے کر آتی تھی!" ذرا دم لینے کے بعد:-

"میرے ابا مشینوں کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھے۔"

"وہ فیکٹری کہاں تھی؟" نرس نے بیتاب ہو کر پوچھا اور جیب سے کاغذ پنسل نکال لی۔

"مثاتومی ٹنکیا میں ہل پر سے جاؤ تو ———" سومیکو نے دیکھا کہ نرس کچھ لکھ نہیں رہی تو خود بھی چپ ہو گئی۔

"سومی چان کے ماموں اسے لینے کے لیے جلدی آ جائیں گے! وہ کھوج پتے کے دفتروں سے پوچھ تاچھ کر رہے ہوں گے! اس دفتر سے ہزاروں بچوں کا پتہ چل گیا ہے اور ان کے رشتہ دار آ کر انہیں لے گئے ہیں! سومی چان بھی اپنے ماموں کے ساتھ جلدی جائے گی۔ تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی بس چپ چاپ لیٹی رہا کرو، اور الٹی کروٹ کبھی نہ لینا!" اس کے کان کے پاس منہ لا کر "اچھے بچے رو رو کر دوسروں کی نیند خراب نہیں کرتے ہیں! سمجھیں اچھی؟"

سومیکو نے سیدھی کروٹ لے کر پھر ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

———

⑤

دوسرے دن ایک غیر ملکی اور عمر رسیدہ ڈاکٹر آیا جس کی ایک آنکھ پر سیاہ کپڑا بندھی تھی۔ اور اس نے سومیکو کا معائنہ کیا۔ کسی اجنبی زبان میں اسپتال کے اسسٹنٹ ڈاکٹر سے کچھ کہتا رہا اور پھر نرس سے بولا:-

"اس کی پٹی تم اتار دے سکتی ہو!"

سومیکو نے اسے اپنا معالج سمجھا اور شکایت کے طور پر کہا:-

"میرے شانے میں بڑی کھجلی ہوتی ہے اور تکلیف رہتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے ہر وقت بہت تیز اور بہت سفید روشنی دکھائی دیتی ہے۔"

"فکر مت کرو، تمہارے کوئی زخم نہیں ہے۔ جل جانے کا نشانی داغ ہے۔ وہ جلدی اچھا ہو جائے گا۔ اس نے کہلا دیا۔

اسپتال کے نوعمر ڈاکٹر نے سومیکو کی کروٹ میں ایک آئینہ رکھ کر اس کو وہ داغ دکھایا اور کہنے لگا:-

"دیکھا، بس یہ داغ ہے ذرا سا ــــ سومیکو نے اپنے شانے کے داغ کو آئینے میں دیکھ کر کچھ کہا نہیں۔

دو ہفتے میں اسے خیمے کے اندر چل پھر لینے کی اجازت مل گئی۔ اس وارڈ میں دس چٹائیاں اور تھیں۔ مگر سب سومیکو سے کم عمر کی تھیں۔ اس کے برابر والی چٹائی خالی ہوئی تھی تو اس پر ایک اور لڑکی لا کر لٹا دی گئی تھی کہ تیسرے ہی دن اس نو وارد لڑکی کے بدن پر دو سے داغ نکل آئے اور قے جاری ہو گئی، اور پھر ایک دن اسٹریچر والے آئے اور اسے بھی اٹھا لے گئے۔ نرس نے پہلے کی طرح تختی پر سے کونیکو کا نام بھی مٹا دیا اور اسی طرح ہاتھ اٹھا کر سر جھکا لیا۔ اس کے بعد فوراً ہی ایک ننھی سی بچی لا کر اسی چٹائی پر لٹا دی گئی اور چند دن بعد یہ ننھی سی بچی بھی اسی راستے روانہ ہو گئی اور وہی اسٹریچر والے آ کر اس کو بھی اٹھا لے گئے، اور پھر نرس نے اسی طرح ہاتھ اٹھا کر گردن جھکا لی۔

اس اسپتالی خیمے کی خاموش سی دنیا میں باہر کی دنیا سے، جہاں ایک نہایت ہولناک اور ہیبت آفریں اور فہم سے باہر واقعہ رونما ہوا تھا، کبھی کبھی سفید لبادے پہنے اور ناک منہ پر غلاف چڑھائے لوگ آتے تھے، یا پھر سفید پوش جماعت مریضوں کو اٹھا کر لے جانے آتے تھے۔ کبھی کوئی مریض واپس بھی لایا جاتا تھا۔ کسی کسی وقت ہوا جب اس رخ کی ہوتی تو بدبودار دھواں خیمے میں گھس آتا اور خیمے والوں کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ سومیکو کے برابر والی چٹائی پر جو نئی لڑکی لا کر لٹائی گئی تھی اس نے بتایا کہ یہ دھواں چتاؤں کا ہے۔ کہیں قریب مردے پھونکے جاتے ہیں۔

⑥

اس خیمے کی دو مریض لڑکیوں کے رشتے دار ڈھونڈ ڈھانڈ کرتے آ پہنچے اور ان لڑکیوں کو لے گئے تو سومیکو اپنے بے وارث ہو جانے پر بہت روئی۔ خادمہ اسے بڑی دیر تک تسلی دیتی رہی:-

سومی چان کے رشتے دار بھی جلدی آئیں گے ــــ سومی چان کی چچی آنے ہی والی ہے بس۔"

"میری تو چچی ہی نہیں ــــ بس ایک ماموں ہے!"

"تو یقین کر لو کہ تمہارا ماموں بیچارہ تمہاری تلاش میں ہر جگہ مارا پھر رہا ہے اور ایک دن کوئی نہ کوئی اسے یہاں کا پتہ بتا دے گا۔ اس

ماآنا اور تمہیں سے جانا بالکل پکی بات ہے اور بات بھی بس دنوں کی ہے!"

اس رات سوسیکو کی آنکھوں کے سامنے پھر دھند لکا چھایا رہا اور سر میں شدت کا درد تھا۔ خیمے کے اندر جو دھواں بھر گیا تھا، اس میں پہلے کی سی بدبو نہ تھی۔ تو سوسیکو نے خیال کیا کہ یہ شاید چاولوں کا نہیں ہے بلکہ کسی نے مچھروں کو اڑانے کے لیے دھواں کیا ہے، تھوڑی دیر میں ہوا کا رُخ بدلا اور دھواں نکل گیا مگر اسے نیند پھر بھی نہ آئی۔ شانے کے داغ میں جلن رہی اور بار بار ٹیسٹ کے لیے خون لینے سے بازو بھی دکھ رہا تھا۔

کہیں دور کتے بھونکتے سنائی دیئے۔ نرس اور خادمہ ایک چٹائی پر بیٹھ گئیں اور پیپے سے کرسی کا کام لیا گیا تھا۔ دونوں نے ناک منہ کے غلاف اتار دیئے اور پنکھے ہلاتی ہوئی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ نرس نے اسے بتایا کہ :-

"کل امریکن ہوائی جہاز اترے ہیں۔ ابھی صرف ڈاکٹر اور اخباری نمائندے آئے ہیں۔ یہ لوگ ایٹم بم پھٹنے کے اثرات کی جانچ پڑتال کریں گے۔ آج یہ لوگ ہجیاشی گئے تھے۔ ان کے ساتھ بہت بڑے بڑے تھرما میٹر کی شکل کے آلے ہیں جن کو وہ زمین میں گاڑ کر شاید شعاعی نفوذ (RADIATION) کا اندازہ کرتے ہیں۔"

خادمہ نے اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔

"کتانو سان[1] اسسٹنٹ سے کہہ رہے تھے کہ امریکیوں کا حکم ہے کہ مریضوں کے معائنے اور تحقیقات کے نتیجوں کا پورا ریکارڈ ان کو بھیج دیا جائے۔ یہ امریکن ڈاکٹر خود بھی مریضوں کا معائنہ کریں گے۔"

"کوئی کہہ رہا تھا کہ ایک امریکن عورت نے جو کسی اخبار کی نامہ نگار ہے۔ سڑک کے تارکول کا ایک ٹکڑا بڑی قیمت دے کر خریدا ہے، کیونکہ اس میں جوتے کے دو اسٹار (لوہے کے ٹکڑے جو تلے کی مضبوطی کے لیے لگائے جاتے ہیں) جڑے ہوئے تھے۔ تم سمجھیں کہ اس نے یہ قیمت کس چیز کی دی ہے؟ سنو! ایٹم بم جب پھٹا تو اس کی بہت تیز آنچ سے جوتے اور جوتے کا پہننے والا دونوں گھل گئے۔ وہ لوہے کے ٹکڑے گرم تارکول میں جڑے رہ گئے اور تارکول پھر جم گیا۔ وہ اسٹار چھوٹے سائز کے ہیں اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ ان جوتوں کا پہننے والا کوئی بچہ تھا جن میں یہ اسٹار جڑے تھے۔ اور اس لیے کہ وہ صبح کا وقت تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ بچہ اسکول جا رہا ہوگا!

"اب یہ امریکن عورت اس تارکول کے ٹکڑے کو اپنے ڈرائنگ روم میں سجائے گی اور اپنے ملاقاتیوں کو دکھا کر خوش ہوگی کہ امریکن سائنس کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ اسکول جاتے بچوں کو ہوا میں گھول دے سکتا ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر امریکہ کی مخالفت کر ہی نہ سکیں۔

ان دونوں عورتوں پر ردِ عمل کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ ایسی چپ ہوگئیں جیسے کتوں کا بھونکنا بڑے غور سے سن رہی ہیں۔ جب خاموشی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو خادمہ نے پھر بات چھیڑی :-

کل رات کو بڑا بُرا ہوا۔ خیمے میں ایک کتا پھر گھس آیا اور ایک بچے کو لے ہی گیا ہوتا۔ مگر خیر گزری۔ بھوک سے جانور بھی تو درندے

---

[1] جاپانی میں خالی "سان" کا لفظ صاحب کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ کتانو اس اسپتال کے بڑے ڈاکٹر کا نام ہے۔ مترجم

بن گئے ہیں! کتاتو سان کہتے تھے ۲۰۰ کو (ACUTE) قسم کا لیوکومیا (خون میں سفید سالمات کی تعداد بڑھنے لگتی ہے) ہے! اور جب خون ٹیسٹ ہوا تو وہ اپنی سمجھ کو عاری کہنے لگے!" نرس نے گردن ہلا کر مشکل صورتِ حال کی تائید کی اور بولی:-

"مجھے یقین ہے کہ ہم اُسے نہیں بچا سکیں گے! اس کو تو پہلے دن نیا خون چڑھنا تھا۔"

ایک مریض لڑکی کراہنے لگی تو خادمہ نے کہا:-

"۱۰۰۰ کے متعلق کتاتو سان کو یقین ہے کہ حالت جلدی بگڑنے لگے گی! بیچ شہر کے علاقے کے جتنے کیس آئے کوئی جانبر نہ ہو سکا! ان کا خیال ہے کہ (GAMMA) شعاعیں —"

خادمہ نے دیکھا! سومیکو جاگ پڑی ہے تو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نرس کو بھی چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جب دونوں چپ ہو گئیں تو سومیکو نے پوچھا:-

"میں کیا بچوں گی نہیں؟" خادمہ اٹھ کر اس کے پاس گئی اور پنکھا ہلاتے ہوئے کہنے لگی:-

"تم تو اب اچھی ہو رہی ہو! ہم تمہاری بات تھوڑی کر رہے تھے!"

"۱۰۰۰ تو میں ہوں! یہ گما شعاعیں کیا ہوتی ہیں؟" سومیکو پوچھنے لگی:-

"اچھی تم چپ لیٹی رہو۔ یہ ڈاکٹروں کی باتیں بچوں کے سمجھنے کی نہیں ہوتی ہیں!" نرس نے کہا:-

سومیکو آنکھیں موند کر سوتی بن گئی۔ مگر ان دونوں کو اب کوئی بات کرنا ہوتی تو پرچے پر لکھ کر کرتیں۔

جس لڑکی کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی پہلے تو وہ چپکے چپکے روتی رہی اور پھر اس کی حالت ہذیانی ہو گئی۔ سفید رومال اور سفید پردے کی بکواس کرتی رہی۔ جب ذرا چپ ہوئی تو نرس کہنے لگی:-

"حیرت کی بات یہ ہے کہ ان سب کو سفید ہی سفید دکھائی دیتا ہے! اور ہذیان میں تو اود بدا کر ——"

"مجھے بھی نرس؟" سومیکو نے گردن ذرا اٹھا کر پوچھا۔

"نہیں! سومی چان تو بس گردن کو نوچتی ہے یا ایک گڑیا کو یاد کرتی رہتی ہے!" نرس نے مسکرا کر جواب دیا۔

(۷)

نرس اور خادمہ نے صبح ہی سے اسپتالی خیمے کی جھاڑ پونچھ کر کے ہر چیز قرینے سے لگا دی تھی۔ خیمے کی چھت میں سوراخ تھا۔ اس کو بھی سی کر بند کر دیا تھا! اور مریضوں کی چٹائیوں کے بیچ میں نئی گھاس رکھ دی تھی۔ نرس نے پاؤڈر لگا کر سفید ٹوپی بھی بدل ڈالی تھی۔

ڈاکٹر کتاتو نے اس دن صبح کا راؤنڈ نہیں لگایا تھا! اور جب ایک غیر ملکی فوجی وردی پہنے آیا تو اس کے ساتھ وہ نہیں بلکہ اسسٹنٹ ڈاکٹر تھا۔ دونوں ناک منہ کا غلاف چڑھائے تھے۔ اس غیر ملکی کے ساتھ ایک ترجمان بھی تھا! اور وہ بھی فوجی وردی میں تھا۔

ایک مریض لڑکی کے گال کو جھلس لگا تھا۔ اور اب وہ سرخی مائل داغ پورے گال پر پھیل گیا تھا۔ وہ کپاس کے گالوں والا غیر ملکی پاس کھڑے ہوئے پیپے پر بیٹھ گیا، اور اپنے دستانہ چڑھے ہوئے ہاتھ سے اس کو چھوتا اور مسکتا رہا! اس کے بال نوچے۔ سر کو گھمایا اور پھر بھاری

آواز میں ترجمان کے ذریعے سے حکم دیا۔

"یہ کیس بڑے غور اور باریک بینی سے دیکھا جائے، ہر تبدیلی کا تفصیلی ریکارڈ تیار کر کے ہمارے پاس فوراً بھیج دیا جائے! اور جیسے ہی جانکنی کی حالت شروع ہو، ہم کو فوراً اطلاع ہونا چاہیے ۔"

اسسٹنٹ ڈاکٹر نے نرس اور خادمہ کو ہٹا دیا اور چپکے چپکے ترجمان سے باتیں کرنے لگا؛ اور باتیں کرتے کرتے اس کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ آواز اونچی ہو گئی، سر اور ہاتھ کے اشارے مسلسل ہوتے گئے، چہرے کا انگ انگ تن گیا اور ایک موقع پر تو اپنے بال نوچنے اور سینہ کوٹنے لگا۔ اس پر اس غیر ملکی فوجی نے تازہ سگریٹ سلگایا اور ترجمان کے ذریعے سے کہا:۔

"تمہاری باتیں ایک ڈاکٹر کی نہیں، جذباتی بڑھیا کی سی ہیں! ایک ڈاکٹر کا وظیفہ سائنس کی خدمت ہے؛ اور یہی طبابت کا اخلاق ہے تاریخ نے یہ نادر موقع دیا ہے تو اس سے ہمیں پورا پورا فائدہ اٹھانا اور سائنس کو انسانیت کے مفاد کے لیے ترقی دینا ہے! اس لیے انسانی اعضا و جوارح پر شعاعی نفوذ (RADIATION) کیا اثرات مترتب کرتا ہے، اس کے نتیجے بڑی احتیاط اور تفصیل سے محفوظ کر لینا اشد ضروری اور اہم بات ہے!

"یہ حقیقت آنکھ سے اوجھل نہ ہونا چاہیے کہ ہم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ سائنس کے مفاد اور اس طرح پوری انسانیت کے مفاد کے لیے ہے! موجودہ لمحے کا اصل اور اہم ترین مسئلہ صرف یہ ہے، باقی سب ذیلی باتیں ہیں!" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں سکیڑ لیں اور اسسٹنٹ ڈاکٹر کے شانے کو تھپ تھپایا۔

اسسٹنٹ ڈاکٹر نے خم تعظیم ادا کیا؛ اور دوسرے مریضوں کا معائنہ کرنے کے بعد وہ غیر ملکی اور اس کا ترجمان چلے گئے۔ نرس اور خادمہ نے خیمے کے پردے ہٹا دیئے اور پنکھوں سے اس کی سگریٹ کا دھواں نکالنے لگیں جس سے خیمہ بھر گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حمال آئے اور یکے بعد دیگرے تین لڑکیوں کو لے گئے۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھی جس کا پورا گال جل گیا تھا۔ یہ لڑکیاں پھر پلٹ کر نہ آئیں، اور نرس تختیوں پر سے ان کے نام مٹا کر باری باری ہر ایک کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی اور گردن جھکا لیتی تھی پھر تین دوسری لڑکیاں منگائی گئیں، ان میں سے ایک واپس نہ آئی تو نرس نے اس کا نام مٹا کر پھر اسی طرح دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور گردن جھکا دی"۔

اسسٹنٹ ڈاکٹر کا کام خون کے ٹیسٹ کرنا اور رپورٹ لکھنا تھا۔ سوسیکو کی انگلی اور بازو سے خون لے جا کر ٹیسٹ ہوتا رہتا تھا۔ سوسیکو کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ وہاں سے لڑکیاں امریکن کیمپ میں لے جائی جاتی ہیں۔ ایک دن خود سوسیکو کی باری بھی آ گئی۔ وہ بہت ڈری، لیکن سٹریچر پر لیٹنا ہی پڑا۔ نرس نے اس کے نام کی تختی اتار کر اس کے سرہانے رکھ دی اور حمال اٹھا کر لے گئے۔

ایک بڑے میدان میں پہاڑی کے دامن میں گھنے درختوں کی چھاؤں میں ایک کیمپ لگا تھا۔ یہاں ایک زرد رنگ کے خیمے کے سامنے سوسیکو کا سٹریچر لیجا کر رکھ دیا گیا۔ اس خیمے کے سامنے امریکن فوجی سنتری فولادی ٹوپیاں پہنے اور ٹخنوں پر چمڑے کے گیٹس کسے تنے ہوئے کھڑے تھے۔ جاپانی حمال اس خیمے کے اندر نہیں گھس سکتے تھے جس میں "خاص مُلکِ خدا" کے باشندے رہتے تھے! چنانچہ خیمے کے اندر سے دو امریکن ناک منہ پر غلاف چڑھائے اور سفید لبادے پہنے نکلے اور سوسیکو کا سٹریچر اٹھا کر اندر لے گئے۔ وہاں کئی امریکن ماہر موجود تھے ان سب کے

ناک منہ پر غلاف چڑھائے اور سب سفید لبادے پہنے تھے۔ ان میں وہ چھوٹے گالوں والا فوجی ڈاکٹر بھی تھا جو سوسیکو کے اسپتالی خیمے میں معائنہ کرنے گیا تھا۔

سوسیکو بالکل ننگی کر دی گئی۔ وہ بہت کھسیانی ہو گئی مگر اسے ایک کرسی سے باندھ دیا گیا۔ جس کا پشتہ حسب ضرورت نیچا اونچا ہوتا تھا۔ کرسی کے برابر ایک بڑا بکس سا پہیوں کے اوپر رکھا تھا جس پر ایک گھڑی سی جڑی تھی، اور اس کی سوئیاں روغن کی ہوئی تھیں۔ سوسیکو نے نیچے سر کر کے اوپر تک لی آواز سنی اور ایک بڑا گول سفید روشنی دینے لگا: روشنی پڑتے ہی سوسیکو بے قرار ہو گئی اور چیخ مار کر کھڑی ہو گئی، مگر پھر زبردستی اسے کس کر بٹھا دیا گیا۔ اس کی آنکھوں پر زمین چشمہ چڑھا دیا گیا اور ایک امریکی جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ اب اس گوشت کی رنگت ہری ہو گئی تھی۔ اس ڈیرے میں جتنے امریکن ماہر تھے۔ سب نے باری باری اس کا معائنہ کیا۔ ربڑ کے دستانے چڑھائے ہاتھوں نے اس کے داغ کو مسل مسل کر دیکھا۔ پھر اس کے پیٹ سے ایک سیاہ رنگ کی نلکی لگا دی گئی اور کھٹاک ہی اس نلکی میں سنسناہٹ پیدا ہو گئی۔ پھر سوسیکو کے تسمے کھول دیے گئے، اور اسے ایک دوسرے بکس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، جس کی شکل اس جادو کے پٹارے سے ملتی جلتی ہے جس میں جاپانی کی رانی دربھی "شمرن" دکھایا جاتا ہے۔ آخر میں ایک امریکن نے جس کی پیشانی پر چمکیلے دھات کی ٹکیا بندھی تھی، سوسیکو کی آنکھوں کا معائنہ کیا۔ اور جب یہ سب کام ہو چکے تو ان امریکیوں نے ناک منہ کے غلاف اتار دیے اور سگریٹ سلگا کر باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں وہی چھوٹے گالوں والا بار بار کیلائڈ (KELOID) کا لفظ بولتا تھا۔

سوسیکو نے اپنا کیمونو پہن لیا تھا مگر ایک امریکن نیکر پہنے اور ٹرینچ کیپ رنگدار ٹوپی لگائے آیا اور اسے پھر ننگی کر کے مختلف سمتوں کے یا پہلوؤں سے فوٹو اتارے۔ جب پہلی بار کیمرے کا فلیش چمکا تو سوسیکو نے چیخ مار کر ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھک لیا۔ وہ پھر ایک اور میز پر لے جائی گئی۔ جہاں ایک اور امریکن نے اس کی دسوں انگلیوں کی چھاپ لی، اور پھر سگریٹ کا دھواں اڑاتی ایک نرس آئی اور سوسیکو کے بازو پر ایک پیتل کی ٹکیا باندھ دی گئی جس پر (SSK 2279) کندہ تھا۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد سوسیکو اپنے اسپتالی خیمے کو واپس ہو گئی۔

ان امریکن ماہروں کو ایٹم بم کے اثرات کا پورا جائزہ لینا تھا۔ اس لیے وہ مختلف مقامات پر جا کر ان بے غیرت یعنی سخت جان جاپانیوں کا معائنہ کرتے پھر رہے تھے جو ابھی تک سانس لے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سوسیکو کو دوبارہ وہاں جانا نہیں پڑا۔ اور جب نرس نے اسے یہ بات بتائی تو سوسیکو بہت خوش ہوئی۔

(٨)

ایک دن رات کے وقت ایک امریکن فوجی نشے میں دھت اس اسپتالی خیمے میں گھس آیا۔ گلے میں ایک زنانہ رومال لپیٹے تھا وہ سیدھا چل تو سکتا تھا مگر ابھی سیدھا نہ رہ سکتا تھا۔ خیمے میں گھس کر اس نے پہلے تو نرس کو آنکھ ماری اور پھر انگلی ہلا کر اسے اپنی طرف بلایا نرس نے بڑے غصے کی حالت میں اس کو چلے جانے کو کہا:۔

"دیکھتے نہیں، تم نے میرے مریضوں کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ مہربانی کر کے فوراً چلے جاؤ، ورنہ تمہارے کمانڈنگ افسر سے شکایت کر دوں گی!"

یہ بدمست فوجی امریکن ایک جاپانی نرس کی تو کیا ماننے والا تھا، لیکن کمانڈنگ آفیسر کے نام میں کچھ ایسا جادو تھا کہ وہ چپ چاپ نکل کر چلا گیا۔ خیمے سے باہر ہوگیا تو گلا پھاڑ پھاڑ کر گانا شروع کر دیا: شاید گانا گا کر وہ اپنی اس ناکامی کے زخم پر مرہم رکھ رہا تھا یا اس طرح وہ اپنے کمانڈنگ آفیسر کی شان بڑھانا چاہتا تھا۔ یہ راز کبھی فاش نہ ہوگا:۔

"چانگ کنگ، چانگ کنگ، چنگ چانگ، کینیا، کینیا۔
ہیروشیما، ناگاساکی، بم م م م، بم م م م!"

جہاں تک اس کی آواز پہنچی، اس کے گیت کی موسیقی نے، سننے والوں کے کان کے پردوں پر خراشیں ڈال دیں: اور کم از کم وہ لوگ امریکن شاعری کی صناعت اور امریکن کلچر کی بلندی کے قائل ہوگئے اور کانوں میں انگلیوں دے کر یا پیشانیاں سکیڑ کر داد پیش کر دی!

اس بدمست امریکن کی آواز آنا موقوف ہوئی تو ہوائی جہاز کی گھن گھن سنائی دی اور بلند ہو ہو کر سنائی دیتی رہی: یہ قصہ ساری رات جاری رہا اس لیے کہ امریکن ہوائی جہاز آ آ کر اتر رہے تھے اور جاپانی سرزمین پر پہلا امریکن فوجی اڈہ بن رہا تھا۔

⑨

سوسیکو چٹائی پر بیٹھی کاغذ کی چڑیاں کاٹ رہی تھی کہ اس نے پیچھے پیچھے کھسر پھسر کی آواز سنی:

"وہی ہے؟"

اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو ایک دبلا پتلا آدمی نظر آیا جس کی تانبے کی رنگت پر جھریوں کا جال تھا۔ بدن پر ایک گھسا پٹا سرج کا سوٹ تھا۔ پاؤں میں گھاس کی چپلیں، ایک پٹیا ہاتھ میں دوسرا ٹھلے میں پڑی تھی۔ ایک قدم بڑھ کر وہ آدمی رندھی ہوئی آواز میں پکارا۔

"سوسی چان! شکر ہے میں نے تجھے زندہ پایا!"

"ماموں!" سوسیکو جھٹ سے کھڑی ہوئی؛ لیکن فوراً ہی کچھ سوچ کر بیٹھ گئی اور پالتی مار کر ادب سے سر جھکایا اور چٹائی پر اپنے دونوں ہاتھ چپٹ رکھ دیئے!

"میں بیٹی تجھے سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ اور کہیں کھوج نہ ملا تو نراش ہوگیا تھا۔ لاکھ لاکھ شکر ہے تو سلامت ملی!" یہ کہہ کر اس نے نرس اور خادمہ کو خم تعظیم ادا کیا اور احسان مندی ظاہر کرنے کو کہا "میری بھانجی کے ساتھ آپ لوگوں کا ہمدردانہ سلوک عمر بھر یاد رکھوں گا!"

"ہمیں تو پورا یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن تم کو اس ہسپتال کا پتا لگے گا، اور تم ضرور آؤ گے! سوسی چان کو تمہارا نام پتا یاد نہ رہا تھا۔ ورنہ ہم خود اطلاع کرتے!" نرس نے اس کو بتایا۔

"اس نحوس بم کی تباہیاں دیکھ کر تو مجھے کوئی امید نہ رہی تھی: لیکن اس بھری دنیا میں میرا اپنا کوئی نہیں ہے: بس اس خیال نے مجھے تلاش کرنے پر اکسایا: میری بیوی پہلے ہی مر چکی تھی، بیٹا برما کے مورچے پر کام آیا اور بیٹی اوساکا کی بمباری کی بھینٹ چڑھ گئی تھی!" اس نے سوسیکو کے سر پہ ہاتھ پھیر کر پوچھا "اب تو پہچان گئی تو؟ جنگ سے پہلے میں تیری ماں کے پاس گیا تھا، یاد ہے کچھ؟ تیری ماں کہتی تھی کہ تو لڑکوں کی طرح بڑھ گئی ہے! وہ —" بہن کی یاد سے اس کا دل بھر آیا اور بات پوری نہ ہوسکی۔ اس نے ناک صاف کی، پیٹی سے پائپ نکالا پھر اڑس لیا۔

"بس یہ داغ ہے!" سوتیسکو نے شانہ کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔

اس کے ماموں نے داغ کو دیکھ کر کچھ سوچا، نرس نے کچھ اس کے کان میں کہا اور باہر چلی گئی۔

"سوتی چان گھر جا رہی ہیں؟" برابر والی لڑکی نے پوچھا مگر سوتیسکو نے جواب نہ دے کر اسے اپنی بنائی ہوئی کاغذ کی چڑیاں دے دیں۔ لڑکی نے شکریہ ادا کرکے کہا "میرے لیے کوئی نہیں آئے گا!"

"ضرور آئے گا! تمہارے رشتہ دار بھی اسی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، جیسے میرے ماموں پھرتے رہے؛ اور انہیں بھی ایک دن ایسے ہی پتا چل جائے گا۔ جیسے میرے ماموں کو چل گیا" سوتیسکو نے اسی طرح گردن ہلا ہلا کر اس لڑکی کو یقین دلایا جیسے نرس خود اس کو دلایا کرتی تھی۔

نرس اسسٹنٹ ڈاکٹر کو ساتھ لائی اور وہ سوتیسکو کے ماموں سے کہنے لگا:۔

"آپ سوتیسکو کو لے جانا چاہتے ہیں تو جلدی لے جائیے"

"اگر رکاوٹ کی کوئی بات نہیں تو میں آیا اسی لیے ہوں!"

"بہتر ہے، آپ اسے لے جائیں، چند روز میں یہاں کے سارے مریض امریکن ڈاکٹروں کے سپرد کر دیے جائیں گے؛ پھر وہ لوگ کسی کو چھٹی نہ دیں گے!" سوتیسکو کے ماموں نے چپکے سے کچھ پوچھا تو ڈاکٹر نے جواب میں بتایا "دیکھنے میں تو اسے فائدہ ہو رہا ہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگے چل کر کیا صورت پیدا ہوگی۔ تمہارے گاؤں کے قریب میں کوئی اسپتال ہے؟"

"جی ہاں، قصبے کا اسپتال بہت قریب پڑتا ہے!"

"وقتاً فوقتاً اس کے دماغ میں تکلیف ہوگی، بخار بھی ہو جائے گا، جب ایسی کوئی شکایت ہو تو جاپانی ڈاکٹر کو دکھانا، مشنری سپتال ہرگز نہ لے جانا!" اس آخری فقرے پر ڈاکٹر خود بھی مسکرایا اور سوتیسکو کی طرف دیکھ کر گردن جھکائے تعظیم ادا کی۔ جواب میں سوتیسکو نے بھی چٹائی پر دونوں ہاتھ ٹیک رکھ کر تعظیم دی۔ ڈاکٹر نے سوتیسکو سے کہا "تمہیں یہاں سے کپڑے بھی مل گئے!" اور پھر نرس کے ساتھ باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں نرس کپڑے لے کر آگئی: ایک سفید کیمونو، ایک پاجامہ اور ایک جوڑی موزے سوتیسکو کو دے کر بولی:۔

"تمہارے پاؤں کا جوتا کوئی نہ تھا؛ کیمونو بھی مردانہ ہے، مگر کام تو چلائے گا"

"اس کو درکار بھی یہی تھا۔ میری بھانجی ہمیشہ سے لڑکوں کی طرح ہڑدنگی رہی ہے!" سوتیسکو کے ماموں نے ہنس کر کہا!

سوتیسکو نے کپڑے بدل لیے تو اس کے ماموں نے گلے سے وہ پوٹلی اتاری اور اس میں سے ایک گلدان نکال کر میز پر رکھا، اور کہنے لگا:۔

"ادب سے بیٹھ جاؤ، یہ پھول اور راکھ، میں نے دروازے کے سامنے سے سمیٹ لیے تھے۔ فاتحہ پڑھ لینا چاہیے!" یہ کہہ کر اس نے ہاتھوں کی انگلیوں کے پورے آپس میں ملا کر گردن جھکالی۔ سوتیسکو نے بھی ایسا ہی کیا۔ نرس اور خادمہ نے بھی دعاخوانی میں شرکت کی۔

اپنی بہن کے لیے یہ آخری رسم ادا کرکے اس نے وہ گلدان جس میں ایٹم بم کی چتا میں جلی ہوئی بہن کی راکھ لیے پھر رہا تھا، پھر پوٹلی میں رکھ لیا اور پوٹلی گلے میں ڈال لی اور پھر گردن خم کرکے سب سے رخصت لی اور مریض لڑکیوں سے کہا:۔

"ندامت کرو، تم سب بھی اپنے گھروں کو جاؤ گی، تمہارے رشتے دار بھی آتے ہی ہوں گے!"

ماموں اور بھانجی جب بجی گیاڑی سے اتر رہے تھے، سامنے دور تک خاکستری رنگ کی ویرانی پھیلی نظر آتی تھی۔ سوئیکو نے ماموں کی آستین کھینچ کر پوچھا:۔

"ہم کیا اُدھر ندی کی طرف چل رہے ہیں؟"

"نہیں بچی، وہاں اب کیا رہا ہے!" اس کے ماموں نے حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"اور مٹانی گیا، جہاں ابا کی فیکٹری تھی؟"

اس کے ماموں نے افسوسناک لمبی سانس بھری اور گردن ہلا کر بتایا کہ وہ علاقہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت سوئیکو نے تہ کیا ہوا پتلی سیا اپنے بازو سے کھول کر زور سے پھینک دی۔ اور پتھر پر پڑتے سے کھسکا ہوا تو اس کے ماموں نے جا کر وہ بیل اٹھا لیا اور پوچھا:۔

"یہ کیوں پھینک دیا تم نے؟"

"امریکنٹ بھیڑیوں نے میرے بازوؤں پہ باندھ دی تھی!" سوئیکو نے غصے اور نفرت کی حالت میں بتایا۔ اس کے ماموں نے اسے کپڑے پر کڑھا ہوا دیکھا تو کہنے لگا:۔

"اس پر تو کچھ لکھا بھی ہے، پھینکنا کیا ہے۔ داشتہ آید بکار، جانتی ہو؟ انہوں نے یہ نمبر وغیرہ اپنے رجسٹروں میں ضرور درج کیا ہوگا!" اور اسے ایک کاغذ میں لپیٹ کر سوئیکو کی جیب میں رکھ دیا۔

(۱۰)

تیسرے دن ماموں اور بھانجی اوساکا جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے۔ جہاں سے انہیں اتری ساحل کی طرف جانے والی گاڑی بدلنا تھی۔ ریل کے ڈبے میں سوار ہونے سے پہلے سوئیکو کے ماموں نے پلیٹ فارم پر ایک امریکن فوجی سے ایک شیشی خریدی اور کھڑے کھڑے اپنے منہ میں انڈیل لی۔ امریکن فوجی کو تیز تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوئیکو نے اپنے ماموں کی آستین پکڑ کر کھینچی تو وہ مسکرا کر بولا:۔

"فکر نہ کرو بچی، میرا ماموں ابھی تک سب بدیسی دارو اسے بدمست نہیں کر سکتی!"

جس ڈبے میں یہ دونوں سوار ہوئے وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک جوان عورت جو سیٹوں کے درمیان ایک بورے پر بیٹھی اور خون کا سا ہوڈ (HOOD) سر پہ ڈالے تھی، سوئیکو کے ماموں نے اس سے درخواست کی کہ ذرا سی جگہ سوئیکو کو دے دے۔ اس عورت کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور اس میں سے ایک گلدان کی گردن نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سوئیکو کے ماموں نے کچھ اور پوچھے بغیر اس سے پوچھا:۔

"کیا اُسی دن کا واقعہ ہے؟"

"نہیں، ناگاساکی کا!" اس عورت نے روتی ہوئی آواز میں بتایا۔

ٹ امریکی کی جگہ اصل میں Amis استعمال کیا ہے اور جاپان میں یہ لفظ تحقیر کا مفہوم رکھتا ہے۔ مترجم

"تمہارے والدین؟"

"نہیں، میرے سرے دونوں نہ!" وہ عورت آبدیدہ ہو گئی اور اُن کی گردن دوپٹیا کے اندر چھپا دیا۔

سوسیکو کے ماموں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سوسیکو کی طرف اشارہ کر کے بتایا:-

"میری یہ بھانجی اس وقت بھی شہر میں تھی جب روشنی کی ایجاد گرائی گئی تھی!"

ادھیڑ عمر کی ایک عورت کڑھائی کے کام کا کیمونو پہنے قریب ہی بیٹھی تھی اس نے ناک پر عینک رکھ کر پوچھا:-

"اور یہ بچ رہی؟"

"یہ شانے پر ایک جھلسا سا لگا تھا! ماموں نے سوسیکو کا شانہ کھول کر دکھایا' اب زخم کا سا نشان بنتا جا رہا اور رنگت آلو بخارے کی سی ہو گئی ہے: سونا بھی ویسا ہی پڑ رہا ہے!"

"ایٹم بم کے جھلسے کو میلائڈ کہتے ہیں۔" ایک نوعمر آدمی نے بتایا جو طالب علموں کی سی ٹوپی پہنے تھا۔

"بم گرا تو اس وقت تم کہاں تھیں؟" ایک اور آدمی نے پوچھا جو اسپتالی لبادہ اور فوجی ٹوپی لگائے سوسیکو کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"سانجوپل کے پاس، اسی کے قریب بم گرا تھا!" سوسیکو کے ماموں نے بتایا اور آواز اونچی کر دی کہ سب سن سکیں۔

"اس وقت یہ محلے میساکا میں تھی جہاں سے ریلوے اسٹیشن بہت قریب تھا۔ اس نے ہوائی جہاز کو کالا چھتری سی پھینکتے دیکھا تو یہ ایک نالی میں اوندھے منہ گر گئی تھی اور دعائیں پڑھتی رہی۔" سوسیکو نے اپنے ماموں کی آستین پکڑ کر کھینچی مگر وہ چپ نہ ہوا۔ "بم ٹھیک اس کے سر پہ پھٹا: زمین میں بھونچال آ گیا۔ جہنم پھٹ پڑا۔ اینٹ مکان اڑ گئے، آگیں لگ اٹھیں، مگر یہ وہیں پڑی رہی! شہر کے دوسری طرف سے گوداموں کی چھت اڑ کر میساکا میں آ گری، جہاں یہ پڑی تھی۔ وہ چھت اس کا شیلٹر بن گئی! اس محلے میں کوئی بچا بھی تو اس کے حواس بگڑ گئے مگر یہ لڑکی ڈری بھی نہیں۔"

"پکیڈون (PIKADON) پھٹا اور یہ ڈری بھی نہیں؟" اسپتالی لبادہ پہنے ہوئے آدمی نے حیران ہو کر کہا:-

"اسے شاید ڈرنے کی مہلت ہی نہ مل ہوگی۔"

سوسیکو نے اپنے ماموں کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا اور کہنے لگی:-

"لگا کیوں نہیں ڈر — میں تو بہت ڈری تھی!"

"اس کا بچ نکلنا سچ مچ معجزہ ہے! اس کے پاس کوئی تعویذ ہوگا!" ایک عورت جو دوسری بنچ پر بیٹھی تھی کہنے لگی۔

سوسیکو کا ماموں اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سوسیکو نے اس کی آستین کھینچ کر روک دیا۔ کیمونو پہنے ہوئے عورت پوچھنے لگی:-

"کہتے ہیں یہ ہوائی جہاز کوریا سے آئے تھے، ٹھیک بات ہے؟"

"نہیں، وہ اتر پورب سے آئے تھے اور بڑے B-29 تھے اور آٹھ ہزار فٹ کی اونچائی سے بم گرایا تھا!" اس طالب علم نے بتایا: "لیکن بم جس جہاز نے گرایا تھا اس کا نام اینولا گے (ENOLA GAY) تھا!"

"یہ کیا کسی امریکی شہر کا نام ہے؟" اس ادھیڑ عمر کی عورت نے پوچھا۔

"شہر کا نہیں بلکہ اس ہوا باز کی ماں کے کنوارپنے کا نام ہے جو اس جہاز کو اڑا رہا تھا۔ اس طرح اس نے اپنی ماں کے نام کو امر بنا کر

اپنا دودھ بخشوایا ہے!" طالب علم نے سمجھا کر کہا۔

"بیشک بڑا سعادت مند بیٹا تھا وہ" بھیڑ میں سے کسی نے کہا۔

ڈبے کے سارے مسافر پکیڈون کی باتیں اور اس کے پھٹنے کے اثرات اور تباہیوں کا ذکر کرنے لگے۔ طرح طرح کی جو افواہیں اڑی تھیں ان کو دہرانے لگے۔ ایک نے کہا کہ جس وقت بم پھٹا تو جو آدمی جہاں تھا وہیں ہوا میں گھل گیا اور ایسے آدمیوں کی پرچھائیاں آس پاس کی دیواروں پر ابھی تک قائم ہیں! دوسرے نے سنایا کہ ہیروشیما پر بم پھٹا تو بیچ شہر میں اوساکا بنک میں جتنے کرنسی نوٹ تھے، وہاں سے اڑ کر میانو علاقے کے ایک گاؤں میں جا رہے تھے! تیسرے نے بتایا کہ یاکا ضلع میں رات کے وقت سر کٹے بچوں کے بھوت جھلسے کپڑے پہنے پھرا کرتے ہیں!

سومیکو دہشت اور حیرت کے ساتھ یہ قصے سن رہی تھی۔ اس نے اپنے ماموں کی آستین پکڑ کر کھینچی:-

"بیٹی میں کچھ کہہ کب رہا ہوں!"

"اس بم کو پکیڈون کیوں کہتے ہیں؟" سومیکو نے پوچھا۔

مگر اس کا ماموں اس کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر لاعلمی کا اظہار کرنے لگا تو اس طالب علم نے بتایا:-

"پکے کے معنی اندھا کر دینے والی روشنی ہے اور ڈون سے مراد پھٹنے کی آواز ہے!"

ایک اور آدمی جس کے سر سے پٹیاں بندھی تھیں اور فوجی وردی میں تھا، اور جو اب تک کچھ بولا نہ تھا۔ پوچھنے لگا۔

"سنا ہے کہ جو لوگ بچ رہے اور زندہ ہیں، اب امریکن ڈاکٹر ان کی حالت کی جانچ پڑتال کر رہے اور پتا چلانا چاہتے ہیں کہ ایٹم بم کا اثر انسانی خون کے ساتھ کیا کھیل کھیلتا ہے! اس لڑکی کے خون کی کیا کیفیت بتائی گئی؟"

"یہ ان شعاعوں کے نفوذ (RADIATON) کا نتیجہ ہے۔" اس طالب علم نے بتایا اور لبادہ پہنے آدمی سے کہا:-

"ٹھیک ہے۔ آدمی بچ بھی گئے اور زندہ بھی ہیں مگر شعاعی نفوذ نہایت مہلک چیز ہے۔ جاپان کے ماہر ریڈیوں کا تو کہنا ہے کہ جن کے داغ آ گئے ہیں، انھیں خون کی کمی کی شکایت کسی وقت بھی دس سال بعد بھی ہو سکتی ہے!"

"تو ان لوگوں کی موت یقینی ہے!" اسپتال لبادہ پہنے آدمی نے کہا مگر فوراً سومیکو کا خیال آیا اور بات ٹالنے کو ریل کی کھڑکی سے باہر اشارہ کر کے کہنے لگا "ان بڑھیوں کو دیکھو کیسی بھاری بوریاں اٹھائے جا رہے ہیں، بھکشا والے ہوں گے۔ مگر اتنی ہمت!"

"ایک نے تو زنانہ پاجامہ بھی پہن رکھا ہے!"

ادھیڑ عمر کی عورت نے اپنے تھیلے سے کچھ خشک خوبانیاں نکال کر سومیکو کو دیں، اور جو عورت کڑھائی کا کیمونو پہنے تھی وہ پوچھنے لگی:-

"تو تمہارا علاج امریکن ڈاکٹروں نے کیا ہے؟"

"نہیں ان سوروں نے تو سوئیاں گود گود کر میرا بازو چھلنی کر دیا اور بس ٹیسٹ کرتے رہے، ڈھیروں فوٹو لے ڈالے، دوا کوئی بھی نہ دی! جاپانی ڈاکٹروں کو بھی دوا دینے سے روک دیا!" سومیکو نے گردن ہلا ہلا کر بتایا۔

اس دفعہ اس کے ماموں نے سومیکو کی آستین پکڑ کر کھینچی اور وہ چپ ہو رہی۔

ایک اور مسافر جو انگریزی سولہ ہیٹ لگائے اور سوٹ پہنے اب تک سنتا رہا تھا پوچھنے لگا۔

"یہ کیا عجیب بات ہے کہ ایٹم کی شعاعوں کے مارے مریضوں کی اچانک نکسیر پھوٹ نکلتی اور آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے نظر آتے اور بخار ہو جاتا ہے؟"

"چھوڑو اب اس منحوس ذکر کو! اور اور باتیں کرو!" سر سے پٹیاں باندھے فوجی نے کچھ سمجھ کر کہا اور اس طالب علم سے اس پروفیسر کی بابت پوچھنے لگا جس نے اس کی آنکھوں کا علاج کیا تھا۔

رات میں ڈبے کے اندر بڑی گھٹن رہی۔ سومیکو بار بار جاگ پڑتی تھی کیونکہ اس کے داغ میں کھجلی اٹھ رہی تھی۔ بہت سویرے اس کے ماموں نے سومیکو کو جگایا اور فکرمند ہو کر اس کے داغ کو دیکھنے لگا:۔

"دو سرخ دھبے! کل تو یہ تھے نہیں! بہت تکلیف ہے؟"

"بس کھجلی ہے۔ اور کوئی تکلیف نہیں! مچھروں نے کاٹا ہوگا!" اور ماموں کا کچھ ارادہ دیکھ کر بولی "نہیں میرے منہ سے بات نہ لگانا صاف ہونے کے بعد تو بڑی بری صورت نکل آئے گی!" اس پر سب ہنس پڑے۔

گاڑی ایک ٹنل میں گھسی اور ہال بالکل دھیمی ہو گئی۔ پھر جب ٹنل سے نکلی، ایک جگہ رک گئی۔ پہاڑی کے پیچھے سے اچانک ایک ہوائی جہاز آیا اور پہاڑی کے دامن میں صنوبر کے جھنڈ کے بیچ میں لگوڑا تھا۔ اس کے گرد چکر کھانے لگا۔ اس جہاز کی دم کے قریب ایک سیاہ چکر بنا تھا جس کے دونوں طرف سفید ستارے اور دھاریاں کھچی تھیں۔ سومیکو نے جیسے ہی ہوائی جہاز کی شکل دیکھی چیخ پڑی اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھک لیا۔

"ڈرو مت بیٹی، جنگ ختم ہو چکی ہے! اب پکینڈون نہیں گریں گے! تم چھو چھو کر گردن کے یہ دھبے نہ مٹا دینا کہیں!"

اس کے ماموں نے کہا۔

"بیشک اب پکینڈون نہیں گرائے جائیں گے ——— کبھی نہ گرائے جائیں گے!" اسپتالی لبادہ پہنے ہوئے آدمی نے بڑے اعتماد سے کہا

کب ہوگا سویرا

انور

پارٹی شباب پر تھی۔ کوک ٹیل تقسیم ہو رہی تھی۔ مرغوں کی دُمیں زور زور سے ہل رہی تھیں۔ مرغوں کی ٹانگیں بُری طرح سے لڑکھڑا رہی تھیں اور اب مرغوں کی اذانیں بلند ہونے والی تھیں اور مسجدوں میں سوئے ہوئے مؤذن بیدار ہونے والے تھے۔

فینسی ڈریس شو ہال میں ہوا تھا جس میں مرچی لائٹوں کی تیز روشنی کے سامنے فینسی ڈریسنگ میں حصہ لینے والے ایک دائرے کی شکل میں ججوں کے ارد گرد گھومتے رہے تھے۔ کمانڈر قاضی کو مردوں کا اور مسز کرسٹین کرافورڈ کو عورتوں کا فینسی ڈریسنگ میں پہلا انعام ملا تھا۔

کمانڈر قاضی ایک خونخوار سمندری ڈاکو کے فینسی ڈریس میں تھا۔ اس نے سُرخ، سبز، سیاہ اور زرد نٹنگ کا بنا ہوا رنگ برنگا لباس پہنا ہوا تھا۔ دراصل یہ رنگ دار اونی نٹنگ کی سرخ، سبز، سیاہ اور زرد جھنڈیاں ہیں جو فرداً فرداً انگریزی کے حروف تہجی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان سے اونچے سمندروں میں بحری جہاز ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ کمانڈر قاضی نے انگریزی حروف تہجی کی جن جھنڈیوں سے اپنا لباس تیار کیا تھا وہ یہ ہیں: پی، اے، کے، آئی، ایس، ٹی، اے، این۔ اس رنگ برنگے لباس پر اژدہے کے موٹے چمڑے کی چوڑی پیٹی تھی جس کے ایک طرف ایک خوفناک چوڑے پھل والی فولاد کی تلوار تھی اور دوسری طرف زنجیر اور ہتھکڑی لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنوں تک فل سائز کے گم بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی اس کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے سر کے بال اس کے کندھوں پر پڑے تھے۔ اس کے کانوں میں موٹے موٹے سونے کے بالے تھے۔ پارٹی میں سب مدعو مہمان اس کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے، وہ فینسی شو میں حصہ لینے والوں کے ساتھ ججوں کے ارد گرد گھوم رہا تھا، ججوں نے اس کو سب سے پہلے اپنے سامنے بلایا۔

چیف جج نے اس سے پوچھا:۔

"آپ کون ہیں؟"

اس نے غضب آلود لہجے میں جواب دیا۔

"میں ایک سمندری ڈاکو ہوں، سمندروں کا شہزادہ۔"

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"مجھے محمد بن قاسم نے جزیرۂ عرب کی حفاظت کے لیے یہاں تعینات کیا ہے۔"

"آپ کا محمد بن قاسم سے کیا تعلق ہے؟"

"میں محمد بن قاسم کا گورنر ہوں، محمد بن قاسم بحیرۂ عرب میں سمندری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے آیا تھا، پھر اس نے بحیرۂ عرب کے ساحل پر ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی، کچھ عرصے کے بعد مغرب کی سفید قوموں نے اس سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ شاید مغرب کی سفید قوموں نے سمجھا

تھا کہ محمد بن قاسم مر گیا ہے۔ نہیں محمد بن قاسم مرا نہیں۔ محمد بن قاسم زندہ ہے۔ میں محمد بن قاسم کا گورنر ہوں میں نے جزیرۂ عرب کے ساحل کو سفید قوموں کی قید سے آزاد کرا دیا ہے اور اب میں اپنے جہازوں کے ساتھ بحیرۂ عرب کے ساحلوں کی حفاظت کر رہا ہوں۔

سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

محمد بن قاسم کا گورنر فینسی ڈریس کے دائرے میں واپس چلا گیا۔

عورتوں میں فینسی ڈریسنگ کا پہلا انعام پانے والی مسز کرسٹین کرافورڈ نے ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا سفید براق ریشمی فراک پہنا ہوا تھا، جو اوپر گلے تک بند تھا، اور جس کے سینے پر سموکنگ کی ہوئی تھی اور جس کے کفوں پر لیس لگی ہوئی تھی۔ فراک کا وہ حصہ جو کمر سے اوپر تھا، جس کے گول فریم کی مدد سے ایک گول چھتنٹ دار ستون کی شکل میں پیروں تک چلا گیا تھا۔ سر پر کالے ربن والی سفید اونچی ہیٹ پہن کر مسز کرسٹین کرافورڈ کسی عجائب گھر میں رکھا ہوا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی عورت عورت نہیں تھی، عورت کا مجسمہ تھی۔ مسز کرسٹین کرافورڈ نے کلب کے ہال کو عجائب گھر بنا دیا تھا۔ ججوں نے مسز کرسٹین کرافورڈ کو ان کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا۔

چیف جج نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

مسز کرسٹین کرافورڈ نے جواب دیا:

"میں لیڈی ہیملٹن ہوں۔"

"میں قوموں کو زیر و زبر کر دیتی ہوں، اور فاتحوں کو مفتوح بنا دیتی ہوں۔"

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"میں یہاں کی عورتوں سے ناراض ہوں۔ یہاں کی عورتیں مجھے برقع اور شلوار سمجھتی ہیں میں ان سے ملنا چاہتی ہوں میں ان کو بتانا چاہتی ہوں کہ لیڈی ہیملٹن کا کام اس دنیا میں برقعے اور شلوار کا کردار ادا کرنا نہیں ہے۔ لیڈی ہیملٹن زندگی کی کش مکش میں مبتلا قوموں کے لیے سیاسی، معاشرتی اور ادبی ترقی کا سمبل ہے۔"

فینسی ڈریس شو کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔

آخر کے قریب جس وقت جج اپنا فیصلہ سنانے والے تھے۔ ہال کے ایک طرف سے ہلچل ہوئی۔ یہ ہلچل تھوڑی دیر میں حیرت، دہشت زدگی اور ناپسندیدگی کی صداؤں کے شور میں تبدیل ہو گئی۔ اور یہ شور لحظہ بہ لحظہ بڑھتا گیا۔ سب حیران کھڑے تھے۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟

ہال کے ایک طرف سے ہجوم کو چیرتا ہوا مقامی کالج کے طالب علموں کا ایک گروہ، فینسی ڈریس شو میں حصہ لینے کے لیے ہال میں داخل ہوا۔ تمام ہال پر اداسی اور مردنی چھا گئی۔ طالب علموں کے اس گروہ نے فینسی ڈریس شو کے لیے کوئی لباس نہیں پہنا ہوا تھا۔ وہ لنگوٹیوں اور پھٹے ہوئے تہمدوں میں تھے۔ ان کے سوکھے ہوئے جسموں میں پسلیوں کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ان کے پاؤں ننگے تھے۔ اور ان کی ٹانگیں بیساکھیوں کی طرح سوکھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اور ان کے گرد سیاہ خندقیں کھدی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ پر مونچھیں اور داڑھیاں ایسی دکھائی دے

رہی تھیں جیسے گڑھوں میں اُگی خودرو گھاس۔ ان کے سروں پر چپکے ہوئے بالوں کی لٹیں سانپوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سانپ کسی کو ڈسنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ اپنے اپنے کمزور ہاتھوں میں بانس کی سوٹیاں تھامے ہوئے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے فینسی ڈریس شو میں داخل ہو گئے اور ججوں کے ارد گرد چکر کاٹنے لگے۔

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ججوں نے اپنے قلم اپنے مُنہ میں لے لیے۔ اور میں زور زور سے تالیاں بجانے اور چلّانے لگا لیکن دوسرے کسی مہمان نے میرا ساتھ نہ دیا۔ سب شو کا خیال چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں چپ ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔

ججوں نے فینسی ڈریس میں حصّہ لینے والے اس نئے گروہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور ان میں سے کسی کو اپنے سامنے پیش ہونے کا حکم نہ دیا اس لیے وہ خود بن بلائے یکے بعد دیگرے ججوں کے سامنے آنے لگے۔

ان میں سے ایک سب سے کمزور ہڈیوں کا ڈھانچہ ڈگمگاتا، لڑکھڑاتا، ججوں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کلپتے ہوئے بولا۔

"میں بھوک ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا اور فینسی ڈریس پریڈ میں شامل ہو گیا اس کے بعد دوسرا ہڈیوں کا ڈھانچہ ججوں کے سامنے آیا اور بولا:-

"میں بیماری ہوں۔"

پھر تیسرا

"میں غریبی ہوں۔"

پھر چوتھا۔

"میں بیکاری ہوں۔"

پھر پانچواں

"میں بے گھر ہوں۔"

پھر چھٹا۔

"میں ننگا ہوں۔"

پھر ساتواں۔

"میں جہالت ہوں۔"

پھر آٹھواں

"میں بے کسی ہوں۔"

پھر ہال میں سناٹا چھا گیا۔

پھر چیف جج نے فینسی ڈریس شو کے انعاموں کا اعلان کیا۔

"مردوں کا فینسی ڈریس فرسٹ پرائز کمانڈر تاشی۔ سمندری ڈاکو۔ محمد بن قاسم کا گورنر۔

ہال تالیوں سے گونج اٹھا

سمندری ڈاکو نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر ہوا میں بلند کی اور ایک خوش کا نعرہ بلند کر کے چیف جج کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنا انعام لے کر چیف جج کو سلیوٹ کیا اور چیف جج کی دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

چیف جج نے دوسرا اعلان کیا:

"عورتوں کا فینسی ڈریس - فرسٹ پرائز - مسز کرسٹین کرافورڈ - لیڈی ہیملٹن۔"

ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔

لیڈی ہیملٹن چیف جج سے انعام وصول کر کے وکٹورین انداز میں جھک کر آداب بجا لائی اور واپس جانے لگی، وہ ابھی تھوڑی دور گئی تھی کہ سمندری ڈاکو اس پر اپنی تلوار نکال کر عقاب کی طرح جھپٹا۔

"ہالٹ"

لیڈی ہیملٹن ٹھہر گئی۔

"بحیرۂ عرب کے ساحل پر سفید قوموں کا داخلہ ممنوع ہے۔ تم کس کی اجازت سے میرے علاقے میں آئی ہو؟"

لیڈی ہیملٹن نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم کو گرفتار کیا جاتا ہے۔"

سمندری ڈاکو نے اپنی بیلٹ سے زنجیر کھول کر لیڈی ہیملٹن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور اس کو ننگی تلوار کے سائے میں کشاں کشاں مجمعے کے درمیان گھومنے لگا، مجمعے نے قہقہوں اور تالیوں سے ہال سر پر اٹھا لیا۔

جب وہ چیف جج کے سامنے سے گزر رہا تھا تو چیف جج نے اسے بڑے ادب سے خطاب کیا:

"حضور والا اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

سمندری ڈاکو نے جواب دیا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو، فریادی؟"

چیف جج نے التجا کی۔

"حضور والا! مسز کرافورڈ کی جان بخشی کی جائے۔ وہ ہماری مہمان ہیں۔ ان کو اور ان کے شوہر مسٹر ایڈورڈ کرافورڈ کو ہم نے اس فنکشن کے لیے خاص طور پر انگلستان سے مدعو کیا ہے۔ جناب والا"

"میں آپ کو مسز کرافورڈ کے بارے میں ایسی حیرت انگیز بات بتاؤں گا جس کو سن کر آپ بہت حیران اور بہت خوش ہوں گے۔"

سمندری ڈاکو نے اپنی تلوار کو نیام میں ڈال لیا اور تن کر چیف جج کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"بتاؤ!"

"حضور والا، یہ کلب صرف سفید قوموں کے لیے تھی۔ اس کے گیٹ پر ایک نوٹس بورڈ ہوتا تھا جس پر یہ عبارت لکھی تھی۔ صرف یورپین

کے لیے۔ کسی یورپین کو اپنے ساتھ کسی دیسی آدمی کو کلب میں لانے کی اجازت نہیں' بالکل اسی طرح جیسے ریلوے سٹیشنوں کے نوٹس بورڈوں پر لکھا ہوتا ہے۔ "درجہ اول کے شرفا کے لیے طعام خانہ۔ کتوں کو اندر لانے کی اجازت نہیں"۔ آزادی سے پہلے مسٹر ایڈورڈ کرافورڈ اس کلب کے سیکرٹری تھے۔ لیکن معلوم نہیں میں مسٹر ایڈورڈ کرافورڈ کا نام اتنے احترام سے کیوں لینے لگ گیا ہوں۔ مسٹر ایڈورڈ کرافورڈ میرے لیے صرف ایڈورڈ تھا۔ نہیں وہ میرے لیے ایڈورڈ بھی نہیں تھا۔ وہ میرے لیے صرف ایڈی تھا۔ اس نے کیمبرج میں میرے ساتھ تعلیم پائی تھی۔ وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ اس کی ماں نے ہم دونوں کے لیے سینڈوچ بنائے تھے۔ اس کی بہنوں نے ہماری قمیضوں پر بٹن لگائے تھے۔ اور جب میں اپنی تعلیم مکمل کرکے واپس یہاں آیا تو ایڈی اس کلب کا سیکرٹری تھا اور اس دن شام کو جب میں ایڈی کے ساتھ اس کلب کے گیٹ پر آیا تو ایڈی نے اس کلب کا گیٹ کھول کر کہا:

"اچھا! خدا حافظ! میں نے کہا: "ایڈی، کتنی دیر کے بعد ملے ہیں ہم۔ آج کی شام ہم اکٹھے کیوں نہ گزاریں"۔ پھر یکایک میری نظر گیٹ کے نوٹس بورڈ پر پہنچ گئی۔ "صرف یورپینوں کے لیے۔ کسی یورپین کو کسی دیسی آدمی کو کلب میں لانے کی اجازت نہیں"۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریلوے سٹیشن پر کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے اور میں نوٹس بورڈ کی عبارت پڑھ رہا ہوں: "درجہ اول کے شرفا کے لیے طعام خانہ۔ کتوں کو اندر لانے کی اجازت نہیں۔ درجہ اول کے شرفا اور تھرڈ کلاس کا ٹکٹ۔ اور پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم اور ٹرین کی قیامت خیز آمد اور جو شرفا میں سے تھے وہ درجہ اول کی طرف چلے گئے اور جو شرفا میں سے نہیں تھے وہ تھرڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ لیکن میں پلیٹ فارم پر کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ میں تو شرفا میں سے نہیں ہوں۔ پھر میں ایک شریف آدمی کی طرح پلیٹ فارم پر کیوں کھڑا ہوں۔ یکایک میں نے انجن کو زور سے مکا مارا اور ٹرین کو ایک زناٹے کی لات ماری۔ انجن پٹڑی سے اتر گیا اور ٹرین الٹ گئی اور جب میرا غصہ کچھ کم ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایڈورڈ گیٹ کے پاس لہولہان پڑا ہے۔ اس کے ہونٹ سے خون نکل کر اس کی سفید قمیض کے کالروں میں جذب ہو رہا ہے۔ اس کا ریکٹ اس سے دور لان کے کنارے پڑا ہے۔ اس کے گھٹنے سے خون بہہ کر اس کی سفید نیکر کے کناروں پر ٹھہر گیا ہے اور نوٹس بورڈ ٹوٹ کر نیچے ڈھلوان میں جا گرا ہے۔ ہم دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ پھر میں آگے بڑھا۔ میں نے اپنے رومال سے ایڈورڈ کے ہونٹ گردن اور گھٹنے سے خون صاف کیا۔ اس کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اور اپنے گلے سے لگا لیا۔ ایڈورڈ نے گیٹ کے دونوں دروازے پوری طرح کھول دیئے۔ اور ہم دونوں کلب میں داخل ہو گئے۔"

ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور دیر تک گونجتا رہا۔

چیف جج نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

"حضور والا! یہ ڈرامہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس ڈرامے کا ڈراپ ابھی ہونے والا ہے۔ اس شام کو اس کلب میں ٹینس کا میچ تھا۔ کلب کے سارے یورپین ممبر کلب میں موجود تھے۔ جب انہوں نے مجھے ایڈورڈ کے ساتھ کلب میں آتے دیکھا، تو وہ سب مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے حیران و پریشان دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک قوی ہیکل جوان میری طرف بڑھا اور مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا: گیٹ آؤٹ یو بلیک باسٹرڈ۔ ایڈورڈ نے اپنی پوری قوت سے اپنا ریکٹ گھما کر اس جوان کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ اس کے بعد مجھے اور ایڈورڈ کو کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ جب ہمیں ہوش آیا تو ہم دونوں ہسپتال میں تھے۔"

چیف جج گولڈنیل کے ایک گھونٹ کے لیے ٹھہر گیا۔ کلب میں مکمل خاموشی تھی۔ کلب کا کلاک ٹک ٹک ٹک ٹک کر رہا تھا۔

, چیف جج نے اپنا کوک ٹیل کا گلاس بلند کرتے اُس کی طرف دیکھتے ہوا کہا:

"جنابِ والا: اس وقت میرے گلاس میں دُنیا کی بہترین کوک ٹیل ہے۔ میں نے ابھی ابھی دُنیا کی بہترین کوک ٹیل کا ایک گھونٹ پیا ہے آج شام کو اس کلب میں ہمارے معزز مہمانوں نے دُنیا کی بہترین کوک ٹیل نوش فرمائی ہے۔ جنابِ والا، دُنیا کی یہ بہترین کوک ٹیل میرے ایڈورڈ کی ایجاد ہے میرا دوست ایڈورڈ دنیا کا چیمپئن کوک ٹیل مکسر ہے۔ ایڈورڈ کوک ٹیل کا آرٹسٹ ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے اس کو اس آرٹ میں کمال حاصل کرنے پر اس سال سر کا خطاب پیش کیا تھا، لیکن ایڈورڈ نے یہ اعزاز قبول کرنے سے کیوں انکار کیا؛ اس کی وجہ میں آپ کو تھوڑی دیر میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے ایڈورڈ کرافورڈ کو اس پارٹی کے لیے خاص طور پر انگلستان سے مدعو کیا ہے' اندازہ فرمایئے کہ وہ شخص جو برٹش گورنمنٹ کا سر کا خطاب ٹھکرا دیتا ہے، وہ ہماری دعوت قبول کر لیتا ہے اور یہی نہیں کہ وہ ہماری دعوت قبول کر لیتا ہے بلکہ وہ ہماری درخواست پر ہمارے مہمانوں کے لیے کوک ٹیل بنانا بھی قبول کر لیتا ہے اور اب سچی بات بتانے میں کیا حرج ہے۔ ہم نے اس کو اس پارٹی میں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی کوک ٹیل چکھنے کے لیے ہی مدعو کیا تھا، اور اب ہم فخر سے آئندہ نسلوں کو یہ بتا سکیں گے کہ ہم نے ایڈورڈ کرافورڈ کی بنائی ہوئی کوک ٹیل پی ہے۔ خواتین و حضرات! میں ایڈورڈ کرافورڈ کا جامِ صحت تجویز کرتا ہوں "

بے شمار گلاس فضا میں بلند ہوئے۔

"ایڈورڈ کرافورڈ کے لیے!"

" ایڈورڈ کرافورڈ کے لیے!"

" ایڈورڈ کرافورڈ کے لیے!"

چیف جج نے اپنی تقریر پھر شروع کر دی۔

"حضورِ والا، جب اس کلب کی گورننگ باڈی نے ایڈورڈ کو ڈسمس کر کے واپس انگلستان بھیج دیا تو اس کلب پر زوال آگیا۔ یہ کلب ہر سال اس تاریخ کو اپنا برتھ ڈے مناتی ہے۔ برتھ ڈے کی یہ پارٹی ایڈورڈ کی کوک ٹیل کی وجہ سے سارے یورپ اور امریکہ میں مشہور تھی۔ آزادی کے بعد اب اس کلب میں یورپینوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ لیکن کلب کے ممبران کو اپنے مہمان کے طور پر یہاں مدعو کر سکتے ہیں، حضورِ والا، بتانے والی بات یہ ہے کہ اس کلب کی گورننگ باڈی نے یورپینوں پر داخلے کی پابندی کے باوجود ایڈورڈ کرافورڈ کو اپنا لائف ممبر بنا لیا ہے۔ گورننگ باڈی نے ایک اور اہم فیصلہ یہ کیا ہے کہ ایڈورڈ کرافورڈ کی زندگی میں ہر سال اس کلب کا برتھ ڈے منایا جائے گا اور ہر سال اس پارٹی میں ایڈورڈ کو مدعو کیا جائے گا۔ ایڈورڈ نے ہماری پیشکش کو قبول کرنے سے پہلے ایک شرط رکھی، وہ شرط یہ تھی کہ ایڈورڈ کرافورڈ کے ساتھ مسز کرسٹین کرافورڈ کو بھی یہاں مدعو کیا جائے۔ ہم نے یہ شرط بڑی مُسرت کے ساتھ منظور کر لی، چنانچہ آج کی پارٹی میں مسٹر ایڈورڈ کرافورڈ اور مسز کرسٹین کرافورڈ ہمارے مہمانِ خصوصی ہیں، حضورِ والا! اس وقت مسز کرسٹین کرافورڈ آپ کی قید میں ہیں' ہم آپ سے ان کی رہائی کی درخواست کرتے ہیں"

سمندری ڈاکو نے بلند آواز سے اعلان کیا:۔

"لیڈی ہیلٹن کو رہا کیا جاتا ہے"

ہال ایک دفعہ پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ تالیوں اور قہقہوں کے درمیان سمندری ڈاکو نے لیڈی ہیلٹن کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔

فینسی ڈریس شو کے بعد ہمارا گروپ لان میں گلاب کے پھولوں کے ایک تختے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا، ہم میں سے کسی نے کہا:
"یہاں ٹھیک ہے، یہاں سے کلب کا ہر حصہ نظر آتا ہے۔ کلب میں سب آنے جانے والے ہمارے پاس سے گزریں گے۔"

اور یہاں سے کلب کا ہر حصہ نظر آتا تھا۔ ڈائننگ روم میں ہمنہ سی ڈاکو بھوکے، بیمار اور غریب طالب علموں کے گروہ کو کھانا کھلا رہا تھا۔ کھانے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ان کی پسلیوں کی ہڈیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ چکن سوپ، چکن روسٹ، فرائڈ فش اور فروٹ پڈنگ بڑے مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ ان کے گلاسوں میں پانی کی بجائے کوک ٹیل بھی۔

اور لاؤنج میں تمام عورتیں اور لڑکیاں لیڈی ہیملٹن کے ارد گرد جمع تھیں۔

ہم میں سے کسی نے کہا:

"آؤ بیوٹی کے لیے نمبر دیں، آج بیوٹی کونٹسٹ بھی ہونا چاہیے تھا۔ لیڈی ہیملٹن کو صفر نمبر۔"

میں نے کہا:

"کنواری لڑکیوں کو چھوڑ کر۔"

اس نے کہا:

"کیوں کنواری لڑکیوں کو کیوں چھوڑا جائے؟"

میں نے کہا:

"ان میں میری لڑکیاں بھی بیٹھی ہیں۔"

کسی نے کہا:

"میری بھی۔"

کسی اور نے کہا:

"میری بھی۔"

ایک اور بولا:

"میری لڑکیاں بھی وہاں بیٹھی ہیں۔ اس کا مطلب یہ کیسے ہوا کہ لڑکیوں کو بیوٹی کے نمبر نہ دیے جائیں۔ یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب لڑکیاں کالج کی بجائے لاؤنج میں بیٹھی ہوں تو ان کے نمبر کٹ جاتے ہیں۔ میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ لڑکیوں کو نمبر دیجیے اور بیگمات کو ڈائننگ کے نسخے۔ یہ صاحبان لڑکیوں کو نمبر دینے کے اس لیے خلاف ہیں کہ ان کی لڑکیاں فیل ہو جائیں گی۔"

تازہ کوک ٹیل کے گلاس آگئے۔ عثمان ٹرے کی طرف تیزی سے بڑھا۔ میں نے اس کو بازو سے پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور بیرے کو انگلی کے اشارے سے جانے کے لیے کہا۔ عثمان بہت پی گیا تھا۔ اب وہ بری طرح سے ڈگمگا رہا تھا، اور میرے کندھے کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم باز تھیں۔ میں نے ابھی اس کو باتھ روم سے لایا تھا۔ فلش سسٹم خراب ہو جانے کی وجہ سے انتظامیہ نے وہاں پس پوٹ رکھوا دیے تھے۔ تمام پس پوٹ بھرے پڑے تھے۔ پس پوٹ سے باہر پیشاب کرتے ہوئے مجھے عثمان نے کہا: "سب پی رہے ہیں تم مجھے وسکی کیوں نہیں دیتے۔" میں نے

کہا: وہسکی ختم ہوگئی ہے، اور تم نے پیشاب کر لیا ہے۔ چلو اس نے کہا: وہاں وہسکی نہیں ہے۔ مجھے یہیں بیٹھنے دو۔ پیس پوٹ سے وہسکی کی خوشبو آ رہی ہے۔ میں اس کو کھینچ کر یہاں لان میں لے آیا، اور اب جو میں نے اس کو کوک ٹیل کا گلاس لینے سے منع کیا تو اس نے جھنجھلا کر میرا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے مجھے کہا: سور کے بچے! اگر تو مجھے ایک کوک ٹیل نہیں دے گا، تو میں ابھی باتھ روم میں جا کر سارا پس پوٹ پی جاؤں گا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر اس کو زور زور سے تین چار جھٹکے دیئے۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اور جب میں نے اس کو چھوڑ دیا تو اس کی آنکھیں پھر نیم باز ہو گئیں۔ وہ کندھے گرا کر اور گردن لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

پھر جب میری نظر عثمان سے ہٹی تو میں نے دیکھا کہ سمندری ڈاکو ڈائننگ ہال کی طرف سے بڑے غضب ناک انداز میں ہمارے گروپ کی طرف چلا آ رہا ہے۔

وہ ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا، اور غصّے سے بھری ہوئی نظروں سے ہمارے گروپ کے افراد کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گرجدار آواز میں کہا:۔

"ہمیں کس نے پکارا؟ فریادی، ہم آ گئے ہیں۔ بتاؤ، بتاؤ! ہمیں کس نے پکارا؟"

عثمان لڑکھڑا کر تھوڑا سا آگے بڑھا اور بولا:

"میں نے"

سمندری ڈاکو نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

"ہاں، میں دیکھ رہا تھا تم نے اس کو کوک ٹیل لینے سے منع کیا۔ یہ پارٹی کے آداب کے خلاف ہے۔ میں نے دیکھا کہ جب عثمان نے شراب طلب کی تو تم نے بڑی بے رحمی سے اس کے بال نوچے، تمہیں ایک معصوم اور مظلوم شرابی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی"

پھر اس نے بیرے کو آواز دی۔ ایک بیرا مختلف شرابوں کی ٹرے لیے ہوئے آ گیا۔ اس نے بیرے کو حکم دیا۔

"صاب کو کوک ٹیل دو"

بیرے نے شرابوں کی ٹرے عثمان کے سامنے کر دی۔ عثمان نے کوک ٹیل کا ایک گلاس اٹھایا اور اسے غٹا غٹ پی گیا۔ اس نے خالی گلاس کو ٹرے میں رکھ دیا، اور کوک ٹیل کا ایک اور گلاس اٹھا لیا۔ پھر بیرا سمندری ڈاکو کی مزید ہدایات کے لیے اس کے برابر کھڑا ہو گیا

سمندری ڈاکو نے سب سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"کوئی اور بھی ہے جس کو مجرم نے بہکانے کی کوشش کی ہو؟"

سب نے جواب دیا:

"نہیں"

پھر سمندری ڈاکو نے سب سے فرداً فرداً پوچھنا شروع کیا۔

"آپ کے گلاس میں کیا ہے؟"

"کوک ٹیل"

"آپ کے گلاس میں ؟"

"کوک ٹیل"

اس کے بعد سوال کے بغیر ہی جواب آنے لگے۔

"کوک ٹیل"

"کوک ٹیل"

"شمپین"

"وَوڈکا"

"مارٹنی"

"شیری"

"وسکی"

"برانڈی"

"کوک ٹیل"

"کوک ٹیل"

پھر اُس نے مجھ سے پوچھا،

"تمہارے گلاس میں کیا ہے ؟"

میں نے جواب دیا۔

"میرے گلاس میں ان شرابوں میں سے کوئی شراب نہیں۔ مجھے ان شرابوں سے نشہ نہیں ہوتا۔ میں ایک بہت بڑا شرابی ہوں۔ میں ہمیشہ نشے میں رہتا ہوں، میں جو شراب پیتا ہوں، وہ ان سب شرابوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ اس دنیا کی کسی بار میں نہیں ملتی۔"

"تم بکتے ہو۔ پرتگال کے جس جہاز کو لوٹ کر میں نے اس کلب کو شراب مہیا کی ہے، اس میں ہر قیمتی سے قیمتی شراب موجود تھی۔ میں ابھی تمہارے لیے شراب مہیا کرتا ہوں۔ بتاؤ تم کونسی شراب پیتے ہو؟"

میں نے کہا:

"زندگی کی شراب!"

سمندری ڈاکو حیران ہو گیا اور بولا:

"زندگی کی شراب! یہ کونسی شراب ہے۔ اٹلی کی شراب ہوتی ہے۔ روس کی شراب ہوتی ہے۔ فرانس کی شراب ہوتی ہے۔ سکاٹ لینڈ کی شراب ہوتی ہے۔ زندگی کی شراب کونسی شراب ہوتی ہے ؟"

یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف بڑھا۔ اور میرے ہاتھ سے میرا گلاس چھین کر بولا،

"لاؤ، میں دیکھوں، تم کونسی شراب پیتے ہو۔"

اس نے میرے گلاس میں سے ایک گھونٹ پیا اور پیتے ہی غصے سے لال ہوگیا اور گرج کر بولا:

"او نابکار! بدکردار! یہ تو سوڈا ہے۔"

اس نے میرے سوڈے کے گلاس کو دور لان پر پھینک دیا، اور اپنی پیٹی سے ہتھکڑیاں نکالتے ہوئے بولا:

"تمہیں دروغ گوئی کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

سمندری ڈاکو نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور مجھے کھینچتا ہوا کلب کے گوشے گوشے میں لئے پھرا۔

ڈائننگ ہال سے کھانے کی کرسیاں اور میزیں ہٹا دی گئی تھیں اور وہاں کرکٹ کا میچ ہو رہا تھا۔ ہال کی لمبائی میں میٹنگ بچھا ہوا تھا، اور اس کے دونوں کناروں پر گیارہ گیارہ آدمیوں کی دو ٹیمیں کھڑی تھیں۔ ان ٹیموں میں تماشائی بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس طرح ہال میں ہجوم ہو گیا تھا، لکڑی کا ایک شش پہلو بلوک جس کی لمبائی دو فٹ اور قطر آدھا فٹ تھا۔ میٹنگ پر باری باری لڑھکایا جا رہا تھا۔ یہ بلوک سفید پینٹ کیا ہوا تھا اس کے پانچ پہلوؤں پر بڑے بڑے کالے اعداد میں رنز لکھی ہوئی تھیں۔ ایک پہلو پر ایک، دوسرے پہلو پر دو، تیسرے پر تین، چوتھے پر چوکا اور پانچویں پر چھکا، چھٹے پہلو پر آؤٹ لکھا ہوا تھا۔ ہر کھلاڑی باری باری لکڑی کا یہ بلوک میٹنگ کے ایک سرے پر کھڑا ہو کر اپنے پورے زور سے لڑھکاتا تھا۔ جب بلوک میٹنگ کے دوسرے سرے تک پہنچ کر رک جاتا تھا تو اس کے اوپر کے پہلو پر جو عدد لکھا ہوتا تھا۔ وہ کھلاڑی کا سکور تھا۔ دو، ایک، تین، چھکا، دو، چوکا، آؤٹ۔ جب بلوک کے اوپر کے پہلو پر آؤٹ آجاتا تھا، تو کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا تھا۔ اس طرح جب ٹیم کے سارے کھلاڑی کھیل چکتے تھے تو اس کے گیارہ کھلاڑیوں کے مجموعی سکور کے خلاف دوسری ٹیم کھیلنا شروع کرتی تھی۔ اس وقت جو ٹیم کھیل رہی تھی، اس کا سکور آٹھ سو چالیس تھا اور اس کے چھ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ آخری کھلاڑی نے تین سو پچاس رنز بنائی تھیں، جس میں دو چھکے تھے۔

بال روم میں دس بارہ جوڑے ڈانس کر رہے تھے۔ ان میں سے میں صرف مسز مسعود اور اس کے ساتھ ڈانس کرنے والے شخص کو جانتا تھا۔ یہ وہ شخص تھا، جس کے اعزاز میں مسز مسعود نے اپنے گھر پہ پارٹی دی تھی۔ وہ اس کو اپنا ہاتھ دکھانا چاہتی تھی۔ مسعود ایک کورس کے سلسلے میں انگلستان میں تھا۔ میں مسعود کی عدم موجودگی میں کسی پارٹی کے فیور میں نہیں تھا۔ لیکن مسز مسعود نے میری مخالفت کے باوجود وہ پارٹی دی۔ یہ شخص جو اپنے آپ کو پروفیسر چشتی کہتا ہے، ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کا ماہر تھا۔ وہ بڑی جلدی سارے مہمانوں خصوصاً عورتوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے مسز مسعود کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ ہاتھ کی لکیروں کو دیر تک غور سے دیکھتا رہا، اس کے ساتھ مہمان عورتیں اور مرد بھی مسز مسعود کے اوپر جھکے ہوئے غور سے اس کی ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ رہے تھے اور پروفیسر چشتی کی پیش گوئی کا بے قراری سے انتظار کر رہے تھے۔ سب نے سانس بند کر لیے، اور خاموشی گہری ہوتی چلی گئی۔ اس خاموشی سے پروفیسر چشتی کی آواز اس طرح ابھری جس طرح کسی قدیم یونانی مندر میں پیش گوئی کرنے والے دیوتا کی آواز ابھرتی ہے۔ "مسز مسعود آپ کی ہاتھ کی لکیریں بہت کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک بات بتاؤں گا۔" مسز مسعود نے کہا "بتایئے۔" پروفیسر چشتی نے کہا: "آپ کی لکیریں اس وقت جو سب سے زیادہ اہم بات کہنا چاہتی ہیں، وہ یہ ہے کہ آپ کے شوہر نامدار جونہی انگلستان سے واپس آئیں گے ان کا پروموشن ہو جائے گا۔" اس پیش گوئی پر کسی کو یقین نہ آیا۔ سب نے محسوس کیا کہ پروفیسر چشتی مسز مسعود کی بدیانتی اور چکن کری کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ مسعود بہت جونیئر تھا، وہ مجھ سے بھی جونیئر تھا۔ اس کا ریکارڈ بھی مجھ سے اچھا نہیں تھا، وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ اس کا تعلیمی معیار مجھ سے بہت نیچا

تھا۔ مسز مسعود اپنے بہترین لباس میں پروفیسر چشتی کے ساتھ لگی ہوئی خوش و خرم ڈانس کر رہی تھی۔ جب اُس نے مجھے سمندری ڈاکو کے پیچھے ہچکچاتے ہوئے دیکھا تو اس کے چہرے کے خطوط کہہ رہے تھے: اچھا ہوا، تم اسی قابل تھے۔

کلب کا تھیٹر خالی پڑا تھا۔ ہمیں اس میں سے گزر کر بار روم کی طرف جانا تھا۔ جب ہم اس میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ خالی نہیں ہے۔ اس کا آڈیٹوریم خالی تھا لیکن اس کا سٹیج خالی نہیں تھا۔ اس پر بھوکے، بیمار، بے کس طالب علموں کا گروہ علامہ اقبال کے ایک شعر کو ٹیبلو کی شکل میں پیش کر رہا تھا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

طالب علموں کے ننگے، کالے، سوکھے ہڈیوں کے ڈھانچے سٹیج پر اس طرح پڑے تھے جیسے گندم کے جلے ہوئے خوشے۔ اس ٹیبلو کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس ٹیبلو کو پیش کرنے والوں کو امید تھی کہ ان کو دیکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ خاموش، سنسان، خالی ہال کے درمیان کھڑے ہو کر میں نے خاموش زبان میں ان سے کہا: میں آ گیا ہوں، لیکن دوسرے لمحے سمندری ڈاکو مجھے کھینچ کر بار روم میں لے گیا۔

بار روم میں سات آٹھ پرانے موسم زدہ بڈھے اپنی اپنی پسندیدہ شرابوں کے گلاسوں میں اپنے ماضی کے رنگین نقوش دیکھنے کی، اور دوسروں کو دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لاؤنج میں عورتیں جمع تھیں۔ نوجوان لڑکیاں لیڈی ہیملٹن سے فیشن سیکھ رہی تھیں اور بڑی عمر کی عورتیں خانہ جنگی کی تاریخ اور فلسفے بیان کر رہی تھیں۔

برج روم اس دن تمبولا کے لیے استعمال ہو رہا تھا، جہاں بڑی رونق تھی۔ برج کے لیے باہر برآمدے میں میزیں لگا دی گئی تھیں۔

تمبولا کے ہجوم میں سے گزر کر ہم برآمدے میں آ گئے۔ جہاں کچھ ٹیبلوں پر برج ہو رہی تھی اور کچھ ٹیبلوں پر فلاش۔ یہاں میں نے انگلستان سے واپسی کے بعد مسعود کو پہلی دفعہ دیکھا۔ اس نے دیکھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے کہا: پروموشن مبارک ہو۔ وہ بولا! شکریہ! لیکن تم اتنے دنوں سے کہاں غائب ہو۔ مجھے واپس آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ تم نے شکل نہیں دکھائی۔ پھر وہ سمندری ڈاکو سے مخاطب ہو کر بولا: حضور والا! ان کو رہا کر دیجئے، یہ بالکل بے قصور ہیں۔ سمندری ڈاکو نے کہا: ان کو اس وقت تک رہا نہیں کیا جائے گا۔ جب تک یہ تسلیم نہ کریں کہ دنیا گول ہے۔ میں ان کو لے کر دنیا کے گرد چکر لگا رہا ہوں۔ جب میں ان کو لے کر اس مقام پہ پہنچوں گا، جہاں سے ہم چلے تھے تو میں ان سے پوچھوں گا کہ بتاؤ دنیا گول ہے یا نہیں۔ اگر انہوں نے یہ جواب دیا کہ ہاں دنیا گول ہے، تو ان کو رہا کر دیا جائے گا، یہ کہہ کر سمندری ڈاکو مجھے کشاں کشاں بلیرڈ روم میں لے گیا۔ ہم دیر تک بلیرڈ کھیلتے رہتے تھے۔ آج انگلستان سے واپس آنے کے ایک ہفتہ بعد مجھے بلیرڈ کی ایک بازی لگانے کو دل چاہتا ہے۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھ کر اس سے کہا: تمہیں معلوم ہے۔ وقت کیا ہے۔ رات کے تین بجے ہیں۔

بلیرڈ روم کلب کی مین بلڈنگ سے ہٹ کر نئے بلوک میں تھا۔ اس بلوک سے سوئمنگ پول تک بانسوں کی جالی تھی، جس پر انگوروں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بعد میں جب سوٹزرلینڈ سے نیا بلیرڈ ٹیبل بن کر آیا، تو اس کو مین بلڈنگ میں پرانے بلیرڈ روم کی بجائے اس بلوک میں رکھ کر ایک نیا بلیرڈ روم بنا دیا گیا۔ پرانے بلیرڈ روم میں اندھیرا تھا اور سیلن تھی۔ اس نئے بلیرڈ روم میں مغربی دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی جہاں سے شام

کو غروب آفتاب کا منظر بڑا پیارا لگتا تھا۔

بلیرڈ روم میں پوکر ہو رہی تھی۔ چمک دار آبنوسی ٹیبل کی سبز ملائم فلیٹ کی سطح پر فلڈ لائٹ کی تیز روشنی میں رنگ برنگے بلیرڈ بال بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ بلیرڈ کے کھلاڑی کھیل میں اس قدر محو تھے کہ انہیں ہمارے اندر داخل ہونے کی بھی خبر نہ ہوئی۔ اس سے پہلے سمندری ڈاکو مجھے جس جگہ بھی لے کر جاتا تھا، وہاں لوگ ہمیں دیکھ کر قہقہے مارتے تھے اور تالیاں بجاتے تھے، لیکن بلیرڈ روم میں عجیب بے اعتنائی تھی۔ عجیب خاموشی! عجیب پُراسراریت!

ہم بلیرڈ روم سے باہر آ گئے اور لان میں سے ہوتے ہوئے اپنے گروپ کی طرف چل پڑے۔

لان میں سے گزرتے ہوئے میں نے اپنی ہتھکڑیاں کھول کر سمندری ڈاکو کی پیٹی میں اڑس دیں اور اس سے مخاطب ہو کر بولا!

"او قاضی کے بچے، تو تو کہتا ہے کہ آج تک تیری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ پھر تو نے اس پارٹی میں آ کر عشا کی نماز کیوں قضا کی؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اس لیے قاضی کہتے ہیں کہ تو اپنی نمازیں قضا کرنے کا عادی ہے۔"

وہ بولا:

"کس نے کہا کہ میری عشا کی نماز قضا ہو گئی۔ میں عشا کی نماز پڑھ کر آیا تھا، اور تمہیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ پارٹی میری نماز میں حائل ہوتی ہے۔ پارٹیاں تو مجھے نمازوں کے اور بھی موقعے بہم پہنچاتی ہیں۔ پارٹی کے بعد میں تہجد کی نماز پڑھتا ہوں!"

ہم اپنے گروپ میں پہنچ گئے۔

کسی نے سمندری ڈاکو سے کہا۔

"کلب کی گورننگ باڈی کی ہنگامی میٹنگ ہو رہی ہے، ایک بیرا آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

سمندری ڈاکو نے حیرت زدہ ہو کر کہا:

"اس وقت گورننگ باڈی کی ہنگامی میٹنگ! اب ساڑھے تین بجے۔ اچھا میں جا رہا ہوں۔"

سمندری ڈاکو کلب کے آفس کی طرف چلا گیا۔

پھر سب نے مجھ سے یک زبان ہو کر کہا:

"آپ کے کاسٹنگ ووٹ کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا:

"کیا مطلب؟"

ان میں سے سب سے زیادہ چرب زبان نے کہا:

"بیوٹی کونٹسٹ میں مسز منظر اور مسز مسعود دوسرے نمبر پر ٹائی میں آ گئی ہیں۔ تمہارے کاسٹنگ ووٹ سے فیصلہ ہو گا کہ ان دونوں میں سے دوسرے نمبر پر کون ہو گا۔"

میں نے پوچھا:

"حسن کے اس مقابلے میں کُتیاں، بلیاں، عورتیں سب شامل تھیں؟"

ہلکی سی ہنسی۔

اُسی چرب زبان نے جواب دیا:

"نہیں، صرف عورتیں تھیں۔ شادی شدہ عورتیں۔"

میں نے کہا:

"پھر مسز مسعود اس مقابلے میں کیسی آگئی؟ وہ تو ایک حسین کُتیا ہے۔"

سب ہنس پڑے۔ ایک نے کہا:

"تو مسز مظفر جیت گئی۔"

پھر سب نے کہا۔

"ہاں، مسز مظفر اس بیوٹی کونٹسٹ میں دوسرے نمبر پر آئی ہے۔"

میں نے پوچھا:

"پہلے نمبر پر کون آئی ہے؟"

کئی یک زبان ہو کر بولے:

"تمہاری بیوی۔"

میں ایک بلند قہقہے میں پھوٹ پڑا، اور ہنستے ہنستے بولا:

"حضرات! آپ نے آج مجھے ایک بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ مدت ہوئی اپنی شادی کی پہلی رات کو مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ میری شادی ایک بہت خوب صورت لڑکی سے ہوئی ہے، اس کے بعد آج آپ نے مجھے یہ بات یاد کرائی ہے۔"

سب ہنسنے لگے۔

میں نے لاؤنج کی طرف دیکھا۔ مسز مسعود کو ایک اور آدمی ڈانس کے لیے لے گیا۔ میں لاؤنج میں بیٹھی ہوئی دوسری عورتوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں مسز مظفر کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"عثمان کو کوک ٹیل نے بالکل مرغا بنا دیا تھا۔ اس کے کندھے اور بھی اوپر کو اُٹھ گئے تھے۔ اس کی گردن اور بھی نیچے کو لٹک گئی تھی۔ اس کا ہاتھ کوک ٹیل کے گلاس کے بوجھ سے لرز رہا تھا۔

یکایک برآمدے کے بائیں کونے سے مسٹر اور مسز مظفر نمودار ہوئے۔

ہم سب نے مسز مظفر کو دیکھنے کے لیے مسٹر اور مسز مظفر سے تعارف کی خواہش ظاہر کی۔

ہمارا چرب زبان دوست تیزی سے آگے بڑھا۔ عثمان جو اس کے راستے میں تھا، اس سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ چرب زبان نے بلند آواز سے کہا:

"پروفیسر ساسانی، آپ اتنی جلدی واپس جا رہے ہیں، ابھی تو ساڑھے تین بجے ہیں۔"
پروفیسر ساسانی نے جواب دیا۔
"ہاں کچھ شرپسند لوگ بہت زیادہ پی گئے۔ اب خواتین کا زیادہ دیر تک یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔"
چرب زبان نے کہا:
"پروفیسر میرے دوست آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ اس سے بہتر موقعہ ان کو کبھی نہیں ملے گا۔ اس طرف تشریف لائیے۔"
مسز منظفر ساسانی دلہن کا مجسمہ تھی۔ جس میں کسی بُت پرست نے اپنی محبت کی شدت سے جان ڈال دی ہے۔ اور اپنے مرمر کے جسم پر ریشمی سونے کی ساڑھی پہن کر منظرِ عام پر آگئی تھی۔ میں اسے آتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور ایسا محسوس کر رہا تھا، جیسے میں کسی مقدس عبادت گاہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ جس کے گنبدوں پر منقش سونا چڑھا ہوا ہے۔ جب وہ ہمارے گروپ میں داخل ہوئی تو اس کے ساتھ خوشبوؤں کا کارواں آیا۔
عثمان جس کو کوک ٹیل نے مرغا بنا دیا تھا، اپنی آنکھیں بند کیے پنڈولم کی طرح جھوم رہا تھا۔ جب خوشبوؤں کا کارواں اس سے ٹکرایا۔ تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مسز منظفر ساسانی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اور پھر جب ساڑھیاں اور بلاؤز فضا میں تیرنے لگیں تو اس نے آنکھیں بند کرلیں۔
چرب زبان نے ہمارے گروپ کے سب ممبروں کا پروفیسر منظفر ساسانی سے تعارف کرایا، پھر پروفیسر منظفر ساسانی کا تعارف کراتے ہوئے اُس نے کہا:
"اور یہ پروفیسر منظفر ساسانی۔ ہمارے ملک کے مشہور سوشل ورکر اور یہاں کے ایک اہم کالج کے معتدد پروفیسر۔ انہوں نے ہی آج طالب علموں کے ایک گروہ کو دعوت نامے بھیج کر ان کو فینسی شو میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ انہوں نے ہی طالب علموں کے فینسی ڈریس کے ذریعے آج یہاں اپنے ملک کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ محترمہ ——"
یہاں چرب زبان کی زبان بند ہوگئی۔ پروفیسر ساسانی نے اس کی مدد کی اور محترمہ کا تعارف کرایا۔
"یہ ہیں میری وائف!"
یکایک عثمان کی آنکھیں کُھلیں۔ اور اُس نے مسز منظفر ساسانی کو دیکھتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ میں کہا۔
"طوائف: طوائف کہاں ہے؟ طوائف یہاں کیا کر رہی ہے؟"
میں جھنجلا اٹھا اور چلایا:۔
"شٹ اپ یُو ایڈیٹ۔ انہوں نے وائف کہا ہے۔ طوائف نہیں کہا۔"
اور اس سے پہلے کہ میں مسٹر اور مسز ساسانی سے معذرت کرتا، وہ اپنی کار کی طرف چلے گئے۔
ان کے جانے کے بعد چرب زبان نے بلند آواز سے احتجاج شروع کیا۔
"غضب ہوگیا۔ یہ کتنی بڑی بداخلاقی تھی۔ اب پروفیسر ساسانی سے میرے تعلقات بگڑ جائیں گے۔ یہ بہت بُرا ہوا۔"
میں نے کہا:

یار، چھوڑو۔ بات کا تبنگڑ مت بناؤ۔ ایک شرابی کی زبان پھسل جانے سے مسز ساسانی طوائف نہیں بن جائے گی۔"

چرب زبان نے جواب دیا:

"اگر تم اس واقعے کی بیک گراؤنڈ سے واقف ہوتے تو یہ بات نہ کہتے۔"

میں نے کہا:

"تو بتاؤ نا بیک گراؤنڈ؟"

چرب زبان نے کہا:

"مسز منظور ساسانی ایک طوائف ہے۔ نہیں میں غلط کہہ رہا ہوں مجھے کہنا چاہیے کہ مسز منظور ساسانی ایک طوائف تھی۔ پروفیسر ساسانی ایک بے لوث سوشل ورکر ہیں۔ انہوں نے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایک دن ان کے پاس ایک طوائف آئی اور بولی وہ گناہوں کی زندگی سے تنگ آ چکی ہے۔ اور اب وہ معاشرے کی ایک مفید ممبر بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ منظور ساسانی نے اس کی کسی اچھے گھرانے میں شادی کرانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کے سب دوستوں نے ایک طوائف سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر ان کو خود اس سے شادی کرنی پڑی۔"

میں مزید معلومات کے لیے کچھ اور کہنا چاہتا تھا، لیکن ایک بٹلر نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس نے میرے کان میں کہا: مسعود صاحب آپ کو بلیرڈ روم میں بلا رہے ہیں۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا: اچھا میں جا رہا ہوں۔

بلیرڈ روم میں مسعود اکیلا بلیرڈ کھیل رہا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس نے سپوٹ بال سے سرخ اور سفید بلیرڈ بال کا ایک کینن سکور کیا اور سرخ بال کو دائیں پاکٹ میں پوٹ کر دیا۔

میں نے کہا:

"ویل ڈن"

وہ اپنا کیو لے کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بلیرڈ ٹیبل کے کنارے پر پڑے ہوئے نیلے چاک کو اپنے کیو کے سرے پر رگڑتے ہوئے بولا:

"تم جانتے ہو، یہ کلب اپنا برتھ ڈے منانے کے لیے اپنے مہمانوں کو تمام رات اپنی آغوش میں رکھتی ہے۔ رات کو انہیں شاندار ڈنر دیتی ہے۔ ساری رات ان کی قیمتی شرابوں سے تواضع کرتی ہے اور صبح کو ناشتہ دینے کے بعد ان کو الوداع کہتی ہے۔ ایسی پارٹیوں میں جہاں رت جگا ہوتا ہے، میں صرف بلیرڈ کی مدد سے جاگتا ہوں۔ اب ہم یہاں صبح تک بلیرڈ کھیلیں گے۔

معلوم نہیں، ہم کب تک بلیرڈ کھیلتے رہے، بالکل چاپ چاپ، بالکل خاموش۔

پھر مسعود نے کہا:

"یار، تم چپ چپ کیوں ہو؟ کیا تمہاری ماں مر گئی؟"

میں نے کہا:

"نہیں، ابھی زندہ ہے۔"

وہ بولا :

"کیا تم اپنی بھابی سے خفا ہو؟"

"کون بھابی؟ مسز مسعود؟"

"ہاں مسز مسعود، میری بیگم، تہاری بھابی۔"

"نہیں، اب وہ میری بھابی نہیں ہے۔ مسز مسعود ہے۔"

"اور کے، مسز مسعود، میں نے انگلستان جانے سے پہلے تمہیں اس کا نگران مقرر کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اپنے فرائض کامیابی سے انجام نہیں دیئے، کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

اس وقت میں میز پر جھکا ہوا تھا۔ میرا کیو میرے بائیں ہاتھ کے سٹینڈ پر تھا، اور میں اپنی سفید بلیرڈ بال کے اوپر کے حصّے کو سٹرائک کر کے ایک تیز رفتار کینن بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں کینن کا خیال چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا :

"مسعود، کیا تم مسز مسعود کو جانتے ہو؟ تم مسز مسعود کے شوہر ہو۔ کیا تم مسز مسعود کے شوہر کی حیثیت سے اپنے فرائض کامیابی سے انجام دے رہے ہو؟ کیا تم مسز مسعود کو جانتے ہو؟"

مسعود نے جواب دیا :

"یہ بڑا نامعقول سوال ہے اور تمہیں اس سوال کا جواب معلوم ہے۔"

"ہاں میں اس سوال کا جواب جانتا ہوں، اور میں یہ جانتا ہوں کہ تم مسز مسعود کو نہیں جانتے۔"

"تو اے شیکسپیئر کے بچے، تو میری رہنمائی کر اور مجھے بتا کہ مسز مسعود کون ہے۔؟"

میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور بولا :

"مسز مسعود ایک آدم خور عورت ہے۔ اگر تمہارے انگلستان جانے سے پہلے مجھے یہ بات معلوم ہوتی تو میں کبھی اس کا نگران بننے کی ذمّہ داری نہ لیتا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ اس کی خاموشی کمرے کی خاموشی میں جذب ہو گئی۔ ہم کمرے کی خاموشی کا ایک حصّہ بن گئے۔ یہ خاموشی اس وقت بھی موجود تھی جب اس نے دوسری گیم جیت کر میری پہلی گیم واپس کر دی اور ہم برابر ہو گئے۔ اس نے تیسری گیم کے لیے سکور بورڈ پر انڈیکیٹر رول کو زیرو پر لاتے ہوئے کہا :۔

"یہ تمہارے آدم خوروں کا معمہ میری سمجھ میں نہیں آیا، اچھا، اس کو چھوڑو، میں اس کو حل نہیں کر سکوں گا، ایک اور معمہ ہے اس سے بھی مشکل اور عجیب۔ تم نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا : میں تمہاری فیملی کی دیکھ بھال کی ذمّہ داری مزید برداشت نہیں کر سکوں گا، بھابی کو راہگیروں پر مجرمانہ حملوں کا مرض ہو گیا ہے۔ اور گدھے کے سینگ! یہ کیا بکواس ہے؟ کیا تم کسی ایک راہگیر کی مثال دے سکتے ہو جس پر

میری بیوی نے مجرمانہ حملہ کیا ہو؟

میں نے جواب دیا۔

"مجھ پر!"

"تجھ پر۔ او گدھے کے سر! تجھے میری بیوی نے ریپ کرنے کی کوشش کی۔ تو نے کبھی اپنی شکل آئینے میں دیکھی ہے؟"

"ہاں اُس رات کو۔ تمہارے بیڈ روم میں، تمہارے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں میری شکل بڑی مکروہ نظر آ رہی تھی۔ میں حیران تھا بھابی کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس نے میری ٹائی پکڑلی۔ وہ مجھے ٹائی سے پکڑ کر تمہارے خالی بیڈ کی طرف کھینچ رہی تھی اور میں دروازے کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا، میں دبی ہوئی آواز میں چلا رہا تھا، بھابی! مسعود میرا دوست ہے، تم میری بھابی ہو۔ تم میری بہن ہو۔ پھر اچانک ٹائی پھسل کر بھابی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، بھابی بستر پر جا گری۔ میں دروازے سے باہر نکل کر بھاگا۔ دوسرے دن اس نے تمہیں خط لکھا کہ میں نگران کی حیثیت سے اپنے فرائض کامیابی سے انجام نہیں دے رہا ہوں اور مجھے ٹیلی فون کیا۔ کل تم نے میری بڑی توہین کی ہے۔ میں انتقام لوں گی۔ اس نے انتقام لیا سول سرجن امین چشتی نے جس کو لوگ ہاتھ کی لکیروں کا ماہر ہونے کی وجہ سے پروفیسر چشتی کہتے ہیں، اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھیں، اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بھابی سول سرجن کے ہسپتال میں اپنڈیسائٹس کے اوپریشن کے لیے دس دن تک داخل رہی۔ اپنڈیسائٹس کا اوپریشن ایک بہانہ تھا۔ اصلی وجہ کچھ اور تھی۔ ہسپتال سے باہر آ کر بھابی مجرمانہ حملوں کی مریض ہو گئی۔"

مسعود پر گہری خاموشی چھا گئی۔

بہت دیر کے بعد مسعود نے خاموشی کا طلسم توڑا۔

"اب تم یہ جاننا چاہتے ہو گے کہ میں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتا ہوں، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے تو خود تمہاری بھابی کو اس کی اجازت دی تھی۔"

میں حیران ہو گیا۔

"تم نے خود اس کو اجازت دی تھی؟"

"ہاں، میرے انگلستان جانے سے کچھ عرصہ پہلے اس نے مجھے کہا۔ میں جانتی ہوں، انگلستان میں عورتوں کے چنگل سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ میں آپ کو اچھا وقت گزارنے کے لیے سب کچھ کرنے کی اجازت دیتی ہوں۔ صرف آپ سے یہ وعدہ چاہتی ہوں کہ آپ وہاں سے کوئی میم لے کر نہ آئیں۔ میں نے اس کی فراخ دلی کے ردِ عمل میں اس سے کہا: میں جانتا ہوں تمہیں میرے بغیر ایک رات گزارنا بھی مشکل ہے خدا جانے تمہارا ایک سال کیسے گزرے گا۔ اگر تمہیں میری یاد بہت ستانے لگے اور تمہیں راتوں کو نیند نہ آئے۔ تو تم میرے خالی بستر پر کسی کو سونے کی اجازت دے سکتی ہو۔ اخلاق کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ میری بیوی اور میرے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، وہ تو ٹولرنس کی آخری سرحد ہے۔ جو شاید ہماری تہذیب میں کبھی داخل نہ ہو سکے۔ اور تم نے اخلاق کے جس بلند معیار کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ پر بہت تعریف کے قابل ہے۔ لیکن شاید کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم اس کا مطالبہ پورا کر دیتے اور اس کو بھنور سے بچا لیتے۔ جس میں وہ غرق ہوتی جا رہی ہے۔"

اس کے بعد یکایک ہماری گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

بلیرڈ روم کے مغربی شیشے کی دیوار پر ایک پتھر ٹکرایا اور شیشے تڑاخ تڑاخ فرش پر گرنے لگے۔

مسعود گھبرا گیا۔ اس نے اپنا کیو ٹیبل پر پھینک دیا اور دروازے کی طرف بھاگا۔

معلوم ہوتا ہے کلب میں بلوہ ہو گیا ہے۔ تمہاری بھابی ڈر جائے گی۔ میں جا رہا ہوں۔"

مسعود ایک دروازے سے نکل کر مین بلڈنگ کی طرف بھاگ گیا۔

دو اور پتھر شیشے کی دیوار سے ٹکرائے، تڑاخ تڑاخ تڑاخ تڑاخ فرش پر شیشوں کا ڈھیر لگ گیا۔

میں اکیلا بلیرڈ روم میں کھڑا ہوا یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پتھر کدھر سے آ رہے ہیں۔ باہر سوئمنگ پول کے کنارے ٹیوب لائٹوں کی روشنی تھی۔ بانس کے پودوں اور انگور کی بیلوں میں سیمنٹ کے بنچوں کے پاس بجلی کے تیز قمقمے جل رہے تھے۔ درختوں اور پھولدار جنگلی جھاڑیوں میں فیری لائٹس جھلملا رہی تھیں۔

پتھروں کی ایک اور بوچھار نے شیشے کی ساری دیوار چکنا چور کر دی۔ اب شیشے کی دیوار کے چاروں دروازے استعمال کے قابل نہیں رہے تھے۔ اب میں صرف سوئمنگ پول کی طرف باہر نکل سکتا تھا۔ میں شیشے کے ٹکڑوں سے بچتا ہوا اندرونی دروازہ کھول کر سوئمنگ پول کی پویلین میں آیا اور کلوک روموں اور باتھ روموں کے پاس سے گزرتا ہوا باہر سوئمنگ پول کے سامنے انگور کی بیلوں کی جالی میں نکل آیا، وہاں سے نکل کر میں بانس کے پودوں کی طرف چل پڑا۔ بانس کے پودوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سیمنٹ کے بنچ تھے جو نئے شادی شدہ جوڑوں اور کورٹ شپ کرنے والے لڑکیوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ میں ان بنچوں میں سے ہوتا ہوا کلب کی مین بلڈنگ کی طرف جا رہا تھا۔

جب میں بانسوں کے قدرے لمبے اور گھنے پتوں میں چھپے ہوئے ایک بنچ کے پاس پہنچا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔

بنچ پر ایک لڑکی کی لاش پڑی تھی، سترہ اٹھارہ سال کی جوان لڑکی کی لاش، وہ بالکل ننگی تھی، اس کے پھٹے پرانے کپڑے بنچ کے پاس پڑے تھے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے اوپر رومال باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اس کی دونوں ٹانگیں بنچ کی دونوں طرف لٹک رہی تھیں، اس کے دونوں ہاتھ اس کی دونوں رانوں پر تھے اور بنچ کے درمیان ہلکے سبز موزیک پر خون جما ہوا تھا۔

میں جلدی جلدی کلب کی مین بلڈنگ کی طرف بڑھا۔

مین بلڈنگ کی دوسری طرف کلب کے ان حصوں میں جو لکڑی کے بنے ہوئے تھے آگ لگی ہوئی تھی۔ کلب کے فرنٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور پڑے تھے۔ بہت سی کاروں سے جو کلب سے کچھ فاصلے پر پارک تھیں، شعلے بلند ہو رہے تھے، کلب کے سامنے سڑک پر کچے مکانوں اور جھونپڑیوں سے لوگ آ کر جمع ہو گئے تھے۔ اور شور مچا رہے تھے۔

"ہماری لڑکی کہاں ہے؟" — "ہماری لڑکی واپس کرو" — کلب کا سیکرٹری دور سے ایک بلند مقام پر کھڑا ہوا انہیں کہہ رہا تھا:

"یہاں کوئی لڑکی نہیں، یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ آپ اپنے گھروں کو جائیے، ہم نے پولیس کو رپورٹ کر دی ہے۔ آپ پولیس کے آنے سے پہلے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔" پولیس کی چار مسلح لاریاں کنسٹیبلوں سے بھری ہوئی آ کر کلب کے سامنے رکیں۔ پولیس کنسٹیبلوں نے اپنی رائفلوں کے ساتھ کلب کے چاروں طرف پوزیشنیں لے لیں۔ اور فائر بریگیڈ کے انجن آ کر آگ بجھانے میں مصروف ہو گئے۔

اور میں گورننگ باڈی کے ممبروں سے گفت و شنید کرنے کے لیے کلب کے آفس کی طرف چلا گیا۔

آسیب کا محل

ڈاکٹر احسن فاروقی

دن بھر کا تھکا ماندہ شام ہوتے وقت میں اس گاؤں میں پہونچا۔ یہ گاؤں ایک پہاڑی کے پاس ایک اونچا ٹیلہ کے نیچے آباد تھا، اور ٹیلے کی چوٹی پر ایک بہت بڑا محل بنا تھا جو شام ہوتے وقت کے اندھیرے میں بڑا ہی وحشت زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے گاؤں سے محل کو اور محل سے گاؤں کو کئی دفعہ نظر اٹھا اٹھا کر دیکھا۔ گاؤں میرے اندر ایک خوشی کا جذبہ پیدا کرتا تھا، کیونکہ بہر حال یہاں آدمی تھے اور مجھے اپنی بھوک پیاس بجھانے اور آرام سے لیٹ جانے کی جگہ ملنے کی امید تھی۔ مگر محل کو دیکھ کر سب جذبات ٹھنڈے ہو جاتے اور ایک پُر اسرار افسردگی میرے دل پر چھانے لگتی تھی۔ اس وقت مجھے اس تضاد کا کچھ زیادہ احساس نہ ہوا اور میں شوق میں جتنی جلدی ہو سکتا تھا، گاؤں کی طرف بڑھتا گیا۔

وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ لوگ ایک کچے مکان کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے ان کے پاس جا کر کہا "بھئی میں شکار پر نکلا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ صبح سے یہ وقت آگیا ہے۔ میں بھوکا ہوں پیاسا ہوں اور رات ہو رہی ہے اگر کہیں ٹھہرنے کی جگہ ممکن ہو تو بتاؤ۔"

ان لوگوں نے آپس میں اور ہی زبان میں بات چیت کی جو میں نے نہ سمجھی۔ مگر وہ یہ جان کر کہ میں شہر کا آدمی ہوں مجھ سے دیہاتی ملی ہوئی اردو میں بولنے لگے۔

"کھانے پینے کا انتظام ہوئی جائے گا۔ اکٹھا آنے دیجیے" ایک بولا۔

"محل سونے کی ٹیڑھی کھیر ہے" دوسرے نے کہا۔

"ارے ہاں ابے رحموا۔ تو ان کا محل ماں نہ سلائے لے جا؟"

"کوئی بات نہیں" وہ شخص بولا جس کو رحموا کہہ کر متوجہ کیا گیا تھا اور پھر میری طرف رخ کر کے بولا "صاحب۔ آپ کا ہواں سب آرام مل جائے گا۔ مسہری، بستر، لحاف سب ہیں۔"

"جو کچھ تم کہو گے میں دے دوں گا۔ کتنے پیسے ہوں گے۔ ابھی لے لو۔"

"پیسے کی کوئی بات ناہیں جو جی ہو وئے دینا۔ کل۔ ۔ ۔" اور یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ میں نے اس کو غور سے دیکھا، اس نے کہا "کچھ ناہیں چلو ہمرے ساتھ اب رات ہونے والی ہے۔"

اتنے میں دوسرا آدمی میرے لیے ایک پیالے میں سالن اور ایک تھالی میں روٹیاں لے کر آیا اور ایک کھری کھٹیا پر جو قریب پڑی ہوئی تھی رکھ کر بولا "آئیے کھانا کھائیے۔"

میں نے وہ بد مزا کھانا بھوک کی وجہ سے بہت بھر کر کھایا اور پانی پی کر رحموا کے ساتھ چلا۔ اندھیرا اتنا نہیں چھایا تھا کہ راستہ دکھائی نہ دیتا۔ ٹیلے پر رکھا ہوا محل بہت ہی زیادہ سیاہ نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ اس طرف ہی سے ٹیلے پر چڑھ کر ہم تب پہنچ جائیں گے، مگر رحموا بولا:

"یوں تو پچھواڑا ہے۔ ہم لوگ پھاٹک سے جائیں گے۔"

چنانچہ ہم نے ٹیلہ کا چکر لگایا اور دوسری طرف ایک پھاٹک پر پہنچے جو بالکل زمین پر بنا تھا اور جس سے اونچی اونچی دیواریں ٹیلے کے اوپر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ دیواریں اتنی اونچی تھیں جتنی اونچی میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ اندھیرے کے باوجود ان میں ہر جگہ رخنے دکھائی دیتے اور یہ محسوس ہوتا جیسے کہ وہ دانت نکال رہی ہیں۔ ان کی شکستگی کا عالم ظاہر تھا مگر ان کی دبازت اس کی ضامن تھی کہ وہ ہزاروں برس اسی طرح کھڑی رہیں گی۔ پھاٹک بھی قلعوں کا سا تھا۔ جس میں ہاتھی معہ انباری عماری و ہودے کے نکل جاتا۔ اوپر نوبت خانہ بنا تھا۔ پھاٹک کے پٹ بڑی موٹی لکڑی کے تھے اور ان میں برابر بھالے لگے تھے۔ بائیں پٹ میں ایک چھوٹا پھاٹک تھا جس کو رحمو نے کھولا اور ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ ایک چڑھتی ہوئی سڑک پھاٹک سے محل کو جا رہی تھی اور اس کے اِدھر اُدھر باغ بغیچے تھے جو دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے کھر جھاڑ ہو گئے تھے۔ بائیں طرف مجھے ایک سنگ مرمر کی بارہ دری بھی نظر آئی جس کا رنگ اندھیرے کی بنا پر مٹیالا معلوم ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی زمانے میں یہ نشاط باغ ہو گا، اور میں نے رحمو سے کہا:۔

"یہ باغ بارہ دری وغیرہ تو بہت اچھے ہوں گے۔ ان کو اس حالت میں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔"

"بارہ دری۔ ہاں بارہ دری۔ اس کے ادھر ایک نہر بھی ہے۔ مگر اس کا پانی سڑ رہا ہے اور اس میں کیڑے ہیں۔ میں تو ادھر جاتا بھی نہیں۔"

اس طرح باتیں کرتے ہوئے ہم بالکل اوپر پہنچ گئے۔ ایک بہت بڑا برآمدہ محل سے آگے کو نکلا ہوا سامنے آیا، اس کے پیچھے ایک کمرہ تھا، جس کے بڑے بڑے دروازے بند تھے۔ اس کے بائیں ایک دروازہ تھا جس کو رحمو نے کھولا اور ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑا لق و دق صحن سامنے آیا جس کی زمین کچی تھی۔ قلعہ کی دیوار پر یہاں لوہے کے کٹہرے لگے تھے جن کے پاس آ کر گاؤں کا اس طرف کا حصہ دیکھا جا سکتا تھا۔ صحن پار کر کے ایک بڑا لمبا برآمدہ آتا تھا جس میں ایک جگہ پر ایک بڑا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے پاس مٹی کے تیل کی لالٹین رکھی ہوئی تھی، جس کو اٹھا کر رحمو نے جلایا۔ پھر دروازہ کھولا اور ہم دونوں ایک غلام گردش میں داخل ہوئے جو بڑا تاریک تھا اور کافی لمبا بھی تھا۔ اس میں سے نکل کر پھر ایک کھلا صحن پڑا جس کی دیواریں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور جہاں سے گاؤں کا وہ حصہ دکھائی دیتا تھا جہاں میں پہلے پہنچا تھا۔

رحمو دیوار کے پاس آ کر ہم لوگوں کے کمر کمر اونچی تھی بولا "دیکھو۔ وہ ہمارا گھر ہے۔ ہوان تم آئے رہو۔"

مجھے کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ گاؤں کے چراغ ٹمٹماتے ہوئے نظر آئے۔ صحن کے اس طرف جدھر سے ہم آئے تھے۔ ایک بہت بڑا برآمدہ تھا اور اس کے پیچھے ایک سات دروازوں کا کمرہ تھا۔ ہم ان میں سے بیچ کے دروازے پر پہنچے جس کو رحمو نے کھولا اور ہم اندر گئے۔ لالٹین کی روشنی میں یہ ایک بہت بڑا کمرہ دھندلا سا سامنے آیا۔ رحمو لالٹین لیے ہوئے ایک دیوار کے پاس گیا۔ جہاں ایک بہت بڑا لیمپ ایک اونچی اور چوکی میز پر رکھا تھا۔ اس نے اسی لیمپ کو جلایا اور کمرہ روشن ہو گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ ساتوں دروازوں پر کمخواب کے زرد اور میلے پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر مینا کاری تھی جو جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی۔ زمین سے چند فٹ کی اونچائی تک چاروں طرف لکڑی لگی تھی جس کی پالش کب کی جا چکی تھی اور جس میں کیڑا لگنے کے بھی آثار نمایاں تھے۔ اوپر قد آدم تصویریں لگی تھیں۔ اور ان کے بیچ بیچ میں قد آدم آئینے بھی تھے۔ تصویروں کے زرد سنہرے ہوں گے مگر اب جگہ جگہ ان پر سیاہی آ گئی تھی۔ زمین پر ایک ایرانی قالین پورے کمرے کے فرش پر بچھا تھا۔ داہنی دیوار کے قریب ایک بڑا چھپر کھٹ تھا

جس کے پاس ایک دروازہ نظر آتا تھا۔ جو پاس کے کمرے میں بھی کھلتا تھا۔ دوسری طرف دیوار سے کافی ہٹ کر گدّے دار کرسیاں، بید کی بنی ہوئی آرام کرسیاں اور چھوٹی کرسیاں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔

رتھوا بولا۔ "اس چھپر کھٹ پر میں سوتا ہوں۔ آپ بھی ایک طرف لیٹ رہیے گا۔ بہت بڑا ہے پانچ آدمی لیٹ جائیں

چھپر کھٹ کے پردے غائب ہو چکے تھے مگر اوپر کا فریم دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر نہایت عمدہ بستر اور تکیہ رکھے تھے اور سپید چادر بھی تھی۔

میں نے کہا "یہ بستر ہی اس تمام محل میں صاف اور نیا معلوم ہوتا ہے"

"ہاں حکم ہے کہ بستر روز بدلا جایا کرے۔ جیسے نواب کی زندگی میں بدلا جاتا تھا۔ اب روز تو کیا آٹھویں میں ضرور بدل دیتا ہوں۔ آج ہی بدلا ہے" اور وہ پھر رک کر بولا "روشنی ٹھیک ہے نہیں تو جھاڑ جلاؤں"؟

اب میں نے چھت کی طرف دیکھا بہت بڑے بڑے گاڈروں پر وہ چھت رکی تھی اور بیچ کے گاڈر کے بیچ میں ایک سو بتی کا سُرخ جھاڑ تھا جس کے کنول پانچ قطاروں میں نیچے سے اوپر جا رہے تھے۔

"اتنے بڑے جھاڑ کو جلانا آسان ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کا ہے۔ سب کنولوں میں موم بتیاں ہیں اور ادھر تار لگا ڈنڈا رکھا ہے اس کے گوٹے کو جلا کر ایک منٹ میں سب روشنی ہو جاتے ہیں۔ حکم ہے چاروں لیمپ اور جھاڑ روز ضرور جلے مگر میں ایک لیمپ جلا لیتا ہوں"

اب میں نے دیکھا کہ جیسا لیمپ روشن تھا ویسے تین اور دیواروں کے قریب رکھے تھے۔ ایک چھپر کھٹ کے سرہانے تھا۔ ایک اس کے مقابل والے کونے میں تھا اور ایک ادھر تھا، جدھر دروازے کھلتے تھے۔

تھکا ہونے کی وجہ سے میں نے کوٹ اتارا۔ برجیس ڈھیلی کی اور چھپر کھٹ پر لیٹ رہا۔ رتھوا بھی چھپر کھٹ کے کنارے بیٹھ گیا۔ ہم نے کہا "تم نہیں لیٹو گے؟"

"میں بہت رات گئے لیٹتا ہوں۔ نیند بہت کم آوت ہے میاں۔ دن ماں گھر ماں سووت ہوں"

تھکے ہونے کے باوجود مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بات نکالنے کے لیے اس سے پوچھا "یہ قلعہ کس کا ہے اور اس حالت میں کیوں ہے؟"

"کس کا؟ یو لمبا کمرہ ہے۔ دیکھو۔ جو تصویر ہے۔ یو پہلے نواب کی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں ایک مندر تھا۔ شاہی میں ان نواب نے اس کو ڈھیر کر دیا۔ بہت بڑا مندر۔ دھرم شالا، باغ سب کچھ تھا۔ نواب نے ایسا ڈھایا کہ سب برہمن پجاری، دیوداسی سب کی سب دب کر رہ گئیں۔ کہتے ہیں کہ نہ ہوں گی تو ونڈ سولا شیں اس ٹیلے کے نیچے ہوں گی، جس پر ان نواب نے یہ محل بنایا، ان کی ارواح بہت لوگوں نے دیکھی ہیں۔

"تم نے بھی دیکھیں؟"

"میں نے کبھی نہیں دیکھیں، مگر میرے دادا نے دیکھی تھیں۔ وہ بتایا کرتے تھے۔ باپ نے کہا کہ اب وہ سب بھسم ہو گئی ہوں گی۔

مجھے کہاں دکھائی دیتیں اب مجسم ہوگئیں۔ ہاں تو ان کے بعد یہ نواب ہوئے" اس نے ایک اور تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "اور پھر یہ اور پھر یہ اور آخری پانچویں یہ"

میں نے اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ لیمپ کی روشنی اسی پر پوری پڑ رہی تھی۔ تصویر کی آنکھیں بالکل زندہ آدمی کی آنکھیں معلوم ہوئیں میں نے نظر ہٹا کر رحمو کی طرف کی "یہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں"

"ہاں انیس ۱۹ برس کے تھے جب مر گئے۔ اب کوئی بیس برس ہونے کو آتے ہیں"

"ان کے کوئی اولاد نہیں ہے؟"

"اب کیا بتاؤں۔ ازار بند کے بڑے ڈھیلے تھے۔ نہ معلوم کتنی اولادیں گاؤں والیوں سے شہر والیوں سے ہوئیں۔ پر سب کی سب ناجائز"

"کوئی جائز شادی نہیں کی؟"

"ایک بیگم آئیں۔ تو اب کیا بتاؤں۔ ان سے ایک لڑکی ہوئی۔ پھر ایک لڑکا ہوا۔ لڑکا تین برس کا ہوگا۔ بڑے لاڈلے تھے۔ ولی عہد بہادر۔ مگر ایک دن کھڑے کھڑے گرا اور بھیٹ سے دم نکل گیا۔ بیگم بہت روئیں اور آٹھ دن میں وہ بھی مر گئیں۔ نواب اب ہائے ہائے کرتے۔ لکھنؤ گئے۔ وہاں ایک چچیرے بھائی کے یہاں رہے۔ خونریزہ ہوا۔ نہ معلوم کیا ہوا، نعش یہاں آئی۔ ایک لڑکی رہ گئی۔ چچیرے بھائی نے اپنے لڑکے کے ساتھ شادی کرنے کے مارے ان کو زہر دلوا کر مروا ڈالا"

"مگر اس کا کچھ ہوا نہیں"

"کیا ہوتا۔ ڈاکٹر سے دوا میں زہر دلوا دیا۔ کون جان سکتا ہے۔ مگر ان چچیرے بھائی کو بھی کچھ نہ ملا۔ لڑکی کو ماموں لے گئے ڈپٹی کمشنر کے زور پر اور پھر اپنے لڑکے سے شادی کر کے ولایت بھیج دیا۔ وہ دونوں وہیں ہیں اور وہیں رہیں گے"

"یہاں کیوں نہیں آتے؟"

"یہاں اب کیا ہے۔ یہ ٹوٹا محل۔ اس میں نہیں آئیں گے۔ اس میں آسیب ہے۔ بس اس کی چھاجت کا روپیہ مجھ کو مل جاتا ہے اور روشنی کا خرچہ اور حکم"

"آسیب کیسا؟ تم تو کہتے ہو کہ برہمنوں کی روحیں مجسم ہوگئیں اور ان کو مارنے والے کی پانچ نسلیں چلیں"

"یہ سب ٹھیک ہے پر یہ نواب بس اب کا کہن۔ ان کی روح نہ سرکئے۔ سارا کیا دھرا ان کا ہے"

"انہوں نے کیا کیا تھا"

"کام نہیں کیا تھا۔ اور ایک دفعہ بیٹی داماد آ کر یہاں رہے۔ بس صبح ہی کو بھاگ کھڑے ہوئے۔ چلے گئے ولایت کہ نہ ہندوستان میں ہوں گے اور نہ گھر آئیں گے۔ معلوم نہیں اس ایک رات میں انہیں کیا دکھائی دیا کہ پھر نہ پلٹے"

"یہ عجیب بات ہے۔ مگر تم کو بھی نہیں معلوم کہ کیا ہوا تھا"

"اپنی اپنی سب کہتے ہیں۔ نواب صاحب کی لاش یہاں آئی تھی۔ پاس کے توشہ خانے میں رکھی رہی۔ ریاست کے جگر گڑے تھے

بو آنے لگی۔ انگریز نے اُٹھوا کر دفن کرائی۔ گاؤں کے ادھر مڑ دار ٹ ہے۔ اسی میں دفن ہیں۔ مگر سید کی بد دعا۔ خدا بچائے۔ یا اللہ معاف کرنا میرے گناہوں کو۔ میں گنہگار بندہ ہوں اللہ توبہ" اس نے اپنے کان پکڑے اور مُنہ پر طمانچے لگائے۔"

"آخر یہ سب ہوا کیا تھا۔ جس سے تم اس قدر خوف زدہ ہو" میں نے پوچھا۔

"اس کمرے میں کوئی نہ رہ پایا۔ سوائے میرے بیٹی داماد چلے گئے۔ مگر حکم یہ کر گئے کہ اسی کمرے کو ٹھیک رکھا جائے اور ایک آدمی اس میں رہے۔ نہ معلوم کتنے آدمی بدلے گئے۔ وہ بدھوا تو رات کی کو بھاگا بکتا ہوا" ارے وہ ٹھوکر مارت ہیں۔ ٹھوکر مارت ہیں" اور دس آدمی اور بدلے گئے ہوں گے۔ مگر سب ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"کیا اسی کمرے میں یہ آسیب ہے یا پورے محل میں؟"

"بیٹی داماد کہیں اس کمرے میں تھوڑے رہے تھے۔ ایسے نہ ہوں گے تو بیس کمرے تو ضرور ہوں گے اس محل میں۔ مگر کیا معلوم انہوں نے کیا دیکھا کہ سارا محل ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ سب کمرے خالی ہیں، سب میں جالے لگے ہیں، سانپ بچھو رہتے ہوں گے۔ باہر کا پلستر گر رہا ہے دیواروں پر گھاس اُگ رہی ہے۔ بس اس کمرے کی حفاظت کا حکم ہے۔ کون جانے کیا آسیب ہے مگر اللہ سے بھاگ کے کوئی کہاں جا سکتا ہے سید کی بد دعا۔ آلِ رسول کی بد دعا اور وہ نجیب الطرفین سید تھے۔ دیکھو اجاڑ ہو گیا۔ ہر طرف ہو کا عالم ہے۔"

"تو تمہارے نزدیک یہ سب نواب صاحب کے کسی بڑے گناہ کا نتیجہ ہے۔"

"ایک گناہ ہو تو بتاؤں"

ٹھاکر کی لڑکی کو اٹھوائے لیا۔ رات بھر رکھن۔ وہ پولیس لادا۔ او کا مار کر توپ دین"

"لڑکی کو مار ڈالا؟"

"ہاں بڑے ظلمی تھے۔ نہ معلوم کئی عورتوں کے چھری بھونک دی"

"چھری بھونک دی"

"مگر لڑکی ذرا کتری پڑی بس کمر سے چھری نکالی اور عین اسی جگہ گھسیڑ دی"

"تو وہ پاگل تھے؟"

"آپ چاہے پاگل کہو چاہے جلمی (ظلمی)، مار ڈالنا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سید کی لڑکی پہ نظر پڑی۔ خود گھر میں گھس کے اُٹھا لائے۔ سید آیا۔ تو چبوترے پر ٹھوکریں ماریں۔ بلبلا کر گرا۔ اور پیشاب کی جگہ پہ ٹھوکریں۔ پھر پھڑ پھڑا کر اس نے کہا "میں اپنے جد کے سپرد کرتا ہوں" میں نے اپنے کان سے سنا اور پھر پھڑ پھڑا کر مر گیا۔"

"اور لڑکی کیا ہوئی"

"اس کو نہیں مارا۔ ماں کے پاس بھیج دیا۔ سارے کنبے کو پالتے رہے۔ نہ معلوم کیا ہوا کہ سب ظلم بھول گئے۔ مگر لڑکی کو خراب کر دیا اور باپ کو مار دیا اور نعش اس کی ندی میں بہوا دی۔ پولیس کو روپیہ دے دیا۔ مگر اللہ اور رسولؐ تو دیکھ رہے تھے۔ پیٹ سے لڑکا مر گیا، بیوی مر گئی۔ اور یہ قلعہ رہ گیا۔ نہ معلوم ان کی ارواح پر کیا گزرتی ہو گی۔ اللہ معاف کرے۔ یا اللہ معاف کرنا" اور اس نے پھر کان پکڑے اور

گالوں پر طمانچے مارے"

اس کا دہشت زدہ چہرہ دیکھ کر مجھے بھی خوف ہوا اور کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا "یہ سب تو ہوا مگر اس محل کے آسیب سے اس کا کیا تعلق؟"

"تعلق کا ہے نا، یہی ایسے جلی کی ارواح کا کہ دائیے کے یہاں ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس محل میں بھٹکت پھرت ہے۔" وہی آسیب ہے میرے پاس کیا آئے۔ میرے بازو پر تعویذ ہے، گلے میں تعویذ ہے اور پھر دادا پیر کی دعا ہے کہ کوئی آسیب نہ ستائے۔"

تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ چھپر کھٹ پر نہایت عمدہ لحاف تھا، جو میں نے اوڑھ لیا تھا۔ رحمو پائنتی پڑا تھا اور اسے لحاف کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی نواب صاحب کی تصویر پر پڑ رہی تھی اور تصویر کی آنکھیں زندہ معلوم ہو رہی تھیں، چہرہ بھی عجیب دہشت ناک لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں مجھے محسوس ہوا جیسے کہ وہ تصویر زندہ ہو کر غصہ کرتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ میں نے اس کی طرف سے رُخ ہٹایا اور چاہنے لگا کہ نیند آجائے۔ مگر آنکھوں سے نیند بالکل اُڑ گئی۔

"بھئی رحمو" میں نے کہا "اگر یہ لیمپ بجھا دو تو نیند آجائے۔"

"وہ بولا "لیمپ نہ بجھاؤ، وہ نہیں تو سب معاملہ خراب ہو جائے گا۔ میرے تعویذ روشنی میں اثر رکھتے ہیں۔"

"اندھیارا ہونے سے کیا ہوگا؟"

"آپ جانت نہیں۔ اس توشہ کھانے والے کمرے میں اُو ہیں۔ اِدھر اندھیرا ہوا اور اُدھر آئے گئے۔ پیر صاحب یہی کہن کہ اندھیرا نہ ہونے دینا۔"

"تمہارا وہم ہے اندھیرا کر کے تو دیکھو"

"نہیں یہ ہم سے نہ ہوئی ہے۔"

میں خاموش رہا اور تھوڑی دیر کے بعد خود بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ اندھیرا نہ ہونا چاہیے۔ اس کمرے کی فضا کچھ عجیب تھی۔ ایک نامعلوم گمنام قسم کا خوف مجھ پر بھی طاری ہونے لگا تھا۔ میں چھت کی طرف دیکھتا تو بڑے بڑے گاڈر عجیب معلوم ہوتے۔ یہ محسوس ہوتا کہ وہ ہل رہے ہیں اور مجھ پر گرنے والے ہیں۔ میں ڈر کر کروٹ لیتا تو وہ بے رحم چہرے والی تصویر آنکھیں نکالے ہوئے آنکھوں کے سامنے آتی اور معلوم ہوتا کہ فریم سے نکل کر میری طرف بڑھے گی اور مجھے ٹھوکریں مارنے لگے گی۔ دوسری طرف کروٹ لیتا تو سامنے وہ دروازہ تھا جو توشہ خانے کا تھا، جس میں نواب کی نعش کچھ دن پڑی سڑا کی تھی اور جس میں رحمو کے یقین کے مطابق اب بھی ان کی ارواح تھی۔ میں آنکھیں بند کر لیتا تو خیال آتا کہ سارے محل میں وہ ارواح چکر لگاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی بیٹی اور داماد یہاں نہ ٹھہرے اور مُلک کو بھی چھوڑ دیا کہ کوئی پوچھے نہ کہ اپنے محل میں کیوں نہیں رہے۔ ترکِ وطن سے ان کا مقصد یہی تھا کہ ان کے محل کا آسیب چھپا رہے۔ عجیب عالم تھا۔ تھکن سے آنکھیں مندی جاتیں مگر پھر محسوس ہوتا جیسے کہ کسی چیز نے اندر سے ہلا دیا۔ ایسا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ آنکھیں بند کر کے کسی اور طرف دھیان لگاؤں مگر اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جو نیند کی طرف دھیان لگانے کا یعنی معلوم ہوتا کہ میرے اندر کوئی چیز مجھے ہلا کر پھر اس کمرے کی اور اس محل کی طرف دھیان لے آتی۔ یہ کش مکش بڑی دیر تک رہی۔

میں نے گھڑی دیکھی تو کل نو بجے تھے۔ نو سے چھ بجے صبح تک پورے نو گھنٹے ایک ایسا پہاڑ معلوم ہوئے کہ میں بوکھلا گیا۔ میں نے آواز دی "میاں رحمو! سو گئے؟"

اس نے جواب دیا "سوئے گئے۔ یہاں نیند بہت کم آوت ہے۔ صبح ہوتے کچھ آنکھ لگ جات ہے۔"

"میں دن بھر کا تھکا ہوا ہوں۔ کوئی پچیس میل تو ضرور چلا ہوں گا۔ تھکن سے چور ہوں۔ نیند آنکھوں میں بھری ہے۔ مگر جیسے ہی آنکھ جھپکتی ہے، معلوم ہوتا ہے کسی نے ہلا دیا۔"

"یہاں ایسے ہی ہووت ہے۔ آلکھر نواب کا ہے اور ان کی ارواح یا س بند ہے۔"

"تم کو بھی ایسا محسوس ہوتا ہے؟"

"اسی مارے تو میں سوتا نہیں۔ نوکری جاگنے ہی کی سمجھتا ہوں۔ دن بھر چھٹی رہتی ہے۔ سوتا رہتا ہوں۔"

"اچھا تو ہم تم جاگ رہے ہیں، باتیں ہی کریں۔"

"کا باتیں کریں۔ یہاں ان لوگوں کے سوا اور کسی کی بات ہی دھیان میں نہیں آتی۔ کوئی بات کرو لوٹ پھیر کے وہی نواب کی بات یاد آجاتی ہے۔ پیر صاحب بتائن کہ وظیفہ پڑھا کرو۔ تو وہ بھی نہیں چلتا۔ بس تعویذوں سے ڈھارس بندھی ہے۔ نہیں تو میں کب کا یہ نوکری چھوڑ دیتا۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ میں کوئی اور نوکری نہیں کر سکتا۔ بڈھا آدمی۔ کھیت میں کام کرنے کی مزدوری کرنے کی طاکت نہیں۔ یوں ہی تنگی کے دن کٹ جائیں گے۔"

اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی اسی عالم میں تھا جس میں میں۔ اور اسی احساس نے میرے اندر عجیب وہم پیدا کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اس محل میں کچھ آسیب ضرور تھا۔ جو عجیب پُر اسرار طریقہ پر نفسیات پر اثر ڈالتا تھا، اور جو عقل و امکان سے بالاتر تھا۔ آسیب کا عجیب پُر اسرار اثر مجھے محسوس ہو رہا تھا اور یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر میں پڑھا لکھا اور عقل میں عقیدہ رکھنے والا نہ ہوتا تو مجھے ضرور بھوت دکھائی دینے لگتے۔ مگر وہ احساسات جو بھی لوگوں کے آگے بھوت لے آتے ہیں، مجھ میں برابر کار فرما تھے۔ ایک عجیب قسم کا خوف مجھ پر طاری ہو رہا تھا، جس کا کوئی ممکن علاج نہ تھا، سوائے اس کے کہ کبھی چت لیٹ جاؤں۔ کبھی ایک کروٹ لوں۔ کبھی دوسری۔ کبھی آنکھیں بند کر لوں، کبھی کھول دوں۔ اس عالم کو ایک عرصہ گزر گیا اور مجھے گھڑی دیکھنے کا خیال ہوا۔ گھڑی دیکھی تو گیارہ ہی بجے تھے۔ کل دو گھنٹے ہوئے، جو مجھے نہ معلوم کتنے گھنٹے معلوم ہوئے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ ہجر کی رات بڑی طولانی ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں ہجر کا سوال نہ تھا۔ خوف کی رات تھی اور مجھے تجربہ ہو رہا تھا کہ ایسی رات بھی کتنی طولانی ہوتی ہے۔

کچھ دیر اور اسی طرح تڑپنے کے بعد میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رحمو بولا "نیند نہیں آوت۔ ہم پہلے کہہ دیا تھا۔"

"تم نے کیا کہا تھا؟"

"ہم کہے رہے تھے کہ تم نے سنا ہی نہیں، اور ان لوگوں نے بھی سنے نہیں دیا۔"

"تم کہہ دیتے تو میں یہاں نہ آتا۔ گاؤں میں کسی چھپر کے نیچے کھٹیا پر پڑ رہتا۔ نیند تو آتی؟"

"ہم اگر کہتے بھی تو تم کہاں مانتے۔ تم جیسے یہ لوگ انگریزی پڑھ گئے نہیں ڈرتے" کرنا سیکھ جاتے ہو۔ اب معلوم ہوا۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے ہم سب پر اپنے حساب طنز کیا تھا جو آسیب کو تو ہم کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ اور اسی طرف سے میرا احساس اور بھی تیز ہو گیا۔ اب یقین ہوا کہ یہ کوئی چیز ضرور ہے جس کو ہمارا عقل فلسفہ یا سائنس نہ سمجھا سکنے کے مارے ٹال جاتا ہے۔ میں اس مسئلہ پر فلسفی انداز سے غور کرنے لگا۔ مگر وہ مخل ہونے والی پُراسرار شے میرے سوچنے کو بھی اسی طرح ہا کر کاٹنے لگی۔ جیسے میری نیند کو:

آخر کو تنگ آ کر میں نے کہا "میاں رحموا۔ مجھے یہاں سے نکال لے چلو۔ یہاں میری جان عذاب میں آ گئی"۔

"یہ تو رات میں ہو ہی نہیں سکتا۔ آ گئے تو آ گئے۔ اب صبح سے پہلے نہیں جا سکتے۔"

"کیوں! تمہارے تعویذ نہیں کام دیں گے اور لالٹین ساتھ ہو گی۔ اس کی روشنی میں ان کا اثر برابر ہو گا۔ چلو میں اٹھتا ہوں مجھے باہر پہنچا دو۔"

"ایسا غضب نہ کرنا۔ لالٹین کی روشنی کچھ نہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ مصیبت ہی آتے جائے گی۔ بس کسی طرح رات کاٹو۔ اب سے آئے ہو تو جانتے کہاں ہو؟"

اب ایک احساس اور بڑھا کہ میں وہاں قید بھی تھا۔ اس احساس نے ایک الجھن پیدا کی اور خوف کو بڑھا دیا۔ مجھے کچھ گرمی سی محسوس ہوئی اور لحاف جسم پر بھاری معلوم ہوا۔ رحموا بغیر لحاف ہی کے پڑا تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ اسے لحاف کی ضرورت کیوں نہیں محسوس ہوتی۔ ڈر کے مارے وہ اس عالم میں ہوتا ہے کہ اگر گرمی ہو تو پسینہ چھوٹنے لگے اور جاڑے کا موسم ہونے سے بس اس حد تک بدن گرم ہوتا ہے کہ سردی نہ محسوس ہو۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں نے لحاف بالکل ہٹا دیا۔

میری نظر رحموا پر گئی۔ مجھے خیال ہوا کہ اس کو ہی غور سے دیکھوں تو شاید وہ پُراسرار خوف کم ہو۔ وہ سر پر پگڑی باندھے تھا۔ چہرہ جھریوں سے بھرا تھا اور سفید داڑھی بھی تھی، جو بے تکان بڑھی ہوئی تھی۔ مونچھیں بھی داڑھی میں ملی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں کھلتی تھیں اور بند ہو جاتی تھیں۔ اس کے جسم سے موٹی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ اور پھر ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر اس کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ بھی کچھ بھیانک لگنے لگا۔ میں نے اس کو پکارا، اس نے جواب دیا "کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا "تم اس دیہات میں ہمیشہ رہے"؟

"نہیں" اس نے کہا "ہم شہر میں بہت رہے تب ہی تو صاف بولی بولتے ہیں۔ دیہاتی نہیں بولتے"۔

"تم صاف بولی بولتے ہو؟ یعنی اردو۔ واہ۔ مجھے تو تمہاری بولی دیہاتی معلوم ہوتی ہے۔"

"اب آپ کی طرح تھوڑی بول سکتے ہیں۔ آپ پڑھے بھی تو ہیں۔ پڑھنے سے بس یہی آ جاتا ہے اور کچھ نہیں"۔

"اور کچھ نہیں سے کیا مطلب تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ پڑھے لکھے بنتے بہت بہادر ہیں مگر ڈرتے ہمیں لوگوں کی طرح ہیں"۔

یہ پھر اس کا مجھ پر طنز تھا، اور میں نے دل میں کہا "میں کس وہم میں مبتلا ہوں"۔ اور کوشش کی کہ اس وہم کو نکال دوں۔ مگر جو جو کوشش کرتا تھا توں توں میرا خوف بڑھتا جاتا۔ ایک لمحہ کیلئے مجھے خیال ہوا کہ کہیں رحموا بھی تو بھوت نہیں ہے۔ مگر یہ خیال بہت ہی خام تھا اور زیادہ

دیر نہ جما۔ خیر قوتِ ارادہ پر بار بار زور دینے سے یہ تو ضرور ہوا کہ خوف کی ترقی میں کمی ہو گئی۔ اور اگر یہ بھی کہوں کہ وہ کچھ گھٹنے لگا تو بھی بہت زیادہ غلط نہ ہوگا۔

شاید یہ خوف کے گھٹنے ہی کی وجہ سے ہوا کہ اب کچھ کچھ دیر میری آنکھ لگنے لگی، اور میں ایک عجیب تھکن کے عالم میں آگیا جس نے میرے سارے قوٰی معطل کر دیئے۔ کہہ نہیں سکتا مگر یہ بھی امکان ہے کہ صبح ہونے سے دو گھنٹے قبل بالکل سو گیا۔ کیونکہ جب میں چونکا تو اذان کی آواز کان میں آئی۔ میں نے غور سے سُنی۔ گاؤں کی طرف سے بلند آواز میں صدا آئی۔ اس وقت رحموا خراٹے لے رہا تھا۔ نمازی نہیں تھا اور نہ وہ جو اٹھ کر نماز پڑھتے۔ مگر مجھے ایک اطمینان ہوا تھا کہ اب دن نکلنے والا ہے اور میں محل کی قید اور وہم کی قید سے نکلنے والا ہوں۔ میں نے سُنا تھا کہ اذان کی آواز سے بھوت بھاگ جاتے ہیں، اور میں نے محسوس کیا کہ میرا خوف بھی غائب ہو گیا تھا۔

دن نکلنے میں جو دیر ہوئی وہ مجھے زیادہ طویل نہ معلوم ہوئی۔ کمرے کے دروازوں کے شیشے چمک اُٹھے۔ رحموا سو ہی رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سورج کے دمکتے ہوئے ڈلے کو گاؤں سے کچھ اوپر دیکھا۔

میں نے رحموا کو جگایا "اٹھو دن نکل آیا۔" "وہ اچھا" کہہ کر اُٹھا۔ اور بڑی جلدی جلدی بغیر کسی چیز کو دیکھے ہوئے میں اس آسیب کے محل سے نکل آیا۔

گاؤں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہاں سے تین کوس دور ایک ریل کا اسٹیشن تھا جہاں سے مجھے گھر آنے کا ٹکٹ مل جائے گا اور اس اسٹیشن تک پہنچانے کے لیے ایک لیڑھو بھی ایک روپیہ کرائے پر میرے لیے جوڑ کر تیار کر دیا گیا۔ لیڑھو پر آگے چلانے والا بیٹھا تھا اور پیچھے میں پیٹھ کو لگائے ٹیکا کر بیٹھ گیا۔ کچی سڑک پر پہنچا تو وہ محل ٹیلے پر رکھا ہوا سورج کی روشنی میں چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ کالی رات سے سیاہ۔ جگہ جگہ بڑے بڑے رخنے۔ سورج کی روشنی سے اس کی وحشت زدگی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے مجھ پر نیند کا غلبہ تھا۔ مگر لیڑھو کے سڑک پر اُچھلنے سے جو دھکے لگتے تھے وہ مجھے چونکا دیتے اور محل کی طرف نگاہ جاتی اور توہم کے وہ دھکے یاد آجاتے۔ جنہوں نے مجھے رات بھر پریشان کیا تھا۔ میں سوچتا "آسیب۔ یہ ہے کوئی چیز ضرور۔ میرے اندر نہیں، بلکہ اس محل کے اندر۔ گاؤں والوں نے اسے نواب کے ظلم سے وابستہ کر کے اسے ایک اخلاقی اور مذہبی نوعیت دے دی اور ان کے توہم نے اس میں بھوت تخلیق کیے بلکہ دیکھ بھی لیے۔ میرا مشاہدہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس میں آسیب ضرور ہے۔ اور جس چیز کو آسیب کہتے ہیں وہ کوئی حقیقت ضرور ہے۔

راستہ کٹ گیا اور محل نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں گھر پہنچ گیا اور سب کچھ بھول ہی گیا۔ مگر اب بھی اس محل کا خیال آتے ہی وہ رات یاد آجاتی ہے جو میں نے اس میں گزاری تھی اور دل یہ کہتا ہے "آسیب ہے۔ یہ کوئی چیز ضرور۔"

قالین

مختار مسعود

وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی، معصوم اور اجنبی، کم سن بھی تھی اور انگریزی بھی ٹوٹی پھوٹی بولتی تھی، اس کے ستواں ناک اور کھوئی کھوئی آنکھوں کو دیکھ کر میں نے جانا کہ وہ غریب بھی ہے اور غمگین بھی۔ اس نے بتایا کہ وہ جرمن ہے اور کسی فرم میں ملازمت کرتی ہے۔

میں نے پوچھا "آپ کیا چاہتی ہیں۔؟"

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی میں نے اس پر ایک نظر ڈالی، یہ غیر ملکی ہے، شاید ویزا کی میعاد میں اضافہ چاہتی ہے، یہ غریب ہے، شاید امداد مانگنے آئی ہو۔ یہ کھوئی کھوئی سی نظر آتی ہے، شاید بیمار ہے اور ہسپتال میں داخلہ چاہتی ہے۔ یہ سادہ سی لگتی ہے، شاید تبلیغ پر اتر آئے۔ غیر ملکی، غریب، پریشان، سادہ۔ ان حیثیتوں سے میں نے اس کی ضروریات کا اندازہ لگایا اور اپنے اختیارات کی روشنی میں اس کی ہر حالت کا ایک سیدھا سا جواب بھی ذہن میں تیار کر لیا، حکم، امداد، دلجوئی، مشورہ۔ نہ جانے جواب میں کونسی روش اختیار کرنی پڑے۔ یہ بات البتہ اس وقت میرے ذہن میں نہ آئی کہ وہ سب کچھ ہونے یا نہ ہونے کے باوجود ایک جوان لڑکی ہے اور شاید۔۔۔ ۔۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"مجھے قالین چاہیے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

اسے قالین چاہیے تو یہ بازار کیوں نہیں جاتی۔ میں سوچ میں پڑ گیا اور سوچ مجھے ساتھ لے کر بہت دور نکل گئی۔ مجھے اصفہان کے باشندے یاد آنے لگے، وہی جو نئے قالین سڑک پر بچھا دیتے ہیں تاکہ گھس جائیں، وہی گھٹے ہوئے سر، دھنسی ہوئی آنکھوں اور لمبی لمبی انگلیوں والے باشندے جو ساری عمر اڈے پر اڈوں سے ہوتا ہوا اس سادہ سی لڑکی کی اداس آنکھوں پر جا کر رک گیا جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ مسکرائی اور اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے قالین چاہیے۔"

"محترمہ، اگر آپ کو قالین چاہیے تو آپ بازار جائیے، آپ یہاں کیا لینے آئی ہیں، یہ تو دفتر ہے دفتر۔"

"اگر یہ بات درست ہے کہ میں اس وقت ضلع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مخاطب ہوں تو میں اپنا سوال پھر دہراؤں گی۔ مجھے قالین چاہیے۔"

میں نے اس کے سوال کو مہمل سمجھا اور اس کی تکرار سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس لڑکی کا دماغ چل نکلا ہے، امداد، دلجوئی، مشورہ، سبھی غیر ضروری نکلے۔ یہ کیس تو حکم کا ہے۔ منکہ فلاں ابن فلاں اپنے اختیارات زیر دفعہ متعلقہ کے تحت مسماۃ فلاں بنت فلاں کو مفاد عامہ کے تحت حراست میں لیتے ہوئے دماغی ہسپتال میں معائنے کے لیے بھیجتا ہوں۔ ابھی ان احکامات کی کاپیاں ٹائپ ہوں گی، مہر لگے گی، دستخط ہوں گے اور پھر

ایک فائل اور ایک لڑکی داخل دفتر ہو جائے گی۔

میں نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے گفتگو شروع کی۔ وہ جنگ کے دوران پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ نے جنگ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ کئی سال وہ قریہ قریہ بھاگتے رہے مگر جنگ نزدیک آتی چلی گئی۔ پھر جنگ سارے ملک میں پھیل گئی۔ کئی دشمن چاروں طرف سے ملک میں گھس آئے۔ فوجوں کا گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا۔ بھاگنے کی راہیں بند ہو گئیں۔ آخر ایک دن جنگ ختم ہو گئی مگر اس کے ماں باپ کو ساتھ لے گئی۔

یہ لڑکی ایک رفیوجی کیمپ، ایک یتیم خانے، ایک چرچ، ایک خیراتی تربیتی ادارے اور بہت سے آدمیوں سے گزرتی ہوئی جوانی تک پہنچی۔ اب مجھے اس کی سادگی، اداسی اور دھیمے پن میں چھپے ہوئے غم کی جھلک نظر آئی۔ مجھے ندامت ہوئی کہ ایک لمحے کے لیے بھی میں نے یہ کیوں سوچا تھا کہ میرے سرکاری اختیارات اس لڑکی کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں۔ ایسے پہاڑ جیسے بوجھ کے نیچے تو اختیارات ہی نہیں بلکہ اچھے بھلے ملک بھی دب کر گم ہو جاتے ہیں۔

سال بھر ہوا کہ یہ لڑکی یہاں آئی۔ جرمنی میں یہ جس فرم میں ملازم تھی اسے ایک مقامی ٹھیکہ ملا تو اس کا تبادلہ بھی یہاں کی شاخ میں ہو گیا۔ نیا ملک، نئے لوگ۔ اس کا دل اس غم کو بھول گیا، جسے اپنے شہر کے کھنڈر اور دوسرے ملکوں کے فوجی ہر روز تازہ کر دیتے تھے۔ یہاں اسے بڑا سکون ملا۔ وہ ایک متوسط درجے کے علاقے میں رہتی تھی۔ اسے آس پاس کے فلیٹ والوں کے نیچے مس صاحب اور نوکر میم صاحب کہہ کر پکارتے۔ اسے پہلی بار اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ انہی فلیٹوں کے صاحب لوگ جب بھی اس کے پاس سے گزرتے اسے ایک بار تو بڑے غور سے دیکھتے۔ لڑکا لوگ تو اکثر مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے، اسے پہلی بار اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔

وہ خاموشی سے دن بسر کرتی رہی۔ دفتر کا کام اور پھر گھر کا کام۔ چھ دن ان کاموں میں یوں گزرتے کہ کسی اور بات کی سدھ بدھ نہ رہتی۔ ساتواں دن کچھ گرجے میں گزرتا کچھ بدیسی عورتوں کے ایک ہفتہ وار اجلاس میں۔ ایک دن اس اجلاس میں ایک سفارت خانے کی طرف سے اعلان ہوا کہ ان کے ملک کا ایک باشندہ اس ضلع کی سنٹرل جیل میں قید ہے۔ اس ملک میں نہ تو اس کا کوئی رشتہ دار ہے اور نہ ہی اسے یہاں کی زبان آتی ہے۔ لہٰذا اسے قید بامشقت کے ساتھ ساتھ قید تنہائی اور قید خاموشی بھی کاٹنی پڑ رہی ہے جس کا اثر اس کی صحت پہ بہت برا پڑا ہے۔ سفارت خانے نے سفارش کی کہ اس کے ہم وطن جو اس شہر میں رہتے ہیں ہفتہ وار ملاقات کے دن باری باری جیل ہو آئیں تو اس قیدی کا دل بہل جائے گا۔ اعلان میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر صرف پچاس ہم وطن بھی اس کام کے لیے تیار ہو جائیں تو سال بھر میں ہر شخص کو صرف ایک بار ملاقات کے لیے جیل جانا ہوگا۔ سال کے بعد وہ قیدی رہا ہو جائے گا۔

تنکے نے ڈوبتے کو سہارا دینا چاہا۔ یہ سادہ سی غمگین اور یتیم جرمن لڑکی اس جرمن قیدی سے ملنے کے لیے تیار ہو گئی۔

جیل میں ملاقات کا کمرہ دراصل ایک لمبی سی بارک تھی جسے سلاخوں سے بند کی ہوئی محرابوں نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک حصے میں ملاقاتی اپنی چادریں بچھا کر بیٹھ جاتے اور دوسرے حصے میں قیدی ننگے فرش پر بیٹھ کر سلاخوں میں سے کبھی پیار سے جھانکتے کبھی مایوسی سے نظریں نیچی کر لیتے۔ جیل میں طرح طرح کے قیدی ہوتے ہیں اور ان کے ملاقاتیوں کی قسمیں بھی ان گنت ہوتی ہیں۔ انہی رنگا رنگ کے ملاقاتیوں کے ریلے میں بہتی ہوئی یہ جرمن لڑکی بھی اس بارک میں آ نکلی۔ ادھیڑ عمر، چھریرے بدن اور واجبی شکل و صورت کے اس قیدی

نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ اس نے سوچا اب اس کے دن پھرنے والے ہیں۔ پھر اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا' ابھی تو دو سال قید بامشقت میں سے صرف ایک سال گزرا تھا' ابھی تو ایک گرمی' ایک خزاں' ایک سردی اور ایک بہار کے گزرنے پر کہیں اسے رہائی نصیب ہوگی۔ یہ جرمن لڑکی کو دیکھتے ہی اسے خواہ مخواہ دنوں کے بہتر ہو جانے کا خیال کیوں آ گیا، وہ پھر رنجیدہ ہو گیا۔

لڑکی نے اسے چائے کا ڈبہ، سگریٹ کے پیکٹ اور ولایتی صابن کی ٹکیہ اپنی ٹوکری میں سے نکال کر دی۔ اتنی سی بات پر قیدی پھر خوش ہو گیا، وہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے اسے جیل میں اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ دوسرے قیدی اس کو اکثر گدھا کہہ کر تنگ کرتے ہیں: وہ اسے گورا صاحب کہتے ہیں۔ بعض تو اس کے حصے کی مشقت میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس نے چکی بھی پیسی اور بان بھی بٹا۔ اس نے مٹی بھی ڈھوئی اور اینٹیں بھی پتھی ہیں' اب وہ آٹھ قیدیوں کے ہمراہ ایک عالی شان قالین بننے پر لگا ہوا ہے۔ یہ قالین اسے بے حد عزیز ہے۔ ابھی اسے مکمل ہونے میں چھ آٹھ ماہ لگ جائیں گے۔ وہ اپنی رہائی کی تاریخ کا حساب کیلنڈر سے نہیں قالین کی تیاری سے لگاتا ہے۔ قالین میں جب بھی وہ گرہ لگاتا ہے تو اسے خیال ہوتا ہے کہ اس نے قید کی زنجیر کا ایک حلقہ توڑ ڈالا ہے' پھر وہ تیزی سے گرہیں لگانے لگ جاتا ہے۔

وہ تیزی سے بہت کچھ کہہ گیا، لڑکی اتنی زود حس تھی تو خفتی گریہ دل سے سنتی رہی۔ وطنیت' فرض' ہمدردی' مجبوری' نہ جانے کون کون سا خیال اس لڑکی کے دل میں رہ رہ کر اٹھتا اور وہ واپسی کا ارادہ کرتی تو اس کا پاؤں پکڑ لیتا۔ یہاں تک کہ ملاقات کا گھنٹہ ختم ہو گیا، انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ وہ ساٹھ منٹ تک کھڑے باتیں کرتے رہے ہیں۔

اگلے ہفتے وہ پھر ملاقات کے لیے پہنچی۔ قیدی کے قدم بوجھل تھے' اس کا سر جھکا ہوا تھا' آنکھیں سرخ اور جسم نڈھال تھا وہ اس لڑکی کے پاس مشکل سے پہنچا اور آتے ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے سر دیوار سے لگا دیا اور ہاتھوں سے سلاخوں کو تھام لیا۔ لڑکی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی اس نے وجہ پوچھی۔ قیدی نے بتایا کہ پچھلے تین دن سے اسے مشقت سے ہٹا کر بیگار میں لگا دیا ہے۔ بیگار بھی عجیب قسم کی ہے جب دھوپ خوب تیز نکل آتی ہے تو اسے ایک گھنٹے کے لیے دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں بٹھا دیا تھا۔ وہ وجہ پوچھتا ہے تکلیف سے شور مچاتا ہے۔ اس کی کوئی نہیں سنتا اور سنے بھی کیسے یہاں جرمن زبان کس کو آتی ہے۔ لڑکی نے ملاقات ختم کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج ہی اس سلسلے میں جیلر سے شکایت کرے گی اور ضرورت پڑی تو سفارت خانے کی معرفت احتجاج بھی کیا جائے گا۔

وہ جیلر کے دفتر میں پہنچی تو وہاں اسے کچھ دیر ایک طرف بیٹھ کر بد مزاجی کا ایسا مظاہرہ دیکھنا پڑا کہ وہ مایوس ہو گئی۔ جب یہ آدمی کسی سے سیدھی طرح بات ہی نہیں کرتا تو اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جیلر نے اس کی بات سنی۔ وہ اب بڑا نرم دل نظر آ رہا تھا اور لڑکی کی شکایت بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اس ماتحت کو جس کے حکم سے قیدی کو دھوپ میں بٹھایا جاتا ہے نہ صرف منع کرے گا بلکہ سزا بھی دے گا۔ اس نے لڑکی کو چائے پیش کی اور بڑی عزت کے ساتھ دروازے تک آ کر رخصت کیا۔

اگلے ہفتے پھر ملاقات تھی۔ قیدی آج نمبر اور لکیروں والے کرتے پاجامے کے بجائے پتلون قمیص پہن کر ملنے آیا۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ پچھلی ملاقات پر جب اس نے جیلر سے شکایت کی تو اس کے بعد سب کا رویہ یکایک بدل گیا۔ لڑکی شکریہ ادا کرنے کے لیے جیلر کے دفتر گئی تو اس نے جیلر کا رویہ بھی بدلا ہوا پایا۔ آج وہ خاصا بے تکلف ہو رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو چائے بھی پیش کی اور رات کے کھانے

کی دعوت بھی دی۔ اس نے چائے کی پیالی ہاتھ سے لے لی مگر کھانے کے لیے معذرت کرنے لگی۔ جیلر نے بڑے اطمینان سے کہا، اگر آپ میرے کھانے پر نہیں آسکتیں تو آپ کا قیدی واپس دھوپ میں بیٹھنے پر مجبور ہوگا۔ قیدی کی تکلیف کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی جو اس کے آرام کی خاطر دعوت پر آنے کی زحمت بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایسی خود غرض عورت سے مزید گفتگو بیکار ہے۔ آپ جا سکتی ہیں۔

اگلے ہفتے قیدی نے ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ اس سے اگلے ہفتے اس نے مکمل سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جب اس سے بھی اگلا ہفتہ آیا تو وہ سیٹی پر کسی مغربی ناچ کی دھن بجا رہا تھا۔ لڑکی ہر ہفتے ڈنر پر جاتی رہی، قیدی کی آسائش میں ہر روز اضافہ ہوتا رہا۔ پھر ایک بار جیلر نے چند دنوں کی چھٹی لی اور اس لڑکی کے ساتھ پکنک منانے کسی پہاڑ پر چلا گیا، جب وہ واپس آئے تو اگلی ملاقات پر قیدی نے بتایا کہ اس کی سزا میں جو زیادہ سے زیادہ تخفیف جیلر کے اختیار میں تھی وہ بھی اسے مل گئی ہے۔ اب وہ تین ماہ بعد رہا کر دیا جائے گا۔ قیدی نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا تین ماہ ہوتے ہی کتنے ہیں یونہی کٹ جائیں گے چٹکی بجاتے۔ لڑکی نے سوچا تین ماہ کتنے طویل ہوتے ہیں۔ تین ماہ میں بارہ ہفتے ہوتے ہیں اسے بارہ ڈنر ابھی اور کھانے پڑیں گے۔ ایسا تو ایک ڈنر بھی عمر بھر کے لیے منہ کو بدذائقہ کر دیتا ہے، یہاں تو ابھی تین ماہ اسی حال میں گزریں گے۔ اس کا جی متلانے لگا۔

آج پھر ملاقات کی باری تھی۔ لڑکی ایک نیا ریشمی فراک پہن کر آئی۔ قیدی نے آتے ہی فراک کی تعریف کی اور جب اس نے شکریہ ادا کیا تو قیدی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ لڑکی نے دل میں سوچا کہ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس وقت ہمارے درمیان جیل کے سلاخوں والے دروازے ہیں، یہ سوچتے ہی اس کے ہاتھ سلاخوں کی طرف بڑھے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ قیدی نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ کر انہیں زور سے جکڑ لیا۔ کافی دیر خاموشی رہی، البتہ ان دونوں کے چہرے سُرخ سے ہو گئے۔ آج ملاقات کے بعد جب وہ رخصت ہوئی تو لڑکی کے کانوں میں اس کے الفاظ گونج رہے تھے "چار ہفتے باقی ہیں رہائی اتوار کی صبح ہوگی۔ ہم دونوں سیدھے چرچ جائیں اور شادی کے بعد اپنے فلیٹ کا رُخ کریں گے۔" چار ہفتے باقی ہیں گر ابھی تو اسے شادی کا بہت سا بندوبست کرنا ہے اور ابھی تین ڈنر بھی تو باقی ہیں۔ ڈنر کا خیال آتے ہی اس کا جی متلانے لگا۔

چرچ کا انتظام مکمل ہو گیا، فلیٹ بھی آراستہ ہو گیا، چند دوست اور دو چار موٹریں بھی مل گئیں۔ لڑکی نے اپنی فرم سے کچھ ایڈوانس لے کر جیل میں اس قالین کا آرڈر بھی بُک کرایا، جس کی ہر گرہ سے قیدی کی یادیں بندھی ہوئی تھیں، اس قالین میں تو ہزاروں گرہیں لگی ہوئی تھیں ہر انچ میں پانچ سو گرہوں کا حساب تھا، ہر گرہ ایک نہ ختم ہونے والا لمحہ بن چکی تھی، لڑکی نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ یہ قالین ہفتے کے دن اُسے مل جائے اور اتوار کی صبح کو جب قیدی اُس کے شوہر کی حیثیت سے فلیٹ میں داخل ہو تو اس کا پہلا قدم اسی قالین پر پڑے۔ لڑکی نے اس بات کا قیدی سے ذکر تک نہ کیا۔

لڑکی مجھ سے باتیں کر رہی تھی، میں نے کیلنڈر پر نگاہ ڈالی، مارچ کا مہینہ تھا اور آج ہفتے کا دن تھا۔ لڑکی بولی میں آج صبح قالین لینے جیل کے دفتر گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ قالین صرف اس شرط پر مل سکتا ہے کہ آج رات کا ڈنر بھی مجھے جیلر کے ساتھ کھانا ہوگا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ کل میری شادی ہو رہی ہے مگر وہ نہ مانا اور قالین دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کتنا خود غرض اور بے وقوف ہے، وہ میری مسکراہٹ اور آمادگی کو کتنا غلط سمجھا۔ مسکراہٹ میری عادت ہے، آمادگی میری ضرورت تھی۔ میں نے قیدی کے لیے قربانی دی تھی، یہ میری شرافت

ہے، وہ بیوقوف سمجھتا ہے میں خراب لڑکی ہوں۔

"مسٹر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، مجھے قالین چاہیے۔"

پھر وہ لڑکی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر سے چلی گئی۔ اگلے دن وہ دونوں چرچ سے ہوتے ہوئے اپنے فلیٹ میں پہنچے، فلیٹ کا دروازہ کھلا، قیدی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لڑکی کی پلکیں بھیگ گئیں، قیدی نے سوچا، شاید میں انہی دو چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے جیل گیا تھا، ایک لڑکی اور ایک قالین!

مُٹھّی بھر دھوپ

کشمیری لال ذاکر

ابھی کچھ دیر پہلے وہ مٹھی بھر دھوپ اس بے دردی سے مجھ پر پھینک گیا ہے کہ اب تک چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی تیز کرچیاں میری آنکھوں میں چبھ رہی ہیں۔ لگتا ہے روشنی کی خشک برق آلود ریت میرے پپوٹوں کے اندر گھس کر چھوٹے چھوٹے زخم بناتی جا رہی ہے اور میری آنکھوں میں سُرخ خون کے ڈورے لہرانے لگے ہیں اور نگاہوں کے سامنے زخموں کے پھول کھل رہے ہیں۔

"کوئی پوچھ رہے ہیں آپ کو منیتا بی بی" ملازمہ نے اندر آ کر کہا تھا۔

"کون ہیں؟"

"نام نہیں بتایا۔"

میں نے سوچا وہی انشورنس والا ہوگا۔ کم بخت کئی ہفتوں سے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ یہ انشورنس ایجنٹ بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ آپ جتنا انہیں پرے جھٹکیں گے یہ اتنا ہی ساتھ چپٹتے جائیں گے۔ گندم کے ادھ پکے خوشے کی طرح جو ایک بار جسم سے چھو جائے تو کھال پر خراشیں ڈال کر ہی چھوڑتا ہے۔ یہ انشورنش ایجنٹ بھی آپ کی عمر کے نازک نازک لمحوں پر تفصیلات کی خراشیں ڈالے ہی جاتے ہیں جب تک کہ آپ اپنی عمر کا پیرہن اتار نہیں پھینکتے۔ ویسے یہ انشورنس ایجنٹ شکل وصورت کا بھی اچھا ہے اور باتیں بھی اچھی کرتا ہے۔ آ جائے تو دس پانچ منٹ بات کر لیتی ہوں پچھلے ہفتہ بڑے ہی خوبصورت کلینڈر اور نہایت ہی پیاری سی امپورٹڈ ڈائریاں دے گیا تھا۔ کلینڈر تو میں نے بانٹ دیئے میں لیکن ڈائریوں پر برنارڈ شا کے ڈراموں کے خوب صورت جُملے نوٹ کرتی رہتی ہوں۔

لیکن وہ انشورنس ایجنٹ نہیں تھا۔

میں جب نیم اندھیرے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی تو میری آنکھیں چوندھیا سی گئیں۔ تیز دھوپ کا ایک بگولہ روشنی سے بھرپور میری نظروں سے ٹکرایا۔ پل بھر کو میں بھونچکی سی رہ گئی۔ آنکھوں سے گاگلز اتارے، فریم کو انگلیوں میں اٹکائے۔ ایک ہاتھ میں بریفکیس تھامے وہ ایک ستون کی طرح کھڑا تھا۔ میرے قدم جم گئے اور زبان گنگ ہو گئی۔ میں ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔

"کیا میں واپس چلا جاؤں؟" ستون سے آواز آئی۔

میں خاموش رہی۔

"اچھا خدا حافظ" وہ جانے کو مڑا۔ اس کی پُشت میرے سامنے تھی۔

"سنو!" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ رُک گیا۔ اور پھر اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

"وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر کیوں نہیں آتے؟"

"دُھوپ سینک رہا ہوں۔" وہ مسکرا دیا اور اُسی لمحہ مُٹھی بھر دھوپ اُس نے میری آنکھوں میں پھینک دی۔ جُون کے پہلے ہفتہ کی تپتی ہوئی وہ ریت میری رُوح کی گہرائیوں پر چھا گئی اور میرا ذہن و جسم جل اُٹھا۔

"جُون میں بھی دُھوپ سینکتا ہے کوئی؟"

"ہاں، وہ جسے دسمبر میں یہ نعمت نصیب نہ ہو۔"

اور وہ ستوں دھیرے دھیرے سرکتا ہُوا میرے قریب آ گیا اور میرا جی چاہا کہ اس جلتے ہوئے ستُون پر اپنے لمبے سیاہ بالوں کا سایہ ڈال دُوں۔ اس کے ہونٹوں پہ وہی مُدتوں پہلے والی مسکراہٹ تھی جس کی چمک وقت کے غبار میں دب کر بھی زندہ تھی۔ وقت کے غُبار میں دَب کر بھی زندہ رہنا، اپنی دھڑکنوں کو محسوس کرنا، زندگی کے بوسوں کی لذت کو یاد رکھنا کتنی عظیم چیز ہے۔ کتنے سخت جان ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھ پے بہ پے چوٹیں کھانے کے باوجود زندگی کے آنچل کو نہیں چھوڑتے۔ جب صحرا میں چلتی ہوئی لُوؤں کے بعد ریت کے ڈھیر ہٹ جائیں تو زندگی کا چہرہ گرد و غبار جھاڑ کر ایک بار پھر چمک اُٹھے۔ اس سے بڑھ کر بھی ہے کچھ دُنیا میں۔

وہ جب برآمدے سے گذر کر نیم اندھیرے کمرے میں داخل ہُوا تو اُس کے ماتھے پر جمے پسینے کے قطرے چمک اُٹھے۔

"پسینہ تو پونچھ ڈالو اپنا۔"

"یہ قطرے تو وہ سنگِ میل ہیں جن کے پاس سے گذر کر یہاں تک پہونچا ہوں۔ انہی سے تو میں نے سفر کی طوالت کو ماپا ہے۔

ساقی نہ پوچھ کس طرح پہونچے ترے حضور
رستے میں اک طویل بیابانِ ہوش تھا۔"

"سبحان اللہ!" میں زور سے ہنس دی اور گورے ٹھنڈے کمرے میں اُس کے پسینے کے قطرے موتی بن گئے۔

اُس نے کاغذ پاس تپائی پر رکھ دیئے اور بریف کیس صوفے پر پٹک دیا۔

"اِس طرح پٹکنے سے کچھ ٹوٹ جائے تو؟"

"ٹوٹنے والی چیزیں تو کب کی ٹوٹ چکیں۔ اب رہ ہی کیا گیا ہے ٹوٹنے کو۔"

"ٹوٹنے کو تو سدا ہی کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے۔"

"وہ تو جڑنے کو بھی رہ جاتا ہے۔" وہ بولا۔

"کیا رہ جاتا ہے جُڑنے کو؟"

"انسانی رشتوں کے کچے دھاگے۔"

"اس کچے سوت کا کیا بھروسہ ہے؟"

"احساسات کے کچے سوت سے زندگی اپنے لئے بڑے خوبصورت پیرہن تیار کرتی ہے۔ پُھنسا، جن میں پیار کی خوشبوئیں اور مباہ

کے رنگ رچے ہوتے ہیں۔"

اُس کی یہ بات سُن کر جانے کیوں میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کچھ دیر اسے سہلاتی رہی اور پھر اُس کی پشت کو چوم کر چھوڑ دیا۔ پھر میں دُوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ میری کچھ لمحوں کی غیر حاضری میں یقیناً کمرے کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ میں جب سکواش کے دو گلاس ٹرے میں رکھے کمرے میں واپس آئی تو وہ دیوار کے سامنے کھڑا ایک پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ تصویر زندگی کی طرح ننگی ہے۔"

اُس کی یہ تنقید سُن کر میں سناٹے میں آگئی۔

"اس کو کپڑے پہنانے کی کوشش نہ کرنا۔"

میں اب بھی خاموش تھی اور ٹرے میں لبالب بھرے گلاس لرز رہے تھے۔

"یہ کپڑے پھاڑ کر بھی باہر نکل آئے گی۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں خود نہیں جانتا میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور جو جانتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اس کی بات کوئی نہیں سمجھتا۔"

میں دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھامے اُس کے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے میرے بائیں گال کو تھپتھپایا اور ایک گلاس ٹرے سے اُٹھا لیا۔

"سکواش کا رنگ گلابی ہو گیا ہے نا؟"

میں نے محسوس کیا میرے گال تمتما اُٹھے تھے۔ میں نے دوسرا گلاس ہاتھ میں لے کر ٹرے ایک طرف رکھ دی۔

"اتنے برس کہاں رہے تم؟"

"بن باس کاٹتا رہا، سوچا تھا اپنی موت کا نشہ اُتر جائے تو پھر وطن لوٹوں۔"

اُس نے نہایت ہی خوبصورت لائیٹر سے وہی پرانے برانڈ والا گھٹیا سا سگریٹ سُلگایا اور دھوئیں کا ایک گہرا غبار چھوڑ دیا جو کمرے کی خُنک فضا میں ایک بوجھل بدلی کی طرح لہراتا رہا۔

"تم اب تک یہی سگرٹ پیتے ہو؟"

"پرانا دقیانوسی قسم کا آدمی ہوں۔ بہت ترقی پسند ہوتا تو اب تک بیڑی پر آ گیا ہوتا۔"

"کتنا ٹھوس پن ہے تمہاری شخصیت میں۔ تم کسی سانچے میں ڈھلتے ہی نہیں۔"

"بس ایک ہی سانچا ہے۔ اُس میں ڈھل کر اب ایک ہی طرح کی ساخت بن گئی ہے۔ اب تو صرف ٹوٹ ہی سکتا ہوں۔"

اور وہ ایک دم زور سے ہنس پڑا۔

"ارے ہاں، وہ تمہارے خاوند قسم کے صاحب کہاں ہیں؟"

" آسٹریلیا میں۔"

" اُون کا کاروبار کر رہے ہیں کیا؟"

" شاید!"

" لیکن اُن کی اعلیٰ نسل کی بھیڑ تو ہندوستان میں ہے۔"

" پلیز!"

اور وہ اتنے کھلے گلے کی ہنسی ہنسا کہ میری رُوح کے تمام زخم کُھل گئے۔

" تم کیوں نہیں ساتھ چلی گئیں، اس گھٹے ہوئے ماحول میں کیوں سڑ رہی ہو؟"

" گناہ تو ہر آدمی کرتا ہے، لیکن ہر آدمی اپنے لئے سزا خود تجویز نہیں کرتا۔"

" اِسی لئے تو عدالتوں کی انسٹی ٹیوشن قائم ہے۔"

" لیکن ایک عدالت ایسی بھی ہے جس میں صرف ملزم ہی ملزم ہیں، جج کوئی نہیں۔"

" اور میں نے اُسی عدالت کے فیصلے پر اتنے برسوں کا بن باس کاٹا ہے۔" وہ بولا۔

" اور میں نے زندگی کی روشوں پر ببول اُگائے ہیں۔"

" تاکہ بن باس میں رہنے والوں کے پاؤں میں کانٹے چُبھتے رہیں۔"

اُس کی یہ بات سُن کر میرے سِلے ہوئے زخموں سے خُون اُبل پڑا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے آگے سرک کر اپنے ہونٹ میری آنکھوں پر رکھ دیئے۔

" آنسوؤں میں نمک بھی ہوتا ہے سُنتا، یہ میں نے آج جانا ہے۔"

" زندگی میں یہی بات جاننا مشکل ہے۔"

" اور جو یہ بات جان لیتا ہے اُسے زہر کا پیالہ ملتا ہے۔"

" میں نے ان تمام برسوں میں گھونٹ گھونٹ زہر پیا ہے اور زہر سے ہی اپنے زخم دھوئے ہیں۔ اِسی لئے تو اتنے صاف ستھرے ہیں میرے زخم۔" میری آواز میں کپکپی تھی۔ میرا سر اُس کے سینے پر ٹِکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میرے بالوں میں تھے اور اُس کے ہونٹ میری آنکھوں سے سرک کر میرے ماتھے پر جم گئے تھے۔

وہ پانچ برس کے بعد ملنے آیا تھا مجھے۔ کسی پرائیویٹ فرم سے وابستہ ہے۔ چار سال امریکہ میں رہ کر اپنے مُلک میں لوٹ آیا تھا۔ کچھ دیر وہ امریکہ میں گذارے ہوئے دنوں کی باتیں سناتا رہا۔ وہاں کے نظام کی۔ ادب کی۔ نظم کی، ایکٹوں کی، سبھی کچھ۔ اپنے ایک آدھ رومان کی کہانی بھی۔

" آتی بار وہاں سے کسی کو ساتھ کیوں نہیں لے آئے؟"

" زندگی بھر کا ساتھ نبھانا مشکل ہے۔ میرے جیسا آدمی ایڈجسٹ ہی کیا کر سکتا ہے کسی سے؟"

"ایڈجسٹمنٹ تو زندگی کی بہت بڑی ضرورت ہے۔"

"ضرورتیں جتنی کم ہوں زندگی اتنی آسودہ رہتی ہے۔"

"تو جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آگئے ہو۔"

"نہیں - میرے دل پر تجربات کی تحریریں ہیں، جنھیں پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

پھر کھانے کا وقت ہو گیا۔ ملازم نے کھانا کھلوا دیا۔ دن میں آرام کرنے کی اسے عادت نہیں۔ دن بھر گھومتے رہنا پڑھتے رہنا یہ اس کا پرانا دھندہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر پھر اسی کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ سگرٹ پھونکے جا رہا تھا اور باتیں کئے جا رہا تھا۔

"اب تم کمل عورت لگتی ہو۔ جب میں تم سے آخری بار ملا تھا تم ایک معمولی سی لڑکی تھیں، ان پانچ برسوں میں تم میں کتنا انقلاب آگیا ہے۔"

"جسم کا انقلاب بھی اگر انقلاب ہے تو تم پہلے سے کمزور نظر آتے ہو۔ لگتا ہے جیسے فاقے کاٹتے رہے ہو۔"

"کیا جھگڑا ہو گیا تھا تمہارا خاوند سے؟"

"اس کے منہ سے بڑی تیز بو آتی تھی اور وہ دن میں مجھے بیسیوں بار چومنا چاہتا تھا۔"

"جھگڑے کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔"

"اور دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہوا کہ اس کے منہ سے آتی ہوئی یہ تیز بو دراصل اس کی زندگی کی بنیاد تھی۔ اس کے نظریات، اس کی قدریں، اس کا اخلاق، اس کی عادتیں، سب میں ایک تیز، گندی اور تعفن سے بھری بو تھی اور میں نے بدبو سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ تم تو یہ بات جانتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اور؟"

"اور کیا۔ مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اگر میں اس شخص کے ساتھ کچھ عرصہ رہ گئی تو میری رگ رگ میں بدبو سرایت کر جائے گی اور میرے خون میں سڑاند بھر جائے گی اور میرا دل گندے خون کا ایک جوہڑ بن جائے گا۔ وہ جب بھی مجھے پیار کرنے کی کوشش کرتا مجھے لگتا جیسے ایک نہایت گندے جوہڑ میں جونکیں مٹی سے چمٹ کر دھرتی کا رس نچوڑنا چاہتی ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، خاک! میں نے سیپریشن لے لی۔"

"پھر؟"

"پھر تمہارا آسرا۔" میرے منہ سے بڑی تلخی سے یہ الفاظ نکلے۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے وہ مجھ پر طنز کر رہا تھا۔ اور پھر میں ایک دم پھوٹ پڑی۔ اتنا شاید میں اس روز بھی نہیں روئی تھی جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ماں جو کینسر کی مریض تھی اور جس نے میرے لئے ایک ایسا خاوند چنا تھا جس کی تمام زندگی ایک بہت بڑا کینسر تھا۔

"تمہاری سیپریشن کی خبر مجھے ملی تھی لیکن تفصیل معلوم نہیں تھی۔"

"تفصیل سُن کے تو بہت خوش ہوئے ہو گے؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب تم اُس تصویر کو کپڑے پہنانے کی کوشش نہیں کرو گی، وہ تصویر جو تمہارے سامنے ہے۔ زندگی جیسی ہے ویسی ہی رہنے دو، جلد کی بیماریوں کو قیمتی کپڑوں اور تیز خوشبوؤں سے مت چھپاؤ۔"

"اوبناش!" میں نے پہلی بار اُس کا نام لیا تھا۔ پانچ برس کے بعد اسے پکارا تھا۔ میں نے اُسے چاہا تھا لیکن چاہت کو چھپاتی رہی تھی۔ اپنے معصوم، اُجلے پیار کو دھوکوں سے ڈھانپتی رہی تھی اور ایک دن میرے پیار کی تصویر نے کپڑوں کے وہ انبار نوچ کر پھینک دیئے اور آدم زاد ننگا میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس دن سے میں نے محسوس کیا کہ پیار کو کسی بھی لباس کی ضرورت نہیں۔

اُس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میرا ذہن اُس کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے لگا اور اپنے گنبد میں گذشتہ کھوئی ہوئی گونجوں کو ٹٹولنے لگا۔

"میں نے سوچا تھا آج معلوم کروں کیا تم نے اپنے بے خواب کواڑ مقفل کر دیئے تھے یا ابھی کسی روزن سے دھوپ اور چاندنی کی کوئی پرچھائیں اندر جا سکتی تھی۔"

"کیا معلوم تم نے؟"

"ہاں۔"

"کیا!"

"کہ اب مجھے فوراً چلے جانا چاہئے۔"

اُس نے یہ کہہ کر جیسے میرا گلا گھونٹ دیا تھا۔ میرے حلق میں الفاظ اٹک رہے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہ کہ ابھی لمحہ چلا جاؤں گا۔ جانے سے پہلے تمہیں خطوں کا ایک پلندہ دینا چاہتا ہوں جو میں نے تمہیں ان پانچ برسوں میں لکھے ہیں لیکن پوسٹ نہیں کئے۔ انھیں پڑھ چکو گی تو پھر آؤں گا۔ وہ وقت مناسب ہو گا رُکنے کا۔"

یہ کہہ کر اُس نے بریف کیس میں سے ایک پیکٹ نکالا اور تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے اُسے ایک نظر دیکھا اور اُٹھا کر اپنے پہلو میں دھر لیا۔

"لیکن آج تو رُک جاؤ۔"

"نہیں۔ ابھی میرا بن باس پورا نہیں ہوا۔ ابھی تمہارے اُگائے ہوئے پھولوں کے کچھ کانٹے میرے خون کے پیاسے ہیں!"

اور وہ بغیر کسی تمہید کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ صرف ایک بار مجھے اپنی بانہوں میں لے کر میری مانگ کو چوم لیا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مضبوطی سے دبا دیا۔

میں برآمدے میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی اور ظالم نے گیٹ بھی بند نہیں کیا۔ مڑ کر دیکھا بھی نہیں، وہ مضبوط قدم اُٹھاتا سامنے والی سنسان سڑک پر چل پڑا۔ میں بہت دیر برآمدے میں کھڑی رہ کر کمرے میں واپس آ گئی اور خطوں کے اُس پیکٹ کو کھولا۔ اُس نے خطوں کو تاریخ وار ترتیب دے کر رکھا تھا۔ جیسے ہر خط کسی ناول کا باب ہو۔ پہلے خط پر درج وہی تاریخ تھی جس تاریخ کو میری شادی ہوئی تھی اور جس تاریخ کو اُس نے مجھے آخری بار چوم کر کہا تھا۔

"زندگی کا نرگس مت بگڑنے دینا۔"

اور اُس کے بعد میری نظریں اُسے ڈھونڈتی رہی تھیں اور وہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور میں اُس کی صورت کو بھی ترس گئی تھی۔

آخری خط دو مہینے پہلے کا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی جانے کتنی ہی دیر ان خطوں کو پڑھتی رہی اور مجھے محسوس ہوتا رہا جیسے میں نے یہ پانچ برس اونیاش کے ساتھ گذارے ہیں اور دن رات ہر گھڑی اُس کے پاس رہی ہوں اور اُس کے دُکھ درد میں شریک رہی ہوں، جیسے اونیاش اور میں کبھی الگ ہوئے ہی نہ تھے۔ لگ رہا تھا جیسے میں ایک داستان پڑھ رہی تھی جو میری داستان تھی اور جو میں نے خود لکھی تھی۔

اور اس وقت اُس کے آخری خط کی آخری سطریں میرے سامنے ہیں:

"مجھے یہی ڈر ہے کہ تمہاری وہ تصویر جو میرے ذہن میں محفوظ ہے اور جسے میں نے صبح و شام دیکھا ہے۔ چاہا ہے، پُوجا ہے، کہیں غبار سے دُھندلا نہ گئی ہو۔ مجھے اُس تصویر میں کہیں ذرا سی بھی تبدیلی نظر آئی تو میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لوں گا نیتا! اور تمہاری تصویر کو انسانی رشتوں کے بہت وسیع کنڈر میں پھینک کر زہر پی لوں گا ———"

وہ نہیں جانتا کہ میں نے تو خود تمام زندگی زہر پیا ہے اور احساسات کو زہر میں بھگو کر اپنی تصویر کو صاف و شفاف رکھا ہے۔ کبھی سایے تک کا نقش نہیں پڑنے دیا اُس پر۔ کاش یہ سب باتیں وہ مجھ سے ویسے ہی کر لیتا بجائے اس کے کہ ذہن میں تذبذب اور اندیشے لئے کر کسی اگلی ملاقات کا بھروسہ دلا کر یوں اچانک الگ ہو جاتا۔

سورج غروب ہو چکا ہے۔ سائے بھی ڈھل چکے ہیں لیکن میری آنکھوں میں اُس مٹھی بھر دھوپ کی کرچیاں ابھی تک چبھ رہی ہیں جو اُس نے آتے ہی بڑی بے دردی سے مجھ پر پھینک دی تھی۔

آؤٹ گیٹ کے اندر

کرتار سنگھ دُگل

دیویانی اپنی بہار ایسی کوٹھی کے باہر ٹہل رہی ہے

ایسی مخملی گھاس پر جوتے پہن کر چلنا' اسے گنوار پن لگتا ہے۔

ریشم سے ملائم' نرم نرم گھاس پر ٹہلتی ہوئی دیویانی کو سانجھ ہونے لگی ہے۔ یوں اکیلی ٹہلتے ہوئے اسے لگتا ہے مانو ہلکا ہلکا سایہ اندھیرا کسی دن اس کے پورے وجود کو اپنی باہوں میں بھر لے گا اور وہ تیرتی تیرتی دور کسی تارے میں پہنچ جائے گی۔ پھر ایک اور دیویانی کا جیون جینے کے لیے۔

پچھلے کئی دنوں سے دیویانی کو ایسا محسوس ہو رہا ہے' جیسے زندگی اُس کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی جا رہی ہے' دھیرے دھیرے جیسے کوئی آنچل کو سرکا رہا ہو۔ اور پھر وہ ایک ایک چیز کو سنبھالنے بیٹھنے لگتی ہے۔

اس کا پتی' اُس کے مُنہ کی طرف دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہے' لیکن دیویانی نے جیون میں سدا اپنی من مرضی کی ہے۔ اسے کوئی نہیں ٹوک سکتا۔

پچھلے ہفتے وکیل کو بلوا کر دیویانی نے اپنی وصیت لکھوائی ہے' اپنی اور اپنے پتی کی۔ ایک کوٹھی بیٹے کے لیے' ایک کوٹھی بیٹی کے لیے۔ بینک کا آدھا روپیہ بیٹے کے نام' آدھا بیٹی کے نام۔

جب تک "یہ" زندہ ہیں' اس کوٹھی میں رہ سکتے ہیں' ان کے بعد کوٹھی بیٹے کو مل جائے گی۔

جب تک "یہ" زندہ ہیں' بینک سے پیسہ نکلوا سکتے ہیں' ان کے بعد سارا دھن بچوں کا ہو جائے گا۔

جتنی بار ماں' اپنی وصیت کا بچوں سے ذکر کرتی' وہ دونوں ہنس دیتے۔

پچھلے دنوں وہ آئے ہوئے تھے۔ اب اپنے اپنے گھر چلے گئے ہیں' بیٹا لندن میں رہتا ہے۔ کسی بدیسی فرم میں نوکر ہے۔ اس عمر میں اس کی تنخواہ اپنے باپ سے دوگنی ہے۔ جس تنخواہ پر باپ ریٹائر ہوا' بیٹا اسی عمر میں اس سے کہیں زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ بیٹی امریکہ میں ہے پڑھائی کے دنوں میں اپنے پروفیسر سے پریم کرنے لگی۔ وہیں اس نے بیاہ کیا اور وہیں بس گئی۔ اب ہر دوسرے سال جاڑوں میں ماں باپ سے ملنے آتی ہے۔ بے پناہ دولت' اس کا پتی' کالج کا پروفیسر کسی مالدار تاجر کا بیٹا ہے۔

دیویانی کے بیٹے کو ماں باپ کی جائداد کی پرواہ ہے اور نہ ہی دیویانی کی بیٹی کو اس کی کوئی خاص ضرورت ہے۔

اب اپنے دیش میں دیویانی اور اس کا پتی اکیلے ہیں' جیون مرن کے ساتھی۔ اس کا پتی صبح بینک گیا تھا۔ راستے میں شاید اسے ٹھنڈ لگ گئی' پتہ نہیں کہاں سے زکام لے آیا ہے۔ اب اندر پڑا ہے شہر کے باہر اتنی بڑی کوٹھی میں دیویانی اور اس کا پتی' اکانت میں رہتے ہیں پتی ساری عمر کام کر کے تھکا اب آرام کر رہا ہے۔ دیویانی جیسے ساری عمر اس کی باٹ دیکھتی رہی ہو' اور اب جی بھر کر اس کی قربت کا مزہ لے

رہی ہے۔

ننگے پاؤں گھاس پر چلنا دیویانی کو ہمیشہ اچھا لگتا رہا ہے۔ بچپن میں ندی کے کنارے گھاس پر چلا کرتی تھی۔ سُنبلے سُنبلے تازہ تازہ پھوٹے گھاس کے انکھوؤں پر دھیمے دھیمے پگ دھرتے ہوئے دیویانی کو لگتا جیسے کوئی ننھے بچے کے گال سہلا رہا ہو۔ باقی لڑکیاں پانی میں تیرنے کی شوقین تھیں، لیکن دیویانی شبنم میں دُھلے گھاس پر گھنٹوں ٹہلتی رہتی۔

دیویانی کا پتی ہمیشہ اسے ٹوکتا رہتا ہے۔ صبح و شام ننگے پاؤں یوں گھاس پر چلتی ہو، تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی کبھی۔ لیکن دیویانی کو گھاس پر چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ گرمی ہو یا سردی ننگے پاؤں گھاس پر چلنے سے دیویانی کو کوئی منع نہیں کر سکتا۔

ہاں، ایک بار ... ...

اور وہ شام اب دیویانی کو یاد آنے لگی ہے۔ بہت جھجک کی وہ شام، دل کے کسی کونے میں دبی پڑی تھی۔ اب اچانک دیویانی کو یاد آنے لگی ہے۔

کتنے ہی دن کش ہونے کو آتے ہیں!

یونہی اپنے کمرے سے باہر لان میں وہ اُس دن ٹہل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے بار بار اس کی نظر سامنے کوٹھی کے گیٹ پر جا پڑتی۔ ابھی تک وہ نہیں آیا تھا اور دیویانی اپنے دل سے پوچھنے لگی کہ اسے ہو کیا رہا تھا۔ کچھ دنوں سے اُس کے آنے کے سمے وہ اُتاولی کیوں ہونے لگتی تھی۔ ایک ایک کھشن جیسے یگ جتنا لمبا ہوتا جا رہا ہو۔ کمرے کے اندر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ بار بار وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتی۔ یوں بار بار جھانکتے ہوئے جب وہ تھک جاتی تو باہر لان میں آ کر ٹہلنے لگتی، اُس کے انتظار میں۔ بار بار مڑ کر دیکھتی کہ وہ اتنی دیر کیوں کر رہا ہے۔ اونچا لمبا، گورا چٹا، خاموش خاموش شانت گمبھیر، اس کے بول دیویانی کے کانوں میں گونجنے لگتے، جیسے کوئی نغمہ سنا رہا ہو۔

اس کی مسکان دیویانی کی آنکھوں کے سامنے کھیلنے لگتی۔ اس کے موتی جیسے دانت، دیویانی اس کے دانتوں کو دیکھتی اور من ہی من میں کہتی۔ کم بخت! اتنے سندر دانت تو مجھے دے دے۔ مردوں کو ایسے دانتوں کی کیا ضرورت ہے! اور پھر دیویانی کو لگتا کہ وہ تو اس کے پورے وجود کو اپنانا چاہتی ہے۔ دل کے کسی اونچے سنگھاسن پر اسے بٹھانے کے لئے۔

اور یہ تاپ روز بروز چڑھنے لگا، بڑھنے لگا جیسے کوئی میٹھا درد ہو۔ اس کے آنے سے کتنی دیر پہلے وہ اس کی باٹ دیکھنا شروع کر دیتی۔ اتاولی ہونے لگتی۔ ہر صبح اسے اچھی اچھی لگتی۔ ہر سانجھ اس کے ارمانوں کی پٹاری میں نئے پھول چھوڑ جاتی۔ اور پھر ایک دن اس کی چھوٹی بہن نے جیسے اس کے منہ پر چپت دے ماری ہو۔

"دیدی، تمہیں ماسٹر جی کا انتظار ہے؟"

"نہیں تو!"

"تو پھر تم یوں بار بار گیٹ کی اور کیوں دیکھتی ہو؟"

"نہیں تو، نہیں تو... ..."

"ماسٹر جی کے آنے میں ابھی پون گھنٹہ باقی ہے۔"

اور وہ بے چین، باہر لان میں ٹہل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے بار بار اس کی نظر سامنے گیٹ پر جا پڑتی جس ادھر سے اسے آنا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ "آؤٹ" گیٹ سے اندر آتا۔ کئی بار دیویانی جب یہ سوچتی تو سر سے پاؤں تک کانپ جاتی۔ پھر دیویانی کا من کہتا۔ پیدل چلنے والوں کے لیے "ان" گیٹ اور "آؤٹ" گیٹ برابر ہوتے ہیں۔ "ان" گیٹ سے باہر جا سکتے ہیں، "آؤٹ" گیٹ سے اندر آسکتے ہیں۔ "ان" اور "آؤٹ" کا فرق تو موٹر والوں کے لیے ہوتا ہے۔

اور وہ موٹر والا نہیں تھا۔ بے چارہ اسکول ماسٹر، جسے شام کو ٹیوشن پڑھا کر گذارہ کرنا ہوتا تھا۔ ایک دن دیویانی نے سنا۔ اس کی ماں کو وہ بتا رہا تھا۔ کوئی ڈھائی سو روپیہ میں بنا لیتا ہوں۔

ڈھائی سو روپیہ! اور پھر دیویانی کو جب وہ بہت اچھا لگتا، بار بار اس کے کانوں میں جیسے کوئی پھونکنے لگتا "ڈھائی سو روپیہ! ڈھائی سو روپیہ" سے زیادہ پلنے والے تو اس کے باپ کی دوکان پر کئی نوکر تھے۔ اور تو اور مرلی سا نیم تو بھی کھاتہ رکھتا تھا۔ اس کی تنخواہ ڈھائی سو روپیہ تھی، اور دیویانی کے منہ کا سواد پھیکا ہو جاتا۔ کچھ دنوں سے اس کے اندر یہ جو میٹھی میٹھی کسک محسوس ہونے لگی تھی۔ آپ سے آپ دھیرے دھیرے کھو گئی۔

اور ٹھنڈی یخ، دیویانی نے اپنے بھائی چارے میں ایک امیر لڑکے سے بیاہ کر لیا۔ دیویانی سے بھی کہیں زیادہ دولت مند۔ ایک بچہ ایک اور بچہ، اور زندگی خوشی خوشی بیتنے لگی۔ سب کچھ تھا۔ گھر بار، نوکر چاکر، پیسہ عزت! اگر کبھی کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے دیویانی کو لگتا جیسے کوئی چیز اس کے جیون میں سے ایک دم نکل گئی ہو۔ ایک کسک جو کئی برس ہوئے اس کے بھیتر پنپنے لگی تھی، وہ میٹھی آگ پھر کبھی لت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کھویا کھویا سا رہنا، وہ اکھڑا اکھڑا سا رہنا۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی۔ کسی کو پانے کی تڑپ۔ کوئی انتظار۔ جھریری سا کوئی آنسو۔

جب کبھی دیویانی کو اس کا دھیان آتا، آپ سے آپ اس کے قدم باہر لان کو بڑھنے لگتے اور وہ کتنی کتنی دیر ننگے پاؤں گھاس پر ٹہلتی رہتی۔ ٹہلتی رہتی ۔

اپنی کوٹھی کے باہر لان میں ٹہلتے ہوئے دیویانی کو اچانک آج یاد آتا ہے۔ بینک میں سے پیسے نکلوانے گیا اس کا پتی، اس ماہ کے خرچ کے لیے ڈھائی سو روپیہ لایا تھا۔ ڈھائی سو روپیہ گن کر اس نے بٹوے میں رکھے تھے۔ پچھلے مہینے بھی اس نے ڈھائی سو روپے نکلوائے تھے۔ پتی پتنی، ان کا خرچ ہی کیا تھا؟ کوٹھی میں ڈھیر سی سبزیاں انہوں نے اگا رکھی تھیں۔ گھر کا دودھ دہی اور آدمی کی ضرورت ہی کیا ہوتی ہے؟ اس کا پتی نہ شراب پیتا تھا نہ سگریٹ پینے کی ہی لت تھی۔ اور پھر دیویانی کو کئی برس پہلے کی ایک بات یاد آنے لگی۔

"کوئی ڈھائی سو روپیہ میں بنا لیتا ہوں!" اونچا لمبا، گورا چٹا، خاموش، خاموش سا، شانت گمبھیر موتی جیسے دانتوں والا۔

"کوئی ڈھائی سو بنا لیتا ہوں!" — زندگی کی سانجھ ڈھلے دیویانی کو آج لگ رہا ہے جیسے وہ تھک گئی ہو۔

ڈھائی سو روپیہ ہی اس کے پتی کو بینک میں سے کیوں نکلوانے تھے! پچھلے مہینے بھی اس نے ڈھائی سو روپے نکلوائے تھے۔ ڈھائی سو میں انہوں نے گذارہ کیا تھا۔ اس مہینے بھی ڈھائی سو میں وہ گزارہ کرے گی۔ ٹھنڈے یخ ڈھائی سو روپے، مسکراتا دھیمی دھیمی کسک، میٹھا میٹھا درد!

اور دیویانی کو لگتا جیسے کہ وہ تھک گئی ہو۔

پرایا گھر

جیلانی بانو

تمام گھر ایک جیسے ہیں کہیں میں کسی اور گھر میں نہ پہنچ جاؤں!

جب وہ مجھے ہاسپٹل سے گھر لے جا رہے تھے تو میں بار بار یہی سوچ رہا تھا۔

ہسپتال کے ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ کار کے حادثے میں مجھے شدید چوٹ آئی تھی۔ مگر وہ سب جھوٹے ہیں۔ اگر مجھے چوٹ لگی تھی تو اس کا احساس کیوں نہ ہوا۔

وہ سب مجھے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھتے تھے اور ہر وقت میرے بستر کے پاس پہرہ دیتے رہتے تھے جیسے میں اٹھ کر کہیں بھاگ جانے والا ہوں۔

اور آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

وہ لوگ مجھے جانے کس پرائے گھر میں چھوڑ گئے۔ جیسے ہی مجھے سب نے پکڑ کے بستر پر لٹایا، کوئی عورت زور زور سے چلانے لگی۔

"ہائے یہ کیا ہوگیا۔ نہیں نہیں یہ میرا ساجد نہیں ہو سکتا۔ اسے کچھ نہیں ہوا"

اور پھر کسی بچے نے پوچھا۔

"امی یہ چادر اوڑھے کون لیٹا ہے۔ ابا کے پلنگ پر —؟"

اب تو اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ میں غلطی سے کسی اور کے گھر میں آگیا ہوں

مجھے ہمیشہ سے اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ اگر میں بھول کر کسی اور کے گھر میں گھس جاؤں تو کیا ہوگا — ؟ کہیں گھر کے مرد نہ آجائیں — بھاگو — بھاگو — مگر لوگ مجھے چاروں طرف سے پکڑے بیٹھے ہیں۔

"چپ رہو — چپ۔ بھابی — دیکھو کمرے میں کوئی مرد سب کو چپ کراتا پھر رہا ہے — تم لوگ اتنا شور مچاؤ گے تو وہ اور بھی پاگل ہو جائے گا۔ اب کسی طرح اسے بہلاؤ — تاکہ اس کا جی گھر میں لگے"

بہلاؤ — بہلاؤ کیا معنی — یعنی میں اپنا گھر چھوڑ کے اس گھر میں رہ پڑوں! آخر یہ ہے کون بزدل جو اپنے بیوی بچوں کو خود نہیں پال سکتا، اور مجھے زبردستی اپنے پلنگ پر سلا رہا ہے — ہو نہ ہو یہ سب لٹیرے ہیں مجھے لوٹنا چاہتے ہیں — میری کنجیاں کہاں گئیں — ! میری کنجیاں مجھے دو۔

اُوہ — جانے کس احمق کا گھر ہے کہ روشنی کا کمرہ میں نام بھی نہیں ہے —

آج ابھی تک سورج کیوں نہیں نکلا — کہیں اسے بھی کسی اور کے گھر میں قید نہ کر دیا ہو — یا شاید اب رات ہو — مگر رات آئی کدھر سے — ؟ رات ہوتی تو چاند تارے چھت پر نکلتے — چندا ماموں کا۔ آؤ آؤ — کون آیا ہے — ؟ کیا سورج صاحب آگئے! ہاں سورج کو اب آجانا چاہیے — اگر کسی دن صبح ہو جائے اور سورج نہ نکلے تو کیا غضب ہو ——————

پھر میں تو نہ شیو کر سکوں گا نہ چائے پی سکوں گا — بھلا اس اندھیرے کمرے میں کوئی شیو کر سکتا ہے! کہیں اپنی گردن ہی نہ کاٹ لوں۔ ہسپتال کا ڈاکٹر کہتا تھا کہ اب کبھی اپنے ہاتھ سے شیو مت کرنا — کیوں — کیا وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کار کے حادثے میں میرے ہاتھ بھی کٹ گئے ہیں!

اب شیو کا سامان بھی کیسے ملے گا! میری تو کنجیاں ہی کھو گئی ہیں۔ میری ہر چیز غائب ہے — ڈاکو میری ساری دولت لے بھاگے ہیں — اس گھر میں تو چوروں کی بستی آباد ہے — وہ سب مجھے کیسے تعجب سے دیکھتے ہیں — آپس میں کانا پھوسی کرتے ہیں — اور وہ کمانے کر آنے والا فضلو تو مجھے دیکھ کر زور زور سے ہنستا ہے۔ بدتمیز — جاہل گنوار۔

شاید وہ سب بے چارے کسی حادثے میں پاگل ہو گئے ہیں — مثلاً کہیں کار میں جا رہے ہوں گے کہ اچانک — اوہ — میرے سر میں کیسا شدید درد ہو رہا ہے۔ یقیناً کسی نے میرے سر پہ پتھر مارا ہے — جی چاہتا ہے میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دوں۔ سب کو مار مار کے بھرکس نکال دوں۔

مگر اس وقت تو اتنے نرم گرم بستر سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ اور پھر اس آدمی سے بھی ڈر لگ رہا ہے جو دروازے کے اوپر ایک چھوٹی سی کھڑکی میں بیٹھا ہر وقت جھانکتا رہتا ہے۔ میری طرف بڑی طنز بھری نظروں سے دیکھتا ہے — جیسے کہہ رہا ہو — کیوں — کیسے پکڑے گئے —؟

"جاؤ — یہاں سے چلے جاؤ — مجھے چھوڑ دو —" میرے چیخنے کی آواز سن کر ایک موٹی سی تھل تھل عورت اندر آتی ہے۔ اس عورت کا نام نجو ہے۔

(مجھے جانے کیسے یہ بات معلوم ہو گئی ہے!) وہ یہ ڈھونگ رچائے ہوئے ہے کہ میں اس کا شوہر ہوں۔ یہ بھی خوب رہی — اتنی قابل نفرت بدشکل اور بھدی عورت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ میں اس سے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ فی الحال تو میں تمہیں ہاتھ سے بھی چھونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود وہ کئی کئی بار کمرے میں آ کر مجھے ڈانٹتی ہے۔ چپ چاپ لیٹے رہنے کا حکم دیتی ہے۔ اس بات سے مجھے کچھ شبہ ہوتا ہے کہ وہ یقیناً اگلے جنم میں کسی نہ کسی مجھ جیسے مظلوم انسان کی بیوی ضرور رہی ہو گی۔

اس وقت بھی وہ اندر آ کر پوچھتی ہے۔

"کون آیا ہے۔ آپ کسے ڈانٹ رہے ہیں۔؟"

"یہ آدمی! آخر یہ چوبیس گھنٹے مجھے کیوں گھورے جاتا ہے —" میں ہاتھ اٹھا کر کھڑکی میں بیٹھے اس آدمی کو ٹھینگا دکھاتا ہوں۔

"یا اللہ — میرے اوپر رحم کر —" نجو اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کے کہتی ہے:

"وہ بھی کوئی آدمی ہے۔ جس سے آپ ڈر رہے ہیں۔ وہ تو آپ ہی کا فوٹو ہے۔ کیا آپ اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔؟"

نہیں — یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی میں ہوں۔ اگر وہ آدمی "میں" ہوں تو پھر "یہ" "کون ہوں!" ہم دونوں میں سے اصل میں کون ہے! یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ اصل "میں" "کوئی اور" ہے تو کیا ہو گا؟ اب مجھے جلدی سے کہیں چھپ جانا چاہیے۔ میری رضائی کہاں گئی — اب چاہے مجھے کوئی کتنا ہی پکارے میں ہرگز جواب نہیں دوں گا۔

دوسرے کمرے میں کوئی بار بار میرا نام لے کر کچھ کہہ رہا ہے۔

"وہ پاگل نہیں ہوا ہے۔ تم لوگ اس کا علاج نہیں کرواتے۔ کیوں کہ تم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ وہ پھر صحت مند ہو کر تمہاری گردن پہ سوار ہو جائے ———"

اتنی جائیداد — بنک بیلنس —— سات سو روپے پنشن ——'

یہ آدمی یقیناً نو کا شوہر ہے ممکن ہے اب پاگل ہو گیا ہو۔ یا پھر وہ سب مل کر مجھے پاگل بنانے کی سازش کر رہے ہیں۔ مجھے دو ٹکڑوں میں بانٹ کر اوپر لٹکا دیا گیا ہے ۔ یہ لوگ مجھے ہسپتال سے اغوا کر کے لائے ہیں ——

کون ہے —— کون میری رضائی کھینچ رہا ہے —— میں یہاں نہیں ہوں۔ میں تو اوپر کھڑکی سے جھانک رہا ہوں۔

اچھا نو پھر میرے پاس آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں انگوروں سے بھری ایک پلیٹ ہے اور ساتھ میں چند تماشائی بھی ہیں، جنہیں وہ میرا تماشہ دکھانے لائی ہے۔

وہ بڑی محبت سے انگور میرے منہ میں رکھ کر کہتی ہے۔

'حامد — ذرا ہوش میں آئیے۔ دیکھئے آپ کی چچی اماں آئی ہیں۔ نشاط اور اختر آئے ہیں۔ کیا آپ انہیں بھی بھول گئے!'

'کہیئے کیسے مزاج ہیں' ایک صاحب میرے قریب بیٹھ کر پوچھتے ہیں۔

'اچھا اچھا میں سمجھ گیا' میں اس آدمی کو پہچان کر کہتا ہوں۔

'تم ہسپتال والے ہو — مجھے انجکشن دینے آئے ہو' میں جلدی سے اٹھ کر اپنے بچاؤ کے لیے گلدان ہاتھ میں اٹھا لیتا ہوں۔

'چلے جاؤ —— یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ سب کے مزاج بحال کر دوں گا'

پھر میں روتی ہوئی نو کے بھی ایک لات جما کر کہتا ہوں۔

'بس کرو ایکٹنگ — میں مداری کا بندر نہیں ہوں تم جس کا تماشہ سب کو دکھاتی ہو۔ کہو تو ابھی سب کے سامنے تمہارا بھی تماشہ شروع کر دوں ——'

اب تو اس گھر سے بھاگنا ہی پڑے گا۔ واہ کیا مزہ آئے گا۔ جب کسی دن یہ لوگ مجھے اس بستر پر نہ پائیں گے، اور چلا چلا کے میری جائیداد اور پنشن کے لیے روئیں گے۔

مگر اس دوسرے 'میں' نے تو سارا معاملہ ہی چوپٹ کر دیا ہے۔ وہ کمبخت ہر وقت میری نگرانی کرتا ہے —— میں آخر کیوں دو حصوں میں ٹوٹ گیا۔ ایسا ٹوٹا پھوٹا انسان کرے تو کیا کرے ——؟

اس دن میرے کمرے میں دو بچے بھیجے گئے۔

دس گیارہ برس کا ایک بے حد شکی اور محتاط قسم کا لڑکا بچہ۔ وہ بار بار دیکھ رہا تھا کہ میرے ہاتھ میں پتھر تو نہیں ہے۔ اور ایک بے حد خوبصورت منی سی بچی۔ چھوٹی سی گڑیا، جو چابی دینے سے چوں چوں بولتی ہے۔

'چوں چوں —— آؤ آؤ'

لیکن میرے بلانے سے پہلے ہی وہ مجھ سے آ کر لپٹ گئی، اور بچے کے منع کرنے کے باوجود اپنے سنہرے بال میرے سینے پر پھیلا کے کہنے لگی۔

'ابا ابا۔ آپ کو سر میں چوٹ کیسے لگی —— ابا ابا، پپو آپ سے ڈرتا ہے۔ ابا ابا آپ ہمیں تو نہیں ماریں گے نا —— پھر میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر آہستہ سے بولی۔

"ہمیں ایک چھوٹا سا پلین لا دیجئے۔ اس میں بیٹھ کر اپن دور چلے جائیں گے۔
خوب دور ــــ اُڑن ـ زون ـ زون ــــ"

اچانک ہم دونوں واقعی چھوٹے سے پلین میں بیٹھ کر اڑنے لگے ــــ

"ٹاٹا ــ ٹاٹا ــ" چوں چوں ہاتھ ہلا کے نیچے رہ جانے والی ذلیل مخلوق سے کہتی ہے۔
"ٹاٹا ــ ٹاٹا ــ" میں بھی ہاتھ ہلا کے اس اجنبی گھر کے لوگوں سے کہتا ہوں۔
"ٹھہریئے ــ آپ کہاں جا رہے ہیں!"
آخر ان کم بختوں نے مجھے پکڑ ہی لیا۔

"اتنی تیزی سے مت بھاگیے۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے" نمو پیچھے سے مجھے پکڑ لیتی ہے۔
"منی اتر نیچے۔ اب ان کے کاندھے پر سوار ہونے کی عادت چھوڑ دے ــــ تیرے ابا کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔
"چھوڑ دو ــ ہمیں چھوڑ دو ــ ہم پلین میں دلی جا رہے ہیں۔ بہت دور جا رہے ہیں ــ ٹاٹا ــ ٹاٹا"
لیکن منی کو زبردستی اترنا پڑا۔ مجھے بھی مجبوراً اپنے کمرے میں آکر لیٹنا پڑا ــ

اب نمو میرے پاس بیٹھ کر بڑے ناز سے کہتی ہے۔

"خدا کا شکر ہے آپ اپنے بچوں کو نہیں بھولے"

پھر وہ چوں چوں کی طرح میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر میرے اور قریب آجاتی ہے۔
"سچی ــ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ اگر آپ اپنے بچوں کو بھول گئے تو ہمارا کیا ہوگا"
"کیوں تمہارا کیا بگڑ گیا ــ" میں اس سے دور ہٹ کر بیٹھ جاتا ہوں۔
"اے واہ ــ میں کیا اب کمانے نکلتی! آپ کی پنشن آ رہی ہے تو گھر چل رہا ہے ــ اب اس تھوڑی سی جائداد کا سہارا ہی تو رہ گیا ہے۔
امتیاز کی ماں تو خوب عیش کر کے مر گئی۔ اب آپ نے مجھ سے بیاہ کیوں کیا تھا۔ میں ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں ــ؟
یہ عورت یقیناً پاگل ہے۔ ابھی رونا شروع کیا تھا کہ ابھی جھٹ سے ہنسنے لگی۔ اور ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا۔
"لو اس پر دستخط کر دو"
یہ کیا ہے ــ! میں غور سے دیکھتا ہوں کہ کہیں میری غلامی کی دستاویز تو نہیں ہے۔ شاید اس بات کا اقرار ہو کہ میں دو حصوں میں بٹ گیا ہوں۔ ایک تو اوپر کھڑکی میں سے جھانک رہا ہوں۔ اور ایک یہاں ان ظالموں کے جنگل میں پھنسا بیٹھا ہوں۔
"کیا دیکھ رہے ہیں۔ دستخط کر دیجئے نا" نمو یوں بے قرار ہے جیسے انگاروں پر کھڑی ہو۔ میں بڑے غور سے کاغذ دیکھتا ہوں ــــ ایک ہزار ــ ایک ہزار کے ہندسے ابھر ابھر کر مٹ رہے ہیں ــ اچھا تو یہ صرف پیسوں کی بات ہے ــ!
میں جلدی سے دستخط کر دیتا ہوں۔

"امی ــ اگر ابا دستخط کرنا بھی بھول جاتے تو کیا ہوتا!" ہمارے قریب کھڑا ہوا پپو کہہ رہا ہے۔ پپو کے قریب فضلو ہے۔ فضلو کے

زیب تی — اور جانے کون انّی۔ تمّی ہمیں گھیرے کھڑے ہیں۔

"حساب کلم پکڑنا بھول جاتے تو ساری دولت ہاتھ سے گئی تھی"

یہ بات سڑے سیتاپھل کے بیجوں جیسے دانتوں والے فضلو صاحب فرما رہے ہیں۔

"تو چپ — چپ — چپ —" میں اچانک اسے ڈانٹنا شروع کرتا ہوں۔ بڑا آیا دولت کا تماشہ دیکھنے والا۔ اور تو مجھے ہر وقت دیکھ دیکھ کر کیوں ہنستا ہے — یہاں کوئی مداری کا تماشہ ہو رہا ہے۔ یا میرے سر پہ سینگ اُگ آئے ہیں —؟

میری بات سن کر سب ہنس پڑتے ہیں۔ اور مجھے شک ہوتا ہے کہ واقعی میری صورت میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یا پھر یہ بات ہر شخص کو معلوم ہو چکی ہے کہ میں آدھا وہاں کھڑکی میں ہوں جبھی تو سب مجھے اتنے غور غور سے دیکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کھڑکی میں بیٹھا ہوا میں بھی اپنے آپ کو بڑی حیران نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ نہیں۔ اب یہ اول جلول حرکتیں چھوڑ دینا چاہیے۔ کل جب میں ایک مکھی کو مارنے سارے گھر میں ٹانگی لیے پھر رہا تھا تو بہت سے بلب ٹوٹ گئے تھے۔ شیشے کی الماری اوندھی ہو گئی۔ اور فوز کہنے لگی سب لوگ میرا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے شہر کے سینما ہال بند ہو چکے ہیں۔ جبھی تو لوگ تماشہ دیکھنے اس گھر میں آ جاتے ہیں۔ بلکہ تماشہ کرنے بھی —— کل دوپہر یہاں ڈرائنگ ہال میں میٹنی شو چل رہا تھا۔ وہی خوب صورت سی لڑکی تھی ہیروئن تھی۔ اور ایک لمبا سا کالا نوجوان ہیرو تھا۔ وہ لوگ بڑے رومانی موڈ میں تھے۔ یہ چوری ہے — سرِ کھا چوری — میں نے سوچا کہ یہ منظر تو ہر ہندوستانی پکچر میں دیکھ چکا ہوں۔ بس اب گانا شروع ہو گا — تو میرا چاند — میں تیری چاندنی — اگر واقعی گانا شروع ہو گیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔

"بند کرو — خدا کے لیے بند کرو یہ سین"

میں چلّایا تو انھوں نے ڈر کے مارے سچ مچ اس سین کو ادھورا چھوڑ دیا۔

ہیرو تو قلابازیاں کھاتا ہوا باہر بھاگا۔ اور ہیروئن آ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی۔

"ابّا۔ ابّا مجھے معاف کیجیے" وہ رو رہی تھی جھوٹ موٹ کے آنسو۔

"اور مجھے بھی معاف کیجیے۔" میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کر بالکل کسی ہیروئن کے باپ کے انداز میں جواب دیا۔

"میں آپ کے ایسے فضول ڈرامے میں کوئی پارٹ نہیں کر سکتا"

اتنے میں کہیں سے چوں چوں آ گئی۔

آج اس کی گود میں کاغذ کی بہت سی کترنیں تھیں۔

"جلدی لیجیے ابّا — اتنے بہت سے روپے لائی ہوں" اس نے میری گود میں کاغذ ڈالے تو وہ سچ مچ کے ننھے منے نوٹ بن گئے۔

"اب اس نوٹ کا کیک لائیں گے — اور اس نوٹ کا ٹیمن — اور اس نوٹ کا ابّا کے لیے سگریٹ — اور اس نوٹ کا —— وہ ایک ایک نوٹ اٹھا کر بڑی گرہستنوں کے انداز میں اپنی گود میں رکھتی جاتی ہے

"اور اس نوٹ کے ابّا ——"

"ہٹ پاگل ——" پپّو کہتا ہے۔ "کہیں نوٹ سے ابّا خریدے جاتے ہیں۔؟"

"آں ہاں — خریدے جاتے ہیں ۔" چوں چوں بڑے وثوق کے ساتھ کہتی ہے۔

"کیوں ابا آپ نے ہم سب کو ایک نوٹ سے خریدا ہے نا —؟"

"ہاں اور کیا۔ تم سب کو میں نے خریدا ہے۔ تم سب میرے غلام ہو۔ سب میرے حکم پہ یہاں کھڑے ہو جاؤ۔"

میں حکم دیتا ہوں۔ مگر کوئی نہیں سنتا۔

"یہ تو اُلّو کا پٹھا ہے۔" مُنّی کہتی ہے۔

"امی کہتی ہیں رُوپے ہوں تو ہر چیز خرید سکتے ہیں۔"

تو پھر میں کیوں نہ اس دوسرے "میں" کو خرید لوں میں سوچتا ہوں۔ اور منی سے سب رُوپے چھین کر اپنی گود میں چھپا لیتا ہوں۔

"جاؤ بھاگ جاؤ۔ یہ سب روپے میرے ہیں۔"

"نہیں میرے ہیں" — مُنّی رونے لگتی ہے۔ "میرے رُوپے ابا نے لے لیے۔ دے دیجئے۔"

"ان کاغذوں کا آپ کیا کریں گے؟ مُنّی کو دے دیجئے نا۔" اس کی آواز سن کر نبو اندر آ گئی۔

"میں ان روپوں سے ایک "میں" خریدوں گا۔ تم جانتی ہو میں ہمیشہ ادھورا رہا ہوں — دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہوں —؟"

"اللہ خیر،" نبو میری ڈانٹ سن کر سہم جاتی ہے۔"

"جاؤ بچو، تم باہر کھیلو۔ تمہارے ابا کو پھر دورہ پڑنے والا ہے۔"

وہ مجھے کمرے میں بند کر کے چلی جاتی ہے۔

آج اخبار میں خبر آئی ہے کہ رابرٹ کینیڈی کو کسی نے گولی مار کے ہلاک کر دیا

میں بھی اپنے سب دشمنوں کو فائر کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا پستول تو کینیڈی کا قاتل ادھار لے گیا ہے۔ ورنہ میں اس دنیا میں اتنے وحشی اور نکمے لوگوں کو رہنے دیتا —؟

خصوصاً نبو — فضلو اور امتیاز — ان تینوں کو تو ضرور شوٹ کر دینا چاہیے۔ پھر دیکھنا اس دن سورج کیسا چمکیلا نکلے گا۔ لوگ کیسے ہنسیں گے۔

ٹھائیں — ٹھائیں — ٹھائیں — میں اپنے ہاتھوں کی بندوق بنا کر نشانہ بازی کی مشق شروع کر دیتا ہوں۔ لوگ میرے نشانے کی زد میں آ کر دھڑا دھڑ گر رہے ہیں۔ نبو — فضلو — اور ہاسپٹل کا وہ سور کی صورت ڈاکٹر جس نے مجھے زبردستی اس پراگ گھر میں بھجوایا — اور پنشن آفس کا وہ کلرک جو مجھے ہر مہینے دیکھ کر مسکرایا کرتا ہے۔ سب مر گئے — چلو اب خوب موج اڑاؤ — کباب کھاؤ —

آج مجھے کتنی بھوک لگ رہی ہے۔ گذشتہ ایک برس سے میں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ آج میں کباب کھاؤں گا۔ شوب مرچ مسالے والے چٹ پٹے۔ اور اگر کباب نہ ملے تو امتیاز کو بھون کر کھا جاؤں گا۔

کباب لاؤ — جلدی — کباب وانٹیڈ —

مگر کبابوں کی بجائے پھر امتیاز آ گیا۔

یہ لڑکا بھی اسی گھر کا ایک فرد ہے۔ اور ان کی والدۂ محترمہ بار بار یہ جتاتی رہتی ہیں کہ یہ ناخلف صاحبزادے بھی میری ہی اولاد ہیں۔ لاحول ولا— مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگلے جنم میں بھی ہم ایک دوسرے کے دشمن ہی تھے۔ کیوں کہ اب بھی امتیاز کی نظروں میں میرے لیے بڑی حقارت اور نفرت بھری رہتی ہے۔ اور جب بھی میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے "اچھا تمہیں سمجھوں گا بیٹا"

پتہ نہیں یہ لڑکا کس کی دولت پر اکڑتا پھرتا ہے۔ سگریٹ کا دھواں سیکے منہ پر چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اور ہر وقت ماں بیٹے میں روپے پیسے کے لیے لڑائیاں ہوتی ہیں۔ رات کو ایک دو بجے وہ نشے میں چور گھر لوٹتا ہے تو شاید یہ سمجھتا ہوگا کہ میں الکحل کی بدبو کو نہیں پہچان سکتا۔ مجھے تو اس کی ماں کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے آوارہ لڑکے کو میرا بیٹا بنانے کی جرأت اس نے کیسے کی!

میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے امتیاز کے منہ پر اتنے طمانچے ماروں کہ اسے اپنا سچ مچ کا باپ یاد آ جائے۔ مگر اس کے بڑھتے کٹے بدن سے ڈر لگتا ہے۔ جانے کون بدنصیب باپ ہوگا جس کی قسمت میں ایسی اولاد لکھی تھی۔

آج بھی اس نے آتے ہی مجھے حکم دیا۔

"جلدی سے تیار ہو جائیے۔ آج ۸ تاریخ ہے۔ پنشن لانے میرے ساتھ چلنا ہے"

مجھے باہر جانے اور پنشن لانے سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس دن ہم خوب بازاروں کی سیر کرتے ہیں۔ جب میں اپنی پنشن کے اتنے بہت سے روپے اپنی جیب میں رکھنا چاہتا ہوں تو امتیاز مجھے ان پیسوں کی قلفی ملائی لا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے گھر چھوڑ کے کہیں چلا جاتا ہے۔ تو اس کی ماں خوب چیخ دپکار کرتی ہے۔ ایسا اکثر ہر تاریخ کو ہوتا ہے لوگ ادھر سے ادھر گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ وہ کہتی ہے میں اس کا ہوں اس لیے وہ مجھے پنشن لانے اپنے ساتھ لے جائے گی۔ امتیاز کہتا ہے مجھ پر صرف اسی کا حق ہے۔ اس لیے اپنے ساتھ مجھے وہ لے کر جائے گا۔ مگر آج میں امتیاز کو جلانے کے لیے اس کی بات اَن سُنی کر دیتا ہوں۔

"میرے کباب کہاں ہیں۔ جلدی لاؤ مجھے بھوک لگی ہے"

"آپ کپڑے تو بدل لیجیے — وہ بڑی محبت سے کہتا ہے۔ آج آپ کی ساری پنشن کے آپ کو کباب کھلا دوں گا"

آج امتیاز مجھ پر کتنا مہربان ہے۔ آج مجھے نہ تو وہ بار بار ڈانٹتا ہے۔ نہ ڈھنگ سے دے کر کپڑے پہننے پر مجبور کرتا ہے۔

"یا اللہ— کباب کتنے مہنگے ہو گئے ہیں، سات سو روپے میں ایک پلیٹ کباب۔ ! جاؤ۔ آج میں کباب بھی نہیں کھاتا۔ امتیاز کے ساتھ بازار کی سیر بھی نہیں کروں گا۔ آخر میں کیوں جاؤں پنشن لانے! ابھی اگر رضائی تان کر سو جاؤں تو کبھی آنکھ نہ کھلے۔ بس آج یہی فیصلہ کیا ہے۔ مانا کہ اتنے کپڑے بدل کر کہیں جانا تو ایک آفت ہے۔ سارا گھر اکٹھا ہو جاتا ہے۔ کوئی شیو کروا رہا ہے۔ کوئی منہ دھلا رہا ہے۔ اس دن امتیاز خود استری کرکے مجھے کپڑے پہناتا ہے کہ لوگ مجھے ایسی حالت میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ !

لوگ — لوگ — جانے وہ کون لوگ ہیں جن سے اس گھر کے رہنے والے اتنا ڈرتے ہیں کہیں مجھے وہ لوگ مل جائیں تو اس گھر کا سارا کچا چٹھا سنا ڈالوں — یہ تک بتا دوں کہ پرسوں بہو کی غیر موجودگی میں دوسری چابی لگا کر امتیاز نے الماری میں سے کئی زیور نکال لیے ہیں۔ اور شمی عنقریب اس کالے بھجنگ نوجوان کے ساتھ گھر کی دولت سمیت فرار ہونے والی ہے۔ میں دن بھر پردے کے پیچھے سے جھانک جھانک کر سب دیکھتا رہتا ہوں۔ ایک دن بہو ڈگچی میں سے بوٹیاں چن چن کر کھا رہا تھا۔ میں نے اچانک اسے ڈرا دیا تو سب کو سخت حیرانی ہوئی کہ آخر میں ڈائننگ ہال میں

کیسے پہنچا اور کب سے وہاں چھپا کھڑا تھا!

اور یہ فضلو تو اتنا چالاک ہے کہ کیا کہوں! میرے لیے کھانا لا کر تپائی پر رکھتا ہے اور خود ہی کھانے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد ایک دن میں نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ وہ منو سے کہہ رہا تھا کہ صاحب کو کھانا کھلا دیا ہے۔

"نہیں نہیں۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ جلدی کھانا دو۔"
میں نے کھانے کے کمرے میں جا کر کہا۔

"یہ ایک اور مصیبت ہے۔" منو شمی سے کہنے لگی "ابھی فضلو نے کھانا کھلایا ہے اور پھر بھوک لگی ہے۔

"زیادہ کھانے سے آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی نا۔ جائیے آرام کیجیے۔" شمی مجھے کمرے کی طرف دھکیلنے لگی۔

"نہیں مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ فضلو سے پوچھو میں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

مگر فضلو جواب دینے کی بجائے منو کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے۔

"مگر آپ یہاں کیوں آ گئے۔ میز گندی کر دیں گے۔ جائیے میں آپ کے کمرے میں کھانا ابھی بھجواتی ہوں۔" منو نے مجھے کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔

"میرے ابا کو مت مارو۔ مت مارو۔" چوں چوں باہر چلا رہی ہے۔ رو رہی ہے۔

"چپ۔ چپ۔ بڑی آئی ابا کی بیٹی۔" منو چوں چوں کو بھی مار رہی ہے۔

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔" میں نے زور زور سے کواڑوں پر اپنا سر مارنا شروع کر دیا تو دروازہ کھل گیا۔

کیا چوں چوں کو مار ڈالا۔ میں نے اپنے ماتھے پر سے بہتا ہوا خون پونچھ کر دیکھا تو وہ ایک کونے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف باہیں پھیلائے دوڑتے ہیں۔

منو نے مجھے کمرے میں بٹھانے کی ایک اور ترکیب نکالی۔

وہ طرح طرح کے لوگوں کو میرے پاس لاتی ہے کہ میں ان سے باتیں کر کے اپنا جی بہلاؤں۔

پرسوں ایک پاگل صاحب تشریف لائے۔ نقلی داڑھی لگا کر آئے تھے۔ وہ بار بار ہوا میں اڑتی تو گھبرا کے یوں پکڑتے جیسے بھید کھلنے کا ڈر ہو۔ مجھے دیکھتے ہی یوں گلے سے لپٹ گئے، جیسے برسوں پرانی دوستی ہو۔

"کہو یار کیسے ہو۔ طبیعت اب ٹھیک رہتی ہے۔" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں تم اپنی سناؤ۔ یہ نقلی داڑھی کیسے لگاتے ہو؟"

وہ میری بات سن کر پیچھے کو ہٹے۔ لیکن میں انہیں پکڑ کے بٹھا لیتا ہوں۔ کیا برا ہے اگر کچھ وقت کسی پاگل کے ساتھ ضائع ہو جائے۔
اب وہ مجھ سے بہت دور ہٹ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گئے۔

"کئی بار ارادہ کیا کہ تمہیں دیکھ آؤں۔ مگر ڈر ہی لگتا تھا کہ جانے تم مجھے پہچانو گے یا نہیں۔" وہ اپنی داڑھی سہلا کے بولے۔

"ہاں اب تم بیچارے اپنی دماغی بیماری سے بدل ہو گئے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں نہیں — وہ بابا نے کیوں میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ کہتے ہیں پاگل ہمیشہ دوسروں کو پاگل سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بڑھے بھی مجھ ہی کو پاگل سمجھ رہے ہوں۔

"یار مجھے تمہاری بیماری کا بہت دکھ ہے۔ کیا کریں! اللہ کی مرضی۔ وہ کہتے ہیں۔

"اور مجھے تمہاری اس نقلی داڑھی پر بے حد پیار آ رہا ہے۔ ایک دن کے لیے ہمیں ادھار نہیں دو گے! ہم چوں چوں کے ساتھ ڈاکو ڈاکو والا کھیل کھیلیں گے۔"

لیکن وہ میری بات سن کر دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں اور پھر رک کر فرماتے ہیں —" یار کچھ سمجھداری کی باتیں بھی کرو۔ سنا ہے بھابی نے تمہارا علاج معالجہ کچھ نہیں کروایا۔ کیا تم اپنی ساری پنشن بھی ان ہی لوگوں کے حوالے کر دیتے ہو یا کچھ اپنے لئے بھی رکھتے ہو —؟

پھر وہی پنشن کی بات! ایسا لگتا ہے جیسے میرا دوسرا "میں" کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اور بس میں جو ہوں۔ یہ ایک پنشن کا نام ہے۔ ہر شخص مجھے یوں دیکھتا ہے، جیسے میں آدمی نہیں رہا، پنشن بن گیا ہوں۔ جسے دیکھو اسی کا ذکر۔ اسی کی بات۔ جی چاہتا ہے اس پنشن کو کسی طرح اپنے منہ پر سے نوچ پھینکوں۔ پتہ نہیں پھر میں اس گھر میں کسی کو نظر بھی آؤں گا یا نہیں!

مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ اس پاگل سے مجھے کب چھٹکارا ملا۔ فضلو کہہ رہا تھا کہ جب میں نے زبردستی داڑھی چھیننے کی کوشش کی تو وہ ڈر کے مارے بھاگ گیا۔

بھلا ایسے سرپھرے پاگلوں کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا ہے۔!

ایسا ہی ایک اور بہروپیا میرے کمرے میں آیا تھا۔ حسب توقع وہی میری اور اپنی پرانی دوستی کا ڈھونگ رچایا اور پرانے قصے سنانے لگا، جو بالکل جھوٹے تھے۔ پھر میری آنکھ بچا کر میرا پارکر پن اپنی جیب میں ڈال لیا اور میرے سب سگریٹ پھونک ڈالے۔ پھر جاتے وقت میرے سر پر احسان کا ایک چھپر رکھ گئے کہ آج کل منو کا دل بہلانے میں وقت صرف کرتے ہیں۔ تاکہ میری بیماری سے اس کا دل بالکل ہی نہ ٹوٹ جائے بلکہ یہ انکشاف بھی فرمایا کہ ہسپتال سے اس اجنبی گھر میں لانے کے ذمہ دار بھی یہی حضرت تھے۔ اتنا سنتے ہی میں بے قابو ہو گیا۔

"اچھا تو تم ہی ہو جس نے مجھے اس پرائے گھر کی دوزخ میں ڈال دیا ہے۔ آخر مجھے ستانے میں تمہیں کیا مل گیا —؟

"ابھی نہیں ملا۔ مگر مل جائے گا۔" وہ مکاری سے مسکرایا۔

"یہ بات ہے تو میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔ ابھی تمہارے کچے چٹھے کھولتا ہوں۔"

میں فوراً فون کا ڈائل گھماتا ہوں۔ ہیلو — ہیلو —

"میرا چھوٹا فون دے دیجئے — چوں چوں جلدی سے آ کر اپنا چھوٹا سا سرخ نیلا فون مجھ سے چھین لیتی ہے۔" لائیے میں کر دوں — آپ کس کو فون کریں گے؟"

"پولیس سٹیشن — پولیس کو جلدی بلاؤ چوں چوں ورنہ مجرم فرار ہو جائیں گے۔" میں سخت پریشانی میں کہتا ہوں۔

"ہیلو —" چوں چوں بڑی سنجیدگی سے فون کان سے لگا کر زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔

"جلدی آئیے — ابا کو سب ستا رہے ہیں۔ کھانا نہیں دیتے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اس کھیل سے اُکتا جاتے ہیں۔

"اب فون کا کھیل ختم ۔ چلیے چلیے اب چور کو پکڑیں گے" اور پھر ہم دونوں سچ مچ چور کو تلاش کرنا شروع کر رہے ہیں۔

"ہشت ۔ آہستہ چلیے" چوں چوں مُنہ پہ انگلی رکھ کر کہتی ہے۔

اب ہم دونوں گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے پلنگوں کے نیچے گھسٹ رہے ہیں۔ اچانک میرا سر مسہری کے پائے سے ٹکراتا ہے اور آہٹ سُن کر کوئی نیچے کود جاتا ہے۔

"چور ۔ چور ۔" میں چور کی ٹانگ پکڑ کے چلانے لگا "جلدی میرا پستول لاؤ ۔ چور پکڑ لیا ہے۔"

"چور پکڑ لیا ۔ چور پکڑ لیا" چوں چوں بھی زور زور سے تالیاں بجانے لگی۔

"انہیں چھوڑ دیجئے ۔ چھوڑ دیجئے ۔ بچے آ جائیں گے۔ شور مت مچائیے" ممو مسہری پر سے اٹھ کر کہہ رہی ہے ۔ تب میں نے غور کیا کہ جس چور کو ہم نے پکڑا ہے ۔ یہ وہی آدمی ہے جو ابھی مجھ سے باتیں کر رہا تھا ۔ ہماری آواز سُن کر سارا گھر کمرے میں اکٹھا ہو گیا ۔ شی ۔ فضلو ۔ پپو ۔ امتیاز وہ سب بڑی حیرانی کے ساتھ کبھی مجھے دیکھتے ہیں اور کبھی اس آدمی کو ۔ پھر سر جھکا کے کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں۔

عجیب بزدل لوگ ہیں یہ ۔ میں دل میں سوچتا ہوں ۔ چور کو سزا دینے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے ۔ ؟

ممو ساری رات اپنے کمرے میں بڑبڑاتی رہی ۔

"نہیں وہ پاگل نہیں ہے ۔ سب ڈھونگ رچا رکھا ہے ۔ اپنے آپ کو بھول گیا ۔ مگر میری نگرانی کرنا نہیں بھولتا"

ایک دن عجیب حادثہ ہوا ۔

کیا دیکھتا ہوں کہ رات ختم ہو گئی ہے ۔ سب لوگ جاگ اُٹھے ۔

میرے کمرے میں بھی اُجالا تو ہے ۔ مگر دھوپ کا کہیں پتہ نہیں ہے ۔ کہیں رات وہ چور سورج کو تو چرا کے نہیں لے گیا! مجھے بڑی تشویش ہونے لگی ۔ پھر جب چوں چوں اپنا ٹیلی فون لے کر آئی تو میں نے اسے فوراً یہ وحشت ناک خبر سُنائی ۔

"رات چور سورج کو چرا کے لے گیا"

"کہاں لے گیا ۔ ؟ چوں چوں بھی سخت فکر مند ہو گئی ۔ اس گھر میں اس بچی سے زیادہ سمجھدار اور کوئی نہ تھا ۔

"کیا پتہ ۔ دیکھو نا رات سے کیسا اندھیرا اندھیرا سا ہے ۔ اب میری تو بھرپور دولت ہی لُٹ گئی ۔ سورج نہ رہا تو دن کیسے نکلے گا ۔ میں بستر سے کیسے اٹھوں گا ۔ ؟"

میں غم کے مارے رونے لگا ۔ چوں چوں نے مجھے روتے دیکھ کر اپنے کھلونے پھینک دیئے اور حسبِ عادت اپنے سنہرے بال میرے سینے پر پھیلا کے بولی ۔

"میں ایک بڑا سا سورج آپ کو خرید کر لا دوں گی ۔ میرے پاس دو پیسے ہیں"

"بے وقوف ۔ سورج کہیں بکتا ہے ۔ !" میں اس کی نادانی پر ہنسنے لگا ۔

"پھر آپ کے پاس کیسے آیا تھا ۔ ؟" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کے پوچھا ۔

تو۔ اب ایک نیا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ آخر سورج میرے پاس کیسے آیا تھا۔ کیوں آیا تھا!
کیا اُسے بھی میری پنشن کی سُن گُن لگ گئی تھی۔ یا پھر اس "دوسرے" میں کی اسے بھی خبر ہوگئی تھی۔!
" وہ کون ہے ۔۔؟" میں نے چوں چوں کو انگلی سے اوپر دکھایا۔
" وہ ۔۔ ! وہ ۔۔ ؟ بڑی دیر تک وہ گردن اوپر اٹھائے غور سے۔ "دوسرے میں" کو دیکھتی رہی ۔۔" وہ ابا ہیں"
" کس کے ابا ۔۔ ؟ میں خوش ہوگیا کہ وہ کوئی اور نکلا۔
" میرے ۔۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔
" وہ آپ ہیں "
میں ۔۔ ؟ میں پھر لرز اٹھا۔ تو اب اتنے اتنے سے بچوں میں بھی یہ بات پھیل چکی ہے کہ میں دو حصوں میں بٹ چکا ہوں۔
" تمہیں معلوم ہے چوں چوں کہ مجھے وہاں کس نے ٹانگا ہے ۔؟ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑی رازداری میں پوچھا۔
" امی نے "۔ اس نے بھی اتنی ہی احتیاط کے ساتھ کان میں کہا" ایک دن امی نے آپ کو شیشے میں بند کرکے، رسی لگا کے وہاں ٹانگ دیا تھا"
" شیشے میں بند کر کے ؟ رسی لگا کے ۔۔ ؟ یعنی مجھے مار ڈالا گیا ہے ۔ گویا مجھے پھانسی دی گئی ہے ۔! پھر میں کیوں اس پلنگ پر لیٹوں! میں تو مر چکا ہوں ۔ میرا اب اس دُنیا سے کیا واسطہ رہا۔
میں دیوار سے لگ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا کہ پھر وہ کمرے میں نازل ہوئی۔ جب سے میں نے جوڑ پکڑا تھا۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھی۔ مگر اس وقت تو وہ اپنی آواز میں شکر گھول کر آئی تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے زبردستی دیوار سے ہٹانے کی کوشش کی۔ پھر ہار مان کے خود بھی میرے قریب آ بیٹھی۔
آج وہ مجھ سے بجدا ہم مشورے کر رہی تھی اور بڑی بے تکلفی سے "میری پنشن" کو " اپنی پنشن" اور اپنے بچوں کو " میرے بچے" کہے جا رہی تھی۔
اسے تیس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ مکان بیچنا چاہتی ہے اور بنک میں جتنا روپیہ ہے اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے تاکہ شمّی کا بیاہ ہو سکے اور امتیاز کا حصہ اسے دے کر گھر سے رخصت کر دیں ۔۔ میں سب سنتا ہوں۔ سچ مچ کے مظلوم شوہروں کی طرح حالانکہ پنشن اور بنک کی باتیں مجھے سخت بور کرتی ہیں۔ لیکن پھر بھی میں بڑی دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے خوب ڈانٹتا ہوں۔
" چپ رہو۔ اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم نے مجھے مار ڈالا ہے میرے گلے میں رسّی ڈال کر مجھے پھانسی دی گئی ہے "
یہ سن کر وہ میرے قدموں سے لپٹ جاتی ہے ۔۔" اس رات والی بات بھول جاؤ۔
حامد۔ مجھے معاف کر دو۔ اب کبھی تمہیں دھوکا نہیں دوں گی "
" واہ کیوں معاف کر دوں؟ میں نے اب اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔
" تم نے میرا سورج چرا لیا ہے۔ بھلا اتنا اندھیرا کبھی دُنیا میں ہوا تھا۔ ! اور میرا پستول چھپا لیا ہے کہ میں کسی چور کو نہ مار سکوں ۔۔

تمہیں کچھ خبر ہے کہ اس گھر کے کونے کونے میں کتنے چور چھپے بیٹھے ہیں — ! میں کس کس کو دیکھوں — ؟ یہ گھر ہے یا فلم اسٹوڈیو جہاں ہر وقت رومانی شارٹس فلمائے جاتے ہیں — نہیں — میں ایسے فضول ڈراموں میں کوئی پارٹ ادا نہیں کر سکتا۔"

اچانک میری نگاہ اوپر گئی' جہاں شیشے کے کیس میں بند کر کے مجھے رسی سے لٹکا دیا گیا ہے۔

"مجھے پھانسی کس نے دی — ! میرے ٹکڑے تم نے کیے ہیں — میں تو اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

منو زور زور سے چلانے لگی — کیوں کہ میرے ہاتھ میں جو جو چیزیں آئیں میں نے اٹھا کر اسے مارنا شروع کر دیا تھا — پھر جو بھی مجھے پکڑنے آیا وہ خود زخمی ہو کر بھاگا۔ آج میں سب کو مار ڈالوں گا — سب کو شوٹ کر دوں گا — ایک بڑا سا پتھر اٹھائے میں سارے گھر میں چیختا پھر رہا تھا۔

"لوگو — ذرا اس آدمی کی حالت دیکھو۔" منو چلا چلا کر محلے والوں سے کہہ رہی تھی۔

"میں آج ہی ساری جائیداد اپنے نام کروں گی۔"

"ٹھیک ہے — ابا کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا — امتیاز بھی کمرے سے نکل کر لڑائی میں حصہ لے رہا تھا۔

"اچھا — ! خبردار جو انہیں چھوا۔" منو ہاتھ نچا رہی تھی — بڑے آئے باپ کی محبت کرنے والے — اپنے ساتھ انہیں لے جا کر سات سو کی پنشن پر قبضہ کرنا چاہتے ہو — انہیں کوئی اس گھر سے نہیں لے کر جا سکتا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا بھی تو ایک سہارا ہے۔"

وہ سب اتنی زور زور سے لڑ رہے ہیں کہ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میں پتھر پھینک کر سوچتا ہوں کہ کیا واقعی امتیاز مجھے اس پرانے گھر سے لے جائے گا — ؟

اس بات کی خبر اس دوسرے "میں" کو نہیں ہونا چاہیے — میں اسے یہیں چھوڑنا چاہتا ہوں' ان خونخوار لوگوں سے نبٹنے کے لیے۔

"چوں چوں آؤ ہم تم کہیں بھاگ چلیں۔"

میں نے لڑائی کے ڈر سے سہمی ہوئی چوں چوں کو اٹھا کر کاندھے پر بٹھا لیا۔

"کہاں — ؟ کہاں جائیں گے — ! وہ اپنی گڑیا اور اسے نہلانے کی ننھی سی بالٹی پھینک کر میرے کاندھے پر بیٹھ گئی۔

"دور — خوب دور — وہاں سورج کے پاس۔

میں بڑے اطمینان سے پھاٹک کھول کر باہر آ گیا۔ کیونکہ اس وقت وہ سب آپس میں لڑ رہے ہیں۔ انہیں اپنے اپنے حصے کی دولت سمیٹنے میں اتنے حواس کہاں ہیں کہ ہمیں پکڑ سکیں۔

مگر اچانک میں بھول گیا کہ وہ لوگ آخر کیوں لڑ رہے تھے ! شاید کوئی آدمی مر گیا جسے وہ بہت چاہتے تھے۔ شاید سورج مر گیا ہے — یا پھر میری پنشن مر گئی ہے۔

"ابا ابا، بھائی جان آپ کی پنشن کے لیے امی کو مار رہے ہیں — چوں چوں کہتی ہے۔

پنشن کے لیے — ! اب میں کیا کروں — کہیں امتیاز اب مجھے بھی مارنا شروع نہ کر دے۔

"ابا ابا، آپ اپنی پنشن کو وہاں ندی میں پھینک دیجئے نا — پھر سب لڑائیاں ختم ہو جائیں گی۔

چوں چوں مجھے مشورہ دیتی ہے — پھر اچانک تالیاں بجانا شروع کر دیتی ہے۔

"ابّا ابّا، دیکھیے سورج پل گیا — وہ وہاں ندی میں چھپ رہا ہے — جلدی چلیے" ارے — واقعی سورج ہے — اسے کسی چور نے نہیں چرایا ہمیں دیکھ کر وہ جلدی جلدی پانی میں چھپ رہا تھا۔

"ارے ابّا ابّا — جلدی بھاگیے — وہ دیکھیے امّی آپ کو پکڑنے آ رہی ہیں —

چوں چوں میرے کاندھے پر بیٹھی بیٹھی چاروں طرف کی اطلاعیں دے رہی ہے ۔

ارے باپ رے باپ — میں اور تیز تیز بھاگنے لگتا ہوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تو ّسے چھپ کر کہاں جاؤں — سامنے تو دور دور تک پانی ہی پانی ہے — چوں چوں' چلو اس پانی میں چھپ جائیں — پھر دیکھیں کون ہمیں کیسے پکڑتا ہے —

رسٹ واچ

رام لعل

یہ کمرہ اب نیرجا اور سبھاش کو رہنے کے لیے ملا ہے۔ چند روز پہلے تک اس میں ملہوترا صاحب رہا کرتے تھے۔ نیرجا کے سسر اور سبھاش کے پتا، وہ اب نہیں رہے۔ نیرجا اپنے کمرے کو خود ہی ٹھیک کرا رہی ہے۔ نوکروں سے اپنا سامان جو وہ جہیز میں ساتھ لے کر آئی ہے بڑی حفاظت سے لگوا رہی ہے۔ پلنگ، میز، کرسیاں! نوکر کوئی چیز توڑ نہ دیں! وہ بار بار انہیں تنبیہ کرتی ہے۔ بہت ہی دھیمی آواز میں، ابھی اس کی آواز میں وہ بے تکلفی نہیں آئی جو گھر کے دوسرے افراد میں ہے، نوکر اس کا ہر حکم بجا لانے میں بڑی سعادت مندی دکھا رہے ہیں، لیکن وہ چھوٹی بہو کے شرمیلے پن پر زیر لب مسکراتے بھی پھرتے ہیں۔

دیوار میں ایک بڑی الماری فٹ ہے۔ اس میں ملہوترا صاحب کی قانون کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، یہ کتابیں اب کسی کے کام کی نہیں، گھر میں ان کے بعد قانون کسی اور نے نہیں پڑھا۔ سبھاش ایک فرم کا ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر (ADMINISTRTOR) ہے۔ اس کے دونوں بڑے بھائی بزنس کرتے ہیں، سبھاش صبح دفتر جانے سے پہلے نیرجا سے کہہ گیا تھا " ان کتابوں کو مت ہٹانا، یہ یہیں پر رہیں گی۔"

وہ اپنے پتی کے جذبات کو سمجھتی ہے۔ وہ اپنے باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے، بہت لاڈلا، کئی بار اپنے باپ سے الجھا، کئی باتوں پر ان سے ڈانٹ بھی کھائی، ان کا پیار بھی پایا۔ جب باپ کی اچانک موت ہوئی تو ان کے ساتھ لپٹ لپٹ کر کس طرح سے رویا تھا! نیرجا کی آنکھوں کے سامنے سارا منظر موجود ہے ابھی تک! ان کو مرے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں! ان کی شادی کے فوراً بعد ان کی مرتیو! شادی والے گھر میں سوگ! لیکن کسی نے اسے نہ کوسا! عام طور پر دلہنیں ہی ایسی درگھٹناؤں کے لیے ذمہ دار ٹھہرائی جاتی ہیں، لیکن سبھاش نیرجا سے اتنی محبت کرتا ہے، جسے دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں ہوئی زبان چلانے کی!

نیرجا خود بھی اداس ہے۔ اس کمرے میں آکر وہ کتنی دیر تک روئی ہے۔ جب ساس نے اور گھر کے دوسرے لوگوں نے اسے آکر سمجھایا تب کہیں وہ اپنا سامان رکھوانے پر راضی ہوئی۔ وہ اب بھی بھری بھری آنکھوں سے کتابوں والی الماری کی طرف دیکھتی ہے۔ موٹی موٹی پٹھے کی جلدوں والی قانون کی کتابیں۔ ان پر گرد پڑی ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے وہ انہیں جوں کا توں ہی رکھے گی لیکن ان کی گرد ضرور صاف کرے گی۔

ایک نوکر فرش پونچھ رہا ہے۔ دوسرا نوکر بڑی ماں کے بلانے پر باہر چلا گیا ہے۔ وہ اسٹول پر چڑھ کر اور ایک جھاڑن ہاتھ میں لے کر الماری کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ نوکر اس کے ہاتھ سے جھاڑن لے لینا چاہتا ہے، لیکن وہ اسے اپنا کام کرنے کو کہتی ہے جس میں وہ پہلے سے لگا ہوا ہے۔

نیرجا الماری کے سامنے اسٹول پر کھڑی ہوئی کتنی عجیب سی لگ رہی ہے۔ وہ یوں بھی نئی نئی ہی لگتی ہے۔ لباس سے شکل سے۔ لب و لہجے سے اور لوگوں کے برتاؤ سے جو وہ اس کے ساتھ کرتے ہیں! یعنی کوئی اس سے کام کرنے کو نہیں کہتا۔ کوئی اس کے ساتھ بہت زیادہ بے تکلفی

سے نہیں ہوتا، سب اس کی عزت کرتے ہیں، اُس کا لحاظ کرتے ہیں۔

جس دن نیرجا دلہن بن کر اس گھر میں آئی تھی اسے سب سے پہلے یہاں کے بڑوں کے چرن چھونے پڑے تھے۔ یہ رسم دلہنوں کے لیے اور پریوار کے لیے بھی بہت شُبھ مانی جاتی ہے۔ بزرگ دلہنوں کو آشیرواد دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ حسبِ توفیق کچھ بخشیش بھی دیتے ہیں۔ روپے، زیور، ہر چیز؛ جیسا کوئی چاہے!

نیرجا کو اس کی نند مینا ایک ایک بزرگ کے پاس لے گئی تھی۔ نیرجا اور سُبھاش سے اگر کوئی چند روز بھی بڑا تھا تو وہ اس وقت بزرگ بن گیا تھا۔ اس حساب سے مینا خود بھی اس سے بڑی تھی۔ سب سے پہلے اُس نے خود نیرجا کو ایک لاکٹ دیا تھا۔ عالی شان کوٹھی کے کئی کمرے تھے۔ مہمانوں کی ہر طرف ریل پیل تھی۔ کمروں کے اندر، باہر، برآمدوں میں اور آنگن اور لان میں جگہ جگہ کرسیاں، پلنگ بکھرے پڑے تھے۔ عورتیں مرد اور بچے بھی اس رسم کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو اُٹھے۔ دلہن کے آگے پیچھے بھیڑ بنا کر چلنے لگے۔ نیرجا گھونگھٹ کاڑھے چلتی رہی۔ مینا سب کو آگے چلنے سے منع کرتی رہی۔ لیکن بچے تھے کہ ہر جگہ پر گھسے ہی پڑتے۔ دلہن کس طرح سر جھکا کر چرن چھوتی ہے۔ بڑے کس طرح اسے آشیرواد دیتے ہیں۔ لے کتنا کچھ دیتے ہیں۔ یہ سب دیکھنا اور یاد رکھنا اور پھر سب کو بار بار بتانا بھی جیسے بچوں اور عورتوں کے لیے ایک بہت ضروری کام تھا۔

نیرجا کو اس کی ساس نے گھر کی ساری چابیوں کا گچھا ہی تھما دیا تھا اور اس کا سر چوم کر کہا تھا ــ "لے بہو، تو ہی آج سے اس گھر کی مالک ہے!"

مظفر نگر کی شوکر والی چاچی سے اُسے سو کا ایک نیا نیا نوٹ ملا تھا۔

سُبھاش کے وائڈ ورکس والے ماما جی نے اسے سونے کی ایک انگوٹھی پہنائی تھی۔

رادھے شام اور کرشن چندر دونوں بڑے بھائیوں اور اُن کی بیویوں نے مل کر پچاس پچاس روپے دیئے تھے۔ تین بڑے پھوپھاؤں نے اُسے بیس بیس روپے دیئے تھے۔ لیکن چھوٹے پھوپھا نے صرف پانچ ہی دیئے تھے۔ اس پر اس کی نند مینا نے مذاقاً طنز بھی کیا تھا ــ "بس پھوپھا جی! صرف پانچ ہی!"

وہ بیچارا کھسیا کر رہ گیا اور ایک بیڑی سُلگاتا ہوا دور ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

نیرجا کا آنچل روپوں سے بھرتا چلا گیا تھا۔ مینا سب کے ساتھ اس کا پریچے بھی کراتی چلی گئی تھی۔ لیکن وہ سب کے نام فوراً کیسے یاد کر لیتی! اسے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ پریوار خاصا بڑا ہے۔ خوشحال ہے۔ مہذب اور شریف لوگوں کا ہے۔ لیکن ابھی تک اُسے اپنے سُسر صاحب کے پاؤں چھونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ڈرائنگ رُوم میں اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہے۔ انہیں بس تھوڑی ہی دیر کے لیے باہر آ جانے کے لیے کہلا دیا گیا تھا۔ لیکن وہ بہت دیر تک باہر نہیں آپائے تھے۔ ایک مرتبہ مینا انہیں بُلانے کے لئے گئی۔ ایک بار ان کے چھوٹے بھائی گئے۔ دونوں بار یہی جواب ملا وہ ابھی مصروف ہیں۔ کچھ دیر بعد آئیں گے۔

جب وہ صرف بہت دیر تک آشیرواد دینے کے لیے نہ نکلے تو اچانک جیسے سب کچھ تھم گیا۔ نیرجا اور اس کی نند کے قدم بھی اور تماشا دیکھنے والے بچوں و عورتوں کی باتیں بھی۔ اب گھر میں کوئی ایسا بزرگ نہیں بچا تھا جس کے چرن نیرجا چھو نہ چکی ہو۔ اب صرف مہوترا صاحب ہی باقی تھے، جن کے پاس جانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ آخری بار انہوں نے بڑے غصے میں جواب دیا تھا۔

"مجھے پریشان مت کرو۔ میں فرصت ملنے پر آشیرواد دے دوں گا۔"

یہ بات نیرجا کے کانوں میں پڑی تو اسے ایک دھکا سا لگا۔ وہ من ہی من میں دکھی ہوگئی۔ کسی قدر روہانسی بھی۔ لیکن وہ اسے برداشت کر گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ وہاں اور بھی کئی تھے۔ دو ایک نوعمر لڑکیاں سر کھڑے آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھیں۔ دو منچلے نئے کپڑوں کے لیے ضد کر رہے تھے۔ سبھاش بار بار اس کمرے کی طرف آ نکلتا، لیکن دلہن کو اکیلا نہ پا کر لوٹ جاتا تھا۔ ایک بار وہ نیرجا کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی دیا جس پر نیرجا نے جلدی سے سر جھکا لیا۔ اس پر لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

اس رشتے کی ملہوترا صاحب نے سخت مخالفت کی تھی۔ جس دن سے رشتے کی بات چیت چلی تھی وہ بار بار کہہ رہے تھے مجھے یہ منظور نہیں ہے۔

پہلے انہوں نے کہا "لڑکی قبول صورت نہیں ہے" یہ وہی دن تھا جب وہ اپنے بیٹے سبھاش، اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ نیرجا کو دیکھنے کے لیے گئے تھے، لیکن سبھاش نے تو نیرجا کو دیکھتے ہی اُسے پسند کر لیا تھا۔

لڑکے کی خواہش دیکھ کر انہوں نے نیرجا کے ماں باپ کی مفلسی کا بہانہ بنایا لیکن نیرجا کے باپ نے کہلا بھیجا ان کی تو ایک ہی بیٹی ہے۔ اس کی شادی کے لیے انہوں نے جتنا کچھ جمع کر رکھا ہے سب خرچ کر دیں گے۔ اس کے علاوہ بھی وہ ان کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں۔

ملہوترا صاحب ہار گئے۔ آخر میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا لڑکے کی ضد میری جان ہی لے کر ٹلے گی! انہوں نے سچ مچ کئی بار دل کی گھبراہٹ کی شکایت کی۔ لڑکے کی ضد نے ان کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

شادی سے پہلے سبھاش اکثر اپنے دفتر سے نکل کر نیرجا کے کالج جا پہنچتا تھا۔ اُسے اپنی اسکوٹر پر پیچھے بٹھا کر کسی ریسٹوران میں لے جاتا۔ نیرجا کے سامنے اپنے باپ کی بے جا ضد کا مذاق اڑاتا۔ اسے یہ بھی بتاتا کہ میرے ڈیڈی یہ سمجھتے ہیں تم نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا ہے!"

یہ سُن کر نیرجا اپنے ہونے والے پتی کی طرف بڑے فخر سے دیکھتی من ہی من میں خوش بھی ہوتی، ایسے آدمی کی بیوی بن کر وہ ہمیشہ سکھی رہے گی۔

سبھاش میں سبھی مردانہ خوبیاں موجود تھیں۔ خوب صورتی، خوش مزاجی اور ایک معقول ملازمت! کبھی کبھی وہ سوچتی اگر اس کے اپنے ماں باپ نے اس شادی کی مخالفت کی ہوتی تو وہ سبھاش کی طرح ان کا مقابلہ نہ کر پاتی۔ سبھاش اس سے کہیں زیادہ ہمت والا ہے۔ یہ سوچ کر وہ سبھاش کی طرف بڑی میٹھی نظر سے تکتی اور مسکراتی تھی۔ ہر عورت کے اندر اسی طرح کی ایک اور عورت رہتی ہے جو مرد کو اپنے لیے لڑتے، جھگڑتے اور تحفے تحائف لے کر آتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش اور مطمئن ہوتی ہے۔ یہ اندر کی عورت بے حد چالاک ہوتی ہے۔ باہر کی عورت سے کہیں زیادہ!

نیرجا کو یہ بھی احساس ہو چکا تھا کہ سبھاش اب اس کے لیے دن بدن زیادہ بے قرار ہوتا جا رہا ہے۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے اپنے باپ کو جھکا سکتا ہے۔ موقعہ آ پڑنے پر اس سے الگ بھی ہو سکتا ہے۔

جب رشتہ بالآخر طے ہو گیا اور شادی کی تاریخ قریب آنے لگی تو نیرجا کی گھبراہٹ بھی بڑھنے لگی۔ اب وہ اپنی خوبصورتی اور محبت کے

جادو کا سارا نشہ بھول کر صرف اسی گھبراہٹ کا شکار رہتی تھی کہ اسے اُس کے سُسر نے پسند نہیں کیا ہے! شادی کے بعد کہیں اس کی زندگی کانٹوں سے ہی نہ بھر جائے۔ ٹھوترا صاحب کی مخالفت نے اس کے مستقبل پر افسردگی کے بادل تان دیئے تھے۔

شادی کے فوراً بعد آشیرواد پانے کے موقع پر انہوں نے اپنا رویہ ظاہر کر ہی دیا۔ اس سے ہر ایک کو گہرا صدمہ پہونچا۔ لیکن دوسرے لوگ ابھی تک پُرامید تھے کہ ٹھوترا صاحب فرصت پاکر باہر آجائیں گے، لیکن نیرجا کو اس بات کی امید نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی ٹھوترا صاحب اسے آشیرواد کبھی نہیں دیں گے!

اچانک سُبھاش پھر کمرے میں آگیا۔ نیرجا سے بولا۔ "میرے کچھ فرینڈز تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ باہر چلو ان سے ملا دوں!"

نیرجا نے اسے کوئی جواب نہ دیا لیکن مینا نے سبھاش کو ڈانٹ پلائی۔ "جب تک دلہن اپنے سُسر جی سے آشیرواد نہیں لے لے گی وہ کسی باہر کے آدمی سے نہیں مل سکتی۔!"

نیرجا نے سر اٹھا کر اپنے پتی کی طرف دیکھا۔ نئے کپڑوں میں جوانی اور خوشی سے تمتمایا ہوا چہرہ اور بھی تمتما اٹھا۔ اُسے اپنے ڈیڈی کی ضد کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ خاص طور پر اپنے ذاتی معاملات میں۔ وہ ان سے فوراً اُلجھ پڑتا تھا۔ اب بھی اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ اب سیدھا ڈرائنگ روم میں جائے گا اور اپنے ڈیڈی کو ان کے دوستوں کی موجودگی کے باوجود باہر آنے کے لیے مجبور کرے گا۔

لیکن وہ وہاں سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف نہ گیا۔ نیرجا نظروں سے اس کا تعاقب کرتی رہی۔ وہ اِدھر اُدھر آنگن میں گھومتا پھرا اپنے دوستوں کی خاطر تواضع کے لیے نوکروں کو ہدایات دیتا پھرا۔ خود بھی مٹھائی، پان و سگریٹ کی پلیٹیں لے لے کر باہر کو جاتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر موقع پایا تو پھر اندر آگیا۔ اب کے تو اس کے پاس ہی صوفے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اس کے لیے بہت تاب تھا نا۔! سب کے سامنے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھنے لگا، نیرجا اس کی اس اچانک حرکت پر کانپ اُٹھی۔ اس کی بہنیں سُبھاش کو اس کے پاس سے ہٹا کر باہر نکال لائیں۔ اُسے پھر اس طرف آنے سے منع کر دیا۔ لیکن نیرجا کا دل زور زور سے کانپتا رہا، دھڑکتا رہا۔ وہ ننھے سے دل کو بھی قابو میں نہ لا سکی! اس کا دل چاہتا تھا، زور زور سے رو اٹھے۔ اُس کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو آگئے۔ اُس نے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی۔ چہرے پر گھونگھٹ کھینچ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کوئی اُسے روتا ہوا دیکھے۔ اس سے رونے کا سبب پوچھے۔ وہ کسی کو کچھ بتا نہیں سکے گی۔

اُسے بار بار سبھاش کا اس کے پاس آ کر صوفے میں دھنس جانا یاد آتا رہا۔ ایک خاص انداز سے اچانک ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر رسٹ واچ دیکھنا بھی!

سُبھاش نے یہ دونوں حرکتیں ایک خاص شخصی عادت کے طور پر کی تھیں۔ جیسے کوئی خاص انداز کسی کی شخصیت کا غماز ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ سر ہلا ہلا کر باتیں کرتا ہے۔ کندھے جھٹکتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بات کرتا ہے۔ سُبھاش نے بھی کچھ اسی قسم کا اچانک مظاہرہ کیا تھا۔ جو اس سے قبل نہیں کیا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے اس کے دل کو جکڑ لیا۔

دو سال پہلے وہ راجوڑی گارڈن کے بس اسٹاپ پر کتنی دیر سے اکیلی کھڑی تھی۔ جتنی بسیں آئی تھیں سب کی سب بھری ہوئی نکل گئی تھیں۔ وہ بار بار رسٹ واچ دیکھتی اور پریشان ہو اٹھتی تھی۔ اسے جمنا پار گاندھی نگر پہونچنا تھا۔ یہاں سے ایک بس کے ذریعے جا کر فوارے سے دوسری بس بدلنی تھی۔ اس طرح کافی دیر ہو جانے کا احتمال تھا۔

اچانک اس کے پاس ایک کار آکر رُک گئی تھی۔ اندر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ آدمی نے اس سے پوچھا تھا۔ "بیٹا تمہیں کہاں تک جانا ہے؟ بہت دیر ہوگئی ہے۔ میں کناٹ پیلس تک جا رہا ہوں۔ تمہیں اگر اسی طرف جانا ہے تو میری گاڑی میں لفٹ لے سکتی ہو۔"

یہ بات اس نے انتہائی شرافت اور شفقت سے کہی تھی۔ وہ کناٹ پلیس تک لفٹ لینے سے انکار نہ کر سکی۔ اس کے ساتھ آگے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسی جگہ وہ ذرا دیر کے لیے سگریٹ کا پیکٹ لینے کے لیے اُترا اور پھر دھم سے آکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ نیرجا کو ابھی تک اس آدمی کا بیٹھنے کا انداز یاد تھا۔ جب گاڑی رج روڈ پر سے گزر رہی تھی تو اس آدمی نے آس پاس کی ویرانی کا فائدہ اٹھا کر اچانک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "میں تمہیں نئی گھڑی لے دوں گا۔ یہ ماڈل تو پرانا ہو چکا ہے۔ ابھی چل کر لے دیتا ہوں۔"

نیرجا گھبرا اٹھی۔ چاہتی تو اس کا ہاتھ جھٹک دیتی۔ اسے سختی سے کار روک دینے کے لیے کہہ دیتی۔ لیکن سڑک تو دور دور تک سنسان تھی وہ کار کو کسی بھی ویران راستے پر ڈال لیتا۔ اسے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک ہی لمحہ ملا۔ اس نے ایک ہی لمحے کے اندر کتنے زمانوں کا احساس کر لیا۔ گزرے ہوئے اور گزرنے والے زمانوں کا۔ جس میں عورت مرد کی مٹھی میں پہونچ کر ایک بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی رہ جاتی ہے اس نے ایک ہی لمحے کے اندر فیصلہ کر لیا کہ وہ ابھی شور نہیں مچائے گی! اس کا ہاتھ نہیں جھٹکے گی! اس سے کار روک لینے کے لیے بھی نہیں کہے گی۔

اس نے ادھیڑ شفیق آدمی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اس سے بڑی نرمی سے کہا۔ "مجھے بس ذرا دیر کے لیے لیڈی ہارڈنگ ہاسپٹل میں رکنا ہے۔ وہاں ایک بہت ضروری میسج دینا ہے۔"

وہ بہت خوش ہوا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ وہ اس کے جال میں پھنس گئی ہے۔ اس نے کار کو زیادہ اسپیڈ پر ڈال دیا۔ اُسے جلدی سے لیڈی ہارڈنگ اسپتال کے گیٹ پر پہونچا دیا۔ نیرجا دو منٹ کی اجازت لے کر اندر چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے بڑے اطمینان کی سانس لی۔ اسپتال کے اندر اس کا کوئی بھی شخص واقف نہیں تھا۔ اُسے وہاں کسی کا میسج نہیں دینا تھا۔ چند منٹ تک وہ بے مقصد ہی مختلف وارڈوں میں گھومتی رہی۔ دراصل باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہی تلاش کرتی پھری۔ اُسے راستہ مل گیا تو باہر جا کر اس نے جلدی سے اسکوٹر کرایہ پر لی اور سیدھی گھر چلی گئی۔

کبھی کبھی اُسے اپنی ہمت اور مکاری کی یہ بات یاد آتی تو وہ دل ہی دل میں ہنس پڑتی تھی۔ لیکن اس نے یہ بات ابھی تک کسی کو بتائی نہیں تھی۔

اچانک نیرجا کو لڑکیوں کا شور سنائی دیا۔ انہوں نے ڈرائینگ روم میں مہمانوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے سب کو اطلاع دے دی کہ ڈیڈی ڈرائینگ روم میں اب اکیلے ہیں۔ سب کو اس بات کی توقع تھی کہ ابھی کسی بھی لمحے میں وہ پردہ اٹھا کر باہر آجائیں گے۔

لیکن کئی لمحے گزر گئے جو لمبے ہوتے ہوتے منٹوں میں تبدیل ہو گئے۔ ملہوترا صاحب کے باہر نہ آنے پر سب کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ نیرجا کی ساس تو رو پڑی۔ وہ بار بار رو اٹھتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر پانی سے پھولی ہوئی ربڑ کی گیند کی طرح! بولی۔ "میں پہلے ہی جانتی تھی اس رشتے کو انہوں نے من سے سویکار نہیں کیا ہے۔ بھلے ہی لڑکے کی خوشی کی خاطر برات کے ساتھ چلے گئے تھے۔ وہ بہو کو آشیرواد بھی نہیں دیں گے!"

گھر میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ لیکن سُبھاش ابھی تک اپنے دوستوں کے ساتھ لان پر بیٹھا تھا۔ خوش گپیوں میں مصروف۔ اُن

کے قہقہوں کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

کسی نے کہا — "سبھاش کو دلہن کے پاس بھیجا جائے۔!"

لیکن کسی نے اُس تجویز کا خیر مقدم نہ کیا۔ سب ہی باپ بیٹے کے جھگڑے سے ڈرتے تھے۔ کتنی دیر تک خاموشی رہی۔ بالکل خاموشی —— گھڑی بھر میں جیسے ساری خوشی پر اُداسی کی راکھ بکھر گئی۔

اچانک نیرجا کمرے میں سے باہر نکل پڑی۔ سب نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ نئی نویلی دلہن پہلے ہی روز کسی کی مدد کے بغیر کہاں جا رہی ہے؟

وہ دھیرے دھیرے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہ بات سب کو عجیب سی لگی۔ لیکن کسی نے اسے نہ روکا۔ کوئی روک ہی نہ سکا۔ اس تناؤ سے بھرپور لمحے نے جیسے سب کو باندھ لیا، روک لیا۔ ساتھ چلنے سے بھی اور کچھ کہنے سے بھی! وہ اکیلی ہی ڈرائنگ روم کے اندر گئی۔ اندر جاتے ہی گھونگھٹ کی اوٹ میں سے اپنے سسر صاحب کو تلاش کیا۔ وہ ایک آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا چہرہ اخبار سے ڈھک رکھا تھا۔ شاید پڑھتے پڑھتے سو گئے ہیں!

نیرجا کے پاؤں کی چاپ سُن کر بھی اُنہوں نے چہرے سے اخبار نہ ہٹایا۔ نیرجا کتنی دیر تک سر جھکائے ہوئے کھڑی رہی۔ خاموشی اور گہری ہوتی گئی۔ جیسے ایک رات کے بعد دوسری رات شروع ہو جائے! ایک اندھیرا ختم ہونے کے بعد دوسرے اندھیرے کا سفر شروع ہو جائے۔!

اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر بہو پاؤں کے بل بیٹھ گئی۔ سسر کے چرنوں پر جھک گئی۔ کہنے لگی — "پتا جی، میں جانتی ہوں آپ کیوں ناراض ہیں۔ جس دن آپ مجھے دیکھنے کے لیے ہمارے گھر آئے تھے۔ اُسی دن میں آپ کی ناراضگی کا کارن سمجھ گئی تھی لیکن مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ انسان غلطی کا پتلا ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ اگر کوئی غلطی مجھ سے بھی ہوئی ہے تو اسے آپ بھی معاف کر دیں۔ اب میں آپ کی بہو ہوں، آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کی ہمیشہ عزت کروں گی، جتنی آپ کی عزت ہونی چاہیے۔ آپ مجھے آشیرواد دیجئے۔ آپ کے سامنے آنچل پھیلاتی ہوں!"

وہ کتنی دیر تک آنچل پھیلائے بیٹھی رہی۔ مہوترا صاحب نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرح اخبار میں مُنہ چھپائے پڑے رہے۔ بے حس و حرکت۔ چپ! نیرجا ہر ہر لمحہ انتظار کرتی رہی، وہ ابھی ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پہ رکھ دیں گے۔ لیکن جب انہوں نے ایسا نہ کیا تو وہ پھپک پھپک کر رو پڑی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ آخر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

نیرجا کے رونے کی آواز سُن کر پردے کے پیچھے کھڑے ہوئے سب لوگ جلدی سے اندر آ گئے تھے۔ سبھاش، اس کی ماں، بہنیں، چاچی، بھابی، سب لوگ! انہوں نے دلہن کو وہاں سے ہٹا لیا۔ اس کی ساس نے غصے میں رو رو کر اپنے پتی کو کوسا اور اس کے چہرے پر پڑا ہوا اخبار بھی نوچ لیا۔

مہوترا صاحب گرد و پیش سے بالکل بے خبر آنکھیں بند کیے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی تھی۔

نیرجا نے الماری میں رکھی ہوئی کتنی ساری قانون کی کتابیں جھاڑ پونچھ لی ہیں۔ انہیں پھر سے قطار در قطار سجا دیا ہے۔ ان کی نئی ترتیب سے

کمرہ بھی جگمگا اُٹھا ہے۔ سب سے اوپر والے خانے میں ابھی کچھ کتابیں پونچھنا باقی ہیں۔ نوکر ایک ڈبے میں بھرے ہوئے کھلونے لے آیا ہے مختلف شہروں کی تہذیبی علامتیں۔ انہیں کہیں رکھنے کے لیے وہ جگہ ڈھونڈنے لگتی ہے۔ الماری کے سب سے اوپر والے حصے سے اگر کتابیں ہٹالی جائیں تو وہاں یہ کھلونے بہت ہی خوب صورت لگیں گے۔

وہ جلدی جلدی کتابیں اٹھا کر نیچے کے خانوں میں ٹھونسنے لگتی ہے۔ اسے یقین ہے۔ اس پر سُبھاش کو کوئی اعتراض نہ ہو گا کوئی کتاب الماری سے باہر نہیں رکھی گئی ہے۔ ساری کتابیں اسی کے اندر سما چکی ہیں۔

اچانک خالی کی ہوئی جگہ پر اُسے ایک ڈبیا ملتی ہے۔ گرد آلود! جگہ جگہ سے اُس کا رنگ بھی اڑا ہوا۔ ! نیرجا بڑی حیرانی سے اسے ہاتھ میں اٹھاتی ہے۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھتی ہے۔ جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو اُسے کھول دیتی ہے۔ پیکنگ پیپر کے اندر لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی گھڑی ہے۔ کلائی پر باندھنے کی۔ سونے کی طرح چمکتی ہوئی بالکل نئی!

وہ دیر تک اُسے ہاتھ میں لیے کھڑی سی رہ جاتی ہے۔ بالکل گم صم سی! کیا کرے اس کا!!

کتنے سو سال

بانو قدسیہ

ہردرشن کور تو ایک ایسا پودا تھی جو نہ بیج سے اُگتا ہے، نہ جس کی کوئی جڑ ہوتی ہے بلکہ جو پیوندی آم کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے کھٹے اچاری آم سے سفوف کے بغیر رس دار انور رٹولوں میں بدل جاتا ہے۔ وہ تو اُس منی پلانٹ کی طرح تھی جس کا ایک پتہ چھوٹی سی ڈالی کی جگہ سے کاٹ کر لگا دو تو آپ سے آپ ہری بھری بیل میں بدل جاتی ہے۔

ہردرشن کور جب پیدا ہوئی اور دائی نے اس کے گلے میں اُلجھی ہوئی آنول کو جلدی سے اتار کر اس کے نیلے بدن کو لال کالے چوکوروں والے کھیس میں لپیٹا تو اسی وقت اس کی ماں نے لمبا سا سانس لیا اور واہگرو کی جے کہہ کر مٹھیاں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ باپ ایک رات زمین میں ہل جوتنے گیا تو صبح جب وقت چاند ڈوبا کسی نے گھر آکر خبر دی کہ جسونت سیاں سپاٹ پر مُنہ کے بل گرا ہے اور اس کے جسم پر لٹھ کے پورے بائیس نشان ہیں۔

اب حویلی میں دو جوان بھائی اور پالنے میں پاؤں کا انگوٹھا چوستی ہردرشن کور رہ گئی۔

کشمیری ڈونگے جیسی پگڑیاں پہننے والے دونوں سرداروں نے اس ربڑ کی گڑیا کی طرف دیکھا اور ذمہ داری کے بوجھ سے یوں جھک گئے جیسے بڑ کی ڈالیاں چڑیوں کے بیٹھنے پر زمین کی جانب جھکتی ہیں۔ لیکن جوان جسم ذمہ داریوں کو کچھ دل سے قبول نہیں کرتا۔ روپئے اور بھائیوں کے درمیان ہردرشن اس کچے امرود کی طرح لڑھکتی پھری جیسے بچے گیند سمجھ کر کرکٹ کھیلتے پھریں۔ گھٹے گھٹے سیلے کمروں میں درشن مکھن دودھ پر پلی ہوئی مشکوں کی گھومتی پھرتی دیواروں سے کھرچ کھرچ کر مٹی کھاتی۔ کیڑوں کو ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کر دیکھتی اور بالآخر سورگباش سب جی کے۔ نواڑی پلنگ کے نیچے گھس جاتی۔ پلنگ کے نیچے درشن کور کی کائنات تھی۔ یہیں اس کے سلور کے چوہے دیگچیاں تھیں۔ کھوکھے کی لکڑی سے بنا ہوا سنگار بکس چھوٹی سی چارپائی اور چارپائی پر کپڑے کی گڑیا تھی جو اس کی طرح نہایت بے سروسامانی کے دن بسر کر رہی تھی۔ درشن کور کو ان کھلونوں سے بہت کم دلچسپی تھی۔ بس پلنگ کے تلے کا اندھیرا اسے اچھا لگتا تھا۔ پھر نواڑ کا ایک ڈھیلا لڑ پائنتی کی طرف تھا، اس میں بیٹھ کر وہ کتنی کتنی دیر جھولا جھولتی رہتی اور گاتی رہتی۔ یہ سارے گانے اس کے خود ساختہ ہوتے کیونکہ سردار ہربل سنگھ کے گھر میں کسی کا آنا جانا نہ تھا۔

بھائیوں کی لاڈلی کے بہت سے نام تھے۔ لیکن آگے چل کر جو نام پکا ہو گیا وہ کرنیل کور تھا۔ بلبیر سنگھ اور ہربل سنگھ چھوٹی سی بچی کو اپنی کرپان پکڑا کر کہا کرتے —— "دیکھو تو خالصہ فوج کی کرنیل نظر آتی ہے"

گیندا رنگے سوٹ میں وہ پنڈاروں کے ساتھ ڈاکہ زنی کرنے والی شیر دل لڑکی لگا کرتی تھی۔ چہرے کا رنگ تپتی ہوئی اینٹ جیسا اور آنکھیں کرنجی تھیں۔ ماتھا رانی جنداں کی طرح فراخ اور بانصیب نظر آتا تھا اور ہونٹوں کا خم اپنے فیصلے آپ کرنے کی نشان دہی کرتا تھا۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تجسس، ذہانت اور غیرت مندی کا عکس پڑا رہتا تھا۔

حویلی کے ساتھ میں دیوار پار بصری رہتی تھی۔ بصری ذات کی میراثن تھی اور تیلی داد کی بیوی تھی۔ کھلی ہوا میں رہ کر اس کی رنگت کاسے

ہوئے چمڑے کی طرح چمکدار اور صندلی ہوگئی تھی بس پردے کی اور صوم و صلوٰۃ کی بہت پابند تھی۔ جونہی حویلی کی چھت پر ذرا سی آہٹ ہوتی فوراً گوبھو کے پاس سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی جاتی۔ لیکن اچانک ایک دن اسے یہ پردہ چھوڑنا پڑا۔

کرنیل کور رہتی والے نلکے تلے پیڑھی رکھے نہا رہی تھی خود ہی نلکہ چلاتی اور نالی کے آگے ہاتھ رکھتی اور پھر خود ہی پھدک کر نالی کے نیچے بیٹھ جاتی۔ اس بندر والی اچک پھاند میں اچانک پیڑھی پر اوچھا پاؤں پڑا۔ پیڑھی گھسٹتی چلی گئی اور کرنیل کور کی کہنی لہولہان ہوگئی۔ اس وقت صرف ہربیل سنگھ گھر پر تھا۔ پہلے تو اس نے زخم دھویا لیکن لہو بری طرح بہہ رہا تھا۔ ادھر کرنیل کا چہرہ اتنا سارا لہو دیکھ کر گیندے کے پھول سے بھی زیادہ پیلا ہو رہا تھا۔ میراثن کے گھر اور حویلی کی سانجھی دیوار میں ایک کھڑکی حویلی کی جانب تھی جو آج تک کبھی نہ کھلی تھی۔ ہربیل سنگھ نے چھوٹی سی چندری کو جھٹکا دے کر توڑا اور کواڑ کھول کر اوٹ میں ہو کر بصری کو آواز دی۔

جب لہو تھم گیا اور کرنیل کور سوگئی تو بصری چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی اس کے دوپٹے پر جا بجا لہو کے دھبے تھے۔ لیکن اسے ان سے گھن نہ آ رہی تھی۔ آج اتنے برسوں بعد اس کی گود میں کوئی سویا تھا۔ دادو اور بصری بن بچوں والے گھر میں یوں خاموش خاموش رہتے تھے جیسے کسی کتب گھر میں کتابیں ان کے اندر تو بہت سی کہانیاں تھیں لیکن وہ یہ کہانیاں عموماً بند ہی رکھتے تھے۔ بصری کی ملنے ملانے والیاں اسے عموماً مشورہ دیتی تھیں کہ وہ دادو کو بڑے ہسپتال لے جائے وہاں ایک امریکی ڈاکٹر آیا ہوا تھا جو مردوں کے علاج خوب کرتا تھا لیکن بصری یہ کہہ کر چپ ہو جاتی کہ جب اللہ رسول کا حکم ہو جائیگا۔ آپی بچہ ہو جائے گا میں اپنے جنے کو لوگوں کے سامنے کیوں بدنام کروں؟

بصری کا پردہ کیا ٹوٹا ہربیل سنگھ نے پہلی بار سکھ کا سانس لیا ڈیوڑھی کی کھڑکی کھول کر آواز دے دیتا۔ ”بہن بصری کرنیل کا دھیان رکھنا میں کھیتوں پر جا رہا ہوں۔“

ادھر بصری کو بچی کیا ملی۔ خوشیوں کا باب کھل گیا۔ کرنیل کور کو اپنے گھر لا کر وہ اس کا منہ ہاتھ کھلی سے دھوتی۔ پھر اس کے بالوں میں اصلی سرسوں کا تیل ڈالتی ناک کی سیدھ مانگ نکال کر چوٹی کرتی اور پیچھے لمبا سا سوہاب ڈالتی۔ یوں اپنی گڑیا کو بنا سنوار کر وہ چارپائی پر بٹھا کر کہتی ”لے اب تو کھیل اور میں ہانڈی روٹی پکالوں۔“ کرنیل دادو کو دیکھنے لگی جتنی بصری خوب صورت تھی اسی قدر دادو آنکھوں کو برا لگتا تھا۔ گدلی گدلی آنکھیں تنگ ماتھا۔ آگے سے کٹی ہوئی سی ناک اور بڑے بڑے کان۔ سارا دن اڈے پر بیٹھا گدھے کو ہانکتا اور ناک سے چھچھے نکالتا رہتا۔ کرنیل کور کو دادو کی سب سے بری بات یہ لگتی تھی کہ اس کا ننگ سا سینہ تھا جس پر ایک بھی بال نہ تھا۔ بیرجی کے سینے پر تو سیاہ بالوں کی گھنی گھاس اگی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر سو جاتے تو کرنیل کو بہت مزہ آتا۔ دادو کے چکنے بھیڑے سے سینے کو دیکھ کر کرنیل کا جی چاہتا کہ وہ دادو کو خوب مارے۔

اسی غصے کے تحت ایک روز اس نے بصری سے کہا۔ ”ماسی — یہ تیرا دادو نرا ناچی کا رشتے دار ہے۔“

بصری نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا اور جواب دیا۔ ”ناں بیٹی ناں وہ مونا سکھ اور ہم مسلمان —— رشتہ داری کیسی۔“

”تو دادو کے ساتھ کیوں رہتی ہے ہمارے ساتھ حویلی میں رہ۔ بے جی کا پلنگ دوں گی تجھے۔“

”اب تو اسی کے قدموں میں رہنا ہے کرنیل۔“

یہ فلسفہ کرنیل کو سمجھ نہ آیا۔ بولی۔ ”کیوں؟“

"کیوں؟ کیونکہ یہ میرا مجازی خدا ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ماسی؟"

"ہندو عورتیں جسے سوامی کہتی ہیں نادہ۔"

"سوامی کیا ہوتا ہے ماسی؟"

"جسے سجدہ کرو تو گناہ نہیں ہوتا بیٹی۔"

کرنیل بات کو اپنی عقل سے بڑا پاکر خاموش ہوگئی اور نفرت سے اُس دادو کی طرف دیکھنے لگی۔ جس نے آنکھوں میں لال دوا ڈال رکھی تھی اور تت تت کرتا مریل گدھے کو ہنکانے میں مشغول تھا۔

اب ڈیوڑھی والی وہ کھڑکی کھلی رہنے لگی جس کے آگے مضبوط آہنی سلاخوں کا جنگلا تھا کرنیل کور کھڑکی کی سل پر بیٹھ کر بصری کے گھر میں جھانکتی رہتی اور بصری نماز پڑھتی کپڑے دھوتی جھاڑ دستہ فرش صاف کرتی۔ ٹیل وانس سے پیپوں میں نیا تیل ڈالتی کرنیل کے وجود میں کھوئی رہتی۔

"کیا کر رہی ہے ماسی؟"

"وضو کرنے لگی ہوں کرنیل۔"

"وضو کیا ہوتا ہے ماسی؟"

"عبادت کے لیے پانی سے بدن کو پاک صاف کرنا۔"

"اور عبادت کیا ہوتی ہے ماسی؟"

"عبادت؟ — عبادت یعنی اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کو کہتے ہیں۔"

"اور نعمتیں کیا ہیں ماسی؟"

"دادو سا شوہر — یہ گھر — کھانے کو دو وقت کھانا — پہننے کو کپڑا — کسی کی محتاج نہیں، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا۔"

یہ بات تو کرنیل کور کو سمجھ نہ آئی لیکن ماسی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی گڑوی میں پانی بھرا اور اپنی گڑیا کو وضو کرایا۔ جیسے جیسے بصری وضو کرتی بالکل ویسے ہی کرنیل بھی اُس کی نقل کرتی۔ جب کپڑے کی گڑیا اچھی طرح بھیگ گئی تو کرنیل کور کو یوں لگا جیسے وہ بھی بڑوں کی فہرست میں شامل ہو گئی ہے کیونکہ وضو جیسا مشکل کام اُس نے سیکھ لیا تھا۔

کوٹھے پر سب سے چھپ کر کرنیل کور نے گارے کے ساتھ ایک مسجد بنائی۔ اینٹوں کا تھڑا اُس پر گارے کا لیپ کیا۔ ٹیڑھی میڑھی اینٹوں کا منبر بنایا اور پھر اس ساری جگہ کے گرد اینٹیں چن کر حد بندی کر لی۔

ویسے تو ہرنیل سنگھ اور بلبیر سنگھ کرنیل کی وجہ سے کبھی رات باہر نہ رہتے تھے۔ لیکن اب جو بصری کا سہارا ملا تو دونوں ہر کا میلہ دیکھنے چلے گئے اور کرنیل کو بصری کی تحویل میں دے گئے۔

جس روز پہلی بار کرنیل بصری کے ہاں رات بھر ٹھہری اس کے دوسرے دن جمعرات تھا۔ بصری نے ایک تھال میں تین تمیری روٹیاں

اور ایک پیالے میں پتلا آلو شوربہ۔ سر پہ برقعہ اوڑھا اور کرنیل کی انگلی پکڑ کر مسجد کی طرف روانہ ہو گئی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں ماسی؟"

"مسجد کی طرف جا رہے ہیں کرنیل۔"

"وہاں کیا ہے ماسی؟"

"مولوی صاحب کے لیے روٹی لے جانی ہے۔"

"وہ اپنی روٹی آپ کیوں نہیں پکاتے۔"

"بیٹی ثواب ہوتا ہے انہیں روٹی دے کر۔"

"اور ثواب کیا ہوتا ہے ماسی۔"

"ثواب ہوتا ہے روح کو۔ خاموشی سے چل۔ سڑکوں پر بات نہیں کرتے۔"

مسجد میں طاقچوں پر دیئے روشن تھے۔ صفوں پر نمازی جمع ہو رہے تھے۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ دو چار لڑکے اب بھی بیٹھے سپارے پڑھ رہے تھے اور مولوی صاحب کے حجرے گیس کی روشنی تختے کی صورت نکل کر باہر پڑ رہی تھی۔ جب کرنیل واپس حویلی میں آئی تو سب سے پہلے اس نے کوٹھے پر چڑھ کر اپنی مسجد میں کھجوری صف کا ایک ٹکڑا بچھایا۔ کھو کمہار سے دو پیسے کا کرا بدھنا لیا اور چوبترے پر کاغذوں کو کاٹ کر سپارے کی شکل کا بنا کر رکھ لیا۔ اب وہ آزادی سے کوٹھے پر چڑھ کر پہروں وضو کرتی۔ پھر خود ہی اذان دیتی اور خود ہی ماسی بصری کی طرح نماز پڑھنے میں مشغول ہو جاتی۔

ایک روز ہربیل سنگھ کرنیل کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن وہ تو اوپر نماز پڑھنے میں مشغول تھی۔ بالآخر ہربیل سنگھ نے ڈیوڑھی والی کھڑکی کھولی اور آواز دی ـــ "کرنیل کور ـــ"

ہینڈ پمپ کے سامنے چارپائی کھڑی کرکے بصری نہانے میں مشغول تھی۔ بصری کو دیکھ کر ہربیل سنگھ کی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں۔ اپنے جوڑے کو کھجاتے ہوئے اس نے کھڑکی بند کر دی۔ اب تک وہ باپ کی کمائی سے پربندھک پارٹیاں دل اور جتھے بنایا کرتا تھا۔ آج اچانک اس کا جی چاہا کہ ساری دُنیا سے اُس کا ناطہ ٹوٹ جائے۔ اور ڈیوڑھی والی کھڑکی ہمیشہ کے لیے کھلی رہے۔ اس کے بالوں بھرے سینے میں یک دم گرم گرم پسینہ آ گیا تھا، اور تن سے ایک ایسی خوشبو اٹھنے لگی تھی جس کا اُسے پہلے کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ کبھی جوتے پہنتا اور کبھی کھول دیتا۔ کبھی پگڑی پہنتا اور کبھی اتار دیتا کبھی آئینے میں شکل دیکھتا اور کبھی کمس سے سنے ہوئے ہاتھ داڑھی پہ پھیر کر دل کو سمجھاتا۔ کر ہوش کر ہربیل سیاں! ہوش کر بصری نے کبھی کیس اور داڑھی والے مرد کو دیکھا ہے کہ میں اپنا آپ دکھلانے کی کوشش کروں ہوش کر ہربیل سنگھ ہوش کر!۔

اس واقعہ سے پہلے ہربیل سنگھ کے لیے بصری کو بے دھڑک آواز دینا آسان تھا۔ اب دل کے چور نے مُنہ پر ڈھاٹا باندھ دیا تھا ڈرتے رُکتے ہوئے کھڑکی کی زنجیری پر ہاتھ ڈالتا اور مری ہوئی آواز میں کہتا "بھائی واؤ یہ جا رہے ہیں باہر ـــ کرنیل کو ر اکیلی ہے۔"

اگر کہیں سے اس کی آواز سن کر بصری آ جاتی تو ہربیل سنگھ کا منہ لٹک ہو جاتا۔ گلے میں سنگھاڑوں کے کانٹے اُبھر آتے اور چھاتی کے بالوں میں ہلکا ہلکا پسینہ آ جاتا۔ ذات کی میراثن نے سوڈھیوں کے موڈھی کا ایسا حال کر دیا جیسے خارشی کتا کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہو۔

اس روز ہربیل سنگھ سجان پور سے واپس لوٹا تو قلمی آموں کا ٹوکرا ساتھ تھا۔ ٹوکرا ڈیوڑھی میں رکھ کر وہ اندر گیا، تو مکان میں ایک بھی بتی روشن نہ پائی۔ رسوئیا بڑے کمرے کو تالا لگا کر غالباً فلم کا دوسرا شو دیکھنے جا چکا تھا۔ ہربیل نے کرنیل کور کو دو چار آوازیں دیں۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اسے یقین ہو گیا کہ کرنیل کور ابھی بصری کے گھر سے نہیں لوٹی اور بلبیر سنگھ چھت پر غالباً گہری نیند سو چکا ہے۔

چھ فٹے فولادی جسم کے اندر دل یوں بجنے لگا جیسے آندھی میں کواڑ کھلا رہ جائے۔ پہلے اس نے دل بہلانے کے لیے آم بالٹی میں ڈالے اور پھر کنوئیں سے پانی نکال کر انہیں ٹھنڈا کیا۔ دو ایک آم کھانے کی کوشش بھی کی لیکن پہلی بار آموں میں نہ خوشبو تھی نہ مٹھاس۔ اس کے بال پسینے میں بھیگ رہے تھے اور اندر باہر اندھیروں سے گرمی ٹپک رہی تھی۔ بالآخر اس نے سارے آم ٹوکرے میں ڈالے اور ٹوکرا کندھے پر رکھ کر بصری کے گھر پہنچا تو تھال سا چاند منڈیر پر آ کر تماشا دیکھنے کے لیے آ ٹکا۔

ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ہربیل سنگھ آہستہ سے کھانسا۔

اندر سے خاموشی اور سرسوں کے تیل کی خوشبو نے اس کا سواگت کیا۔

"دادو بھائی ——" آواز یوں نکلی جیسے چھوٹی سی کنکری بڑے سے تالاب میں گری ہو۔

"دادو۔۔۔ میں کرنیل کور کو لینے آیا ہوں"

اب بھی اندر خاموشی رہی تو متوحش ہو کر ہربیل سنگھ اور آگے بڑھا۔

دادو کی چارپائی خالی تھی اور ساتھ والی چارپائی پر بصری اور کرنیل کور ایک ہی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھیں۔ چاندکی روشنی میں بصری کا وہ بازو جو کرنیل کے سر کے نیچے تھا۔ ہاتھی دانت کا بنا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ناک کا کوکا ننھے سے موتی کی طرح چمکنے لگا تھا اور ماتھے پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے تھے۔ بصری ویسے بھی رانی جنداں کا دوسرا روپ تھی پر چاندکی چاندنی میں یوں بدن ڈھیلا چھوڑے اور کولہے کا مٹکا آزاد مرے تو وہ دھنت سپنا کی طرح توبہ شکن لگ رہی تھی۔

ہربیل سنگھ جیپڑھ کی خشک لکڑی کی طرح جلنے لگا۔

کبھی سوچتا بھاگ جاؤں اور لوٹ کر حویلی میں قدم نہ رکھوں کبھی دل میں آتی کہ کلاوہ بھر کر بصری کی گٹھڑی بنا کر راون کی طرح کسی لنکا نگری میں جا کر چھپ رہوں۔

بالآخر جب بصری نے کروٹ لی اور آہستہ آہستہ پنکھے کی ڈنڈی اس کے ہاتھ میں ہلنے لگی تو وہ بولا —— "بصری ——"

بصری گھبرا کر اٹھی۔ آنکھوں میں نیند اور گرمی کی سرخی گردن اور کندھے پر بکھرے ہوئے بال اور ان میں الجھی ہوئی چاندی کی ڈنڈیاں، اٹھی لاد بغیر دوپٹے کے ہربیل سنگھ تک آ پہنچی۔

کیا بات ہے بھائی جی !۔

ہربیل سنگھ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کیا بات ہے بھائی ہربیل سنگھ ؟ —— نیند کی ماتی نے سوال کیا۔

لیکن ہربیل تو پیدائشی تیندوے کے مریض کی طرح واکو کچھ کہنے کے باوجود زبان تک نہ لا سکتا تھا۔

"کرنیل میرے پاس ہے۔ سو گئی ہے — صبح لے جانا اسے" اپنا دوپٹہ پائے سے اٹھا کر بصری نے اوڑھتے ہوئے کہا۔

"دادو کہاں ہے؟"

"مائی مہراں کے ساتھ واند نے گیا ہے —" دادو کے پلنگ پہ بیٹھ کر بصری بولی۔

وہ ڈرتے ڈرتے کرنیل کور کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کچھ اس طرح کہ دونوں کے گھٹنوں میں بمشکل تمام دو انچوں کا فاصلہ تھا۔

"بات کیا ہے؟" حیران ہو کر بصری نے پوچھا۔ "کہیں کوئی ... کوئی خون تو نہیں ہو گیا؟"

"ہو گیا ہے۔"

"خون — ؟ — کہاں؟"

ہربیل سنگھ نے نظریں جھکا کر آہستہ سے اپنا ہاتھ بصری کے گھٹنے پر رکھ دیا اور ہولے سے بولا "میں یہاں سو جاؤں رات کی رات ... کرنیل کور کے پاس۔"

ہربیل سنگھ کی ساری کشش اس کی آنکھوں میں تھی۔ یہ آنکھیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خوب صورت بیٹے دیپ سنگھ کی آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھوں میں جب التجا ہوتی ہے تو اسے رد کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہوتا۔ بصری نے اپنا آپ مارنے سے پہلے ایک لمبی سی جھرجھری لی اور آہستہ سے بولی۔ "دادو یہاں ہوتا تو آپ تم تم جی صدقے سو جاتے۔ جب تک وہ نہ آئے بھائی جی میں کسی کو گھر کیسے رکھ سکتی ہوں۔"

ہربیل سنگھ کی نظروں میں دادو گھوم گیا۔ آنکھوں میں لال ڈورا ڈالنے والا دادو ... جب وہ کاٹھی پر بیٹھ کر گدھا ہانکا کرتا تو اس کی ننگی لام چھاتی دیکھ کر وہ دونوں بھائی خوب خوب ہنسا کرتے تھے۔ اس وقت اسے دادو اپنے پہ ہنستا نظر آ رہا تھا۔

"بصری! سوڈھی سکھ داگرو کی سوگند بہت غیرت والا ہوتا ہے۔ اور اونٹ کی طرح بدلہ لے کر رہتا ہے۔ بصری نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ ہربیل کے کندھے پر رکھا اور چاند کی کرنوں جیسی ٹھنڈی آواز میں بولی۔ "میں ذات کی میراثن تیلی کی بیوی۔ تجھ جیسا سردار مجھ جیسی عورت سے بدلہ لے کر کیا لے گا۔"

ہربیل سنگھ چپ سا ہو گیا۔

"تو نے میری بڑی عزت بڑھائی ہے یہ بات کہہ کر۔ لیکن اب جواں مردی اسی میں ہے کہ مجھے مجبور سمجھ کر جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح لوٹ جا — مجھے کوئی کسی نے قید تھوڑی کر رکھا ہے کہ تو چھڑانے آیا۔ میں نے تو خود اپنی مرضی سے زنجیر پہن رکھی ہے۔ یہ کڑا نہیں دیکھتا میرے ہاتھ میں — سنگھار کے لیے کوئی بوجھ تھوڑی ہے اس کا؟"

ہربیل سنگھ خط استوا کی گرمی سے نکل کر یک دم کوہ قراقرم کی پہاڑیوں میں جا پہنچا۔ بصری کی کلائی اس سے تھوڑی دور تھی۔ اس نے اپنے جلتے ہونٹ اس ٹھنڈے رولڈ گولڈ کے کڑے پر رکھ دیئے لمحہ بھر کو سوڈھیوں کا سارا مان بصری کے قدموں میں ڈھیر کیا اور پھر اٹھ کر باہر چلا گیا گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کی ساری داڑھی آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔

اس دن کے بعد ہربیل سنگھ نے پھر کبھی ڈیوڑھی کی کھڑکی نہ کھولی۔ اب بلیسری کرنیل کور کو لے کر جاتا اور گھر واپس لاتا۔ لیکن پھر بلیسری کی ملاقات لدھیانے کے سٹیشن پر ایک لڑکی سے ہو گئی جو سکھ نہیں تھی اور جس کے گھر والے لدھیانے میں ٹانسا بناتے تھے۔ بلیسری ستے زمینوں سے نکلو

توڑ لیا اور اس لڑکی سے شادی کر کے خود بھی لدھیانے میں ٹلنے کی کھڈیوں پر کام کرنے لگا۔ لیکن اب تو کرنیل کور سیانی ہو چکی تھی اور خود ہی بصری کے گھر آنے جانے لگی تھی۔ اس لیے ہربیل سنگھ کو ڈیوڑھی کی کھڑکی کھولنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

کرنیل کور سکول سے واپسی پر نہ صرف بستہ چھوڑنے گھر آتی اور پھر سکول کے کپڑے اتار کر بصری کی طرف چلی جاتی۔ اس نے تو بصری سے اتنے سارے کھلاتے بھی پکانے سیکھ لیے تھے۔ ہر بار جب وہ کچھ پکا کر ہربیل کے آگے رکھتی تو وہ پوچھتا۔ بڑا سواد ہے تیرے ہاتھ میں کرنیل بے جی کی طرح — تیری استانیاں تو بڑی قابل ہیں۔

"استانیوں کو کچھ نہیں آتا۔ بیر جی — سب ماسی بصری سکھاتی ہے مجھے —"

حالانکہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ سب کچھ بصری سکھاتی ہے۔ لیکن کرنیل کے منہ سے یہ سن کر اسے عجب طرح کی خوشی سی حاصل ہوتی

"اسے تو کھل سے ہنانا آتا ہے اور کچھ نہیں آتا اُسے۔"

"نہ بیر جی — ماسی بصری کو تو سب کچھ آتا ہے۔ یہ دیکھو کیا کشیدہ سکھایا ہے مجھے 'میری استانی کہتی ہے کہ ایسا کشیدہ تو ہیڈ مسٹریس بھی نہیں کر سکتی۔"

کڑھے ہوئے تکیے غلاف کو ہربیل سنگھ ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھتا رہتا۔ ایسے تکیے پر سر رکھ کر سونے کی اسے کتنی تمنا تھی۔

ایک روز کرنیل نے بصری سے کہا۔ "ماسی تو ایک تکیہ غلاف بیر جی کے لیے بھی بنا دے وہ بہت تعریف کرتے ہیں" تیرے کشیدے کی بصری نے گادی پر بیٹھے دادو پر نگاہ ڈالی اور مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اگر فرصت ملے گی تو بنا دوں گی۔"

"یہ تو سارا دن برقعے کی ٹوپی پر جو کرشائی کرتی رہتی ہے تو ایک تکیہ غلاف نہیں بنا سکتی ماسی؟ — بیر جی کے لیے؟"

"برقعہ تو ضرورت کی چیز ہے کرنیل — اس کے بغیر کوئی گزارہ ہو سکتا ہے؟ غلاف تو سادہ بھی ہو سکتا ہے۔"

بات بودی تھی، لیکن اس وقت چل گئی کرنیل کی توجہ غلاف سے ہٹ کر برقعے کی طرف ہٹ گئی۔

"یہ برقعہ کیوں پہنا جاتا ہے ماسی؟ —"

"تاکہ اپنی زینت پر دوسروں کی نگاہ نہ پڑے اور ان کا ایمان قائم رہے۔ کسی کو آزمائش میں ڈالنا گناہ ہے بیٹی۔"

کرنیل کور نے اپنی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "ماسی — مجھے برقعہ پہننا چاہیے ناں؟ —"

پہننا تو چاہیے — پر شاید تمہارے بیر جی پسند نہ کریں —"

جس روز وہ سیاہ برقعہ بازو پہ دھرے ہربیل سنگھ کے کمرے میں پہنچی اس وقت ہربیل سنگھ پلنگ پر لیٹا بلبیر سنگھ کے متعلق سوچ رہا تھا یادیں بھی پیتل کا برتن ہیں۔ اگر مانجھتے رہو تو دمکتی ہیں ورنہ ان پر بھی کائی کا زنگ چڑھ جاتا ہے۔ ہربیل سنگھ نے تو پچھلی یادوں کو چمکا چمکا کر اس طرح کر دیا تھا جیسے سیڑھیوں کے ساتھ لگی ہوئی ریلنگ ہاتھوں کی رگڑ سے چکنی ہو جایا کرتی ہے۔

"بیر جی —"

"کون ہے؟ —"

"میں جی کرنیل۔"

ہربیل سنگھ اُٹھ بیٹھا:
"آجا کمرٹی کیوں ہے؟"
"میں برقعہ پہن لوں ——"
"برقعہ؟ — حیران ہو کر ہربیل سنگھ نے پوچھا۔
"ماسی بصری کہتی ہے کہ — کہ جوان لڑکی کو برقعہ پہننا چاہیے۔ سب دیکھتے ہیں نہ ——"
اپنی کرڑی بڑی داڑھی میں انگلی پھیر کر ہربیل سنگھ نے لمبی سانس لی اور بولا — "اب کیا کہتی ہے۔ بصری؟"
"برقعہ — میں پہن لوں بیرجی؟
"تو مجھ سے کیوں پوچھتی ہے؟ بصری نے کبھی کوئی غلط بات بھی کہی ہے۔ پہن لے برقعہ۔"
"وہ .. .. وہ ماسی کہتی تھی کہ .. .. کہ یہ مسلمانوں کا رواج ہے .. .. آپ سوچ لیں ——"
ہربیل سنگھ آہستہ سے ہنسا اور پھر بولا — "رواج تو رواج ہوتے ہیں نہ رواج ہندو ہوتا ہے نہ سکھ نہ مسلمان۔ کپڑے میں کیا دھرا ہے پہن لے جو تیرا جی چاہے —" پھر ہربیل نے دور دیکھتے ہوئے اور بھی آہستہ سے کہا — اور میں کوئی اس لیے اجازت تو نہیں دے رہا کہ .. .. یہ اچھی چیز ہے — میں تو .. .. میں تو — لیکن خیر چھوڑ اس بات کو اب پہن کے دکھا اپنا برقعہ۔"
برقعہ پہن کر وہ ہربیل سنگھ کو دکھانے کے بجائے سیدھی ماسی بصری کے گھر پہنچی۔ بصری دیوار سے اُپلے اتار رہی تھی۔
کرنیل نے گھستے ہی آواز دی —— "ماسی! — ماسی دیکھ تو کیسی لگتی ہوں میں ——
بصری کے ہاتھ رک گئے۔
"خدا کی قسم! تھوڑی دیر کے لیے تو میں سمجھی کہ عذرا ہے ——"
ڈوری کھولتے ہوئے کرنیل نے پوچھا — عذرا کون ماسی؟ ——"
"میری بہن تھی۔ بڑی خوب صورت تھی تیری طرح — ایسی ہی کرنج آنکھیں تھیں نمبردار کے گھر منگنی ہوئی تھی۔ منگنی کے دسویں دن پھول ماتا نکلی سارا پنڈا پک گیا تھا۔ مری اب تو پہچانی نہیں جاتی تھی ——"
بصری کی آنکھیں بھیگ گئیں ——
"جن سے پیار کرو وہ کبھی پاس تو رہتے نہیں —— پھر زندگی کا فائدہ بھلا؟ ——" بصری نے دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔
کرنیل نے ماسی کے گلے میں بازو ڈال دیئے اور اس کے سر کو چوم کر کہا —— "تو مجھے عذرا ہی سمجھ ماسی ——"
"وہی ناک نقشہ ہے وہی رنگ وہی قد بت ——"
"تو مجھے عذرا کہا کر ماسی آج سے ——"
اس طرح کرنیل کور کو جو اصل میں ہردرشن کور تھی ایک اور نام کا بپتسمہ ملا۔

شب معراج کا ذکر ہے۔ شام کو بصری نے نہا دھو کر عطر حنا لگایا۔ ہاتھوں میں گو وہ ہاتھی دانت کی سی سفیدی نہ رہی تھی لیکن مہندی کا رنگ خوب کھلا تھا۔ کھیر پکا کر دادو کے ہاتھ مسجد میں بھیجی اور کڑوے تیل سے دیئے بھرنے لگی تو کرنیل کورا آگئی۔ ہر سال اسی طرح اس کے چھوٹے سے گھر میں شب معراج کی رات دیئے جلا کرتے تھے اور مسجد میں کھیر جاتی تھی۔ لیکن کوئی کوئی دن کوئی کوئی لمحہ کٹاری کی طرح تیز ہوتا ہے اور دل کے آر پار چلا جاتا ہے۔

کرنیل کی آہٹ پا کر بصری نے پوچھا — ”کون ہے —“

”میں ہوں ماسی — عذرا —“

”اچھا عذرا باہر کیوں کھڑی ہے دہلیز پر —“

کرنیل کورنے کروشیے کی جالی سے ڈھکی ہوئی پلیٹ کھول کر کہا — ”کڑاہ لائی ہوں ماسی —“

”تو اندر رکھ طاق میں — دادو مسجد سے آئے تو اسے کھلاؤں گی —“

”رکھنے کے لیے نہیں ہے ماسی — خیرات کرنے کے لیے لائی ہوں — اللہ واسطے —“

”آج خوشی کا دن ہے ناں ماسی؟ خوشی کے دن کچھ خیرات کرنی چاہیے ناں؟ —“

”ابھی تھوڑی دیر میں اللہ ہو والا بابا آئے گا اُسے دیں گے حلوہ اسے اندر رکھ آ —“

پھر دونوں نے مل کر دیئے جلائے۔ منہ سے اللہ اور سینے سے ہو کی آواز نکالنے والے بابا کو حلوہ دیا دادو ساری رات کی نستار ہا، اور بتیاں ٹمٹما ٹما کر آخر کار بجھ گئیں۔

”گھر نہیں جاؤ گی عذرا —“ بصری نے رات گہری ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں ماسی آج بیرجی لدھیانے گئے ہوئے ہیں“

جب کرنیل چارپائی ڈال کر لیٹنے لگی تو اس نے دیکھا کر بصری سامنے چبوترے پر جہاں صبح کے وقت تیل کے کنستر رکھے جاتے تھے۔ چٹائی پر سفید کھیس بچھا کر بیٹھ گئی اور سامنے رحل پر قرآن شریف دھر کر اگربتیاں جلانے لگی۔

کرنیل کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ لیکن اگربتی کی خوشبو نے اُسے جگا سا دیا بصری کے پاس پہنچ کر اُس نے پوچھا — ”تو نہیں سوئے گی ماسی“

”آج کی رات کوئی غافل ہی سوتا ہے کرنیل۔ آج کی رات جاگنے کا بڑا ثواب ہے۔ رسولِ مقبول عرش منوّر پر گئے تھے۔“ کرنیل نے زمین کی کھلی چھت پر نظر ڈالی جس پر ہزاروں تارے جل بجھ رہے تھے۔

”بہشت میں ایک بہت بڑا درخت ہے عذرا۔ اس درخت کی لاکھوں ڈالیاں ہیں اور ہر ڈالی پر اَن گنت پتے ہیں۔ ہر پتے پر کسی نہ کسی انسان کا نام لکھا ہے۔ جس آدمی کے نام کا پتہ جھڑ جاتا ہے وہ سال کے اندر اندر اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے —“

کرنیل کو ایسے درخت کے تصور سے خوف آنے لگا وہ بصری کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔

”یہ عبادت کی رات ہے کرنیل کورے۔ ساری رات مومن لوگ عبادت میں گزارتے ہیں۔ رات کا ایک پہر ایسا ضرور آتا ہے۔ جب کائنات کی ہر چیز سجدے میں چلی جاتی ہے“

'وہ کیوں ماسی ؟' ——

'جس گھڑی حضور مقبولؐ عرش بریں پر گئے تھے اس وقت آج بھی ہر چیز سجدے میں چلی جاتی ہے۔

کرنیل کا بدن آہستہ آہستہ کانپنے لگا

'ماسی یہ گھر۔۔ یہ درخت سب۔۔۔'

'ہر جاندار ہر عزیز جان دار سب۔۔۔'

'کسی نے انہیں سجدہ کرتے دیکھا ہے ماسی ؟'

'بہت سے ولیوں نے اللہ کے پیاروں نے دیکھا ہے بیٹی۔ جو یہ منظر دیکھ لیتا ہے اُس کے دل کا ہر قفل ٹوٹ جاتا ہے اور پھر اُس کا دل اللہ کا گھر بن جاتا ہے۔ اس میں کسی آدمی کا بسیرا نہیں ہو سکتا کرنیل۔!

کرنیل کا منہ سوکھنے لگا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں تو کرنیل کور کرپان۔ سرہانے تلے رکھ کر سونے کی عادی تھی، لیکن آج اُسے نہ جانے کیوں چارپائی پر لیٹے خوف آ رہا تھا لیٹی تو کچھ سوئی سی کچھ جاگی سی ڈھیر ہوتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو بصری دوہری بُکل مارے قرآن کھولنے والی تھی۔ کرنیل نے ماسی کی تقلید میں دوپٹہ کانوں کے گرد اُس کر بُکل ماری اور آہستہ سے بولی —— "ماسی میں یہاں تیرے پاس بیٹھی رہوں"

'بیٹھی رہ بیٹی ——'

'کوئی گناہ تو نہیں ہوگا تجھے۔ مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔'

'تو تو فرشتہ ہے۔ فرشتوں کے بیٹھنے سے تو رحمت ہوتی ہے۔'

ڈرتے ڈرتے کرنیل نے ہاتھ قرآن کریم کی طرف بڑھایا اور بولی۔ 'ماسی میں۔ تیرے قرآن کو ہاتھ لگاؤں ؟——'

'میرا قرآن کیسا عذرا ؟ یہ تو سب کا قرآن ہے تیرا میرا۔ ساری دُنیا کا۔ یہ تو چشمہ ہے صاف پانی کا جس کا جی چاہے جتنا مرضی پی لے

کرنیل کور نے ڈرتے ڈرتے قرآن کریم کو ہاتھ لگایا اور پھر اور ڈرتے ڈرتے ان انگلیوں کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

'اگر کہیں میں عربی پڑھنا جانتی تو۔۔۔ تیرا قرآن ضرور پڑھتی ماسی'

بصری چپ چاپ اندر گئی اور موٹے حروف والا نسخہ اٹھا لائی جس کی جلد چرمی کاغذ موٹا اور کتابت بہت بڑی بڑی تھی۔ اس کو صاف تکیے پر رکھ کر بصری نے کہا۔ بیٹی اگر پڑھنا نہیں آتا تو کیا ہوا۔ وہ بے پروا تو نیت دیکھتا ہے تو ہر سطر کے نیچے انگلی پھیرتی جا اور بسم اللہ پڑھتی جا تجھے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا قرآن پڑھنے کا ملتا ہے۔'

کرنیل کور کی کرنجی آنکھوں میں ہربیل سنگھ کی آنکھوں کا سارا حسن آ گیا۔

'سچ ماسی ؟'

'اور دیکھ اللہ نے چاہا تو بہت رحمت ہوگی تجھ پر۔

کرنیل نے الف لام میم کے نیچے انگلی رکھی آہستہ سے بسم اللہ پڑھی تو ایک کرنٹ سا انگلی سے نکل کر پیروں کے انگوٹھے تک چلا گیا۔ آہستہ

آہستہ اس کے لب ہلنے لگے اور وہ "ثُمَّ" کُمَّ" انگلی پھیرتی رہی۔

یہ فجر اور تہجد کے درمیان کی بات ہے جب بصری قرآن پڑھتی پڑھتی اونگھ کر اپنے غلاف پر سر دھرے سو رہی تھی اور داود کی کھانسی بند تھی کرنیل نے اپنے گھر کی طرف نظر کی۔ یہ حویلی اس کے دادا کنور سرجیت سنگھ نے بنوائی تھی۔ کنور کا خطاب اس کے دادا کو مہاراجہ کپورتھلہ نے دیا تھا، اور سب کہتے تھے کہ حویلی دیکھ کر کپورتھلے کے شاہی محل یاد آتے ہیں۔ اب حویلی میں وہ آن بان نہ رہی تھی۔ پیلی دیواروں میں ننھے ننھے پیپل کے پودے اُگ آئے تھے۔ اندر آنگن میں لگا ہوا انجیر کا درخت آدھا بصری کے گھر جھکا ہوا تھا۔ باہر والا جستی پھاٹک اور اونچے اونچے کنگروں والی دیوار۔ یہ حویلی پرانی تھی اور سودھی خاندان کی نجابت شرافت اور شیر دلی کی امین تھی۔

کرنیل نے اس پرانی حویلی پر نگاہ کی تو اُسے محسوس ہوا جیسے کنگروں والی حویلی کیرتن کرتی جھول رہی ہے۔ کنگرے کیس نوا رہے ہیں اور انجیر کے درخت کی ساری ڈالیاں ہاتھ جوڑے پرنام کر رہی ہیں۔

گھبرا کر کرنیل نے بصری کے گھر کی طرف دیکھا۔ داود کی چارپائی آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ گدھے کا ماتھا زمین پر لگا تھا۔ ماسی کا مکان اس حد تک جھکا ہوا تھا کہ کرنیل کو لگا جیسے ابھی وہ اس پر گر جائے گا۔

کرنیل کور کے اندر جیسے دل پر لگا ہوا گجراتی تالا کھٹاک سے ٹوٹ گیا۔ سکھ پان وہ گرا اور گھیر کے تمام پُرزے دُور دور بکھر گئے۔ کرنیل نے جھک کر قرآن کو سینے سے لگا لیا اور ہونٹ اس کی سطح پر رکھ کر آہستہ سے بولی۔

"میں آگئی ہوں۔ میں تیرے حضور آگئی ہوں۔ یا اللہ میں نہیں جانتی کہ سیدھا راستہ کونسا ہے؟ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تیری کتاب میں کیا لکھا ہے اور میرے باپ دادا کی کتاب میں کیا نہیں لکھا۔ لیکن اے شبِ معراج گواہ رہنا کہ آج کی رات میں . . . نے ماسی بصری کے ایمان کو اپنا ایمان کہا . . . اور ان لوگوں میں شامل ہوئی جو شبِ معراج کو سجدہ کرتے ہیں۔

صبح ہوئی تو کرنیل کور کو سب کچھ عجیب عجیب سا لگا۔ وہی گھر تھا وہی آنگن تھا۔ وہی بصری وہی داود تھا۔ لیکن وہ دھنک کی طرح زمین کو چھوتی ہوئی زمین سے بہت دور تھی۔ جو کیفیت اس پر رات گزری تھی اس کا ذکر کسی سے ممکن نہ تھا۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھی کوٹھے پر چلی گئی۔ بچپن میں جو سجدہ اس نے بنائی تھی وہ اب بکھری ہوئی اینٹوں کی شکل میں نظر آئی۔ کرنیل ایک اینٹ پر بیٹھ گئی اور اس بڑھو کی طرح رونے لگی جو پیدل مدینے پہنچ جائے اور روضہ مبارک دیکھنے سے پہلے اندھا ہو جائے۔ یہ احساس غالباً زمین نے اس وقت محسوس کیا ہو گا جب وہ سورج سے کٹ کر پہلی بار اپنے محور پر گھومی ہو گی۔ اپنی بے مائیگی کا احساس اپنی محرومی اپنی تنہائی کا احساس کسی کی زبان نہ سمجھ سکنے کا دکھ اپنی بولی نہ سمجھا سکنے کا ملال۔

اب تو کرنیل کور بالکل جزیرہ بن گئی۔ پہلے وہ سب باتیں بصری سے کر لیتی تھی۔ لیکن اب تو وہ نہ بصری کے پاس بیٹھ کر چین میں رہتی نہ حویلی میں اسے قرار آتا۔ سارا دن اس چمگادڑ کی طرح چکر لگاتی رہتی جو اچانک سرِ شام کمرے میں داخل ہو جائے۔

ادھر کرنیل کور کے من میں جوالا مکھی پھوٹی تھی۔ ادھر سارے ملک میں آگ پھیل رہی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب گورداسپور ہندوستان میں آگیا تو سربیل سنگھ نے سکھ کا سانس لیا۔ جوان بہن کو اکیلا حویلی میں چھوڑ کر جانا کچھ اتنا آسان کام بھی نہ تھا۔ وہ کرنیل کی شادی جلد از جلد کر دینا چاہتا تھا۔ کئی بار دل میں سوچا کہ ملبیر سنگھ کو لدھیانے خط لکھے لیکن پھر خیال آتا کہ جب اُسے ہی خیال نہیں تو بات کرنا بیکار ہے۔

پاکستان بنے کوئی دسواں دن تھا۔ گرمی بے پناہ تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عجیب سے عجیب خبر سننے میں آتی تھی۔ کئی برسوں سے مزیل

سنگھ نے بصری کے آنگن میں جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا۔ یکدم جو ادھر سے رونے کی آواز آئی تو وہ کھڑکی کھول کر آواز دی — "داود — داؤد بھا — گیا ہے؟"

بصری آنگن میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر رونے لگی۔

"کیا بات ہے بصری؟ —"

"داود کو کسی سکھ نے قتل کر دیا ہے اللہ کرے مر جائیں سارے سکھ۔ بدبختو ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کسی کا کیسا چھین لیا ہے۔ میرے سر کی چھاؤں لے لی — میرا سہارا — میرا مالک — داود ..."

ہربل سنگھ کے پاؤں چھوٹے پڑ گئے۔

"کہاں ہے داود —"

"ترمورو ڈپہ — غارت گروں نے لٹیروں نے قتل کر دیا۔ اتنی لاشوں میں اس کی لاش کہاں ملتی —؟ اور جائے گا کون اس کی لاش لینے ہائے تجھے کفن بھی نصیب نہ ہوا میرے سرتاج — تیرے لیے قبر کا حکم بھی نہ ہوا۔ ہائے میرے سوہنے داود، میرے پیارے داود — ہائے میرا شیر جوان داود —"

بصری کے بین سن کر ہربل سنگھ کو ہنسی آ گئی اور عورتوں جیسے ماتم سینے والا نظروں میں گھوم گیا۔

"تو ادھر حویلی میں آجا — بصری وہاں اکیلی نہ رہ —"

"ادھر آجاؤں تاکہ تو اکیلی پا کر مجھے کرپان سے اس پار پہنچا دے ہائے داود — کو بلاؤ کوئی —"

ہربل سنگھ اندر جا کر پلنگ پر لیٹ کر ٹخنے کھجلانے لگا۔ یوں دوپٹہ پرے پھینکے سینہ پیٹتی بصری کچھ اُس بصری سے کم نہیں تھی جس نے اس کی جانب اپنا گڑا بڑھایا تھا۔ اگر ادھر وہ حویلی میں آجائے تو برسوں کا قرض چکایا جا سکتا ہے۔ ایک انجانی خوشی کے ساتھ ہربل نے کرنیل کور کو آواز دی اور سارا معاملہ سمجھاتے ہوئے کہا — "ادھر جا کر اپنی ماسی کو لے آؤ۔ داؤد مر گیا ہے وہ اکیلی وہاں کیا کرے گی۔ ویسے بھی جان کا خطرہ ہے"

لالٹین میں تیل کم تھا اور وہ بھک بھک کر اچانک جل اٹھتی تھی۔ گرمی زبان نکالے کتے کی طرح ہانپ رہی تھی۔ ہربل سنگھ پر یہ رات عجیب تھی۔ جیسے اُس کا شہد بھوڑا ابھار رہا ہو اور وہ خال چھپتے کے مکڑوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھرا جا رہا ہو۔ سارے گھر سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلیاں اپنے ساتھیوں کو حاضر نہ پا کر رو رہی تھیں۔ کواڑ رہ رہ کر چرچراتے تھے اور سیلے کمروں سے جھینگروں کی صدائیں آتی تھیں۔

بصری اور کرنیل ایک ہی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھیں آج کرنیل کا بازو بصری کے سر تلے تھا۔ بصری کی رنگت آج بھی کمائے ہوئے چمڑے کی طرح چکنی تھی۔ صرف بالوں میں سفید بال آ گئے تھے۔ ناک میں وہی آب دار کوکا تھا اور کانوں کی ڈنڈیاں بالوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم وقت کے ساتھ فربہ ہو گیا تھا۔ لیکن یہ موٹاپا خوب صورت تھا۔ کلاسیکی تصویروں میں پینٹ کی ہوئی عورتوں کی طرح شاداب دلدار اور توجہ طلب۔

ہربل سنگھ چھوٹی لکڑی کی سیڑھی پر بیٹھا کتنی ہی دیر بصری کو دیکھتا رہا وہ اُس کی جانب پشت کیے کولہے کا گڑا آڑا ادھر سے سُدھ سو رہی تھی اگر ہربل سنگھ چاہتا تو کلاوہ بھر کے بصری کو اندر حویلی میں لے جا سکتا تھا۔ پرانے کمروں میں اس کی آواز چھچھوندر کی آواز بن جاتی۔ ہربل سنگھ اسی خیال کے تحت اُسے حویلی میں لایا بھی تھا۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ یوں گڑا ہوا تھا۔ جیسے لکڑی کی میخ

ٹھونکی ہوئی ہو۔

آج اسے رہ رہ کر دادو یاد آرہا تھا۔ دھوئی تی جیسی رنگت والا دادو! گدھے کی آنکھوں پر لوپٹ جمائے کولہو کے بیڑ پر چکر لگاتا۔ پلی پلی تیل کے پیچھے گاہکوں کے ساتھ جھگڑتا۔ وہی نلوا کھونٹی جس سے وہ وقت بے وقت کولہو کی موری کھولا کرتا تھا۔ اسی چوبی دستے سے کبھی کبھی وہ بصری کی تواضع بھی فرمالیتا تھا۔ اڈے پر بیٹھے بیٹھے اس کا اونگھنا اور لاٹ کے توازن بگڑنے پہ بدک کر اٹھنا اور لال دوا سے زخمی ہوتی آنکھیں مل کر بصری کو آواز دینا۔ تیل وانس میں انگلی ڈبو ڈبو کر تیل چکھنا اور پھر جھوٹی انگلی کو بغیر بالوں والی چپاتی پر مل کر ڈکار لینا ادھ کچلی تھیلن سے مالش کرتا ہوا دادو ——— ایک معمولی بے ضرر لکھاڑ پر چلنے والے گدھے سے بھی بے ضرر تیلی نے سوڈھیوں کے سردار کو پچھاڑ دیا تھا۔ آج اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے دادو ساری عمر تیل کے کنستر اپنے گھر جمع کرتا رہا اور پھوک پھوک اس کے گھر پھینکتا رہا۔ لال دوا آنکھوں میں ڈالنے والے اس آدمی سے بدلہ لینا ضروری تھا۔ لیکن ابھی تک ہربیل سنگھ وہ طریقہ نہ سوچ سکا تھا جس سے دادو کو گھان بچا کو لہو کیا جا سکتا۔

ابھی وہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ بیسی پھاٹک کی چولیں آہستہ سے کرکرائیں اور کسی نے کنڈے پہ ہاتھ رکھ کر اندر کی طرف دھکیلا۔ ہربیل سنگھ کے قدم بصری کی چارپائی سے مڑ کر ڈیوڑھی کی طرف چلے گئے۔

"کون ہے۔؟" اس نے اندر والے قفل میں چابی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہم ہیں"

آواز جانی پہچانی تھی۔ ہربیل نے دروازہ کھول دیا تو باہر چاند کی روشنی میں کرپانیں ہی کرپانیں نظر آئیں۔

یہاں تیرے پاس کوئی مسلمان شرن لینے آیا ہے ہربیل سنگھ؟ —

ہربیل نے باہر نکل کر اپنے پیچھے آہستہ سے پھاٹک بند کر دیا۔ یہ ساری صورتیں جانی پہچانی تھیں۔ ان میں سے زیادہ لوگ وہ تھے جن کے ساتھ مل کر اس نے کئی پربندھک پارٹیاں بنائی تھیں۔ مسلمانوں سے بھارت ماتا کو پاک کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اس کے سامنے اس کے کورد بھائی بھتیجے چچا کھڑے تھے اور راجہ ارجن کی طرح وہ پانڈوؤں کی رتھ میں بیٹھا لرز رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنوں پر کیوں کر وار کیا جا سکتا ہے۔

"بول ہربیل سنگھ! ہم نے قسم کھائی ہے کہ نہ اپنوں کے گھر میں رہنے دیں گے نہ پرائیوں کے گھر شرن لینے دیں گے۔ بول —

ہربیل سنگھ نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم تیرے گھر کی تلاشی لیں گے۔ ہربیل سیاں" جنڈ جیسی خشک ڈاڑھی والا کہنہ سال بولا۔

"یہ ایک سوڈھی سردار کا گھر ہے اس گھر کی تلاشی میری موت کے بعد ہوگی۔ تمہارے لیے میرا بچن کافی ہے۔" ہربیل غرایا۔

"اب ہم آزاد ہیں۔ جو چاہیں گے کریں گے۔"

"بھارت کے علاقے میں ایک سکھ کے گھر کی تلاشی ہوگی۔ لعنت ہے ایسی آزادی پر —"

"تیرے گھر میں مسلمان چھپے ہیں اور ہم نے سوگند کھائی ہے۔"

"میں نے بھی ایک سوگند کھائی ہے جوگندر سنگھ۔"

"راستہ چھوڑدے ہربیل سنگھ۔"

"سوڈھی سردار راستہ چھوڑا نہیں کرتے۔ راستے ان کے لیے چھوڑے جاتے ہیں۔"

ہربیل نے اندر مڑنے کے لیے کمر موڑی تو اُسے کوئی ٹھنڈی سی چیز پشت پر اندر کی طرف دھنسی محسوس ہوئی۔ کرپان کا پھل اتنا تیز تھا کہ جس وقت جوگندر سنگھ نے اس پر وار کیا اس وقت اسے لمحہ بھر کے لیے بھی شک نہ گزرا تھا کہ وہ موت سے اس قدر قریب ہے۔ تیورا کر گرا تو کشمیری ڈونگے جیسی پگڑی پہلے پھاٹک سے ٹکرائی اور پھر پھول کی طرح پتی پتی بکھر گئی۔

"ویر تو نے کیا کیا مورکھ؟ —" پیچھے سے آواز آئی۔

"اپنے پنتھ کے آدمی کو ماردیا۔"

"سوڈھیوں کا پتہ نہیں تجھے۔ ایک کو مارو تو لاکھوں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔"

"دیکھتے کیا ہو۔ مرنے کی صلاح ہے کیا اب؟"

جب بصری اور کرنیل کور جستی پھاٹک تک پہنچیں تو ایک بھی مورکھ باہر موجود نہ تھا۔ ہربیل کی سانس رُک رُک کر آ رہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ اس کے ماتھے سے نئی بار لہو نکلتا تھا۔ بصری کے دوپٹے پر جابجا لہو کے دھبے تھے۔ اسی طرح جب کرنیل کور کو چوٹ لگی تھی تو اس کا دوپٹہ لہو سے بھیگ گیا تھا لیکن اسے اُس سے گھن نہیں آئی تھی۔

"تو باتیں نہ کر ہربیل سنگھ آرام سے سوجا۔"

"اب تو سو ہی جانا ہے بصری کم از کم باتیں تو کر لینے دے۔"

بصری نے مُنہ پرے کر لیا اور آہستہ آہستہ ہربیل سنگھ کا بازو دبانے لگی۔

"میرے پاس تجھے دینے کو کچھ نہیں ہے بصری۔ یہ کرنیل کور ہے۔ اسے ساتھ لے جانا —"

"لیکن —"

"یہاں نہ بیٹھی رہنا میرے بعد اپنے ملک چلی جانا — اور کرنیل کو ساتھ رکھنا —"

"بصری نے بات کاٹ کر آہستہ سے کہا۔ "پر یہ تو... میں اسے کہاں بیاہوں گی ہربیل سنگھ۔"

"کسی اپنے سے آدمی سے بیاہ دینا — یہاں اس کا کوئی نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک ہو جائے گا ہربیل — ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر اُسے کسی سوڈھی سردار سے بیاہ دینا۔"

"جوگندر سنگھ کی کرپان کا زخم کبھی ٹھیک نہیں ہوتا بصری۔"

ہربیل سنگھ کی ٹانگیں آہستہ آہستہ کانپ رہی تھیں اور وہ پٹی پر ہولے ہولے ہاتھ مار رہا تھا۔

بصری نے مُنہ پرے کر لیا اور سورہ یٰسین پڑھنے لگی۔

"تو اپنی ماسی کے ساتھ چلی جانا درشن کور — یہاں اب تیرا کوئی نہیں ہے۔ یہ ہمیں جانتی ہے یہ کسی اچھی جگہ تیرا بیاہ کر دے گی۔"

رِبن تیل کی بتی آخری بار بھک سے جلی اور پھر بجھ گئی۔

پاکستان پہنچ کر بصری نے بہت کوشش کی کہ کرنیل کی شادی کسی اچھے گھرانے میں ہو جائے لیکن جہاں بھی پیام لے کر جاتی لوگ کرنیل کی پچھلی ہسٹری سن کر خاموش ہو جاتے۔ کسی کو کوئی اعتراض تھا تو کسی کو کوئی۔ بہت برسوں بعد جب بصری نے دادو کے چچیرے بھائی سے کرنیل کور کا نکاح کیا۔ اس روز شبِ معراج پھر لوٹ کر آئی۔ کرنیل ہاتھوں میں مہندی لگائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کی ساس کے مُنہ پر پھول ماتا کے داغ تھے اور رنگ زنجن ماچھی سے بھی سیاہ تھا۔

شبِ معراج ہوئے ہوئے گزر رہی تھی اور کرنیل کے ہاتھوں کی مہندی سوکھ کر بھر بھری ہو گئی تھی۔ پھر پچھلے پہر اس کی ساس نے بصری کو جگایا اور آہستہ سے کہا —— "تو ہمیں سچ سچ کیوں نہیں بتاتی کہ اس لڑکی کے ماں باپ کون ہیں؟"

"میں ہی اس کی ماں ہوں اور میں ہی اس کا باپ ہوں۔"

"دیکھ اگر تو اب نہیں بتائے گی تو بعد میں پچھتائے گی۔"

بصری ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ بولی۔ "بہن اس کے پچھلے سکھ ہیں۔ لیکن خدا جانتا ہے کرنیل کور ہمیشہ کی مسلمان ہے۔ اس کا دل بچپن سے مومن تھا۔"

"اگر کسی کو گاؤں میں پتہ چل گیا کہ یہ سکھوں کی بیٹی ہے تو میری چٹیا نالیوں میں ہوگی۔"

"نہیں بہن عذرا سکھ نہیں ہے۔ نماز پڑھتی ہے روزہ رکھتی ہے —— اس کا تو بچپن سے یہی حال ہے —— دین داروں کی بیٹی ہے۔"

"ہائے ہائے بہن خدا کا خوف نومسلم کا رشتہ میرے بیٹے کے لیے ہی رہ گیا تھا؟ —— ہمارے لیے کیا کوئی مسلمان لڑکی کا رشتہ نہیں مل سکتا تھا۔" آج پہلی بار کرنیل کو پتہ چلا کہ بصری اُس کا رشتہ کیوں نہیں کر سکتی تھی ——؟

کرنیل کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو نکل کر اُس کے مہندی لگے ہاتھوں میں جذب ہونے لگے۔ پھر اُسے لگا جیسے بڑی حویلی کے کنگروں پر سے انجیر کے درخت کی ڈالیاں زمین کی طرف جھکیں۔ ایک پتہ ان ڈالیوں سے بچھڑ کر فرش پر جا گرا ——

اس پتے پر ہربیل سنگھ کا نام لکھا تھا۔

ہربیل سنگھ کون تھا؟

کیا میں پاکستان میں کبھی اس کا ذکر کسی سے نہ کر سکوں گی؟ — کیا عذرا بیگم بن کر میرے دل سے ہربیل سنگھ کی ساری محبت دُھل چکی ہے؟ کیا ہربیل سنگھ کا نام میرے سسرال میں گالی سمجھا جائے گا ——؟

حماتیں جھکی آرہی تھیں چار پائیاں ہلکورے لے رہی تھیں —— اور کرنیل کے ہونٹ بغیر ہلے کہہ رہے تھے۔ یا رسول اللہ! تیرے دَر پر آتے ہوئے لوگوں کے لیے تیرے پیاروں نے دروازے کیوں بند کر رکھے ہیں ..؟ مجھے اس بات کا رنج نہیں کہ سوڈھی سرداروں کی لڑکی تیلی کے ساتھ بیاہی جا رہی ہے۔ میں تو تجھ سے پوچھتی ہوں کتنے برسوں میں ایک نومسلم مسلمان ہو جاتا ہے۔ کتنے برسوں میں؟ کتنے برسوں میں عرشِ منور پر جا تولے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد مسلمان کہلانے کے لیے کتنے برسوں کٹھالی میں رہنا پڑتا ہے ..؟ کتنے سال؟ کتنے سو سال؟ اور پھر مسلمان ہو جانے پر کب اور کس طرح وہ تیرے دروازے پر دستک دینے والوں پر تیرا ہی دروازہ بند کر دیتا ہے؟ قفل کھولنے —— اور دوسروں پر قفل لگانے کی کتنی منزلیں ہیں۔ رسول اللہ۔ عرب سے عجم۔ عجم سے پاکستان۔ پاکستان سے بنگال .. .. بنگال سے انڈونیشیا۔ کہاں کہاں دروازے کھٹکھٹائے گئے اور بند پائے گئے —— اندر گھس جانے والے باہر والوں پر یہ ظلم کب تک روا رکھیں گے۔ ظلم سہنے اور ظلم کرنے کی روایت کب تک رہے گی۔ کتنے سال؟ کتنے سو سال؟

دس پیسے کے بارہ

اعجاز حسین بٹالوی

آخر نثار حسن کاظمی ایم اے کو نوکری مل گئی۔

نوکری کا پروانہ ملے تین دن ہو چکے تھے۔ اس کی والدہ محلے کی عورتوں سے مبارکبادیاں وصول کر چکی تھیں اور نثار حسن کاظمی اپنا بستر باندھ چکا تھا۔ نوکری ملنے کی خوشی تو ضرور تھی لیکن آج کافی ہاؤس میں اس کی آخری شام تھی اور جب دوستوں کی مجلس برخاست ہوئی اور وہ گھر جانے کے لئے اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ کافی ہاؤس کی کرسیوں میزوں سے گلے ملے۔ درودیوار سے لپٹ کر رو دے۔ وہ دوستوں کے ہجوم میں گھرا ہُوا کافی ہاؤس سے یوں نکلا جیسے میکے سے دلہن کی ڈولی نکلتی ہے۔

دوست احباب رخصت ہوئے اور وہ اکیلا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر کی طرف روانہ ہُوا۔ سالہا سال سے اس کے قدم ہزارہا مرتبہ ان راستوں کو ناپ چکے تھے۔ کرشن نگر، کالج اور کافی ہاؤس۔ ان راستوں کا ہر درخت، بجلی کا ہر کھمبا، سڑک کا ہر موڑ اس کا آشنا تھا۔ ——— اور کل سے نئی زندگی ہوگی۔ نئے راستے، نئے لوگ، نیا کام۔

اس نے سوچا کیا ہُوا جو شہر میں نوکری نہ مل سکی۔ اندھیرا تو گاؤں ہی میں ہے۔ اصلی پاکستان تو انھیں دیہات میں بستا ہے۔ پاکستان کو ترقی کرنی ہے تو سب سے پہلے تو گاؤں میں روشنی پھیلانی پڑے گی۔ وہ یہی سوچتا ہُوا بڑے دفتر کے قریب سے گزر کر کرشن نگر کی طرف مڑ گیا۔ اس کا اصلی وطن تو اب کرشن نگر ہی تھا۔ انھیں گلیوں میں کھیل کر بچپن گزارا اور وہیں جوانی آئی۔ بریلی کی تو شاید ہی کوئی یاد اس کے حافظے میں محفوظ ہو۔ اور ہوتی بھی کیسے۔ وہ تو ابھی بچہ تھے وہ سے میں پڑھتا تھا کہ اس کا خاندان بریلی سے اٹھ کر پاکستان آ گیا۔ اس کے والد بریلی کی کچہری میں پیشکار ہوتے تھے۔ اب انھیں لاہور کی کچہری میں نوکری مل گئی اور وہ لوگ کرشن نگر میں گھر الاٹ کرا کر یہیں کے ہو رہے۔ گھر میں تو اُردو بولی جاتی تھی مگر نثار حسن خود اچھی خاصی پنجابی بولنے لگا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی فصیح پنجابی بولنے والا ایسا لفظ بول جاتا کہ نثار حسن کی تُرکی تمام ہو جاتی اور وہ ششدر اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔

ایم اے تک پہنچتے پہنچتے اسے محنت کی اچھی خاصی عادت پڑ گئی تھی۔ خاندان کی مالی حالت بہت خوشحال کبھی نہ ہو سکی اس لئے اسکول کالج کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بیچ بیچ میں ملازمت کرتا رہا کبھی محلے میں کسی امیر آدمی کے لڑکے کی ٹیوشن پڑھا دی۔ کبھی اخبار میں ترجمے کا کام کر دیا لیکن اب ایم اے کے بعد تو اسے مستقل ملازمت کی تلاش تھی۔ چنانچہ اس نے ریڈیو پاکستان، انکم ٹیکس، خاندانی منصوبہ بندی، کسٹم اور محکمہ آبکاری میں درخواستیں دے دیں اور آخر کار قصبہ محکمہ خاندانی منصوبہ بندی میں کھلا اور اسے ایک معقول تنخواہ پر اس محکمے میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ دقت صرف یہ تھی کہ ملازمت دیہات کی تھی لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا اور اپنی نئی ملازمت پر رخصت ہو گیا۔

ملازمت کا پہلا پڑاؤ ضلع کا صدر مقام تھا۔ لاہور سے دُور جس ضلع میں اسے کام کرنا تھا اس کے صدر مقام پر تمام نئے بھرتی ہونے والے افسروں کو جمع کیا گیا تاکہ دیہات میں بھیجنے سے پہلے خود ان کی مناسب تربیت کی جائے پہلا لیکچر ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے دیا جس میں اس عظیم کام کی اہمیت واضح کی گئی جو یہ سب نوجوان شروع کرنے والے تھے۔ اِس مسئلے کو ملک کے لئے بہت بڑا چیلنج قرار دیا گیا اور ان نوجوانوں کے دلوں میں اس کام کی عظمت اور اہمیت کے چراغ روشن کئے گئے۔ حکومت ان کے کام کی پشت پناہی کرے گی کروڑوں روپے کا بجٹ اس کام کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ ان کے کام پر اس ملک کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ آنے والی نسلیں صحت مند، ذہین اور ذمہ دار ہونی چاہیں۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر واقعی گفتار کے غازی تھے پہلے لیکچر ہی میں ان نوجوانوں پر جادو کر گئے اور اس تقریر کے بعد جب انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو محسوس ہوا کہ ہر شخص اپنے آپ کو عظیم کام کے لئے سینہ سپر کرنے پر پوری طرح آمادہ ہے۔

پھر دو ہفتے تک اُن کی تربیت ہوتی رہی۔ ڈاکٹروں اور جنسیات کے ماہروں کے لیکچر۔ علم البدن کے پروفیسروں کے لیکچر۔ بچوں کی پیدائش اور افزائش نسل پر لیکچر۔ مانع حمل تدابیر پر لیکچر۔ آبادی اور اقتصادیات پر لیکچر۔ دیہی معاشرت اور خاندانی منصوبہ بندی پر لیکچر۔ غرضیکہ یہ دو ہفتے علم کی گہما گہمی اور نئے ساتھیوں کے میل جول میں گزر گئے۔ کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ لاہور اور لاہور والوں کا کچھ زیادہ خیال نہ آیا۔ نئے کام کی تربیت مکمل ہو چکی تو ان کے تبادلوں کے احکام آ گئے اور دو ہی روز میں نوجوانوں کا یہ گروہ چڑیوں کے چنبے کی طرح اڑ کر منتشر ہو گیا۔ نثار حسن کاظمی کی تعیناتی ضلع کے صدر مقام سے ستر میل دور ایک گاؤں میں ہوئی جس کا نام تھا رکھاں والا۔

ستر میل کا یہ سفر کوئی چھ گھنٹے میں طے ہوا اس لئے کہ دس میل کے بعد کچی سڑک شروع ہو جاتی تھی اور اس سڑک پر ہر روز لاری کے آنے جانے سے سڑک کی مٹی پسے ہوئے باریک میدے کی طرح ہو گئی تھی۔ لاری کے ٹائر اس میں دھنستے چلے جاتے تھے۔ پھر سڑک میں گڑھے بھی تھے مگر لاری ڈرائیور کسی پختہ مشق ملاح کی طرح جو ساحلی چٹانوں سے بچا کر کشتی کو چھوٹے چھوٹے جزیروں تک پہنچاتے ہیں، لاری کو کمال احتیاط سے ان گڑھوں سے بچاتا ہوا رکھاں والا کی طرف لئے جا رہا تھا۔ لاری کی معزز آبادی میں تھانے کا ایک سپاہی، ایک چھوٹے سے طرے والا زمیندار جس نے گلے میں پستول لٹکا رکھا تھا اور نثار حسن کاظمی تھے۔ باقی آبادی عام دیہاتی عورتوں اور مردوں کی تھی۔ راستے میں دو تین مقام ایسے بھی آئے جہاں لاری نے اطمینان سے رک کر آرام کیا۔ یہ راستے کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں بچوں نے گڑ والے چنے، عورتوں نے باسی پکوڑے اور پستول والے زمیندار نے کھوئے کے پیڑے خریدے جن کا رنگ سفید سے پیازی ہو چکا تھا اور اس نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے دوکاندار سے کہا" اوئے بدبختا مکھیاں تو جھل دیا کر۔" نثار حسن کاظمی نے بڑ کے درخت کے نیچے لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے نکال کر پانی پیا اور لاری پھر چل پڑی۔

کوئی دو گھنٹے بعد نثار حسن کاظمی نے لاری میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف نظر اُٹھائی تو اسے محسوس ہوا کہ ان کے خدوخال ان کے چہرے یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہ تازگی، جو سفر کے شروع میں چہروں پر تھی اب غائب ہو چلی تھی۔ گرد کا ایک دیو ہیکل ہیولا تھا کہ لاری کے ساتھ ساتھ اڑتا چلا جا رہا تھا اور دونوں طرف کی جھاڑیوں اور درختوں کو آندھی کی طرح اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جا رہا تھا۔ — نثار حسن کاظمی ایم اے فیملی پلاننگ آفیسر رکھاں والا ہر لحظہ اپنی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

رکھاں والا دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر آباد تھا۔ نثار حسن کاظمی نے پتلون سے گرد کی تہیں جھاڑتے ہوئے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ مسافر لاری کی چھت سے اپنا اپنا سامان اتروا رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے گٹھڑیاں سروں پر رکھے گاؤں کی گلیوں میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے اندازے سے پہچانتے ہوئے اس سے کہا "آپ خاندانی منصوبہ بندی....."

جی ہاں جی ہاں نثار حسن کاظمی کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اسی ایک نقطہ سے رکھاں والا کی ساری اجنبیت ختم ہو گئی "تو چلیے میں آپ ہی کو لینے آیا ہوں۔ میں یونین کونسل کا سیکریٹری ہوں۔"

نثار حسن کاظمی اس کے ساتھ ہو لیا۔ لاری کے اڈے کے ساتھ ہی ایک جوہڑ تھا جس کے بند پانی پہ گہری سبز کائی کی تہہ جم گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جن پر مرغیاں چونچیں مار مار کر کوڑے کو بجا۔ دو طرف پھیلانے میں مشغول تھیں۔ اس کے ساتھ گاؤں کی مسجد تھی اور پھر پرائمری سکول تھا جس کی محراب پہ جلی حروف میں لکھا تھا "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" باہر کے دروازے پہ خوش آمدید لکھا تھا مگر بارش کی دھار کچھ اس طرح پڑی تھی کہ "آ" مٹ گیا تھا اور اب صرف "خوش مدید" باقی رہ گیا تھا جس راستے پر وہ چل رہے تھے وہاں سے چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی میڑھی گلیاں گاؤں کے اندر چلی گئی تھیں جن کے دونوں طرف مٹی کے پکے مکان تھے جن میں بعضوں کی دیواریں پوتی گئی تھیں مگر اکثر گھروں کی دیواریں لیپ پوت کی محتاج تھیں۔

نثار حسن کاظمی کے میزبان نے اس سے کہا "اچھا ہے آپ گاؤں کے باہر ہی رہیں گے۔ ہم نے یونین کونسل کے دفتر ہی میں آپ کی رہائش کا انتظام کر دیا ہے۔"

یونین کونسل کا دفتر گاؤں کے پرانے مندر کی عمارت میں واقع تھا۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد سے اب تک یہ مندر اور اس کے ملحقہ کمرے ویران پڑے تھے۔ شروع شروع میں رہتک اور حصار کے مہاجر یہاں آ کر ٹھہرے تھے مگر جب ان کو قریبی موضع میں زمینیں الاٹ ہو گئیں تو مندر پھر ویران ہو گیا۔ اب یونین کونسل نے اس کی مرمت کرا کے یہاں اپنا دفتر قائم کیا تھا۔ اس عمارت کے ایک مختصر سے کمرے میں نثار حسن کاظمی کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کوٹھڑی میں ایک چارپائی تھی۔ ایک شکستہ سی کرسی تھی اور ایک میز پر لالٹین رکھی تھی۔ یونین کونسل کے سیکریٹری نے نثار حسن کاظمی کی طرف تحسین طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ شہر سے آ رہے ہیں ہم نے آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ کو اپنا کمرہ پسند آئے گا۔" نثار حسن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا "اب آپ آرام کریں۔ شام کا کھانا تو میں آپ کے لئے لاؤں گا اور کل سے آپ کا کوئی بندوبست کر دیں گے اور ہاں کل ہمارے چیئرمین صاحب بھی آپ سے ملنے آئیں گے۔ آج وہ پار کے ایک گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔"

نثار حسن کاظمی کا بستر چارپائی کی پائنتی پڑا تھا اور وہ اس سے ٹیک لگائے چھت کی کڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا اور سورج دریا کے دوسری طرف درختوں کی اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ نثار حسن کاظمی جیسے گہرے خواب سے جاگ کر اٹھا اور مندر کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اس نے صدر دروازے پر لگا ہوا بورڈ پڑھا "دفتر یونین کونسل رکھاں والا" اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دریا کی طرف نکل گیا۔ دور حدِ نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں سیم اور تھور کی کھائی ہوئی بھربھری سفید سفید زمینیں تھیں۔ سر پہ آسمان کی چھت تھی اور دور دور تک کوئی چیز نظر میں حائل نہ ہوتی تھی۔ ہر شے خاموش تھی، خاموش اور ساکت۔ دریا کا پانی بھی انتہائی خاموشی سے بہہ رہا تھا اور

ہر شے آہستہ آہستہ سرمئی اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ دُور ٹیلے پر گاؤں کی مسجد کے مینار اور پھیلے ہوئے کوٹھے ایک گہرے غبار میں چھپتے جا رہے تھے اور خاموشی جو نثار حسن کے دل کے اندر تھی اور اس کے باہر تھی اسے ایک عجیب طرح کا سکون پہنچا رہی تھی جیسے جدائی کے زخموں پر مرہم کا کام کر رہی ہو۔

اگلے روز یونین کمیٹی کا چیئرمین نثار حسن کاظمی سے ملنے آیا۔ اُوپر ململ کا ڈھیلا ڈھالا کھلی آستین کا کرتا۔ نیچے نیلے رنگ کا تہمد، سر پہ چھوٹا سا ٹپکا جو اس طرح باندھا گیا تھا کہ اس کے تیل لگے ہوئے پٹوں کی چمک پر حاوی نہ ہو سکتا تھا۔ مونچھیں جن کے سروں کو تاؤ دے کر ذرا سا اوپر کی طرف اٹھا دیا گیا تھا اور سر پہ تیل لگانے کے بعد وہی ہاتھ مونچھوں پر بھی پھیر دیا گیا تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان گھوڑی کا رنگ سفید جو مندر کے بیرونی صحن میں پیڑ تلے باندھ دی گئی تھی۔ چیئرمین کے آنے سے پہلے گاؤں کے کافی لوگ کمیٹی کے دفتر میں پہنچ چکے تھے۔ یہ سب لوگ علاقے کے معتبر تھے۔ نمبردار، یونین کونسلوں کے ممبر، جرگے کے رکن، چودھری اور علاقے کے با اثر لوگ جن سے نثار حسن کاظمی کا تعارف کرایا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے کام اور اپنے فرائض کے متعلق انہیں تفصیل کے ساتھ کچھ بتائے۔ اب نثار حسن کو اس طرح کی تقریر کرنے کا موقع مل گیا جس طرح پہلے روز ڈپٹی کمشنر صاحب نے کی تھی۔ گاؤں کے لوگ خاموشی سے اس کی تقریر سنتے رہے مگر اس کو حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ تقریر کے بعد جو سوال پوچھے گئے ان میں سے بیشتر کا تعلق اس کے کام سے نہ تھا مثلاً آپ کی ذات کیا ہے؟ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کس خاندان سے آپ کا تعلق ہے؟ مہاجر ہیں یا مقامی؟ تعلیم کتنی ہے؟ شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟ اور جب یہ میٹنگ ختم ہو گئی اور مجمع آپس میں گھل مل کر منتشر ہو گیا تو ایک فقرہ جو نثار حسن کاظمی نے دبے دبے لفظوں میں دو تین مختلف لوگوں سے سنا تھا کانسی کے تھال کی طرح اس کے ذہن میں جھنجھناتا رہا "یہ جی چودھری صاحب جو رُوح دنیا میں آنی ہے اسے بھلا کون روک سکتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کس کا دخل ہے۔" اور اسے یوں لگا جیسے یہی فقرہ اس کے راستے کی سب سے بڑی کھائی ہے یا تو وہ خود اس میں گر جائے گا یا قسمت اچھی ہوئی تو اسے پھلانگ کر نکل جائے گا۔

اپنی ہدایات، تربیت اور چیئرمین کے مشورے سے نثار حسن کاظمی نے باقاعدگی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ لوگوں کو اس کام کی اہمیت سے آشنا کیا جائے اور پھر اس کام کے پرچار کے لئے کام کرنے والوں کا ایک پورا دستہ گاؤں کی آبادی پر چھوڑ دیا جائے جو ہر شادی شدہ مرد اور عورت کو خاندانی منصوبہ بندی کے فوائد سے آگاہ کرے۔ نثار حسن کاظمی کی تربیت اور علم کے مطابق دیہاتی آبادی کے دو گروہ ایسے تھے جن کی صف آرائی اس سلسلے کا اولین کام تھی۔ ایک گاؤں کی دائیاں اور دوسرے گاؤں کے حکیم۔ چیئرمین کے اختیارات کو استعمال میں لا کر یونین کونسل کے سارے علاقے کی دائیوں کو طلب کر لیا گیا اور نثار حسن کاظمی نے ان کی تربیت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آج ان کا پہلا لیکچر تھا۔ پُرانے مندر کے بڑے کمرے میں جہاں آج سے ربع صدی پہلے تک مرد ملی اور مُردہ پتھروں کی پوجا ہوتی تھی، آج نثار حسن کاظمی نے ایک نئی تدریس کی ابتدا کی۔

اس کے سامنے پچیس تیس دیہاتی عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن میں بیشتر ادھیڑ عمر کی تھیں۔ کوئی کوئی ڈھلتی جوانی کی تھی۔ جس نے جوانی میں بیوہ اور بے سہارا ہو کر دائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ چہرے مہرے سے سب کی سب تجربہ کار اور پکی پیڑھی معلوم ہوتی تھیں۔ نثار حسن کاظمی عجب مخمصے میں گرفتار تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے۔ سب سے پہلے اُس کے منہ سے نکلا "بہنو اور بی بیو"۔ پھر خاموشی چھا گئی پھر اُس

نے سوچ کر کہا: "میں اُسی کام کے متعلق آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو آپ برسوں سے کر رہی ہیں یعنی بچے کی پیدائش" - اس فقرے کے بعد جیسے نثار حسن کاظمی اپنے موضوع پہ قائم ہو گیا اور اس نے پورے وثوق اور علم کے ساتھ اپنی تقریر جاری کر دی - زمین کی گھٹتی ہوئی پیداوار اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی - لمبے چوڑے خاندان کی مصیبتیں، تعلیم کی ضرورت، اقتصادی بدحالی اور خوش حالی کی وجوہات، مختصر کنبے کے فوائد غرضیکہ ایک دریا تھا جو آہستہ روی سے بہتا چلا جا رہا تھا اور دیہات کی یہ دائیاں جو برس ہا برس سے اس علاقے کی آبادی میں اضافہ کر کے خوش ہوتی اور مبارکبادیاں وصول کرتی چلی آئی تھیں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں کہ اُن کے بظاہر نیک کام کے کیسے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں - پھر اُس نے گریز کیا اور اپنی تقریر کا رُخ آبادی کو کم کرنے کے لئے احتیاطی تدابیر کی طرف موڑ دیا - مانع حمل تدابیر سے پہلے ضروری تھا کہ وہ بچے کی پیدائش اور افزائش نسل کی ابتدا کا تذکرہ کرے چنانچہ اس نے طرح طرح کے چارٹ نکال کر سامنے لٹکا دیئے۔

یہ دیکھیے "نسل انسانی کا آغاز اس ایک جرثومے کے دوسرے جرثومے سے ملاپ کے ذریعے ہوتا ہے - اُس نے لمبی سی چھڑی اُٹھا کر ایک چارٹ کی طرف اشارہ کیا - اس نقشے میں عورت کا جسم ...... اور ابھی وہ فقرہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی دونوں عورتوں نے اپنے دوپٹے کا پلّو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور دوسری صف میں بیٹھی ہوئی تینوں عورتیں چارٹ پر سے نگاہیں ہٹا کر دیوار کی طرف دیکھنے لگیں پیچھے سے ایک عورت کی دبی ہوئی آواز " ہائے ہائے نی یہ ڈاکٹر کیسی بے شرمی کی باتیں کر رہا ہے "۔

کمرے کی فضا میں اب ایک ایسا کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ تقریر جاری رکھنا نثار حسن کاظمی کے لئے مشکل ہوتا جا رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ گھبرا کر کرسی پر بیٹھ جاتا مگر اسے اپنی تقریر کے لئے ایک لمحہ سہارے کا خیال آیا - اس نے پھر کہا: " بہنو اور بیبیو! مجھے افسوس ہے کہ جو کام آپ ساری عمر کرتی رہی ہیں اس کے بیان پر آپ کو خواہ مخواہ ہچکچاہٹ ہو رہی ہے حالانکہ آپ سب خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور آپ نے سن رکھا ہے کہ شرع میں شرم نہیں ہوتی - یہ اگر ایسا ہی مضمون ہوتا تو خدا کے کلام اور رسول اللہؐ کی احادیث میں بچے کی پیدائش کا ذکر نہ ہوتا - آپ جانتی ہیں کہ افزائش نسل تو ایک اعتبار سے خدا رسولؐ کے حکم کی بجا آوری ہے "۔ اب کمرے کی فضا میں پھیلا ہوا کھنچاؤ ٹوٹ گیا - آنکھوں پر پڑتے ہوئے دوپٹے نیچے گر گئے دیوار پر لگی ہوئی نظریں واپس چارٹ پر آگئیں اور پچھلی رو سے ایک بڑی عمر کی دائی کی آواز آئی جو اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت سے مخاطب تھی: " اڑیئے ڈاکٹر ٹھیک ہی تو کہتا ہے شرع سے آگے کیا شرم جو چیز تم ساری عمر دیکھتی رہی ہو اس کی تصویریں دیکھتے میں کیوں شرماتی ہو "۔

خدا خدا کر کے نثار حسن کاظمی نے اپنی تقریر ختم کی اور دائیوں کو اگلے روز صبح نو بجے دوسرے لیکچر کے لئے آنے کی ہدایت کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پورے اٹھارہ دن دائیوں کی تربیت پر صرف ہوئے - نثار حسن کاظمی کا کام آسان نہ تھا - صدیوں کے توہمات ان کے دلوں سے دُور کرنے تھے - صرف علم ہی کافی نہ تھا - کوشش یہ تھی کہ وہ اس کام کی اہمیت سے واقف ہو جائیں اور اس کے اچھا اور ضروری ہونے پر ایمان لے آئیں - سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اگر وہ خالص علمی انداز سے گفتگو کرتا تو وہ بیزار ہو کر بے تعلق ہو جاتیں اور اگر وہ انھیں ذرا ڈھیل دیتا تو وہ ایسی کھل کر باتیں کرنے لگتیں کہ کلاس روم کی گفتگو اور فقرے بازی بے حیائی کا نمونہ بن جاتی - ایک روز جب وہ نہایت علمی اور سائنسی انداز میں مرد اور عورت کے اختلاط کے وقت احتیاطی تدابیر کا ذکر کر رہا تھا تو ایک دائی نے ہنس کر کہا: " ڈاکٹر

جی آپ کی تو شادی بھی نہیں ہوئی، آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہو گئیں اور اِس پر سب کی سب اِس طرح کھلکھلا کر ہنسیں کہ نثار حسن کاظمی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

اِن سب مشکلات کے باوجود وہ خوش تھا کہ اُس کے کام کو آگے بڑھانے والا یہ پیشرو دستہ آہستہ آہستہ کام کی اہمیت سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔

مانع حمل دواؤں اور احتیاطی تدابیر پر اُن کو مفصل لیکچر دیئے گئے تھے اور نثار حسن کاظمی کو یقین تھا کہ جب یہ عورتیں تربیت مکمل ہونے پر سارے علاقے کے گھروں میں پھیل جائیں گی تو گویا اِس علاقے میں خاندانی منصوبہ بندی کا پہلا مورچہ قائم ہو جائے گا۔

خاندانی منصوبہ بندی کا دوسرا مورچہ علاقے کے مقامی طبیب، حکیم اور سیلانے تھے۔ چیرمین نے یونین کونسل کے سارے ممبروں سے کہا کہ اپنے اپنے علاقے کے حکیموں کی فہرستیں اسے بھیج دیں۔ یونین کمیٹی نے تمام حکیموں کو چٹھیاں لکھ کر اپنے دفتر میں بلا لیا اور مقررہ روز سارے علاقے کے حکیم گھوڑوں پر سوار دفتر میں پہنچ گئے۔ قریبی مواضعات کے حکیم پیدل چل کر بھی آئے۔ غرضیکہ اچھا خاصا مجمع ہوا۔ نثار حسن کاظمی کو اپنے دعوت ناموں کا یہ رَدِ عمل دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ وہ ہنس ہنس کر ہر ایک سے ہاتھ ملاتا۔ اس کا نام پتہ اپنے رجسٹر میں درج کرتا اور انھیں اپنے کام میں شریک کرتا جاتا۔ حکیموں کا کام دائیوں کی نسبت زیادہ آسان تھا۔ دائیاں تو دراصل ایک طرح کی ففتھ کالم تھیں جنھیں غنیم کی صفوں میں گھس کر بغاوت پھیلانا تھی مگر حکیم تو میدانِ جنگ تک گولہ بارود سپلائی کرنے والے دستے کا کام کرنے والے تھے اور پھر اس خدمت کے لئے اقتصادی مفاد الگ تھے۔

نثار حسن کاظمی نے علاقے کے تمام حکیموں کو سمجھا دیا کہ یہ کارِ خیر ان کے تعاون کے بغیر نہ ہو سکے گا۔ احتیاطی تدابیر کے لئے لاکھوں روپے کا سامان دیہاتوں میں بھیجا جا رہا ہے۔ اِس کی فروخت اور تقسیم کا کام حکیم صاحبان کو سنبھالنا پڑے گا۔ پھر نثار حسین کاظمی نے اپنا بکس کھولا۔ "یہ دیکھیے اِس ڈبیا میں جھاگ والی گولیاں ہیں اور بیس گولیوں کی قیمت صرف چار آنے ہے اور یہ ہیں ربڑ، دس پیسے کے بارہ۔ شہر سے یہ چیز خریدیے تو آپ کو صرف ایک کے دام آٹھ دس آنے دینے پڑیں گے لیکن سرکار کی مہربانی ہے کہ آپ لوگوں کی مالی حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اتنی کم قیمت مقرر کی ہے، یعنی دس پیسے کے بارہ۔ میری گزارش ہے کہ آپ ان دونوں چیزوں کا سٹاک اپنی اپنی دکانوں پر رکھ لیجیے اور ضرورت مندوں کو سپلائی کیجیے۔ دونوں احتیاطی تدبیروں میں سے اگر ایک کا بھی استعمال کر لیا جائے تو کافی ہے۔"

تقریر کا یہ حصہ سن کر حکیموں کے چہروں پر دلچسپی کی کوئی خاص لہر نظر نہ آتی تھی بلکہ وہ چیرمین کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے خاموشی سے اُس کو کہہ رہے ہوں کہ آپ نے آخر ہم کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا اب ہم سے ایسے کام لئے جائیں گے۔

اب نثار حسن کاظمی نے ترُپ کا پتہ پھینکا۔ "جناب حکیم صاحبان اِس کارِ خیر میں شرکت کے لئے ہم آپ کی تھوڑی بہت مالی امداد بھی کریں گے۔ حکومت نہ صرف اِس ملک کی بہتری اور خاندانی منصوبہ بندی کی کامیابی میں دلچسپی لے رہی ہے بلکہ آپ کی مالی بہبود بھی اس کے پیشِ نظر ہے طریقہ اِس کا یہ ہو گا کہ آپ ہمارے پاس سے اگر دس روپے کا مال خرید کر اپنے پاس رکھیں گے تو اس

کو بیچ کر ہمیں صرف پانچ روپے واپس کریں گے باقی پانچ اپنی خدمات کے عوض منافع کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں گے۔"

اب معزز حکیم صاحبان کی دلچسپی خاندانی منصوبہ بندی میں فزوں تر ہونے لگی اور ہر طرف سے اس تجویز کو خوش آمدید کہنے اور اس کی کامیابی کے لئے مزید تجویزیں پیش کرنے کی پیش کش شروع ہو گئی۔ ایک حکیم صاحب نے فرمایا کہ مسجدوں کے خطیبوں سے بھی اس کارِ خیر میں شرکت کرنے کے لئے کہا جائے لیکن نثار حسن کاظمی نے اس کی حامی نہ بھری۔ پرائمری اسکولوں کے مدرسوں کے متعلق خیال یہ تھا کہ جہاں تک اسکولوں کے اندر کا سوال ہے وہاں تک ان کا دائرۂ عمل بچوں تک محدود ہے اسکول سے باہر البتہ اگر وہ چاہیں تو نئے خیالات کی ترویج میں کافی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بعض حکیم صاحبان نے ان احتیاطی تجاویز کو حفظانِ صحت کے لئے بھی مفید قرار دیا اور جب ان اشیا کو اپنی دوکان پر اسٹاک کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوتا تھا ہر شخص دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا ہے۔

نثار حسن کاظمی نے کہا: "جناب حکیم صاحبان سرکار کا حکم یہ ہے کہ میں پانچ روپے نقد لے کر دس روپے کا مال آپ کو دے دوں۔ یہ دس روپے کا مال بذاتِ خود چالیس پچاس روپے سے کم نہیں یہ تو صرف دیہات کی مالی حالت اور نئے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لئے ایسے کم داموں پر آپ کو دیا جا رہا ہے لیکن آپ کے چیئرمین صاحب آپ پر مزید مہربانی کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آپ میں سے جو صاحبان ہم کو یہ حلف نامہ لکھ دیں کہ وہ دس روپے کا مال ہم سے وصول کر رہے ہیں اور اس کو فروخت کر کے ہم کو پانچ روپے واپس کر دیں گے اور پانچ روپے خود رکھ لیں گے اُن کو مال فی الحال بغیر قیمت وصول کئے دے دیا جائے اور قیمت صرف اسی وقت وصول کی جائے جب مال فروخت ہو جائے۔"

اب حکیم صاحبان نے جھاگ والی گولیاں اور ربڑ اس ذوق و شوق سے حاصل کرنے شروع کئے جیسے سمجھدار تاجر منڈی میں دام سستے دیکھ کر زیادہ سے زیادہ مال خریدتا ہے۔

اب دوسرا مورچہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ نثار حسن کاظمی نے اپنی کارکردگی کی ماہانہ رپورٹ اپنے افسرانِ بالا کو بھیجنا شروع کر دی۔ وہ اُس کے کام سے خوش تھے اور وہ بھی اپنی کامیابی سے مطمئن تھا کبھی کبھی دیہات کی دائیاں اس کے دفتر میں آ کر اسے اطلاع دیتیں کہ کیسے ابتدائی مدافعت کے بعد گھروں میں چکی چولہے کا کام کرنے والی عورتیں اب ان کی باتوں پر کان دھرنے لگی ہیں اور کبھی کبھی وہ خود اپنے علاقے کے دیہات میں اُن حکیموں کی دوکانوں کا دورہ کرتا اور خود اُن سے گفتگو کر کے اپنے کام کے متعلق نتیجے نکالتا۔ جب وہ اپنے دیئے ہوئے مال کی قیمت فروخت اُن سے وصول کرتا تو اُس کا دل باغ باغ ہو جاتا کہ حق بحقدار پہنچ رہا ہے اور دائیاں جو اس مہم کے ہراول دستے کا کام کر رہی ہیں، نئے خیالات پھیلا کر حکیموں کے مال کی بکری کے راستے کھول رہی ہیں۔

نثار حسن کاظمی کے افسر اس کے کام سے خوش تھے اور اُس کو ہدایات آ رہی تھیں کہ اب وہ اپنے علاقے میں اگلا قدم اٹھائے اور قریبی شفاخانے سے مل کر احتیاطی مردانہ آپریشن کے لئے بھی رضاکار مہیا کرے اور اگر ہو سکے تو اپنے علاقے کی عورتوں میں زیادہ مستقل احتیاطی تدابیر کو عام کرنے کی کوشش کرے لیکن نثار حسن کاظمی ابھی اس کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اُسے اِن کاموں کے لئے کس قدر سخت جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ گاؤں والے ابھی تک اسے ایک باہر سے آئے ہوئے اجنبی کی طرح ملتے تھے۔ گاؤں کی زندگی اور طور طریقوں کو اختیار کرنا اس کے لئے آسان نہ تھا لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے اُوپر جبر کر کے اپنے اندر دیہاتی رنگ

پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاؤں والے نہ اس کی عزت کرتے تھے نہ اس سے ڈرتے تھے محض اس لئے کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے پاس دراصل کوئی سرکاری اختیارات نہیں ہیں۔ ایک دن ایک دیہاتی نے اس سے پوچھا تھا "ڈاکٹر جی یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے سولہ جماعتیں پڑھی ہیں؟"

اس نے کہا "یہ درست ہے" تو دیہاتی بے ساختہ بولا "پھر بھی آپ کو تحصیلداری نہ ملی؟" نثار حسن نے کہا "ہاں مگر میں نے تو تحصیلداری کی کوشش ہی نہیں کی۔" مگر دیہاتی نے فوراً کہا "یار ڈاکٹر تحصیلداری نہیں ملتی تھی تو گرداوری کر لیتے۔"

نثار حسن کاظمی جب سیر کے لئے نکلتا تو گاؤں کی عورتیں جو سارا دن گاؤں والوں کے سامنے بغیر گھونگھٹ نکالے اِدھر سے اُدھر پھرتی رہتیں اُسے دیکھ کر فوراً گھونگھٹ نیچے کر لیتیں اور نثار حسن کو احساس ہوتا کہ وہ اِس گاؤں میں باہر والا ہے۔ گاؤں والے اس کے پاس آ کر یونین کونسل کے چیئرمین کو لاکھ لاکھ گالیاں دیتے۔ اُسے ڈکیت اور رشوت خور کہتے لیکن جب اُس کے سامنے آتے تو اس کی خوشامد بھی کرتے۔ اُس کے پاؤں بھی چھوتے اور گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے محض اس لئے کہ اس کے پاس اختیارات تھے۔ وہ پولیس سے نفرت کرتے مگر تھانے کا ایک سپاہی بھی اگر گاؤں میں آجاتا تو گاؤں کا ہر شخص مؤدب ہو کر اس سے بات کرتا۔

آہستہ آہستہ نثار حسن کاظمی پر اس کائنات کے اسرار و رموز کھلنے لگے تھے اور وہ سوچتا تھا دیہات میں کام کرنا کسی شہر والے کے صبر اور ذہانت کا آخری امتحان ہے لیکن اسے ایک بات کا ہمیشہ سہارا رہتا تھا اور وہ یہ تھی کہ اُسے اپنے کام کی اہمیت اور ضرورت پر ایمان تھا اُسے یقین تھا کہ وہ جو کام کر رہا ہے اُس میں اُس کے ملک کی بھلائی ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اِس زندگی کی ہزار مشقتیں برداشت کرتا جا رہا تھا اور اُس نے گاؤں کی زندگی کی اُداسی کو بھی برداشت کر لیا تھا جو گھن کی طرح اُس کی رُوح کو کھائے جا رہی تھی۔

گیہوں کے کھیت سبز سے بھورے ہو کر کٹنے شروع ہو گئے تھے اور فضا میں گرمی اور اُداسی پھیلنے لگی تھی فصلیں کٹنے لگی تھیں اور درگاہوں اور مزاروں پر عرس اور میلے لگنے شروع ہو گئے تھے۔

نثار حسن کاظمی یونین کونسل کے صحن میں درخت کے نیچے بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ ساتھ کے گاؤں کا نمبردار اس کے پاس آیا اور رازداری کے لہجے میں اُس سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دم اُس کی آواز میں غصہ بڑھنے لگا اور وہ اونچی آواز میں بولا "دیکھیئے میں آپ کو بتا دیتا ہوں سارا گاؤں ڈانگیں لے کر آپ کے اُس حکیم پر ٹوٹ پڑے گا اور اُس کا سر توڑ دے گا۔ آخر بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

نثار حسن نے نمبردار کو تسلی دی اور بار بار یہ کہا "آپ گھبرائیے نہیں مَیں خود آ کر اس کی تحقیق کروں گا۔ آج ہی تحقیق کروں گا۔ یہ بھلا ہو کیسے سکتا ہے۔ یہ تو سرکاری مال ہے۔"

سہ پہر کو نثار حسن کاظمی اپنے گاؤں سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے قریبی گاؤں میں پہنچا۔ گاؤں کے میدان میں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں کھیل رہے تھے۔ دن بھر لُو چلتی رہی تھی اور اب لُو چلنا تو بند ہو گئی تھی مگر مٹی کے ذرّے ہوا میں معلق ہو گئے تھے جس سے گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ میدان میں ہر طرف گرد اُڑ رہی تھی اور گاؤں کے بچے دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز اپنے کھیلوں میں مشغول تھے۔ گرد و غبار

اڑاتے اِدھر سے اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ اُن کے پاس آٹھ دس غبارے بھی تھے جنھیں کبھی وہ ہوا میں اچھالتے تھے اور کبھی فٹ بال کی طرح پاؤں سے ٹھوکر لگا کر اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک طرف کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ نثار حسن کاظمی نے اسے محبت سے اپنے پاس بلایا "کیوں بیٹے یہ غبارے تم کہاں سے لیتے ہو؟" —— "حکیم جی کی دوکان سے" اس بچے نے جواب دیا — "کتنے میں آتا ہے" نثار حسن نے پوچھا "ایک آنے میں" لڑکے نے کہا۔

نثار حسن کاظمی نے جیب سے ایک آنہ نکال کر اُسے دیا اور کہا "لو بیٹا تم بھی ایک خرید لو" لڑکا اکنّی لے کر گلی کی طرف بھاگا۔ نثار حسن کاظمی جلدی جلدی قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چل کر گلی کے موڑ پر رک گیا جہاں سے حکیم صاحب کی دوکان صاف نظر آتی تھی۔ لڑکے نے ایک آنہ حکیم صاحب کو تھما دیا۔ انہوں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا۔ اندر سے ایک ربڑ نکالا اُسے کھول کر منہ کے قریب لے گئے۔ دونوں ہونٹ اس کے اُوپر رکھے اور پھیپھڑوں کی ساری ہوا پورا زور لگا کر اس کے اندر بھر دی۔ نثار حسن کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ کمبخت چیز پھیل کر اتنی بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ اب وہ غبارہ سا پھول کر ایک اچھے خاصے تربوز جتنا بڑا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب نے اکنّی اپنی صندوقچی میں ڈالی اور غبارے پر دھاگہ باندھ کر بچے کے حوالے کر دیا جو اسے لے کر بھاگتا ہوا آیا اور باقی بچوں میں شامل ہو گیا۔

نثار حسن کاظمی میدان کے کنارے اپنا سر تھامے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کائنات میں ہر طرف غبارے ہی غبارے اڑتے پھرتے تھے —— دس پیسے کے بارہ مگر آنے کا ایک ایک!

پاتال

جوگندر پال

مَیں کہاں ہوں؟

یورپ میں، امریکہ یا افریقہ میں، یا برِصغیرِ ہند میں؟

مجھے معلوم نہیں۔ اگر مَیں باہر نکل کر دیکھنا چاہوں کہ میں کہاں ہوں تو مجھے گولی سے اڑا دیا جائے گا۔

باہر کرفیو نافذ ہے!

میرے آس پاس کی دُنیا اس قدر پُرسکوت ہے کہ بے اختیار شور بپا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شور سے مجھے ڈر لگتا ہے، لیکن جی چاہتا ہے کہ شور بپا ہو۔

ابھی ابھی یہاں قیامت گُزر آئی تھی۔ آگ ہی آگ، خون ہی خون، لاچار چیخیں جو جان بچانے کو مُنہ سے یوں کود پڑیں۔ جیسے جان بچانے کی کوشش میں خودکشی کر رہی ہوں۔

"نہ بیٹا، دروازہ مت کھولو۔"

باہر موت ہی موت ہے اور زندگی باہر سے بھاگ کر اندر چلی آئی ہے اور مقبرے آباد ہو گئے ہیں۔

ہم ایک دوسرے سے کیوں کر ملیں گے؟ اپنی قبر سے پڑوس کی قبر تک کیسے پہنچیں گے؟ ہمیں اپنے ملنے مُلنے کی عادتیں بدلنی ہوں گی۔ کسی سے سچ مچ گلے ملنے کے لیے بے قرار ہونے کی بجائے ہمیں اپنے آپ کو یقین دلانا ہوگا کہ ملاقاتیں دل ہی دل میں کی جاتی ہیں۔ جو لوگ قبروں میں آباد ہوں اُن سے صرف ذہنوں میں ہی ملاقات ہو سکتی ہے۔

"بھیّا، میں اپنے گھر میں بڑی خوش ہوں۔ میرے میاں بڑے اچھے ہیں اور سُسرال کے سب لوگ بڑے اچھے ہیں۔ میں بڑی خوش ہوں، مگر آپ کی یاد آتی ہے بھیّا تو میرا سینا نہیں تھمتا۔"

"ارے پگلی، میں دور تھوڑا ہی ہوں، یہ ہندوستان ہے اور یہ ساتھ ہی پاکستان۔ بس ذرا آنکھیں بند کروں اور یہ لو میں تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ رؤو نہیں۔ نہ۔ نہ۔ دیکھو میں بھی تمہاری طرح مور کھ ہوں۔ میرے بھی آنسو نکل آئے ہیں۔"

(یا اللہ! کیا روحیں بھی روتی ہیں؟)

"ابّا جان، میں باہر جاؤں گا۔"

"باہر کرفیو ہے بیٹا۔"

"کرفیو کیسا ہوگا ابّا۔ آپ باہر جا کے اُسے بچائیے۔ وہ لوگ اُسے مار دیں گے۔ جائیے ابّا جائیے! کرفیو کو اندر لے آئیے۔"

مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ کرفیو ہمارے دروازے کے باہر سہما ہوا کھڑا ہے، میں نے اُٹھ کر چپکے سے دروازہ کھولا ہے، اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ اندر گھس آیا ہے۔ اور اس کی بھیدبھری ہولی شکل دیکھ کر خوف کے مارے میں اپنے کمرے سے دوڑ کر وجود کے اندر چلا آیا ہوں، اور جو دو اُتھ دو سال پہلے اپنے وجود کے باہر دیکھا تھا اُسے اپنے ذہن میں بار بار ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ کسی سفاک نے اپنے بوجھل کلہاڑے کو دونوں ہاتھوں سے سر کے اوپر اٹھا لیا ہے۔ ک۔ ٹک! میرا بڑا بیٹا کٹ کے گر گیا ہے۔ میری مضبوط ترین شاخ کٹ گئی ہے۔ میرے تنے سے سفید خون بہہ رہا ہے۔ مجھے رونا نہیں آ رہا، مگر میرے بیٹے کا قاتل رو دیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرا رامو بھی اسی طرح مرا تھا۔ وہ بدستور روئے جا رہا ہے۔ جیسے اُس نے میرے ہمو کو قتل نہیں کیا بلکہ کسی اور نے اس کے رامو کو قتل کیا ہے۔ وہ اپنے غم کی تاب نہ لا کر پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے میرے ہمو کو پھر قتل کرنے کے لیے کلہاڑے کو پھر دونوں ہاتھوں سے سر کے اوپر اٹھایا ہے۔ اور اسے روکنے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھایا ہے۔ مگر خیالوں کے ہاتھ گرفت پر کہاں قادر ہوتے ہیں؟ میرا بچہ پھر قتل ہو گیا ہے۔

میں رابرٹ کینیڈی کا باپ ہوں۔

جوزف، تم تو دوسری جنگِ عظیم میں کام آ گئے تھے۔ اب پھر تیسری جنگ کے لیے کہاں سے آ کر صف آرا ہو گئے ہو بیٹا؟

جان، تم رابرٹ کے کان میں کیا پھونک مار گئے تھے کہ وہ بھی تمہارے پیچھے پیچھے نکل پڑا؟ ملکِ عدم کے راہیو! ملکِ عدم میں کوئی کسی کو نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اس بے چہرہ کائنات کی خاک چھاننے کی بجائے یہیں پڑے رہو۔ زندہ ہو گے تو بچھڑ کر بھی تصور میں ایک دوسرے سے مل لو گے مگر مر جاؤ گے تو تمہارے جسم کے ساتھ تمہارا تصور بھی مر جائے گا ——— ادھر آؤ ایڈورڈ، تم کینیڈی خاندان کے بجھتے چراغوں کی لو ہو۔ ادھر آؤ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ بیٹھو۔ آؤ کافی پئیں بیٹا، اور گڈ اولڈ ڈیز کی باتیں کریں، جب ہم پر گاڈ آل مائٹی پیہم برکتیں نازل کیا کرتا تھا۔ نہ بیٹا جیزس کے باپ کو ان بُرے دنوں کا ذمہ دار مت ٹھہراؤ۔ خدا رحیم ہے، بہر صورت رحیم۔ اگر وہ رحیم نہ ہوتا تو تم بھی اپنے بھائیوں کے مانند چل بسے ہوتے۔ ارے ــ یہ کہاں جا رہے ہو ایڈورڈ بیٹے؟ مقبروں میں تمہارا دم گھٹتا ہے؟ میرا بھی دم گھٹتا ہے بیٹا، مگر مقبرے محفوظ ہیں۔ یہیں پڑے رہو۔ مُردے کبھی نہیں مرتے۔ یہاں تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔ نہیں؟ کیوں نہیں؟ ــ کیا تم بھی اپنے بھائیوں کے مانند ــ؟ کیا تم بھی بیٹا؟ کیا ــ ک ــ؟ ــــ؟

"پھر دروازے کی طرف جا رہے ہو بیٹا۔ خبردار! باہر کرفیو ہے۔"

"نہیں ابا، میں باہر جا کے کرفیو کے ساتھ کھیلوں گا۔"

میں اپنے معصوم بچے کو کیسے سمجھاؤں؟ وہ لوگ بھی تو کرفیو سے کھیلنے کے لیے ہی نکل آئے تھے۔ کیا مزیدار کھیل تھا! روشنی کا کھیل، اتنی دلفریب روشنی کہ نظر دھوکا کھا جائے۔ انسان جل رہے ہوں اور گمان یہ ہے کہ پھل جھڑیاں جل رہی ہیں۔ آپ کیوں منع کرتے ہیں؟ آتشبازی کا موقع روز روز تھوڑا ہی ملتا ہے۔ خوب تالیاں پیٹو، کھلکھلا کر ہنسو تاکہ لوگ چیخ رہے ہوں تو معلوم ہو کہ پٹاخے ٹھاٹھا قہقہے لگا رہے ہیں۔ طبیعت گدگدا اُٹھے تو آس پاس کی عمارتیں لوٹ پوٹ ہو کر گرتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ ہنسو، ہنستے جاؤ تاکہ تمہیں یاد نہ رہے کہ کب ہنسا جاتا ہے۔ کب ہنسا جاتا ہے۔ ہنسی کا بھی کوئی ٹائم ہوتا ہے بھلا؟ بس جب ہنسنے کو جی چاہا ہنس لیا۔

ایک امریکی نے ایک انگریز سے پوچھا۔

"آپ ہنستے ہیں تو آپ کے چہرے پر اتنا کھچاؤ کیوں آجاتا ہے؟"

"کیوں کہ ہم مقررہ اوقات پر چہرے کی ورزش کے لیے اپنے آپ کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

"اسی لیے آپ اپنی سلطنت تباہ کر بیٹھے۔ ہم تو بے سبب ہنستے رہتے ہیں' اور اپنے اردگرد سب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح بے سبب ہنسیں۔"

"اور اگر وہ بے سبب نہ ہنسیں تو۔"

"تو ہم انہیں گولی مار دیتے ہیں۔"

مارٹن لوتھر کنگ! سُنا تم نے؟ تمہیں اس لیے گولی ماردی گئی کہ تم نے بے سبب ہنسنے سے انکار کر دیا، ٹھیک ہے تمہارے پاس بے سبب ہنسنے کا بھی کوئی سبب نہ تھا، مگر جان بچانا کیا اسباب میں شمار نہیں ہوتا؟ ۔ لیکن شاید ہنسنے کے باوجود تمہاری جان کو بدستور خطرہ لاحق رہتا، اگر سفید لوگ تمہارے تاریک چہرے پر افسوس کے نشان نہیں دیکھ سکے تو اس اندھیرے میں تمہاری خوشی کا نشان کیوں کر ملتا؟ تمہیں ہر صورت میں قتل ہونا ہی تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ' کیونکہ تمہارے چہرے کی تاریکی سے وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ امریکی تمدن کو اندھیرے سے خوف محسوس ہوتا ہے' اسی لیے وہ ہمہ وقت روشنی سے گھرا رہنا چاہتا ہے۔ ایجوکیشن فار لائیٹ' لونگ فار لائیٹ' کلنگ فار لائیٹ امریکی تمدن سوتا بھی ہے تو ڈر کے مارے چکا چوند روشنی میں' ان حالات میں اسے نیگرو چہرے کی بے نشان تاریکی سے الجھن کیوں نہ ہوتی؟ جوں جوں روشنی بڑھتی جاتی ہے' اندھیرا ختم ہوتا جاتا ہے۔ اندھیرے کو ختم ہونا ہی ہے' اندھیرے کو ختم ہونے دو۔ تم خواہ مخواہ دنگا کر رہے ہو کالے لوگو۔ یہ فساد۔ کرفیو۔ مصنوعی روشنیوں کی یلغار۔ اندھیرے کی بے چین لکیریں جو روشنی کے گھیرے میں باریک ہو ہو کر معدوم ہو جائیں گی روشنی۔ روشنی!۔

"ابا' میں باہر جاؤں گا۔"

میرے بیٹے کو معلوم نہیں کہ باہر بیکراں روشنی اُس کے وجود کو ہر جانب سے جکڑے گی اور جگہ جگہ کر' اس کے جسم میں سرایت ہو ہو کر آباد ہو جائے گی' اور پھر بے کراں روشنی میں وہ کہیں نظر نہ آئے گا' اس کی جگہ اندھی اندھی روشنی نظر آئے گی' روشنی' جو قطعاً خالی ہو۔

باہر جانے کی بجائے میں اپنے بیٹے کے ساتھ زمین کی اندھیری تہوں میں گھسنا چاہتا ہوں۔ ان تہوں میں رینگ رینگ کر ہماری ٹانگیں' اور ہاتھ گھس جائینگے' گھس گھس کر غائب ہو جائیں گے اور ہمارے سر اور دھڑ برابر ہو ہو کر گول ہوتے جائیں گے اور ہم سانپوں کی کوئی نئی نوع اختیار کر لیں گے۔ سانپوں کی لمبی عمر کا باعث ان کی زیر زمین زندگی ہے' اسی زندگی کی ٹھہری ٹھہری تاریکی سے وہ دیرپا ہیں' اور زمین کے زہر سے ضائع ہونے کی بجائے وہ اسے اپنے سر میں جمع کرتے رہتے ہیں' جو گہرا اور گاڑھا اور بالآخر جامد ہو کر من بن جاتا ہے جس سے تاریکیاں بینا ہو اٹھتی ہیں۔

میرا بیٹا پہلے ہی بہت بوکھلایا ہوا تھا ورنہ میں اس سے کہتا۔

"آؤ بیٹا' زمین میں دھنس جائیں۔"

دفعتاً وہ بے اختیار رونے لگا ہے۔

"نہ رو' بیٹا۔ نہ رو۔ چپ!۔ چپ ہو جا!۔ بس اب چپ ہو جا!"

میرے بیٹے کو شاید اپنی مرحُوم ماں یاد آ رہی ہے جس کی شکل وہ بھول چکا ہے، شاید وہ اس لیے رو رہا ہے کہ اسے اپنی ماں کی شکل یاد نہیں آ رہی ہے، مجھے بھی اپنی ماں کی شکل یاد نہیں آ رہی ہے۔ ہم سب یتیم ہیں اور کسی چہرے میں ہمیں اپنے چہرے کا سراغ نہیں ملتا، کوئی بھی ہمیں اپنا معلوم نہیں ہوتا۔

'آؤ بیٹے، اِدھر آؤ میرے پاس!'

میرا بیٹا چپ ہو گیا ہے، شاید اپنے کومل کندھے پر میرے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے وہ سہم گیا ہے کہ اگر وہ چپ نہ ہوا تو میں اُسے پیٹوں گا۔ میرا بیٹا مجھے شک کی نظروں سے دیکھ دیکھ کر جوان ہو گا۔ مجھ سے نفرت کی یہ جڑ اس کے دل میں بڑھتی پھیلتی جائے گی۔ بڑا ہو کر وہ میرا اس لیے پاس کرے گا کہ اُسے مجھ سے نفرت ہے۔

ہم سب یتیم ہیں اور ہمیں اپنے اولین چہرے بھول چکے ہیں جن سے ہمارے چہرے برآمد ہوئے ہمیں سب چہرے اجنبی معلوم ہوتے ہیں، مانوس اجنبی، ہم صرف اجنبیت سے مانوس ہیں ہمارا کوئی نہیں اور جب ہم کسی سے یہ کہتے ہیں کہ تم ہمارے ہو تو ہم جھوٹ بولتے ہیں۔

'ادھر آؤ بیٹے!'

ہیں! میرا بیٹا اپنی خواہش سے چپ نہیں ہوا بلکہ خوف کے غلبے سے اُس کی رونے کی آواز سلب ہو گئی ہے۔ ممکن ہے اس اضطرابی کیفیت میں اُسے لگ رہا ہو کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ جو کبھی تو اُس کے باپ نے ہی قتل کیا تھا۔

'ڈرو نہیں شہزادے! ڈرتے کیوں ہو؟ بس کل کرفیو ہٹ جائے گا تو میں تمہیں سارے شہر کی سیر کروانے کے لیے لے جاؤں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا!'

کل تک! ہم کب سے کہہ رہے ہیں کہ کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا ہماری دُنیا تہ و بالا ہو چکی ہے اور ہم اپنے سیٹلائٹ سے لڑھک کر خلاء میں آ گرے ہیں؟ — وقت یہاں عدم موجود ہے۔ کل کبھی نہ آئے گی۔

'بیٹا، کل تک —'

شٹ اپ! تم چاند تک کبھی نہ پہنچ پاؤ گے۔ تمہارا راکٹ خلاء میں غرق ہو چکا ہے۔ تمہارے کرۂ ارض کا ذرہ ذرہ خلاء میں ڈوب کر خلاء بن چکا ہے۔

بیٹا، کیا تم میری آواز کو سُن رہے ہو؟ کیا میں واقعی بول رہا ہوں، یا مجھے یونہی لگ رہا ہے کہ میں بول رہا ہوں! کیا میں ہوں؟ تم ہو؟ خلاء میں روحیں بھی تو تحلیل ہو جاتی ہوں گی!

'تمہیں ایک کہانی سناؤں بیٹا؟ بڑی مزیدار کہانی! سنو گے؟'

میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کونسی کہانی سناؤں، مگر میں چاہتا ہوں کہ ایسی کہانی سناؤں جس سے میرے بچے کا دل بہل جائے، اس کا خوف دور ہو جائے، اس کا کھلکھلا کر ہنسنے کو جی چاہے، کسی نیک انسان کے خوب صورت مستقبل کی خوش کن کہانی۔

شٹ اپ! جھوٹ مت بکو!

'ایک تھا —'

میں کہانی شروع کرتا ہوں۔

'ایک تھا —'

کون تھا ایک؟ میں سر کھجا رہا ہوں کہ وہ کون تھا۔

'ایک تھا بڑا نیک آدمی'

بڑا نیک آدمی! کون تھا وہ نیک آدمی؟ اُس کا نام اور پتہ اور پیشہ بتاؤ، اور ثابت کرو کہ وہ واقعی نیک تھا۔ بولو! بولو!

'وہ آدمی بڑا نیک تھا'

اس کی نیکی کا ثبوت پیش کرو۔

'وہ آدمی —'

میرا خوفزدہ بیٹا میری بوکھلاہٹ پر کھل کھلا ہنس پڑا ہے اور میرا جی اتنا خوش ہو گیا ہے کہ کہانی جاری رکھنے کا مجھے خیال ہی نہیں رہا ہے:

"ابا، باہر کرفیو ہو تو ہم گھر کے اندر کیوں رہتے ہیں؟"

میرے بھولے بیٹے کو کیا پتہ کہ کرفیو باہر نہ ہو تو اندر نافذ ہوتا ہے۔

باہر دنیا چل پھر رہی ہے مگر پاستر نک کے دروازے پر پہرہ لگا ہوا ہے۔ نہ کوئی ہمکلام، نہ ہم خیال۔ پاستر نک اگر لکھ لکھ کر نہ بولتا تو اُس کا ذہن خیالات سے پھول پھول کر پھٹ جاتا۔

اپنے ذہن کو یونہی پھٹ جانے دو ورنہ تمہارے دماغ پر گولی داغ دی جائے گی!

ارے بھائی، دیکھو میں نے یہ کیا لکھا ہے۔

نہ بابا، ہم تمہاری زبان نہیں جانتے۔

یہ میرے ہم زبان! — خیر نہ سہی، مگر میں بولے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لو، میں بول رہا ہوں، میری زچگی کا وقت آ گیا ہے۔ اگر مجھے روکا گیا تو میرے بدن میں زہر پیدا ہو جائے گا۔ میں اپنے بچے سمیت مر جاؤں گا۔ اے یورپ، اے امریکہ، اے ایشیا اور افریقہ، میرے ہم زبان مجھے سننے سے انکار کر رہے ہیں۔ مگر میں بول رہا ہوں۔ تم میری زبان نہیں سمجھتے، مگر پلیز، مجھے سنو! ہمارے منہ میں وہی ایک زبان ہے۔ مجھے سنو پلیز!

کرفیو! — "ابا، کل مجھے باہر لے جائیں گے نا؟"

"ہاں، بیٹا، ہاں! ضرور لے جاؤں گا!"

مگر کل بھی کرفیو ہو گا، پرسوں بھی، ہر روز! میں اپنے بیٹے کی خواہش کیوں کر پوری کر پاؤں گا۔؟

میں اس کے پُر امید چہرے کی جانب دیکھتا ہوں۔

'ضرور لے جاؤں گا بیٹا'

مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ میں اپنی چار دیواری میں نہیں ہوں بلکہ اس کمرے کے اندر اپنے جسم میں تنہا پڑا ہوں، اور میرا بیٹا لگاتار میرے بدن کے کواڑ پیٹ رہا ہے اور کرفیو کے ڈر سے مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ کنڈی کھول دوں۔

رضو باجی

قاضی عبدالستار

سیتاپور میں تحصیل سدھولی اپنی جھیلوں اور شکاریوں کے لیے مشہور تھی۔ اب جھیلوں میں دھان بویا جاتا ہے۔ بندوقیں بیچ کر چکیاں لگائی گئی ہیں اور لائسنس پر ملے ہوئے کارتوس بلیک کر کے شیروانیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے قصبوں کا زنجیرہ پھیلا ہوا تھا جن میں شیوخ آباد تھے جو اپنے معزز ماضی کی یاد میں ناموں کے آگے خان لگاتے تھے اور ہر قسم کے شکار کے لیے غنڈے، کتّے اور شکرے پالتے تھے۔ ان میں سارنگ پور کے بڑے بھیا رکھو چچا اور چھوٹے بھیا پاچو چچا بہت ممتاز تھے۔ میں نے رکھو چچا کا بڑھاپا دیکھا ہے۔ ان کے سفید ابروؤں کے نیچے زخمی آنکھوں سے چنگاریاں اور کڑکتی آوازسے پٹیں نکلتی تھیں۔ رضو باجی انہی رکھو چچا کی اکلوتی بیٹی تھیں جن سے لڑکپن میں رضو باجی کے حسن اور اس جہیز کے افسانے سنے تھے جسے ان کی دوسوتیلی صاحب جائداد مائیں جوڑ جوڑ کر مر گئی تھیں۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں میراثنیں اتنے لفظوں سے ان کا ذکر کرتیں کہ ٹیڑھے بینچے لوگ بھی ان کی ڈیوڑھی پر منڈلانے لگتے۔ جب رضو باجی کی ماں مر گئیں اور رکھو چچا پر فالج گرا تو انہوں نے مجبور ہو کر ایک رشتہ قبول کر لیا، مگر رضو باجی پر مین جھگنی کے دن جنات آ گئے۔ اور رضو باجی کی ڈیوڑھی سے رشتوں کے "کاگا" ہمیشہ کے لیے اڑ گئے۔ جب رکھو چچا مر گئے تو پاچو چچا ان کے ساتھ تمام ہندوستان کی درگاہوں کا چکر کرتے رہے لیکن جناتوں کو نہ جانا تھا نہ گئے۔ پھر رضو باجی کی عمر ایسا پیمانہ بن گئی جس کے قریب پہونچنے کے خوف سے سوکھی بھوئی کنواریاں لرز جاتیں جب بھی رضو باجی کا ذکر ہوتا میرے وجود میں ایک ٹوٹا ہوا کانٹا کھٹکنے لگتا اور میں اپنی یادوں کے کارواں کو کسی ذہنی مصروفیت کے صحرا میں دھکیل دیتا۔ انھیں رضو باجی کا جب رجسٹری لفافہ مجھے ملا تو میں ایسا بدحواس ہوا کہ خط پھاڑ دیا۔ لکھا تھا کہ وہ حج کرنے جارہی ہیں اور میں فوراً سارنگ پور پہونچ جاؤں لیکن اس طرح کہ گویا میں ان سے نہیں پاچو چچا سے ملنے آیا ہوں' اور یہ بھی کہ میں خط پڑھنے کے بعد فوراً جلا دوں۔ میں نے رضو باجی کے ایک حکم کی فوری تعمیل کر دی۔ خط کے شعلوں کے اس پار ایک دن چمک رہا تھا۔ پندرہ سال پہلے کا ایک دن جب میں بی اے میں پڑھتا تھا اور محرم کرنے گھر آیا ہوا تھا۔

محرم کی کوئی تاریخ تھی اور سارنگ پور کا سپاہی خبر لایا تھا کہ دوسرے دن میر کھ اسٹیشن پر شام کی گاڑی سے سواریاں اتریں گی۔ ہماری بستی کے محرم سارے ضلع میں مشہور تھے اور یہ مشہور محرم ہمارے گھر سے وابستہ تھے اور دور دور سے عزیز و اقارب محرم دیکھنے آیا کرتے تھے اور ہمارا گھر شادی کے گھروں کی طرح گھمگھمانے لگتا تھا۔ اس خبر نے میرے وجود میں قمقمے جلا دیئے۔ میں رضو باجی کو' جن کی کہانیوں سے میرا تخیل آباد تھا' پہلی بار دیکھنے والا تھا۔ عید کی چاند رات کے مانند وہ رات بڑی مشکل سے گزری اور صبح ہوتے ہی میں انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے ادھے جن کو پھرک اور لٹھر دبھی کہتے ہیں، سنوارے گئے۔ بیل صابن سے نہلائے گئے۔ ان کو نئی اندھیریاں، سنگوٹیاں اور جھلیں پہنائی گئیں، دھرائیں جھولیں اور پردے نکالے گئے۔ گھوڑے کے ایال تراشے گئے۔ زین پر پالش کی گئی اور سیاہ اطلس کا پھٹا باندھا گیا جو اس کے سفید جسم پر پھوٹ نکلا۔ ساتھ جانے والے آدمیوں میں اپنی نئی قمیصیں بانٹ دیں اور جیب خرچ سے دھوتیاں خریدیں اور دو پہر ہی سے کلف لگی برجس پر لانگ بوٹ

پہن کر تیار ہو گیا۔ اور دو بجتے بجتے سوار ہو گیا جب کہ چھ میل کا راستہ میرے گھوڑے کے لیے چالیس منٹ سے کسی طرح زیادہ نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کو جو ہمارے تحائف سے زیر بار رہتا تھا۔ اطلاع دی کہ ہمارے خاص مہمان آنے والے ہیں اور مسافر خانے کے پورے کمرے پر قبضہ جما لیا۔ گاڑی وقت پر آئی، لیکن ایسی خوشی ہوئی جیسے کئی دن کے انتظار کے بعد آئی ہو۔ فرسٹ کلاس کے دروازے میں سارنگ پور کا موٹو گرام لگا تھا۔ ایک بوڑھا سپاہی کھڑا تھا۔ ڈبے سے مسافر خانے تک قناتیں لگا دی گئیں، آگے آگے پھوپھی جان تھیں۔ ایک رشتے سے رکھو چچا ہمارے چچا تھے اور دوسرے رشتے سے ان کی بیوی ہماری پھوپھی تھیں، ان کے پیچھے رضو باجی پھر عورتیں مختر باکس اور پاندان اور صندوقچے اٹھائے ہوئے آ رہی تھیں، چلنے کا انتظام تھا، لیکن پھوپھی جان نے میری بلائیں لے کر انکار کر دیا اور فوراً اس ادھے پر سوار ہو گئیں جو تابوت کی طرح پردوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ رضو باجی بھی اسی میں غروب ہو گئیں، جن کے ہاتھ سیاہ برقعے پر شعلوں کی طرح تڑپ رہے تھے۔ دوسرے ادھوں پہ عورتوں کو سامان کے ساتھ چڑھا دیا گیا۔ گھنٹا دیس کے پھڑکتے ہوئے سیاہ بیلوں پر میرا چھوٹا سا ادھا خالی اڑ رہا تھا۔ اور میں پھوپھی جان کے ادھے کے پہلو میں چھل بل دکھلاتے ہوئے گھوڑے پر بھاگ رہا تھا۔ میں جو کبھی ہوائی بندوق ہاتھ میں لے کر نہ چلا تھا۔ آج بارہ بور کی پنچفیری اس امید پر لادے ہوئے تھا کہ اگر اڑتا ہوا طاؤس گرا لیا تو رضو باجی ضرور متاثر ہو جائیں گی۔ کچی سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے ڈھنڈھاری کے جنگل پر میری نگاہیں منڈلا رہی تھیں اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ دور کسی جھاڑی سے کوئی طاؤس اٹھے اور اتنے قریب سے گزرے کہ میں شکار کر لوں کہ پھوپھی جان کا ادھا رک گیا۔ میں گھوڑا چمکا کر قریب پہنچا آج سے زیادہ کبھی اس جانور کے نخرے بھلے نہ لگے تھے۔

"میرا تو اس تابوت میں دم گھٹا جا رہا ہے"

رضو باجی کی آواز تھی جاڑوں کی صبح کی طرح صاف اور چمک دار!

"تو آپ میرے ادھے پر آ جائیے"

"مگر اس پر پردہ کہاں ہے؟"

"میں ابھی بندھوا تا ہوں"

پردہ بندھ رہا تھا کہ پھوپھی جان نے حکم دیا۔

"کسی بوڑھے آدمی سے کیوان کا ادھا ہنکے اور کسی عورت کو بٹھال دو"

"ادھا تو میں خود ہانکوں گا"

"ارے تو ——— ادھا ہانکے گا؟"

انہوں نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا اور میں گھوڑے سے پھاند پڑا۔ ساتھ ہی کسی سپاہی نے میری تائید کی۔

"ایسا ویسا ہانکت ہیں بھیا ——— بیلن کی جان نکال لیت ہیں"

چادروں اور صافوں کا پردہ باندھ دیا گیا۔ رضو باجی سوار ہوئیں اور بولیں۔

"اس پر اتنی جگہ کہاں ہے کہ تو بھی دھانس لی جائیں"

قبل اس کے کہ بوا اپنے ادھے سے اتریں میں نے بیل جڑوا دیئے اور بینڈے کر جور پر بیٹھ گیا اور بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ پھوپھی جان

نے کچھ کہا، لیکن پانچ جوڑ بیلوں کے گھنے گھنگھروؤں کی تند جھنکار میں ان کی بات ڈوب گئی۔ جب حواس کچھ درست ہوئے اور دماغ کچھ سوچنے پر رضامند ہوا تو جیسے رضو باجی نے اپنے آپ سے کہا۔

"امّی کے ادھے کی ساری ڈھول ہمیں کو پھانکنا ہے۔"

میں نے فوراً لیکھ بدلی۔ آدمی نے راسیں کھینچ کر مجھے نکل جانے دیا۔ ظالم بیلوں کو دوبارہ لیکھ پر لانے کے لیے میں نے ایک کے پنیٹھ اور دوسرے کے ٹھوکر ماری اور میری ممیز اس کی ران میں چبھ گئی وہ تڑپا اور قابو سے نکل گیا، اور اچانک رضو باجی کے ہاتھ میری کمر کے گرد آ گئے اور میرا بایاں شانہ ان کے چہرے کے مس سے سلگ رہا تھا اور اعصاب میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔

"روکو"

انہوں نے پہلی بار مجھے حکم دیا۔ میں نے سینے تک راسیں کھینچ لیں۔ بیل دلکی چلنے لگے میں نے جھانک کر دیکھا۔ سانپ کی طرح رینگتی ہوئی سڑک پر دور تک درختوں کے سنتری کھڑے تھے اور ایک سپاہی میرے گھوڑے پر سوار سائے کے مانند پیچھے لگا تھا۔ رضو باجی نے برقعے کا اوپری حصہ اتار دیا تھا، اور وہ سرخ بال جن پر ان کے حسن کی شہرت کا دارومدار تھا۔ چہرے کے گرد پڑے دہک رہے تھے۔ اور وہ ایک طرف کا پردہ جھکا کر جنگل کی بہار دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی قاتل گرفت نے ایک بار پھر میرے چٹکی لی اور میں نے بیلوں کو چھیڑ دیا۔ اور ایک بار پھر ان کے سفید نرم ریشمی ہاتھ میری کمر کو نصیب ہو گئے۔ لیکن اب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں اور میں بیلوں کو پچکار رہا تھا اور ان کا سر میری پشت پر رکھا تھا۔ اور میں اڑتی ہوئی ریشمیں لٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ باغ نظر آنے لگے جن کے سائے سے آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ سرکھ سے میرے گھر کا راستہ کبھی اتنی جلدی نہیں ختم ہوا تھا نہ دلکش نہیں معلوم ہوا۔ میں نے ادھارے کا پردہ برابر کیا۔ سپاہی کو جوئے پر بٹھا کر خود گھوڑے پر سوار ہوا۔ بستی میں بیل ہانکتے ہوئے داخل ہونا شایانِ شان نہ تھا۔ رضو باجی مجھے دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ جب وہ اتر کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں تو میں نے پہلی بار ان کا سراپا دیکھا اور ان کے حسن کے سامنے میراثنوں کی تمام کہانیاں ہیچ معلوم ہوئیں۔ وہ مجھ سے تھوڑے دنوں بڑی تھیں، لیکن جب انہوں نے میری پیٹھ پر سر رکھا اور ٹھنک کر کہا کہ گھر پہونچ کر وہ اپنی بھابھی جان اور میری اماں سے مرمت کرائیں گی تو وہ مجھے بہت چھوٹی سی معلوم ہوئیں، جیسے میں نے ان کی گڑیا نوچ کر پھینک دی ہو اور مجھے دھمکیاں دے رہی ہوں۔

میں جو محرم میں سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات باہر گزارا کرتا تھا۔ اس سال باہر جانے کا نام نہ لیتا تھا اور بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اندر منڈلایا کرتا تھا۔ نویں کی رات سال بھر میں واحد رات ہوتی تھی۔ جب ہمارے گھر کی بیبیاں بستی میں زیارت کو نکلتی تھیں۔ پورا اہتمام کیا جاتا تھا کہ وہ پہچانی نہ جائیں۔ برقعوں کے بجائے وہ موٹی موٹی چادریں اوڑھ کر نکلتی تھیں، لیکن دور چلتے سپاہیوں کو دیکھ کر لوگ جان جاتے تھے اور عورتیں تک راستہ چھوڑ دیتی تھیں۔ جب رات ڈھلنے لگی اور سب لوگ سوتی چادریں اوڑھ کر یعنی بھیس بدل کر جانے کو تیار ہوئے تو پتہ چلا کہ رضو باجی سو گئی ہیں کسی نے جگایا تو پتہ چلا کہ سر میں درد ہے اور میں اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ جب بیبیوں کے پیچھے چلتے ہوئے سپاہیوں کی لاٹھیاں اور لالٹینیں پھاٹک سے نکلنے والی سڑک پر کھو گئیں۔ تب میں اندر آیا۔ وہ دالان میں سیاہ کامدانی کے ڈوپٹے کا پلّو سر پر ڈالے سو رہی تھیں۔ ایک عورت پنکھا جھل رہی تھی دوسری ان کی پائنتی پڑے کھٹولے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے ان کی سفید گداز کلائی پر میٹھی سی چٹکی لی۔ انہوں نے مُنہ کھول دیا۔

"چلئے آپ کو تعزیے دکھلا لائیں"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جسے انھوں نے عورتوں کو دیکھ کر جلدی سے چھڑا لیا۔ اور کھڑی ہو گئیں۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے"

"زیارت کی برکت سے دور ہو جائے گا"

میں نے بڑے جذبے سے کہا انھوں نے کپڑوں پر نگاہ کی۔

"اگر ان سے خراب کپڑے آپ کے پاس ہوں تو پہن لیجئے"

اور میں نے ان کے پلنگ سے چکن کی چادر اُٹھا کر ان کے شانوں پر ڈال دی،

اپنے تعزیئے کے پاس بیٹھی ہوئی بھیڑ سے چند پاسی منتخب کئے سان کو بندوق اور ٹارچ لینے کی ہدایت کی اور رضیہ باجی کو لیے ہوئے سڑک پر آگیا۔ مجھے بیسیوں کے راستے معلوم تھے جو محرم کے جلوس کی طرح معمور تھے اور میں مخالف سمت میں چل رہا تھا۔ کٹا ہوا چاند بھائی آسمان پر روشن تھا اور ہم بستی کے باہر نکل آئے تھے اور میں تو اپنے منصوبے سے لرز رہا تھا۔ پھر وہ تالاب آگیا جس کے پاس ٹیلے پر مندر کھڑا تھا اور سامنے املیوں کے دائرے میں لکھوری اینٹوں کا کنواں تھا۔ میں نے اپنے رومال سے پختہ جگت صاف کی۔ نو خیز پاسیوں کو حکم دیا کہ وہ مندر کے اندر جاکر بیٹھ جائیں۔ اب حدِ نگاہ تک دھکتے پانی اور آبادی کے دھندلے خطوط کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف املی کے درختوں کا گھنا سایہ پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا۔ اُن کے پاس بیٹھ کر پہلی بار ان کو مخاطب کیا۔

"یہ کنواں دیکھ رہی ہیں آپ؟"

مجھے خود اپنی آواز بھیانک معلوم ہوئی۔

"یہ جناتوں کا کنواں ہے"

انہوں نے پوری شربتی آنکھوں کو کانوں تک کھول دیا اور میری طرف ذرا سا سرک آئیں۔

"اس میں جنات رہتے ہیں"

وہ پیسے اور قریب آگئیں۔ اُن کا زانو میرے جسم سے مس کرنے لگا، بس جاٹوں کی طرح لاتعلق لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ جنات میرے ایک دادا کے شاگرد تھے جب دادا میاں اس کنوئیں میں ڈوب کر مر گئے تو جناتوں نے یہاں اپنا بسیرا کر لیا"

انھوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، چادر اُن کے شانوں سے ڈھلک گئی۔ گھٹی گھٹی آواز میں بڑے کرب سے بولیں۔

"چلو۔ یہاں سے بھاگ چلو"

اور ان کا سر میرے شانے پر ڈھلک آیا اور میں نے سُرخ بالوں کی ریشمیں لپٹوں میں اپنے ہاتھ جلا لیے، جن کے داغ آج بھی جلد کے نیچے محفوظ ہیں۔

"محرم کی اس رات کے آخری حصّے میں جو شخص اس کنوئیں سے اپنے دل کی ایک مراد مانگتا ہے وہ پوری ہوتی ہے"

وہ مجھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں، اور میں اس دنیا میں تھا جو پہلی بار میرے حواس نے دریافت کی تھی۔

"آپ ذرا دیر کے لیے چھوڑ دیجئے میں ایک دعا مانگ لوں ۔۔ آج کے بعد پھر کبھی اس کنوئیں سے کوئی دعا نہ مانگوں گا"

وہ تڑپ کر اُٹھیں، اور مجھ کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی چلیں۔ جب پاس کھڑے ہو گئے تب وہ مجھ سے الگ ہوئیں۔ سڑک پر آ کر چل گئیں کہ گھر جاؤں گی مگر میں ان کو بہلاتا ہوا امام باڑے کی طرف چلا۔ یہ امام باڑہ نواب نقی کی اس بہن نے بنوایا تھا جو واجد علی شاہ کی محل تھی آج بھی اس کی اولاد موجود ہے جو امام باڑے والیوں کے نام سے مشہور ہے اور یہ عمارت انہی کے عمل میں ہے۔ یہاں کربلائے معلیٰ سے لائی ہوئی ضریح رکھی ہے۔ عورتیں اپنے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر مراد مانگتی ہیں، جب پوری ہو جاتی ہے، تو اپنی لٹ کھول لے جاتی ہیں۔ ایک ماما نے دوڑ کر امام باڑہ مردوں سے خالی کرا دیا۔ پھاٹک میں عورتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ بستی کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے گھر کا کوئی فرد کسی عورت کے ساتھ محرم دیکھنے نکلا ہو۔ زیارت کرنے نکلا ہو۔ دالان کے پاس ایک گدبدی سی لڑکی میرے جوتے کھولنے آئی۔ میں نے رضو باجی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ ان کے سینڈل کھولنے لگی۔ جب میں اس ہال میں داخل ہونے لگا جس میں سونے کی پانی کی ضریح رکھی ہے تو وہی لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور بولی بٹیا صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ باہر ہی رہیں، اور میں باہر ہی کھڑا رہا۔ جب میں ان کے ساتھ امام باڑے سے نکل رہا تھا تو ان گنت مرد مجھے کنکھیوں سے گھور رہے تھے۔ عورتیں گھونگھٹ سے جھانک رہی تھیں اور میرے اعصاب کی کمان کھنچی ہوئی تھی، کہ ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا۔

"کون ہیں؟"

"بڑے بھیا کی دلھن ہیں۔"

اور میں لڑکھڑا گیا۔ رضو باجی کے سر سے چادر کا جھونپا ڈھلک گیا۔ جب سڑک ویران ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ رضو باجی کا چہرہ لمبی چوڑی مسکراہٹ سے روشن ہے۔ میں اُن کے بالکل قریب ہو گیا۔

"آپ بہت خوش ہیں۔"

"اوں ۔۔ ہاں ۔۔ ۔۔ نہ مانگتے دیر نہ ملتے دیر۔"

اور میں اس جملے کے معانی سوچتا رہا۔

پھر ہمارے مقدر میں کوئی ایسی رات نہ لکھی گئی جو ان کے قرب سے مہک سکتی۔ ایک آدھ بار ان کی صورت دیکھنے کو ملی بھی تو اس طرح جیسے کوئی چاند دیکھ لے اور جب میں سارنگ پور کی ڈیوڑھی پر یکے سے اُترا تو دیر تک کسی آدمی کی تلاش میں کھڑا رہا، دن دہاڑے وہاں ایسا سناٹا تھا، جیسے اس شاندار بوسیدہ عمارت میں آدمیوں کے بجائے روحیں آباد ہوں۔ میں دوسری ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور آواز دی۔

"میں اندر آ جاؤں"

ایک بوڑھی پھٹی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں چھوٹے کا اجن ہوں"

"ارے ۔ آئیے ۔۔ بھیا آ جائیے"

بھاری پختہ صحن پر میرے جوتے گونج رہے تھے۔ بارہ دروں کے دوہرے دالان کی اینٹی محرابوں کے پیچھے لانبے کمروں کے اونچے اونچے دروازے کھلے تھے اور دوسری طرف کی عمارت نظر آ رہی تھی، کمرے میں قدم رکھتے ہی میں چونک پڑا یا ڈر گیا۔ دور تک پھیلے ہوئے سفید چوکے پر سفید کپڑے پہنے ہوئے بھاری بھرکم رضو باجی کھڑی تھیں، چنا ہوا سفید دوپٹہ ان کے شانوں پر پڑا تھا اور سرخ و سفید بال اُن کی پیٹھ پر ڈھیر تھے۔ وہ گردن گھمائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اترتی ہوئی شام کی مدھم روشنی میں ان کے زرد چہرے کی سیاہ شکنیں صاف نظر آ رہی تھیں، وہ کانوں میں بیلے کے پھول اور ہاتھوں میں صرف گجرے پہنے تھیں۔ میں ان کی نگاہ کی ویرانی سے کانپ اُٹھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے رہے۔ صدیاں گزر گئیں۔ کسی میں نہ پلک جھپکنے کی طاقت تھی، نہ زبان کھولنے کا حوصلہ پھر جیسے وہ اپنی آواز کا سہارا لے کر تخت پر ڈھے گئیں۔

"تم ایسے ہو گئے۔۔۔ اجن؟"

"بیٹھ جاؤ"

میں چوکے کے کونے پر ٹک گیا۔

"مجھے اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ مجھ پر جو گزری وہ اگر پتھروں پر گزرتی تو چور چور ہو جاتے۔ لیکن تم کو کیا ہو گیا؟ کیسے کالے دُبلے کھیٹا سے ہو گئے ہو۔ نوکر ہو نا۔۔۔ اچھی بھلی تنخواہ پاتے ہو۔ زاہدہ جیسی بیوی ہے۔ پھول ایسے بچے ہیں، نہ قرض ہے نہ مقدمے بازی تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا چپ کا روزہ رکھ لیا"

میں نے دل میں سوچا جناتوں کا سایہ ہے نا ان پر۔

"آپ نے پندرہ برس بعد روزہ توڑنے کو کہا بھی تو اس وقت کہ زبان کا ذائقہ بھول چکی اور معدہ قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکا۔"

انہوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ وہ بوڑھی عورت میرے سوٹ کیس کے نیچے کچلی ہوئی چلی آ رہی تھی، پھر پاچو چچا آ گئے۔ دُبلے پتلے غم زدہ سے پاچو چچا جن کے شکار کی ایک زمانے میں دھوم تھی۔

رات کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، جب رضو باجی اٹھ گئیں تو چچی جان نے سرگوشی میں کہا۔

"آج نوچندی جمعرات ہے۔ بیٹا پر جن کا سایہ ہے وہ آنے والے ہیں۔ تمہارا بستر اپنی طرف لگوایا تھا، لیکن بیٹا نے اٹھوا لیا اگر ڈرنا تو آواز دے لینا یا چلے آنا، بیچ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔"

جمعرات کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر خاموش رہا۔ ان کے ہاتھ سے گوریاں کے کرشنہ میں دبائیں اور کھڑا ہو گیا وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو تھپکتی رہیں۔ پاچو چچا مجھے پہنچانے آئے۔ دالان میں دو بستر لگے تھے۔ ان کے درمیان ایک کھٹولہ پڑا تھا جس پر رضو باجی کی بو دھیر تھیں۔ پاچو چچا مجھے صحن میں چھوڑ کر لالٹین لیے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ایک کالا جھبرا جھبرا کتا ایک طرف سے نکلا اور مجھے سونگھتا ہوا چلا گیا۔ پھر ایک دروازے سے رضو باجی نکلیں اور سارے میں مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ ان کے کپڑے نئے اور پھول تازے تھے وہ بہت مصروف معلوم ہو رہی تھیں۔ بطخوں کے پرے آسمان پہ شور مچاتے گزر رہے تھے۔ صحن میں اکتوبر کی چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ برساتی میں پرانی

کرسیوں پر بیٹھے ٹھنڈی سفید گاڑھی کافی پی رہے تھے، اور گفتگو کے لیے الفاظ پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہ جناتوں کا کیا قصہ ہے رضو باجی؟"

مجھے اپنی آواز پر حیرت ہوئی، میں نے یہ گولی کس طرح داغ دی تھی۔ انہوں نے پیالی رکھ دی مسکرائیں۔ وہ پہلی مسکراہٹ عمر بھر کے حزن سے زیادہ غمزدہ تھی۔

"میں نے تم کو اسی لیے بلایا ہے۔"

"کاش آپ نے اس سے پہلے بلا لیا ہوتا۔"

"بیاہ کی طرح بے حیائی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اجن۔۔ دس برس پہلے کیا یہ ممکن تھا کہ تم اس طرح کھلے خزانے آدھی رات کو مجھ سے باتیں کر رہے ہوتے؟ آج تم گھر بار والے ہو۔ میں کھوسٹ ہو گئی ہوں، اور چچی جان کا باورچی خانہ میری جائداد سے روشن ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو میں حج کرنے جا رہی ہوں اور حج کرنے والے ہر اس شخص سے معافی مانگتے ہیں جس کے ساتھ انہوں نے کوئی زیادتی کی ہو۔ تم کو معلوم ہے مجھ پر جنات کب آئے؟ آج سے دس سال پہلے۔ اور تم کو معلوم ہے تمہاری شادی کو کتنے برس ہوئے؟ دس سال! تم کو ان دونوں باتوں میں کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا! تم نے چتر ہٹ کے سفر میں کیا کیا؟ تم محرم کی نویں تاریخ مجھے کہاں کہاں کھینچتے پھرے؟ تم اس بھیانک کنوئیں سے میرے سامنے کیا مانگنا چاہتے تھے؟ تم نے عباسی علم کو بوسہ دے کر مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کیسے پانے کی آرزو کی تھی۔۔۔! جاؤ اپنے امامباڑے کی ضریح کو غور سے دیکھو۔ میرے بالوں کی سرخ لٹ آج بھی بندھی نظر آئے گی۔ اگر کھچڑی نہ ہو گئی ہو۔ کیا میں نے امام حسین سے صرف ایک عدد شوہر مانگنے کے لیے یہ جتن کیے تھے؟ سازنگ پور کی نائنوں اور میراثنوں سے پوچھو کہ وہ رشتے لاتے لاتے تھک گئیں، لیکن میں انکار کرتے نہ تھکی۔ کیا مجھ سے تم یہ چاہتے تھے کہ میں سازنگ پور سے ستو باندھ کر چلوں اور چتر ہٹ کی ڈیوڑھی پر دھونی رما کر بیٹھ جاؤں اور جب تم برآمد ہو تو اپنا آنچل پھیلا کر کہوں کہ حضور مجھ کو اپنے نکاح میں قبول کر لیں کہ زندگی سوارت ہو جائے، تم نے رکھو میاں کی بیٹی سے وہ بات چاہی جو رکھو میاں کی طوائفوں سے بھی ممکن نہ تھی۔"

"لیکن رضو باجی۔"

"مجھ پر جنات نہیں آتے ہیں اجن میاں! میں جناتوں کو خود بلا لاتی ہوں اگر جنات نہ آتے تو کوئی دولہا آ چکا ہوتا اور تب اگر جناتوں کا کنواں، عباسی علم اور ضریح مبارک تینوں میرے دامن کو ایک مراد سے بھر دینے کی خواہش کرتے تو میں کیا کرتی؟ کس منہ سے کیا کہتی اس لیے میں نے یہ کھیل کھیلا تھا۔ اسی طرح جس طرح چتر ہٹ میں تم مجھ سے کھیل رہے تھے نہ اس میں تمہارے لیے کوئی حقیقت تھی اور نہ اس میں رضو کے لیے کوئی سچائی ہے۔ یہ حج میں اپنے باپ کے لیے کرنے جا رہی ہوں جو میرے بوجھ سے کچل کر مر گئے۔ جنہوں نے مرتے وقت بھی اپنی عاقبت کے لیے نہیں، میری دنیا کے لیے دعا کی۔ اس لیے میں نے تم کو معاف کیا۔ تم اگر زاہدہ کو مجھ پر سوت بنا کر لے آتے تو بھی معاف کر دیتی۔"

وہ نرکل کے درخت کی طرح لرز رہی تھیں۔ ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا، دو رنگی شال شانوں سے ڈھلک گئی تھی، سرخ بالوں میں برابر سے پروئے ہوئے چاندی کے تار جگمگا رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی رائیگاں چلی گئی۔ جیسے میری بیوی نے مجھے اطلاع دی ہو کہ یہ بچے میرے بچے نہیں ہیں۔

کنواری

اختر جمال

بینڈ کی آواز گیس کی لالٹینیں لمبا سا جلوس۔ رنگ برنگی آتش بازی اور بیچ میں پھولوں سے لدی ہوئی خوب صورت موٹر۔ اجب بھی کسی کی بارات گذرتی سارے بچے دوڑتے۔۔ رؤفہ ان سب سے آگے ہوتی۔ جب بارات دور ہو جاتی بالکل نظروں سے اوجھل۔ تو وہ سب خوشی خوشی لوٹ آتے "آپا جی۔ ہم نے بارات دیکھی۔!"

جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو سر پر ڈوپٹہ لے کر کوٹھے پر سے بارات دیکھنے لگی۔ اسے اپنے بھائیوں پر بڑا رشک آتا جو بالکل قریب سے نیچے کھڑے بارات دیکھا کرتے تھے۔ دادی اماں کا سخت حکم تھا کہ لڑکی کا لڑکوں کے ساتھ ہر ہر پھرنا انہیں ذرا پسند نہیں ہے جب رشتہ کی اور بہنیں بھی ساتھ ہوتیں تو وہ دادی اماں کے حکم کی بھی پروا نہ کرتی۔ جب وہ خود ذرا بڑی ہوئی تو اسے بھی سڑک پر کھڑے ہونا اچھا نہ لگا دور سے باجوں کی آواز پر وہ اور شاہدہ کوٹھے پر دوڑتیں۔ شاہدہ کا اور اس کا گھر قریب قریب تھا۔ ان کے کوٹھے بھی ملے ہوئے تھے۔ شاہدہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور دو کلاسیں پیچھے بھی مگر وہ اس کی سب سے اچھی دوست تھی۔ وہ اس کی خالہ زاد بہن بھی تھی۔۔ اس طرح ان دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ رؤفہ اپنے کوٹھے پر پہنچ کر آواز دیتی۔ شاہدہ بارات آرہی ہے۔۔ اور شاہدہ کھلا کر سیڑھیاں چڑھتی۔! وہ دونوں اسوقت تک کوٹھے پر کھڑی رہتیں جب تک بارات نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ شاہدہ ان باراتیوں کے کیسے مزے ہیں بارات کے ساتھ ساتھ جائیں گے؟ گھوڑے ہاتھیوں والی لمبی چوڑی باراتوں کی جگہ دھیرے دھیرے موٹروں نے لے لی تھی۔ موٹر کے چمکدار اور شفاف شیشے میں سے دولہا نظر آتا سہرے کی لڑیوں میں چھپا ہوا اور دلہن بالکل گٹھڑی بنی ہوئی۔ رؤفہ رشک سے دلہن کو دیکھتی۔۔ اور سوچتی بڑی پیاری ہوگی۔ رؤفہ نے اب تک جتنی شادیاں دیکھی تھیں کبھی کوئی دلہن اسے بری نہ لگی تھی جب وہ اپنی امی کے ساتھ ریشمی کپڑے اور رنگ برنگی چوڑیاں پہن کر شادی میں جاتی تو اسے سب سے بڑی خوشی دلہن دیکھنے کی ہی ہوا کرتی تھی۔ گھر آکر وہ امی سے پوچھتی امی میں کب دلہن بنوں گی۔! ایک دفعہ تو ایک شادی میں ایک دلہن پر اس کا ایسا دل آیا اور وہ ایسی للچائی کہ گھر آکر امی کے پیچھے پڑ گئی کہ" امی میری شادی کر دیجئے۔ میں دلہن بننا چاہتی ہوں۔۔!"

"واہ کہیں اتنی ننھی سی لڑکی کی شادی ہوتی ہے بڑی ہوگی تو پھر"

"امی میں کب بڑی ہوں گی ــــ؟ کتنے دن لگیں گے بڑا ہوتے میں۔۔؟"

اس نے بے صبری سے پوچھا۔ "پاگل دلہن بن کر تو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ دوسروں کے گھر ہمیشہ کے لیے جانا ہوتا ہے۔ اور اپنے گھر میں لڑکیاں پھر مہمانوں کی طرح آتی ہیں۔ امی کی پلکیں میکے کی یاد سے گیلی ہو گئیں۔ انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"تو ہم سب کو چھوڑ کر چلی جائے گی؟" وہ امی سے لپٹ گئی تھی۔

"نہیں امی میں آپ سب کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔" امی آنسو پونچھ کر ہنس پڑی تھیں، اور سوچنے لگی تھیں کہ بچپن کتنی پیاری چیز ہے۔

جب وہ کسی کی شادی میں جاتی تو بڑے چاؤ سے دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتی اور اپنی نظریں دلہن کے چہرے پر سے پل بھر کو نہ ہٹاتی۔ بس جی چاہتا کہ دلہن کو دیکھے ہی جائے ——! خوبصورتی سے اسے ازلی پیار تھا۔ سرخ کپڑے گوٹے اور چمپا کا کام۔ بڑا سا جھلمل کرتا گھیر دار غرارہ —— بڑی بڑی جھمکیاں —— گلے میں چمپا اور کنٹھی —— اور بہت سے ہار —— ہاتھوں میں چوڑیاں اور کنگن۔ ماتھے پر ٹیکا اور ہاتھ بھر کا لمبا گھونگٹ جس میں سے صرف جڑاؤ نتھ نظر آتی تھی۔ اتنے ڈھیر سے زیوروں کے اسے نام بھی پورے نہ آتے تھے۔ دلہن کبھی گوری ہوتی جیسے چودھویں کا چاند۔ حیا اس کے گالوں پر خون بن کر نظر آتی۔ کبھی وہ سانولی سلونی ہوتی نمکین چہرہ بھیگی بھیگی پلکیں —— کبھی ایسی پیلی اور زرد جیسے سرسوں بہار پہ ہو اور کبھی کبھی ایسی دلہن بھی دکھائی دیتی جیسے کالا توا —— اور پیلا سونا اس پر ایسا لگتا جیسے رات کے اندھیرے میں لالٹین! اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں دلہن اچھی لگتی تھی —— اور ہر دلہن میں وہ اپنا کوئی روپ دیکھتی اور سوچتی وہ بھی کبھی دلہن بنے گی ——! کس کی دلہن ——؟ اس بات سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اس نے یہ کبھی سوچا۔

وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر بھی ایسی ہی لالی ہو۔ ہاتھوں میں مہندی اور مانگ میں افشاں اور پیشانی پر ایسا ہی ٹیکا ہو جس میں ننھے منے موتی لرز رہے ہوں۔ دلہن اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ ایک دن جب استانی جی نے کلاس میں لڑکیوں سے پوچھا کہ وہ بڑی ہو کر کیا بنیں گی تو رؤفہ بلا سوچے سمجھے زور سے چیخی "دلہن ——!"

استانی جی کو ہنسی آ گئی۔ اور پھر ان کے چہرے پر اداسی کھیل گئی۔ وہ شاید ایسے ہی خواب دیکھتی ہوئی جوان ہوئی ہوں گی۔ ان کے بال کھچڑی تھے۔ مگر وہ دلہن نہ بن سکیں۔ دلہن کے لیے دولہا بھی تو ضروری ہے اور دولہا کے لیے دلہن کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ضروری ہیں —— استانی جی کی اچھی خاصی صورت تھی مگر وہ دلہن نہ بن سکیں ——! انہوں نے جب اداس ہو کر ننھی لڑکیوں کو دیکھا تو وہ لڑکیاں اپنے مستقبل کے سارے خطروں سے بے پروا اور مگن انہیں بہت پیاری لگیں۔ اور ان سب چھوٹی چھوٹی لڑکیوں میں جو پہلی جماعت میں پڑھتی تھیں رؤفہ دلہن بننے کے بارے میں سب سے زیادہ پُر امید تھی بس بڑی ہونے کی دیر ہے!

رؤفہ کو جیسے جیسے شعور آتا گیا دولہا اور دلہن کا یہ روائتی تصور دھندلا ہوتا گیا۔ اور اس کی خوبصورتی کم ہوتی گئی۔ اس کا اظہار اس نے اس طرح کیا کہ گڑیاں کھیلنا اور دھوم دھام سے ان کی شادیاں کرنا چھوڑ دیا ——! وہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ پھر جب وہ بڑی جماعتوں میں آئی تو اس نے ڈھیر سے قصے اور کہانیاں پڑھیں۔ نذیر احمد۔ راشد الخیری اور نیاز فتح پوری سے لے کر حجاب اسمٰعیل تک کی ساری کتابیں ——! کتابیں پڑھ کر اسے معلوم ہوا کہ دلہن کیا ہوتی ہے اور بعض دفعہ دلہن بننا کتنا خوفناک ہوتا ہے۔ مردوں کے مظالم کے قصے پڑھ پڑھ کر وہ خوب روتی۔ کتابوں میں دلہنوں کا حسرت ناک انجام دیکھ دیکھ کر اسے رفتہ رفتہ شادی بیاہ کے نام سے ہی نفرت محسوس ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اصغری جیسی سگھڑ اور سلیقہ مند دلہن بھی اسے پسند نہ آئی۔ دلہن کا خوب صورت تصور جو بچپن سے ساتھ تھا ایک کانچ کے برتن کی طرح چھن سے چور چور ہو گیا۔

مردوں کے مظالم کے قصے اور عورتوں کی مظلومی کی داستانیں پڑھ پڑھ کر اسے سارے ہی مرد بُرے لگنے لگے۔ اکثر وہ فیصلہ کن لہجے میں اپنی سہیلیوں سے کہتی "تم دیکھ لینا۔ میں کبھی بیاہ نہیں کراؤں گی" کبھی کبھی حجاب کے رومانوی ماحول کا خواب سا تصور چھاتا تو وہ اسے جھٹک کر پھینک دیتی۔ جھوٹی بات ہے ——! نہ ایسی صبحیں ہیں نہ ایسی شامیں —— تو پھر ایسے لوگ کہاں ہو سکتے ہیں ——! کبھی کبھی شفیق الرحمن کے کسی ڈرامے

اور نٹ کھٹ کردار دل لبھاتے —! حجاب کے رومانی ماحول کی نسبت اس ماحول میں زیادہ دل لگتا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ اس کے ارد گرد ایسی کتابوں کا ڈھیر لگ گیا، جن میں زندگی کی تلخی درد اور غربت کی کہانیاں تھیں۔ غلامی کے مسائل —! اور پھر ان سب کا لازمی ردِ عمل یہ ہوا کہ محبت وغیرہ فضول باتیں ہیں —! اس نے اپنی ہم عمر لڑکیوں کی بہ نسبت اتنا زیادہ پڑھ لیا تھا کہ وہ ان سب کو بے وقوف سمجھنے لگی تھی۔

وہ لڑکیاں اپنے چھوٹے چھوٹے راز رُدفہ سے چھپانے لگی تھیں وہ محبت کا مذاق جو اڑایا کرتی ہے۔ اکثر وہ سب آپس میں بیٹھی کھسر پسر کر رہی ہوتیں وہ بھولے بھٹکے وہاں پہنچتی تو سب کو یکایک سانپ سونگھ جاتا، جیسے کوئی نامحرم آگیا ہو۔ گھر سے اسکول تک کے راستے کے چھوٹے چھوٹے رومان — جو بس زیادہ سے زیادہ دور سے دیکھنے اور چوری چھپے خط لکھنے تک محدود تھے۔ اس سے چھپائے جاتے تھے۔ وہ مذاق جو اڑاتی ہے۔ محبت کو بکواس کہتی ہے —! بڑی بوڑھیوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ ایک دن شاہدہ نے اس سے کہا کہ "آپا سڑک کے کنارے جو بڑا سا پیپل ہے نا اس کے نیچے ایک لڑکا روز سائیکل لیے کھڑا رہتا ہے — میرا خیال ہے وہ تمہیں دیکھا کرتا ہے" "خدا کرے اس کمبخت کی آنکھیں پھوٹ جائیں۔ تم اس کی طرف نہ دیکھا کرو — اترا جائے گا" شاہدہ نے اپنی عقلمند بہن کو مرعوب ہو کر دیکھا۔ ایک دن اس کی ایک سہیلی بولی "رُدفہ یہ کون ہے۔ پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا ہوتا ہے جب تم اسکول کے گیٹ میں داخل ہوتی ہو تب ہی لوٹتا ہے میں کئی دن سے غور کر رہی ہوں"

"ہوگا کوئی —! کیا کروں ٹیچر سے کہہ دوں —؟"

"تمہارا کیا جاتا ہے اگر کوئی دیکھتا ہے تو دیکھا کرے۔ اسی کے پیر دکھتے ہوں گے"

شاہدہ نے کہا وہ بولی "ہاں تو ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ ایک دن اس نے بھی پیپل کے درخت کے نیچے غور سے دیکھا آخر کون ہے وہ حیران رہ گئی — تو یہ اس کا پڑوسی ہے جس کی باجی کی شادی میں سب مدعو تھے — اتنا نیچ ہے یہ لڑکا وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ پھر ایک دن اس کے نام اسکول کے پتہ پر خط آیا۔ خط پر لکھنے والے کے نام کا پہلا حرف 'غ' تھا۔ اس کو بہت غصہ آیا۔ مارے غصے کے وہ رو پڑی۔ جی چاہا کہ جوتا لے کر جائے اور پیپل کے درخت کے نیچے مرمت کر ڈالے۔ یقیناً وہی ہوگا۔ لڑکیوں نے غ سے جتنے نام بن سکتے تھے بنا ڈالے چند لڑکیاں بولیں رائٹنگ بہت پیاری ہے

"مگر یہ بھی کوئی شرافت ہے — بڑا آیا محبت کرنے والا ساری شیخی نکال دوں گی"

"اسے کیا معلوم کہ تمہیں محبت سے ہی نفرت ہے ورنہ بیچارہ نفرت کرتا اور پھر تم خوش ہوتیں — شاہدہ نے بولی۔

وہ غصے کے مارے سیدھی ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں گئی۔ خط ان کی میز پر رکھ دیا۔ بوڑھی اور شفیق ہیڈ مسٹریس نے اس کی طرف پیار سے دیکھا "اتنی پریشان کیوں ہو —؟"

"جی — یہ خط —؟"

ہیڈ مسٹریس نن تھیں انہوں نے اپنی ساری جوانی لڑکیوں کو پڑھانے میں گزار دی تھی — جوانی میں ضرور بہت خوب صورت ہوں گی ان سب کو اب بھی اچھی لگتی ہیں۔

"تم اسے جانتی ہو"

"جی پڑوس میں رہتا ہے۔ ایک دفعہ شادی میں ہم سب اس کے گھر گئے تھے"

ہیڈ مسٹریس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ رونے کی کیا بات ہے بیٹی۔ ایسی چیزوں کی پروا بھی نہیں کرتے۔ تم نے اچھا کیا جو مجھے بتایا۔ اب اسے پھاڑ کر پھینک دو اور ہنستی ہوئی چلی جاؤ۔

اور ہاں آئندہ کوئی خط ایسا اور آئے تو بغیر پڑھے پھاڑ دینا"

"کیا اور بھی خط آئے گا؟" وہ گھبرا گئی۔

"ابھی تم ایک ننھی مُنّی اور پیاری سی لڑکی ہو جب بڑی ہو جاؤ گی تو شاید اور بہت سے خط آئیں گے۔ مگر ان خطوں کا ایک ہی علاج ہے۔ پڑھو مت اور پھاڑ کر پھینک دو!

ہیڈ مسٹریس سے باتیں کرنے کے بعد اسے سکون مل گیا، اور وہ بڑی مطمئن کلاس میں واپس آئی۔

دوسرے دن جب اس کی بہن نے لڑکیوں کے سامنے کہا کہ خط کی بات رؤفہ نے گھر جاتے ہی اپنی امی اور ابا کو سنائی تھی تو لڑکیوں کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیسی عجیب لڑکی ہے!

چند روز بعد دوسرا خط آیا وہ اس نے بغیر پڑھے پھاڑ دیا۔ اس کی کلاس کی لڑکیاں ردّی کی ٹوکری میں سے پرزے نکال کر جوڑ جوڑ کر پڑھتی اور لطف لیتی رہیں۔ رشیدہ آپا کلاس کی سب سے بڑی لڑکی تھیں اور انہیں ایسی باتوں سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ کئی خط آئے اور پھر آنا بند ہو گئے مگر اس نے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا ہونا نہ چھوڑا۔ رؤفہ نے ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کر پیپل کے درخت کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے بچپن میں سنا تھا کہ پیپل پر بھوت ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے وہ اسے پیپل کا بھوت ہی سمجھنے لگی تھی۔ جب لڑکیاں کھسر پھسر کرتیں "کیسا بھولا بھالا سا ہے شکل بھی اچھی ہے" تو وہ انہیں غصّے سے ڈانٹ پلاتی اور وہ چپ ہو جاتیں۔ بہت سی لڑکیاں محبت کرنے کی اتنی شوقین تھیں کہ انہیں استانیوں سے ہی فلمی سی محبت ہو جاتی تھی۔ رؤفہ کو ایسی لڑکیاں پسند نہیں تھیں۔

ایسے بے شمار خط اور اَن گنت بھوت اس کی زندگی میں آئے۔ اس نے کسی خط کو نہیں کھولا اور کسی بھوت کی طرف نہیں دیکھا اس کی ہم جماعت لڑکیاں چھپ چھپ کر خط لکھتی نظر آتیں تو وہ انہیں بھی سمجھاتی "یہ محبت وحبت بالکل فضول باتیں ہیں"

ایک دن تو ایک لڑکی نے بڑی عجیب حرکت کی گھر سے اسکول کا کہہ کر آئی اور پھر کہیں اور چلی گئی۔ اس کی امی کو شادی میں جانا تھا، وہ اسے لینے آئیں تو نکہت اسکول میں نہیں تھی وہ بیچاری سخت پریشان ہو گئیں۔ فوراً اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔ چھٹی کے بعد جب رؤفہ گھر لوٹ رہی تھی تو اسے نکہت راستے میں مل گئی اس کے ہاتھ میں بستہ تھا۔ نکہت کا قد تو ٹھگنا تھا مگر شکل بڑی پیاری تھی اور آواز کی تو سارے اسکول میں شہرت تھی۔

"ارے نکہت تم آج اسکول نہیں آئیں پھر یہ بستہ لیے کدھر جا رہی ہو۔ ہاں تمہاری امی تمہیں لینے آئی تھیں"

"ہیں ——" نکہت کے ہاتھ سے بستہ چھوٹ گیا وہ پریشان ہو گئی۔ رؤفہ تم میرے ساتھ چلو —— تم میری امی سے کہہ دینا کہ میں تمہارے گھر تھی ——"

"مگر واہ میں تو ابھی اسکول سے آ رہی ہوں"

"رؤفہ میری جان بچالو ورنہ میں زہر کھالوں گی"

"کھالو مجھے کیا ڈراتی ہو — میں تمہارے گھر امی سے پوچھے بغیر کیسے چلی جاؤں — اور اس روز امی کے ساتھ آئی تھی تب بھی تمہارے بھائی مجھے کیسے گھور رہے تھے۔ میں نے تو واپسی میں امی سے کہا کہ مجھے یہ لوگ پسند نہیں ہیں"

"رؤفہ تم واقعی عجیب لڑکی ہو — مگر اس وقت مجھ پر ترس کھالو"

اس کی خالہ زاد بہن شاہدہ کا ننھا سا دل پسیج گیا۔

"کیا حرج ہے رؤفہ آپا —"

"نہیں منّی ہم اس کے گھر نہیں جائیں گے" پھر اس نے نکہت سے کہا "تم سیدھی گھر جاؤ اور ساری باتیں سچ سچ اپنی امی کو بتادو۔ ماں باپ سے بڑھ کر کون دوست ہو سکتا ہے"

نکہت نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور پھر چپ چاپ چلی گئی۔

اسے نکہت پر ترس بھی آیا "کتنی بیوقوف اور پیاری سی لڑکی ہے"

اس نے شاہدہ سے کہا — !

جب اس نے میٹرک پاس کر لیا تو اپنے شاندار نمبروں پر پھولی نہ سمائی۔ وہ بے چینی سے کالج جانے کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ نکہت کی امی اس کے گھر آئی تھیں — بہت سی مٹھائی بھی ساتھ لائی تھیں، مگر اس کی امی نے مٹھائی واپس کر دی اور وہ چلی گئیں — !

جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کے لیے نکہت کے بھائی کا پیام آیا تھا تو وہ مارے غصہ کے آگ بگولا ہو گئی۔ سینکڑوں باتیں نکہت اور اس کے بھائی کو سنائیں۔ امی نے پیار سے سمجھایا "بیٹی"۔

"خفا ہونے کی کیا بات ہے جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر آتے ہی ہیں"

"ہوں خوب — تو میں بیری ہوں — !" وہ جل بھن گئی۔

پھر ہر سمت سے اس پر پتھراؤ شروع ہوا تو وہ گھبرا گئی۔

"امی میں خوب پڑھنا چاہتی ہوں، بڑے بڑے کام کرنا چاہتی ہوں"

"آخر تم اتنی پریشان کیوں ہوتی ہو — ؟" وہ اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگی "امی آپ اس قسم کی باتوں سے متعلق بالکل نہ سوچا کریں، ان لوگوں کو ڈانٹ دیا کریں۔ ان فضول عورتوں کو اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ پرائی لڑکیوں کو دیکھتی پھریں۔ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔

اس کی ماں گلے سے لگا کر پیار سے سمجھاتی "بیٹی وہ زمانہ اور تھا جب لڑکیاں آنگن کی چڑیاں سمجھی جاتی تھیں تو گھبراتی کیوں ہے جتنا تیرا جی چاہے پڑھنا۔ پھر تیری شادی کریں گے۔ لیکن اگر کسی کا پیام آئے تو رونے دھونے اور لڑنے بھڑنے کی بات نہیں۔ دنیا کا یہی طریقہ ہے، اب یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ ہم عداوت اور دشمنی مول لیں" امی کی باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں۔ اس نے ایسی باتوں پر کڑھنا جھکنا چھوڑ دیا اسے سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ ابا بالکل اس کے ہم خیال تھے۔ وہ کہا کرتے تھے لڑکوں اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں

کو برابر پڑھنا چاہیے۔ ابا نے اس کے لیے اچھی اچھی کتابوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ وہ بڑے احتیاط سے اپنی کتابیں رکھا کرتی تھی، اور خود بھی بس اسے ایک ہی شوق تھا۔ کتابیں خریدنے کا شوق۔ عام لڑکیوں کی طرح اسے کبھی زیورات اور کپڑوں کا شوق نہ ہوا۔ بس سارا جیب خرچ اچھی کتابوں پر خرچ کر ڈالتی تھی۔ اور اس کے ابا جب ان کتابوں کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ ان باپ اور بیٹی میں کس قدر خیالی قربت اور ہم آہنگی تھی۔ وہ کتنی اچھی اچھی باتیں کیا کرتے تھے۔

آزادی اور پاکستان! اور اس کے سامنے یہی نصب العین تھا۔ وہ بڑی سرگرمی سے لڑکیوں میں نیشنل گارڈ کی تحریک چلا رہی تھی اور اسٹوڈنٹس یونین کے ہنگاموں میں تو اس قدر الجھی رہتی تھی کہ پڑھائی کا بھی نقصان ہونے لگا تھا۔ اور ایسی مصروف زندگی میں جب کوئی کنکر پھر اس کی طرف آتا تو اسے اور بھی غصہ آتا۔ "ہائے اللہ مجھے دنیا میں اتنے بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ ان لوگوں کو سوائے شادی بیاہ کے اور کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے۔" اس کی چند سہیلیوں کی میٹرک کے بعد شادی بھی ہوگئی۔ وہ ان کی شادی میں خوشی خوشی شریک بھی ہوئی، مگر وہ بچپن والا دلہنوں اور براتوں کا شوق اب اسے یاد کرکے بھی ہنسی آتی تھی۔!

انہی دنوں اس کی بڑی خالہ بھی اپنے اکلوتے بیٹے کا پیغام لے کر آئیں۔! اس نے شوکت بھائی کی ہمیشہ بہت خاطر مدارات کی وہ جب بھی آتے رؤفہ کو بڑی خوشی ہوتی مگر یہ تو اس کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ شوکت بھائی کبھی اسے بیری سمجھ کر پتھراؤ پر آمادہ ہو جائیں گے۔ بڑے بھائی کی تو سدا کی بھوکی تھی — اپنے سب بھائی نخنے منے تھے۔ اس لیے وہ رشتے کے بھائیوں کی آمد پر بہت خوش ہوتی تھی۔ مگر بڑی خالہ نے اچانک ایسا بڑا پتھر کھینچ مارا کہ اس کی سٹی گم ہوگئی! ہائے اللہ اب کیا ہوگا —! اور جب وہ ہمیشہ کی طرح امی کے گلے لگ کر روئی اور ابا نے بھی حمایت کی کہ وہ بہت پڑھے گی تو بڑی خالہ خفا ہو کر چلی گئیں — امی نے اس کی خاطر بہن کا دل توڑ دیا۔ مگر ایسا کرکے امی بھی کچھ خوش نہ تھیں — لیکن وہ بہت خوش تھی حالات بالکل اس کی مرضی کے تابع تھے۔

جب وہ کالج جانے لگی اس کی سرگرمیاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ کالج یونین کی سیکرٹری ہوگئی۔ بزم ادب کی بھی روح رواں، ادھر تاختی پھر ڈبیٹ اور ڈرامے۔ کبھی نہ ختم ہونے والے ہنگامے! اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کام تو اب اتنے ہوگئے تھے کہ اسے پڑھنے کا بھی زیادہ وقت نہ ملتا تھا۔ اس کی امی اکثر کہتیں ساری دنیا کے جھنجھٹ ہیں اور ایک تیری جان — آخر یہ اتنے کام کیوں مول لے رکھے ہیں۔" مگر اسے تو خبط تھا۔ دھن سوار تھی۔ سیاست سر پر اس طرح مسلط ہوگئی تھی کہ تعلیم بھی ثانوی چیز معلوم ہونے لگی تھی۔

اسکول کے زمانے میں اسے مردوں سے جو شدید نفرت تھی۔ کالج آ کر وہ کم ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ سارے ہی مرد راشد الخیری کی کہانیوں جیسے نہیں ہوتے۔ اس کے ابا کی طرح اور بھی بہت سے اچھے لوگ ہیں۔ قابل اور لائق پروفیسروں سے وہ مرعوب ہوئی اور بہت سے ایسے لڑکے بھی ملے جن کے سوچنے کا انداز اس کی اپنی طرح تھا۔ وہ مباحثے کرتے۔ سوشلزم، کمیونزم اور سرمایہ داری نظام کے سارے پہلوؤں کو زیر بحث لاتے۔ بعض دفعہ جوش خروش اور جذباتی حد تک اپنے نظریات سے محبت کی وجہ سے وہ لڑنے بھی لگتے تھے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ اسے اچھے لگتے۔ انہوں نے کبھی کوئی گری ہوئی بات یا گھٹیا حرکت نہیں کی بلکہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کام کے دوران اسے یہ تجربہ ہوا کہ لڑکیاں بالکل فضول ہوتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دماغ اور تصورات اور لڑکے کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ کتنے بڑے بڑے منصوبے باندھتے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ نڈر اور صاف گو ہوتے ہیں۔ اس نے لڑکوں کو کبھی لڑکیوں کی طرح کھسر پھسر کرتے نہ دیکھا تھا مگر

سارے ہی لڑکے ایسے نہ تھے چند لڑکے بہت ہی چھچھورے اور فضول معلوم ہوئے بلکہ اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں جو جوش و خروش دکھا رہے ہیں وہ بھی اس کی وجہ سے — تاکہ اس سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملے۔ ایسے لڑکوں سے اسے نفرت محسوس ہوئی اور اس نے انہیں کبھی مُنہ نہ لگایا۔ فیڈریشن میں شاکر، ریوتی اور قاسم اس کے قریب آسکے تھے۔

وہ تینوں اس کی طرح جوشیلے اور سرگرم کارکن تھے۔ وہ سب مل کر پوسٹرز بناتے، جلسوں اور میٹنگوں کی روئداد لکھتے۔ پھر فیڈریشن کا اخبار اور مزدور کسان پارٹی کا اخبار بیچتے۔ اور بھی کئی محنتی اور مخلص کارکن تھے۔ مگر ان تینوں سے زیادہ کوئی اس کے قریب نہ آسکا تھا۔ وہ اس کے گھر بھی آتے اور اسطرح گھل مل گئے تھے جیسے اسکے گھر انے ہی کے فرد ہوں۔ ابا کو مباحثے کا شوق تھا اور وہ ان سب کے ساتھ ہمیشہ بحث میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔

رفیعہ کو کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ نظریاتی ہم آہنگی کا بھی وہ رشتہ ہے جو خون کے رشتہ کی طرح تعلقات استوار کرتا ہے۔ اسے ریوتی، قاسم اور شاکر پر جو اعتماد تھا وہ اپنے بہت سے رشتے کے بھائیوں پر بھی نہ تھا۔ وہ ان سے جس طرح بولتی اور مل جل کر کام کرتی۔ وہ بات ان رشتے کے بھائیوں کے درمیان بھی پیدا نہ ہو سکی جو رشتے میں قریب ہوتے ہوئے بھی نظریاتی لحاظ سے بہت دور تھے۔ یہ بات ان لڑکیوں کی سمجھ میں نہ آسکتی تھی جو لڑکوں کے نام ہی سے سُرخ ہو جایا کرتی تھیں اور جو باہر سے آنے والے ہر مہمان کو دروازے میں جھانک کر اور چھپ کر دیکھا کرتی تھیں، بلکہ گھر کے جوان نوکروں تک سے شرمایا کرتی تھیں۔ ایسی لڑکیاں ہمیشہ اس کے بارے میں کہا کرتی تھیں کہ "بہت آزاد ہے" "لڑکوں سے باتیں کرتی ہے"۔ وہ حیران ہو کر انہیں دیکھتی۔ اور پھر چپ ہو جاتی۔ شاید وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ بھی نہ سکتی تھیں۔ ایسے لڑکوں سے شرمانا گھبرانا اور ان کو ہر وقت جھانکتے رہنا بڑا عجیب سا لگتا تھا اور وہ لڑکیاں اس بات پر حیران ہوتی تھیں کہ وہ کس طرح اس قدر صبر و سکون اور اطمینان سے لڑکوں سے باتیں کر لیتی ہے۔

عجیب بات تھی اسے لڑکوں میں بیٹھ کر کبھی اپنے لڑکی ہونے کا احساس نہ ہوا تھا۔ اور جانے کیوں لڑکیوں میں بیٹھ کر وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ ان کی طرح باتیں نہیں کر سکتی۔ بچپن سے ہی وہ بالکل اپنے ابا کے رنگ میں رنگ گئی تھی — ادب — سیاست — اس کی امی بھی عام گھریلو عورتوں سے زیادہ سیاست سے دلچسپی لیتی تھیں اور سادگی سے رہتی تھیں۔ اس وجہ سے کبھی اسے کپڑوں اور بناؤ سنگار کا شوق بھی نہ ہوا تھا اور لڑکیوں کے پاس سب سے بڑا موضوع ہی کپڑے اور فیشن تھا یا پھر شادی بیاہ کی باتیں — وہ اکثر تعجب سے سوچتی بچپن میں اسے دلہن بننے کا کتنا ارمان تھا۔ اور اب اسے شادی بیاہ کے ذکر سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔ پھر وہ سوچتی محبت — شادی — شاید وہ ان سب باتوں کے لیے نہیں بنی ہے۔ یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ اسے تو دنیا میں بہت بڑے بڑے کام کرنا ہیں۔ اکثر ایسے لمحے بھی آتے کہ جب وہ کوئی غزل یا رومانی نظم پڑھتی تو اسے ایسا لگتا کہ وہ خود ہی شاید وہ ہیروئن ہے۔ جس کے بارے میں یہ سب باتیں کہی جارہی ہیں شاید یہ جوانی کا احساس تھا جو اس کے سنجیدہ اور خشک خیالوں کے تانے بانے میں چپکے سے داخل ہو کر اسے جگاتا تھا۔ اور جب وہ اس کی آہٹ پر خاموش رہتی تو وہ احساس کملا جاتا۔

بہت سی ایسی لڑکیاں جو اسے آزاد سمجھتی تھیں۔ اس کے منہ سے رومانس کی باتیں سننا چاہتی تھیں اور جب انہیں شدید مایوسی ہوتی تو وہ خود اپنے ذہن سے اس کے اِرد گرد خوب صورت رومانوی ماحول بنا کر خوش ہوتیں۔ فرزانہ کا خیال تھا کہ شاکر اور قاسم جو سٹوڈنٹس فیڈریشن میں کر تا دھرتا بنے پھرتے ہیں۔ رفیعہ کی وجہ سے ضرور باہم رقیب بھی ہوں گے، اور جب وہ ان دونوں کو ہمیشہ ساتھ دیکھتیں تو انہیں اس خیال کے غلط ہو جانے سے بڑا رنج ہوتا۔ وہ قاسم اور شاکر کے مابین کوئی بڑی رقابت اور لڑائی کی خبر سننے کی منتظر رہتی تھیں۔ "میری سمجھ میں

نہیں آتا کہ یہ فیڈریشن کے لیے اتنی دوڑ دھوپ ہے یا رُدنہ کی خاطر۔ فرزانہ کی اس قسم کی باتوں کی اطلاع اسے نزہت اور سعیدہ سے فوراً مل جاتی تھی۔ فرزانہ ایک بے حد رومان پسند لڑکی تھی وہ گہرا پردہ کرتی تھی۔ کلائی بھر بھر کے چوڑیاں پہنتی تھی اور جب وہ برقعہ میں سے اپنا مہندی لگا ہاتھ جس میں رنگ برنگی چوڑیاں جھل مل کرتیں نکالتی تو ایک لمحے کو ساری کلاس کے لڑکے کیا لڑکیاں بھی اس کا ہاتھ دیکھنے لگتے۔ اور پروفیسر صاحب بھی اپنا ٹاپک بھول جایا کرتے تھے۔ فرزانہ کے پردے کا بڑا شہرہ تھا۔ اس کے ماں باپ فخریہ کہا کرتے تھے کہ برقعہ اوڑھ کر لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی ہے۔ اگر لڑکیوں کا کالج علیحدہ ہوتا تو بے چاری فرزانہ کو اس کالج میں آنا بھی نہ پڑتا۔ مگر مجبوری تھی۔ اس کے سیاہ ریشمی برقعے میں ہمیشہ ہلکی سی مہک آیا کرتی تھی اور اس ریشمی برقعے کا وجود ماحول پر چھا جاتا تھا۔ وہ جب ایک باریک نقاب ڈال لیتی تو اور بھی اچھی لگتی تھی۔ لڑکیوں کے کمرے میں آکر جب وہ پوری نقاب اٹھا لیتی تو انہیں یہ محسوس ہوتا کہ نقاب ہٹنے سے اس کی کشش کم ہو جاتی ہے۔ ایک بات پر رُدنہ کو ہمیشہ تعجب ہوتا تھا کہ وہ باوجود سیکرٹری ہونے کے بہت سے لڑکوں کے نام نہیں جانتی تھی اور فرزانہ برقعہ اوڑھنے کے باوجود سب لڑکوں کے نام جانتی تھی اور انہیں پہچان بھی لیتی تھی۔

فرزانہ کا اپنے رشتہ کے ایک بھائی سے زبردست رومانس چل رہا تھا وہ دونوں کالج کے احاطے میں آگے پیچھے نظر آتے اور جب فرزانہ کا تانگہ آجاتا تو وہ اپنی سائیکل لے کر دوسری سمت نکل جاتا۔ اگر کالج کے احاطے سے گیٹ تک وہ ساتھ ساتھ جاتے تو سب کی نظریں سیاہ ریشمی برقعے کا تعاقب کیا کرتی تھیں، اور بھی چند لڑکیاں برقعے پہن کر آتی تھیں۔ مگر ان میں سے کسی کا برقعہ پُراسرار نہ تھا۔ وہ کلاس میں نقاب اٹھا کر دوسری لڑکیوں کی طرح آگے بیٹھ جایا کرتی تھیں اور چند لڑکیاں تو صرف آتے جاتے برقعہ اوڑھتی تھیں۔ ان کے والدین روشن خیال تھے، اور انہوں نے اس حد تک ان کو آزادی دے رکھی تھی۔ زیادہ تر لڑکیاں بے پردہ تھیں مگر وہ سب اپنی بے پردگی کی وجہ سے سیدھا سادھا سا لباس پہنا کرتی تھیں اور اس بات کا زیادہ خیال رکھتی تھیں کہ کسی کو اعتراض کا کوئی موقعہ نہ ملے — !

فرزانہ کے ابا بہت سخت قدامت پسند بزرگ تھے وہ دوسروں کے گھر بھی چھپ کر ہی جاتی تھی۔ سینما کے تو اتنے خلاف تھے کہ فرزانہ کو جب سینما جانا ہوتا وہ کسی لڑکی سے جشن میلاد کا رقعہ منگواتی اور پھر بڑی سعادت مندی سے اجازت لے کر سہیلی کے گھر آتی اور پھر پکچر دیکھتی — !

رُدنہ کو اس ریاکاری کی وجہ سے فرزانہ پسند نہیں تھی، اگر وہ کچھ کرنا چاہتی ہے تو اسے جرأت بھی پیدا کرنی چاہیے — !

فارسی کے پروفیسر صاحب لڑکیوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ گورے چٹے آدمی تھے۔ چمکتی ہوئی بڑی بڑی کالی آنکھیں — اور پھر لچھے دار باتیں — اور شعر و شاعری — ! وہ سرمہ بھی لگاتے تھے، اور خوشبو بھی استعمال کرتے تھے۔ بات بات پر شعر پڑھنا ان کی عادت تھی۔ رُدنہ کو وہ اتنے بُرے لگے کہ ان کی وجہ سے اس نے کالج آکر فارسی ہی چھوڑ دی، مگر لڑکیوں میں عام طور پر وہ بہت ہر دلعزیز تھے۔ فرزانہ ان کی سب سے زیادہ سعادت مند طالبہ تھی۔ وہ ہر وقت اس کے کام اور ذہانت کے گن گاتے — اور نقاب کے موضوع پر شعر پڑھا کرتے تھے انہیں نقاب کے متعلق اتنے شعر یاد تھے کہ رُدنہ کو حیرت ہوتی تھی۔ فرزانہ کو اپنے رشتہ کے بھائی سے اگر اتنی محبت نہ ہوتی تو پروفیسر کی کامیابی یقینی تھی

تحریک پاکستان نے ان دنوں طالب علموں میں اتنا جوش و خروش پھیلا رکھا تھا کہ وہ لڑکیاں جنہیں سیاست سے ذرا بھی دلچسپی نہ رہی تھی وہ بھی اب فیڈریشن سے دلچسپی لینے لگی تھیں۔ طالب علموں کو کتابوں اور قلم دواتوں کا ہوش نہ تھا، ملک میں انتخابات ہونے والے تھے اور ان

ہی انتخابات سے ملک اور پاکستان کا مستقبل وابستہ تھا۔ وہ سب ٹولیاں بنا کر گھر گھر جاتے۔ پاکستان کا نظریہ سمجھاتے اور لیگ کے امیدواروں کی حمایت کے لیے لوگوں کو جوش دلاتے، علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم تو اس انتخابی مہم کو اتنے جوش و خروش سے چلا رہے تھے کہ وہ صوبہ سرحد تک کے دورے کو نکلے تھے۔ اس کے رشتہ کے چند بڑے بھائی بھی دورے پر تھے۔ اس کا بھی بڑا جی چاہا کہ اس انتخابی دورے میں شامل ہو، اور اسے پہلی بار اپنے لڑکی ہونے پر کمتری کا احساس ہوا۔ جب اس نے امی سے کہا کہ بیگم علی خاں بھی جا رہی ہیں تو امی نے کہا "تم کنواری ہو، وہ بیاہی؟ تمہارا ان کا کیا مقابلہ۔!" تو اسے پہلی بار شدت سے یہ احساس ہوا کہ بیاہے جانے کے بھی بڑے فائدے ہیں، اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔

اپنے شہر میں بھی بہت کام تھا۔ ان سب نے سبز لوپی فارم تیار کی تھی۔ اور انتخابی مہم کے دوران وہ سب سبز پوش رہیں، ان ہی دنوں اس کی قمر آپا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اتنی مخلص اور محنتی تھیں کہ وہ بہت جلد ان کی گرویدہ ہو گئی۔ انتخابی مہم کے دوران ان سب نے آپا کو اپنا قائد بنا لیا۔ وہ ان سب کو مفید مشورے دیتیں اور کام کرنے کے طریقے بتاتی تھیں۔ ان کے شوہر ایک بہت مصروف سیاسی کارکن تھے۔ وہ میاں بیوی ہر جگہ ایک ساتھ دوڑ دھوپ کرتے۔ کئی دفعہ آپا نے اس سے کہا کہ اگر ہمارے بھائی میری مدد نہ کریں تو میں کچھ بھی نہ کر سکوں۔ آپا نے شادی کے مسئلے پر اس سے کئی دفعہ بحث کی، اور ہر بار اس کو قائل کر دیا۔ آپا کی زندگی دیکھ کر اسے یہ محسوس ہوا کہ شادی اتنی بری چیز نہیں ہے۔ جتنی کہ وہ سمجھتی ہے۔ اگر اس کی امی مدد نہ کرتیں تو کیا اس کے ابا اتنے سکون سے کام کر سکتے۔ اور پھر وہ سنجیدگی سے سوچتی کہ فلمی قسم کی محبت تو واقعی حماقت ہے مگر وہ شادی جس میں ذہنی رفاقت اور محبت ہو ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن جب وہ اپنے اردگرد نظر ڈالتی تو اسے اس لحاظ سے کوئی بھی مناسب نہ معلوم ہوتا تھا۔

شاکر اور قاسم دونوں اپنی جگہ بچے معلوم ہوتے تھے۔ جن کا مطالعہ مشاہدہ سب اس کی اپنی سطح تک تھا بلکہ مطالعہ شاید اس کا دونوں سے زیادہ ہی تھا، وہ اسے مرعوب نہ کر سکتے تھے۔ اور پھر شاکر اور قاسم ساتھ پڑھنے کی وجہ سے اس کے لیے ایسے تھے جیسے ایک آنگن میں کھیلنے والے بہن اور بھائی اسے کبھی ان کے متعلق اور کوئی خیال نہیں آیا۔ اور وہ پیام تو اسے ذرا بھی پسند نہ تھے جو اس کی سمت اس طرح آتے تھے، جیسے بیری کی طرف پتھر۔!

روفہ سیاست میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اسے اب ذاتی نوعیت کی باتیں سوچنے کا موقعہ بھی کم ہی ملتا تھا۔ مزدور سبھا کی طرف سے شہر میں ہڑتال ہوئی تو ان سب کی ہمدردی میں طالب علموں نے بھی ہڑتال کی۔ نظر بند مزدوروں کے کنبوں کی دیکھ بھال کا مشکل کام بھی طالب علموں نے اپنے ذمے لے لیا۔ ان کے لیے چندہ کرنا۔ ضرورت کی چیزیں مہیا کرنا اور ان کے گھر میں جو بیمار افراد ہوں، ان کی دیکھ بھال اور علاج ـــ بدیسی حکومت آزادی کی تحریکوں سے اتنی بوکھلائی ہوئی تھی کہ وہ طالب علموں پر بھی کڑی نگرانی رکھتی تھی۔

ان ہی دنوں شہر میں ایک اجتماع ہوا جس میں ایک مشہور مزدور رہنما جو ایک بڑے ادیب بھی تھے۔ صدارت کے لیے آئے ان سب نے دن رات ایک کر کے جلسہ کا انتظام کیا۔ وہ ان کی کتابیں پسند کرتی تھی۔ اور بغیر دیکھے ہوئے بھی ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھی وہ سیدھے سادے سے کپڑوں میں تھے۔ الجھے سے بال اور ذہین آنکھیں۔ جب وہ بولنے کھڑے ہوئے تو انہوں نے سب پر سحر کر دیا۔ اور روفہ تو بت بنی بیٹھی رہی۔ ان کے ساتھ ان کی والدہ بھی آئی تھیں۔ وہ ایک معمر خاتون تھیں، سفید ساری اور سفید بال وہ انہیں انتہائی مقدس معلوم ہوئیں! انہوں نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی اور لڑکیوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی جدوجہد تیز کر دیں۔ جب ان سب نے دیر تک آزادی اور پاکستان کے

نعرے لگاتے تو اس کی آنکھوں سے دیر تک آنسو بہتے رہے اور جب اس نے اپنے آنسو پونچھ کر ڈائس پر بیٹھے ہوئے مہمان کی طرف دیکھا تو اُسے یہ محسوس ہوا کہ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ وہ کتنے سمجھ دار مخلص اور اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اور اس کے ہونٹوں پر دھیرے سے مسکراہٹ کھیل گئی!

جلسہ کے بعد طالب علموں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ ان سب کو آٹوگراف دیتے رہے۔ روفہ نے جب آٹوگراف لینے کے لیے البم ان کی طرف بڑھائی تو جانے کیوں اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ شاید یہ ان کی شخصیت کا سحر ہی تھا۔ انہوں نے روفہ کو آٹوگراف دینے کے بعد اس سے بہت سی باتیں کیں اور کہا "آپ یہاں فیڈریشن کی سیکرٹری ہیں، آپ کے کام کی بہت تعریف سُنی ہے۔" اس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔

دوسرے دن جب جلسہ ہوا تو طالب علموں نے بھی تقاریر کیں۔ اور روفہ نے بھی انتہائی جوش سے تقریر کی۔ تقریر کے دوران وہ اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور جلسہ کے بعد انہوں نے اسے بہت ہی شاباش دی اور اس کی تقریر کی بہت تعریف کی اور سب طالب علموں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ روفہ اس روز خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ ایسی خوشی اسے آج تک نہ ہوئی تھی۔!

ان کی والدہ باوجود اپنی ضعیفی کے تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں بہت کام کر رہی تھیں۔ وہ ان سب لڑکیوں سے بڑی شفقت سے ملیں اور روفہ تو انہیں اتنی پسند آئی کہ وہ اس کے گھر بھی آئیں، اور اس کی امّی سے بھی ملیں اور جاتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور اسے گلے لگایا۔ "آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔"

روفہ کو وہ خاتون بہت پسند آئیں۔ اور ان کے مُنہ سے اپنی تعریف سُن کر بھی اسے خوشی ہوئی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی طالب علم کئی دن تک ان کی باتیں کرتے رہے۔ ربوتی جو کمیونسٹ تھا، ان سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی ہی ان دنوں ایسی جماعت تھی جو تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ حمایت کر رہی تھی۔ ربوتی بھی پاکستان کا پُرجوش حامی تھا۔ فیڈریشن میں ہر مکتبِ خیال کے طالب علم تھے۔ اپنے عظیم مہمان کی شخصیت سے وہ سب انتہائی متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایک بڑے ادیب اور مزدور رہنما کی حیثیت سے ان سب کی محبوب شخصیت بن گئے تھے۔

روفہ کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ فرزانہ جو ہمیشہ فیڈریشن کو بُرا بھلا کہا کرتی تھی ان کی تقریر سُن کر فیڈریشن کی ممبر بن گئی اور اس نے روفہ سے کہا کہ "حالانکہ میرے ابّا کانگریسی مولوی ہیں، مگر تم مجھے جو کام دوگی میں کروں گی۔ اور انتخابی مہم کے دوران اس نے بھی عورتوں میں خاص طور پر چندہ کیا اور کام کیا۔" اور ان ہی دنوں اس کے ریشمی برقعے کا پُراسرار سحر بھی ختم ہو گیا، اور وہ ان سب کو اپنی طرح ایک معمولی لڑکی نظر آنے لگی۔ اگر وہ بے چاری یہ کام بھی اپنے ابّا سے چھپ کر ہی کر رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ پاکستان کے مخالف تھے، اور کٹر کانگریسی تھے۔!

ان دنوں روفہ کو فرزانہ بھی بہت پیاری معلوم ہوئی۔ فرزانہ جس کی بہت سی باتوں سے اس کو چڑ تھی۔ ایک دن فرزانہ اس سے کہنے لگی تھی وہ مزدور رہنما جو تھے نا۔ ان کی نظروں میں کچھ عجیب سی بات تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میں اتری جا رہی ہیں۔ روفہ ہنس پڑی۔ مگر پھر یکایک سنجیدہ ہو گئی، بالکل یہی احساس تو اسے بھی ہوا تھا۔ تو کیا اب وہ بھی فرزانہ کی سطح پر آ کر سوچنے اور محسوس کرنے لگی ہے۔! اور پھر وہ فرزانہ سے خوش ہو کر بولی چلو اچھا ہوا ان کے آنے کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ تم بھی فیڈریشن کی ممبر بن گئیں۔ فرزانہ ہنس کر بولی "یہ ان کی شخصیت کا جادو

نہیں بلکہ تمہاری محنت ہے — ! تم جو اتنا شور مچایا کرتی ہو تو آخر میں انسان ہوں دیوار تو نہیں ہوں "

اس نے محبت سے فرزانہ کا ہاتھ پکڑ لیا — ! یہ سچ مچ اس کی اپنی جیت ہے — فیڈریشن کی جیت ہے۔

ایک دن اس کی خالہ زاد بہن شاہدہ جس کی شادی ہو چکی تھی' اور اب دو بچوں کی ماں بن چکی تھی، اس سے ملنے آئی اور اس کے شیلف پر نظر ڈال کر بولی "ہر وقت کتابوں کی دنیا میں کھوئی رہتی ہو۔ اس لیے اللہ میاں نے تمہاری قسمت میں ایک ادیب ہی لکھ دیا ہے۔

"کیا بک رہی ہو —؟"

"سچ وہی جن کی کتابیں تم نے اپنے شیلف میں رکھ چھوڑی ہیں — ارے بابا وہ جو لیڈر بھی ہیں — جلسہ میں آئے تھے —"

"پاگل دماغ خراب ہے — !"

"تو کیا تمہیں پسند نہیں ہیں — ؟

"یوں پسند کرنا اور بات ہے — !"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی — !"

"شاہدہ — میں نے انہیں اس نظر سے دیکھا ہی نہیں — میں نے تو انہیں اس طرح دیکھا جیسے کوئی شاگرد اپنے محبوب اور لائق استاد کو دیکھتا ہے — یا جیسے کوئی عقیدت مند اپنے دیوتا کو دیکھتا ہے۔

"سچ تم انہیں اتنا پسند کرتی ہو — !"

"ہاں سوچو تو — تم برس ہا برس سے ذہنی طور پر کسی سے متاثر ہو اور کبھی اس سے ملو تو اس کی شخصیت کو اتنا پیارا پاؤ — تو پھر تم اسے کتنا پسند کرو گی — مگر یہ محبت ان ساری محبتوں سے اونچی ہے جنہیں تم محبت کہتی ہو — یہ تو کچھ اور چیز ہے — اس میں شادی کا خیال نہیں آ سکتا"

"بہر حال تمہیں آئے یا نہ آئے انہیں تو آ ہی گیا۔ خوش مذاق معلوم ہوتے ہیں۔ تم نے ان کی کتابوں کی اتنی تعریفیں کی ہوں گی کہ انہوں نے سوچا میاں مٹھو کو پنجرے میں بند کر کے رکھ لیں —"

اس نے غصّے سے شاہدہ کو دیکھا۔ "بات کرتی نہیں، بکواس کیے جا رہی ہے — جب سے تیری شادی ہوئی ہے تو مجھ پر رعب جمانے لگی ہے "

"وہ تو قدرتی بات ہے تم دو سال بڑی کیا تھیں ساری عمر بڑائی کا رعب جماتی رہیں تو بیوی اب میں دو بچوں کی ماں ہوں' یہ کیوں نہ رعب جماؤں —؟ اچھا سنو — ان کی والدہ جب یہاں تمہاری امی سے ملنے آئی تھیں تو میں کھٹکی تھی — میں نے خالہ سے کہا بھی تھا کہ' خدا خیر کرے۔ در اصل دونوں ماں بیٹوں نے کانفرنس کے دوران ہی معلوم ہوتا ہے تمہارے متعلق سازش کر لی ہو گی۔ تمہیں کس قدر پسند کر رہی تھیں صدقے واری جا رہی تھیں۔ اب انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شادی کا پیغام بھیج دیا"

وہ حیران پریشان شاہدہ کو دیکھتی رہی۔ شاہدہ آنکھیں مٹکا کر بولی "مگر خالہ اور خالو دونوں کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے —"

وہ چونک پڑی "کیوں — ؟"

"وہ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ تمہارا ان سے متاثر ہونا۔ ایک ذہنی عقیدت ہے جسے اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اس

لئے کہ ان سے شادی تمہیں مشکل میں ڈال دے گی۔ دیکھو نا۔ وہ اتنے بڑے مزدور لیڈر ہیں۔ ہزاروں خطرے انہیں درپیش ہیں کبھی جیل میں کبھی انڈر گراؤنڈ — اس طرح کی زندگی میں ان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ شادی کریں اور اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی اجیرن کریں خالہ بڑی الجھن میں ہیں، وہ تمہارے جذبات کا احترام بھی کرتی ہیں' انہیں احساس ہے کہ تم انہیں پسند کرتی ہو گر خود سوچو کہ شادی واقعی حماقت ہے — میں نے سوچا تمہیں بھی اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے تم بھی خالہ اور خالو کے فیصلے کی تائید کرنے پر مجبور ہو گی۔"

وہ پیار سے شاہدہ کو دیکھنے لگی' اس کی بچپن کی رفیق اور دوست — ! وہ کتنی تجربہ کار بن کر باتیں کر رہی ہے۔ مگر اس کے لہجے میں کتنا خلوص ہے — اسے میرے دکھ سکھ کا کتنا احساس ہے — مگر عجیب بات ہے وہ مجھے جان کر بھی نہیں جانتی ہے — اور امی — انہیں تو اب مجھے سمجھنا چاہیے — !

جب ہر رشتہ پر وہ "نا" سن کر چپ ہو جایا کرتی تھیں تو انہیں اب یہ سمجھنا چاہیے کہ میں کس قسم کا شوہر چاہتی ہوں — ! آخر میرے سکھ کا ہی کیوں سوچ رہی ہیں — ؟ بیچاری امی وہ کیا کریں — ! آخر اتنے بھائیوں کی وہ ایک ہی تو بہن ہے اس کے دکھ سکھ کا سب ہی کو خیال رہا ہے — امی سچ ہی تو سوچ رہی ہیں کہ ان کے حالات بہت صبر آزما ہیں — نہ ملازمت کا ٹھیک ہے نہ زندگی کا کوئی قرینہ ہے بس ہر وقت کام — کام ! اور یکایک اسے ان سے شدید محبت محسوس ہوئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان سے ضرور شادی کرے گی۔ اس نے سوچا وہ اس لیے اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں سہارا دے سکے۔ ان کے ساتھ چل سکے — وہ انہیں اتنی راحت اور آرام دے گی کہ ان کی ساری تھکن اُتر جائے گی — ان کے لیے کھانا پکائے گی — کپڑے سیئے گی — پھر ان کے دکھ سکھ کا خیال رکھے گی اور وہ پھر زیادہ سکون اور اطمینان سے کام کر سکیں گے۔ جس طرح قمر آپا اور بھائی صاحب کام کرتے ہیں — ! وہ ان کی بیوی بن کر زیادہ اچھی طرح کام کر سکتی ہے — ابھی ہزاروں پابندیاں ہیں — بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مگر ان کی رفاقت اس کے ہاتھ مضبوط کر دے گی اور قدموں میں استواری پیدا کرے گی: آپا سچ ہی کہتی تھیں کہ "شادی اور محبت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہیں۔" وہ ایک مزدور رہبر کی بیوی بنے گی' اس کیلئے تکلیفیں اٹھائے گی۔ تمام دکھ جھیلے گی۔ اسے حوصلہ دے گی۔ امی اور ابا اس لیے یہ رشتہ پسند نہیں کرتے کہ وہ اس کے لیے گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں چاہتے ہیں نہیں — نہیں اسے تو کڑی دھوپ میں چلنا ہے — ! وہ جو اتنے بڑے بڑے کام کرنے کے خواب دیکھتی رہی ہے۔ ان کی مدد کے بغیر کچھ بھی نہ کر سکے گی اسے ان سے شادی کرنی چاہیے — خواہ ساری دنیا کو خفا ہی کیوں نہ کرنا پڑے — ! اس نے شاہدہ سے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں صرف ان ہی سے شادی کروں گی ورنہ کسی سے بھی نہیں — کبھی نہیں — !"

شاہدہ نے اسے ہمدردی سے دیکھا — ! "سوچ لو — ان پر تو انگریزی سرکار مہربان رہتی ہے۔ زیادہ تر تو سرکار کے ہی مہمان رہتے ہیں — "

"ہاں اسی لیے تو میرا ان سے شادی کرنا بہت ضروری ہے۔"

"سوچ لو — ورنہ تمہارے اور بھی اچھے رشتے ہیں' بڑی خالہ کے صاحبزادے بھی بیٹھے ہیں' بیچارے نے اب تک تمہارے فراق میں شادی نہیں کی' اور پھر ان کے علاوہ بھی — شاہدہ نے چند ایسے نام لیے جن کی سماجی حیثیت اور دولت سے وہ مرعوب تھی — ! اسے غصہ آ گیا۔ "میں سرکار کے مہمان سے شادی کروں گی' انگریزی سرکار کے خادم سے نہیں — بڑی خالہ کو اپنے بیٹے کا عہدہ مبارک ہو۔

آخر انہوں نے آئی۔ سی۔ ایس کیا ہے' انہیں رشتوں کی کیا کمی ہے۔ دو چار برس بعد شاید ولایت سے میم لے آئیں۔ مجھے ان سے نفرت ہے وہ ساری زندگی میرے انتظار میں گزار دیں' تب بھی میں ان سے شادی نہیں کروں گی" اور پھر اسے جانے کیوں رونا آگیا۔ شاہدہ نے اُسے گلے لگایا "میرا خیال ہے تمہارے لئے سب سے موزوں ایک ہی شخص ہے' اور وہ قاسم۔ !تم دونوں ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے ہو۔۔"

وہ ہنس پڑی "قاسم ۔۔ وہ تو ذرا سا بچہ ہے"

اور پھر عمر میں بڑا ہونے کے باوجود بھی میں نے اس سے ہمیشہ چھوٹے بھائیوں کا سا برتاؤ کیا ہے۔

عجیب ہو بھلا قاسم ۔۔ وہ بہت اچھا ہے مگر اس سے شادی کی کیا تک ہے؟"

شاہدہ چپ ہو گئی۔۔ اسے معلوم تھا کہ شاہدہ صرف اسی آدمی سے شادی کرے گی' جو اس پر ذہنی طور پر چھا سکے ۔۔ جو اسے بہت بڑا معلوم ہو ۔۔ جس کی وہ عزت کر سکے ۔۔ !

شاہدہ نے ہمدردی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "دوست تمہارے انتخاب کی ہر سمت سے مخالفت ہو گی۔ ایک تو بڑی خالہ نے اپنی مہم دوبارہ شروع کر رکھی ہے ۔ پھر اب خالہ بھی تمہاری شادی کے مسئلہ پر سنجیدہ ہیں۔ مگر کاش کہ وہ تمہیں سمجھ سکیں۔ میں بساط بھر کوشش کروں گی ۔۔ مگر مجھے امید کم نظر آتی ہے"

جب ہر طرف سے اس کی پسند کی مخالفت ہوئی تو اس ضدی لڑکی نے طے کر لیا کہ وہ اگر شادی کرے گی تو صرف اسی آدمی سے ۔ !

اسے اپنی جدوجہد کی طرح اپنی شادی بھی ایک مقدس فرض معلوم ہوئی۔ اگر یہ شادی نہ کر سکی تو پھر کوئی کام بھی نہ کر سکے گی۔ یہ اس کے لیے چیلنج ہے۔ امتحان ہے اور وہ اس امتحان میں پورا اترنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ !

ابو اس سے کتنا پیار کرتے تھے۔ وہ اس کے سب سے اچھے دوست تھے۔ مگر اب وہ رفاقت جس میں بے تکلفی بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک عجیب سا حجاب ان کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ان سے بات کرتے ہوئے کتراتی تھی اور وہ کچھ سمجھانا چاہتے ہوئے بھی سمجھا نہیں سکتے تھے۔ شاید دونوں ایک دوسرے کی مجبوری سمجھتے تھے ۔ اور اس لیے خاموش رہنے لگے تھے ۔ ! اس کا دل عجیب طرح کے دکھ سے بھر جاتا تھا۔ ابو اُسے کتنے پیارے ہیں' ان کی مرضی کے خلاف قدم اٹھا کر کیا وہ خوش رہ سکے گی۔ آخر وہ ان کی لاڈلی بیٹی ہے' اگر وہ اس کے لیے سکھ چاہتے ہیں تو ٹھیک ہی تو ہے ۔ اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو زندگی وہ اپنے لیے چن رہی ہے اس میں سکھ نہیں ملے گا ۔ ! لیکن پھر ہمیشہ کی طرح ان سب نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ بچپن سے اسی طرح اپنی ہر بات منوانے کی عادی تھی ۔ !

وہ سب اس کے بیاہ کی تیاریاں کرنے لگے مگر اس طرح جیسے کوئی پجاری اپنی عزیز ترین شے دیوتا کی بھینٹ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ کوئی بھی خوش نہ تھا۔

وہ اپنی ماں کے چہرے پر خوف کے بادل دیکھتی ۔ وہ انہیں سمجھانا چاہتی تھی کہ اصول اور نظریات اس کی زندگی میں زیادہ اہم ہیں ان کی خاطر ہی وہ شادی کر رہی ہے۔ وہ صرف خالی خولی مزدوروں اور کسانوں کی ہمدردی نہیں رکھتی بلکہ وہ خود بھی فاقے کر سکتی ہے' تکلیف برداشت کرنا چاہتی ہے تاکہ خیال اور عمل میں کوئی فاصلہ اور تضاد باقی نہ رہے ۔ اُس نے اپنی ماں کو یقین دلایا کہ ہم دونوں کا نصب العین

ایک سے اس پہلے مستقبل سے خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ اسے یقین تھا کہ اپنے عظیم ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر جب وہ نیا سفر شروع کرے گی تو منزل اور قریب آجائے گی۔

اس کی خوشی — ! ان سب کی خوشی نہ تھی وہ ان سب کی مجبوری تھی — اور یہ احساس اسے اپنے گھر میں اجنبی بنائے دے رہا تھا۔ وہ چوہوں کی طرح اپنے کمرے میں دبکی رہتی۔ ماں باپ کی رائے پر اپنی مرضی مسلط کرکے اسے ان کا سامنا کرنے کی ہمت جیسے نہیں رہی تھی۔ وہ خیالوں کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتی — !

جب حقیقت کا سامنا کرتی تو سب کے فکرمند چہرے دیکھ کر سوچتی کہ متوسط طبقہ مزدوروں اور کسانوں سے زبانی ہمدردی ہی کر سکتا ہے، جہاں حقائق کا سامنا ہوا ہمت جواب دے جاتی ہے اور جب اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ ایک ایسے انسان کا ہاتھ پکڑ رہی ہے جس کے خیال اور عمل میں تضاد نہیں ہے تو اسے روحانی خوشی ہوتی۔ وہ سوچتی وہ کسانوں اور مزدوروں کا رہنما ہے — اتنا بڑا ادیب ہے — انقلابی قوتوں کا سب سے پرجوش نمائندہ — اب وہ بھی نڈر اور بے خوف ہو کر اس کے ساتھ ایک نئی جدوجہد شروع کرے گی۔ وہ اس انجان آدمی کے لیے جو جذبہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے پرستش بنتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے جیون ساتھی کی کتابیں پہلے بھی پڑھی تھیں، مگر اب تو جب اس کا جی گھبراتا وہ اس کی کتابیں پڑھنے لگتی۔ کتابوں کے سب ہی اچھے جملے اسے زبانی یاد ہو گئے تھے — !

وہ سوچتی کہ اس کی عبارت کتنی سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ضرور زندگی میں بھی ایسے ہی سلجھے ہوئے اور بھلے مانس ہوں گے۔ اس کی کتابوں میں وہ اس کا وجود ڈھونڈھ رہی تھی — اور وہ اُسے اپنے بہت قریب پاتی تھی۔ اکثر تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ اُسے اچانک وہ شدید محبت اس آدمی سے ہو گئی ہے۔ جس محبت کا وہ اب تک مذاق اڑاتی آئی ہے — ! شائد محبت واقعی اب اس سے بدلہ لے رہی ہے — ! پھر وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ڈانٹ پلاتی شاید یہ دوسروں کی محبت کا مذاق اڑانے کی سزا ہے جو اب دن رات وہ اپنے تصورات میں ایک شخص کو بسائے پھرتی ہے۔ کیا وہ اب فرزانہ کے راستہ پر جا رہی ہے — ! وہ کبھی کبھی گھبرا کر سوچتی — ! وہ اپنے خیالوں میں اس سے ایک لمحہ کے لیے بھی تو الگ نہ ہوتی تھی۔

ایک شام قاسم اس سے ملنے آیا۔ وہ اس سے کالج میں بھی سینئر تھا اور اب فلسفہ میں ایم اے کرنے کے بعد کالج میں پروفیسر ہو گیا تھا۔ قاسم بہت خاموش اور سنجیدہ تھا۔ رؤفہ کو احساس ہوا کہ شاید قاسم کی ہمدردیاں بھی اس کے گھر والوں کے ساتھ ہیں، وہ بھی اس رشتہ پر خوش نہیں ہے

"قاسم چپ چپ کیوں ہو — !"

"سوچتا تھا کہ بہت سی باتیں کروں گا۔ مگر اب کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے — !"

"قاسم — !" وہ کچھ نہ بول سکی۔

"رؤفہ اتنا اندھیرا نظر آرہا ہے کہ اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔"

اس نے حیرت سے قاسم کو دیکھا۔ "آخر کیوں — ؟"

"میرا خیال تھا کہ تم یہ بات جانتی ہو کہ کیوں — !"

"نہیں قاسم — مجھے ایک عرصہ سے تمہارے متعلق کوئی خبر نہیں ملی" وہ یکایک اس نئے انکشاف سے اتنی بھونچکی سی رہ گئی کہ اس نے قاسم کی بات کو سمجھنا ہی نہ چاہا — اور تجاہلِ عارفانہ اختیار کرنا پڑا —

"رؤفہ — !" اس نے قاسم کی آنکھوں میں دیکھا — ! کئی دفعہ اسے یہ احساس ہوا تھا کہ یہ آنکھیں اس سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ مگر اس نے کبھی ان کی طرف اس طرح نہ دیکھا کہ وہ پڑھ سکتی — !

اتنے بادل ہیں — کہیں بارش شروع نہ ہو جائے — لیکن نہیں قاسم بہت مضبوط اور خوددار انسان ہے۔

"سنا ہے تمہاری شادی ہو رہی ہے"

"تم نے مجھے مبارکباد بھی نہیں دی"

"کیا تم بہت خوش ہو — ؟ سچ مچ خوش ہو — ؟"

"ہاں اور کیا — میں نے سب کی مرضی کے خلاف اپنے لیے جیون ساتھی چنا ہے — !

"ہاں میں جانتا ہوں وہ بہت بڑا آدمی ہے — بہت بڑا مقرر ہے، ادیب ہے — لیڈر ہے — واقعی اس کی صلاحیتوں کا ہم بھی لوہا مان گئے — !"

"اس قدر طنز سے کیوں تعریف کر رہے ہو — میں دماغ کی دولت کو ہی اصل دولت سمجھتی ہوں — "

"اور دل کی دولت — ؟"

"دل کی — دل کی بھی دولت ہوتی ہے — ؟"

"رؤفہ ایک عرصہ سے کوئی دیوانہ اس بھول میں مبتلا تھا کہ وہ تمہیں پالے گا۔ میں نے تمہارے اعتماد کو محبت نہیں سمجھا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ اعتماد اور دوستی تمہیں میرے قریب لے آئے گی — "

"قاسم تم میرے سب سے اچھے دوست ہو ! مگر زندگی بھر کا ساتھ — !

جس شخص کے ساتھ میں بیاہ کر رہی ہوں، اس کے اور میرے درمیان برسوں کی ذہنی قربت ہے، اس کا سوچا اور لکھا ہوا ایک ایک جملہ مجھے اپنے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے"

"اس قابل اور لائق آدمی نے واقعی ہم سب کا دل موہ لیا تھا۔

ہم نے اس کے استقبال کی کتنی تیاریاں کی تھیں — اپنے کالج کو اس کے لیے سجایا تھا — اسے پھولوں کے ہار پہنائے تھے — اور تم جب ہم سب کے ساتھ اسے محبت اور عزت سے دیکھ رہی تھیں تو میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تمہارے جذبات اس کے لیے کچھ اور ہیں — ہم سب سے مختلف — ؟"

"اس وقت میں نے بھی اسے ان ہی نظروں سے دیکھا تھا جن نظروں سے تم سب دیکھ رہے تھے۔ مگر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ زندگی کے لمبے سفر میں مجھے اپنا ساتھی بنانا چاہتا ہے تو پھر میں نے اس کے لیے عجیب و غریب محبت محسوس کی — مجھے ایسا لگا کہ جیسے مجھے جنم جنم سے اس کا انتظار تھا — !"

"مگر رؤفہ سوچو تو — وہ مشکل سے ایک ہفتہ یہاں رہا ہے۔ تم چند گھنٹے بھی اس کے ساتھ نہیں رہی ہو — کتابوں کی اور بات ہے شخصیت کے اور بھی تو پہلو ہو سکتے ہیں — جو تم نہیں دیکھ سکتیں —"

وہ برا مان گئی۔ "تو کیا تمہارا خیال ہے اتنے پیارے آدمی کی شخصیت کے تاریک پہلو بھی ہو سکتے ہیں ؟"

"برا نہ مانو — تم تو شادی اور محبت ان سب باتوں کا مذاق اڑایا کرتی تھیں، اور اب اتنی جذباتی ہو گئی ہو۔"

"قاسم وہ آدمی اتنا اونچا اور اتنا پیارا ہے۔ میں اس کے متعلق کوئی بری بات سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں — ! اور محبت — ! محبت تو ایک طویل رفاقت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اکٹھے دکھ سکھ جھیلنے سے — تم جسے محبت سمجھ رہے ہو — وہ شاید بس دوستی کا جذبہ ہے، اور میں تمہاری دوستی کی قدر کرتی ہوں —"

"روفی میں ادیب اور شاعر نہیں ہوں مجھے خوب صورت جملے کہنے نہیں آتے مگر میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے دل کی آواز ہوتی ہے۔ میں تمہاری محبت کو محض دوستی کا جذبہ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو اسے اپنی زندگی سمجھتا ہوں — !"

وہ ہنس پڑی "قاسم خدا کے لیے فلمی ہیرو کے سے جملے نہ بولو۔

پھر تم نے مجھ سے یہ سب باتیں پہلے کیوں نہیں کہیں — میں نے تو تمہارے بارے میں ہمیشہ اس طرح سوچا ہے جس طرح اپنے بھائیوں کے بارے میں سوچتی ہوں — ہم اتنے عرصہ قریب رہے۔ اکٹھے کام کیا۔ فیڈریشن میں کوئی اور تمہارے اور شاکر کی طرح میرے قریب نہ آ سکا۔ ہم تم تو جیسے بالکل ایک گھرانے کے فرد بن گئے تھے۔ میں پھر کیسے — کیسے اس طرح سوچتی ! اور جو جذبات آج میں کسی اور کے لیے محسوس کر رہی ہوں، وہ میں نے آج تک کسی کے لیے محسوس نہیں کیے تھے — ! اور تم نے یکایک مجھے پریشان کر دیا — !"

"سچ ہی تو ہے — واقعی تمہیں پریشان نہ کرنا چاہیے — مجھے خاموش ہی رہنا چاہیئے تھا اور اب تک میں خاموش ہی تھا۔ اس لیے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس موضوع پر تم سے کیسے بات کی جائے — ہم ساری دنیا کی باتیں کرتے تھے مگر یہی بات مجھ میں تم سے کہنے کی ہمت نہ تھی — اس لیے کہ بقول فرزانہ تمہیں محبت سے ہی جو نفرت تھی" !

"قاسم — تم سچ کہتے ہو۔ اگر تم یہ بات آج سے بہت پہلے کرتے تو میں تمہیں بھی بہت برا سمجھتی — ! خدا جانے اس نے میری شخصیت کو کس طرح بدل دیا ہے — مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں مجھے اس سے محبت ہی تو نہیں ہو گئی ہے — ! وہ میرے تصور میں اتنا اونچا اور قابل پرستش ہے —"

"خدا کرے تم خوش رہو — !

"قاسم تم میرے بہت اچھے دوست ہو — خدا کے لیے میرے دوست رہو، مجھے سہارا دو — اب تم ہم دونوں کے مشترکہ دوست ہو گئے ہو"

"تم دونوں کا مشترکہ دوست ؟"

اس کے ہونٹوں پر وہی پرانی مسکراہٹ لوٹ آئی، اس کا جی چاہا وہ سدا یونہی مسکراتا رہے — !

"قاسم میں تمہارے لیے بہت اچھی دلہن تلاش کروں گی گوری خوب صورت جیسے چودھویں کا چاند —"

"شکریہ —"

"برا مان گئے ؟"

"میرے ساتھ آکر اب چاند کو گرہن لگ جائے گا۔ اب تو میں چاند اور تاروں کی دُنیا سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میں کسی کو اتنے برسوں تک اپنے تصور میں ساتھ لیے رہا اب میں چاند تاروں کی دنیا میں کس دل سے تلاش کو نکلوں۔ یہ فریب مجھ سے نہ ہوگا۔"

"میرے خدا۔ ! قاسم تم سچ مچ مجھ سے اتنی محبت کرتے رہے ہو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ ! اس نے صرف چند دنوں میں ہی مجھے ایسے جیت لیا جیسے میں اس کی ہی تھی۔ اسی کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ ! قاسم میں نے کبھی کسی کو پل بھر کے لیے بھی اپنے تصور میں جگہ نہیں دی تھی، پھر بھی میرا کوئی نامعلوم ہیرو تھا۔ ایک آئیڈیل انسان۔ ایک انجان چہرہ۔ اسی تمام عرصہ میں شاید میں اس سے محبت کرتی رہی۔ اور اس کا انتظار کرتی رہی۔ اور پھر اچانک ایسا لگا کہ وہ خود میرے پاس آگیا !"

"خدا کرے تم کو اپنے ہیرو کے ساتھ ہمیشہ خوش رکھے۔"

"آج بہت دعائیں دے رہے ہو۔ یہ طنز تو نہیں ہیں۔ ؟"

"دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا ہے۔ اسے طنز نہ کہو۔"

مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں شاید تم سے اب نہ مل سکوں میں کچھ عرصہ کے لیے گاؤں جا رہا ہوں۔ وہاں خاموشی سے کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"کام۔ ؟"

"ہاں میرا ارادہ تھیسس لکھنے کا ہے۔ لیکن یہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے وہاں جا کر بھی کچھ نہ کر سکوں۔"

"قاسم ایسی باتیں نہ کرو۔ میں چاہتی ہوں تم بہت بڑے آدمی بنو۔ !"

"بڑا آدمی۔ ؟"

"ہاں بہت بڑے اور اچھے آدمی۔ ابھی تم آدمی ہی کہاں۔ ! میری طرح بچہ ہو۔ بلکہ میرا خیال ہے میں تم سے عمر میں چھوٹی ہوتے ہوئے بھی بہت سی باتوں میں زیادہ سمجھدار ہوں۔"

"ثابت تو یہی ہوتا ہے۔" وہ اداسی سے بولا۔

"مذفرہ ہم نے ہمیشہ اکٹھے کام کیا ہے اس لیے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"قاسم میں نے تو سُنا تھا کہ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"شاعروں اور ادیبوں کو دل ٹوٹنے سے فیضان ہوتا ہوگا خون دل و جگر میں ڈبو کر زیادہ خوب صورت الفاظ لکھ سکتے ہوں لیکن میں تو ہار گیا ہوں۔"

"قاسم۔ !"

"لیکن یہ ہار بھی مجھے جیت سے زیادہ عزیز ہے۔"

"تم تو کہتے تھے کہ مجھے خوب صورت جملے کہنے نہیں آتے۔"

"شکریہ کم از کم تمہیں یہ جملے خوب صورت تو لگے۔"

"اور سُنو۔ تم گاؤں سے جلد آنا۔ تمہیں میری شادی میں شریک ہونا پڑے گا۔ سوچو تو۔ تمہارے بغیر بھلا کیا مزا آئے گا۔

"قاسم ہنسا اس نے حیرت سے رفعت کی طرف دیکھا۔ "میرے بغیر تمہیں شادی میں کیا مزا آئے گا۔؟
عجیب باتیں کرتی ہو۔ اور خود کو بڑا عقلمند سمجھتی ہو۔"
"ہاں قاسم اس میں کونسی عجیب بات ہے ہر شخص کا جی چاہتا ہے اس کی خوشی میں عزیز دوست شریک ہوں۔
رقیہ اور سلمیٰ کو میں اتنے دور سے بلا رہی ہوں۔
فرزانہ بھی مع اپنے میاں اور بچوں کے آ رہی ہے اور شاکر وہ آتنا اچھا ہے وہ ضرور شریک ہوگا ——— مگر تم۔!"
"اچھا اب میں چلتا ہوں ———"
"ٹھہرو ——— تو آج تمہیں چائے پلانا بھی یاد نہ رہا اتنی باتیں نکال لیں ———"
"نہیں ——— رہنے دو ——— جب کبھی آتا ہوں تم چائے ضرور ہی پلاتی ہو۔ اتنے سالوں میں میں تمہارے گھر سے چائے کی پیالی کے علاوہ اور کچھ لینے کا حقدار نہ ہوا۔"
"پھر وہی باتیں۔ کاش تمہیں دوست نہ سمجھا ہوتا ——— بھوت سمجھا ہوتا اور تم سے بھی دور بھاگ جاتی ——— نفرت کرتی مگر اب ———"
"تمہاری مہربانی اور دوستی کا احسان مند ہوں، واقعی جو تم نفرت ہی کرتیں تو پھر کیا رہ جاتا ———" وہ کھڑا ہو گیا ——— اب میں چلتا ہوں"
"قاسم برا نہ مانو۔ مجھے سمجھو ——— تم اتنے عرصہ سے مجھے جانتے ہو اگر تم ہی نہ سمجھے تو کون سمجھ سکے گا۔؟
"رفعت خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے" وہ چلا گیا اس کی تیز نظریں دیر تک اس کے انگ انگ میں چبھتی رہیں ——— آخر وہ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہا تھا جیسے ہم اب نہیں ملیں گے۔ اس کا رونے کو جی چاہا۔ سب ناراض ہیں۔ سب روٹھ گئے ہیں۔ میرا کوئی دوست نہیں۔ ہمدرد نہیں جس سے دو باتیں بھی کر لوں۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی امی نے آ کر کہا آج قاسم تمہارے پاس اتنی دیر تک بیٹھا رہا اور تم نے اسے چائے کے لیے بھی نہیں روکا۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی تھی۔ کیسا اچھا لڑکا ہے ——— ہم سب کو کتنا پسند تھا ——— !"
اس نے تعجب سے امی کو دیکھا۔ وہ واپس چلی گئیں ——— وہ اس قدر اداس کیوں ہیں، کیا انہوں نے قاسم کی باتیں سن لیں ——— یا وہ جانتی تھیں ——— میرے خدا ——— ! لیکن میں کیا کروں، میں جس طرح انہیں پوج رہی ہوں میں نے اس طرح آج تک کسی کو نہیں پوجا ——— !
"اس کا ہونے والا جیون ساتھی اس کے تصورات پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ وہ اپنا وجود تک بھلا بیٹھی تھی۔ اس کی کتابیں پڑھتے پڑھتے خیالوں کی دنیا میں کہیں دور چلی جاتی۔ اپنے خیالوں میں اس سے پہروں باتیں کیا کرتی ——— اس کی کتابوں میں جو رنگین جملے نظر آتے لگتا کہ یہ سب باتیں وہ اسی سے کہہ رہا ہے۔ اس کی کہانیوں کی ہیروئن وہ خود ہے" اور وہ عشق و محبت کا مذاق اڑانے والی عجیب لڑکی شدید قسم کی جذباتیت کے ساتھ خیالوں کی رنگین وادی میں چھپ گئی تھی۔ اس نے اپنی تنہائی کو اس کے تصور سے آباد کر لیا تھا۔ وہ اس سے کہتی "میں تمہیں پانے کے لیے ساری دنیا کھو سکتی ہوں۔ تم مجھ پر کس طرح غالب آ گئے ہو ——— تمہاری شخصیت اور تمہارا فن ! میں نے زندگی بھر کس طرح تمہارا انتظار کیا تھا۔ مجھے چاند تاروں کی دنیا میں بھی تم نظر آتے تھے ——— ہوائیں تمہاری ہی تلاش میں آوارہ دکھائی دیتی تھیں اور میں تاریک راتوں میں ایک ننھا سا چراغ جلائے بیٹھی تھی۔ تمہارے انتظار میں ——— اور پھر تم آ گئے ——— ! میرے راجا ——— ! میرا دل بھی میرے جسم کی طرح کنوارا ہے۔ شیشے کی طرح بے داغ اور چمکیلا ——— اور اب اس میں تمہارا چہرہ کتنا صاف نظر آ رہا ہے۔ ! میرے ساجن کسی کا تصور بھی ——— یہاں سے نہیں گزرا تھا ——— ! اور اب جب تم آ گئے ہو تو زندگی

کتنی خوب صورت ہو گئی ہے ــ! اب سب چیزیں میری سمجھ میں آنے لگی ہیں تمہاری تخلیق کی ہوئی ان چیزوں سے مجھے ایسا پیار محسوس ہو رہا ہے جیسے ان کی تخلیق میں میرا بھی حصہ ہو ۔! کسی دن میں تمہاری کسی نئی اور خوب صورت تخلیق میں رنگ بھر دوں گی میری دنیا میں دیوالی کی سی روشنی ہو گئی ہے ــ اور اب میرا جی چاہتا ہے کہ ہاتھوں میں چراغوں سے بھرا تھال لے کر پیروں میں پائلیں باندھ کر ناچوں ــ! ناچتی رہوں ــ! آشاؤں کی کلیوں کو تمہارے قدموں میں ڈال دوں ــ اور تمہارے قدموں کی مہک سے وہ پھول بن جائیں ۔ اور پھر تم میرے تھال میں سے سیندور اٹھا کر میری مانگ میں لگا دو ــ اور میں اپنے ماتھے پر چمکتی ہوئی سرخ بندیا کو تمہارے قدموں پر جھکا دوں اور اپنے سہاگ کو غرور سے دیکھوں!

میرا کیا کیا جی چاہتا ہے ــ میں کیسی عجیب عجیب باتیں سوچا کرتی ہوں!

کبھی کبھی وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں اتنے رنگین سپنے دیکھنے پر شرما جاتی ــ! بھلا اگر فرزانہ اس حالت میں مجھے دیکھے تو کیا کہے ــ! وہ شاید کہے گی تم نے اپنی شخصیت پر خود ہی پہرا قائم کر رکھا تھا ۔ تمام رنگین خیالوں اور سوچوں کو مقفل کر دیا تھا ۔ اور آج جب سارے تالے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے ہیں تم کتنی بے بس ہو ۔! انہیں میں فرزانہ سے کہوں گی "یہ سب رنگینی ایک اجنبی کی یاد اپنے ساتھ لائی ہے ۔ ساری شادابی نکہت اور حسن اس کی دین ہے ــ میری جھولی تو خالی تھی ۔

وہ اس سے کہتی "میرے محبوب جب تم میرے پاس آؤ گے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہو گے کہ تم تمہارا فن ــ تمہاری دنیا سب چیزیں میری ہی منتظر تھیں تو مجھے کیسا عجیب لگے گا ۔ اس وقت کہیں میں ساری شرم و حیا بھول کر ہنس نہ پڑوں ۔ لیکن نہیں میں ہنسوں گی ۔ میں سر جھکائے بیٹھی رہوں گی ۔ اپنا گھونگھٹ بھی اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گی ۔ جب تک تم اسے اپنے ہاتھ سے نہ الٹو ۔! میں بہت شرمیلی دلہن بنوں گی ــ ایسی ہی جیسی بچپن میں دیکھا کرتی تھی ۔! مجھے دولہا اور دلہن ہمیشہ سے پسند ہیں ۔ ان روائتی دولہا اور دلہن میں مجھے بڑی تقدیس نظر آتی ہے ۔ تم اگر یہ باتیں سنو تو ہنس پڑو ــ! اسے بچپن کہو ــ تمہارے مقابلے میں تو میں بچہ ہی ہوں ــ میں تمہاری ذہنی رفعتوں تک کیسے پہنچ سکتی ہوں ۔ کاش تم میری مدد کرو ــ اور میں کسی دن تمہارے قابل بن سکوں ــ میں تمہارے قدموں کی خاک کی بھی برابری نہیں کر سکتی ــ!"

کبھی وہ یہ سوچتی کہ جب وہ پہلی بار اس سے ملے گا تو کیا باتیں کرے گا، اس کی کہانیوں میں محبت بھرے جو جملے تھے اس نے انہیں کئی دفعہ پڑھا ۔ اور پھر سوچا کہ جو باتیں وہ کرے گا وہ ان باتوں سے زیادہ خوب صورت ہوں گی ۔ ان میں سچا پیار ہو گا ۔ اس لیے کہ یہ باتیں تو کاغذی کردار کر رہے ہیں ۔ اور وہ باتیں جو اس کے منہ سے سنے گی وہ تو اس کی اپنی باتیں ہوں گی ــ ان کرداروں کے خالق کی باتیں ــ! خدا جانے وہ اسے کن نظروں سے دیکھے گا اور اس کی کیا چیز پسند آئے گی ۔ بچپن سے ہی وہ اپنی آنکھوں اور بالوں کی تعریفیں سنتی آ رہی ہے ــ دانتوں کو بھی سب موتیوں کی طرح کہتے ہیں ــ اور اس کی سہیلیاں اس کی خوب صورت مسکراہٹ کی گرویدہ ہیں ــ انہیں تو اس کی ہر چیز پسند ہے ۔ فرزانہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ خدا کے لیے اتنے خوب صورت بالوں کی چوٹی نہ بنایا کرو ۔ ساری ریشمی لہریں چھپ جاتی ہیں ۔! وہ ہنس پڑتی ۔ اس لیے کہ اس نے اتنی ڈھیر مصروفیتیں مول لے رکھی تھیں کہ بالوں کی آرائش کی فرصت ہی کہاں تھی ــ بس دوڑے بھاگتے چوٹی گوندھنا ہی سب سے آسان لگتا تھا ۔

کبھی اسے بیٹھے بیٹھے قاسم کا خیال آتا ۔ وہ کتنی بہت سی باتیں کہہ گیا ہے ــ! چند روز کے لیے تو ذہنی سکون درہم برہم سا ہو گیا تھا ۔ اسے یہ سوچ کر تعجب ہوتا کہ قاسم اس تمام عرصہ میں اس سے اتنی شدید محبت کرتا رہا ہے ۔ اور پھر جب اس نے سوچا تو اسے قاسم کی بہت سی باتیں یاد آئیں

ایک دفعہ شاہدہ نے اس سے کہا کہ " رؤفہ ان فیڈریشن کے دھندوں میں تمہیں حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا، البتہ تم نے اپنا رنگ گندمی کر لیا ہے" قاسم تنک کر بولا تھا " سفید پلاسٹر سا رنگ بھی کوئی رنگ ہوتا ہے۔ ذرا آئینہ دیکھو بالکل ایسی لگتی ہو جیسے دیوار کی قلعی۔ اور پھر اس نے رؤفہ کی طرف دیکھ کر کہا تھا اور گندمی رنگ تو۔ میرا خیال ہے آدم نے شیطان کے بہکانے میں گندم نہیں توڑا بلکہ گندم کے رنگ نے اسے بہکا دیا ہو گا۔" شاہدہ برا مان گئی تھی۔ وہ اپنے سفید رنگ پر سچ مچ ناز کرتی تھی۔ پھر قاسم نے اس سے معافی مانگی " شاہدہ میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ تم تو اس شہر کی سب سے سفید لڑکی ہو" سب اس کی باتوں پر خوب ہنسے تھے۔ نہ جانے وہ کیسا رنگ پسند کرتے ہیں مگر ان کا رنگ بھی تو گورا نہیں ہے۔ قاسم کا رنگ تو اتنا صاف ہے کہ وہ اسے اکثر سفید دیو کہا کرتی تھی۔ وہ دیو کی سی پھرتی سے فیڈریشن کے کام کرتا تھا۔ لیکن اس سفید دیو کو تو سانولے لوگ پسند ہیں خود سفید جو ہوا۔

رؤفہ کے دل میں اکثر رونے کی شدید خواہش ہوتی۔ اس کا دل بوجھل سا ہونے لگتا۔ ایک منزل چھوڑ کر دوسری منزل پر جانے سے دکھ تو قدرتی ہوتا ہے۔ خواہ نئی منزل کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ پرانی منزل کے ساتھ تو زندگی کے انمول دن اور راتیں وابستہ ہیں، بھائیوں کا پیار ——— ماں باپ کا لاڈ۔ اور محبت ——— دوستوں اور ساتھیوں کی محبت ——— پھر سب کو چھوڑ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف جانا اور کسی اجنبی کا ہاتھ تھام کر اس کے گھر کو اپنا گھر بنانا۔ اور اپنے گھر کو یوں چھوڑ دینا جیسے وہ ایک سرائے تھی جس میں اب تک رہتے رہے ہوں۔ اجنبی راہوں کا انجانا سا ڈر محسوس ہوتا۔ مگر یقین اور محبت سب چیزوں کو آسان بنا دیتی ہے۔ اس لیے وہ آنسو پونچھ کر مسکرانے لگتی۔ اور اپنے تصور میں کسی کو قریب پا کر کہتی " جوں جوں ملن کے دن قریب آ رہے ہیں، میری عجیب حالت ہوئی جاتی ہے۔ ساحل سامنے ہے ——— کشتی ہی ناؤ ہے ——— ملاح کو دور سے ہی دیکھا ہے ——— اور راہ طویل اور دشوار ہے۔ لیکن ملاح بڑا بھلا مانس دکھائی دیتا ہے، اور اب اگر راہ میں طوفان آ جائے تو مجھے پروا نہیں ہے۔ یا میں اس کے ساتھ مر جاؤں گی یا ہم اکٹھے کنارے پر جا ئیں گے۔"

وہ اس اجنبی ملاح سے کہتی "جس طرح ہوائیں ساکت ہو جاتی ہیں اور روئی کے دھنکے ہوئے گالوں کی طرح برف دھیرے دھیرے پہاڑوں اور وادی کو چھوتی ہے ایسے ہی دل میں چپکے چپکے ——— دھیرے دھیرے تمہاری یاد آتی تھی۔ اب وہ دن بہت قریب آ گیا ہے جب میں تم سے بھی یہ سنوں گی کہ تم نے کس کس طرح میرا انتظار کیا ہے۔ کیا تم بھی میرے بارے میں اسی طرح سوچا کرتے ہو؟"

ارے یہ کیا میرے کانوں میں شہنائیوں کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ تم ہنس رہے ہو۔ بھلا شہنائیوں کا تمہاری آمد سے کیا تعلق ——— تم نئے زمانے کے ترقی پسند لوگ تو ان باتوں کا مذاق اڑاتے ہو ——— ان ریت رسموں کا ——— باجوں تاشوں کا ——— اور اسی لیے تم دولہا بن کر شہنائیوں کے ساتھ نہیں آئے ہو۔ نہ مشعلوں کا لمبا جلوس ہے ——— !

نہ ویسی بارات ہے جو میں کوٹھے پر چڑھ کر دیکھا کرتی تھی۔ !

سنا ہے تم ایک کار سے سرمئی سوٹ پہنے اترے ہو۔ چند کاریں اور ساتھ آئی ہیں۔ تم سادگی اور خاموشی پسند کرتے ہو۔ لیکن میں کیا کروں، یہ شہنائیاں شعور کے کسی گوشے میں ایسی بسی ہوئی ہیں کہ بیاہ اور برات کے ساتھ بجیں نہ بجیں سنائی ضرور دیتی ہیں۔ کاش میں تمہیں کار سے اترتا ہوا دیکھ سکتی۔ مجھے بارات دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے، اور یہ تو میری اپنی بارات ہے۔ لیکن بھلا اپنی بارات بھی کوئی دیکھتا ہے سب میرے پیچھے پڑ جاتے۔ شاہدہ ابھی میرے پاس دوڑی ہوئی آئی اور بولی " اتنا سنجیدہ اور بور دولہا ہے۔ کہ دولہا کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ بات

کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کسی سیاسی جلسہ کے لیے لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔" کیسی عجیب باتیں کرتی ہے۔ شاہدہ کہہ رہی تھی کہ ایسے سنجیدہ آدمی سے شادی کا یہ مطلب ہے کہ عمر بھر ایک ایسے اُستاد کے سامنے بیٹھ جائیں، جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو۔ خیر بی روفی خدا تمہارا محافظ ہو۔" اس کی باتوں پر مجھے بڑا غصہ آیا۔ "تم کھلنڈرے لڑکے تو ہو نہیں جو شاکر اور قاسم کی طرح قہقہے لگاؤ۔ مجھے تو تمہاری سنجیدگی پسند ہے۔ میں بہت منہ زور مشہور ہوں اچھا ہے اب مجھے بھی سنجیدہ بننا آجائے گا۔ اور ہاں سنو فرزانہ آئی ہے۔ میری سب ہی سہیلیاں آئی ہیں۔ اس کی شادی اسی چچازاد بھائی سے ہوئی ہے، جس سے اسے محبت تھی۔ وہ بہت خوش ہے۔ وہ ابھی تک ان پروفیسر صاحب کو بھی نہیں بھولی ہے، جنہیں نصاب کے موضوع پر سب سے زیادہ شعر یاد تھے۔ ! مجھ سے کہہ رہی تھی "خدا کا شکر ہے روفی کہ معیار پہ کوئی تو پورا اترا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اس دُنیا کا مرد تو اسے پسند آئے گا نہیں آسمان سے کوئی فرشتہ اُترے گا۔" میں ہنس پڑی۔ فرزانہ یہ بھی کہہ رہی ہے کہ وہ بہت پہلے ہی یہ بات سمجھ گئی تھی۔ جب تم نے مجھے آٹو گراف دیئے تھے۔ اوروں کو اتنی جلدی جلدی دے دیئے تھے اور تم کو جب وہ آٹو گراف دے رہے تھے، میں ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ تم سے رازداری کی باتیں بھی تو کی تھیں۔"

میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی اس قسم کی باتوں کا بُرا نہ مانا بلکہ اُلٹا شرما گئی۔ حالانکہ تم نے رازداری کی کوئی بھی بات نہ کی تھی، قاسم اور ریوتی کی موجودگی میں صرف اتنا ہی تو کہا تھا "سنا ہے آپ فیڈریشن کی سیکرٹری ہیں۔ آپ کے کام کی بہت تعریف سُنی ہے۔" مگر آج تو میں فرزانہ کی بات پر اس طرح شرما گئی جیسے سچ مچ تم نے رازداری کی باتیں کی ہوں۔ ایک زمانہ گزرا۔ اس نے قاسم کے متعلق کہا تھا "قاسم ضرور روفی سے محبت کرتا ہے۔" اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ اسے تھپڑ مار دوں۔ میں اس پر بہت خفا ہوئی تھی، اس کی ذہنیت کو ہزاروں باتیں سنائی تھیں۔ مگر وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ ! کاش میں اس وقت یقین کر لیتی۔ ! وہ واقعی ان معاملوں کو سمجھنے میں سب کے پَر کاٹتی تھی۔ ! قاسم میرے بیاہ میں نہیں آیا۔ شاکر اور ریوتی اور دوسرے سب ہی ساتھی میرے بھائیوں کے ساتھ بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ کتنا کام کر رہے ہیں اور قاسم نے آنے کی زحمت بھی نہ کی۔ ! سویرے شاکر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے قاسم یاد آ رہا ہے۔ "اس کا عزیز دوست جو ہوا۔ ! کاش وہ دیوانہ آجاتا۔ تو سب خوش ہو جاتے۔ !

جب نکاح کے وقت اس نے ہاں کہی تو اسے رونا آ گیا۔ کسی طرح آنسو نہ تھمتے تھے۔ وہ بہت روئی۔ رونا تھمتا نہیں تھا۔ ! یہ رونا ہر لڑکی کا فطری رونا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ "ہاں" کہتے ہی زندگی کا ایک خوب صورت اور مانوس باب بالکل ختم اور دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ ! اور اس دوسرے باب کے بارے میں نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کاتبِ تقدیر نے کیا لکھا ہے۔ ! اس کی ماں۔ سہیلیاں اور رشتہ دار عورتیں بھی اس کے ساتھ روتی رہیں، ان کو تو ایسا لگ رہا تھا کہ اب وہ کہانیوں کی شہزادی کی طرح اَن گنت مصائب اٹھانے اپنے شہزادے کے ساتھ جا رہی ہے۔ ! شہزادہ جو سیاست کے خارزار میں دشت نوردی کر رہا ہے، یہ رونا ہمدردی کا رونا تھا۔ ! مگر وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے اپنی پسند کی زندگی چُنی ہے، اور پسند کا ساتھی ہے رونے جا رہی تھی۔ ! اور پھر روتے روتے اس نے دل ہی دل میں دعائیں مانگیں کہ خدا اسے طاقت دے اور وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کر کے اور قابلِ فخر ساتھی بن سکے۔ اور ساتھ اس نے سوچا کہ وہ ان کی کاغذی ہیروئن سے تو زیادہ سمجھ دار ہے۔ پھر وہ کیوں گھبرا رہی ہے۔ ! کاغذی ہیروئن۔ ! وہ ہمیشہ دو راہے پر پھنس جاتی ہے۔ فیصلہ نہیں کر پاتی۔ ! مگر وہ تو مضبوط ارادے کی سچ مچ کی گوشت پوست کی لڑکی ہے جو فیصلہ کر سکتی ہے۔ ! اور اسے نبھا بھی سکتی ہے۔ اور یہ سوچ کر وہ روتے روتے مسکرا دی۔ !

جب وہ بیاہ کر نئے گھر میں آئی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ گھونگٹ میں نظریں جھکائے اپنی سسرالی عورتوں کے درمیان گھری ہوئی ان سب کی باتیں سُن رہی تھی۔! وہ سب دلہن پر صدقے واری جا رہی تھیں۔ اور اسے بہت پسند کر رہی تھیں۔ ان کی باتیں سُن کر اسے ایک انوکھا اور خوشگوار احساس ہوا۔ اور اس کے گالوں پر گہری سُرخی آ گئی۔ اپنے گھرانے سے بچھڑنے کے بعد اس کا دل غم سے ڈوبا ہوا تھا، مگر اب ایک نئی خوشی کے احساس نے اسے حوصلہ دیا۔! بار بار اس کے کانوں میں کسی نہ کسی خاتون کی آواز آتی "بڑی پیاری دلہن ہے، خدا نصیب اچھا کرے۔"

اس کی آنکھیں زیادہ رونے سے دکھ رہی تھیں مگر جب وہ اپنے متعلق اتنے پیارے پیارے جُملے سنتی تو اطمینان سے آنکھیں بند کر لیتی اور عجیب طرح کی تسکین محسوس کر کے آنکھوں میں ٹھنڈک سی محسوس کرتی۔!

اس کی ساس نے اسے کلیجے سے لگا کر پیار کیا۔! اسے اپنی ماں کا شفقت بھرا روپ ایک دفعہ پھر اپنے سامنے محسوس ہوا۔! اس نے سوچا آخر اُن کی ماں بھی میری ماں ہی ماں ہوئیں۔! پھر سب عورتیں چلی گئیں۔ ساس بھی ایک دفعہ اور اس کی صورت دیکھ کر اور پیشانی چُوم کر رخصت ہو گئیں۔

وہ تنہا رہ گئی۔! اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ دل بُری طرح گھبرانے لگا اور کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا کہ دل اتنی زور زور سے اچھل رہا ہے کہیں حلق میں نہ آ جائے۔! آخر وہ اس قدر گھبرا کیوں رہی ہے۔ وہ تو اتنے اچھے ہیں۔ اس نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمجھانا چاہا۔ کمرے کا خواب آفریں ماحول دیکھ کر وہ گم سم ہو گئی۔!

"روفہ" کسی نے اس کا گھونگٹ اُٹھا کر دیکھا۔ اس نے نظریں اوپر نہ اٹھائیں۔ وہ کانپ رہی تھی۔

"روفہ — میری طرف دیکھو۔" اس نے ہمت کر کے اپنی جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں مگر ان کی طرف نہ دیکھا بلکہ کھڑکی میں جہاں چاند کی روشنی نے ہالہ بنا رکھا تھا وہاں اس کی نظریں رک گئیں۔! اسی طرف اُس کے پاس ہی میز پر ایک بڑی سی تصویر رکھی تھی۔ خوب صورت عورت کی تصویر! اسے تصویر بہت اچھی لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو —" اس کو خاموش پا کر وہ سمجھ گئے۔

"اوہ یہ تصویر —" ان کے چہرے پر عجیب سا رنگ آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے تصویر کو اُلٹا کر کے رکھ دیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور سگریٹ پینے لگے۔ پھر آہستہ سے بولے "تم نے اس تصویر کی طرف اشارہ کر کے اچھا نہیں کیا —"

وہ ہمت کر کے بولی "یہ — یہ کس کی تصویر ہے؟"

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے — بڑی شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولے "روفہ تم تو اتنی اچھی لڑکی ہو — میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا —! میں نے اس لڑکی سے محبت کی ہے —!" وہ چپ ہو گئے۔

"آپ نے — آپ نے اس سے شادی کیوں نہیں کی —" اس نے ایسی لرزتی ہوئی آواز نکالی، جیسے وہ ڈوبتے ڈوبتے پاتال میں چلی گئی ہے — جہاں نہ سانس لیا جاتا ہے نہ بولا جاتا ہے —!

"ہمارے درمیان مذہب کی دیواریں حائل ہوگئی تھیں — وہ ہندو تھی —!"

"تو کیا آپ اِن دیواروں کو پھلانگ نہیں سکتے تھے — توڑ نہیں سکتے تھے — آپ کی کتابیں پڑھ کر تو اور لوگوں میں اتنی جرأت پیدا ہو جاتی ہے — کیا صاف اور سیدھا راستہ دکھائی دیتا ہے۔

اور آپ — آپ خود کچھ نہ کر سکے"

"میں کیا کرتا — میں مجبور تھا"

"آپ — آپ اُسے لے کر کہیں بھاگ جاتے"

"تمہارا مطلب ہے فرار — مگر لوگ کیا کہتے میری پوزیشن! یہ شہرت اور عزت —؟"

"آپ اس سے بیاہ کر لیتے پھر دیکھا جاتا"

"عجیب باتیں کرتی ہو تم"

"بھئی آج کل تو یہ چلن بھی فیشن ہے پھر آپ کو بیاہ کرنے میں کیا ڈر تھا — شادی تو گناہ نہیں ہے —"

"نہیں میں سیدھے راستہ پہ چلنا چاہتا تھا اور وہ بھی یہ نہ کر سکی"

"آپ نے کوشش تو کی ہوتی"

"رؤفہ وہ ظالم بہت خوش ہے وہ جو کل تک ایک غریب ادیب کی محبوبہ تھی — آج ایک مالدار آدمی کی بیوی بن کر بے حسی سے قہقہے لگاتی ہے — اور میں — مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اب زندگی زندگی نہیں ہے — اب تو اس لیے جینا ہے کہ سب ہی جیتے ہیں اور بزدل ہی خودکشی کرتے ہیں اس کا جی چاہا کہ کاش وہ اور ان کی محبوبہ دونوں ہی اتنے بزدل ہوتے —! تو آج وہ یہ باتیں نہ سنتی —!

پھر وہ آہستہ سے بولے" رؤفہ اب میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں، مگر ان بیتے ہوئے دنوں کی یادیں ہر وقت پھن اُٹھائے مجھے ڈستی ہیں —"

"شاید آپ نہ بھول سکیں — اور پھر جانے اس نے کیسے یکایک یہ سوال کیا" آپ نے — آپ نے مجھے شریکِ زندگی کیوں منتخب کیا ہے —؟"

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا — پھر آہستہ سے بولے" دنیا کی یہی ریت ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے میں اسے نہ پاکر بزدلوں کی طرح خودکشی کر لیتا —! اور زندگی میں شادی ایک بڑی ضرورت ہے۔ ہر شریف آدمی شادی کرتا ہے —! تم مجھے اچھی معلوم ہوئیں — تمہارا کام — جوش — ولولہ — مجھے محسوس ہوا کہ تم میرے ساتھ چل سکتی ہو —! اس لئے کہ جن اصولوں سے میں محبت کرتا ہوں تم بھی ان ہی اصولوں سے محبت کرتی ہو"

——" اوہ — یہ بات ہے مجھے آپ سے ہمدردی ہے آپ کی زندگی واقعی کس قدر ناکام ہے"

"محبت کی ناکامی زندگی کی ناکامی نہیں ہوتی"

انہوں نے بڑی ترقی پسند بات کہی — اس کا دل چاہا کہ وہ اتنے زور سے چیخ مارے کہ اس کی آنکھ کھل جائے — اور پھر اسے معلوم ہو کہ

وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہی تھی — مگر نہیں نہیں — یہ خواب نہیں ہے — ! یہ حقیقت ہے — ! اس نے سوچا کہ یہ بات آپ کہہ سکتے ہیں مگر وہ — وہ جس نے محبت ہی نہ کی ہو — اور جو محبت کرنا چاہتا ہو — وہ یہ بات کیسے سوچ سکتا ہے — ! اور پھر وہ کتنی بدل گئی۔ ساری شرم حیا۔ گھونگھٹ — ناز نخرے سب کچھ بھول گئی۔ اس نے اپنا گھونگھٹ ختم کر دیا اور سادگی سے بولی "وہ کیسی تھی — وہ لڑکی جسے آپ چاہتے تھے — ؟

وہ دوبارہ آہ بھر کر بولے "وہ بے پناہ خوبصورت تھی بلکہ یوں کہو کہ وہ خوب صورتی کی انتہا تھی —"

" اوہ —" وہ زخم خوردہ ہرنی کی طرح تڑپ گئی۔ مگر انہوں نے پروا نہ کی اور کہنے لگے "اس کا رنگ اتنا سفید تھا جیسے سنگ مرمر — اور اس کا دل بھی سنگ مرمر کی مورت جیسا نکلا — !"

روشنہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو پلکوں سے نکلنے نہ دینے کا ہزار جتن کر کے اس نے سوچا "آہ تم مجھے بھی سنگ مرمر کی مورت سمجھے — ! جس کے احساسات اور جذبات کچھ نہیں ہوتے — پتھر کی مورت ! جیسے میں مینا بازار سے گڑیاں خرید کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک دو بار دیکھ کر تم نے مجھے اُٹھا لیا — !

تم جو فنکار ہو — جو زندگی اور محبت کے نکتے کو سمجھتے ہو — تم جس کے سینے میں سب کا درد ہے۔ مظلوموں اور مجبوروں کا درد — ! تمہارے کاغذی کردار کتنے جاندار ہوتے ہیں، ان کی نفسیات پر کتنا عبور ہے — جیسے تم ان کے ساتھ سوچتے اور ان کے ساتھ چلتے ہو — مزدور اور کسان — ! اور عورت ؟

یہ بھی تو صدیوں سے پِسی جانے والی مخلوق ہے — یہ جنس کتنی مظلوم ہے کبھی تم نے سوچا ہے ! تم نے اپنی کتابوں میں اس کی بے بسی اور مجبوری پر تو آنسو بہائے ہیں مگر تمہاری ساری ہمدردیاں اپنی ہیروئن کے ساتھ کیوں ہوا کرتی ہیں، جو تمہارے ہیرو کی زندگی میں محبوبہ بن کر آتی ہے — ! تمہیں عورت کے کسی اور روپ سے ہمدردی نہیں ہے ! تم نے جب عورت کا ہاتھ پکڑا تو ایسے ہی جیسے گڑیا اٹھا رہے ہو، جیسے کسی بُت کو آرائش کے لیے لاتے ہو — یا پھر مشین کی خریداری کی ہے — جس طبقہ کو تم گالیاں دیتے ہو اس کی ذہنیت خود تمہارے اندر جھانک رہی ہے۔ تمہارے کاغذی کردار انقلاب کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور تم — تم زندگی کے اس موڑ پر ہار جاتے ہو، جب تمہاری زندگی کی مسرتوں کی راہ میں مذہب اور سماج حائل ہو جاتے ہیں۔ تم اپنے لیے نہیں لڑ سکے — تم دوسروں کے لیے کیا لڑو گے ؟

تم بزدل ہو — بُزدل !

اس کے سینے میں ایک طوفان امنڈ رہا تھا — وہ ان سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر کچھ بھی تو نہیں بولی بس سر جھکائے سوچتی ہی رہی۔ جس آدمی کو وہ دور سے دیوتا سمجھ رہی تھی آج وہ اُسے بزدل اور خود غرض معلوم ہو رہا تھا — وہ اس سے کہنا چاہتی تھی، پوچھنا چاہتی تھی کہ تم نے آخر مجھ سے شادی کیوں کی ہے — ! جب تم محبت کے دو بول بھی نہیں سُنا سکتے تھے — ! تم نے کس خود غرضی سے اپنے دکھ کا راگ چھیڑا — تمہیں ایک لمحہ کے لیے بھی آشاؤں کی ان کلیوں کا خیال نہ آیا جو کِھلنا چاہتی تھیں۔

تم کتنے ظالم ہو — ! وہ سر جھکائے سوچتی رہی اور مُنہ سے کچھ بھی تو نہ بول سکی — ایک لفظ بھی تو شکایت کا ہونٹوں تک نہ آ سکا ! اور پھر اس نے سر جھکا کر سوچا یہ میری سزا ہے ! شاید یہ امی اور ابّو کا دل دکھانے کی سزا ہے — ! یا شاید یہ ان سب کی بددعا ہے جن کا میں نے دل دکھایا ہے — ! مگر نہیں قاسم مجھے بددعا نہیں دے سکتا — وہ اتنا بُرا نہیں ہے — !

چھٹکی ہوئی چاندنی میں ناؤ خاموش کھڑی تھی کہ ملاح آئے تو پتوار سنبھالے۔ مگر اچانک چاند گل ہو گیا۔ اندھیرا۔ ایسا اندھیرا جیسے چاند اور سورج کی موت واقع ہو گئی ہو ــــ اور پھر طوفان ــــ اور ملاح ؟ وہ تو نہ جانے کہاں دیکھ رہا ہے کیسے ڈھونڈ رہا ہے ــــ! اس کا جی چاہا کہ خوب روئے ــــ مگر وہ چپ چاپ بیٹھی اپنے پلو کو مسلتی رہی جذبات کی کش مکش اتنی بڑھی کہ اس نے اپنے ہاتھ کی ایک سرخ چمکیلی چوڑی توڑ ڈالی ــــ! سہاگ کی چوڑی ــــ پھر وہ چونک پڑی اس کی کلائی پر خون بہہ رہا تھا۔ مگر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے کوئی توجہ نہ کی۔ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھے، کھڑکی کے باہر دیکھ رہے تھے ــــ افسردگی، حسرت اور یاس ــــ جیسے کہہ رہے ہوں اب تم میرے پاس آئی ہو تو کیا آئی ہو ــــ میرا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ تم کیا چاہتی ہو ــــ میری طرف ایسے کیوں دیکھ رہی ہو ــــ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ بولے شاید یہی سوچ کر کہ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ؟"

"میں نے ــــ؟" وہ چونک پڑی "جی ــــ میں "

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے۔

وہ آہستہ سے بولے بڑی نرمی سے "ہاں تم نے ــــ تم نے کبھی محبت کی ہے ــــ؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ کر کہے "ظالم میں تو تم سے محبت کرنا چاہتی تھی ــــ" مگر پھر جانے کیسے اس نے کہا "میں ــــ کنواری ہوں ــــ بھلا کنواری لڑکیاں بھی کہیں محبت کرتی ہیں ــــ"

وہ ہنس پڑے۔ "ابھی یہ یورپ نہیں ہے ــــ ہمارے ہاں تو مرد بھی کنوارے ہی ہوتے ہیں، مگر دیکھو نا ــــ شادی اور محبت دو جدا جدا چیزیں ہیں ــــ"

رؤفہ کا دل دکھ سے بھر گیا ــــ! "اچھا ــــ" وہ چپ ہو گئی۔ اسے آم املی اور پیپل کے سارے بھوت یاد آئے ــــ پھر بڑی خالہ کے چہیتے بیٹے شوکت بھائی یاد آئے ــــ جنہیں اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ ملازمت کے باوجود وہ حقیر سمجھتی رہی ــــ اور انہوں نے کتنے سالوں اس کا انتظار کیا۔ بیچاری بڑی خالہ انہوں نے بیٹے کی خاطر امی کی کیسی کیسی منتیں کیں ــــ! اور پھر قاسم! اتنے سارے موقعے اس نے کیوں نکل جانے دیئے کاش محبت ہی کی ہوتی ــــ شادی نہ کی ہوتی ــــ! آج کتنی پیاس ہے ــــ! حلق میں کانٹے ہی کانٹے ہیں ــــ سانس بھی نہیں لی جاتی ــــ دم گھٹا جا رہا ہے اور یہ شخص مجھے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پلا سکتا ــــ! میں نے ساری دنیا کی مخالفت مول لے کر شادی کی ہے اور ان کی محبوبہ وہ ان کی خاطر ایک دیوار بھی نہ پھلانگ سکی ــــ مذہب کی دیوار ــــ دولت کی دیوار ــــ! اور پھر اسے یہ خیال آیا کہ قاسم بھی شاید اسے اسی طرح چاہتا ہوگا جس طرح یہ اپنی محبوبہ کو چاہتے ہیں اور اس خیال سے اسے ایک درد بھری خوشی ہوئی ــــ اسے کوئی چاہتا ہے ــــ اتنا زیادہ ــــ شاید یہ بھی اپنی بے وفا محبوبہ کو اتنا نہ چاہتے ہوں ــــ!

اس کا جی چاہا کہ وہ قاسم کو پکارے ــــ قاسم ــــ! خدا کے لیے آؤ ــــ! مجھے سہارا دو ــــ! میں مر جاؤں گی! کتنی عجیب بات ہے وہ شخص جسے میں نے ساری دنیا سے لڑ کر حاصل کیا ہے، میرا نہیں ہے ــــ! وہ تو اس عورت کا ہے جس نے اس سے بیوفائی کی ہے ــــ مجھ سے تو اس نے بیاہ کیا ہے ــــ وہ شادی اور محبت کو دو الگ الگ چیزیں سمجھتا ہے۔ کاش میں اتنے بڑے بڑے آدرشوں کے پیچھے دیوانی نہ

ہوتی۔ میں ایک گوشت پوست والی لڑکی ہوتی۔ فسانہ کی طرح ——پھر—— پھر میں ضرور کسی سے محبت کرتی۔!

وہ کھڑکی کے پاس کھڑے تھے اور پھر اپنی سوچوں کی دنیا سے نکل کر وہ اس کے پاس آئے اور وہ خیالوں کی دنیا میں بھٹک ہی رہی تھی کہ انہوں نے اسے پھر چونکا دیا۔

"رفو تم کتنی معصوم ہو —— تم شاید مجھے نہ سمجھ سکو —— مگر وہ اس نے میرے ساتھ چار سال پڑھا تھا —— وہ میری دوست تھی —— ہم نے اپنے خوابوں میں ایک جنت بسائی تھی، جس کی تعبیر اتنی بھیانک نکلی —— اسے سرمائے کے سانپوں نے ڈس لیا ——!

"ہیں ——" اس نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ کمرے کے در و دیوار چلا چلا کر کہہ رہے تھے "تم وہ بھیانک تعبیر ہو ——!" ان کا شاید یہ مطلب نہ ہو —— انہیں تو جیسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں —— "فردوس کا وہ عکس آج اپنے دامن پر تمنا کا خون بن کر نظر آ رہا ہے" ——! خون۔! اس نے چونک کر اپنے مہندی رچے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا —— اور پھر ان کی نظروں سے چھپا لیا —— اسے ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ خون میں لت پت ہیں! اسے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید اب وہ ذہنی توازن کھونے والی ہے —— وہ جو اتنی چہیتی اور لاڈلی لڑکی تھی اور اپنی تعریفیں سن سن کر جوان ہوئی تھی —— زندگی کی یہ پہلی اور آخری چوٹ ایک ساتھ برداشت نہیں کر سکتی تھی ——!

"مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے —— بتائیے میں کیا کر سکتی ہوں؟" بڑی ہمت سے اس نے اپنی لمبی خاموشی کو توڑا ——

"ارے تم میری باتیں سن کر اداس ہو گئی ہو —— پگلی دکھ تو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ تم نے صبح سویرے سرخ اور سفید پھولوں پر شبنم کے قطرے دیکھے ہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے یہ بھی جدائی اور محبت کے آنسو ہیں۔"

"آپ تو واقعی اپنی کتابوں میں لکھے ہوئے جملوں سے زیادہ خوب صورت باتیں کرتے ہیں۔"

"یہ سب خوب صورت باتیں اس خوب صورت تصور کے ساتھ تھیں اب کچھ بھی نہیں رہا ——!

اس نے سوچا وہ عورت جو مختلف روپ سے کر اس کے قلم کے پاس آتی رہی ہے، اس کے کاغذی کرداروں میں جس کی جھلک ہوگی —— جس کی محبت اور جوانی کے نغمے اس نے گائے ہیں ——! وہ عورت اسے کہیں مل جائے تو وہ اس سے پوچھے —— بتاؤ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا —— میں جام ہونٹوں سے لگانا چاہتی تھی، تم نے مجھ سے توڑ دیا۔ اور آج میں پیاسی ہوں۔! آج میری سہاگ رات ہے ——! میرے دل میں دیوالی کی سی روشنی تھی۔ میں ہاتھوں میں جلتے چراغ لے کر رقص کرنا چاہتی تھی۔ اپنے بھگوان کی پوجا کے لیے تھال میں جو ان کھلی کلیاں لائی تھی وہ بھی بکھر گئیں۔ جب رقص مجھے تھکا دیتا تو میں جلتے ہوئے دیپوں کی روشنی میں کلیاں ان کے قدموں پر رکھ کر جھک جاتی ——! اور وہ کلیاں پھول بن جاتیں ——! مگر تم —— ! تم نہ جانے کہاں سے آگئیں۔ تم نے میرے چراغوں کا تیل ہی چرا لیا —— اب لاکھ جوت جگانا چاہوں وہ کیسے جلیں گے ——؟ آہ میرے سارے دیئے بجھ گئے، میری پائلیں ٹوٹ گئیں —— میں اندھیرے میں کیسے ناچوں —— میرے پیر کانپ رہے ہیں اور وہ کچی کلیاں وہ تو کھلنے سے پہلے ہی بکھر گئیں —— مرجھا گئیں —— یہ کیسی زہریلی ہوا تھی —— یہ اندھیرا کیسا ہے —— میرا دل گھبرا رہا ہے، میں مر جاؤں گی! میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں کوئی میری پیاس نہیں بجھا سکتا تو پانی کے چند قطرے ہی ہونٹوں سے چھوا دے! آہ کسی کو مجھ پر ترس نہیں آتا —— میرے فنکار تم خاموش اور اداس ہو —— میری طرف دیکھو ——! اس نے انہیں ایسی نظروں سے دیکھا کہ شاید وہ اس کے خاموش ہونٹوں کی زبان سمجھ گئے —— انہیں سچ مچ اس پر ترس آگیا۔ اس بچاری کا کیا قصور ہے —— ! شاید وہ سوچ رہے تھے۔ پھر وہ اس کے اور قریب ہو گئے لیکن اس کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لے کر اسے ہونٹوں سے نہیں لگایا —— اس کی کلائی پر بہتے ہوئے خون کو بھی نہیں دیکھا۔ اسے ایسا لگا

جیسے ان کا جسم اس کے پاس ہے، اور روح کہیں بہت دور رہے — ان کے دل و دماغ تک اس کی پہنچ کبھی نہ ہو سکے گی۔ حلق میں کانٹوں کی چبھن اب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی — پیاس سے ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں، مگر وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ وہ پانی کا ایک گھونٹ چاہتی ہے۔ محبت کے دو بول — جو اسے سہارا دے سکیں۔

وہ اس کے بہت قریب ہو گئے، اس لمحہ اسے جانے کیوں ایسا لگا جیسے وہ اسے اپنی محبوبہ سمجھ رہے ہیں جو بیوفا تھی اور جواب لوٹ آئی ہے: مگر نہیں نہیں میں وہ نہیں ہوں — میں وہ نہیں ہوں — وہ چلّانا چاہتی تھی مگر اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ان کی سانسیں اس کے چہرے کو چھونے لگیں؛ اسے ایسا لگا کہ وہ جھلس جائے گی — اور پھر شاید دھیرے دھیرے راکھ ہو جائے گی —!

اچانک انہوں نے نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت اس کے سلگتے ہوئے پیلے ہونٹوں پر اپنے سرد سرد خاموش ہونٹ رکھ دیئے اور وہ بے بس ہو کر ان کی گود میں گر گئی، اور مرد کا پہلا پیار اسے ایسا لگا جیسے کسی بچھو نے زہریلا ڈنک مار دیا ہو !

عکس کے آئینے

ہرچرن چاولہ

میں ابھی ابھی بستر سے اٹھا ہوں۔ سوائے دو موقعوں کے تمام رات آرام سے سویا ہوں۔ ان ہی دو مواقع کی وجہ سے تھکاوٹ میرے انگ انگ میں رچی ہوئی ہے۔ میرا جسم اب اُس دہی کی طرح ہے جسے کسی طاقت ور دوشیزہ نے مٹی کی مٹکی میں بڑے زور شور سے گھم گھم ماتا بستی میری تپلی مکھن میرا گھاٹا نہ لگاتے ہوئے بلویا ہے۔ دہی کی حالت اب گاڑھا گاڑھا مکھن نکلنے سے کچھ ہی دیر پہلے کی سی ہے۔ رات کے دو موقعے جنہوں نے تھکاوٹ میرے جسم میں رچا بسا دی ہے۔ میرے ذہن کی سلیٹ پر بالکل صاف صاف لکھے ہیں۔ پہلے موقعے میں میں نے وہ کام کیا ہے جس نے میرے مُنہ کو گورا کیا ہے گورا یعنی پیلا اور کمزور اور دوسرا موقعہ وہ خواب جس میں مَیں نے اپنے مُنہ کو کالا کیا ہے۔ کام دونوں ایک سے ہیں مگر کیا کیا جائے۔ دُنیا کی اصطلاح میں ایک میں مُنہ کالا ہوتا ہے اور دوسرے میں گورا۔ یہ مُنہ کالا کرنا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ وہ گورا گورا مکھڑا کئی دنوں سے میرے خوابوں کا مرکز بنا ہُوا تھا۔

میری بیوی نہا دھو کر، سفید ساڑھی پہن کر رات کی بات کا کھلا اشتہار بن کر۔ کیونکہ آگے پیچھے، سردی گرمی، وہ نہائے یا نہ اس موقعہ پر ضرور نہاتی، سفید ساڑھی پہنتی اور کام کرتے کرتے بھجن بھی گاتی رہتی ہے۔ میرے سامنے باداموں کی چائے کا گلاس اور خالص گھی کا ایک پراٹھا رکھ گئی ہے۔ یہ چیزیں دیکھ کر میری ساٹھ سالہ بوڑھی ماں کے چہرے پہ خوشی کی لکیریں دوڑ دوڑ گئی ہیں۔ وہ میز پہ دوسری کرسی پر میرے پاس آبیٹھی ہے۔ میری ماں کے پاس ماضی کے اتنے واقعات ہیں کہ ان پر لگاتار داستان گھنٹوں بول سکتی ہے۔ اپنی زندگی کے واقعے اس نے وقت بے وقت۔ موقعہ۔ بے موقعہ میری حالت یا تھکاوٹ کی پرواہ کیے بغیر میرے کانوں کی راہ میرے دل و دماغ پر انڈیلے ہیں اور وہ اس طرح بکھر کر پھیل گئے ہیں۔ بہہ گئے ہیں۔ مٹ گئے ہیں جیسے کوئی دیوداسی شولنگ پر دودھ کا لوٹا انڈیلتی ہے اور وہاں ایک بوند بھی ٹھہرے بغیر دودھ ادھر اُدھر بکھر جاتا ہے۔ بہہ جاتا ہے۔

میری ماں کے پاس تمام واقعات پاکستان سے وابستہ پرانی یادوں پر مبنی ہیں۔ نقشے میں اُنگلی رکھ کر بتانے کے لیے میں اسے پاکستان کا نام دے رہا ہوں۔ ورنہ میری ماں کے پاس ان جگہوں کا نام نہ ہندوستان اور نہ ہی پاکستان بلکہ تھل۔ کچھ۔ شہباز خیل اور میانوالی تک محدود ہے۔ وہاں کے کسی بھی ذکر سے پہلے وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر ضرور کہتی "ہائے ربا۔ تو نے کیا کر دیا۔"

وہ ریکارڈ پلیر پہ رکھے ریکارڈ کی طرح بجنے لگی ہے "دے سائیں دتہ۔ جب تو چھوٹا تھا۔ اتا سا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو بہت قریب لا کر میرا چھوٹا پن دکھایا ہے۔ گلگلہ سا۔ گلگلہ دکھانے کے لیے اس کے ہاتھوں کے پاس کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ آگے بڑھ گئی ہے۔ میں نے تازہ آیا رسالہ شمع اُٹھا لیا ہے۔ ابھی سرورق ہی دیکھ سکا ہوں کہ اس کی آواز کانوں میں گھس آئی ہے۔

"جب تُو شہباز خیل گیا تو تیری ماسی بہت ہی گوری ہو گئی تھی جیسے کسی نے اس کے چہرے پہ ملتانی مٹی مل دی ہو۔" میں نے لاڈ سے آکر کہا۔"

"لالہ - یہ تو نے بیٹی کس قصائی کے گھر بیاہ دی۔ لڑکی تو ختم ہو کر رہ گئی۔ واہ کیا رنگ تھا، رُوپ تھا، چھوکری کا۔ مثل انار قندھاری کی دیکھتے آنکھیں بھرتی تھیں۔"

مجھے کرشن چندر کا "گدھا" اپنے ساتھ بمبئی لے گیا ہے۔ میں اس کے ساتھ قدم بقدم کئی جگہ گھوم آیا ہوں۔ رشک کا مارا میں سوچ رہا ہوں۔ کاش میں اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر نہ ہو کر ایسا ہی کوئی گدھا ہوتا جس کے ساتھ کتنی ہی حسینائیں شادی کرنے کو بے چین ہوتیں۔ میں کیا ہوں؟ یہ تو میرا باپ بھی نہیں جانتا۔ میرا باپ یعنی پرانے سے پرانا سٹیشن ماسٹر بھی کیونکہ بیک وقت کلرک، مال بابو، تار بابو، ٹکٹ بابو، فون بابو، رات بابو اور نجانے کتنے بابوؤں کا مجموعہ ہوں۔ معجون مرکب مقوی۔ ۔۔۔ مقوی۔۔ ۔ کوئی لفظ ہے یاد نہیں آ رہا۔ مقوی دماغ کہہ لیجئے۔ ریلوے کے ہر حادثے میں میری ٹانگ ضرور اڑی رہتی یعنی مچھ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں رہتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ سب کے پاؤں میں میرا پاؤں یوں ہی خواہ مخواہ ضرور الجھا رہتا ہے۔ ریلوے قانون جن پر مجھے چلنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کا ہر پھندہ میری گردن پر بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔ اگر کبھی نہ بیٹھے تو میری گردن کو ٹھوک بجا کر اس کے مطابق فٹ کر دیا جاتا ہے۔ میں کہاں پہنچ گیا۔ گدھا کہہ رہا تھا " اکثر اخبارات نے میری سوانح حیات کے خاص خاص واقعات شائع کیے تھے۔" میری ماں کہہ رہی ہے۔

تو بیٹا کچے میں گاؤں سے دور "کنواریوں کا دریا" بہتا تھا۔ تیرا بڑا بھائی بنسا۔ میرا بڑا بھائی ہربنس لال بیس سال پہلے کا بنسو بن گیا ہے۔ وہ بہت شرارتی لڑکا ہے۔ دوسرے شرارتی لڑکوں کے ساتھ وہ جلتی گرم دوپہر میں کچے میں "کنواریوں کے دریا" پر چلنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ ہمارے باؤ جی کی نظروں میں یہ ایک شرارت آمیز فعل ہے۔ مگر مجھے کنواریوں کے دریا پر جا کر نہانے میں کوئی شرارت نظر نہیں آتی۔ پانچ چھ لڑکے جلتی تپتی ریت پر دریا کی طرف جا رہے ہیں۔ پچاس قدم اُن سے پیچھے میں بھی ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ میرا بھائی رُک کر مُڑ کر میری طرف چار پانچ گالیاں اُچھال کر چلاتا ہے۔ "دُر کتے۔ مر جا۔ تینوں موت پئے جائے۔ واپس چلا جا۔"

میں رُک جاتا ہوں۔ "اوں ہوں۔ اوں ہوں۔" آنکھیں ملتا ہوا روتا ہوں۔ وہ کچی ریت کے دو ڈھیلے مجھے مارتا ہے۔ میں دو قدم پیچھے ہٹتا ہوں۔ وہ دوڑ کر آگے نکل گئے ساتھیوں سے جا ملتا ہے۔ میں پھر پیشقدمی جاری کر دیتا ہوں۔ میں کافی دور ان کے پیچھے پیچھے نکل آیا ہوں۔ اب بڑھتے ہوئے سورج سے تپتی ہوئی ریت کی گرمی برداشت کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ میرے "اوں ہوں۔ اوں ہوں" کی آواز اُونچی ہوتی جا رہی ہے۔ بنسو نے دو دفعہ مڑ کر میری جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا ہے۔ تیسری دفعہ وہ ہولے ہولے میری جانب بڑھا ہے۔ میں ڈر کر پیچھے کی طرف بھاگتا ہوں۔ اس نے چلا کر مجھے رُک جانے کو کہا ہے۔ میں سہم کر تھم گیا ہوں۔ دوڑ کر وہ میرے قریب آیا ہے۔ اس نے زور سے مجھے دو گھونسے دیئے ہیں۔ پھر مجھے آنکھیں ملتے اور روتے ہوئے اپنے کندھے پر اٹھا کر ایک جھاڑی میں آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے اس جھاڑی کے کچھ خوشے توڑ کر اپنے ہاتھوں میں لے لیے ہیں۔ میرے بوجھ سے اس کے پاؤں جلتی ریت پر پورے پورے نہیں پڑتے۔ تھوڑی دور چل کر وہ خوشے اپنے پاؤں کے نیچے رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ دم لے کر چند قدم پھر چلتا ہے اور پھر وہی عمل دہراتا ہے۔ اس کے دوست اُسے آوازیں دیتے دیتے بہت دور نکل گئے ہیں۔ ان سے آدھے گھنٹے بعد اب ہم بھی دریا پر پہنچ گئے ہیں۔

نہا دھو کر اب ہم واپس آ رہے ہیں۔ دُور دُور تک آگ کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ گرم گرم بگولوں کے چکر اپنے چکروں میں لے کر گھما گھما ڈالتے ہیں۔ بنسو کے ہاتھ میں تازہ خوشوں کے گچھے ہیں۔ میری جیب میں اس کے توڑ کر دیئے ہوئے پکے اور سوکھے بیر ہیں وہ

محبت کا مارا کسی کی طرح جلتی ریت پر آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ میں اس کے کندھے پر بیٹھا بیر کھا رہا ہوں، وہ بہت کم کم وقفوں کے بعد خوشوں کا استعمال کرنے لگا ہے۔ خوشے جل کر تراڑہ بن گئے۔ اس کے سر بالوں میں میرے مُنہ سے پھسلی ہوئی کوئی کوئی گٹھلی اٹکی جاتی ہے جو کہ میں نہیں اُتارتا ہوں کہ وہ میری تفریح کا ایک سامان مہیا کر رہی ہے۔ کالے کالے اُلجھے ہوئے بالوں میں بیر بہوٹی سی لال لال گٹھلی!

میں ماں کے ہاتھوں میں وہ گیند ہوں جسے وہ ماضی کی پختہ دیوار سے جابجا ٹکراتی اور حال کے ہاتھوں سے واپس پکڑ لیتی ہے۔

میری ماں نے اپنی محبت کا جال صرف چار سہاروں پر لٹکا رکھا ہے۔ ہر تانا بانا انہی چار کونوں پر آ کر ختم اور شروع ہوتا ہے یہ چار کونے اس کے چار بچے یعنی میں، میرا بھائی اور میری دو بہنیں ہیں۔ انہی چار ستونوں پر اس کی محبت کی عظیم عمارت قائم ہے۔ اسی لیے شاید اسے انہی چار پودوں کے علاوہ دنیا کی اتنی بڑی جنت کا کوئی فکر نہیں۔ اپنا دُکھ سکھ، جیون مرن صبح شام اُسے ہماری ہی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ وہ میرے پاس رہتی ہے۔ چاہتی ہے میرے بچے چاہے بھوکے رہ جائیں اس کا بچہ بھوکا نہیں رہنا چاہیے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ بیٹا تم نے صبح سے کیا کھایا ہے۔ میں اخبار پڑھتا ہوا اُسے کھانے کی ڈی ٹیل بتا رہا ہوں یہ دُنیا دار المحن ہے۔ لوگوں کو اپنے ہی دکھوں سے مفر نہیں۔ میری ماں باقی تینوں ستونوں کے دکھ سکھ مجھ پر بھی آ کر لپیٹتی رہتی ہے۔ ان امر بیلوں سے گھرا میں بیری کا وہ درخت ہوں جس کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں رہا۔ میں شادی بیاہ کے ہنگامے میں گھر اوہ بانس ہوں جو خوبصورت تنبوؤں سے بنے محل کا تمام بوجھ سنبھالے کھڑا ہو مگر جھنڈیوں اور کپڑوں سے ڈھکا نظروں سے اوجھل ہو۔ میری ماں تین دفعہ پہلے مجھے کھلانے کے بعد چوتھی دفعہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ کیا اور لاؤں۔ وہ کہتی ہے میں اگر کھاؤں گا نہیں تو کماؤں گا کیسے! وہ چاہتی ہے میں دن بھر چرتا چگتا رہوں۔ وہ پھر ماضی کی طرف پلٹ گئی ہے۔ "اجی کیا کھانے تھے ہمارے وقت سردی کا موسم آیا نہیں کہ ایک بوری مکسڈ ڈرائی فروٹ، ایک بوری بادام، چھ ٹین خالص گھی گھر میں ڈال دیا اور کسی نہ کسی صورت اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ میں اُتار دیا۔ گرمی کے موسم میں بادام گھوٹے جا رہے ہیں۔ پیڑوں کی لسیاں بلوئی جا رہی ہیں۔ آئس کریم کی مشین گھمائی جا رہی ہے۔ بیٹا تم کہتے ہو میں ہر وقت کھانے کی راگنی گاتی رہتی ہوں۔ بیمار ہوں لا دو نا، پاؤ بھر انگور کہیں سے۔ تمہارے باپ کے راج میں انگوروں کی پیٹیاں دیکھی ہیں گھر میں چلغوزے اُس دن بازار میں دیکھے تھے۔ شیشے کے مرتبان میں پڑے تھے۔ ڈرتے ڈرتے میں نے قیمت پوچھی کہ کہیں قیمت پوچھنے کی قیمت نہ مانگ لے۔ نہ ادا کر سکوں تو بے عزتی کی صورت وصول کر لے۔ جا جا آئی ہے بڑی چلغوزے کھانے والی۔ ڈیڑھ روپے چھٹانک ہیں۔ اب ہمیں تو سنبھال لے۔ تیری دنیا اتنی تنگ ہو گئی ہے۔ ڈیڑھ پیسے چھٹانک میں نے اپنے ہاتھوں سے کئی دفعہ خریدے ہیں کچے۔ جھوٹ نہیں بولوں گی۔ بھُنے ہوئے دو پیسے چھٹانک آتے تھے۔ تم کہتے ہو میں کھانے کی بات کرتی ہوں۔ ارے بھئی رہ ہی کیا گیا ہے تمہارے اس بھوکے ننگے زمانے میں۔ قیمتیں ہیں آسمان کو چھُو رہی ہیں لیڈر تمہارے اس بات کو مانتے نہیں۔ اب لٹکے رہو تم بیچ میں"

ماں کو آج پھر دورہ پڑا ہے۔ وہ ماضی کے تالاب میں پڑی تیرتی رہنا چاہتی ہے کسی کو اس میں حال کی کنکری تک پھینک کر ہل چل پیدا کرنے کی اجازت تک نہیں دے سکتی۔ اب مجھے کئی دن زبان پر تالا لگا کر خاموش رہنا پڑے گا۔ اس کی سننی پڑے گی۔ اپنی نہیں سنانی ہوگی، کیونکہ وہ اپنے دورے سے آج کی دوائیوں اور میری باتوں سے ٹھیک نہیں ہوتی اپنے پرانے ٹوٹکوں اور پہیلوں سے ٹھیک ہوتی ہے جو کہ میری پہنچ سے دونوں چیزیں باہر ہیں۔ کیونکہ بندھی بندھائی حق حلال کی میری تنخواہ ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے آپ کو تین ٹانگوں پر کھڑے پایا ہے۔ پھر دو پر اور اب صرف ایک پر ہی اکتفا کیے ہوئے ہوں۔ اس سے بھی اُٹھ گیا تو نہیں جانتا کہاں جاؤں گا۔ یہ ایک

ٹانگ میری تنخواہ کا پہلا ہفتہ ہے، جس ٹانگ کے سہارے میرے جسم و جاں کا رشتہ قائم ہے۔ باقی تینوں ٹانگیں تو ہوا میں معلق ہیں۔ میری ماں کی طبیعت ان تین چیزوں کے علاوہ ایک تیسری چیز سے بھی سنبھل جایا کرتی ہے۔ وہ تیسری چیز اس کے چاروں بچے ہیں۔ اس کی بیماری میں چاروں بچے اس کے آس پاس اکٹھے ہو جائیں تو وہ تمام دکھ درد کو جھٹک کر ٹھیک ٹھاک ہو کر چارپائی پہ بیٹھ جاتی ہے۔ کسی وجہ سے اگر ان باقی تینوں کو میں یکجا نہ کر سکوں تو کم از کم ایک کا حاضر کرنا تو اشد ضروری ہے۔ میرے بڑے بھائی یا منجھلی بہن کی موجودگی تو بس اکسیر کا کام کرتی ہے۔ آج اچانک میرا بڑا بھائی ادھر آ نکلا تھا۔ میری ماں نے چارپائی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ کہہ رہی ہے۔ اپنے بابو کا بیٹا ہے۔ دیکھا میں بیمار پڑی نہیں کہ اس کے دل میں جیسے کوئی تار سی بل کر رہ جاتی ہے۔ تم نے بلوایا نہیں آپ ہی آپ کیسے آ گیا۔ اس کا خون اُبلتا ہے اور چلا آتا ہے۔ کچے دھاگے سے بندھا ہوا۔ میں ابھی ابھی اپنے بڑے بھائی کو بس سٹاپ پر چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ بیوی سے چھپا کر میں اسے تین سو روپے ہی دے سکا ہوں وہ پانچ سو مانگتا تھا۔ میرے پاس اتنے ہی تھے۔ بیوی سے کئی دن کی جنگ کے بعد یہ پیسے میں نے جمع کیے تھے۔ میں نے کوئی بلڈنگ نہیں بنانی تھی۔ نہ ہی کسی بچے کو فارن بھیجنے کا پروگرام تھا اور نہ ہی کوئی شادی وادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے یہ روپے اس لیے رکھے تھے کہ کسی وقت اچانک مصیبت مثلاً حادثہ۔ بیماری۔ موت یا غمی پہ ضرورت پڑ گئے تو کہاں سے لاؤں گا۔ ایک دفعہ میرا ایک سکوٹر سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ مہینے کا آخری ہفتہ تھا۔ اچھا چھوڑیئے۔ کچھ تو پردہ رہنے دیجیے۔

میں اندر ڈرائینگ ٹیبل پہ بیٹھا ہوں۔ میری ماں باہر دھوپ میں بیٹھی شلغم کاٹ رہی ہے۔ ساتھ ساتھ باتوں کے ساگ کو بھی زبان کی درانتی سے کاٹتی جاتی ہے۔

بیٹا تیرا بھائی تیری نئی بھابی کے ساتھ آتا تو میرا من ٹھنڈا ہو جاتا مگر وہ قطامہ یہاں کیوں آنے لگی۔ الٹا ہم سے ہمارے بیٹے کو چھین رہی ہے۔ میں پتھر ہانسی کی دیوار سے جا ٹکرایا ہوں۔ یہ ٹکر میرا سر پاش پاش کر دے گی، یا میں کسی کا سر توڑ دوں گا۔ دیا میری بھابی ہے میرے بھائی کی نئی بیوی۔ اس کی پہلی بیوی ابھی بیمار ہی تھی کہ دیا کی ماں نے میری ماں کو راضی کر لیا تھا۔ دیا تمہارے گھر آنا چاہتی ہے۔ پہلی بات کو بھول جاؤ۔

میری ماں اور میرا بھائی پہلی بات کو بھول گئے مگر دیا اور میں اسے نہ بھول سکے۔ دیا ہمارے گھر آنا چاہتی تھی، میری بیوی بن کر۔ تب ان لوگوں نے اسے آنے نہیں دیا۔ دیا مجھ سے چھ سال چھوٹی ہے مگر میرے بھائی سے پورے اٹھارہ سال چھوٹی ہے۔ وہ مجھ سے میرا بھائی چھین رہی ہے نہ میری ماں سے اس کا بیٹا۔ صرف اپنے آپ سے اور مجھ سے وہ دنیا چھین لینا چاہتی ہے جو دو گھروں کی آگ بھی بن سکتی ہے۔ میری ماں ہردوار جانا چاہتی ہے۔ میں سٹیشن سے اس کے لیے ریلوے پاس بنوانے جا رہا ہوں۔ دل کے کسی کونے میں ایک خواہش سر اٹھا رہی ہے گنگا میا میری ماں کو اپنی گود میں جگہ دو۔ ورنہ میں تم میں سما جاؤں گا۔

لندن سے ایک تار

احمد سعید

"نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے۔ ابھی تو دو روز ہوئے میں شیخ کو ملا تھا۔ وہ کیسے اچانک مر سکتا ہے۔ ایک نہایت تندرست اور کڑیل جوان۔ ایک کالا پانچ چھ گوروں کا مقابلہ کر سکتا ہے ..... " میں کسی کے، اس کے گھر پاکستان میں، اس کے مرنے کی اطلاع بذریعہ تار دینے پر حیران ہو گیا۔ زیادہ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ انہوں نے اس کے پتے پر اسے دو تین تار بھی اس منادی کی تصدیق کرنے کے لئے بھیجے تھے لیکن ان کے جوابی ہونے کے باوجود کوئی جواب نہیں بھیجا گیا تھا۔ بھیجتا بھی کون؟ لندن جیسے شہر میں جہاں ہموطن بھی پردیسی لگتے ہیں اور اصل باشندے اجنبی سے براعظم، ایک سیدھے سادے اپنے شہر اور خاندانی مراسم رکھنے والے شیخ کے مرنے کی خبر وقتی طور سے یوں محسوس ہوئی جیسے ایک تارا وطن سے ٹوٹ کر انجانی فضاؤں میں گم ہو گیا ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے وہ تارا کسی اجنبی کو دیس جا گرا ہو، اس کٹی ہوئی پتنگ کی مانند جسے ہمارے ہاں پتنگ باز ٹوٹ کر خود اڑاتے ہیں اپنے حالات کی تاریکی سے نکل کر چندھیا دینے والی بلکہ خیرہ کن مغربی چمک جو مشرق سے ابھر کر مغرب تک پہنچتے سورج کی روشنی سے پیدا ہوتی ہے، جو سورج، چاند اور تارے وہاں اجنبی لگتے ہیں۔

شیخ کو میں چھ سات برس بعد ملا تھا۔ اسے انگلستان آئے ہوئے کافی عرصہ ہوا تھا ..... اب جب مجھے اپنے گھر سے اس کے مرنے کی خبر ملی تو میں اس کی تصدیق کے لئے فوراً شیخ کی جائے رہائش کی طرف چل دیا۔ یہ میرے ہال سے بمشکل تین منٹ کے فاصلے پر تھی۔ پہلے تو میں بھاگ اٹھنا چاہتا تھا لیکن اپنے آپ کو نہایت مہذب ظاہر کرنے کے لئے فقط تیز چلنا ہی مناسب سمجھتے ہوئے۔ شیخ سے دو تین گذشتہ ملاقاتوں کے مناظر نظروں کے سامنے لا کر اس مبینہ المناک خبر کا ذہنی مطالعہ کرتا چلا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ —

پہلی بار اس کا پتہ پوچھ کر جب میں اس کے ہاں پہنچا تو مجھے اس کا کچھ دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔

"مسٹر شیخ یہیں رہتے ہیں؟" میں نے ایک انگریز بچے سے پوچھا جو مکان کی گھنٹی بجانے پر دروازہ کھول کر باہر آیا۔

"مسٹر شیخ .... بچے نے قدرے توقف کے بعد متجسس انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔ پاکستانی ہیں۔"

لڑکے نے قدرے معنی خیز انداز میں سر ہلایا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ بہر نوع چند منٹ بعد وہ مجھے دوسری منزل پہ لے گیا۔ وہاں اس نے لینڈنگ پر واقع ایک کمرے کے دروازے پہ دستک دی۔ کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا۔ لڑکے نے اسے کچھ کہا۔ دروازہ قدرے بھیڑ دیا گیا۔ پھر کھلا اور کسی نے باہر جھانک کر دیکھا۔

"تو .... آپ — ک۔ کب۔ آئیے۔ السلام علیکم۔" یہ شیخ تھا — مجھے اس کے پہلے ہی سوال میں ایک عجیب جھجک سی محسوس

ہوئی ..... (ہوسکتا ہے پی رہا ہو اس لئے شرما گیا ہے۔ وہ ہے تو شروع ہی سے شرمیلا۔ بڑوں کی عزت کرتا ہے)

"آیئے ——" یہ دعوت انگلستان میں مدت سے مقیم پردیسیوں کی اُس سرد مہری سے مترشح تھی جو اہل انگلستان کی امتیازی خصوصیت ہے .... لیکن مجھے اس کی تہ میں اک دبا ہوا احساس گناہ محسوس ہوا ..... میری نظر پہلے پہل میز پہ پڑی شراب کی بوتل پر گئی لیکن بوتل پھر نہ دکی اس کے ساتھ پڑے دو پیگوں پہ ..... شیخ معاً اپنی دائیں جانب مڑ کر کسی سے دبے الفاظ میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن میں نے ایک تو دو آدمیوں کے اس کمرے (DOUBLE BED.ROOM) کے کینوں کے بارے میں ایک ثانیہ کے لئے لاشعوراً مجبوری پر سوچتے ہوئے اور انفرادی آزادی میں بے جا مخل ہونے کے احساس سے قصداً یہ دیکھنے کی کوشش نہ کی کہ شیخ کیا کر رہا ہے۔ تاہم میری کنکھیوں نے بتایا کہ ایک ڈبل بیڈ میں ایک عورت لیٹی ہوئی تھی، اُس کے برابر کسی چیز کو ڈھانپا جا رہا تھا —— یہ ایک بچہ تھا۔ عمر؟ یہی کوئی ایک برس ...... وہ کمرے میں ایک اجنبی کو داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور عورت پلنگ کی پٹی پر ہٹ کر بیٹھ گئی .... غیرارادی طور پہ میری نظریں دو ایک مرتبہ شیخ کے چہرے سے ہٹ کر اس بچے کے چہرے پر پڑیں —— کیا یہ اس کا بچہ ہے؟ اور ایک اچٹتی نگاہ اس کی ماں پر پڑی ہو نہ ہو یہ اُس کی ماں تھی۔ ایک نہایت صحت مند، پستہ قد دیہاتی سی گدرائے جسم کی عورت .... وہ چہرے بشرے سے قطعاً انگریز نہیں معلوم ہوتی تھی ...... لیکن مجھے اس وقت معاً شیخ کی والدہ کا خیال آیا جس نے میرے ذریعے اپنے بیٹے کے لئے لاہور سے تعویذ بھیجا تھا۔ جب میں نے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد یہ معلوم کر کے کہ وہ کس کارخانے میں کام کرتا تھا، چند ہی ماہ ہوئے برمنگھم سے لندن آیا تھا، نسلی امتیاز کا کسی حد تک شکار ہونے کے باعث گاہے گاہے بیکار بھی ہو جاتا تھا، اُسے اُس کی والدہ کا تعویذ دیا۔

"..... ایسے تعویذ اماں نے پہلے بھی بھیجے ہیں .... پر" اُس نے مخصوص کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "یہ یہاں اثر نہیں کرتے" (اس پر میں نے دل ہی دل میں کہا ہر بلا سے محفوظ کرنے کے لئے بھیجا ہوگا) "لیکن ہرج بھی کیا ہے۔ کلام الٰہی ہے۔ روحانی سکون اور طاقت ملتی ہے۔ باندھ لو" میں نے کہا۔

اس کے جواب میں شیخ نے احترام کے طور پر اس تعویذ کو بازو سے باندھ لیا اور پھر میری خاطر مدارات کے لئے بندوبست کرنے لگا۔ گو مجھے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی، باہر برفباری اور اس سے فضا میں اک عجیب یاس انگیز شعریت اور دلفریبی پیدا ہونے کے باوجود لیکن شیخ کو قدرے مضطرب دیکھ کر میں نے اُسے اس عورت کو مشترکہ باورچی خانہ میں چائے تیار کرنے کے لئے بھیجتے دیکھ کر روکنا پسند نہ کیا ..... وہ ایک لحظہ کے لئے شب خوابی کا لباس پہن رکھنے کے موجب کمرے سے باہر جاتے جھینپ گئی اس پر شیخ نے اُسے کھونٹی سے لٹکتا ڈریسنگ گاؤن اتار کر پہنا دیا اور خفیف سا معنی خیز دھکا دے کر کمرے سے باہر کر دیا۔ میں نے اس کی شخصی آزادی پر حملہ کرنے کے سوال کو بالائے طاق رکھ دیا کیونکہ اس کی والدہ کب سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی اور کب سے وہ اُسے قطعاً یہ کہہ کر ٹالے جا رہا تھا کہ وہ اسے باقاعدہ خرچ تو بھیج رہا ہے، فقط میٹرک پاس ہونے اور سفارش کے بغیر اُسے وطن میں کب اتنی تنخواہ مل سکتی تھی جس سے وہ گھر ہر ماہ اوسطاً اڑھائی تین سو روپیہ ماہوار بھیج سکتا تھا .....

شیخ کی والدہ شوہر زندہ ہوتے ہوئے مدت کی بیوہ ہو گئی تھی چونکہ موخرالذکر نے اپنی ترقی کے راستے میں غریب خاندان سے

تعلق رکھنے کے باعث اُسے جبراً الگ کر دیا تھا۔ وہ طلاق لینے پر قطعاً اس لئے آمادہ نہ ہوئی تھی کیونکہ اولاد —— ایک لڑکا شیخ اور ایک لڑکی جس کی بعد میں شادی کر دی گئی —— کو بن باپ اور یتیم نہیں کہلوانا چاہتی تھی اور اس اُمید پہ زندہ تھی کہ شاید شوہر کے دل میں کبھی ترس آ جائے اور وہ اسے دوبارہ قبول کرے۔ اس کا نتیجہ بعد ازاں اتنا ضرور نکلا کہ وہ نہ صرف گھر کے اخراجات کے لئے بیوی کو گاہے گاہے کچھ رقم بھیجتا رہا، بلکہ اپنی لڑکی کی شادی کے لئے بھی اُسے دو تین ہزار روپے بھیجے۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے —کہیں—" میں شیخ سے اُس کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں پوچھتے پوچھتے اس عورت اور بچے کی طرف اشارہ کرتے کرتے رک گیا "کہیں" میں نے ہنس کر آخر بات کہہ ڈالی "کہیں شادی تو نہیں کر لی ؟"

" اللہ پاک کی قسم کوئی بات نہیں" شیخ نے اب میرے خدشے زور دینے پر قسم کھاتے ہوئے کہا کہ عورت تو اس کے پڑوس میں رہتی تھی— "یہاں ایسی باتیں تو عام ہوتی ہیں . . . . . آپ سمجھتے ہیں !"

"لیکن —شیخ یہ ہے —کون ؟"

"شادی شدہ ہے ۔جب شوہر کام پر چلا جاتا ہے . . . . . تو یہاں آ جاتی ہے ۔میری (COMPANIAN ، ہے۔"

اتنے میں بقول شیخ اس کی COMPANIAN چائے بنا کر لے آئی اور مجھے شیخ کی رنگت ایک لحظہ کے لئے اڑتی نظر آئی۔ میں نے اُسے فقط اتنا مشورہ دے کر بات ختم کر دی کہ تنہائی دور کرنے کے لئے خواہ جو چاہے کرے لیکن کسی مغربی عورت سے شادی نہیں، ہمارے افق مختلف ہیں تہذیبیں الگ، بدن اور روحیں تک جُدا ۔مشرق کا پودا مغرب میں نہیں پنپ سکتا ۔شیخ سر جھکائے میری باتیں سنتا رہا —— اس نے ساری بات اس تان پہ توڑی " آخر وطن جا کر کروں گا کیا —— ؟"

شیخ سے دوسری ملاقات پہ مجھے اس کی COMPANIAN سے مختصراً بات کرنے کا موقعہ ملا ۔اس سے پتہ چلا کہ وہ سکاٹ لینڈ کی رہنے والی ہے ۔مجھے پہلے اس پر یونانی یا یہودی بلکہ ترک تک ہونے کا شک گذرا تھا۔ وہ بے پناہ قوتِ ارادی کی مالک ایک سخت گیر عورت بھی معلوم ہوتی ۔ ہمارے ہاں کی جنگلی بلی کی مانند ! —— اب اس کا بچہ کمرے میں آزادانہ کھیل رہا تھا ۔ میں نے قدرے تجسس اور پیار کے جذبات کے تحت اسے اٹھا کر اپنے زانو پہ بٹھا لیا اور اُس کی نظروں میں نظریں ڈال کر شیریں کر لے ڈرانے کے لئے چنگھاڑا ۔سچ پوچھئے اس وقت مجھے اس کا چہرہ بالکل شیخ کے چہرے کی مانند خوف زدہ سا لگا ۔اور اس کے منہ سے معاً "ڈیڈی" نکل گیا ۔ڈیڈی کی آواز پہ نہ جانے شیخ کیوں چونک اٹھا —— ڈیڈی ۔ یہ ڈیڈی کون تھا — ؟

"یہ ہر ڈرانے والے کو ڈیڈی کہتا ہے —" شیخ نے بچے پہ ملامتی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

ڈیڈی — ڈیڈی — شیخ کی طرح چہرہ —سخت گیر عورت —— میں شیخ سے دوسری مرتبہ ملاقات کرنے کے بعد سوچتا ہوا اس کے ہاں سے نکلا ۔اور یہ کہ میں وطن واپس جا کر اس کی ماں کو کیا جواب دوں گا کہ اس کا لڑکا کسی عورت کا غلام بنا بیٹھا ہے۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے جب میں شیخ کے ہاں تار کی خبر کی تصدیق کے لئے پہنچا تو مکان کی مالکن نے ہنستے ہوئے جواب دیا " اس

کے وطن سے جوابی تاریں بھی آئی ہیں انہوں نے گھر بدل لیا ہے۔ اس لئے جواب نہیں دیا۔"

"انہوں کا مطلب۔ شیخ اور اس کی بیوی نے۔؟"

"بیوی!۔۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے شوہر کو اس کا کوئی ہم وطن ملے!۔" مکان کی مالکن نے نہایت خشک، دو ٹوک جواب دیا۔

"تو وہ تار۔۔۔ سمجھا!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔۔۔۔ ہو نہ ہو یہ تار شیخ کی بیوی نے اس کے گھر انتقاماً دیا ہے!"

جب میں واپسی کی تیاری کے سلسلے میں بازار سے شام کو واپس لوٹا تو پتہ چلا کہ کوئی مسٹر شیخ مجھے ملنے آیا تھا۔۔۔۔

تو شیخ زندہ ہے! میں بھی کہتا تھا کہ اس جیسا صحت مند شخص اچانک بیمار پڑ کر مر نہیں سکتا۔۔۔ لیکن وہ مجھے کس لئے ملنے آیا تھا۔ شاید شادی کر لینے کا اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا جواب فقط وقت ہی دے سکتا ہے۔ اس نے اپنا نیا پتہ میرے ہاں چھوڑ جانے کی بجائے فقط اتنا کہا تھا کہ مجھے دوبارہ ملنے آئے گا۔

لیکن وہ مقررہ دن اور وقت پر نہ آیا ———

گھوڑی

قیصر جہاں

پانچ سال پہلے جب راج رانی بہو بن کر اس گھر میں آئی تھی۔ نریش انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ دیور کے روپ میں اُسے پاکر وہ نہال ہوگئی تھی۔ اس کی سادگی اور دل جیت لینے والی عادتوں سے راج رانی کے دل میں ممتا اُمڈ آئی۔ صرف تین چار مہینے سنگ ساتھ رہا۔ امتحان دے کر وہ گاؤں چلا گیا۔ پھر اس نے اِلہ آباد میں داخلہ لے لیا اور بہت دن تک گھر نہیں آیا۔ لیکن جب بھی بھائی کو خط لکھتا تو بھابی راج رانی کے لیے چند لائنیں ضرور لکھتا۔ "بھابی تمہاری بڑی یاد آتی ہے"۔ "بھابی تمہیں دیکھنے کو ترس گیا ہوں"۔ "بھابی مجھے بھلا مت دینا۔"

گرمیوں میں جب وہ دو دن کے لیے آیا تو سایہ کی طرح بھابی کے ساتھ رہتا۔ باتیں تھیں کہ ختم ہی ہونے میں نہ آتی تھیں۔ پھر جب دن بعد ایک سرٹیفکیٹ لینے آیا تھا تو بھی یہی حال رہا بھابی پر ہر وقت نچھاور ہونے کو تیار رہتا۔

اتنی چاہ— اتنا پیار راج رانی سمجھ نہیں پاتی کہ وہ کیا کر ڈالے۔ کیا دے ڈالے جو اس کا دل ہلکا ہو۔

اور پھر سال گزرتے گئے۔ نریش بھابی کے پاس نہیں آپایا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد اچانک آج دوپہر اس کا خط آیا تھا۔ "بھابی میں تم سے ملنے آرہا ہوں" خط پاکر وہ بہت خوش ہوئی تھی اور اب کام سے فرصت پاکر اُس نے ایک بار پھر خط پڑھا اور لیٹ گئی۔ پھر سوچنے لگی— شادی کو اس جون میں پانچ سال ہو جائیں گے۔ پانچ سال جیسے پانچ صدیاں گزر گئیں۔ راج رانی کے کوئی اولاد نہ ہوئی اور روزمرہ کی گھسی پٹی زندگی اب ایسی ہو گئی کہ جیسے کہیں کوئی چمک ہی نہ رہی ہو اور سب کچھ بجھا بجھا سا ہو۔

اس کے شوہر سریش چندر ترپاٹھی کی شخصیت کا ایک ایک پہلو شروع سے آخر تک اس کے سامنے کھلا ہوا تھا۔

خوب کھاتے۔ خوب سوتے۔ خوب نہاتے۔ خوب ہنستے۔ خوب سجتے سنوارتے اور خوب سگریٹ پیتے تھے۔

راج رانی کو پہلے دن کی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ اُس نے اپنی ساڑی ٹھیک کرتے وقت شوہر کو کہتے سُنا تھا "مزے آگئے" کس قدر چونکی تھی وہ اپنے شوہر کی اس بات پر اور پھر اسے کیسا عجیب معلوم ہوا تھا۔ رات بھر وہ سو بھی نہ سکی تھی اور یوں ہی دن نکل آیا تھا۔

یاد آیا— پہلے دن اس نے باورچی خانے میں جاتے وقت پوچھا تھا۔ "کیا کھائیے گا؟"

اور سریش چندر ترپاٹھی نے بغیر ہچکچاہٹ کے کہا تھا۔ ارہر کی دال۔ لوکی کی ترکاری۔ بیسنی روٹی اور کدو کا رائتہ بس۔

اس نے بڑی لگن سے سب کچھ بنایا تھا۔ اور شوہر نے خوب کھایا تھا۔ پھر ہاتھ دھو کر مُنہ صاف کرتے ہوئے بولے تھے "بڑا عمدہ کھانا بناتی ہو تم، واہ! مزے آگئے"

یاد ہے— یہ سُن کر اس کے دل پر گھونسہ سا لگا تھا اور جانے کہاں سے کلیجے میں ایک کانٹا سا آ چبھا تھا۔ رات بھی تو اس نے یہی جملہ سُنا تھا۔

یاد آیا۔ دوسرے دن وہ دونوں کوئی فلم دیکھنے گئے تھے۔ لوٹتے وقت اس کے شوہر نے رکشا میں بیٹھ کر سگریٹ سلگائی اور ایک لمبا کش لے کر کہا تھا "ہیلن کی کمر میں کس قدر لچک ہے کیا ناچ کرتی ہے واہ! مزہ آگیا۔" اس بار اس کے دل میں شوہر کی اس بات سے چوٹ لگی تھی۔ یاد ہے اس نے دوسرے دن بہت ہچکچاہٹ سے بہت آہستہ سے اپنے دیور سے پوچھا تھا۔ "کیا تمہارے بھائی صاحب دال بھات، چٹنی، عورت اور آرٹ میں کوئی فرق نہیں کرتے سب کو ایک سمجھتے ہیں۔ کیا سب کو ایک کیٹیگری میں رکھتے ہیں؟ کیا سب کا مزا انہیں ایک سا ہی لگتا ہے۔"

اور نریش نے ہنستے ہنستے بڑی سادگی سے کہا تھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھابی۔ بھلا عورت اور دال بھات۔ آرٹ اور دال بھات برابر ہو سکتے ہیں۔ تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے بھابی۔ "مزے آگئے" ان کا تکیہ کلام ہے۔ جب وہ کسی چیز سے بہت خوش ہوتے ہیں یوں ہی کہہ دیتے ہیں۔ "واہ مزے آگئے۔"

اور یاد آیا۔ شروع شروع کے انہی دنوں میں چھٹی کی ایک شام کو جب نریش کسی ٹیم کے ساتھ شہر سے باہر چلا گیا تھا اور بادل چھائے تھے اور آسمان سے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی تو لحاف میں دبکے بیٹھے سریش چندر ترپاٹھی نے باتوں کے دوران ہی راج رانی کو سنایا تھا۔ "تو اس طرح میری شادی جعفر آباد میں قریب قریب طے ہو گئی تھی۔ رام بدن مصری کی نواسی تھی وہ۔ مشہور زمیندار اور ساہوکار کے گھر سے رشتہ ہو رہا تھا۔ لڑکی کچھ زیادہ پڑھی لکھی تو نہ تھی لیکن اس کی تندرستی نہایت اچھی تھی اور رنگ تم سے بھی زیادہ کھلتا ہوا تھا۔ وہ بہت ہی سلیقہ کی اور گھر کے تمام کاموں میں ہوشیار تھی۔ ایک میلے میں مجھے اس کو بڑے نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ بالکل سیب جیسے گال اور کٹورے کی طرح آنکھیں تھیں بھرپور نظر سے دیکھ لے تو آدمی کا کلیجہ نکل آئے۔ میری طبیعت خوش ہو گئی اور اسی دن سے وہ میرے دل میں بس گئی۔ دن رات اسی کا خیال رہتا اور اسی طرح رفتہ رفتہ میرے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہو گئی۔ پھر جانے کیا لین دین پر جھگڑا ہو گیا اور وہاں شادی نہ ہو سکی۔ اس طرح میرے آشیانے پر بجلیاں گر گئیں میں بہت بے چین اور بے قرار ہوا لیکن میں نے فرض پر اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ سارے جذبات جہاں کے تہاں دفن کر دیئے اور باپو نے جب تمہارے رشتہ کے بارے میں ایک دوست کی معرفت دریافت کیا تو میں نے فوراً منظوری دے دی۔ باپ آخر باپ ہی ہوتا ہے جس کا اولاد پر بہت زیادہ حق ہوتا ہے۔ میں نے اپنے باپ سے وہ حق چھیننا گناہ سمجھا اور شادی تم سے کر لی۔ کوئی بات نہیں۔ تم بھی کیا بری ہو۔ میں عورت میں کچھ چیزیں ضروری سمجھتا ہوں مثلاً صحت اچھی ہو۔ صورت شکل کیل کانٹے سے درست۔ محنت کش اور خوش مزاج مرد کی نظر پہچانے اور اس کی طبیعت ہری کر دے۔ خدمت اور اپنے ناز نخروں سے مرد کا دل بہلائے۔ اپنی لاجواب عادتوں سے مرد کے دل میں پھل جھڑیاں چھوٹنے والی عورت کو میں سینٹ پرسینٹ نمبر دیتا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تم میں وہ سب کچھ ہے جو ایک عورت میں ہونا چاہیے۔ امیر لڑکی نہیں ملی کوئی بات نہیں۔ میں تم سے خوش ہوں۔ لیکن عورت کا ایک بڑا اہم فرض اس کا وفادار ہونا ہے۔ عورت اگر وفادار نہیں تو سمجھو وہ دو کوڑی کی ہے اب تم ایک وفادار گھوڑی کی مثال لو، مجال ہے مالک کا بغیر اشارہ پائے منزل کی طرف ایک قدم بھی بڑھنے اور مالک کے اشارے پر دھکتی آگ میں کود جائے۔ دریا پار کر جائے۔ اور ایک بے وفا گھوڑی کا کچھ ٹھکانا نہیں جانے کس کھائی خندق میں جا پھینکے۔ میری بات پر غور کرو۔ میرا تجربہ معمولی نہیں ہے۔ بہت کچھ جانتا ہوں۔"

اس بادلوں بھری شام کو پتی کے منہ سے یہ باتیں سن کر اندر ہی اندر اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ دوسرے دن اس نے بڑی ہچکچاہٹ

کے ساتھ سرلیش سے پھر پوچھا تھا "کیا تمہارے بھائی صاحب عورت کو ایک گھوڑی مانتے ہیں؟"

نرلیش نے اس دن بھی ہنستے ہوئے کہا تھا "تمہیں مغالطہ ہوا بھلا عورت بھلا گھوڑی کیسے ہو سکتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ بھائی صاحب گھوڑا سواری کے بڑے شوقین ہیں اسی طرف دھیان چلا گیا ہوگا۔ کچھ کہہ دیا ہوگا گھوڑی کے بارے میں۔

راج رانی نے پھر دیور کی بات پر یقین کر لیا تھا اور پھر جب بھی اس نے وفادار گھوڑی کی بات سنی تو یہی سمجھ لیا کہ گھوڑی کی طرف دھیان چلا گیا ہوگا۔

پھر کسی دن سریش چندر ترپاٹھی یوں ہی سنانے لگے۔ یہ بڑے افسروں کی داتیں مجھے قطعی پسند نہیں۔ میں بخوبی جانتا ہوں یہ سالیاں اپنے بیوقوف شوہروں کو اُلّو بنا کر خود زندگی کے مزے لوٹتی ہیں۔ تم مجھ سے ایک ایک کے قصے سن لو۔ سب کی پول معلوم ہے۔ یہی بے غیرت عورتیں جب کبھی سبھا سوسائٹی میں آگے کی کرسیوں پر بیٹھتی ہیں تو اس وقت خون کھول جاتا ہے۔ تم یقین مانو میں اگر آج کوئی بڑا افسر ہوتا تو بھی میرے یہی خیالات ہوتے۔ اس سروس کی طرح آفیسر کی کرسی بھی مجھے بڑی آسانی سے مل جاتی۔ باپ کے اوورسیر سے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے ایم اے۔ کی اس ڈویژن نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ اس ڈویژن کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ دو سال تک پروفیسر ورما کے یہاں پاپڑ بیلتا رہا۔ ان کی کتابوں کے پروف دیکھنے سے لے کر ان کے کمرے میں جھاڑو لگانے تک کا ذلیل سے ذلیل کام کیا۔ لیکن وقت آنے پر وہ سالا ورما دغا دے گیا۔ وہی تھرڈ ڈویژن تھوپ دی میرے کھوپڑے پر۔ سر پیٹ کر رہ گیا۔ یہ پروفیسر ہی ہوتے ہیں جو انسان کو اعلیٰ آفیسر اور ادنیٰ کلرک بنا دیتے ہیں۔ ہزاروں نوجوانوں کی قسمت ان کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ بڑے مطلبی بڑے مکار اور سانپ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کہ چپکے سے کاٹ کھائیں اور معلوم نہ ہو۔ مجھے تو ان کی پوری جماعت سے نفرت ہے۔ خیر اب تو مجھے کوئی دیسا دکھ نہیں ہے۔ سروس اچھی خاصی ہے اور ترقی کے لیے پوری گنجائش بھی ہے ایک نہ ایک دن آفس سپرنٹنڈنٹ ہو ہی جاؤں گا۔ پھر دیکھنا تم میرے ٹھاٹ۔

راج رانی نے پھر نرلیش سے شرماتے اور ہچکچاتے ہوئے پوچھا تھا "کیا تمہارے بھائی صاحب ہمیشہ تھرڈ ڈویژن ہی پاس ہوتے رہے ہیں"

نرلیش نے سر ہلا کر کہا۔ "ایسی بات نہیں بھائی صاحب اچھے اسٹوڈنٹ تھے ڈویژن تو چانس کی بات ہے۔"

راج رانی پھر مان گئی تھی۔

نرلیش جب تک یہاں رہا وہ ان تمام باتوں پر یقین کرتی رہی نرلیش چلا گیا تو اس کے یقین کی لمبی عمارت بھر بھرا کر گر گئی اور اس کے ملبے میں راج رانی اچانک دب کر مر گئی۔

سریش چندر ترپاٹھی کا فلسفۂ زندگی ایک دن اس کو خود اپنے کانوں سے سننے کا موقع ملا۔ کوئی بچپن کے لنگوٹیا یار آئے تھے۔ کھا پی کر بیٹھے تو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سریش چندر ترپاٹھی نے اُچک کر کہا۔

"سنو مائی ڈیر! فرسٹ آف آل۔ آدمی کی تندرستی برقرار رہے اسے روز بڑھیا خوراک ملے۔ عورت ذرا ڈھنگ کی ہو۔ نوکری میں زیادہ ہائے توبہ نہ ہو تنخواہ مناسب ہو اور صاحب مکان کرایہ کا نہ ہو۔ بس اور کیا چاہیے؟ ایک انسان کو؟ ... اب رہی اولاد میرا کہنا ہے ہو جائے تو واہ واہ! نہ ہو تو کوئی خاص نقصان بھی نہیں۔ اولاد کا بھی ایک سکھ ہوتا ہے میں مانتا ہوں۔ لیکن سچ پوچھو تو اولاد ہو جانے پر عورت کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے بالکل پھیکا ہو جاتی ہے۔

دونوں ساتھی ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ راج رانی دور بیٹھی سنتی رہی تھی۔ ہنسی روک کر سریش چندر ترپاٹھی نے کہا ”اب تم سیاست۔ ادب اور آرٹ کی بات کہو گے تو میرا فیصلہ سُن لو۔ سیاست صرف بیروزگار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ یا ان لوگوں کا مشغلہ ہے جو اخباروں میں اپنی تصویر چھپی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ادب بالکل بے کار کی چیز ہے۔ واہیات۔ میں تو دراصل ادب کو ذہنی عیاشی مانتا ہوں۔ ایک شخص ہر آرٹ میں ماہر نہیں ہو سکتا۔ لیکن بھائی میرے۔ کوئی آرٹ تو انسان کے پاس ہونا چاہیے“ پھر سر کو ترچھا کر کے کہا ”دوست میں تو صرف ایک آرٹ جانتا ہوں۔ تم جانتے ہو بچپن سے ہی مجھے گھوڑی پر چڑھنے کا شوق تھا۔ پھر جوانی آتے آتے یہ حال ہو گیا کہ خوابوں میں بھی مجھے گھوڑیاں ہی نظر آتی تھیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ گھوڑی پر چڑھنے کا مجھے موقع ملا۔ اور میں نے ان سالیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ گدھی کی طرح سیدھی ہو کر میرے سامنے کھڑی رہتی تھیں۔ لیکن صاحب کسی اونچی نسل کی۔ اونچی اٹھان والی گھوڑی پر سواری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک آرٹ ہے جناب اور یہ آرٹ مجھے بخوبی آتا ہے۔ بس میں کر لینے کے اس آرٹ کے پس پُشت ایک بڑی بات اور ایک بڑی فلاسفی چھپی ہوئی ہے اچانک ہی جس دن مجھے یہ معلوم ہوا یہ سمجھو میری تیسری آنکھ کھل گئی۔ اور اب میں نے وہ فلسفہ دُنیا کی اس بھیڑ میں آزمانا شروع کیا تو تم سے صحیح کہتا ہوں بالکل کھرا سونا ثابت ہوا۔ مزے آ گئے۔ اور اب تو یہ عالم ہے کہ کیسی بھی بدذات۔ بگڑیل غصیل عورت کیوں نہ ہو۔ تم مجھے چند دن کا موقع دو اس کی نسیں نہ ڈھیلی کر دوں تو کہنا۔ لیکن یاد رہے۔ وہی پرانا اصول یہاں بھی کام میں لایا جاتا ہے جو میں نے ابھی بتایا تھا کہ۔ اونچی نسل کی اونچی اٹھان والی گھوڑی پر سواری کرنا سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن خدا کی قسم مجھے چڑھنا آتا ہے۔ مجھے آتا ہے۔

کچھ دور بیٹھی ہوئی راج رانی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ یقین کی عمارت مسمار ہو گئی اور ملبے کے نیچے راج رانی دب کر مر گئی۔ اس نے ان باتوں کے متعلق اپنے پتی سے پھر کچھ نہ پوچھا۔ اس نے زبان پر تالے ڈال لیے اور سنتی رہی صرف سنتی رہی۔

”آج تو فلاں چیز بناؤ بڑی ذائقہ دار ہوتی ہے۔ کل رات تو تمہارا کاجل غضب ڈھا رہا تھا۔ آج ذرا یہاں بائیں گال پر کالا تل بنا کر دکھانا۔ یہ نئی ساڑی آج پہنو تو دیکھوں تمہارے اوپر کیسی لگتی ہے۔ یہ بُشرٹ پہن کر آج آفس گیا تو میرے باس دیکھتے رہ گئے۔ وہ سنہا اد۔ ایں بڑا الگھاگ ہے۔ ذرا سے کیس میں اس نے تین سو پیٹ لیے۔ ملکھا سنگھ اس پنجابی لونڈیا کو آج پھر صاحب کے پاس لایا تھا۔ کس قدر حرامی ہوتے ہیں۔ یہ سالے مطلبی۔ پروموشن کے لیے چچازاد بہن کو پیش کر دیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی وائف کو آج میں نے خود اس کے ساتھ دیکھا۔ وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال رہا تھا۔ اور وہ مسکرا رہی تھی۔ کمینی۔ رنڈی۔ سالی!“

یہ باتیں راج رانی روز سُنتی تھی اور ہر روز شوہر سے پوچھ پوچھ کر کھانا بناتی رہتی اور ہر رات شوہر کی فرمائش پر لال ہری اور گلابی ساڑیاں پہنتی رہی۔ اور صبح ہوتے وقت سنتی رہی وہ مزے آ گئے، اس کا حسین جسم، اس کی شخصیت، اس کے جذبات سب ختم ہو گئے تھے وہ ایک مُردہ جسم رہ گئی تھی جس کی روح کبھی کی ختم ہو گئی تھی۔

دن آہیں بھرتے اور رات سسکتے گزر گئی لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے ایک دن اچانک ہی کھانا کھاتے کے بعد سریش چندر نے کہا ”کچھ ذائقہ نہیں آیا۔ آج سب بدمزہ ہی رہا اور یہ کہہ کر چلے گئے۔

اس دن راج رانی کا تمام جسم اور دل تھر تھر کانپنے لگا تھا وہ شخص ضرور کسی رات کو کہے گا ”مزہ نہیں آیا“

تھر تھر کانپتی راج رانی سے روٹی کا ایک لقمہ بھی نہ اُٹھا اور وہ اندر جا کر زمین پر لوٹتی رہی۔ تڑپ تڑپ کر خدا سے پوچھتی رہی۔ اب میں کیا کروں نارائن! اب میں کیا کروں؟ کیا کروں؟ پانچ سال میں آج وہ پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس رات پہلی بار شوہر کے سامنے گھگھیا کر کانپتی زبان سے کہا تھا "آج معافی چاہتی ہوں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

سریش چندر ترپاٹھی نے کہا "کوئی بات نہیں رہنے دو۔ میں بھی آج بہت تھک گیا ہوں۔ آؤ سو جاؤ۔"

سریش چندر ترپاٹھی سو گیا۔ خراٹے لینے لگا۔ لیکن قریب لیٹی راج رانی اندھیرے میں آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ گز بھر کے فاصلے پر ایک سایہ نظر آیا جو کہہ رہا تھا۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے میں تو تمہاری محبت کے سہارے زندہ ہوں۔ تم نے مجھے کیوں بھلا دیا راج رانی؟

چھلچھلاتی آنکھوں سے اندھیرے میں گھورتی ہوئی راج رانی نے کہا "میں تمہیں نہیں بھول پائی ہوں تمہیں کبھی نہیں بھلا پاؤں گی۔ لیکن میں اب تمہاری راج نہیں ہوں، پانچ سال ہوئے میں دال بھات ہو گئی ہوں۔ تمہاری راج کہاں ہوں میں! پانچ سال ہوئے گھوڑی ہو گئی ہوں۔ دیکھ لو اپنی آنکھوں سے یہ سو رہا ہے میرا سوار۔ لیکن تم اب کہاں ہو یہ تو بتاؤ کیا کوئی جیون ساتھی نہیں ملا؟ تمہارے دن کیسے گزر رہے ہیں؟ ہائے! میں کچھ نہیں جانتی۔ کچھ نہیں۔"

راج رانی کو یاد آیا۔ شادی سے پہلے وہ اس کی کنواری زندگی میں اچانک ہی آ گیا تھا۔ غریب اور بے سہارا دکھ بھری آنکھوں والا وہ طالب علم۔ جو بڑی دس میں مہرا کے یہاں رہتا ہے۔ چھت والے کمرے میں اور عوض میں ان کے دونوں نواسوں کو پڑھاتا تھا۔ مہرا نے ہی سفارش کر کے اس کی چھوٹی بہن سشما کا ٹیوٹر بنوا دیا تھا۔ ہر شام برآمدے کے کونے میں بیٹھ کر وہ سشما کو پڑھانے لگا تھا۔ ایک دن سشما ضد کرنے لگی تھی "ہم اپنے ماسٹر صاحب کو چائے پلائیں گے اور وہ بار پڑھائی چھوڑ کر دوڑتی ہوئی آئی تھی "چائے بن گئی" — "لاؤ ہم لے جائیں" تو بار کر اماں نے راج رانی سے چائے بھجوا دی تھی، وہ دن ابھی تک یاد ہے۔ راج رانی کو سامنے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا، اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا تھا۔ اس وقت راج رانی نے بڑی بہن کی طرح کہا تھا:۔

"بیٹھئے آپ۔ چائے پی لیجئے۔"

اس کے بعد وہ کبھی کبھی اس کے سامنے آتی تھی۔ رفتہ رفتہ تکلف اور جھجک ختم ہو گئی تھی۔ ایک دن اچانک سشما دوڑتی ہوئی آئی تھی "دیکھو دیدی ہمارے ماسٹر صاحب کا نام چھپا ہے۔ اس رسالے میں یہ دیکھو شری ہری موہن شرما اور یہ کویتا تو پڑھو — ٹو ساون بیت چلا۔"

اس خوبصورت نظم کو پڑھ کر راج رانی کا دل پسیج گیا تھا اور دوسرے دن اس نے پوچھا تھا۔ آپ کویتا بھی لکھتے ہیں، وہ ہنسنے لگا تھا۔ راج رانی نے سر جھکائے ہوئے پوچھا تھا "اتنی سندر کویتا کیسے لکھ لیتے ہیں؟ آپ کو کہاں سے اس کی تحریک ملتی ہے وہ اسی طرح آہستہ آہستہ ہنستا رہا تھا۔ اور راج رانی نے پھر سر جھکا کر بہت آہستہ سے پوچھا تھا:۔

"کون ہے وہ پریم کی مورتی جس پر نچھاور ہونے کے لیے آپ کی کویتا بے قرار ہے۔"

اس دن وہ اپنے اس سوال کا جواب نہیں پا سکی تھی لیکن اس پریم مورتی کے درشن پانے کے لیے وہ بہت زیادہ خواہشمند تھی — ان دونوں میں بے تکلفی بڑھتی جا رہی تھی آرٹ ادب اور زندگی کے متعلق وہ طرح طرح کے سوالات کرتی وہ عجیب عجیب جواب دیتا اور نہ جانے کس کس دنیا کی سیر کراتا کہ راج رانی خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ یہ نرم و نازک دل کو چھو لینے والے جذبات اسے بے سدھ کر دیتے۔ کالج میں جا کر ان باتوں

کا تذکرہ وہ اپنی سہیلیوں سے کرتی تھی۔ سہیلیاں تعجب سے پوچھتیں "یہ تمہارے اپنے خیالات ہیں۔ راج رانی کون سی کتابیں پڑھا کرتی ہو" راج رانی بڑی شان سے کہتی "کتاب کوئی نہیں ہے میرے نزدیک ان سب کا تعلق دل سے ہے۔ ذرا اپنے دل کے دروازے کھولو سب نظر آنے لگے گا۔ سمجھیں؟" "سمجھ گئے بھائی سمجھ گئے — ذرا من کی کوڑیاں کھول سیاں تیرے دوارے کھڑے" "لیکن وہ ہے کون جس کے لیے تم نے من کی کوڑیاں کھول دی ہیں، بتاؤ ڈیئر" یہ سن کر راج رانی شرماتی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں ہنس کر کہتی "تمہیں کیسے دکھاؤں دل میں سما گیا ہے وہ تو" سکھیاں یہ سن کر خوش ہوتیں اور کہتیں "سلامت رہو راج رانی"

یاد ہے امتحانات قریب تھے وہ روز اس سے مدد لینے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اس سے زیادہ بے تکلف ہوتی گئی اور ایک شام پھر اس نے ہری موہن کی کویتا پڑھ کر وہی سوال دہرایا تھا "کون ہے وہ جس کے استقبال کے لیے تم نے اتنے ہار پروئے ہیں اس قدر مالائیں گوندھی ہیں کیا وہ اتنا بوجھ سنبھال سکے گی"

ہری موہن ہنسا۔ "دہ نہیں یہ شک کیوں ہوا کیا تم نے کبھی گنگا کی پوتر دھارا میں عقیدت اور عبادت کے پھولوں کو بہتے دیکھا ہے؟ کسی پہ کوئی پابندی نہیں ہے گناہ گار اور پرہیزگار سب کی عبادت قبول کی جاتی ہے۔ اس کا امرت جل سب پی سکتے ہیں"

"کیا تمہاری وہ گنگا کی طرح ہے۔ شاید وہ بڑی قوت برداشت کی حامل اور بڑی فراخدل ہے۔ کیا تم اسے پیار کرتے ہو۔ حسن اور پاکیزگی کی دیوی مانتے ہو۔ لیکن وہ ہے کون یہ تو بتاؤ تم بتاتے کیوں نہیں؟ کیا مجھ پر یقین نہیں ہے؟ کیا مجھ سے کوئی خطرہ ہے۔ بولو کون ہے؟

ہری موہن نے منہ سے کچھ نہ کہا راج رانی کی کاپی پر کچھ لکھ کر اس کے سامنے رکھ دی اور سر جھکا لیا۔

ہری موہن نے صرف دو حرف لکھے تھے "تم"

یاد ہے کئی دن تک راج رانی اس سے کتراتی رہی تھی رات رات بھر نیند نہ آتی اور اس بے خودی کے عالم پر اماں کی ڈانٹ بھی سہنی پڑتی لیکن دل مانتا ہی نہ تھا گھنٹوں لیٹے لیٹے کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

اور انہی بے خودی کے دنوں میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بابو جی نے رات کو اپنے پلنگ پر لیٹ کر کہا۔ "کئی دنوں سے دماغ میں ایک بات چکر کاٹ رہی ہے سو گئی راجو؟" کونے میں لیٹی راج رانی نے جواب نہ دیا تو بابو جی کہنے لگے "سو گئی! سنتی ہو میں یہ سوچتا ہوں یہ لڑکا ہری موہن بہت ہی اچھا ہے اسی کے ساتھ راج رانی کا رشتہ کر دیں تو کیسا رہے؟ کوئی حرج ہے؟" راج رانی کا دل دھک دھک کرنے لگا سانس رکنے لگی۔ اماں نے سوچ کر کہا "حرج تو کچھ نہیں لڑکا بہت لائق ہے اور اپنے خاندان کا بھی ہے۔ بس ایک بات کھٹکتی ہے کہ بالکل اکیلا ہے۔ راجو کو ساس سسر، دیور جیٹھ، نند کسی کا بھی پیار نہیں ملے گا یہی بات ذرا قابل غور ہے"

"یہ سب کچھ نہیں" بابو جی نے کہا تھا "اصل بات لڑکے کی ہوتی ہے۔ لڑکے کی اہمیت پر غور کرو۔ میں کہتا ہوں راجو کی ماں یہ لڑکا ایک دن ترقی کرے گا۔ بہت اوپر جائے گا۔ تم دیکھ لینا چہرہ دیکھتی ہو اس کا۔ ذہانت کی کیسی چمک ہے جیسے ہیرا ہو کوئی"

"تو ٹھیک ہے اسی سے بیاہ دو راجو کو چلو فکر ختم ہوئی۔ لڑکا ڈھونڈنے میں نامعلوم کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھانا پڑتیں۔ ہری موہن اور راج رانی کا یہ رشتہ تو بھگوان کی طرف سے ہوا ہے۔"

یاد ہے ساری رات راج رانی کو نیند نہیں آئی تھی، ساری رات جاگی اور پھر اس کے بعد اس نے ہری موہن کے پاس جانا بند کر دیا۔

سب کے امتحانات ختم ہو گئے۔ سُشما پاس ہو گئی۔ اب جیسے کرنے کے لیے کوئی کام ہی نہ رہا ہو۔ ایک شام سُشما نے چپکے سے کہا "دیدی تمہیں ماسٹر صاحب بلا رہے ہیں" وہ ہچکچاتی ہوئی لڑکھڑاتے قدموں سے گئی۔ دیکھا تو ہری موہن اس کا منتظر تھا۔ کھڑے ہی کھڑے راج رانی سے بولا "آج رات کو باہر جا رہا ہوں سوچا تم سے ملاقات ہو جائے۔ پھر جانے کب ملنا ہو، تم نے میرے پاس آنا ہی بند کر دیا کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ ہر لفظ راج رانی کے دل میں چبھتا چلا گیا۔ وہ کچھ نہیں بولی آنکھیں جھکائے کھڑی رہی تو ہری موہن نے بہت نرمی اور محبت بھرے انداز میں کہا "انجانے میں مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تو معاف کر دینا۔ حدوں کو پار کر لینے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرا کوئی حق ہے تمہارا پریم پا کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہوں۔ میں تمہارا احسان نہیں بھول سکتا۔ کیا تم اسے یاد رکھ سکو گی جو تمہیں کچھ بھی نہ دے سکا؟"

راج رانی نے پھر بھی کچھ جواب نہیں دیا تو ہری موہن نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا "اچھا اب مجھے جانا چاہیے" راج رانی نے لڑکھڑاتی زبان سے صرف اتنا کہا تھا "اپنا پتہ دیتے جاؤ"

ہری موہن نے غمگین لہجہ میں کہا۔ "کہاں کا پتہ دوں تمہیں؟ میرا اپنا گھر بار کہیں نہیں ہے میں تو خانہ بدوش اور بے سہارا ہوں، جہاں پہنچوں گا وہاں سے اپنا پتہ لکھ دوں گا چھٹی باؤجی کے نام بھیجوں گا۔ نستے۔"

اُسے یاد آیا۔ انہیں گرمیوں میں اس کی شادی سریش چندر ترپاٹھی سے ہو گئی تھی۔ باؤجی کے دوست گیندن لال ترپاٹھی اچانک دروازے پر آکھڑے ہوئے تھے۔ جہیز آباد والوں سے دینے دلانے کی وجہ سے کچھ جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ انہوں نے راج رانی کے باؤجی سے سینہ ٹھوک کر کہا تھا۔ دکھا دوں گا، ان دوغلوں کو کہ گیندن لال شیطان نہیں برہمن ہے۔ اگر مجھے بغیر روپیہ پیسے شادی کرنی ہے تو میں پڑھی لکھی سلیقہ مند غریب باپ کی بیٹی سے شادی کیوں نہ کروں۔ تم بھی تو مصر ہی ہو؟ لو سادہ دیکھ لو مصریوں میں ہی شادی ہو رہی ہے۔ میں بھگوان کی قسم کھا کر آیا ہوں تم سے ایک پیسہ بھی لوں تو گئو ماتا کا مانس لوں "یہ برہمنوں کی شادی ہو گی بغیر کسی طرح کا لین دین کیے۔ دیکھو دوست میں بہت ارمان لے کر تمہارے دوار آیا ہوں۔ بیٹیا مجھے پسند ہے اب اگر تم نے انکار کیا تو تمہاری چوکھٹ پر ہی اپنے پران تیاگ دوں گا۔"

باؤجی اور اماں یہ سُن کر پھولے نہ سمائے تھے اس قدر امیر خاندان لڑکا ایم۔ اے۔ برسرِ روزگار، تندرست، ملنسار، ہنس مکھ اور ساتھ ہی لینے دینے کا کوئی سوال نہیں۔ یہ خدا کا کرم ہی تھا ورنہ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی۔

راج رانی سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ نہ خود راج رانی کچھ کہہ پائی تھی۔ اُسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ نہ روئی نہ چلائی نہ کسی بات کو منع کیا۔

اس رات جب ٹیکا چڑھ رہا تھا وہ چھت پر کھڑی ہو کر ہری موہن کے کمرے کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی اور ہونٹ بند کیے کیے اپنی پوری طاقت سے پکار رہی تھی۔ "تم کہاں ہو تم کہاں ہو"

سریش چندر ترپاٹھی کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی تھی۔

ہری موہن سے جدا ہوئے چھ سال ہو گئے تھے۔ اب وہ جانے کہاں تھا۔ وہ پھر لوٹ کر نہیں آیا اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ کوئی خط نہیں آیا۔ یا شاید باؤجی کے پاس آیا ہو۔ اُسے کیا معلوم کہ اس کی غیر موجودگی میں یہاں کیا سے کیا ہو گیا۔

وہ کبھی کسی کی گنگا تھی لیکن اب تو دال بھات ہو گئی۔ کھوڑی بن گئی۔

اور اب اس دال بھات کو کھانے والا منہ بگاڑنے لگا تھا۔ بدمزہ اور بدذائقہ ہونے کی شکایت ہو رہی تھی۔ شاید کسی روز وفادار گھوڑی کی سواری بھی بدمزہ لگے۔ اس دن کا انتظار تھا۔

انتظار۔ نریش کا خط پھر یاد آگیا کل صبح وہ آ رہا ہے، وہ اپنا پیارا بھائی، دیور، صبح تک وہ اس کا انتظار کرے گی۔ انتظار میں بھی کتنا سکھ ہے، کس قدر خوشی ہے۔ یہ خوشی اس کی اپنی خوشی ہے۔

انگڑائی لے کر راج رانی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ جیسے تین گھنٹے کوئی غم اور خوشی سے بھرپور فلم دیکھی ہو اور اس کا اثر ابھی تک دل و دماغ پر ہو۔ باہر جوتوں کی آواز سنائی دی۔

سریش چندر ترپاٹھی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ یہ لو تمہارا خط ہے۔ دروازے پر پڑا تھا۔ پڑھ لو۔ تمہاری بہن سشما آ رہی ہے میں نے بھی اُسے بہت دن سے نہیں دیکھا اب تو اور بھی خوب صورت ہو گئی ہوگی، نریش بھی آ رہا ہے اور سشما بھی آ رہی ہے۔ کل تو مزے آجائیں گے۔

دوسرے دن واقعی اس آنگن میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھر رہی تھیں۔ چھوٹی بہن اور دیور کو پا کر راج رانی بہت خوش تھی۔

سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ گپ شپ کرتے دوپہر گزری تو نریش نے کہا۔ بھابی تم تیار رہنا میں ذرا اگر جا شنکر کا یہ سامان اس کی بوا کے پاس رکھ آؤں۔ پھر فلم دیکھنے چلیں گے۔

اُدھر سشما نے پوچھا۔ جیجا جی آپ کے شہر میں دیکھنے کے لائق کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سریش چندر نے ایک لمبی فہرست سنادی۔ سشما بہت خوش ہوئی اور بولی۔ اور سب تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ آج آپ مجھے پرانا قلعہ دکھا دیجئے۔ بارھویں صدی کی عمارت کے کھنڈر میرے لیے بڑی دلچسپی کا سامان مہیا کریں گے، چلیں گے نا؟

ضرور چلوں گا بھائی تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ آخر تم میری اکلوتی سرتاج لا ہو اور میں تمہارا اکیلا جیجا جی ہوں تمہارا موسٹ او بیڈینٹ سرونٹ

سریش چندر نے جھک کر فرشی سلام کیا تو سشما ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ نریش کو واپس آنے میں بہت کم دیر لگی۔ راج رانی نے آج بہت دنوں کے بعد اپنی پسند کا لباس پہنا تھا اور اپنی پسند کا میک اپ کیا تھا۔ آج آئینہ میں خود کو دیکھ کر اسے بہت سکون حاصل ہوا تھا، وہ آئینہ کے سامنے کھڑی تھی کہ نریش آہستہ سے کھانسا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو نریش نے خوش ہو کر کہا "بہت اچھے بھابی۔ داد دیتا ہوں تمہاری ۔ واہ مزے آگئے" اس نے بھائی صاحب کے انداز میں سر ترچھا کر کے کہا تو راج کو ہنسی آگئی۔ اور بولی۔ حاضر ہوں خدمت کے لیے کیا حکم ہے جناب؟

"بغلگیر ہو جاؤ۔ باقی لوگ کہاں ہیں۔؟

"میں نے ان کو دفع کر دیا، چلیے تشریف لے چلیے"

رکشا کافی دور نکل آئی تو بھابی نے آہستہ سے کہا چپ کیوں ہو؟ بولو کچھ!

کیا بولوں" نریش نے کہا۔ میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ میٹر اپنے کمرے میں لگوا لیا تھا، دو ماہ تو ٹھیک کام کرتا رہا۔ لیکن اب اس کا یہ حال ہے کہ چکر الٹا چل رہا ہے۔ یعنی کبھی کبھی وقت کا چکر بھی الٹا گھومنے لگتا ہے یہاں آ کر اس کا یقین ہو گیا۔

"یہاں آ کر۔ یہاں آ کر کیا دیکھ لیا ایسا؟"

"تم بھابی، تمہاری عمر تو پیچھے لوٹ رہی ہے بالکل کمسن لڑکی معلوم ہوتی ہو پہلے سے زیادہ سندر ہوگئی ہو"

"چپ رہو بڑے بدتمیز ہوگئے ہو"

نریش نے کہا "تمہیں دیکھ کر بدتمیزی کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ سچ بھابی۔

تمہارے بھائی صاحب سے شکایت کر دوں گی۔ ہنس کر بولی۔

"جھوٹ بول رہی ہو شکایت نہیں کرو گی"

"کر دوں تو" مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بھابی کہنا چھوڑ دوں گا، پھر ماتا جی کہا کروں گا"

"بھابی تو ماں کے برابر ہی ہوتی ہے"

غلط — بھابی تو آدھی بیوی ہوتی ہے۔ ہاف وائف اور تم کسی بھی راہ چلتے سے پوچھ لو میرے پاس بیٹھی ہو، میری بیوی بتائے گا، تمہیں کہے گا، جوڑی اچھی ہے۔ سمجھیں۔

سمجھ گئی۔ بھابی نے ہنسی کو دبا کر کہا۔ ایسا ہی ہے تو پھر مجھے اپنے ساتھ ہی لے چلو۔

"سچ کہہ رہی ہو"

کیوں یقین نہیں آتا؟"

"بھائی صاحب کیا کریں گے پھر؟

"جھک ماریں گے نہیں تو کوئی اور تلاش کر لیں گے۔ عورتوں کی کیا کمی ہے دنیا میں۔ اب بتاؤ۔

نریش نے ذرا سنجیدگی طاری کر کے کہا "ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے، تمہیں یوں ہی بھگالے جانے سے مزہ جاتا رہے گا۔ پہلے رومانس لڑاؤ، دھیرے دھیرے پیار کی پینگیں بڑھاؤ۔ لمبے لمبے پریم بھرے خط لکھو۔ راتوں کو جاگو۔ آہیں بھرو۔ آنکھیں پُرنم رہیں، چہرہ زرد، نہ کھانے کی سُدھ نہ کپڑوں کی کھوئی کھوئی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھو۔ یہ سب کرو تو ذرا محبت میں مزہ آئے۔ یہ کیا کہ نہ برہ کی آگ سلگی نہ ملنے میں کوئی رکاوٹ آئی۔ چٹ سے بھاگ کھڑی ہوئیں میرے ساتھ۔

اچھی بات یہی کروں گی آج۔

"اے رکشا والے روکو روکو" رکشا رک گیا بھابی نے چونک کر پوچھا۔

"کیا ہوا"

اُترو جلدی —— نریش نے کہا۔

بھابی کا ہاتھ پکڑ کر نریش قریب کے ریسٹورنٹ میں آ کھڑا ہوا۔

"یہاں کہاں لے آئے"

"کیوں کیا اتنے میں گھبرا گئیں۔ دھیرج رکھو یہ بار ہے شراب خانہ ساتھ بیٹھ کر ایک ایک پیگ شراب پئیں گے۔ پیو گی نا؟

نیوں گی" بھابی نے کیبن میں بیٹھتے ہوئے پوچھا" پھر کیا کریں گے ۔
" پیار ۔ بھابی سننے میں لاج اور شرم سب جاتی رہتی ہے ۔تمہیں ذرا بے شرم کردوں"
ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا آرڈر لینے آگیا " دو کپ چائے اور ٹوسٹ " بھابی مسکراتی ہوئی بولی :۔
" شراب کو نہیں کہا"
نریش نے بھابی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور آہستہ سے بولا، بوتل کی شراب پی کر کیا ہوگا۔آنکھوں کی شراب بہت نشیلی ہوتی ہے ۔
بھابی کا چہرہ لال ہوگیا پلکیں گر گئیں اور بولی ذرا جامے کے اندر رہو اب" یہ کہہ کر ہنس دی ۔
یہ لوگ بل ادا کرکے باہر نکلے تو قریب کے کیبن میں رام سریش ترپاٹھی کے ساتھ بیٹھی ہوئی سشما کی نگاہ راج رانی کی ساڑھی پر پڑی اسے ـــ دیدی اس نے سٹ پٹاکر کہا ۔
چپ رہو ۔رام سریش ترپاٹھی آہستہ سے بولے "جانے دو انہیں"
" دیدی کو اگر معلوم ہوا تو ۔"
" تو کیا ہوگا ۔کیا ہم کوئی بُرا کام کررہے ہیں ؟ تم میری سالی ہو یا نہیں ۔
" جی ہوں سشما نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ہنس کر کہا ۔
اور میں تمہارا جیجا ہوں یا نہیں ۔
" جی ہیں "
" تو پھر بس اتنی مدت کے بعد تو تم مجھے ملی ہو کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ تمہیں اپنے ساتھ بٹھاکر چائے پانی پی لوں "
سشما نے ہنس کر کہا پورا حق ہے ،لیکن آپ تو رک گئے یہ سینڈ وچ کھائیے نا "
" نہیں میں تو تمہیں کھاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ۔بہت اچھا لگ رہا ہے ۔ ہاں کس کر ۔ پھر کاٹو تو اپنے دانتوں سے ۔ یوں ! اور انہوں نے عجیب سی حرکت کی تو سشما نے شرما کر کہا ۔ جائیے آپ بڑے وہ ہیں "
ابھی آدھا گھنٹہ پہلے وہ دونوں پرانے قلعہ کی برج پر بیٹھے تھے ۔آسمان پر ہلکے ہلکے بادل آگئے تھے اور رک رک کر نشیلی ہوا کے جھونکے آرہے تھے ۔ سشما کے بال اڑ رہے تھے وہ ان کو بار بار سنبھال رہی تھی کتنی پیاری لگ رہی تھی اس کی یہ ادا ، سریش چند ترپاٹھی اس کے حسن سے محظوظ ہوتے ہوتے بولے " میرے ایک ساتھی تھے ان کی ایک سالی تھی انٹر میں پڑھتی تھی" انہیں کے یہاں رہنے لگی تھی" میرے دوست اسے بہت پیار کرتے تھے ، ان کا پیار کرنا بھی واجب تھا ، میں نے خود اس لڑکی کو دیکھا ہے ۔ بے حد خوب صورت تھی ، بھلا جب ایسی لڑکی چوبیسوں گھنٹے نظر کے سامنے رہے تو پیار کرنے کو کیسے دل نہ چاہے گا ۔ وہ لڑکی بھی رفتہ رفتہ اپنے جیجا جی کو پیار کرنے لگی ، میرا وہ دوست بھی بڑا ہینڈسم تھا ۔
" جیسے آپ " سشما نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"تو اس طرح سالی جیجا جی کا پیار ہو گیا اور نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

"کیا نتیجہ ہوا؟"

سر جھکا کر بولے" —— پریگنینٹ ہو گئی تھی وہ میرے ساتھی نے باقاعدہ شادی کر لی۔ پھر دو عورتیں یعنی کہ دو کھلی کھلی جوانیاں اس کے اغل بغل تھیں، کس قدر خوش نصیب تھا وہ۔

سشما نے بھی مسکراتے ہوئے نظریں دوسری طرف کر کے پوچھا:۔

"آپ بھی ایسا ہی ارادہ کر رہے ہیں کیا؟"

تریاٹھی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ارادہ کیا خاک کروں اب تو قاعدہ ہی بدل گیا کوئی ہندو دو شادیاں کر ہی نہیں سکتا۔

"تو پھر اب کیا کیجیے گا؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اپنی تقدیر کو کوسیں گے۔ یعنی کہ پروسی ہوئی تھالی سامنے ہے مگر ہاتھ نہیں لگا سکتے، کھا نہیں سکتے:

سشما نے کھلکھلا کر کہا، "جو سچ مچ بھوکا ہوتا ہے آنکھیں بند کر کے کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے، خواہ اوپر سے سر پر جوتے ہی پڑتے رہیں، کھائے چلا جاتا ہے"

تریاٹھی نے سر ہلا کر کہا "غلط! بھوجن کے زبان نہیں ہوتی اور عورت ایک جاندار چیز ہوتی ہے، ایک بولتی ہوئی چیز۔ وہ اگر کہے——!

"آؤ مجھے کھاؤ——یہی نا؟ سشما نے ہنس کر کہا—— جیجا جی آپ نے پیار کی تعریف بڑے گھٹیا درجے کی ہے 'آئی ڈونٹ لائک دس' کوئی خوب صورت سی تعریف کیجیے ——

تریاٹھی نے کہا دیکھو بھابی ابھی تمہارے ساتھ رہنے کے لیے صرف دو گھنٹے ملے ہیں، آہستہ آہستہ اثر ہو رہا ہے۔ کچھ روز میرے پاس رہ جاؤ تو بڑی اونچی اڑانیں بھرنے لگوں گا سمجھیں"

"سمجھ گئی چلیے بہت ٹائم ہو گیا" وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ برج کا زینہ بہت ڈھالو تھا اور ایک جگہ اندھیرا بھی بہت زیادہ تھا۔ سشما نے پیچھے سے پکار کر کہا "رکیے تو، اپنا ہاتھ دیجیے ذرا مجھے کچھ نہیں نظر آ رہا ہے۔

تریاٹھی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، سہارا دے کر اتار لائے اور بس اسٹینڈ تک اس کا ہاتھ پکڑے رہے۔ بس آئی تو کہیں دو سیٹیں ایک جگہ خالی نہ تھیں۔ سشما نے ہونٹ سکیڑ کر کہا، "اترئیے رکشا کر لیجیے یہاں تو ساتھ بیٹھنا بھی نصیب نہ ہو گا"

تریاٹھی اس کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوا فوراً رکشا منگایا، رکشا والا نوجوان تھا، سونی سڑک پر اس نے رکشا سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا۔ سشما کا آنچل بار بار سریش چندر تریاٹھی کے منہ پر آتا۔ دھکا لگا تو سشما اس کے اوپر جھک گئی۔ اسی طرح تمام راستہ گزر گیا۔ سریش چندر تریاٹھی جھوم رہے تھے، گنگنا رہے تھے۔ رات کو آگے پیچھے دونوں رکشا دروازے پر رکے تو بابا وجہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے

اس کے بعد تھوڑی دیر تک نو فلموں پر تنقید ہوئی سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور بعد میں تاش کا نمبر آیا۔ بغیر کہے سنے سشما جیجا جی کے ساتھ ہو گئی اور نریش کی پاٹنر بھابی بن گئی۔ شروع کی دو بازیاں نریش جیت لیا تو سشما نے جھلا کر کہا "جیجا جی کیا آپ سو رہے ہیں کیا

نیند میں پتے پھینک رہے ہیں ؟"

ترپاٹھی نے سینہ تان کر کہا "اچھا اس بار دیکھ لوں گا موذیوں کو سب ایمانی نہیں چلے گی، نہیں چلے گی سشما! مائی ڈیر سسٹران لا ہوشیار!" ترپاٹھی نے واقعی بازی جیت کر دکھائی اور سینہ تان کر بولے "یوں جیتتے ہیں کھیلنے والے۔ بولو میرے ہمدم اب تو خوش ہونا؟"

سشما خوش ہمتی نریش بغیر کچھ بولے پتے پھینٹ کر ترپاٹھی سے بولا "کاٹئے" اور بھابی کی طرف دیکھ کر بولا "اپنی کھوپڑی پہ زور ڈالو تم سب معاملہ خراب کیے دے رہی ہو"

ترپاٹھی نے سشما کی طرف آنکھ مار کر کہا "دیکھ لو! پیر اکھڑ گئے دشمنوں کے" سشما کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ترپاٹھی نے ڈانٹا "خبردار۔ اس بار سخت مقابلہ ہے لگائے جاتے۔ بر رے فتح۔ بسم اللہ۔ یہ غلام چڑی کا"

نریش نے فوراً چڑی کی بیگم ڈال دی سشما کا نمبر تھا۔ ترپاٹھی چلا کر بولا "دیکھتی کیا ہے کر دے ترپ چال"

"بھائی صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں"

"بچہ ہے۔ نادان ہے۔ کچھ سمجھتی نہیں ہے ذرا سہارا..."

سشما نے سوچ سمجھ کر ترپ کی چوکی ڈال دی۔ نریش نے دیکھ کر کہا "بھابی چھکا پنجا ڈالو کچھ"

"یہ زیادتی ہے"

"آپ بھی تو بول رہے ہیں"

ترپاٹھی نے سر ہلا کر کہا "نریش ذرا عقل سے کام لو کہاں ایک نئی بچھڑی اور کہاں ایک پرانی لدو گھوڑی۔ یعنی کہ تم دونوں کو برابر کیے دے رہے ہو"

راج رانی نے ہاتھ کے پتے وہیں رکھ دئیے اور بغیر ایک لفظ بولے اٹھ گئی۔ نریش اس کے پیچھے بھاگا۔

سشما نے پریشان ہو کر کہا "آپ نے سارا کھیل بگاڑ دیا کیسے ہیں آپ"

ترپاٹھی ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا آگے کی طرف جھک کر دھیرے سے بولا۔ "تو کیا اُسے کہوں؟

راج رانی کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی، نریش نے آ کر کہا بھابی کیا تم ناراض ہو گئیں؟ بھائی صاحب کے منہ میں تو لگام ہی نہیں ہے جو دل میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں، ان کی طرف سے میں تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔

راج رانی نے بڑی مشکل سے ہنس کر کہا "نہیں ناراض نہیں ہوں، کھیلتے کھیلتے میرا دل بھر گیا۔ اسی لیے چلی آئی۔ بیٹھو ذرا تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں"

نریش پلنگ پر بیٹھ گیا تو راج رانی اٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے بغیر کسی تمہید کے اس سے سوال کیا ـــ "سشما کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے اُسے اپنا سکو گے" یہ سن کر نریش چونک پڑا، کچھ دیر خاموش رہا پھر بھابی سے سوال کر بیٹھا "کیا سشما مجھے اپنا سکے گی"

یہ سن کر بھابی چونک پڑی اور دیور کے چہرے کو تقریباً گھورتے ہوئے کہنے لگی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ تمہیں نہیں اپنائے گی تمہیں

یہ شک کیوں ہوا۔

"میرا یہ شک درست ہے بھابی۔ میں عورت کو نہ تو صرف جنسی بھوک مٹانے والی چیز مانتا ہوں نہ داسی اور نہ دیوی ماننے کو تیار ہوں۔ عورت کی اپنی ایک طاقت ہے تم جانتی ہو انگریزی میں عورت کے لیے ایک لفظ ہے بیٹر ہاف میں اسے بیٹر ہاف ہی مانتا ہوں۔ مرد عورت کے بغیر ادھورا ہے جیسے برابر لائنوں پر چلتی دو پٹریاں ہوتی ہیں۔ جیسے ان پٹریوں کی بناوٹ ایک سی ہوتی ہے۔ جن کا وجود ایک دوسرے پر منحصر ہے اور جس طرح ایک پٹری پر گاڑی نہیں چل سکتی، اسی طرح چھوٹی بڑی پٹریوں پر بھی گاڑی کا چلنا ناممکن ہے۔" بھابی اس کا منہ تکتی رہی تھی۔ نریش نے کچھ دیر ٹھہر کر کہا "میرا شک بے بنیاد نہیں ہے۔ بھابی۔ حسن۔ جوانی نظر انداز کرنے کی چیزیں نہیں ہیں، بہت بڑی اہمیت ہوتی ہے ان کی۔ لیکن بھابی اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ضروری ہے۔ جس کی اہمیت ان سے بھی زیادہ ہے، خاص طور پر کسی نوجوان مرد اور عورت کا اپنے جیون ساتھی کو تلاش کرتے وقت اور چیزوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ بھابی۔ خاص مسئلہ شادی کا نہیں ہے۔ بلکہ ہم خیال۔ ہم پسند ہم نظر کا ہے۔ جسم کی پیاس بجھانے والا دل کو بھی سکون پہونچا سکے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ نہیں تو زندگی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ آدھا ٹکڑا تو جیسے کٹ کر گر جاتا ہے، کس قدر ناقابل برداشت حالت ہوتی ہے۔ یہ عورت اور مرد دونوں کے لیے۔ میں قطعی نہیں جانتا تمہاری بہن کے کیا خیالات ہیں۔ آئندہ زندگی کے متعلق وہ کیا سوچتی ہے۔ اس سے صرف دو چار بار ملنا ہوا ہے اور ابھی یہ سفر ساتھ ساتھ ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی کیا دلچسپی ہے کس چیز سے اسے خاص لگاؤ ہے لیکن یہی تو کسی کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے اس کے دل میں بھی عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی تمنا ہو، جیسی کہ عموماً ہر لڑکی کی ہوتی ہے یا ہو سکتا ہے آرٹ اور ادب کا اسے ذوق ہو یا ممکن ہے مطالعہ اور تحقیق ہی اس کے دلچسپ موضوع ہوں۔ بھابی میرے پاس ان میں سے ایک چیز بھی نہیں ہے، نہ میں انہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں اور نہ کبھی پا سکوں گا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں ایک غریب باپ کا بیٹا ہوں جن کی ہستی گینڈن لال ترپاٹھی کے سامنے دو کوڑی کی رہی ہے، مڈل اسکول کی ماسٹری کر کے خاموشی سے انہوں نے اپنی زندگی بسر کی ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو میں شروع ہی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوں میرے پتا کی اتنی ہستی نہیں تھی کہ مجھے پڑھا پاتے اس لئے ٹیوشن کر کے پارٹ ٹائم میں نے پڑھا ہے۔ میں سروس نہیں کرنا چاہتا۔ ایم ایس سی ہو جاؤں تو پھر ایک فیکٹری چلاؤں۔ یہ میری خواہش ہے۔ کچھ متوسط گھرانے کے میرے دوست میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں، امداد باہمی کے ڈھنگ پر خود اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے فیکٹری چلائیں گے اور وہ چیزیں بنائیں گے جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ بھابی اپنے سماج کی۔ اپنے ملک کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا، اس سے زیادہ خوشی مجھے اور کیا ہو سکتی ہے کام بڑھ گیا تو ہم غیر ممالک میں بھی اپنا سامان بھیج سکیں گے۔ یہ ایک چھوٹی سی اسکیم ہے ہم لڑکوں کی۔ اگر کچھ نہ ہو سکا تو اپنے گاؤں کو ہی لوٹ آؤں گا، اور پھر نئے ڈھنگ سے کاشت کروں گا تاکہ پیداوار دوگنی ہو جائے۔ اچھی پیداوار کے ذرائع کسانوں کو بتاؤں گا، اس طرح تمام ملک کو فائدہ ہو گا۔ اور اسی کام میں اپنی زندگی صرف کروں گا۔ بس بھابی میں نے یہی سوچا ہے اور یہی مجھے کرنا ہے تو بھابی اب تم ہی بتاؤ کیا تمہاری بہن فیکٹری مزدور کو، ایک ٹریکٹر چلانے والے کسان کو اپنا پتی کہتے ہوئے اپنے کو خوش قسمت محسوس کر سکے گی؟ کیا وہ ہماری فیکٹری کی آفس انچارج ہو سکے گی؟ کیا وہ ہمارے گاؤں کی فصلوں کے حساب کتاب سنبھال سکے گی؟ پوری طرح ساتھ دے سکے گی تن من سے؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو بھابی اس کی اور میری دونوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ تمہیں سوچو!

راج رانی کو سکتہ ہو گیا تھا۔

بھابی کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری کوئی بات بھی نہیں جانتا۔ بھگوان جانتا ہے کتنی بار راتوں کو پڑھتے پڑھتے۔ اندھیرے کمرے میں بیٹھے تمہاری شکل میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اور میں نے دل ہی دل میں اس مظلوم سے کہا۔ تمہاری خاموش عبادت، تمہاری یہ قربانی بالکل بیکار ثابت ہوئی۔ سولہ آنے بیکار۔ تمہاری اس گھٹن سے دیش کو۔ سماج کو اور قوم کو کوئی بھی تو فائدہ نہیں پہنچا۔ تم کیا ہو کسی نے سمجھا ہی نہیں، شاید کسی عظیم ادیب کے لیے ادب کی تخلیق میں تم تحریک کا باعث ہوتیں، کسی آرٹسٹ کے آرٹ کا سرچشمہ بن سکتی تھیں۔ تمہاری جھپنددوں بھری اور خیالوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، محبت، ممتا، ہمدردی سے لبالب بھرا ہوا تمہارا یہ دل سمندر کی طرح ہے۔ بلند خیالی، پاکیزگی، سادگی شاید تم سماج کو بہت کچھ دیتیں، لیکن اب تمہاری شخصیت کو مہر لگا کر بند کر دیا گیا ہے، تالے لگا دیئے گئے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اور اب جو کچھ تم ہو۔ جو کچھ باقی بچ گئی ہو، بہت دکھ ہوتا ہے تم کو دیکھ کر۔ بھابی مجھے یہ کہنے میں کچھ بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی کہ بھائی صاحب تمہارے لائق بالکل بھی نہ تھے اور ہو سکتا ہے بھابی میں بھی تمہاری بہن کے لائق نہ ہوں۔ تم مجھ سے جو کچھ پوچھ رہی ہو، اسی سے پوچھو۔"

راج رانی کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا اس کے ہونٹ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے اور وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی! ... ...

... اتنی دیر تک اکیلے ترپاٹھی کے ساتھ تاش کھیلتی سُشما تھک گئی تو اس نے انگڑائی لے کر کہا — بس جیجا جی اب بند کرو کل پھر۔"

"کل پھر میرے ساتھ کھیلو گی نا؟" ترپاٹھی نے خوش ہو کر پوچھا۔

"اجی کل ہی کیوں روز کھیلوں گی آپ کے ساتھ ابھی تو مجھے پندرہ دن رہنا ہے یہاں۔ گھبراتے کیوں ہیں؟"

"ویری گڈ ویری گڈ۔ جیو راجہ جیو۔" ترپاٹھی خوش ہو کر بولے اور وہ کھِل کھلاتی ادھر بھاگ آئی۔

نریش تب تک اُٹھ گیا تھا، راج رانی خاموش پلنگ پر لیٹی تھی اُسے گم سا دیکھ کر سُشما نے کھڑے کھڑے ہی پوچھا:۔

"کیا ہوا دیدی"

"کچھ نہیں ہوا" راج رانی نے ذرا مُسکراتے ہوئے کہا "لائٹ بند کر دے، آج میرے پاس یہیں سو جا۔"

دونوں بہنیں ساتھ ساتھ لیٹ گئیں تو راج رانی نے سُشما سے پوچھا:۔

"سوشی تو شادی کب کرے گی؟"

چھوٹی بہن نے فوراً سوال کیا "کیوں پوچھ رہی ہو دیدی، کیا سیٹھ گیندا لال کا کوئی اور بیٹا باقی ہے۔ جن کے لیے مجھے چُنا جا رہا ہے۔"

بڑی بہن نے ہنس کر کہا — "ان کے پاس تو ایک لڑکا تھا وہ خوش قسمتی سے مجھے مِل گیا، اب کوئی گنجائش باقی نہیں ہے تو اپنے دل کی بات بتا شادی تو کرے گی نا؟"

تب سُشما نے آہستہ سے کہا — "شادی کے لیے دل کیسے چاہے دیدی؟ شادی سے مجھے کیا حاصل ہو جائے گا؟ تمہاری یہ چھوٹی سی گرہستی ہے۔ ہر قسم کا آرام ہے لیکن دیدی یہ چھوٹی سی دُنیا جس میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں مجھے پسند نہ ہو اور بڑی دنیا جہاں صرف

کی ہی ملی ہو ایسی دُنیا میں اگر رہنا چاہوں تو شاید تمہیں میری بات غلط معلوم ہوگی، لیکن دیدی ہر ایک کی اپنی پسند ہوتی ہے اور اپنی قسمت ہوتی ہے۔ دیدی تمہیں میرے ان ماسٹر صاحب کی یاد ہے ہری موہن شرما، یاد ہیں نا؟"

راج رانی کے دل کو چوٹ لگی وہ کانپ گئی۔ اچانک ہی مُنہ سے نکلا "کہاں ہیں وہ؟"

سُشما نے کہا، وہ اب ہماری یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ دیدی تم نہیں جانتیں وہ کتنے بڑے انسان ہیں۔ اُن کی شخصیت کو تمہارے سامنے کس طرح پیش کردوں، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ان کی تعریف کے لیے اتنے روز تک برابر ان کے ہمالیہ کی طرح پاکیزہ، بلند اور مضبوط خیالات کو سُنتے سُنتے اب مجھے گھر گرہستی میں گھری ہوئی عورت کی زندگی بہت پست معلوم ہوتی ہے۔ دیدی تم یقین کرو جسمانی رشتوں کو میں نہیں جانتی۔ میک اَپ مجھے بُرا لگتا ہے، سہیلیاں مجھے ہیجڑا کہتی ہیں۔ شاید ایسا ہی ہو تو بھی کیا نقصان ہے۔ پروفیسر شرما کہتے ہیں کہ "ہمیں بہت کام کرنا ہے تعلیم تو صرف ایک سیڑھی ہے منزل علیحدہ ہے۔ ملک آزاد ہوا ہے اُسے ترقی کی ضرورت ہے کسی بھی کام میں خود کو لگایا جا سکتا ہے۔ غریبی، گندگی، بے ایمانی، بدکرداری یہ سڑی گلی روایتیں انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے ہمیں ملک کو آگے بڑھانا ہے۔" وہ یہی سبق دیتے ہیں دیدی اکیلی میں ہی نہیں مجھ جیسے کتنے ہی طالب علم لڑکے اور لڑکیاں اس طرف قدم اٹھا رہے ہیں، میرے پاس وقت ہی کہاں ہے، گیندن لال یا چمپا کے بیٹے کی جسمانی بھوک مٹانے اور ان کی خدمت کرنے کے لیے میرے گرو دیو کو فیلوشپ ملی ہے۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی میں شاید مجھے بھی ان کے ساتھ جانا ہو، اسی لیے تم سے ملنے چلی آئی۔"

سُشما خاموش ہو گئی تو راج رانی نے آہستہ سے پوچھا:۔

"کبھی مجھے یاد کیا"

سُشما نے کہا: "تمہارا تذکرہ ایک بار کیا تھا۔ پوچھ رہے تھے راج رانی خوش ہے نا؟ میں نے کہہ دیا تھا دیدی خوب خوش ہے پھر کبھی نہیں پوچھا، اب سو جاؤ دیدی بہت رات ہو گئی ہے۔"

کروٹ بدل کر سُشما سو گئی لیکن راج رانی کو نیند نہیں آئی، وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔ "سُنا تُو نے؟ نریش نے اپنے پلان بنا لیے ہیں، وہ بھی پورے ہوں گے کبھی۔ تیری چھوٹی بہن جو تیرے پاس لیٹی ہے، خدمت خلق میں زندگی گزارنا چاہتی ہے، گندی جسمانی بھوک کو مٹانے والی زندگی کو پسند نہیں کرتی، ہری موہن جو کبھی تیرا سب کچھ تھا، اس نے اپنا مقصد پا لیا ہے، لیکن افسوس تیری آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوئیں، یہ بتا تو آج کیا ہے۔ سریش چندر ترپاٹھی کی ایک وفادار گھوڑی بن کر رہ گئی ہے۔ تیری اہمیت کیا ہے آج؟ تو صرف گھوڑی ہے گھوڑی۔"

تمام رات راج رانی نے جاگ کر ہی گزاری ترپاٹھی ہمیشہ دیر سے ہی اُٹھتے تھے، اس دن کچھ زیادہ ہی سوئے، آنگن میں دھوپ پھیل گئی تو اُٹھے، بیڈ ٹی سامنے آئی تو جیسے یاد کر کے پوچھا "اور لوگ کہاں ہیں؟" راج رانی نے بیزاری سے کہا "وہ دونوں پرانی مسجد تک گھومنے گئے ہیں۔"

"بیٹھو ذرا۔ یہیں آ جاؤ میرے پاس۔" ترپاٹھی چائے کا گھونٹ لے کر پوچھنے لگے۔ "رات سُشما تم سے کیا بک رہی تھی؟ چونکو مت میں وہیں کواڑوں کے پاس کھڑا سُن رہا تھا پوچھو کیوں؟ تو بھائی تم تو جانتی ہو مجھے اپنی خوراک نہ ملے تو طبیعت بے حال ہو جاتی

ہے لہٰذا دبے پاؤں اُدھر گیا تھا، سوچا تھا سُشما نیند میں ہو گی تم اپنے پلنگ پر اکیلی ہو گی، چپ چاپ جا کر تمہیں دبوچ لوں گا۔ سارا پلان چوپٹ ہو گیا بڑی جھنجھلاہٹ معلوم ہوئی اس وقت سُشما کی آواز سُن کر ایک بار تو میرا دل چاہا کہ اندھیرے میں ہی دونوں بہنوں کے بیچ ——"

قہقہہ مار کر ہنس پڑے پھر جلدی جلدی چائے ختم کر کے کہنے لگے۔ "تمہاری بہن جو کچھ کہہ رہی تھی تم نے اس پر غور کیا؟ کچھ سمجھا؟ راج رانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ترپاٹھی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "یہ پروفیسر بھی عجیب ہوتے ہیں ایک دم چغد۔ دیکھو تو اچھی خاصی نوجوان لڑکی کا دماغ خراب کر کے رکھ دیا نالائق نے۔ بھلا عورت کہیں اس کام کے لیے ہوتی ہے کہ دُنیا میں اِدھر سے اُدھر بھاگتی پھرے؟ دیش کی غریبی دور کریں گی کماری سُشما! بڑے بڑے مر گئے، اپنی زندگی مٹا دی، لیکن مُلک کی حالت جہاں تھی وہیں ہے، تو اب لونڈیوں کو سونپا جا رہا ہے یہ کام ضرور ترقی ہو گی۔ جوان جوان لونڈیاں کندھے پر جھولا ڈالے گھومیں گی ہر شہر ہر دفتر میں پہنچیں گی تو کرپشن مٹے خواہ نہ مٹے یار لوگوں کے ارمان تو پورے ہو ہی جائیں گے۔ واہ گرو۔ واہ!

راج رانی پھر کچھ نہیں بولی تو ترپاٹھی نے اپنی تقریر جاری رکھی "ارے بھئی مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے، آخر وہ پروفیسر بچہ اس نوجوان لڑکی کو اپنے ساتھ اتنی دور کیوں لیے جا رہا ہے؟ تمہاری ماں اور تمہارے باپ اس کی اجازت دے دیں گے میرے ماں باپ تو ہرگز نہ مانتے اور پھر مجھے بھی یہ بے جا حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ وہ خواہ تمہاری بہن ہو یا میرا بھائی، مجھے تو وہ بھی پسند نہیں تھا، جب تم نے ان دونوں کو اکیلا بھیج دیا تھا۔ وہ اُٹھتی ہوئی جوانیاں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو آگ لگ جاتی ہے۔ یہ جانتی ہو کہ نہیں؟

"راج رانی پھر بھی کچھ نہیں بولی تو ترپاٹھی نے پلک جھپکتے اسے اپنی گود میں کھینچ لیا اور پیار سے چُوم کر بولے "ناراض ہو شاید۔ غلطی تو تمہاری تھی، بھلا سشما کو اپنے قریب کیوں سُلایا۔ بتاؤ تمہیں کیسے خوش کرتا۔ راج نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر جانے کے جھوٹے برتن اُٹھائے اور باہر جانے لگی تو ترپاٹھی نے پکار کر کہا:۔

"آج رات کو۔ ۔ بھولنا مت"

O

اُمتسر کی نیبہ کرائی ہوئی سیکڑوں برس پرانی مسجد دیکھ کر زمین کے ساتھ ہنستی مسکراتی سشما لوٹ آئی۔ ترپاٹھی اس دن آنگن میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے سشما نے تعجب سے پوچھا "ارے آپ اب تک یہیں بیٹھے ہیں! اپنے دفتر نہیں گئے۔ اخبار میز پر پھینک کر انگڑائی لے کر ترپاٹھی نے کہا:

"نہیں گئے چھٹی لے لی آج۔ یہاں سے چار میل دور ایک خوب صورت جھرنا ہے، وہیں لے چلوں گا تمہیں! دیکھ لی تو خوش ہو جاؤ گی۔ چلو گی نا؟"

"ضرور چلوں گی"

ترپاٹھی بہت خوش ہوئے لیکن نرمش رضامند نہیں ہوا راج رانی نے بھی منع کر دیا سشما تنہا جانے کو تیار نہیں ہوئی، ترپاٹھی بہت

جھنجلائے، بہت غصہ ہوئے اور جب کسی پر کوئی اثر نہ ہوا تو کھانا کھا کر سو گئے۔

خوب سوئے خوب سوئے آنکھ کھلی تو گھر میں سناٹا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سب لوگ اور۔ انیس۔ سنہا کے یہاں دعوت میں گئے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ اس کو بھی جانا ہے، بہت خوش ہوا یہ سوچ کر کہ آج خوب کھایا جائے گا۔ کھانے سے فراغت پا کر رمی کھیلا گیا۔ اتفاق سے وہاں ایک شاعر بھی موجود تھا، اس سے کچھ سنانے کے لیے اصرار کیا گیا، جو اس نے بخوشی قبول کیا۔ اس نے کسی اپنی کوتا کے بجائے کالی داس کے رگھو ونش کے کچھ بند سنائے۔ کونے میں بیٹھی راج رانی محو ہو کر سن رہی تھی کہ اچانک دس گیارہ سال کی بچی نے پیچھے سے آ کر اس کے کان میں کہا "کوئی آپ کو نیچے بلا رہا ہے۔"

لان کے اس پار کھڑے ترپاٹھی نے راج رانی کو دیکھتے ہی کہا "چلو اب گھر"

راج رانی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا "اندر بہت اچھا کوتا پاٹھ ہو رہا ہے تم بھی سن لو۔ میں بھی سن لوں گی۔ چلو۔"

ترپاٹھی بولے:۔

"گیارہ سے اوپر ہو رہا ہے کیا رکھا ہے کوتا پاٹھ میں، تم چلو صبح جو پرامس ہوا تھا وہ بھول گئیں"

راج رانی نے سشما سے چلنے کو کہا، لیکن اس نے انکار کر دیا، آخر کار راج رانی کو اکیلا جانا پڑا۔

اپنے گھر آ کر ترپاٹھی نے کہا کوتا وہ سنے جس کے پاس کچھ نہ ہو، دل کی پیاس بجھانے کے لیے۔ شراب کی بوتل کی مانند تم میرے پاس ہو میں بھلا کوتا کیوں سنوں گا۔ بتاؤ۔ اچھا اب یہ کپڑے اتار دو۔ وہ نائلون والی ساڑی پہن لو دیکھو وہ نئی ساڑی۔ پیٹی کوٹ نہیں۔ وہ ساڑی مجھے بہت پسند ہے۔ اس میں تمہارا یہ گلابی جسم یوں جھلکتا ہے جیسے سفید بوتل میں گلابی شراب، مزے آ جائیں گے۔ آج پیٹ تو خوب بھرا ہے مگر یہ دوسری خوراک بھائی بہت بھوکا ہوں، ذرا جلدی کرو۔"

○

صبح ہوتے ہوتے نریش اور سشما واپس آ گئے۔ نریش اپنے دوست سے ملنے چلا گیا۔ راج رانی نریش کے لیے پوڑیاں بنانے کے لیے دال پیس رہی تھی۔

ترپاٹھی کے کمرے میں ایک خوبصورت سی الماری تھی، جس میں اس کے عمدہ عمدہ سوٹ رہتے اور دوسری طرف قد آدم آئینہ تھا۔ سشما بال دھو کر نکلی اس وقت ترپاٹھی جاگ گئے تھے۔ نوجوان سالی کو آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر بہت خوش ہو کر بولے "تمہارا منہ دیکھ رہا ہوں آج ضرور کچھ نہ کچھ ملے گا۔"

"مجھے بھی حصہ دیجیے گا نا" سشما نے بھیگے بالوں کو پونچھتے ہوئے جیجا جی سے کہا تو جیجا جی انگڑائی لے کر بولے:۔

"حصہ کیا مانگ رہی ہو تمہارے لیے تو میری جان حاضر ہے"

سشما کچھ نہیں بولی، بس مسکرا کر رہ گئی۔ ترپاٹھی اٹھ کر باہر گئے، شاید بیڈ ٹی کے لیے منہ صاف کیا۔ اور پھر فوراً ہی واپس آ گئے۔ اور کھوئے یں سشما کے پیچھے کھڑے ہو کر آئینہ میں اس کا عکس دیکھنے لگے۔

ایک طرف گردن جھکا کر لیے، ٹھنڈے بالوں کو کنگھے سے سلجھاتی سشما کی نظریں اپنے پیچھے کھڑے جیجا جی سے ملیں تو لاج

مسکرا دی۔ اسی لمحہ سریش چندر ترپاٹھی نے اسے اپنی باہوں میں لے لیا۔ پھر اس کے گلابی ہونٹوں کو پیار کرنے کے لیے وہ آگے بڑھے تو سشما نے اپنی پوری طاقت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو قریب رکھی ہوئی میز اور کرسی دونوں لڑھک گئے۔ یہ آوازیں سن کر راج رانی دوڑتی ہوئی آئی۔ سشما اس وقت ترپاٹھی کی باہوں سے چھوٹ گئی تھی اور باہر کھڑی ہانپ رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اور آنکھوں سے غصہ کی وجہ سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ سریش چندر ترپاٹھی خاموش کھڑے تھے۔ آنکھوں کی پیاس اور ہونٹوں کی بھوک برقرار تھی۔ اور مسکرا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر راج رانی کے پیروں کی زمین نکل گئی۔ ایک لمحہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہو۔ کسی نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ سشما ساڑی سر پر ڈال کر نہایت تیزی سے بہن کے پاس سے نکل گئی۔ اس وقت راج رانی نے شوہر کو بھرپور نظر سے دیکھا۔ اور سریش چندر نے نہایت بے شرمی سے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا:-

"آہا مزے آ گئے، بہت دنوں کے بعد منہ کا مزہ بدلا ہے، بیحد کتنی خوب ہے چھوکری۔ لیکن مزے آ گئے۔"

راج رانی کا دل چاہا دہاڑیں مار مار کر چیخنے لگے، وہیں دیوار سے اپنا سر مار لے، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ رام سریش ترپاٹھی غسل خانے کی طرف چلے گئے، اور راج رانی کانپتی ہوئی دوسری طرف چلی آئی۔ کمرے میں لیٹی ہوئی سشما اب بھی کانپ رہی تھی۔ راج رانی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھی کانپ رہی تھیں، زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ عجیب منظر تھا۔

اسی وقت سشما نے غصہ سے کہا "میں یہاں سے آج ہی چلی جاؤں گی میں اب ایک لمحہ بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی"

پھٹی پھٹی آنکھوں سے بہن کا منہ گھورتی ہوئی راج رانی ایک لفظ بھی نہیں بول پائی تو سشما نے دلی تکلیف سے تڑپ کر سرد آہ بھری اور کہا:-

"ایسے جانور مرد کے ساتھ رہ کر تم زندہ کیسے ہو دیدی۔ یہ تو جانور ہے دیدی! بالکل حیوان ہے۔"

راج رانی پھر بھی خاموش تھی۔ ...

... گیارہ بج چکے تھے تو نریش واپس آیا آنگن میں ہی سے آواز دے کر کہنے لگا "بھابی یہ گاڑی تو گئی اب میں تین بجے والی سے جاؤں گا۔ کھانا کھا کر بکنگ آفس سے ٹکٹ لے کر آؤں گا"

بھابی نے کچھ نہیں کہا، اور نہ ہی اسے روکا۔ نریش تعجب کر رہا تھا کہ اچانک اندر سے سشما نکل آئی اور نریش کے قریب آ کر بولی "دیور جی میں آپ کے ساتھ چلوں گی"

"اتنی جلدی؟ کیوں کیا بات ہے؟"

"بات کچھ نہیں ہے۔ بس چلوں گی۔ یہ روپیہ لیجیے میرا ٹکٹ بھی لیتے آئیے گا۔"

بھابی پھر بھی خاموش تھی۔ نریش کو کھانا کھلایا، لیکن بولی کچھ نہیں، جب وہ دونوں ٹکٹ خریدنے جانے لگے تو راج رانی نے اسے روک کر کہا "سنو ذرا ادھر آؤ" نریش کو کمرے میں لے جا کر راج رانی نے بڑی آہستگی سے کہا:-

"میرے لیے بھی ٹکٹ لیتے آنا میں بھی چلوں گی۔"

نریش نے کہا "یہ یکایک پروگرام کیسے بن گیا؟ بھائی صاحب سے پوچھ لیا؟ تمہیں ماں کے گھر جانے دیں گے؟" کہتے کہتے اس کے

ہونٹوں پر ہنسی آگئی "

لیکن اس بار راج رانی مسکرائی نہیں، اس نے کہا "میں نے طے کر لیا ہے کہ مجھے اس گھر میں نہیں رہنا ہے۔ سب ختم ہو گیا"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بھابی؟" نریش نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

"ایسی بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟"

اس وقت تک سشما بھی پہنچ گئی تھی۔ بہن کی بات سن کر اُسے بہت تعجب ہوا تھا۔ راج رانی نے پھر کہا "تم ٹکٹ لے آؤ، مجھے جانا ہی پڑے گا۔ میں اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندگی بھر کے لیے جا رہی ہوں"

سشما متعجب تھی نریش نے پریشان ہو کر کہا "بھابی اس طرح جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ دماغ سے کام لو۔ آئندہ تم کیا کرو گی، ماں باپ کے مرنے کے بعد تمہارا کیا حال ہوگا۔"

"راج رانی نے دھیرے سے کہا "میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرتی، تم جانتے ہو غصہ یا جوش یا جلدی میں میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا، دراصل یہ تو میری عادت ہی نہیں ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم یہ بھی سمجھ لو کہ میں ماں باپ کے پاس رہنے کے لیے نہیں جا رہی ہوں، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے۔ یہ سوال بیکار ہے کہ میں کیا کروں گی، کیا اس ملک میں، اس دنیا میں میرے کرنے کے لائق کوئی کام نہیں ہے، میرے لیے تمام دروازے بند ہیں، یہی کہنا چاہتے ہو تم؟

نریش نے نرمی سے کہا "لیکن بھابی۔ کیا تم اپنا گھر، یہ گرہستی چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ بھائی صاحب کا اتنا پیار — ایسی کیا بات ہو گئی بھابی کہ تم ... !

راج رانی نے بڑی سادگی سے کہا "بات تو برسوں پہلے ہو گئی تھی، مجھے اسی وقت یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے تھا لیکن میں خود ہی نہ جانے کیا سوچ کر اتنے عرصے تک اس گھر میں زندہ رہی، لیکن نریش اب نہیں اب قطعی نہیں بہت ہو چکا، بہت سہہ چکی ہوں میں۔ اب گھوڑی بن کر اس اصطبل میں رہنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے قطعی نہیں۔۔۔ راج رانی کی آواز کانپ رہی تھی۔ گلا رندھ گیا تھا وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ نریش اور سشما خاموش کھڑے تھے۔ راج رانی نے اپنی آواز پر قابو پا کر کہا،

"تم دونوں اس طرح نہ آتے، ایسی باتیں مجھ سے نہ کہتے تو میری آدھ مری روح کسی دن دم توڑ دیتی۔ پھر میری لاش ہی رہ جاتی، اس چار دیواری کے اندر۔ پھر لاش کو خواہ کس قدر رکھتا وہ کچھ نہ کہتی میں جانتی ہوں میرا یہی حشر ہوتا، لیکن شاید بھگوان کو یہ منظور نہیں تھا، تم دونوں یہاں آگئے۔ کیوں آگئے تم دونوں میرے پاس؟ کیوں تم دونوں نے مجھ سے وہ سب کچھ کہا جس نے میری روح کو جگا دیا، اور اب تم دونوں مجھے یہاں انگاروں پر کھڑا کر کے جا رہے ہو، کیا تمہارے دل پتھر کے ہیں؟ ہمدردی یا محبت کچھ بھی نہیں ہے؟ بے رحم تم میرے دیور — اور پتھر دل تو میری بہن — راج رانی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سشما کی طرف دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بہن سے لپٹ گئی، اور کانپتے ہونٹوں سے کہا "تو چل دیدی تو میرے ساتھ چل" — نریش نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور ایک دم آگے بڑھ کر محبت بھری آواز میں کہا — "روپیہ دو بھابی دیر ہو رہی ہے ٹکٹ خرید لاؤں!

(ہندی سے ترجمہ)

نئے

افسانہ نگار

برسات

احسان ملک

بدھن وال کی زمین سے پانی اب کی بار یوں غائب ہوا جیسے بُرے سمے میں دلوں سے وفا اور آنکھوں سے مہر اٹھ جائے۔ علاقے بھر میں نہ سونے کا مول رہا ہے نہ چاندی کا۔ مول اب اگر کسی شے کا باقی ہے تو صرف پانی کا۔ پانی کی طلب میں بدھن وال کے ہر انسان کی خواہش پیاس بن چکی ہے اور علاقے میں جہاں جہاں بھی پانی کا داغ رہ گیا ہے۔ اس زیارت گاہ پر دن رات کے پہرے قائم ہیں۔

آسمان سے آگ برس رہی ہے چاروں اور تنہائی، اُداسی اور ویرانی کا سماں ہے۔ دھوپ یوں چنچنا رہی ہے کہ نگہ کام نہ کرے اور ہر چیز کانپتی نظر آئے۔ کھیتوں میں اکا دکا کیکر، بیری اور ٹاہلی کے پیڑ ساکت کھڑے برسات کی دعا مانگتے دکھائی پڑتے تھے۔

سوہان ندی سوکھی پڑی ہے اور بدھن وال کی زمینوں کو پانی دینے والی جھلاریں اُجڑ گئی ہیں، سارا گاؤں مویشیوں کی کربناک فریاد سے گونج رہا ہے۔

شیخ رحمت کی چوپال میں بڑ کے گھنے پیڑ تلے منڈلی جمی ہے اور چرچا پانی کے قحط کا ہے۔

"زمین سوہے لوہے کی طرح گرم ہو رہی ہے رحمت لالہ! اور آسمان جلتا ہوا کوئلہ بن گیا ہے۔ قادر خاں لوہار نے بازو پر بندھے تعویذ کو کستے ہوئے کہا اور حقے کی نڑ لکڑی چارپائی پر لیٹے مہندی رنگے بالوں والے بڈھے شیخ رحمت کی طرف پھیر دی۔ شیخ رحمت نے بے دلی سے ایک کش لگایا اور پھر نا آسودگی سے منہ بنا کر حیراں حیرے لہجے میں بولا "گرمی تماکو کا سارا نشہ پی گئی۔ حقے پر آگ دھرنے کی ضرورت بھی نہیں اب تو" نتھا کمہار بول اٹھا۔ "اجی اس دھوپ میں تو کچی اینٹیں پکا لیتا شیخ جی، پر کیا کروں گارے کے لیے پانی نہیں ملتا۔ یہ کہتے ہوئے علاقے بھر کے کمہاروں کے استاد نتھے نے حقہ غفورے ترکھان کی جانب سرکا دیا۔ غفورے ترکھان نے پہلے چلم اتاری، پھونک سے راکھ جھاڑی۔ پھر نیچے کو دبا کر نڑ میں پھونک بھر کر تھوڑا سا پانی گرا دیا اور پھر حقہ یوں تھام لیا کہ معلوم پڑے حقہ غفورے ترکھان ہی کا ہے۔ پھر اس نے عبرت اور خدا خوفی سے بھرپور لہجے میں کہنا شروع کیا "جنگلوں میں سوکھے سرکنڈوں میں آپوں آپ آگ لگ رہی ہے، سینکڑوں من لکڑی جل کر راکھ ہو گئی، اب آپ ہی بتائیے شیخ جی آپ کے نئے مکان کی کھڑکیاں کیسے بنیں گی؟ لکڑی کا بھاؤ دُگنا بلکہ تگنا نہیں چار گنا، ہو گیا ہوگا، خدا رحم کرے" اتنے میں محمد صدیق نائیں نے آ کر حاضرین کو بتایا کہ شیر محمد کمالیاں والے کی کھوڑی جبی" رستہ تڑا گئی۔

"ہچ ہچ ہچ ۔۔۔ " جھورے ماچھی نے غفورے کے ہاتھ سے حقے لیتے ہوئے کہا۔ "پانی نہ ملے تو انسان تو کیا جناوروں میں بھی وفا نہیں رہتی۔" یہ کہہ کر جانے وہ کس سوچ میں ڈوب گیا۔ جھورا ماچھی بڑا رقیق القلب انسان تھا۔ کسی کو دکھ میں دیکھتا تو رونے لگتا۔ جب ہنستا تو اس کے دونوں ہونٹ دُہرے ہو جاتے اور وہ احمق ہونے کی حد تک بھولا اور سادہ نظر آنے لگتا۔ آس پاس کہیں سیلاب یا قحط سالی کی مصیبت آتی اور لوگ باگ مزدوریاں کرنے باہر نکلتے تو لوہروں کے لوہے بلا معاوضہ سوہان ندی کے پار لگا دیا کرتا۔ جھورے ماچھی

نے حقہ جب دتو بھڑ بھونجے کے ہاتھوں میں دیا تو وہ کش لینے سے پہلے بولا "خلق خدا دانوں کی طرح بھنی جاتی ہے۔ ایسے میں نور دین جب دوسرے گاؤں دوا لینے گیا تھا۔ گلے میں پگڑی اُلجھائے آیا اور روہانسے ہو کر بتایا کہ اس کی لوہی بیلوں کی جوڑی میں سے کسیاگری کا جھٹکا کھا کے مر گیا۔

"خدایا خیر، خدایا خیر" شیخ رحمت کے پرانے نمک خوار مزارع صدیقے نے کلمہ پڑھ کے انگلیاں چوم چوم کر آنکھوں کو لگاتے ہوئے کہا "ابھی کل ہی مائی جھیندو والی کے تھاپی گئی ہے۔"

شیرے کا حال پتلا ہو رہا ہے" محمد صدیق رائیں منڈلی میں پیروں کے بل بیٹھ کر تہمد کے سروں کو گود میں تہ کر کے آگے کو سرک کر بولا "گھوڑی کیا تھی اللہ کی شان تھی۔

"اور شیرے کا مان تھی" جھوُرے نے لقمہ دیا۔

"سچ مچ کی جٹی تھی جی شیخ جی" غفور ا ترکھان دوبارہ حقہ تھام کر کہنے لگا۔ "دھرتی اس کی چال پر رانجھے کے دل کی طرح دھڑکنے لگتی تھی۔ قسم ہے مولائے نامدار کی۔"

"گاؤں کو ویران کر گئی سالی۔"

"چاروں اور ویرانی ہی ویرانی ہے شیخ جی۔ اب کے برسات نہیں ہونے کی۔"

"کفر کا کلمہ مت نکال بھائی۔ اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔"

شمشیرا رستہ گیر آنکھوں میں آنسو بھر کے اپنی بلواڑ بھینس کو گاؤں کے بیچوں بیچ گزرنے والی سڑک پر لے آیا اور بولا "جا اب چلی جا نیلی جہاں جی چاہے نکل جا۔ اب کے برسات نہیں ہوتے کی، تو پیاسی مر جائے گی نیلو" لیکن نیلی، بالشت بھر زبان نکال کر بے بس اور مایوس آنکھوں سے شمشیرے کی طرف دیکھتی اور پھر زور کی دہائی دے کر اس کا بدن چاٹنے لگتی۔

شیخ سجادا اپنے گھر کی دھریک تلے بہت ہی اداس اور مغموم بیٹھا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ابھی ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا، وہ بڑے محرومانہ انداز میں اپنے ننگے بدن پر ہاتھ پھیرتا۔ پھر اپنی سفید داڑھی کھجاتا اور پھر جانے آسمانوں میں کیا دیکھنے لگتا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی بی بی سے بولا "لے دیکھ لے بھاگوان، تو کہتی تھی کہ کسی سے بچہ لے کر پال لیں، کبوتر تک تو اس زمانے میں دغا دے جاتے ہیں۔" شیخ سجادے کے ہاں کوئی اولاد نہیں اس نے کبوتر پال رکھے ہیں اور اُن سے جی بہلاتا ہے۔ نیکی اور دین داری میں شیخ سجادا مولوی محمد عمر قاضی کے بعد سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔ شیخ سجادا پانچ وقت کا پکا نمازی ہے لیکن اس سے پختہ تر کبوتر باز۔ کبوتر اس کا تکیہ کلام ہے۔ گاؤں کے نوجوانوں کو اکثر یوں نصیحت کرتا "صبح سویرے اٹھا کرو کم بختو منہ اندھیرے اور عبادت خدا کی کیا کرو، کبوتروں کی طرح۔" اور اگر کسی کو خوش دیکھتا تو کہتا کس طرح گٹک رہا ہے کبوتر کی طرح۔" ابھی کچھ دیر پہلے وہ اپنی گھر والی سے کہہ رہا تھا کہ اگر برسات نہ ہوئی تو سب لوگ بدھن دال سے کبوتروں کی طرح اڑ جائیں گے۔ آس پاس کے دیہات کے لوگ جو کبھی کبھی اس سے پانی دم کروانے آتے، اسے بابا کبوتروں والا کہتے تھے۔

ملنگ سیدن شاہ بوڑی والے کے "ڈیرے" پر گوہی کے پیڑوں سے سر نکالتے ہوئے کونے کھانے ہر علم بے حرکت اور ساکن ہیں۔ گویا اس دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہے ہوں۔ کوندی کے ایک پیڑ سے بندھا ایک نیولا اپنا منہ کھولے ہانپ رہا ہے۔ ملنگ کے ڈیرے پر سردائی کی خوشبو

کی بجائے قبروں پر پڑے باسی پھولوں کی ویرانی باس صبح شام جلنے والی ہرمل کی بو کے ساتھ گھل مل کر رو رہی ہے۔ فیقرا کانا جسے گاؤں کے لوگوں نے "حرامی" کا لقب دے رکھا ہے گھوتوی کی خالی کونڈی میں "چھپن چھپن" ہلا کر کہنے لگا "ہائے ملنگا کیا ٹھنڈی میٹھی آواج ہے" چھپن پن چھپن پن' ہائے مولا مرے پانی نہ ہوا"۔ فیقرا ایک آنکھ سے کانا اور ایک پیر سے لنگڑا ہے اور لوگ اسے حرامی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بچپن ہی سے بہت شریر یعنی حرامی ہے۔ وہ خفیہ آب کاری کا کام اور نشہ آور چیزوں کی خرید و فروخت کرتا اور شراب کے ساتھ تیتر بٹیر کا کچا گوشت نمک لگا کر کھاتا۔ اس نے تجربے کی خاطر حرام حلال ہر جانور اور پرندے کا گوشت چکھا ہے اور ان کے گوشت کی تاثیروں کے راز سمجھتا اور آزماتا جانتا ہے۔ فیقرے نے شراب خود کشید میں بوٹیاں جھونک جھونک کر زندگی کے بڑے عجیب تجربے کئے ہیں اور اس لحاظ سے "حرامی" کا لقب، اُسے ایسے ہی لگتا ہے جیسے کسی پہلوان کو بچے کا پاجامہ پہنا دیا گیا ہو۔

(۲)

ہوا ٹھہر گئی، درختوں کے پتوں تک میں ہل جُل باقی نہ رہی، ہر طرف امس اور گھٹن پھیل گئی اور چاروں اور گہرا سناٹا چھا گیا، یوں محسوس ہونے لگا جیسے خاموشی آواز بن کر کچھ کہنا چاہتی ہے، جیسے آسمان کی جانب سے کوئی ندا آنے کو ہے اور شجر حجر، چرند پرند اور سارا ماحول شدید انتظار کے عالم میں ہمہ تن گوش ہے۔

اور پھر یکایک اس خاموشی کے سینے میں تیر سا گڑ دیا اور مولوی محمد عمر قاضی کی خوش الحان اذان سناٹے کے اس اداس اور ویران مزار پر پھولوں کی چادر کی طرح چھا گئی۔

بدھن وال کی اس کڑی دوپہر میں دیہات والوں نے اذان سنی اور جب کلمہ پڑھ پڑھ کے انگلیاں چومیں اور آنکھوں کو لگائیں تو انہیں احساس ہوا کہ ان کی آنکھیں ساون کے بادلوں کی طرح بھری ہوئی ہیں۔

مولوی محمد عمر قاضی کی اذان جیسے حوض کوثر میں دھلی ہے۔ آج ان کی آواز میں عجب دلگیری ہے۔ کمال کا تقدس ہے، ایک یاس، ایک مجبوری، ایک حسرت جیسے آواز کا روپ دھار کے آگئی ہے اور مولوی صاحب کا دل جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر آواز کی لہروں میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ مولوی محمد عمر قاضی کی اذان فلک کا سینہ شق کر دے گی اور بدھن وال کے باسیوں کو سامنے خداوند لایزال کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔

بدھن وال کی تپتی زمین پر بے شمار آنسو گر رہے ہیں۔ بکور ہائی کنٹر سے سوچ رہے ہیں کہ یہ آنسو ہیں یا ان کے دل کی آخری فریاد لہو بن کر ان کی آنکھوں میں ٹپک پڑی ہے۔

ابھی مولوی محمد عمر قاضی کی اذان کی گونج بھی تھمنے نہ پائی تھی کہ اہل دیہات نے افق کی وہ گولائی ماند پڑتے دیکھی جو ابھی تک خنجر آبدار کی طرح چمک رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماحول دھندلا گیا۔ دھوپ ماند پڑتی چلی گئی۔ پھر آہستہ آہستہ درختوں نے آگے پیچھے جھومنا شروع کر دیا اور پھر ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا منہ پر مٹی لگائے بدھن وال میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی رستہ بھٹکا بالک شام کو گھر آ جائے۔ پھر گاؤں بھر کے پیڑ سائیں سائیں کرنے لگے۔ آندھی چلی بادل گھر آئے اور بجلی یوں کڑکی کہ کچے گھروں کی دیواریں تھرتھرا گئیں۔ تو وہ

تولہ بھر کے تپکے گرنے شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تل دھار برسات کا سماں بندھ گیا، ایسے میں گاؤں کے بوڑھے ڈھولئے مست علی کی کوٹھڑی میں گنبد کی نیچیلی ڈگی کی ظالم چوٹ سے ٹھنرا اٹھی "تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن، تاک،۔ گاؤں میں شور اٹھا۔ بلائی شیرا" اور بدھن وال میں ایک مجذوبانہ سرمستی کا طوفان در آیا "بلے بلے"

"مہر ہارا" اور بدھن وال کے بچے بوڑھے، جوان چک پھیریاں لے لے کے ناچنے لگے۔ مست علی مجذوبانہ انداز میں چلایا۔

"پانی پانی پانی"
پانی یار سے جانی
پانی باہجھ ہنیرا
پانی نال سویرا
پانی میرا نہ تیرا
پانی مالک رب دا
رجے بھکھے سب دا

بولو

"پانی رحمت پروردگار دی" اور سب لوگ گلا پھاڑ کے چلائے۔

"پانی رحمت پروردگار دی"

درخت اور پرندے زمرد کی مورتیں بن کر پھوہار میں مست جھومنے لگے، مویشی باڑوں سے نکل آئے اور مینہ کے پانی میں اپنی کھالیں بھگو کر بڑے آنند کے ساتھ طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔ آسمان کی طرف منہ کر کے پانی چاٹنے لگے اور برسات کی ٹھنڈکیاں محسوس کرنے کے لیے کانوں میں دونے بنا بنا کر، تھوتھنیوں کو اوپر کر کے پانی کی میٹھی دھاروں کو آنکھوں پر لینے لگے۔

برسات کو جب سارا دن گزر گیا اور رات ہونے کو آئی تو گاؤں کے ایک بڈھے کریمے کھنڈسار نے دوسرے بڈھے حاجی رمضانے سے کہا "رمضانے یار یہ سب مولوی محمد عمر قاسمی کی کرامت ہے جب اذان دے رہا تھا، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے، جیسے اب برسات پڑ رہی ہے نا۔ بالکل اسی طرح"

"ہاں دوستا" حاجی رمضانے نے کہا "میں نے بھی یہی دیکھا تھا، مولوی کے دل نے آسمان پر چوٹ ماری ہے۔"

رات بھر موسلادھار برسات ہوتی رہی، بادل کی گرج، بجلی کے چمکاروں اور چھاجوں پانی گرنے کی متواتر آواز اور رت جگا منانے والی سٹیاروں کی ڈھولک اور ساونیوں نے گاؤں بھر کو سونے نہ دیا۔

صبح گاؤں والوں نے دیکھا، سوہان ندی میں قیامت آئی ہے۔ پہاڑ ایسی لہریں آسمان کی طرف شعلوں کی طرح لپکتیں اور دور تک شور مچاتی، دندناتی ایک دوجے کا تعاقب کرتی نظر آتیں، ندی کا پاٹ پھیل کر نظر کی حد کو توڑنے نکلا ہے، اور یوں لگتا ہے کہ سوہان ندی کا چھور اب نہیں ملنے کا۔

جھڑیاں تڑ تڑ کر ٹوٹتی رہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کر لگتی رہیں اور مینہ اس طرح برس گیا کہ ہالی کے دل کی ہر پیاس بجھ گئی۔

(۳)

اور پھر ایک روز صبح کی روشنی چھٹکی تو گاؤں والوں نے دیکھا کہ پیڑ اور پودے زمرد کی خوب صورت مورتیاں بنے کھڑے ہیں۔ چاروں اور ٹاہلیوں اور کیکروں پر امیست کے لیے میناروں پر اور ریٹھی کی سوندھی خوشبو دیتے گھروندوں پر اور میدانوں میں صاف نکھری ہوئی چاندنی کی طرح مہین مہین دھوپ پھیلی ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور آسمان کی نیلی جھیل میں سفید بادل راج ہنس کی طرح تیرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور گلائیں، پپیہاں، نیل کنٹھ، ٹیٹریاں، "کھٹ بڑھئی" ہوا کی پینگ پر جھولتے نیچے اوپر، اوپر نیچے، ڈولتے، خوشی میں چہکاریں لگاتے اڑانیں بھرتے پھرتے ہیں شہد کی مکھیاں مدھ چوس رہی ہیں۔ بھنورے بھنبھنا رہے ہیں اور زمین پر چیونٹیوں کی قطاریں آبادیاں بدل رہی ہیں۔ پانی کے گڑھوں کے گرد اگرد اور کچی دیواروں کی بنیادوں سے دب اور کھبل گھاس پھوٹ پڑی ہے، آکاس بیل بڑھ بڑھ کے درختوں کے گلے کا ہار ہوئی جاتی ہے۔ گلدوتے پھیل پھیل کر ایک گھر کو دوسرے گھر سے ملا دیا ہے اور گاؤں سے باہر خانہ بدوشوں کے ٹوٹے جڑی بوٹیوں میں جنگلی ، بن کھری، پیٹھ کنڈا، بھنگرہ اور چنڈن اکھیڑ کر جھولوں میں بھرتے نظر آتے ہیں۔

گاؤں سے باہر ریتلے میدان میں کبڈی ہو رہی ہے اور جوان بجلیاں بن بن کر ایک دوجے کی جان کا آزار ہوئے جاتے ہیں۔ ہالی اپنے اوزار درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور کوئی ایک اپنے کچے گھروں کی گری دیواریں بنا رہے ہیں۔

شیر اکمالیاں والا صبح صادق پورے چھ کوس کا فاصلہ پیدل طے کر کے شیرے رنبہ گیر کے مجرمانہ رسوخ سے بھونگہ طے کر کے اپنی گھوڑی واپس لے آیا ہے۔ سرخ مخمل کی موتیوں والی صدری پہنے سبز طرے دار پگڑی سر پر جمائے چمکتا ہوا نیزہ ہاتھ میں لیے اور مونچھوں پر کڑوے تیل کی لاٹ لگائے بڑی آن بان سے نکلا ہے۔ مارے گھمنڈ کے اس کا رنگ شنگرف ہو رہا ہے نہ "جٹ" کی چالیں جانچ رہا ہے کہ کہیں لڑی نہ ہو گئی ہو۔ گھوڑی اسے کبھی دلکی کبھی شہانہ اور کبھی سرپٹ دوڑ کر اپنی اصالت دکھا رہی ہے۔

شیخ سجاد اگھر میں کابکوں کے درمیان کھڑا آنکھوں پہ ہاتھ کا چھجا بنائے اپنے نقابی، لوہارے اور جالداری کبوتروں کو آسمان میں تارا ہوتے دیکھ رہا ہے۔ وفورِ انبساط اور ارتکازِ توجہ سے وہ ہمہ تن نگاہ بنا آسمان کی طرف چلا گیا ہے بلندی سے ایک زرد چشم قلابازیاں کھاتے ہوئے "تاق، تاق، تاق" دونوں پروں سے تالیاں بجاتا نیچے آ رہا ہے اور شیخ سجاد اس کی اس ادا پر قربان ہوا جاتا ہے۔ سماجاتا ہے، فنا ہونے کو ہے۔

گوندی کے پیڑوں کی چھاؤں میں ملنگ میدن شاہ اپنے چیلوں سے کہہ رہا ہے "یار ذرا دیکھو تو سوہان کا لہرا اور جیسے سردائی کی لہر چلبلا رہی ہو۔ یہ کہہ کر اس نے بسم اللہ پڑھی اور "تڑاق، تڑاق، تڑاق" سلفے کے دم ٹے کھینچنے لگا اور آنکھیں جب سرخ مرچ کی طرح لال ہو گئیں تو زور کا نعرہ لگایا

"مستانہ دے مستانہ نہ تو اپنا، نہ بیگانہ، سلفے نادیوانہ۔

ہو رے ہو ہو ہو ہو ہو"

شیخ رحمت علی کی چوپال میں خوب گہما گہمی ہے، دوست عزیز اور رشتہ دار دور دور سے ملنے آئے ہیں۔ باہر بیل گاڑیاں اور گھوڑیاں کھڑی ہیں، سازندے اور گائک منڈلی سجائے ساز درست کرنے میں مشغول ہیں۔ مہندی رنگی داڑھی اور مہندی رنگے بالوں والا شیخ رحمت جس کے پاس گاؤں میں سب سے زیادہ زمین اور سب سے زیادہ جوان لڑکے اور سب سے زیادہ بیریاں ہیں، ایک ہاتھ کو سر سے سہارا دیئے دوسرے ہاتھ میں حقہ تھامے بولا "یار و مولبی کی دعا سے کپاس تو اللہ کی شان ہو رہی ہے۔" شیخ رحمت کے سب سے بڑے لڑکے خیر محمد نے لقمہ دیا۔ "اور بابا ہمارے امرود بھی۔"

"ہاں" شیخ رحمت بڑے اطمینان سے دھوئیں کا ایک بڑا بھبکا چھوڑ کے بولا "اب کے گڑ بھی بہت ہو گا" صدقے جاواں اس کی رحمت کے۔" اور یہ کہہ کر اس نے انگشت شہادت نیلی چھتری کی طرف اٹھا دی اور حقہ زمین پر اکڑوں بیٹھے ہوئے غفورے کی طرف پھیر دیا۔

"اور شیخ جی . . . ." غفورے ترکھان نے خاندانی خدمت گاروں کا سا انداز اختیار کر کے کہا "اب کے مونگ پھلی بھی کیا لوداں لوداں رنگ لائی ہے" "واہ، واہ، وہ واہ، وہ واہ،" اس کے ساتھ ہی حقے کر اس نے دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے شروع کر دیئے۔ کوئی یہ نہ جان پایا کہ غفورا حقہ لیتے کے لیے تمباکو کی داد دے رہا ہے یا رحمت پروردگار پہ سر دھن رہا ہے۔ یا شیخ رحمت کی فصلوں کی شادابی سے خوش ہو رہا ہے حقہ رحیمے کو دے کر وہ پھر بولا "اب کے برس علاقے میں کماد بھی اچھا ہو گا اور دھان بھی۔ بیلا، پرمل، جنسراج، مشکن اور بیگمی چاولوں کے تو پہاڑ لگ جائیں گے۔

"ہاں ٹھیک کہتا ہے تو" شیخ رحمت بولا "تیری مکئی کا کیا حال ہے بے سلطانے ؟"

"بوٹا بوٹا آپ کے جان مال کو دعائیں دے رہا ہے شیخ جی۔"

اب جھورے ماچھی نے حقہ ہاتھ میں لیا اور ایک کش لگا کر بولا "جال درست کر لیا ہے۔ اب مچھلیاں سو ہاں سے اس طرح نکلیں گی جس طرح ماں کے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔"

ایسے میں اکتارے والے نے "تن، تن، تن" سے سب کو متوجہ کرتے ہوئے حاضرین مجلس سے پوچھا "کی سنائیے وڈی قسمتاں والیاں نوں . . . دوہڑا، بیت، کافی، زخمہ، سویا، کبت، کنڈلی، چوبرگا . . . ."

دوسرا گائک پہلے کو لقمہ دیتے ہوئے بولا "

ڈھولا، ماہیا، بالو، جندڑی، اونگاں، چھلا، ونسا، جیٹری، پنوں، پٹھ، حمد، نعت، منقبت . . ."

شیخ رحمت نے جذبے سے بھرپور آواز میں کہا "میرے مولا کی رحمت کے ترانے گاؤ۔"

(۴)

جمعہ کے دن اہل دیہات کے ساتھ نماز شکرانہ ادا کرنے کے لیے گھر سے مسجد کی طرف جاتے ہوئے مولوی محمد عمر قاسمی کے ہاتھ پر جب پانی کا ایک قطرہ گرا تو انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بڑے اطمینان قلب کے ساتھ زیر لب الحمد للہ کہا، ان کی آنکھوں سے ایک عجیب و غریب نور برس رہا ہے۔ چہرے پہ شکر، طمانیت، تقدس اور پاکیزگی کے احساسات و جذبات نمایاں ہیں۔ وہ انسان نہیں کوئی

آسمانی مخلوق نظر آ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والا بھاری عصا ہے جو اُن کے پیر و مُرشد قاضی عبدالودود داؤدی کی نشانی ہے۔ مولوی محمد عمر قاضی کو اس عصا پر اتنا ہی اعتقاد ہے جتنا کسی بوڑھے انسان کو اپنے تابعدار بیٹے پر ہو سکتا ہے۔

مولوی محمد عمر قاضی خدا کے نام کا وظیفہ کرتے ہوئے۔ سنگِ یشب کی تسبیح ہاتھ میں ہے، دانے پروانہ گراتے اور قدموں کے آہنگ پر عصا ٹکاتے چلے جا رہے تھے کہ مگا انہیں احساس ہُوا کہ گھروں کی کھڑکیوں روزنوں اور دروازوں کی اوٹ سے گاؤں کی عورتیں اور بچے بانے بڑے احترام، یقین اور اعتقاد کے ساتھ انہیں تاک رہے ہیں، مولوی صاحب اپنی شرعی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر نظریں نیچی کیے محجوبانہ مسکرانے لگے۔ انہیں یوں لگا کہ ان کے ہاتھ میں مرشد محترم کا بخشا ہوا عصا بھی ایک مہربان دوست کی طرح مسکرا رہا ہے اور سنگِ یشب کی تسبیح کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے۔

شیخ رحمت کی چوپال سے گزر کر اور مائی جنتو کے تندور پر سے دائیں ہاتھ کو مُوتے ہوئے مولوی صاحب مسجد والی گلی میں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ شمشیرا رسّہ گیر پگڑی گلے میں ڈالے، سر جھکائے اور ہاتھ جوڑے سامنے کھڑا ہے۔

"مولوی جی حجور۔۔ ۔۔" اور مولوی صاحب گھن گرج سے جھنگاڑے "ملعون"

"حجور میری بھی بخشش ہو جائے" شمشیرا ہاتھ جوڑے بلک بلک کر روتے ہوئے بولا اور مولوی صاحب کے پیر چھونے کے لیے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے فوراً ہی اس کے ہاتھ پکڑ لیے، "یہ کیا کر رہا ہے شمشیرے، چل نماز کو اور چھوڑ دے رسّہ گیری اور کر مزدوری مردود۔ خدا تجھے راہِ راست پر لے ہی آئے گا۔"

"مولبی جی اب کی برسات نہ ہوتی تو ہم سب مر گئے ہوتے" شمشیرے نے آنکھیں پونچھ کر گلوگیر آواز میں کہا اور مولوی صاحب نے دیکھا کہ وہ نہا دھو کر اور صاف کپڑے پہن کر پہلے ہی سے نماز کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔

"ابے یہ تو اس پروردگار کی رحمت بے پایاں پر منحصر ہے مردود، ورنہ ہم تو گنہگار اور عاجز بندے ہیں اس رب العلمین کے، ایسے ملعون تو کیا ہمیں تکبر میں گھسیٹنا چاہتا ہے؟" شمشیرا رسّہ گیر مولوی صاحب کی یہ مقدس گالیاں کھا کر یوں خوش ہُوا جیسے کوئی بالک چوری کے بیر کھا کر خوش ہوتا ہے، وہ سر جھکائے اور آنکھیں پونچھتا ہوا اپنے تائب ہونے کا خاموش اعلان کر رہا تھا کہ ایسے میں مولوی صاحب کو سامنے سے فقیرا کانا آتا ہوا دکھائی دیا، ایک پیر سے لنگڑاتا وہ قریب آ گیا تو مولوی صاحب نے دیکھا کہ وہ مردود، شقی القلب یزید صفت انسان رو رہا ہے۔ کوئی اور دن ہوتا تو مولوی صاحب اس ابو الخبیث کے منہ پر تھوک کر لاحول پڑھتے آگے بڑھ جاتے۔ لیکن آج جب وہ دوڑ کے ان کے قدموں پر گر پڑا تو اسے اُٹھا کر مسجد کو لے چلے۔ "آ گیا نا بے خبیث راہِ راست پر، چل بدذات روزِ قیامت سے ڈر اور جل شانہٗ، رحیم و غفور کے آگے سر بسجود ہو جا پڑھ بسم اللہ۔۔۔ ۔۔ ۔۔"

مولوی محمد عمر قاضی ایک فاتحانہ زہد کی سُرخی ایک منکر اور عاجزانہ تفاخر کی رونق چہرے پر لیے ایک پارسا اور پاک تبسم لبوں پر سجائے ان دونوں افراد کو جلو میں لیے مسجد کے قریب پہنچے تو انہوں نے گاؤں کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو ہاتھوں میں ہار لیے استقبال کے لیے منتظر پایا۔ ہر طرف سے مرحبا اور جزاک اللہ کی صدائیں آ رہی تھیں اور مولوی محمد عمر قاضی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا ہر قدم زمین پر نہیں آسمان پر پڑ رہا ہے۔ شمشیرا رسّہ گیر اور فقیرا کانا دونوں فرطِ جذبات سے رو رہے تھے۔ لوگوں نے ان کو بھی سینے سے لگایا اور توبہ کرنے کے صدقے میں

ان کو بھی زرد زرد ہار پہنا دیئے۔ مولوی محمد عمر قاضی ہاتھ میں عصا لیے منبر پر جلوہ افروز ہوئے تو ہر جانب قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی اور فضا میں اگر بتی کی پاکیزہ خوشبو کے سوا کسی کے لیے کوئی احساس باقی نہ رہا اور پھر یہی خوشبو مولوی محمد عمر قاضی کی خوش الحان آواز بن گئی۔ ایسے میں دھوپ ماند پڑ گئی، ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، درخت اور پودے جھومنے لگے، بادل گھر گھر آئے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ تب ایک نمازی نے آسمان کی طرف دیکھ کر دوسرے سے کہا "بارانِ رحمتِ خداوندی ہے۔"

دوسرا بولا "الحمدللہ" تیسرے نے کہا "مرحبا، مرحبا، سبحان اللہ۔"

نمازی آنکھیں بند کیے اس ذاتِ لایزال، خداوند بارک تعالیٰ کا تصور باندھے ہوئے تھے کہ معاً دور سے کہیں بہت سی عورتوں کے رونے کی اور بین کرنے کی آواز آئی۔ رفتہ رفتہ یہ صدا قریب تر آ گئی اور پھر مٹن کوٹ والے نزلسے پر دائیں اور بائیں دو قافلے دکھائی پڑے۔ قافلے کی بوڑھی اور جوان عورتیں بین کر رہی تھیں، مرد غم کی تصویر بنے بیل گاڑیاں ہانک رہے تھے اور بیلوں، خچروں، گدھوں پر سامان لادے چلے آتے تھے۔

یہ لمبا قافلہ جب بدھن وال سے گزرا تو معلوم ہوا کہ نشیبی آبادیوں کو سیلاب نے آلیا ہے۔ دائیں ہاتھ والے قافلے میں جھنڈا اور، دو کوٹھہ، میرواہ، تاندیانوالہ، پتیل منڈا، بھاگل اور ان کے ملحقہ دیہات تھے اور بائیں ہاتھ پر سوہاوہ، غازی گھاٹ، کوٹلہ، حامی شاہ، گورلے کی، سک والہ بستی کریک، بکھیری، بھولا والہ اور ان کے آس پاس کی آبادیوں کے لوگ تھے، جن کو سیلاب نے راتوں رات آن لیا تھا، اور وہ اچھی طرح خبردار بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آدھوں آدھا آبادیوں کو سیلاب نے نگل لیا، بھوکے پیاسے مویشی ساتھ لیے، لاٹھیوں پر گٹھڑیاں لٹکائے، بیل گاڑیوں پر چارپائیاں، گدڑیاں، رضائیاں، ٹین کے ٹرنک اور لکڑیوں کے صندوق لادے، ہاتھوں میں لاٹھیاں، کلہاڑیاں یا ٹبیروں کی گٹھلیاں اور تیتروں، چکوروں کے پنجرے تھامے یہ لوگ ڈھور ڈنگروں کی طرح خاموش اور سر جھکائے بدھن وال کے خوشحال گھرانوں سے آنکھیں چراتے، ندامت اور انکساری کے مارے دور دور رہتے یوں چلے جا رہے تھے گویا ان سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

معانقہ

حفیظ احسن

جونہی کریم کیشیئر نے کا براؤن کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کھڑکی کی طرف مڑا لمبے میز کے گرد سموسے کھاتی ہوئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور بیگم کریم نے ساڑھی کا پلو چھوڑ کر ایک لمحے کے لیے اپنی پیشانی تھام لی۔ کریم سب کو ہنستے ہوئے دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگا۔ اس بہرے آدمی کی طرح جو کسی بڑی شگفتہ محفل میں بیٹھا ہنس رہا ہو اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں بہرہ ہوں تو کیا ہوا، اندھا تو نہیں ہوں۔ لیکن کریم بہرہ نہ تھا اور آنکھیں تو اس کی بڑی خوب صورت اور غلافی غلافی سی تھیں جو اس کے سرخ و سپید چہرے کی اونچے بانسے والی ناک پر کسی طاؤسی مجسمے کی آنکھوں کی طرح ترشی ترشی نظر آتی تھیں۔ بیگم کریم نے پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر اپنے شوہر کو دیکھا جس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور چہرے پر ایک وسیع مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھنچے ہوئے ہونٹوں والی مسکراہٹ بیگم کریم کو زہر لگتی تھی اور وہ کئی مرتبہ اپنے شوہر سے کہہ چکی تھی کہ ہونٹ بھینچ کر مسکرانے والا آدمی ممکن ہے امریکہ میں بھلا معلوم ہوتا ہو لیکن پاکستان میں بالکل بونگا لگتا ہے۔ "خدا کے لیے آپ یا تو اتنی شدت سے مسکرایا نہ کریں۔ اگر مسکرایا کریں تو اپنے ہونٹوں کو کھلا چھوڑ دیا کریں، خدا کا فضل ہے آپ کے ہونٹوں میں کوئی نقص نہیں ہے، یہ گلاب کی پتی اور انار کے دانے کی طرح دل کش اور پیارے ہیں اور آپ کے دانت بھی ماشاء اللہ موتیوں کی طرح آب دار اور خوب صورت ہیں۔" لیکن اس معاملے میں کریم، اس بھلا چاہنے والی نیک خاتون کا جو گذشتہ پندرہ برس سے اس کی رفیقۂ حیات تھی کبھی کلیجہ نہ ٹھنڈا کر سکا۔ یہ بات نہیں کہ اس نے کبھی بیگم کی دانشمندانہ ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا، اس نے ایسا کرنے کی بارہا کوشش کی تھی۔ لیکن اس بات کا کیا اپائے تھا کہ اسے اپنی بیگم کی ایسی باتیں ہمیشہ مسکرانے کے بعد یاد آتی تھیں۔ اس وقت ایک لمحے کیلئے وہ اس کھلونے کی طرح ساکت ہو جاتا جس کی کوک ختم ہو گئی ہو۔ پھر وہ فوراً اپنے ہونٹوں کو کھول کر سفید سفید دانت بالکل اچانک طور پر یوں نکالتا جیسے پردۂ فلم پر کوئی بدروح اپنے تازہ شکار کو دیکھ کر باچھیں نکالتی ہے۔ ایسے موقعوں پر بیگم کریم عام طور سے بے ہوش ہوتے ہوتے رہ جاتی تھی۔ اب آج ہی کی بات تھی پارٹی میں آنے سے پہلے بیگم نے خود اس کی ٹائی کی گرہ لگائی تھی، اپنے ہاتھوں سے گلے اور آستینوں کے بٹن بند کیے تھے۔ بوٹ اور جراب کی جانچ پڑتال کی تھی اور پھر کوٹ پہناتے ہوئے جوتے کے تسموں سے لے کر پیشانی سے اوپر مانگ تک اور پشت کی طرف ایڑی سے لے کر گدی تک ایک ایک چیز کا بغور ملاحظہ کیا تھا لیکن ہائے ری قسمت مضحکہ تمسخر تو جیسے ان کا نصیب بن چکا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ پیچھے کی طرف سے قمیض پتلون سے باہر نکل آئے گی۔ اور اگر ایسا ہو ہی گیا تھا تو اسے بھری محفل میں کوٹ اتارنے کی دھن کون سے آسمان کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔

دبی دبی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ میں بیگم کریم اٹھ کر اپنے شوہر کی طرف بڑھی۔ اس کے چلنے کا انداز بڑا باوقار تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے خاوند کی اس اتفاقی مجلسی بے قاعدگی پر وہ لوگوں کے ردِ عمل سے قطعی متاثر نہیں ہے۔ وہ باتیں کرتے آہستہ آہستہ چلتی اپنے شوہر کو ساتھ والے سنہری چمکیلی ٹائلوں والے باتھ روم میں لے گئی۔ "با۔ با۔ بات کیا ہے" کریم نے حسب عادت ہکلاتے ہوئے اپنی بیگم سے پوچھا۔ اس پر ایسی ہکلاہٹ عام طور پر ایسی محفلوں میں طاری ہوا کرتی تھی۔ جن میں خواتین بڑی تعداد میں شریک ہوں۔ بیگم کریم خاموش تھی، لیکن کریم کو کھٹک گئی تھی کہ کوئی بات خلاف

معمول ضرور ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس نے منہ چباڑ کر آنکھیں کھولیں باتھ روم کے آئینے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھا اور ٹھوڑی اور گالوں پر انگلیاں تھپتھپاتے ہوئے بولا "صورت تو میری ٹھیک ہے۔ پھر۔ پھر"۔ بیگم ہنس پڑی "صورت تو آپ کی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ لیکن پیچھے سے اپنی قمیض کو پتلون کے اندر کر لیجیے' اور ہاں خدا کے لیے باہر نکلتے ہی کوٹ کی طرف نہ لپکیے گا۔ اسے چلتے وقت پہنیے گا۔"

بیگم کریم نہ صرف ایک تعلیم یافتہ خاتون تھی بلکہ اپنے حلقوں میں مجلسی زندگی کی جان سمجھی جاتی تھی' اچھی عمدہ گفتگو کی شہزادی اور سلیقہ شعاری کا چلتا پھرتا مجسمہ تھی' ہلکا ہلکا میک اپ اس انداز سے کرتی تھی کہ کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ کتنا ہے۔ جسیم' بوٹا سا قد اور گھنگھریالے بالوں والی یہ سرخ و سپید خاتون پانچ بچوں کی ماں ہو گئی۔ بس یوں لگتا تھا کہ ڈولی سے اترے زیادہ سے زیادہ دو سال ہوئے ہوں گے' ایک دفعہ سلیمان جی غفار بھائی کی پارٹی میں ہندوستان سے آئی ہوئی ایک ادھیڑ عمر' خوش لباس پارسی خاتون نے اسے ساڑھی پہنے ہوئے دیکھ کر کہا تھا "ادھر بلمبے میں وہ سالا سہراب مودی کا مسز مہتاب بھی سالا اس ماپھک ساڑی نہ پہنتا ہوتا۔"

کریم جب کبھی ایسی محفلوں میں اپنی بدحواسیوں سے ایک خاص قسم کے رسوا کن مزاح کا رنگ پیدا کر دیتا تو وہ اور سنجیدہ ہو جاتی تھی' اور ایک طرح کے خاموش اظہارِ ناپسندیدگی سے اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے مرد عورتوں کو گہرا احساس دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ اسے اپنے شوہر کے بارے میں لوگوں کا ایسا تضحیک بھرا رویہ ہرگز پسند نہیں' لیکن وہ دل ہی دل میں کڑھتی ضرور رہتی تھی کہ آخر اس کے شوہر جو بظاہر بڑی وجیہہ اور خوب صورت شخصیت کے مالک تھے' نیک اور فرض شناس تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اتنے مضحکہ خیز کیوں ہیں' اور اس بات پر اکثر گھر میں بڑی بدمزگی رہتی تھی۔ بیگم کریم کلبوں اور پارٹیوں میں تو کریم کو بڑی فراخدلی سے معاف کر دیتی تھیں۔ لیکن گھر آ کر وہ دبی دبی زبان میں اپنے دل کا غبار نکالتیں۔ کریم دانتوں سے ناخن کاٹتے ہوئے اپنی بیوی کی جلی کٹی سنا کرتا جب کوئی بات اسے چبھتی تو بار بار اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیتا یا ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے میل کی مروڑیاں اتارنے لگتا' کان کے لووں کی چٹکیاں لیتا' ناک کے نتھنے پھڑپھڑا کر سوں سوں کرتا اور اگر کچھ اور نہ ہوتا تو منہ کھول کر اوپر چھت پر لوہے کے شہتیروں پر جڑی ہوئی آہنی کڑیاں گننے لگتا۔ اس وقت بیگم کریم کو ایک جھنجھلاہٹ کے ساتھ ساتھ خوشگوار قسم کی مسرت بھی ہوتی' وہ کچھ دیر کے لیے اپنے شوہر کی تمام بدحواسیوں اور مضحکہ خیزیوں کو بھول جاتی اور ایک لمحہ کے لیے اپنے شوہر کی اطاعت شعاری اور مرعوبیت پر اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔

گھر پہنچتے ہی نوکر نے ایک لفافہ بیگم کریم کو دیا' جو کریم کے کسی رشتہ دار عزیز نے نارتھ ناظم آباد سے بھجوایا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں ان کے گاؤں کے چودھری ابراہیم ضلع دار کی بڑی لڑکی شمیم آپا اپنے شوہر کے ہمراہ کراچی آئی ہوئی تھی اور وہ کل شام پانچ بجے ان کے ہمراہ کریم کے گھر آ رہے ہیں' خط پڑھ کر کریم کچھ ایسے مبہوت سا رہ گیا جیسے ابھی اس کے کان گھوڑے کی کھڑی کنوتیوں کی طرح لمبے ہو جائیں گے۔

"کون ہے یہ شمیم آپا؟" بیگم کریم نے پوچھا۔ کریم نے آہستہ آہستہ حسب عادت لفظوں کے گھونٹ بھرتے اور ہکلاتے ہوئے مختصراً بیگم کو بتایا کہ وہ لوگ ادھر ہندوستان میں اس کے گاؤں میں رہتے تھے اور اس کے والد اس کے ابا جی کے گہرے دوست تھے' بچے کے چیخنے کی آواز سن کر بیگم شور کی طرف چل دی اور کریم ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ اٹھائے اپنے کمرے میں چلا گیا' کمرے میں روشن دان اور کھڑکیوں سے داخل ہوتی مدہم سی روشنی کے سوا بالکل اندھیرا تھا۔ کریم نے سوئچ بورڈ پر گڑے ہوئے سبز زیرو بلب کا بٹن دبایا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں کمرے کے اندر رکھی ہوئی چیزیں بڑی پراسرار سی لگ رہی تھیں۔ کریم نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا

"ہک ہا — شمیم آپا" اور پھر ایک تل شہد کی مکھی کی طرح بھنبھناتا ہوا اس کے دماغ میں گھس گیا' یہ وہی تل والی شمیم آپا تھی جسے پورے بائیس برس بعد وہ دیکھنے والا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں والی گوری گوری شمیم آپا' جو اس سے نفرت کرتی تھی۔ جسے اس کی شکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ شمیم آپا جس کے داہنے ہونٹ کی نوک کے پاس گال کی ہنسنے والی لکیر پر ایک سیاہ تل تھا۔ یہ تل کریم کو کتنا پیارا لگتا تھا۔ جب شمیم آپا کسی سے باتیں کرتی تو یہ تل اس متحرک لکیر کے ساتھ اپنی جگہ بدلتا رہتا۔ جب شمیم آپا ہنستی تو اس کے ملنے والے بالائی دانت سے ٹھیک داہنی طرف چوتھا نوک دار دانت جو باقی دانتوں کی نسبت کافی ابھرا ہوا تھا، اس کے گلابی ہونٹ کے نیچے چنبیلی کی بند کلی کی طرح نمودار ہوتا۔ اس وقت اس کے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش پیدا ہوتی کہ وہ بھاگ کر شمیم آپا کو اپنے سینے سے لگالے اور اس سیاہ تل کو۔ تل کو۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ شمیم آپا کو تو اس کی صورت سے نفرت تھی۔ مزاج کی اتنی کڑوی کسیلی تھی کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی اور پھر کریم سے عمر میں بھی پانچ چھ سال بڑی تھی۔ کریم ان دنوں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا اور شمیم آپا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ وہ سکول سے آتے ہوئے قریب قریب ہر روز دروازے میں سے جھانک کر شمیم آپا کو دیکھتا جو جامن کے درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی۔ وہ چپکے چپکے اسے دیکھتا رہتا۔ اباجی ضلع دار کے ہاں شطرنج کھیلنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ جب کبھی اماں جی اسے اباجی کو بلانے کے لیے ضلع دار صاحب کے ہاں بھیجتی تو اس کی موج ہو جاتی۔ لیکن یہ دور دور کی باتیں تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ شمیم آپا اسے کیوں پسند ہے۔ بس اسے اس کی ہنسی بہت پسند تھی' وہ تل بہت پسند تھا جسے شمیم آپا کے چاندی جیسے گورے گال پر تھرکتے دیکھ کر اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی اور وہ چنبیلی کی بند کلی سا ابھرا ابھرا اجلا سفید دانت تو بہت ہی اچھا لگتا تھا، کیونکہ وہ اس وقت نظر آتا تھا جب شمیم آپا ہنستی تھی۔ لیکن یہ دور دور کی شمیم آپا تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شمیم آپا اتنی سنگ دل بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے اباجی بیمار ہوئے اور حکیم جی نے گائے کا خالص دودھ استعمال کرنے کی ہدایت کی تو ضلع دار صاحب نے بہت مصر ہو کر اباجی کو مجبور کیا کہ دودھ ان کے ہاں سے منگوا لیا کریں۔ ضلع دار صاحب نے ان دنوں ملٹری ڈیری فارم سے ایک بڑی خوب صورت گائے بڑی کوشش سے خریدی تھی جو بھینس اتنا دودھ دیتی تھی' وہ روزانہ پیتل کی سفید قلعی والی گڑوی لے کر ضلع دار صاحب کے گھر جاتا۔ شمیم آپا گھڑونجی میں جاتی رکھے ملنے والوں کو پانی ملی لسی تقسیم کر رہی ہوتی۔ اسے دیکھ کر شمیم آپا کے ماتھے پہ بل پڑ جاتے۔ "کمبخت گھور گھور کر مجھے یوں کیوں دیکھا کرتا ہے۔" پھر وہ گڑوی اس کے ہاتھ سے جیسے چھینتے ہوئے کہتی "ادھر لا دے" وہ دودھ سے بھری ہوئی گڑوی بڑی بے احتیاطی کے ساتھ دوسری کے ہاتھ کی طرح اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں میں تھما دیتی۔ گڑوی کے کناروں سے بہت سا دودھ چھلک کر زمین پر گر جاتا۔ لیکن شمیم آپا کو اس کی بالکل پروا نہ تھی۔ ایک دن وہ بہت سویرے چلا گیا۔ شمیم آپا مدھانی کے گرد لپٹی ہوئی رسی کو رنگین دھاریوں والی گلابی انگلیوں میں پھنسائے دودھ بلو رہی تھی۔ نوکر دودھ دوہنے والی لوہے کی بالٹی نلکے کے کھرے میں رکھے راکھ سے مانجھ رہا تھا۔ جامن کے درخت کے نیچے پکی پکی سیاہ جامنیں بکھری ہوئی تھیں۔ گڑوی تنور والے کچے چبوترے پہ رکھ کر اس نے ڈرتے ڈرتے جامنوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اوئے کمینے کے بچے! یہ کیا کر رہا ہے تو۔ چل ادھر ہٹ۔" اس نے گردن گھما کر شمیم آپا کی طرف دیکھا تو وہ سونے کی تیلی والا نتھنا پھلائے اسے بلی کی طرح گھور رہی تھی۔ دوسرے دن کچے چبوترے پر بیٹھتے ہوئے اس نے تنور کے منہ کا کنارا توڑ دیا تو شمیم آپا کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ "ہاتھ ٹکتا ہی نہیں مرن جوگے کا' گندی شکل والا منحوس۔"

"شمیم آپا! میں نے جان کر تھوڑے ہی توڑا ہے جو تم خفا ہو رہی ہو۔"

"بس بس زبان نہ چلا۔ آئندہ وقت پہ آیا کر' آدھی رات کو گھر سے چل پڑتا ہے۔" اور اس روز تو بس حد ہی ہو گئی۔ دوپہر کے وقت شمیم

آپا ملانی جی کے گھر میلاد شریف پر گئی ہوئی تھی کہ جیجا اسے راستے میں مل گیا۔ "چل ذرا جامنیں توڑیں ضلع دار کے گھر سے، وہاں کوئی نہیں ہے۔"

وہ دونوں حیدر کی بیٹھک کی چھت پر سے ضلعدار صاحب کے احاطے میں کود گئے اور درخت پر چڑھ کر پکی پکی جامنیں توڑنے لگے۔ پتہ نہیں شمیم آپا بلی کی طرح چلتی ہوئی کس وقت درخت کے نیچے پہنچ گئی۔ اس کے گھنگھرو کی آواز سن کر جونہی اس کی نظر نیچے پڑی تو اس کی روح فنا ہوگئی۔ "کیسے منحوس، نیچے اتر تیری ہڈیوں کا سرمہ بناتی ہوں۔" وہ جلدی سے دوسری شاخ کو پھلانگ کر پڑے تنے پر قدم جمانے ہی لگا تھا کہ شاخ ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آگئی اور وہ تیزی سے زمین کی طرف لڑھکا اور شمیم آپا کے جسم کے اوپر ڈھیر ہوگیا۔ اس کا دھڑکتا ہوا سینہ شمیم آپا کی تنی ہوئی چھاتیوں کے اوپر تھا اور ہونٹ اس سیاہ تل سے کوئی دو انچ اوپر تھے۔ شمیم آپا تڑپ کر اس کے جسم کے بوجھ تلے کسمسائی اور پھر پھیلی ہوئی انگلیوں کے پنجے سے اس کے منہ کو پرے دھکیلتے ہوئے بولی "دور ہٹ گندی شکل والے منحوس۔" وہ گھنی شاخوں والی ٹہنی ایک طرف ہٹا کر اٹھی اور دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک کیکر کی چھلی ہوئی کھردری ٹیڑھی چھڑی اٹھا کر اس کی طرف آئی۔ غصے سے اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور چہرے کی خراشوں سے بہتے ہوئے خون سے سرخ لکیریں بن گئی تھیں۔ کریم کو مارنے کے لیے اس نے چھڑی والا ہاتھ ہوا میں لہرایا تو اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے سر کو غیر شعوری طور پر ڈھانپ لیا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن دوسرے لمحے شمیم آپا کی مضبوط بانہہ نیچے گر گئی اور اس کی آنکھیں اپنی اصلی حالت پر آگئیں لیکن ان میں بلا کی نفرت تھی۔ "جا چلا جا۔ دفع دور ہو جا۔"

اور اسے محسوس ہوا جیسے شمیم آپا نے اپنی آنکھوں میں پھیلی ہوئی نفرت کی ساری سیاہی اس کے منہ پر انڈیل دی ہے اور اس کا چہرہ بالکل سیاہ ہوگیا ہے۔ ان پکی پکی جامنوں کی طرح جنہیں توڑنے کے لیے وہ جیجے کے ساتھ درخت پر چڑھا تھا۔

نوکر کوٹھی کے سامنے ٹیکسی سے اترتے ہوئے مہمانوں کو دیکھ کر دروازے کے پردے کے اندر منہ کر کے بولا:

"بی بی جی وہ آگئے ہیں۔"

تیزی کے ساتھ بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے کریم کا ہاتھ برآمدے میں گول میز پر چنے ہوئے برتنوں پر پڑا تو ایک چھناکے کے ساتھ چینی کراکری کے کئی عمدہ نمونے فرش پر ٹکڑوں کی صورت میں بکھر گئے۔ بیگم نے نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے کریم کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ مہمانوں کو پھاٹک کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔ "بس آ گئے" ایک بھرے بھرے جسم اور موٹی موٹی آنکھوں والی تقریباً چالیس سالہ خاتون ہنستے ہوئے آگے بڑھی اور "کریم بھائی" کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ کریم کی ٹانگیں جیسے ایک دم جواب دے گئیں، اس کے کولہوں سے پسینے کی لکیریں پھسل پھسل کر پتلون کے کناروں میں جذب ہونے لگیں، شمیم آپا کا گدگدا جسم اس کی بانہوں کے حلقے میں تھا اور سر اس کی ٹھوڑی سے مس کرتا ہوا کریم کے کندھے پر ٹکا ہوا تھا، سر میں کہیں کہیں سفید بالوں کے تار چمک رہے تھے اور شمیم آپا کے چہرے کا وہ سیاہ تل اور بائیں جانب چنبیلی کی بند کلی سا لگتا تھا۔ دانت مل کر ہنس رہے تھے، مسکرا رہے تھے۔ اور وہ کہہ رہی تھی "تمہیں دیکھنے کو دل بہت تڑپتا تھا، کتنے بیوفا ہو تم۔ کبھی یاد تک نہ کیا کہ شمیم آپا زندہ ہے یا مر گئی، پوچھو اپنے بھائی جان سے میں تمہیں کتنا یاد کرتی رہی ہوں۔" کریم زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بس اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بیگم کریم آنکھیں پھاڑے کبھی اپنے خاوند اور کبھی شمیم آپا کو دیکھ رہی تھیں۔

پچھلی دوپہر سے مطلع ابر آلود تھا۔ جس وقت شام کو شمیم آپا رخصت ہوئیں تو دیکھتے ہی دیکھتے گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ کریم نے اپنے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے ہوا کے جھونکوں میں پھڑپھڑانے لگے، باہر سڑک پر موسلا دھار

بارش ہو رہی تھی۔ اور کریم کھڑکی کے پٹ کے ساتھ کھڑا سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ سڑک پر پھیلی ہوئی مٹی اور کیچڑ اب دھل کر صاف ہو چکی تھی اور اس پر بارش کا جھاگ اڑاتا پانی بہہ رہا تھا۔ گراسی پلاٹ کے درختوں اور پودوں کے پتے پانی میں نہا کر بھیگے بھیگے سے بلب کی روشنی میں صبح کی سنہری کرنوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس نے بچا سگریٹ سلگا کر تیلی کھڑکی کی سلاخوں سے باہر پھینکی تو اسے بیگم کی آواز سنائی دی "کھانا بھجوا دوں"؟

"نہیں میں نہیں کھاؤں گا۔"

"اللہ تو پہلے بتا دیا ہوتا، میں اتنی دیر سے کچن میں جھک مار رہی ہوں۔" کریم خاموش رہا۔ بیگم کمرے سے باہر نکلنے لگی تو وہ بولا "صبح مجھے دفتر جلدی جانا ہے۔ چھ بجے گرم پانی اور ناشتہ تیار کروا دینا۔"

صبح بیگم کریم بستر سے اٹھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کریم تیار ہو کر کپڑے پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھا بالوں میں کنگھی کر رہا ہے۔

"ارے آپ تیار ہو گئے!"

"اور کیا کرتا، تم تو گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھیں، دراصل تم لوگوں کو اپنی ذمہ داری کا کوئی احساس نہیں ہے۔"

"ذمہ داری کا احساس!"

"ہاں، ہاں" کریم کی آواز میں بڑی حکیمانہ سرزنش تھی "اب کھڑے کھڑے احمقوں کی طرح میرا منہ کیا تک رہی ہو، ناشتہ دو تا کہ میں بھی چلا جاؤں۔"

"آج میں — میں آپ کی نظروں میں احمق ہو گئی ہوں؟" بیگم کریم قریب قریب چیخ پڑی۔

"نہیں صاحب، احمق تو میں ہوں جو پندرہ ۲۰ برس سے آپ کے ساتھ جھک مار رہا ہوں۔"

کریم کے چہرے پر ایک وسیع طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ میں سے اس کے اجلے اجلے سفید دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں خود اعتمادی سے دیکھ رہا تھا، جیسے کوئی ممتحن کسی امیدوار کا انٹرویو لینے کے لیے اسے اپنی نظروں میں تول رہا ہو اور بیگم کریم بدحواسی میں آنکھیں پھاڑے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس اکھڑ اور سخت مزاج انسان سے واسطہ پڑا تھا۔

"ناشتے کے لیے اب اور کتنا وقت ضائع فرمائیے گا میرا؟"

"آ آ آپ — بھی لاتی ہوں۔" اور بیگم کریم ہکلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

بیری والا گھر

عظیم سرور

نئی کراچی میں آئے ہوئے معین خاں کو ایک سال ہونے کو آیا تھا لیکن اب تک ان کا مزاج اس بستی سے ڈھب پر نہیں آیا تھا۔ نہ یہاں کے لوگوں سے رسم و راہ پیدا ہوئی تھی۔ بس ایک لال خاں تھے جو شام کو آ کر دو گھڑی بیٹھ جاتے اور لالو کھیت کی خبریں سنایا کرتے۔ لال خاں لالو کھیت کے سکول میں چپراسی تھے اور ندی کی جھگیوں میں سے اٹھ کر آئے تھے۔ معین خاں کی جھگی گجر نالے پر تھی۔ ایک سال پہلے جب گجر نالے کی جھگیوں میں آگ لگی تو معین خاں نئی کراچی آئے تھے۔

کراچی کی جھگیوں میں آگ یونہی منٹوں سیکنڈوں میں لگتی ہے۔ کہیں مٹی کے تیل کا کوئی چولہا پھٹا یا کسی ڈبے سے ٹاٹ نے آگ پکڑی تو جانو قیامت آگئی۔ سمندری ہوا آگ کے شعلوں کو لے اڑتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے جھگیوں کے آسمانوں پر دھواں پھیل جاتا ہے۔ اس دھوئیں کے نیچے آگ کی زرد لپٹیں ہوتی ہیں اور اوپر کی لہریں انسانی چیخوں سے لرزتی ہیں۔ گھنٹے پون گھنٹے بعد اس فضا میں سائرن کی آواز پھیل جاتی ہے، فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آتی ہیں لیکن آگ اس عرصے میں سینکڑوں گھروں پر اپنے جلال کی نمائش کر چکی ہوتی ہے۔

ایک سال پہلے بھی گجر نالے کی جھگیوں میں ایک دن یہی ہوا تھا۔ ہوا تیز تھی اور آگ اس تیزی سے پھیلی کہ ماؤں کو اپنے بچوں تک کا خیال نہ آیا۔ فائر بریگیڈ نے آ کر لوگوں کی مدد سے جب بیچ کی پچاس ساٹھ جھگیاں گرائیں تب آگ بجھ گئی لیکن دلوں کی آگ ساری رات لوگوں کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کی شکل میں بہتی رہی۔ ایک انجمن نے بے گھر لوگوں کے لیے شامیانہ لگوا دیا تھا۔ چار دن تک اس انجمن کی طرف سے دیگیں چڑھتی رہیں۔ ان چار دنوں میں کچھ لوگوں نے کہیں سے روپیہ پیسہ پکڑ کر پھر بانسوں کے سہارے تختے کھڑے کیے اور باقی لوگ نئی کراچی لے جانے والے ٹرکوں کا انتظار کرتے رہے۔ معین خاں کو بھی نئی کراچی میں ایک کوارٹر الاٹ ہو گیا تھا۔ اس آگ نے ان کے دل کو ایسا جلایا کہ انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ گجر نالے کے پاس خاموشی کا کوئی ہے جہاں ان کی بیوی دفن ہے اور جہاں وہ ہر دوسرے تیسرے فاتحہ پڑھ آتے ہیں اور لالو کھیت میں بے شمار دوست ہیں جن سے ان کا دل لگا ہے۔ ان سب باتوں کو بھول کر وہ نئے گھر کی سوچ رہے تھے۔ ٹرک کی انہیں زیادہ فکر یوں نہ تھی کہ ان کے پاس کچھ سامان تھا ہی نہیں۔ بس کل کائنات ایک ٹھیلہ اور ایک بیٹی صغریٰ تھی۔ جب آگ لگی تو وہ چوراہے پر ٹھیلہ لگائے ہوئے تھے۔ صغریٰ گھر میں اکیلی تھی۔ آگ آگ کا شور مچا تو وہ پکے مکانوں کی طرف دوڑی اور وہاں کھڑی ہوئی عورتوں کی چیخوں کے ساتھ آواز ملا اپنے جلتے گھر پر رونے لگی۔

نئی کراچی آ کر معین خاں نے ٹھیلے پر پھل بیچنا بند کر دیا، ورنہ سبزی منڈی جانے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ ٹھیلے کو انہوں نے کیبن بنوا لیا تھا اور اس میں پان سگریٹ رکھ کر بیچنے لگے تھے۔ تینتیس روپے ہر ماہ انہیں پنشن کے مل جاتے۔ اس ایک سال کے عرصے میں پیسے پیسے کر کے انہوں نے گھر کو قاعدے کا بنا لیا تھا اور صغریٰ کے لیے کپڑوں کے جوڑے اور ہلکا سا کچھ زیور بھی بنوا لیا تھا۔ صغریٰ کی ماں زندہ ہوتی تو یہ سب جھنجھٹ وہی سنبھالتی لیکن اب یہ بوجھ معین خاں کے سر تھا اور معین خاں جو سرکاری نوکری سے سفید بالوں کا تحفہ لے کر ریٹائر ہوئے تھے۔ اب سوچا کرتے تھے کہ یہ کام

کیسے نمٹے گا۔ ایسے لمحوں میں انہیں اپنی مرحوم بیوی کی یاد اس شدت سے آتی کہ وہ روہانسے ہو جاتے اور بے بسی کا وہ عالم ان پر طاری ہو جاتا تو جب آنسو بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہر رات جب وہ بستر پر لیٹتے اس سوچ میں ڈوبے رہتے۔ کبھی وہ ان ساعتوں کا تصور باندھتے جب صغریٰ کے سر پر سہرا بندھا ہو گا اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے کہیں گے — "بیٹی تیرا اصل گھر تو وہی ہے۔ جا خدا حافظ۔"

گجرنالے کی جھگی میں رہتے ہوئے بھی معین خان نے چار سال کا عرصہ اس انتظار میں گزار دیا تھا کہ شاید کوئی شخص ان سے صغریٰ کے رشتے کی بات چھیڑے۔ معین خاں میں تو اس بات کی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے منہ سے کہتے کہ میری بیٹی کو بیاہ لے جاؤ۔ اسی بات پر لالوکھیت کے ایک خلیفہ جی کو ایک بار معین خان نے ڈانٹ بھی دیا۔ خلیفہ جی کی چار جوان لڑکیاں تھیں بہت زیادہ بوجھ تھا اور خلیفہ جی اس بوجھ سے ایسے بوکھلائے تھے کہ ہر جگہ، موقع بے موقع اپنی لڑکیوں کا ذکر لے بیٹھتے اور کہتے۔ "دعا کرو میری لڑکیاں عزت و آبرو سے گھر بار کی ہو جائیں۔ اے بھائی تمہاری نظر میں کوئی شریف لڑکا ہے۔ بس لڑکا محنتی ہونا چاہیے۔ باقی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" بات جانے کہاں کی ہو رہی تھی لیکن خلیفہ جی نے اس کی تان اپنی چار لڑکیوں پر لا توڑی تو معین خان کو غصہ آگیا۔ کہنے لگے۔

"شرم کرو خلیفہ جی۔ تم تو یوں بات کرتے ہو جیسے لڑکیوں کا سودا کرنے والے۔ موقع مقام تو دیکھ لیا کرو۔ میاں اللہ پر بھی بھروسہ کرنا چاہیے۔ جہاں لکھا ہے وہاں ہو جائے گا۔"

معین خاں پر گجرنالے کے چار سالوں سے زیادہ بھاری نئی کراچی کا ایک سال گزرا تھا۔ اس ایک سال کے عرصے میں انہیں رہ رہ کر خلیفہ جی کی ایک بات یاد آتی تھی۔ "میاں معین! ہر نئے دن ان لڑکیوں کا بوجھ دوگنا ہو جاتا ہے۔"

اردو اخبار کی خبریں سن سن کر ان کی جان اور سوکھتی تھی شام کے وقت وہ دس پیسے کا اخبار خرید کر رکھ لیتے۔ اس وقت ان کے پاس لال خاں آیا کرتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ کسی اڈے کے سے آتے جو اخبار میں جرائم کی خبریں سنایا کرتا تھا۔ اخبار میں اغوا کی خبریں ہوتیں یا ان لڑکیوں کے عدالتی بیانات جو اپنے ماں باپ کو ٹھکرا کر اپنے عاشق کا ہاتھ تھام لیتیں۔ ایسی خبریں سن کر معین کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور ان کے منہ سے صرف دو تین لفظ ہی نکل سکتے۔ "توبہ ہے توبہ۔"

ارے میاں! غریب لڑکیاں بھی کیا کریں۔ کب تک بیٹھی رہیں۔ لال خاں ہر بار ایسا ہی فقرہ بولتے اور معین خاں کھسک جاتے۔ ان کا دماغ صغریٰ کے بوجھ تلے ایسا دبا کہ انہیں کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ "ہماری صغریٰ جانے کب تک بیٹھی رہے گی۔"

نئی کراچی میں کچھ زیادہ لوگوں سے رسم و راہ بھی نہ پیدا ہوئی تھی۔ سارے کے سارے مزدور پیشہ لوگ تھے اور گھر اور روزگار کے علاوہ ان کی ساری فکر بس تک محدود رہتی جس میں گھس کر وہ میلوں دور اپنے کام پر جاتے۔ رات دیر تک ان کے کیبن سے لوگ سگریٹ ماچس خریدتے رہتے لیکن لال خاں کے سوا کوئی ایسا نہ ہوتا جو دو گھڑی ان کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کر لیتا۔ اڑوس پڑوس میں رہنے والوں سے بھی بس معمولی سی صاحب سلامت تھی۔ صغریٰ نے جس گھر سے زیادہ تعلقات بڑھائے تھے وہاں خود ایک نہ دو چند لڑکیاں تھیں۔ معین خاں اگرچہ کر سکا کرتے بھی تو ان لوگوں سے کیسے کہتے کہ میری بیٹی کے لیے کوئی لڑکا تلاش کر دو۔ لے دے کے ایک لال خاں رہ جاتے تھے جن سے معین خاں کا دل مل گیا تھا۔ لال خاں کے کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ لڑکا نہ لڑکی بس ایک وہ تھے ایک بیوی۔ دونوں کو اولاد کی بہت تمنا تھی۔ لال خاں اب تک امید لگائے ہوئے تھے اور کسی پیر فقیر حکیم ڈاکٹر کے ہاں سے ذرا سا بھی آسرا بندھتا تو دونوں خوش رہتے۔ اولاد کی خواہش تو اتنی تھی لیکن اولاد جو بوجھ بے کر آتی ہے اس سے وہ بالکل ناآشنا

تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اب تک معین خاں نے لال خاں سے صغریٰ کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

اس دن جب انہوں نے سنا کہ نئی کراچی کی ایک لڑکی فرار ہوتے ہوئے پکڑی گئی ہے تو انہوں نے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ لال خاں سے صغریٰ کے بارے میں بات کر ہی لی جائے۔ شاید اُسے اس کے بوجھ کا احساس ہو جائے اور وہ کسی جگہ بات لگا دے۔ اُس دن وہ اپنی کیبن سے اُٹھ کر دو مرتبہ گھر گئے۔ صغریٰ باپ کے بار بار آنے پر کچھ پریشان سی ہوئی اور اس نے پوچھا۔

"کیوں ابا خیریت تو ہے"

"کچھ نہیں بیٹے یونہی تجھے دیکھنے آگیا تھا"

شام کو جب لال خاں اپنے ساتھ رِکشا لے کر آیا تو معین خان نے اس کی طرف بڑھا دیا۔ جتنی دیر وہ رِکشا اخبار سناتا رہا معین خان اپنے دل اور دماغ سے لڑتے رہے۔ اخبار ختم ہو گیا تو لال خاں بولے۔

"کیوں بھائی معین۔ کیا سوچ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو۔" لال خان کو معین خان کی خاموشی کھلنے لگی تھی۔

"ارے یار۔ لڑکی کی سوچ رہا تھا۔

"کونسی وہ جو کل بھاگے جا رہی تھی۔ ہاں۔ کل آئے گی اخبار میں اس کی خبر"

"نہیں، اس کی نہیں" معین خان کے چہرے پر بیزاری کا ہلکا سا تاثر پھیل گیا۔

"پھر۔؟"

"دیکھ یار۔ تجھے معلوم ہے میں اپنی آنکھ کا اپریشن کیوں نہیں کرواتا"

"یہ کیا بات ہوئی"

"میں بتاتا ہوں۔ دیکھ میں اپنی لڑکی کی بابت سوچ رہا تھا"

"کیوں"

"وہ کہیں اپنے گھر بار کی ہو جائے تو میں اپنی آنکھ کا آپریشن کراؤں۔ نظر روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے"

"تو پہلے آپریشن کروا لو بھائی میرے"

"لیکن اس بوجھ کا کیا کروں؟"

"کمال ہے یار ایک لڑکی ہے وہ بھی بوجھ لگ رہی ہے"

"تو نہیں سمجھتا لال خاں بیٹی کا بوجھ کیا چیز ہوتی ہے۔

دیکھ بھائی۔ لال خاں ٹھہر ٹھہر کر بہت مدھم آواز میں بولنے لگے" میں تو یہ جانوں ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کا جوڑ پیدا کیا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ رشتہ خود بخود آجاتا ہے۔ ایک نہیں کئی آتے ہیں۔ ڈھیلوں کی طرح آگرتے ہیں"

"لیکن کہاں لال خاں۔ آج پانچ سال سے انتظار کر رہا ہوں۔" معین خاں کی آواز میں مایوسی تھی۔

"چلو آج نہیں تو کل سہی۔ فکر نہیں کرنی چاہیئے بھائی معین۔ بزرگوں کی بات کبھی جھوٹی نہیں ہوئی، جہاں بیری ہوتی ہے وہاں ڈھیلے ضرور آتے ہیں ——"

لال خاں کی ان باتوں کے بعد معین خاں خاموش ہو گئے۔ کیبن بند کر کے جب گھر آئے تب بھی لال خاں کے کہے ہوئے الفاظ ان کا پیچھا کرتے رہے۔ وہ یہ سوچے جا رہے تھے کہ اب تک ڈھیلا کیوں نہیں آیا۔ کیا اس شہر میں خود باہر نکلنا پڑے گا اور ہر اجنبی سے کہنا پڑے گا کہ میری لڑکی کے لیے کوئی بر تلاش کر دو۔ یا اللہ یہ کیسے ہوگا۔ پھر انہیں اپنی بیوی یاد آئی وہ ہوتی جیسے چاہتی نمٹاتی۔ انہیں کوئی فکر نہ ہوتی۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ قرآن کے سارے فرائض بھی ان کے سر آن پڑے تھے — اور یہ سارے فرائض ایسے بوجھل تھے کہ ان کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دماغ تو بالکل ہی اندھا ہو گیا تھا اور اس اندھے پن کے سائے ان کی آنکھوں کے سامنے بھی لہرانے لگے تھے۔

صغریٰ نے کھانا سامنے رکھا تو وہ سوچ رہے تھے "میرے گھر ڈھیلا کیوں نہیں آتا۔

یہ کیا زمانہ آگیا ہے۔" اس سوچ نے ان کی بھوک ختم کر دی۔ ان کے ذہن میں عجب کش مکش برپا تھی۔ کبھی اس لڑکی کا خیال آتا جو فرار ہوتے ہوئے گئی تھی۔ کبھی ان لڑکیوں کے قصے یاد آجاتے جو راتوں میں چھپ چھپ کر رنگ رلیاں مناتیں۔ کبھی لوگوں کے جملے یاد آتے جو تبصرے کے طور پر کہے جاتے اور کبھی انہیں خلیفہ جی کی بے چینی یاد آتی — پھر ان سب سوچوں پر لال خاں کا ایک فقرہ چھا جاتا۔ "میاں بیری والے گھر میں ڈھیلے ضرور آتے ہیں۔"

"تو پھر دیر کاہے کی مولا —" ان کے دل سے آواز نکلی۔ صغریٰ نے برتن مانجھتے۔ ہاتھ روک کر پوچھا۔ "مجھ سے کچھ کہا ابا۔"

"بیٹے میں کہہ رہا تھا۔ بستر لگا دئیے۔" معین خاں نے بات بنانے کے انداز میں کہا۔

"جی ابا۔" معین پھر برتنوں پر راکھ مارنے لگی اور معین خاں کمرے سے نکل کر صحن میں آگئے۔ صحن میں صغریٰ اور ان کی چارپائیاں۔ ساتھ ساتھ بچھی تھیں۔ چارپائی پر لیٹ کر ایک بار پھر ان کا جی اپنی بے بسی پر بھر آیا۔ بتاؤ زمانہ ایسا خراب کہ اللہ بچائے۔ آنکھیں جواب دیتی جا رہی ہیں۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے اور گھر میں جوان بیٹی ہے۔ کیسے مشکل آسان ہوگی خدایا —!

تھوڑی دیر میں صغریٰ بھی آکر لیٹ گئی اور روز کی طرح باتیں شروع کر دیں۔ معین خاں تو اپنی سوچوں میں الجھے ہوئے تھے۔ صغریٰ کی بات پر توجہ کیا دیتے۔

"ابا آج کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں بیٹی۔"

"مجھے بتاؤ تو۔"

"کچھ نہیں بس ذرا طبیعت خراب ہے۔ بس سو جاؤ۔"

آخری لفظ معین خاں نے جان چھڑانے کے انداز میں کہے۔ صغریٰ پھر اس کے بعد نہ بول سکی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ معین خاں اب تک جاگ رہے تھے۔ آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو انہوں نے دعا مانگی۔ اے خدا۔ تو نے میرے گھر میں بیری لگائی ہے، تو

کوئی ڈھیلا بھی پھینک ۔ یا خدا تو سب کی سُننے والا ہے میری بھی سُن لے ۔ بس اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہوتا۔"

اور پھر ان کی آنکھ لگ گئی ۔ جاگتے میں جو باتیں سوچی تھیں وہ خواب بن کر آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے آنگن میں ایک بڑی بیری لگی ہے اور اس پر ڈھیلے برس رہے ہیں ۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ صغریٰ روتی ہوئی رخصت ہو رہی ہے باجے زور زور سے بج رہے ہیں۔ پٹاخے چھوٹ رہے ہیں ۔

اچانک ان کی آنکھ کھل گئی ۔ ان کا سارا بدن پسینے میں تر ہو رہا تھا ۔ ایک انجانا سا تاثر ان کے تمام اعصاب پر پھیل گیا تھا ۔ "شاید میری دعا قبول ہو گئی ۔ انہوں نے سوچا ۔ اب مرفی بچی کے ہاتھ پیلے کرنے کا وقت آ گیا۔" انہیں صغریٰ پر پیار آیا ۔ گردن گھما کر اس کی چارپائی کی طرف دیکھا تو جیسے اُن کی جان نکل گئی ۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ایک دم وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور صغریٰ کی چارپائی کو یوں ٹٹولنے لگے جیسے وہ اندھے ہو گئے ہوں ۔

"صغریٰ!" انہوں نے آواز دی ۔ کوئی جواب نہ آیا ۔ "صغریٰ ۔ اصغریٰ ۔ اصغریٰ!!"

وہ آوازیں دیتے رہے ۔ کوئی جواب نہ آیا ۔ سارے گھر میں وہ اندھوں کی طرح گھوم لیے ۔ پھر آ کر صغریٰ کی چارپائی پکڑ کر بیٹھ گئے ۔ بستر کو یوں ٹٹولتے ہوئے جیسے صغریٰ اس کی کسی شکن میں چھپی ہو ۔ انہوں نے بہت تھکی ہوئی آواز میں کہا ۔ "یہ کیا ہو گیا میرے مولا ۔ ؟" اور اس مرتبہ ان کے ہاتھ میں ایک کنکر کی چبھن محسوس ہوئی ۔

کنکر کو ہاتھ میں لے کر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں گہرا اندھیرا تھا ۔

رنگ محل

انوار احمد زئی

سیٹھ واسومل آسُر داس شہر کے نامی گرامی بنئے تھے، اور روایتی بنیوں کی طرح کوڑی کوڑی پہ مہر لگا کر بھی رکھتے تھے۔ لیکن شاید یہ بھی ان بنیوں کی روایت رہی ہے کہ جب کسی کا بیاہ کرنے یا گھر بنوانے پہ آتے ہیں تو اشرفیوں کی بوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں۔ سیٹھ جی نے بھی جب یہ حویلی بنوائی تو شہر بھر میں چرچا ہو گیا۔ سیٹھ جی نے جی کھول کر پیسہ خرچ کیا۔ اور وہ وہ محرابیں چھجے اور جالیاں بنوائیں کہ یہاں سے اگلے شہر کے سیٹھوں نے بھی اپنی ہتک محسوس کی، اور پھر ان جالیوں کے نقش و نگار میں بھرے گئے رنگ تو کچھ اتنے خوشنما اور جاذب نظر قرار پائے کہ اس حویلی کا نام ہی رنگ محل پڑ گیا لیکن یہ صرف قیاس ہے، اس کی تصدیق نہیں ہو سکی، اس لیے رنگ محل کے نام کی توجیہات اور بھی ہو سکتی ہیں۔

ملکی تقسیم کی بھگدڑ کے دوران سیٹھ واسومل جی نے اس حویلی کی ڈیوڑھی میں کھڑے رہ کر اور دہلیز پہ بیٹھ کر آٹھ آٹھ آنسو بہائے اور اپنے اس تمام اثاثہ پر جو اس حویلی کی تعمیر میں خرچ ہوا تھا صبر کر کے جان بچانا ہی مناسب سمجھا اس لیے وہ صرف ایک بنڈی اور دھوتی میں سے بھگوان اور رام رام، کی مالا جپتے طوفان میل میں بیٹھ کر اس شہر اور حویلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے۔ ان حویلی کے دوسرے قابض بھی اتفاق سے سیٹھ ہی نکلے — یہ سیٹھ کرم الٰہی تھے۔ جنہوں نے بتیس لاکھ کا کلیم بھر کر دس لاکھ کا منظور کروایا اور اسی میں یہ حویلی خرید ڈالی۔

سیٹھ کرم الٰہی کی ایک دو نہیں گیارہ لڑکیاں تھیں — اور سب کی سب بدصورت اور بدرنگ — ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے اس حویلی کا نام رنگ محل پڑنے کی — سیٹھ صاحب کی گیارہ کی گیارہ لڑکیاں گو بدصورت تھیں لیکن تھیں سب جوان — انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا کہ ان میں کون بڑی ہے اور کون چھوٹی — نہ جانے یہ کہنیاں کس وقفہ سے پیدا ہوئی تھیں کہ سب کی سب ایک ساتھ جوبن نکال پڑیں — ان سب کے جوان ہونے کے باوجود ان کی جانب کوئی جوان لڑکا ملتفت نہ تھا یقیناً اس کی وجہ ان سب کی بدصورتی تھی — جوانی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ان سب نے اب جوان چھوکروں کے دل لبھانے کے نت نئے طریقے نکالے اور اپنی چھتوں اور دو چھتوں پر ہر شام کھڑے ہو کر اٹھلانا اور اترانا شروع کر دیا — رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ست رنگے دوپٹے اوڑھے اور سبز دھانی، فاختئی، چمپئی، ساڑیوں سے جسم کے ابھار ڈھلکے جب یہ حویلی کے بام پہ آتیں تو محلے کے جوان لونڈوں کے لیے تفریح کا سامان پیدا ہو جاتا، بستی میں زندگی لہریں لینے لگتی اور حویلی میں رنگوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا — ہو سکتا ہے کسی دل جلے نے اسی لیے اس حویلی کا نام رنگ محل رکھ دیا ہو۔

ان لڑکیوں کی ماں تو اتنی بوڑھی تھی کہ پلنگڑی پہ پڑے پڑے گل جا رہی تھی۔ مگر خود سیٹھ صاحب اب تک سلٹھے پاٹھے تھے — اتنے ہی چست — اتنے ہی چوبند — جتنے جوانی میں رہے ہوں گے — اس لیے سیٹھ صاحب کو بھی ہر شام اپنے بھڑکتے چراغ کی لو دبانے کے لیے ایک... عورت کی نہیں... شاید عورت سے ان کا دل بھر گیا تھا — عورت کے نعم البدل کی ضرورت پڑتی تھی — یہی وجہ ہے کہ شام کے دھندلکوں کے ساتھ ہی اس حویلی میں رنگ سایوں کا آغاز ہو جاتا اور نور کے تڑکے تک یہ عمارت رنگین فسانے دہراتی رہتی تھی۔

سیٹھ صاحب غیرت مند ضرور تھے، لیکن مجبور بھی تھے: ایک تو اپنے شوق کے ہاتھوں۔ اور دوسرے لڑکیوں کی تعداد اور ساتھ پر بد بدصورتی کی وجہ سے۔ لڑکیاں اپنی طرار جوانی کو لبھانے کے نت نئے انداز کرتی رہیں اور یہ رنگ محل شہر بھر میں مشہور ہوتا رہا۔

اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ اس رنگ محل کے گیارہ رنگوں میں تین مٹ گئے۔ آٹھ رہ گئے۔ اس حویلی میں اب صرف آٹھ لڑکیاں رہ گئی تھیں۔ تین کی شادیاں تو نہیں ہو سکی تھیں مگر وہ تینوں نوکروں کے ہمراہ کچھ وقفہ وقفہ کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔ وجہ شاید یہ رہی ہو کہ کوئی اچھا لڑکا انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور نوکروں کے ساتھ نکاح کو سیٹھ صاحب کا مزاج شایان شان نہیں سمجھتا تھا۔ اور ادھر جوانی کو ضرورت تھی منتقل ہمارے کی۔ سو یہ ہاتھ لگا: اپنی قسمت سمجھ کر یہ لڑکیاں چلتی بنیں اور اپنی بقایا آٹھ کو رستہ دکھا گئیں۔ سیٹھ صاحب کی آنکھ اب بھی نہ کھلی۔ نہ تو ان کے ذوق سلیم میں فرق آیا اور نہ وہ گزشتہ سے نصیحت لے کر باقی آٹھ کو نوکروں کے حوالہ کرنے پر رضامند ہوئے۔

محلے کے بوڑھے اس گھر سے تنگ تھے اور جوان بہت خوش۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کے لیے اس حویلی میں ہونے والا ہر واقعہ معمولی حیثیت سے زیادہ اہمیت کا مستحق نہ ہوتا۔ ان لوگوں میں زیدی بھی شامل تھا۔ اور میں بھی۔ ہم دونوں گو جوان تھے لیکن تھے پھنڈ۔ شاید اسی لیے ہماری جیب نے کبھی موقع ہی نہ دیا کہ ہم رنگ محل کے گلال سے اپنے کو رنگ سکیں۔ آخر گلال کی ان پچکاریوں کو ملتفت کرنے کے لیے تحائف کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔

زیدی کی نوکری لگتے ہی وہ بھی دھندے سے لگ گیا۔ اور اب صرف میں رہ گیا جو اس جنت کے شجر ممنوعہ سے محروم تھا — پہلے پہلے تو میں نے زیدی کو سمجھایا لیکن جب وہ نہ صرف باز نہ آیا بلکہ اس نے رنگ محل کی رنگین پریوں کی رنگ بھری داستان سنائی تو مجھے بھی الف لیلیٰ کے قصے یاد آ گئے۔ دل کے چور دروازے سے کوئی منیلا سا، بیہودہ سا خیال، واہیات سی خواہش ذہن میں در آئی، اور میں بھی سوچنے لگا کہ کہیں سے کچھ رقم مارے ایک سستی سی لیڈیز رسٹ واچ خریدوں اور جوانی کا پہلا تجربہ کر ہی ڈالوں۔ آخر بہتی گنگا سے کیوں نہ ہاتھ دھو ہی لیے جائیں۔ جانے کب یہ آٹھ بھی کسی نوکر یا ٹھیلے والوں کے ساتھ بھاگ جائیں۔ اور خالی سیٹھ صاحب کی اکبری، ادبی دھوپ اس حویلی کا طرۂ امتیاز بن کر رہ جائے۔ اس وقت سے پہلے ہی پچاس روپیہ کی چوری میرے لیے ضروری تھی۔ اور میں کوشش میں لگ گیا۔

سیٹھ صاحب کو تو لوگ بے غیرت کہتے ہی تھے۔ کئی بار اس معاملہ میں ان سے محلے کے بوجھ بجھکڑ اور ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کا جھگڑا بھی ہو چکا تھا، لیکن ہر بار جیت سیٹھ صاحب ہی کی ہوتی۔ ان کے پاس ایک ہی جواب تھا: "تو اپنے اپنے لونڈوں سے بچاؤ لوان کو۔ میں کیا کروں۔ کب تک ان کے بردن کا انتظار کروں۔ کب تک ان کا پہرہ دوں۔ اور پھر تم لوگ اپنے لونڈوں کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ یہ بھی تو تمہارا فرض ہے۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ نہ یہ لوگ اپنے لونڈوں کو سمجھا سکتے تھے اور نہ سیٹھ صاحب اپنی لونڈیوں کو۔ جب آتش فشاں پھٹتا ہے تو دبا نہیں دبتا۔ آگ اور بارود کی موجودگی سے دھماکہ تو ہوتا ہی ہے۔ جوان دلوں کی دھڑکنیں نہ کوئی روک سکا ہے اور نہ ان کے ابرو کے اشاروں پر پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں۔

پہلی تاریخ کو مجھے ٹیوشن کے پیسے ملے تو تمام اخراجات کو بھول کر میں نے ایک رسٹ واچ خرید لی۔ زیدی کو میں نے صبح بتایا کہ آج شام کے اندھیرے میں میں بھی ہولی کھیلوں گا، اور رنگ محل کے رنگ ڈھنگ دیکھوں گا۔ تم اس سلسلہ میں میری کیا مدد کر سکتے ہو آخر تم اب اس محل کے پرانے مصاحب ہو چکے ہو۔"

زیدی میری پوری بات سن کر ٹھٹکا۔ اور مجھے سمجھاتے ہوئے بولا "ہم کرن سے نڈھال ہو رہے ہیں جو تم اس لائن پر لگانا چاہتے ہو۔ کچھ بھی ہو تجربہ بڑی چیز ہے"

"یہ سب بہانے ہیں۔ تم اس خیال کو دل سے نکال دو اور پیسے جمع کرو اور شادی کر کے تمام تجربے کر ڈالو" زیدی بڑے ناصحانہ انداز میں بولا "نہیں آج تو میں ضرور رنگ محل کی سیر کروں گا۔ سیٹھ جی کس وقت باہر سے آجاتے ہیں" میں نے پوچھا میں نے کہا "تم وہاں نہیں جاؤ گے"

زیدی سنجیدہ ہو گیا۔ لیکن میں بھی آج چوکنے والا نہ تھا۔ اور پھر مجھے زیدی کی خود غرضی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

"واہ! قانونی شہر صاحب — آمریت چاہتے ہو۔ صرف تم ہی عیش کرو اور دوسرا بد صورت بنا رہے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا" میں بولا۔ میری ہٹ دھرمی کے آگے زیدی کو جھکنا ہی پڑا۔

"تم وہاں جانا ہی چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ لیکن آج نہیں کل جانا۔ آج رات میں اور روز میرے فرار ہو رہے ہیں"

زیدی کی یہ بات سن کر میں ٹھٹھک گیا۔ گویا کہ سہم گیا۔ یہ تو بہت بڑا اقدام ہے۔ "تمہارا خاندان بدنام ہو جائے گا۔ اور پھر تمہیں بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ سیٹھ صاحب تو راضی برضا یہ رشتہ قبول کریں گے۔ آخر تم جیسا لڑکا انہیں ملے گا کب۔؟!"

"تم نہیں سمجھتے۔ سیٹھ صاحب راضی نہیں ہیں۔ میں سب کوششیں کر کے ہار چکا ہوں" مجھے واقعی تعجب تھا۔ زیدی کی خاطر میں نے ایک رات کے لیے پروگرام ملتوی کر دیا۔

رات مجھے نیند نہ آئی۔ ہر لمحہ ہر آہٹ پر چونک چونک جاتا۔ سینہ پر کانٹے چبھ رہے تھے۔ کروٹیں لیتے لیتے صبح کے ۴ بج گئے کہ اچانک شور بلند ہوا ایک ہنگامہ تھا، ایک طوفان تھا۔ شاید کہیں بلوہ ہو گیا تھا۔ میں شب خوابی کے لباس ہی میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ سامنے رنگ محل سوگوار تھا اور اس کے سامنے سارا محلہ جمع تھا۔ کچھ لوگ کسی کو پیٹ رہے تھے۔ میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ یقیناً زیدی پکڑا جا چکا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ آگے بڑھوں یا انجان بن جاؤں۔ لیکن پھر دل نے یہی کہا دوست مصیبت میں ہے۔ اس کی کسی طور بھی مدد کی جائے۔ اس لیے چند قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ رنگ محل پر پہنچ کر۔ دیکھا۔ تو عجیب ہی عجیب تھی۔ بجائے زیدی کے سیٹھ صاحب کی پٹائی ہو رہی تھی۔ اور پولیس کے افراد اندر گھسے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں زیدی بھی رنگ محل سے نکلا۔ لیکن اس کے تو ٹھاٹھ ہی عجیب تھے — پولیس انسپکٹر کی وردی میں ملبوس۔ زیدی کو پہچاننے میں دیر لگی اور پھر پولیس کی حراست میں آٹھ لڑکیوں، ایک بڑھیا اور سیٹھ صاحب کے علاوہ محلے کے دو لونڈوں کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ — صبح ہوتے ہوتے رنگ محل ایک کہانی بن گیا جتنے منہ اتنی باتیں کہ زیدی آ پہنچا۔ اور اس نے راز سربستہ سے پردہ ہٹایا تو معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا فراڈ اور بردہ فروش گروہ کے سرغنہ تھے۔ اور یہ گیارہ لڑکیاں ان کی اولاد نہ تھیں بلکہ تمام مغویہ تھیں۔ بڑھیا سیٹھ صاحب کی بیوی نہیں بلکہ نائکہ تھی۔ اور وہ تین لڑکیاں نوکروں کے ساتھ فرار نہیں ہوئی تھیں بلکہ بیچ دی گئی تھیں۔ زیدی نے اپنی پولیس کیپ اتارتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ ملازم ہی سی آئی ڈی میں ہوا تھا جس کے سلسلہ میں وہ رنگ محل کی رنگ رلیاں آئی تھیں۔ فضا دھل چکی تھی۔ بارش ختم چکی تھی اور اسی کے ساتھ رنگ محل کے تمام رنگ بھی دھل گئے تھے —

سگریٹ جلانے کے لیے میں نے لائٹر جیب سے نکالنا چاہا تو لیڈی رسٹ واچ میرا منہ چڑانے لگی۔ لیکن میں نے اسے نہایت عقیدت سے سیف کے دراز میں رکھ دیا۔ اور اپنے خوب صورت خیالوں ہی میں اسے کسی گورے ہاتھ میں پہنانے لگا۔

آندھی کے آم

اے-آر کاردار

آم ایک سدا بہار درخت ہے۔ یہ ہمیشہ سبز پتوں سے سجا رہتا ہے۔ ہمارے گھر میں بھی ایک آم کا درخت ہے۔ کچھ دو سال سے ہم اس گھر میں بستے ہیں۔ اسی گھر میں دو گرمیاں، دو سردیاں اور دو موسم بہار و خزاں دیکھے ہیں در اصل مشرقی پاکستان میں خزاں اور بہار کو جدا کرنا مشکل ہے۔ یہ خطہ اتنا سرسبز ہے کہ سارا سال، بہار ہو کہ خزاں، جدھر بھی نگاہ اٹھائیے ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ مگر دو سال سے ہم نے اس آم کے درخت پر صرف وہ آم لگتے دیکھے ہیں جو کہ اپریل اور مئی کی تند ہواؤں اور آندھیوں کی وجہ سے اپنے پھل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ پہلے چھوٹی چھوٹی کیریوں کے گرنے سے درخت کے آس پاس بچوں کا ہجوم رہتا ہے۔ یہ بچے کسی کی بھی بات نہیں مانتے اور اٹھا اٹھا کر کھا جاتے ہیں۔ اس کے بعد ذرا بڑی کیریاں گرتی ہیں تو ہماری بیگم اچار ڈالنے کی فکر میں ان کو اکٹھا کرواتی ہیں۔ ہم شام گئے گھر لوٹنے پر درخت کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ یہ کب چند ایک پھل آندھیوں کی زد سے بچا کر ہمیں پیش کرے گا۔ مگر دو سال اسی انتظار میں گزرے ہیں۔ ماہر فن کہتے ہیں کہ یہ درخت کمزور ہے اس لیے جو کچھ پھل لگتا ہے مضبوطی نہیں پکڑتا اور آندھی کے زور کو برداشت نہ کرتے ہوئے گر جاتا ہے۔ کئی ایک نسخے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً اس کی جڑوں میں روزانہ دودھ سینچا جاتے مگر ابھی تیسرے سال میں بھی ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ قوانین قدرت میں دخل اندازی نہ کی جائے۔ آخر جو کچھ بھی ہوتا ہے انہیں قوانین کی رو سے ہوتا ہے اور ہم تو ہیں ہی رضائے الٰہی کے محکوم۔

البتہ اس سال آموں کے موسم سے پہلے ہی برسات کے شروع شروع میں ہمیں ایک محترم دوست نے آندھی کے آموں کو اکٹھا کرنے کا ایک سبق دیا۔ ہم سادہ لوح تو ٹھہرے ہی، اس کے ساتھ ساتھ دو سال کی مایوسی کی وجہ سے فوراً ان کی بات نہ صرف ماننے پر تیار ہو گئے بلکہ ہمہ وقت اسی تاک میں لگ گئے کہ کب یہ آندھی کے آم ہمارے ہاتھ لگیں۔

قصہ یوں ہے کہ ہمارے محترم دوست ایک اونچے درجہ کے سرکاری کارندے ہیں۔ ہم وقتاً فوقتاً محض ملنے ملانے کو ان کے دفتر چلے جاتے ہیں۔ فطرتی طور پر خوش مذاق اور خوش زبان واقع ہوئے ہیں اس لئے یہ ملاقاتیں دلچسپ رہتی ہیں۔ ایسے ایک موقع پر فرمانے لگے "کپتان صاحب! آپ بھی خوب انسان واقع ہوئے ہیں کاروبار کرتے ہوئے آپ سب سے آسان کام پر بالکل دھیان نہیں دیتے۔ اس دفتر میں کیا سارے ملک میں آندھی کے آم گر رہے ہیں، ہر طرف لوٹ مار مچی ہے اور آپ ہیں کہ ان باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ آخر آپ کاروباری ہیں اور آپ کو کچھ روپیہ پیسہ بنانا ہے تو کیا حرج ہے کہ آپ ان آندھی کے آموں کی طرف دھیان دیں۔"

ہم نے سوچا کہ گھر کے آم تو آندھی کی نذر ہو جاتے ہیں کیا حرج ہے کہ اب کچھ "آندھی کے آم" ہی ہاتھ آ جائیں۔ ہمارے ہاں کرنے کی دیر تھی کہ تیار کردہ منصوبہ ہمارے سامنے رکھ دیا گیا۔

ہمیں صرف ایک عدد درخواست اور ایک بنک کا سرٹیفکیٹ بخدمت حکومت عالیہ پیش کرنا تھا۔ ہم اس تکلیف کو برداشت کرتے

کے لیے یک دم تیار ہو گئے۔

قصہ مختصر دوسرے روز ہم ان کاغذات کے ساتھ پھر ان حضرت کی خدمت میں پیش ہوئے۔ جس سرعت کے ساتھ کاغذات پر عملدرآمد ہوا اس کا اندازہ نہ تھا اس پر طرہ یہ کہ ہمیں لائسنس ایک روز میں مل گیا، گھر اس طرح لوٹے جیسے تمام دنیا کے فاتح ہم ہی ہیں۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے آم کے درخت کی طرف حقارت سے دیکھا یعنی کہ "تو نہ دے! ہم آندھی کے آم کسی اور طرح کھائیں گے۔"

اس رات نیند بہت مشکل تھی۔ کئی بار لیٹے لیٹے اندازہ لگایا کہ کیا رقم ہاتھ لگے گی؟ پھر اور کس طرح اس کا مصرف ہوگا۔ کس فیصدی پر لائسنس دیا جائے گا، اور خریدنے والا کب اس کا معاوضہ ہم تک پہنچائے گا کبھی بار یہ بھی خیال آیا کہ یہ رقم ناجائز سی ہوگی۔ کیونکہ ہم نے کسی محنت سے اس کو دستیاب نہیں کیا ہوگا۔ مگر ضروریات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ ملک ایک تناور درخت ہے جس سے چند آم آندھی سے جھڑ جانے سے کسی کو نقصان نہیں ہوگا۔ ہم نے اپنے ضمیر کو گہری نیند سلا دیا۔ مگر ہمیں نیند نہ آئی۔ بستر سے اٹھے اور قلم کاغذ لے کر از سرِ نو حساب فیصدی لگانے لگے۔ کچھ وقت اس پر، مگر زیادہ وقت اس پر صرف ہوا کہ گھر میں کن کن اشیاء کی ضرورت ہے۔ بچے مدت سے ٹیلی ویژن سیٹ کا اصرار کر رہے تھے۔ "یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے۔" یہ جواب سن سن کر بچے تنگ آ چکے تھے۔ اب ان کو یہ خوش خبری سنائیں گے۔ میں اس وقت ان کے دمکتے ہوئے خوشی سے بھرپور چہرے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر بیگم حج کا بھی ذکر کر رہی تھیں۔ وہ حج کر لیں گی اور ہم یورپ کا دورہ ... ...

ضمیر کو تو سلا ہی چکے تھے اب تھک کر جسم و جان بھی بستر پر دراز کئے اور یورپ کی رنگینیوں کے خواب دیکھنے لگے۔ مگر ابھی حسین خواب مکمل نہ ہوا تھا کہ ایک آم کا درخت، جو کہ اپنے گھر کے آم سے کچھ بڑا تھا، دیکھا اس پر بجائے آموں کے الّو اور گرگٹ بیٹھے ہیں۔ بعض کا لباس یورپی اور کسی ایک کا پاکستانی ... مگر ہر ایک کی گردن میں انسانی ہڈیوں کا ہار دیکھا۔ ہم نے پکارا، للکارا کہ کس طرح یہ ظالم جانور انسانی ہڈیوں کا ہی احترام کر کے انھیں چھوڑ دیں، مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ہم نے غصہ میں ایک پتھر ان کی طرف پھینکا گر یہ پتھر ہماری ہی طرف واپس آ رہا تھا کہ اس بھیانک خواب سے بیدار ہوئے۔

کچھ دیر سوئے تھے، اور پھر یہ خواب، رات بھر نیند نہ آئی۔ لیٹے لیٹے پھر جمع و تفریق کا معاملہ درپیش رہا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو اطلاع ہوئی کہ جن صاحب سے ہماری امیدیں وابستہ تھیں کہ وہ رقم لے کر آئیں گے، تشریف لائے ہیں۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ نہیں صبح صبح تکلیف دی اس لیے کہ وہ لائسنس کا مال نہیں منگوا سکتے کیونکہ ان کا سرمایہ کہیں اور پھنسا ہوا ہے۔ لہٰذا کچھ مدد لینے آئے ہیں کہنے لگے کہ یہ رقم بھی اصل کے ساتھ لوٹا دیں گے۔ ہم نے فوراً چیک بک نکال کر چیک دے کر رخصت کیا۔

ان کے جانے کے بعد خیال آیا کہ بجائے کچھ پیسہ حاصل کرنے کے ہم نے تو خود ہاتھ سے سرمایہ کھو دیا۔ سوچا کہ خیر یہ سب واپس آ جائے گا، وقت کی بات ہے، آندھی چلی اور آم ہاتھ آئے۔

مصروفیات میں دن کٹا۔ گھر لوٹے یہ سوچتے ہوئے کہ بچوں کو ٹیلی ویژن سیٹ کی خوشخبری دی جائے یا نہیں۔ فطرتاً خوش فہم واقع ہوئے ہیں اس لیے دفتر کے کاغذات رکھنے سے پہلے پہلے بچوں کو مبارک دی اور مبارک حاصل کی۔ اُدھر یہ عالم کہ رات کے کھانے سے پہلے پہلے دونوں بچوں نے باری باری اپنے دوستوں سے ڈینگیں چلائیں کہ لیجئے اب ہمیں آپ کے ہاں آ کر ٹی وی دیکھ کر مشکور نہ ہونا پڑے گا۔ خوشامد کے دن گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بستر پہ لیٹتے ہی پانچ ہزار کے چیک کا خیال آیا۔ مگر خوش فہمی میں سوچا کہ یہ تو بچت ہوگئی۔ پڑے پڑے خرچ ہی ہو جاتے۔ چلئے کسی کام لگ گئے۔ جہاں ۲۰ ہزار آئے گا تو یہ رقم بھی آجائے گی۔

کتاب پڑھنے کے لیے اٹھائی تو دل نہ لگا۔ سوچا لگے ہاتھوں گھر کے لیے زمین کا پلاٹ بھی لے لیں گے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہم نے ابھی تک ان باتوں کے متعلق نہ سوچا۔ لوگوں نے مکانات کھڑے کر لیے اور ہم ابھی تک کرایہ کے مکانوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ اب آندھی کے آم بھی آئے اور مکان کا پلاٹ بھی ساتھ۔ آموں کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔

ٹیلیویژن سیٹ اور مکان کی زمین کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی تھے کہ پھر خواب میں آم کے درخت پر اُلّو اور گرگٹ گلے میں ہڈیوں کا ہار پہنے دیکھے۔ مگر اس دفعہ یہ ہار درخت کی جڑ تک لٹکے ہوئے تھے۔ کہیں بازو ہے تو کہیں ران، کہیں پنجہ ہے تو کہیں پاؤں۔ اچانک یہ تمام ہڈیاں ایک انسانی پنجر کی صورت میں درخت کے نیچے نمودار ہوئیں، اور ایک گہری آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی: "اس جہان میں صرف دو ہی قسم کے انسان بستے ہیں۔ ایک برسرِ پیکار اور برسرِ پیمان، ہر وقت، ہر گونہ ترقی کی راہوں پر گامزن اور دوسرے لاچار و نادار، لاشیں ہی لاشیں۔ جن کا اگر ہاتھ مضبوط ہے تو بازو شست و لاچار۔ اگر ٹانگیں توانا ہیں تو پاؤں لغزش زدہ۔ ہر ایک کو، تم کو بھی، یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کس شمار میں آنا ہے۔ اگر لاچار و نادار ہو تو جلد ہی ہمارے شمار میں آ جاؤ گے۔ زندگی کی کش مکش میں تم حال ہی میں داخل ہوئے ہو۔ ایک وقت تھا جب ہم بھی تمہاری طرح راستوں کی تلاش میں تھے۔ جس راستہ پر ابھی تم قدم رکھ رہے ہو، ہم نے بھی رکھا تھا۔ ہم نے بھی چاہا تھا کہ اس طرف چل دیں مگر ہم نے اسی طرح انسان کی دو صورتیں دیکھی تھیں اور چاہا تھا کہ ضمیر کی آواز کو کچل دیں اور انفرادی نفع اندوزی کی راہ میں بڑھتے چلیں، مگر انسانی ہڈیوں کا ہار دیکھ کر جو کہ آج تم نے طوقِ بربریت کی طرح انسانوں کے گلوں میں دیکھا ہے، ہمت ہار بیٹھے تھے۔ ہم اس راستہ سے ہٹ گئے تھے۔

— سوچا تھا کہ ان ہڈیوں کے بوجھ سے خود یہ جابر انسان اسی وزن کے ساتھ خود اپنی قبر کھود کر اس میں گر پڑیں گے۔ مگر پہلی صورت والا انسان بڑا دور رس ہے۔ اس نے ان ہڈیوں میں ایسے کیمیائی ذرّات ڈالے ہیں کہ اس کا بوجھ خود دوسری ہڈیوں سے متوازن ہو گیا ہے اور اگر یہ بوجھ کسی کو محسوس ہوتا ہے تو ان ہڈیوں کو مجموعی طور پر۔ سو تم دیکھ لو کہ یہ دو راستے ہیں اور دونوں راستوں کے بعد منزلِ مقصود دونوں انسانوں سے دور۔۔۔ — ان الفاظ کے ساتھ پنجر پھر ہڈیوں کی صورت میں واپس اُلّو اور گرگٹ کے گلوں کا ہار بن گیا۔۔۔ کانوں میں تمام رات "ترقی، ترقی، اور زیادہ ترقی" اور "آندھی کے آم، آندھی کے آم" گونجتے رہے۔

اگر روزمرّہ زندگی میں انسانوں کا وِرد صرف ذاتی ترقی اور نفع اندوزی ہو تو پھر ذہن، تن اور من میں صرف ایک ہی صدا گونجتی ہے۔ محبّت، مروت ایسی زندگی میں دبے پاؤں بھی داخل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح میرے آئندہ ہفتے اسی تگ و دو میں گزرے کہ کب ایل سی کھلے اور کب ہمیں روپیہ ملے۔ مگر اس کا خیال ہی کافی تھا کہ روپیہ آنے والا ہے اور اس کی امید میں ہم نے کچھ ضروری اور کچھ غیر ضروری اخراجات بھی کر ڈالے۔ مگر اُمید کی کرن نمودار ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہوتی معلوم ہونے لگی۔ حکومتِ عالیہ نے تمام گزشتہ لائسنس منسوخ کرنے کا اعلان کیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ملک کے پاس زرِ مبادلہ کی انتہائی قلت ہے۔ اس لیے اب صرف ضروری اشیاء کی درآمد ہوگی۔ میرے مُربّی کا ٹیلیفون آیا۔ بے انتہا ہمدردی کے ساتھ بتایا

کہ وہ کام ملتوی ہوگیا ہے۔ میں نے بامر مجبوری اپنے پانچ ہزار روپے کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ وہ تو آپ ان صاحب سے مل کر وصول کریں۔ لہٰذا ان کی تلاش کی گئی وہ ملے تو بڑی عاجزی کے ساتھ بولے "کپتان صاحب! آپ اور میں دونوں آندھی کے آموں کی تلاش میں تھے۔ اس سال آندھی آتے آتے رُک گئی۔ میں نے آپ کی رقم بطور نذرانہ ایک افسر اعلیٰ کو دے دی تھی تاکہ وہ حج کے لیے جا سکیں۔ یہ بطور قرض ہے، لوٹا دیا جائے گا۔ البتہ اگر آندھی کسی سمت سے آگئی تو پھر آپ کو اور مجھے کسی قسم کی تشویش نہ ہوگی، پھر آم ہی آم ہے"

الغرض ہم گھر لوٹے تو نہ صرف آندھی کے آموں کو کھو بیٹھے تھے بلکہ اصل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

رات کا کھانا کھائے بغیر سوئے تو پھر خواب میں آم کا درخت دیکھا۔ اس دفعہ اس پر آم ہی آم تھے، نہ کوئی اُلّو اور نہ کوئی گرگٹ، بلکہ اس کے پیڑ کے نیچے ہجوم انسانی۔ تمام اپنی نظریں آموں کے پھل پر لگائے ہوئے یکایک ایک بے انتہا تیز آندھی مغرب کی طرف سے اُٹھی اور آموں کی کیریاں ہوا میں اُچھلیں، کودیں، اس ہجوم انسانی کے حلقہ سے باہر گرنے لگیں۔ ان کا گرنا تھا کہ ایک بڑی تیز رو مشین ان آموں کو زمین کے اندر دھنسانے لگی ... یہ ہجوم اس طرف لپکا مگر آم دھنس چکے تھے، کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

اسی اثنا میں آم کے درخت کے ساتھ والے درخت سے اُلّو اور گرگٹ کچھ طبع آزمائی کرتے سُنے گئے۔ ہجوم غم و غصہ میں اس درخت کی طرف لپکا۔ کوئی پتھر لیے بڑھا تو کوئی لاٹھی۔ مگر یہ جانور ان دونوں کی زد سے باہر ثابت ہوئے۔ ان حالات میں کسی نے للکارا "آؤ اس درخت کو گرائیں اس درخت کو جس سے پھل صرف طاقتوروں کو ملتا ہے۔ آؤ، بڑھو یہ ہماری زد میں ہے"

ہجوم نے درخت کی جڑ پر حملہ شروع کیا تو میں اس کارروائی کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے بآواز بلند کہا:-

"بھائیو! سنو! یہ درخت ہم سب کے لیے ہے۔ یہ قدرت کے کیمیائی ذرات کی طاقت سے بڑھا اور پھل کے قابل ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس درخت پر کس نے قبضہ کیا، اور کس نے اس کا پھل صرف اپنے لیے مخصوص کیا اور ہم سب کو، تم کو، مجھ کو، اس سے محروم کیا۔ یہ ان کا قصور ہے جنہوں نے یہ نا انصافی کی نہ کہ درخت کا۔ ایسے اس کو گرانے کی بجائے ہمیں اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ رہا قصہ اس کے پھل کی تقسیم کا تو وہ ہم خود مل کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم ان معاملات میں ان اُلّوؤں اور گرگٹوں کو دخل اندازی نہ کرنے دیں۔ یہ درخت اسی وقت ہمارے حق کو کچل سکتے ہیں جبکہ آندھی چل رہی ہو اور آم ہر سمت گر رہے ہوں۔ ہمیں اس درخت کو آنا سنبھالنا چاہیے، اس طرح سینچنا چاہیے کہ سخت سے سخت آندھی چلے مگر اس درخت کا پھل نہ گرے بلکہ ایک وقت پر اُترے، ایک جگہ پر اکٹھا ہو، اور کوئی ٹوکری میں برابر برابر سب میں تقسیم ہو۔ ہمیں اس طرح محنت کرنی چاہیے کہ اس محنت میں ہر ایک کا یکساں حصہ ہو۔ اس ترقی میں ہر ایک برابر کا بوجھ برداشت کرے اور اس کا پھل خواہ کم و بیش ہو، میٹھا ہو یا ترش، یکساں ہر ایک کو میسر آئے۔ ان الفاظ کا اثر دیکھنے سے پیشتر میں خواب سے بیدار ہوا۔ اسی خواب کی سوچ میں اپنے مربی اعلیٰ کے دفتر گیا۔ باتوں باتوں میں آندھی کے آموں کا ذکر آیا تو میں نے بہ ادب عرض کیا کہ میں نے نہ تو آندھی کے آم کھائے اور نہ اب کھانے کی ہوس ہے۔

یہ سن کر کہنے لگے "کپتان صاحب! انگور کھٹے کا محاورہ سنا تھا۔ آم کھٹے ضرور ہو سکتے ہیں مگر ایسے محاورہ میں استعمال ہوتے ہوئے ہم نے آج تک نہیں سنا۔ چلئے جانے دیجئے، پھر موقعے آئیں گے، آندھی کب تھمی ہے جو اب ختم ہو جائے گی۔ بس ذرا چلنے کی دیر ہے۔ پھر آم ہی آم ہے"

میں نے کنایۃً مسکراتے ہوئے کہا "اور پھر شاید گٹھلیوں کے بھی دام"

انتظاریہ

وہ افسانے جو بروقت نہیں مل سکے تھے!

ورثہ

علی عباس حسینی

نصیر اور نسرین کی اچانک ملاقات چوبیس برس بعد دلّی میں پالم کے ہوائی اڈے پر ہوئی، وہ اس طویل مدّت کے بعد وطن پلٹا تھا۔ وہ ہندوستان سے بھاگا تھا، اسی نسرین کو دل کے مندر سے نکالنے اور اسے بالکل فراموش کر ڈالنے کی غرض سے وہ نہ جانے کتنے ملکوں میں مارا مارا پھرا تھا۔ اس نے اَن گنت تکلیفیں اٹھائی تھیں، سختیاں جھیلی تھیں، اسی نسرین کے ہجر میں۔ وہ اس سے چھوٹنے کے غم میں دوسری جنگِ عظیم میں ایک معمولی سپاہی کی طرح بھرتی ہوگیا تھا۔ سینکڑوں بار گولیوں کے آبشار سے گزرا۔ کئی بار زخمی ہوا۔ مرتے مرتے بچا۔ جب آخری بار پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے سے ہلکا سا لنگ صحت یاب ہونے پر بھی باقی رہ گیا۔ تو اُسے فوج سے فارغ خطی مل گئی تھی، پھر وہ اپنے طور پر ایشیا، افریقہ، جنوبی و شمالی امریکہ، کناڈا، الاسکا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، انڈونیشیا، ملائشیا، فلپائن، برما میں سیر کرتا رہا۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی تجارتیں بھی کیں۔ کہیں کہیں اپنی فرم کی شاخیں بھی کھولیں اور کہیں کہیں اپنے کارخانوں کے بنے ہوئے مال کے لیے نئی نئی منڈیاں بھی تلاش کیں اور نئے نئے معاہدے بھی کیے۔ اس لیے کہ نصیر حقیقتاً ہندوستان کے چند بڑے پونجی پتیوں سے تھا۔ بمبئی اور احمد آباد میں اس کی کاٹن ملیں تھیں، کانپور میں بھی ایک کاٹن مل تھی، گورکھپور میں ایک شوگر مل، بھدوہی میں قالینوں کا کاروبار، اور کلکتہ میں ایک جوٹ مل۔ اس کی ایک ٹی اسٹیٹ آسام میں تھی اور ایک کیرالا میں۔ اس کی عدم موجودگی میں یہ سارا کاروبار اس کے اعزا اور معتمد ملازمین بڑے سلیقے سے چلاتے رہے تھے۔ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اس کے پاس بہت سے کام تھے۔ اس کے دل بہلانے اور ذاتی غم کے بھول جانے کے بڑے ذریعے تھے۔ لیکن اس نے لاکھ چاہا کہ نسرین کا خیال دل سے نکال دے۔ پر وہ نہ نکلا، نہ نکلا۔ ایک گوشت میں پیوست کانٹے کی طرح وہ رگِ جاں میں گھسا کھٹکتا ہی رہا، کھٹکتا ہی رہا۔

آج بھی اسی ظالم کی یاد وہ دل میں لیے دلّی سے پلٹ رہا تھا۔ چوبیس برس بعد وطن آنے پر اس کے ہاں بے تحاشہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ان تمام مقامات کو ایک نظر پھر دیکھ لے، جہاں جہاں وہ اور نسرین ساتھ ساتھ ہنستے ہوئے ایک دوسرے کی محبت میں سرشار گھومے پھرے تھے۔ وہ ایک دن سے زیادہ دلّی میں نہ ٹھہر سکا تھا۔ اس لیے کہ ہر یاد کے ساتھ کچھ ایسے واقعات وابستہ تھے کہ جو اس کے دل کو رلاتے تھے، سینہ چھلنی کرتے تھے۔

نسرین اس کی محبوبہ و معشوقہ نہ تھی؛ اس کی سچی عاشق بیوی تھی۔ کیسے پیار اور محبت کے چھ مہینے دونوں نے ہر لمحہ ساتھ گزارے تھے۔ پنج پنج دن عید تھے، اور راتیں شب برات۔ جو دیکھتا یہی کہتا کتنا اچھا جوڑا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا۔ دونوں حسین، دونوں پڑھے لکھے مہذب اور دونوں دولتمند نصیر احمد آباد کے سب سے دولتمند تاجر کا اکلوتا بیٹا اور نسرین سیٹھ عبدالکریم کروڑپتی کی واحد چشم و چراغ ہر عیب ذات خدا کی۔ نصیر میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ اور وہ بھی ان انوکھے طور پر کہ یا تو مہینوں ایک قطرہ نہیں۔ یا جب پینے پر آیا تو پانچ سات دن لگاتار سوائے شراب کے اور کچھ نہیں۔ وہی کھانا۔ وہی پینا۔ وہی اوڑھنا وہی بچھونا۔ وہی زمین وہی آسمان، وہی عزیز۔ وہی دوست، وہی معشوقہ، وہی بیوی! پلنگ اور اس کے ارد گرد کا حصّہ ہر طرح کی آلائش سے پر، ڈاکٹر کھڑے ہیں، نرسیں نگرانی کر رہی ہیں، مہترانیاں ہر لمحہ صفائی کے لیے تیار ہیں اور وہاں یہ حالت کہ لاکھ چاہو کہ کوئی چیز حلق سے سوائے شراب کے اتر جائے، یہ ناممکن۔ اسی کو عرفِ عام میں کہتے ہیں "برسٹ" ہونا۔ یعنی پھٹ جانا۔ بس شراب نوشی کے خلاف

سارے بندھن، سارے نیک عزائم، ٹوٹ جاتے تھے اور مستی و بے خودی کا وہ سیلاب آتا کہ نصیر کی عزت، حمیت، شرافت، انسانیت اور محبت تنکے کی طرح بہہ جاتی تھی، اور وہ ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا تھا جن کا اس کے جیسے آدمی کے بارے میں وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

نہ نسرین اس کمزوری سے واقف تھی اور نہ نصیر کے سسر سیٹھ عبدالکریم کو اس کی خبر تھی۔ سیٹھ جی باوجود پابند مذہب اور حاجی ہونے کے نئے ڈھنگ کے کاروبار سے واقف تھے۔ پھر بھی وہ شراب نوشی کے سخت خلاف تھے اور اگر انہیں نصیر کی اس کمزوری کی بھنک بھی مل جاتی تو وہ نسرین کا تڑپ تڑپ کر مر جانا پسند کرتے لیکن کبھی نصیر کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہ دیتے۔ خود نسرین کو شراب سے "الرجی" تھی۔ اُسے اس کی بُو سے تے آتی تھی۔ دور سے دیکھ لینا ہی اس کے دردِ سر کے لیے کافی بہانہ تھا۔ کسی میخانہ یا بار کے سامنے سے گزر جانا ہی اس کو مضمحل بنا دیتا تھا۔ بمبئی میں شراب ممنوع ہونے نے اُسے بہت کچھ ایسی آفتوں سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ سکھ چین کی نیند سوتی تھی۔ نہ کوئی خطرہ، نہ کوئی ڈر۔ اور اس نسرین پر نصیر نے اچانک "برسٹ" کی آفت ڈھائی۔

نصیر اس شب ایک مشہور فلم اسٹار کے ہاں دعوت میں اکیلا ہی گیا تھا۔ نسرین کی ادھر پندرہ بیس دن سے کچھ طبیعت ماندی تھی۔ بیمو چاٹنے، کھٹی چیزیں کھانے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ اس رات میں گرانی سر کی وجہ سے شوہر کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ نو ہی بجے سے بستر پر لیٹی نیند بلاتی رہی تھی وہ ناز نخرے کرتی رہی تھی۔ چھ مہینے سے سر کسی کے بازو اور سینے کو تکیہ بنانے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی دفعہ اس شب پہلو میں نہ تھا۔ غرض، گیارہ بجے کے قریب نیند کی دلہن بڑی منتوں، سماجتوں کے بعد خراماں خراماں آئی مگر وہ بمشکل ایک گھنٹہ سو پائی ہو گی کہ اسے محسوس ہوا کہ پورا ہنڈا کسی نے اس کے منہ پر انڈیل دیا۔ وہ تڑپ کر جاگی۔ دیکھا تو نصیر شراب میں وحشت دونوں ہاتھوں میں دو دو بوتلیں لیے اس پر پیار کرنے کے لیے منہ چومنے کے لیے جھکا ہوا ہے۔ اسے محسوس ہوا یہ شوہر نہیں بلکہ گندگی میں لبا کوئی بھنڈ لیا ہے۔ وہ بھڑک کر نصیر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے نکل اور تھو تھو کرتی باتھ روم میں بھاگی۔ نصیر نے لڑکھڑاتے ہوئے پیچھا کیا۔ نسرین بیسن میں منہ کی تلخیاں اُگل رہی تھی کہ نصیر نے پیچھے سے آ کر اسے دبوچ لیا۔

"اب کہاں نہ جائے گی میری فری!" نصیر نے نشے میں چور آواز میں کہا۔

نسرین باز کے چنگل میں پھنسی ہوئی کبوتری کی طرح پھڑپھڑائی۔ اور اس نے اپنے میاں کو پوری قوت سے دھکیل دیا۔ نصیر لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور حمام کے فرش پر گر پڑا۔ شراب میں وحشت نصیر کو اب غصہ آ گیا۔ وہ غرا کر بولا "اشا، تو ہم سے لڑنا مانگتا ہے تو فیر (پھیر) یہ دیکھ! اور یہ لے! یہ لے!

اور اس نے نسرین کی ٹانگ اس زور سے کھینچی کہ وہ منہ کے بل گر پڑی اور حمام کے چکنے فرش نے اسے گھس کر لہولہان کر دیا۔ اس کی دونوں کہنیاں بھی چھل گئیں۔ اس نے گرتے ہوئے "ہائے" کی تھی کہ "یہ لے! یہ لے!" کی ہر بے کے ساتھ منہ پر طمانچے پڑے۔ پہلے تو وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ لیکن طمانچوں نے اسے ایک بت کی طرح بے حس و حرکت بنا دیا۔ نصیر شراب کے نشے میں سمجھا دشمن کو زیر کر لیا۔ دو ہاتھ اس نے اور جھٹکے۔ پھر موٹی سی گالی دے کر بولا "ارام زادی، ام سے لڑتی ہے۔ اِکش گھر میں رہنا ہے تو شیدھی طرح رہ، نہیں تو نکل جا! دور ہو جا، ابھی نکل!"

نسرین خاموشی سے اٹھی اور اس نے بیڈ روم میں جا کر باہر نکلنے والے کپڑے پہن لیے۔ وہ اپنا پرس لیے باہر جا رہی تھی کہ نصیر منہ سے بوتل لگائے باتھ روم سے جھومتا نکلا۔ نسرین کی تیاری دیکھ کر دھاڑا "اشا، جا رہی ہے، تو جا، ہمیشہ کے لیے جا! میں نے تجھے طلاق دی!" اور جب وہ اس پر حسرت و نفرت کی نگاہ ڈالتی ہوئی چلی گئی تو وہ پوری بوتل ایک سانس میں خالی کر کے بولا "چلی گئی شالی! شلی گئی!" اور ہنستے ہنستے

روتے نکا اور بل چڑھاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

نسرین نے پالم کے ایئرڈروم پر جب نصیر کو ٹیکسی سے اُترتے دیکھا تو وہ اُسے پہچان نہ سکی تھی۔ اکیس برس کا جوان اب پینتالیس برس کے ایک سوکھے بوڑھے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گورا رنگ جھلس گیا تھا۔ کنپٹیوں کے پاس بال سفید ہو گئے تھے۔ اور جس کا ہر قدم مضبوط پڑتا تھا، اب لنگ کرنے لگا تھا۔ چہرے پر گہرے نشانات تھے اور اس کی مست بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں بجھی اور بے آب تھیں۔

چوبیس برس کا زمانہ ایک عمر ہوتا ہے۔ کم سے کم نسرین کو تو وہ ایک جُگ محسوس ہوا تھا۔ وہ سترھویں میں تھی کہ اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف چھ مہینے اس نے خوشی، عیش اور محبت کے دیکھے، پھر چوبیس برس کا بے آب و گیاہ صحرا شروع ہو گیا۔ اور دل کی نگری میں پیاس بجھانے والی ایک بوند بھی نہ ملی۔ اس کی پیاس بجھتی بھی کیسے؟ نسرین ان بی بیوں میں تھی جو زندگی بھر ایک ہی جام سے پی سکتی ہیں۔ اس کا وہ ساغر ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اُسے نصیر سے بے پناہ محبت تھی۔ شراب سے نفرت ایک بیماری تھی جس کا یہ عشق بھی مداوا نہ تھا۔

وہ اسی رات احمد آباد سے بمبئی چلی گئی تھی۔ اس نے میکے پہنچتے ہی غصے اور غم کے زیر اثر باپ سے ساری روداد بیان کر دی تھی — اور انہوں نے دوسرے ہی دن ایک وکیل کے ذریعہ نصیر کو نسرین کے مہر کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ ممکن تھا مقدمہ دائر ہوتا اور نصیر اپنے حواس میں آجاتا تو بگڑی بات بن جاتی، مگر نصیر نے بات بڑھنے نہ دی۔ اس نے فوراً ہی ایک لاکھ اکاون ہزار کا چیک بھیج دیا اور ڈاکٹروں کی اجازت ملتے ہی وہ یورپ چلا گیا۔

نسرین کے دل میں جو غم و غصہ کا طوفان اس رات کے واقعہ سے اُٹھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ بس ایک آندھی تھی۔ جس نے تھوڑی دیر رنجشوں کی گرد اڑائی۔ پھر آنسوؤں کا چھینٹا پڑتے ہی غبار دُھل چھٹ گیا۔ دل کا مطلع صاف ہو گیا تھا۔ نسرین نے اُلٹے اپنے کو ملامت کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ محبت کے امتحان میں پوری نہ اتری تھی۔ اس کو یقین تھا۔ نصیر کا "مرض" وہ اطاعت و محبت اور سچی پریت سے دور کر سکتی تھی۔ اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ وہ کڑی پڑتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ مگر اب تو چڑیاں کھیت چُگ گئی تھیں۔ پچھتاوے سے کیا حاصل؟ مگر ندامت و خجالت منع کرنے سے رُک نہیں جاتی۔ اس کے ہاں تو ان جذبوں کے بڑھانے میں بچہ پیٹ میں ہونے سے اور نصیر کی نشانی منیر کے پیدا ہونے نے گویا سونے پہ سہاگے کا کام کیا تھا۔

نصیر کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی یادگار ایک بیٹا بھی ہے۔ سیٹھ عبدالکریم نے سوائے چند لوگوں کے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی تھی۔ وہی اس کے باپ، اس کی ماں بلکہ سارے خونی رشتوں کا مجموعہ بن بیٹھے تھے۔ کسی کو منیر کی پرورش و پرداخت کے سلسلے میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ نسرین تک کو وہ اس معاملے میں رقیبانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ اس کے روادار نہ تھے کہ نسرین اپنے بچے کے لیے کوئی قمیص، کوئی نیکر، کوئی دودھ کا ڈبہ، کوئی کھلونا یا کسی قسم کی کوئی چیز خرید لے۔ ایسے میں بھلا وہ اس کی کیسے اجازت دیتے کہ ان کے نالائق اور پاجی داماد نصیر کو اس کی اطلاع بھیج دی جائے کہ سیٹھ جی کی کوٹھی میں اب بھی کوئی ایسی شے ہے جس پر اس شرابی کا شرعاً و قانوناً سب سے زیادہ حق ہے اور سیٹھ جی اس سے بے حق کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اس کا، نواسے کی جگہ اپنا ہی بیٹا کہہ کر، لوگوں سے تعارف کرایا اور نسرین کو بھی 'ممی' یا 'امی' کی جگہ اس سے 'آپا' ہی پکڑوایا۔

خود منیر کو بھی چودھویں سال تک اپنے حقیقی باپ کا نام معلوم نہ تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسے اس سال جونیئر کیمبرج کے

امتحان کا فارم بھرنا تھا تو سیٹھ جی کو مجبوراً منیر کو اس کے باپ کا نام بتانا ہی پڑا۔ نصیر کا نام جس تمہید کے ساتھ انہوں نے منیر پر ظاہر کیا، اس نے منیر کے دل میں نصیر کی طرف سے ہمیشہ کے لیے نہ جانے والی نفرت بھر دی۔

سیٹھ جی نے بیٹی اور نواسے کو بڑے اہتمام سے اپنے سامنے کرسیوں پر بٹھایا۔ پھر منیر کو ایک گمنام شرابی کی کہانی سنائی جو اپنی بیوی پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا اور جس نے بالآخر ایک شب شراب کے نشے میں اس عصمت مآب کو پیٹا اور گھر سے نکال دیا اور ایسی حالت میں گھر سے نکالا جب اس بے چاری کے بطن میں تین مہینے کا بچہ بھی تھا۔ پوری کہانی اس ڈرامائی انداز میں سنائی گئی اور شوہر کے کردار کی اتنی تاریک تصویر پیش کی گئی کہ چودہ سالہ منیر غصہ سے بوٹیاں نوچنے لگا۔

جب نواسے کی یہ حالت دیکھی تو سیٹھ نے فاتحانہ طور پر مسکرا کہا "یہ ہیں تمہارے باپ کے کرتوت۔ اور اس کا نام ہے نصیر!"

منیر بیساختہ چیخ پڑا "نہیں! نہیں! وہ میرا باپ نہیں! میں ایسے سوّر آدمی کو اپنا باپ نہیں مان سکتا!" اور وہ نانا کی گود میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نسرین کے دل پر دو طرح کی چوٹیں لگیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے منہ پر اس کے چہیتے شوہر کی اس قدر ذلت کی گئی۔ نصیر یقیناً اتنا بڑا نہ تھا جتنا بھیانک بنا کر سیٹھ جی نے اسے پیش کیا تھا۔ سوائے اس ایک رات کے وہ ایک مثالی شوہر ثابت ہوا تھا۔ بیوی کا سچا عاشق۔ اس کے گرد بھونرے کی طرح پھرنے والا۔ آقا کی جگہ غلام، نسرین کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے والا کہانی کے درمیان نصیر کی محبت کی یادوں کے مجموعی اثر نے اس کو بار بار اکسایا کہ وہ باپ کو بیچ سے ٹوک دے۔ اس سے کہہ دے کہ اس کا شوہر کبھی بھی بدمزاج نہ تھا، اور نہ ہی اس نے اس سے کبھی برا سلوک کیا، مگر وہ باپ کو خفا نہ کرنا چاہتی تھی، اس لیے وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔

دوسرے یہ کہ منیر بجائے اس کے کہ ماں کی گود میں سر ڈال کر سسکیاں بھرتا، اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا، اس کو اپنے اس رویہ سے یقین دلاتا کہ وہ اسے ماں ہی نہیں باپ بھی سمجھے گا، وہ نانا کے زانو سے لپٹا اور اس نے فریاد رس اسی کو سمجھا۔ گویا اتنا سا لڑکا بھی دینے دل ہاتھ پہچاننے لگا تھا۔ اس میں دنیاداری کی بو ابھی سے آگئی تھی۔ اس کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ منیر کو سیٹھ کی گود سے کھینچ کر دو طمانچے مارے کہ تیرا باپ اتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ تو نا خلف اسے "سوّر" کہے اور پھر بیٹے کو چھاتی سے لگا کر اس کے اور اپنے آنسوؤں سے جل تھل بھر دے۔ مگر اس نے چودہ سال میں وہ محبت کھو دی تھی جس سے وہ منیر کو اپنے باپ سے چھین لیتی یا شوہر کے متعلق اسے جھٹلاتی۔ عورت ہمیشہ مرد کی پشت پناہی کی طالب ہوتی ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ وہ اسی طرح کی خلق کی گئی ہے۔ نسرین کی زندگی میں دو مردوں میں سے ایک نصیر تھا اور دوسرا سیٹھ۔ نصیر چلتی پھرتی "ابر گہربار" کی چھاؤں ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کی زندگی سے اس طرح غائب ہوا تھا جیسے جلتے توے سے پانی کی بوند۔ اب جو کچھ سہارا تھا وہ سیٹھ کا تھا۔ ایک مضبوط املی کا درخت۔ جس کے سایہ میں وہ پلی، پروان چڑھی اور اب بھی باوجود اس کے پھلوں کی کھٹاس کے وہ اسی کی تنومند شاخوں میں گھونسلا بنائے بیٹھی تھی۔ سیٹھ کو خفا کرنا گویا خود اپنے ہاتھوں نشیمن برباد کرنا تھا۔ اسی لیے وہ نصیر کی برائی خاموشی سے سنتی رہی اور بیٹے کے دل میں باپ کی طرف سے حقارت و نفرت کے بیج کو بوتے اور سرسبز ہوتے دیکھتی رہی بے بس عورت! شوہر سزا دے چکا تھا۔ اب اپنا ہی باپ، اپنا ہی بیٹا، اس کے "حیثیت" گواہ، بلکہ وکیل بن کر اسے بدترین سزا دے رہے تھے۔

سیٹھ کے انتقال کے بعد جب اکیسواں سال پورا کر کے منیر نے نانا کے کارخانے اور ان کی دولت پر مالکانہ تصرف کا حق حاصل کیا،

تو نسرین کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ وہ دل ہی دل اس پر کُڑھتی رہی کہ مُنیر اس سے بھی زیادہ جائداد اور دولت کا صحیح طور پر حقدار ہونے کے باوجود اس کا دعوے دار بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے وجود میں باپ کی شرکت نہ چاہتا تھا۔ گویا وہ بن باپ ہی کے پیدا ہو گیا تھا۔ نسرین نے دو ایک بار بیٹے کے دل سے باپ کی نفرت نکالنے کی کوشش کی، لیکن اس پر تو نصیر کے تذکرے ہی سے جیسے بھوت سا سوار ہو جاتا تھا۔

اب کے البتہ جب وہ بیمار ہوئی اور اُسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے مُنیر کو زبردستی اپنے پلنگ پر بٹھا کر اپنی ازدواجی زندگی کے سچے سچے واقعات بے کم و کاست بیان کر دیئے تھے۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسی شرابی کی یاد تھی، جس نے اسے سیٹھ جی کے شدید اصرار کے باوجود دوسرے نکاح پر آمادہ ہونے نہ دیا تھا۔ ماں کی زبان سے اس کی چند مہینوں کی خوشی اور غم سے لبریز زندگی کا حال سُن کر مُنیر کے ہاں ایک غیر شعوری نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چودہ برس کے لڑکے کی جگہ تیئس برس کا تعلیم یافتہ جوان تھا۔ وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اور اس میں ایک طرح کی رواداری سی آ گئی تھی۔ پھر بھی باپ سے نفرت نانا نے اس کے خمیر میں ڈال دی تھی۔ اسے اس نفرت سے محبت سی ہو گئی تھی۔ ماں کی پہلی کوشش ہی میں اس کا دل سے نکل جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ گو اوپر کی سطح ٹھنڈی پڑ گئی تھی، مگر ہانڈی کی تہہ میں اب بھی گرم کھولن باقی تھی۔

نسرین بمبئی میں صحت یاب ہونے کے بعد اپنے مخصوص ماہر قلبی ڈاکٹروں کو دکھانے دلی آئی تھی۔ آج وہ اس کے سینی ٹوریم سے بالکل ہی تندرست ہو کر نکلی تھی اور ہوائی جہاز سے بمبئی واپس جا رہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اب بھی نصیر مل جاتا تو وہ باپ بیٹے میں بہ آسانی صلح کرا دیتی اور شاید اس کی اجاڑ زندگی پھر سے آباد ہو جاتی۔ اور اس کے دل میں نہ جانے کتنے ایسے سفروں کی وہ یادیں سانپ بچھو بن کر ڈس رہی تھیں، جو اس نے اپنے چہیتے کے ساتھ کاٹے تھے۔

نصیر آج ہی صبح کلکتہ سے دلی آیا تھا۔ پورا دن اس نے نئے بھارت کی نئی راجدھانی کے دیکھنے میں صرف کیا تھا۔ وطن کے یوسف نے اس زلیخا کو پھر سے جوانی بخش دی تھی۔ بڑھاپے کے آثار جو کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے وہ اس کی نکھار کو بڑھاتے تھے۔ وہ نئی نئی عمارتیں دیکھتا رہا۔ پھر دل نہ مانا اور وہ قُطب مینار دیکھنے چلا گیا۔ اس کی سیر اس نے اس سے پہلے نسرین کے ساتھ کی تھی۔ وہاں جاتے ہی اُسے نسرین کی وہ فطری کمزوری یاد آ گئی جو اُس وقت اس کے لیے بہت شیریں بن گئی تھی۔ وہ نصیر کے ساتھ ہنستی بولتی قطب کے سب سے اونچے حصے تک چڑھ گئی تھی، لیکن جیسے ہی اس نے وہاں سے جھانک کر نیچے دیکھا تھا وہ کانپنے لگی تھی۔ خوف نے اس میں اس بلا کی کمزوری پیدا کر دی تھی کہ وہ تقریباً سات بار مختلف جگہوں پر رُکتی بیٹھتی نصیر کے سہارے سے نیچے اُتری تھی۔ نصیر نے اس وقت بار بار یہی سوچا تھا کہ قطب مینار کو باقاعدہ تفریح گاہ بنانے کے لیے اس میں اُسی طرح لفٹ دی جائے اور اسی طرح کا اس کے ایک حصے میں کچھ اضافہ کر کے اچھا سا ریسٹوران کھول دیا جائے، جس طرح کا پیرس کے آئیفل ٹاور میں ہے، تو سرکاری آمدنی میں ایک خاصہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر سرکار اس خرچ کے لیے تیار نہ ہو تو وہ خود ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کر کے یہ کام انجام دے گا۔ مگر احمد آباد پہنچتے ہی اس کے "برسٹ" ہونے نے سارے منصوبے ہی خاک میں ملا دیئے تھے۔

وہ قطب مینار سے اسی لیے نظر ڈالتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اور بجائے دو چار دن قیام کرنے کے وہ اسی شام کو بمبئی کے لیے سیٹ بُک کرا کے پالم ہوائی اڈے پر پہنچا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہاں اپنی کمپنی کے مختلف برانچ مینجروں اور ایجنٹوں سے مل کر وہ ایجنٹا الورا جائے گا، اور وہاں سے حیدر آباد سے ہوتا ہوا احمد آباد۔ وہ انہیں خیالات میں محو ٹیکسی سے اترا اور لونج میں اپنے لیے جگہ ڈھونڈنے لگا تھا۔ وہاں صرف ایک نشست خالی دکھائی دی۔ وہ برقعہ پوش نسرین کی بغل میں تھی۔ گو نسرین نے اُسے پہچان لیا۔ مگر وہ اُسے نہ پہچان سکا۔ نقاب نے اس چہرے پر

پردہ ڈال رکھا تھا، جس کی تصویر اس کے دل کے پردوں پر ہر دم کھنچی رہتی تھی۔ وہ ایک تھکے ہوئے مسافر جیسی لمبی سانس لے کر اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس کے نتھنوں نے اس سینٹ کی خوشبو محسوس کی جو نسرین کا دل پسند تھا۔ اس نے گھبرا کر نسرین کی طرف دیکھا۔ برقعہ میں لپٹی ایک سکڑی سکڑائی خاتون نظر آئی۔ کیسے پوچھے کہ کیا نام ہے؟ پھر نسرین تو اس کے ساتھ بے پردہ گھومتی تھی۔ اجنبی برقعہ پوش خاتون سے اس کو کیا نسبت! وہ اپنے خیالات و جذبات سے پریشان ہو کر کرسی سے اُٹھ کر لونج کو میدان سے جدا کرنے والی ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور مختلف طرح کی یادوں میں کھو گیا۔

نسرین کے دل میں پٹخے لگے تھے۔ جب نصیر بغل میں آکر بیٹھا تھا تو وہ کانپنے لگی تھی۔ اب جبکہ اُٹھ کر ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ جس کے ملنے کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھی وہ اتنا قریب آکر پھر ہاتھ سے جایا چاہتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر نصیر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور اس سے گفتگو کا بہانہ ڈھونڈھنے لگی۔ نصیر، جو ستاروں سے آنکھیں لڑائے ان کی متحرک چمک میں نسرین کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی محبوب خوشبو سے چونکا۔ اس نے پلٹ کر برقعہ پوش کو دیکھا۔ نسرین نے کانپتے ہاتھوں سے نقاب اُلٹ دی۔ وہی پیارا چہرہ مگر چوبیس سال کا غم زدہ، وہی غزالی آنکھیں مگر جامِ مے کی جگہ درد سے پُر دو کٹورے۔ وہی گلاب کی پنکھڑیاں ہونٹ، مگر خزاں دیدہ، مرجھائی ہوئی کلیوں جیسے!

نصیر کے جسم میں زلزلہ سا آگیا بوٹی بوٹی کانپی بمشکل منہ سے آواز نکلی "نسرین؟"

اس نے بھی گھٹی آواز میں جواب دیا "جی ہاں، وہی آپ کی لونڈی"

نصیر بمشکل اپنے کو قابو میں رکھ سکا۔ اس نے ریلنگ دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑلی اور میدان کی طرف رُخ کر کے کہا "بس یہی ایک آرزو تھی کہ تم سے ایک بار معافی مانگنے کا موقع مل جائے۔ میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ اپنی شراب نوشی چھپائی اور نشے کے عالم میں تم پر بڑے ظلم کیے۔ میں نے اپنے جرموں کی پاداش میں اپنے کو خود کڑی سزا دی۔ ہندوستان سے جاتے ہی آسٹریا کے ایک کلینک میں چھ ماہ پڑا رہا۔ شراب کی لت پر فتح پاکر میں وہاں سے نکلا۔ اس رات کے بعد سے آج تک ایک بوند حلق سے نہیں اُتاری۔ کتنا دکھ ہوتا ہے ان نشوں کے چھوڑنے میں اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ لیکن میں نے ان تکلیفوں کو برداشت کیا۔ پھر بھی زندگی بے سود اور بیکار سی محسوس ہوئی۔ میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ مجھ کو کمیشن مل سکتا تھا۔ میں نے سختیاں جھیلنے کے لیے ایک معمولی سپاہی کی زندگی پسند کی۔ نہ جانے کتنی بار گولیوں کی بوچھاڑ سے عمداً گزرا۔ مگر سوائے ٹانگ ٹوٹنے کے حسبِ خواہش موت نہ آئی۔ سچ ہے "موت کا ایک دن معین ہے"۔

نسرین سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ اس کے نسبتاً کھردرے ہاتھ کو اپنے نازک ہاتھ سے تھپک تھپک کر بولی۔

"شراب ترک کرنے کے بعد کاش مجھے اطلاع دے دی ہوتی! پھر ہماری زندگیاں اس طرح اجاڑ نہ گزرتیں۔!"

نصیر نے تعجب سے پوچھا "لیکن تمہیں مجھ سے نفرت نہیں!"

اس نے نظریں نیچی کر کے کہا "محبت کے گھر میں نفرت کی گنجائش کہاں سے ہو سکتی ہے؟"

نصیر نے اُسے اور بھی گھبرا کر دیکھا "ارے سیٹھ جی نے تمہاری دوسری شادی نہیں کر دی؟" اس نے پوچھا۔

نسرین نے غرور سے سر اونچا کر کے کہا "انہوں نے شروع میں تو بہت زور دیا مگر جب ہمارا منیر پیدا ہو گیا تو پھر ہم دونوں اس

کی خدمت اور پرورش میں تن من سے لگ گئے۔

اس نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا "یہ مُنیر کون ؟"

وہ آہستہ سے بولی "تمہارا بیٹا۔ وہ تین مہینہ کا پیٹ میں تھا جب میں گھر سے نکالی گئی"

نصیر نے "اُف ! اُف !" کہہ کر اپنے ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا "ارے میرا بیٹا تمہاری گود میں اور مجھے کچھ خبر نہیں !"

مجھ سے یہ بات چھپا کر سیٹھ جی نے مجھے سب سے بڑی سزا دی !"

نسرین نے کہا "انہیں یقین تھا تم اُسے اُن سے چھین لوگے اور اپنا ہی جیسا بنا دو گے"

وہ بولا "غلط نہ تھا۔ ان کو یہ خدشہ ! مگر یہی بچّہ شاید میری پوری زندگی یوں برباد ہونے سے بچا لیتا۔ وارث کے نہ ہونے سے ہر مرد حد درجہ بے پروا ہو جاتا ہے۔ اس کو کسی کے لیے ایک اچھی مثال بننے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ مجھے تو ہر وقت محسوس ہوتا رہا۔ میں ایک بے سود سی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھ پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری ہی نہیں ہے — مگر اپنا بیٹا، اپنا وارث !۔۔۔" اور وہ رُک کر بڑی بے چینی سے پوچھنے لگا: "اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا۔ شکل و صورت کیسی ہے ؟"

وہ مسکرا کر بولی: "ہو بہو باپ کی جوانی کی تصویر !"

وہ آبدیدہ ہو کر بولا "خدا نہ کرے کہ باپ جیسی سیرت بھی ہو !"

اتنے میں ہوائی جہاز کے چھوٹنے کا اعلان ہوا۔ میدان میں جانے کے لیے راستہ کھول دیا گیا۔ دونوں جہاز میں دو پاس پاس کی ملی ہوئی سیٹوں پر بیٹھے۔ گلے شکوے بھی ہوئے اور میٹھی میٹھی پیار کی باتیں بھی۔ کئی گھنٹے کا راستہ آنکھ جھپکتے میں کٹ گیا۔ آپس میں طے ہو گیا کہ وہ ہفتہ عشرہ بمبئی میں ضرور ٹھہرے گا اور بیٹے کو اپنے سے مانوس کرنے کی آہستہ آہستہ کوشش کرے گا۔

'سنٹا کروز' میں وہ اُترے تو منیر ماں کو خلافِ معمول لینے نہ آیا تھا۔ کیڈلک لیے غفور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ سیٹھ جی کا پرانا ملازم تھا اور نصیر کو پہچانتا تھا۔ اس نے جو "دولہا میاں" کو "بٹیا" کے ساتھ دیکھا تو وہ باغ باغ ہو گیا۔ نسرین نے اس سے پوچھا "منیر کیوں نہیں آیا؟"

وہ کچھ سٹ پٹا کر بولا "کسی دعوت میں گئے ہیں۔ مجھے حکم دیا تھا کہ تم جا کر آپا کو لے آنا"

اس نے نسرین کا اسباب ڈکی میں جب رکھا تو نسرین کے خاموش اشارے پر نصیر کا اٹیچی بھی وہیں رکھ دیا۔ نصیر نے عذر کر کے ہوٹل میں قیام کا نام لیا اور موٹر میں نسرین کے ساتھ سوار ہونے میں پس و پیش کیا۔ وہ بولی "کوٹھی میرے ہی نام ہے۔ اب وہ میرا گھر ہے یا آپ کے بیٹے کا۔ ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں آپ کو انکار کرتے شرم نہیں آتی ؟"

وہ لاجواب ہو کر خاموشی سے نسرین کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔

موٹر اسی جانی پہچانی سہ منزلی عمارت کے سامنے پورٹیکو میں رُکی، جہاں آتے جاتے سیٹھ جی کی موجودگی میں بھی اُسے ہمیشہ مسرت ہوتی تھی نئی نئی قلعی اور مرمت ہوئی تھی۔ اس سبب اس کے پرانے پن میں بھی ایک خاص طرح کا حسن تھا۔ نسرین اُسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ دروازے کے بالکل ہی مقابل دیوار پر سیٹھ جی کی قدِ آدم تصویر آویزاں تھی۔ نصیر کو محسوس ہوا جیسے سیٹھ جی کھڑے اُسے بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں، جیسے تصویر کے بے جان لب ہل رہے ہیں، اور اُن سے آواز آ رہی ہے "بے شرم، بے غیرت شرابی! تو پھر اس گھر میں اسے

برباد کرنے آیا! ——— اور نصیر دروازے ہی پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ نسرین ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی۔

نصیر پشت کی جانب جو کھڑکی تھی اس پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر ایک چھوٹا سا سدا بہار چمن تھا۔ اس میں چھٹکی ہوئی چاندنی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس چمن کی بہاریں اس نے کئی بار نسرین کے ساتھ لوٹی تھیں اور ان کی چھیڑ چھاڑ پر اکثر پھول مسکرائے اور ہنسے تھے۔ شیریں یادوں کا یہ سلسلہ غفور کے دروازہ کھولنے اور جھانکنے نے توڑا۔

اس نے پوچھا "بیٹیا دولہا میاں کا سوٹ کیس کس کمرے میں رکھوں؟"

نسرین نے کچھ شرما کر، کچھ شپٹا کر کہا "مہمان کے کمرے میں!"

جب غفور دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تو وہ نصیر سے اپنی صفائی میں بولی "میں چاہتی ہوں کہ منیر آپ سے مل جائے تو میں اسے آپ کا نام بتا دوں"۔ نہ جانے کیوں نصیر عرق عرق ہو گیا۔ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "ہاں، نہ جانے سیٹھ جی نے کتنا بس اس کے دل میں میری طرف سے بھر دیا ہو گا۔ مگر۔ اپنے لئے کوئی نیا نام بھی تجویز کرنا پڑے گا!۔۔۔"

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک موٹر زور زور سے ہارن دیتی پورٹیکو کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے دو موٹروں میں ہلکی سی ٹکر ہوئی اور شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار بھی سنائی دی۔ نسرین "ارے یہ کیا ہوا؟" کہتی کمرے کے باہر لپکی۔ نصیر نے بھی اس کا ساتھ دیا مگر دروازہ کے باہر ہی ٹھٹک رہا۔ منیر ٹکر مارنے والی موٹر سے دھاڑتا ہوا اترا۔

"یو فول! ڈیم نگر! ام آرن پر آرن دے رہا ہے اور تم ہمارا راستہ کیوں نہیں دیتا!"

غفور جو دونوں موٹروں کے درمیان کچھ دبا سا چوٹ کھایا "سی سی" کر رہا تھا، بولا

"بھیا میں ڈکی سے بٹیا کا اسباب نکال رہا تھا، میں موٹر کیسے ہٹاتا!" ——— منیر بولا "بٹیا؟ بٹیا؟ او ام سمجھا، امارا آفا!"

نسرین نے برآمدے سے پوچھا "ارے کیا ہوا غفور؟" ——— منیر اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بڑھا "تم آ گیا آفا؟ امارا پیارا آفا!"

لیکن جیسے ہی منیر نسرین کے قریب آیا وہ غصہ سے جھڑک کر بولی "ارے تو نے شراب پی ہے، بھئو!"

وہ ہنس کر بولا "بڑے کاروبار میں فیناڈ (پینا) ہی پڑتا ہے آفا۔ فر بہت نہیں پی۔ بس تمہاری صحت کے تین جام، ڈارلنگ آفا!"

اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر ماں کی طرف بڑھا۔

نسرین ناک پر رومال رکھ کر ابکائی لیتی ہوئی چیخی "ارے تو نے آخر تجھ کو بھی باپ کا ورثہ مل ہی گیا! ہائے اللہ! میں نے لاکھ جتن کیے مگر باپ کا خون رنگ لا کر ہی رہا!" اور وہ باتھ روم کی طرف بھاگی۔ شراب کھولتی ہانڈی کا تہ نشین میل باہر پھینک دیا۔ منیر ماں کے پیچھے لپکتا ہوا بولا "میرے شوئر باپ کا نام تم نے کیوں لیا آفا؟ اُس بدماش کا خون! اُس شوئر کا ورثہ! نہیں! ہرگز نہیں!" اور اس نے باتھ روم کے قریب رکھے ہوئے گملوں میں ایک سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل وہ برآمدے کے فرش پر آ رہا۔

غفور اپنی چوٹ بھول کر اسے اٹھانے دوڑا۔ مگر نسرین نے باتھ روم کے اندر جا کر اس کا دروازہ دھڑاک سے بند کر لیا۔

اور نصیر نیچی نظریں کیے، گردن جھکائے کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

جراحتِ دل

اختر اورینوی

روشنی کی بارش ہو رہی تھی۔ چھت سے آویزاں چینی کے بڑے گُوم میں بجلی کے کئی پُر قوت قمقمے آپریشن کی میز پر روشنی بکھیر رہے تھے۔ ڈوم کے دائرے میں ایک سینہ چاک آدمی کا لال لال دل، شریان و ورید، رگ و ریشہ، پسلیاں، عضلات اور بریدہ جلد سب کچھ منعکس ہو رہے تھے۔ مریض کے جسم کے اندر، اوپر اور میز کے سرخ ربڑ پر آرٹری فورسیپ، کلپ، مختلف قسم کے فورسیپ، اسکیل پل، روئی، چھوٹے چھوٹے تولیے منتشر تھے۔ وہ ہرے ایپرن پہنے ہوئے ڈاکٹر، نرسیں، ہاؤس مین، سینیئر طلبہ میز کے گرد طرح طرح کے زاویوں میں کھڑے یا جھکے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے چوڑی پٹیوں (ماسک) سے اپنے ناک منہ ناگا سادھوؤں کی طرح بند کر رکھے تھے۔ بڑے بڑے چلتے ہوئے ڈریسنگ کمبلوں کی سطح پر اور روشنی کے ڈوم میں عجیب عجیب ہیئتوں اور تماشوں کے عکس پڑ رہے تھے۔ بے ہوش کرنے والی دوا ایتھر کی بُو تمام پھیلی ہوئی تھی۔ آکسیجن سلنڈر سے ربڑ کی نلکی نکل کر زیرِ جراحت مریض کی ناک تک پہنچی تھی۔ ایتھر اور آکسیجن باری باری استعمال کیے جا رہے تھے۔ ماہرین مریض کی نبض اور سانس کی رفتار کا بار بار جائزہ لے رہے تھے۔ کبھی کبھی آہستہ آہستہ لوگ باتیں کرنے لگتے تھے۔ اور سرجن شہاب کے احکامات کی طرف دھیان لگائے ہوئے اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپریشن کمرے کا درجۂ حرارت ضبط و نظم میں رکھا گیا تھا۔ پھر بھی کام میں انہماک اور محنت کی وجہ سے سرجن شہاب کی بلند و تاباں پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور وہ کھلے ہوئے دل کے ایک اندرونی خانے کی ماؤف جھلی کی جگہ پر ایک مصنوعی جھلی لگا رہا تھا۔ آپریشن کا مرکزی مرحلہ کامیابی سے ختم کر کے اُس کے ذہن کو ذرا فرصت ملی اور اُس نے سوچا۔ کاش ریحانہ کا آپریشن مرض کی ابتدا ہی میں ہو جاتا۔ بڑی ضدی ہے۔ ریومیٹزم کے پہلے حملے کے بعد ہی ڈاکٹروں نے اُسے آرام کرنے کو کہا تھا لیکن اُس نے ایک نہ سنی۔۔۔۔۔۔

شہاب آپریشن روم میں واپس آ گیا اور دل کے شگاف کی اِسٹچنگ میں لگ گیا۔ پھر پیری کارڈیم کی سلائی کی، پسلیوں کو ٹھیک ٹھیک بٹھایا اور جوڑا، جھلیوں اور عضلات کو درست کیا اور آخر شق کی ہوئی جلد میں اسٹچنگ کی جانے لگی۔

ملہوترا! سانس کی رفتار؟۔۔ بنرجی! آکسیجن! محمود! نبض!'

سرجن شہاب نے جلد کی سلائی کا آخری مرحلہ اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کیا اور اپنے خاص ملحقہ کمرے کی طرف چلا گیا۔

کافی کی سہارا دینے والی خوشبو اور ایک حوصلہ افزا گھونٹ نے شہاب کو ریحانہ تک پہنچا دیا۔۔۔۔۔۔ ریحانہ کے دل کا آپریشن کرنا ہوگا، لیکن اب صرف جھلی کی اصلاح سے کام نہیں چلے گا۔ دل کے عضلات ماؤف ہو چکے ہیں۔ وہ کب تک اس طرح لیٹی رہے گی۔ اپنے جنازے کو آپ گھورتی رہے گی؟ بستر کی قبر میں آکسیجن سلنڈروں کے منکر نکیر اُس کے سرہانے کب تک کھڑے رہیں گے؟۔۔۔۔۔

شہاب کے دل میں درد سا اُٹھا۔

"اچھا حال ہے سَر!"

محمود، بنرجی اور ملہوترا نے بہ یک وقت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رپورٹ پیش کی۔ گرم کافی کا آخری گھونٹ ختم کر کے سرجن شہاب آپریشن تھیئٹر میں واپس جاتے ہوئے بولا۔

"بیرا! ہم سب لوگوں کے لئے کافی اور سینڈوچ تیار رکھو۔۔۔۔۔۔ مبارک ہو! آپریشن کامیاب ہوا۔ ایک ہفتہ میں مریض دوڑتا ہوا اپنے گھر جائے گا۔ سبھوں کا شکریہ۔ موت سے لڑائی میں ہماری فوج کو فتح مبارک ہو! لیکن ہر وقت چوکس رہنا ضروری ہے۔۔۔۔۔ مریض کو ابھی ٹمپریچر کنٹرول روم میں رکھو!"

مریض کو پہئیے دار آپریشن میز پہ کنٹرول روم میں لے جایا گیا ———

سرجن شہاب کارڈیک سرجری کا عالمی شہرت رکھنے والا ماہر تھا۔ اس نے انگلستان اور کینیڈا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ دل کے بہت سارے آپریشن خود کئے تھے اور بہتیرے معرکہ آرا آپریشنوں میں عظیم سرجنوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ تبدیلیٔ قلب کے دو کامیاب آپریشنوں میں شمولیت اُس کے تازہ ترین کارناموں میں شمار کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں اُسے ایک بار انگلستان اور دوسری بار امریکہ خاص طور پہ مدعو کیا گیا تھا۔

پشاور کے قریب شمال مغربی پہاڑیوں کے درمیان ایک پُرفضا سطح مرتفع پہ شہاب نے امراضِ قلب کے لئے اپنا سرجیکل کلینک قائم کیا تھا۔ اُس کے مددگار سرجنوں میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کئی ماہرین تھے۔ دو ہندوستانی بھی اُس کے شریکِ کار تھے جو کینیڈا سے اُس کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔ شہاب خود بھی ہندوستانی مہاجر تھا۔ اُس کا خاندان تقسیمِ ہند کے فوراً بعد ہی پٹنے سے پاکستان چلا آیا تھا۔

شہاب نے اپنے بنگلے کے سادہ مگر آرام دہ ڈرائنگ روم کے ایک دریچے کو کھولتے ہوئے سوچا۔ یہ نیلے پہاڑ نہ معلوم کیوں اتنے خیال انگیز ہوتے ہیں۔ یہ کہستانی سلسلے پُرپیچ یادوں کو ماضی سے پکار کر بُلا لاتے ہیں۔ میری زندگی یادوں کا ایک سنگستانی سلسلہ ہے جس میں خال خال سبزہ زار ہیں۔ اور یہ سبزہ بھی سوکھتا جاتا ہے۔ ریحانہ تم بہت ضدی ہو۔ لیکن اب تمھیں فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں اب بھی تمھارا منتظر ہوں۔ میرا فن تمھارا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے صرف تمھاری خاطر کارڈیک سرجری میں مہارت حاصل کی۔ تم تو مجھے چاہتی تھیں ریحانہ۔ پھر کیوں بدل گئیں۔ تم نے اپنی بیماری کو جان بوجھ کر بڑھایا۔ مجھ سے بھی کنارہ کش ہوگئیں۔ تم عجیب ہو۔ میں تمھارے دل تک پہنچا اور اُس سے باہر نکال دیا گیا۔ میں پھر تمھارے دل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ وہ میری محبت کا وطن تھا۔ کب دل کے دریچے بند ہوتے ہیں اور کب کھلتے ہیں۔ کون جانے۔ دل بدلتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن میرے دل میں تم اب تک مکین ہو ریحانہ۔ تم ایک معمہ ہو۔ شاید میرے وطن میں میری محبت اب تک کہیں چھپی بیٹھی ہو۔ یہ فریبِ تسکین ہے یا حقیقت۔ مجھے معلوم نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرا دل تمھاری نگاہِ اولیں کی جراحت سے ہنوز چاک چاک ہے۔ تم اپنی مہرباں پلکوں کی سوزن سے اسے سی دو۔

شہاب کے حافظہ کے روکٹ نے دوسرے مرحلے پہ پیچ کھایا اور جست لگائی ———

سرحدی پہاڑوں کے راز پرور دھندلکے سورج کی کرنوں سے ڈر کر گھاٹیوں میں جا چھپے تھے۔ شہاب ابھی تک کھلے ہوئے دریچے کے سامنے کھڑا تھا۔ دیاسلائی پر رگڑ پڑتے ہی راکٹ نے چھلانگ لگا دی تھی۔ سگرٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کے اندر سے ایک شہر اُبھرا۔ عظیم آباد، جو پاٹلی پترا بھی تھا، عظیم آباد اور پٹنہ بھی۔ شہاب کا تخیل تصویر آفریں اور صنم ساز تھا۔ وہ ٹیکسلا، دِلّی اور لکھنؤ ہوتا ہوا پٹنے پہنچا۔ اُس کے دل میں ایک ہوک اُٹھی۔ وہ اُس کی محبت کی روشنیوں کا شہر تھا۔ شہاب کو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب سے محبت تھی، پٹنے سے محبت تھی، ریحانہ سے محبت تھی۔ اُس نے سوچا۔ کاش لوگوں کے دل بدل جاتے——

وہ سگرٹ کے کش لیتا رہا۔ مرغولوں سے تاریخ اُبھری، تہذیبیں اُبھریں، شہرِ محبت اُبھرا، اور ریحانہ کا حسین مگر سوگوار چہرہ اُبھرا—— یہ حسین چہرہ اُفق اُفق ہر شئے پر چھا گیا۔ پھر وہ پیارا چہرہ شہاب کے دل میں جا چھپا۔ دل وقت کی طرح دھڑکتا رہا۔ اور حافظہ کا راکٹ کیپسول ماضیٔ بعید میں جا پہنچا—— بانکی پور کی پکی سڑک کے قریب ایک چوڑی گلی سے ملحق افتادہ زمین کے بیچوں بیچ دو گھنیرے پیپل اور برگد کے درختوں کے درمیان ایک زرد سا دو منزلہ مکان پُراسرار انداز میں سانس لے رہا تھا۔ ٹین کا پھاٹک گلی میں تھا۔ سامنے ایک دیوار حائل تھی، جس کے بائیں جانب ایک دروازہ براہِ راست آنگن میں کھلتا تھا اور داہنی جانب ایک لکڑی کی بوسیدہ سیڑھی کوٹھے کی چھت پر گھماتی ہوئی چڑھ جاتی تھی۔ دس بجے دن کے قریب اُس مکان میں تھوڑی دیر کے لئے کچھ رونق سی ہوتی اور پھر سناٹا۔ شام کے پانچ چھے بجے رونق لوٹ آتی اور غروب آفتاب کے بعد گُھپ کا عالم طاری ہو جاتا۔ ایک لالٹین کھونٹے پر جلتی رہتی اور ایک نیچے۔ ان کی زرد روشنیاں مکان کی زردی کو زرد تر بنا کر تاریکی میں محلول کرتی رہتیں۔ ہم سایہ درختوں پر فاختاؤں اور بگلوں کا بسیرا تھا۔ سرِ شام یہ پیڑ بہت آباد اور بے حد چہچہال ہو جاتے۔ پرندے اپنے نشیمن کو واپس آتے، پُرمسرت شور مچاتے اور سورج ڈوبتے ہی خاموش ہو جاتے۔ ان کی خاموشی زرد مکان کی خاموشی کو اچانک زیادہ محسوس اور جاں گُسل بنا دیتی۔

محلے والے اس زرد مکان کو 'پادری کی حویلی' کہنے لگے تھے۔ ایک بتیس سالہ کنوارا دراز ریش نوجوان، چار کنواری جوان لڑکیاں اور ایک نہایت گوری چٹی بوڑھی خاتون یہ سب پادری کی حویلی کے مکین تھے کبھی کبھار۔ ایک آدھ ملازم چھوکرا یا کبڑی سی خادمہ بھی یہاں نظر آ جاتی تھی۔ معمر خاتون بیوہ تھیں۔ اُن کے مرحوم شوہر وکیل تھے۔ ریشائل جوان بی، اے پاس کر کے خاکسار تحریک میں شامل ہو گیا، مختلف قومی پارٹیوں میں رہا اور آخر کار ان سبھوں کو بے قدر شوق نہ پا کر خانہ نشین ہو گیا۔ ایام طالب العلمی میں بڑی فلسفیانہ بحثیں کیا کرتا تھا اور اب ورد و وظائف کی طرف مائل تھا۔ فرائض سے زیادہ نوافل اور عملیات کی جانب توجہ تھی۔ اِس لانبی بھوری داڑھی، گورے لمبوترے چہرے، لانبے کُرتے اور عربی پاجامے والے شخص کو سب 'پادری' کہتے تھے۔ اسے بڑی پولیا کے بڑے کیتھولک پادری سے بے حد مشابہت حاصل تھی بھی۔

پست قد، گدرانہ جسم، گول چہرے، کمھلائی ہوئی سفید رنگت اور تیز عقابی آنکھوں والی کنواری بی، اے پاس کرنے سے پہلے دل شکستہ ہو کر خانقاہ نشین ہو گئی تھی۔ الہ آباد سے آنے والی ایک دبی دبی افواہ تھی کہ بڑی کنواری سے نہایت ہی تقوی پرور قسم کا رومان وابستہ ہو گیا تھا لیکن اسے راس نہ آیا۔ اور اب یہ حال تھا کہ کنبے میں دور و نزدیک کا رکوڑھی، کیش رکھنے والے

"بکانفیے" نایاب ہوگئے تھے۔ دو بڑی بہنوں کی شادی قبل ہی دو بکانفیوں سے ہو چکی تھی۔ تیسری کے لئے ہڈی میں ہڈی ملانے والے کسی خاندانی شاہزادے کا صبر آگیں انتظار تھا۔ لہٰذا پادری کی حویلی کی بڑی کنواری پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتی، پابندی سے رمضان کے روزوں کے علاوہ رجب، شعبان، محرم، ربیع الاوّل وغیرہ کے نفلی روزے رکھتی، پُرتکلف افطار اور سحری کھاتی، رات کے کھانے سے بھی غفلت نہیں برتتی، تلاوت میں مشغول رہتی، دعائے گنج العرش چن چن کر پڑھتی، ستر حج کا ثواب بٹورتی اور ہر وقت سر پہ آنچل اوڑھے رہتی۔

'پادری کی حویلی' میں پچیس[25] سالہ بڑی کنواری کے بعد منجھلی، سنجھلی اور چھوٹی کنواریاں بائیس[22]، بیس اور اٹھارہ[18] سال کی عمر کی ہوں گی۔ منجھلی شعلۂ جوالہ تھی۔ سرخ و سفید رنگ، بیضوی تراشیدہ چہرہ، نشیلی آنکھیں، چھریرا بدن، گھنیرے سنہرے لہراتے ہوئے بال، کم سن مولسری کے پودے جیسا قد، لغزیدہ چال، اور تیز مرتعش آواز۔ گویا نگاہوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ ایم۔ اے پاس کر کے ایک زمانہ کالج میں لکچرار ہو گئی تھی اور بڑی کنواری کی سِل کے سرکنے کا انتظار کر رہی تھی۔

سنجھلی کنواری سانولی سلونی، درانہ قد، نرم خو منکسر لیکن بے حد بیدار آنکھوں والی تھی۔ اُس کے مضبوط کینڈے کے مزاج کو گرویدہ زلفیں اور نمایاں کئے دیتی تھیں۔ شاید سائنس کی طالبہ ہونے کی وجہ سے اُسے بال ترشوانے پڑے تھے۔ وہ جوڑا باندھنے کی عادی نہیں تھی اور گیسوئے پریشاں کو گیس برنر کی لَو سے لاگ تھی۔ لیکن اُس کے شانوں کے درمیان واضح نسائیت موجود تھی۔

کنجھلی کنواری چمپئی کی ادھ کھلی کلی کی طرح تھی۔ نرم سفیدی، ہلکی فالسئی رنگت اور کومل زردی لئے ہوئے سنہرے لانبے بال، تھرتھری شرمیلی مگر چمکتی ہوئی آنکھیں، کتابی چہرہ، سندر، سجل، سجے سجے، دمکتے ہوئے دانتوں، رسیلی آواز، پھاگن کی صبح جیسی مسکراہٹ اور لجائی ہوئی ہنسی کے درمیان ابھرتی ہوئی بانے پن کی موہنی خوشبو بڑے بھولے پن سے دل نشیں ہو جاتی تھی۔

سگریٹ کے دھوئیں اور خیالات و تصورات کے مرغولے رقص کرتے رہے۔ سرجن شہاب نے بارہا اپنے کو 'پادری کی حویلی' میں داخل ہوتے اور نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ زرد مکان کی نچلی منزل کے دالان میں بڑی بی کو خاموش بجھی ہوئی فضا میں گھورتے ہوئے پاتا۔ بڑی بی ماشاءاللہ بہری ہو چکی تھیں اور مصلحتاً نابینا۔ دالان کے متصل نچلے کمرے کے تخت پر رفعت کو عموماً سویا ہوا یا کسی زیارت میں جانے کی تیاری میں مشغول دیکھتا۔ حکمت عملی برتتے ہوئے وہ کچھ دیر انھیں لوگوں کے پاس بیٹھ جاتا اور پھر کوٹھے پر چلا جاتا۔ کوٹھے پر دو کمرے تھے۔ ایک میں نسیم رہتی تھی اور ایک میں فرحت اور ریحانہ۔ تینوں بہنیں اُسے شام کو کھلی چھت پر ملتیں۔ نسیم کالج کے قصے سناتی، ادبی گفتگو کرتی اور کبھی شعر و شاعری کے چرچے ہوتے۔ فرحت شعر و ادب کا مذاق اڑاتی اور ریحانہ ہر بات پر مسکرا دیتی۔

شہاب پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال میں ہاؤس مین تھا اور شہرۂ آفاق سرجن بو تراب تقی کا چہیتا اسسٹنٹ بن گیا تھا۔ سرجن تقی اپنے فن میں بڑی مہارت تو رکھتا ہی تھا، وہ ایک شائستہ پرست دانشور اور سماجی احساس رکھنے والا انسانیت دوست شخص بھی تھا۔ شہاب کی شخصیت سرجن تقی کے سیرتی سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ مرشد و مرید دونوں ہر دل عزیز تھے۔ ۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے زہر سے بھی یہ دونوں بالکل محفوظ رہے تھے۔ وہ انسانیت کش حالات پر کڑھتے رہتے اور اپنی اپنی بساط بھر اپنے وطن کو مجروح ہونے سے بچانے کی کوششوں میں لگے رہتے۔

مرغولوں کے بادلوں سے خون کی بارش ہونے لگی۔ پرنالے بہہ گئے۔ ہند کے دل کا خون مٹی میں مل رہا تھا۔ وطن پر مُردنی چھانے لگی۔

شہاب نے گھبرا کے 'پادری کی حویلی' میں پناہ لی۔

وہ تینوں کنواریوں کو بہ یک وقت چاہنے لگا تھا۔ بچپن کو ارشد کی فضا سے بور ہو کر وہ بعض دفعہ سویرے ہی 'پادری کی حویلی' چلا آتا تھا۔ اُس وقت تک نسیم، فرحت اور ریحانہ کالج سے واپس نہیں آئی ہوتیں تو 'پادری' وہاں ضرور مل جاتا۔ وہ چھت پر ٹہل ٹہل کر کوئی مذہبی کتاب زور زور سے پڑھتا ہوا ملتا اور شہاب کو بالکل خاطر میں نہ لاتا۔ جب کنواریاں آجاتیں تو 'پادری' نچلی منزل کو چلا جاتا۔

دھوئیں کے مرغولے سے 'پادری' نکلا اور زرد حویلی کی مکمل چھت کے شمالی حصے میں دھیرے دھیرے ٹہلنے لگا۔ اُس نے شہاب کو نہیں دیکھا۔ وہ زور زور سے ورد کر رہا تھا۔

"قُلْ اَعوذُ...... قُلْ اَعوذُ...... اول نہرا! اول نہر ا! قُلْ اَعوذ۔ اول نہر ا!"

علی وارث صحیح قرأت کی سعیٔ بلیغ میں سرگرداں تھا۔ کوئی مخصوص دعا تھی جس کی تاثیر صحیح صحیح قرأت کے بغیر ناممکن بتائی گئی تھی۔ وہ آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اُٹھا کر عجیب پُراسرار حرکتیں بھی کر رہا تھا۔ شہاب گھبرا کر نسیم کے کمرے میں جا بیٹھا اور 'بال جبریل' پڑھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر سامنے اُٹھ گئی۔ دونوں کمروں کے مشترک دروازے کے چوکھٹے میں ریحانہ بُت بنی کھڑی تھی۔ شہاب کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ دیر سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ انھیں نگاہوں کی شعاعوں سے بن دیکھے متاثر ہو کر چونکا تھا۔ ان خاموش متمنی نظروں نے شہاب کے دل کی دھڑکنوں کو نیا سرگم عطا کر دیا۔

"ریحانہ!" اور وہ جا چکی تھی۔

شہاب نے اپنی قسمت کا ستارہ پا لیا تھا۔ چاروں کنواریوں میں سے ایک نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ آہستہ آہستہ اس کشش میں اضافہ ہوتا گیا اور وں کی توجہ میں کمی ہوتی گئی۔ معلوم نہیں کیوں علی وارث اس سے ناراض رہنے لگا۔

شہاب مغرب کے تھوڑی ہی دیر بعد واپس ہو جایا کرتا تھا۔ اُسے آپریشن تھیٹر جا کر مرحن قلی کے ساتھ آپریشن میں شریک ہونا تھا۔ مشغولیت کے باوجود وہ 'وادیٔ ریحانہ' کی طرف جاتا رہا۔ اکثر صرف تین کنواریاں چھت پر ہوتیں، لیکن کبھی کبھی رفعت بھی آنکلتی اور ہر بار کسی نہ کسی پہ کوئی تیز طنز کر جاتی۔ عموماً شہاب ان طنزوں کا نشانہ بنتا۔ نسیم اور فرحت کی دست برداری کے باوجود شہاب سے اُن کا ربط ایسا بر فیل بھی نہیں ہو گیا تھا کہ خوش دلانہ ہنسی مذاق کے پھول ہر شام نہ کھلتے۔ لیکن علی وارث اور رفعت دونوں شہاب کی طرف سے دن بہ دن تلخ تر ہوتے جا رہے تھے۔

شہاب کے وارڈ یا آپریشن تھیٹر چلے جانے کے بعد 'پادری کی حویلی' پر گھٹن پیدا کرنے والی خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ علی وارث عملیات میں مشغول ہو جاتا، رفعت کھانا کھا کر جتنا تک سو رہتی۔ نسیم ٹیوٹوریل کی کاپیاں دیکھ دیکھ کر بے حد بور ہوتی رہتی، فرحت سائنس کے فارمولے یاد کرنے میں لگ جاتی اور ریحانہ جس نے شہاب کے کہنے کے باوجود سائنس نہیں لی تھی مومن اور میر کی غزلیں یا کیٹس اور شیلے کی نظمیں پڑھتی اور آہستہ آہستہ آہیں بھرتی۔

ریحانہ سنجیدہ، حسین اور تخیل پرست تھی۔ والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہو چکا تھا اور والدہ اپنے چار بیٹوں اور چھ بیٹیوں کے

درمیان بالکل بے اثر ہو کر رہ گئی تھیں۔ گھریلو محبت کی فضا بجھی بجھی سی تھی اور ماحول میں انتشار پایا جاتا تھا۔ حویلی پر رفعت کی ناکام ازدواجیت کا سایہ خود اس کے ناآسودگی اور دوسروں کے لئے اضطراب و بغاوت کا موجب بن گیا تھا۔ ریحانہ جذبات کی تشنگی اور حالات کے کرب کو شدت سے محسوس کرتی مگر سارے زہر کو اپنے دل میں گھول لیتی۔ اس کا تبسم بھی دردناک ہوتا۔ وہ برملا اظہارِ محبت سے قاصر تھی۔ لیکن اس کی غمناک نگاہیں، اس کا عنوانِ نظر اس کی محویتِ انتظار اور علیحدگی کا خاموش درد ریحانہ کی جاگی ہوئی خاموشی کو گویا بنا چکا تھا۔

ٹ۵۴ء کی برسات میں لہو کی برکھا بھی ہوئی اور پانی بھی خوب برسا۔ سیلاب آئے۔ آدمیت اور آدمی ڈوب مرے۔ اسی برسات میں ایک شام ریحانہ کالج سے آتے ہوئے زوروں کی بارش میں رکشے پہ شرابور ہوگئی۔ گھر پہنچی تو اس وقت بھی موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔ چھت پہ دو کمروں سے بننے والے زاویے میں پرمن کے پانی سے اس نے فرحت کے ساتھ مل کر خوب نہایا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ سنکتی ہوئی اُنڑسی پُروائی چل رہی تھی۔ رات ہی کو ریحانہ شدید بخار میں مبتلا ہوگئی اور صبح کو اس کے ہر جوڑ بند میں بے حد درد تھا۔ دوپہر تک جوڑوں میں ورم، سرخی اور سوزش بھی پیدا ہوگئی۔ ریحانہ پر بحرانی کیفیت طاری تھی۔ ڈاکٹروں نے ریومیٹزم کا مرض تشخیص کیا۔ دریافت حال سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ آٹھ نو سال کی عمر میں بھی ریحانہ پر وجع المفاصل کا حملہ ہوا تھا۔ غالباً اسی وقت قلب پر ضرب پڑی تھی۔ اسے سے دل کی آوازوں میں 'مرمر' صاف سنائی دیتا تھا اور قلب کی مریضانہ کیفیت کا دائرہ وسیع تھا۔ طبی مشورے کے ماتحت ریحانہ کو تین ماہ تک پلنگ پر آرام کرنا چاہیئے تھا۔

ایک ہفتہ تک بخار رہا۔ درد کی شدت اسپرین نے بہت کم کر دی۔ ریحانہ کو سوڈی سیلیسلس مکسچر سے سخت نفرت تھی۔ پھر بھی شہاب کے کہنے سے وہ تلخ گھونٹ پی جاتی تھی۔ بخار اترنے کے بعد ریحانہ چند دنوں تک تو بستر پہ آرام کرتی رہی۔ لیکن اس عرصے کے بعد طبی ہدایات پر اچھی طرح عمل نہ کر سکی۔ اس علالت کا ایک خوش گوار پہلو یہ تھا کہ علاج، عیادت اور تیمارداری کے فرائض انجام دیتے ہوئے شہاب ریحانہ سے بہت قریب ہوگیا۔

محبت عجیب عجیب کرشمے دکھاتی ہے۔ لیکن اس کی کرشمہ کاریاں غضب بھی ڈھاتی ہیں۔ عالمِ محبت میں انسان کی غیر متوقع صلاحیتیں ابھر آتی ہیں۔ محبت صبر و ایثار سکھاتی ہے مگر بے تاب بھی کرتی اور توقعات پیدا کر دیتی ہے۔ یہ نیاز آگیں بھی ہے اور ناز پرور بھی۔ اعتماد اور شکوک اس کے جلو میں ہوتے ہیں۔ یہ امرت بھی ہے اور زہر بھی۔ نہ جانے کب محبت کون سی کروٹ بدل لے۔

ریحانہ نے شہاب کی خاطر بہت احتیاطیں کیں۔ لیکن کسی طرح اسے معلوم ہوگیا کہ اس کے دل کی حالت اچھی نہیں۔ کبھی اکتا کر وہ کبھی ازرہِ ناز وہ ڈاکٹروں کی حکم عدولی پر اتر آتی۔ شہاب کو سخت فکر لاحق رہتی اور وہ ریحانہ کو سمجھاتا تاکہ اسے بستر سے بالکل ہی نہیں اٹھنا چاہئے۔ تین مہینوں میں دل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ وہ جبر سے پہلے تین ماہ بار بستر رہی اور اس کے بعد بھی اسے بڑے نپے تلے انداز میں رہنے سہنے کا حکم ملا۔ شہاب کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ریحانہ صحت کی پابندی نہیں کرتی۔

ایک سال بعد شہاب "ف۔ آر۔ سی۔ ایس" کا امتحان دینے انگلستان چلا گیا اور ایک ہسپتال میں اس نے ملازمت کر لی۔ وہاں دو سال قیام رہا اور اس عرصے میں اس نے "ف۔ سی۔ ایس" کے دونوں پارٹوں میں کامیابی بھی حاصل کر لی اور امراضِ دل کے اسپتال میں ایک ماہرِ فن

کے ساتھ کام بھی کرتا رہا۔ ریحانہ کی محبت پروان چڑھتی رہی اور سلسلۂ مراسلت بھی جاری رہا۔ لیکن وہ اس کی صحت کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ وہ اپنی فکرمندی کا بار بار اپنے خطوں میں ذکر کرتا رہا اور ریحانہ سے التجا کرتا رہا کہ وہ طبی مشورے پر پوری طرح عمل کرے۔ اور ستم یہ ہوا کہ اس کے ولایت سے لوٹنے کے کچھ قبل ریحانہ پر ریومیٹزم کا تیسرا حملہ ہوا اور اس کی حالت اندیشہ ناک ہوگئی۔

جب شہاب انگلستان سے واپس آیا تو اس نے ریحانہ کو ذی فراش پایا۔ لیکن اب کے دفعہ وہ بالکل لاپروا ہوگئی تھی۔ احتیاط بالکل نہیں کرتی تھی۔ شہاب بیتابانہ زرد مکان کی دوسری منزل کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اس کا دل جذبات سے بریز ہو کر چھلک رہا تھا۔ وہ چھت سے گذر کر ریحانہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بستر پہ لیٹی ہوئی ایک اور ناول پڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح پڑھتی رہی۔ پھر کتاب سرہانے رکھ کر بڑی بیگانگی سے شہاب کی طرف متوجہ ہوئی۔

شہاب نے پہلے یہ سمجھا کہ وہ ناز کر رہی ہے۔ لیکن یہ انداز ملاقات کے اختتام تک قائم رہا اور روزانہ ریحانہ کا یہی رویہ رہا۔ مجبوراً شہاب بھی "پادری کی حویلی" آنے میں جھجکنے لگا اور جب بھی وہ بے قرار ہو کر آیا ریحانہ کی روش نہ بدلی۔ شہاب کی حیرت جاگتی اور امید سوتی رہی۔

ایک روز شہاب نے دیکھا کہ اس کے رخصت ہونے سے کچھ پہلے ہی ریحانہ نے ایک کتاب اٹھائی اور کروٹ پھیر کر پڑھنے لگی۔ اس بے رخی سے شہاب کا دل خون ہو گیا۔ جب وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکلنے لگا تو گوشۂ چشم سے اس نے دیکھا کتاب کی اوٹ میں ریحانہ کی خوبصورت آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں اور وہ بڑے ضبط سے آنسو پی رہی ہے۔ مگر وہ رکا نہیں۔ زینے سے نیچے اتر گیا۔

باتوں باتوں میں شہاب نے ریحانہ کے اس دل شکن رویہ کا ذکر نسیم سے کیا۔

"ریحانہ ایک معمہ ہے۔ آخر اب اتنی بیگانہ وشی کیوں؟"

"وہ جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے۔ راّنو نہیں چاہتی کہ آپ کے لئے بوجھ بنے۔"

"راّنو اور میرے لئے بوجھ! اس کا یہ احساس میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ریحانہ نے اس بات کا اظہار کیا ہے؟"

"شہاب صاحب! آپ لوگ اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ عورت کے ایثار میں اس کا پندار چھپا ہوا ہے۔ راّنو اپنے دل پہ پتھر کی سِل رکھے ہوئے ہے۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں خوب سمجھتی ہوں کہ وہ قلب کی ناقابل علاج بیماری کی حالت میں آپ پر بارگراں بن کر اپنے کو ہلکا کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی محبت کو بھی اپنی خودی پہ قربان کر سکتی ہے۔"

"تم عورتیں!" شہاب کراہا۔

"محبت بے وقعت ہو کر محبت ہی نہیں رہتی، محض نوازش و کرم ہو کر رہ جاتی ہے یا حقارت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

"نسیم! محبت، حقیقی محبت کو زوال ہو ہی نہیں سکتا۔" شہاب نے بڑے جذبے سے کہا۔

"آپ جراحتِ دل کے ماہر بن رہے ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دل میں صرف خون ہی نہیں ہوتا۔" نسیم نے بیدار شعور کے ساتھ جواب دیا۔

دھوئیں کے دائروں میں ماضی حال کے لمحات کا زنجیری بنتا رہا۔ شہاب دور کی نیلی پہاڑیوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی نم اسکرین

کو دیکھے۔

شہاب نے نسیم کے لب و لہجے کے پیچھے جھانک کر دیکھا تھا۔ اُس نے الفاظ کے پرت اُلٹ پلٹ کر حرفوں کی سیڑھیوں کی مدد سے معنی کے تہہ خانوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا نسیم مثلث محبت کا ایک زاویہ تھی؟ کچھ دنوں سے شہاب ایسا محسوس کر رہا تھا اور اس گفتگو کے بعد اُسے نہ ریحانہ کا رویہ سمجھ میں آیا اور نہ نسیم کی تشریح۔ تشریحیں معنی کو مستور کر دیتی ہیں۔ وہ الجھتا رہا تھا۔ وہ اُلجھتے اُلجھتے مزید تعلیم و تجربے کے لئے انگلستان واپس لوٹ گیا تھا۔

حادثاتِ زمانہ نے شہاب کے خاندان کو پاکستان پہنچا دیا۔ ریحانہ کا خاندان بھی ہجرت کر چکا تھا۔ صرف ایک شادی شدہ بہن ہندوستان میں رہ گئی تھیں۔ بہنوئی انجینئر تھے۔ ریحانہ عموماً ہندوستان ہی میں رہتی تھی۔

شہاب نے شادی نہیں کی اور اپنے فن میں غرق ہو گیا۔ ماہ و سال گذرتے گئے اور وہ امراضِ قلب اور جراحتِ دل میں مہارت حاصل کرتا رہا۔ یہ فن اُس کا مشغلہ بھی تھا اور مسئلہ بھی، مقصد بھی اور راحت بھی۔ ریحانہ کی محبت اور اس کے دل کے علاج کی فکر اُسے قوتِ عمل عطا کرتی رہی۔ اور اب جبکہ شہاب ایک بہت ہی معیاری کارڈیک کلینک کا ہدایت کار بن کر قلب کی سرجری میں عالم گیر شہرت کر چکا تھا۔ وہ اس درد میں غلطاں تھا کہ اُس سے کنارہ کش ریحانہ پھر اُس کی طرف مائل ہو جائے۔ اُس کی گم شدہ جنت کی بازیابی ہو۔ لیکن ریحانہ صرف شہاب ہی سے نہیں زندگی سے بھی بیزار ہو چکی تھی۔

شہاب کو جنوبی افریقہ بلایا گیا تھا۔ امراضِ قلب کے مشہور اسپتال میں تبدیلیٔ قلب کا اہم اپریشن ہونے والا تھا۔ ایک موت کی سزا پانے والے حبشی نے ایک سفید فام نسل کے بیمار مایۂ ناز کے لئے اپنا صحت مند دل پیش کیا تھا۔ شہاب وہاں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا اُس نے سوچا، شاید دل بدل جانے سے سفید و سیاہ کا فرق مٹ جائے۔ ملکوں کی تقسیم سے زیادہ الم ناک رنگ و نسل، چھوت اچھوت اور طبقات کی تقسیمیں ہیں۔ کاش دُنیا والوں کے دل صحت مند ہو جاتے!

پیچیدہ خیالات اور موج در موج جذبات اُس کے وجود میں اُبلنے لگے۔ اور ایک تیز لہر اُٹھی۔ ان موجوں کے درمیان اُس کے ارادے کی چٹان اُبھری۔ وہ ریحانہ کے دل کو ضرور بدلے گا۔ وہ اپنے اسپتال میں تبدیلیٔ قلب کا آپریشن کرے گا۔ محبوب ہستی کو موت کے پنجے سے چھڑائے گا۔

شہاب اب تک دریچے کے مقابل کھڑا تھا۔ کئی سگرٹوں کی راکھ لمحاتِ ماضی کی طرح گرتی اور بکھرتی رہی —اُمڈتے ہوئے خیالات و جذبات کے گردابوں میں وہ گھرا رہا۔

ریحانہ پٹنے میں تھی۔ افریقہ سے واپس آکر اُسے پشاور لانا تھا۔ کیا وہ اس میں کامیاب ہو سکے گا؟ اتنے بڑے آپریشن کے لئے لوگ راضی ہوں گے؟ خود ریحانہ موت کی آغوش سے نکلنا پسند کرے گی؟ موت شہاب کی رقیب تھی۔ وہ اُس سے نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

ریحانہ کے ساتھ شہاب کو اپنا آبائی وطن یاد آیا، پیارا پٹنہ یاد آیا، پادری کی حویلی یاد آئی۔ اور بہت سے دریچے، کاشش، اُس کے دل میں رینگنے لگے۔

ریحانہ اپنے دل کے زخموں کے مقابل تصوّرات کے صد پہلو آئینے رکھتی اور انھیں چشمِ تخیّل سے دیکھتی رہی۔ برسوں اُس نے شہاب کی محبت کے صنم تراش کر اپنے دل کے مندر میں سجائے تھے اور اس کے جذبات اُن کی پوجا کرتے تھے۔ لیکن بیماری کے شدید حملے کے بعد اپنے صنم خانے کے دروازوں کو بند کر دیا تھا۔ اور اُسی کے اندر دھونی رما کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ شہاب کی شبیہہ کو پوجتی تھی اور شہاب سے روگرداں تھی۔ اسی لیے وہ پاکستان میں بہت کم قیام کرتی تھی۔ زیادہ تر ہندوستان میں رہتی تھی۔

پارہی کی حویلی ٹوٹ کر نئے سرے سے بن رہی تھی۔ ہمسایہ گھنیرے درختوں پہ فاختاؤں کی نئی نسلیں رین بسیرے کے لئے مسلسل آتی رہیں۔ مگر زرد مکان کے مکین نئے بسیروں کی تلاش میں چاروں اور بکھر گئے تھے۔ اُس گھر کی کئی کنواریاں اور کنوارے اب تک اُسی عالم میں تھے لیکن بعض کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ نسیم نے بڑی حقیقت شناسی سے کام لے کر مثلث محبت کو توڑ دیا تھا اور اُس پنجرے سے آزاد ہو کر ایک خوبصورت پنچھی کی طرح اُڑ گئی تھی۔ شہاب اُس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ لہٰذا اُس نے ایک فوجی افسر سے شادی کر لی۔ لیکن رفعت اور علی وارث نے ابدی رہبانیت قبول کر لی تھی۔ رفعت بڑھاپے کے قلعے میں پناہ گزیں ہوئی اور علی وارث زندگی کی کڑی دھوپ میں گھٹتا پگھلتا رہا۔ مگر دونوں شہاب کے راستے کی رکاوٹ تھے۔

دھوئیں کے مرغولے فضائے بسیط میں تحلیل ہوتے رہے۔ کئی سگرٹ ختم کرکے شہاب ایک عزمِ تازہ کے ساتھ ناشتے کی میز پہ آ بیٹھا۔ اُس نے دو اُبلے ہوئے انڈے اور دو ٹوس کھائے۔ کافی کی دو گرم گرم پیالیاں پئیں۔ اُس کے پُر وقار چہرے پر صحت مند خون خوش فعلیاں کرنے لگا۔ اس کا ارادہ اور قوی ہو گیا۔ بڑی طمانیت سے اُس نے فیصلہ کیا کہ افریقہ سے واپس آ کر وہ ریحانہ کو اپنے اسپتال میں لا کر رکھے گا اور پشاور کے صدر اسپتال کے تعاون سے تبدیلیٔ قلب کا اپریشن وہ خود کرے گا۔ سگرٹ کے کش لیتے ہوئے شہاب اپنے کلینک کی طرف بڑے اعتماد سے روانہ ہو گیا۔

جب شہاب تبدیلیٔ قلب کے اپریشن میں شریک ہو کر افریقہ سے کامیاب و کامران پشاور واپس آیا تو اُسے ریحانہ کی شدید علالت کی خبر ملی۔ وہ ہندوستان میں تھی۔ شہاب طیارے سے پٹنہ پہنچا اور ریحانہ کا علاج اور دیکھ بھال شروع کر دی۔ دل کا بدترین دورہ پڑا تھا۔ لیکن وہ جانبر ہو گئی۔ یہ فن کا نہیں محبت کا معجزہ تھا۔ شہاب دو ہفتے پٹنے میں رہا اور اُس نے چٹانوں کو پگھلا لیا۔ اُس نے ریحانہ کے بھائی بہنوں کو سمجھایا کہ تبدیلیٔ قلب کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں۔ کسی وقت دوسرا دورہ پڑے گا اور وہ چل بسے گی۔ سارے اعزّا جمع ہو گئے تھے۔ علی وارث بھی شہاب سے متفق ہو گیا مگر رفعت نے شدید مخالفت کی۔

"یہ زندگی ہے۔ ریحانہ کو چین سے مرنے دو۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔ تقدیر ہوئی تو وہ بچ رہے گی۔"

آخرش ایک دن شہاب نے ریحانہ سے بڑی محبت اور اعتماد کے ساتھ بات کی۔

"رانو! تم خود بار بار کے دوروں اور مستقل طور پر بارِ بستر رہنے سے اُکتا چکی ہو۔ اپریشن سے تم بالکل اچھی ہو جاؤ گی۔"

ریحانہ نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تم میری محبت سے باز نہ آئے تو کیا میرا دل بدلنے کے ارادے سے ٹل جاؤ گے۔ تم جیتے میں ہاری شہاب! میری زندگی، میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میرا مالک جو چاہے کرے۔ میں اپریشن کے لئے خوش دلی سے راضی ہوں۔"

شہاب کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور اُس نے ریحانہ کے لب و رخسار بیتابانہ چوم چوم لئے۔

"میری رانو! میری رانو!"

ریحانہ محبّت کے شہپروں کے سہارے زندگی اور موت سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

"سَر! میں نے کالج میں مس ریحانہ کے آرام کے سارے انتظامات کر دیئے ہیں۔"

"شکریہ مس ایلس! اور اُن کے تیمارداروں کے لئے؟" شہاب نے دریافت کیا۔

"جی ہاں؟" سب کے لئے۔" مس ایلس نے جواب دیا۔

"اور مس ایلس ہی ریحانہ کے علاج معالجے کی انچارج بھی ہیں۔" شہاب نے خوش دلی سے کہا۔

"میں تو حکم کی بندی ہوں۔ ویسے مجھے مس ریحانہ سے محبت ہوگئی ہے۔ میں اُن کے لئے سب کچھ کروں گی۔"

"مس ایلس! یہاں ہم سب لوگ پارٹنر ہیں۔ حاکم کوئی نہیں۔"

شہاب نے پیار سے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ مسٹر ایلس بڑے سکون کے ساتھ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

شہاب نے ریحانہ کے قلب کی تبدیلی کے آپریشن کے لئے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اُس نے بار بار اپنے شرکائے کار محمود، ہلوتا، بینرجی، ایلس وغیرہ سے مشورے کئے۔ پشاور کے صدر اسپتال کی دو ٹربن بھی بلائیں اور اپنے کارڈی آک کلینک میں ایک اعلیٰ درجہ کے جنرل ایمرجنسی سرجیکل وارڈ کی تنظیم بھی کی۔ اُس نے امریکہ، انگلستان اور جنوبی افریقہ کے چند ماہرین سے تیار رہنے کی درخواست کی جو اس کے ہم مشرب سرجنوں نے منظور کر لی۔ کیبل گرام کے ذریعہ انٹرنیشنل اہمیت رکھنے والے سرجنوں سے مشورے ہوتے رہے۔ دل کے آپریشنوں کی رپورٹوں کا مطالعہ کیا جاتا رہا۔

دوسری طرف ریحانہ کی صحت کو بہتر بنانے کے سارے جتن مسٹر ایلس کی نگرانی میں ہوتے رہے۔ اُس کے دل بہلانے کے لئے انتظام ہوا۔ انڈور رنگیم قسم قسم کے — ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم پروجکٹر وغیرہ منگوائے گئے۔ مسٹر ایلس ریحانہ پر جان چھڑکتی تھی۔ شہاب زیادہ سے زیادہ وقت ریحانہ کے پاس گذارتا۔ اکثر ریحانہ، شہاب اور مس ایلس تینوں مل کر کوئی کھیل کھیلتے، کتابیں پڑھتے اور سناتے، طرح طرح کی دلچسپ باتیں کرتے اور اپنی دُنیا میں مگن رہتے۔

شہاب آپریشن کی نقشہ بندی، تفصیلات کے تعین اور طریقۂ کار طے کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ اپنے شرکائے کار کو ہدایات دیتا، اُن سے مشورے لیتا اور آپریشن کی ٹکنیک کی بار بار وضاحتیں کرتا۔

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تبدیلیٔ قلب کے لئے کسی بدحال مریض کی موت کا انتظار کرنا صحیح طریقہ نہیں۔ پھانسی پانے والے مجرم کا انتخاب بھی مناسب نہیں۔ اس کے دل پر سخت خوفناک قسم کا نفسیاتی دباؤ پڑتا ہے۔ دونوں حالتوں میں دل کے رگ و ریشے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ وہ دوسرے جسم میں منتقل ہوکر اُس کی دمسازی اچھی طرح نہیں کر سکتے۔" شہاب نے اپنی ٹیم کو سمجھایا۔

"آپ کے خیال میں کون سی صورت سب سے بہتر ہے؟" مسٹر ایلس نے سوال کیا۔

"ماہرینِ قلب کی اکثریت حادثوں کے شکار صحت مند لوگوں کو ترجیح دیتی ہے۔ میں اُن سے متفق ہوں۔ اگر کسی جانبار مجروح

کا دل حاصل ہو سکے تو بہت سازگار ہوتا ہے۔ ورنہ جو میسر ہو۔ دماغی تھرومبوسس کے کیس بھی بُرے نہیں ہوتے۔ اُن کے دل بھی کام کے ہوتے ہیں۔" سرجن شہاب نے تشریح کی۔

"ظاہر ہے کہ آپریشن شیڈیول کو لچک دار ہونا چاہیئے اور کئی "بدل" مدِ نظر ہونے ضروری ہیں۔" سرجن محمود بولا۔

"بالکل صحیح! انتظار اور احتیاط! یہ ہمارا قول ہے۔" شہاب نے کہا۔

"اگر کسی مہلک بیماری کا مریض زندگی سے بیزار ہو کر مزید اذیت سے بچنے کے لئے اپنا دل عطا کرے تو آپ اسے قبول کریں گے؟" سرجن ملہوترا نے سوال کیا۔

"کیا قبل از وقت؟" بنرجی بول اُٹھا۔

"بڑا نازک مسئلہ ہے۔ تبدیلیٔ قلب کے آپریشنوں کے باب میں کئی اخلاقی سوال پیدا ہوں گے۔" شہاب نے وضاحت کی۔

شہاب کے سب ساتھی اُس پر جان چھڑکتے تھے۔ پچھلے چند سالوں میں سسٹر ایلس بڑی جذباتی گہرائی سے شہاب کو چاہنے لگی تھی۔ وہ ایک تیس سالہ، دراز قد، نازک اندام، نیلی آنکھوں والی انگریز خاتون تھی۔ بڑی حسین اور متوازن۔ اُس نے اپنی زندگی شہاب کے اسپتال کے لئے وقف کر دی تھی اور نفسیاتی طور پر اپنے کو اُس عظیم سرجن کی شریک حیات سمجھنے لگی تھی۔ مگر پاس وضع نے محبت کی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بننے نہ دیا تھا۔ شہاب مس ایلس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ نہایت خلوص، جوش اور جذبے سے کام کیا کرتی تھی۔ شہاب کے گھر کی دیکھ بھال میں بھی منہمک رہتی اور اُس کے کنوارے پن پر کُڑھتی رہتی تھی۔ شہاب ایلس کے لئے مسیحا کی طرح تھا۔ کنوارا، پاکباز، دردمند نجات دہندہ۔ اور ایلس مادر ایلس ایک مقدس نن تھی۔

جب ریحانہ کلینک میں آئی تو ایلس کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ کوئی شہاب کا پرستیدۂ تمنا بھی ہے۔ لیکن اُس کے جذبۂ پرستش میں کوئی فرق نہ آیا۔ شہاب مسیحا کا روپ تھا۔ مسیح کے لئے اَنگنت کنواریاں اپنی زندگی وقف کر دیتی ہیں۔ ایلس نے اپنے اندر کی عورت کو دل کی خانقاہ میں بٹھا دیا اور صلیب گلے میں ڈال لی۔ خدا محبت ہے۔ محبت مسیح ہے۔ مسیح محبوب ہے اور محبوب سے وابستہ ہر شے پیاری۔ ایلس ریحانہ کو عبادت کے انداز میں چاہنے لگی۔

سرجن شہاب اپنے اسپتال کے ہر کارکن کا مکمل طبی معائنہ کراتا رہتا تھا۔ اُس نے اُن کے خون کے گروپوں کا تعین بھی کر لیا تھا۔ اسپتال میں ہر قسم کے اعداد و شمار اور ہر نوع کی طبی اطلاعات کا باضابطہ ریکارڈ موجود تھا۔ مریضوں کے متعلق بھی ہر ضروری اطلاع حاصل کر لی جاتی تھی۔ ریحانہ کا طبی معائنہ اور ہر طرح کی جانچ باقاعدہ رنگ میں کر لی گئی تھی۔

"ریحانہ ہمارے دل کس طرح مل گئے ہیں! دیکھو ہمارا بلڈ گروپ بھی ایک ہی ہے۔" ایلس نے ریحانہ سے کہا۔

"مجھے بے حد خوشی ہے کہ ہم دونوں اتنے گھل مل گئے ہیں۔ کاش ہم لوگ ہمیشہ گلے ملے رہیں۔" ریحانہ بولی۔

منصوبہ کے شیڈیول کے مطابق آپریشن کا مہینہ قریب آ گیا تھا۔ ہمہ جہتی طور پر تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں۔ چند مریضوں اور پھانسی پانے والے قیدیوں کو بھی چُن لیا گیا تھا۔ پشاور اسپتال اور جیل سے رابطہ قائم تھا۔ حکومت سے باقاعدہ اجازت لے لی گئی تھی اور متعلقہ اشخاص سے ضروری اجازت نامے بھی حاصل کر لیے گئے تھے۔ لیکن شہاب حادثات کی طرف لَو لگائے ہوئے تھا۔ وہ تبدیلیٔ قلب کے لئے حادثات میں ہلاک

ہونے والوں کو ترجیح دیتا تھا۔ آپریشن کی صحیح تاریخ تو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ عمل سارے حالات کی سازگاری پر منحصر تھا۔ تاہم شہاب نے ایک مہینہ متعین کر لیا تھا۔ اس بات کا علم سوائے اُس کے اور کسی کو نہ تھا۔ مسٹر کائے کار کو اُس نے تین مہینے کی مدت کی خبر دی تھی۔ اس دوران میں کبھی آپریشن ہونے والا تھا۔ پندرہ دن قبل خاص ماہرین کو اطلاع دے دی گئی۔ لیکن صرف یہ بتایا گیا کہ فلاں تاریخ سے مقررہ مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ بیرونی ممالک کے ماہروں کو بھی بلوا لیا گیا۔ سارے انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ ریحانہ کو ایک عام اطلاع دی گئی کہ اُس کے آپریشن کا وقت قریب آ رہا ہے۔ مسٹر ایلس اُسے نفسیاتی طور پر تیار کرتی رہی۔ اُسے بتایا گیا کہ تبدیلی قلب کا آپریشن اب کثرت سے کامیاب ہونے لگا ہے۔ شہاب کی مہارتِ فن پر ریحانہ کو اٹل اعتماد تھا۔

ایک ہفتہ کی مدت مقرر کر لی گئی اور حادثات کے شکار اشخاص کی تیزی سے تلاش کی جانے لگی۔ دو مرتبہ "بدل" بھی قطعی طور پر منتخب کر لئے گئے۔ تین شدید قسم کے مجروحین مل گئے۔ تینوں کو کلینک کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کر لیا گیا اور اُن کا علاج شروع ہو گیا۔ ہر طرح کی جانچ کر لی گئی۔ آپریشن تھیٹر اپنے جدید ترین ساز و سامان کے ساتھ تبدیلی قلب کے آپریشن کا منتظر تھا۔ مصنوعی دل، میکانکی پھیپھڑے اور گردے مناسب جگہوں پر سیٹ کر دیئے گئے۔ بلڈ پلازما اور ٹرانسفیوژن کے ساز و سامان تیار تھے۔ بیہوش کرنے والی دوا کے آلات، آکسیجن سلنڈر اور ہر قسم کے ضروری اوزارِ جراحت موجود تھے۔ ماہرینِ فن ہر وقت چوکس رہتے تھے۔

مجروحوں کا علاج معالجہ بڑی دیانت داری اور توجہ سے ہوتا رہا۔ ایک اچھا ہونے لگا۔ دوسرے کی حالت دو بدھ کی تھی۔ تیسرے کا حال بُرا تھا۔ حادثے میں خون بہت بہہ گیا تھا اور دوبارہ خون چڑھانے کے باوجود وہ ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ اندازہ تھا کہ وہ ایک دو روز کا مہمان ہے۔

تیسرے مجروح کی حالت بگڑتی گئی۔ شہاب نے طے کر لیا۔ اس تیسرے شخص کی جانچ سے یہ پایا گیا کہ تبدیلی دل کے لئے یہ نہایت موزوں ہوگا۔

شہاب نے اپنے سارے رفقا کو آگاہ کر دیا کہ اگلے تین دنوں میں سے کسی دن تبدیلی قلب کا آپریشن ہوگا۔ سب لوگ پورے طور پر تیار رہیں۔ پشاور کے مرکزی جیل اور اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ سے فون کے ذریعے 'بدل' کے تعین کے لئے باتیں کی گئیں۔ تفصیلات طے کرنے کے لئے شہاب نے کاغذات تیار کئے اور انھیں ایلس کے حوالے کر دیا کہ کسی کو پشاور روانہ کر دے۔ وہ خود آپریشن تھیٹر کی آخری دیکھ بھال میں مشغول ہو گیا۔

ایلس شہاب کے کاموں کو اپنا کام سمجھتی تھی۔ اُس نے انتہائے اخلاص میں کلینک کی جیپ نکالی اور تمام کاغذات لے کر پشاور کو روانہ ہو گئی۔ اُس کے ذہن کے اوراق میں بھی نہ جانے کتنی شعوری و لاشعوری تحریریں مستور تھیں۔

سہ پہر کو پشاور صدر اسپتال کے بڑے سرجن کا فون آیا۔ ایلس کہساروں میں حادثے کا شکار ہو گئی۔ اُسے اسپتال میں داخل کر لیا گیا ہے۔ شہاب پر بجلی گری۔

سارے کلینک میں کھلبلی مچ گئی۔ شہاب کے ساتھ محمود، بینرجی اور مہوترا بھاگم بھاگ پشاور اسپتال پہنچے اور سیدھے آپریشن تھیٹر کی طرف دوڑ پڑے۔ ایلس کو بے ہوشی وارڈ اسٹریچر پر تھیٹر سے باہر لایا جا رہا تھا۔ سب بیتابانہ اسپیشل سرجیکل وارڈ کی طرف

چل پڑے۔

"کھوپڑی پر سخت چوٹ ہے۔ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ لیکن دماغ پر کتنی گہری ضرب پڑی ہے کیا معلوم"۔

انچارج سرجن نے شہاب سے کہا۔

"شکریہ سرجن! آپ سب لوگوں کا شکریہ۔ آپ نے ایک نہایت قیمتی جان بچائی ہے"۔

شہاب بڑے گہرے تشکر سے بولا۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ پیاری روح ہماری تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لئے کب تک رہے۔ خوبصورت قالب میں رہے گی"۔

سرجن فریدی نے کہا۔ سب متفکر آگے بڑھتے رہے۔

رات بڑی تشویش میں کٹی۔ کلینک کے سب سرجن پشاور اسپتال ہی میں رہے۔

"شکر خدا کا! جیپ اُس وقت اُلٹی جب کھاٹی کا آخری نچلا ڈھلوان آچکا تھا۔" محمود نے سگرٹ انگلیوں میں دبائے ہوئے کہا۔

"ایلس بچ جائے گی۔ لیکن اُس نے یہ خطرہ مول کیوں لیا۔ ویسے وہ ڈرائیونگ اچھی طرح جانتی ہے" بینرجی بولا۔

"پُرپیچ گھاٹیوں میں موٹر ڈرائیو کرنا موت سے آنکھ مچولی کھیلنا ہے۔" ملہوترا نے فکرمند انداز میں کہا۔

"ایلس کو فرض شناسی کا گہرا احساس ہے۔ ہم لوگ آپریشن کی تیاری میں مشغول تھے۔ اُس نے ہم میں سے کسی کو ساتھ لینا مناسب نہ سمجھا اور وہ ریحانہ کو بے حد چاہنے لگی ہے۔ محبت و فرض کے دوہرے جوش میں وہ تنہا نکل کھڑی ہوئی۔" شہاب بولا۔

"ٹینک کا ڈرائیور تو موجود تھا۔" بینرجی نے اظہارِ خیال کیا۔

"شکر ہے کہ وہ بچ گئی۔" ملہوترا نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہوا۔" محمود بولا۔

صبح پُرامید اور روشن تھی۔ ایلس کو ہوش آتا جا رہا تھا۔ شام تک اُس کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔ لیکن ایلس بالکل بے ربط باتیں کرتی رہی۔ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ خون بہت ضائع ہوا ہے۔ بلڈ ٹرانسفیوژن کے باوجود نقاہت باقی ہے۔ اسی لئے دوران بے ہوشی کا اثر ابھی تک دور نہیں ہوا۔

"میری اچھی! میری اچھی! سرجن!.... اور پُرپیچ راستہ.... زندگی کا پُرپیچ راستہ! دور نیل آسمان... بلیڈ میری...... شہاب! او کرائسٹ! مائی لارڈ......"

ایلس ہذیانی کیفیت میں مبتلا تھی۔

تبدیلیٔ دل کا آپریشن ایک ہفتہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ ایلس کی طرف سے ذرا اطمینان ہونے کے بعد کوئی تاریخ مقرر ہونے والی تھی۔ اُمید بندھی تھی کہ ایک دو دنوں میں ایلس اچھی ہو جائے گی۔ مگر اُس کی حالت ذرا سنبھلتی اور پھر بگڑ جاتی۔ سانحہ کے چوتھے دن اس کی آواز بہت نحیف ہو گئی اور جب وہ بے ہوشی سے ذرا ہوش میں آتی تو دو چار ہذیانی جملے دھیمی آواز میں بولتی اور خاموش ہو جاتی۔ پانچویں دن صبح کو ایلس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ شہاب پاس بیٹھا تھا۔ وہ قریب تر گیا۔ ایلس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں بہت

دھیمے سے کہا۔

"کرائسٹ! سیو مائی سول! میری سیو مائی ہارٹ! اٹیچی! ڈائری! او گاڈ!۔۔۔ ہاؤ گرین واز مائی ویلی!۔۔۔ شہاب! سرجن شہاب! مائی تو! سیو مائی ہارٹ! گاڈ از تو!۔۔۔۔!"

ایلس نے نیم بے ہوشی میں کئی بار اپنی اٹیچی کا ذکر کیا تھا۔ شہاب نے وہ اٹیچی منگوائی جو حادثے کے وقت جیپ پر بھی ایلس کے ساتھ تھی اور اسے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ کلینک کے سرجنوں کے سامنے اٹیچی کھولی گئی۔ ساری اشیا کا جائزہ لیا گیا۔ ڈائری کا سرسری معائنہ بھی ہوا۔ یادداشت کے صفحات میں پہلے صفحے پر سرخ روشنائی سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی:۔

"میرے سینے میں ریحانہ کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ اُس کی امانت ہے۔ شاید میرا دل ریحانہ کے پاس ہے یا اُس کے پاس جس نے ریحانہ کا دل لے لیا ہے۔

اگر میں جلد کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں تو ریحانہ کی امانت اُسے واپس دے دی جائے۔ یہ میری وصیت ہے۔"

حادثے سے قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے کی تاریخ کے ساتھ ایلس کے دستخط تھے۔

شہاب پر اس عبارت کو پڑھ کر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے جذبات کے موتی برسنے لگے۔

آخر بہت بڑا فیصلہ کر لیا گیا۔ ایلس کسی طرح سے جانبر نہ ہو سکی۔ سہ بارہ بلڈ ٹرینسفیوژن کیا گیا۔ جانچ کے بعد دوسری دفعہ خود شہاب نے ایلس کے لئے اپنا خون پیش کیا۔ خون کافی مقدار میں چڑھایا گیا۔ ساری کوششیں کر لی گئیں لیکن کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ ایلس جاں بحق تسلیم ہو گئی اور محبت ہی حق ہے۔

"اگر جی اُٹھنے پر ایمان ہو تو صلیب پر مرنا اتنا بڑا المیہ نہیں۔"

پشاور کے صدر اسپتال کے بڑے سرجن نے کہا:۔

"اور مریم نے بھی اپنی صلیب آپ اُٹھائی۔ وہ اُس پر شہید ہو کر دوبارہ جی اُٹھے گی۔"

شہاب نے بڑے دردناک عزم کے ساتھ جوشیلے انداز میں کہا اور فیصلے کا دن آ گیا۔

ایلس کے پاک دل کو تکنیکی مہارت کے ساتھ فی الفور اُس کے سینے سے نکال لیا گیا۔ ماہرین نے اُسے کیمیاوی سیال سے لبریز جار میں بند کیا۔ اس میں بجلی کی تاریں اور آکسیجن پہنچانے والی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا۔ بڑے اہتمام کے ساتھ اس دلِ زندہ کو شہاب کے کلینک میں پہنچا دیا گیا۔ اسی رات کو تبدیلیٔ قلب کے آپریشن کی گھڑی مقرر ہو گئی اور ایلس کے مقدس جسم کو پھولوں سے ڈھک دیا گیا۔ دوسرے روز تجہیز و تکفین ہونے والی تھی۔

رات کو طے شدہ پروگرام کے مطابق ریحانہ کا آپریشن عمل میں آیا۔ ماہرین نے دو "قلبِ زندہ" اور حاصل کرے۔ ایک مرکزی جیل میں پھانسی پانے والے مجرم کا تھا اور دوسرا کلینک کے ایمرجنسی سرجیکل وارڈ میں مر جانے والے ایک مجروح کا۔ تینوں دلوں کے رگ و ریشے کی مکمل کیمیاوی اور خوردبینی جانچ ہوئی۔ ریحانہ کا صدر چاک کر کے محاذِ قلب کا پورا معائنہ کیا گیا اور قلب کے رگ و پے کے ضروری امتحان ہوئے۔ ایلس کا دل ریحانہ کے لئے سب سے بہتر ثابت ہوا۔ ان دونوں میں بڑی مماثلت تھی۔

"انسانی مماثلتوں کے لئے رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں - بیبز آجی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

ریحانہ کا ماؤف دل نکال لیا گیا - اس کے ورید و شریان کو مصنوعی میکانکی دل سے عارضی طور پہ منسلک کر دیا گیا۔ مصنوعی دل میں بلڈ پلازما بھرا ہوا تھا اور وہ بجلی سے حرکت کرتا تھا - ایلس کے قلب کو جار کے کیمیاوی سیال سے نکالا گیا - اُس پہ کچھ ضروری سائنسی عمل کئے گئے اور اسے ریحانہ کے سینے میں نصب کر دیا گیا اور بڑی ہنرمندی سے ریحانہ کے ورید و شریان کے سلسلے مصنوعی دل سے کاٹ کر ایلس کے دل کے ورید و شریان سے ملا دیئے گئے - اب ایلس کا دل ریحانہ کا دل تھا - اور دیکھو وہ دھڑک رہا تھا - شہاب کے ہاتھوں معجزہ ظاہر ہُوا -

آپریشن کامیاب ہُوا - آپریشن کے بعد کی ساری احتیاطیں برتی گئیں - دوسرے دن شام کو ریحانہ اُس وقت ہوش میں آنے لگی جب کلینک کے قریب ایک سرسبز مرغزار میں ایلس کے مقدس جسم کو سپرد خاک کر کے شہاب اور چند دوسرے سرجن گردنیں جھکائے آبدیدہ واپس آئے -

اور ایلس جی اٹھی!

ریحانہ آپریشن کے چھ مہینے تک کلینک میں رہی - اُسے دو ماہ بعد بستر سے اُٹھنے کی اجازت ملی اور تیسرے مہینے وہ تھوڑا تھوڑا چلنے پھرنے لگی - اُس نے آپریشن کے چند ہی دنوں کے بعد پوچھنا شروع کیا کہ ایلس کہاں ہے - وہ ایلس کے لئے بے چین رہنے لگی - اسے بتایا گیا کہ آپریشن کے دوسرے روز انگلستان سے کیبل آیا کہ ایلس کی ماں بستر مرگ پر ہے - اسی وجہ سے وہ بذریعہ طیارہ ولایت چلی گئی - اس اطلاع کے باوجود ریحانہ ایلس کی راہ تکتی رہی - وہ بار بار ایلس کے بارے میں شہاب سے پوچھتی - اس کی ماں کی خیریت دریافت کرتی اور فکرمند رہتی -

شہاب جب بھی ریحانہ کو دیکھتا - اُس کا دل تیز چلنے لگتا اور اکثر اس کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں - ریحانہ سمجھتی مسرت کے آنسو ہیں محبت اور فن کی فتح کی خوشی - لیکن ان آنسوؤں میں ایلس کی المناک محبت کا درد بھی شامل تھا - شہاب ریحانہ کے دل کا معائنہ کرتا تو اُس کی دھڑکنوں میں ایلس کے پیار کی آواز سُنتا - وہ بہت مسرور ہوتا کہ ریحانہ زندہ ہے اور بے حد رنجیدہ کہ ایلس اب زندہ نہیں لیکن اسے یہ احساس ذرا مطمئن کر دیتا کہ ایلس کا دل ریحانہ کے سینے میں زندہ ہے اور اس کی محبت کی پرورش کر رہا ہے - محبت غیرفانی ہے -

ریحانہ کے رشتہ داروں نے اُسے لاہور لے جانا چاہا - رفعت اور علی وارث لے جانے پہ مُصر تھے - شہاب کہتا تھا کہ کلینک سے باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے - آخرش وہ راضی ہو گیا اور اُس نے مشورہ دیا کہ خاص طیارہ کے ذریعہ طبی نگہبانی میں ریحانہ کو لے جایا جائے - اور وہ خود اسے پہنچا آیا -

ریحانہ لاہور میں بخیر و خوبی تین مہینے رہی - شہاب پشاور سے آکر اُسے ہر ہفتہ دیکھ جاتا تھا - وہ مطمئن تھا - اُس نے بار بار لوگوں کو تنبیہہ کی تھی کہ ایلس کی موت کی خبر اور تبدیلیٔ قلب کی تفصیلات اُسے ہرگز نہ بتائی جائیں -

ریحانہ کو حیرت تھی کہ ایلس نے ولایت سے کوئی خط نہیں لکھا اور اس کی خیریت نہیں پوچھی - اُس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ایلس اُسے

کبھی بھول سکتی ہے۔

ایک دن پُرانے میگزین کے اوراق الٹتے ہوئے ریحانہ کو ایلس کی تصویر نظر آئی۔ اُس رسالے میں تبدیلیٔ قلب کے آپریشن کی تفصیل بڑے فخر سے پیش کی گئی تھی۔ مضمون مُصوّر تھا۔ سرجن شہاب، ریحانہ، ماہرین کی جماعت اور مسز ایلس کی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ ریحانہ اصل حقیقت کی تاب نہ لاسکی اور بے ہوش ہوگئی۔ مقامی ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ شہاب کو تار دیا گیا۔ بہت دیر کے بعد ریحانہ کو ہوش آیا۔

"ایلس ایلس! میری جان ایلس!"

ریحانہ دردناک طور پر سسکتی رہی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ بڑی نازک حالت سے گذر رہی ہے۔ اُس پر تشنجی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔

شہاب اپنے کلینک کے ڈاکٹروں سمیت لاہور چارٹرڈ پلین سے پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ ریحانہ کے کمرے میں داخل ہوا وہ اُٹھ بیٹھی اور اپنے بازو پھیلا کر روتی ہوئی بولی۔

"شہاب! میری ایلس!"

اور پھر وہ بستر پہ ڈھیر ہوگئی۔

شہاب اور اُس کے رفقا نے لاکھ جتن کئے مگر ریحانہ کی حالت خراب ہوتی گئی دوسرے دن ریحانہ کے قلب کی حرکت بند ہوگئی اس کے سینے میں مکین ایلس کا دل رُک گیا۔ شہاب دودھاری تلوار کی جاں سوز جراحت سے تڑپتا رہ گیا۔

رفعت اور علی وارث کی مخالفت کے باوجود شہاب ریحانہ کی لاش پشاور لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ کلینک کے قریب ہی ایلس کی قبر کے پاس مرغزار میں ریحانہ کو پھول اور آنسوؤں کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

نارڈی اک کلینک کے رفقا شہاب کی طرف سے بیحد متردد و پریشان تھے۔ وہ دُنیا سے بے خبر قبروں کے پاس دھونی رمائے بیٹھا رہتا۔ اشعار پڑھتا اور تبدیلیٔ قلب و جراحتِ دل پر مختلف لٹریچر کا گھنٹوں مطالعہ کرتا کبھی دور کی وادیوں اور کہساروں میں گُم ہوجاتا۔

"وہ عورت جو مرگئی جی اُٹھے گی...... اَٹ وِنٹر کمس کین اسپرنگ بی فار بیہائنڈ؟...." "کمیہ وعدے پہ ہے: سب چُھپے پیٹھے ہیں تہ خاک"..... موت زندگی ہے۔ موت موت ہی ہے..... وہ دوسری عورت جو مرگئی۔ کیا جی اُٹھے گی؟ ....

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم

تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا!

میرے دل کا آپریشن کرو محمود، ملہوترا، بنرجی! سب کے دلوں کو بدلو تاکہ ہر سینہ خالی رہ جائے آدم کے دل کو بدلو۔ حوّا کے دل کو بدلو۔ مگر دل کہاں سے آئیں گے۔ ایک پنجرا۔ ایک پنچھی!..... طائر بے قفس۔ قفس بے طائر..... آخر کام تمام کیا.....

شہاب پہروں گُم سُم نیلے کہساروں کی طرف دیکھتا رہتا۔ اُسے ہمیشہ دھڑکنے والے دل کا انتظار تھا۔

آسیب

احمد ندیم قاسمی

کمرہ بھی وہیں تھا۔ کمرے کی کھڑکی بھی وہیں تھی لیکن بڑ کا وہ درخت کٹ چکا تھا جو سید امجد حسین کا دوست اور بزرگ تھا۔ یوں تو وہ درخت اس وسیع و عریض بنگلے کے ہر حصے میں موجود تھا مگر اس کمرے کی کھڑکی کے ساتھ اس کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ اُن دنوں وہ سوچتا تھا کہ اگر بڑ کا درخت نہ ہوتا تو یہ کھڑکی کیسے ہوتی!— اور اب وہ درخت نہیں تھا مگر کھڑکی اسی طرح موجود تھی اور اس کے چہرے پر فق ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہوا کا بہت تیز جھونکا بھی بڑ کی ٹہنیوں اور پتوں میں سے گزر کر جب اس کھڑکی تک آتا تھا تو ایک سرگوشی سی بن جاتا تھا، یا صرف اتنا ہوتا تھا کہ دوسری منزل کی چھت تک پہنچی ہوئی بیل کے دل نما پتے رُخ بدل کر اس کمرے میں شریر بچوں کی طرح جھانکتے تھے اور ہٹ جاتے تھے۔ مگر اب وہ باقاعدہ اندر گھسے چلے آ رہے تھے اور دیر تک ایک جگہ رک کر یوں لرزتے تھے جیسے انہوں نے ہنسی پر ضبط کر رکھا ہے اور وہ اندر ہی اندر گنگنا رہے ہیں۔ مگر کھڑکی تھی کہ اپنا غار کا سا منہ کھولے، بے حس کھڑی تھی۔ اسے تو بڑ کے کٹ جانے کے بعد سید امجد حسین کے دل و دماغ کی طرح ایک تڑاقے کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانا چاہیے تھا۔

رات جب اس نے کھڑکی بند کر دی تھی تو چاند شیشوں کے پار اتنا اداس ہو رہا تھا کہ نیلا پڑ گیا تھا۔ صبح جب اس نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ چڑیوں کا ایک غول اوپر سے اتر کر آتا تھا اور بڑ کی پناہ گاہ نہ پا کر پھر اوپر اٹھ جاتا تھا اور شور مچاتا تھا جیسے چڑیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں کہ یہ کیا سانحہ گزر گیا۔ یہ چڑیاں سالہا سال سے ہر صبح اس بڑ پر بیٹھ کر دن بھر کی مشقت کے منصوبے بناتی تھیں۔ مگر وہ بڑ نہیں تھا تو جیسے ان کے پنجوں کے نیچے سے پورا کرۂ ارض نکل گیا تھا۔

وہ کھڑکی میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کھڑکی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ وہ اسے چنوا دے گا۔ وہ اس گھر کی ساری کھڑکیاں چنوا دے گا۔ وہ اس گھر کے دروازے اور دریچے اور روشندان سب چنوا دے گا۔ سید امجد حسین کو ایسا محسوس ہوا جیسے کٹا ہوا پیڑ اس کے اندر اُگنے لگا ہے اور اس کی شاخیں اس کی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی پھیل رہی ہیں۔ اس نے کھڑکی کو تڑ سے بند کر دیا تو بیل کا ایک پتہ کٹ کر اس کے قدموں میں لوٹ گیا۔ پھر بیل کھڑکی کے شیشوں پر سر پٹخنے لگی اور کھڑکی ہی میں سے سورج کی ایک کرن گزری اور تلوار کی طرح کمرے کو چیرتی ہوئی، سامنے کی دیوار میں گڑ گئی۔ بڑ موجود ہوتا تو باہر کی کسی بھی چیز کی مجال تھی کہ وہ اس کی تنہائی کے سکون کو متلاطم کرتی؟ بڑ نے اس کی ساری شخصیت کو اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔ اس پر بڑ کا سایہ تھا۔ بڑ اس کا آسمان تھا۔ اُن دنوں وہ سوچتا تھا کہ اگر کبھی بڑ کٹ گیا تو اس کے ساتھ ہی پورا بنگلہ ڈھے جائے گا اور وہ اس میں دب کر مر جائے گا۔ اب بڑ کٹ چکا تھا مگر بنگلہ بھی موجود تھا۔ وہ کمرہ بھی اپنی کھڑکی سمیت موجود تھا۔ حد یہ کہ وہ خود

بھی موجود تھا۔

"کیا میں موجود ہوں؟" سید امجد حسین نے آئینے کے سامنے جا کر سوچا۔

تب اس کے خد و خال پگھلنے لگے اور اس کے کندھوں پر ایک اور چہرہ نمودار ہوا اور اس چہرے نے کہا۔ "چھوڑیئے بھی ابا جی۔ اس بڑھاپے کی بڑی خوبی یہی ہے نا کہ یہ بوڑھا ہے۔ اگر بڑھاپے کے سوا اس کی کوئی اور خوبی بھی ہے تو خدارا مجھے بتا دیجیے۔ اس صورت میں مجھے اجازت دیجیے کہ ——"

"نہیں!" وہ چیخ اٹھا اور آئینے نے اس کا چہرہ اسے واپس دے دیا۔ وہ کتنا بھیانک ہو رہا تھا! اس نے اپنی اتنی خوفناک بدہیئتی کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے رگڑ دیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ رو رہا تھا!

اور اُس روز سید امجد حسین بالکل بے خیالی میں، قطعی غیر ارادی طور پر، دن بھر روتا رہا اور اسی کمرے میں پڑا اسی کھڑکی کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے: مرجانا چاہیئے یا مار ڈالنا چاہیے؟

اس نے کتنے چاؤ سے اپنے بیٹے کا نام سید سقراط شاہ رکھا تھا اور اسے ایم اے تک فلسفہ پڑھایا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک روز یہی سقراط ایک پیالے میں زہر گھول کے لایا اور بولا "دیکھیئے ابا جی۔ آپ بہت بوڑھے ہیں۔ آپ اس محل جیسے بنگلے میں بھلے نہیں لگتے۔ آپ جب لان میں آرام کرسی بچھا کر اس پر لیٹ جاتے ہیں اور ٹانگیں سامنے تپائی پر رکھ لیتے ہیں اور اخبار پڑھتے پڑھتے اسے چہرے پر پھیلا کر سو جاتے ہیں تو سنہری دُھوپ اُداس ہو جاتی ہے اور سبز باڑ کے پتوں کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور ملازم یوں دبے پاؤں گذرتے ہیں جیسے لان میں ایک میّت پڑی ہے۔ میرے خیال میں یہ بالکل غلط بات ہے اس لئے پدرانہ شفقت سے کام لیجیے اور زہر کا یہ پیالہ پی کر مر جائیے۔ آپ نے مجھے پڑھایا، لکھایا، مہذب بنایا، اب یہ آخری احسان بھی کر ڈالیئے!"

قریب قریب یہی ہُوا تھا۔ جب سقراط کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایک روز جب امجد حسین لان میں آرام کرسی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا تو سقراط آیا اور اس کے سامنے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ منتظر رہا کہ سقراط گفتگو شروع کرے گا، مگر جب وہ کچھ نہ بولا تو اس نے پوچھا "کیوں بیٹا، کیا اخبار پڑھنا ہے؟"

"جی نہیں" سقراط نے کہا "ایک عرض کرنا ہے"

وہ سقراط کی خلافِ معمول سنجیدگی سے چونکا اور اخبار کو ایک طرف رکھ کر بولا "کیا بات ہے؟"

"پہلے وعدہ کیجیے کہ آپ خفا نہیں ہوں گے" سقراط نے اپنی عمر سے پندرہ سال کم کے لہجے میں کہا۔

سقراط کی اس سعادت مندی نے اسے سرشار کر دیا۔ وہ بولا "نہیں بیٹا۔ تم سے خفا ہونے کے بعد اس دنیا میں میرا صرف یہ کام رہ جائے گا کہ خودکشی کر لوں اور میں فی الحال خودکشی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں اس بڑ کی طرح دنیا پر چھا جاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی" سقراط اتنی واضح یقین دہانی کے باوجود مذبذب تھا۔

"تو کہو"

"وہ جی بات یہ ہے ـــ" سقراط یہ کہہ کر رک گیا اور کچھ یوں پہلو بدلا جیسے اپنے انتشار کو سمیٹ رہا ہے۔ "بات یہ ہے کہ یہ جو ہمارے بنگلے میں بڑ کا درخت ہے نا ـــ" وہ پھر رک گیا۔

"ہاں ہاں" سید امجد حسین کو کچھ تشویش ہوئی۔

"اسے کٹوا دیجئے۔" سقراط نے یہ تین الفاظ تیزی کے ساتھ اتنے وقفے میں ادا کئے جتنے وقفے میں ایک لفظ بولا جاتا ہے۔

اور وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ مشینی آدمی ہے اور اسے اچھالنے والا بٹن دبا دیا گیا ہے۔

سقراط بھی اٹھ کھڑا ہوا اور مسلسل بولتا چلا گیا۔ "اس نے ہمارے سارے بنگلے کو ڈھانپ رکھا ہے۔ سڑک پر سے گزرنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کسی کا بنگلہ ہے۔ سارے بنگلے کے اتنے لمبے برآمدے کی صرف ایک محراب نظر آتی ہے جیسے یہ کسی سائیس کا کوارٹر ہو۔ کار پورچ میں آتی ہے تو جیسے کسی غار میں گھس گئی ہے۔ دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ دنیا جوہری دور میں سے گزر رہی ہے اور تمہارا خاندان ابھی تک درخت پر سے نہیں اترا۔ آخر اس بڑ میں آپ کو کیا حسن نظر آتا ہے کہ ایک روز مالی نے میرے کہنے سے میری کھڑکی کے سامنے پھیلی ہوئی شاخ کے چند پتے توڑ کر پھینک دیئے تو آپ نے اسے پیٹا بھی اور نوکری سے بھی جواب دے دیا۔ ایسے بھونڈے درخت تو صرف جنگلوں ہی میں بھلے لگتے ہوں گے۔ آبادیوں میں تو پھول لگائے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایسے درخت جن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہو کہ وہ خوبصورت ہوں اور ہر وقت جوان نظر آئیں۔ اب اس مصیبت کو کٹوا دیجئے اور جو اتنا بڑا میدان اس کی گرفت سے آزاد ہو، وہاں کیاریاں بنوائیے اور پھول لگوائیے۔ میں ملک بھر کی نرسریوں سے یورپ اور امریکہ کے ایسے ایسے پھول جمع کر لاؤں گا کہ آپ دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔ ہفتے بھر بعد یہاں ولیمہ ہوگا مگر آپ کو ضد ہے کہ وہ بھی اس منحوس بڑ کے نیچے ہوگا جس کے ایک ایک پتے سے سو سو حشرات لٹک رہے ہیں ـــ"

سقراط سانس لینے کے لئے رکا تو امجد حسین بولا۔ "کہہ چکے؟"

سقراط نے کہا۔ "جی یہی سمجھ لیجئے کہ مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔"

"تو سنو" وہ بولا۔ "بڑ کا یہ درخت اُس وقت تک نہیں کٹے گا جب تک اس کے سائے میں رکھی ہوئی میری میت اٹھ نہیں جاتی۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارا کام۔"

سقراط اپنے باپ کی آنکھوں میں جھانکتا رہ گیا اور باپ کہتا رہا۔ "تم جانتے ہو۔ میں تمہیں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ اس درخت نے ہمارے خاندان کی چار پشتیں دیکھی ہیں۔ اس کی عمر پنجاب پر انگریز کے اقتدار سے بھی زیادہ ہے۔ میرے دادا نے جب سنہ ۱۸۸۰ء میں یہ بنگلہ بنوایا تو اس وقت کے بڑے بوڑھوں کے مطابق اس بڑ کی عمر آدھی صدی سے بھی کچھ زیادہ رہی تھی۔

اس وقت یہ ہماری طرح جوان تھا اور اتنا خوبصورت تھا کہ دادا کہتے تھے: اگر یہ بڑ نہ ہوتا تو یہ بنگلہ بھی نہ بنتا، یا کم سے کم یہاں نہ بنتا۔ اس وقت یہاں چار طرف ویرانہ تھا مگر دادا نے آس پاس کے ویرانے کو گلزار میں بدل دیا اور یہ بڑ اس گلزار کا بادشاہ تھا۔ دادا نے اس وقت کے لفٹیننٹ گورنر کو اسی بڑ کے نیچے ٹی پارٹی دی تھی اور اس کی ایک شاخ میں ریشم کے رسّوں کا جھولا ڈالا گیا تھا جس میں میمیں جھولی تھیں۔ خود لیڈی صاحبہ بھی جھولی تھیں اور کہا تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اس بڑ کو اکھیڑ کر ولایت لے جائیں اور وہاں اپنے بنگلے کے لان میں لگائیں ــــ"

باپ بیٹا دیر تک ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے اور باپ اسے بڑ کے بارے میں وہ ساری باتیں بتاتا رہا جو وہ اسے بچپن سے بتا رہا تھا۔ مگر آج ان باتوں میں بعض نئے انکشافات بھی شامل تھے ــــ "اگر تیز ہوا میں بڑ کا کوئی پتہ اڑتا ہوا سڑک پر چلا جائے تو میں اس کا پیچھا کر کے اسے پکڑ لاتا ہوں۔ میں اس کے گرے ہوئے پتوں کو جلا دیتا ہوں مگر کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی ان پر پاؤں رکھے۔ یہ بڑ تو سقراط بیٹے، میرے لئے ایک صحیفہ ہے اور اس کے پتے اس صحیفے کے ورق ہیں۔ اس بڑ کے نیچے تمہارے دادا نے اپنا بچپن گزارا۔ انگریز گورنس یہیں انہیں بچہ گاڑی میں گھماتی تھی۔ اباجی مجھے خود بتلاتے تھے کہ جب اماں سے ان کے رشتے کی بات ہو رہی تھی اور میرے نانا جان اس رشتے کے حق میں نہیں تھے، تو بڑ کے نیچے، وہ جہاں سنگِ مرمر کی بنچیں بچھی ہیں نا، وہیں انہوں نے اماں کا وہ خط کھولا تھا جس میں انہوں نے قسم کھائی تھی کہ اگر یہ رشتہ طے نہ ہوا تو وہ زہر کھا لیں گی۔ پھر ۱۹۳۸ء میں میری شادی پر جو ولیمہ ہوا، وہ بھی اسی بڑ کے نیچے ہوا تھا اور اس میں خود گورنر صاحب شامل ہوئے تھے اور انہوں نے بڑ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ درخت نہیں ہے۔ یہ تو قلعہ ہے۔ اس روز سے میں نے اسے سچ مچ کے قلعے کی صورت دینا شروع کر دی۔ جہاں جہاں سے اس کی داڑھی لٹکی، وہیں بیلیں لگوا دیں جو داڑھی کے گرد لپٹتی ہوئی اوپر چلی گئیں۔ اب دور سے ایسا لگتا ہے جیسے اس قلعے کی چھت سبز رنگ کے اتنے بہت سے ستونوں پر کھڑی ہے۔ تم اسی قلعے میں پروان چڑھے ہو۔ ۱۹۴۲ء سے لے کر اب تک تم پر اسی کا سایہ رہا ہے۔ اس بڑ کا ایک ایک پتہ، ایک ایک ریشہ تمہیں اپنا دوست، اپنا والی سمجھتا ہے اور تم اسے کٹوانے پر تلے ہوئے ہو۔ تم اسے کٹوا کر اپنے بنگلے کی نمائش کرنا چاہتے ہو مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح تمہارا قلعہ ٹوٹ جائے گا۔ تمہارا بنگلہ ننگا ہو جائے گا۔ بارش اسے چاٹنے لگے گی۔ دھوپ اسے چوسنے لگے گی۔ آج کل کے موسم بہت بے رحم ہوتے ہیں بیٹا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑ کٹ گیا تو ہمارے خاندان کا سارا ٹھاٹھ باٹھ بھی جڑ سے کٹ جائے گا۔ میں سوچتا ہوں تمہیں یہ خیال آیا ہی کیوں؟ کس چیز نے تمہیں ایسا سوچنے پر آمادہ کیا؟"

پھر سید امجد حسین اپنے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر بڑ کے سائے کے غار میں اتر گیا۔ اوپر شاخوں میں قسم قسم کے پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے نیچے اس قلعے کے سبز ستونوں پر اودے اودے پھول کھل رہے تھے جو گھنے سائے کی وجہ سے کالے کالے لگتے تھے۔ تنے کے پاس پہنچ کر اس نے سقراط سے کہا "دیکھو بیٹا۔ اس ایک تنے میں کتنے بہت سے تنے گتھے ہوئے ہیں۔ اور پھر کیا یہاں ایسا نہیں لگتا جیسے آسمان نیچے اتر آیا ہے اور ہماری اور ہمارے بنگلے کی ڈھال بنا کھڑا ہے۔ لگتا ہے نا؟"

"جی۔" سقراط اس دوران پہلی بار بولا "ایسا ہی لگتا ہے — جیسے آسمان نیچے اتر آیا ہے۔"

سقراط کی شادی کے دوسرے ہی روز بعد دعوتِ ولیمہ ہوئی تو سید امجد حسین نے بڑ کو سیم چم کا آسمان بنا دیا۔ بڑ کی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ناقابلِ یقین حد تک لمبی شاخوں کا کوئی ایک انچ بھی ایسا نہ تھا جہاں قمقموں کی صورت میں ستارے نہ جگمگا رہے ہوں۔ مہمان عش عش کر اٹھے البتہ ایک حادثہ ہو گیا۔ جب دعوت جاری تھی تو سب ستارے ایک دم بجھ گئے اور آسمان جیسے اور بھی نیچے اتر کر گرنے سا لگا۔ عورتیں چیخ اٹھیں اور بھگدڑ مچی تو پلیٹوں اور گلاسوں کے ٹوٹنے کی آوازوں نے دہشت میں اضافہ کر دیا۔ فوراً ہی خدام گیس کے بے شمار ہنڈے اٹھائے ہوتے آئے جن کا انتظام ایسے ہی امکان کے پیشِ نظر پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ یہی لوگ یہ خبر لائے کہ باہر آندھی آئی ہے۔

"لیجئے، باہر آندھی آئی ہے اور بڑ کے نیچے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" سید امجد حسین نے ہنس کر بڑے فخر سے کہا۔

کسی نے اس کی ہنسی کے جواب میں تائیدی ہنسی کا تکلف نہ برتا کیونکہ سب سقراط کا اعلان سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا —

"خواتین و حضرات! اب جبکہ گیسوں کی روشنی ہو رہی ہے، مجھے ایک ضروری اعلان کرنا ہے۔ بجلی بجھی تو کوئی خاتون اپنے شوہر کے دھوکے میں مجھ سے لپٹ گئیں۔ پھر جب میں نے اپنا تعارف کرایا اور فریاد کی کہ مجھ سے الگ ہو جایئے کہ اگر میری نئی نویلی دلہن نے دیکھ لیا تو عمر بھر کے لئے مجھ سے کُٹی کر لیں گی تو وہ صاحبہ الگ ہوئیں۔ مگر میں ان سے معافی مانگنا بھول گیا۔ چنانچہ میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جو خاتون مجھ سے لپٹی تھیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں۔ انشانی ان خاتون کی یہ تھی کہ خوشبو لگا رکھی تھی، بالوں میں پنیں تھیں اور ساڑھی ریشمی تھی!"

سب خواتین چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں مگر سب نے خوشبو لگا رکھی تھی، سب کے بالوں میں پنیں تھیں اور سب کی ساڑیاں ریشمی تھیں۔ پھر وہ سب جھینپ کر ایک ساتھ ہنسیں اور اس وقت تو قہقہوں کا ایک طوفان سا اُمڈ پڑا جب ایک معمر خاتون پرلی طرف سے گھبرائی ہوئی آئیں اور سید امجد حسین کے پاس آ کر بولیں "ہائے سید۔ تمہارے اس جنگل میں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے کہ نہیں؟"

پھر کوئی تین چار روز بعد جب سید امجد حسین لان میں کرسی بچھائے، تپائی پر پاؤں رکھے، اخبار پڑھ رہا تھا تو سقراط اور نگینہ آئے اور اس کے پاس مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

"کہو بیٹی، کیسی ہو؟" اس نے نگینہ سے پوچھا اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شادی کے فوراً بعد لڑکی کے خد و خال میں کتنی دھاریں اور نوکیں ایک دم نکل آتی ہیں۔

"ایک عرض ہے انکل۔" نگینہ نے کنکھیوں سے سقراط کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی "اس روز جب میں نے اس بنگلے میں پہلا قدم رکھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے منہ مانگا تحفہ دیں گے۔"

"ہاں ہاں کہا تھا۔ یقیناً کہا تھا۔" خوشی سے سید امجد حسین آرام کرسی کے بالکل آخری سرے تک کھسک گیا۔ پھر بہت آگے جھک کر بولا "تم کچھ مانگو تو سہی۔ سقراط کہہ رہا تھا کہ امریکہ کا چھ مہینے کا ٹرپ ٹھیک رہے گا مگر تمہاری مرضی مقدم ہے۔ چلو بولو۔"

"تو پھر عرض یہ ہے"، نگینہ بولی"۔ کہ ——— مگر آپ سچ مچ دیں گے نا انکل؟"

سید امجد حسین بے تحاشہ ہنسنے لگا" ارے لڑکی، تُو کہہ تو سہی۔"

اور نگینہ بولی" تو پھر بڑ کا یہ درخت کٹوا دیجئے۔ یہ تو مجھے بالکل زہر لگتا ہے۔"

وہ جیسے بیٹھا تھا، بیٹھا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں بہت پھیل گئیں اور گردن بہت آگے نکل آئی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے سقراط کی طرف دیکھا، مگر سقراط اٹھا تو ساتھ ہی نگینہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں لان سے نکل کر برآمدے کی طرف دکھائی دینے والی واحد محراب میں سمٹا کر چلے گئے۔

"اکبر!" سید امجد حسین اس زور سے بولا کہ بڑ پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ یہ آواز قتل ہونے والے کی چیخ کے مشابہ تھی۔

کچھ دیر کے بعد سقراط اور نگینہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ اکبر نے کار کی ڈِگی میں دو سوٹ کیس رکھے ہیں۔ پھر امجد حسین اوپر کے کمرے سے اتر کر آیا اور جیسے بڑ میں سے نکل کر کار میں بیٹھ گیا۔ دلاور نے کار اسٹارٹ کر دی تو سقراط لپک کر آیا اور کار کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے بولا۔ "آپ تو ابا جی کہیں جا رہے ہیں؟" ڈرائیور نے کار روک لی۔ اتنے میں نگینہ بھی آ گئی۔

امجد حسین نے جیسے بہت سوچ سمجھ کر اعلان کیا" میں اپنی فرم کی سب شاخوں کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں۔ سال دو سال میں آجاؤں گا۔"

"سال دو سال میں؟" سقراط اور نگینہ حیران رہ گئے۔

"کیوں انکل" نگینہ نے جھک کر کہا" اگر آپ ایک دم سال دو سال کے لئے کہیں جا رہے ہوں تو اپنا وعدہ پورا کرتے جائیے اور میرا تحفہ مجھے ———"

مگر اِدھر سے سقراط نے اسے بازو سے کھینچ لیا، اُدھر کار چل دی اور پھر نگینہ کو ایک دم ہنسی چھوٹ گئی۔

"ارے بس نا گی" سقراط بولا" ابھی ابھی تم نے ناشتہ کیا ہے۔ کھانے کے فوراً بعد اتنا بہت سا ہنسنے سے انتڑیوں میں گرہیں پڑ جاتی ہیں ——— ابا جی کہتے ہیں۔"

آخری الفاظ پر نگینہ پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا اور تیز ہوا کے جھونکے سے لان میں پڑی ہوئی تپائی پر سے اخبار ورق ورق ہو کر اِدھر اُدھر اڑ گیا۔

چھ سات مہینوں کے بعد جب سید امجد حسین کی کار اس کے بنگلے کے صدر دروازے میں داخل ہوئی تو وہ پچھلی سیٹ پر جیسے اچھل پڑا۔" ٹھہرو دلاور۔ کہاں جا رہے ہو؟ یہ ہمارا بنگلہ کہاں ہے؟"

"یہی ہے صاحب" ڈرائیور نے کار روک لی اور پلٹ کر سید امجد حسین کو ایک طبیب کی سی تشویش سے دیکھا۔

پھر اُدھر سے اکبر بھاگتا ہوا آیا۔ دوسرے ملازم بھی اپنے کوارٹروں سے نکلے مگر وہیں ایک قطار سی بنا کر رک گئے۔ وہ سب یوں دم بخود کھڑے تھے جیسے ابھی تھوڑی دیر میں کوئی بم پھٹنے والا ہے۔ سید امجد حسین نے اکبر کو دیکھا تو کار سے نکلا اور دروازے کو اس زور سے بند کیا کہ پوری کار لرز کر رہ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے اکبر کے سلام کا بھی جواب نہ دیا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلّایا" سقراط!"

سقراط ناک بند کرتا ہوا برآمدے میں نمودار ہوا مگر ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ امجد حسین اسی شدت سے چلّایا" بڑ کہاں ہے؟"

"آ گئے ابا جی" سقراط برآمدے سے نکلا۔

"میں پوچھتا ہوں میرا بڑا کہاں ہے؟" امجد حسین رونے کی حد تک چیخا۔

سقراط نے پلٹ کر دیکھا نگینہ بھی برآمدے میں آ گئی تھی۔ "اپنی بہو سے پوچھئے۔" یہ کہہ کر سقراط جیسے اپنے باپ کے سوال کا جواب دینے کے فرض سے عہدہ برآ ہو گیا۔

پھر نگینہ بڑے اطمینان اور آسودگی سے چلتی ہوئی آئی اور بولی: "وہ میرا تحفہ تھا انکل میں نے استعمال کر لیا۔"

چند لمحے تک نگینہ کے سوا سب بُت بنے کھڑے رہے۔ پھر سید امجد حسین نے جلدی سے جیب میں سے رومال نکال کر اسے اپنے دانتوں میں دبا لیا اور جیسے لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

دلاور کار کو آہستہ آہستہ گیراج کے دروازے تک لے گیا۔ اکبر سر جھکائے واپس جانے لگا۔ تب نگینہ نے سقراط کو داد دی۔ "بالکل وہی ہو رہا ہے جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ ہو گا!"

"ہم نے فلسفہ پڑھا ہے، گھاس نہیں کھودی ہے۔" سقراط بولا۔ "اور اب یوں ہو گا کہ رات دو رات کے بعد انہیں صبر آ جائے گا۔"

پھر اکبر ان کے قریب تیز تیز چلتا ہوا گزرا۔ "بڑے صاحب نے گھنٹی بجائی ہے۔" اس نے دونوں کو جیسے کوئی بہت ضروری اطلاع دی۔ فوراً بعد وہ واپس آیا اور بولا "صاحب نے اندر بلایا ہے۔ اپنے اوپر والے کمرے میں۔ آپ دونوں کو—"

سقراط نے نگینہ کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا اور نکٹائی کی گرہ درست کی۔ پھر دونوں اندر چلے گئے۔

جب انہوں نے سید امجد حسین کے کمرے کا پردہ اٹھایا تو وہ پردے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ فوراً بولا "میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا ہے کہ پھر یہاں نہ آنا۔ جب مردے کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو ساری دنیا سے اس کا پردہ ہو جاتا ہے۔ اب میرا تمہارا پردہ ہے۔ جاؤ۔"

وہ دیکھتا رہا کہ اس کی یاد میں پہلی بار اس کمرے کی کھڑکی میں چاند چمکا تھا۔ اسے یاد آیا، اس نے جب کہیں پڑھا تھا کہ بعض لوگ چاند کو دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں تو وہ خوب ہنسا تھا اور کہا تھا کہ چاند کی سی خوبصورت چیز کو دیکھ کر صرف وہی لوگ پاگل ہو سکتے ہیں جو پہلے سے پاگل ہوں۔ اور آج اسے چاند سے کتنا ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی تو شیشوں کے پار چاند اتنا اداس ہو گیا کہ نیلا پڑ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ کمرہ بھی وہی ہے۔ کھڑکی بھی وہی ہے مگر بیٹے کے کٹنے سے سب کچھ کتنا بدل گیا ہے جیسے وہ اپنے گھر میں نہیں کسی ہوٹل میں پڑا ہے۔ پھر تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا تو کھڑکی کے پٹ کھل گئے اور پردہ پھڑپھڑانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ہوا کے ساتھ چاند بھی اس کے کمرے میں گھسا چلا آئے گا اور سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا اور ساری دنیا کی راتیں قیامت تک کے لئے اندھیری ہو جائیں گی۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا ہے یا سویا بھی ہے۔ صبح کو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا اور آنکھوں میں درد تھا اور کان گونج رہے تھے۔ اٹھ کر اس نے کھڑکی کھولی تو چڑیوں کا ایک غول آیا اور "شاں" کی آواز کے ساتھ کھڑکی کے پاس سے گزر کر اوپر اٹھ گیا۔ کیا یہ چڑیاں اس کے پاس تعزیت کرنے آئی تھیں! پھر ابھرتے ہوئے سورج کی پہلی کرن سیدھی اس کھڑکی میں سے گزر کر سامنے کی

دیوار میں تلوار کی طرح گڑ گئی۔ بڑ اپنے ساتھ اس کا احساسِ تحفظ بھی لے گیا تھا۔ ہر چیز اندر گھسی چلی آ رہی تھی۔ ہوا بھی اور دھوپ بھی اور چھت تک جاتی ہوئی بیل بھی۔ اس نے کھڑکی کو بند کیا تو بیل کا ایک پتہ کٹ کر اس کے قدموں میں لوٹ گیا۔ سید امجد حسین نے یہ پتہ یوں اٹھایا جیسے بڑ کا پورا درخت اس کی مٹھی میں آ گیا ہے۔ پھر جیسے وہ اتنے زیادہ بوجھ کو سہار نہ سکا اور اس بڑ کے نیچے دب کر مر گیا۔

نہ جانے وہ روتا رہا تھا یا سو گیا تھا یا بیہوش ہو گیا تھا۔ بہرحال جب وہ اکبر کی دستک سے جاگا تو صبح کو کھڑکی میں سے آتی ہوئی جو دھوپ سامنے کی دیوار پر پڑ رہی تھی، وہ کمرے کے سارے فرش کا سفر طے کر کے واپس کھڑکی کے قدموں میں سمٹ گئی تھی۔ "کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ اور باہر سے اکبر کی عاجزی سے بھری ہوئی آواز آئی: "چھوٹے صاحب کہتے ہیں حضور کہ آپ نے ناشتہ نہیں کیا تو اب کھانا تو کھا لیجئے۔"

"چھوٹے صاحب سے کہو کہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بند دروازے کے پاس دانت پیس کر کہا۔

شام کو بھی یہی ہوا۔ اکبر نے باہر سے منت کی کہ "چائے کی ایک، صرف ایک پیالی ہی پی لیجئے۔" مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

وہ پھر نہ جانے رونے لگا یا سو گیا یا بے ہوش ہو گیا مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو چاند کھڑکی میں جھک رہا تھا اور کل کی طرح نیلا پیلا ہو رہا تھا۔ پھر وہ کسی آواز سے چونکا۔ اٹھ کر روشنی جلائی۔ پھر اس کمرے سے ملحق مطالعے والے کمرے میں گیا اور وہاں سے وہ سیڑھی اٹھا لایا جو اس نے اونچے آبنوسی شیلفوں کے بالائی حصوں سے کتابیں اتارنے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کے اس روشن دان تک سیڑھی لگائی جس کے شیشوں کو کسی زمانے میں بڑ کے پتے چھوتے تھے اور جب وہ ہوا میں ہلتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اس پورے بنگلے کی پیٹھ کھجا رہے ہیں۔ سید امجد حسین نے روشنی بجھا دی اور چوروں کی طرح اوپر چڑھ کر روشندان میں سے بنگلے کے اس حصے میں جھانکنے لگا جہاں بڑ کا خون ہوا تھا۔

وہاں اس نے دیکھا کہ چاروں طرف ڈھکی ہوئی دودھیا برقی روشنیوں کی ایک قطار ہے جس نے ایک بہت وسیع لان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ لان میں گھاس قالیچے کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ لان کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریوں کا ایک چوڑا حاشیہ ہے۔ برقی روشنیوں میں یہ کیاریاں بالکل اس طرح نظر آ رہی ہیں جیسی دن کو نظر آتی ہوں گی۔ ہر کیاری میں دوسری کیاری سے مختلف رنگ کے پھول ہیں کسی میں سرخ کسی میں زرد کسی میں نیلے۔ وسیع لان کے وسط میں، جہاں بڑ کا تنا ہوتا تھا، گلاب کے پودوں کا ایک بڑا سا دائرہ ہے جس کے درمیان میں شفاف پتھروں کا ایک چبوترہ ابھرا ہوا ہے۔ پتھروں کے کہیں نیچے برقی روشنی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے یہ پتھر چمک رہے ہیں اور چبوترے پر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سقراط اور نگینہ ایسے لگ رہے ہیں جیسے وہ دھوپ سے چمکتے ہوئے تالاب میں تیرتے پھر رہے ہیں۔ وہ کافی پی رہے ہیں اور بات بات پر ہنس دیتے ہیں۔ پھر وہ اٹھتے ہیں۔ نگینہ گلاب کے ایک بڑے سے پھول کو دونوں ہاتھوں میں بڑے پیار سے سونگھتی ہے اور پھر اسے چومتی ہے۔ سقراط اس پھول کو توڑ کر اس کے بالوں میں لگاتا ہے مگر پھول بڑا ہے اس لئے نگینہ کے بالوں میں رکتا نہیں ہے۔ چنانچہ سقراط پھول کو پتی پتی کر کے اسے نگینہ پر برسا دیتا ہے اور نگینہ اس سے لپٹ جاتی ہے۔ پھر وہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس ٹہلنے لگتے ہیں۔ ہر چند قدم کے بعد سقراط نگینہ کو اپنے بازو میں سمیٹ کر اسے پیار کرتا ہے۔ وہ گھومتے ہوئے جب سید امجد حسین کے کمرے کے نیچے سے گزرتے ہیں تو ان کی باتیں اسے سنائی دے

جاتی ہیں۔ وہ پھولوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ ان پھولوں کی کوئی قسم انگلینڈ سے آئی ہے اور کوئی ہالینڈ سے انہوں نے کسی دوست سے کہہ کر امریکہ اور جاپان سے بھی پھول منگا رکھے ہیں۔ پھر ایک بار سقراط نگینہ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اسی کی جرأت نے اس گھر پر سے بڑ کا آسیب دور کیا۔ "آسیب؟" وہ احتجاج کرتی ہے "یہ تو میرا تحفہ تھا جو میں نے انکل سے زبردستی چھینا ہے!" اس پر دونوں زور سے ہنستے ہیں اور دونوں ایک دم خاموش ہو کر اوپر جیسے روشن دان کی طرف دیکھتے ہیں۔

سید امجد حسین کو یوں لگا جیسے انہوں نے اسے روشندان میں سے جھانکتے دیکھ لیا ہے۔ وہ تیزی سے اترا اور سیڑھی کو مطالعے کے کمرے میں رکھ کر اپنے پلنگ پر آ گرا۔ چند لمحوں تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر ایک دم یوں تڑپ کر اٹھا جیسے اس۔ ذرا کٹھا تھا جب سقراط نے پہلی بار اس سے بڑ کو کاٹنے کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے روشنی جلائی۔ ننگے پاؤں کمرے سے نکلا اور خاصی دیر تک سیڑھیوں کے ایک موڑ میں دبکا کھڑا رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھنے لگا ہے۔ بجلی کی سی پھرتی سے وہ اپنے کمرے میں آیا اور دروازے کو آہستہ سے بھیڑ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے دروازے کی دستک پہچان لی۔ "کیا ہے اکبر؟" اس نے پوچھا مگر اب اس کے لہجے میں تلخی نہیں تھی۔

اکبر کا جواب آیا۔ "صاحب جی، اب تو کھانا کھا لیجئے نا۔"

امجد حسین نے کہا۔ "جی چاہے گا تو منگا لوں گا۔"

اکبر پھر بولا۔ "حضور، چھوٹے صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار پھر جا کے کہو۔"

سید امجد حسین نے ذرا سا سوچا۔ پھر بولا۔ "اچھا تو لے آؤ۔"

اکبر نے دروازہ کھولا اور ایک بڑا سا طشت میز پر رکھ کر بولا۔ "لگا دوں صاحب؟"

"میں کھا لوں گا۔" اس نے کہا۔ "چھوٹے صاحب کو بھی بتا دو کہ اب وہ اطمینان سے سو جائیں۔ سانس آ جا رہی ہو تو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے۔ تم یہ برتن صبح لے جانا۔ میں کھانا کھانے کے فوراً بعد سو جاؤں گا۔"

سید امجد حسین کے مزاج میں اس خوشگوار تبدیلی سے اکبر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ جانے لگا تو امجد حسین نے پوچھا۔ "سقراط آ گیا اپنے کمرے میں؟"

"جی نہیں" اکبر بولا۔ "ابھی ابھی کچن میں آئے تھے۔ آپ کو کھانا کھلانے کی تاکید کر کے چلے گئے۔"

"اس سے کہنا۔" امجد حسین نے کہا۔ "میں نے کھانا کھا لیا ہے اور میں سو رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔" اکبر چلا گیا۔

فوراً بعد امجد حسین پھر اٹھا۔ پنجوں کے بل چلتا ہوا اپنے کمرے میں سے نکلا اور سیڑھیوں کے ایک موڑ میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سنا کہ سقراط اور نگینہ کو اکبر اس کے کھانا کھانے اور سو جانے کی خوش خبری سنا رہا ہے۔ تب نگینہ بولی۔ "بھئی حد ہے ساقی۔ بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ ہو گا۔" اور سقراط بولا۔ "ہم نے فلسفہ پڑھا ہے، گھاس نہیں کھودی ہے!"

صبح کو سقراط اور نگینہ ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے کمرے میں سے نکلے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سید امجد حسین برآمدے میں

ایک کرسی پہ بیٹھا ہے ۔ اس نے بھی ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ گاؤن کی جیبوں میں ہیں اور وہ سامنے میز پر جھکا ہوا اخبار پڑھ رہا ہے ۔سقراط اور نگینہ نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دونوں اس کے پاس آئے ۔

" السلام علیکم ابا جی "۔ سقراط بولا ۔

" وعلیکم السلام "۔ امجد حسین نے سر اٹھا کر جواب دیا ۔" جیتے رہو "

" آداب انکل "۔ نگینہ بولی ۔

" جیتی رہو "۔ امجد حسین نے پیار سے جواب دیا اور پھر اخبار پر جھک گیا ۔

سقراط اور نگینہ کے چہرے کھل اٹھے ۔ پھر سقراط نے نگینہ کو جانے کا اشارہ کیا اور خود نہایت آہستہ سے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گیا ۔

اچانک نگینہ کی ایک وحشت ناک چیخ سنائی دی ۔" ساقی ! ـــ ساقی ! " وہ ہسٹیریا کے مریضوں کی طرح پکارنے لگی ۔

سقراط بجلی کی سی تیزی سے لپکا مگر سید امجد حسین اخبار پڑھنے میں مشغول رہا ۔

پھر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا ۔ نگینہ کے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے کی آوازیں مسلسل آتی رہیں اور سقراط شاید نوکروں کو گھر کتا اور ڈپٹتا رہا ۔ پھر نگینہ کی چیخیں قریب آنے لگیں اور سید امجد حسین نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے سوچا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کتنے بھونڈے انداز میں روتی ہے ۔

سقراط روتی اور تڑپتی ہوئی نگینہ کو سنبھالتا ہوا آیا اور اسے کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کر دیا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ نکلا تو سید امجد حسین نے پوچھا " کیوں بیٹا ، کیا ہوا ؟ "

سقراط بولا " رات کو کسی خبیث نے ہماری ساری پھلواری کا ناس مار دیا ہے ابا جی ۔ پھول نوچ کر پھینک دیئے ہیں ۔ پودے اکھیڑ کر پٹخ دیئے ہیں ۔ اتنی بے رحمی سے پھلواری کو اجاڑا ہے کہ کوئی جانور ایسا نہیں کر سکتا ۔ یہ کسی انسان کا کام ہے ۔ نگینہ نے اپنے ہاتھوں سے پھولوں کی ان کیاریوں میں گوڈی کی اور کھرپا چلایا ۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ـــ "

اور سید امجد حسین نے سقراط کی بات کاٹ کر کہا ۔" ٹھیک ہے بیٹا ، مگر اس میں رونے چیخنے کی کون سی بات ہے ؟ "

سقراط جیسے شکست کھا کر پلٹ گیا ۔ تب سید امجد حسین نے انگڑائی لینے کے لئے گاؤن میں سے ہاتھ نکالے اور انگڑائی لے کر انھیں اخبار پر رکھ دیا ۔ اس کی ہتھیلیوں پر لہو جما ہوا تھا اور پوروں میں گلاب کے کانٹے چبھے ہوئے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے کسی فاتح کے ہونٹوں پر ہونی چاہیئے اور وہ یہ سوچے بغیر زور زور سے ہنسنے لگا کہ سقراط اور نگینہ کیا سوچیں گے ۔

چمکور صاحب

قدرت اللہ شہاب

ضلع انبالہ میں روپڑ سے کوئی نو میل کے فاصلے پر نہر سرہند کے کنارے چمکور کا قصبہ آباد ہے۔ سکھ اسے چمکور صاحب کہتے ہیں کیونکہ اس گاؤں میں سکھوں کی تاریخ کا تقدس کئی بار بنا اور کئی بار بگڑا۔

چمکور صاحب میں چار گردوارے اور ایک خانقاہ ہے۔ گردواروں میں سب سے اونچا درجہ کلغی والے بادشاہ ساتویں گرو کے گوردوارے کا ہے۔ سکھوں کی روایت کے مطابق پنجاب کے ایک پٹھان صوبیدار نے گرو کے دو کم سن صاحبزادوں کو اس گوردوارے کی جنوبی دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ صاحبزادوں کے نام بابا اجیت سنگھ اور بابا جھجھار سنگھ تھے اور آج کل ان کے نام پر اس گردوارے کے ساتھ بابا اجیت سنگھ جھجھار سنگھ خالصہ ہائی سکول بھی قائم ہے۔

دوسرے گوردوارے کا نام دمدمہ صاحب ہے۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے طبل بجایا تھا۔ تیسرے گوردوارے کا نام مسواک صاحب ہے۔ اس مقام پر ایک گرو صاحب نے اپنے دندان مبارک پر مسواک فرمائی تھی۔ چوتھا گوردوارہ جھاڑ صاحب کہلاتا ہے۔ یہاں پر ایک گرو صاحب نے جھاڑ اکھیڑا تھا۔

چمکور صاحب کی اکلوتی خانقاہ "بابا صاحب" ہے۔ بابا صاحب دراصل بابا شہاب الدین حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہم عصر تھے اور اپنے زمانے کے صاحب کرامت بزرگ مانے جاتے تھے۔ زہد و عبادت کے علاوہ بابا شہاب الدین اپنے علاقہ کے قاضی بھی تھے اور کسب معاش کے لیے نیل کا کاروبار کرتے تھے۔ بابا صاحب کے صحن میں نیل کے بھرے ہوئے مٹکوں کی قطاریں پڑی رہتی تھیں۔ ایک روز آدھی رات گئے سکھوں کے ساتویں گرو ارجن دیو اچانک بابا صاحب کے احاطے میں آ گئے۔ گرو صاحب عالم روپوشی میں جان بچاتے پھر رہے تھے کیونکہ ان کے تعاقب میں سرہند کا حاکم فوج کی ایک بھاری جمعیت لے کر نکلا ہوا تھا۔

گرو صاحب نے کہا "بابا جی اگر میں اس جلتی ہوئی بھٹی میں کود جاؤں تو شاید میری روحانیت مجھے آگ کے شر سے بچا لے۔ لیکن سرہند کے مغل حاکم سے بچنے کے لیے انسانی وسیلہ درکار ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی وسیلہ ہو تو بتاؤ۔"

بابا صاحب نے جواب دیا۔ "گرو جی مہاراج۔ وسیلہ روحانی ہو یا انسانی خدا کے حکم کے بغیر میسر نہیں آتا۔ آپ اللہ کا نام لے کر نیل کے اس مٹکے میں بیٹھ جائیں۔ شاید خدا اسی میں بہتری کرے۔"

گرو ارجن دیو گاڑھے گاڑھے نیل سے بھرے ہوئے ایک مٹکے میں بیٹھ گئے۔ بابا صاحب نے مٹکے کا منہ کپڑے کی جالی سے ڈھانپ دیا۔ سرہند کے حاکم نے اپنی فوج کی مدد سے چمکور صاحب کا کونہ کونہ چھان مارا۔ گردواروں کے گرنتھیوں اور نہنگ اکالیوں کو زمین پر لٹا لٹا کے خوب پٹوایا بھی۔ بہت سے گھروں کی تلاشی لی۔ گنے کے کھیتوں کو کاٹ کاٹ کے رکھ دیا۔ کچھ سپاہی سلام کرنے کے بہانے بابا شہاب الدین

کے ہاں بھی آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بابا صاحب کے گھر کا جائزہ بھی لیا اور مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ راتوں رات مغل فوج اپنی مہم پر آگے بڑھ گئی۔ صبح سویرے بابا صاحب نے گرداجن دیو کو نیل کے مٹکے سے باہر نکالا اور لباس تبدیل کرنے کے لیے انہیں نئے کپڑوں کا ایک جوڑا پیش کیا۔

گرو صاحب نے کہا "بابا جی۔ اب میں کبھی سفید کپڑے نہ پہنوں گا۔ آج سے نیلا رنگ میرے پنتھ کا رنگ مقرر ہوا۔

گرو صاحب بابا شہاب الدین کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔ چند روز بعد چکور کے گردواروں کے گرنتھی ایک وفد کی صورت میں بابا صاحب کے پاس آئے۔ انہوں نے بڑے ادب و نیاز سے بابا صاحب کی خدمت میں ریشم کی ایک تھیلی پیش کی۔ اس تھیلی میں گرداجن دیو کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فرمان تھا جس میں سارے سکھ پنتھ کو نصیحت کی گئی کہ وہ بابا شہاب الدین کو اپنا محسن مانیں۔ اس احسان کے بدلے چکور کے گردوارے کی آمدنی میں روپے میں دو پیسے کا حصہ بھی دائمی طور پر بابا شہاب الدین اور ان کی اولاد کے حق میں وقف کر دیا گیا تھا۔

بابا صاحب نے اس فرمان کی پشت پر گورمکھی زبان میں ایک تحریر لکھ دی جس کا مفہوم یہ تھا۔ "اگر یہ موقع گرداجن دیو کے خلاف جہاد کا ہوتا تو بخدا شہاب الدین خود اپنے ہاتھ سے گرو صاحب کا سر قلم کر دیتا۔ لیکن یہ جنگ حاکم اور محکوم کا سیاسی تنازعہ ہے۔ گرو صاحب کے ساتھ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ فقط اپنا اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔ اس کی اجرت میرے لیے حلال نہیں۔ میں اس آمدنی کو اپنی آل اولاد پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتا ہوں۔ البتہ میری خواہش ہے کہ چکور کی حدود میں سور کا گوشت لانا یا کھانا بند ہو جائے۔ اگر سکھ قوم اس خواہش کو پورا کر دے تو یہ اس کی عین عنایت ہوگی۔"

سکھوں نے برضا و رغبت اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور اس روز سے چکور صاحب میں سور کے گوشت کی سختی سے ممانعت ہو گئی۔

چند سال بعد جب بابا صاحب کی وفات ہوئی تو دور دور سے ہزاروں ہندو، سکھ اور مسلمان ان کے جنازے میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے۔ عقیدت مندوں نے اپنے ہاتھ سے بابا صاحب کا مقبرہ تعمیر کیا۔ مقبرہ ایک سادہ سی چار دیواری پر مشتمل تھا۔ بابا صاحب کی وصیت کے مطابق اس پر چھت نہ ڈالی گئی۔

بابا صاحب کی زندگی ہی میں یہ رسم چل نکلی تھی کہ گاؤں میں آنے یا گاؤں سے جانے والی ہر برات ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتی تھی۔ بابا صاحب کچے چاولوں میں شکر ملا کے ایک ایک مٹھی براتیوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان سب اس تبرک کو دولہا دلہن کے لیے نیک فال سمجھتے تھے۔ بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد اس رسم میں اور بھی شدت آ گئی۔ اب ہر برات بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوتی۔ براتی لوگ کچے چاول میں شکر ملا کے مزار پر پھینکتے اور پھر ان کو اکٹھا کر کے دوبارہ براتیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ چاولوں کے جو دانے مزار پر پڑے رہ جاتے ان کو چگنے کے لیے بہت سے کبوتر عام طور پر وہاں جمع رہتے تھے۔ بابا صاحب کے ساتھ کبوتروں کی عقیدت مندی کے متعلق طرح طرح کے قصے بن گئے اور رفتہ رفتہ کبوتروں کو اتنا تقدس حاصل ہو گیا کہ چکور صاحب کی حدود میں ان کا شکار حرام شمار ہونے لگا۔

جس مقام پر بابا شہاب الدین کا مزار واقع تھا اس کے پاس ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس میدان کو پانڈو دانہ کہتے تھے۔ چکور کے خوش فہم بڑے بوڑھوں کو اس بات کا یقین تھا کہ کوروں پانڈوں کی مہابھارتی لڑائی اسی میدان میں ہوئی تھی۔ ذرا سا کریدنے پر اس میدان سے طرح طرح کے پرانے سکے اور جنگی ہتھیار مل جاتے تھے۔ یوں بھی تیز بارش کے بعد جگہ جگہ انسانی ڈھانچوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر ہوا تیز ہو تو ان ہڈیوں کی رگڑ سے جابجا چراغ سے جل اٹھتے تھے۔ برسات کی اندھیری راتوں میں یہ روشنیاں خاص طور پر مافوق الفطرت

سماں باندھ دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ مشہور ہونے لگا کہ روحانی دیئے بھی باباصاحب کی کرامت سے روشن ہوتے ہیں چنانچہ جب کبھی رات کے وقت پانڈوانہ کے میدان میں باباصاحب کی یہ کرامت جگمگاتی گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سر ڈھانپ کر کوٹھوں پر چڑھ جاتیں اور دامن پھیلا پھیلا کر باباصاحب سے برکت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔

باباشہاب الدین کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے فرزند بھورے میاں نے نیل کا کاروبار سنبھالا۔ بھورے میاں کا اصلی نام قاسم علی تھا۔ وہ محض دیندار تھے۔ دنیاداری سے قطعی بیگانہ تھے۔ سیدھی سادی صبر شکر کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے بھی اسی ڈگر پر ثابت قدم رہے۔ لیکن چوتھی پشت میں جاکر چودھری مہتاب دین نے ایک نیا رنگ پکڑا۔ سب سے پہلے انہوں نے گردواروں کے گرنتھیوں سے مل کر روپے میں دو پیسے کی آمدنی پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ یہاں سے ناکام ہو کر انہوں نے نیل کا ایک پرانا مٹکا رنگ کر اسے پھولوں سے خوب سجایا۔ گھر کے صحن میں ایک زرکار شامیانہ تان کر اس کے نیچے ایک خوب صورت تخت بچھایا۔ اس تخت پر ریشمی تکیوں اور گدوں کے درمیان اس مٹکے کو جما کے رکھ دیا۔ دو خوش پوش ملازم مورچھل پنکھے اٹھائے ہر وقت حاضر رہتے تھے اور بڑے ادب سے مٹکے پر آہستہ آہستہ پنکھا جھلاتے رہتے تھے۔ چودھری مہتاب دین نے چار دانگ عالم میں یہ چرچا کر دیا کہ یہی وہ مقدس مٹکا ہے جس میں باباشہاب الدین نے گرو ارجن دیو کو چھپا کے رکھا تھا۔ پہلے اکا دکا سکھ مٹکے کی زیارت کے لیے آئے۔ پھر عقیدت مند ٹولیاں چڑھاوے کے پھول حلوہ مٹھائیاں اور پھل لا کر درشن کرنے لگیں۔ چند مہینوں کے بعد جب سنگھ سبھا کے موقع پر چمکور میں سکھوں کا سالانہ اجتماع ہوا تو ہزاروں زائرین نے مٹکے کو تعظیم دی۔ چودھری مہتاب دین نے تعظیم دینے کا عملی طریقہ یہ رائج کر ڈالا تھا کہ عقیدت مند پہلے ہاتھ جوڑ کر مٹکے کو نمسکار کرتے تھے۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک کر اسے بصد ادب و احترام چھوتے تھے اور آخر میں چاندی کے روپیہ یا سونے کی مہروں کا نذرانہ مٹکے میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی سنگھ سبھا پر دو ہزار روپے جمع ہوئے۔ دوسری بار پانچ ہزار۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے آخر ایسا وقت بھی آیا کہ سنگھ سبھا کے روز مٹکا بار بار بھرتا تھا اور دن بھر کی آمدنی بیس بیس ہزار تک جا پہنچتی تھی۔

پانچ سات برس میں چودھری مہتاب دین ایک معمولی نیل فروش سے ترقی کر کے لکھ پتی رئیس بن گئے۔ چمکور کے ارد گرد انہوں نے سینکڑوں ایکڑ اراضی خریدی اور باباشہاب الدین کے کچے مکان کو مسمار کر کے ایک عالی شان حویلی تعمیر کر ڈالی جس کے چوبارے کی چھت بلندی میں گوردوارہ دمدمہ صاحب کے کلس کا مقابلہ کرتی تھی۔ گرنتھیوں کو یہ گستاخی ناگوار گزری۔ یوں بھی کچھ عرصہ سے جملہ گرنتھی چودھری مہتاب دین سے بیزار ہو رہے تھے۔ مٹکے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے گردواروں کی آمدنی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور چودھری مہتاب دین کی روز افزوں امارت میں گرنتھیوں کو اپنے حقوق کا خون نظر آ رہا تھا۔ ادھر سکھوں میں صلاح مشورے شروع ہوئے کہ چودھری مہتاب دین کے چوبارے کی بلندی گوردوارہ دمدمہ صاحب کے کلس سے بہر حال کمتر ہونی چاہیے۔ ادھر چودھری صاحب نے اس سازش کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے اپنے چوبارے پر سکھ پنتھ کے بے شمار جھنڈے گاڑ دیئے۔ اندر وہی زرکار شامیانہ تان کر اس کے نیچے تخت پوش بچھایا اور تخت پوش پر ریشمی گدوں اور گدیلوں کے درمیان نیل کا خالی مٹکا جما کے رکھ دیا۔ اب یہ کمرہ "چوبارہ مٹکا صاحب" کہلانے لگا اور سکھوں میں دور دور تک شہرت ہو گئی کہ واہ بھئی واہ چودھری مہتاب دین نے بھی کمال کر دیا۔ اپنے خرچ پر مٹکا صاحب کے لیے ایسا بلند و بالا چوبارہ بنایا ہے کہ چمکور کے گوردواروں کو مات کر دیا۔

ہر سنگھ سبھا کے بعد چودھری مہتاب دین سونے چاندی کے سکوں کو گلا کر سلاخوں میں ڈھال لیتے تھے۔ اور ان سلاخوں کو تانبے کی گاگروں میں بھر کر اپنی حویلی کی اندرونی دیواروں میں خفیہ طور پر گاڑ دیتے تھے۔ اس خزانے کی حفاظت کے لیے چودھری صاحب نے ایک نرالی

ترکیب نکالی۔ انھوں نے کوئی درجن بھر قاری اور حافظ جمع کرکے ملازم رکھ لیے۔ اندر کے کمرے میں ہر قاری باری باری سے دو دو گھنٹے بابا شہاب الدین کے لیے قرآن خوانی کرتا تھا۔ ایک دو نوکر ان کی خدمت پر ہمہ وقت مامور رہتے تھے۔ چنانچہ اندرونی کمروں میں چوبیس گھنٹے چراغ جلتا تھا اور قرآن خوانی ہوتی تھی۔ ایک پنتھ دو کاج۔ بابا شہاب الدین کی روح کو ایصالِ ثواب بھی ہوتا رہتا تھا اور چودھری مہتاب دین کے گڑے ہوئے خزانے کی حفاظت بھی بعنوانِ شائستہ ہوتی رہتی تھی۔ دن رات قرآن خوانی کی خبر پھیلی تو لوگوں نے فرطِ حیرت و مسرت سے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ واہ بھئی واہ۔ چودھری مہتاب دین کی کیا بات ہے۔ بابا صاحب کی روحِ پاک کے لیے دن رات چراغ جلاتا اور قرآن شریف پڑھواتا ہے۔ چودھری صاحب نے بھی اپنی سعادت مندی کا مزید ثبوت دینے کے لیے بابا شہاب الدین کے مزار کی مرمت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ قبر کا تعویذ بیش بہا سنگِ مرمر کا بنایا اور فرش اور دیواروں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے خوشنما شیشے جڑھوا دیے۔ اب مزار پر ایک چراغ جلتا تھا تو فرش اور دیواروں پر اس کے سینکڑوں عکس جگمگا اٹھتے تھے۔ عقیدت مند سرشار ہو کر جھومتے تھے اور چودھری مہتاب دین کی امارت اور سخاوت کے گن گاتے تھے۔

دین کی طرف سے بے نیاز ہو کر اب چودھری مہتاب دین نے اپنی دولت کا رخ دنیائی طرف بھی موڑنا شروع کیا۔ حویلی کے بڑے احاطے میں وہ صبح و شام دربار لگا کر بیٹھنے لگے۔ سرخ بانات پر سنہری گوٹ کا شامیانہ لگتا تھا۔ نقرئی پایوں والی زرکار مسند پر چودھری صاحب خود بیٹھتے تھے۔ پیچھے آٹھ دس چوبدار شام وار عصا لئے مستعد کھڑے رہتے تھے۔ دائیں بائیں خوش پوشاک خادم دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ سامنے درباریوں کی نشستیں تھیں۔ درباریوں میں قل اعوذ یئے ملاؤں، مشترادکھانے والے پنڈتوں اور بھنگ کے رسیا نہنگ اکالیوں کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں کو اپنے دربار کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے مہتاب دین طرح طرح کے پاپڑ بیلتے تھے۔ مولویوں کے لیے دو وقت پلاؤ، گوشت اور مرغ پکتے تھے۔ پنڈتوں کے لیے پوری کچوری حلوے اور کھیر کا دور چلتا تھا۔ نہنگ اکالیوں کے لیے بڑے بڑے کونڈوں میں بھنگ گھولی جاتی تھی اور بالٹیاں بھر بھر کے تقسیم ہوتی تھی۔ یوں بھی گرد و نواح کے اٹھائی گیرے، رسہ گیر اور نامی گرامی چور اچکے وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے اور چودھری مہتاب دین کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اپنی نوابی کا ٹھاٹھ بنانے کے لیے چودھری صاحب نے چھ چھ فٹ کے پچاس تنومند گھوڑ سواروں کا دستہ بھرتی کیا اور اپنی سواری کے لیے ایک بوڑھا سا ہاتھی بھی کہیں سے خرید لیا۔ اس ہاتھی پر چاندی کا ہودہ لگا کے وہ گلی کوچوں میں ہوا خوری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ مضافات میں اپنی زمینداری کا دورہ کرنے کے لیے وہ اور ان کا عملہ رتھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ان رتھوں کے لیے انھوں نے ہریانے کے چاق و چوبند بیلوں کی خوب صورت جوڑیاں پال رکھی تھیں۔ جب بیل رتھوں میں جتتے تھے تو ان پر زربفت کے جھول ڈالے جاتے تھے۔ گلے میں چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں لٹکتی تھیں اور سینگوں پر سونے کے خول چڑھائے جاتے تھے۔ اپنے بیلوں سے چودھری مہتاب دین کو خاص الفت تھی۔ ہر صبح وہ ان کا چارہ اپنے سامنے ڈلواتے تھے۔ دن میں کئی بار ان پر پھیرا ہوتا تھا اور ہر جمعرات کو خالص گھی اور شکر میں مکئی کی روٹی کی چوری کوٹ کر انھیں کھلائی جاتی تھی۔ رتھ کھینچنے کے بعد بیلوں کو پانی میں گلاب کا عرق ملا کر پلایا جاتا تھا۔

جوں جوں دولت کی ریل پیل بڑھتی گئی، چودھری مہتاب دین کی دلچسپیاں بھی گھوڑوں، بیلوں اور ہاتھیوں کی دنیا سے نکل کر اپنی جولانیوں کے لیے نت نئے میدان مارنے لگیں۔ طبیعت میں اقتدار کی ہوس اور دماغ پر امارت کا بھوت سوار تھا۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجے جس طرف سے وہ گزر جائیں لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں یہ چودھری مہتاب دین

کی سواری جا رہی ہے" "چوبارہ ٹھکانہ صاحب" کے مالک۔ راجوں کے یارِ غار، مہاراجوں کی ناک کے بال چودھری مہتاب دین جن کے جاہ و جلال اور زرق و احتشام کے سامنے سارے ماجھے میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا۔ لیلائے آرزو کے اس جنون میں چودھری صاحب نے سب سے پہلے روپڑ کے راجہ محبوب سنگھ کو بڑی خوشامد سے چکور صاحب تشریف لانے کی دعوت دی۔ محبوب سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے روپڑ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ دریائے ستلج کے کنارے یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کی اہمیت ابتدا میں صرف اتنی تھی کہ یہاں سے جیند کیتھل اور نابہ کے رجواڑوں پر نظرِ احتساب رکھنا آسان تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا دامِ اقتدار پھیلتا پھیلتا دریائے ستلج تک پہنچ گیا۔ سکھوں کی سلطنت ستلج کے دائیں کنارے تک محدود ہو کے رہ گئی۔ اس موقعہ پر انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک سرحدی شہر کی حیثیت سے روپڑ کو بڑا اہم مقام حاصل ہو گیا۔ راجہ محبوب سنگھ نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ اور رنجیت سنگھ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ ساز باز کا کچھ ایسا جال بُنا کہ وہ دونوں محبوب سنگھ کو اپنا جگری دوست ماننے لگے اور سازشوں کے اس اُلجھاؤ میں محبوب سنگھ رفتہ رفتہ روپڑ کا خود مختار حکمران سا ہو گیا۔ لاہور کا دربار اور انگریزوں کے ایجنٹ راجہ محبوب سنگھ کو منہ مانگی رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔ جنہیں وہ شراب کباب اور عورت پر بے دریغ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر کبھی یہ رقمیں وصول ہونے میں تاخیر ہو جاتی تو محبوب سنگھ کے سپاہی روپڑ کے گرد و نواح میں نکل جاتے تھے اور دن دہاڑے ڈاکے ڈال کے سونا چاندی اور غلّہ کے علاوہ گائے، بھینسوں، گھوڑوں اور جوان عورتوں کو بھی ایک ہی لاٹھی سے ہانک لاتے تھے۔ راجہ محبوب سنگھ عرصہ سے چودھری مہتاب دین کی دن دگنی اور رات چوگنی امارت کے چرچے سن رہا تھا۔ اسے وہ طلسمی مٹکا دیکھنے کا بھی شوق تھا جو سال میں کئی بار دولت کے انبار اگلتا ہے۔ اس کے علاوہ چکور صاحب کے مقدس گردواروں کی زیارت بھی ایک بہانہ تھی۔ چنانچہ جب محبوب کو چودھری مہتاب دین کا دعوت نامہ ملا تو اس نے بسروچشم قبول کر لیا۔ یہ خبر سن کر چودھری صاحب کا سر وفورِ مسرت سے چکرانے لگا اور انھوں نے فوراً بابا شہاب الدین کے مزار پر حاضر ہو کر دو نفل شکرانہ ادا کیے۔

راجہ محبوب سنگھ کی خاطر تواضع اور استقبال کے لیے چودھری مہتاب دین نے جس پیمانے پر انتظامات شروع کیے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ سارے گاؤں کے در و دیوار پر چودھری صاحب نے اپنی جیب سے سفیدی پھروائی۔ گلی کوچوں میں حلوت بچھایا۔ بچوں کو نیلے اور سبز ریشم کی وردیاں سلوا کے دیں۔ وہ رنگ برنگی جھنڈیاں لے کر صبح شام جلوس نکالتے تھے اور نعرے لگانے کی مشق کرتے تھے۔ ہر مشق کے بعد انہیں دودھ جلیبی اور موتی چور کے لڈو بانٹے جاتے تھے۔ پانڈوانہ کے میدان میں راجہ محبوب سنگھ کے سواروں اور سپاہیوں کے لیے خیموں اور شامیانوں کی قطاریں ایستادہ ہو گئیں جن میں سینکڑوں مشعلوں، شمعوں اور فانوسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گرد بٹھانے کے لیے بیسیوں سقے صبح شام چاروں طرف چھڑکاؤ کرتے تھے۔ چھڑکاؤ کے پانی میں عرقِ گلاب کی بوتلیں بڑی فیاضی سے ملائی جاتی تھیں۔

چودھری مہتاب دین کی حویلی مردانے میں راجہ محبوب سنگھ کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مہمان خانے کی دیواروں پر ابرق ڈال کر سفیدی کی گئی تھی۔ دروازوں پر سونے اور کمخواب کے پردے ہر طرف لٹکے ہوئے تھے اور فضا کو ہر لحظہ معطر رکھنے کے لیے کئی ملازم عطر کی پچکاریاں اٹھائے مستعد کھڑے رہتے تھے۔

راجہ محبوب سنگھ کو چکور صاحب میں صرف ایک دن اور ایک رات قیام کرنا تھا۔ ان کی آمد سے ایک ہفتہ قبل راجہ صاحب کے ڈپٹی افسر صاحب انتظامات کا جائزہ لینے تشریف لائے۔ انہوں نے تقریباً ہر چیز میں کچھ نہ کچھ مین میکھ نکالی اور راجہ صاحب کے قیام کو آرام دہ

بنانے کے لیے چودھری مہتاب دین کو بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔ ایک مشورہ یہ تھا کہ راجہ محبوب سنگھ کے لیے اعلیٰ درجے کی شراب کثیر مقدار میں موجود ہو۔ شراب کے ساتھ کباب بھی لازمی ہیں، لیکن گوشت حلال نہ ہو، خالص جھٹکا ہو۔ شراب اور کباب کے بعد راجہ صاحب صرف سؤر کا گوشت نوش فرماتے ہیں۔ سؤر جوان اور فربہ ہوں اور کھانے کے بعد اگر اعلیٰ درجے کے ناچ اور گانے کی محفل برپا ہو تو چودھری صاحب کے ذوق میزبانی پر راجہ صاحب کی خوشنودی کی مہر ثبت ہونا امر یقینی ہے۔

یہ ہدایات سن کر چودھری مہتاب دین ایک لحظہ کے لیے سکتے میں آگئے۔ ان کی رگوں میں بابا شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خون کا جو حصہ تھا، اس نے دم بھر کے لیے بُری طرح جوش مارا لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سینے چاندی سے بھری ہوئی گاگروں کا خوش آیند تصور خون کے جوش پر غالب آگیا اور جاہ و جلال کی شہرت نے موروثی توہمات کے تانے بانے ادھیڑ کر پھینک دیے۔ چودھری صاحب نے اپنا خاص رتھ دو خوش سلیقہ مصاحبوں کے ساتھ انبالہ کی طرف بھگایا تاکہ وہ سہارنپور کی یکتائے روزگار موسیقار زہرہ جان اور جگادھری کی مشہورِ عالم رقاصہ ترنجن بائی کو جس قیمت پر ہو سکے اپنے ساتھ لائیں۔ دونوں کے ساتھ تین تین ہزار روپیہ نقد ایک ایک جڑاؤ گلوبند اور زردوز شاہانہ جوڑوں پر معاملہ طے ہوا۔ اور پانڈو رانہ کے میدان میں ان کے طائفوں کے لیے کئی ایک اور خیمے بھی نصب ہو گئے۔

شراب کے لیے چودھری صاحب نے اپنے گماشتے لدھیانہ روانہ کیے۔ وہاں پر انگریزوں کا پولیٹیکل ایجنٹ کرنل ویڈ تھا۔ وہ سامانِ رسد و دوائیوں کے علاوہ درپردہ انگریزی شراب کا بیوپار بھی کیا کرتا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے آدمی اس سے پانچ ہزار روپے کے عوض اعلیٰ درجہ کی ولائتی شراب کی تین چار پیٹیاں خرید لائے۔

فربہ اور جوان سؤر فراہم کرنے کے لیے چودھری صاحب کو البتہ قدرے دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے وہ چاروں گردواروں کے گرنتھیوں کے پاس گئے کہ وہ اپنی وساطت سے منہ مانگے داموں پر چند ایک اچھے سؤر منگوا دیں لیکن سکھ گرنتھیوں اور بھائیوں نے واہگورو واہگورو کرکے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ہم بابا شہاب الدین کے ساتھ اپنے عہد نامہ کو توڑنے کے روادار نہیں ہیں۔ ہر چند چودھری مہتاب دین نے انہیں یقین دلایا کہ عہد نامہ کی شکست و ریخت کا بوجھ خود ان کی اپنی گردن پر ہوگا۔ لیکن گوردوارہ دمدمہ صاحب کے بوڑھے گرنتھی گیانی کھڑک سنگھ نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا، "چودھری مہتاب دین۔ تم اپنے آپ کو کس کھیت کی مولی سمجھتے ہو۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ کسی کو تمہارا نام بھی یاد نہ رہے گا، لیکن بابا شہاب الدین کا دربار اور سکھ دھرم تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے معاہدہ کو ہاتھ لگانے والے ہم تم کون۔"

چودھری صاحب کا بس چلتا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گیانی کھڑک سنگھ کا منہ نوچ لیتے، لیکن راجہ محبوب سنگھ کی آمد کے موقعہ پر سکھوں سے لڑائی جھگڑا مول لینا قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ چودھری مہتاب دین خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے اور دل ہی دل میں کڑھتے اور جب کٹھ پتلی کو گالیاں دیتے واپس لوٹ آتے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے کوئی درجن بھر چماروں کو جمع کیا اور انہیں توڑے دار بندوقوں اور تیز دھار بلموں سے مسلح کر کے بیلے کے جنگلوں میں بھیج دیا کہ وہ تنومند اور جوان سال سؤروں کا شکار کر لیں۔

خدا خدا کر کے آخر وہ روزِ سعید بھی آپہنچا جس کے انتظار میں چودھری مہتاب بیقراری سے گھڑیاں گن رہے تھے۔ راجہ محبوب سنگھ اپنے جنگی رتھ پر سوار چکور صاحب تشریف لائے۔ ان کے جلو میں ہاتھیوں، گھوڑوں، شکاری کتوں اور فوجی سپاہیوں کا لاؤ لشکر تھا۔ جب یہ جلوس چکور صاحب کی حدود میں داخل ہوا، چودھری صاحب کے بیسیوں ملازم پھلوں کے ٹوکرے اٹھائے دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں

جہاں سے یہ قافلہ گزر رہا تھا۔ یہ لوگ گلاب چنبیلی اور گیندے کے پھول رتھ کے راستے میں بچھاتے جاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے رنگ برنگی جھنڈیاں لہراتے تھے اور گلی گلی میں باوردی بینڈ سکھوں کے مشہور ترانے بجا بجا کر سلامی دیتے تھے۔

راجہ محبوب سنگھ نے پہلے چاروں گوردواروں کی زیارت کی۔ پھر وہ بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے چوہان مٹکا صاحب جا کر اس طلسماتی مٹکے کو تعظیم دی، جس کے بطن میں سونا چاندی بڑی افراط سے پیدا ہوتا تھا۔ راجہ محبوب سنگھ نے نیلے زربفت کا سرپوش اٹھا کر مٹکے کے اندر للچائی ہوئی نظروں سے جھانکا جو آج خاص طور پر سونے چاندی کے سکوں اور زیورات سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ چودھری مہتاب دین نے لپک کر مٹکا انڈیل دیا اور راجہ محبوب سنگھ کے قدموں میں یہ زریں انبار لگا کر بڑی لجاجت سے عرض کیا: "حضور، فقیر کا یہ حقیر نذرانہ قبول ہو۔"

راجہ محبوب سنگھ کے خاص مصاحبوں نے یہ سارا انبار سمیٹ کر بڑے بڑے رومالوں میں باندھ لیا۔ راجہ صاحب نے اظہار خوشنودی کے لیے مٹکا صاحب کو دوبارہ تعظیم دی۔

انگریزی شراب کی بوتلیں راجہ محبوب سنگھ کو خاص طور پر پسند آئیں۔ سرِ شام پانڈوانہ کے میدان میں بڑے بڑے سوروں کی کھالیں اترنے لگیں اور رات گئے جب زہرہ جان اور ترنجن بائی کے طائفے اپنا اپنا ساز و سامان سجا کر محفل میں جم گئے تو گویا ایک چمکور کے ہندو مسلمان اور سکھ بڑے بوڑھے اپنے گھروں کی کنڈیاں چڑھا کر اندر دبک کر بیٹھ گئے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آج پہلی مرتبہ چمکور کی سرزمین پر سور کا گوشت کاٹا گیا تھا۔ آج تک اس قصبہ کی فضا زہرہ جان کے طبلے کی تھاپ اور ترنجن بائی کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے ناآشنا تھی۔ رات کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں جب ان سازوں کی آواز فضا میں دور دور تک لہراتی تھی، گاؤں والوں کے دل دھک دھک کرنے لگتے تھے۔ خوش عقیدہ عورتیں جو ہر جمعرات کو بابا صاحب کے مزار پر دیا جلانے جاتی تھیں، سہم سہم کر کوٹھوں کی منڈیر سے لگی بیٹھی تھیں۔ طوفان زدہ اندھیری راتوں میں وہ انہیں کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کے ان مقدس چراغوں سے اپنی مرادیں مانگا کرتی تھیں جو بابا صاحب کے فیض سے پانڈوانہ کے میدان روشن ہوا کرتے تھے۔ آج اسی میدان میں رنگ دیو کا ایک سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ قندیلوں اور شمعوں کی ضیا تا حدِ نظر جگمگا رہی تھی، لیکن شراب میں بدمست فوجیوں کی جھنکار کے ساتھ گاؤں والیوں کے دل لرزنے لگتے تھے، جیسے کوئی زبردستی ان کی بانہیں پکڑ کر کھینچ رہا ہو۔ بے زبان کنواریاں جو سینوں کی بارات سے کر بابا صاحب کے مزار پر کچے چاول اور شکر کی مٹھائیاں بھر بھر کے نچھاور کیا کرتی تھیں، یوں حیران پریشان تھیں جیسے بھرے ہوئے چوراہے پر سرِعام ان کا سہاگ لٹ رہا ہو۔ سارا گاؤں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اجنبی فضاؤں میں ڈگمگا رہا تھا۔ روایات کی ڈور کٹ گئی تھی، ثبات کا پیچ کٹ گیا تھا۔ سکون کی دولت لٹ گئی تھی۔ حقیقت کی روشنی تاریخ کے بے نور سانچوں میں ڈھل ڈھل کر مستقبل کے لیے ایک بے حس بے جان اور بے رنگ بت کا روپ دھار رہی تھی۔ صدیوں کے سکوت کو فقط ایک رات کے شور نے نگل لیا تھا۔ ایک پھیکا سا انقلاب، ایک بدمزہ سا تغیر چاروں طرف بدرو کے کنارے پانی کی طرح ابل رہا تھا۔ شاید یہ وہ لمحہ تھا جب وقت کا سویا ہوا بادشاہ بیداری کی کروٹ لیتا ہے یا جب وقت کا جاگتا ہوا پاسبان اونگھنے لگتا ہے یا جب وقت کا نہیں وقت کی مصلحت کا بے دام غلام ارضی شطرنج پر سماوی پانسہ پھینکنے کی کوشش یا بہانہ کرتا ہے۔ جیسا تیسا تھا آخر بیت گیا۔ بیت جانا چاہیے۔

دوسری صبح نور کے تڑکے جب راجہ محبوب سنگھ اور اس کا لاؤ لشکر رخصت ہو کر چلا گیا تو چمکور صاحب کی صورت کچھ یوں نکل آئی، جیسے ہزاروں گھوڑوں نے کسی خوبصورت قبرستان کو پاؤں تلے روند ڈالا ہو۔ تھکے ہارے کارندے اور خادم جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئے۔ اندر حویلی میں چودھری مہتاب دین بھی ایک تخت پوش پر لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ایک دو خاص مصاحب ان کا سر اور پاؤں دبا رہے تھے، کئی روز کے لیے۔

رت جگے نے انہیں چور کر دیا تھا۔ یوں بھی کل رات سے وہ کچھ زیادہ ہی کسل مند تھے۔ رقص و نغمہ کی محفل میں راجہ بھوپ سنگھ نے انہیں کئی بار شراب پینے کی دعوت دی تھی، لیکن چودھری صاحب ہر بار خوش سلیقہ حیلوں بہانوں سے ٹالتے گئے۔ انجام کار جب راجہ صاحب خود لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے اور شراب کا جام بہ نفسِ نفیس ان کے ہونٹوں سے لگا کر کھڑے ہو گئے تو چودھری مہتاب دین کی مروّت انکار کی تاب نہ لا سکی۔ دوسرا جام انہوں نے زہرہ جان کے ہاتھ سے پیا۔ تیسرا ترنجن بائی سے۔ اوّلیں بادہ گساری کے اس دور نے چودھری مہتاب دین کے دل و دماغ میں ایسے رنگین قمقمے روشن کر دیے، جن کی تجلیوں سے وہ آج تک روشناس نہ ہوئے تھے۔ حویلی کے در و دیوار ایک خوبصورت غبار میں ڈوب گئے۔ زہرہ جان کی کانچ سی آواز کی جگہ مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ترنجن بائی کے تھرکتے ہوئے تن بدن میں سونے اور چاندی کے تار لہرانے لگے۔ رنگ و نور کے اس سیلاب میں چودھری مہتاب دین غبارے کی طرح اُڑ رہے تھے۔ لیکن جب صبح ہوئی تو ٹوٹتا ہوا خمار چودھری صاحب کے رگ و پے میں ٹیسیں مارنے لگا۔ وہ اپنے تخت پوش پر اوندھے پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ اس عالم میں سردار نونہال سنگھ نے انہیں ایک مژدہ جانفزا سنایا۔ سردار نونہال سنگھ چوبارہ مشکا صاحب کی سیوا پر مامور تھے اور اس روحانی کاروبار میں چودھری مہتاب دین کے دست راست تھے۔

سردار نونہال سنگھ نے چودھری صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چودھری اٹھو۔ اس طرح حاملہ عورت کی طرح پڑے پڑے کب تک لیٹے رہو گے"

چودھری صاحب اپنا دکھتا ہوا بدن سنبھال کر تخت پوش پہ اکڑوں بیٹھ گئے۔

"چودھری لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔" سردار نونہال سنگھ نے کہا۔ "شراب کا کسل بھی شراب ہی سے جائے گا۔"

سردار نونہال سنگھ کے اصرار پر چودھری مہتاب دین نے شراب کے ایک دو گھونٹ پیے تو ان کے کسیلے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ زبان پر تراوت آ گئی۔ گلا کھل گیا اور جسم کے دکھتے ہوئے جوڑوں میں از سرِ نو نشاط عود کر آیا۔ زندگی کے کیف کا یہ تیر بہدف نسخہ چودھری صاحب کو بے حد پسند آیا۔ انگریزی شراب کی بچی کھچی بوتلیں جو نوکر اٹھا کر باہر پھینکوائی جا رہی تھیں، انہوں نے واپس منگوائیں اور اپنے دیوان خانے کی الماری میں احتیاط سے رکھ کر تالا لگا دیا۔

شام کے وقت جب چودھری مہتاب دین ہاتھی پر بیٹھ کر حسبِ معمول ہوا خوری کے لیے نکلے تو انہیں اپنے گاؤں کا ماحول کچھ پرایا پرایا سا لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو کلکاریاں مار کر ہاتھی کی سونڈ سے لٹک جاتے تھے اور ہاتھی انہیں اٹھا اٹھا کر چودھری مہتاب دین کی گود میں ڈال دیتا تھا آج کہیں نظر نہ آئے۔ وہ نوخیز اور شریر لڑکیاں بھی غائب تھیں جو چودھری کا راستہ روک کر چاندی کے کنگنوں اور سونے کی بالیوں کی فرمائش کیا کرتی تھیں۔ آج کسی نے سرِ راہ اس کے ساتھ ہلکا پھلکا مذاق نہ کیا۔ وہ سارا گاؤں گھوم آیا، لیکن کسی کوٹھے کی چھت سے دیہاتن کی آواز نہ آئی کہ "او بابا صاحب کے خوش بخت وارث۔ خدا تجھے سدا ہی سکھی رکھے۔" اس بے کیف سیر کے بعد جب چودھری صاحب گھر آئے تو محجوب و دل شکستہ سے تھے۔ لیکن سردار نونہال سنگھ نے شراب کی بوتل کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔ دو تین پیگ پی کر چودھری صاحب پھر چہک اٹھے۔ گاؤں کی سنسان گلیاں جادو کے زور سے پھر آباد ہو گئیں۔ خاموش کوٹھوں پر خوب صورت پریوں کے جھرمٹ ناچنے لگے۔ آسمان پہ قوس قزح چھا گئی۔ ۔ ۔ ۔

راجہ بھوپ سنگھ نے خوش ہو کر چودھری مہتاب دین کو اپنے ہاتھ سے دو خط لکھ کر دیے تھے۔ ایک پروانہ لارڈ ولیم بینٹنگ کی طرف تھا جو کلکتہ میں ملکہ معظمہ کے نام پر ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل تھے۔ اس خط میں راجہ بھوپ سنگھ نے چودھری مہتاب دین کو "فرزند دلبند حکومت انگلشیہ، وفا شعار قیصرۂ ہند اور سپرِ سلطنت و معاونِ دولتِ برطانیہ" کے خطابات سے نوازا تھا اور لارڈ ولیم بینٹنگ کی خدمت میں بڑے وثوق سے

یہ تصدیق کی تھی کہ راجہ محبوب سنگھ کے بعد ستلج کے اس پار انگریزوں کا سب سے بڑا بہی خواہ چودھری مہتاب دین ہی ہے۔

راجہ محبوب سنگھ کی دوسری سند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام تھی۔ اس میں چودھری مہتاب دین کو سکھ پنچہ کی آنکھ کا تارا اور خالصہ حکومت کا راج دلارا ثابت کرکے یہ سرٹیفکیٹ دیا تھا کہ ستلج کے اس پار راجہ محبوب سنگھ لاہور دربار کی تلوار اور چودھری مہتاب دین مہاراجہ اہیراج کی ڈھال ہے۔ سرکاری اکال پرکھ نے ان دو وفادار سپوتوں کو پیدا کرکے خالصہ دربار کو ستلج پار کی سرحد سے بالکل بے فکر کر دیا ہے۔ راجہ محبوب سنگھ واہگرو جی کا خالصہ اور چودھری مہتاب دین واہگرو جی کی فتح ہے۔

چودھری صاحب نے ان نایاب پروانوں کے لیے ریشم اور کمخواب کی تہہ در تہہ تھیلیاں سلوائیں۔ دن میں کئی بار وہ ان تھیلیوں کو ہاتھ میں لے کر اعلیٰ نسل کے بٹیروں کی طرح سہلاتے تھے۔ کبھی سہلاتے تھے۔ ہتھیانا ایک ایسی صفت ہے، جس کو سمجھنے اور پانے کے لیے یا تو بٹیر بننا چاہیے یا بٹیر باز۔ باز اگرچہ پرندہ ہے، لیکن بازی پرندہ ہے۔ درندہ ہے — سب کچھ وہ ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ رات کے وقت چسکی لگا کر وہ ان تھیلیوں کو بڑے اہتمام سے کھولتے اور دونوں خطوں کو انتہائی ادب و احترام کے ساتھ سر آنکھوں سے لگاتے اور جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے۔ بادامی کاغذ کے یہ پرزے چودھری صاحب کے ذہن میں چل پریوں کی طرح ناچتے اور ان کا ایک ایک حرف الہامی پھوار کی طرح ان کی روح کے نئے ریگزار میں رنگ برنگ ترشح کرتا۔ لاہور اور کلکتہ کے شاہی درباروں کا تصور ان کے دل و دماغ میں پھلجھڑیاں سی چھوڑتا اور خیالوں کے اس گل و گلزار میں جھکور کی بستی بڑی ذلیل اور بے معنی نظر آتی۔ یہاں کے لوگ طوطا چشم تھے جو چودھری مہتاب دین سے کنی کترا کر گزر جاتے تھے۔ انہوں نے کسی کو قتل نہ کیا تھا، کسی کے ہاں ڈاکہ نہ ڈالا تھا، کسی عورت کی آبرو نہ لوٹی تھی، اس کے برعکس انھوں نے تو اس گاؤں کا سر بلند کر دیا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے طفیل آج دور دور تک جھکور کا ڈنکا بجتا تھا، لیکن یہاں کے کمینے لوگ اپنی عظمت کے اس احساس سے بے بہرہ تھے۔ دن بدن مغایرت کی ایک ٹھوس دیوار چودھری صاحب کے گرداگرد اٹھتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ وہ ایک کوڑھی کی طرح سے کٹ کر الگ تھلگ پڑے رہ گئے۔ صبح کی سیر بند ہو گئی۔ شام کو ہاتھی کی سواری بھی موقوف ہو گئی۔ دن بھر وہ اپنی حویلی میں بند رہتے تھے تاکہ گاؤں والوں سے مٹھ بھیڑ نہ ہو جو دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ ماحول کی اس پاگل کر دینے بیگانگی سے گھبرا کر چودھری مہتاب دین نے رختِ سفر باندھا اور ایک ہاتھی تین رتھ چار پالکی، دس سوار اور سو پیادوں کی جمعیت لے کر انہوں نے کلکتہ کا رخ کیا۔

جب چودھری مہتاب دین کی سواری روانہ ہوئی تو گویا طاعون کا چوہا گاؤں سے نکل گیا۔ لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ بچوں نے از سرِنو حویلی کے وسیع میدان میں گلی ڈنڈا کھیلنا شروع کر دیا اور جوان لڑکیوں نے حسبِ معمول کوٹھوں پر بیٹھ کر بابا صاحب کے دوہے گانا شروع کر دیے۔ بابا شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے وطن کی دوشیزاؤں سے خاص انس تھا۔ جو لڑکی عقیدت مندی سے بابا صاحب کے دوہے گاتی تھی، اس کا دامن مراد پھولوں سے گلنار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ جھکور صاحب کی مائیں بڑی توجہ سے اپنی بیٹیوں کو بابا صاحب کے دوہے حفظ کرایا کرتی تھیں۔ یہ دوہے بابا شہاب الدین نے عشقِ الٰہی کی آگ میں جل جل کر تصنیف کیے تھے۔ اور ان کا ایک ایک لفظ دہکتے ہوئے انگاروں کی مانند تپاں تھا۔ لیکن جب یہ دوہے شرمیلی کنواریوں کے ہونٹوں پر رزتے تھے تو یہی انگارے ارمانوں کی سُبک چاندنی اور سپنوں کے سہانے آبشار بن جاتے تھے۔ معرفت کے راز جب حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے تھے تو بابا شہاب الدین کے دوہوں میں نوخیز کنواریوں کے آرزو انگیز سپنے نئی دلہنوں کے مسلاطم ولولے اور منتظر سہاگنوں کی آس عجیب انداز سے جھلکتی تھی:

او میرے یار میں نے ابھی تک تیرے باغ میں قدم نہیں رکھا
مجھے کیا معلوم تیرے پھول پیلے ہیں یا سرخ ہیں یا سفید ہیں
جو تیرا رنگ ہو وہی میرا رنگ ہے۔
اپنے باغ کا دریچہ ذرا سا تو کھول
اگر میرا قدم ہلے تو میں اپنے پاؤں کاٹ ڈالوں
میں تو اپنے یار کے باغ میں آنکھوں کے بل جاؤں گی۔

او میرے یار تیرے دامن کو میں نے کبھی نہیں چھوا
تیرا دامن بادلوں سے پرے ستاروں سے اونچا ہے
میں بچاری تو کبھی تیرے خیال کے دامن کو بھی نہیں چھو سکی
تیرا خیال تجھ سے بھی زیادہ تابناک ہے
کیونکہ اس کو میں تو اپنے ہاتھوں سے سجاتی ہوں

او میرے یار رات کی خلوت میں میں نے تجھ کو لمحہ بھر کے لیے آخر پا ہی لیا
اب میری سہیلیاں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ یہ محض خواب تھا۔
چلو خواب ہی سہی او میرے یار
ایسے خواب پر ہزاروں بیداریاں قربان
اے حقیقت — رات کی تنہائی میں ایک بار میرے حقیقت بن کر آجا۔
میں تو اسی انتظار میں پڑی سوتی ہوں۔

او میرے یار میں بھی تو تیرے بہت کام آتی ہوں
دیکھ میں نے تیرے رخ پر اپنے تصور کا حجاب ڈال رکھا ہے
اگر میں اپنے تصور کی آنکھ ذرا سی بند کر لوں
تو ساری دنیا تجھے بے نقاب دیکھ لے گی۔

او میرے یار تو ابد ہے تو ازل ہے۔

تُو احد ہے تُو صمد ہے
شکر کر تو میری گلی کا البیلا جوان نہیں
ورنہ میں تجھے خوب ستاتی، خوب ترساتی
لیکن یہ ستانا اور ترسانا جھوٹ موٹ کا ہوتا
یہ تو محض تیری آزمائش ہوتی
ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں سارا سارا دن اپنے دروازے کی اوٹ سے تجھے جھانکا کرتی۔

او میرے یار تو عزیز ہے تو حفیظ ہے
تو حکیم ہے تو حلیم ہے
شکر کر تو میرے سینے کا ارمان نہیں
ورنہ اگر میرا سینہ پھٹ جاتا پھر بھی تو نکل نہ سکتا

او میرے یار تو وہاب ہے تو ستار ہے
تُو تواب ہے تو غفار ہے
شکر کر تو ہمارے کھیت کا رکھا نہیں
ورنہ ہر روز میں تجھے چوری چوری ملنے آیا کرتی
تو رکھوالی کر ہی نہ سکتا۔
سارے کھیت کو چڑیاں چگ جاتیں

او میرے یار تُو معبود ہے تُو مقصود ہے
تُو موجود ہے۔ تو مستور ہے
تو سب کچھ ہے
لیکن شکر کر تو میں نہیں
ورنہ نہ جانے تیرا کیا حال ہوتا

(ناول کا ایک باب)

تعبیر[1]

مسعود مفتی

بعض شامیں اداس سی ہوتی ہیں — بغیر کسی وجہ کے — فضا بے کیف لگتی ہے — آسمان کوسوں دُور نظر آتا ہے — ہوائیں نیند سے جاگی ہوئی بلی کی طرح بیزاری سے بوجھل ہوتی ہیں — عمارتیں، درخت، چرند پرند پسینے سے بھیگے ہوئے خط کی طرح دھندلائے ہوتے ہیں — دماغ بند ہوتا ہے دل خالی سینما ہال کی طرح ویران ہوتا ہے — اور زندگی بالکل بے مقصد نظر آتی ہے۔

قدرت نے انسان کی طبیعت کے ساتھ کئی مذاق کیے ہیں۔ مگر ایسی شام سب سے بھونڈا مذاق ہے۔ اچھی بھلی بھرپور زندگی کے کھلاڑی بھی خلا کی وسعت میں کھویا ہوا تنکا بن جاتے ہیں۔

ایسے میں ٹیلی فون خاموش ہو، اخبار پڑھ چکے ہوں، ملنے ملانے والے اپنے پروگراموں میں مصروف ہوں، ریڈیو پر پکے گانے ختم ہی نہ ہوں — ٹیلی ویژن پر بے کیف پروگرام ہو، تو اور بھی ستم ہے۔

ایک ایسی ہی شام کو جب کپڑے پھاڑ کر جنگل میں بھاگ جانے کی ہمت نہ پڑی، تو بیوی کو ساتھ لے کر سیر کو نکل پڑا۔

لیکن کوفت تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی، وہی سڑکیں — وہی کھمبے — کم و بیش وہی چہرے — یا ان ہی کی طرح دوسرے بے جان درشن!

اچانک ایک خیال سوجھا — اقبال پارک میں یادگارِ پاکستان کا ذکر کئی دنوں سے اخبارات کی عادت بنا ہے۔ لگے ہاتھوں وہی دیکھ آئیں۔ بلا سے کچھ تو نیا ہوگا۔

نئے خیال کی بیوی بھی فوراً حامی بن جائے تو سمجھیے قسمت سازگار ہے۔ چنانچہ گیریج سے گاڑی نکالی اور شاہی مسجد کی طرف ہو لیے۔ سوچا وہاں جا کر گاڑی ایک طرف لگا دیں گے اور نئے پارک میں گھومیں گے۔

ٹریفک کے ریلے کو مردانہ وار سہتے ہوئے جب منزل کے قریب پہنچے تو رکنا پڑا۔ کیونکہ اندر جانے کا راستہ ابھی نامکمل تھا۔ اور اس پر اینٹ پتھر روڑے پڑے تھے۔ گاڑی سڑک کے کنارے روک کر ہم لوگ نیچے اترے کہ ادھر اُدھر گھوم کر کوئی اور راستہ دیکھیں جہاں سے گاڑی اندر جاتی ہو مگر نیچے اترتے ہی بھینسوں کے نرغے میں پھنس گئے۔

کالی بھینسیں برقع پوش عورتوں کی طرح آپس میں سمٹ سمٹ کر سڑک پار کر رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر بے صبر ڈرائیور ہارن بجا رہے تھے۔ یا بے تابی سے ایکسی لیٹر دبا دبا کر انجنوں کی زبانی اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔

پیدل چلنے والوں کے پاس سے بھینسیں گزرتیں — تو اُن میں سے کوئی دُم کھینچ دیتا۔ کوئی سینگ مروڑ دیتا۔ اور کوئی نرم سا گھونسا مار دیتا۔

سڑک کے دونوں طرف ٹریفک رُک گئی۔

ہارن زور زور سے بج رہے تھے بھینسیں بے نیازی سے جا رہی تھیں۔ گردن اٹھاتی، جھکاتی۔ ایک دوسری کی دم کو سونگھتیں اور کہیں کہیں

---

[1] جی چاہتا ہے کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ اس افسانہ کے سارے کردار فرضی ہیں۔

گوبر سے مہر لگاتی ہوئی دھکم پیل کر رہی تھیں۔

اتنے میں ایک ٹرک والا اس اژدہام کو توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے پیچھے دو ایک کاڑیاں لپکیں۔ ایک آدھ نے مخالف سمت سے کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ آدھی سڑک پر ٹریفک کا سیلاب چل پڑا۔

زیادہ تر بھینسیں گزر گئی تھیں۔ اس کے بعد ٹریفک کا ریلا آدھی سڑک پر بہنے لگا۔ اور باقی آٹھ دس بھینسیں باقی آدھی سڑک پر رک کر کھڑی ہو گئیں —— ان کی وجہ سے ایک بڑی سی سفید کار رکی کھڑی تھی۔

اس کار کے پیچھے اس طرح گاڑیاں تھیں کہ وہ پیچھے ہٹ کر پرلی آدھی سڑک پر چلنے والی ٹریفک میں شامل نہ ہو سکتی تھی۔ اسی لیے کار والا کھڑکی سے سر باہر نکال کر گوالے کو زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ جو حیران ہو کر ٹریفک کے طوفان کو دیکھ رہا تھا جس نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ گزر جانے والی بھینسیں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں، اس لیے وہ پریشان بھی تھا۔

کار والا بے نقط گالیاں دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس نے بھونڈا سا میک اپ کیا ہُوا تھا اور بہت بھڑکیلا لباس پہنے تھی۔

ہمارا تین سالہ بچہ جو میری اُنگلی پکڑے خوش ہو کر بھینسوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار جھک کر ایک کنکری اٹھاتا اور بھینسوں کو مارنے کے لیے زور سے ہاتھ چلاتا، مگر کنکری ہاتھ چلنے سے پہلے ہی کہیں گر جاتی۔ کبھی پیچھے کبھی پہلو پر!

ایک بھینس نے گردن گھما کر لال لال آنکھوں سے اس کی طرف تاکا، تو وہ میری ٹانگوں پر دبک گیا۔

ہم اس انتظار میں تھے کہ سامنے سے بھینس ہٹ جائیں تو ہم اطمینان سے آگے بڑھیں۔ کار والا گالیاں دے رہا تھا، اور گوالا ایک بھینس کی دُم پکڑے باقیوں کو ٹخار رہا تھا، مگر اس کی کوشش کے باوجود وہ سب مل کر دیوار کی شکل میں کھڑی تھیں۔

سفید کار والا بے تاب ہو گیا۔ بے صبری سے دروازہ کھول کر نکلا۔ اور مکوں اور گھونسوں سے گوالے کو مارنے لگا۔

"حرامی۔ سؤر۔ یہ سڑک تمہارے باپ کی ہے جو سب کو روک کر کھڑے ہو۔"

گوالے نے بازوؤں سے وار روکتے ہوئے حملہ آور کا جائزہ لیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مرد تھا۔ مگر ڈیل ڈول اچھا تھا۔ چہرہ خشمگیں تھا اور جس اعتماد اور اختیار سے وہ مار رہا تھا۔ اس سے گوالے کی آنکھیں بتدریج بجھنے لگیں۔ ویسے تو گوالا بھی جسم کا بہت تگڑا تھا اور ایک ہی ہاتھ میں پٹخنی دے سکتا تھا۔ مگر مخالف کے جائزے سے اس کے چہرے پر واضح خوف اُبھرا کہ مقابلہ کرنا حماقت ہو گی۔ کل کلاں کو مصیبت پڑے گی۔ اس لیے وہ سر نیہوڑا کر کہنیوں سے اپنا چہرہ بچاتا رہا۔ اور دونوں بازو سر کے گرد لپیٹتا رہا۔

اُس آدمی نے بالآخر پاؤں کی ٹھوکر زور سے ماری اور ساتھ ہی دھکا بھی دیا۔ گوالا لڑکھڑا کر زمین پر گرا، جہاں بھینس نے ابھی گوبر کیا تھا اور اس میں لت پت ہو گیا۔

ایک بھینس گڑبڑا کر آگے بڑھی۔ تو ٹرک کی بریکیں چیخ کر جم گئیں۔ ساری ٹریفک رُک گئی اور باقی مویشی پھر سے چل دیئے۔

یہ دیکھ کر کار والا واپس مُڑا۔ اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بُلند آواز میں احتجاج کر رہا تھا۔

"نہ معلوم کتنا فضول مُلک ہے ہمارا بھی۔ قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ زندگی جہنم بنا دی ہے۔ بلکہ جہنم بھی اس سے بہتر ہوگا۔"

کار کا سیلف چھینکا۔ انجن غرا کر سٹارٹ ہوا۔ اُس نے زور سے ایکسی لیٹر دبایا۔ اور گاڑی دھچکے سے شور کرتی اُچھل کر آگے بڑھی۔

میں یہ سارا واقعہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اب راستہ کھلا پا کر آگے چلنے لگا۔ تو چونکا۔

بٹو میرے پاس نہ تھا۔

گھبرا کر نظر دوڑائی۔ تو وہ چند قدم دور ایک بوڑھے آدمی کے پیچھے کھڑا اُسی کا کرتہ کھینچ رہا تھا۔ مگر بوڑھا اس سے بالکل بے خبر سفید کار کو گھور رہا تھا۔ جو اب بھیڑ میں مدغم ہو رہی تھی — جب وہ ذرا دور گئی تو بوڑھا ایڑیاں اٹھا کر دیکھتا رہا۔

بٹو پیچھے کھڑا اس کا کرتہ کھینچ رہا تھا۔ اور چلا رہا تھا "چنے دو۔ چنے دو"

میری بیوی لپک کر آگے بڑھی اور بٹو کو جھپٹ کر اٹھا لیا۔

بوڑھا اس ساری چیز سے بے خبر محویت کے عالم میں کار دیکھ رہا تھا۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ تو چند قدم آگے کو دوڑا۔ اور بجلی کے کھمبے کے چبوترے پر چڑھ کر کار دیکھنے لگا — اس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کی پشت پر ایک ٹین لٹکا ہوا تھا۔ جس کے ایک طرف شیشہ ہونے کی وجہ سے بھنے ہوئے کھٹے چنے دکھائی دے رہے تھے۔

بٹو اب بھی چنوں کی طرف ہاتھ کر کے رو رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ اُلٹے سیدھے نقوش بنا رہا تھا۔

اتنے میں مجھے ایک محفوظ جگہ نظر آئی۔ جہاں سے کار ذرا اندر کو دبا سکتی تھی۔ میں نے بچے کو اٹھا کر کار کی طرف کیا۔ بہلانے کے لیے سٹیرنگ اس کے ہاتھ میں دیا۔ اور پھر گاڑی اندر کی طرف لے گیا۔

یادگار پاکستان کی بلند لاٹ پُرشکوہ انداز میں میدان فتح کے مقابل کھڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف سبزہ زار تھا۔ ہم روشوں پر ٹہلنے لگے بچہ کبھی بھاگ کر آگے نکل جاتا اور ہمیں آوازیں دے کر اُسے روکنا پڑتا یا کبھی پیچھے رہ جاتا۔ اور ہم رک رک کر انتظار کرتے۔ وہ کبھی کسی پرندے کے پیچھے بھاگتا۔ کبھی کوئی پتھر تلاش کرنے لگتا۔ اور کبھی پھولوں کی شامت لے آتا۔

"بیچ بیچ بٹو۔ نہ کرو۔ سارے کپڑے خراب ہوں گے" ماں اسے بار بار تنبیہ کرتی۔ مگر وہ ایک چیز چھوڑ کر دوسری کی طرف مائل ہو جاتا۔

گھومتے گھماتے ہم مینار تک پہنچ گئے۔

"امی چنے لینے ہیں" بٹو ماں سے چپک کر ٹھنکنے لگا۔

"بیٹا وہ تو پیچھے رہ گیا" میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ وہ تو ادھر بیٹھا ہے" بٹو مجھے انگلی سے گھسیٹتے ہوئے بولا۔

اور واقعی وہ ایک پودے کی آڑ میں بیٹھا تھا۔

میری بیوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کیا کہ چنے نہ لینے دوں۔

"بٹو کو کھانسی آ رہی ہے" اس نے گلے پر ہاتھ لگا کر سرگوشی کی۔

مگر بٹو مچل گیا "میں چنے لوں گا"

میرا ہاتھ تھپڑ مارنے کو اٹھا۔ مگر اسی وقت میری نظر چنوں والے بوڑھے پر پڑی۔ وہ بڑی ہی پُر اُمید نظروں سے بچے کی طرف دیکھ رہا

تھا، جیسے اُسے یقین ہو کر بکری ضرور ہوگی۔

میرا ہاتھ وہیں رہ گیا۔ اور پھر میں خود ہی اس تک پہنچ گیا۔

بٹو اچھلتا کودتا مجھ سے آن چمٹا۔ میری بیوی بھی منہ ہی منہ میں احتجاج کرتی پہنچ گئی۔ اور احتجاج ہی احتجاج میں ہم نے ڈھیر سارے چنے لے لیے۔ کچھ بٹو کے لیے کچھ اپنے لیے!

پہلا ہاتھ منہ میں ڈالتے ہی جیسے شام کی ساری بیزاری غائب ہو گئی۔ ہمیں کوئی چیز تو نئی مل گئی تھی۔

چنے کھاتے ہوئے ہم ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اور دنیا نسبتاً سہانی لگ رہی تھی۔

"چنے بڑے مزیدار ہیں۔" میری بیوی چٹخارے لیتے ہوئے بولی "دل چاہتا ہے روز آ کر کھائیں۔"

بوڑھا جوان دنوں چراغاں کی طرح اکا دکا دانت دکھاتے ہوئے ہنسنے لگا۔ "بی بی روز کھاؤ۔ میں تو ہر روز یہاں بیٹھتا ہوں۔ پورے دو سال سے کوئی شام ناغہ نہیں کی۔"

"کیوں تمہیں اور کوئی بارونق جگہ نہ ملی تھی" میں نے پوچھا۔

"پہلے انارکلی میں بیچتا تھا صاحب۔ جب سے اس یادگار پر کام شروع ہوا ہے۔ سب کچھ اٹھا کر ادھر آ بیٹھا۔ اب تو ادھر سے ہی گور میں جائیں تو اچھا ہے۔"

میری بیوی نے شرارت سے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور بولی "ایسی کون سی دل لگانے والی بات ہے یہاں"

دو تین بچے مچلتے ہوئے آئے۔

"بابا دو آنے کے چنے دو"

"میرے ہاتھ میں دینا۔"

"نہیں امی نے پیسے میرے ہاتھ میں دیئے تھے۔ مجھے دینا"

"تم دونوں گندے ہو۔ میں خود لوں گا۔"

جب تک بوڑھا چنے بناتا رہا۔ وہ آپس میں لڑتے رہے۔ بٹو دو انگلیاں منہ میں ڈالے دلچسپی سے ان کو دیکھتا رہا۔ کبھی آدھا قدم آگے کرتا۔ پھر جھجک کر واپس کر لیتا۔ اور مڑ کر میری طرف دیکھتا۔

بڑھے نے مسکراتے مسکراتے دو تین پڑیاں بنا ڈالیں۔ پھر سب سے چھوٹے بچے کے گال پہ ہاتھ سے پیار کر کے ایک پڑیا دے دی "یہ تمہارا حصہ ہے بیٹے۔ ۔ ۔ اور۔ ۔ ۔ یہ" وہ دوسرے کو پڑیا دیتا ہوا بولا "یہ تمہارا۔ ۔ ۔ اور۔ ۔ ۔ یہ تمہارا۔"

تینوں خوشی خوشی اچھلتے کودتے اپنی اپنی پڑیا والا ہاتھ ہوا میں لہراتے بھاگ گئے۔ بڈھا مسکرا کر ان کو دیکھتا رہا۔

"یہاں پر سب کچھ ہے بی بی۔ یہ یادگار ہے اور ایسے بچے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ میاں" وہ مجھے مخاطب کر کے بولا "میں نے ایسے بچے کھوئے ہیں۔ اور اس مقام پر تنہا پائی ہے۔"

بوڑھے کی طبیعت میں شگفتگی اور پیار تھا۔ بات چیت میں شائستگی تھی۔ اور آواز میں ایک دکھ تھا۔ اس سے میری دلچسپی ذرا اور بڑھی۔ میں سوچ ہی رہا تھا۔ کہ کیا کہوں کہ میری بیوی کہنے لگی۔

"تمنا کون سی بابا۔ تمہاری روزی یہاں مل جاتی ہے کیا؟"

"بی بی جس چیز کے پیچھے اپنے معصوم بچے گنوائے۔ وہ سامنے نظر آئے تو تمنا ہی ہے۔"

"اوہو۔ تو تمہارے بچوں کو کوئی نقصان پہنچا تھا بابا" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"صاحب چھوڑیئے ان باتوں کو" اس نے دکھ سے کہا۔ اور بات ٹالنے کو ترازو سے کھیلنے لگا۔ لیکن پھر جیسے ضبط نہ کر سکنے کے باعث ابل پڑا ہو۔

"میرے بھی دو اتنے ہی بچے تھے۔ صاحب۔ جیسے ابھی اُچھلتے کودتے چنے لینے آئے تھے۔ پاکستان سے پہلے جب اوروں کے جلسے جلوس کو دیکھتے تھے۔ تو اپنی توتلی زبانوں میں "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ لیکن جب پاکستان بنا۔ تو... تو... وہ میری آنکھوں کے سامنے ذبح ہوئے... اور میری جوان بیوی دیکھتے دیکھتے کنوئیں میں چھلانگ لگا گئی۔ تاکہ اپنی عزت بچا سکے... ..."

"یہ کہاں کا واقعہ ہے بابا؟"

"کہاں کا نہیں ہے بی بی۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ یہ سُنانے والا۔ آپ تو ان دنوں چھوٹی ہوں گی۔ لیکن ادھر سے آنے والا ہر آدمی یہی کچھ سناتا تھا۔ ہم تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ دے کر بھی پاکستان مل گیا۔"

"پھر بھی تم کس شہر میں تھے؟"

"گورداسپور میں بی بی۔"

میری بیوی چونکی۔ کیونکہ اس کے والدین بھی وہیں رہتے تھے۔ جب پاکستان بننے پر وہ اُدھر آئے تو یہ بمشکل پانچ برس کی تھی۔

"تو کیا تمہاری ٹرین پر حملہ ہوا تھا؟"

"نہیں بی بی۔ میرے پیچھے تو ہندو عرصہ سے پڑے تھے۔ میں مسلم لیگ میں زور شور سے حصہ لیتا تھا۔ اس لیے انہوں نے میرے مکان پر باقاعدہ دھاوا بولا۔ اور وہ بھی ایسے وقت میں کہ میں گھر میں نہ تھا۔ میں ہوتا تو سب کو بچا کر لے آتا۔ یا خود بھی ختم ہو جاتا۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوا۔"

"میں اپنے مکان سے تھوڑی دور ایک اور مکان کی چھت سے دیکھ رہا تھا۔ بیٹی۔ وہاں مسلم لیگ کے سارے کارکن پروگرام بنا رہے تھے کہ کس طرح بچوں کو نکال کر لاہور لے جائیں کہ اچانک شور کی آواز آئی۔ ہم نے چھت سے دیکھا تو میرے گھر پر بھرپور حملہ تھا۔ بلوائیوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ باہر گھوم رہے تھے۔ وہ پکار پکار کر مجھے للکار رہے تھے۔ میں نہ ملا تو اندر سے میرے دونوں بچوں کو پکڑ لائے۔ اور سڑک پر ڈال کر ذبح کر دیئے۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ چند لوگ میری بیوی کا تعاقب کر رہے تھے۔ جو مکان کی پچھلی طرف سے بھاگ کر آئی تھی۔ وہ سیدھی کنوئیں کی طرف گئی۔ اور اس میں کود گئی۔"

"مگر تم مدد کو کیوں نہ گئے بابا؟"

میں تو مچلتا رہا ہی۔ مگر ساتھیوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا اور جانے نہ دیتے تھے۔ پھر قریشی صاحب پیچھے سے بندوقیں لے آئے اور انہوں نے بلوائیوں پر تابڑ توڑ فائر کیے۔ جس سے وہ بھاگ گئے۔ مگر اس وقت تک میرا گھر برباد ہو چکا تھا۔

کاش میں تھوڑی دیر پہلے احمد بخش قریشی کے گھر میٹنگ میں نہ گیا ہوتا۔

بوڑھے کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

ہم دونوں جیسے بجلی کے تار کا جھٹکا لگنے سے چونک اُٹھے ——— احمد بخش قریشی میری بیوی کے والد تھے۔

بابا تم کس مکان میں رہتے تھے؟" میری بیوی تقریباً چیخی۔

"گورنمنٹ کالج کے ساتھ والے مکان میں۔ کالج کی اور ہماری ایک ہی دیوار تھی۔"

مگر وہاں تو۔۔ وہاں تو بابا۔۔ نواب زادہ سعادت خاں رہتے تھے۔"

بوڑھے نے آنکھیں پونچھیں ——— بڑے درد سے مسکرایا ——— اور نظریں چراتے ہوئے کہنے لگا۔

"نواب زادہ سعادت خان۔۔ ۔۔ میں ہی۔۔ ۔۔ ہوں بیٹی۔!!

ہم لوگ سکتے میں آگئے۔

پچھلے چند سالوں میں میں اپنے سسر سے ان دنوں کے اکثر قصے سن چکا تھا۔ جب وہ ریڈکلف ایوارڈ کے بعد گورداسپور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان قصوں میں اکثر نوابزادہ سعادت کا نام آتا تھا۔ جو بڑا پرجوش لیگی کارکن تھا۔ اور اپنے علاقے میں تحریک پاکستان کا روحِ رواں تھا ——— جو کہانی اس نے سنائی تھی من وعن وہی میں اپنے خسر سے سن چکا تھا۔ اس لیے فوراً یقین آگیا۔

"بابا۔ یہ احمد بخش قریشی کی لڑکی ہے۔" میں نے بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

میرا خیال تھا وہ یہ سن کر کھل جائے گا۔ اس کے سر پہ پیار دے گا۔ پچھلی باتیں یاد کرے گا ——— مگر اس کا ردِ عمل بالکل روکھا تھا۔ اس نے صرف ایک دفعہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔

وہاں نقش تو ملتے ہیں۔

اور پھر خاموش ہو گیا۔

میری بیوی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بابا۔ آئیے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ابا سے ملواؤں گی۔ وہ تو اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔"

وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسا "بھولے ہوؤں کو بھولا ہی رہنا چاہیئے بیٹی۔"

ہم دونوں نے بہت اصرار کیا۔ مگر بوڑھا ایک قدم نہ ہلا ——— ہم نے کچھ روپے دینے کی کوشش کی۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا اُلٹا ہم کو دو تین مٹھیاں چنوں کی اور دے دیں۔

ہم چلنے لگے تو بولا "دیکھو بیٹی۔ اپنے ابا کو نہ بتانا۔"

"کیوں بابا۔ ہم تو ضرور بتائیں گے۔

"نہ بیٹی۔ میرا ایک یہی ٹھکانا رہ گیا ہے —— اسے نہ توڑو۔ تم انہیں یہاں سے آئیں۔ تو مجھے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑے گی۔ جیسے اُدھر سے بھاگ آیا ہوں۔ میری تو اب یہی جگہ ہے —— سب کچھ یہی ہے۔"

"آخر اس جگہ میں کیا ہے بابا۔ تم ہمارے ساتھ آؤ۔"

"بیٹی۔ گھر گیا —— جائداد گئی —— اولاد گئی۔ عزیز و اقارب گئے۔ اب یہی ایک جگہ ہے جو رہ گئی ہے۔ تم نے تو یہ یادگار اب بھی ہے۔ اور شاید کتابوں میں پڑھا ہو کہ یہاں وہ جلسہ ہوا تھا جس میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا —— لیکن میں تو اس جلسے میں شریک تھا —— وہاں سٹیج بنا تھا۔ جس کے ساتھ ہی میں بیٹھا تھا۔ اس جلسے کی کارروائی کا ایک ایک واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ نہ جلسہ بھی دیکھا۔ اس کے بعد اپنی جدوجہد کے سات سال بھی دیکھے۔ پھر اپنے گھر کی بربادی بھی دیکھی۔ اب اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ یہ ملک بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور اب اس واقعے کی یادگار بھی دیکھتے ہیں۔ میری تو یہی خواہش ہے بیٹی اسے دیکھتے دم نکلے اور یہیں قبر بنے۔"

ہم دونوں تاسف کے عالم میں کھڑے تھے۔ دل میں کئی سوال آتے تھے مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ ذہن میں کئی خیال آئے مگر پوچھنے میں جھجک تھی۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ گھر چل کر آرام سے سوچیں گے۔ یہ اگر دو سال سے یہیں ہے تو کل بھی یہیں ہوگا۔

"چلو بنو" میں نے بچے کو پچکارا۔

لیکن میری بیوی پوچھ بیٹھی "مگر بابا۔ آپ کی تو اتنی جائداد تھی وہاں۔ اس کے بدلے کچھ نہیں ملا آپ کو۔"

"تھی بیٹی —— مگر جن حالات میں حملہ ہوا۔ میں کوئی کاغذ تو لا نہیں سکتا تھا۔ البتہ میرا ایک نوکر وہ سب کاغذات لے بھاگا۔ اور یہاں آ کر سب جائداد الاٹ کروالی۔"

"لیکن یہ تو دھوکا ہے۔" وہ چلائی "آپ نے کوئی کارروائی نہ کی؟"

"کئی مرتبہ کوشش کی بیٹی۔ لیکن وہ ہر دفعہ مجھے غنڈوں سے پٹوا ڈالتا ہے۔ اپنی دولت سے فیصلہ کرنے والوں کا منہ بند کر دیتا ہے۔ آخری دھمکی قتل کی تھی۔ کیا ہو سکتا ہے.. .. .. قدرت کو یہی منظور تھا.. .."

"مگر وہ ہے کون؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"یہاں تو آجکل وہ بھی نواب کہلاتا ہے۔"

"مگر ہے کہاں؟"

بوڑھا خاموش ہو گیا۔

چند لمحے سوچتا رہا کہ بتائے یا نہ —— پھر بولا:۔

"دیکھا نہیں آپ نے؟ —— وہ جو ابھی سفید کار سے اتر کر گداگر کو مار رہا تھا۔"

بڈھو

عبد الرحمٰن چغتائی

اوپر تلے چار بچے اللہ کو پیارے ہو گئے تو خالہ ہونے والے بچے کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ دل ہی دل میں قیاس آرائیاں کرنے لگی۔ خالہ کی پریشانی بجا بھی لگتی تھی، اس کی سوچ ایک لازمی امر تھا۔ نیک صورت، نیک سیرت خالہ وسوسوں میں کچھ ایسی الجھی کہ وہ پیچھا نہ چھڑا سکی۔

خالہ ابھی جوان تھی، اس کی آرزوؤں میں احتیاج کا پہلو نمایاں تھا، اگرچہ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ خود بھی خاندانی روایات کے مطابق روشن خیال، دکھ سکھ میں سب کے ساتھ!

خالہ پر اب کنبے کی ذمہ داریاں تھیں۔ مستقبل کے متعلق اس کا اپنا ایک نظریہ تھا، جو قریب قریب ہر سلجھی ہوئی عورت کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہونے والے بچے کے متعلق جو کچھ بھی سوچتی تھی، حق بجانب تھی۔

ایک دن بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ دائیں بائیں ہر طرف سے اس کے لیے ہاتھ اٹھتے ہیں، دعائیں نکلتی ہیں۔ وہ لاوارث تو نہیں مرے گی۔۔

درگاہ خواہ کوئی ہوتی، چڑھاوا چڑھانے، نذر نیاز اور منتیں ماننے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ رضیہ، ذکیہ، سلمان اور فوزیہ لڑکا ہو یا لڑکی جو بھی تھا اس کی آنکھوں کا نور تھا، دیکھتے دیکھتے اور کھیلتے کھیلتے موت کی نذر ہو جاتا تو وہ ہاتھ ملتی رہ جاتی تھی۔ اس دفعہ اس نے فیصلہ کر لیا لڑکا ہو یا لڑکی وہ اس کا نام بڈھا یا بڈھو رکھے گی۔ یہ کہہ کر وہ دیر تک چپ رہی کچھ اس انداز سے کہ وہ منہ آئی بات کہہ کر جیسے اپنے اطمینان اور سکون کی تلاش میں ہو۔

خالہ کو اس بات کا یقین تھا کہ کبھی تو اس کے بچہ کو دشمن کی نظر لگ جاتی ہے اور کبھی مہترانی کی۔ مہترانی پر تو اسے اکثر شک گزرتا تھا کہ وہ قربان اور صدقے واری ہوتے ہوتے بھی میرے بچے کو چپٹ کر جاتی ہے۔ حالانکہ جب سلمان پیدا ہوا تو نیکی کے خیال سے اس نے اسے مہترانی کی گود میں ڈال دیا تھا۔

خالہ یہ بات زبان پر لانے سے گریز ضرور کرتی تھی، پھر بھی جب اسے یہ خیال آ لیتا تھا تو اس سے اس کا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا کہ ہمسایوں کی مبارکبادیں بھی اس حادثے کا باعث بن سکتی ہیں، دور دور تک اس کی شکی نگاہیں الجھتی رہتیں۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے اور وقت قریب آ رہا تھا۔ خالہ کو دیواروں سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ دیواروں کے بھی تو کان ہوتے ہیں۔ آوازوں سے شگون لینا اس کا معمول بن چکا تھا۔ ہر آہٹ پر چونک اٹھتی تھی۔

دن قریب آتے گئے تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گئی۔ جلد اُٹھتی مہترانی کو بہانے سے رخصت کر دیا۔ وہ برابر کہتی ہی رہی، اس ڈیوڑھی پر بوڑھی ہو گئی ہوں۔ مگر خالہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ نوکرانی جب سے آئی تھی اس کی طرف سے بھی اس کا دل میلا تھا۔ اُسے بھی

نکال کر دم لیا۔

آخر بچی ہوئی تو سب سے پہلے ملا کو بلا کر بچی کے کان میں اذان دلوائی گئی۔ مذہبی اور دنیاوی رسم و رواج کا پورا پورا احترام کیا گیا۔ مولوی جی کی تجویز کے مطابق بچی کا نام بڈھو رکھا گیا، اور سب سے کہہ دیا گیا کہ کوئی دوسرا نام تجویز نہ کرے۔ محلے کے چھوٹے لیا پڑے۔ جس نے بھی سنا، ناک بھوں چڑھائی۔ سب کا ایک ہی خیال تھا، خالہ کی لڑکی کا نام بڈھو کوئی اچھا نام نہیں۔

خالہ کا فیصلہ اٹل تھا، بڈھو بڈھو ہی رہی۔ پانچ چھ ماہ کے بعد اچانک چمن دھوبن خالہ کے ہاں آنکلی۔ اس نے خالہ کے سر پہ ہاتھ رکھا اور مبارک باد دی اور معذرت کی کہ وقت پر آنہ سکی۔ کیونکہ وہ اپنی بہن کے ہاں گاؤں گئی ہوئی تھی۔ اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے۔

پہلے تو خالہ چمن کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی پھر جب اس نے گاؤں جانے کا سبب بیان کیا تو چپ ہو رہی۔ ویسے اس کے بے وقت آنے سے خالہ نے اسے نہ تو کچھ اچھی نگاہ سے دیکھا اور نہ وہ متوقع تھی کہ چمن آئے گی۔

چمن نے بات بڑھانے کے خیال سے اور خالہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے اپنے طوطے کا ذکر چھیڑ دیا۔ طوطوں کے ویسے تو بی بی آپ نے کئی قصے سنے ہوں گے یہ بک بک کرنے پر اتر آتے ہیں تو کئی ان سنی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یقین جانو خالہ بی گاؤں جانے سے پہلے اچانک اس کی زبان سے نکلا تھا "بے بی" میں تو ششدر رہ گئی۔ پنجرے سے باہر نکالا لاڈ پیار سے سر پہ ہاتھ پھیرا، چپ کا چپ! پھر کچھ نہیں بولا۔ گھر سے نکلی تو بکا "چاندنی ہو چاندنی" یقین جانو بی بی میں نے اس کی بکواس پہ کان نہیں دھرا وہ بکتا رہا اور میں گاؤں چلی گئی۔ یہ سب خدا کی دین ہے۔ زندگی ہو تو ماں باپ کا نام روشن کرے چمن نے یہ کہہ کر بچی کو اٹھا لیا۔ یہ گھنگریالے سنہرے بال، ہیروں کی مانند چمکتی ہوئی آنکھیں یہ گول مٹول گال۔ چمن نے بچی کو جی بھر کر چوما، اور صدقے واری گئی۔ بڑی ہوگی، گڑیاں کھیلے گی گھر بنائے گی۔ بیاہ رچائے گی۔ اس نے بڈھو کو چھاتی سے لگا لیا، ماں فخر سے پھولی نہ سمائی۔ پیشانی تو دیکھو مری بٹیا کی۔

خالہ یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

یوں تو طوطا جو منہ آتا ہے بکتا چلا جاتا ہے۔ ویسے مجھے پکا یقین ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں رمز ضرور ہوتی ہے — نور کا ٹکڑا! اس نے پھر بچی کو جی بھر کر دیکھا اور چوما۔

خالہ کی گود ہری بھری رہے۔ ایک ایک دعا قبول ہوگی چمن کی۔ طوطا تو طوطا رہا، میں نے بھی دھوپ میں بال سفید تھوڑے کئے ہیں۔

چمن نے بچی کو خالہ کی گود میں دیتے ہوئے۔ دعائیں دیں اور دوپٹہ اوڑھ لیا اور بڑی سنجیدگی سے جیسے اسے بشارت ہوئی ہو۔ جمعرات کے روز درگاہ لے جاؤں گی اپنی بٹیا کو۔

خالہ نے چمن کے الفاظ کی تائید کی اور فراخدلی سے کہا، چمن کو جوڑا بھی دوں گی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چمن کا ہر لفظ خالہ پر جادو کا اثر کر رہا ہے۔ اس کا اپنا چہرہ عبادت گزار قسم کی سنجیدگی کا جویا تھا۔ وقت آیا تو خالہ نے چمن کو جی بھر کر خوش کیا اور بڑے شوق سے کہا۔ چمن اپنے طوطے کو کبھی مرے ہاں بھی لانا۔ میں اس کا منہ مٹھائی سے بھر دوں گی۔

چمن جو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ بولی بی بی۔ یہ طوطا افریقہ کی اک نسل سے ہے۔ جو باتوں باتوں میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں چراغ گھسٹے کی بیوی کا اس پر بڑا ہی ایمان ہے۔ وہ ہمیشہ ہی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا ہے۔ اس کی لڑکی کا رشتہ کل کی بات ہے۔ وہ تو جان دیتی ہے اس پر۔ جیسے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ یہ سب کچھ وہی جان سکتا ہے۔ جس سے اس کا واسطہ پڑے۔

تم یقین جانو خالہ میں نے بھی تو اس طوطے کی بڑی حفاظت کی ہے۔ محنت اور محبت سے پالا ہے۔ اس کی پرورش میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔"

افریقہ کے لوگ اس نسل پر بڑا یقین رکھتے ہیں بی بی! جمن اترائی اور کہا میں نے بھی بچپنے میں ان طوطوں کے متعلق بڑی بڑی کہانیاں سنی ہیں۔ افریقہ کے باشندے جو ترکی کہلاتے ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں اور جن جنگلوں میں یہ بستے ہیں، موتی، مونگے اگلتے ہیں۔ میرے دادا اور ان کے بھائی یہ نسل نیروبی سے لاتے تھے۔

جمن طوطا دینے اور خالہ کو اس کی رمز بھری باتیں سنانے کا وعدہ کر کے چلی، تو خالہ نے جمن کو رخصت کرتے وقت اس کی مبارک باد کو بہت سراہا اور اُسے چاول اور پانچ روپے نقد دے کر رخصت کیا اور دوبارہ طوطا لانے کی تاکید کی۔"

جمن کے جانے کے بعد قیاس آرائیاں ایک فطری امر تھا اور اس پر طوطے کی کئی کئی باتیں بشارت کا حکم رکھتی تھیں۔ جمن بہانے بہانے سے جب بھی آتی خالہ کے لیے کچھ نہ کچھ سکونِ قلب کا سامان لے آتی۔

خالہ ابھی بھرپور جوانی میں تھی۔ کسی بھی پہلو معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ پانچ بچوں کی ماں ہے۔ جو بھی دیکھتا تازہ دم پاتا فوبڈھو کے لیے دعائیں مانگتا یہی سب کی خواہش تھی ماں بیٹی دونوں کی زندگی خوش و خرم اور شاداب رہے۔

باپ کے مرجانے کے باوجود لاڈوں بڈھو کے کھیلنے پھولنے کے سامان موجود تھے۔ ورنہ خالہ کی آزادی سلب ہو گئی تھی ویسے بھی بڈھو کے سوا زندگی کی کوئی دوسری دلچسپی نہ تھی۔ خالہ شروع سے سنجیدہ اور مطمئن قسم کی عورت تھی اور سارے کنبے میں لے دے کر خالہ ہی ایک ایسی عورت تھی اس کے دم سے گھر میں ایک توازن موجود تھا۔ اس نظم و ضبط دیکھ کر رشک پیدا ہوتا تھا۔ اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ محلے بھر میں خوشی غمی کی کوئی رسم اس کے بغیر مکمل نہ ہو سکتی تھی۔

خالہ جس محلے میں رہتی تھی، بڑا گنجان واقع ہوا تھا۔ اس میں اچھے بڑے سبھی قسم کے لوگ آباد تھے۔ چراغ گھسہ۔ ماجا مٹھو۔ نتھا پتنگ باز نتھا چنگڑ۔ کالو پہلوان اور نوری کانڈا اپنے اپنے کردار کے لوگ تھے اور ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ اور اندر باہر ان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔

متوسط تھا یا متمول محلے میں جو بھی تھا ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا حصے دار تھا۔ کیا مجال تھی کہ کوئی محلے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا۔ اس ماحول میں خالہ کا کنبہ آباد تھا، اور اس کنبے کے طور طریق محلے والوں کے لیے قابلِ احترام تھے۔ یہ کنبہ اپنی قدیم روایات کی رو سے سب کے دکھ سکھ میں حصے دار تھا۔ جب سے بڈھو کا باپ مرا تھا۔ لے دے کر ماں بیٹی ہی انہی روایات کی نشانی رہ گئی تھیں۔

گلی بل کھاتے کھاتے بڑی سڑک سے جا ملتی تھی۔ ویسے بھی یہ گلی جب سڑک پر کھلتی تھی تو آمد و رفت کا یہ عالم نظر آتا تھا کہ سڑک کیا ہے شہر کا صدر دروازہ ہے۔

خالہ جب بیاہ کر آئی تھی تو اہلِ محلہ نے اس کا خیر مقدم جس تپاک اور خلوص سے کیا تھا، وہ بھولنے والا نہیں، اور سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔ خالہ مرزائی نہیں یہ سارے محلے والوں کی اپنی بہو ہے۔ خالہ کے اخلاق۔ برتاؤ اور سلیقے نے وہ ہر دلعزیزی حاصل کی کہ ہر دیکھنے والا اس کی چوکھٹ پر آنکھیں بچھاتا تھا۔

خالہ کا جب کوئی بچہ کلی سے پھول بننے پر آتا تھا۔ تو اللہ کو پیارا ہو جاتا تھا۔ محلے کی فضا پر یاس کا سماں چھا جاتا تھا۔ کچھ ایسا محسوس

ہوتا تھا۔ محلے والے محض غم ہی بانٹ سکتے ہیں، یہ غم یہ اندوہناک صدمہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔

اللہ کی دین جب بڈھو نے سر نکالا تو اس کا رابطہ ان تمام لڑکیوں سے رہا جو قریب قریب ہم عمر تھیں۔ ماں نے اپنی دوسری مصروفیتوں کے باوجود محلے کی بہو بیٹیوں کے لیے گھر کو ایک درس گاہ کا درجہ دے رکھا تھا، جہاں قرآن اور دینی تعلیم سے یہ مدرسہ مالا مال تھا اور خالہ کے ذہن میں یہ سب کچھ شامل تھا۔

بڈھو ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ اور اس کا ورثہ تھی جس کی روایات اور امارت کا اپنا مقام تھا۔ اسے ایک ایسی سجی ہوئی ماں کے زیر سایہ پروان چڑھنے کا موقع ملا تھا جو ایک ضابطۂ حیات کی پابند اور مبلغ تھی۔ اس نے محلے بھر کے تقاضوں کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور محلے کی ہر بہو بیٹی کو دین و دنیا کی دولت سے مالا مال کرنے کا فرض سنبھال رکھا تھا۔ اس نے اپنے عقیدہ و فراست اور ایمان کی رو سے سینکڑوں امیر غریب لڑکیوں کو دین کی روشنی سے منور کیا تھا۔ جو بھی اس تک پہنچ جاتا تھا، دین جیسی دولت سے مالا مال ہوتا تھا، اور اس میں اس کی بڈھو بھی شامل تھی۔

بڈھو نے جب میٹرک پاس کر کے کالج میں قدم رکھا تو ماحول اور حالات کے مدنظر اس نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ سیاہ برقعے کا ترک تھا۔ محلے والوں نے جب بڈھو کو بغیر برقعے کے آتے جاتے دیکھا تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ وہ کچھ اس انداز سے تکتی کہ بڈھو محلے کی بیٹی نہیں کوئی نو وارد ہے۔

بڈھو کی نشو و نما اور ترقی کا رشتہ اس کی ذہانت سے تھا۔ وہ اپنی مجبوریوں کے باوجود اپنے مستقبل کو پہچان چکی تھی اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس کی عمیق نگاہیں ایک رفتار سے اپنے مستقبل کے قدموں کے نشان دیکھتی رہیں۔

خالہ بڈھو کی تعلیم کے سلسلہ میں بعض اوقات کچھ مجبور سی نظر آتی تھی اور اسے بدلتے ہوئے وقت کے دھارے کا زبردست احساس بھی تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اس کی اپنی تعلیم جس زمانے میں ہوئی اس کے مقابل آج کا ماحول یکسر مختلف ہے۔

بڈھو جوں جوں اپنی تعلیم کی منزلیں طے کرتی رہی وہاں دوسرے لوگوں کی زندگیوں کا مرکز بنتی گئی۔ اس کا نظریۂ زندگی بھی کروٹیں لیتا گیا اور محلے کی تاریک گلی جو بل کھاتی دم نہ لیتی تھی، عجیب و غریب دکھائی دینے لگی اور جب وہ بعض جگہ بسنے والوں کی ذہنیت کا جائزہ لیتی تھی تو حیرت زدہ رہ جاتی تھی۔ خصوصیت سے جب اس نے برقعے کو ترک کر دیا تھا اور بال ترشوائے تھے تو وہ کس قدر کھلی اور پیاری دکھائی دیتی تھی، مگر ہر آنکھ جو اسے دیکھتی تھی، اس میں اسے دیکھنے والوں کی بدنیتی جھلکتی نظر آتی تھی۔

وہ قدم قدم پر اپنی شاہراہ پر اپنی ماں کی دعاؤں اور آرزوؤں کو شامل پاتی اور قدم قدم پر اپنی سہیلیوں سے اپنے حسن بلا کا اور اپنی معصوم خوب صورتی کے متعلق غیر معمولی ریمارک سنتی تھی۔ تو بغیر کسی سنجیدگی سے چپ سادھ لیتی تھی اور ماں کی والہانہ محبت سے سب کچھ ناپ لیتی تھی۔

بڈھو کی رفتار میں ایک جاذبیت تھی اور اس جاذبیت میں اس کے علم کا مقام بھی شامل تھا۔ جب وہ اپنی سرمئی نرگسی آنکھوں کو جھکا لیتی تھی تو کالج کی مغربی استانیاں ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہی پیار اور محبت سے یہ کہا کرتی تھیں "یہ لڑکی تو فینوس۔ روما اور وینس سے بھاگی ہوئی معلوم ہوتی ہے"۔

جوں جوں وہ تعلیم کی بڑھتی چڑھتی ضرورتوں کا احساس کرنے لگی تھی اس کے ذہنی رجحانات میں نئے نئے انقلاب رونما ہوتے گئے۔ وہ پورے اعتماد سے دوسروں کو یقین دلانے میں پیش پیش نظر آتی تھی کہ وہ تعلیم کو اس وقت تک جاری رکھے گی جب تک وہ خود اس سے مطمئن نہیں ہو جاتی۔ موجودہ دور کے بھی تقاضے ہیں کہ علم جیسی دولت کی نعمت کو حاصل کرنا ملک کی جہالت کو ختم کرنا ہے وہ اپنا ارادہ بڑے وثوق سے بیان کرنے کی عادی تھی۔

محلے میں خالہ کو جو اعتماد حاصل تھا۔ وہ اس کی بے پناہ خوبیوں کا حاصل تھا۔ سب نے ایک زبان ہو کر خالہ کو اپنی بہو کہا تھا اور بڈھو کو اپنی اولاد کے برابر عزیز جانا تھا۔

ہر صبح جب وہ اٹھتی تھی۔ اس کی زندگی کا بہترین مشغلہ عبادت تھی اور جب وہ عبادت میں مشغول ہوتی تھی تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہر گزرے ہوئے دن سے کہیں زیادہ اپنے آپ کو خوش پاتی تھی۔ اسے یقین تھا۔ وہ اپنی بچی کے مستقبل کو قریب اور روشن تر دیکھ رہی ہے۔ یہ ہے اس کے خوابوں کی تعبیر کہ اس کی بڈھو اپنے خاندان اپنے ملک کی بہترین لڑکی کہلائے۔

بڈھو کی بس جیسے ہی گلی کے نکڑ پر آ رکتی تھی۔ جب وہ اپنی کتابیں اور دوسری چیزیں سمیٹ کر اترتی اور اپنی سہیلیوں کو خدا حافظ کہتی اور گھر کا رخ کرتی تو بڑا ہی دلفریب نظارہ ہوتا تھا۔ اول تو عین وقت سے پہلے وہاں موجود ہوتی اور بڑے احترام اور قرینے سے بچی کی ایک ایک چیز سنبھالتی اور قدم بقدم بے بی کے پیچھے پیچھے چلنے لگتی۔ محلے کی نوخیز بچیاں اور جوان لڑکیاں جو بیکار زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اور ماں باپ کی ہاں اور نہ یا شادی اور منگنی کی خبر راہ پر بیٹھی تھیں بل کھاتی ہوئی گلی میں کھڑکیوں اور دریچوں سے یوں جھانکتی تھیں جیسے بڈھو نہیں گلی سے کوئی برات گزر رہی ہو۔

بڈھو کو خدا نے جلال و جمال اور حسن اور سلیقہ تو بخشا تھا۔ ذہانت بھی عطا کی تھی۔ وہ بے نیازانہ طور پر گزرتی چلی جاتی تھی اور جس کبھی غفلت سے کام نہ لیتی تھی۔

خالہ کی زندگی پر آشوب دور سے گزر کر ایک بار پھر جد و جہد عمل اور تجربات میں سے گزرنے لگی۔ اور اس کی بچی نے جس علمی بغاوت کا ذمہ اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا وہ رنگ لا رہی تھی۔ محلے والوں کو اس کی آزادی سے جھٹکے پر جھٹکا لگتا تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق چہ میگوئیاں کرتے اور کسی نہ کسی شکل میں جہالت کا مظاہرہ بھی کرتے۔

بڈھو اور خالہ شوپنگ کے بعد گھر واپس لوٹیں تو بعض ایک نے انہیں ایسے بھونڈے سے طریقے سے گھورا کہ بڈھو نے محسوس کیا اور یہ خیال کیا یہ کم سواد لوگ شائستگی سے کس قدر دور ہیں تہذیب ان کے پاس بھی نہیں پھٹکی۔

خالہ اور بڈھو دانستہ جمن کے دروازے کے سامنے رکیں۔ طوطا چونکا اور جمن ماں بیٹی دونوں کا احترام بجا لائی۔ بڈھو کو چودھویں کا چاند اور خالہ کو رحمتوں کا سایہ سمجھا۔ پوری پوری توجہ کی تو بڈھو ماں کے ساتھ لگ گئی۔

ماں بیٹیاں اس کوشش میں تھیں کہ وہ اس واقعہ کو بھول جائیں جو گلی کے موڑ پر انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔

خالہ کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گئی تھی۔ اسے اب اپنی بیٹی کے سیاہ و سفید کی طرف کچھ زیادہ توجہ دینی پڑتی تھی۔ سب کچھ تھا مگر اس کے تعلقات رشتہ داروں کے ساتھ ایسے ہی گہرے اور سلجھے ہوئے تھے۔ میاں بیوی نے بیٹی کے مستقبل اور منگنی کا کچھ سوچ رکھا تھا

آج کے بدلے ہوئے حالات کے مدِنظر۔ بدھو کی بڑھتی چڑھتی تعلیمی سرگرمیاں دیکھتے ہوئے خالہ کی نیت میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔

جب چراغ گھسیٹے کی لڑکی کی شادی ہوئی تو خالہ کو اس موقع پر زیور اور خلعت سے نوازا گیا اور بدھو کا جوڑا بھی دیا گیا تھا۔ چراغ گھسیٹے کی لڑکی کو قرآن نماز اور شریعت کے زیور سے خالہ ہی نے آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔ رسم و رواج کے پابند لوگ خالہ کو بابرکت اور رحمتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے اور احترام سے ان کے سر جھکتے تھے۔ محلے کی سبھی بچیوں نے خالہ سے تعلیم حاصل کی، اور اخلاقی طور پر اپنی مذہبی قدروں کے تحت ہوش سنبھالا تھا۔

طرۂ امتیاز یہ تھا کہ خالہ محلے بھر میں اپنے اعلیٰ اوصاف کی برکت سے پیام دکیا ہوئیں اور بچے وہ سب میں یکساں مقبول تھی۔ اور وہ ان اوصاف کی مالک تھی کہ وہ اہلِ محلہ کی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی نگہداشت کرتی۔ بچوں اور بچیوں کو پروان چڑھانے میں اس کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہ تھے حالات اور اوصاف جن سے ان کی طرف سے میل آنے کا گمان کرنا بھی عجیب لگتا۔ اگر بدھو خالہ کی بیٹی تھی تو محلے بھر کی بھی بیٹی تھی۔

جمن خالہ کے سامنے بیٹھی بت سی لگتی تھی، اور خالہ بھی اُسے اجنبی نگاہوں سے تک رہی تھی۔ جمن محسوس کر رہی تھی خالہ کے بشاش چہرے پر سوچ بچار کے آثار موجود ہیں اور اُسے خالہ کی اُلجھن کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا! خالہ بیٹھی ناشتہ تیار کر رہی تھی اور ایسا نظر آتا تھا۔ وہ عبادت سے فارغ ہو کر پہلا کام جو وہ کرنے بیٹھی ہے ناشتہ کی تیاری ہے۔

خالہ کے چہرے پر پریشانی تو ضرور تھی اور وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ دکھائی دے رہی تھی، اس نے اپنے ہاتھ جمن کی طرف بڑھائے اور اسے قریب آنے کا اشارہ، اور پھر اپنے ہاتھ جمن کے ہاتھوں میں دے دیئے۔ جمن غریب تھی مگر معاملہ فہم ضرور تھی۔ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ خدمت گزاری میں صرف کیا تھا۔

آج اتوار تھی بدھو ابھی بستر میں تھی۔ شوپنگ کا سامان جو ماں بیٹی لائی تھیں جوں کا توں پڑا تھا۔ گھر کا ماحول تھا وہی جو ہوتا تھا، لیکن وہ شگفتگی نہ تھی جو اس گھر کا حصہ تھی۔ خالہ نے اِدھر اُدھر جھانکا، اور کہا اولاد کس کو پیاری نہیں" پالتو طوطا بھی مان نہیں جمن تجھے علم ہے" بدھو میرا آخری سہارا ہے۔

جمن جانتی تھی، خالہ جذبات کو چھپانے پر قادر ہے۔ وہ ٹر ٹر خالہ کا منہ تکنے لگی وہ جانتی تھی خالہ وہی کچھ کہے گی جو اس کے دل میں ہے۔

اس نے کہا میں اپنے رشتہ داروں سے مطمئن ہوں۔ مجھے تو اپنے عزیز اور حتیٰ ہمسایوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اکثر ماں بیٹی، ہم دونوں نظریں چرانے پر مجبور ہو جاتی ہیں، بدھو کی علمی سرگرمیاں اور اس کی شہرت اب اپنے بس کی بات تھوڑی ہے، یہ کہہ کر خالہ بہت دیر تک چپ رہی۔

اس کی چمکدار آنکھوں میں بیٹی کی محبت اور اس کی شہرت نے کروٹ پر کروٹ لی، اضطراب میں کہا، محلہ اپنا ہی تو ہے۔ محلے والے بھی اپنے۔ کچھ دنوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ زندگی سکڑتی اور بوجھل بوجھل سی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے بڑھاتے رک گئی۔ لبوں پہ آئی ہوئی بات کھا گئی۔ جمن کو اس کے طوطے کو کھلانے کے لیے جو تھما دیا اور اسے رخصت کرتے ہوئے کہا پھر آنا۔

خالہ جہاں رہتی تھی۔ وہاں وہ بہو بن کر آئی تھی۔ اور سب نے یک زبان ہو کر عہد باندھا تھا کہ سب کی بہو ہے۔ کھوجی۔ دینا، بچا! اور پامنا یہ سب ذہنی طور پر پست خیال تھے۔ نئی تہذیب پر پھبتیاں کستے تھے۔ بدھو کے مستقبل اور حال سے ان کا دور کا بھی رشتہ نہ تھا۔

بڈھو دیکھتے دیکھتے سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچ گئی تھی اور پھر اس کی خداداد قابلیت اور علم کا چرچا اخباروں اور محفلوں میں بڑی تائید اور احترام سے ہونے لگا۔ اور وہ بڑی آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی تھی۔

جب یونیورسٹی کی طرف سے اخباروں میں یہ خبر بڑی بڑی سرخیاں لے کر چھپی کہ بڈھو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جا رہی ہے تو محلے والوں نے بجائے عزت کے بدنیتی سے ہو ہے کر اس خبر کو اچھالا اور اسے اُلٹے پلٹے رنگ دینے لگے۔ غنڈوں نے بعض سرکردہ لوگوں کو بھی ورغلایا اور فیصلہ کر لیا کہ خالہ کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دینا ضروری ہے ورنہ ہماری بہو بیٹیاں بھی اس رنگ میں رنگی نظر آئیں گی۔

ادھر پرانی بوڑھیوں اور ماؤں کو خالہ کے احسانات کا بھی پاس تھا۔ ابھی کل کی بات تھی کہ خالہ نے چراغ گھسیٹے کی لڑکی کی شادی پر سورۂ الرحمٰن بڑی درد بھری بلند آواز سے پڑھی اور خدا کی بخشش پر روشنی بھی ڈالی اور نئی نسل کے لیے بڑی بڑی دعائیں مانگی تھیں۔ اور کہا تھا بڈھو کے نقش قدم محلے کو لیے مبارک ہوں۔

کل رات بڈھو جب یونیورسٹی کے مباحثوں سے کامیاب واپس لوٹی تو جھولوں سے لدی ہوئی۔ اسے جیسے پروفیسروں اور ہمجولیوں نے سراہا تھا تو وہ ظاہر اً بھی قابل رشک تھا۔ لیکن محلے کے غنڈوں نے جو کئی دنوں سے بڈھو کے اغوا کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا اور اس کا راستہ روکا۔

بڈھو پورے خود اعتمادی اور سنجیدگی کے ساتھ گھر کی طرف قدم بقدم پُروقار انداز میں چلتی رہی۔ اس نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اپنے محلے میں رہنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

رات کے واقعہ نے بڈھو کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اب چپ نہ رہے۔ لوگوں کے رویے اور سرد مہری نے ہر امکان کو ختم کر دیا تھا۔ وہ بستر کے اندر تلملاتی رہی اور صبح کا انتظار کرتی رہی۔ اس نے بستر کے اندر کروٹ لی اور گھر کے ماحول کو دیکھنے لگی۔ وہ خمار آلودہ نگاہوں سے خوفزدہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اضطراب میں زبردست تذبذب پایا جاتا تھا، جو ایک ماں کے لیے قابل مطالعہ تھا۔

ماتا کے روپ میں خالہ نے بڈھو کو دیکھا تو وہ اسے معصوم بچی کا بادا نظر آئی۔ جذبات اور احساسات سے خالی۔ اس میں لوچ تک بھی نہ تھا۔ بستر کے اندر ماں اور بیٹی کی آنکھیں چار ہوئیں تو ماں گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بیٹی جب سے تم نے اس دنیا میں سانس لیا ہے۔ میری یہی آرزو رہی ہے کہ تو سب کے شل بنے۔ تجھ سے تیرے خاندان کا نام روشن ہو۔ تیرا نام جب بھی لوگوں کی زبان پر آئے احترام سے لیا جائے۔

ماں کے آنسو دیکھ کر بڈھو کے بھی آنسو بہنے لگے۔ اور دونوں کے آنسو کچھ ایسے اُبل پڑے کہ اس کا دل بیتاب ہو گیا اور چاہا وہ اُٹھے اور اپنے لرزتے ہوئے لب اس کی آنکھوں پر رکھ دے۔

بڈھو اس وقت شب خوابی کے لباس میں تھی رات کا واقعہ اور اس کا ردِ عمل اس کی پریشانی کا سبب بن لیا تھا، وہ ضبط سے کام لیتی اور یہی چاہتی تھی کہ وہ اپنی اچھی ماں کو اپنے ساتھ پریشان نہ کرے لیکن وہ اس موقع پر اپنے جذبات کو دبانے میں کسی صورت کامیاب نہ ہوئی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ادھر خالہ کے جذبات کا تسلسل شکوک کی بنا پر شدت اختیار کرتا چلا گیا تھا، وہ سمجھتی تھی کہ بڈھو ایسی منزل پر ہے کہ وہ اپنی مرضی سے شادی کرے گی اور میں نے جو وعدہ کر رکھا ہے وہ کسی صورت پورا نہ ہو گا۔ اور یہ انکار، یہ وعدہ خلافی ایک ماں کے لیے المیہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مدت

ہوئی وہ من سے یہ بوجھ اتار چکی تھی۔

بڈھو نے بڑے اعتماد سے اور پُرجوش الفاظ میں کہا، میرا مقام، میرا وقار، میرے خاندان کی روایات اجازت نہیں دیتیں کہ میں ایک عہد کروں، اور اس پر سختی سے کاربند نہ رہوں۔ یہ محلہ ہمیں چھوڑنا ہوگا، اس جگہ کو جہاں فساد کی تو پہیلی ہی چل جاری ہے۔ ماں میں اپنے گھر سے باہر قدم نہ رکھوں گی، میرا عہد، میری تعلیم کا عہد ہے، میرے الفاظ ایک باہوش لڑکی کے الفاظ ہیں، میں اسی پر پابند رہوں گی۔

بڈھو نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے ماں سے کہا اور بڑے وثوق سے کہا، آج اور کل کا سوال نہیں، میں کبھی بھی جیسی کی گڑیا نہ تھی اور بے بصر بھی نہیں۔ تیری عنایتوں سے مجھے کیا نہیں ملا، وہ کیا ہے، ماں جو تو نے مجھے دیا نہیں، اس نے تمکنت کے ساتھ (زیر لب) کہا تیری اور میری نجات کا پروگرام مرتب ہے اور مجھے اس پر عمل کرنا ہے۔ یقین جانو ماں تیرا حکم، تیرا فیصلہ جو تیرے لبوں پر آیا ہے، میرے لیے آخری حکم ہے اور مجھے تیرے حکم کو ہر قیمت پر ماننا ہے۔

ماں نے بڑے قرینے سے ناشتہ بنایا اور سلیقے سے چُن دیا اور تمام شکوک اور رنج کے آثار دھو ڈالے۔ یہی سمجھی کہ نے ایک نئی زندگی کا پروگرام مرتب کر لیا ہے۔ اس وقت خالہ کے پروقار چہرے پر مسرتوں کا ایک نیا آہنگ نئی نئی امیدوں سے تمتما اٹھا تھا۔ اس نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا، سر پر ہاتھ پھیرا، اور اسے ہدایت کی کہ وہ اطمینان سے ناشتہ کرے اور خود دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کی غرض سے خدا کی بارگاہ میں جھک گئی۔

بڈھو اپنے اطمینان اور فرمانبرداری پر نازاں آپے سے باہر ہوتی گئی۔

خالہ رکوع سے سجدے میں گئی، وہ بہت دیر تک خدا کے حضور میں جھکی رہی، جھکی رہی۔ کتنی عاجزیاں اس کے سامنے تھیں۔

بڈھو آخر معصوم ہی بچی تھی، ماں کو مطمئن دیکھ کر مسرتوں سے شادمان ہوگئی۔

ماں نوافل سے فارغ ہو کر دعاؤں میں لگ گئی، وہ اَن گنت رحمتوں سے بھرپور جذبے سے سرشار تھی۔ بازو پھیلا کر بیٹی کو دیکھتی رہی، یہی چاہتی تھی اُٹھا کر کھلونے کی مانند اسے گود میں رکھ لے، بڈھو بھی بے تابی کے عالم میں ماں سے بغل گیر ہوگئی، خوشی سے آنسو بہہ نکلے۔

میری ماں! وہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ غم میں بھی خوشی کے پہلو نکل آتے۔

پوپی

شکیلہ اختر

جس دن پہلے پہل بڑے انتظار کے بعد اوما کو ایک بڑا پیارا نرم نرم روئیں والا کتے کا چھوٹا سا پلّا ملا تھا تو اس پلپلے اور ریشم کی طرح چکنے اور چمکیلے پلّے کو پاکر وہ خوش ہونے سے زیادہ الجھن میں پڑ گئی تھی۔ اوما کو بہت دنوں سے اِک چھوٹے سے قد والے اور اچھی نسل کے کتے کے پلّے کی تلاش تھی۔

گھر کے بچوں نے بڑے شوق اور پیار سے اس پلّے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند گھڑیوں کے لیے اس ننھے سے پلّے کے آنے سے گھر میں خوشی اور ہماہمی سی چھا گئی تھی اور گھر کا ہر ایک بچہ اس پلّے کو اپنی گود میں لینے کو بے چین ہو رہا تھا۔ کالے سیاہ اور چمکیلے رنگ کا ریشم جیسے ملائم روئیں والا ننھا سا پلّا ہر کسی کو بڑی خوشی سے تک رہا تھا اور رہ رہ کر اس کا ننھا سا جسم کانپ کانپ اٹھتا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ معصوم افسردہ اور مظلوم آنکھیں۔ نہ جانے اس کی زندگی کا کون سا درد تھا جس کی کراہ اس کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔ اوما نے اس کو بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ گرم گرم کالے ریشم کے گچھے جیسا ملائم بچہ اس کے ہاتھوں میں تھرتھرا رہا تھا۔ اوما کو اس بچے کی ماں یاد آ گئی۔ ماں کی گود سے چھوٹ کر شاید یہ بچہ اس طرح سے سسک رہا تھا۔

اس نے بڑے پیار سے اس کپکپاتے ہوئے بچے کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ خود اس کے اپنے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور اس کے مرجھائے لبوں پر اس ننھے سے بچے کو چوم لینے کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بے اختیار جھک گئی۔ مگر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ اس کی گود میں سمٹا ہوا آنکھیں بند کیے ایک کتے کا بچہ سو رہا تھا۔

اوما کے جسم کی گرمی میں پلّے کو شاید اپنی ماں کی ممتا مل رہی تھی۔ بچے نے پل بھر کے لیے اوما کی گود میں اور بھی سمٹتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر اس کو دیکھا اور پھر بڑے آرام سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اوما دھیرے دھیرے بچے کا ننھا سا سر سہلاتی رہی اور پھر اس کے لبوں پر آپ ہی آپ کوئی نغمہ مچلنے کو بے قرار ہونے لگا — نغمہ؟ — مگر کون سا گیت؟ لبوں کی ان تھرتھراہٹوں پر کسی راگ، یا کسی لے کی ضرورت ہی کیا تھی۔؟ کس لیے تھی؟ اوما نے دل کے اندر اٹھتی ہوئی جب اس پکار کو روکا اور جب اپنی روح کی اس پیاسی طلب کو کچلا تو بے اختیار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اور پھر اس کے ہونٹوں سے کسی لوری کی جگہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کی ایک کراہ ٹکرا کر رہ گئی۔ اور یہی وہ پہلا دن تھا جب اوما نے بچے کو اپنی گود میں تھپک تھپک کر سُلایا تھا اور بہت سے ناموں میں سے تلاش کر کے اس کا نام پوپی رکھا تھا۔

آنکھوں کی پتلیوں سے لے کر سر سے پیر تک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا نرم نرم بچہ جب اوما کو دیکھ کر خوشی کے مارے اُچھل اُچھل پڑتا تو اس کے اس پیار کو دیکھتے ہوئے اوما کا دل نغموں سے بھرپور ہو جاتا تھا۔ وہ اس کو بڑے لاڈ سے پکارتی — پوپی — پوپی — اور پوپی جہاں کہیں بھی ہوتا دوڑتا اُچھلتا کودتا ہوا اوما کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگتا تھا۔ وہ اس کے پیروں کو چاٹتا، کبھی اس کی گود میں اُچک کر بیٹھ جاتا اور جب

تھا جاتا تو پھر اوما کی ہچکیوں سے کھیلنے لگ جاتا تھا۔ یہی اس کی محبت کا اظہار تھا اور بس یہی اس کے پیار کی انتہا تھی۔

اوما کی زندگی جس تپتے ہوئے سنسان صحرا میں گزر رہی تھی اس کو اوما کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا — دریا کے ساحل پر کھڑی ہو کر بھی وہ پیاسی تھی، اس کی تمناؤں کی ساری کلیاں اس کے غم کی آنچ سے جھلس چکی تھیں۔ فطرت نے جیسے اس کی زندگی کو خوشیوں، مسرتوں اور پیار میں سے کچھ بخشا ہی نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اور ان ساری ناکامیوں سے گزرتے ہوئے بھی وہ ہر کسی کی مسرتوں میں حصہ دار بن کر اپنے آپ کو بہلا دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی قسمت کا کبھی گلہ نہیں کیا۔ جہاں کہیں آرزوؤں اور مسرتوں کو روشن دیکھتی، وہ بڑے خلوص اور پیار سے ان چمکتی ہوئی کرنوں کو اپنی زندگی کے دامن میں سمیٹ لینے کو آگے بڑھتی اور پھر ان ملتے ہوئے اُجالوں سے اپنے دل کی تاریک دنیا کو سنوارتی سجاتی اور ان جگمگاہٹوں میں اپنے غموں کو بھول جاتی اور اس طرح سے چند دنوں کے لیے اس کو ایک پُرفریب سہارا مل جاتا تھا۔ مسرتوں کے یہ چند لمحے اُسے بہلاوے دے جاتے اور پھر وہ اپنے آپ کو اپنے گرد و پیش کو اور اپنی ازلی اور ابدی تاریکیوں کو فراموش کر بیٹھتی۔ اس کی آنکھوں کی اُداسی مٹ جاتی اس کے ہونٹوں پر بھی تبسم ہوتا پھر وہ بھی کچھ نقشے بنانے لگتی۔ اس کے تصور میں بھی پھول مسکرانے لگتے اور پھر وہ اپنے خیالوں میں منہمک ہر ایک نقش و نگار میں تیزی سے رنگ بھرنے لگتی۔ لال پیلے۔ ہرے۔ گلابی۔۔۔ اور پھر سیاہ رنگ، اور اسی ایک سیاہ نقطے پر آ کر وہ چونک پڑتی تھی۔ اپنا ناس اس کو جیسے ہوش آ جاتا تھا۔ یہی سیاہی یہی تاریکی اور اسی اندھیرے نے تو اس کی زندگی کو تاریک کر دیا ہے۔ اس کی آرزوؤں کے سارے حسین رنگوں کو انہی سیاہیوں نے اپنے اندر جذب کر رکھا تھا۔ اور اوما بڑی بے بسی میں اچانک پھر اپنی جانے پہچانے ہوئے اندھیروں میں ڈوبتی چلی جاتی تھی کہ ڈوبتے ہوئے بھی اس کی کمزور انگلیاں "دور کھڑی مسکراتی اور شاداب زندگی کا جگ سے دامن تھام لیتیں اور جیسے سسکتی ہوئی کہتیں — مجھ کو بھی — اپنی ان مسکراہٹوں سے تھوڑا سا سہارا دے دو"

اس طرح اسے مسرتوں کی مانگی ہوئی چند کرنوں کا اجالا مل جاتا اور پھر یہی اس کی تسکین اور جینے کا سہارا بن جاتا تھا۔ اوما کا ایک خوبصورت گھر تھا۔ جس میں اس کا شوہر ہرلیش تھا۔ اس کی ساس تھی اور سسرالی خاندان کے بہت سے پیارے پیارے بچے بھی تھے مگر اس جگمگاتی ہوئی دنیا میں وہ ایک دم اکیلی تھی۔

اس کے شوہر ہرلیش کو ساری دنیا اور ساری انسانیت سے اتنا پیار تھا کہ ایک اکیلی لڑکی پر توجہ دینے کی اس کو بھی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ وہ ساری دنیا کو امن اور شانتی کی زندگی کا حق دلوانا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے بڑے بڑے مسائل تھے۔ وہ ایک ایک گھر کو جنت بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر جہاں ہرلیش کے اتنے اونچے اونچے ارادے ہوں، جہاں وہ ساری دنیا کو سنوارنے کا تصور کر رہا ہو وہاں اک بیچاری اوما کے معصوم دل کی سنسان گلیوں کو کیسے گلزار بنا سکتا تھا۔؟

ہرلیش اس کو بہت پسند تھا۔ اس کو اپنے شوہر کا درد بھرا دل اور دوسروں کے دکھوں پر چھلک جانے والی آنکھوں سے بڑا پیار تھا۔ اوما نے ہرلیش کے حساس اور انسانیت کے خدمت گزار جذبوں کو سر اور آنکھوں سے لگایا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ہرلیش کی محبت کے ساتھ ایک غرور بھرا نشہ بھی چھپا رہتا تھا۔ جب گزرتے ہوئے وقت نے رفتہ رفتہ ہرلیش کو اس سے چھین لیا اور ہرلیش آہستہ آہستہ اوما کی زندگی اور اس کی ساری امنگوں سے دور ہو کر اپنے آپ کو کھوتا چلا گیا۔ تب اوما کو محسوس ہوا کہ وہ ایک دم اکیلی رہ گئی ہے۔ کچھ دنوں تک تو اس نے ہرلیش کے لوٹنے کا انتظار کیا۔ مگر ہرلیش اب اتنی بلندی پر پہنچ چکا تھا جہاں سے اسے اوما کا وجود اس کی نگاہوں میں ایک نقطے کے برابر رہ گیا تھا۔ دنیا

کہ ہریش کی زیادہ ضرورت تھی اور اوما کو ایک آرام پہنچانے والے گھر کے سوا اور کیا چاہیے تھا؟۔

ہریش کا سارا دن اور راتوں کے خواب تک اس کے اپنے نہ رہے تھے۔ بڑا گداز تھا اس کا دل۔ وہ ہر انسان کی زندگی کی قیمت کو جانتا اور اس کو جینے کا صحیح انداز سکھانا چاہتا تھا۔ ہریش اور اوما کے درمیان آسمان کی بلندیاں اور زمین کی ساری وسعتیں حائل ہو چکی تھیں۔ جہاں ساری انسانیت کو ہریش کے خلوص اور خدمت کی ضرورت تھی۔ وہاں ایک فرد پر جو ایک آرام دہ گھر میں رہنے والی اس کی بیوی تھی۔ ہریش کو اس کی طرف توجہ دینے کا احساس بھی بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ آسائش کی زندگی میں تشنگی کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ اور اسی لیے اوما ہریش کی ٹھنڈی آنکھوں میں اپنے لیے کسی جذبے کا اظہار نہ پا کر تڑپ سی جاتی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ راکھ کے اس ڈھیر میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بنا کر رکھ دے۔

دونوں ایک دوسرے سے ملتے، باتیں کرتے، حیات کی باریکیوں اور آرزوؤں کی تشنگی اور تکمیل پر بھی جی کھول کر گفتگو کرتے۔ کبھی کبھی اُسے یقین ہو جاتا کہ جیسے ہریش نے اس کی پیاسی روح کے کرب کو پہچان لیا ہے۔ مگر پھر جب دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تو اُن کے ذہنوں پر ایک اجنبیت اور دوری کا تکلیف دہ اثر باقی رہ جاتا تھا اور یہی اذیت رساں ماحول اوما کو حد سے زیادہ مضطرب بنا دیتا تھا۔ کیا یہی چند چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں اور چند الجھے سلجھے گزارے ہوئے لمحے اس کی زندگی میں لطف دینے والے راستے بن سکتے تھے؟ مگر ایک ضد کے سوا اس کی نگاہوں کے سامنے اور کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔

ہریش جب اوما سے بہت دور دور رہنے لگا تو اس نے گھر کے ننھے ننھے بچوں کے پیار میں اپنے لیے ایک پناہ ڈھونڈلی تھی۔ اس نے بڑے صبر کے ساتھ ہریش کو ساری دنیا کے حوالے کر دیا تھا۔ اور خود اپنے گرد وہ بچوں کے پیار کا ایک جال بننے لگی تھی۔ وہ ان معصوم تمناؤں کو بڑی لگن سے پورا کرنے کا اہتمام کرتی، ان کے کھیلوں میں شریک ہوتی، بڑے چاہ سے گڑیوں کا بیاہ رچاتی۔ اور ان بچوں کی محبت میں اتنی غرق ہو کر رہ گئی تھی کہ اس کو اپنی زندگی کی کسی تشنگی کا کوئی احساس بھی باقی نہ رہا تھا۔ مگر بچے اوما کے کبھی اپنے نہ بن سکے۔ وہ ان بچوں کو بڑی حسرت اور حرص کی نگاہوں سے اپنی ماؤں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ اور پھر وہ اپنے اکیلے کمرے میں دیر تک روتی رہتی۔ اور پھر اس کو یاد آتا کہ کبھی کسی بچے نے اوما کے گلے سے لگ کر اس کو پیار نہیں کیا تھا، اس کے انتظار میں بے چین نہیں ہوا تھا۔ اوما کو کتنی تمنا تھی کہ کوئی اپنی نازک اور کومل بانہوں کو اس کے گلے میں ڈال کر روٹھے ہوئے انداز میں کہتا کہ تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟ مگر یہ کھنکتی ہوئی اس میں ڈوبی ہوئی آواز اس کو کبھی سنائی نہ دی تھی۔

اس کے دل کے ٹکڑے ہو کے رہ گئے تھے۔ وہ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا تھی۔ مایوس، بے سہارا، بیزار، چڑچڑی سی، اس کو اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا تھا اور اب اس کا جی ساری دنیا سے اچاٹ ہو کر مرنے کی تمنا کرنے لگا تھا۔ مگر اب کتے کے اس چھوٹے سے پلّے کو پا کر اوما کو ایک ذرا سی تسکین مل گئی تھی۔ یہ کوں کوں کرتا ہوا بچہ صرف اس کا اپنا تھا وہ جتنی دیر تک چاہتی اس سے کھیل سکتی تھی۔ اس کو اپنے قریب رکھ سکتی تھی۔ اوما کے اس پیار میں کوئی دنیا اور کسی بچے کی ماں کا پیار کبھی حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس ننھے سے پلّے کا سارا پیار صرف اوما کے لیے تھا۔ اسی تھکی ہاری ہوئی اوما کے لیے جس کی اپنی محبت اور چاہت کو کبھی کوئی سہارا نہ ملتا تھا۔ اور جو اپنے دل کی پیاس مٹانے کے لیے اب تک گرم ریتوں پر سراب ہی کی طرف دوڑتی رہی تھی مگر قسمت نے اس کے تلووں میں چھالوں

کی ٹیس کے سوا کبھی کچھ نہ دیا تھا — اور اب وہی درد اور وہی ٹیس اس کی زندگی کا ناسور بن کر رہ گئی تھی۔

کالے ریشم کے گچھے جیسا بچہ، اچھلتا کودتا اب دھیرے دھیرے کچھ بڑا سا ہوتا جا رہا تھا۔ ادما اس کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتی، بڑے پیار سے تھپکار کر نہلاتی پھر اس کو بڑی نزاکت سے روئیں دار تولیے میں لپیٹ کر اپنی گود میں اٹھا لیتی، ہلکے ہلکے ہاتھوں سے اس کے بالوں پر برش چلاتی — بڑے لاڈ سے پکارتی — پوپی — میرے اپنے پوپی — پھر وہ نہلائے دھلائے پوپی کو اس کے گدّے پر لٹا کر تھپکتی ہوئی دھیرے دھیرے گنگناتی — ہوں — ہوں — ہوں ہوں — سو جا،

" میرے پوپی سو جا — راج دُلارے سو جا " ننھا پوپی سارے گھر میں اُچکتا پھرتا تھا۔ ادما جہاں کہیں بھی ہوتی پوپی کو اس کے بغیر قرار نہ آتا تھا۔ وہ اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ کر سو جاتا۔ کبھی سر اٹھا کر دیکھتا، اس کے پیر کی انگلیوں سے کھیلتا اور پھر کبھی کسی شریر بچے کی طرح اس کا آنچل پکڑ کر کھینچتا رہتا تھا۔ اس گھڑی ادما کا جی چاہتا کہ وہ آنکھیں بند کیے اور حقیقت سے نگاہیں چرائے ان لطیف احساسات و جذبات کو ہمیشہ کے لیے اپنی روح میں سمیٹ لے۔ اپنے دل میں بھر لے!

ادما نے اس کے گلے میں بڑے لاڈ سے گھنگھروؤں والا پٹہ ڈال دیا تھا اور جب پوپی کے ہر قدم پر گھنگھروؤں کا نغمہ گونجتا تو اس کی مدھر سریلی آواز بڑی اچھی لگتی تھی۔ اب اس کو ایسا لگتا تھا۔ جیسے اس کی تنہائیاں دور ہو گئی ہوں۔ اس کے قدموں میں سوئے ہوئے پوپی کی گرم لمس کا احساس محفوظ ہو چکا تھا اور اس کے کانوں میں گھنگھروؤں کی بجتی ہوئی آواز کا سرور چھا گیا تھا۔

پوپی ادما کا کھلونا تھا — پوپی کے کھیل کا عجیب سا انداز تھا، کبھی پیار کرتے کرتے وہ انجان بن کر اس پر بھونکنے لگتا تھا۔ کبھی اس کو کاٹنے کے لیے دوڑا دوڑا کر تھکا دیتا۔ پھر جیسے اس کو ادما پر رحم آ جاتا اور وہ اپنا ننھا سا سر اٹھائے اپنی معصوم آنکھوں سے اس کو تکنے لگتا اور اس گھڑی ادما پوپی کی ان خاموش آنکھوں کی دکھ بھری بے بسی کے اظہار سے لرز اٹھتی تھی۔ پھر وہ سوچتی کہ پوپی کی آنکھوں میں یہ دنیا بھر کا درد کہاں سے بھر آیا ہے؟ کہیں یہ ادما کے اپنے غموں کا عکس تو نہیں جو پوپی کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔

پوپی — جب بھی ادما کی گود میں آ کر بیٹھ جاتا۔ اس کو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کے اندر دبی ہوئی ممتا اچانک جاگ اٹھتی ہے اس کو اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ اس کی گود خود سے پھیلتی اور پوپی کے جسم کی گرمی اور نرمی کو پا کر پھر سمٹ جاتی ہے۔ ادما کا جی اداس ہو جاتا۔ اس پر ایک گم سُم مندی سی چھا جاتی تھی۔ اس کو اپنی ذلت کا شدید احساس ہوتا۔ اس کی زندگی میں صرف ایک پوپی کا وجود ہی اس کا اپنا تھا۔ اور پوپی — جو کتے کا صرف ایک چھوٹا سا بچہ۔ اور وہ اس حقیقت پر تلملا کر رہ جاتی — اس کے تومن کے اندھیرے میں روشنی کا کوئی چراغ کبھی جلا ہی نہ تھا۔

مگر — ان سب باتوں کے باوجود پوپی اس کو پیار کرتا تھا، اور وہ پوپی سے زیادہ دیر تک جدا بھی نہ رہ سکتی تھی۔ ادما کو اس بات کی خوشی تھی کہ کسی کو اب اس کی تلاش رہتی تھی اور پوپی اس کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتا اور ادما کو پا لینے کی مسرت میں جیسے وہ جھوم جھوم اٹھتا تھا۔

ایک شام کو مہمانوں کے پاس پوپی نے ادما کے آنچل کا کونا بہت کھینچا۔ نہ جانے وہ کیا چاہ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے پیروں سے لپٹتا رہا اور کچھ دیر میں ادما کی ساڑی کے کناروں پر سو گیا۔

جب وہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے اٹھی تو پوپی مشکلوں سے جاگا۔ اس نے ایک بار ادما کو سر اٹھا کر دیکھا اور چلا گیا۔ جاتے ہوئے دیر تک اس کے گھنگھرو بجتے ہوئے سنائی دیتے رہے چھن چھن چھن — یہ آواز ادما کو بڑی پیاری لگتی تھی۔ سردیوں کی دبلی ہوئی اس

کے تخیل میں بجتے ہوئے گھنگھروؤں کے ساتھ ننھے ننھے خوب صورت سے پاؤں بھی جھلک جھلک پڑتے تھے۔

رات کو ادما نے جب پوپی کو کھانا کھلا کر سُلانے کو پکارا۔ تو پوپی کے گھنگھروؤں کی آواز کہیں سُنائی نہ دی۔ ادما کی پکارتی ہوئی آواز میں خوف کی تھرتھراہٹ اُبھرنے لگی تھی ——" پوپی "۔ "پوپی تم کہاں ہو؟" مگر پوپی کہیں سے دوڑتا ہوا نہ آیا۔ ادما کا جی بے چین ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک پڑے۔ وہ بے اختیار پکار اٹھی،۔

"پوپی۔ تم بھی مجھے چھوڑ نہ دینا۔" مگر گھنٹوں کی تلاش پر بھی پوپی کا کہیں کوئی نشان نہ ملا۔ شاید کوئی اس کو چرا کر لے گیا تھا۔

ادما پوپی کو پکارتی پکارتی، جب تھک کر مایوس ہو گئی تو وہ دیوانہ پن میں ڈرتی ہوئی ہریش کے آفس میں گھس گئی اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی بڑے درد سے بولی۔

"ہریش —— پوپی بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔"

کارڈیئک دمہ

انور سجاد

چھپا چھپا کارڈیئک دمہ دندناتا گویا کہ لفظ و آواز کا تعلق ہی منقطع، زخرہ بریدہ
خرِ مسیحا کی ہنہناہٹ بس ایک لمحہ فشار میں ہے۔
عجیب ضیق النفس کی صد رنگ پنیاں دھند خواب —
مطلع پہ کوندنے کو تڑپ رہی ہیں۔
— (افتخار جالب)

پرندے ان گنت پرندے آسمان کی تمام سمتوں سے اُڈتے ہوئے سیاہ غبار کے بارڈروں پر اپنے پروں کے بند باندھنے کی کوشش میں غبار کی قوت اور رفتار کے سامنے خس و خاشاک، طوفان ہے کہ اڈتا ہی چلا آتا ہے۔

پرندے، اُن گنت پرندے اپنی اپنی بولیوں اپنی اپنی آوازوں میں صدائے احتجاج بلند کرنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ سیاہ غبار میں اڑتی منوں کالی مٹی کے کروڑوں ذرات ان کی چھکی چونچوں سے داخل ہو کر ان کے پھیپھڑوں پر جم جاتے ہیں۔ ہر پل ان کا سانس اکھڑتا ہے۔ نفظ ہیں کہ بریا حلق میں آکر پھول جاتے ہیں۔ پرندوں کے کانپتے دل خون کو پھیپھڑوں میں پمپ کرنے کی سعی میں اور بھی زور سے دھڑکتے ہیں پھیپھڑے لہو کو آکسیجن مہیا کرنے کے بجائے اس میں مٹی کے ذرات گھول دیتے ہیں، صدائے احتجاج خون اور مٹی کی دلدل میں پھنس جاتی ہے۔

پرندے بے دم ہو جاتے ہیں۔

ان میں سے ایک آدھ، دو ڈھائی یا تین ساڑھے تین کی صدا کے خطرے سے آگاہ ہو کر مٹی کے طوفان میں کیمو فلاج منفی اور مثبت بادل ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ رعد چمکتی ہے، کڑکتی ہے اور بڑی تیزی سے بڑھ کر ان ایک آدھ، دو ڈھائی یا تین ساڑھے تین پرندوں کو بھسم کر ڈالتی ہے۔ باقیوں کا سینہ دھونکنی بن جاتا ہے، اور وہ ضیق النفس اپنے سانس کی تلاش میں آسمان کی تمام سمتوں سے اڈتے ہوئے گرد و غبار کے طوفان کے عین وسط میں شفاف آسمان کے نقطے میں نقطہ ہو جاتے ہیں۔

وہ، دروازوں کھڑکیوں گلیوں بازاروں میں چیختی چنگھاڑتی گرد آلود تیز و تند ہوا کے وار اپنے سینے پر سہتا، پھڑپھڑاتے لباس کو تھامتا ہانپتا، آنکھوں کی جھرّیوں سے بصد مشکل دیکھتا بازار کا موڑ مڑتا ہے۔

پلک جھپکتے میں، ہلکا پیلا نارنجی لیلا سُرخ ہلکا آسمانی رنگ فریب نظر نہیں رہتا، پرانی بوسیدہ، ترچھی ہوئی عمارات، نئی سیمنٹڈ، لنٹل کی چھتوں والی بلڈنگوں کو شگافتی بجلی، صحراؤں ویران جنگلوں، بستوں شہروں رستے بستے راستوں پر دندناتی ہوا اور ہر دروازے ہر کھڑکی ہر روزن ہر جگہ ہر لمحہ ہر سانس سے چھننے والے کالی مٹی کے کروڑوں ذرات کی صورت کنکریٹ حقیقت بن جاتا ہے۔

عین اس وقت جب تاریکی پھیلتی ہے، بجلی کے لاتعداد تار ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ جھلک جھلک دھائیں دھائیں۔ شعلوں کی روشنی، چنگھاڑ کی آرزو لئے تاروں کے دہانوں میں غرق ہوتی ہے۔ سارا علاقہ، سارا شہر، ساری کائنات، سب کچھ تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔

نشلی کڑکتی بجلی کا شور، مٹی کے ذروں کی سازش طوفان کے کاندھوں پہ سوار، ایک ہاتھ نرخرے کے منہ پر رکھتی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے دل سے اُمڈ کر بڑی شریان میں موجزن لہو کو روکتی ہے۔

سانس سانس سانس

دل سمٹ کر اس ہاتھ کے ساتھ زور سے ٹکراتا ہے، پھیلتا ہے، قوت سمیٹتا ہے پھر ہاتھ سے ٹکراتا ہے۔

سانس سانس

پھیلتا ہے، پھیلتا ہے پوری قوت سے ٹکراتا ہے۔

ہاتھ لمحہ بھر کے لئے شریان کے منہ سے سرکتا ہے، لہو بڑھتا ہے۔

ہاتھ لمحہ بھر کے لئے نرخرے کے منہ سے سرکتا ہے، ہوا اترتی ہے۔ مٹی کے ذروں کی سازش۔ سانس کی نالیوں سے لوری کی صورت ابھرتی ہے۔

سو جا راج دلارے سو جا

کروٹ بدلتے ہی اس کی مُندی آنکھوں کی جھریاں اور بھی چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، ہوا کے سامنے سینہ سپر ایک ہاتھ دل پہ رکھتا ہے، دوسرے ہاتھ سے آنکھوں میں رڑکتی ریت کو سہلاتا بڑھتا ہے۔

ضیق النفس۔ سانس کی نالیوں سے ذرات کی لوری

سو جا راج دلارے

—— کیا مصیبت ہے، طوفان ختم ہوتا ہے نہ غبار چھٹتا ہے۔ سانس آتا ہے نہ موت آتی ہے۔

سامنے سے آتا ہوا کوئی شخص اس سے ٹکراتا ہے۔ دونوں اپنی آنکھوں سے ہاتھ اٹھا کر گرد و غبار کی چادر کے پار ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، دونوں ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔

—— معاف کرنا بھائی۔

آنکھوں کو رگڑ کر، سانس کی پھانس کو سہلاتے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تمام علیس بازاروں، گلیوں شاہراہوں پہ لوگ اپنے اپنے سانس کی تلاش میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور معاف کرنا بھائی کہہ کر پھر سے بھٹکنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹروں نے اس سے کہہ دیا ہے۔ اسے کسی قسم کی گرد سے الرجی نہیں بلکہ اس کا دل پھیل رہا ہے، جس سے وہ چھوٹا ہو رہا ہے۔

وہ چلتا جا رہا ہے۔ راستہ لمبا ہے۔ اسے کوئی سواری نہیں ملتی۔ رکشہ، تانگہ، ٹیکسی، سب اسے بٹھانے سے انکاری ہیں۔ پیدل چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ وہ ہر قدم پر اپنا سانس سمیٹتا ہے۔ اس کا دل بے بس ہوتے ہوئے بھی اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔ وہاں پہاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی

وادی میں نصب اس بڑے پنڈال میں لوگ اس کے منتظر ہیں۔ یہ سب اس کے کہنے پر وہاں جمع ہوئے ہیں۔ اسے ان لوگوں سے چند باتیں کرنا ہیں چند پیغام دینا ہیں۔ راستے میں اڑتی دھول، انگزاسٹ پائپوں سے نکلتے پٹرول کاروں کے بخارات، ڈیزل بسوں کا حلق دھواں

سانس کیسے سمیٹا جائے

خیال لفظوں کی ماں، لفظ آواز کی کوکھ میں تڑپتے ہیں کہ سانس پر گرد، بخارات، دھوئیں کا پہرہ ہے۔

وہ ہانپتا کانپتا پنڈال میں پہنچتا ہے۔ لوگوں پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ وہ مائیکروفون کے سامنے آتا ہے۔ سب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں وہ پھولے ہوئے سانس کو قابو میں لانا چاہتا ہے۔ اس کا دل سرخ سرخ خون پھیپھڑوں کو منچانے میں پوری قوت صرف کر دیتا ہے لیکن اس کا دل پھیل رہا ہے۔ چند باتیں چند پیغام اس کے دل میں پڑے اتنے وزنی ہو جاتے ہیں کہ دل پھیلنے لگتا ہے۔ زبان پیاسی رہ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ سرخ دھبے ناچنے لگتے ہیں۔ اس کی نظریں ان دھبوں کو یکجا کرنے کی کوشش میں ان دھبوں کے ساتھ ناچنے لگتی ہیں۔ لوگ آواز آواز کا شور مچانے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سرخ دھبے جو اس کی آنکھوں میں رقصاں ہیں ان لوگوں کو نظر کیوں نہیں آتے۔ لوگ آواز آواز کا شور مچائے جاتے ہیں۔ ان سرخ سرخ دھبوں کو زبان چاہیے۔ زبان کے لئے آواز چاہیے اور آواز کے لئے سانس جس پر گرد اور دھوئیں کا پہرہ ہے وہ بولنے کے لئے منہ کھولتا ہے۔ چہرہ اور سخت ہو جاتا ہے۔ سانس اور ڈوب جاتا ہے۔ وہ ایک لفظ تک نہیں کہہ پاتا۔ وہ اپنی آنکھوں میں رقصاں سرخ دھبوں کو مجتمع کرنے کی کوشش میں ہانپتا لرزتا ہے اور میز کا سہارا لے کر بیٹھ جاتا ہے۔

اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ اگرچہ طوفان کا زور ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگ ابھی تک راستوں پر دھوکیاں بنے یک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔

ــــ معاف کرنا بھائی۔

وہ لوگوں سے ٹکراتا، گرتا پڑتا اپنے تنفس میں الجھتا اپنے گھر تک پہنچتا ہے۔ بند دروازے پر ہاتھ رکھ کر سیٹ لگاتے اور دروازے کے ساتھ سرکتا ہوا دہلیز کے آگے سیڑھی پر بیٹھ جاتا ہے۔ گھر کے دروازے میں تالا پڑا ہے جس کا بھید اسے نظر آئے تو وہ چابی لگائے، داخل ہو لیکن گھر میں بھی تو دھی گرد آلود، دکی ایانیں یا کچھ غبار سا تو ہوگا۔ اس لمحے اس سے وہ گھر کی سیڑھی پر بیٹھے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹوٹتے ہوئے سانسوں کی کڑیاں دیلیڈ کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ کان میں کی زبان سے ابھرتی، تیز و تند ہوائی چیخیں رفتہ رفتہ مدھم پڑنے لگتی ہیں۔

اس کے کانوں میں چیخوں کی آواز آتی ہے۔

ــــ نہیں خدا کے لئے نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔

ــــ طوفان آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن یہ کیسی آندھی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔

شور، رفتار، تیزی، ہوا، لوگوں کے شہروں میں لوگوں کی گلیوں میں لوگوں کے مکانوں میں، لوگوں کے جسموں میں دم سادھ کر گھات لگائے بیٹھی ہے۔ ساری کائنات میں مٹی کے ذرات معلق ہیں چپ چاپ۔ خاموش۔ ایک دوسرے کو تھامے خلا میں معلق ہیں۔

چیخ، اکھڑتے ہوئے سانسوں کو تھامے پھیپھڑوں کی نالیوں کے لیبرنتھ میں راہ ٹٹولتی ہے۔

میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں پاؤں پڑتی ہوں۔

دیو قامت، توانا ہیکل جوان بازو پھیلائے ہاتھ بڑھائے الف ننگا اس کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ لرزتی، اپنے تار تار لباس سے تن ڈھانپنے

کی سی کرتی کوشش میں سمٹتی ہے۔

گنے چنے چند علاقوں میں برقی رو واپس آجاتی ہے۔ لیکن گرد کے ذرات میں جکڑی، روشنی وہیں محصور ہوجاتی ہے۔

دیوقامت، قوی ہیکل جوان اپنی آنکھوں سے سانپ کی نظروں کا وار کرتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے۔ لڑکی کا سارا جسم پسینے میں نہاجاتا ہے۔ اس کی گول گول دودھیا چھاتیوں پر ناخنوں کے زخموں سے رستا ہوا اس کے پسینے میں گھلتا ہے اور اس کے پیٹ سے بہتا ہوا رانوں کے درمیان جذب ہوجاتا ہے۔ دیوقامت، قوی ہیکل جوان ایک ہی جست میں اس لڑکی کو فرش پر گرا کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے۔ ایک ران پر گھٹنا ٹیک کر اسے فرش پر مصلوب کردیتا ہے۔ لڑکی، ہوا کے لیے تڑپتی، لفظوں کو جنم دینے کے لیے سانس کی کھوج میں لہولہان ہوجاتی ہے

وہ گھر سے باہر سیڑھی پر بھیانک دروازے کے ساتھ سرکتا سیڑھی پر روانہ ہوجاتا ہے۔ لڑکی کی چیخوں کی بازگشت اس کے جسم کے ریشے ریشے میں تڑپتی ہے سانس لینے کی جدوجہد میں اس کا رُواں رُواں تشنج میں گرفتار ہوجاتا ہے۔

—— یہ غبار چھٹتا کیوں نہیں۔ یہاں روشنی کیوں نہیں ہوتی۔

اس کے ہاتھ کی گرفت، اپنی جیب میں چابی پر اور بھی مضبوط ہوجاتی ہے۔ وہ اندر جاکر آرام سے بستر پر لیٹنا چاہتا ہے۔ سانس تھمے تو اٹھے، روشنی ہو تو دروازہ کھولے۔ وہ اسی تشنج میں گرفتار، کالی مٹی کے ذروں کی سازش کو سانس کی نالیوں سے لڑنے کی صورت سنتا ہے۔

سو جا راج دلارے سو جا۔

وہ پوری قوت سے آنکھیں کھول دیتا ہے۔ مٹی کی کرچیاں آنکھوں کو چھیدتی ہیں۔

میرے سینے پر منوں بوجھ ہے۔ میں کروٹ لینا چاہتا ہوں، ہل نہیں سکتا۔ ہاتھ اٹھانا چاہتا ہوں، ہلا نہیں سکتا۔ پکارنا چاہتا ہوں، پکار نہیں سکتا۔ میرے پھیپھڑے بوجھ تک پھیلنے سے معذور ہیں۔ میں پوری قوت سے چلاتا ہوں۔ لیکن خیال لفظوں کی ماں، لفظ آواز کی کوکھ سے جنم لینے کی آرزو میں تڑپتے ہیں۔ کہ وہ پرندے جو آسمان کی تمام سمتوں سے اڑتے کالی مٹی کے غبار کے عین وسط میں، شفاف آسمان کے نقطے میں نقطہ بنے تھے، ابھی تک سانس کی نوید لے کر نہیں آئے۔

ہزاروں سال لمبی رات

رتن سنگھ

سننے والے اس کی بات کو بڑے انہماک سے سُن رہے تھے، حالانکہ سنانے والا جوان سب کے بیچ بیٹھا ہوا تھا، بالکل اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا۔ ان میں کہیں کوئی تسلسل نہیں تھا۔ بات کرتا کرتا وہ خود ہی بہک جاتا۔ جیسے راہ چلتا مُسافر اپنی راہ سے بھٹک کر کسی غلط راستے پر چل نکلے۔ ایک بات کو ادھوری ہی چھوڑ کر وہ کسی دوسری بات کا سرا پکڑ لیتا۔۔۔ اس طرح رات بہت دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

وہ سب کے سب ریلوے سٹیشن کی طرف جانے والے بازار کی ایک دوکان کے برآمدے میں آکر رات کاٹنے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب ان میں سے سب سے بوڑھے آدمی نے گلا صاف کرتے ہوئے کسی راجہ کی بات شروع کی تو اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سب کے سب آدمی ہنکارا بھرنے لگے۔ "ہوں"۔ "ہاں"۔ "پھر کیا ہُوا بابا"

بس پھر کیا تھا۔ بات چل نکلی۔

ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سات رانیاں تھیں، ساتوں رانیوں کے لیے بادشاہ نے الگ الگ محل بنوائے۔ ایک لکڑی کا۔ دوسرا اینٹ گارے کا۔ تیسرا سنگِ مرمر کا۔ چوتھا تانبے کا، پانچواں چاندی کا۔ چھٹا سونے کا تھا، اور ساتویں میں ہیرے جواہرات جڑے تھے۔

"بالکل ٹھیک"۔ کسی نے ہنکارا بھرا۔

اتنی دولت ہونے پر بھی بادشاہ کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ بہت دکھی تھا۔ بادشاہ کو آخر کسی نے رائے دی کہ فلاں جنگل میں ایک پیڑ ہے۔ اس پر سات پھل لگے ہیں۔ اگر بادشاہ اُن پھلوں کو توڑ کر اپنی رانیوں کو کھلائے تو سب کے اولاد ہو جائے گی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اُس پیڑ تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ راستے میں سات دریا پڑتے تھے اور سات دیووں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اور پھر پیڑ کے گرد سانپوں کا زبردست پہرہ تھا۔ لیکن بادشاہ بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ وہ اپنا لاؤ لشکر لے کر چل پڑا۔

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ بوڑھے کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ جب اس کی سانس درست ہُوئی تو بوڑھا بہک گیا۔ اس نے ایک دوسری بات چلا دی۔

بڑی پرانی بات ہے ایک کاریگر نے ایک ایسا ڈنڈا بنایا جس کے اندر ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔ اس طرح وہ ڈنڈا آدمیوں کی طرح ہی بولتا تھا۔ چلتا پھرتا تھا۔ کھاتا پیتا تھا۔

"ٹھیک"۔ "ٹھیک"۔ قریب قریب سب نے مِل کر ہنکارا بھرا۔

پھر اچانک یہ ہُوا کہ کاروں اور تانگوں کا ریلا شور مچاتا ہُوا سڑک پر سے گزرنے لگا۔ شاید سٹیشن پر کوئی مُسافر گاڑی رُکی تھی۔ اس لیے بوڑھا تھوڑی دیر رکا۔ پھر اس نے ایک مچھلی کی بات شروع کر دی جو اتنی بڑی تھی کہ اس کی پیٹھ پر باقاعدہ ایک شہر بسا ہُوا تھا۔ جس پر نہ معلوم کتنے ہی مکان

بنے ہوئے تھے، کتنے ہی کھیت تھے۔ سمندر میں جس طرف یہ مچھلی جاتی، اس طرف یہ بسا بسایا شہر چلا جاتا۔

"بالکل ٹھیک" سب نے ہنکارا بھرا "پھر ... "

اس طرح رات نہایت آہستہ آہستہ سرک رہی تھی، بوڑھا باتیں کیے جا رہا تھا۔ اور وہ سب کے سب غور سے سن رہے تھے۔ پھر کسی بات کو ادھوری ہی چھوڑ کر بوڑھے نے ایک نئی بات شروع کی۔

ہزاروں سال پہلے کی بات ہے۔ ایک بادشاہ نے آدھی دنیا فتح کر لی۔

"پھر"

پھر اس خوشی میں بادشاہ نے ایک بہت بڑی دعوت دی۔

"پھر" "پھر"

پھر کیا تھا اتنا کھانا بنایا گیا کہ بادشاہ کے شہر کے سارے مکانوں میں کھانا بنا بنا کر رکھا گیا۔

پھر۔ پھر۔ پھر۔ سبھی آدمی ایک ساتھ ہنکارا بھر رہے تھے۔

بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

سب سے پہلے بادشاہ اور اس کے رشتے داروں نے کھانا کھایا ..

"ٹھیک"

پھر سینکڑوں امیروں وزیروں نے کھانا کھایا۔

"ٹھیک"

پھر بادشاہ کے ہزاروں فوجیوں اور چنیدہ شہریوں نے کھانا کھایا

"ٹھیک"

اتنے لوگوں کے کھانا کھاتے کھاتے رات ہو گئی۔

ٹھیک۔

اور پھر سب کے بعد رات کے وقت لاکھوں غریب غربا اور فقیروں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

بالکل جھوٹ" بالکل جھوٹ" اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سبھی آدمی ایک ساتھ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان میں سے ایک آدمی بولا۔ بوڑھے۔ تجھے جھوٹی بات کرتے شرم نہیں آتی۔ اگر ہم نے رات کو پیٹ بھر کھانا کھایا ہوتا تو اس وقت چین کی نیند نہ سوتے ہوتے۔ رات بھر تمہاری یہ بکواس کون سنتا؟"

"ارے بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو" بوڑھے نے کچھ سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں بھی تو تمہاری طرح بھوکا ہوں۔ اگر مجھے بھی نیند آ رہی ہوتی تو یہ باتیں کرنے کے لیے جاگتا ہوتا۔ میں بھی تو سو جاتا۔"

نجات

عفری بخاری

مشین کی ہتھی گھماتے گھماتے اس کا ہاتھ شل ہو گیا اس نے چھوٹی چھوٹی کترنوں کو سمیٹ کر ٹوکری میں ٹھونسا اور مشین کو دھکیل کے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ دروازہ ایک بے ہنگم شور کے ساتھ کھل گیا تھا یہ خوب صورت چہرے والا عباس تھا۔ جو سائیکل کو گھسیٹتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ سائیکل کو دھم سے دیوار کے ساتھ ٹکا کر ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالتا وہ کمرے کے اندر چلا گیا — اس کی بشرٹ کا کھلا کالر اس کے چوڑے شانے پر پیچھے کی طرف گرا ہوا تھا۔ اور اس کا صحت مند جسم پسینے میں شرابور تھا — اس کا پسینہ بڑا بدبودار تھا ان دنوں تو دور سے ہی اس بو سے اسے ابکائی آنے لگتی — وہ ناک دبائے اندر گئی — کمرہ مرے ہوئے چوہے کی سی بدبو سے بھرا ہوا تھا۔ عباس نے اسے اپنے پیچھے آتا دیکھ کر مڑا اور اپنا پسینے سے تر چہرہ اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ یہ بڑا صبر آزما تھا اس کے لئے طبیعت پر جبر کئے رکھنا ناممکن تھا اس نے ایک جھٹکے سے اپنا منہ پیچھے کر لیا اور جلدی سے عباس کی اتاری ہوئی بنیان اور بشرٹ اٹھا کر باہر نکل گئی انہیں دھوپ میں ڈال کر وہ پلٹی تو عباس اس کی حرکت پر برہم ہو رہا تھا۔

"عجیب عورت ہے دوسری عورتیں میاں کے پیار کو ترستی ہیں اور یہ بھاگتی ہے کمبخت"

عباس نے دھم دھم دونوں جوتے اتار کر فرش پر دے مارے تو وہ انہیں بھی اٹھا کر لے گئی اور ہوا میں ڈال آئی کہ بدبو جاتی رہے۔

"دماغ دیکھو کیسا پریوں والا ہے"

جب وہ گلاس میں برف کا چورا ڈال کر لائی تو عباس نے اپنے بڑے سے بھدے ہاتھ میں گلاس دبوچتے ہوئے پھر گلاس کو ہونٹوں سے لگا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور بولا۔۔۔

"دفتر سے نکلتا ہوں تو بڑا خوش ہوتا ہوں مگر یہاں آکر تمہاری رونی صورت دیکھتا ہوں تو دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں آخر تم یہ ہر وقت مظلومیت کی تصویر کیوں بنی رہتی ہو کس ظلم کی چکی میں تمہیں باندھ رکھا ہے اچھا کھاتی ہو اچھا اوڑھتی ہو کوئی بندش نہیں پھر بھی یہاں کوئی دکھ ہے تو ماں کے پاس چلی جاؤ چند دن رہ آؤ۔ پانچ سال میں ایک دفعہ بھی نہیں گئی ہو کیا حرج ہے۔۔۔ ایک مہینہ ان کا کھا آؤ۔ مگر نہیں تم ان کا کھانا کہاں چاہو گی کیوں —؟"

عباس بھدے بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا —

اس نے بڑی بے زاری سے گلاس اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ دھوپ سے بھرے آنگن میں وہ ٹھٹکی اور لمحہ بھر کو آسمان کی طرف دیکھتی رہی شاید وہ آنکھوں میں امڈنے والے بے قرار آنسوؤں کو روکنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے گلاس رکھ دیا اور ایک لمبا ٹھنڈا سانس بھرا —

ان دنوں اس کا ذہن بڑھ رہا تھا اور پیٹ یوں بوجھل تھا جیسے کسی نے منوں پتھر باندھ دیئے ہوں مگر چہرہ پہلے سے زیادہ دبلا اور بے رونق ہوتا جا رہا تھا —— آنکھیں بھی اندر کو دھنس گئی تھیں ۔ مگر عباس نے کبھی اس کی بگڑتی حالت پر دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ اسے پہلے کی طرح ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب گھسیٹ لیتا ..... اور جب اس کے ہاتھ ادھر ادھر بھٹکنے لگتے تو وہ نرمی سے پیچھے کھسک جاتی۔

"کوئی اور بات کیجئے" ——

"اور بات کیا خاک کروں" — عباس اپنی نہایت خوبصورت آنکھوں سے اسے گھور کر کہتا اور بدمزہ ہو کر اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔

"جاؤ دور ہو جاؤ یہاں سے ، تم بالکل بے کار ہو ——"

وہ کروٹ لے لیتا۔

وہ ہولے سے کھسک کر اس کے قریب ہو جاتی اور اس کے چوڑے شانوں کے درمیان بڑی نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگتی ۔ اس وقت کسی معصوم بچے کی طرح وہ اس مضبوط جسم کی پناہ میں آجانے کی خواہش مند ہوتی ۔ مگر تبھی عباس گھوم کر اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پر زور سے مارتا اور چلا کر کہتا ۔

"جاؤ ——"

جب عباس دفتر میں ہوتا وہ بڑے الجھے انداز میں گھر کے خالی کمروں میں گھوما کرتی — اور اپنے متعلق سوچا کرتی —

شادی سے اسے کبھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی —— اس نے دل میں بیاہ نہ کروانے کا تہیہ کر رکھا تھا —— دراصل بیاہ کا جو تصور اس کے پاس تھا وہ بڑا گھناؤنا تھا۔ اور اس کا انجام اسے ہمیشہ ہر جگہ ایک سا نظر آتا — کھمبوں کی طرح پیدا ہو جانے والے بے شمار بچے بیمار اور پریشان ذہن۔ مسخ شخصیتیں حسد نفرت اور رقابت کے سانپ .....

اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت کرید کی تھی —— اسے اپنے ماضی سے نفرت تھی جس نے اسے ڈر خوف نفرت اور دل آزاری کے سوا کچھ نہ دیا تھا وہ ایک خود مختار اور بے خوف زندگی بسر کرنا چاہتی تھی اور اپنے لئے بالکل نئی راہیں وضع کرنے پر آمادہ تھی اس نے سوچا تھا وہ زندگی کو نئے اور مختلف طریقے سے بسر کرے گی —— اس نے بہت سے کاموں کے متعلق سوچا مگر ان میں سے کسی کام کے لائق خود کو نہ پا سکی ۔ یہ محض اسکا اپنا وہم نہ تھا بلکہ دوسروں نے بھی اس کے متعلق کچھ اسی طرح سے سوچا — اور اسے بالآخر یقین ہو گیا کہ خوش نصیبی میں وہ حصہ دار نہیں ہے ——

پہلے اس نے ایئر ہوسٹس بننے کا ارادہ کیا ۔ یہ ایک پرخطر مگر نہایت دلچسپ نوکری تھی مگر اس کی تمام شرائط کو پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی ۔ پھر اس نے نرسنگ کا کورس کرنا چاہا مگر یہاں بھی ان فٹ ہو گئی ۔ پھر اس نے گائیڈ بن جانے کے متعلق سوچا اس میں ایک فائدہ یہ تھا کہ جگہ جگہ گھومنے کی اس کی دیرینہ خواہش بھی پوری ہو سکتی تھی —— اس نے اپنی ایک رازدان سہیلی سے ذکر کیا جو خود بھی تلاش معاش کی فکر میں تھی — ایک دن وہ دونوں برقع میں لپٹی گائیڈ ہاؤس جا پہنچیں ۔

انٹرویو ہوا ۔ دونوں پُر امید واپس لوٹیں مگر چند دنوں بعد صرف اس کی سہیلی کو بلا لیا گیا ۔ آخر اسے کیوں نہ چنا گیا بہت سوچنے پر بھی وہ وجہ نہ جان سکی ۔ اگر وہ اپنی سہیلی سے بہتر نہ تھی تو کمتر بھی نہ تھی بعض باتوں میں وہ اس پر سبقت رکھتی تھی اور بعض باتوں میں

وہ اس سے بہتر تھی۔ قدرت میں بھی دونوں برابر کی تھیں امتحان بھی ایک سے درجوں میں پاس کئے تھے —— ہاں ایک بات میں اس کی سہیلی اس سے بہتر تھی۔ اس کی سہیلی کی شخصیت بڑی متوازن اور اعتماد سے بھرپور تھی وہ خود بھی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس سے مشورہ لیا کرتی اور یہ سہارا اسے بڑی تقویت پہنچاتا ——

اس شکست نے اسے خاصا بددل کیا — پھر اس نے ٹیلیفون ایکسچینج پر ملازم ہونے کے بارے میں غور کیا مگر اس ملازمت میں جس ہمت اور بیباکی کی ضرورت تھی۔ وہ اس میں موجود نہ تھی تھک ہار کر وہ بیٹھ گئی بیاہ بھی شاید اس کے مقدر میں نہ تھا۔ کیونکہ جو بھی آیا اس نے اس کی دوسری بہنوں میں سے کسی نہ کسی کو چنا ——

اور وہ احمقوں کی طرح منہ تکتی رہ گئی۔ اس شکست نے اسے خود اپنی ہی نظر میں خاصا ہیٹا اور ذلیل کیا۔ ماں کو تو خیر اس کے بارے میں چنداں فکر نہ تھا اسے کھانے اور اوڑھنے کو مل رہا تھا اور بہت تھا۔ مگر ابا قدرے فکرمند تھے۔ ایک روز جب اتفاق سے ان کی ملاقات عباس سے ہوئی تو انہوں نے اس کے لئے اسے منتخب کر لیا۔ یوں اس کا بیاہ ہو گیا اس کے بیاہنے میں زیادہ تردد سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس کا دولہا کیسا تھا اور یہ انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا اور نہ کسی اور نے اس بات کو اہمیت دی تھی ——

وہ حیران تھی وہ کیسا ہوگا —؟ کیا وہ کبھی ذہنی اور قلبی طور پر اس کے قریب ہو سکے گی — کیا وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ (اور اس کے خیال میں اسے سمجھنا کچھ ایسا آسان نہ تھا)

جب اس نے پہلی بار عباس کو دیکھا تو وہ اس کی ظاہری صورت سے بلاشبہ مرعوب ہوئی۔ مگر دوسری تمام باتوں میں اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ——

وہ ایک روکھا اور لاپروا آدمی تھا — جذبات کی دنیا سے قطعی بیگانہ۔ اس کے نزدیک ایک ایسی عورت کو جو اس کی بیوی بن چکی تھی سمجھنے کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی —— وہ اس کی کم توجہی کا شکار بھی ہوتی۔ ممکن ہے وہ ایک عام آدمی ہو — اور یہ محض اس کا وہم ہو یا یہ کہ وہ جس توجہ اور محبت کی توقع لے کر آئی تھی اس کے پورا نہ ہونے پر وہ اسے بے توجہی خیال کرنے لگی ہو۔ مگر اس کے خاوند کو ان چھوٹی اور فضول باتوں پر غور کرنے کی ضرورت نہ تھی ——

اس کے شوہر کا خیال تھا چونکہ اسے کھانے اور اچھا پہننے کو مل رہا تھا ساس نندوں کا بھی جھنجھٹ نہ تھا۔ گھر میں خاصی سہولت اور فراغت تھی اس لئے اسے ہر طرح سے خوش و خرم رہنا چاہیئے اس نے بھی اس آرام دہ زندگی پر غور کیا اور خوش رہنے کی کوشش کی مگر وہ خوش نہ رہ سکی۔

یہ زندگی اتنی عام سی تھی جو ہر کسی کو بغیر کوشش کے حاصل ہو سکتی تھی۔ اور اس کی وہ دبی دبی سی غیر واضح تمنائیں۔ جن پر تفصیل سے غور کرتے ہوئے وہ خوف کھاتی تھی وہ ہمیشہ انہیں دوسری باتوں میں بھلا دیتی۔ اور سر جھٹک کر کہتی۔

"بس ٹھیک ہے سب ٹھیک ہے —"

اس کا شوہر کتنا خوبصورت اور مضبوط تھا وہ اس کے پاس کس قدر محفوظ تھی وہ دل کو یہ یاد کراتی۔

مگر تحفظ کا یہ احساس خلا کی مانند کھوکھلا تھا — وہ ہمیشہ خود کو تپلی تار پر چلتے محسوس کرتی اور نیچے کوئی جال تلے نہیں پڑا تھا۔

گرنے کا خوف اس چہرے پر چھایا رہتا۔

اس کا شوہر اپنے حسن کی ڈھینگیں مارا کرتا۔ اور اپنی خوبصورتی کے احساس نے اسے کس قدر سفلہ اور چھچھورا بنا دیا تھا۔ وہ اس کے اندر جھانکتی، ورکڑھتی اور سوچتی وہ اسے کیوں دیکھتی ہے، پھر کیوں نہیں دیکھتی۔ وہ واقعی خوبصورت اور مضبوط تھا —— وہ کسی فرمانبردار بیوی کی مانند اس کی ہر خواہش کے سامنے جھک جاتی اور وہ ہنسا کرتا۔

"ہمارے منتر کا توڑ نہیں ہم ایک نظر سے عورت کو مطیع کر لیتے ہیں"

"تم اپنی طرف دیکھو ہم نے تمہیں جو کچھ دیا ہے کبھی اس کا تصور بھی کیا تھا۔ تم بھی تو خوش ہو اس لئے پھولتی جا رہی ہو" وہ ہنستا۔

وہ اسے خیالی جنت دے چکا تھا جس میں وہ یقیناً خوش تھی وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات کو اہمیت دیتا تھا اور اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتا۔

جب وہ پاس ہوتا وہ تنہائی محسوس کرتی اور جب وہ چلا جاتا تو تنہائی اس کے وجود میں گھسنے لگتی اور وہ اس کا انتظار کرتی۔

وہ شام کو دیر سے آتا، ور کئی گھنٹے اخبار پڑھتا رہتا اور اس کی زبان جبڑوں کے درمیان سوکھی لکڑی کی مانند پڑی رہتی۔

وہ شروع سے آخر تک اخبار پڑھتا پھر اسے ایک طرف ڈال کر کہتا —— "کچھ بات کرو نا۔

گونگوں کی طرح کیوں پڑی رہتی ہو"

وہ کہتی —— "جی"

بس —— وہ ہنس پڑتا ——

"تمہیں کچھ آتا بھی ہے —— ؟"

اور اس کا حلق سوکھا ریتھل بن جاتا ——

وہ طرح طرح کے وسوسوں میں پڑی رہتی تھی۔ وہ بہت کچھ محسوس کرتی اور سوچتی تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا بھی چاہتی تھی۔ وہ تو اسی آرزو میں گھلتی جا رہی تھی کہ کوئی اس کے دن کا حال پوچھنے اور سننے والا ہو۔ اس نے کئی بار کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر شوہر کی سرد اور غیر ہمدردانہ ہنسی اس کی ہمت توڑ دیتی اور اس کی رواں سوچیں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ڈھل کر بکھر جاتیں —— وہ ان غیر موثر اور بیگانہ الفاظ پر اور ہنستا دراصل اس کے شوہر کو اس کے جذبات سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی اس لئے وہ اس کی بات پوری سنے بغیر ہنس پڑتا اور تمسخر سے کہتا۔

"بے فکری اور آرام اکثر لوگوں کی عادتیں بگاڑ دیتا ہے۔ اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان ہر وقت اوٹ پٹانگ باتیں سوچے اور اپنے متعلق فکرمند رہے۔ صبح شام صحن میں چہل قدمی کیا کرو اور ملٹی وٹامن استعمال کرو خوب ٹھونس کر نہ کھاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ سن کر اس کی زبان گنگ ہو جاتی۔

اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ازلی ابدی گونگی ہے۔

اس کا شوہر ہر کام میں تیزی اور جلدی پسند کرتا۔ وہ پست پر بھاری قدموں سے دھب دھب چلا کرتا اور رات کو اسے

زور سے کھٹاک کھٹاک دروازے اور کھڑکیاں بند کرتا کہ اسے دیر تک دیواریں لرزتی محسوس ہوتی رہتیں یقیناً وہ کسی روز انھیں دیواروں کے نیچے دب کر مر جائے گی — وہ نرمی آہستگی اور دھیمے پن کو پسند کرتی تھی۔ ایک بار اس نے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا — اور دیر تک ہنستا رہا —

"واہ بھئی واہ ہماری بیگم بھی کیسے دل گردے کی مالک ہے۔ بچپن میں کیا کھاتی رہی تھیں —"

وہ جب باہر نکلتا تو تیز رفتار سواری پسند کرتا کبھی مجبوراً تانگہ لینا پڑتا تو وہ سارا راستہ تانگے والے سے الجھتا رہتا۔

"ارے چابک لگاؤ تیز چلو تم تو پینگ لڑا رہے ہو —"

اکثر اوقات وہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا تانگہ بدل ڈالتا رکشے پر بیٹھتے ہی وہ کہہ دیتا "ذرا تیزی دکھاؤ —" — رکشا ہوا ہو جاتا اور اس کا دل حلق میں اٹک جاتا۔

وہ اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھا کرتی۔

پھر وہ دور دراز کے اندیشوں میں گھر جاتی اور اندر ہی اندر خود کو کسی متوقع حادثے کے لئے تیار کیا کرتی۔ وہ نئے مستقبل کے بارے میں غیر شعوری طور پر سوچتی اور اس میں خود کو مجبور و بے بس پا کر اس کا دل بوجھل ہو جاتا۔ اور وہ تنہائی میں ان سب لمحوں کو جو اسے مل چکے تھے یا جو مل سکتے تھے یاد کر کے آنسو بہایا کرتی اور اس طرح اسے سکون ملتا —

ان دنوں تو وہ حد سے زیادہ رقیق القلب ہو گئی تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر اس کے آنسو چھلک پڑتے اور دل دھڑ دھڑ کیا کرتا — تنہا اور اکیلے ہونے کا احساس شدت اختیار کر گیا تھا — اسے اکثر اپنے پیٹ کا بوجھ اوپر کو سرکتا محسوس ہوتا اور اس احساس سے اس کا دم گھٹنے لگتا — اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی — ایک عظیم خطرہ پنجے پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی — وہ پاگلوں کی طرح خالی کمروں میں گھوما کرتی۔ اور کان لگا کر انجانی آوازوں کو سنتی یہ آوازیں کہاں سے اٹھتی تھیں — وہ پلٹ پلٹ کر دیکھا کرتی اور پریشان ہوا کرتی۔

اسے گھر سے بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ شام کے بھیگے اندھیرے میں وہ آنکھیں پھاڑے پسنے کی مانند ہموار چھت کو دیکھا کرتی اور رات وہ چھت غیر محسوس طور پر نیچے کو جھکتی محسوس ہوتی، وہ گھبرا کر آنگن میں نکل آتی اور گہرے لمبے سانس لیتی اور بسیرا لینے والے کوؤں اور چیلوں کو عجیب یاس انگیز نظروں سے تکا کرتی۔

وہ بھی انھیں کی طرح تنہا اور دوسروں سے الگ تھلگ اور بے تعلق سی تھی۔ پھر وہ سوچتی یہ بے مقصد زندگی بھی کس قدر خشک اور تھکا دینے والی تھی۔ کسی منزل کے تعین کے بغیر کوئی چلے تو کہاں تک چلے نہ راہ طے کرنے کا جذبہ نہ کوہِ مقصود پا لینے کا ولولہ۔

پھر وہ ان بہت اچھے لوگوں کے متعلق سوچتی جن کے پاس زندگی کا کوئی فلسفہ نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک نہایت کامیاب اور پُر مسرت زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک سیدھی سادی طرح داری اور بناوٹ کے ذہنوں سے پاک جو اونچی آواز میں لڑتے جھگڑتے اور جن کی مسرتوں کے اظہار کا ڈھنگ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

جن کی محبتوں میں ضرورت اور مصلحت کی بجائے اخلاص تھا اور جو ایک دوسرے سے ہر حالت میں ریت کے ذروں کی مانند چمٹے رہتے جن کی خودیں محض اس تمنا میں عمر کے مدارج جلد سے جلد طے کر جانا چاہتی تھیں تاکہ وہ اپنے بیٹے بیٹیوں کی خوشیاں دیکھ سکیں۔ اور ایک اس کی ماں بھی تھی شادی کے بعد سے اس کی توجہ اس پر سے اور بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ چند بار ٹھر گئی اور اسے محسوس ہوا جیسے اب وہاں اس کا آنا جانا زیادہ پسند نہیں کیا جاتا —— وہ اپنے گھر میں اجنبی بن گئی تھی۔ گویا وہ ایک بے کار و بے مصرف بوجھ تھی جسے موقع ملتے ہی اتار پھینکا گیا تھا۔ یہ احساس بہت پہلے سے اس کے اندر موجود تھا جو اب تخیل اختیار کر گیا تھا۔

"تم بے وقوف، وہمی اور نہایت بے زار کن ہو۔" عباس نے بارہا ناگواری سے کہا تھا۔

اور عباس کے متعلق اس کا فیصلہ محفوظ تھا اس نے خود اپنے آپ پر بھی اپنی رائے کو ظاہر نہ ہونے دیا تھا بس ایک گھٹا گھٹا سا شعور تھا۔ ان دنوں وہ ایک نئے تجربے سے دوچار تھی —— اور اس کے گرد کئی نئے اور پرانے خوف جمع ہو گئے تھے —— اور تنہائی کا احساس پارے کی طرح اس کی رگوں میں رستا جا رہا تھا —— وہ اس تجربے سے جانبر نہ ہو سکے گی —— اس کا دل کہتا تھا ——

عباس اس کے سہمے مرجھائے چہرے اور ڈھیلے ڈھیلے سست انداز دیکھتا تو جھنجھلا جاتا۔

"تم تو بالکل انوکھی ہو میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے —— وہ کبھی کڑی مشقت سے باز نہ آتی تھی۔"

اس نے بھی اپنی ماں کو دیکھا تھا —— وہ بارہا ان تجربوں سے گزری تھی اور کبھی خوفزدہ نظر نہ آئی تھی۔ اس نے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے فوراً بعد تیسرا بچہ پیدا کیا تھا —— یوں ان کے بہت سے بچوں کے درمیان کوئی پہچان باقی نہ رہی تھی۔ وہ سب ایک جیسے نظر آتے اور جب وہ ایک کو آواز دیتی تو ایک کی جگہ کئی اکٹھے ہو جاتے . . . . مگر اس کی ماں ان کی تعداد سے کبھی نہ گھبراتی —— ہاں وہ ان کی تعداد کو نظر انداز کر جانے کا گر سیکھ گئی تھی —— وہ ان کے شور شرابے میں عجیب بے نیازی سے بیٹھی رہتی اور جب ان میں سے کوئی دوسرے کو دبا لیتا اور گتھم گتھا ہو جاتا تو تب بھی وہ کسی فوری ردِ عمل کا اظہار نہ کرتی۔ اس کی آنکھوں میں پتھر کی سی خنکی چھائی رہتی اور اس کے وجود میں بے حسی کھٹری نظر آتی ہاں کبھی جب واویلا زیادہ بڑھ جاتا تو وہ بڑے سرد لہجے میں جس میں غصے سے زیادہ بے چارگی ہوتی تھی۔

"تم مر جاؤ —— سب مر جاؤ ——" پھر جیسے وہ ان سب کے مر جانے کے خیال سے روہانسی ہو جاتی۔

"نہیں تم کیوں مرو گے میں مر جاؤں ہاں بس میں مر جاؤں۔"

یہ الفاظ بچوں کے لئے قطعی غیر مؤثر تھے —— گویا ماں کا مر جانا ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا البتہ ماں کا یہ ایک سا رویہ زیادتی کرنے اور زیادتی سہنے والے کے فرق کو مٹا کر ان کے درمیان کسی پہچان کے ابھرتے شعور کو نئے سرے سے غائب کر دیتا —— یوں جہاں ان کے ننھے ذہنوں میں ایک دوسرے کے خلاف غصہ اور کینہ پرورش پاتا تھا وہاں ماں کے غیر ضروری ہونے کا احساس بھی جڑ پکڑتا تھا۔ —— اور وہ اپنی فردی حیثیت کو منوانے کے لئے خودسری اور ضد سے کام لیتے —— یہ عجیب بات تھی اتنے بہت سے بہن بھائیوں کے درمیان اتنے چھوٹے سے گھروندے میں بھی کبھی کسی نے ماں کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس نہ کیا تھا ——

وہ بہت چھوٹی عمر میں بلی کی سی ہوشیاری سے سیڑھیاں چڑھ جاتی اور سیڑھیوں کے اوپر والے سرے پر بڑی بے فکری سے کھڑے

ہوکر تالی بجایا کرتی اس کی ماں کبھی دھیان نہ دیتی نہ خوفزدہ ہوتی اور وہ پھر چاروں ہاتھ پیروں کی ہوشیاری سے لکڑی کے بوسیدہ زینے سے نیچے سرک آتی — اور کسی فاتح کی طرح مسرور ہوتی ۔

وہ کرم خوردہ کڑیوں والی چھت پر دھما دھم بے فکری سے کودا کرتے اور ان کے قدموں کے دھماکوں سے چھت کانپا کرتی ۔ مگر وہ ان دنوں کس قدر باحوصلہ اور بہادر تھی ۔ وہ بڑی دلیری سے چھت کے بیچوں بیچ بنے ہوئے لوہے کی لمبی سلاخوں والے سال خوردہ روشن دان پر لانگ جمپ کی مشق کیا کرتی — اور ماں بے خبر بیٹھی دال بگھارا کرتی اور سادہ چاول پکاتی ، چاولوں کو الگ الگ رکابیوں میں ڈالنے کی بجائے ایک بڑے تھال میں بکھیر دیتی اور اوپر دال انڈیل دیتی اور انھیں پکارتی اور وہ دال چاول کی خوشبو سونگھتے بھوکے بھیڑیوں کی طرح جھپٹ کر آتے یہاں پھر ان کی الگ پہچان کا سوال مٹ جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر ہاتھ مارتے لڑتے جھگڑتے نوالے نگلتے ۔ اور دو گلاس ان کے درمیان گردش کرتے اور وہ کھانے کے دوران غیر شعوری طور پر ان خوش آئند دنوں کے متعلق سوچا کرتے جب وہ بڑے ہو جائیں گے اور ماں ان کو اس دائرے سے نکال دے گی — اب تو وہ اس دائرے سے بہت دور تھی ۔ پھر اس دائرے کی کشش کیوں اسے اپنی طرف کھینچتی تھی — اور اسے وہ کمرہ کیوں یاد آتا تھا ۔ جہاں چارپائیاں ایک دوسری پر چڑھی ہوتی تھیں اور وہ الگ کمروں میں تنہا سونے کے تصور میں ایک دوسرے سے لڑا کرتے ۔ اب وہ کس طرح ان ٹھنڈے کمروں میں ہونقوں کی طرح گھومتی تھی ۔ اور اسے ماں بڑی شدت سے یاد آتی تھی ۔ اور وہ حیران ہوتی ماں کی محبت اور ضرورت کا احساس کہاں چھپا بیٹھا تھا ۔ اس کا دل چاہتا تھا ماں کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ کر وہی دال چاول کھائے اور اس سے کہیں جانے کے متعلق کوئی سوال نہ کرے ۔

مگر ان دنوں وہ کئی بار پوچھا کرتی ۔

” ماں ہم کہیں جاتے کیوں نہیں — ؟ “

” اپنا گھر چھوڑ کر کہاں جائیں — ؟ ماں کہتی ۔

” سب جاتے ہیں میری سہیلیاں بھی چھٹیوں میں چلی جاتی ہیں ہم بھی کہیں جائیں — کہیں بھی “ — وہ اصرار کرتی ۔ اور تصور میں نئے جوتے پہنے اور دادی کا بوڑھا ہاتھ تھامے چھک چھک چھک چھک کرتی گاڑی میں سوار ہو جاتی —

” کہاں جائیں اور کس لئے جائیں کیا فائدہ ہے — “

ماں گہرے اطمینان سے چولہے کی راکھ کریدنے لگتی — گھر ماں کے وجود کا ایک حصہ بن گیا تھا جس سے الگ ہو کر وہ خود کو مکمل محسوس نہ کرتی تھی — مگر وہ ماں کے خلاف ایک شبہ سا دل میں لئے اٹھ جاتی — مگر اب تو وہ ماں کو کسی ایسے سوال سے پریشان کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھی — مگر ماں اس سے دور تھی اور ماں کے تحفظ اور ضرورت کو شدت سے محسوس کر کے وہ کئی بار کمرے کی تنہائیوں میں رو پڑی تھی — اب تو وہ بہت بڑی ہو چکی تھی پھر وہ یوں کیوں سوچتی تھی — کیا اس لئے کہ وہ تنہا تھی اور اس کے پیٹ کا بوجھ اوپر کو سرکتا جا رہا تھا ۔ اور سفید سرد چہرے والی ماں نے کہا تھا وہ اپنا گھر چھوڑ کر نہیں آ سکتی — اور وہ ایک عظیم خطرے کی طرف بڑھ رہی تھی ۔ اور اسے وہ گندے فراک والی چھوٹی لڑکی اکثر یاد آیا کرتی جو گرمی کی بھری دوپہروں میں چھت کے کسی سائے دار کونے میں بیٹھی گیلی مٹی سے بے ڈھنگے گھر بنایا کرتی اور انھیں پھوٹے گھڑے میں چھپا دیتی — پھر گلی میں اتر جاتی بے حد تنگ اور گیلی گلی

گلی جس کے ایک پہلو میں ایک چوڑی سی نالی بہتی تھی جس میں سے ہر وقت گاڑھے کارے کی بدبو اٹھتی رہتی۔ وہ اس نالی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ نالی گلی سے بازار اور بازار سے سڑک پر آتی اور بدرو میں گر جاتی وہ بدرو کے ڈھلوان کنارے پر بے فکری سے بیٹھ جاتی اور چھوٹے چھوٹے مٹی کے ڈھیلے گندے پانی میں اچھال دیتی پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا اور وہ خوش ہو کر دوسرا ڈھیلا لڑھکا دیتی۔ تبھی اس کی پسلیوں میں کوئی نوکدار شے گھس پڑتی وہ گھبرا کر پیچھے دیکھتی اس کے قدم ڈگمگا جاتے۔ مگر وہ سرکس کے نٹوں کی طرح سنبھال لیتی اور بھاگ کھڑی ہوتی۔ اس کا بھائی کوئی مضبوط چھڑی لئے اس کے پیچھے بھاگنے لگتا وہ دور تک ڈھلوان کنارے پر مشاق مداریوں کی طرح بھاگتے چلے جاتے پھر لکڑی کے بوسیدہ پل کو عبور کر کے دوسرے کنارے پر آجاتے اور واپس بھاگ پڑتے وہ چھوٹی سی خطرے میں گھری ہوئی لڑکی جس کی ماں گھر میں بے خبر بیٹھی ہوتی۔ اور اس کا خود سر شریر بھائی اسے پیچھے سے ڈراتا دھمکاتا۔

"گھر چل ماں تیری مرمت کرے گی رسا باندھ کر کھونٹی سے لٹکا دے گی" وہ بے رحمی سے ہنستا اور چھڑی لئے اس کے پیچھے رہتا اور وہ ماں سے زیادہ اس شے سے خوفزدہ گھر کی طرف بھاگتے بھاگتی۔ گھر سے ذرا ادھر بھائی اسے گھیر لیتا اور اس کے چھوٹے چھوٹے خشک پٹوں میں ہاتھ ڈال کر کھینچتا۔ وہ دلدوز آواز میں چیختی سیڑھیاں چڑھتی اور میلے کپڑوں کے ڈھیر میں چھپی ہوئی ماں کو دیکھ کر فریادی آواز میں سسکتی۔۔۔

"مر جاؤ تم سب مر جاؤ۔۔۔"

ماں سرد اور بے تعلق آواز میں کہتی اور زور زور سے کپڑے پٹخنے لگتی۔۔۔

اور اس کی پُرشور آواز گیلی گیلی سسکیوں میں ڈھل جاتی اور وہ اپنے سارے آنسو میلے فراک کے دامن میں جذب کر لیتی۔

اس چھوٹی سی لڑکی کے دکھ کو وہ اپنے اندر محسوس کرتی، اور اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ وہ کتنی اکیلی اور غیر محفوظ تھی۔

اور ایک رات جب وہ اپنے باپ کے ساتھ سرکس دیکھنے گئی تو کس قدر خوش تھی۔ وہ اپنی ماں کو جو عجیب وضع کے برقع میں بیٹھی ہوئی تھی باہر کی دنیا کی زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا ماں پہلی بار گھر کی چہار دیواری سے باہر کی وسیع اور عجیب دنیا میں آئی ہے۔ اور جب خیموں سے باہر زنجیروں سے بندھے گنے چباتے ہاتھیوں کو اس نے دیکھا تھا تو بڑے جوش سے اس نے کہا تھا۔۔۔

"ماں۔ ہاتھی۔۔۔"

اور ماں نے برقع کے اندر ہولے سے سر ہلایا تھا۔۔۔

اور جب رنگ میں بینڈ باجوں کے شور میں ایک جگر جگر کرتے فراک والی میم آئی تھی اور اس نے پتلے تار پر چھتری لے کر چلنا شروع کیا تو ماں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ حالانکہ نیچے جال تنا ہوا تھا۔ تب ماں کو خوفزدہ دیکھ کر اسے از حد تعجب ہوا تھا ماں بھی ایسی باتوں سے ڈر سکتی ہے۔۔۔ وہ میم کی بجائے ماں کے چہرے کو تکتی رہی تھی۔ اور اس کی نظروں میں اپنے گھر کی سب سے اوپر والی منزل کی آدھ فٹ چوڑی دیوار گھومتی رہی تھی۔

جب وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے توازن کی خاطر کمروں کو ذرا سے خمیدہ کئے ماہر مداریوں کی طرح چلا کرتے تھے اور تین منزل نیچے

کوئی بھی جال تانے موجود نہ ہوتا۔ وہ چھوٹی لڑکی کیسے زبردست خطرے میں پڑی تھی اور اس کی ماں بے خبر تھی۔ یقیناً اگر وہ گر پڑتی تو اس کی بوٹیاں فضا میں بکھر جاتیں — مگر وہ خود بھی بے خبر تھی۔ یہ تو اسے اب اتنے سالوں بعد جا کر معلوم ہوا تھا کہ اس بے حد پُرخطر اور غیر محفوظ لمحے کا خوف اس کے اعصاب میں اتر کر منجمد ہو گیا تھا — وہ غیر محفوظ تھی اور پتلے تار پر بغیر کسی حفاظتی اقدام کے کھڑی تھی! اور اس نے ماں کو اتنے سالوں بعد مدد کے لئے پکارنے کی خواہش کی تھی، وہ گر جائے گی اور ریزہ ریزہ ہو جائے گی — اور اس کے سامنے خطرے کا سرخ نشان پھیلتا جا رہا تھا۔

یہ عجیب بات تھی اتنے سالوں بعد اس نے ماضی کی دھول سے اس چھوٹے سے بے ڈھنگے اور بوسیدہ مکان کو برآمد کر لیا تھا۔ جس کی پُرخطر دیواروں پر وہ نٹوں کی طرح چلتے تھے اور جس کی بوسیدہ کڑیوں والی چھتوں پر وہ دھما دھم کود کرتے اور جس کی نچلی بند کوٹھڑیوں کے بارے میں وہ سخت تجسس تھی۔ اس کا خیال تھا پچھلی کوٹھڑی میں سانپ بھرے ہیں اور رات کے وقت بھی دن کی طرح روشن ہوتی ہے۔

ایک شام اس نے ان کوٹھڑیوں میں سے چوہوں کی لمبی قطار کو نکلتے دیکھا تھا۔ چوہوں نے ایک دوسرے کی دموں کو منہ میں دبا رکھا تھا وہ آناً فاناً دالان کو پار کرتے نالی میں گھس گئے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی حیرت پر قابو پا کر ان کا تعاقب کرتی چوہے غائب ہو چکے تھے۔ اس تجربے کے بعد اس نے کوٹھڑیاں کھولنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

پھر ایک دوپہر اس نے پہلی کوٹھڑی کو کھول دیا اس میں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ پھر اس نے دوسری کوٹھڑی کو کھولا — اس میں دوپہر کے وقت بھی شام کا سا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ اور اس دھندلکے میں چمگادڑیں پھڑ پھڑا رہی تھیں اور چوہوں نے گند بدر مچا رکھی تھی۔ چھت کی کڑیاں کرم خوردہ اور ایک طرف کو جھکی ہوئی تھیں — ایک شورہ زدہ دیوار بھی ایک طرف کو قدرے خمیدہ ہو چکی تھی — وہ قطعی طور پر مایوس ہوئی تھی اور ان کوٹھڑیوں کے متعلق سارا تجسس جاتا رہا تھا۔

لیکن اب وہ کیوں رات کو سوتے میں ان کوٹھڑیوں کو کھول دیتی تھی اور ان میں بھری حشرات اس پر جھپٹ پڑتیں۔ اور لینٹر کی مضبوط چھت اس کی طرف جھکتے جھکتے ایک طرف کو ڈھلوان ہو جاتی اور وہ ہسٹریائی آواز میں چیخ پڑتی۔

"بچاؤ — بچاؤ —

عباس کچی نیند سے بیدار ہو کر اس پر بگڑنے لگتا "یہ کیا حماقت ہے۔ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟"

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے لینٹر کی ہموار چھت کو گھورتے ہوئے ہانپنے لگتی اور جب عباس کی لعنت ملامت بڑھ جاتی تو وہ ذرا ہوش حواس میں آ کر کہتی۔

"ان لینٹر کی چھتوں کا بھی کوئی اعتبار نہیں — سنا ہے گرنے پر آئیں تو ڈھکنے کی طرح نیچے بیٹھ جاتی ہیں —"

"خدا کرے بیٹھ جائے تاکہ روز روز کی یہ بک بک ختم ہو"

عباس نہایت تنگ دلی سے کہتا — اور اس کا خوف اندر ہی گھٹ کر رہ جاتا۔

وہ خود کمرے میں بڑے سنبھلے اور محتاط قدموں سے چلا کرتی جیسے ہر قدم پر کوئی خطرہ موجود ہو۔

"آخر تم ان چیزوں کے بارے میں اتنی حساس کیوں ہو —؟" ایک دن عباس نے پوچھا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہاری ماں نے تمہیں بہت احتیاط سے پالا تھا اور ہر چیز سے خوف دلاتی رہی تھی کیوں ٹھیک ہے نا۔؟ اب اپنے بچے کو بھی یوں سات پردوں میں نہ پالنے بیٹھ جانا۔" عباس نے ہنس کر تمسخر سے کہا تھا۔

اور وہ حیرت زدہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کا بچہ کیا یہ ممکن تھا مگر اسے آنے والے وقت پر اعتبار نہیں تھا۔ اور اس بچے کے بارے میں اس کے احساسات گنگ اور جذبات خاموش تھے۔

اور اس رات اس چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن پر جب اس نے ننھے کو جنم دیا تو اس کی نگرانی کے لئے کسی نرس یا ڈاکٹر کی بجائے ایک قصباتی عورت موجود تھی — جو اپنے تجربات اس پر آزما رہی تھی۔ اور باہر عباس تھوڑی دیر بیدار رہنے کے بعد مزے سے سو گیا تھا —

درد کی شدید لہروں سے نڈھال اس نے سر ایک طرف ڈال کر کہا تھا۔

"مجھے سونے دو" ——— اور اس کے اعصاب پر غنودگی سی طاری ہو گئی تھی —

"اس حالت میں بی بی کون سوتا ہے ہوشیار رہو اور اپنی ماں کو یاد کرو اس نے بھی تمہیں جنم دیتے ہوئے ایسی ہی تکلیف اٹھائی ہو گی ———

ماں کے نام پر اس کی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑی تھیں اور گلے میں ہچکیاں ٹوٹ ٹوٹ گئی تھیں۔

عورت جانے کیا سمجھی تھی اس نے بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔

"غم نہ کرو بی بی مائیں کب سدا زندہ رہتی ہیں۔ لیکن تکلیف میں ان کی یاد بھی بڑا سہارا دے جاتی ہے۔"

وہ اور بھی بیتاب ہو کر روئی تھی۔ مگر ماں کا لفظ اس کے جلتے ہونٹوں پر نہ آ سکا۔

اس ٹھنڈے چہرے اور خشک آنکھوں والی ماں کے خلاف اس نے پہلی بار دل میں شدید نفرت محسوس کی تھی۔

وہ کسی کی ماں نہ تھی —

مگر جب اس نے بچے کو دیکھا تو حیرت سے اس کا دل اچھل پڑا — یہ اس کا بچہ تھا خون اور گوشت کا بے بس لوتھڑا جو کلی طور پر اس کے سہارے کا محتاج تھا۔ ساتھ والی کھٹولی پر پڑا مٹھیاں بھینچے ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اور منہ بسور رہا تھا۔ شاید وہ ماں کی حرارت اور گرمی محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ابھی تک اسے نہیں چھوا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اور اسے اپنے ماں بن جانے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ عباس کا چہرہ خوشی اور غرور سے سرخ اور پھولا ہوا تھا وہ کھٹولی کے گرد یوں منڈلا رہا تھا۔ جیسے تخلیق کرنے کے مرحلے سے وہی گزرا ہو — اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی اچانک وہ رکا اور اس نے اپنی مضبوط انگلی بچے کے نرم گال میں گھبوئی بچہ بلبلایا تو وہ ہنس پڑا۔

"دیکھ لو ہمارے خاندان پر گیا ہے" ——— اس نے فخر سے سینہ تان کر کہا تھا۔ بچہ واقعی سرخ و سفید اور تیکھے تیکھے نقوش والا تھا اس کی نظریں بچے کے چہرے میں ڈوب سی گئیں —— اس نے دیکھ بچہ بڑا ہو گیا ہے ویسا ہی خوبصورت مضبوط اور تند آور وہی

ڈیل ڈول اور ویسا ہی پرشور اور طوفانی وہ دھپا دھپ چھتوں پر چلتا ہے اور اس کے وزنی قدموں کی دھمک سے مکان کی اینٹ اینٹ کانپتی ہے وہ اس کی جہالت اور حماقت پر ہنستا ہے۔ ویسی ہی بے رحم اور بے حس ہنسی اس نے منہ پھیر لیا —

بچہ اب رونے لگا تھا۔ عباس نے اس کی طرف کڑی نظروں سے دیکھا۔

"اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ کہ بھوکا مار ڈالو گی" — وہ باہر نکل گیا دودھ نہیں اترا تھا قصباتی عورت نے انگلی پر شہد لگا کر بچے کو چٹا دیا۔ وہ تکیے پر سر ٹیکے چھت کو گھورتی رہی — یہ سب کچھ ایک خواب کی مانند تھا جس میں اس کی اپنی خواہش اور حقیقت لاپتہ تھی۔

بچہ بھوک سے بے تاب رو رو کر نڈھال ہو رہا تھا۔ عباس نے لیٹے لیٹے اسے ڈانٹا —

"اپنے ساتھ لٹاؤ آج چوتھا دن ہے دودھ کیسے نہیں اترے گا"

"بے کار ہے" — اس نے سرد مزاجی سے کہا۔

"واہ تم کیسی ماں ہو" — عباس نے حیرت سے سر اٹھا کر پوچھا تھا۔

"سب مائیں ایسی ہوتی ہیں" — اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ہماری ماں نے کب ہم پر جان چھڑکی مل دل کر خود پل گئے تھے۔ اور وہ بھی بچی تھی آ! جب لڑتے ہماری دھونس دیتے بچے چھین کر گھر سے نکال دوں گا ظاہر ہے دوسرے کے بچے پر کون جان کھپاتا ہے —"

عباس روکھی پھیکی ہنسی ہنس پڑا۔

"بھئی مجھ سے تو اسٹامپ پیپر پر لکھوا لو یہ بچہ میرا نہیں صرف تمہارا ہے۔ لو اب اس پر رحم کھاؤ —"

"مگر اس میں میرا کیا قصور ہے" — اس نے بچے کو زمی سے گود میں اٹھا لیا تھا —

یہ پانچواں دن تھا جب اچانک اس کی ماں ملنے کو آ گئی وہی سرد اور روکھا چہرہ مگر آنکھوں کی خشکی میں حیرت کی جھلک۔

"کیا حال ہے تمہارا" — ماں نے خشک لہجے میں پوچھا تھا اور بڑے رسمی انداز میں آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا۔

یہ قیمتی اور انمول لمحہ اس کی زندگی میں پہلی بار آیا تھا مگر یوں کہ اس کے دونوں بازو پہلوؤں میں بے حسی سے لٹکتے رہ گئے تھے۔

"ٹھیک ہوں" — وہ جب بولی تو اسے اپنی آواز پر ماں کی آواز کا شبہ گزرا اور جب ماں اس سے الگ ہوئی تو اس نے محسوس کیا اس کی ماں کی روح اس کے اندر اتر گئی ہے۔ اور اس کے سینے میں وہی خلا پیدا ہو گیا ہے جو ماں کے سینے میں تھا۔

اس نے سرد اور بے تعلق نظروں سے بچے کی طرف دیکھا جو دوسری کھٹولی پر پڑا مٹھیاں بھینچے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور ویسی غصہ اور لاچارگی کے سائے تاثرات اس کے بسورتے چہرے پر کھنچے ہوئے تھے وہ بھوکا تھا اور اس کی چھاتیاں خشک تھیں۔

رپورتاژ

درچمن ہر ورقی دفترِ حالِ دگرست

قرۃ العین حیدر

۱- کوہ دماوند

جھلانے۔ سپید دریچوں کے باہر خنک، نیلگوں دھندلکے میں تہران کی اَن گنت روشنیاں چراغ لالہ کی طرح جھلملا رہی ہیں۔ ان کے عقب میں اُودی چوٹیوں پر خسروِ عجم کے عظیم الشان برقی تاج جگمگاتے ہیں۔ بادل کوہ دماوند پر سے مودب خداموں یا متحیر سیاحوں کی مانند آہستہ آہستہ گذر رہے ہیں۔ چند لمحوں بعد یہ کاروانِ سحاب پہاڑیوں کے اُدھر تورانی پہنچ کر ایک اور جشنِ پُرشکوہ کا تماشا کرے گا۔ بسیط، منور، بیکراں رات میں یہ کاسنی بادل اندھیرے کیسپین سے اٹھے ہیں۔

البرز کی کوہستانی چٹانوں پر سیمرغ پروں میں چونچ چھپائے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اور باخبر ہے کہ چند فرسنگ پر کوہ طالقان اور کیسپین کے درمیان پراسرار جنگلوں چراگاہوں میں بسنے والا لالی دیو بغلیں بجاتا ہے۔ کہ ہفت خواں طے ہوئی اور سفید دیو بالآخر مات کھا گیا۔ سفید دیو اور ارژنگ دیو اور شیر آسپ۔ گشتاسپ۔ جاماسپ۔ لہراسپ۔ ارجاسپ۔ اسفندیار ''رستم۔ زمانہ میں بہ نہ بہرام رہ گیا''۔۔

بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔

اے خسروِ زمانہ بکشا دو چشم و بنگر۔ در نامہ سکندر احوال ملک دارا۔

رات تیزی سے گذر رہی ہے۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔ برو ایں دام بہ مرغ دگر نہ۔ کہ عنقا را بلند است۔ ہفت خواں کے بعد۔ کیا ہوتا ہے؟ بڑی سخت نیند۔

بالکنی کے سفید پردے سرسرائے۔ ایک مختصر سی شے نے اندر جھانکا۔

''ہلو۔۔''

''ہلو۔'' میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور گھبرا کر جواب دیا۔ ایک عجیب و غریب پرند پھدک کر کمرے میں آ گیا۔

''مجھے آقائے سیمرغ نے بھیجا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' پرند نے پر پھڑپھڑا کر کہا۔

''آقائے۔ کون۔؟'' میں نے گڑبڑا کے پوچھا۔

''خانم۔ آپ ابھی انھیں یاد فرما رہی تھیں۔'' پرند نے ذرا بُرا مان کر کہا۔

''اوہ۔۔''

موصوف خود نہ آسکے۔ کہ پردو توکوآل مانع ہے۔ کیونکہ آپ نے بال کو —

"آگ نہ دکھائی۔" میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ حیرت انگیز پرندا ایک کریٹیلی ویژن پر بیٹھ گیا اور نہایت اخلاق سے گویا ہوا —

"رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست"

ہڑبڑا کر میں نے ذہن پہ زور ڈالا اور مناسب جواب دینا چاہا — "خیر مقدم مرحبا اے طائرِ میمون قدم —" دوسرا مصرع یاد نہ آیا لہٰذا اس کے بعد "السلام علیکم" پر اکتفا کی۔

"وعلیکم السلام" پرندے نے تقریباً علیگڑھ کے لہجے میں ڈپٹ کر جواب دیا۔

"معاف کیجیئے گا —" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا متعجب نظر آرہی ہوں گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ جیسا پرند میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا۔"

"خانم۔ آپ بجا فرماتی ہیں۔ خاکسار عنقا ہے۔"

"آقائے عنقا اب تازہ فارسی رسالوں کے انبار پر فروکش تھے۔ اچانک اپنے پنجوں کے نیچے ایک رنگین تصویر پر ان کی نظر پڑی اور وہ فوراً پھدک کر کاشانی قالین پر آرہے۔ اور اٹنشن کھڑے ہوگئے۔ کہ وہ شاہ کی تازہ ترین تصویر تھی۔

اس مجہز معقول صورتِ حال کے باوجود مجھے ہنسی آگئی۔

"آپ کو معلوم ہے آقائے عنقا کہ عین اس لمحے ماورا النہر کے ادھر کیا ہو رہا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" عنقا نے پینترا بدل کے اب تدبیریوں کا رُخ کیا جس پہ ایک اور عجمی زمزمہ سنج تھا۔

"اس پار —" میں نے دریچے میں جا کر سلسلہ کوہ کی طرف اشارہ کیا۔ "عین اس وقت سلطانی جمہوریہ کا جشنِ تاسیس منایا جا رہا ہے۔"

"آپ کے آئینۂ اسکندر کا حجم بہت مختصر ہے۔" عنقا نے چالاکی سے میری سنی اَن سنی کر کے کہا۔ "ارباب حتبل کو تلقین کیجیے کہ آپ کے حجرے میں دوسرا آئینہ لگا دیں —"

میں اس مسخرے پرند کو کہاں بخشنے والی تھی۔ اپنی بات پہ اڑی رہی — "نغمہ بیداری جمہور — ترکستان - زابلستان - مازندران - آذربائی جان — سب جگہ - دیکھ لیجیئے گا۔ بہت جلد — جس طرح داغستان، کردستان، قزاقستان — "

"اور ہندوستان و پاکستان —؟" عنقا نے چالاکی سے پوچھا۔

"گلستان - بوستان" میں نے فوراً بات ٹالی۔

"سبحان اللہ - ماشا اللہ۔" عنقا نے جواب دیا۔

ساری اولادِ آدم — میں نے خطیبانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

"آقائے آدم تم نے تو جرأت ملیں قائم کر لی ہیں اور ادبی انعام دیتے ہیں —" عنقا نے بات کاٹی۔

کس قدر بے تکا پرندہ ہے۔

"آپ کبھی اُڑ کر اُس طرف تشریف لے گئے ہیں؟"

"کدھر —؟" اس نے تجاہل عارفانہ سے دریافت کیا۔

"شمال میں آپ کا ایک پڑوسی ملک ہے۔ عجائب زرنگار ایسا خطہ ہے مرقع خیال مانی و بہزاد نے نہ کھینچا ہوگا اور پیرو جوان فلک نے مزرعہ عالم میں نہ دیکھا ہوگا۔ یعنی لال دیو کا دیس —"

"تم نے تغفور چین کا تازہ بیان پڑھا؟" عنقا نے جواباً استفسار کیا۔

"آقا۔ پہلے میرے سوال کا جواب عطا ہو۔"

"یاجوج ماجوج کا —" عنقا نے ٹیلی ویژن کا بٹن گھماتے ہوئے جواب دیا۔ "سد باب ہو چکا ہے۔"

"بذریعہ انقلاب سپید؟"

"ہاں۔"

"مگر آپ کو یاد ہے اسے طائر لاہوتی کہ اس ملک میں جہاں آج عوج بن عنق نے بقیہ سفید دیووں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے وہاں دو صد سال قبل ایک انقلاب آیا تھا اور —"

"عوج بن عنق —؟" پرندہ نے پنجہ اٹھا کر ذرا سر کھجایا۔ "سے دی — ہا — موسیو دی گال —! پھر وہ پھدک پھدک کر خوب ہنسا۔

"ہاں۔!" میں نے کہا۔ "ابھی رہی انقلاب بہت سے ملکوں میں آنا باقی ہے۔ اکتوبر والا تو دور رہا —"

"تازیوں کے متعلق خانم آپ کیا کہتی ہیں؟" عنقا نے ایک چوکس صحافی کی طرح بات کا رخ پلٹا۔

"آپ لوگوں نے —" مجھے غصہ آگیا۔ "محض بغض معاویہ میں کانے دجال کے ڈاکو غاب کو تسلیم کر لیا ہے۔"

"وہ جوانان تتاری یعنی داغستان و دولت عثمانی بھی تو اس کے وجود کو قبول کر چکے ہیں۔ اور خانم۔ آپ شاہ دقیانوس کے زمانے کی باتیں کرتی ہیں آج کا اخبار دیکھیے —" اس نے چرخ بیں تازہ اطلاعات اٹھا کر مجھے پیش کیا۔

"جنگ شدید مداومہ دیں — شہر سوئیز درمیان شعلہ ہائے آتش می سوزد —"

"میں پڑھ چکی ہوں۔"

"جی نہیں۔ اندر کا جوشیلا اڈیٹوریل پڑھیے —"

میں نے اخبار کھولا۔

"خانم۔" عنقا نے سنجیدگی سے کہا۔ "مسلمان ہمیشہ مسلمان کا ساتھ دے گا۔ تازیوں کے ان مصائب پر ہم خون کے آنسو رو رہے ہیں —" پھر اس نے دوسری چینل لگائی۔ اسکرین پر دفعتاً تاج شاہی کا کلوزاپ جگمگانے لگا۔ عنقا مسرور سا ہو کر پھر اٹینشن کھڑا ہوگیا۔

"موسیو — تصورِ خواب آور اسکندر و جم کب تک ؟" — میں نے کہا۔

"مادموزیل — آپ کی روشنی بسر کے لئے ۔" اس نے پلٹ کر جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا — "سرمے کی ضرورت ہے۔ حکیم طوسی کو یاد کیجئے ۔"

"میں نے کہا تھا انہیں تلفی معلوم ہوا کاک ٹیلز کے لئے منسٹری آف کلچر گئے ہوئے ہیں ۔ اس کے بعد ان کا ٹویزیوں پر پروگرام ہے — حیف کہ آپ لوگ بھی شمع ٹویزیوں کے پروانے —"

"خانم نے" عنقانے بات کاٹی ۔" ہمارے جامِ جم کو آؤٹ آف فوکس ہوتے صدیاں گذر چکیں۔ کیوں نہ ہم اب ساحرِ فرنگ کے عجائب — اوہو — ہو — ذرا یہ نظارہ دیکھئے —" عنقانے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی — اسکرین پر اب شہر کی قیامت خیز آئینہ بندی اور چراغاں کے مناظر دکھائے جا رہے تھے ۔ خوش پوش عوام کے ہجوم ۔ مسرور چہرے موٹروں کا سیلاب ۔ اچانک کیمرہ حکیم فردوسی کے بلند و بالا مجسمے پر آ کر تھم گیا۔ سنگی قبا میں ملبوس ، ہاتھ میں شاہنامہ تھامے ، روشنی میں نہاتے ہوئے فردوسی دیدہ ور اپنی فرحاں قوم کو کیسی متبسم نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ پس منظر میں سرود بجنے لگا۔

یک بیک عنقانے پر پھیلا کر ایک سانس میں کہنا شروع کیا۔

"برفت اندر پردہ سالار بار — بیامد خراماں بر شہریار
بگفتش کہ رامشگرے بر در است — آیا بربط و مرد رامشگر است
ہمی راہ جوید بدیں پیش گاہ — چو فرماں دہد نامور بادشاہ
بفرمود تا پیش او تاختند — بر رود سازانش بنشاندند
بہ بربط چو بایست برساخت رود — برآورد مازندرانی سرود —"

— اور پھر خاموش ہو گیا۔ مجھ پر نظر ڈالی اور میری جہالت پر افسوس کرتے ہوئے توضیحاً کہا ۔" یہ شاہ کیکاؤس کے جشنِ تاجگذاری کا ذکر تھا۔"

اب اسکرین پر دوبارہ تاجِ شاہی اور اس کے بعد بانکِ ملی میں محفوظ زر و جواہر ۔ کے کلوز اَپ آن موجود ہوئے ۔ اور لعل بدخشاں اور الماس کے جڑاؤ ظروف اور جام —

"روشن ہے جام جمشید اب تک ۔ شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی ۔" میں نے فوراً کہا۔ اشعار مجھے کہ اس عجمی پرند کی موجودگی میں نوائے سروش کی طرح چلے آ رہے تھے ۔

"اے خانمِ خارجی —" عنقانے بے طرح جھلا کر جواب دیا ۔ "آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کجکلاہِ عجم سو شلسٹ ہو گئے ہیں ۔ جھکّی پرندہ ہے ۔ میں نے سوچا اور واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی ۔

اب آقائے پتہ نہیں کون ایک گلشن میں سرود بجائے چلے جا رہے تھے ۔ عنقا نغمے میں محو ہو گیا۔

"آقائے عنقا ۔ چند منٹ بعد میں نے جماہی لے کر کہا ۔" نیند کے مارے میری حالت خراب ہے ۔ صبح بہت سویرے اٹھنا ہے ۔ ابھی پریس روم سے کل کے متعلق تازہ بلیٹن بھی نہیں آیا ۔ آپ کو علم ہے کل شاہ کا کیا پروگرام ہے ؟"

"شہنشاہ آریا مہر کہیے ـــ" عنقا نے ڈپٹ کر جواب دیا۔ میں نے اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ شہنشاہ آریا مہر۔ شہنشاہ آریا مہر ـــ

"یہ آریا مہر کیا شے ہے آقا؟" میں نے سوال کیا۔" اڈولف ہٹلر کی آریا نسل ــ پنجاب کا آریا سماج ـ بھلا غور کیجیے ـــ ایک اصطلاح کتنے مختلف معانی رکھتی ہے۔ خود 'آریا نسل' ایک بیحد مبہم اصطلاح ہے ـ اینتھروپولوجی ـــ"

اب عنقا نے منقارِ وا کر کے جماہی لی۔ مگر میں کہے گئی:۔" اور ایتھنولوجی کی رو سے ایران میں منگول یعنی ترک حبشیت میں نیگرو اور مجموعی طور پر کاکیشن نسلیں آباد ہیں ـ"

"اسی لئے کوہ قاف کی پریاں کہا جاتا ہے ـ ہم ایرانی ایک بیحد خوبصورت قوم ہیں"۔ عنقا نے پر پھیلا کر کہا۔

"درست ـــ اور برطانوی ہند میں 'نیٹو' سے یوروپین 'کو اسی لفظ' کاکیشن سے ممیز کیا جاتا تھا۔ جبکہ انگریز بہادر آپ ایرانیوں کو بھی 'نیٹو' کہتا تھا ـــ"

عنقا سوچتا رہا۔

"اچھا مثال کے طور پر اس فقیر حقیر کو لیجیئے ـ جو اس وقت کوہ دماوند کے سائے میں موجود ہے۔ میں کیا ہوں؟"

"کافرِ ہندی ـــ" عنقا نے مختصراً جواب دیا۔

"آقائے عنقا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا:" مجھ خاکسار کے نسلی اجزائے ترکیبی کا تجزیہ فرمایئے۔ میں سامی النسل ہوں یا آریہ؟"

"نمی دانم۔"

"سنیے۔ یہ فدویہ بنی ہاشم ہے ـــ"

"تازی ـــ" عنقا نے ذرا منہ لٹکا کر کہا۔

"اور جناب شہر بانو خالص ایرانی تھیں تو اس لحاظ سے ناچیز تھوڑی سی آریہ بھی ہوئی؟"

عنقا خوش نظر آیا۔

"میری نسلی، تہذیبی اور روحانی جڑیں ارضِ عرب و عجم میں بیحد گہری ہیں ـــ"

"ہاں ـ لیکن پچھلے آٹھ سو سال سے آپ انڈک[1] سوسائٹی میں شامل ہیں۔" عنقا بولا ـ وہ اپنے ٹوئنبی (TOYNBEE) سے بخوبی واقف تھا۔

"انڈک ـ اسلامک سوسائٹی ـــ" میں نے تصحیح کی ـ" تو ذرا بتلایئے کہ یہ سب کیا کھیلا ہے؟ قوم ـ نسل تہذیب کی بھول بھلیاں۔"

"پچھلے چھ ہزار سال سے۔" عنقا نے جواب دیا ـ" میں کوہ دماوند کی چٹانوں میں چھپا اس کھیلے کا نظارہ کر رہا ہوں جس میں مبتلا ہو کر فانی انسان ایک دوسرے کو نیست و نابود کرتے رہے ہیں۔"

---

[1] INDIC SOCIETY

"ایک خیال اور آیا آقائے عنقا۔" میں نے مزید کہا۔ "مغربی پاکستان شرق اوسط میں شامل ہو گیا ہے۔ یعنی خالص اسلامک سے ساتھی ہیں۔ اور پوربو پاکستان بالکل الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ لہٰذا مجموعی طور پر اس ملک کی کلچرل جڑوں کی تلاش ---؟"

"خانم یہ استفسار مجھ سے نہ کیجئے۔"

"اب زبانوں کے گھپلے پر آیئے۔" میں نے عرض کی "سنسکرت۔ پراکرت۔ فارسی۔ عبرانی، عربی، ترکی یہ سب زبانیں میرے لسانی پس منظر میں شامل ہیں۔ میری مادری زبان کا بیشتر تمدنی سرمایہ بھی ہے۔ چنانچہ آپ شہر جمیل کی سڑکوں، عمارتوں اور بسوں پر فارسی عبارتیں دیکھ کر اور ہوٹل کے مینو پر چھپے ہوئے حافظ و خیام کے اشعار پڑھ کر آنکھوں میں روشنی سی آ جاتی ہے۔ عجیب THRILL سی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح مصر میں عربی اور استانبول میں ترکی سن کر سخت انبساط ہوتا تھا۔ جو انڈونیزین بھاسا سن کر نہیں ہوا۔ حالانکہ بے چاری وہ بھی مسلمانوں ہی کی زبان ہے۔ چنانچہ کیا یہ میرا پان اسلامزم کا جذبہ ہے؟"

"نسلی حافظہ اور غیر شعوری تہذیبی یگانگت۔" عنقا نے مختصراً جواب دیا۔ "ظاہر ہے اگر آپ ملایائی یا چینی مسلمان ہوتیں تو آپ کو فارسی کے بجائے انڈونیزین زیادہ مانوس اور دل کے قریب معلوم ہوتی۔"

"چنانچہ ہم سب الفاظ کے ذریعے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ لفظ وہ پل ہے جس پر چل کر ہم پل کی پل میں ہزاروں برس کا فاصلہ اور بُعد طے کر لیتے ہیں۔"

"زماں و مکاں کے فاصلے اب ہم TELESTAR وغیرہ کے ذریعے طے کریں گے۔" عنقا نے جواب دیا اور پھر نغمے میں منہمک ہو گیا۔ ٹیلی ویژن میں اس کی یہ دلچسپی حیرت انگیز تھی۔

پروگرام ختم ہوا۔ قومی ترانہ بجا۔ عنقا اٹنشن کھڑا ہو گیا۔

"تو یہ یوں ---" میں نے چڑ کر کہا۔ "پسماندہ اقوام مشرق کا نیا STATUS SYMBOL ہے۔"

"ہم ---" عنقا نے بڑے وقار سے گردن اٹھا کر جواب دیا۔ "اب پسماندہ نہیں ہیں۔" اور پھدک کر بالکنی میں چلا گیا۔ "میں دوبارہ حاضر ہوں گا۔ شب بخیر ---" اس نے وہیں سے آواز دی اور پھر سے اڑ گیا۔

اس قدر قوم پرست پرندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

۲۔ ظلِّ ہما

مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو   بادۂ دلکشا بجو تازہ بتازہ نو بنو

نگارندۂ داستانِ عجیب یوں لکھتا ہے پھر ماجرائے غریب کہ جب کاٹھیاواڑ، سندھ، پاکستانی و ایرانی بلوچستان، کرمان اور صفہان کی پہاڑیوں پر اپنا سایہ ڈالتا ہوا ہمائے ایران ہما کل بیچ فرد درگاہ مہرآباد پر پرفشاں ہوا اس وقت کوہ دماوند کی چوٹی ابر میں پوشیدہ تھی اور فضا پر وہ خشکی جانفزا طاری تھی جس کی باعث لالہ زار عجم مینو سواد بہشت نژاد مشہور ہے۔ پایہ تخت اس اقلیم کا پسند خاطر محبوبانِ جہاں، قابل بود و باش خوبانِ زماں۔ شمیم اوس کی واقع خفقان و خلجان۔ زمین اوس کی رشکِ فردوس۔ گلی کوچہ خجلت دہ باغِ ارم۔

مرد و زن بے آزار و خوش اطوار۔ راستے تمام مصفا و ہموار۔ دوکانیں و مکانات نفیس بطرز افرنگ۔ خلق خدا با خاطر شاد۔ والیٔ ملک قباد شوکت و کاؤس حشم۔ شعلۂ طیش سے جس کے دشمن کباب۔ دولت و روغن معدنی وافر۔ سپاہ افروز۔ محتاج و گدا کا شہر میں نام و نشان ناپید۔ رعیت راضی۔ لشکر شاداں۔ غنیم روسیاہ خائف۔ شمع کا چور سر محفل بہ زنداں۔ لیکن باایں حکومت و ثروت کاشانۂ امید کا چراغ گل کہ بادشاہ اور ولی عہد نرینہ نہ رکھتا تھا۔ اور شب و روز مع بی بی و رعایا دست بدعا رہتا تھا کہ ع

الٰہی غنچۂ امید بکشائی

تا آخر اُس کی جناب باری سے پوری ہوئی اور ولی عہد والا تبار گوہر آبدار در شاہوار بطن بانوئے خجستہ سے پیدا ہوا۔

بعد اس واقعہ روح افزا کے تاجدار فیروز بخت نے قصد کیا کہ جب رعایا اُس کی خوشحال ہو جاوے تب تاج شاہی زیب فرق کرے اور دین و دنیا میں سرفرو ہووے۔ سو بفضل باری تعالےٰ آج وہ روز سعید آیا۔ جس نے از شرق تا غرب ڈنکا اپنے کروفر کا بجوایا

القصہ آشیانہ مہر آباد تھا جس پہ آن کر اتنا بوجہ اس جشن دل فروز کے آراستہ پیراستہ مثل عروس نو کے تھا۔ ہر چہار جانب تصاویر شہنشاہ آریہ مہر و شاہ بانو و ولی عہد ہمایوں فر۔ قالین ہائے نظر فریب و گلہائے صد رنگ و معطر۔ زنان ایرانی مثل حوران فرنگ جوانان خوبرو مثل صاحب لوگ۔ ایک سردار جی (کہ قوم سکھ کے افراد کا لقب ہے) ایک گوشے میں کسی شخص حرحداد سے بزبان فارسی محو گفتگو۔ ہر فرد و بشر بہ سکون و تنظیم اپنے اپنے کام میں غلطاں۔

یہ منظر دیکھتا اور عش عش کرتا راقم الحروف باہر آیا جہاں راستے گلپوش۔ قدم قدم پہ شاہ و شاہ بانو و فرزند دلبند کی تصاویر قطعات تہنیت آویزاں جابجا درفش کاویانی سربلند۔ کہ وڑا قمقمہائے برقی فروزاں کہ دن دہاڑے سات روز سے اسی طرح نور افشاں تھے۔ آگے چل کر دیکھا کہ لشکر گاہ وسیع میں عساکر جری قواعد پریڈ میں مشغول۔ وردیوں پہ طلائی ڈوریوں اور تمغہ جات و نشانات کی فراوانی۔ حتیٰ کہ سپاہی چوراہے کا اچھا خاصا میجر جنرل معلوم ہوتا تھا۔ گمان ہوا عہد ہیتس برگ کا کوئی اوپیرا ہے۔ آنکھیں ملیں۔ منظر جوں کا توں پایا۔ تب قدم آگے بڑھایا۔

ایک میدان میں سالم گرم کوٹ پتلون بوٹ موزے اور ہیٹ پہنے تندرست و توانا مزدور زمین کوٹنے میں مستغرق۔ سڑک پر سائیکل رکشائیں بیل گاڑیاں ناپید۔ غلاظت۔ بھکاری۔ دونے کے پتے۔ تھوک۔ پان کی پیک مفقود۔

حیف کہ ایرانی قوم پان کے فوائد سے ناآشنا معلوم ہوئی۔

وسیع باغات، مہذب ہجوم۔ شور و غوغا۔ فلمی گانوں اور ٹرانزسٹر کا غل نایاب۔ سڑکوں پہ دو رویہ صنوبر اور شمشاد کی قطاریں۔ جس سے جگر نالہ میں پیدا ہو وہ ٹھنڈک اور افق پر بھورے کوہستان۔ اس عالم نے شہر کوئٹہ یاد دلایا اور یاد وطن نے ستایا۔

تہران کے نواحی پہاڑوں کا یہ سلسلہ شمران تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں چودہ منزلہ رویال ہلٹون ہوٹل ایک سرسبز ٹیلے پہ ایستادہ ہے۔ طویل۔ سایہ دار شاہراہ پہلوی تہران کو شمران سے منسلک کرتی ہے۔ ہلٹون کی برساتی میں قدیم ایرانی پوشاک پہنے دربان کھڑا ہے کہ

ساری تاریخ اب ٹورسٹ انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔

ہوٹل کے اندر چار سو مغربی نامہ نگار اور متعدد جغادری وی آئی پی آن پہنچے ہیں۔ منی اسکرٹ پہنے سگریٹ پیتی ایرانی خواتین ایوان میں ادھر اُدھر آجا رہی ہیں۔ چشم بینا نے سوال کیا کہ سو سال قبل زرین تاج طاہرہ کس آزادی کی خاطر موت کے گھاٹ اتری تھی؟

چودھویں منزل پر میرے کمرے کے سامنے شمران کی ڈھلان پر امرا کی کوٹھیاں دور دور تک بکھری ہوئی ہیں اور ان کے صحنوں میں تیز نیلے پانی کے سوئمنگ پول جھلملاتے ہیں۔ سردیوں میں یہ سارا منظر برف پوش ہوگا۔ بہار میں یہاں نغمۂ ہزار گونجے گا۔

گرانڈ ہوٹل کی کافی شاپ اور ایوان صحرا میں لوگ ہاٹ گرم تاس اور ششلک کباب اور سرد تربوزہ نوش جان کرنے میں مصروف ہیں۔ وسطی ایوان میں نیلے اطلسی پردوں کے آبشار کے نیچے ان تاجوں کے جو شاہ و شاہ بانو پہنیں گے ڈیزائن ماڈل رکھے ہیں۔ دریچوں کے باہر نیلے دھندلکے میں تہران افق تا افق پھیلا ہوا ہے۔ میں اور میرے ساتھی وقفے وقفے سے پروانے کی طرح اسی ایوان میں آ کر مل جاتے ہیں۔ ایک عمر رسیدہ وسیع و عریض پارسی خاتون زرق برق ساری پہنے جنگی جہاز کی طرح تیرتی ہوئی آ کر اکثر ہماری میز پر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ مارشنس آف ونچسٹر ہیں جنھوں نے چند سال قبل برطانیہ کے سب سے اعلیٰ تربیت یافتہ اسّی سالہ مارکوئیس آف ونچسٹر سے شادی رچائی تھی۔ موصوفہ بقول خود مشرق اوسط کے سارے شیوخ اور سلاطین (مع رضا شاہ کبیر مرحوم) سے گہرے قسم کے ذاتی مراسم رکھ چکی ہیں۔

اچانک سارا شہر پرستان میں تبدیل ہو گیا۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر، مکانوں اور سڑکوں پر ان گنت قمقموں کے برقی تاج۔ پتہ پتہ بوٹا بوٹا قمقموں سے منور ہے۔ ایک بقعۂ نور چوک میں ایک کار اونچے اسٹینڈ پر رکھی ہے۔ "یہ پیکان ہے۔ اسے ہم ایران میں خود بنا رہے ہیں۔" ایک ایرانی مجھے بتاتا ہے۔ قومی فخر، اپنی ترقی پر نازاں، خوش قسمت قوم ہے۔

شام کو تہران پیلس ہوٹل میں وزیر اطلاعات آقائے جواد منصور بیرونی صحافیوں سے ملتے ہیں۔ بڑا سخت ہنگامہ ہے۔ صبح کے کارونیشن بلیٹن میں بتلایا گیا ہے کہ مراقش میں ۲۶ اکتوبر کو روز مسرت منایا جا رہا ہے۔ سوویت سرحد پر شاہ آریہ مہر کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ پاکستان کا فوجی بینڈ تہران پہنچ گیا ہے۔ ایرانی کسانوں کے ڈیڑھ سو نمائندے اپنی مقامی رنگا رنگ پوشاکوں میں ملبوس رضا شاہ کبیر کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کے لئے گئے ہیں۔ سارے ملک میں نئے ہسپتالوں، مدرسوں، شاہراہوں اور مہمان سراؤں کا افتتاح کیا جا رہا ہے۔ ایران اور روس نے نئے تجارتی معاہدے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ جاپان ٹیلی ویژن کے نمائندے نے شاہ بانو کے درزی کا انٹرویو کیا ہے۔ اطالوی اخبار نویسوں کا بیان ہے کہ وہ ایران کو اس قدر ترقی یافتہ دیکھ کر دنگ رہ گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اہم ترین فرمان: تقریب میں شامل ہونے والے تمام حضرات کے لئے لباس برہ یعنی سیاہ ٹیل کوٹ (یورپ کا درباری لباس) اور خواتین کے لئے لمبے گاؤن، لمبے دستانے اور ہیٹ لازم ہیں۔

ایک خستہ تر خاتون نے مجھ سے مل کر مجھے مخاطب کیا۔ "میرا نام سلویا میتھیس ہے۔ نجی زندگی میں مسز اسکر فینڈ ہیں۔ لندن ٹائمز کے لئے تصویریں کھینچ رہی ہوں۔ لمبے گاؤن دستانوں اور ہیٹ کے ساتھ یہ کیسے ممکن ہوگا۔ آپ ساری کے ساتھ دستانے اور

ہیٹ پہنیں گی نا؟" (اس بین الاقوامی مجمع میں اتفاق سے ساری پوش خاتون صرف میں ہوں)۔ ان کی اس بے دقوفانہ معصومیت پر میرے ساتھ کھڑے ہوئے لوگ خاموشی سے محظوظ ہوئے۔

"جی نہیں مسز اسکوفیلڈ۔ میں ساری کے ساتھ دستانے اور ہیٹ قطعی نہیں پہنوں گی۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میں بھی ساری پہن رہی ہوں؟ میں نے پاکستان اور انڈیا سے بہت سی ساریاں خریدی ہیں۔"

ہستوریا کافی بوکھلائی ہوئی بی بی ہیں۔ بلوچستان میں ان کے انجینئر میاں سوئی گیس کشید کرتے تھے اب ایران کا تیل نکالتے ہیں یہ بی بی بلوچستان کے گمنتی قبائل پر کتاب لکھ چکی ہیں۔ ایک فرضی نام سے جاسوسی ناول لکھتی ہیں جو خاصے مقبول ہیں" اب میں نے ایک نیا جاسوسی ناول لکھا ہے اس کا محل وقوع دہلی اور بنارس ہے۔ عنوان ہے DEADLY IN DELHI" انہوں نے مطلع کیا۔

ایک بعد فرانسیسی خاتم پریس کارڈز کے لئے تصویریں کھینچنے کیمرہ لئے ہماری طرف لپکیں۔ میں نے اپنا نام اور پتہ ایک کارڈ پر لکھ کر ان کو دیا۔ نام پر وہ ٹھٹھک گئیں۔ پھر مجھے دیکھ کر دفعتاً بعد اپنائیت سے مسکرائیں "اوہ — خوش آمدید — خوش آمدید —" انہوں نے آہستہ سے کہا اور انگریز صحافیوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

آقائے غفاسنے رات ٹھیک کہا تھا۔ مسلمان ہمیشہ مسلمان رہے گا۔

اہل ہنود کی قدیم پوشاک میں ملبوس، آندک سوسائٹی کی پروردہ، ایک اجنبی زبان بولنے والی خانم خارجی یعنی میں — اور یورپین فراک پہنے اس سفید فام ایرانی خانم کے اب وجد ایک تھے۔ مسلم اقوام کا وہ مشترکہ ماضی کس دھندلکے میں پنہاں ہے؟ اور یہ مختلف نسلوں کے مغربی اور مشرقی افراد جو اس ایوان میں موجود آقائے جاوید منصور سے مصروف گفتگو ہیں قہقہے لگا رہے ہیں اور تصویریں کھینچ رہے ہیں۔ اندرونی طور پر ایک دوسرے سے خائف مشتبہ نسلی و قومی احساس کمتری یا برتری میں مبتلا — یہ سب بھی ایک وسیع ترخاندان ہے۔ ہم سب کا ماضی سنسان پہاڑوں اور وسیع چراگاہوں اور تاریک جنگلوں اور کھنڈروں کے دھندلکے میں چھپا ہوا ہے۔ ہم اس وقت جس خطۂ زمین پر کھڑے ہیں جس تقریب کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ سب کیوں ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ جب دھندلکا شفاف ہو اور آواز بازگشت پانی کی لہروں کی طرح حلقہ در حلقہ پھیلتی کہیں سے کہیں نکل جائے اور ہم سب اس قدر سنجیدہ ہونے کے بجائے اپنے اپنے ماضی پر تھوڑا سا ہنس سکیں تو بہت اچھا ہو۔

کیونکہ بے قصور کوئی نہیں ہے۔

۳- داستانِ باستان

حضرت انسان کل پیدا نہیں ہوئے۔ وہ بہت بوڑھے ہیں اور میلانے میں انسانی ارتقائی اولیں اسٹیج آج سے تینتیس[۳۴] لاکھ سال قبل شروع ہوئی تھی جب ولیز اور لنگور مشرق بعید، یورپ اور افریقہ کے گھنے جنگلوں میں اپنے درختوں سے اترے اور گھٹنا اور پچھلے پنجوں میں اٹھا کر خود کو مستقیم کیا۔ اس کا نتیجہ دیکھ کر کوئی اور جانور آج تک ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔) کوئی دو لاکھ

سال ادھر AUSTRALOPHITHECUS کی قسم نمودار ہوئی۔ آپ باقاعدہ شکاری تھے۔ گو ہاتھ اور عقل اور شکل بندر کی رکھتے تھے۔ یعنی کافی چالاک رہے ہوں گے۔ ہمارے پردادا یعنی HOMO SAPIEN کا تقریباً ایک لاکھ قبل ارتقا ہوا۔ یعنی جسمانی جبلتوں کے علاوہ فطرت نے انہیں دھندلا سا ذہن اور تخیل بھی عطا کر دیا۔ انہوں نے ایک نوع کی "مذہبی قربانیاں" شروع کیں اور اپنے مردے دفن کرنے لگے۔ ہمارا دادا جو CRO-MAGNON MAN کہلاتے ہیں۔ (ہم آپ بالکل ان کے ہم شکل ہیں) تیس ہزار سال قبل نہ صرف اس عالم آب و گل میں بھٹکنے کے لیے آ چکے تھے بلکہ آرٹ کے چکر میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اور غاروں کی دیواروں پر تصاویر بنانے میں جُٹ گئے تھے۔ بارہ ہزار سال ان کو گلہ بانی اور کھیتی باڑی کرتے گذر چکے ہیں۔ دس ہزار سال ادھر ابن آدم نے غالباً دنیا کا پہلا شہر یریحو (JERICHO) تعمیر کیا۔ زمین کی خاطر جنگ شروع کی۔ نسلوں کی تفریق واضح ہوئی۔

ایتھنولوجی کے لحاظ سے "کاکیشن" دنیا کی قدیم ترین نسل اور منگول اور نیگرو (کہ نیگرو ہسپانوی زبان میں سیاہ کو کہتے ہیں) بعد کی نوعی تبدیلیوں (MUTATIONS) کی پیداوار ہیں۔ کاکیشن کی تین شاخیں آریہ یا انڈو یورپین، سامی اور حامی کہلائیں۔ (ایتھنولوجی نے فرزندانِ نوحؑ کی تفریق کو قائم رکھا ہے کیونکہ جدید علوم کے انکشافات نے انجیل مقدس کی تاریخ اور سمبلزم کو بہت حد تک صحیح ثابت کر دیا ہے)۔ کاکیشن خاندان کی آریہ شاخ موجودہ یورپین اقوام کے اجداد یعنی یونانی، لاطینی، ٹیوٹن (جن میں جرمن اور انگریز شامل ہیں) کیلٹ اور سلاو قبائل میں بٹ گئی۔ کیلٹ سب سے پہلے ایشیائی چراگاہوں سے نکل کر یورپ پہنچے۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسرے آریہ قبیلے نے اس جزیرہ نما میں پہنچ کر جو اب اطالیہ کہلاتا ہے کیلٹوں کو وہاں سے مار بھگایا۔ ادھر یونانی قبیلہ یونان پر قابض ہوا۔ پھر نہایت جنگجو ٹیوٹن قبیلے نے بے چارے کیلٹوں کو وسط یورپ سے اور آگے دھکیل دیا اور خود ڈنمارک اور اسکنڈے نیویا پر بھی قابض ہو گئے۔ کیلٹ برطانیہ، فرانس اور آئرلینڈ میں آج تھوڑے سے باقی ہیں اور "کیلٹک تجدید" وغیرہ قسم کی شاعرانہ چیزوں میں مصروف رہتے ہیں۔ رومینٹک قوم تھی اس لئے پٹ گئی۔ سب سے آخر میں لیتھوینین اور سلاو اقوام ایشیا سے یورپ آئیں۔ سلاو حضرات روس، پولینڈ اور بوہیمیا وغیرہ میں پھیل گئے۔ لیتھوینین ظاہر ہے لیتھونیا ہی گئے۔ باقیماندہ پرشیا اور روس ہی آباد ہوئے۔ یہ سب زمانہ قبل از تاریخ کی ہجرتیں ہیں۔ اس سے قبل یہ ایک ہی بڑے انڈو یورپین قبیلے میں شامل تھے اور ہجرت سے قبل ایک حد تک متمدن ہو چکے تھے۔ مکان بنا کر رہتے تھے۔ ہل، چکی، تیر اور تلوار چلانے لگے تھے۔ گھوڑا پالتے تھے۔ خاندان کی شیرازہ بندی ہو چکی تھی۔ ایک خدا یا کھلے نیلے آسمان کی پرستش کرتے تھے اور چونکہ اس قبیلے کا سماجی اور معاشی ارتقا ایک سا رہا تھا لہٰذا زبان بھی ایک ہی تھی[1]۔ چنانچہ انڈو یورپین زبانوں میں آج تک

---

[1] طوفان کے بعد نوحؑ کے بیٹوں کی اور ان کی نسلوں سے اور گروہوں میں جا بجا منقسم ہوئی۔ اور تمام زمین پر ایک ہی زبان تھی اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سنعار میں ایک میدان ملا اور وہ وہاں بس گئے اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں۔ اور خداوند اس شہر اور برج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اترا اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان کی زبان ایک ہے۔ وہ جو کچھ یہ کرنے لگے ہیں تو اب جو کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں اور خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔" کتاب پیدائش (باب ۱۱) یہ تمدنی اور نسلی ارتقا کی دوسری اسٹیج تھی۔

گہری مماثلت موجود ہے۔ آریوں کی دوسری شاخ میں انڈو ایرانی قبائل شامل ہیں جو ایران، افغانستان اور ہندوستان میں آکر بسے۔ کا کیشن خاندان کی تیسری شاخ میں اشوری، عبرانی، فینقی اور عرب پیدا ہوئے اور سامی نسل کہلائے۔ چوتھا خاندان حامی تھا ان میں وہ قدیم مصری شامل تھے۔ جن کی اولاد آج قبطیوں کے نام سے ہسٹری کے ایک فٹ نوٹ کی طرح تھوڑی سی تعداد میں موجود ہے۔ مجموعی طور پر نیگرو اقوام کو حامی کہا جاتا ہے۔

" اور یہ فرزندان نوح سام، حام اور یافث کی نسلیں ہیں جو طوفان کے بعد پیدا ہوئیں۔ بنی یافث یہ ہیں: گومر[1]۔ ماجوج[2]۔ مادی۔ اور یاوان۔ اور توبل اور مسک اور تیراس۔ اور گومر کا بیٹا اشکناز[3]۔ [وغیرہ وغیرہ] اور بنی حام کوش اور مصرائیم اور کنعان [وغیرہ] تھے۔ اور سام کے ہاں جو بنی عبر کا باپ اور یافث کا بڑا بھائی تھا۔ جو اولاد ہوئی وہ یہ ہے۔ عیلام اور اشور اور ارام۔ [وغیرہ] اور عبر کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ ایک کا نام فلج تھا۔ کیونکہ زمین اس کے ایام میں بٹی۔ اور کوش سے نمرود پیدا ہوا۔ اور اس کی بادشاہی کی ابتدا ملک سنعار میں بابل اور ارک اور اکاد سے ہوئی۔ اسی ملک سے نکل کر وہ اشور میں آیا۔ [یعنی وادی دجلہ و فرات میں شہری تمدن کی بنیاد پڑی اور بادشاہت کا آغاز ہوا۔ اس وقت یورپ گئے ہوئے آریہ قبائل ایشیا کی مہذب سامی اور حامی نسلوں کے مقابلے میں قطعی وحشی تھے]

" بنی حام " پر آج تک گوری اقوام کے ہاتھوں جو کچھ گذری ہے اس کے جواز میں مغرب کے نسل پرست خصوصاً امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے گورے نوح کی اس بد دعا کا اکثر حوالہ دیتے ہیں: " کنعان [حام کا بیٹا] ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہو گا۔" (کتاب پیدائش)۔ جس وقت عہد نامہ قدیم لکھا گیا سماج میں حبشی غلاموں کی خرید و فروخت کب کی شروع ہو چکی تھی۔

اولاد نوح کے نسب نامے میں قبیلوں اور ملکوں کے نام[4] ان کے اصلی یا اسطوری مورث اعلیٰ کے نام سے منسوب کئے گئے ہیں۔ کتاب پیدائش میں عیلام کو بھی بنی سام میں شامل کیا گیا ہے۔ اور آج بھی ایران کے ان قدیم باشندوں کی نسل کے متعلق طے نہیں ہو سکا ہے (عیلامیوں سے بھی قبل یعنی اب سے کوئی چھ ہزار سال پہلے ایران میں ایک باقاعدہ متمدن جنم لے چکا تھا جو وادی سندھ، عراق وغیرہ کا ہم عصر تھا۔ اس کے خالق گویا ایران کے " دراوڑ"

---

[1] اہل کریمیا۔ [2] منگول یا سیتھین۔

[4] اور یہ مشرقی روایت کافی دور تک چلی گئی ہے۔ مثلاً قصص الانبیا اور تاریخ فرشتہ دونوں میں لکھا ہے کہ اہل ہند و حبش حام کی اولاد ہیں (اہل ہند غالباً اس لئے کہ وہ کالے تھے)۔ یافث نے ترکستان بسایا اور شیطان علیہ اللعنۃ نے یافث ہی کو ہند میں بت پرستی سکھائی۔ فرشتہ اس میں مزید اضافہ کرتا ہے (جو انجیل کے نسب نامے کے مطابق ہے) کہ بنی سام میں ارم، قبطہ، اور ہود، صالح اور براہیم کے جد امجد ارفخشد شامل تھے اور ترکوں کے پردادا یافث کے ایک بیٹے کا نام چین تھا۔ حام کے تین بیٹے ہند، سندھ، حبشہ تھے ہند کے چار بیٹے پورب، بنگ، دکن، نہروال [گجرات] تھے۔ دکن کے تین لڑکے مرہٹ، کنڑ اور تلنگ تھے! (غور کرنے کا مقام ہے بنگال اس زمانے سے OVER POPULATED ہے۔ کیونکہ فرشتہ لکھتا ہے بنگ کے گھر میں بے شمار اولاد ہوئی)

تھے[1]۔ آج سے کوئی پانچ ہزار سال قبل عیلامی شمال اور مشرق کے پہاڑوں سے اترے اور اپنا پایہ تخت شوش میں قائم کیا (جو موجودہ شستر سے ۲۵ میل دور ہے) اس وقت تک وادی دجلہ و فرات میں سومیر اور اکاد وغیرہ کی طاقتور سامی ریاستیں[1] قائم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ عیلامی مستقل اپنے ان پڑوسیوں سے لڑا کیے۔ یہ اپنا طرزِ تحریر ایجاد کر چکے تھے مگر سومیری اور اکادی زبانیں بھی انہوں نے اختیار کیں۔ ان کے بعض نام بھی سامی ہیں۔ یہ مادری نظام کے قائل اور دیوتی ماں کے پرستار تھے۔ ان کے سرداروں نے پہلی بار خود کو پیغمبر، باپ اور بادشاہ کہا۔ سمجھدار لوگوں کو تبھی پتہ چل گیا تھا کہ یہ بادشاہت کا نیا چکر آسانی سے ختم ہونے والا نہیں۔ عیلامی بڑے طاقتور حکمران ثابت ہوئے۔ یہ ابھی تک عہد عتیق کے کہرے میں چھپی ہوئی قوم تھی لیکن ایران کے باستان شناس ان کی کھوج میں جٹے ہوئے ہیں[2]۔ (آرکیالوجسٹ کے لئے باستان شناس کیا عمدہ ترکیب ہے!)

عیلام نے کئی صدیوں تک عروق کو اپنی کالونی بنائے رکھا۔ مگر اٹھارویں صدی قبل مسیح میں دانشمند قانون[3] ساز بادشاہ نے جس کا

---

[1] یہ سب سلطنتیں بیحد کنفیوزنگ ہیں، سومیر، اکاد، اشوریہ یا اسور، عروق۔ جو بعد میں کلدانیہ اور اس کے بعد بابل بن جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ یہ موجودہ شام اور عراق کے قدیم نام ہیں۔ داستان گل گامش جو شاہ اشور کے کتب خانے سے نینوا کی کھدائی میں الواح پر لکھی ہوئی برآمد ہوئی (اور شاہ انگلستان کے کتب خانے یعنی برٹش میوزیم میں اشوری الواح محفوظ کی گئیں) ایک قدیم سومیری کہانی پر مبنی تھی جس میں اتناپشتم نے دیوتاؤں کے حکم سے طوفان سے بچنے کے لئے کشتی بنائی بعد میں عبرانیوں نے اس سے مشابہہ طوفان نوحؑ کا قصہ قلمبند کیا۔ ہندوستانی دیومالا میں اسی عہد میں منو مہاراج کو ایک مچھلی کا سامنا کرنا پڑا جس کے بعد وہ نسل انسانی کے باپ بنے۔ غالباً یہ دنیا بھر میں ICE AGE کے خاتمے کے متعلق تذکرے تھے۔

[2] اکتوبر ۶۷ء میں روزنامہ کیہان نے اطلاع دی: عملیات حفاری در هفت تپه از اول دیماه مجدداً آغاز می شود۔ در این منطقه تاکنون آثار ارزنده و جالبی از ۳۵ قرن پیش کشف گردیده است بهمین جهت برای کشف سایر آثار باستانی که بنا به تخمین در دل خاک های هفت تپه مدفون است کارهای حفاری در شوشتر دنبال می شود و احتمالاً قریب ۵۰ سال بطول می انجامد۔ عملیات حفاری بدنبال بررسی های قبلی از ده سال قبل در محوطه ای بشعاع یک کیلومتر در هفت تپه شروع گردید و آثار جالبی نظیر آرامگاه سلاطین و معبد بزرگ عیلامیها که یادگاری است از ۳۵۰۰ سال پیش از زیر خاک بیرون آورده شد۔ معبد کشف شده دارای حیاط بزرگ، محل قربانی و سالن های متعدد است و دیوارهای سالن با تصویر زیبا نقاشی شده ولی بر اثر مرور زمان فقط رنگ این تصاویر بر دیوارها مانده است که قرار است برای کشف نوع تصاویر و سبک آن آزمایش های مختلف روی رنگها و دیوارهای سالن صورت گیرد۔ دکتر نگهبان رئیس هیات حفاری هفت تپه بخبرنگار کیهان گفت آخرین کشفی که در منطقه هفت تپه شوش صورت گرفت یک کتیبه بسیار بزرگ است که ۵۵ سطر خط میخی روی آن نقش بسته است۔ این کتیبه وقف نامه یکی از سلاطین عیلامی بنام تپتی آهار است که در معبد گذاشته شده و مربوط به ۳۵۰۰ سال پیش می باشد۔

[3] بابل کے سنگتراشوں نے ایک سنگی تصویر میں حمورابی کو یوں دکھلایا کہ شمش یعنی سورج دیوتا اسے قوانین کی الواح عطا کر رہا ہے۔ چند صدیوں بعد ایک اور سامی قوم یعنی عبرانیوں نے قلمبند کیا کہ کس طرح ان کے رہبر و سردار موسیٰؑ نے کوہ سینا پر احکام الٰہی کی الواح حاصل کیں۔

نام حمورابی تھا ملک کو آزاد کر کے سومیر اور اکاد کو متحد کیا اور بابل کی ریاست قائم کی۔

عہد حمورابی کے آس پاس ہجرت کے دو اہم واقعات پیش آئے جنہوں نے مستقبل کی ساری تاریخ کا رخ بدل دیا۔ ان میں سے ایک ہجرت اجتماعی تھی اور دوسری ایک پیغمبر کی انفرادی۔ اجتماعی ہجرت کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہوگا کہ دو ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ یوریشیا میں بڑی تہلکہ خیز اور بڑے وسیع پیمانے پر ہجرتیں ہو رہی تھیں۔ انڈو یورپین قبائل کی ہجرت کا پہلے مختصراً ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب ہو یہ رہا تھا کہ دنیا کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک قبیلہ بڑھتا اور زور پکڑتا اس کے پیچھے ایک اور خاندان قبیلے میں تبدیل ہو کر حصول معاش کی جستجو میں یا خاندانی رقابتوں کی وجہ سے دوسرے قبیلوں کو آگے دھکیل دیتا اور ان کی چراگاہوں پر قابض ہو جاتا یا کال پڑتا تو نئے سبزہ زاروں کی تلاش میں قبیلے کہیں اور کوچ کر جاتے۔ شہسواری کے علاوہ گھوڑوں کو ہلکے پھلکے تیز رفتار رتھ میں جوتنا بھی انہوں نے ایجاد کر لیا تھا۔ ادھر یہ سن رکھا تھا کہ جنوب میں بڑے ٹھاٹھ ہو رہے ہیں۔ دریاؤں کے کنارے زبردست اور دولتمند شہر آباد ہیں۔ جن کے باشندے بے حد مہذب ہونے کی وجہ سے ڈیکیڈنٹ ہو چکے ہیں۔ اس طرف جا کر کیوں نہ قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ انہوں ایسا ہی کیا (وہ آئندہ پونے چار ہزار سال تک یہی کرتے رہے۔) چنانچہ دو ڈھائی ہزار سال قبل مسیح انڈو یورپین شہسواروں نے یوریشیا یعنی جنوبی روس سے نکل کر مشرق اور مغرب کا رخ کیا۔ ایک گروہ بحیرہ اسود کا چکر کاٹ کر مشرقی یورپ پہنچا۔ پھر وہاں سے اناطولیہ میں آن وارد ہوا۔ یہاں کی بے چاری مقامی آبادی ایک غیر آریائی زبان بولتی تھی (جسے اب ماہرین لسانیات نے حطّی کا نام دے دیا ہے) اور اپنے ملک یعنی ایشیائے کوچک کو حتّی کہتی تھی اس کا سب سے بڑا شہر حتوساش تھا جہاں بہت سے اشوری سوداگر بھی رہتے تھے۔ تازہ وارد انڈو آریوں نے حسب عادت مقامی آبادی پر قبضہ جمایا اور خود کو حتّی کہلوانے لگے۔ اور بڑی زبردست سلطنت قائم کر لی۔ ملک میں لوہے کی دریافت کی وجہ سے حتّی سب سے طاقتور بن گئے۔ مشرق اوسط کی ساری قومیں ابھی تانبے کے عہد میں پڑی تھیں۔ حتّی حضرات مزے سے گویا HEAVY INDUSTRY چلا رہے تھے۔ ماہر سنگ تراش بھی تھے۔ ان کی انڈو یورپین زبان سرکاری زبان تھی۔ جو بالکل حکمران طبقے کی انگریزی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:-

WATAR (water)

HAUTI (anti-)

HASTAI (osteo- ہڈی)

PHAHHUR (fire)

UGA (ego)

ساتھ ہی سنسکرت سے اس کی مشابہت ایک حتّی شہر کے نام پرشش کھنڈ سے ظاہر ہوتی ہے (جسے ترکوں نے برشش خندم کہا)۔ رفتہ رفتہ اس زبان میں سامی الفاظ بھی شامل ہو گئے۔ بیشتر حتّی بادشاہوں کے نام غیر آریائی ہیں۔

ادھر [illegible] ق م میں بحیرہ کیسپین کے جنوبی پہاڑوں سے کسّی (کیا دلچسپ نام ہے) جو اٹھے تو انہوں نے سیدھے عراق پہنچ کر دم لیا اور یہاں مقامی حکومت قائم کر لی۔ اور سخت نکمے ثابت ہوئے۔ ان کے ہاں اندر، ورن، مروت وغیرہ آریہ

دیوتاؤں کے پرستار تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی بندوں یعنی اناطولیہ کی ہتّی قوم سے خوب جنگ و جدل کی اور پھر ایک صلح نامے میں اندرا اور وروَن کی قسم کھا کر امن کا عہد کیا۔ اور پھر لڑنے۔ یہ بھی بڑے بہترین شہسوار تھے۔ انہوں نے غالباً پہلی بار مشرق اوسط میں گھوڑوں کی ٹریننگ کا باقاعدہ انتظام کیا۔ ان کی شہسواری کے ایک مقالے کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ایکاورتنا (سنسکرت : ایکاورتنم یعنی ایک چکر)

تیراورتنا (″ : تری ورتنم)

پانزاورتنا (″ : پنچ ورتنم)

ستاورتنا (″ : سپت ورتنم)

نوارتنا (″ : نوورتنم

وشرتّ ایک متانی بادشاہ تھا جو بالکل راجہ دسرتھ کا کزن معلوم ہوتا ہے۔

پھر خاصی قبیلہ شمال کے پہاڑوں سے اترا (کہا جاتا ہے کہ کیسپین سمندر اور موجودہ ایران کے شہر قزوین کے نام اسی قوم کی یادگار ہیں)۔ ان کے دیوتا بھی ماروتش (ہندوستانی ماروت) اور شوریاش (سوریہ) تھے۔ انہوں نے عیلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی کیونکہ وہ بھی اب تک ڈیکیڈنٹ ہو چلا تھا۔ عیلام کے بعد انہوں نے عراق کا صفایا کیا اور صدیوں اس پر قابض رہے۔

اسی زمانے میں ہتّی، ہُرّی اور خاصی حضرات کے علاوہ ایک اور قبیلہ یوریشیا سے روانہ ہوا اور بحیرہ کیسپین کا چکر کاٹ کر ایران پہنچا یا یوں سمجھیئے کہ اسی قبیلے کی وجہ سے اس ملک کا نام ایران پڑا۔ یہ انڈو ایرانی قبیلہ تھا جو ہندوستان اور ایران میں آباد ہوا۔ ہتّیوں ہُرّیوں خاصیوں وغیرہم کو تاریخ کھا گئی۔ مگر یہ قبیلہ آج تک مرنے سے وِنکار رہا ہے۔

اب ہم تاریخ کی اس دوسری عظیم ہجرت کا ذکر کریں گے جو ایک تن تنہا مرد خدا نے کی تھی اور جس کی وجہ سے دنیا کے تین عظیم مذاہب یہودیت، نصرانیت اور اسلام کی بنیاد پڑی۔

اس دور میں یعنی ۱۸۵۰ق م کے آس پاس ہر قسم کے آریہ اور سامی دیوی دیوتاؤں کی ریل پیل تھی۔ شوری بادشاہ اپنی تیزرفتی میں ضرب المثل بن چکے تھے۔ مصر میں فرعون اپنی فرعونیت میں مشغول تھے جہاں سورج دیوتا رع کا اوتار فارع یعنی بادشاہ تھا (جو عبرانی میں فاراؤ اور عربی میں فرعون ہوا)۔ سومیر کا پایۂ تخت نجوم پرستی کا مرکز تھا۔ اب کتاب پیدائش کو یاد کیجیے کہ یہی سام کے اخلاف ارفخشد، صالح اور عبر کا زمانہ تھا۔ اور بنی آدم میں عوض شامل تھے۔ (اور قصص الانبیاء میں ہے کہ عاد بن عوض کا بیٹا شداد تھا۔ اور قوم عاد کی ہدایت کے لئے حضرت ہودؑ پیدا ہوئے)

اسی زمانے میں سومیر کے پایۂ تخت اُر میں رہنے والے ایک سامی قبیلے بنی آدم میں آل عبر کے ایک متمول فرد تارح کے ہاں حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا آذر نے ان کی پرورش کی (آذر مندر کے کاہن کا لقب تھا)۔ اور جب حضرت ابراہیم نے جوان ہو کر خدائے واحد کی پرستش شروع کی تو خداوند نے ابراہیم سے کہا تو اپنے وطن اور اپنے

باپ کے گھر سے نکل اور اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر لعنت کروں گا۔ (پیدائش ۱۲ : ۱-۳) — چنانچہ ابراہیمؑ نے اپنے کنبے کے ساتھ اللہ توکل صحراؤں کا رُخ کیا۔ اور کنعان کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ وران کا قبیلہ آل عبر کی مناسبت سے عبرتم اور بعد میں عبرانی کہلایا۔ ایک مغربی نظریے کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خاندان کو کنعان پہنچنے کے بعد عبرانی اس لئے کہا گیا کہ وہ نہر یعنی دریا (فرات) کے اس پار سے آئے تھے۔

پانچ منٹ کے لیے اگر یہ فرض کر لیجیے کہ حضرت ابراہیمؑ اُر سے نکل کر (کہ اس سے عنسر نام کسی شہر کا مراد نہیں سکتا) صحرائے عرب کا رخ کرنے کے بجائے ایک کشتی میں بیٹھ کر خلیج فارس سے گذرتے وادی سندھ پہنچ گئے ہوتے جہاں موہن جو دڑو اور ہڑپہ والوں کے تجارتی اور تمدنی تعلقات صدیوں سے سومیر سے قائم تھے اور سندھیوں نے ایام سومیر اور غالباً ٹرائے کے ساتھ غالباً ۲۳۰۰ قبل مسیح سے ہی ایکسپورٹ امپورٹ (اور غالباً اسمگلنگ) شروع کر رکھی تھی۔ اور یہاں آن کر خلیل اللہ نے دین براہیمی پھیلا دیا ہوتا تو ایک طرف تو ہندوستان کی تاریخ بالکل مختلف ہو جاتی اور دوسری طرف آج مسئلہ یہود اور لوٹتے دیان کانے دجال کا وجود نہ ہوتا مگر اللہ میاں نے ان سے یہی کہا کہ کنعان چلے جاؤ۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

اٹھارویں صدی قبل مسیحؑ ہجرتوں کا دور تھا۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۷۰۰ قبل مسیح میں ہائیکسوس قبیلے نے مصر پہنچ کر وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ (یونانیوں نے انھیں ہائیکسوس کہا جس کے معنی گڈریے بادشاہ ہیں۔ مغربی مؤرخین کے خیال میں یہ یونہی چٹیچر سے لوگ تھے اور ان میں ہرّی، کنعانی اور عرب سب خلط ملط ہو گئے تھے۔

اس طرف ہتّی سلطنت زوروں میں جاری تھی۔ حتّی سارے مشرق اوسط میں پھیل چکے تھے اور کنعان میں بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اسی وجہ سے کتاب پیدائش کے نسب نامے میں حیتھ کو کنعان کا بیٹا بتایا گیا۔ انجیل مقدس میں "بنی حِطّ" کا ذکر جا بجا ملتا ہے:

"اور سارہ نے قریت اربع میں وفات پائی۔ یہ کنعان میں ہے اور حبرون بھی کہلاتا ہے۔ اور ابراہیمؑ سارہ کے نوحہ و ماتم کے لئے وہاں گئے اور میت کے پاس سے اٹھ کر بنی حِطّ سے باتیں کرنے لگے۔ اور کہا کہ میں پردیسی غریب الوطن ہوں۔ تم اپنے ہاں قبرستان کے لئے کوئی جگہ مجھے دو تاکہ میں اپنا مردہ وہاں دفن کر سکوں۔ تب بنی حِطّ نے جواب دیا اے ابراہیمؑ! تم ہمارے درمیان زبردست سردار ہو۔ ہماری قبروں میں جو سب سے اچھی ہو اس میں اپنا مردہ دفن کر دو۔ اور ابراہیمؑ نے اٹھ کر بنی حِطّ کے آگے جو اس ملک کے لوگ ہیں آداب بجا لا کر یوں کہا کہ صحر کے بیٹے عفرون سے میری سفارش کرو کہ مکفیلہ کے غار کو جو اس کے کھیت کے کنارے پر ہے گورستان کے لیے مجھے فروخت کر دے۔ (پیدائش۔ باب ۲۲ : ۲-۱۰)

لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے چار سو مثقال میں وہ زمین قبر کے لیے بنی حطّ سے خرید لی۔ (حتّی قوم کو عبرانی ختیم اور مصری ختا کہتے تھے)

حتّی کنعان میں یونہی زبردستی پہنچ گئے تھے۔ یہ ملک دراصل اس تاجر قوم کا تھا جس کی اولاد بعد میں فنیقی LEVANTINE[1] کہلائی

---

[1] LEVANT کی اس افسانوی، ساحلی سرزمین کا شمالی حصہ اب شام، وسطی لبنان اور جنوبی اسرائیل میں شامل ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی آمد کے وقت فنیقی شہر بائیبلوس مصر، عراق اور وادیٔ سندھ سے ایک ہزار سال سے تجارت کر رہا تھا۔ ان کے دو مرے دولت مند اور عشرت زدہ شہر سدوم اور عمورہ تھے۔

کنعان میں حضرت اسحٰقؑ بن ابراہیمؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہوئے جن کا ایک لقب اسرائیل تھا۔ اس طرح ان کی آل اولاد بنی اسرائیل کہلانے لگی۔ حضرت یوسفؑ بن یعقوبؑ کو ان کے سوتیلے بھائیوں نے ایک قافلے کے ہاتھ بیچ دیا اور مصر پہنچ کر غالباً تھیبز کے بازار میں ان کو فروخت کیا گیا۔ اور ایک سرکاری افسر نے انھیں خرید لیا۔ اس وقت مصر پر ہائیکسوس "گڈریہ بادشاہوں" کی حکومت تھی۔ اسی زمانے میں کنعان میں زبردست قحط پڑا اور بنی اسرائیل نے روٹی کی تلاش میں مصر ہجرت کی۔ اس دوران میں حضرت یوسفؑ حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے سرکار نے ان کے مہاجر قبیلے کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک صوبہ ان کی سکونت کے لیے مخصوص کر دیا۔ برطانیہ کے یہودی مورخ سیسل روتھ کا خیال ہے کہ چونکہ ہائیکسوس حکمران خود سامی النسل تھے اس لیے انہوں نے حضرت یوسفؑ اور ان کے قبیلے کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

اس وقت ہی مصر کی قدامت کا یہ حال تھا کہ وہاں کی بادشاہت دو ہزار سال پرانی ہو چکی تھی۔ مگر یہ نو دولتیے ہائیکسوس فرمانروا غیر ملکی تھے۔ چنانچہ ان کے خلاف قوم پرست انڈر گراؤنڈ تحریک شروع ہوئی۔ جو کامیاب ہوئی اور ۱۵۵۵ء ق م میں ہائیکسوس شاہی خاندان تھیبز سے نکال دیا گیا اور مصر میں ڈیڑھ سو سال بعد دوبارہ قومی سلطنت قائم ہوئی۔ اب حکومت کی پالیسی بدل گئی۔ نئے مصری فراعنہ نے چن چن کر غیر ملکی بنی اسرائیل پر ظلم توڑنے شروع کیے۔ اور ان کی حالت غلاموں سے بدتر ہو گئی۔ مصری سامراج کا دور شروع ہوا۔ لیکن مشرق اوسط میں مصر نے حتی سلطنت کا اپنا سب سے بڑا حریف پایا۔ حتی بادشاہ مرسی لیس اول حمورابی کے پڑپوتے شمسی دتنا کو زیر کر کے عظیم الشان بابل کو ۱۵۹۵ء ق م میں ختم کر چکا تھا۔ ۱۵۲۵ء ق م میں ایک حیرت انگیز روشن خیال حتی فرمانروا طیلے پی نس اول نے کمل مطلق العنانی کے اس تاریک دور میں دنیا میں پہلی بار ایک آئینی حکومت قائم کی تھی جس کی مجلس شوریٰ بادشاہ کو سزائے موت تک دے سکتی تھی[1]۔ اسی زمانے میں متانی حکومت بھی بہت زور پکڑ چکی تھی۔ اس کے ایک بادشاہ دشرتّا بھی ایک حضرت تھے۔ انہوں نے فرعون آمینوفس سوم کو اکادی میں (جو انٹرنیشنل ڈپلومیسی کی زبان تھی) بڑا ہی ڈپلومیٹک خط لکھا۔ ملاحظہ ہو:۔

"آپ کے میرے والد مرحوم سے ہمیشہ بہت گہرے تعلقات رہے۔ اب بادولت اور آپ دوست ہیں اور ہماری یہ دوستی گذشتہ تعلقات سے دس گنا زیادہ استوار ہے۔ تو میں اپنے برادر عزیز سے کہتا ہوں کہ جتنا سونا وہ میرے باپ کو بھیجتا تھا اس سے دس گنا زیادہ مجھے بھیجے۔"

مصر نے کنعان کی شہری ریاستوں کو اپنا باجگذار بنایا اور مغربی ایشیا میں اپنے حلقۂ اقتدار کی توسیع کرتا چلا گیا۔ مگر فرعون آمینوفس سوم کے بیٹے آمینوفس چہارم کے دور میں حالات بدل گئے۔ بقول پروفیسر سٹوربرگ یہ نیا فرعون عہد عتیق کا ایک عجیب و غریب اور اپنے

---

[1] ایک متعصب مغربی مورخ کا کہنا ہے کہ چونکہ طیلے پی نس ایک فطرتاً سفاک ایشیائی نہیں تھا بلکہ انڈو یوروپین تھا اس وجہ سے اس نے انصاف پرستی اور نیک دلی کا ثبوت دیا۔!

دور کے لئے MISFIT بادشاہ ہے۔ صوفی منش، فلسفی اور خواب دیکھنے والا۔ تجیبر کی شان و شوکت اور ہنگاموں سے گھبرا کر اس نے صحرا میں ایک نیا شہر سنہ ۱۳۶۷ ق م میں تعمیر کروایا اور وہاں غور و فکر میں محو ہو گیا۔ اکبر کی طرح ایک نیا مذہب بنایا۔ مصر کے ہزارہا دیوی دیوتاؤں کو ترک کر کے ایک معبود آتون کی پرستش شروع کی جس کا مظہر سورج قرار دیا۔ اپنا نام اخناتون رکھا۔ یعنی "آتون مطمئن ہے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ اخناتون اپنے صحرائی محل میں خواب دیکھتا رہا۔ سلطنت کمزور پڑ گئی اور دشمنوں نے سر اٹھایا۔ مصری صوبوں کے حاکم اخناتون کو خط پہ خط لکھتے رہے کہ باغیوں اور حملہ آوروں کے خلاف ہماری مدد کیجئے۔ فنیقی شہر صور کے حاکم آبی ملک نے لکھا: "سدوم کا گورنر زمردہ عبد عشترت کے نامعقول بیٹے عذیرو سے ساز باز کر رہا ہے۔ جہاں پناہ! فدوی نے آپ کو مطلع کر دیا ہے تاکہ آپ باخبر رہیں۔" ادھر بابلوس کے شہزادے رب عدی کو بھی وہی نامعقول عذیرو تنگ کر رہا تھا۔ لہٰذا رب عدی نے فرعون کو پروانہ بھیجا: "میرا چھوٹا بھائی بابلوس کو عبد عشترت کے حوالے کر دینا چاہتا ہے۔ مجھے مصر سے خالی ہاتھ، بغیر کمک کے واپس لوٹتے دیکھ کر اس نے مجھے شہر سے نکال باہر کیا۔ فرعون وقت متوجہ ہوں۔" ابھی غریب اخناتون اسی مراسلے پر غور کر رہا تھا کہ ابی ملک کی طرف سے ایک اور فریاد آئی (جس کا سدوم والے زمردہ نے عموری سردار عذیرو سے مل کر محاصرہ کر لیا تھا) "ہم محصور ہیں۔ ہمارے پاس نہ ایندھن ہے نہ پانی۔ نہ اپنے مُردے دفن کرنے کے لئے زمین۔" دوسری جانب سے اسی زمردہ نے مصر سے اپنی وفاداری کا اظہار کر کے دشمنوں کے مقابلے میں امداد کا مطالبہ کیا۔ ادھر یروشلم کے شہزادے عبد خبہ نے فوری مراسلہ بھیجا: "شاہا! اپنی سلطنت کی حفاظت کیجئے بغاوت پھیل رہی ہے۔ میں برابر ملتجی ہوں کہ مجھے فرعون کی خدمت میں حاضر ہونے دیا جائے تاکہ میں فرعون کی دونوں آنکھوں کی زیارت کر سکوں۔ لیکن میرے دشمن مجھے باریابی حاصل نہیں کرنے دیتے۔ اپیرو قوم نے ملک میں لوٹ مار مچا رکھی ہے۔ اور زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ عالی جاہ! جب آپ کے افسر دورے پر آتے ہیں تو میں ان سے کہتا ہوں کہ فرعون کی مملکت تباہ ہو رہی ہے۔ مگر وہ میری نہیں سنتے۔ جہاں پناہ! اپنے تیر اندازوں کی طرف توجہ کیجیے۔ اگر اس سال تیر انداز یہاں پہنچ جائیں۔ تو یہ ملک بچ سکتا ہے۔" لیکن اخناتون اپنے خوابوں میں کھویا رہا اور یہ مراسلات غالباً بیکار گئے۔ سلطنت میں بدامنی بڑھتی گئی۔ مصری کاہن جو اب تک بہت با اقتدار رہے تھے اخناتون کی مذہبی اصلاحات کی وجہ سے اب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے کیونکہ مندر بند کئے جا چکے تھے۔ اب ان کاہنوں نے اخناتون کے خلاف سازش کی اور سنہ ۱۳۵۰ ق م میں اس عجیب و غریب تخیل پرست فرعون کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کا گیارہ سالہ داماد توت عنخ آمون تخت نشین ہوا۔

اتنے عرصے میں ایک اور زبردست حطی بادشاہ شپی لولیوس (کس قدر کمال کے نام ان صاحبان کے تھے!) جسے مغربی مورخین "مشرق قریب کا شارلمین" کہتے ہیں متانی فرمانروا یعنی ہمارے پرانے دوست دشرتہ سے ٹکر لے چکا تھا۔ سنہ ۱۳۴۰ ق م میں اس نے اجہ

ملہ یہ چارسے اخناتون کی ڈپلومیٹک خط و کتابت کی ان گنت تختیاں مصر کی کھدائی سے برآمد ہوئی ہیں۔
ملہ یہ "اپیرو" غالباً عبرانی تھے جو ٹھکانے کی تلاش میں جگہ جگہ مارے مارے پھر رہے تھے۔

دشرت کا تیع قمع کر کے متانی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا اور چاروں طرف نظر ڈالی کہ اب کس کا تختہ اُلٹوں جب مصر میں نوجوان توت عنخ آمون کا اٹھارہ سال کی عمر میں انتقال ہوا اس وقت بوڑھا سپ لُو لُو (کہ مصریوں نے سمجھداری سے کام لے کر اس کا نام مختصر کر دیا تھا) چالیس سال حکومت کرنے کے بعد اب شام میں فوج کشی کر رہا تھا۔ تب ہی ایک بڑا ڈرامائی واقعہ پیش آیا۔ مصر کی بیوہ ملکہ اخناتون کی بیک وقت بیٹی (مصری شاہی دستور کے مطابق تاکہ تخت و تاج باہر نہ جانے پائے) اور بہو یعنی اپنے سوتیلے بھائی توت عنخ آمون کی بیوی کا بھی تھی۔ مصری قانون کے مطابق اب وہ جس سے شادی کرتی وہی نیا فرعون بن جاتا۔ اس وقت بوڑھے دربار پروہت آئے نے جو کم سن توت عنخ آمون آنجہانی کے دور میں سلطنت کا مشیر تھا اور اس کے باپ دادا کے کا وزیر رہ چکا ہے چاری ملکہ عنخ اسن آمن سے بیاہ رچانا چاہا۔ ملکہ نے ہڑبڑا کر حطی بادشاہ ستپ لُو لُو کو ایلچی بھیجا کہ میں اس موٹے بھدے بدقطع کاہن پجاری سے ہرگز شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اپنے ایک شہزادے کو روانہ کر دیجیے تاکہ میں اسے اپنا شوہر اور نیا فرعون بناؤں۔ ستپ لُو لُو اس وقت میدان جنگ میں بے طرح مشغول تھا۔ یہ درخواست سن کر باغ باغ ہو گیا کہ مصر کی سلطنت یوں مفت میں ہاتھ آ گئی۔ مگر اس کے مشیروں نے کہا ممکن ہے یہ کوئی گہری سیاسی چال ہو۔ ذرا توقف کیجیے۔ چنانچہ ستپ لُو لُو نے مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے اپنا سفیر مصر روانہ کیا۔ جب یہ حطی سفیر تھیبز پہنچا ہے اس وقت توت عنخ آمون کی لاش ممی بنا کر دھوم دھام سے اہرام کی طرف لے جائی جا رہی تھی۔ ملکہ سپ لُو لُو کی اس سرد مہری سے اور زیادہ پریشان ہوئی اس نے دوبارہ ایس۔ او۔ ایس بھیجا۔ اب مصری سفیر نے اشوریہ کے محاذ پر پہنچ کر ملکہ کا پرابلم ستپ لُو لُو کو سمجھایا لیکن ستپ لُو لُو کو جنگی مصروفیت کی وجہ سے اپنا ایک بیٹا مصر بھیجنے میں چند روز کی دیر لگ گئی۔ اس اثنا میں چالاک پجاری کو ملکہ کی سازش کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے حطی شہزادے کو راستے ہی میں قتل کروا دیا اور خود بیچاری عنخ اسن آمن سے شادی کر کے فرعون بن بیٹھا۔

کچھ عرصے بعد بوڑھے سپی لولیومس عرف ستپ لُو لُو کا طاعون میں دیہانت ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا مرسی لس دوئم حطی بادشاہ بنا جو بڑا اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشین کی پھر مصر سے ٹھن گئی۔ اس وقت مصر میں ایک بیحد شاندار فرعون رعمسیس دوئم حکومت کر رہا تھا۔ ۱۲۹۰ ق م میں اس نے اشوریہ پہنچ کر حطی بادشاہ سے گھمسان کی جنگ کی مگر پسپا ہونا پڑا۔ اس کا غم غلط کرنے کے لیے مصر واپس آ کر اس نے اپنے عظیم الشان مندروں کی دیواروں پر جنگی مناظر کے ایسے فریسکو بنوائے جن میں سرکاری مصوروں نے حطی دشمنوں کو انتہائی بدقطع اور حقیر حرکات سا پیش کیا۔ اس جنگ کے بعد آخری عظیم حطی بادشاہ حطوسیلیس سوئم کا دور شروع ہوا۔ اس نے ۱۲۶۹ ق م فرعون رعمسیس دوئم سے امن کا معاہدہ کیا اور اپنی بیٹی بھی فرعون کو بیاہ دی۔ معاہدے کے تحت کنعان مصر کے حلقہ اثر میں شامل رہا۔ حطوسیلیس سوئم دنیا کی اولیں خود نوشت سوانح عمری کا مصنف بھی ہے (اور اس نے آٹو بائیوگرافی میں اپنی تعریفیں کرنے کی روایت کی بنا بھی ڈالی۔)

۱۲۵۰ ق م میں حطوسیلیس سوئم کی وفات کے بعد حطی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ بلقان اور غالباً یونان سے ایک اور جنگجو انڈو یوروپین قبیلے نے (ان ہی کی مانند خود حطی بھی بلقان سے آئے تھے) جہازوں میں سوار ہو کر ایشیائے کوچک کا رخ کیا۔ اس سمندری قوم نے حطی پایۂ تخت حطوشاش کو تاراج کیا۔ حطی قوم جان بچا کر ادھر اُدھر شام وغیرہ میں جا بسی۔ اور ان کی سلطنت صفحۂ ہستی سے

غائب ہوگئی۔ ان "سمندری حملہ آوروں" میں فلسطینی نام کا ایک قبیلہ بھی شامل تھا جس نے کنعان پہنچ کر تباہی مچائی اور مصر پہ دھاوا بولا۔ مگر رعمسیس سوئم نے ان کو مار بھگایا۔

حضو سیتس سوئم کی مانند اس کا ہم عصر اور داماد رعمسیس دوئم بھی اپنے ملک کا آخری رفیع الشان فرمانروا ثابت ہوا۔ اس کے بعد بین الاقوامی سیاست پر مصر کا اثر رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوگیا۔ گو کاہے بگاہے خاصے ! جبروت فرعون پیدا ہوتے رہے جن میں سے ایک کی وجہ سے "ہر فرعونے را موسےٰ" کی ضرب المثل نے جنم لیا ——

مصر عہدِ عتیق کی سب سے زیادہ پُر اسرار، بیحد ذہین، آرٹسٹک اور عجیب MYSTICAL سی قوم ہے۔ وہ زندگی کی رونقوں پر عاشق تھے ساتھ ہی انھیں موت کے تصور نے مسحور کر رکھا تھا۔ فراعنہ کی ضیافتوں کے مواقع پہ ممفس اور تھیبز کے جگمگاتے ایوانوں میں طعام اور دور شراب کے بعد ایک غلام ایک ممی کو کندھے پر اٹھا کر ڈنر ٹیبل کے چاروں طرف خاموشی سے چکر لگاتا تھا تاکہ معزز مہمانوں اور سوسائٹی لیڈیز کو یاد رہے کہ وقت کم ہے ——

اس ہزاروں برس پرانی دنیا کے عیلامی، حتّی، اشوری وغیرہ ہمارے لئے اجنبی سے ہیں مگر وادیِ نیل میں بسنے والی اس انوکھی، رمزیت پرست قوم سے ہمارا رابطہ دو پیغمبروں کے ذریعے قائم ہے ——   (مسلسل)

چنگھوہ پاچینان

اشفاق احمد

یہ بصیرت افروز واقعہ میرے ساتھ نہیں گزرا میرے ایک دوست کے ساتھ گزرا ہے جو آج سے کئی سال پہلے جموں کے ہائی سکول کا طالب علم تھا اور اس کے اردو کورس میں غالب کی تین غزلیں شامل تھیں، جو استاد انہیں اردو فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ ان کا نام ہرنام سنگھ تھا اور وہ گورداسپور کے رہنے والے تھے۔

ایک دن میرا یہ دوست جب کلاس میں اپنی غیر معمولی ذہانت کے باوجود غالب کے اس شعر پر رک گیا۔

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

تو ماسٹر ہرنام سنگھ کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے اس شعر کا مطلب کلاس کے ذہین نمبر ۲ سے پوچھا تو وہ بھی بت کی طرح کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر انہوں نے باری باری ہر ایک سے اس شعر کا مطلب پوچھا اور ہر طالب علم بقدر ظرف اپنی گردن پیچھے کو کھینچ کر چھت پر نگاہیں جما کر بیٹھ گیا۔ جب ماسٹر ہرنام سنگھ صاحب نے اپنے طالب علموں کے ذہنی دیوالیہ پن کی یہ حالت دیکھی تو کہا غالب صاحب فرماتے ہیں:۔

سادگی ہور پرکاری، بے خودی ہور ہشیاری۔ حسن نوں تغافل وچ جرأت آزما پایا۔ لو اینی گل سی اینویں ہوتے جھک کے بہ گئے سارے منگتے چلو۔

جب مجھے پیکنگ میں رہتے چار روز ہو گئے اور میں نے اپنے علم کے زور پر، مشاہدے کے زور پر اور اپنے ترجمان کی تقریری گفتگو کے زور پر چین کو سمجھ لیا تو ماسٹر ہرنام سنگھ کی شرح اور غالب کا یہ شعر میرے صبح و شام کا وظیفہ ہو گیا۔

پاکستان سے چلتے وقت میں نے چین کے بارے میں بڑے بڑے تصور باندھے تھے۔ کبھی اسے جنت ارضی سمجھا تھا اور کبھی سوشلزم کی معراج۔ کبھی غریبوں کا بہشت جانا تھا اور کبھی یوٹوپیا کا پایۂ تخت لیکن وہاں پہنچ کر میرے سارے سنہرے خواب ٹوٹ گئے اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ مجھے چین کے بارے میں بتایا گیا تھا وہ مبالغے اور دروغ بیانی پر مبنی تھا۔ چین ایسا ہی ہے جیسا کہ چین کو ہونا چاہیے، یعنی سیدھا سادا۔ مشرق زادہ۔ میرا آپ کا ہمارا ملک۔

اس بات کا احساس مجھے ۵ جولائی ۱۹۶۶ء کو ہوا جب میں نے پیکنگ ہوٹل کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور کہا پاکستان اور چین میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کہیں ان دونوں ملکوں کے درمیان زبان کا فرق مٹ جائے تو سبحان اللہ! باقی پاکستان چین ہی کی طرح کا ایک ملک ہے چین کے سر کوئی سرخاب کا پر نہیں لگا ہے۔ اک ذرا پاکستان سے بے ایمانی اور بدمعاشی دور ہو جائے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام نکل جائے، ریاکاری رشوت ستانی اور افسر شاہی ختم ہو جائے۔ اسلام آئے اور اسلام پرستی دور ہو جائے۔ کم سے کم سو روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ۵۰۰/- روپیہ

ماہوار تنخواہ مقرر ہو جائے ۔ بیماری، گندگی اور غیر ملکی خوراک ختم ہو جائے تو پاکستان بھی چین جیسا ہی ہے ۔ اینی گل اے فرق کوئی نہیں ۔

باقی وہ لوگ جو چین جانے کے لیے یا چین دیکھنے کے لیے تڑپتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ چین ویسا نہیں ہے، جیسا وہ سمجھتے ہیں ۔ شنگھائی کے ہوائی اڈے پر جب 'PIA' کا پر تولتا ہوا طیارہ اُترے گا اور ٹیکسی کرتا ہوا ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف جائے گا تو آپ کو سب سے پہلے رن وے کے ارد گرد پھیلے ہوئے سبزہ زاروں میں کام کرنے والے وہ لوگ دکھائی دیں گے جنھوں نے بیشتر نیلی پتلونیں اور سفید بشرٹیں پہن رکھی ہوں گی ۔ نیلی پتلونیں دُھل دُھل کر پہلے سلیٹی اور پھر چوہے رنگی ہو چکی ہوں گی ۔ ہر پتلون کے زانو پر گہرے نیلے رنگ کا نئے کپڑے کا ایک پیوند ہو گا ۔ ایک پیوند کندھے پر، ایک پیوند کولہے پر اور ایک پیوند قمیص کی پُشت پر ۔ میں نے اپنے جہاز کی کھڑکی میں سے باہر نظر کی اور اپنے آپ سے کہا لو جی ملاحظہ ہو چین اور چینیوں کی حالت ۔ پھر میں نے تھیلے سے کنگھی نکال کر بال ٹھیک کیے ۔ اپنی ستّر فی صد ٹری لین اور چالیس فیصد ایجپشن کاٹن کی قمیص کے بٹن بند کیے ۔ یہ قمیص PL ۴۸۰ کے تحت پاکستان میں امپورٹ ہوتی تھی اور اس کے نیچے براؤن رنگ کی ڈیکرون پتلون شرق پور کی لمبی باسمتی کی دو بوریوں کے عوض جاپان سے آئی تھی اور دکان دار نے مجھے بتایا تھا، مجھے فوراً دو ایسی اور پتلونیں خرید لینی چاہئیں کیونکہ بونس کا بھاؤ ۵۲/= اسے اوپر جانے والا تھا ۔ میں تھیلے سے پاسپورٹ اور کاغذات نکال رہا تھا اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر میری واپسی تک بونس کا بھاؤ ۵۲/= اسے بڑھ گیا تو یہ میری زندگی کی کتنی بڑی حماقت ہو گی ۔ میرے دوسرے دوست جو ملک میں موجود ہر روز اخبار کا مطالعہ کرتے ہوں گے بونس کی ہل جل سے باخبر ہو کر تین تین پتلونیں خرید لیں گے اور جب میں چین سے واپس آؤں گا تو میرے گھٹنے پر ایک پیوند ہو گا ۔ میرے کندھے پر ایک پیوند ہو گا اور میری عقل پر ایک پیوند ہو گا کہ اے احمق تو نے مستقبل کی فکر کیوں نہ کی ۔

ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اپنے ترجمان مسٹر چانگ سے کہا تم اپنے مستقبل کی فکر کیوں نہیں کرتے ہو ۔ تمہارے دو بچے ہیں ایک بیوی ہے ۔ اس نے مُسکرا کر کہا پارٹی کی صحیح گائیڈنس اور چیئرمین ماؤ کی تعلیمات کی روشنی میں مستقبل کی فکر نہیں رہتی ۔ میں نے کہا یہ سوا دو سو روپے جو تم تنخواہ کے طور پر پلتے ہو ان میں تمہاری گزر اوقات ہو جاتی ہے ۔ اس نے کہا گزر اوقات! میں نے اس میں سے ۴۲۵/= بچا کے بھی رکھے ہیں، اور یہ رقم میں نے ساڑھے چار سال کی مدت میں بہ آسانی جمع کر لی ہے ۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ سوشلسٹ سٹیٹ میں کوئی شخص رُوپیہ نہیں جمع کر سکتا، لیکن میرے چانگ کے پاس ۴۲۵/= نقد موجود تھے ۔

"یہ روپے کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا ۔

تو چانگ نے ہنس کر کہا بنک میں اور کہاں ۔ میں نے کہا مجھے اپنی پاس بُک دکھاؤ ۔ وہ میری اس فرمائش پر بہت حیران ہوا لیکن چونکہ یہ فرمائش ایک گہرے دوست ملک کے معزز باشندے کی طرف سے تھی اس لیے وہ مجھے ہنیٹڑے جانے سے پہلے اپنے فلیٹ لے گیا ۔ میں اس کے ساتھ اوپر اس کے فلیٹ میں نہیں گیا بلکہ سڑک کے کنارے سرکاری موٹر میں اس کا انتظار کرتا رہا ۔ پاس بُک چھوٹے سائز کی تھی ۔ اس کے کاغذ بڑھیا نہیں تھے، نہ ہی اس پر جلد تھی ۔ انٹریاں کسی حد تک میری پاس بک کی طرح تھیں ۔ کوائف چینی زبان میں لکھے تھے ۔ ہندسے انگریزی حروف میں درج تھے ۔ واقعی چانگ کے پاس ۴۲۵/= رُوپے بنک میں جمع تھے ۔ ایک نظر دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اس نے ۲۰/= روپے ایک دفعہ نکلوائے ہیں ۱۸/= ایک مرتبہ اور ۲۵/= ایک مرتبہ ۔ جب میں نے اس سے یہ رُوپے نکلوانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "کبھی کبھی ایسی ضرورتیں بھی انسان کو آپڑتی ہیں ۔ دس رُوپے میں نے اپنی بہن کی بچّی کی منگنی پر تحفتہً دیئے ۔ اٹھارہ روپے کے نئے ٹائر اور ٹیوب خریدے ۔ کچھ پیسے ایک مرتبہ یاروں، دوستوں کے

ساتھ پک نک پر لگائے اور باقی کے ۔ ۔ ۔

میلن ابھی وہ فقرہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ میں نے کہا تم پک نک وغیرہ بھی مناتے ہو؟ اسے میرا سوال سمجھ نہ آیا تو میں نے اس کی خود ہی وضاحت کر دی کہ تمہارے یہاں تو REGIMENTATION ہے ہر حرکت اور ہر فعل پر کڑا پہرہ ہے تم پک نک کیسے منا سکتے ہو۔ چانگ پھر مسکرایا اور ٹھوڑیاں طوطے کی طرح سر ہلا کر بولا۔ SEEING IS BELIEVING تم خود دیکھ لوگے۔

خود دیکھنے جو ہم دیوار چین گئے تو ہمارے ساتھ پانچ عرب ملکوں کے تیرہ مندوبین، دو نیپالی، پانچ تھائی لینڈ والے اور ایک میرا ہیڈ آف دی ڈیلیگیشن شوکت صدیقی بھی ساتھ تھا۔

وہاں پیوند لگے مزدور سیمنٹ، بجری چھان کر مسالہ تیار کر رہے تھے۔ دیوار چین کی شکست و ریخت کی نگہداشت ان لوگوں کے ذمہ تھی۔ ایک میٹ تھا جو کرسی ڈالے مزدوروں کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے کوئی پیوند نہ لگا تھا۔ ان مزدوروں کے پڑدادا اور سکڑدادا اسی مقام پر شاہان چین کے حکم سے دیوار چین اٹھاتے تھے اور اسی طرح ان کے سر پر میٹ ہیڈ میٹ اور شاہی گماشتوں کی ٹولیاں ہوا کرتی تھیں۔

میرے یار عراقی مندوب نے کہا "ملاحظہ فرماؤ مزدوروں کی حالت۔" میں نے ایک مزدور سے کہا یار سگریٹ سلگانے کو سگریٹ دیا۔ اس نے محبت، حیرت، مسرت اور فخر سے میری طرف دیکھا اور تو تا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور بڑے مربیانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "خوش ہو؟" ترجمان نے ترجمہ کیا۔ مزدور نے کہا "ہمیشہ خوش۔ اب خوش جب خوش افریقی اور ایشیائی مہمانوں کو دیکھ کر اور بھی خوش۔"

میں نے کہا "خوشی کی وجہ؟" کہنے لگا۔ "پارٹی کی صحیح گائیڈنس اور چیئرمین ماؤ کی تعلیمات اور ان پر سب کا عمل۔"

عراقی یار نے کہا "دیکھا پیارے کیا طوطے کے سے رٹے جملے بولتا ہے۔ جہاں جاؤ، ہر کوئی یہی جملہ کہے گا۔ مجھے چین پسند نہیں آیا۔ میں تو ہانگ کانگ جاؤں گا، گڈ گرلز BIG BUST" شوکت صدیقی نے کہا "یار واقعی بات تو ٹھیک ہے، جھاڑو دینے والے سے لے کر مفکر اعظم COMO-JO تک سے پوچھو یہی جواب دے گا۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ اور سکھایا ہی نہیں گیا۔"

نیپالیوں کے ترجمان نے پوچھا تمہارا دوست تمہیں اردو میں کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے اسے عراقی یار اور اپنے ہیڈ کی بات بتا دی۔ وہ پہلے تو حیران ہوا پھر ذرا سوچ میں ڈوب گیا۔ یہی بات اس نے ترجمہ کر کے مزدور کو بھی بتا دی۔ مزدور نے سگریٹ کا گل جھاڑا اور ہنس کر کہا تو گویا مجھے اپنے خوش رہنے کی یہ وجہ بیان کرنی چاہیے حتی کہ سورج دیوتا کی مہربانی اور چیانگ کائی شیک کے مظالم اور کنفیوشس کے فلسفہ کی بدولت میں خوش ہوں! میں نے کہا بالکل بالکل اسے ہم لوگ آزادیٔ اظہار کہتے ہیں، اور اظہار پر ہم کسی قسم کی پابندی پسند نہیں کرتے۔ تم اور تمہاری قوم خواہ پارٹی کی صحیح گائیڈنس اور چیئرمین ماؤ کی مسلسل جد و جہد اس کے عمل اور اس کی تعلیمات کی بدولت اس مقام پر پہنچے ہو، لیکن ہمیں ہم لوگوں کی خوشنودی کے لیے گاہے گاہے اس بیان کو تبدیل کر کے بھی دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ہر بار جب تمہیں السلام علیکم کہیں تو تم اس کا جواب وعلیکم السلام ہی کہو اسے موقع محل دیکھ کر بدل بھی دیا کرو نہیں تو تم پر REGIMENTATION کی دفعہ لگ جائے گی۔

شوکت نے کہا اس میٹ کو دیکھو کیا نائلون کی بشرٹ پہنے بیٹھا ہے۔ میں نے ترجمان سے کہا "کیوں بے نائیلون کی بشرٹ کیوں پہنے بیٹھا ہے۔" وہ مزدور کدالیں چھوڑ کر یک زبان ہو بولے "پہننے کا بڑا ٹھرکی ہے۔ ہفتہ ہفتہ ایک وقت کی روٹی کھاتا ہے اور انیس روپے

کی نائیلون بشرٹ خریدتا ہے۔ اور یوں بھی طبقاتی نزاع میں ہم سے بہت آگے ہے۔ ہم کو اسّی روپے مہینہ ملتے ہیں۔ یہ سو روپیہ مہینہ لیتا ہے یہ ڈاٹ باندھ لیتا ہے۔ ہم سیدھا سادا پلستر کر سکتے ہیں۔ یہ SKILLED ہے ہم UN SKILLED ہیں۔

عراقی یار نے کہا کس مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں سارے چینی۔ میں تو کانفرنس کے بعد ہانگ کانگ جاؤں گا (BIG BUSTS)

اشفاق (VERY BIG BUSTS)

پیکنگ میں لڑکے لڑکی میں شناخت کرنا مشکل ہے یا تو آپ اسے آواز سے پہچان سکتے ہیں یا پھر لڑکی کے کانوں کے پاس دو پتلی پتلی چوٹیاں دیکھ کر۔ لیکن چین کے دوسرے شہروں اور گاؤں میں یہ بات نہیں۔

گاؤں سے آنے والی سبزیوں اور پھلوں کے چھکڑے اور ریڑھے شام کے چار بجے سے پیکنگ میں داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان ریڑھوں کے آگے گھوڑے۔ گدھے اور آدمی ہر طرح کی مخلوق جُتا کرتی ہے۔ آدمی دو طرح سے گاڑی کھینچتے ہیں یا تو سائیکل رکشا کے انداز میں یا پیدل زمین پر چل کر۔ ان ریڑھوں، ریکوں اور چھکڑوں کے قریب سے بسیں اور کاریں گزرا کرتی ہیں کبھی کبھی ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کوئی بابو آ تو سائیکل پر بھی گزر جاتا ہے۔ یہ بسیں سرکاری ہیں، یہ کاریں سرکاری ہیں، ان میں بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جنہیں سرکار نے تیزی سے امورِ مملکت طے کرنے پر متعین کیا ہے اور سرکار معلوم ہے کون ہے؟ وہ پیوند لگا جھری سی آنکھوں والا ادھیڑ عمر کا آدمی جو نواڑ کا کرخت پٹہ کندھے پر ڈال کر سبزیوں کا ٹھیلا کھینچ کے منڈی کی طرف سے جا رہا ہے۔ سرکار نہ چو این۔لائی ہے نہ ماؤزے تنگ ہے نہ لیو شاؤچی نہ چوتے۔ جب یہ آدمی اپنے کمیون میں کہے گا کہ کاریں چلنی بند کر دو۔ مجھے یہ تکلیف دیتی ہیں تو کاریں بند ہو جائیں گی، جب یہ کہے گا کاریں سُست رفتار ہیں۔ ان کی جگہ ہیلی کوپٹر ہونے چاہئیں، تاکہ امورِ مملکت اور تیزی سے طے ہوں تو اونچی عمارتوں کے کلسوں کے اوپر اوپر ہیلی کوپٹر پرواز کرنے لگیں گے۔ پیکنگ سے کوئی چار میل دور جب بانسوں کی ایک غریب بستی اور کسانوں کے ایک محلے سے قصبے میں فوٹو اتارنے لگا تو میرے ترجمان نے مجھے روک دیا۔ میں نے کہا دیکھا بچو آ گئی ناں وہی بات جو لائف میگزین میں پڑھی تھی۔ یہ مجھے ادھ ننگے بچوں اور دُبلے پتلے مردوں، عورتوں کی تصویر کیسے اتارنے دے گا بھلا! میں نے ڈر کے مارے اپنا کیمرہ فوراً کیس میں بند کر لیا۔ اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔ اس علاقے کی تصویر کیوں اتارنا چاہتے تھے؟ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا، تاکہ میں یہاں کے غریب علاقے کی تصویر کا ریکارڈ بھی رکھ سکوں؟"

اس نے کہا "ہمارے (SLUMS) کی تصویر بنانا چاہتے ہو!

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہاں"

چانگ نے میرا کندھا جھنجوڑ کر کہا "مجھے پہلے ہی معلوم تھا لیکن یہ (SLUM) ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں سے ۲½ میل کے فاصلے پر اس سے بھی زیادہ غریب بستی ہے۔ وہاں کے لوگ زیادہ غریب ہیں، وہ بہت ہی گرا پڑا علاقہ ہے، وہاں چلتے ہیں، وہ ٹھیک رہے گا۔

یہ بات سن کر میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں ہم اس بستی میں تھے۔ یہاں نہ بجلی تھی۔ نہ پانی کا خاطر خواہ انتظام۔ بانس کے جھونپڑے تھے۔ پرانے دھولتے ہوئے اندر باہر خوب صفائی تھی۔ ایک عورت تسلے میں پانی ڈال کر اپنے بچے کو نہلا رہی تھی۔ کسان اپنے اپنے گھروں کے آگے لکڑی کی ڈگڈگیوں پر بیٹھے تھے۔ مرغیاں دانہ دُنکا کر رہی تھیں۔ بطخیں ایک چھوٹے سے جوہڑ میں غوطے لگا رہی تھیں۔ لڑکے نیکریں اور جبڑیاں پہنے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ایک گول پر انہوں نے دو چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ چھوڑے تھے۔ دوسری طرف

ایک بانس کی ٹوری اور ایک لڑکے کی سرخ ٹوپی۔ بڑا الٹا گلا تھا فٹ بال دس بارہ بچوں کی ٹانگوں کے درمیان دبکا ہوا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی اپنے گھر کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے چیئرمین ماؤ کے مضامین پڑھ رہی تھی۔ بہت غریب بستی تھی لیکن بیحد صاف۔ ایک عورت اپنے بچے کو تسلے میں نہلا رہی تھی۔ اس نے صابن کی ٹکیہ اخبار کے کاغذ پر رکھی ہوئی تھی۔ تسلا بہت پرانا تھا۔ پانی بہت کم تھا۔ عورت بہت جوان تھی، شاید یہ اس کا پہلا بچہ تھا۔ ایک غیر ملکی کو اپنی طرف کیمرہ تانے دیکھ کر بستی کے لوگ کچھ ناخوش اور کچھ شرمسار سے تھے۔ میں نے کلک کلک چار پانچ سنیپس (SNAPS) تیار کر لیے۔ چیئرمین ماؤ کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے والی لڑکی اندر بھاگ گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی۔ وہ شرماتی لجاتی ترجمان تک آئی اور کہنے لگی یہ ڈیلی گیٹ کہاں کا رہنے والا ہے۔ ترجمان نے کہا "پاکستان"۔ لڑکی نے اپنا منا سا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے ہاتھ ملایا۔ اور دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر جلدی سے نوٹ بک لے لی تاکہ بیچاری بچی پاکستان کے ایک عظیم ادیب کے آٹوگراف سے محروم نہ رہ جائے۔ وہ نوٹ بک عجیب و غریب تھی۔ اس پر حروف بھی تھے اور ہندسے بھی۔ حساب کے سوال بھی اور چیئرمین ماؤ کے ارشادات بھی! لڑکی نے ترجمان کے ذریعے کہا "اس پر چین کی اور چینی لوگوں کی وہ خامیاں لکھ دیجیے جو آپ نے اپنے دورے میں مشاہدہ کی ہوں"۔

میں ایک لمحہ بھر کے لیے چکرا سا گیا۔ یونیورسٹی جاؤ، پروفیسروں سے ملو، آخر میں۔ PLEASE LET US KNOW OUR SHORT COMINGS WHICH YOU MIGHT HAVE NOTED DURING YOUR STAY IN CHINA

پیکنگ ریڈیو جاؤ۔ PLEASE LET US KNOW OUR SHORT COMINGS

تھیٹر جاؤ، اوپرا جاؤ، ڈیپارٹمنٹ سٹور جاؤ۔ آخر میں مرغے کی وہی ٹانگ ٹانگ۔ ان کی SHORT COMINGS بتاتے ہوئے پارٹی سے لے کر نظامِ اشتراکیت تک اور ملک چین کی بے عزتی سے لے کر کمیونوں کا ٹھٹھا اڑانے تک چاہے جتنی مرضی ہیرا پھیری، ڈھیر بڑے جائیے چینی سامعین بڑے سلوک، سبھاؤ اور نرم روی کے ساتھ آپ کی ساری باتیں سنتے جائیں گے۔ ہاں جب ماؤزے تنگ پر تنقید کرو کہ وہ ڈکٹیٹر ہے، آمر ہے تو ان کے دلوں میں اک ہوک سی اٹھتی ہے، آنکھوں میں دکھ سا تیرنے لگتا ہے، پر وہ یہ سب کچھ بھی سہہ لیتے ہیں۔

لڑکی کی نوٹ بک میرے ہاتھ میں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس پر کیا لکھوں۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے لکھ دیا "چین کے سب بچے زیادہ تر فٹ بال کھیلتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ کھیل ان پر لاگو کیا گیا ہے۔ ہم چین کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں اس کھیل کے تکرار کو REGIMENTATION سمجھتے ہیں۔ اس کھیل کے علاوہ یہاں بیس بال اور کرکٹ بھی ہونی چاہیے۔ نہیں تو میں پاکستان جا کر بتا دوں گا کہ چین میں بچوں کے کھیل کود پر پابندی ہے، اور انہیں فٹ بال کے علاوہ ہر کھیل سے منع کیا جاتا ہے۔"

جب ترجمان نے اس کا ترجمہ کر دیا تو لڑکی بہت خوش ہوئی۔ سر جھکا کر دو مرتبہ کہا شے شے، شے شے! (شکریہ، شکریہ) اور پھر جا کر اپنی کتاب پڑھنے لگی۔

کتاب پڑھنے کا نرالا انداز چین میں دیکھا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں آزادی پانے کے بعد چیئرمین ماؤ نے کہا کہ "ہمارے ملک کی سب سے بڑی طاقت کسان ہیں۔ کسان ساری آبادی کا اسی فی صد ہیں لیکن سارے کے سارے ان پڑھ ہیں، اگر کہیں یہ پڑھے لکھے ہوتے تو تعمیرِ نو کا کام بہت آسان ہو جاتا"۔

چیئرمین ماؤ تو یہ آرزو بیان کر کے خاموش ہو رہے، لیکن اَن پڑھ کسانوں نے تہیہ کر لیا کہ فارغ وقت میں تعلیم حاصل کر کے رہیں گے، آپ کے ذہن میں تعلیم بالغاں کا تصور ہو گا۔ میرے ذہن میں بھی تھا۔ قاف شین سے شاشے ای کیمون کو جاتے ہوئے ہم نے راستے میں ہل چلاتے کسانوں کو دیکھا جو پرانی وضع کے ہلوں میں سیاہ بھینسے جوتے، بانس کی چھتری لی ٹوپیوں کے پیچھے دو چوٹیاں چھوڑے ٹھوڑی پر گیارہ گیارہ بال داڑھی کے لٹکائے مکئی کے کھیتوں میں ناڑی سے بوائی کر رہے تھے۔ ہر کسان کی پشت پر پلائی وڈ کا پھٹا لٹک رہا تھا، ویسا ہی جیسے ٹورنگ ٹاکیز کے ٹلی کھڑکانے والے اٹھا کر پھرا کرتے ہیں۔ ان پر چینی زبان میں موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا تھا۔ میں نے چانگ سے پوچھا یہ کیا ہے؟ چانگ نے کہا ان پر لکھا ہے:

اب جا۔ کل آ۔ ہل پر چل صنعت کر۔ آج کا کام آج کر لے۔ روٹی کھائے، پانی پی لے۔

اگلے ہالی کا پھٹا پچھلا ہالی پڑھتا جاتا ہے، اور اپنا آموختہ یاد کیے جاتا ہے۔ پچھلے ہال کا اس سے پچھلا کسان اور یوں کتاب عمل کے اوراق کھیتوں میں ہل چلانے کے ساتھ ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔ چیئرمین ماؤ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ عمر رسیدہ کسانوں نے اپنے آپ کو ابتدائی پڑھائی سے روشناس کرانے کے لیے کیا طریق ایجاد کیا ہے۔

میں نے چانگ سے کہا ٹھہرو، مجھے ان کسانوں کا فوٹو اتارنے دو۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا ان کا فوٹو! وہ کس لیے؟ میں نے کہا میرے چار پیسے بن جائیں گے۔ کچھ ایکسچینج مل جائے گا۔

ایکسچینج! اس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا ہاں بھائی، یہ بہت کمال کی چیز ہاتھ آئی ہے، میں یہ تصویریں ایک چھوٹے سے مضمون کے ساتھ کسی امریکی رسالے کو بیچ دوں گا، عنوان ہو گا:

چین کے عمر رسیدہ وضعدار کسانوں پر چینی ڈکٹیٹرشپ کے مظالم!

جو کسان پارٹی کا ساتھ دینے سے انکار کرتے ہیں، ان کے گلے میں ماؤزے تنگ کی تعلیمات کے پھٹے ڈال دیے جاتے ہیں، وہ چینی آقا کے ان پھٹوں کو اپنے جسموں سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ انہیں انہی تختوں کے ساتھ سونا پڑتا ہے اور انہی کا بوجھ اٹھا کر ہل چلانا پڑتا ہے۔

چانگ ہنسا اور بولا کتنی رقم مل جائے گی؟

میں نے کہا تصویر کے ساتھ تین چار سو ڈالر مل جائیں گے۔

چانگ نے کہا تو پھر جلدی کرو، ایسا موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔

میں نے کہا یار چانگ، بدنام ضرور ہوں پر ایسا بد نہیں ہوں!

شاشے ای کیمون کی کہانی بہت لمبی کہانی ہے اُسے پھر کسی مناسب وقت پر اختصار لکھتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ شاشے پہاڑ سطح سمندر سے کوئی ساڑھے تین ہزار فٹ اونچا ہے، سارا پہاڑ چکنے پتھر کا ہے اور صدیوں کی آندھیوں اور تند ہواؤں نے ان پتھروں پر کوئی چھ چھ انچ مٹی ادھر ادھر سے اٹھا کر ڈال دی ہے۔ شاشے ای بریگیڈ نے سوچا کہ ملک چین میں اگر یہ پہاڑ چٹیل رہ گیا تو ستر کروڑ لوگوں کو چٹکی چٹکی بھر آٹا کم ملے گا۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں یہاں بھی مکئی کی فصل بو دیں۔ کیمون نے فیصلہ کر لیا اور جیالے کسان بیج لے کر وہاں پہنچ گئے۔ بیج بو دیا گیا، لیکن

پانی کے بغیر بیج اُگتا کہاں سے۔ بڑے بوڑھوں نے کہا پانی تھوڑا بہت تو ہونا چاہیے، پھر شاید کہیں سے کوئی بدلی آ کر برس جائے۔ تین چار روز کے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ نیچے دس میل پر جو ندی بہتی ہے۔ اس سے پانی کے کنستر بھر بھر کر لاتے ہیں اور اپنے کھیت سیراب کرتے ہیں، لڑکوں نے ڈنکے پر چوٹ لگا دی۔ لڑکیاں کمر کس کر سرخ جھنڈا لے کر جھونپڑیوں سے باہر نکل آئیں۔ بچہ سو مرد و عورتیں پانی کے خالی برتن کندھوں پر رکھ کر چلے اور دس میل نیچے ندی پر پہنچ گئے۔ وہاں سب نے اپنے اپنے برتن میں پانی بھرا اور پھر اوپر چڑھنے لگے۔ صبح سویرے چار بجے یہ قافلہ پانی لینے چل جاتا پانی چھڑک دیا جاتا، اور رات کو کمیون کے کھپریل تلے۔

مکئی اُگ گئے اور فصل پکنے پر نظمیں کہی جاتی ہیں، گیت گائے جاتے، مکئی کی فصل نے سر نکالا، ہر پودے کوئی انگل انگل بھر کے ہو گئے۔ جب قدرت نے کمال کیا، شام کے وقت بادل گھر گھر آئے۔ سب لوگ کمیون کے طویلے میں جمع ہوئے، بارش برسی وہ برسی ۔۔ وہ برسی کہ صدیوں کی پڑی ہوئی مٹی مکئی کی فصل سمیت پتھروں سے چاٹ کر نالوں کے ذریعے تالی میں اتر گئی۔ کمیون کے دروازے پر کھڑی ہوئی عورتیں زور زور سے رونے لگیں۔ بوڑھے فلک نابکار کو بددعائیں دینے لگے، جوانوں کی کمریں ٹوٹ گئیں۔ بڑی بھیانک بارش تھی۔ بڑا خوفناک سماں تھا، کسی بیوقوف لڑکے نے ڈنکے پر چوٹ لگا دی۔ کمیون کے لوگ جلتی بجھتی لالٹین اور کاغذی جھنڈوں سے کر پوچھنے لگے کیا ہوا کیا ہوا؟

لڑکے نے کہا "فصل کی کیا فکر کرتے ہو ہماری مٹی گئی۔"

بوڑھوں نے کہا "مٹی گئی۔"

جوانوں نے کہا "مٹی گئی۔"

پھر ڈنکے پر چوٹ پڑی، سب نے اپنے اپنے برتن سنبھالے اور بہتے ہوئے نالوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے، عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر لمبے سرخ رومال لیے روتی رہیں، بین کرتی رہیں۔ صبح سویرے بارہ میل کی دوری پر انہوں نے اپنی مٹی کو جا پکڑا۔ یہ مٹی ایک بڑے برساتی نالے کے بیڈ میں بیٹھ گئی اور اس پر بیل کے نالو ایسی لہریں اُبھر آئی تھیں۔ سب نے یک زبان ہو کر مٹی سے کہا چل ہم تجھے لینے آئے ہیں۔ سب نے پانی سے جلنے والا برتن سیلی سیلی مٹی سے بھرا اور اسے کندھے پر رکھ کر پہاڑ کے پنجے پر پہلا قدم دھرا اور اوپر چڑھنے لگے۔ راستے میں انہیں اپنے کمیون کی عورتیں ملیں جو آنسوؤں سے بھیگے سرخ رومال اپنی کمروں سے باندھے خالی برتن لٹکائے اپنے کمیون کے کھیتوں کی مٹی تراؤں سے واپس لینے آئی تھیں، اس ایک بارش کے بعد وہ تین سال مٹی ڈھوتے رہے۔ صبح چار بجے سے شام کے ساڑھے سات بجے تک ایک فرد ایک دن میں ایک کنستر مٹی لا سکتا تھا۔

اس مٹی والے کھیت کے سرخ ٹماٹر، سبز کھیرے اور خوشبودار پہاڑی سبز مرچیں کھلتے ہوئے میں نے اور شوکت صدیقی نے بڑے مربیانہ انداز میں کسانوں سے کہا۔ شاباش بھئی۔ بڑی اچھی کھیتی اگائی ہے تم نے آئندہ بھی ایسے ہی محنت کرتے رہو گے تو اچھا پھل پاؤ گے ۔۔ شاباش شاباش ۔۔ ویری گڈ ۔۔ ویری گڈ ۔۔

میں نے اور عراقی یار اور سیلون کے مندوبین نے تالی بجا کر کہا ویری گڈ ویری گڈ۔ دریائے ینگ سی پر ہوپے پروانس کے پانچ ہزار لڑکے اور لڑکیاں ہم افرو ایشیائی ادیبوں کے اعزاز میں تیر کر دکھا رہے تھے۔ ہم ایک سو اکسٹھ ادیب اور دانشور خوب صورت موٹر بوٹوں میں بیٹھے ان کا نظارہ کر رہے تھے۔ تیراکوں نے سرخ جھنڈے ایک ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے وہ پانی کی لہروں کو چیر رہے تھے۔ ہم بڑے شفقانہ

اور مر بیانہ انداز میں تال بجا رہے تھے۔ ایک دفعہ شیپ شینک صاحب کمشنر جالندھر ڈویژن فیروزپور آئے تھے تو میں نے اور میرے چھوٹے بھائی نے ہیرن پارک ٹینک میں انہیں تیر کر دکھایا تھا تو کمشنر صاحب نے عین اسی انداز میں تال بجائی تھی جیسے ہم ہوپے پولانس کے جوانوں کو دیکھ کر بجا رہے تھے ——— اتنے میں شور مچا۔ ماؤزے تنگ۔ ماؤزے تنگ۔۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا گورے رنگ کے ایک چھوٹے سے اگن بوٹ پر بند بند آنکھوں والا پانچ فٹ گیارہ انچ کا دوہرے بدن کا ماؤزے تنگ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر ایک شور مچا، ہنگامہ ہوا۔ سرخ جھنڈے تیراکوں کے ہاتھ سے چھوٹ گئے، ماؤ اپنے بوٹ میں ہاتھ لہراتا، تالی بجاتا دور نکل گیا۔ اس کا بوٹ دریا کے ایک کنارے پر جا ٹھہرا۔ سب چینی ساکت و جامد ہو گئے، جو دریا میں تھے وہ بھی، جو ہمارے ساتھ موٹر بوٹوں پر تھے وہ بھی۔

چانگ نے کہا چیئرمین ماؤ ینگ سی میں تیرنے لگے ہیں۔ میں نے کہا چانگ ایمانداری سے کہنا کیا یہ REGIMENTATION نہیں کہ چونکہ ماؤ کو تیراکی پسند ہے' اس لیے اس نے سارے چینیوں کو مجبور کر رکھا ہے کہ وہ تیرنا ضرور سیکھیں۔

چانگ نے ہنس کر کہا اس STATEMENT کے نہیں کتنے پیسے مل جائیں گے ؟ میں نے کہا پچیس تیس پونڈ سے زیادہ نہیں ——— ——— پچیس تیس پونڈ سے زیادہ نہیں۔۔۔ تیس پونڈ ہوگا، آپ تول کے دیکھ لیجئے۔ یہ بات میں نے شنگھائی ایرپورٹ پر "PIA" کے سٹال میں اپنا سوٹ کیس تلواتے ہوئے کہی۔

نوجوان نے کہا کوئی بات نہیں، آپ چاہے دس بیس سیر وزن اور لے جائیے۔

جب میں گنگ وے پر چڑھ کر جہاز میں داخل ہوا تو سٹوارڈ نے کہا WELCOME SIR گڈ ایوننگ۔

میں نے کہا السلام علیکم۔ بولا آپ بھی ان افریقی بھائیوں کے ساتھ ہیں ؟

میں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا "بھئی کانفرنس میں شریک ہونے آئے تھے۔"

کہنے لگا "سر چین کیسا لگا آپ کو ؟"

میں نے کہا کچھ نہیں یار سٹوارڈ۔

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

سے اپنی گل اسے اور ساری دنیا بوجھا اٹھا کر خواہ مخواہ چین کی طرف دیکھ رہی ہے' مجھے تو چین اور پاکستان میں کوئی خاص فرق دکھائی نہیں دیا ——— سٹوارڈ نے مسکرا کر کہا "یس سر۔ یو آر رائٹ۔"

ہونگ کونگ

اختر ریاض الدین

لڑکپن میں اس نام سے چینی طوائف، بردہ فروشی، جرائم اور افیم خانے منسوب تھے۔ خدا ہالی وڈ کی فلموں کو سلامت رکھے۔ جو ہر ملک اور ہر شہر کا حلیہ اس طرح بگاڑتے ہیں کہ اسے پہچانتے پہچانتے وقت لگتا ہے۔

بڑے ہوئے تو ہماری سہیلیوں نے ہونگ کونگ کی (بقول بمبئی والوں کے) "ہونگ مانی" شروع کی۔ ساڑھیاں، کیمرے، گھڑیاں، ہیرے۔ لیکن ہماری مثال تو وہی تھی کہ ہاتھی جاوے سستا اور کوڑی مہنگی۔ پیسہ ہو تو سب چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ نہ ہو تو دانت چیز بھی بادام کے مول نظر آتی ہے۔ میاں کی شروع شروع کی نوکری تھی، دو اور دو چار جوڑتے ہوئے بھی بجٹ مشکل سے پورا ہوتا تھا، اس لیے ہونگ کونگ میں کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ پھر کچھ سال ہوئے، جین سوین HAN SUYIN کا دل پذیر ناول جسے دنیا جتنا بھی سر پر اٹھائے کم ہے، پڑھا LOVE IS A MANY SPLENDOURED THING چین اور یورپ کے مخلوط خمیر سے اٹھی ہوئی اس خاتون نے ہونگ کونگ کا ایسا نقشہ کھینچا کہ دل تڑپ اٹھا۔ غالباً اس مصنفہ کا پہلا اور آخری عشق ہونگ کونگ میں واقع ہوا تھا، اس لیے انہوں نے وجد میں آ کر وہ رنگ اس جزیرے میں بھرے کہ قوس قزح بھی شرما گئی۔ آخر میں عورت ہوں، نازک اور حساس۔ تہیہ کر لیا کہ یہ جزیرہ مرنے سے پہلے ضرور دیکھوں گی۔ اس قسم کے ارادے میں نے متعدد مرتبہ کیے ہیں کیونکہ موت وقتاً فوقتاً ملتوی ہوتی رہی تھی۔ اس لیے اللہ کی بنائی تمام دنیا دیکھ لی۔ میرے میاں کہتے ہیں کہ تمہارا مرنا ابھی بہت دور نظر آتا ہے۔ اس لیے مرتے مرتے تم میری جیب خالی کر جاؤ گی۔

میرے شوہر محترم ایک کانفرنس میں ٹوکیو جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز میں دو گھنٹے باقی تھے۔ میرے دل میں جو سمائی تو پوچھا "چلوں؟" فرمایا "چلو" اس قدر مختصر اجازت اس سرعت سے کسی بیوی کو "ایک سی۔ ایس۔ پی" سے کبھی نہیں ملی ہوگی۔ بہرحال اپنی دیوانگی سے زیادہ اپنے میاں کی ہمت اور فیاضی کی داد دیتی ہوں۔

تو لیجئے صاحب! ادھر میں نے سوٹ کیس میں چار ساڑھیاں پھینکیں۔ ادھر میاں نے ٹکٹ کے لیے سٹیٹ بنک سے اجازت لی۔ ہونگ کونگ کے لیے ویزا درکار نہیں ہوتا۔ پیسہ مجھے نہیں چاہیے تھا۔ اس لیے سٹیٹ بنک کو پس و پیش کی کچھ گنجائش ہی نہ رہی۔

میرے میاں پر چودہ سال میں میری صرف ایک بات کا رعب پڑا ہے۔ اور وہ ہے میری قناعت۔ میں ممالک غیر میں خرید و فروخت کا دھندہ کبھی نہیں کرتی۔ دوسرے ممالک میں سیر و سیاحت کے مواقع اس قدر ہوتے ہیں کہ خریداری کے لیے وقت ہی نہیں بچتا ہے اور یہ اپنے اپنے شوق کی بھی بات ہے۔ شاید اس مسئلے میں مجھ میں نسوانیت بہت کم ہے۔

قصہ کوتاہ! دو گھنٹے کے اندر میں میاں کے ساتھ "بی۔ او۔ اے۔ سی" کی آرام دہ کرسی پر رواں تھی، اور نیچے زمین پر رہنے والے تاکتے ہی رہ گئے کہ یہ گئی کہاں؟

میرے والد کا فون آیا کہ رسولن بائی کی محفل موسیقی ہونے والی ہے۔ اختر کا انتظار ہو رہا ہے کہاں ہے؟

نوکر بولا "بیگم صاحبہ جاپان چلی گئیں"

جواب ملا "کیا کہتے ہو ابھی تو وہ مجھ سے طنبورہ لانے کو کہہ رہی تھی"

بہرحال جو صلواتیں مجھ پر پڑی ہوں گی وہ میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن اس وقت تو ہونگ کانگ کے لیے میری روح پر تول رہی تھی، اور مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

تیسرے پہر ہمارا جہاز دو چار بادلوں کے جھرمٹ میں اترنا شروع ہوا۔ جزیرے کے جاذب خط و خال ابھرے۔ کہیں کہیں دھوپ کے دھبے، کہیں کہیں چھاؤں کی بانہیں۔ پرسکون پانی۔ نیا ہوائی اڈہ عین دو پانیوں کے بیچ میں بنایا گیا ہے کہ گویا اب دو کشتی ہے۔ مگر زکم اس کے پر تو سترہ جینئے اڑاتے ہوں گے۔ ہوائی اڈہ کشادہ۔ کسٹم افسران "سمگلروں" کے باوجود باتمیز اور پھرتیلے۔ ٹیکسی تیز اور سستی۔ مغربی ہوٹل مہنگے۔ چینی سرائے ٹکے سیر۔ بازار رات کے بارہ بجے تک کھلے ہوئے۔ سڑکوں پر ساری رات رونق۔ ایک باندار اور ہوشیلا شہر ہے۔ ہونگ کونگ! آپ اس سے کبھی بیزار نہیں ہو سکتے۔

پچھلے برسوں میں اتفاق سے مجھے اسے تین دفعہ دیکھنے کا موقع ملا اور تینوں مرتبہ مجھے از سر نو لطف حاصل ہوا۔ حالانکہ نہ تو یہ کسی بڑے ملک کا دارالسلطنت ہے نہ اس کا کوئی تاریخی پس منظر ہے۔ یہ شہر روایات سے مبرا قدامت سے محروم ہے۔ اس کی تاریخ میں ایک بھی عجائب گھر نہیں اور ہو بھی کیسے؟ اس جزیرے کو سمندری لٹیروں کی بستی کہتے تھے۔ پھر برطانیہ نے کوڑیوں کے مول اسے چین سے خرید لیا۔ جنگ عظیم میں جاپانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا لیکن پھر چھوڑنی ہی اس سے مراجعت کرنی پڑی اور برطانوی پرچم دوبارہ بلند ہو گیا۔ تو یہ ہے ہونگ کونگ کی تاریخ۔ اس تاریخی تہی کے باوجود ہونگ کونگ آج بین الاقوامی سیاست اور سرخ چین کی روز افزوں طاقت کی وجہ سے دنیا کے نقشے پر ایک اہم نقطہ بن گیا ہے۔

تین دفعہ قیام کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی کہ ہونگ کانگ میں پانچ قسم کے باشندے پائے جاتے ہیں۔

۱۔ سیاح۔ یہ قوم سردی گرمی سرگرداں رہتی ہے۔ اور باقی آبادی پر اتنی چھائی ہوئی ہے کہ اصل باشندے بعض اوقات نظر نہیں آتے۔ گروہ در گروہ اتنی منتشر کہ ہلاکی پکڑیاں رکھے کم دو ناک کٹ ہاتھ میں بنڈل دکھے کہ دس، اس قدر کہ کوئی جہاز بدلنے میں دو گھنٹے کا بھی وقفہ ملتا ہے تو فوراً بازار کا رخ کرتی ہے۔ اس میں مشرقی عورتیں ہوں گی جو چمگادڑوں کی طرح دکانوں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ سیاحوں کی اس قوم نے ہونگ کونگ کے دام کہیں سے کہیں پہنچا دیئے ہیں۔ یہ جزیرہ کبھی سستا ہوگا لیکن اب نہیں۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ یہاں کی مشہور چیزیں سستے ریشمی کپڑے، دستانے اور مصنوعی زیورات امریکہ میں زیادہ سستے اور اونی لباس سستے انگلستان میں۔

خریداری کے معاملے میں ہونگ کونگ ایک ڈھونگ ہو گیا ہے۔ اور معصوم سیاح اس خوش فہمی میں ہزاروں روپے لٹاتے جاتے ہیں کہ شاید کسی دوسری جگہ یہ چیزیں اتنے داموں میں نہ ملیں۔ اس کی صرف ایک چیز اب بھی سستی ہے اور ہمیشہ سستی رہے گی اور وہ ہے نفیس کشیدہ کاری ہوتی اور ریشمی کپڑے پر کڑھا ہوا۔ ناسمجھ مزدوریوں کا، جن پر غریب چینی عورتیں دیدہ ریزیاں کر کے زندہ ہیں!

۲۔ دوسری قسم ماہ عسل منانے والوں کی ہے۔ چاہے شادی برازیل میں ہو یا برلن میں دولہا دلہن ہنی مون کے لیے ہونگ کانگ ضرور پہنچتے ہیں۔ یہ دلیلیں ہے تیسرا ایک دوسرے کے بازوؤں میں لپٹے ہوئے وقت کی دھار پر بہتے جاتے ہیں۔ اگر صرف ایک دوسرے کی شکل ہی صورت دیکھنی تھی

تو یہ جو ہر شب اتنی دور دیوں آتے ہیں؟ چونکہ مرد ایک رومانوی جانور ہے۔ اس لیے اپنی منکوحہ حماقت کے لیے رومان انگیز پس منظر تلاش کرتا ہے۔

"یہ تو مَہ" دور سے پہچانی جاتی ہے۔ کیونکہ دولہا کی چال میں نشہ ہوتا ہے۔ اور دلہن کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ قوم ابھی کباڑ نہیں چکاتی۔ جو کوئی جہاں کہیں جو کچھ مانگے دے دیتی ہے۔

۳۔ تیسری نوع بیرونی اخبارات کے نامہ نگاروں کی ہے۔ خاص طور پر امریکی صحافی اور سیاسی آبزرور (OBSERVERS) یہ چیز سب سے اہم اور خطرناک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی رسائی اتنی ہی محدود ہے جتنی زبان کی۔ یہ تمام نامہ نگار ہزاروں کی تنخواہوں پر بیٹھے ایک حسین جزیرے میں پل رہے ہیں۔ اور اپنی نشی دوربینوں سے چین کی دیوار دستوں کا جھوٹا سچا جائزہ لے لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں رپورٹیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت نے کبھی چین کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔ کچھ ادھر سے سنا کچھ اُدھر سے ٹٹولا اور ایک تبصرہ کھینچ دیا۔ یہی قوم جاسوسی کی خدمات بھی انجام دیتی ہے۔ اور شام کو کلبوں میں ایک دوسرے کے جام صحت بھی پیتی ہے۔ پندرہ سال سے مشرق و مغرب کے دانشور اسی گروہ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کے متعلق لطیفے گھڑ رہے ہیں۔ جملہ بازیاں کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ امریکہ کے اگر ان صحافیوں کی فوج یہاں نہ رکھی ہوتی اور ہزاروں دفتر ریسرچ کے نہ کھولے ہوتے تو شاید مشرق بعید اور خصوصاً چین پر زیادہ صائب نظر پیدا کر سکتا۔

۴۔ چوتھی قسم اصل نسل باشندے ہیں جن کی معاشرت کی ساخت بیشتر جنوبی چین سے ملتی ہیں۔ ان کے خط و خال، رنگت، لباس، تمدن، لوچ، لہجہ و زبان خالص کینٹونی CANTONESE ہے۔ شمالی چین کی نفاست اور شیرینی مفقود ہے۔ اگر اس قوم کو کھلے بندوں صرف "کینٹنیز" بولتے ہوئے سُنیں تو منہ سوجنے لگیں اور پندرہ منٹ اور سنیں تو کان بک بک کر دیں۔ اس زبان کا اتار چڑھاؤ دنیا سے نرالا اور ایسا رقت آمیز ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اگر اس لہجے کا میں تحریری نقشہ کھینچوں تو یہ ہوگا۔



اس فصیح و بلیغ ہجوی نقشے سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اس زبان کی کثرت اور ٹیپ ٹاپ کہاں تک ہیں؛ ہر جملے پر آواز چڑھتی جاتی ہے اور پھر ڈھل بیٹھا جاتا ہے۔

بہرحال یہ چینی قوم اصل میں تو چین کا سچا نمونہ ہے۔ اور سوائے محنت و مشقت کے جو ہر چینی کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ اس قوم میں ہر وہ خامی نظر آتی ہے۔ جسے سرخ چینی "بورژوا" تصور کرتے ہیں۔ ہمہ اوقات منافع کا کاروبار۔ ذاتی مفاد، ذاتی مکاریاں، ذاتیات کی بدترین مثال۔

۵۔ اس شہر کی آبادی کی پانچویں قسم طوائفیں ہیں۔ جن کو انگریزی میں بھینے بھینے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً "ڈیسی ڈونز"، "سڑک کی دوسری طرف کی عورت" "سرخ علاقے والی عورت" وغیرہ وغیرہ۔

اس موضوع پر مجھے اتنا ہی معلوم ہے جتنا مجھے تیوں بارہ بار بتایا گیا۔ پہلی دفعہ جب میں ہفتہ بھر ٹھہری تو ہوٹل میں ہمارے دوست جو ایک ناکس سے نینڈ تھے بہت ٹیپ ٹاپ رہبر بنے۔ وہ طوائفوں پر خاص ریسرچ کر چکے تھے۔ واللہ اعلم یہ ریسرچ ذاتی تھی یا کتابی!

بہرحال اندازہ یہی ہوا کہ ہر ملک کی طرح لف قانون سے بچنے کے لیے سوانگ رچا جاتی ہے۔ جاپان میں گیشا بنتی ہے۔ لندن میں ٹیکسی گرل۔ نیویارک میں "کول گرل" سویڈن میں ساونا کی حمام دان۔

پاکستان اور ہندوستان میں اکثر یہی۔ یورپ میں شبینہ کلب میں رقص اور مشروب کی ساقی۔ ہونگ کونگ میں طوائفوں نے مالش گری سنبھال لی ہے۔ ہر نو آمد مرد کو آتے ہی ان مالشنوں کی فہرست دے دی جاتی ہے۔

رچرڈ میسن نے "THE WORLD OF SUZI WONG" لکھ کر اس طوائف کو اور اس کے قدیم پیشے کو اور لازوال بنا دیا ہے یہ افسانوی "سوزی وونگ" اب ایک اصلیت بن گئی ہے۔ سنا ہے ہونگ کونگ کے "ہانگ کوک" ہوٹل پر یہی بستی ہے۔ لوگ اس عقیدت سے دیکھنے آتے ہیں۔ گویا "سوزی" ابھی باہر آجائے گی۔ اور ان سے ہاتھ ملا کر شراب پینے بیٹھ جائے گی۔

بعض شہر تو ایک معمر طوائف کی طرح رات کی چکا چوند میں سج جاتے ہیں لیکن صبح اگر ان کی مستی سر سے اترنے کے بعد شکل دیکھو تو کراہت آنے لگے۔ ہونگ کونگ ان نادر جزائر میں سے ہے، جو دن کے وقت بھی خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اور رات کو ان کا حسن اور بھی نکھر آتا ہے۔ پاکستان کی طرح اس شہر کے دو ٹکڑے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے خاصی دور ہیں۔ ایک کو ہونگ کونگ کہتے ہیں۔ دوسرے کو "کاؤلون" لیکن چونکہ دونوں کے درمیان پانی ہے۔ اس لیے ہر دس منٹ کے بعد ایک کشتی چلتی ہے، جس کا کرایہ واجبی سا ہے۔ اس "فیری اسٹیشن" پر ہر دس منٹ میں انسانوں کا سیلاب امڈتا ہے اور اس کی دو منزلوں میں سما جاتا ہے۔ پندرہ منٹ میں یہ کشادہ "فیری" ایک بستی سے دوسری بستی میں پہنچا دیتی ہے۔ دونوں بستیوں میں خاصا فرق ہے۔ ہونگ کونگ کا سماجی درجہ اونچا ہے۔ وہاں پرانے رئیس نو دولتیا کہتے ہیں۔ انگریزی سرکار کے بعد اہل کار اپنی خود پسندی اور خود ستائی میں بری طرح مست ہیں — دوسری طرف کاؤلون متقابلتاً سستا ہے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں تنگ تنگ دکانیں کھلی ہیں۔ سودا چکانے کا بہت مزہ آتا ہے۔ مجھے تو وہ پرانے دن یاد آ گئے۔ جب سائیکل پر "چن چن چائنا مین" بوسکی اور کشیدہ کے کپڑے لاد کر بیچا پھرتا تھا اور بچے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے تھے۔ ان سائیکل سوار سوداگروں سے سودا چکانے کا بڑا لطف آتا ہے۔ وہ زمانہ تھا فرصت کا۔ ماں بہنیں ابھی نوکری کے چکر میں نہیں پڑی تھیں۔ ان کے پاس وقت کی افراط تھی۔ اس لیے "چائنا مین" سے کاروبار بھی ایک پکنک ہوتی تھی۔ چاہے دو گھنٹے کی بحث کے بعد ایک رومال یا ایک میز پوش ہی خریدیں۔ لیکن ایک تفریح رہتی تھی۔ اور "چائنا مین" کو بھی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ کم بخت بیس روپے گز سے قیمت شروع کر کے تین روپے گز پر سلک دے کر جاتا تھا اور بیس روپے سے تین روپے پر آنا بھی ایک آرٹ ہوتا تھا۔ بہرحال "کاؤلون" میں اگر آپ تھوڑی بہت زبان جانتے ہیں۔ تو قیمتیں خاصی کم کروا سکتے ہیں۔ اور زبان نہ بھی جانیں تو ہاتھ کے اشاروں سے سمجھا سکتے ہیں۔ دکانداری میں چینی قوم کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ وہ سو روپے پر صرف دو پیسے نفع رکھتا ہے۔ لیکن بکری کی کثرت پر ہزاروں کما لیتا ہے۔ مسلمان بھائی نہیں کہ پہلے ہی داؤ میں صد فیصد کما لیا اور پھر سارا سال ڈنڈے بجاتے۔

کاؤلون میں ایک مشہور سڑک ہے۔ NATHAN ROAD جس کا جواب دنیا میں نہیں ہے۔ نیویارک کا "ٹائمز سکوائر" پیرس کا "شانزالیزے" "روم کی "ویا ویٹیتو" اور لندن کی "پکاڈلی" اس سڑک کے سامنے بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ اس شاہراہ کے جادو کا راز یہ ہے کہ دونوں طرف شانہ بشانہ چینی رسم الخط میں دکانوں کے نام یا اشتہار ہیں۔ جو مخصوص رنگوں سے آراستہ ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں کھلے لال اور سنہری رنگ سے اشتہاری جلووں میں یکسانیت کے ساتھ کرختگی آ گئی ہے۔ ہونگ کونگ کے برقی قمقمے ہلکے گلابی۔ کاسنی اور فیروزی ہیں۔ ان کی آمیزش میں ایک لاجواب دلنوازی ہے۔ نیون کی گوناگوں اشتہار بازی گو دنیا میں عام ہے۔ لیکن چینی رسم الخط کی برکت سے ایک ہی اشتہار کسی چینی چیستاں کا ملغوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنی روشن اور اتنی سحر انگیز سڑک میں نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ اس کو اگر صحیح زاویے سے دیکھنا ہو تو ڈبل ڈیکر بس میں اوپر بیٹھ کر دیکھیے۔ یہ سڑک کسی وقت بھی نہیں سوتی۔

ہمارے رہنما اور میزبان ایک پنجابی ڈاکٹر اور ان کی بہن تھیں۔ یہ دونوں تحصیل چکوال کے ہیں اور عرصہ سے یہاں پر بسے ہوئے ہیں۔ پنجابی، چینی تلفظ سے اور چینی چکوالی تلفظ سے "ٹھونکتے" ہیں۔

پنجابی جوان مرد بھی خوب ہے۔ اتنا سیلانی، محنتی اور قسمت آزما کہ دُنیا کے ہر کونے میں پایا جاتا ہے۔ اسے میں نے "لیک ڈسٹرکٹ" میں چوڑیاں بیچتے دیکھا۔ اسے میں نے "وین کوور" میں لکڑی کا ٹال لگائے دیکھا۔ یہ ہوائی میں ہوٹل چلا رہا ہے۔ اور تبت میں قصابی کر رہا ہے۔

تو خیر ہمیں ہونگ کونگ بہت بھایا۔ ہر وقت گہما گہمی۔ یہ شہر شاید ہی رات کو کبھی پلک جھپکاتا ہو، کیونکہ سیاحوں نے اس کو لاڈ میں اس قدر "بھینایا" ہے (ہمارے چکوالی میزبان کا جملہ)، کہ یہ شہر ہر وقت ان کے لیے داب ہے۔ ہر جگہ "کاغذاری" چل رہی ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں۔ ریلوے سٹیشن میں۔ تار گھر میں۔ ہسپتال میں غرض جدھر جاؤ اسٹال ہی سجی ہوتی ہیں۔ سامان کی اتنی افراط ہے کہ دوکانوں پر سے ابل ابل کر سڑکوں پہ گرا پڑتا ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے۔ ہاتھی دانت، کانچ، آبنوس، سیپ، لاکھ، مینا، سیم و زر، ریشم و اطلس کی صنعت کاریاں کوئی کیا دیکھے کیا خریدے!!!

عورتیں چیلوں کی طرح جھپٹ رہی تھیں۔ اون کے سویٹر، ہزار زیبائشوں یعنی نگ، موتیوں سے آراستہ، نائٹ سوٹ، اکوتو، کمخوابی سیٹن کے نائٹ گاؤن، جوتیاں، بٹوے، چھتریاں، ریڈیو گرام سے لے کر مچھلی کے انڈے تک اور فرنیچر سے لے کر بندر کے دماغ تک کیا نہیں ملتا؟ چین سے اڑائے ہوئے خزانے یہاں، جاپان کی صنعتوں کے گودام یہاں، برطانیہ اور جرمنی کی منڈیاں یہاں ——— لیکن اپنے اوسان قائم اور جیب سنبھال کر جیب میں رکھیے، ورنہ یہاں دونوں کے غائب ہونے کا خدشہ ہے۔ اس خرید و فروخت کی فردوس میں کئی معصوموں کی حجامت بنی۔ ہم خود دکان داروں کے ہاتھوں الّو بن گئے۔ ہمیں ایک ریڈیو گرام دکھایا مگر روانہ دوسرا کر دیا۔

البتہ ہونگ کونگ میں ایک لحیم شحیم دکان ہے، جسے "سُرخ چین کا ایمپوریم" کہتے ہیں۔ جہاں آپ آنکھ بند کر کے چیزیں خرید سکتے ہیں اور کوڑی کی بے ایمانی نہیں ہوگی۔ یہ دکان ہونگ کونگ تو کجا سارے ایشیا میں سب سے سستی ہے۔ چین سب پر ثابت کر رہا ہے کہ وہ نہ صرف ہر شے بنا رہا ہے بلکہ سب سے اچھی اور سب سے سستی بھی۔ اس دکان کی ہر منزل پر گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ پس مجھے تو یہ ایک عجائب گھر یا نوادر خانہ معلوم ہوا۔ کاریگری اور دیدہ ریزی کی انتہا تھی۔ میں مزے سے اندر ٹہل رہی تھی اور باہر امریکن عورتوں کی حسرت بھری نگاہوں کو دیکھ رہی تھی جو اس کی نمائشی کھڑکیوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ سیاسی تعصب اور کور بینی کی انتہا ہے کہ امریکہ والوں نے اپنے باشندوں کو اس دکان سے کچھ خریدنا ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر اس دکان کا ٹھپہ کسی شے پر نظر آ جائے تو امریکی کسٹم والے وہ چیز ہی ضبط کر لیتے ہیں۔ لیکن عورت ایک عورت پہلے ہوتی ہے اور وطن پرست بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکن عورت چپکے چپکے چیزیں خریدتی ہے اور اس پر سے سُرخ چین کے لیبل پھاڑتی جاتی ہے۔

سیاحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ انفرادی اور دوسری مجبوری۔ ذاتی سیاحت میں خود دھکے کھاتے پھریے۔ ٹیکسیاں لیجئے۔ گائیڈ بک پڑھیے۔ اس میں آزادی زیادہ اور آرام کم ہے۔ مجبوری سیاحت میں اپنے تئیں کسی ٹورسٹ دفتر کے سپرد کر دیجئے۔ وہ آپ کو تین گھنٹے میں آدھا شہر دکھلائے گا۔ اور پیسے گرا لے گا۔ اپنی اپنی ذہنیت، مزاج اور بٹوے کی وسعت پر منحصر ہے کہ آپ کونسی سیاحت اختیار کریں۔ پہلی دفعہ تو میں نے دفتری سیاحت کی۔ جزیرے کے چاروں طرف گھومی۔ واقعی اس کے ساحل خاموش اور راحت آفریں ہیں۔ مچھلی پکڑنے والے۔ تیراکی کے شیدائی، گنگنی رانی کے سودائی سب تمن میں سیر کرتے کرتے ہم "ٹائیگر بام گارڈن" پہنچے۔ یہ ایک چینی لکھ پتی نے اپنے شوق کے لیے بنوایا تھا۔ لیکن جب ٹائیگر بام سے آمدنی زیادہ ہوئی تو اس نے اس باغ کو عوام کے لیے کھول دیا اور نام بھی اسی پر رکھا۔ یہ ایک بھونڈے یا بھیانک دماغ کی ایجاد ہے۔ چاروں طرف اونچی اونچی

پہاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر تاریخی مناظر اور تاریخی لمحے تراشے گئے ہیں۔ کہیں جون آف آرک کو جلایا جا رہا ہے۔ کہیں افریقہ میں بھوت اتارا جا رہا ہے۔ کہیں فرنگی سولہ ہیٹ پہنے چینیوں کو غلاموں کے بازار سے خرید رہا ہے۔ غرضیکہ اذیت پسند بید سے پٹتے اور مناظر جنہیں آدھا دیکھ کر ہی سانس پھول جاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے۔ OPEN AIR CHAMBERS OF HORRORS کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

نوعمر بہت خوش ہوتے ہیں کہ سر چڑھائی کے بعد آئس کریم اور ناہنجار کوک بکتی ہے۔ ہم تو اس بات سے متاثر ہوئے کہ چینی ساہوکار نے کما کر واپس پبلک کو کچھ دے دیا۔ ہمارے یہاں تو سوداگر صرف کمانا جانتے ہیں۔ دینا نہیں۔

قصہ کوتاہ ایک اور جگہ لایا گیا جس کے اندر گرد سیاح طواف کرتے ہیں۔ اور وہ تھا سمندری غذا کا SEA FOOD ریستوران۔ مجھے ذاتی طور پر سمندری مخلوقات سے کوئی رغبت نہیں۔ سوائے مچھلی کے میں نے کبھی کوئی اور آبی پیداوار نہیں کھائی۔ لیکن اس ریستوران میں لوگوں کو زندہ جاندار بحری مچھلیاں کھاتے دیکھا۔ اہم کچھوے کا سوپ اور خوفناک شارک کے پروں کی یخنی، اژدر کا مربہ بھی بکتے دیکھے۔ ہر قسم کے کچھوے، مینڈک، جھینگے، کیکڑے، رنگا رنگ کی سلاد میں سجے ہوئے دیکھے۔ انسان بھی کیا جانور ہے۔ ہر چیز کھانے کو تیار ہے۔ جب کچھ اور نہ ملے تو ایک دوسرے کو کھاتا ہے اور بہت مہذب ہو تو اپنے کو کھانے لگتا ہے۔

ہانگ کانگ کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف اونچے کاخ زریں اور عظیم بارگاہیں اور دوسری طرف غریب مہاجروں کی اداس بستیاں۔ یہ مہاجر کچھ ازلی ہیں اور غالباً چین واپس چلے جائیں گے۔ ایک پورا دن میں ان کی نو آبادیوں میں پھری جو حکومت اور عیسائی تبلیغی مشن قائم کر رہے ہیں۔ گو خدمت سرعت سے ہو رہی ہے۔ لیکن جو مچھیروں کے گاؤں ABERDEEN FLOATING VILLAGES کشتیوں میں آباد ہیں۔ ان کیلئے ناک دور سے بند کرنی پڑتی ہے۔ ایک دو گزی کی ناؤ میں ایک انسان کس طرح اپنی زیست کا تقاضا پورا کرتا ہے۔ وہاں دیکھنا چاہیے۔ ہر غلیظ بادبان تلے انسان نمونہ "نو آبادیات" جو اوسطاً چار حشرات الارض پر مشتمل ہیں۔ کوڑے سے گورنمنٹ کی قید کاٹ رہا ہے۔ بعض علاقوں میں ان مہاجرین کے لیے مشترکہ گھر بنا دیے گئے ہیں یہاں مشترکہ باورچی خانے، مشترکہ غسل خانے، مشترکہ تفریح گاہیں اور مشترکہ کارخانے ہیں۔ اکثر یہ بدنصیب مہاجر سرخ چین کی اشتراکیت سے گھبرا کر یہاں آئے تھے۔ تو کیا یہ نئے آسمان تلے وہی اشتراکیت نہیں؟ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ غریب انسان کہاں بھاگے؟

ہانگ کانگ ایک اور چیز کے لیے مشہور ہے۔ اور وہ ہیں مشرق بعید کے طعام خانے۔ یہاں آپ برمی، انڈونیشین، جاپانی، کورین، ہر قسم کے کھانے کھا سکتے ہیں۔ چینی ریسٹورانٹ تو خیر ہر وقت بھرے رہتے ہیں۔ مجھے چینی دسترخوان سے خاص انس ہے اور کچھ برا بھلا پکا بھی لیتی ہوں۔ میں نے چینی غذا یورپ میں کھائی۔ امریکہ میں کھائی، جاپان میں کھائی۔ ہانگ کانگ میں کھائی اور بمبئی، کراچی و لاہور میں اکثر کھائی۔ اپنے دیس کے چینی کھانے میں مزہ تو ہے۔ لیکن خلوص نہیں۔ اصلی چینی کھانے سے اس غریب کا دور کا بھی رشتہ نہیں جڑتا۔ اگر چین جانا نصیب نہ ہو۔ تو کم از کم چینی سفیر کے گھر ضرور "اپنے آپ کو مدعو" کرائیے جو یہاں چینی جاؤ اور چٹخارہ دیکھا۔ چین سے باہر کہیں نہیں ملا۔ لکھتے لکھتے صرف یاد ہی سے منہ میں پانی پانی آ رہا ہے۔ اٹھارہ کورس کا ڈنر جس کے "ابتدائیہ" یعنی HORSDOEUVRE ہی سے پیٹ بھر جائے۔ مثلاً اسی ابتدائیہ میں سوکھی مرغی اچار کی طرح ڈلی ہوئی، چار اچی مچھلی، بہت سے بیج نرم کیا ہوا کھیرا اور بانس کی کونپلیں۔

پھر پردہ اٹھا تو اصلی ڈرامہ شروع ہوا۔ چکن چلی۔ نہایت لذیذ ہمارے بریانی کی جگہ مشرومیان[1]۔ جو کھمبوں اور چاولوں کو سبزی کے قدرتی

---

[1] یہ میری اختراع ہے۔

رنگوں کی تہوں میں دم دی ہوئی۔

پھر ایک ڈش آئی جو طعام کارڈ پر FROGS LEGS بتائی گئی تھی۔ پیٹ میں تھوڑی سی ابکائی اٹھی۔ لیکن چینی میزبان ہنس دیئے۔ ارے ڈریئے مت۔ یہ آپ کے لیے مینڈکوں کا بدل اختراع کیا گیا ہے۔ پاپاٹ کے پتے کو بالکل مینڈک کی شکل کا تراش کر اس میں پسا ہوا مرغ کا قیمہ بھرا ہوا تھا۔ اس میں صرف جدّت ہی نہیں لذت بھی تھی۔

آخر میں سوپ آیا۔ تو میرا سانس اٹک رہا تھا۔ کہیں گنجائش نہیں تھی۔ عجیب بات ہے کہ ہم لوگ اتنی چینی کھاتے ہیں۔ لیکن خود چینی چینی نہیں کھاتے۔ نیم شیریں پانی میں کنول کے بیج سامنے رکھ دیے کہ کھاؤ۔ چینی اپنی قدامت پسندی کو خورد و نوش میں بھی لے گئے ہیں۔ ۲۰ سال پرانا انڈا جو سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ کھلایا۔ سال ہا سال پرانی لیچی جس میں اندر پھپھوندی جھنجھنا رہی تھی۔ بہت شوق سے کھائی۔ اتنی پھپھوندی کھا کھا کر غالباً اس قوم کو پنسلین کی ضرورت نہیں رہی۔

ایک چیز قابلِ ذکر ہے۔ وہ ہے بدھ کا کھانا۔ اس نوع کے ریستوران ڈھونڈ کر نکالنے پڑتے ہیں لیکن جب آپ ایک دفعہ براجمان ہو گئے تو پھر بسم اللہ کیجیے اور کھاتے جائیے۔ پلیٹوں کی پلیٹیں خالی ہوتی جائیں گی۔ لیکن آپ کا پیٹ بدستور خالی ہوگا۔ ڈریئے مت اس کا بل دیتے وقت آپ کے بٹوے کو ہرگز شرمندہ ہونا نہیں پڑے گا۔ بدھ کھانا ہونگ کونگ میں سب سے سستا اور خوش ذائقہ ہے۔ یہ چینی کھانے سے بھی ہلکا پھلکا ہے اور بہت زود ہضم ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں گوشت کسی قسم کا نہیں ملتا۔ بدھ لوگ صرف نباتات کھاتے ہیں کوئی جاندار نہیں چھیڑتے۔ بچے بانس کی جڑیں۔ کنول کے پھول، کنول کے بیج اس کے علاوہ ہر طرح کی دال سے دس قسم کے طعام تیار کرتے ہیں۔ دال ہمارے یہاں غریبوں کا سہارا ہے۔ لیکن وہاں پر صرف چنے کی دال سے چھ نمکین ڈش اور چھ قسم کی مٹھائیاں تیار کرتے ہیں اور وہ اس قدر ہلکی پھلکی کہ منہ میں ڈالو تو گھل جائیں۔ بدھ مذہب جتنا خود بے لذت ہے اتنے ہی اس کے کھانے لذیذ ہیں۔ آخر میں میں یہ کہوں گی کہ میری باتوں میں نہ آئیے گا۔ اس جزیرے کو خود جا کر قائل کیجیے یا قائل ہو جائیے۔

مشرقی ایشیا میں فرنگی شہنشاہیت کا آخری سنگِ میل، تعیشی اجارہ داری کا آخری قلعہ، ہونگ کونگ! بلاشبہ دنیا کے کثیر ترین اور گنجان ترین شہروں میں سے ہے۔ اس میں گالف کورس مشرق میں سب سے نفیس، اس کا ہسپتال "کوئین الزبتھ" مشرق میں سب سے بڑا، اس کا ریس کورس دنیا میں سب سے مہنگا اور بڑا، یہاں کا قدِ آدم ٹیلی ویژن الف سے بے تک "گھڑ دوڑ" دکھاتا ہے۔ پھر ہر منزل پر خود کار زینے۔

اس کی آبادی تیس لاکھ ہے (سارے نیوزی لینڈ سے دس لاکھ زیادہ) یہ حقیقت کہ ستّر کروڑ چینی صرف چند میل دور سرخ سرحد کے پار بستے ہیں۔ اس شہر کی زندگی میں ایک نیا ولولہ پیدا کرتی ہے، ہراس نہیں۔ برطانیہ نے جس پٹے پر اسے چین سے خریدا تھا۔ اس کے بقیہ ۲۵ سال رہ گئے ہیں۔ اگر چین چاہے تو بغیر انگلی ہلائے اسے ایک ہی سانس میں ہڑپ کر سکتا ہے لیکن اسے کوئی جلدی نہیں۔ جب بغیر کسی دردِ سری کے کروڑوں پاؤنڈ کا زرِ مبادلہ چین کو اس کے ذریعے پہنچ رہا ہے۔ تو کیا مضائقہ۔

یہ مشرقِ بعید میں برطانوی سامراج کا آخری علمبردار ہے کب تک اس پرچم کو لہرائے گا۔ اس کا جواب صرف موجودہ کرۂ ارض کے دو یاجوج ماجوج روس اور امریکہ دے سکتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں کم سے کم اگلے دس سال تک ممالک کی قسمتوں کی باگ ڈور ہے۔

ڈرامے

شیش محل

حکیم احمد شجاع

منظر: ایک مغلئی طرز کا دیوان خانہ

مرزا طاہر ایک پرانی وضع کے رئیس ایک گاؤ تکیہ کے سہارے فرش پر بیٹھے اپنے ایک پرانے دوست میر صاحب کے ساتھ شطرنج کھیل رہے ہیں۔ مرزا طاہر اچھے بھاری بھرکم جسم کے آدمی ہیں، اور ان کی وضع قطع سے امیرانہ ٹھاٹھ ظاہر ہے۔ میر صاحب ایک پتلے دُبلے آدمی ہیں، اور ان کی گفتگو کا سلیقہ ویسا ہی ہے جیسے پُرانے زمانے کے امراء کے مصاحبوں کا ہوا ہے۔ دیوان خانے کی دیواروں میں محراب دار دروازے ہیں جن پر پردے لٹک رہے ہیں۔ بائیں طرف ایک تخت بچھا ہے، جس پر ایک قیمتی پاندان رکھا ہے، اور اس کے قریب ایک خاصدان جس میں ایک سروتا ہے اور کچھ کٹی ہوئی چھالیاں اور الائچیاں ہیں، تخت کے ساتھ ایک چوکی رکھی ہے، جس پر ایک ریشمی گدا ہے۔ دیوان خانے کے دائیں اور بائیں جانب دروازے ہیں، جو شیش محل میں کھلتے ہیں۔ شطرنج کی بساط نظر آ رہی ہے۔

میر صاحب : (مسکراتے ہوئے) یہ بازی بھی آپ نے ہار دی سرکار!

مرزا طاہر : (بڑے استقلال سے شطرنج کے مہروں کو بساط پر جماتے ہوئے) تو ایک اور سہی۔ بازی ہار دینے کا نام شکست نہیں ہوتا میر صاحب! جی ہار بیٹھنے کا نام شکست ہوتا ہے۔

میر صاحب : (خوشامد سے) ماشاء اللہ — کیا بات کہہ دی ہے سرکار (اپنے مہروں کو سجاتا ہے)

مرزا طاہر : (مہرے کو حرکت دیتے ہوئے) ہار جیت تو اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے۔ میر صاحب! آپ اپنی چال چلیے۔

(دونوں اپنے اپنے مہروں کو آگے پیچھے چلاتے ہیں کہ اتنے میں ایک خدمت گار بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

خدمت گار : (بڑے ادب سے) بیگم صاحب نے کہلا بھیجا ہے سرکار کہ اب کے شب برات کو شیش محل میں چراغ نہیں جلیں گے۔

مرزا طاہر : (شطرنج کھیلتے ہوئے بے پروائی سے) ہونہہ — جیسے شب برات روز روز آتی ہے (حقارت سے ہنس کر) اب کے شب برات کو شیش محل میں چراغ نہیں جلیں گے — کیوں؟

میر صاحب : سچ تو کہتی ہیں — ساہوکار نے ڈگری لے لی ہے، شیش محل قرق ہونے کو ہے۔ آپ اس طرح کب تک گھر پھونک کر تماشا دیکھا کریں گے میرے حضور!

مرزا طاہر : (ہنستے ہوئے، شطرنج کی بازی میں اسی طرح محو) ہا ہا ہا ہا — گھر پھونک کر تماشا نہ دیکھا، تو تماشا ہی کیا دیکھا میر صاحب! اب کے بھی شب برات پر شیش محل میں چراغ جلیں گے اور اتنے ہی جلیں گے جتنے ہمارے باپ دادا کے وقت

ت جیسے پیسے تے ہیں ۔ موبہہ بنیا ہی کیا کب کا اک شیش محل قرق کرا دیا۔

(ملازم کو آواز دیتے ہوئے)

بندو!

خدمت گار : (داخل ہوتے ہوئے) جی سرکار!

مرزا طاہر : ذرا منشی جی کو تو دیکھو۔ کہاں ہیں۔

بندو : ڈیوڑھی میں بیٹھے کچھ حساب کتاب کر رہے ہیں سرکار۔

مرزا طاہر : انہیں ذرا سی دیر کے لیے ہمارے پاس بھیج دو۔

بندو : جو حکم سرکار۔

(بندو چلا جاتا ہے)

مرزا طاہر : (میر صاحب سے مخاطب ہو کر بڑی خوشی سے ایک مہرے کو آگے بڑھاتے ہوئے) یہ رہی کشت میر صاحب!

میر صاحب : (کسی قدر غرور سے) آپ نے اس فیل پر نظر نہیں ڈالی حضور۔ (فیل کو اٹھا کر مرزا طاہر کے مہرے پر مارتے ہوئے) لیجئے آپ کا یہ مہرا بھی پٹ گیا۔

مرزا طاہر : ایک مہرا پٹ گیا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں مہروں کی کیا کمی ہے (ایک اور مہرے کو بڑھا کر) اب فرمائیے۔

(میر صاحب ڈاڑھی کھجاتے ہوئے اپنی چال سوچنے لگتے ہیں کہ منشی داخل ہوتا ہے)

منشی : غلام حاضر ہے سرکار۔

مرزا طاہر : (منشی جی کی طرف دیکھتے ہوئے) ہاں تو منشی شب برات کے لیے چراغوں کا انتظام کیا ہے آپ نے۔ (شیش محل کے کنگروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) باری دری کے کنگروں کے ساتھ ساتھ برقی قمقمے ہونے چاہئیں اور چراغ جلا دس ہزار سے کیا کم ہوں گے!

منشی : (گھبرا کر) دس ہزار چراغ؟

مرزا طاہر : (رندانہ انداز سے مسکرا کر) اور ہاں —— کچھ رقص و سرود کا بھی انتظام ہو ہی جائے تو اچھا ہے منشی جی۔

منشی : (حیران ہو کر اور کچھ رک رک کر) ان سب باتوں کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا سرکار؟

مرزا طاہر : (بے پروائی سے ہنستے ہوئے) جہاں سے ہمیشہ آیا کرتا ہے —— جہاں لاکھ وہاں سوا لاکھ —— منشی جی۔

(ملازم داخل ہوتا ہے)

وکیل صاحب تشریف لائے ہیں حضور۔

(حیران ہو کر) وکیل صاحب۔ اس وقت انہیں کیا کام آ پڑا۔ بلاؤ۔

(ملازم جاتا ہے)

میر صاحب : (شطرنج کی بساط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں نے اپنا مہرا بڑھا رکھا ہے سرکار۔

مرزا طاہر : بازی اسی طرح جمی رہے میر صاحب۔ ہم ذرا وکیل صاحب کی بات سن لیں۔ آپ اتنے میں مردانے میں تشریف رکھیے۔

میر صاحب : (اٹھتے ہوئے) میں ذرا سی دیر کے لیے گھر سے نہ ہو آؤں سرکار۔ بیگم کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔

مرزا طاہر : کیا مضائقہ ہے؟

(میر صاحب دائیں جانب سے نکل جاتے ہیں اور وکیل صاحب داخل ہوتے ہیں۔)

وکیل صاحب : میں نے کہا آداب عرض کرتا ہوں سرکار!

مرزا طاہر : تسلیم کہیے اس وقت کیسے آنا ہوا، وکیل صاحب؟

وکیل : (سوچتے ہوئے رک رک کر) میں نے کہا۔ ۔۔ کیا عرض کروں ۔ ۔

مرزا طاہر : (ایک فکرمندانہ انداز سے) کچھ تو فرمائیے۔

وکیل : (کچھ گھبرا کر) بس یوں سمجھ لیجیے سرکار کہ ایک ضروری کام تھا۔

مرزا طاہر : (مسکرا کر) آپ کا کوئی کام ایسا بھی ہے جو ضروری نہیں ہوتا فرمائیے۔

وکیل : (کچھ سوچتے ہوئے) میں نے کہا کہ ایک بار پھر سرکار کی خدمت میں عرض کر دوں کہ شیش محل کا جھگڑا اب چکا ہی دیا جائے تو اچھا ہے۔

مرزا طاہر : (کچھ بگڑ کر) تو آپ یہ کیوں نہیں کہتے وکیل صاحب کہ مرزا طاہر کے خاندان کا نام ہی مٹا دیا جائے تو اچھا ہے۔ کہیے آپ نے شیش محل کی قرقی کے خلاف اپیل دائر کی ہے یا نہیں؟

وکیل : میں نے کہا حضور اس وقت شیش محل کے دام اچھے مل رہے ہیں۔ قرض بھی ادا ہو جائے گا اور کچھ رقم بھی بچ رہے گی۔

مرزا طاہر : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔ یہ خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ اگر وہ بنیا ہاتھ جوڑ کر کہتا کہ سرکار شیش محل کے نام کچھ تاوان نکلتا ہے تو ہم شیش محل تو کیا اپنے آپ کو بھی بیچ کر اس کا قرض چکا دیتے۔ لیکن اس نے پیسے کو دیکھا مرزا طاہر کے خاندان کی عزت کو نہ دیکھا۔ جھٹ سے جا کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا، اب تو ہم بھی میدان میں اتر آئے ہیں یا اُسے پچھاڑیں گے یا خود پچھڑ جائیں گے۔ آپ جلدی سے اپیل دائر کرنے کا انتظام کریں وکیل صاحب!

وکیل : اپیل دائر کرنے کے لیے بھی تو پیسہ چاہیے سرکار۔

مرزا طاہر : تو ہماری زمین کس دن کام آئے گی۔؟

منشی : (بے اختیار بول اٹھتا ہے) زمین کا ایک ذرا سا ٹکڑا رہ گیا ہے، سرکار اسے نہ بیچئے۔ لے دے کے اب یہی تو زندگی کا ایک سہارا ہے۔

مرزا طاہر : (غصے سے) شیش محل نیلام ہو گیا تو پھر زندہ رہنے سے فائدہ؟

(مقلانی بیگم صاحب کی ملازمہ داخل ہوتی ہے)

مغلانی : بیگم صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے سرکار۔

مرزا طاہر : وکیل صاحب چلے جائیں تو انہیں بھیج دو۔ ہماری شطرنج کی بازی کے مہرے کہیں ادھر اُدھر نہ ہو جائیں (وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے) جائیے وکیل صاحب اپیل دائر کرنے کی تیاری کیجیے۔
(منشی کی طرف دیکھتے ہوئے) اور آپ شب برات کے جشن کا انتظام کریں منشی جی۔
(دونوں خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔ مرزا طاہر شطرنج کے مہروں کی طرف غور سے دیکھتے ہیں کہ بیگم صاحب داخل ہوتی ہیں۔ مرزا طاہر کی بڑی بیٹی سلمیٰ ان کے ساتھ ہے۔)

بیگم : (داخل ہوتے ہی) ذرا دیکھیے تو میرے ساتھ کون ہے؟

مرزا طاہر : (سر اٹھا کر بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے) کون؟ سلمیٰ!

سلمیٰ : آداب ابا جان۔

مرزا طاہر : جیتی رہو۔ (بڑھ کر اس کے سر پر پیار کرتا ہے) یہ تم اطلاع کیے بغیر کیسے آگئیں؟

سلمیٰ : میں نے کہا کہ اطلاع کیے بغیر آ پہنچوں گی تو آپ اور زیادہ خوش ہوں گے۔

مرزا طاہر : یہ تو تم نے بڑی اچھی بات کی کہ شب برات سے پہلے آ پہنچیں۔ تم نہ آتیں تو چراغوں کی روشنی کچھ مدھم مدھم سی نظر آتی۔

سلمیٰ : (حیران ہو کر) چراغ کیسے ابا جان؟

مرزا طاہر : شب برات کے چراغ اور کیا۔

بیگم : اب چھوڑیئے بھی ان اللوں تللوں کو۔ شب برات تو سبھی کے لیے آتی ہے۔

مرزا طاہر : (بات کاٹ کر) اور سبھی کے گھر چراغ جلتے ہیں
(سلمیٰ کے سیدھے سادے لباس کو حیرت سے دیکھتے ہوئے)
مگر تم نے یہ لباس کیسا پہن رکھا ہے؟

سلمیٰ : دیہات میں ایسا ہی لباس پہنا جاتا ہے ابا جان۔

مرزا طاہر : بیوقوف لڑکی — سڑ سڑ کر رہ گرول کی امیرن بھی کھو بیٹھی — (بیگم سے) جاؤ بیگم منیم سے کہو سلمیٰ کے لیے ریشم کے دس بیس جوڑے سی آئے۔ اور دیکھو ان کے سلنے میں دیر نہ ہونے پائے۔ (زیادہ تر اپنے آپ سے) میں جانتا ہوں وہ لوگ غریب ہیں اور گاؤں میں رہتے ہیں مگر ان کی رگوں میں ہمارے باپ دادا کا خون تو ہے۔

سلمیٰ : ساحرہ کہاں ہے اماں جان۔

بیگم : مرے زیبا بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوگی۔

مغلانی : آج تو چھوٹی بی بی نے ناشتہ بھی نہیں کیا سرکار!

مرزا طاہر : جاؤ ساحرہ سے کہو بی آپا آگئی ہیں۔

مغلانی : بہت اچھا سرکار — (مغلانی چلی جاتی ہے)

مرزا طاہر : (کچھ سوچتے ہوئے) ناشتہ بھی نہیں کیا — تو اس کی طبیعت ضرور کچھ ناساز ہوگی۔

بیگم : اس کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ کوئی کتاب پڑھنے کو مل جائے تو پھر اُسے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔

ساحرہ : (دوڑتی ہوئی آتی ہے اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ اُس کی عمر کوئی سولہ سترہ برس کی ہے) یہ کیا! آپا — آپ آگئیں اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔

سلمیٰ : (بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیتی ہے) تم اچھی تو رہیں ساحرہ؟

ساحرہ : آپ کی دعا ہے۔

مرزا طاہر : بی مغلانی کہتی ہیں کہ آج تم نے ناشتہ نہیں کیا — کیوں طبیعت تو اچھی ہے؟

ساحرہ : کتاب ہی کچھ ایسی دلچسپ تھی کہ میں ناشتہ داشتہ سب کچھ بھول گئی۔

مرزا طاہر : ہوگا کسی اناڑی شاعر کا دیوان — یا کوئی فرضی اور جھوٹا قصہ۔

ساحرہ : نہیں ابا جان — اس میں تو بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔

مرزا طاہر : بھلا ہم بھی تو سُنیں اس میں کیا لکھا ہے؟

(بیگم — سلمیٰ اور ساحرہ تخت پر بیٹھ جاتی ہیں۔ ساحرہ کتاب کھول کر اُسے پڑھنا شروع کرتی ہے)

ساحرہ : "ایک بڑے دانا کا قول ہے کہ انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے کہ اس کے قویٰ اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم ناماسبت پیدا نہ ہو — مگر جس قوم میں پرانے رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے، وہاں زندگی کا منشا معدوم ہوجاتا ہے۔

مرزا طاہر : (بگڑ کر) یہ کسی بڑے دانا کا قول ہے یا کسی بڈھے بے وقوف کا؟ جو قوم پرانے رسم و رواج کی پابند نہیں وہ بھی کوئی قوم ہوتی ہے؟

ساحرہ : (بے پروائی سے پڑھتے ہوئے) ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے یہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کا حق ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ اگلی روایتوں یا رسم و رواج پر مبنی ہے وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے اور اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے۔ اس کے رہنے والے نہ خوشحال ہوسکتے ہیں اور نہ ترقی کرسکتے ہیں۔۔ ۔۔ ۔

مرزا طاہر : (بگڑ کر) ہونہہ — تم نے یہ کیا پڑھا — یہ بھی کسی دانا شخص کی رائے ہے! احمق کہیں کا۔

سلمیٰ : (بے پروائی سے پڑھتے ہوئے اپنے موجبے اور بے سمجھے پرانی رسوم کی پابندی کے یہ معنی ہیں کہ کسی شخص کو اس چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے کا اختیار نہیں۔ پرانی رسوم کی تقلید سے اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں کہ نقل کرنے کی جو خاصیت بندر میں پائی جاتی ہے۔ انسان میں بھی موجود ہے۔۔ ۔۔

مرزا طاہر : (بہت بگڑ کر) بند کرو اس کتاب کو — گویا ہم لوگ جو پرانی رسوم کے پابند ہیں، بندروں کی خاصیت رکھتے ہیں — بد تمیز کہیں کا — (بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے) اب بیگم تم ہی بتاؤ کہ یہ عید بقر عید کی خوشیاں — شادی بیاہ کی رسمیں — اور شب برات کا چراغاں نہ ہو تو — پھر زندگی کس چیز کا نام ہے؟

بیگم : خوشی تو اسے کہتے ہیں جس کا انجام بھی خوشی ہو — اگر قرض لے کر انسان ان رسموں کی پابندی کرتا چلا جائے اور پھر قرض اتنا بڑھ جائے کہ وہ اپنے باپ دادا کی جائیداد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تو یہ خوشی کوئی خوشی نہیں۔

مرزا طاہر : (بڑی ناراضگی سے) اچھا — تو آپ اشاروں اشاروں میں ہم پر بھی فقرے کسنے لگیں۔؟

بیگم : اس میں فقرے کسنے کی کیا بات ہے — بنیا شیش محل کی قرقی کی ڈگری حاصل کر چکا ہے۔ اس کے نیلام کا ڈر سر پر منڈلا رہا ہے اور آپ کو شب برات کے چراغوں کی فکر لگی ہوئی ہے۔

مرزا طاہر : اس بدبخت منشی نے یہ تو سب کچھ کہہ دیا اور یہ نہ کہا کہ وکیل صاحب اس ڈگری کے خلاف اپیل کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

سلمیٰ : اپیل سے کیا ہوگا ابا جان؟ قرقی رک جائے گی۔ لیکن بنیے کا قرض تو دیسے کا دیسا ہی موجود رہے گا۔

مرزا طاہر : ہم نے تمہارے بڑے بھائی کو لکھ دیا ہے۔ اس کی پریکٹس آج کل زوروں پر ہے۔ اسے لاکھ دو لاکھ کی کیا پروا ہوگی۔ جب تک اپیل کا فیصلہ ہو بنیے کا قرض ادا ہو جائے گا۔

بیگم : آپ کے خط کا جواب آ چکا ہے۔

مرزا طاہر : (خوشی سے گھبرا کر) تو کیا لکھا ہے اُس نے؟

بیگم : (بیگ سے خط نکال کر مرزا طاہر کی طرف بڑھاتے ہوئے) خود ہی پڑھ لیجئے۔

مرزا طاہر : (خط پڑھتے ہوئے) "تین برس میں دن رات کی محنت کے بعد کہیں جا کر چار پیسوں کا منہ دیکھا ہے، میرے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا کہ میں بنیے کا قرض چکا دوں۔ میرے خیال میں یہی بہتر ہے کہ شیش محل بیچ دیا جائے اور قرض چکا دیا جائے۔ اگر کچھ رقم بچ جائے تو اپنی وسعت کے مطابق رہنے کے لئے کوئی مکان خرید لیا جائے .. .. " (انتہائی غصے میں) ننگ خاندان — باپ کو اس کی وسعت بتاتا ہے۔ دولت کی ریل پیل ہے اور کہتا ہے کہ تین برس کے بعد چار پیسوں کا منہ دیکھا ہے ... .

بیگم : (بات کاٹ کر) ذرا آگے تو پڑھیے۔

مرزا طاہر : (پھر خط پڑھنا شروع کرتا ہے) "میں نے ابا جان کا خط دیکھتے ہی اخباروں میں شیش محل کی فروخت کے لیے اشتہار دے دیا ہے" (انتہائی غصے میں خط کو زمین پر پھینک کر) تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ ہماری مفلسی کا ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے۔ خاندان کے نام کو نیلام کرنے کا اشتہار دے دیا ہے تو بہت اچھا — اگر اس کو یہ منظور نہیں کہ اپنے باپ دادا کی وراثت سنبھالے تو شیش محل کو نیلام ہو جانے دو بیگم — ہم اپنا سر چھپانے کو کوئی جھونپڑا ڈھونڈ لیں گے۔

سلمیٰ : آپ نے چھوٹے بھائی جان کو بھی اسی طرح ننگ خاندان کہہ کر گھر سے نکال دیا تھا۔۔ ۔۔ ۔۔

مرزا طاہر : (بات کاٹ کر اور غصے میں) اسے ہم گھر سے نہ نکال دیتے تو اور کیا کرتے۔ اس ننگ خاندان نے ہماری اجازت کے بغیر ایک کباڑیے کی بیٹی سے شادی کر لی۔ نہ ہماری عزت کو دیکھا۔ نہ اپنے خاندان کا لحاظ کیا۔ صرف اس لیے کہ اس کباڑیے کے پاس چار پیسے ہیں۔ کہنے لگا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ لوگوں کا ٹوٹا پھوٹا مال بیچ کر پیسہ جمع کرنے والا دکاندار بھی بڑا آدمی ہو گیا (حقارت سے) تمہارے چھوٹے بھائی جان نے اس کی دولت دیکھی تو اپنے خاندان کو کلنک لگا دیا۔ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ۔ اب اپنے بڑے بھائی جان کے خط کا مضمون بھی تم نے سن لیا۔۔۔ ۔۔

بیگم : (بات کاٹ کر) جب اس غریب میں قرض چکانے کی سکت ہی نہیں تو وہ اور کیا کرتا۔؟

مرزا طاہر : خدا جانے اس نئی پود کو کیا ہو گیا ہے۔ ہر شخص دولت کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ نہ باپ دادا کی عزت کا پاس۔ نہ خاندان کے نام کا لحاظ۔

ساحرہ : اباجان اس کتاب میں اس کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے۔

مرزا طاہر : (غصے میں) جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے سب غلط ہے۔ یہ بیہودہ ہے۔ ہم نہیں سننا چاہتے۔

بیگم : آخر سن لینے میں کیا حرج ہے؟

سلمیٰ : (ساحرہ کی دلجوئی کے خیال سے) پڑھو ساحرہ ہم سنیں گے۔

ساحرہ : (کتاب پڑھتی ہے) جس طرح انسان کا جسم بڑھاپے میں رو بہ انحطاط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی عقل بھی روز بروز کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ اگر انسان کی بینائی کمزور ہو جائے تو وہ اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے چشمہ لگا لیتا ہے۔ اگر دانت گر جائیں تو وہ مصنوعی دانتوں سے کام لیتا ہے۔ لیکن عقل کے ضعف کا کوئی علاج نہیں۔ اگر اس کا کوئی علاج ہے تو یہ کہ سن رسیدہ لوگ جو حقیقت میں تعصب اور ضد کا محض ایک پلندہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ جوان سال لوگوں کی عقل کا سہارا لیں اور انہیں نادان اور ناتجربہ کار کہہ کر اپنی کم عقلی کا ثبوت نہ دیں۔ ۔۔ ۔۔

مرزا طاہر : (بات کاٹ کر غصے میں) گویا ہم تعصب اور ضد کا محض ایک پلندہ ہیں اور یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے۔ ہماری کم عقلی کا ثبوت ہے۔؟

سلمیٰ : ساحرہ نے یہ کب کہا ہے اباجان۔ یہ تو کتاب میں لکھا ہے۔

مرزا طاہر : اس کتاب کو پھاڑ ڈالو۔ یہ تمہیں بے ادب اور گستاخ بنا دے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کتابوں کو چھاپنے کی اجازت کیوں دی جاتی ہے۔

سلمیٰ : سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اباجان! اگر ادب مانع نہ ہوتا تو میں بھی صاف صاف کہہ دیتی کہ آپ کی ضد اور آپ کے فرسودہ اصولوں کی پابندی نے سارے خاندان کو جہنم میں جھونک دیا ہے۔ اب میری ہی طرف دیکھیے پہننے کو کپڑا نہیں۔ کھانے کو روٹی میسر نہیں آتی اور آپ یہ جھوٹی تسلیاں دے دے کر میرا دل بہلا رہے ہیں کہ وہ لوگ غریب سہی مگر ان کی رگوں میں ہمارے

باپ دادا کا خون تو ہے اب میں آپ کے اس خون کی شرافت کو اوڑھوں یا بچھاؤں ؟

میرزا طاہر : (گھبرا کر غصے سے) تو تم سب کے سب بغاوت پر اتر آئے - اور اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ امیری اور غریبی زمانہ کی دھوپ چھاؤں کا نام ہے مگر خاندان کی عزت ایسی چیز نہیں جسے اس طرح اٹھا کر بازار میں اچھال دیا جائے - ہم جانتے ہیں شیش محل نیلام ہو جائے گا، مگر ہم اپنے ہاتھوں اسے کیوں فروخت کریں ... ...

سلمیٰ : آپ تو ناحق بگڑ بیٹھے ابا جان - میں غریب پرایا دھن میری کیا مجال کہ آپ کی باتوں میں مین میخ نکالوں - میرے نصیب میں تو جو کچھ لکھا تھا، مجھے مل گیا - اب ساحرہ کا خیال آتا ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتی ہوں - اس کے لیے آپ نے ایک ایسا بر ڈھونڈ نکالا ہے کہ اگر وہ سونے میں لد کر نہ گئی تو وہ لوگ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے -

(ساحرہ کھلی ہوئی کتاب کو زور سے بند کرتی ہے اور اٹھ کر چلی جاتی ہے - اس کی حرکت سے بیزاری ظاہر ہے)

مرزا طاہر : ہم نے ساحرہ کے لیے یہ بر تلاش نہیں کیا - نواب بنّن نے ہمارے خاندان کو دیکھ کر اپنے بیٹے کے لیے ساحرہ کے رشتے کی خود آرزو کی ہے -

بیگم : (بگڑ کر) تو آپ نے بھی نواب بنّن کے خاندان ہی کو دیکھا - اسے دیکھنے کی کوشش نہ کی، جس سے آپ اپنی بیٹی کا دامن باندھنا چاہتے ہیں -

مرزا طاہر : (حیران ہو کر) تو نواب بنّن کے بیٹے میں کیا خرابی ہے ؟

بیگم : ایک خرابی ہو تو کہوں - اس میں وہ سب خرابیاں ہیں جو بگڑے ہوئے نوابوں کی اولاد میں ہوتی ہیں وہ نشائی خوار اوباش جس نے اپنے باپ دادا کی رہی سہی عزت اور جائیداد آوارگی میں لٹا دی ہے - اب ضرور ساحرہ ہی کا ہو کر رہے گا -

مرزا طاہر : (کچھ مسکرا کر) امیروں کے بیٹے جوانی میں کیا کچھ نہیں کیا کرتے ہم بھی بیگم شادی سے پہلے کیا کچھ نہ کیا کرتے تھے - مگر تم نے آتے ہی ہماری ناک میں نکیل ڈال دی شادی کے بعد نواب بنّن کے بیٹے کے بھی سب بل نکل جائیں گے اور وہ سیدھا سیدھا چلنے لگے گا -

(مغلانی داخل ہوتی ہے)

مغلانی : میر صاحب آئے ہیں سرکار !

مرزا طاہر : (بیگم سے) لو اب تم جاؤ بیگم ! یہ قصے تو ہوتے ہی رہیں گے (سلمیٰ سے مخاطب ہو کر) اور سلمیٰ تم اپنا کمرہ درست کر لو ہم چاہتے ہیں کہ کچھ دن تم ہمارے پاس رہو - اتنے میں ہم ذرا میر صاحب کا ادھار چکا دیں - آج تو اس کم بخت نے آتے ہی ہماری سب چالیں مات کر دیں (بیگم اور سلمیٰ اٹھ کر جاتی ہیں - مغلانی سے مخاطب ہو کر) جاؤ بی مغلانی منشی جی سے کہو میر صاحب کو یہیں بھیج دیں -

مغلانی : بہت اچھا سرکار

(مغلانی جاتی ہے مرزا طاہر شطرنج کی بازی پر نظر جمائے گنگنانے لگتے ہیں)

ع۔ نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو۔

(دو تین مرتبہ اس مصرع کو دہراتے ہیں)

(میر صاحب دائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں' ان کی بغل میں ایک اخبار دبا ہوا ہے)

میر صاحب : آداب عرض کرتا ہوں سرکار۔ آتے آتے کچھ دیر ہی ہوگئی۔

مرزا طاہر : کیا مضائقہ ہے۔ بازی ویسی کی ویسی ہی جمی ہے میر صاحب! دیکھئے نا ہمارے فرزین کے ٹھاٹھ رفت، ہاں ہاں اور ذرا کشت بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اب بازی ہم نے جیتی ہی جیتی۔

(میر صاحب شطرنج کی بساط پر مرزا طاہر کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں' ان کے چہرے پر مایوسی کے آثار ہیں)

میر صاحب : شطرنج کی بازی تو آپ جیت ہی لیں گے، سرکار۔ مگر زندگی کی بساط پر آپ نے ایک اور بازی ہار دی۔

مرزا طاہر : (کچھ حیران ہوکر) کیا مطلب؟

میر صاحب : میں گھر سے واپس آرہا تھا کہ رستے میں نواب بنّن سے مڈبھیڑ ہوگئی اور انہوں نے جھٹ سے یہ اخبار بغل سے نکال کر مرزا طاہر کو دکھاتے ہوئے) اشتہار دکھایا اور بڑی طنز سے کہا کہ نوبت بایں جا رسید۔؟

مرزا طاہر : (حیران ہوکر) کیوں خیر باشد!

میر صاحب : (اخبار کے ایک صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اب آپ اس اشتہار کو خود ہی پڑھ لیجئے نا۔

مرزا طاہر : (اشتہار پڑھتے پڑھتے) تو ہمارے دیوالیہ پن کا یہ اشتہار چھپ بھی گیا!

(غصّے میں) اس نالائق بیٹے نے یہ بھی نہ کیا کہ باپ کو جیتے جی کاٹنے سے پہلے اس سے پوچھ تو لیتا۔

میر صاحب : خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا سرکار۔ لیکن نواب بنّن نے تو غضب ہی ڈھا دیا۔

مرزا طاہر : (حیران ہوکر) کیا کیا انہوں نے؟

میر صاحب : اب کس منہ سے کہوں سرکار کہ نواب بنّن نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ نہیں چاہتے کہ ان کے بیٹے اور آپ کی چھوٹی صاحبزادی کے رشتے کے بارے میں آپ سے کوئی مزید بات چیت کی جائے۔

مرزا طاہر : (حیرت اور غصے سے) کیوں اس اشتہار سے اس رشتے کا کیا تعلق ہے؟

میر صاحب : (رک رک کر) تعلق ہے سرکار — وہ اپنے بیٹے کا رشتہ اس مرزا طاہر کی بیٹی سے کرنا چاہتے تھے جو شیش محل کا مالک تھا۔

مرزا طاہر : (غصے میں) تو جائیے میر صاحب اس سے کہہ دیجئے کہ اگر انہیں اپنے بیٹے کا رشتہ شیش محل کی اینٹوں سے کرنا تھا تو وہ اب بھی وہیں کی وہیں دھری ہیں۔

میر صاحب : (بڑی سنجیدگی سے) اگر آپ برا نہ مانیں سرکار تو میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے نواب بنّن کے بیٹے میں کیا خوبی دیکھی۔ اور نواب بنّن کو کیا سمجھا۔؟

مرزا طاہر : بس یہی کہ ان کا خاندان اچھا ہے۔ اس سے بڑی خوبی اور کیا ہوسکتی ہے۔

میر صاحب : معاف کیجئے سرکار — آپ نے بہت غلطی اپنی بڑی صاحبزادی کے لیے رشتہ پسند کرنے میں کی تھی۔ وہ لوگ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کی مالی حالت بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ کس ناز و نعم میں پلی ہوئی بیٹی کو کچھ سوچے سمجھے بغیر ان گنواروں کی جھولی میں ڈال دیا۔

مرزا طاہر : (ڈھٹائی سے) مگر اس کو کیا کیجئے کہ خاندان میں اس وقت کوئی اور لڑکا ہی نہ تھا۔

میر صاحب : لڑکے تو اس وقت بھی بہت تھے اور اب بھی بہت ہیں۔ لیکن آپ کو اپنے خاندان اور نواب متن کے خاندان کے سوا اور کوئی گھرانا نظر ہی نہیں آتا۔

مرزا طاہر : مثلاً۔

میر صاحب : اب اشرف خان صاحب کے بیٹے ہی کو دیکھ لیجیے۔ ولایت سے بڑے بڑے امتحان پاس کر کے آیا ہے۔ خوبصورت ہے۔ شریف زادہ ہے۔ باپ دادا کا کاروبار اس لیاقت سے چلا رہا ہے کہ بڑے بڑے پرانے گھاگ بھی دنگ رہ گئے ہیں۔

مرزا طاہر : (کسی قدر حیرت سے) یہ اشرف خاں کون ہیں؟

میر صاحب : (حیرت سے) آپ اشرف خان کو نہیں جانتے ——— آج ملک بھر میں ان کے کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑے کی دھوم مچ رہی ہے۔ بچے بچے کی زبان پر "اشرف کلاتھ ملز" کا نام ہے۔ اور آپ فرما رہے ہیں کہ اشرف خان کون ہیں؟

مرزا طاہر : تو اچھا — آپ کی مراد (کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کارخانے کے مالک شرفو سے ہے۔ وہی شرفو نا جس کے باپ نے سر پر اینٹیں اور گارا اٹھا اٹھا کر شیش محل کی دیواریں کھڑی کی تھیں۔ ابھی تو میر صاحب ان دیواروں میں وہ گارا بھی خشک نہیں ہوا اور آپ نے اسے اشرف خاں صاحب بنا دیا۔ اور ہماری بیٹی کے لیے اُس کے بیٹے کا رشتہ تجویز فرمانے لگے! ہم غریب ہو گئے تو کیا ہوا۔ اگر آسمان جھک کر زمین سے بھی آ لگے تو کوئی اسے زمین نہیں کہتا۔

میر صاحب : (بے بسی سے) مگر اس کو کیا کیجئے حضور کہ زمین سے لگے ہوئے آسمان کو کوئی آسمان نہیں کہتا۔

مرزا طاہر : آن ہی سے انسان ہوتا ہے میر صاحب! جی ہاں، آن نہیں ان کی دولت کس کام کی ——— اور یوں تو دروازے پر پڑے ہوئے کتے کو بھی روٹی کا ٹکڑا مل جاتا ہے۔

میر صاحب : (تنگ آ کر) نواب متن نے تو صاف جواب دے دیا ہے سرکار۔ اگر آپ اسی ضد پر اڑے رہے تو میرے منہ میں خاک صاحبزادی کے لیے اب آپ کی پسند کا کوئی رشتہ ملنا محال بلکہ ناممکن ہے۔

مرزا طاہر : تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب ہمارے پلے کے اور کوئی لوگ نہیں رہے۔!

میر صاحب : ہیں سرکار — مگر — آپ کو مسدس حالی کا یہ بند تو ضرور یاد ہوگا۔

بہت آگ چلموں کی سلگانے والے
بہت گھاس کی گٹھڑیاں لانے والے
بہت در بدر مانگ کر کھانے والے
بہت فاقے کر کر کے مر جانے والے

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر
تو نکلیں گے نسلِ ملوک ان میں اکثر

مرزا طاہر : تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب ہمیں اپنی بیٹی کا بر تلاش کرنے کے لیے چلموں کی آگ سلگانے والوں، گھاس کی گٹھڑیاں اٹھانے والوں، دربدر کی ٹھوکریں کھانے والوں اور فاقہ کر کے مر جینے والوں کے ہاں جانا ہوگا — شیش محل کو ہرے ہاتھ سے جاتے دیکھا تو آپ اڑ گئے، خوب پر اتر آئے میر صاحب!

میر صاحب : کیا مجال کہ میری زبان سے گستاخی کا ایک لفظ بھی نکلے — میں تو سرکار آپ کا پرانا نمک خوار اور دیرینہ نیازمند ہوں۔ مگر اس نمک خواری اور نیازمندی کا تقاضا یہی ہے کہ آپ سے صاف صاف کہہ دوں کہ اس وقت میری نظر میں اشرف خان کے بیٹے کے سوا کوئی ایسا لڑکا نہیں جو آپ کی صاحبزادی کے رشتے کے لیے موزوں ہو۔ غلام نے آپ کی بچی کو گود میں اٹھا اٹھا کر کھلایا ہے۔ میں نہیں دیکھ سکتا کہ آپ کی ضد کے باعث زندگی اس کے لیے وبالِ جان ہو جائے اور سچ پوچھیے تو سرکار میرا جی جانتا ہے کہ مجھے تو آپ کے انکار سے کس قدر خوشی ہوئی۔

مرزا طاہر : (کس قدر نرمی سے) تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم اپنی بیٹی کی شادی شرفو کے بیٹے سے کر دیں اور اس کے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے یہ کلنک لگا دیں کہ مرزا طاہر کی بیٹی کو ایک مزدور کے بیٹے کے سوا کوئی بر نہ ملا۔

میر صاحب : میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میری آواز نہیں — وقت کی آواز ہے — زمانے کی آواز ہے سرکار! آج کل لوگ شرافت کو حسب نسب کے شجروں میں تلاش نہیں کرتے۔ انسان کے ذاتی اوصاف میں دیکھنا چاہتے ہیں، اور جہاں تک ذاتی اوصاف کا تعلق ہے اشرف خاں کے بیٹے میں شرافت کے سب جوہر موجود ہیں۔

(بندو ملازم داخل ہوتا ہے)

بندو : وکیل صاحب آئے ہیں سرکار — وہ کہتے ہیں کہ انہیں سرکار سے ایک ضروری کام ہے۔

مرزا طاہر : (ترش روئی سے) پھر وہی ضروری کام — خدا جانے وکیل صاحب کے یہ ضروری کام کب ختم ہوں گے۔ اچھا بھیج دو انہیں۔ اور دیکھو منشی جی سے کہو کہ ذرا سی دیر کے لیے آجائیں (میر صاحب سے شطرنج کی بساط کی طرف اشارہ کرکے) تو یہ بازی ان کھیلی ہی پڑی رہے گی۔

میر صاحب : آپ وکیل صاحب سے نپٹ لیجیے سرکار — شطرنج کی بازی تو ہوتی ہی رہے گی۔

(وکیل اور منشی جی داخل ہوتے ہیں)

وکیل : آداب عرض کرتا ہوں سرکار۔

مرزا طاہر : آداب آداب — تشریف لائیے وکیل صاحب — ایسا ضروری کام کیا نکل آیا؟

(وکیل مرزا طاہر کے پہلو میں ادب سے تسلیم کرکے بیٹھ جاتا ہے)

وکیل : میں نے کہا سرکار کہ زمینوں کی فروخت کے بارے میں جو آپ نے حکم دیا تھا اس کا معاملہ تو طے ہو گیا ہے۔ اب زمین کو بیچ کر جو رقم

لڑنے سے کوئی بات نہیں بنے گی۔

مرزا طاہر : (حیران ہو کر) کیوں؟

وکیل : ڈگری کے خلاف اپیل کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

مرزا طاہر : یہ آپ نے عجیب بات کہی۔ اپیل تو عدالت کے فیصلے کے خلاف ہو سکتی ہے۔

وکیل : ضرور ہو سکتی ہے — لیکن (رک جاتا ہے)

مرزا طاہر : (بے صبری سے) لیکن کیا؟

وکیل : اگر عدالت کا فیصلہ کسی قانونی نقص کے لحاظ سے انصاف پر مبنی دکھائی نہ دے تو بیشک اپیل ہو سکتی ہے۔

مرزا طاہر : (غصے میں) تو آپ کے خیال میں یہ فیصلہ انصاف پر مبنی ہے؟

وکیل : بنیئے کے پاس آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے پرونوٹ موجود ہیں اور آپ نے ان کی ادائیگی کے لیے شیش محل کو مقفل بھی کر رکھا ہے۔

مرزا طاہر : لیکن بنیئے نے تو ایک ہزار روپے دے کر دس ہزار کا پرونوٹ لکھوا لیا تھا۔ اور پھر سود در سود کے حساب سے یہ رقم کہاں سے کہاں جا پہنچی۔

وکیل : تو اس کا ثبوت تو ہمیں کو دینا ہو گا سرکار۔

مرزا طاہر : ثبوت کے لیے کیا ہمارا بیان کافی نہیں؟

وکیل : تحریری ثبوت کے سامنے عدالت کی نگاہ میں زبانی بیان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی سرکار۔

مرزا طاہر : تو عدالت کی نگاہ میں مرزا طاہر اور وہ بنیا یکساں ہو گئے؟

وکیل : عدالت کا کام انصاف کرنا ہوتا ہے سرکار — اور انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ کسی فریق کے جاہ و منصب کا لحاظ نہ کیا جائے۔

مرزا طاہر : (غصے میں) تو آپ اسے انصاف کہتے ہیں کہ دس ہزار روپے کی جگہ بنیئے کو ایک لاکھ روپے کی ڈگری مل گئی۔

وکیل : اب تو ہاتھ کٹ چکے ہیں سرکار۔ بنیئے نے قرض کی ساری رقم کا تحریری ثبوت عدالت میں داخل کر دیا۔

مرزا طاہر : (کچھ سوچ کر) تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ان تحریروں پر بقائمی ہوش و حواس خمسہ دستخط نہیں کیے۔

وکیل : اس سے تو آپ کے دشمنوں کی عزت پر حرف آئے گا سرکار۔

مرزا طاہر : (گھبرا کر) ہماری عزت پر حرف آئے گا — تو شیش محل کو نیلام ہو جانے دیجئے وکیل صاحب۔

وکیل : مگر میں تو یہ عرض کرنے آیا تھا سرکار کہ اس سارے معاملے کو طے کرنے کی ایک اچھی صورت نکل آئی ہے۔

مرزا طاہر : وہ کیا؟

وکیل : اشرف کلاتھ ملز کے مالک نے اخبار میں شیش محل کی فروخت کا اشتہار دیکھا تو مجھے بلایا اور اس فروخت کا باعث دریافت

کیا۔ میں نے آپ کی مجبوریوں کا ذکر کر دیا۔

مرزا طاہر : (بگڑ کر) یہ تو آپ نے بڑی غلطی کی وکیل صاحب! آپ سے کس نے کہا تھا کہ ہماری مجبوریوں کا ڈھنڈورا پیٹتے پھریں۔

وکیل : (رندانہ مسکراہٹ سے) اسی سے تو ایک اچھی صورت پیدا ہوگئی ہے سرکار! اشرف کا تھ طرفے کے مالک اس بات پر تیار ہو گئے ہیں کہ وہ اس قرض کی پائی پائی چکا دیں اور اس رقم پر کوئی سود بھی نہ لیں بشیش محل پر آپ ہی کا قبضہ رہے اور جب بھی ہو سکے ان کی رقم انہیں واپس کر دی جائے۔

(خدمت گار داخل ہوتا ہے)

مرزا طاہر : کیا ہے بندو؟

بندو : حضور کوئی بڑے سیٹھ ایک بڑی سی موٹر میں آئے ہیں اور سرکار سے ملنا چاہتے ہیں۔

(بندو ایک طشتری جس میں ایک وزیٹنگ کارڈ رکھا ہے، مرزا طاہر کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ مرزا طاہر کارڈ ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں)

مرزا طاہر : (خان بہادر محمد اشرف خان، (کسی قدر حقارت اور حیرت سے) اچھا تو یہ شخص پہلے اشرف خان بنا پھر اشرف خان صاحب اور اب خان بہادر محمد اشرف خان بن گیا۔ اور اس کو یہ جرأت بھی ہوگئی کہ ہمارے ہی گھر آ کر ہمارا منہ چڑائے (منشی کی طرف دیکھتے ہوئے) جائیے منشی جی (ذرا بناوٹ سے) خان بہادر محمد اشرف خان صاحب سے کہیے کہ ہم ان کے انتظار میں چشم براہ ہیں۔

(منشی اور بندو دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

وکیل : (بے اختیار ہو کر) کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھئے گا کہ جس سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

مرزا طاہر : آپ نے ہمیں ایسا بد تمیز سمجھ لیا ہے۔ ہمارے ہاں دشمن بھی آجاتے تو ہم اُسے دوست سمجھتے ہیں۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ آگے آگے اشرف خان اور اس کے پیچھے منشی جی داخل ہوتے ہیں۔ مرزا طاہر اشرف خان کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کے استقبال کے لیے اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میر صاحب اور وکیل اشرف خان کی تعظیم کے لیے سر و قد کھڑے ہو جاتے ہیں)

اشرف خان : (جلدی سے قدم اٹھا کر) آپ مجھے شرمسار نہ کیجیے حضور!

مرزا طاہر : (بڑے رکھ رکھاؤ سے) نہیں نہیں۔ جب خدا نے آپ کو عزت دی ہے تو آپ کی تعظیم ہم پر بھی فرض ہوگئی۔ تشریف رکھیے (اشرف خان مرزا طاہر کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے) کہیے۔ آپ کے مزاج تو اچھے ہیں۔

اشرف خان : خدا کا شکر ہے۔

مرزا طاہر : آپ چائے پئیں گے یا شربت؟

اشرف خان : اس تکلف کی کیا ضرورت ہے حضور —— اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ سے کچھ باتیں تنہائی میں کرنا چاہتا ہوں۔

مرزا طاہر : کیا مضائقہ ہے۔ ویسے تو میر صاحب اور وکیل صاحب غیر آدمی نہیں۔

میر صاحب : (اٹھتے ہوئے) اتنے میں ہم مردانے میں انتظار کرتے ہیں۔

مرزا طاہر : (وکیل سے مسکراتے ہوئے) اگر کوئی ضروری کام نہ ہو تو ذرا سی دیر کے لیے آپ بھی ٹھہر جائیے گا۔

وکیل : بہت بہتر سرکار۔

(میر صاحب اور وکیل دونوں باہر نکل جاتے ہیں)

مرزا طاہر : (کسی قدر ترش روئی سے) جب آپ کو وکیل صاحب نے سب حالات بتا ہی دیئے تھے اور آپ نے شیش محل کو واگذار کرانے کا ارادہ ان پر ظاہر بھی کر دیا تھا تو پھر تنہائی میں گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اشرف خان : (بڑے ادب سے) مجھے کچھ یقین سا ہو چلا تھا کہ آپ کی غیرت میرے اس حقیر پیش کش کو ایک غیر آدمی کا احسان سمجھ کر کبھی قبول نہ کرے گی۔ اس لیے میں خود ہی حاضر ہو گیا کہ آپ کو اپنی زبانی بتا دوں کہ یہ کسی غیر آدمی کا پیسہ نہیں، آپ کے اپنے ہی خون اور پوست کی کمائی ہوئی دولت ہے، جس سے میں یہ قرض چکانا چاہتا ہوں۔

مرزا طاہر : (حیران ہو کر) ہمارے خون اور پوست کی دولت؟ کیا معنی؟؟

اشرف خان : یہ ایک راز ہے جو سو برس سے زیادہ عرصے تک سربستہ رہا ہے۔ لیکن آج محض اتفاق سے اسے ظاہر کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

مرزا طاہر : (حیران ہو کر) ایسا بھی کیا راز ہے جو سو برس سے زیادہ عرصے تک سربستہ رہا ہے۔

اشرف خان : (بڑے رازدارانہ انداز سے) سن اٹھارہ سو پینتیس (۱۸۳۵) میں جب انگریزی حکومت کا نائب ولیم فریزر دہلی میں مارا گیا اور نواب شمس الدین نے اس الزام میں پھانسی پائی تو انگریزوں نے ان کی جاگیر ضبط کر لی اور ان کی فوج کے رسالے کو توڑ دیا۔ اس رسالے کے رسالدار مرزا نجیب بیگ بیوی بچوں کو ساتھ لے کر بڑی خستہ حالت میں پہلے تو دہلی گئے اور پھر وہاں کے ہنگاموں سے تنگ آ کر پنجاب میں آ گئے۔۔۔۔۔

مرزا طاہر : (حیران ہو کر) رسالدار مرزا نجیب بیگ! وہ تو اباجان کے چچا تھے۔

اشرف خان : جی۔ پنجاب میں دربدر کی ٹھوکریں کھا کر آخر کار وہ اس شہر میں آ بسے۔ کچھ پڑھے لکھے نہ تھے سپاہ گری کے سوا اور کوئی فن نہ جانتے تھے۔ خاندانی غیرت کا یہ تقاضا نہ تھا کہ بھیک مانگ کر گزر اوقات کرتے۔ اتنی توفیق نہ تھی کہ اپنے دونوں بیٹوں میں سے کسی ایک کو بھی پڑھاتے لکھاتے یا کوئی ہنر سکھاتے۔ یک گمنام زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے آخر کار مزدوری کرنے لگے اور کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کس خاندان سے ہیں۔ دن بھر سر پر اینٹیں اور گارا اٹھاتے اور اس مزدوری سے جو روکھی سوکھی مل جاتی، اس پر اپنا اور بیوی بچوں کا گزارا کرتے۔

مرزا طاہر : (اظہار تاسف سے) اباجان اس وقت زندہ تھے اور خدا کے فضل و کرم سے اچھی حالت میں تھے وہ ان کے پاس کیوں نہ چلے آئے۔

اشرف خان : اپنی مصلحتیں تو وہ خود ہی جانتے ہوں گے۔ مگر شاید ان کی غیرت نے یہ بات قبول نہ کی ہوگی کہ اپنی بیوی کے خاندان میں سے کسی کا سہارا لیں۔

مرزا طاہر : (بڑی دلچسپی کے اظہار میں) پھر کیا ہوا؟

اشرف خان : جب ان کے دونوں بیٹے اس قابل ہوگئے کہ باپ کا ہاتھ بٹائیں تو ان میں سے ایک ان کے ساتھ ساتھ اپنے سر پر اینٹیں اور گارا اٹھانے لگا۔ چھوٹا بیٹا کچھ زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے پرانی بوتلیں اور ردی اخبار بیچنے کا دھندا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ ٹوٹا پھوٹا اور پرانا سامان بیچنے کی دوکان کھول کر کباڑیا بن بیٹھا۔

مرزا طاہر : (گھبرا کر) اس کا کیا نام تھا؟

اشرف خان : نام تو باپ نے مرزا اکرم بیگ رکھا تھا مگر لوگ اسے "اکو" کباڑیا کہتے تھے۔

مرزا طاہر : (اور زیادہ گھبرا کر اور حیران ہو کر) تو کیا وہ اکو کباڑیا رسالدار مرزا نجیب بیگ کا بیٹا ہے؟

اشرف خان : جی ہاں۔

مرزا طاہر : اور ان کے بڑے بیٹے کا کیا نام تھا؟

اشرف خان : مرزا معظم بیگ —— وہی موجو جس نے اپنے سر پر اینٹیں اور گارا اٹھا اٹھا کر شیش محل کی دیواریں کھڑی کیں — وہی موجو جس کا بیٹا شرفو بچپن میں آپ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اور جو اس وقت آپ کے سامنے موجود ہے۔

مرزا طاہر : (بے اختیار ہو کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ان کی آنکھ سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور پھر اشرف خان کو اس کے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہیں۔ اشرف خان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے ہیں اور چلا کر کہتے ہیں) شرفو!

(پھر اسے چھاتی سے لگا لیتے ہیں۔ اشرف خان کچھ کہنا چاہتا ہے)

مرزا طاہر : بس بس — اب کچھ نہ کہو میرے بھائی — میں سب کچھ سمجھ گیا —
(پھر زور سے ملازم کو آواز دیتے ہیں) بندو!

(باہر سے آواز)

بندو : جی سرکار۔ (بندو داخل ہوتا ہے)

مرزا طاہر : جاؤ مغلانی بی کو ہمارے پاس بھیج دو۔

بندو : بہت اچھا سرکار۔ (بندو چلا جاتا ہے)

مرزا طاہر : (اشرف خان سے) کسے معلوم تھا کہ اس ذرا سے وقت میں ہمارے خاندان کی تاریخ کتنے ورق الٹ دے گی — مگر یہ تو کہو بھائی تم یہ اشرف خان کیوں بن بیٹھے؟

اشرف خان : ابا جان کی وصیت تھی کہ آپ پر کسی صورت بھی ظاہر نہ ہونے پائے کہ میں اور اکرم مرزا نجیب بیگ کے پوتے ہیں۔

مرزا طاہر : (طشتری پر رکھے ہوئے وزیٹنگ کارڈ کو اٹھا کر جس پر خان بہادر محمد اشرف خان لکھا ہے پھاڑ دیتا ہے، اب اس

بہروپ کی کوئی ضرورت نہیں۔ نئے کارڈ چھپواؤ اور بڑے فخر سے ان پر خان بہادر مرزا اشرف بیگ لکھواؤ۔

(مغلانی داخل ہوتی ہے)

مغلانی : کیا حکم ہے سرکار؟

مرزا طاہر : (بڑی خوشی کے اظہار سے) بی مغلانی جاؤ سلمیٰ اور ساحرہ سے کہو ان کے چچا آئے ہیں۔ اور دیکھو بیگم صاحب سے بھی کہو کہ اپنے دیور کے لیے پان بنا کر خود لائیں۔

(مغلانی حیرت سے اشرف خان کی طرف دیکھتی ہے اور جب اشرف خان آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو جھک کر کہتی ہے)

مغلانی : آداب چھوٹی سرکار۔

(اشرف خان مسکراتا ہے۔ مغلانی چلی جاتی ہے)

مرزا طاہر : تم خوش تو بہت ہوگے کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں ایک بھرا پرا خاندان مل گیا۔

اشرف خان : خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔

(سلمیٰ اور ساحرہ دوڑتی ہوئی آتی ہیں اور اشرف خان کی بیگانی صورت دیکھ کر رک جاتی ہیں)

مرزا طاہر : (ہنستے ہوئے) رک کیوں گئیں — آگے بڑھو اور چچا ابا کو آداب کرو۔

سلمیٰ : (حیرت سے) چچا ابا؟

طاہر مرزا : ہاں ہاں — یہ تمہارے چچا ابا ہیں (مسکراتے ہوئے) کہیں کھو گئے تھے خدا نے آج ملا دیا۔

(دونوں بڑی خوشی سے بڑھتی ہیں اور آداب بجالاتی ہیں)

سلمیٰ : آداب چچا ابا۔

ساحرہ : (جلدی سے) آداب چچا ابا۔

اشرف خان : جیتی رہو — (اٹھ کر دونوں کے سر پہ پیار کرتا ہے۔ مرزا طاہر کی طرف دیکھ کر) لڑکیاں بھی کتنی جلدی بڑھ جاتی ہیں۔ کون جانتا تھا بھائی جان کہ اس زمانے کے بعد ہم اس وقت ملیں گے جب ہماری اولاد بھی جوان ہو چکی ہوگی۔

(بیگم دروازے سے داخل ہوتی ہے اور رک جاتی ہے)

مرزا طاہر : (بیگم کو رکتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے) بیگم — یہ ہیں ہمارے بھائی مرزا اشرف بیگ — ان کا تو تم نے آج تک نام بھی نہیں سنا ہوگا۔

اشرف خان : (بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کر) آداب عرض کرتا ہوں بھابھی!

بیگم : (حیرت سے) یہ کیا بھول بھلیاں ہیں؟ (مرزا طاہر سے مخاطب ہو کر) آپ نے آج سے پہلے تو ان کا کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔

مرزا طاہر : قدرت کے پردہ غیب میں کچھ ایسے راز بھی ہوتے ہیں بیگم جو وقت ہی پر ظاہر ہوتے ہیں۔

(بیگم بڑھ کر خاصدان ساحرہ کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ ساحرہ خاصدان سے پان کی گلوری نکال کر اشرف خان کی طرف بڑھتی ہے)

ساحرہ : لیجیے چچا ابّا۔

اشرف خان : (پان کی گلوری اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا ہے) جیتی رہو۔

مرزا طاہر : اب آپ سب بیٹھ جائیے۔ اور ہم سے داستان امیر حمزہ سنیے۔

(بیگم تخت پر بیٹھ کر سروتے سے چھالیا کترنے لگتی ہے۔ بلّی اور ساحرہ تخت سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ جاتی ہیں۔ بی مغلانی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی رہتی ہے) یہ کہانی تو بیگم ہم پھر سنائیں گے کہ یہ تمہارے دیور اب تک کہاں رہے۔ لیکن ذرا اپنے چھوٹے صاحبزادے کی کارستانی ملاحظہ ہو۔

(مسکرا کر) اس ننگ خاندان۔۔ ۔۔

ساحرہ : (بات کاٹ کر) پھر آپ نے بھائی جان کو ننگ خاندان کہا؟

مرزا طاہر : (ہنستے ہوئے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے) توبہ توبہ۔ اب ہم اسے ننگ خاندان نہ کہیں گے بیٹا! لیکن سنو تو وہ کباڑیا جس کی بیٹی سے اس نے ہماری اجازت کے بغیر شادی کر لی وہ بھی تمہارا چھوٹا چچا ہے۔

بیگم : (خفا ہو کر) اور آپ اپنے بھائی کو کباڑیا ہی کہتے رہے!

مرزا طاہر : (خوش ہو کر ہنستے ہوئے) ہا ہا ہا ہا — قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہمارا چھوٹا بھائی کباڑیوں کا کام کرنے لگے۔ اور بیگم یہ جو اشرف کلاتھ ملز ہے اور جن کے تیار کیے ہوئے کپڑے تم پہنتی ہو، ان کا مالک بھی ہمارا ہی بھائی ہے۔

بیگم : (حیران ہو کر) کون؟

مرزا طاہر : (اشرف خان کی طرف اشارہ کر کے) یہ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں مرزا اشرف بیگ۔

اشرف خان : (کچھ مسکراتے ہوئے ادب سے) اب اس داستان کا ایک حصہ رہ گیا ہے، اجازت ہو تو اسے بھی سنا دوں۔

بیگم : ضرور سناؤ بھیا۔

اشرف خان : ایک فقیر اپنی جھولی پھیلا کر آپ کے دروازے آیا ہے۔ اسے خالی ہاتھ نہ جانے دیجیے گا بھابھی!

مرزا طاہر : (کچھ سمجھ کر) ہمیں شیش محل کو بیچ کر بیٹے کی ڈگری کا حساب چکا لینے دو اشرف میاں! اگر اس کے بعد بھی ایک امیر نے ایک فقیر کے جھونپڑے پر آ کر اپنی جھولی پھیلائی تو وہ خالی ہاتھ نہ جائے گا۔

اشرف خان : (بڑی آزردہ دلی سے) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان!

مرزا طاہر : (بیگم سے) لو بیگم اب تم جلدی سے کچھ کھانے دانے کی تیاری کر لو۔ اشرف میاں آج پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے ہیں۔ ہم انہیں کھانا کھائے بغیر نہ جانے دیں گے (ساحرہ سے مخاطب ہو کر) اور دیکھو ساحرہ کھانا ایسا ہو کہ تمہارے چچا ابا کا جی خوش ہو جائے۔

ساحرہ : (خوشی سے) ہم چچا ابا کو ایسی اچھی اچھی چیزیں کھلائیں گے کہ انہوں نے پہلے کبھی نہ کھائی ہوں۔

اشرف خان : (خوش ہو کر بڑی تمنا سے) خدا کرے بیٹا تم اپنے گھر میں آباد ہو کر ہمیں ایسی اچھی اچھی چیزیں کھلایا کرو جو ہم نے پہلے کبھی نہ کھائی ہوں۔

(بیگم سلمیٰ اور ساحرہ جاتی ہیں)

مرزا طاہر : (مغلانی سے) بی مغلانی! منشی جی سے کہو میر صاحب اور وکیل صاحب کو ہمارے پاس لے آئیں۔

مغلانی : بہت اچھا سرکار۔ (مغلانی جاتی ہے)

اشرف خان : (مرزا طاہر سے مخاطب ہو کر کسی قدر آزردگی سے) بھائی جان آپ شیش محل کی فروخت کا ذکر بچوں کے سامنے نہ کیا کیجیے۔ لڑکیوں کا دل بہت نازک ہوتا ہے اور پھر اس قرض کی حقیقت ہی کیا ہے۔ ادا ہو جائے گا۔

مرزا طاہر : (بڑے اطمینان سے) ہاں میاں —— اللہ مالک ہے۔

(منشی جی وکیل صاحب اور میر صاحب آتے ہیں)

میر صاحب : (ذرا آگے بڑھ کر بے تکلفی سے) آج تو حضور اشرف خان صاحب سے بڑی گاڑھی چھننے لگی۔

مرزا طاہر : اشرف خان صاحب۔ آج سے انہیں مرزا اشرف بیگ کہا کیجیے۔

میر صاحب : (حیرت سے) مرزا اشرف بیگ؟

مرزا طاہر : (بڑی خوشی کے اظہار سے) ہاں ہاں میر صاحب! بیٹھے بٹھلائے آج ہمارا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔

میر صاحب : (خوش ہو کر) چشم ما روشن دلِ ما شاد۔

وکیل : مبارک باد عرض کرتا ہوں حضور۔

منشی : اور غلام کی طرف سے بھی مبارکباد قبول ہو سرکار۔

اشرف خان : (وکیل سے) آپ نے ڈگری کی کل رقم دیکھ لی وکیل صاحب؟

وکیل : منشی جی کے حساب سے بنیئے کے کھاتے میں جو رقم لکھی ہے اصل سے کوئی دس گنا زیادہ ہے۔

اشرف خان : (بے پروائی سے) بنیئے کے کھاتے کو پھاڑ ڈالیے۔ ڈگری کی رقم بتایئے۔

وکیل : (پاکٹ بک نکال کر اسے دیکھتے ہوئے) اصل اور سود ملا کر ایک لاکھ پینتیس ہزار چھ سو بیس روپے گیارہ آنے تین پائی ہوتے ہیں (اشرف خان جیب سے چیک بک اور فونٹین پن نکالتا ہے اور چیک لکھنے کو ہے کہ مرزا طاہر اسے روک دیتے ہیں۔

مرزا طاہر : مرزا نجیب بیگ کے پوتے ہو کر یہ غضب ڈھانے لگے ہو اشرف میاں! شاید بھول گئے ہو کہ انہوں نے سر پر اینٹیں اور گارا اٹھانا منظور کیا مگر ہمارے دروازے کا منہ دیکھنا قبول نہ کیا۔ ایسی کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا جس سے تمہارے دادا ابا کے خاندان کی رسوائی اور ہماری جگ ہنسائی ہو۔

(اشرف خان لاچار سا ہو کر کچھ سوچنے لگتا ہے۔ میر صاحب اور وکیل ایک دوسرے سے اشاروں ہی اشاروں میں مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔

(مرزا طاہر کا ملازم بندو داخل ہوتا ہے)

بندو : جو موٹر پہلے آئی تھی سرکار — ایک اس سے بھی بڑی موٹر آئی ہے اور اس میں ایک دیسی قسم کے صاحب بہادر بیٹھے ہیں (طشتری پر ایک وزیٹنگ کارڈ رکھ کر وکیل صاحب کی طرف بڑھا دیتا ہے)۔ یہ رہا ان کا کارڈ۔

(وکیل کارڈ اٹھا کر پڑھتا ہے)

وکیل : چیف منیجر ــــ بنک لمیٹڈ پرنسپل آفس

مرزا طاہر : (نام سن کر اور حیران ہو کر) تو یہ کوئی اور ڈگری آگئی؟ ہم کو تو یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کسی بنک سے کبھی کوئی قرض لیا ہو۔ اچھا بلالو انہیں۔

(بندو جاتا ہے)

خدا برا وقت کسی پر نہ لائے۔ ایک بنیا ہی کیا کم تھا کہ اب یہ چیف منیجر آ ٹپکے۔

منشی : کسی اور کام سے آئے ہوں گے سرکار — ہمارا حساب کتاب کسی بنک وینک سے نہیں۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ انگریزی لباس پہنے ہوئے ایک نوجوان داخل ہوتا ہے۔ پھر ہیٹ اتار کر آگے بڑھتا ہے۔)

چیف منیجر : میں اطلاع کیے بغیر آنے کی معافی چاہتا ہوں — مگر کام ہی کچھ ایسا ضروری تھا۔

مرزا طاہر : (طنز سے مسکرا کر) یہاں جو بھی آتا ہے کسی ضروری کام ہی سے آتا ہے (منیجر کی طرف دیکھ کر) ہمارے دیوان خانے میں کوئی کرسی ورسی تو ہے نہیں آپ اس (چوکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) چوکی ہی پر تشریف رکھیے۔

منیجر : نہیں نہیں جناب — میں فرش ہی پر بیٹھ جاتا ہوں۔

مرزا طاہر : اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں — آپ کی پتلون میں سلوٹ پڑ جائے گی۔

منیجر : (چوکی پر بیٹھتے ہوئے اور جیب سے کچھ نکالتے ہوئے) شکریہ

(سب لوگ بڑی تشویش سے منیجر صاحب کو دیکھنے لگتے ہیں)

مرزا طاہر : (کسی قدر تشویش سے) تو کیا تھا وہ ضروری کام؟ کوئی ڈگری یا قرقی؟

منیجر : (مسکرا کر) ایسی کوئی بات نہیں جناب۔ (کاغذ کو پڑھتے ہوئے) یہ ایک لیٹر آف اتھارٹی۔

مرزا طاہر : یہ کیا بلا نازل ہو گئی منیجر صاحب؟

منیجر : یہ ایک چھٹی ہے۔

مرزا طاہر : (اطمینان سے) بس صرف ایک چٹھی ہے — جس نے لندن سے چل کر ہمارے پاس آنے کی تکلیف گوارا کی۔

منیجر : جی — اس میں ہمارے بنک کو اختیار دیا گیا ہے کہ ہم آپ کے قرض کی کل رقم ادا کر دیں اور شیش محل کو واگذار کرا دیں۔

اس کے علاوہ ... ...

مرزا طاہر : (حیرت اور خوشی سے) اس کے علاوہ اور کیا ؟

مینجر : اس کے علاوہ یہ کہ آپ کی خدمت میں محل سرا کے اخراجات کے لیے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دس ہزار روپے کا چیک پیش کر دیا جایا کرے۔ اور آپ کی چھوٹی صاحبزادی کے لیے جس قدر رُوپے کی ضرورت ہو فوراً مہیا کر دیا جائے۔

مرزا طاہر : (خوش ہو کر) اے واہ — سبحان اللہ! (میر صاحب سے مخاطب ہو کر) اسی لیے تو داناؤں نے کہا ہے میر صاحب کہ جب خدا دینے پر آتا ہے تو چھت پھاڑ کر دیتا ہے۔

میر صاحب : (خوشامد سے) بجا شک سرکار۔

مرزا طاہر : (مینجر سے) مگر اس کو بھیجنے والا کون ہے مینجر صاحب ؟

مینجر : لندن کی ایک مشہور فرم ہے جس کا لین دین ہمارے بینک کے ساتھ ہے۔

مرزا طاہر : یہ فرم کیا بلا ہوتی ہے، مینجر صاحب ؟

مینجر : بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بڑا تجارت خانہ۔

مرزا طاہر : تو اس تجارت خانے کا مالک کون ہے ؟ جس نے ہم پر یہ مہربانی فرمائی۔

مینجر : (چھٹی پڑھتے ہوئے) شکیل بیگ اینڈ سنز۔

مرزا طاہر : (خوشی سے اچھل کر) شکیل بیگ — ! شکیل بیگ تو بیشک ہمارا بیٹا ہے مگر یہ "اینڈ سنز" کیا ہوا۔

مینجر : یعنی ان کے بیٹے۔

اشرف خان : (مسکراتے ہوئے) خیر سے شکیل کے دو چاند سے بیٹے بھی ہیں۔

مرزا طاہر : (فرطِ انبساط سے) شکیل کے دو چاند سے بیٹے بھی ہیں — یعنی ہمارے پوتے — تو مینجر صاحب! سب کام چھوڑ کر اس فرم کو ایک تار دیجئے کہ شکیل بیگ آئے نہ آئے مگر اینڈ سنز کو ہمارے پاس فوراً بھیج دے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پوتے شیش محل میں ہماری نگرانی میں پرورش پائیں۔

مینجر : آپ کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی حضور — لیکن (رک جاتا ہے)

مرزا طاہر : اب لیکن کیا ؟

مینجر : مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ ڈگری کی ساری رقم چکا دی گئی ہے۔ شیش محل اب واگذار ہے اور محل سرا کے اس مہینے کے اخراجات کے لیے (اُٹھ کر ایک چیک پیش کرتے ہوئے) دس ہزار رُوپے کا یہ چیک حاضر ہے۔

مرزا طاہر : (چیک کو ہاتھ میں لے کر) ہاں — مینجر صاحب! شکیل میاں کو لکھ دیجئے کہ انہوں نے یہ قرض چکا کر ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اپنی جائیداد واگذار کرائی ہے۔

مینجر : اب میں اجازت چاہتا ہوں سرکار۔

مرزا طاہر : ایسی بھی کیا جلدی ہے — آپ نے ہمیں "اینڈ سنز" کی خوشخبری سنائی ہے ذرا منہ تو میٹھا کر جائیے۔

مینیجر : میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا حضور! اس وقت ایک ضروری کام ہے۔

مرزا طاہر : پھر وہی ضروری کام؟

مینیجر : تسلیم — اچھا خدا حافظ

(مینیجر چلا جاتا ہے۔ مرزا طاہر اشرف خاں کی طرف دیکھتے ہوئے)

مرزا طاہر : آداب اشرف میاں ہم نے تمہاری جھولی بھر دی۔

اشرف خان : (خوشی اور ادب سے) میں کس منہ سے آپ کے اس احسان کا شکر بجا لاؤں۔ اب آپ کا بھتیجا بھی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جائے گا۔

مرزا طاہر : (خوشی اور فخر سے) نہیں — ہم چاہتے ہیں کہ اب وہ سہرا باندھ کر ہی شیش محل کی ڈیوڑھی میں داخل ہو۔

(سب کے چہرے پر خوشی کے آثار ہیں۔ اتنے میں مغلانی دروازہ کھول کر داخل ہوتی ہے)

مغلانی : دسترخوان بچھ گیا ہے سرکار —!

مرزا طاہر : (اشرف بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے) بسم اللہ —! اور (منشی کو مخاطب کر کے) منشی جی دیکھو —! اب کے بھی شب برات پر شیش محل میں اتنے ہی چراغ جلیں گے جتنے ہمارے باپ دادا کے وقت سے جلتے چلے آئے ہیں۔

(مرزا طاہر کا کلوز اپ)

———— : فیڈ آؤٹ : ————

تلی پھٹ گئی

سید امتیاز علی تاج

"تلی پھٹ گئی" میرا ایک ایکٹ کا پہلا کھیل ہے جو میں نے کالج کے زمانۂ طالب علمی میں مشق کے طور پر لکھا تھا۔ پاکستان کے آج کے آزاد لوگوں کے لیے انگریزی حکومت کے اُس زمانے کی مشکلات و قیود کا اندازہ لگانا آج ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ کھیل نہ کبھی اسٹیج پر آیا اور نہ کہیں چھپا۔ لکھنے والوں کے ایک مختصر سے مجمع سے البتہ اس نے ایک بار داد پائی۔ مجھے اُمید ہے آج کے قارئین، اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو شاید اس خیال سے اس کھیل کا پڑھنا، سُننا اور دیکھنا پسند کریں کہ یہ تقریباً نصف صدی پیشتر لکھا گیا تھا ——— (تاج)

اتوار کے سہ پہر کو یوپی کے ایک ڈویژن کے یورپین کلکٹر مسٹر ہنری اسٹیفنز اپنے بنگلے کے برآمدے میں کوٹ اتار کر قمیص کی آستین چڑھائے ایک کرسی پر بیٹھے اپنی بندوق صاف کرنے میں مصروف ہیں۔ قریب ہی مسز ہنری اسٹیفنز بیٹھی سلائی کا کام کر رہی ہیں۔

مسز اسٹیفنز : (سلائی پر سے نظریں اٹھا کر) پر ہنری، وہ اپنے بیٹے کو جنگ میں نہیں بھیجنا چاہتا۔

مسٹر : (بندوق صاف کرتے کرتے بے پروائی سے) کوئی اپنے بیٹے کو جنگ میں بھیجنا نہیں چاہا کرتا۔

مسز : پھر تم اس کو مجبور کیوں کرتے ہو۔؟

مسٹر : مجبور نہ کیا جائے تو جرمنوں کو جتانے کے لیے ہمارے پاس کسی شخص کا مشیانہ رہے۔

مسز : لیکن یہ ظلم ہے ہنری!

مسٹر : ظلم کیوں؟

مسز : بوڑھے کا اکلا بھی ایک لڑکا ہے۔ اور تم اس کو موت کے منہ میں بھیج رہے ہو۔

مسٹر : عین ممکن ہے وہ جنگ میں دلاورانہ اعزاز حاصل کرے۔

مسز : لیکن بوڑھے باپ کی محبت کو یہ خیال اطمینان نہیں بخش سکتا۔

مسٹر : بے وقوف ہے۔

مسز : پھر تم کیوں بے وقوفوں کے معاملے میں دخل دیتے ہو؟

مسٹر : اس ملک میں یہی کام ہمارا فرض ہے۔

مسز : دیکھو ہنری تم دنیا کو جرمنی کے ظلم سے بچانے سے پہلے خود ظلم کر رہے ہو۔

مسٹر : لڑائی میں سب جائز ہے۔

مسز : پھر تم جرمنوں پر کیوں الزام لگاتے ہو؟

مسٹر : اس لیے کہ وہ جرمن ہیں۔

مسز : او ہنری بحث کی خاطر تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم نے جرمنوں کو کبھی اس لیے بُرا نہیں سمجھا۔

مسٹر : (مسز ہنری اشیفنز کی طرف سر پھیر کر) ہم عورتوں نے ؟

مسز : (کسی قدر برانگیختہ ہوکر) ہم برطانیہ کے باشندوں نے ہم ہمیشہ حق و صداقت کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ ہم دنیا کو ظلم اور جہالت سے بچانے کے لیے گھر چھوڑ کر نکلتے ہیں۔ ہم علم تہذیب اور آزادی کے علمبردار ہیں۔

مسٹر : تم بھرتی کے کسی اسٹیشن پر رنگروٹوں کے سامنے یہ تقریر دہرا نہیں سکتیں ؟

مسز : (غصے سے) کیا ؟

مسٹر : یہ بہت اچھی تقریر تھی میں داد دیتا ہوں۔

مسز : یہ غلط ہے ؟

مسٹر : غلط ہو یا صحیح کچھ ڈر نہیں۔ بہت کم شش سے تم نہایت عمدہ مقررہ بن سکتی ہو۔

مسز : تمہارا کیا مطلب ہے ؟

مسٹر : میں اپنے آپ کو بہت کم دھوکا دینے کا عادی ہوں۔

مسز : تم اس کی تردید کی جرأت کرتے ہو۔ ؟

مسٹر : واقعات اس قدر خوب صورت نہیں ہوتے۔ تقریر اور تحریر کا فن ان میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔ اسی واسطے میں نے تمہاری تقریر کی داد دی تھی۔ اسی واسطے !

مسز : اور اپنے ان خیالات پر تم دل میں شرمندہ بھی نہیں ہوتے ؟

مسٹر : قوت کے ہوتے شرمندہ ہونے کی ضرورت کبھی لاحق نہیں ہوتی۔

مسز : ہنری تم عیسائی ہو ؟

مسٹر : جہاں تک اپنے کو عیسائی کہنا مجھے فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ مگر اس کے اصول۔ بھوہ ! اس زمانے کے لیے ناموزوں۔ قوت اور سیاست کے دشمن۔

مسز : (بہت سنجیدہ اور مجبور ہو کر) اوہ ۔ ۔ ۔ ۔

مسٹر : جوش میں مت آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ میں نے واقعات بیان کیے ہیں اور تم جانتی ہو میں شاعری سے کتنی دور ہوں۔

مسز : (اکتا کر) میں اس کے متعلق اور باتیں نہیں کرنا چاہتی۔ نہیں تو میں تم سے، مجھے یقین ہے کیا نوشتہ اپنے آپ سے بھی نفرت کرنے لگوں گی لیکن مجھے بتاؤ ! تم بیرا میتاک کے لڑکے کو بھرتی سے معاف کر سکتے ہو یا نہیں ؟ تم جانتے ہو، بیرا بوڑھا آدمی ہے۔ اس نے مدتوں ہماری خدمت کی ہے۔ اس کے اور کوئی لڑکا نہیں۔ اس نے پیسہ پیسہ بچا کر اپنے لڑکے کو تھوڑا بہت پڑھایا ہے۔ وہ چاہتا تھا، تمہاری عزت

اس کو کوئی کلرکی یا نوکری مل جاتی۔ لیکن تم اُسے بھرتی کرنا چاہتے ہو بلکہ بھرتی ہونے پر مجبور کر رہے ہو۔ میں تمہارے فرض یا ترقی کے فلسفے کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں تم اس کو چھوڑ دو۔ میری خاطر چھوڑ دو۔ وہ بوڑھا انسان میرے پاس آیا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں تم سے اس کی سفارش کروں۔

مسٹر : تو تم اُس کی وکیل بن کر آئی ہو۔؟

مسز : میں صرف درخواست کرنے آئی ہوں۔

مسٹر : وہ خود درخواست لے کر میرے پاس کیوں نہ آسکا؟

مسز : کیونکہ اُسے کامیابی کا یقین نہ تھا۔

مسٹر : وکیل اور کس کو کہتے ہیں۔؟

مسز : اب جو تمہارا دل چاہے سمجھ لو۔

مسٹر : اگر تم بیوی کی حیثیت سے سفارش کرنے آئی ہو تو تمہارا یہ فعل ناپسندیدہ ہے۔ اگر تم اس وقت صرف اس کی وکیل ہو تو میں کہنا چاہتا ہوں سلطنت کی ضروریات ایک بڑھے کی پگلی محبت سے زیادہ اہم ہیں۔

مسز : لیکن اس کا لڑکا بھرتی کے لیے مناسب نہیں۔

مسٹر : بھرتی کے افسر نے اس کو پاس کر دیا۔ اور مزید معلومات تمہاری یا میری نسبت ڈاکٹر زیادہ صحیح دے سکے گا۔

مسز : ہاں مگر ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔!

مسٹر : (بات کاٹ کر) کل اس کا معائنہ کرے گا۔

مسز : نہیں میں کہنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کر چکا۔

مسٹر : کر چکا!

مسز : ہاں! آج صبح۔

مسٹر : کیسے؟

مسز : میں نے اس کے لڑکے کو خط دے کر ڈاکٹر کے پاس بھیجا تھا۔

مسٹر : کیوں؟

مسز : کیونکہ فیصلے کا دارومدار اسی مرحلے پر تھا۔

مسٹر : تم کو مجھ سے اجازت لینی چاہیے تھی۔

مسز : میں نے محض خود معلومات حاصل کرنے کے لیے معائنہ کروایا تھا۔

مسٹر : (کھنکار کر) اور تم نے ڈاکٹر کو لکھا کہ صاحب اس کو بھرتی کروانا چاہتے ہیں۔

مسز : اس کی کیا ضرورت تھی۔

مسٹر : ہاہم، اور ڈاکٹر نے کیا کہا؟

مسز : اس نے لکھا، اس کی صحت درست نہیں، سینہ کمزور ہے۔ دل کمزور ہے اور۔ اور بہت کچھ۔

مسٹر : بدمعاش!

مسز : ہنری اب تمہارا اصرار بچوں کی ضد کی طرح ہے۔

مسٹر : اور بچے اپنی ضد پوری کیا کرتے ہیں۔

(اندر چلا جاتا ہے) اسپرنگ والا دروازہ چوں کی آواز کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا ہے۔

(مسز شیفر ایک آہ بھر کر پھر سلائی کے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ میتا ڈرتا ڈرتا آتا ہے)

میتا : میم صاحب!

مسز : دل میتا۔ صاحب نہیں مانتا۔ ہم نے بوٹ کہا۔

میتا : پھر میم صاحب!

مسز : گر میتا! تم اتنا ڈرتا کاہے کو مانگٹا تمہارا لڑکا لڑائی میں بوٹ نام پیدا کرکے آئے گا، بوٹ امیر بن کر آئے گا۔

میتا : میم صاحب میں بڈھا ہوں۔ میرے ایک ہی لڑکا ہے۔

مسز : صاحب بولتا یوں سب کا لڑکا چھوڑ دیا گیا۔ تو ہم بھرتی کس کو کرے گا؟

میتا : صاحب زبردستی کرتے ہیں! حضور سرکار کا تو انصاف مشہور ہے۔

مسز : دل یس۔ ٹم یس ٹم۔ سچ کہتا پر میتا ام یہ کہتا مانگٹا کہ اگر ام لڑائی میں ہار گیا تو فر امارا انصاف نہیں رہنے سکتا۔ اسی انصاف کو بچانا کے واسطے ام ٹم لوگوں کو تھوڑا تکلیف دینے رہا۔

میتا : اگر بھیجنا ہی ہے تو مجھ کو بھجوا دیجئے۔ میں بڈھا آدمی یہاں نہ مرا وہاں مر جاؤں گا۔ مگر میرے بچے نے تو ابھی زندگی کا کچھ دیکھا ہی نہیں۔

میم : میتا ام کو تم سے بوٹ ام ڈر دی پر ام کیا کرے۔ ٹم ایک کام نائیں کرنے سکتا؟ ٹم ڈاکٹر کو ڈیکھو۔ اس سے بولو، تمہارے لڑکے کو پاس نائیں کرے۔ صاحب بولے تو بھی پاس نائیں کرے۔ اس نے پاس نہیں کرنے مانگا تو فیر صاحب بھی نہیں بھیجنے سکتا۔

میتا : حضور بھلا کلکٹر صاحب کے مقابلے میں وہ غریب بیراگی کیوں سننے لگے؟

میم : دیل وہ مسلمان ہوتا!

میتا : حضور تو بات سن لیتی ہیں۔ وہ بات بھی نہ سنیں گے میری۔ حضور! مجھ بوڑھے کا آسرا تو آپ ہی ہیں۔ اللہ مجھے اور میرے بچے کو بچانے ہیں بے موت مرنا رہے میم!

میم : دل بیرا۔ ام فر کوشش کرنے سکتا۔ مگر ام کو امید نہیں۔ صاحب بوٹ ضدی ہے۔ اس کا سر فر گیا ہے۔

(اسپرنگ والا دروازہ کھلتا ہے)

مسٹر : فلورا!

مسز : اوہنری۔

مسٹر : تم بڈھا! (اسپرنگ والا دروازہ دھڑ سے بند ہونے کے بعد) تم گدھے کا بچہ۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ تم پھر میم صاحب کے پاس ہماری شکایت کرنے آیا۔ تو ہم تمہارا سر توڑ ڈالے گا۔

مسز : ہنری! ہنری!

مسٹر : تم نہیں جائے گا بڈ ماش۔

مسیتا : حضور ——— سرکار ———

مسز : ہیرا جاؤ۔ جاؤ۔ تم جاؤ۔ ہم کہتا تم جاؤ۔

مسیتا : بہت اچھا مائی باپ! (میتا جاتا ہے)

مسٹر : فلورا! مجھ کو پسند نہیں کہ تم میرے متعلق اپنے خیالات سے نوکروں کی معلومات میں بھی اضافہ کرو۔

مسز : ہنری میں معافی مانگتی ہوں۔ میرا مطلب نہ تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ سچ مچ مجھے بہت افسوس ہے۔

مسٹر : تم کو آئندہ اس قسم کے افسوس کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے۔

مسز : ہنری میں اپنے لفظ واپس لیتی ہوں۔ تم نے مجھے معاف کر دیا؟

مسٹر : اگر کہنا کافی ہو سکتا ہے۔

مسز : تم دل سے معاف نہیں کر سکتے؟

مسٹر : اگر دل سے معافی مانگی جائے۔

مسز : میں اپنے لفظوں کے لیے دل سے نادم ہوں

مسٹر : اور اپنے خیالات کے لیے؟

مسز : تم چاہو۔ تو میں کہہ سکتی ہوں۔

مسٹر : تم ابھی تک بحث کرنا چاہتی ہو؟

مسز : نہیں ہنری بحث کیوں کہتے ہو۔ بحث نہیں۔ میں بحث کیسے کر سکتی ہوں۔ میں صرف التجا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جانے دو۔

مسٹر : یہ نسبتاً خوشگوار ہوگا۔

مسز : تمہاری خوشی بہر حال مقدم ہے۔

مسٹر : اگر مجھ سے اس کی قیمت طلب نہ کی جائے۔

مسز : قیمت اور انعام میں بہت فرق ہے۔

مسٹر : لیکن انعام دینے پر مجبور کرنا قیمت طلب کرنا ہے۔

مسز : انعام کے لیے مجبور کون کر سکتا ہے۔

مسٹر : تمہارے ایثار کے اصول۔
مسز : ہنری تمہیں دکھ پہنچا کر مزا آتا ہے۔؟
مسٹر : قوت کے لیے یہ مزا سب سے پُرلطف ہے۔
مسز : ادہ ظالم . . . . .
مسٹر : ہاں تم مجھے ظالم کہہ سکتی ہو۔ مجھے یہ لفظ پسند ہے۔ قوت کا اعتراف یہی لفظ بہترین طور پر کر سکتا ہے۔
مسز : ہنری تم کس طرح کسی سے محبت کی توقع کر سکتے ہو۔؟
مسٹر : لیکن میں اطاعت چاہتا ہوں۔
مسز : تم جسم پر حکومت کرنے کو کافی سمجھتے ہو؟
مسٹر : اور زبان پر۔
مسز : اور دل پر؟
مسٹر : میں دلوں پر حکومت کرنے کا قائل نہیں۔ دل متلون چیز ہے۔
مسز : تو میں تمہاری بیوی ہو کر تم سے دل میں نفرت کر سکتی ہوں؟
مسٹر : میں نے زبان کی آزادی نہیں دی تھی۔
مسز : ہنری!
مسٹر : فلورا!

(دونوں تیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

(اسپرنگ والے دروازے سے نوکر آتا ہے)

نوکر : حضور چائے تیار ہے۔

(دونوں اندر جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہوتا ہے۔ سیتا اور اس کا لڑکا کریم داخل ہوتے ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں پلیٹیں ہیں، اور ان میں سینڈوچز اور توس ہیں۔ برآمدے کے قریب ٹھہر جاتے ہیں۔ کریم ادنے تعلیم یافتہ بر خود غلط اور باتونی لڑکا ہے)

کریم : سینڈوچیں اندر نہیں لے جاؤ گے ابا؟
سیتا : ابھی جمعہ باہر آتا ہوگا۔
کریم : چائے پلانے کا کام اب جمعہ کے سپرد ہوگیا ہے؟
سیتا : نہیں تو۔
کریم : پھر!
سیتا : کہا تو ابھی جمعہ باہر آجائے گا۔

کریم : یہ فرنچ ٹوس تو وہ چائے پینے سے پہلے کھائیں گے۔ دے آؤں اندر؟

میتا : تھک گئے ہو۔ تو لاؤ مجھے دے دو۔

کریم : تھکا تو نہیں۔ مگر میں کہتا تھا —

میتا : کچھ مت کہو۔

کریم : (جو ٹوس ہاتھ میں ہے اسے دیکھ کر) ابا ان کا مزا کیسا ہوتا ہے؟

میتا : جیسا گالیوں کا مزا ہوتا ہے۔

کریم : پھر تو چکھ لوں ایک۔

میتا : ہیں! (کریم خاموش ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ بندوق نظر آتی ہے)

کریم : ابا بندوق چلانی کتنے روز میں آجاتی ہے؟

میتا : کیا معلوم۔

کریم : اگر کہیں ڈاکٹر صاحب مجھ کو پاس کر دیتے اور لام پر جانا پڑتا۔ جب تو سیکھنی ہی پڑتی۔

میتا : چپ ہو جا۔ صاحب نکل آیا تو جوتے مارے گا۔

کریم : کس کے؟

میتا : میرے اور تمہارے۔ اور کس کے؟

کریم : اجی اس کی ایسی کی ۔ ۔ ۔ (اسپرنگ والا دروازہ کھلتا ہے)

جمعہ : میتا!

میتا : کیوں!

جمعہ : لاؤ پلیٹیں لے لیتا ہے)

میتا : جاؤں میں؟

جمعہ : ٹھہرے رہو (سرگوشی میں) مگر باتیں نہ کرو صاحب کا مزاج بگڑ رہا ہے آج۔

میتا : خدا خیر کرے (جمعہ اندر آتا ہے)

کریم : کیا بات ہے؟

میتا : ادھر آجاؤ۔

کریم : کسی سے ناراض ہیں صاحب؟

میتا : تم کوٹھری میں چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔

کریم : فارغ ہو لو تو اکٹھے چلیں گے۔

مسیتا : تمہاری مرضی۔

کریم : (کچھ دیر چپ رہنے کے بعد) ابا! میں کہتا ہوں۔ یہ انگریز شہر کے محلّوں میں کیوں نہیں رہتے؟

مسیتا : مجھے کیا معلوم۔

کریم : شاید ڈرتے ہیں کہ ۔۔۔

مسیتا : (بات کاٹ کر) کریم! ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا تو فوج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔؟

کریم : میم صاحب کا رنڈوے کر گیا تھا۔ ایسی حالت میں جو کچھ کہتے ہوں گے۔ یقین ہی سے کہتے ہوں گے۔

مسیتا : خدا کرے اپنی بات پر قائم رہیں۔

کریم : تم کیوں اتنے پریشان ہو؟

مسیتا : باپ بنو گے تو معلوم ہوگا۔

کریم : تو بہت سے بہت یہ کرتا کہ نوکری چھوڑ دیتا۔ چلو چھٹی ہوئی۔

مسیتا : تم مشکلوں کو کیا سمجھو۔

کریم : ابھی میں تو ایسا غائب ہوؤں کہ ان کے فرشتوں کو بھی میری خبر نہ ملے۔

مسیتا : یہ سامنے کون آ رہا ہے۔؟

کریم : ہوگا اور کون ڈاکٹر صاحب ہیں؟

مسیتا : تو تم چل کر کوٹھڑی میں بیٹھئے۔

ڈاکٹر : کیوں ڈاکٹر صاحب سے ملنے میں کچھ مضائقہ ہے؟

کریم : مضائقہ تو کیا (ڈاکٹر صاحب داخل ہوتے ہیں) سلام ڈاکٹر صاحب!

کریم : کیوں بھئی صاحب بہادر ہیں اندر؟

مسیتا : آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!

(ڈاکٹر کریم کے دخل در معقولات کی پروا نہیں کرتا)

مسیتا : چائے پی رہے ہیں حضور۔

کریم : فرمائیے مزاج تو اچھا ہے جناب کا؟

ڈاکٹر : (کریم کی بے تکلفیوں سے چڑ کر اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتا) کتنی دیر میں فارغ ہوں گے؟

مسیتا : ہوا ہی چاہتے ہیں (ڈاکٹر بنچ پر بیٹھنے لگتا ہے)

کریم : آپ تشریف رکھئے نا۔ کیسے آنا ہوا اس وقت؟

مسیتا : کریم تم جاؤ۔ جا کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھو۔

کریم : ہر وقت بیٹھے رہنے سے صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کیوں ڈاکٹر صاحب؟

ڈاکٹر : چپ رہنا نقصان دہ نہیں ہوتا۔

کریم : ہہ ہہ ہہ (شرمندگی رفع کرنے کو ہنستا ہے)

میتا : کریم!

کریم : (ذرا دیر چپ رہ کر) ڈاکٹر صاحب یہ ڈاکٹری کتنے عرصے میں آجاتی ہے؟

ڈاکٹر : آدمیت حاصل کرنے کی نسبت اس میں زیادہ عرصہ صرف ہوتا ہے۔

کریم : خوب ہو ہہ ہو ہہ۔

ڈاکٹر : تو تم اطلاع نہیں کر سکتے میتا؟

کریم : کوئی بہت ضروری کام ہے آپ کو؟

میتا : باہر آیا ہی چاہتے ہیں۔

کریم : (ذرا دیر چپ رہ کر) کوئی جنگ کی تازہ خبر فرمائیے۔ ڈاکٹر صاحب؟ اب کیا حالت ہے؟

ڈاکٹر : میں جنگ سے نہیں آرہا۔

کریم : ہو ہہ ہو ہہ۔ نہیں میں نے کہا، اخبار میں کوئی خبر نظر سے گزری ہو۔

ڈاکٹر : میں نے اخبار نہیں دیکھا۔

کریم : (اخبار کی طرف اشارہ کرکے جو ڈاکٹر کی جیب میں ہے، تھوڑا تھوڑا باہر نکل رہا ہے) گر آپ کی جیب سے تو اخبار ہی جھانک رہا ہے میں دیکھ سکتا ہوں؟

میتا : کریم!

ڈاکٹر : اہم۔ اہم۔ دیکھ لو۔

اخبار دے دیتا ہے کریم اخبار پڑھنے لگتا ہے۔ بعد کی گفتگو میں وہ کئی مرتبہ اخبار کی خبر سنا کر میتا اور ڈاکٹر کا قطع کلام کرتا ہے مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتے۔

میتا : میم صاحب نے لڑکے کو حسنو کے پاس بھیجا تھا۔

ڈاکٹر : ہاں ہم نے اسے دیکھ کر رپورٹ لکھ بھیجی تھی۔

میتا : تو۔

ڈاکٹر : صحت کی اور خرابیاں تو میں نے لکھ دی تھیں۔ اب مجھے اس کے دماغ میں بھی کچھ ۔۔۔۔!

میتا : تو حضور فوج میں تو بھرتی نہیں کیا جا سکتا نا؟

ڈاکٹر : بھرتی کے قابل نہیں ہے۔

کریم : دیکھی آپ نے ڈاکٹر صاحب اِن جرمنوں کی حرکت ۔۔ ۔۔ ۔

مسیتا : (بغیر کریم کی بات کا خیال کیے) حضور نے اچھی طرح دیکھا تھا نا؟

ڈاکٹر : اچھی طرح کیا معنی؟

مسیتا : وہ میں نے کہا حضور دوبارہ تو۔۔ ۔۔ ۔۔

ڈاکٹر : دوبارہ کیا۔ اس کا دل کمزور ہے۔ سینہ کمزور ہے اسکے علاوہ ABDOMINAL — تم نہیں سمجھ سکتے۔ مگر تم اس کو فوج میں بھرتی کیوں کروانا چاہتے ہو؟

مسیتا : میں؟

ڈاکٹر : ہاں کسی دفتر میں کلرک وغیرہ کروا دیتے۔

مسیتا : حضور میں تو۔۔ ۔۔ ۔۔

ڈاکٹر : اور کیا۔ کچھ پڑھا لکھا ہے، کچھ اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ گزارہ کرے گا۔

مسیتا : حضور میں تو خود ۔۔ ۔۔ ۔

ڈاکٹر : جوانی کا جوش ہے۔ فوج میں جا کر معلوم ہوتا ہے، کتنا دشوار کام ہے۔

مسیتا : اجی یہ تو۔۔ ۔۔ ۔۔

کریم : بھئی یہ جرمن شہزادہ بھی کم بخت قیامت کی چیز ہے۔

ڈاکٹر : اور دیکھو ایک بات تمہیں اور بتا دیں۔ (رازدارانہ انداز میں) میم صاحب بھی نہیں چاہتیں کہ یہ فوج میں بھرتی ہو۔ ان کے رقعے ہی سے معلوم ہوتا تھا۔ صاف تو کیسے لکھ سکتی تھیں مگر ہم تو تاڑ جاتے ہیں نا۔

مسیتا : خدا میم صاحب کو خوش رکھے۔

ڈاکٹر : عجیب لوگ ہیں جی جسے اپنا سمجھ لیں۔ اس کے لیے تو پھر مرتے ہی مرتے ہیں (دیسے جناب ان ہی صاحب نے ہم سے کہہ کہہ بہت سے ایسوں کو بھرتی کروا دیا جو جنگ میں سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے کہ جرمنوں کی گولیوں کے لیے کھتی کا کام دیں۔ ہاہا! (ہنستا ہے گویا بہت اونچا فقرہ کہا ہے)

مسیتا : وہ حضور صاحب ہی تو۔ ۔۔ ۔۔

ڈاکٹر : ہاں ہاں صاحب کی مرضی نہیں ہوگی نا جو میم صاحب نے تمہارے لڑکے کے متعلق اس قسم کا رقعہ ہمیں بھیجا۔ سمجھ گئے ہم۔ ہم نے بھی ان انگریزوں ہی کے ساتھ عمریں کاٹی ہیں۔ اشارے خوب سمجھتے ہیں۔

مسیتا : اور اگر آپ صاحب کی مرضی۔

کریم : (زور سے قہقہہ لگا کر) بھئی آپ ڈاکٹر لوگ بھی حد کرتے ہیں۔ یعنی یہ تِلی پھٹ گئی آپ لوگوں نے کیا عجیب مرض نکالا ہے!

ڈاکٹر : عجیب مرض ہے جو انگریز کے ہاتھ سے مرنے کے بعد ہمیشہ یہاں کے باشندوں میں پایا جاتا ہے۔

مسیتا : کریم۔

کریم : یعنی ایک دو نہیں، ڈاکٹر صاحب قبلہ! دسوں مرتبہ تو میں اپنی عمر میں دیکھ چکا ہوں کہ یہاں کا کوئی باشندہ جہاں کسی انگریز کے ہاتھ سے اتفاقیہ یا عمداً مارا گیا کہ ڈاکٹروں نے اس کی لاش کا معائنہ کیا، نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا ہے کہ اس کی تلی پھٹ گئی تھی۔

مسیتا : چپ ہو کم بخت۔!

ڈاکٹر : لاؤ ہمارا اخبار۔

کریم : مگر صاحب فرمائیے تو یہ انگریز کے وار میں تلی پھاڑ دینے کی تاثیر کیسی ہے۔؟

ڈاکٹر : تمہارا لڑکا ۔۔۔ ۔۔ ۔۔

مسیتا : جاتا کیوں نہیں تو؟

کریم : ڈاکٹر صاحب! یوں بحث نہیں جیتا کرتے۔

مسیتا : (غصہ سے) چلا جا یہاں سے ۔۔ ۔۔ ۔

(کریم کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا چلا جاتا ہے)

ڈاکٹر : آج کل کی تعلیم نوجوانوں کو بہت گستاخ بنا رہی ہے

کریم : تو میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب، اگر صاحب بھرتی ۔۔ ۔۔ ۔

ڈاکٹر : اماں کیا عرض کیا عرض کیا لگا رکھی ہے۔ کہہ جو دیا کہ لڑکا فوج میں بھرتی نہیں ہو سکتا۔

مسیتا : مگر حضور میں یہ کہتا تھا ——

ڈاکٹر : تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے، ہم نے جو امتحان لے لیا ہے۔

مسیتا : خدا حضور کو سلامت رکھے۔ پر ——

(اسپرنگ والا دروازہ کھلتا ہے۔ مسٹر اسٹیفنز آتا ہے)

کلکٹر : ویل ڈاکٹر؟

ڈاکٹر : سلام حضور!

کلکٹر : ٹم مسیٹا! ٹم یاں کیا کر رہا؟

مسیتا : حضور چائے کا سامان لایا تھا۔ اب ڈاکٹر ۔۔ ۔

کلکٹر : جاؤ۔ بوٹ ٹورا ادھر آیا کرو

ڈاکٹر : ہاں تمہارا ادھر زیادہ کچھ کام نہیں۔

مسیتا : حضور۔ (چلا جاتا ہے)

ڈاکٹر : وہ حضور مبارک باد دینے کو حاضر ہوا تھا حضور کے اقبال سے جرمن پیچھے ہٹا دیئے گئے ہیں۔
کلکٹر : پھر اس میں تمہارا کیا کام؟
ڈاکٹر : حضور بڑی خوشی ہوئی (ہنستا ہے) ہیں ہیں
کلکٹر : تم نے میسٹاک کے لڑکے کو ڈیکا"
ڈاکٹر : جی حضور میں نے اُسے کر دیا اَن فِٹ۔
کلکٹر : کیوں؟
ڈاکٹر : اور جی کوئی رعایت بھی نہیں کی میں نے وہ مناسب تھا ہی نہیں حضور۔
کلکٹر : یُو فول!
ڈاکٹر : حضور؟
کلکٹر : تم ——
ڈاکٹر : وہ میں سمجھ گیا تھا حضور، وہ میم صاحب کا رقعہ، جی ہاں ہیں ہیں۔
کلکٹر : کیا میم صاحب کا رقعہ؟
ڈاکٹر : حضور میرا مطلب یہ نہیں۔ وہ فٹ تھا ہی نہیں حضور!
کلکٹر : —کیوں نا ئیں تھا —؟
ڈاکٹر : وہ غریب پرور میں نے رقعے میں میم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیا تھا۔
کلکٹر : کیا؟
ڈاکٹر : وہ دو تین نقص میں نے نکال ڈالے حضور ویسے وہ تھا بھی اَن فٹ۔
کلکٹر : —تم—
ڈاکٹر : حضور ہی ہیں جو اپنے نوکروں پر اتنا کرم فرماتے ہیں۔
کلکٹر : تم گدھا۔
ڈاکٹر : حضور؟
کلکٹر : تم نے کیوں ایسا کیا؟
ڈاکٹر : کیا سرکار؟
کلکٹر : وہ اَن فِٹ تھا۔
ڈاکٹر : نہیں، جی ہاں کچھ ایسا حضور ہیں! ہیں! ہیں!
کلکٹر : تم نے کیوں کیا اَن فٹ —؟

ڈاکٹر : حضور! ہم صاحب۔ رقعہ نہیں! ہیں ہیں

کلکٹر : ایک دم فٹ کرو ——— ورنہ ———

ڈاکٹر : فٹ حضور؟

کلکٹر : ہماری طرف کیا دیکھتا؟

ڈاکٹر : حضور؟

کلکٹر : کیا نکس نکالا تھا تم نے؟

ڈاکٹر : حضور دل کمزور بتایا تھا

کلکٹر : اَب؟

ڈاکٹر : مضبوط ہو جائے گا حضور۔

کلکٹر : اور؟

ڈاکٹر : نظر کمزور کہی تھی۔

کلکٹر : اَب؟

ڈاکٹر : ٹھیک دیکھنے لگے گا سرکار۔

کلکٹر : اور؟

ڈاکٹر : سینہ کمزور بتایا تھا۔

کلکٹر : اب؟

ڈاکٹر : بہت مضبوط ہو جائے گا حضور!

کلکٹر : فوراً بندوبست کرو۔

ڈاکٹر : اور وہ میم صاحب؟

کلکٹر : میم صاحب کا بچہ۔ ہم جو کہتا۔ تم کو میم صاحب سے کیا؟

ڈاکٹر : نہیں حضور میری مجال ہے۔

کلکٹر : (بلانے کے لیے اونچی آواز سے) میتا!

ڈاکٹر : ارے میتا! میتا! چلو جلدی چلو۔

(میتا آتا ہے)

میتا : سرکار!

کلکٹر : اپنا لڑکا کا تیار کرنا مانگو۔ اسی وکٹ ڈاکٹر اس کو دیکھے گا۔ ہم کل اس کو بھرتی کرنا مانگتا۔

میتا : حضور۔۔۔

کلکٹر : کچھ نہیں سننا مانگتا۔

میتا : ڈاکٹر صاحب کہتے تھے وہ بھرتی کے قابل نہیں ہے۔

کلکٹر : ڈاکٹر بکتا تھا۔

ڈاکٹر : میں بکتا تھا اور تم عجیب آدمی ہو جی۔ تم نے بتایا بھی نہیں۔

میتا : حضور فرماتے تھے وہ کسی طرح نہیں بھیجا جا سکتا۔

ڈاکٹر : میں جھک مارتا تھا۔

میتا : حضور اُس کا تو دل کمزور ہے۔

کلکٹر : (ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر) ڈل؟

ڈاکٹر : بیشک کمزور ہے مگر ہمیں تو لڑائی میں چُن چُن کر کمزور دل کے آدمی بھیجنے چاہئیں، ورنہ وہ بھی جرمنوں کا سا ظلم کریں گے۔

میتا : حضور یہ تو ظلم ہے۔

کلکٹر : دل بکومٹ۔

میتا : مگر حضور اس کی نظر بھی کمزور ہے۔

ڈاکٹر : او ہو! تو لڑائی میں نظر کا کیا کام؟ وہاں شکار تو نہیں کھیلا جاتا، گولی چلائی ہوتی ہے۔ سر پہ گولی مت لگائے۔ ٹانگ میں لگائے کسی کی جان نہ لے، زخمی کر دے۔ کافی ہے۔

بیرا : سرکار۔

کلکٹر : بس اب کچھ نہیں سننا مانگتا۔ ڈور ہو جاؤ۔ اپنے لڑکا کو دوسری بار ڈاکٹر کو دکھانے کو تیار کرنا مانگو۔ ڈاکٹر اس کو دیکھ کر جلدی دوسرا سرٹیفکیٹ ڈو۔ ہم صبح اس کو بھرتی کرنا چاہا۔

میتا : (پیروں پر گرتا ہے) حضور مائی باپ ہیں۔ حضور اَن داتا ہیں۔ میرے سرکار!

کلکٹر : (دھکا مار کر) جلدی جاؤ۔ (بیرا روتا ہوا جاتا ہے) ہم ان بدماشوں کو ٹھیک کرے گا۔

ڈاکٹر : جی حضور لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔

کلکٹر : ول اب تم جاؤ۔ ہم ابھی ڈم بیرا کا لڑکا تمہارے پاس بھیجتا ہے۔

ڈاکٹر : بہت اچھا سرکار۔ سلام حضور۔

(اسپرنگ والا دروازہ کھلتا ہے، مسز ہنری داخل ہوتی ہے۔)

مسز : ہنری!

مسٹر ہنری : ول؟

مسز : آخر تم نے ڈاکٹر کو مجبور کر دیا کہ بیرا کے لڑکے کو فٹ کر دے۔

مسٹر ہنری : میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

مسز : ہنری یہ تم، بوڑھے بیرا کو مار ڈالے گا۔

مسٹر : وہ ویسے بھی تھوڑے عرصے کا مہمان ہے۔

مسز : وہ لڑکا بھرتی کے قابل نہیں ہے۔

مسٹر : میں بھرتی کر کے بتا دوں گا — وہ اس قابل ہے۔

مسز : تم کیوں اتنے سنگ دل بن رہے ہو؟ بیرا کے خون کے آنسو بھی تمہارا دل نہیں پگھلا سکتے ـ؟

مسٹر : اور میں حیران ہوں کہ شوہر کی خوشی کا خیال بھی تم کو خاموش نہیں کر سکتا!

مسز : آہ ہنری میں کچھ نہ بولتی۔ ایک بار مایوس ہو جانے کے بعد دوبارہ کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتی۔ لیکن ابھی ابھی بیرا میرے پاس گیا وہ میرے پیروں میں زخمی پرندے کی طرح تڑپنے لگا وہ اپنی تھرتھراتی ہوئی آواز میں رو رو کر التجا کرنے لگا۔ آہ ہنری! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم پتھر ہو۔ یہ منظر کس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔

مسٹر ہنری : یہاں سے بیرا تمہارے پاس گیا؟

مسز : پھر وہ کیا کرتا؟

مسٹر : میں نے اس سے کہا تھا کہ اپنے لڑکے کو ڈاکٹر کے پاس بھیجنے کو تیار کرے۔

مسز : اس نے ایک دفعہ پھر مجھے سفارش کرنے پر مجبور کیا۔

مسٹر : (اونچی آواز سے) بیرا بیرا!

مسز : تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

مسٹر : (بغیر پروا کیے) بیرا! بیرا! (میتا آتا ہے)

میتا : سرکار!

ہنری : اُلّو کا بچہ! تم نے پھر میم صاحب سے ہمارا شکایت کیا۔ تُم نے پھر ہمارا کہنا نہیں مانا۔ (ہنری میتا کو مارتا ہے)

مسز : ہنری! ہنری!

میتا : مر گیا۔ مار ڈالا! مار ڈالا۔

ہنری : ہاں ہم تُمہیں مارے گا۔ سچ مچ جان سے مارے گا۔

فلورا : ہنری خدا کے لیے ——

ہنری : ہٹ جاؤ۔

میتا : بچاؤ، خدا کے لیے بچاؤ (ہنری اور مارتا ہے، میتا کے شور و غل کی آواز سن کر کریم آتا ہے۔

کریم : ابا! ابا!
ہنری : ابا کا بچہ ہٹ جاؤ۔
کریم : چھوڑو صاحب
ہنری : یو راسکل
کریم : زبان سنبھالو صاحب
ہنری : تمہارا شامت آیا ہے۔
کریم : نہیں صاحب آپ کی شامت آئی ہے۔
ہنری : تم بدمعاش (مارنے کو بڑھتا ہے کریم ہاتھ پکڑ لیتا ہے) چھوڑو ہمارا ہاتھ۔ چھوڑ۔ ۔ ۔
میتا : کریم کریم!
مسز : خدایا۔
مسٹر : ول اُلّو کا پٹھا! تم ٹھہرو۔ ہمارا بندوق۔
میتا : بھاگ جا کریم۔ بھاگ جا!

(ہنری بندوق اٹھاتا ہے)

مسز : ہنری! ہنری!

(ہنری بندوق چلا دیتا ہے کریم گرتا ہے)

میتا : گولی! کریم! کریم! میرے بچے۔ آہ لہو۔ اللہ! (بیہوش ہو کر گر پڑتا ہے)
مسز : ہنری ہنری! (رقت آمیز لہجے سے) (ہنری کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہے۔ ہنری اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھاتا ہے۔ بندوق کی آواز سن کر چند ملازم داخل ہوتے ہیں۔)
نوکر : حضور کیا ہوا؟ بندوق چلنے کی آواز آئی تھی۔
ہنری : (میتا اور کریم کی طرف اشارہ کر کے) ان دونوں کو لے جانا مانگو۔
نوکر : حضور یہ تو۔
ہنری : بکواس مت کرو۔ جاؤ (نوکر اٹھاتے ہیں)
(دوسرے نوکر سے) تم جانا مانگو۔ ابھی ڈاکٹر یہاں سے گیا ہے۔ اس کو بلا کر لاؤ۔
نوکر : بہت بہتر حضور۔ (سب جاتے ہیں۔ فلورا ہوش میں آتی ہے۔)
ہنری : فلورا!
فلورا : (آنکھیں کھول کر اور کچھ دیر ہنری کا چہرہ دیکھ کر) وہ مر گیا؟

ہنری : میں نہیں جانتا۔
مسز : تم نے اسے مار ڈالا۔ مار ڈالا ہنری؟
مسٹر : اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟
مسز : تم قاتل ہو۔ خدایا۔!
مسٹر : میں تمہارا شوہر ہوں۔
مسز : آہ میں کیا کروں؟
مسٹر : ہوش میں آؤ۔
مسز : ہنری شاید وہ زندہ ہو۔ وہ زخمی ہوا ہو۔ وہ کہاں گیا۔ جاؤ اسے دیکھو۔ شاید وہ بچ سکے۔
مسٹر : کچھ ضرورت نہیں۔
مسز : لہو اس کے سینے سے بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور اس کا باپ ا۔ باپ کی نظروں کے سامنے۔
مسٹر : خلدرا :۔
مسز : خدایا! (ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)
ڈاکٹر : حضور کیا معاملہ ہو گیا؟
مسٹر : ہم نے تم کو باتیں سنانے کو نہیں بُلایا۔
ڈاکٹر : نہیں حضورؑ!
مسٹر : جاؤ بیرا کے لڑکے کو ڈیکھا مانگو۔
ڈاکٹر : مگر حضور!
مسٹر : وہ مر گیا ہے۔
ڈاکٹر : جی وہ تو میں نے پہلا معائنہ کرنے کے بعد ہی کہہ دیا تھا کہ اس کی صحت خراب ہے۔ چند روز کا مہمان ہے۔ مگر حضور وہ مرا کیسے۔
مسٹر : تم آپ ڈیکٹ کر مالم کرو۔
ڈاکٹر : جی میں سمجھ گیا آپ بے فکر رہیے۔
میں ابھی معلوم کیے لیتا ہوں۔
(ڈاکٹر جاتا ہے)
مسز : ہنری۔ میں اندر جاؤں گی۔
مسٹر : کیوں؟

مسٹر : مجھ سے یہاں نہیں بیٹھا جاتا۔ مجھے ڈر ہے یہ زمین پھٹ نہ جائے، ہمیں نگل نہ لے۔

مسز : تم احمق ہو۔

مسٹر : آہ نہیں، مجھے اندر لے جا کر لٹا دو۔

مسٹر : تم خود جا سکتی ہو۔

مسز : میں نہیں چل سکتی۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر : (گھبرا کر) حضور پولیس انسپکٹر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

مسٹر : بھیج دو۔ (نوکر جاتا ہے)

مسز : پولیس! خدایا! کیا ہونے والا ہے۔

(گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے)

مسٹر : تم میں کھڑے ہونے کی طاقت اب کہاں سے آ گئی۔؟

مسز : اب کیا ہوگا! وہ تمہیں پکڑ لیں گے؟

مسٹر : تم اندر جاؤ۔

مسز : خدایا! اندر یہ بندوق بھی یہیں ہے۔

(گھبرا کر) اسے کہاں چھپاؤں!

مسٹر : چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(بندوق لے کر بے اختیار بھاگ جاتی ہے، اسپرنگ والا دروازہ جلدی سے کھلتا اور دھڑ سے بند ہو جاتا ہے، پولیس افسر داخل ہوتا ہے۔)

انسپکٹر : سلام حضور

مسٹر : دل؟

انسپکٹر : حضور ہمیں اطلاع ملی ہے یہاں ابھی کوئی قتل کی واردات ہوئی ہے۔

مسٹر : کس نے اڑا دیا؟

انسپکٹر : میں حضور سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ سچ ہے یا غلط ہے؟

مسٹر : ہاں کوئی قتل نہیں ہوا، کوئی آپ مر گیا ہوگا۔

انسپکٹر : تو حضور یہی فرما دیں۔ کون مر گیا ہے؟

مسٹر : تم جانتا ہم کون ہے؟

انسپکٹر : جی ہاں حضور کلکٹر صاحب ہیں۔
مسٹر : کلکٹر کا کام اِس قسم کی بیہودہ بات کرنا نہیں۔ اُس کا کام تم لوگوں پر حکومت کرنا ہے۔
انسپکٹر : وہ تو درست ہے حضور مگر۔
مسٹر : تم جانتا، ہم تم سے ناراج ہو کر تم کو کتنا نکسان پہنچائے سکتا؟
انسپکٹر : حضور ہی کی عنایت سے ہم لوگ پیٹ پال رہے ہیں۔
مسٹر : پھر سوچ سمجھ کر بات کرو۔
انسپکٹر : تو گویا حضور کو تو معلوم ہی نہیں کہ کیا واقعہ ہوا؟
مسٹر : ول ام نے سنا۔ کوئی نوکر کا لڑکا مرتے مانگتا۔ ہم نے اسی وقت ڈاکٹر بلوایا۔
انسپکٹر : حضور ہی اِس طرح نوکروں کی پرورش کر سکتے ہیں۔
مسٹر : ڈاکٹر اس کو ایگزیمین کر کے ابھی آنا مانگتا ہوگا۔
انسپکٹر : جی ہاں ان سے تمام معاملہ معلوم ہو جائے گا۔
(زمین پر خون دیکھ کر)
مگر یہ خون!
مسٹر : ول؟
انسپکٹر : یہ یہاں خون؟
مسٹر : تم پھر بھول رہا ہے۔ تم کس کا حضو موجود ہے۔
انسپکٹر : نہیں حضور۔
مسٹر : پھر کیا تمارے گدھے کے مانک، سر میں ہماری بابت کچھ شک ہے۔
انسپکٹر : نہیں حضور شک کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو کہتا تھا کہ شاید وہ آج شکار کھیلا ہے حضور نے (ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)
(داخلہ ڈاکٹر صاحب)
کلکٹر : ول؟
ڈاکٹر : جی حضور وہ دیکھ لیا میں نے۔
کلکٹر : پھر
ڈاکٹر : جی ہاں، اُس کا انتقال ہو گیا۔
کلکٹر : کیسے؟
ڈاکٹر : وہ میں نے اچھی طرح غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ——

ڈاکٹر اور انسپکٹر : (مل کر) اس کی تلی پھٹ گئی تھی۔
ڈاکٹر : اوہ انسپکٹر صاحب آپ کو تو الہام ہوا۔
کلکٹر : ول۔ انسپکٹر تم کو کیسے مالم ہوا اس کا تلی پھٹ گیا؟
انسپکٹر : حضور تجربے سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔
کلکٹر : کیسا تجربہ؟
انسپکٹر : وہ حضور جانتے اب کیا بات ہے۔ صاحب بہادر کے نوکر اور لوگ بھی جب کبھی صاحب بہادروں کی کوٹھی پر دم توڑتے ہیں تو مرنے کے بعد ان میں یہی مرض پایا جاتا ہے۔
کلکٹر : ول۔ ول۔ ول۔
انسپکٹر : جی تو۔ اب تو تمام معاملہ مجھے معلوم ہو گیا۔ میں مناسب رپورٹ کر کے رفع دفع کر دوں گا۔
کلکٹر : تم ترقی کرنے والا آدمی مالم ہوتا۔
ڈاکٹر : عنایت ہے حضور کی۔
کلکٹر : تم بھی ہوشیار آدمی۔ ہم تمہارا خیال رکھے گا (رخصت کرنے کے لیے) اچھا۔!
انسپکٹر : سلام حضور۔
ڈاکٹر : سلام حضور۔
(سرگوشیاں کرتے جاتے ہیں۔ اسپرنگ والا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ مسز ہنری آتی ہے۔)
مسٹر : ہاہا۔
مسز : ہنری! پولیس گئی؟
مسٹر : ہاں۔
مسز : وہ کچھ نہ کریں گے؟
مسٹر : وہ کیا کر سکتے تھے؟
مسز : تم محفوظ ہو اب؟
مسٹر : میں کب محفوظ نہیں تھا؟
مسز : اوہ۔ پولیس کے آنے سے میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میری روح کانپ گئی تھی لیکن اب وہ تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ تو میں خوش نہیں ہوں۔
مسٹر : تمہارا کیا مطلب ہے؟
مسز : کاش مجھے معلوم ہوتا۔

مسٹر : تمہارا دماغ پھر گیا ہے۔

(مسٹر ہنری اندر جاتا ہے۔ مسز ہنری بڑھ کر کچھ کہنا چاہتی ہے — مگر رک جاتی ہے اور کرسی پر گر پڑتی ہے۔)

مسز : خدایا! ہم پر رحم کرنا۔

(مسیتا آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے قدموں سے داخل ہوتا ہے)

مسز : (چونک کر کھڑی ہو جاتی ہے) تم! تم! تم مسیتا کی روح ہو؟

مسیتا : میں بے حیا زندہ ہوں میم صاحب!

مسز : (جلدی سے) تم ہم سے بدلہ لینے آیا؟

مسیتا : بدلہ، بے بس بے کس ملازم اور بدلہ؟ نہیں میں مرنے کے لیے آیا ہوں۔

مسز : خدایا۔

مسیتا : میری حضور، یہ لڑکھڑاتی زبان کس طرح تمہارا شکریہ ادا کرے۔

مسز : (سر موڑ کر) کچھ مت بولو، چلا جاؤ، !

مسیتا : میں جانے ہی کے لیے آیا ہوں۔ میں تمام ہو چکا ہوں۔ میری حضور میں مر چکا ہوں۔ میری روح صرف چند لفظ کہنے کے لیے بے قرار ہے، انہیں کہے بغیر بڑے دکھ سے نکلے گی۔

مسز : کیا؟

مسیتا : صاحب کہاں ہے؟

مسز : کیوں؟ تم اس کو بد دعا دے گا؟ نہیں، نہیں وہ ہمارا صاحب ہے، ہمارا بچوں کا باپ ہے۔ اس کو بخش دو۔ اس کا لیے دعا کرو۔

مسیتا : بخش دوں، بڑی کڑی بات ہے۔

مسز : ہمارا کھاطر سے۔ تھوڑا دیر پہلے ہم تمارا سپارش اس سے کرتا۔ وہ نائیں مانا۔ اب اس کا سپارش ہم تم سے کرتا۔ تم مانو اپنا بڑائی دکھاؤ مسیتا۔

مسیتا : میری حضور، آؤ، میرے گھٹنے زمین سے ٹیک دو۔ میں اس کے لیے خدا سے دعا کرتا ہوں۔

(گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔ اسپرنگ والا دروازہ کھل کر دھڑ سے بند ہوتا ہے)

مسٹر : یہ کیا ہو رہا ہے فلورا؟

مسیتا : آہ وہ رہا۔ وہ رہا۔ میم صاحب میرے بچے کا قاتل، میرے جگر گوشے کا قاتل۔ میرا قاتل۔ تو زندہ موجود ہے! میرے سامنے جیتا جاگتا کھڑا ہے؟ خدایا تیری بے آواز لاٹھی۔۔۔ ۔۔

مسز : مسیتا! مسیتا!

میتا: (یک لخت رُک کر) کچھ نہیں۔ میری زبان بند ہے میم صاحب، میری زبان بند ہے۔ میں نے اسے بخش دیا۔ کرہائے نہیں! نہیں۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ جی۔ اور غریبوں کے دل توڑ۔ اور اُن کی تقدیریں پھوڑ۔ کوئی کچھ کہنے والا نہیں کوئی کچھ پوچھنے والا نہیں۔ آسمان ہنستا ہے تو ہنسنے دے۔ زمین رزق سب تو روشنے دے۔ آج زمین اور آسمان تیرے ہیں۔ مگر کل! میرے اللہ کل! خدایا لوٹے ہوئے دلوں کی نیدگی۔ نہیں میم صاحب مت گھبرائیے۔ میں تو مر رہا ہوں۔ میری تو جان نکل رہی ہے۔ ان باتوں سے کیا۔ جانے دو۔ میں نے بھلا دیا۔ بخش دیا۔ خدا بخشنے والا ہے۔ اللہ! میرے اللہ

گر پڑتا ہے۔ فلورا اس کے قریب بیٹھ کر اس کے دل کی حرکت دیکھتی ہے اور شدتِ الم سے سر جھکا لیتی ہے۔ ہنری اپنا پائپ سلگاتا ہے اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا دھواں اُڑاتا ہے۔ فلورا المناک نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر کہتی ہے۔

مسز: ظالم۔ قاتل! خدا تجھ کو بخشے۔

——— پردہ ———

مذاکرہ

اُردو افسانہ کے مسائل

حصّہ لینے والے: سیّد وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، میرزا ادیب،
انتظار حسین، اعجاز حسین بٹالوی، ڈاکٹر احراز نقوی، انور سجاد،
ڈاکٹر میمونہ انصاری، محمد طفیل!

طفیل: میں سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور غریب خانہ پر تشریف لائے۔
دوسرے یہ کہ جہاں دو چار دوست اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہاں وہ آپس میں باتیں بھی ضرور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم بھی اِدھر اُدھر کے مسائل پر باتیں کریں گے۔ بجائے اِدھر اُدھر کے مسائل پر باتیں کرنے کے کیا ہی اچھا ہو کہ آج ہماری گفتگو کا موضوع اُردو افسانہ ہو۔ جیسا کہ میں نے بعض دوستوں کو بذریعہ خط مطلع بھی کیا تھا۔
ویسے تو یہ بات کل کی معلوم ہوتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اُس بات کو پندرہ برس گزر گئے ہیں کہ جب اسی طرح کچھ دوست اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے اُردو افسانہ پر باتیں کی تھیں۔ اُس محفل میں سعادت حسن منٹو بھی تھے اور شوکت تھانوی بھی افسوس کہ وہ آج ہم میں موجود نہیں۔ اس تکلیف دہ پہلو کے ساتھ مقامِ شکر یہ ہے کہ اُس محفل کے بہت سے دوست آج اس محفل میں بھی موجود ہیں جن میں سید وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور اور انتظار حسین ہیں اور ان کے ساتھ آج کچھ دوسرے احباب بھی موجود ہیں۔ جن میں میرزا ادیب، ڈاکٹر احراز نقوی، اعجاز حسین بٹالوی، ڈاکٹر میمونہ انصاری اور انور سجاد ہیں۔
جو باتیں تقریباً پندرہ برس پہلے ہوئی تھیں۔ اُن میں بڑی حد تک اُردو افسانے کی تاریخ آ گئی تھی اور اس کے ساتھ کئی چھوٹے بڑے افسانہ نویسوں کے فن کا جائزہ لیا گیا تھا۔ آج جو ہم باتیں کریں۔ وہ اگر اس سے ہٹ کر ہوں تو بڑا اچھا ہو۔
آج جو دوست یہاں جمع ہیں۔ ان کی سوچوں میں "اپنا پن" ہے اور یہ بھی ہے کہ یہاں بزرگ بھی موجود ہیں اور نوجوان لکھنے والے بھی، لہٰذا کسی بھی طبقہ کی حق تلفی نہ ہوگی۔ بشرطیکہ ہم نے حوصلے سے کام لیا۔
میرا خیال ہے کہ آج ہم اپنی گفتگو کو زیادہ نہ پھیلائیں بلکہ صرف اتنا ہی سوچیں کہ کیا قیامِ پاکستان کے بعد اُردو افسانہ نے ترقی کی؟ دوسرے یہ کہ کیا علامتی افسانہ نگاری مفید ہے یا غیر مفید؟ تیسرے یہ کہ کیا کچھ نئے افسانہ نگار ایسے بھی اُبھرے ہیں جنھیں ہم مستقبل کا افسانہ نگار کہہ سکیں؟
ویسے تو ان میں سے ایک مسئلہ بھی طولِ کلام کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ مگر ہمیں چاہیئے کہ مختصراً اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں اور اِدھر اُدھر نہ جھانکیں۔ آپ چاہیں تو بے شک اِدھر اُدھر بھی نکل جائیں لیکن موضوع اردو افسانہ ہی ہونا چاہیئے۔

میرے نزدیک آج کی گفتگو بڑی اہم ہے۔ نہ صرف اہم ہے بلکہ کسی حد تک سنگین بھی ہو سکتی ہے۔ حوصلے سے کام لیا تو اچھا، بے حوصلہ ہوئے تو سنگین! اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی صاحبِ تدبیر دوست، اس چھوٹی سی نشست کی صدارت قبول کر لیں۔ میرے خیال میں وقار صاحب بہت موزوں رہیں گے۔

وقار: ابھی میرے دوست طفیل صاحب نے ۶۵ء کے مذاکرے کا ذکر کیا۔ اس طرح ہم تقریباً پندرہ سال بعد یکجا ہوئے ہیں۔ پچھلی مرتبہ اس مجلس میں جو ادیب شریک تھے، بھائی اور بہنیں ان میں سے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، خدیجہ مستور اور طفیل صاحب آج بھی شریکِ محفل ہیں۔ میرزا ادیب، ڈاکٹر احراز نقوی، اعجاز حسین بٹالوی، انور سجاد، میمونہ انصاری مجلسِ مذاکرہ کے لئے نئے ہیں۔ جیسا کہ طفیل صاحب نے فرمایا کہ گفتگو کا موضوع اہم ہے اور اہم ہونے کے ساتھ ساتھ سنگین بھی، لیکن میری ناچیز رائے میں اس کی اہمیت تو مسلّم، لیکن سنگین سمجھنا شاید ضروری نہیں۔ گفتگو کے آغاز سے پہلے بعض باتوں کا اظہار ضروری ہے۔ ان میں سے ایک بات ہم سب کے لئے رنج کی ہے۔ ۶۵ء کے مذاکرے میں شریک ہونے والوں میں سے دو آج ہم میں موجود نہیں۔ منٹو مرحوم اور شوکت تھانوی مرحوم۔ بعض افسانہ نگار ایسے ہیں جو پندرہ سال کی مدت میں ہم سے بچھڑ گئے۔ ان جانے والوں نے ادب اور افسانے کو آگے بڑھانے میں جو حصہ لیا اس کے لئے ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت اور محبت پیش کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں ان دو دوستوں کے علاوہ جو نام آ رہے ہیں وہ نیاز فتح پوری، سدرشن، محمد علی ردولوی اور رفیق حسین ہیں۔ یہ افسانہ نگار ہم سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے بلاشبہ لکھنے والوں کو بعض نئی راہیں دکھائیں۔ ہماری دعا ہے کہ آنے والا ان کی چھوڑی ہوئی نشانیوں کی صحیح قدر متعین کرے۔ پچھلے مذاکرے میں بعض باتیں ایسی ہوئیں جنہیں افسانہ نگاری کی تاریخ میں مسلّمہ حقیقت سمجھا جاتا۔ ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ ہم پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ نئی تحقیق کے مطابق پریم چند نہیں بلکہ سجاد حیدر یلدرم پہلے افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۰۰ء میں "معارف" میں چھپا۔ دوسری بات یہ کہ پچھلے مذاکرے میں ہم نے یہ نام نہیں لیا تھا۔ لیکن افسانے کا باقاعدگی سے مطالعہ ہو تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں اس فہرست میں بعض اور ناموں کا اضافہ کرنا چاہیے، مثلاً فیض محمود اور شمس آغا۔

اس ابتدائی گفتگو کے بعد میں آپ کی توجہ ان موضوعات کی طرف مبذول کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو طفیل صاحب نے بتائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہم ان موضوعات پر گفتگو کریں گے تو گفتگو کے دوران میں اور باتیں آئیں گی۔ لیکن اس وقت تو ہمیں اپنی بات انہیں سوالوں سے شروع کرنی چاہیے۔ خواتین و حضرات! انتظار میرے برابر میں بیٹھے ہیں میں سب سے پہلے انہیں سے گزارش کروں گا کہ وہ بسم اللہ کریں۔

انتظار: نہیں پہلے قاسمی صاحب!

وقار: بات تو بہرحال کسی صاحب کو شروع کرنی ہی ہے، انتظار صاحب یا ندیم صاحب۔ لیکن گفتگو شروع کرنے سے پہلے شاید سوالوں کا اعادہ ضروری ہے۔ پہلا سوال طفیل صاحب کا یہ ہے کہ پندرہ سال کی مدت میں ہمارا افسانہ کچھ آگے بڑھا ہے یا اسی جگہ ٹھہرا ہوا ہے یا اس میں انحطاط رونما ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس دور میں بہت سے بعض علامتی افسانے لکھے گئے۔

باتیں سیدھے سادے انداز میں کہے جانے کے بجائے ذرا گھما پھرا کر کہی گئیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اور اس روش کا ہمارے افسانے پر اچھا اثر پڑا یا بُرا؟ اور پھر یہ کہ اس وقت جو افسانہ نگار لکھ رہے ہیں جسے ہم لکھنے والوں کی نئی پود کہتے ہیں۔ ان کے کارناموں کو دیکھ کر کیا ہم اس کے مستقبل کے متعلق کوئی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ یہ باتیں ہیں جو گفتگو کا بنیادی موضوع ہیں۔ ضمنی طور پر بعض اور چیزوں پر بھی گفتگو ہوگی۔ مثلاً ایک بات جو ہمارے سامنے کی ہے یہ ہے کہ پندرہ سال پہلے جو لکھنے والے لکھ رہے تھے ان میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ جو اب نہیں لکھ رہے اور بہت سے ایسے ہیں جن کے نام پچھلے پندرہ برس کی مدت میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں ان کا ذکر آئے گا لیکن میں گزارش کروں گا کہ اگر کسی دوست کا نام نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہم نے اس نام کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ سرسری گفتگو میں بعض اوقات اہم نام بھی رہ جاتے ہیں۔ اس لئے جب یہ مذاکرہ چھپے اور اسے کوئی ایسے صاحب پڑھیں جو افسانہ نگار ہیں اور ان کا نام گفتگو کے دوران میں نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جی ہاں! تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت جو افسانہ نگار لکھ رہے تھے اور اب بالکل نہیں لکھ رہے ان میں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کے افسانہ نگار شامل ہیں۔ یہاں احمد علی اس زمانے میں بھی کم لکھ رہے تھے اور اب لکھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ عزیز احمد نے اس زمانے میں کئی اچھے افسانے لکھے۔ اب لکھنا بالکل بند کر دیا ہے۔ اسی طرح حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی، حسن عسکری، شفیق الرحمٰن، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، اے حمید، اشفاق احمد بھی اب نہ لکھنے والوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ تسنیم سلیم چھتاری، جیلانی بانو، غلام علی چودھری، ممتاز مفتی، میرزا ادیب، غلام عباس، قدرت اللہ شہاب اور جمیلہ ہاشمی نے بھی عرصے سے کچھ نہیں لکھا۔ بعض صاحبان ایسے ہیں کہ وہ پچاس سال پہلے سے لکھ رہے ہیں اور اب تک لکھ رہے ہیں۔ ایسے دو نام میرے ذہن میں ہیں، ایک کوثر چاندپوری اور دوسرے علی عباس حسینی۔ وہ اب بھی تھکے نہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور اس کی قدر و قیمت ان کے پچھلے کارناموں کے مقابلے میں کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علی عباس حسینی کی اِکا دُکا چیزیں اب بھی ایسی آجاتی ہیں جن میں وہی پہلے کی سی تازگی اور شگفتگی اور حسنِ بیان ہے۔ اس وقت ہم نے بعض ایسے افسانہ نگاروں کا ذکر کیا تھا جن کے متعلق ہمیں یقین تھا کہ وہ ہمارے مستقبل کے رہنما بنیں گے۔ احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، بلونت سنگھ، ابوالفضل صدیقی، قرۃ العین حیدر اور قدرت اللہ شہاب وغیرہ کا شمار ایسے لکھنے والوں میں ہے۔ کچھ لکھنے والے ایسے ہیں جنھوں نے چند سال پہلے لکھنا شروع کیا اور بہت جلد اپنے لئے مقام پیدا کر لیا۔ ان میں صادق حسین، جیلانی بانو، واجدہ تبسم اور انور عظیم خاص طور سے اہم ہیں اور ایسے لکھنے والے تو بے شمار ہیں جنھوں نے چند سال پہلے لکھنا شروع کیا اور ان کا کام ابھی جاری ہے اور جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اسے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ وہ افسانے کو ابھی بہت کچھ دیں گے۔ یہ نام ایسے ہیں کہ ان کی موجودگی میں افسانے کو انحطاط پذیر کہنا بڑی ناانصافی کی بات ہے — یہ بات البتہ درست ہے کہ اس نے اپنی راہیں بدلی ہیں — میری اس طویل سمع خراشی کے بعد اب شاید انتظار صاحب کچھ فرمانے میں تامل نہ کریں۔

طفیل: آپ مانیں یا نہ مانیں انحطاط اس معنی میں تو ہے کہ نئے لکھنے والوں میں ہمیں اتنا قدآور افسانہ نگار اور کوئی نظر نہیں آتا جیسے

کرشن چندر، منٹو اور بیدی تھے - انہوں نے تو پہلے ہی چند افسانوں سے چونکا دیا تھا دنیا کو - آج بھی اگر آپ بڑے افسانوں کی فہرست بنائیں گے تو ان میں انہی لوگوں کے افسانے آئیں گے - اس اعتبار سے کچھ یوں گمان گزرتا ہے کہ ہمارے افسانے میں انحطاط ہوا ہے - بات آگے نہیں چلی -

انتظار : بات آگے کیسے چلے - آپ جو راستے میں کھڑے ہیں - (قہقہہ)

وقار : طفیل صاحب! فرض کیجئے کہ کوئی افسانہ نگار آٹھ سال سے لکھ رہا ہے اس کے افسانوں کا ارتقائی جائزہ لیجیے - اس نے جو کچھ پہلے سال لکھا، اس سے بہتر دوسرے سال اور اس سے بہتر تیسرے اور چوتھے اور پانچویں سال اور اس کی تحریروں میں جدت بھی ہے، شگفتگی بھی ہے، اس نے برابر زندگی سے اپنا تعلق بھی قائم رکھا ہے تو اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ ترقی کا راستہ بند ہو گیا یا مسدود ہو گیا - میرے نزدیک ان نئے لکھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے، جن کے بعض افسانوں کو آپ ان کے زیادہ پختہ کار اور محبوب معاصرین کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں - مثلاً میں صادق حسین صاحب کا نام لیتا ہوں - ان کے بعض افسانے مثلاً کلیوں کی پکار اور سپوچیاں واقعی ایسے افسانے ہیں جنہیں بہت اچھے افسانوں کی صف میں رکھ سکتے ہیں یا انتظار حسین نے بھی بعض چیزیں ایسی لکھی ہیں اور ان دونوں افسانہ نگاروں کا قلم ابھی تھکا نہیں - اسی طرح کے بعض نام اور بھی ہیں، اس لئے جو کچھ آپ نے فرمایا میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں -

طفیل : میں اس معیار کی بات کرتا ہوں جو کرشن چندر، منٹو اور بیدی نے قائم کیا تھا - بیدی اور کرشن چندر آج بھی اسی فن کا اندازہ میں لکھ رہے ہیں - نئے لکھنے والے ان سے بہتر نہیں لکھ رہے - بلکہ ان کے آس پاس بھی نظر نہیں آتے -

وقار : بات شاید اس طرح آگے بڑھے کہ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ نئے لکھنے والے کیا اسی انداز کے افسانے لکھ رہے ہیں جیسے وہ لوگ لکھ رہے تھے جن کے نام آپ لے رہے ہیں - اگر انداز میں فرق ہوا ہے، سوچنے کے انداز میں اور جو کچھ انہوں نے سوچا ہے اسے پیش کرنے کے انداز میں، فن اور اسلوب میں - اگر یہ چیزیں بدلی ہیں تو ہم دونوں کو برابر برابر رکھ کر نہیں دیکھ سکتے - نئے افسانوں کو اسی خاص اندازِ فکر اور اندازِ بیان کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے -

طفیل : کیا ان کی تکنیک، کیا ان کا اسلوب، کیا ان کے سوچنے کا انداز اب ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے ؟

وقار : یہ ایک سوال ہے جو آپ نے اٹھایا ہے - اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب افسانہ نگار بہتر طریق پر دے سکیں گے - جو چیزیں ہمارے لئے نظریاتی بحث کی حیثیت رکھتی ہیں وہ ان کا عملی تجربہ ہے -

اعجاز : ہاں انتظار صاحب!

وقار : جی ہاں سوچ رہے ہیں انتظار صاحب کچھ -

اعجاز : SERIOUS SITUATION بڑی معلوم ہوتی ہے - وہ سوچتے ہی چلے جا رہے ہیں -

انتظار : صاحب چائے آگئی کیا کیا جائے ؟ میرے خیال سے پہلے چائے پی جائے -

اعجاز : چائے جی پیجئے، باتیں بھی کیجئے - لیکن بیٹھ کرنے سے پہلے بیٹھ کر لیجئے کہ ترقی کا معیار اور مطلب کیا ہے آخر -

طفیل : ترقی کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ پہلے سے آگے بڑھا ہے یا نہیں ۔ فن اور اسلوب کے اعتبار سے ۔ مسائل کے اعتبار سے !

وقار : معیار زمانے کے ساتھ بدلتا ہے ۔ افسانے میں نئے موضوع آتے ہیں اور موضوع کے ساتھ نئے اسالیب داخل ہوتے ہیں ، اس لئے کل کا معیار آج کا معیار نہیں ہو سکتا ۔

انتظار : صاحب ترقی کا لفظ آپ نے اقتصادیات کی دنیا کا لیا ہے اور جس طریقے سے ہم چیزوں کو وہاں ناپتے ہیں ، جیسا کہ اعجاز صاحب نے ابھی کہا ، ہم ادب کو بھی اسی گز سے ناپنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ خدانخواستہ میں آپ سے پوچھ لوں کہ غالب کے بعد شاعروں نے کتنی ترقی کی ہے تو آپ اس کا جواب کیا دیں گے کہ غالب سے بڑے شاعر ابھی تک موجود ہیں یا یہ کہ غالب کے بعد شاعری تنزل پذیر ہوئی ہے ۔ میرے خیال میں یہ اصطلاحیں ترقی اور تنزل کی ، ادب کے سلسلے میں کچھ زیادہ RELE-VANT نہیں ہیں ۔

اعجاز : لیکن انتظار صاحب تنزل کی اصطلاح جو ہے وہ DECAY کے لفظ کی صورت میں انگریزی تنقید میں بھی موجود ہے اور اُردو تنقید میں بھی ایک باقاعدہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتی ہے ۔ اسی ڈیکیڈنس کا لفظ ہے جو انگریزی کی اصطلاح ہے ، اسے اُردو کے نقادوں نے بھی اختیار کر لیا ہے ۔

انتظار : پتا نہیں اس کا ترجمہ آپ تنزل کریں گے یا کچھ اور ؟

اعجاز : ڈیکیڈنس کا ایک مطلب وہی ہے جو تنزل کے لفظ سے ادا ہوتا ہے ۔ لیکن اس لفظ کے ذریعے ایک مخصوص رجحان کا تعین کیا گیا ہے ۔ اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ ادب زوال پذیر ہے ۔

ندیم : تو پھر ڈیکیڈنس کو کیا کہیں گے ہم ؟

اعجاز : یہی تو میں عرض کر رہا ہوں ۔ انحطاط ترجمہ ہے ڈیکیڈنس کا ۔ ولایت والے اکثر کہتے ہیں کہ آج کل تو انگریزی ادب کا ڈیکیڈنس ہو رہا ہے ۔ اور اس سے ان کی مراد زوال یا انحطاط ہے ۔

انتظار : ڈیکیڈنس میں یہ مفہوم پوشیدہ نہیں کہ ادب تنزل کر رہا ہے ۔ بلکہ اس میں ایک مخصوص امکان یا پاسبلٹی ہے جس کا اس اصطلاح کے ذریعے سے تعین کیا گیا ہے ۔

ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ طفیل صاحب نے کہا ہے کہ جو مرتبہ ہمارے پہلے افسانہ نگاروں کو حاصل تھا اس مرتبے کو آج کا کوئی افسانہ نگار نہیں پہنچا اور یہ بھی کہ پرانے لکھنے والے اسی طریقے سے لکھتے چلے جا رہے ہیں ۔ کرشن چندر کے بارے میں یہ رائے ہے کہ اسی طرح لکھ رہے ہیں ۔ میرے نزدیک ان کے بارے میں یہ کوئی اچھی رائے نہیں ۔ اس بیان سے کہ کرشن چندر پچیس سال یا تیس سال پہلے جس طرح لکھ رہے تھے اب تک لکھتے چلے جا رہے ہیں ۔ ان کی تعریف کا پہلو نہیں نکلتا ۔ اسی طرح ادب کے کسی معقول قاری سے کہا جائے کہ صاحب عصمت چغتائی اب بھی اپنی پرانی ڈگر پہ چل رہی ہیں تو یہ رائے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں ہے ۔

اعجاز : ایسے حالات میں کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ترقی نہیں کی ۔

انتظار: ایک بات یہ ہے طفیل صاحب جو ان معنوں میں سوچ رہے ہیں کہ ان کا جو امیج بنا تھا یعنی عصمت چغتائی کا اور راجندر سنگھ بیدی کا اور سعادت حسن منٹو کا، وہ بہت بڑا تھا اور اس وقت کسی لکھنے والے کا امیج ویسا نہیں ہے تو اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اس میں ادب کے معیارات اتنے زیادہ INVOLVE نہیں ہوتے، بلکہ یہ مسئلہ تاریخی SITUATIONS کا بن جاتا ہے کہ ایک مخصوص تاریخی صورت حال میں لکھنے والے کا امیج کچھ بڑا بن جاتا ہے۔ بعض تاریخی صورت حال ایسی ہوتی ہیں کہ اس میں امیج (IMAGE) بلڈ اپ (BUILD UP) نہیں ہونے پاتا۔ لیکن یہ عام تحریر کا مسئلہ ہے۔ جب نقاد اور سوچ سمجھ کر لکھنے والے لوگ لکھتے ہیں تو ان کا امیج (IMAGE) لکھنے والے کے اور پبلک امیج کے حوالے سے نہیں ہوتا۔ یہ لوگ فن کے معیارات کے حوالے سے فن کا جائزہ لیتے ہیں ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ کرشن چندر کا امیج کتنا بڑا تھا اور اب کسی لکھنے والے کا وہ امیج ہے یا نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہونا چاہیے کہ فن کے جو معیارات ہیں اور افسانہ نگاری کے جو تقاضے ہیں، اس کے لحاظ سے ان کا فن اور ان کا افسانہ کہاں سٹینڈ (STAND) کرتا ہے۔ ان کے حوالے سے ہمیں بتانا ہے کہ وہ کون سی بنیادیں ہیں اور کون سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے کرشن چندر بڑے افسانہ نگار ہیں اور آج کا کوئی لکھنے والا بڑا افسانہ نگار نہیں ہے۔ جب آپ یہ بنیادیں طے کر دیں گے تو پھر ہم کچھ کہنے کے قابل ہو سکیں گے۔

وقار: اب معاملہ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ سنگین بھی ہو رہا ہے (قہقہہ)

طفیل: میری مراد انداز سے نہیں۔ معیار سے ہے۔ وہ بھی موجودہ افسانوی نقادوں کے مطابق معیار سے۔ اپنے موجودہ قومی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی موجودگی میں معیار سے اور ——

ادیب: پھر یہ کہ بڑے ادیب جو ہوتے ہیں وہ تاریخی قوتوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو تاریخی قوتیں ہیں، وہ ایک ریڈر، ایک مصنف کا امیج نہیں بناتیں بلکہ مصنف جو ہوتا ہے وہ ان کو اپنی گرفت میں لے کر اپنا امیج بناتا ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد بڑے افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے کیا اب بھی وہ بڑے افسانہ نگار سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انہوں نے اس زمانے میں تاریخی قوتوں کو اپنی گرفت میں لے کر فنکارانہ اظہار کا ایک خاص انداز اختیار کیا تو اب بھی وہ وقت کے ساتھ چل سکتے ہیں اور ہیئت اور مواد کے اعتبار سے وہی جدت پیدا کر سکتے ہیں جو اس وقت انہوں نے پیدا کی تھی جب ان کا امیج قائم ہوا تھا۔ جب اس وقت ان کا امیج قائم ہو سکتا ہے تو آج ان کا امیج کیوں نہیں قائم ہو سکتا۔

خدیجہ: کیا اب بھی وہی حالات ہیں۔

ادیب: یقیناً وہی ہیں۔ صاحب! مسائل چونکہ بدلتے رہتے ہیں اس لئے اس کے ساتھ IMAGE بھی بدلتا رہتا ہے، اور تاریخی قوتیں بدلتی رہتی ہیں۔ چونکہ انھوں نے اس زمانے میں اپنے شعور کے اعتبار سے ایک خاص امیج قائم کرنے میں مدد دی تھی یا تاریخی قوتوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا، یہ تو ہو سکتا ہے کہ تمام افسانہ نگاروں کے معاملے میں یہ بات درست نہ ہو، لیکن بعض افسانہ نگاروں کے معاملے میں وہ آج بھی درست ہے۔ وہ اسی انداز سے مسائل کو ساتھ لے کر اپنا امیج قائم کر رہے ہیں۔

وقار: اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ کسی افسانہ نگار، کسی ادیب یا فن کار کے متعلق آپ گفتگو کر رہے ہیں تو یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ اس نے اپنے زمانے کے حالات کے حوالے سے بعض چیزیں لکھیں اور اس کی شخصیت کی ایک تصویر ہمارے ذہن میں بن گئی، لیکن دیکھنا اور سوچنا یہ ہے کہ جس افسانہ نگار نے آج سے بیس برس پہلے کے حالات کو اپنی شخصیت کے رنگ میں رنگ کر افسانے کی تشکیل دے دی۔ کیا آج بھی وہ اسی فنی عمل میں مصروف ہے اور کیا آج بھی وہ اس کی اہمیت رکھتا ہے کہ جو کام وہ بیس برس پہلے کر سکتا تھا آج بھی اسے اسی طرح انجام دے سکے گا؟

ادیب: وقار صاحب! میں نے عرض کیا تھا کہ تمام افسانہ نگاروں کے سلسلے میں یہ بات نہیں کہتا، لیکن بعض افسانہ نگار جب افسانہ لکھتے ہیں تو ان میں وہی جوش، وہی جدت پائی جاتی ہے جو اس زمانے میں تھی۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی یا ممتاز مفتی جب لکھتے ہیں تو ان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ وہ آج بھی اسی نقطۂ نظر سے زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں اسی طرح غلام عباس ہیں کہ جب وہ افسانہ لکھتے ہیں تو ان کا وہی دھیما دھیما انداز آج بھی بروئے کار آتا ہے۔ یا عصمت چغتائی کو لیجئے۔ پچھلے دنوں میں نے ان کا ایک افسانہ پڑھا تھا جو ہندی میں ترجمہ ہوا تھا میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت اچھا افسانہ تھا۔ وہ "چوتھی کا جوڑا" جیسا افسانہ تھا۔ وہ افسانہ تو بہت پرانا ہے لیکن اب بھی انہوں نے اسی قسم کا ایک افسانہ لکھا ہے۔ بیدی کا پچھلے دنوں ایک افسانہ چھپا تھا۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو"۔ وہ تو نہایت اچھا افسانہ ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ ہے۔ مجھے نام یاد نہیں آ رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی بڑا اچھا افسانہ ہے۔

وقار: مرزا صاحب! آپ نے سب سے پہلے ندیم صاحب کا نام لیا، جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں طفیل صاحب اور جہاں سے وہ بات شروع کرنا چاہتے ہیں اور جس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس وقت افسانہ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ تو ندیم صاحب کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ وہ زمانہ ان کے عروج کا زمانہ نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عروج کی طرف وہ آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ باقی جن لوگوں کے نام لئے گئے اور جن کا آپ نے بھی نام لیا ان کے بہت اچھے افسانوں کا تصور کریں تو ہم انھیں آسانی سے انگلیوں پر گن لیں گے۔ پندرہ سال کی مدت میں ان کی ساری کائنات سات آٹھ افسانوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگر یہ پرانے افسانہ نگار جنھیں ہم آج بھی اپنا سمجھنے پر اصرار کر رہے ہیں صرف آٹھ دس ایسے افسانے لکھ سکے جنھیں ہم اچھا، یا بہت اچھا کہیں تو ان افسانہ نگاروں کی وہ امیج جو بیس سال پہلے تھی میری نظر میں ہلکی، اور دھندلی ہو جاتی ہے۔

ادیب: یہاں ایک تذبذب سا پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا عصمت چغتائی، منٹو کے چند افسانے اور بیدی کے چند افسانے ہماری کل کائنات ہیں؟ یا یہ ــــ

وقار: جی نہیں! میں جو کچھ عرض کر رہا تھا وہ یہ ہے کہ چند سال پہلے ایک ساتھ بیٹھ کر ہم نے افسانے کے متعلق تفصیل سے بات کی تھی اور اس گفتگو کے بعد اپنے افسانے کی ایک تصویر ہمارے ذہن میں آئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ جو تصویر آج ہم پچھلے پندرہ سال کے افسانوں پر نظر ڈال کر بناتے ہیں کیا وہ تصویر واقعی اتنی ہی شاندار ہے اور فن کے اعتبار سے، یا اپنے تاثر کے اعتبار سے ویسی ہی وزنی ہے اور اہم ہے جیسی کہ وہ اس زمانے میں ہمیں نظر آئی تھی؟

طفیل: میرا جواب تو اثبات میں ہے۔ مثلاً بیدی کا جو فن ہے، میں سمجھتا ہوں پہلے سے زیادہ انہی پندرہ برسوں میں نکھرا ہے۔ آپ چاہیں تو کرشن چندر کو چھوڑ سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے شاید اُتنے اچھے افسانے نہیں لکھے جیسا کہ تقسیم سے قبل لکھے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اس عرصے میں بہت زیادہ لکھا۔ ان کے اس عرصے کے افسانوی مجموعے "دیوانِ میر" بن گئے ہیں دیوانِ میر ان معنوں میں کہ میر کے ہاں بھی اچھا شعر نکالنے کے لئے غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ ان کے ہاں بھی غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود نہ کوئی میر کی عظمت سے انکار کر سکا اور نہ ہی کوئی کرشن چندر کی عظمت سے انکار کر سکے گا۔ اس لئے کہ ایسی غوطہ زنی میں پھر جو کچھ ہاتھ آتا ہے وہ انمول ہوتا ہے۔ لیکن ندیم صاحب کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اسی عرصے میں زیادہ اچھے افسانے لکھے۔ قرۃ العین حیدر نے بھی اسی عرصے میں زیادہ اچھے افسانے لکھے۔

وقار: اس بات سے سب کو اتفاق ہوگا۔

طفیل: منٹو کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پارٹیشن سے پہلے کے مقابلے میں انہوں نے بعد میں زیادہ سوجھ بوجھ کے ساتھ لکھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے پرانے دور سے اس دور میں زیادہ بہتر افسانہ نگار ثابت ہوئے۔ ہم عصمت کے افسانے 'چوتھی کا جوڑا' کی بار بار مثال دے رہے ہیں۔ وہ بھی تو اسی دور کا افسانہ ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ عصمت کے اس افسانے کے ساتھ "ننھی کی نانی" کو بھی نہ بھولیں تو گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ عصمت کا فن بھی اسی دور میں زیادہ چمکا۔

وقار: "چوتھی کا جوڑا" کا ذکر ہم بار بار اصل میں اس لئے کرتے ہیں کہ عصمت کے اس افسانے میں اس کے پرانے رنگ کی کچھ جھلک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ان کے تقسیم سے پہلے والے افسانوں کے درجے کا افسانہ ہے۔

طفیل: میری گزارش ہے کہ ہم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ضرور کریں۔ لیکن ہٹ کر کے نہ سمجھیں کہ پرانے افسانہ نگاروں کی خوبیوں کو بھی تسلیم نہ کریں گے۔

وقار: یہ ابھی طے نہیں کیا۔

(قہقہہ)

ندیم: میرے خیال میں انتظار حسین صاحب نے جو سوال اٹھایا تھا اس کو اب تک صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں گیا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ کرشن چندر اور بیدی کا جو امیج بن چکا تھا کیا وہ امیج اب بھی اسی طرح قائم ہے اور کیا آج کا کوئی افسانہ نگار بھی ایسا نہیں جس نے ایک بھی ایسا افسانہ لکھا ہو جسے ہم ان افسانہ نگاروں کے اس زمانے کے افسانوں کے مقابلے میں رکھ سکیں

طفیل: یہاں ایک آدھ افسانے کی بات نہیں ہو رہی۔ ہم تو مجموعی حیثیت سے بات کر رہے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ مجموعی حیثیت سے ابھی تک پرانے لکھنے والوں نے ہی اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ان پندرہ برسوں میں جو کچھ اچھا لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر انہیں افسانہ نگاروں نے لکھا ہے۔ میں نئے افسانہ نگاروں کی صلاحیتوں کا منکر نہیں۔ مگر وہ چھا جانے والی بات نظر نہیں آتی۔

وقار: میں سمجھتا ہوں کہ یہ اختلاف رائے والی بات ہے۔ بیدی کے اس دور کے کسی افسانے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ان کے بیس برس کے لکھے ہوئے افسانوں میں سب سے اچھا ہے، شاید درست نہ ہو ممکن ہے بعض صاحبان آپ سے اتفاق کریں لیکن میری ذاتی

رائے یہ ہے کہ پچھلے پندرہ برس میں ہمارے افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے ہیں جن کا فنی مقام کسی طرح بیدی، عصمت منٹو وغیرہ کے افسانوں سے کم نہیں۔ احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور صادق حسین کے بعض افسانے پڑھ کر یقین ہے کہ آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔

انتظار: ایک بات میں عرض کروں آپ سے کہ جب ہم تقسیم سے پہلے عصمت چغتائی، منٹو اور کرشن چندر وغیرہ کے متعلق رائے دیتے ہیں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ افسانے اس عہد کے تقاضوں کا عکس ہیں۔ اور چونکہ یہ افسانہ نگار اس عہد کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس بنا پر یہ لوگ بڑے افسانہ نگار ہیں۔ میرے نزدیک سوال یوں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ اچھا لکھ رہے ہیں یا برا لکھ رہے ہیں۔ البتہ ہم عہد کے حوالے سے ان کی قدر و قیمت کا تعین کر سکتے ہیں۔ آپ ہمیں یہ تو بتائیں کہ انہوں نے اچھے افسانے لکھے ہیں یا برے۔ مثلاً عصمت چغتائی نے ان پندرہ سال کے عرصے میں اچھے افسانے لکھے یا نہیں لکھے۔ آپ تو ہمیں یہ بتلایئے یہ پندرہ سال کا عرصہ کس قسم کا عہد ہے۔ یہ کیا مزاج رکھتا ہے۔ اس مزاج کو یا اس کے طرز احساس کو عصمت چغتائی اپنی افسانہ نگاری میں کس طریقے سے گرفت میں لائی ہیں اور کیا اس بنا پر انہیں اس عہد کا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ اس بنیاد پر ہم یہ طے کریں گے کہ ان کے افسانے اچھے ہیں یا برے۔ اگر وہ اسی نہج پر لکھ رہی ہیں۔ مثلاً "جوتی کا جوڑا" جس کا حوالہ دیا گیا ہے وہ افسانہ تقسیم سے پہلے بھی لکھا جا سکتا تھا اور تقسیم کے بعد بھی انہوں نے لکھ دیا۔ وہ کیا چیز تھی کہ عصمت چغتائی کو ایک مخصوص عہد نے اتنا بڑا افسانہ نگار بنایا اور وہ کیا چیز ہے کہ آج اگر کوئی لکھنے والا لکھے ورا اس روح کو گرفت میں لائے تو وہ بڑا افسانہ نگار نہیں۔ اس حوالے سے اچھے اور برے کا فیصلہ کیجئے۔

طفیل: اگر آپ اس بات کی وضاحت کر دیں کہ پہلے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں نئے افسانہ نگاروں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جو پرانے افسانہ نگار نہ دے سکے۔ فن کے اعتبار سے، اسلوب کے اعتبار سے، مسائل کے اعتبار سے! جب تک آپ یہ نہ بتائیں گے۔ میں سمجھ نہ سکوں گا کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟ اور ان کا رُخ کس طرف ہے۔

ندیم: ان کے ذہن میں یہ ہے کہ اردو افسانہ گذشتہ پندرہ سال میں انحطاط کا شکار نہیں ہوا۔ اس زمانے کی روح —— روحِ عصر کہہ لیجئے اسے، وہ پہلے کچھ اور تھی اور آج کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ وہ لوگ اس زمانے کے مطالبات کے اعتبار سے افسانے لکھتے تھے لیکن وہ موضوعات بدل گئے ہیں اور اب تکنیک بدل گئی ہے۔ آج کا افسانہ نگار اپنا افسانہ اسی بدلے ہوئے انداز میں لکھتا ہے۔ آپ پرانے افسانہ نگاروں کو پرانے معیار سے جانچیں، مگر نئے افسانہ نگاروں کو اس معیار سے نہ جانچیں۔

طفیل: میرے نزدیک تو وہ افسانہ نگار ہی نہیں۔ جسے عصری تقاضوں کا لحاظ نہیں دوسری مجھے نہایت ادب کے ساتھ نئے افسانہ نگاروں سے یہ شکایت بھی ہے کہ انہوں نے افسانے سے کہانی پن کو نکال دیا ہے۔ یعنی افسانوں کو مضمون بنا دیا ہے۔

وقت: گویا ان کے یہاں وہ چیز نہیں جسے ہم افسانویت کا نام دے سکتے ہیں۔

ادیب: طفیل صاحب کے اس بیان سے شاید بات آگے چل سکے کہ نئے افسانہ نگاروں نے افسانے سے کہانی نکال دی ہے۔

اعجاز: میرے خیال میں ہوا یہ ہے کہ جس دور کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس میں اُردو افسانے میں رونق زیادہ تھی اور اس وقت عصمت چغتائی کا کوئی نیا افسانہ، یا کرشن چندر کا افسانہ یا منٹو کا افسانہ پڑھنے والوں کی دنیا میں آتا تھا تو اس کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی ادبی حلقوں میں موضوع بنتا تھا۔ اس کے بارے میں ردعمل متعین ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ اس کے بارے میں لکھنے والے کی موجودگی میں بھی بھرپور گفتگو ہوتی تھی۔ وجہیں اس کی کئی ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت لکھنے والے اور پڑھنے والے کا رشتہ آج سے زیادہ مضبوط تھا۔ اس کی کوئی وجہ ہو گی۔ آج وہ رشتہ قائم نہیں رہا۔ آج وہ رشتہ ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ وہ رشتہ کیوں ٹوٹا۔ پھر یہ ہے کہ جن موضوعات پر وہ لوگ کہانیاں لکھ رہے تھے، جن کا نام آپ بار بار لیتے ہیں وہ موضوعات اس وقت نئے تھے۔ ابھی اُردو افسانے میں مڈل کلاس کی لڑکی گھر سے نہیں نکلی تھی۔ ابھی اس کا پردے سے باہر نکل آنا ایک واقعہ تھا۔ ابھی جنس کے بارے میں گفتگو کرنا ایک بغاوت تھی۔ ابھی طوائف کے بارے میں ایک افسانہ لکھنا انقلاب تھا۔ اب یہ باتیں پرانی ہو گئی ہیں۔ اب وہ لڑکی جو برقع کے بغیر نکل چکی تھی اس نے بال بھی کٹوا لئے ہیں۔ وہ کلب سے بھی ہو آئی ہے۔ اور کتنی ہی منزلیں پار کر چکی ہے۔ اب ان پہ ایسا افسانہ لکھا جائے جیسے عصمت لکھتی تھیں۔ وہ ہم کو پردہ اٹھا کے کچھ دکھاتی تھی تو اس پہ بڑی واہ واہ ہوتی تھی لہٰذا اب وہ موضوعات جو تھے بطور موضوعات ان میں کوئی خاص بات نہیں رہی۔ لہٰذا اگر لکھنے والے ان موضوعات پر اب اس طرح کہانیاں لکھیں گے تو کوئی خاص بات نہ ہو گی۔ لہٰذا نئے لکھنے والوں کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ان موضوعات پر اس طرح کی کہانیاں نہ لکھیں۔

احرار: تقسیم کے بعد ایک بالکل نیا زمانہ تھا۔ سماجی اعتبار سے بھی، ذہنی اعتبار سے بھی اور معاشی اعتبار سے بھی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت کوئی نیا افسانہ نگار کیوں نہیں اٹھا جو ان حالات کو اپنی گرفت میں لے کر اپنا امیج بنا سکے۔

اعجاز: ابھی میں یہ سوال خود آپ سے کرنا چاہ رہا تھا کہ شاید میں اس کا کوئی جواب تلاش کر سکوں۔ تقسیم کے بعد جو افسانے لکھے گئے ان میں موضوعات گھس پٹ گئے تھے۔ انتظار صاحب نے ایک بات کی طرف اشارہ کیا اور قاسمی صاحب نے اس کی طرف مزید اشارہ کیا اس کو ہم کہتے ہیں روح — روحِ عصر اور انتظار صاحب کا اصرار یہ ہے کہ صاحب وہ افسانہ نگار جو بڑے تھے تو اس عہد کے حوالے سے بڑے تھے، کیونکہ وہ اس عہد کی نمائندگی کرتے تھے۔ سوال اب اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ افسانہ نگار اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں اور اگر کرتے ہیں تو کیا اتنی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں، اتنی اچھی اتنی خوبصورت نمائندگی کرتے ہیں ——— کہ ادب میں ان کا وہ مقام تو نہیں جو ان پیش رووں کا تھا۔ لیکن اس طرح کا کوئی مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔ ایک بات جو آپ نے کہی ہے میرے خیال میں وہ ایک طرح سے بنیادی اشارہ ہے۔ ایک بات تو واضح ہے کہ اُردو افسانے میں وہ رونق نہیں ہے۔ وہ ہماہمی دکھائی نہیں ہے۔ گویا بڑا اُردو افسانہ اگر چھپتا بھی ہے تو وہ واردات نہیں بنتا پڑھنے والوں کی دنیا میں۔ پتا نہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ ایک وجہ مجھے اس میں جو نظر آئی وہ یہ ہے کہ اُردو افسانے میں سے کہانی پن نکلتا چلا جا رہا ہے اور اس کی جگہ کوئی چیز

بھرکم علم سے رہا ہے — طب کا، سائنس کا، معاشیات، اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ کا۔

وقار: افسانے میں علمیت کا میلان بڑھتا جا رہا ہے اور اس علمیت نے بعض اوقات بقراطیت کی شکل اختیار کرلی ہے۔

اعجاز: جی ہاں! افسانے میں انٹیلکچوئل ہیوی نیس (INTELLECTUAL HEAVINOUS) اس میں آتی جا رہی ہے اور کہانی پن اٹھتا چلا جا رہا ہے لیکن میرا سوال پھر یہی ہے کہ اب اردو افسانہ پڑھنے والے کی دنیا میں واردات کیوں نہیں بنتا؟

وقار: اس کے میرے خیال میں بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔

اعجاز: جناب! میری رائے یہ ہے کہ پڑھنے والے خود بدل گئے ہیں۔ پہلے زمانے میں پڑھنے والا جو تھا اس کا ذہنی معیار اور تھا، اب جوں جوں LITERACY میں ترقی ہوئی ہے، پڑھنے والا فیکٹریوں میں کام کرتا ہے، وہ بس کنڈکٹر ہے، وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ اس کو بھی افسانے پڑھنا ہیں۔ آپ اس بات کا مشاہدہ کریں کہ آخر کیوں یہ "ڈائجسٹ" مقبول ہو رہے ہیں۔ مشاہدہ یہ ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور اسے نکال کے پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور بے شمار پڑھنے والوں کی ایک ایسی تعداد آپ کے ہاں پیدا ہو گئی ہے کہ آج اگر کرشن چندر اور عصمت چغتائی افسانہ نگاری شروع کرتے تو میرا خیال ہے کہ جب تک وہ پڑھنے والے کے ساتھ اپنا رشتہ اور طرح کا قائم نہ کرتے وہ کرشن چندر اور عصمت چغتائی نہ بن سکتے۔

طفیل: ٹیکسی ڈرائیور، بس کنڈکٹر یا فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور جو کچھ پسند کرتے ہیں اسے تو آپ معیار قرار نہیں دے سکتے۔

اعجاز: ایک معیار تو یہ ہے کہ افسانہ چھپتا ہے اور ہر طبقے میں مقبول ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ شاعر تو بہت بڑا ہے لیکن وہ پڑھنے والوں تک نہیں پہنچتا اور اسے قبول عام کی سند حاصل نہیں ہوتی۔

طفیل: قبول عام کی سند معیار نہیں بن سکتی ہمیں تو ایک LEVEL کو سامنے رکھ کر بات کرنی ہے۔

ادیب: پہلے وہ لیول آپ طے کر لیجئے پھر آگے بڑھیئے۔

طفیل: فیکٹری کے مزدور یا ٹیکسی ڈرائیور کا تو کوئی معیار نہ ہوا۔ کوئی ڈائجسٹ ٹائپ کے پرچے پسند کرتا ہے یا اس سے بھی گئے گزرے پرچے، یہ بھی کوئی معیار نہ ہوا۔ معیار اگر ہے تو وہ ایک باشعور قاری کا ہے۔

ندیم: انہوں نے کہہ دیا ہے پبلک یعنی عوام جو امیج قائم کریں افسانہ نگار کے بارے میں وہ امیج حقیقی نہیں ہوتا۔ صحیح IMAGE تو اصل میں وہ ہوتا ہے جو نقاد، فن کار یا ملک کا پڑھا لکھا طبقہ بناتا ہے۔

انتظار: یعنی سمجھ دار قاری۔

وقار: اعجاز صاحب ایک گزارش ہے کہ تقسیم کے فوراً بعد یہ سوال ہر طرف اٹھنا شروع ہوا اور ہر ایک نے اس کی تائید کرنی شروع کر دی کہ ادب پر جمود طاری ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ جمود نہیں ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جس عہد میں اتنے افسانہ نگار لکھ رہے ہوں جتنے اس نام نہاد جمود کے زمانے میں لکھ رہے تھے تو اس حالت کو ہم جمود کا نام نہیں دے سکتے، تو ادب کی پرکھ میں تعداد کوئی اساسی حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن اس اعتراض میں اور اس احساس میں کہ ادب میں جمود ہے ایک بات تھی، یعنی جب کوئی یہ کہتا تھا کہ افسانے میں اور ناول میں جمود ہے تو اس کی مراد یہ تھی کہ ہم جس طرح کی زندگی

بسر کر رہے ہیں اس طرح کی زندگی ہمیں افسانے میں نہیں ملتی اور زندگی کو جس طرح ظاہر کیا جانا چاہیے اس طرح اسے ظاہر نہیں کیا جا رہا۔ یوں گویا اس دعوے کے باوجود کہ بہت کچھ لکھا جا رہا تھا ادب میں جمود تھا۔ لیکن جب ہم پچھلے پندرہ برس کے افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح طور پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ ان پندرہ برس کے دوران میں جو افسانہ نگار ہمارے سامنے آئے ہیں انہوں نے واقعی اس بات کا احساس کیا ہے کہ زندگی سے قریبی تعلق قائم رکھنا ان کا فنی منصب ہے۔ زندگی کو سمجھ کر اور اسے اپنی ذات کے اندر سمو کر افسانہ نگار نے اسے افسانے کی طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر انہوں نے یہ کیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے افسانہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ وہ اپنے اس عمل میں فن کے اعتبار سے کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں یہ ایک الگ بحث ہے۔

ندیم: دیکھنے کی اصل بات یہ ہے کہ افسانہ نگار کا زندگی سے قرب قائم ہے یا نہیں۔

وقار: ندیم صاحب! میں نے عرض کیا کہ جب تک زندگی سے قریبی تعلق قائم نہ رکھا جائے اسے کہانی کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا اور بہ حیثیت مجموعی میرا تاثر یہ ہے کہ ہمارے نئے افسانہ نگار کو اس بات کا شدید احساس ہے۔ اور اس نے اس احساس کو عملی صورت دینے کے لئے محنت، مشقت اور جانکاہی سے کام لیا ہے۔

خدیجہ: میں آپ سے متفق ہوں کہ لکھنے میں جو محنت و مشقت ہوتی ہے اس کا اظہار ہمارے افسانے میں ہوا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے افسانے میں کہانی پن بھی ہے کہ نہیں۔

وقار: آپ اجازت دیں تو میں آپ کے سوال کا جواب ایک مثال سے دوں۔ مثال کے لئے اپنے ایک مشہور افسانہ نگار کا نام لیتا ہوں۔ اب سے چالیس برس پہلے کے معاشرے میں جو باتیں ہوتی تھیں، علی عباس حسینی انھیں اب بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان میں کہانی بھی ہوتی ہے اور کچھ پڑھنے والے انھیں یہ کہہ کر داد دیتے ہیں کہ کتنی اچھی کہانی ہے اور کتنی پیاری زبان ہے لیکن بہ حیثیت افسانہ نگار انھیں وہ مقام نہیں دیتے جو چالیس برس پہلے انھیں دیا جاتا تھا اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ موجودہ زندگی کے ساتھ ان کا رشتہ کٹ گیا ہے۔ ان کا رشتہ اسی زندگی کے ساتھ ہے جو انھوں نے پچاس برس پہلے دیکھی تھی اور آج کا قاری ان کے افسانے کو آج کی زندگی کے حوالے سے پرکھتا ہے۔

اعجاز: یہ دیکھیں کہ ہمارے افسانہ نگار نے پندرہ بیس برس میں کیا کیا ہے۔

انتظار: نہیں جناب! پہلے ترقی اور تنزل والی بات کا فیصلہ کر لیجئے اس کے بعد آگے چلئے۔ اس کا مجموعی آؤٹ پٹ کیا ہے؟

ندیم: اعجاز صاحب نے گفتگو کے شروع میں جو سوال اٹھایا تھا، ترقی اور انحطاط کا، اسے اگر ہم طے کر لیتے تو آؤٹ پٹ اور اچیومنٹ والی بات کا فیصلہ بھی آسان ہو جاتا۔

وقار: میرے ذہن میں تو، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا ترقی کا یہ مفہوم ہے کہ اگر دنیا آگے بڑھ رہی ہے، زندگی آگے بڑھ رہی ہے تو افسانے کو بھی اس کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ افسانہ اس اعتبار سے آگے بڑھا ہے یا ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔ اگر وہ زندگی کے ساتھ آگے بڑھا ہے اور اس نے اس کا ساتھ دیا ہے تو یقیناً اس نے ترقی کی ہے۔

ندیم: میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ ادیب اور افسانہ نگار اپنے دور کے مسائل سے دلچسپی لے رہا ہے یا نہیں؟

طفیل: میرے خیال میں صرف مسائل کی بات نہ کیجیے۔ بلکہ ان کے فنکارانہ اظہار کی بھی بات کیجیے۔ پھر مسائل کا بھی یہ ہے کہ جیسے افسانے "مسائل والوں" نے لکھے۔ ان میں بڑی حد تک یکسانیت ہے اس ضمن میں کئی نام لئے جا سکتے ہیں۔

وقار: طفیل صاحب! بات یہ ہے کہ جب تک آپ بات کو ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کر کے نہ کہیں کہ کس نے فلاں سنہ میں کیا لکھا اور پھر اس سے اگلے سال اور پھر اس کے بعد آنے والے برسوں میں کیا لکھا اس وقت تک آپ کی بات مانی نہیں جائے گی۔

ادیب: صاحب ہم کہیں سے کہیں چلے گئے۔ ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ ترقی سے مراد کیا ہے۔ ندیم صاحب نے بات شروع کی تھی لیکن اس کی وضاحت نہیں کی۔

ندیم: یہ زیادتی ہے۔ انتظار صاحب نے کہا تھا کہ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب کے بعد اردو شاعری نے بہت ترقی کی ہے تو اس کا مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ غالب کے بعد بڑے شاعر موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہیں۔ غالب کے اپنے دور کے مسائل اور تقاضے تھے جن کے ساتھ اس نے دیانت برتی ہے اس کے بعد کے شاعر جو تھے وہ بعد کے تقاضوں کے مطابق اپنے شعر کہتے رہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری انحطاط کا شکار نہیں ہوئی۔

وقار: مثلاً تصوف کے مضمون کو جس طرح خواجہ میر درد نے ادا کیا ہے اس کے مقابلے میں کسی اور نے نہیں کیا۔ زمانے کے مذاق کے ساتھ تصوف کے مضامین کے متعلق اظہار خیال کا انداز بھی بدلتا رہا۔

اعجاز: میں ذرا اختلاف کی اجازت چاہتا ہوں۔ آج جس اعتبار سے ہم اپنے ادیبوں کو جانچتے ہیں بلکہ ڈانٹتے ہیں کہ وہ اپنے عہد سے ——— وفا نہیں کر رہے، اگر اس اعتبار سے اور اسی معیار سے غالب کو جانچا جائے تو غالب کا نمبر زیرو (ZERO) نکلتا ہے۔ ہمارے آج کے نقاد سوشلوجیکل اعتبار سے ہمارے ادب میں یہ چیز ڈھونڈتے ہیں کہ تقسیم سے اس شخص نے کیا اثر قبول کیا۔ ایک سوال جو بار بار کوٹ (QUOTE) کیا گیا کہ ہمارا افسانہ نگار اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہے یا نہیں؟

ندیم: یہاں یہ بات یاد رکھئے گا کہ غالب کو آپ زیرو نمبر دے چکے ہیں۔

(قہقہہ)

خدیجہ: یہ زیادتی ہے اعجاز صاحب کی!

اعجاز: جی ہاں! تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کہا جاتا ہے کہ صاحب یہ افسانہ نگار ۴۷ء میں زندہ تھے۔ جنگ کا انہوں نے عہد دیکھا، جنگ کا ان کے ادب پر کیا اثر پڑا اور وہ اثر ہم بالکل یوں ہی جیسے امتحان میں نمبر دیتے ہیں زیادہ اثر والے کو زیادہ نمبر اور کم اثر والے کو کم نمبر۔ ہم اپنے ادیبوں سے پوچھتے ہیں کہ جنگ کے وقت تم موجود تھے، اتنا بڑا واقعہ ہو گیا، تم بتاؤ تم نے اس پر کیا

لکھا۔ ہمارے ہاں آج کل غریب اور امیر کا جو سوال ہے تم نے اس پر کیا لکھا۔ یہ وہ سوال ہے جو ہم اپنے ادیبوں سے پوچھ سکتے ہیں اور جب کوئی اس کا جواب نہیں دے سکتا تو اس کو CANCEL کر دیتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں اگر یہی طریقہ آپ غالب پر اپلائی (APPLY) کریں اور غالب سے پوچھیں کہ میاں تم نے اتنا بڑا حادثہ دیکھا جس کا نام ۱۸۵۷ء ہے، تم نے اپنی شاعری میں اس کے بارے میں کیا لکھا۔ سوائے اس کے کہ ہم مثالیں ڈھونڈتے پھریں کہ صاحب یہ لکھا ہے کوئی واضح مثال نہیں ملتی۔

ادیب: مثالیں تو واضح ہیں ان کی شاعری میں۔ دیکھنے والی نظر چاہیے۔

اعجاز: اس کا فن غزل تھا جو اس کا مزاج ہے۔ وہ سٹینڈرڈ آج اپنے لکھنے والوں پر نہ عائد کیجیے۔ وہ ہم پر اپلائی نہیں ہوتے۔ ہم آج کے افسانوں میں سے یا آج کی شاعری میں سے اس طرح کی چیزیں نہیں نکالتے جس طرح کہ غالب کی چیزوں سے نکالتے ہیں۔ ہم ان سے ڈفنٹ پروف (DEFINITE PROOF) مانگتے ہیں کہ تم اپنے عہد کے تقاضوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے، اس کی مثالیں دو۔

احمد راز: آپ یہ کہہ کر غالب کی عظمت سے انکار کر رہے ہیں گویا۔

اعجاز: میں غالب کی عظمت سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ غالب سے اگر کہا جاتا کہ تم نے ۱۸۵۷ء پر کیا کہا تو وہ کیا جواب دیتا۔

خدیجہ: اس وقت مجھے وہ شعر تو یاد نہیں جو ثبوت کے طور پر پیش کئے جائیں لیکن میرا خیال ہے کہ۔۔۔

اعجاز: کہ شاید یہ اشعار ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہوں گے۔

ندیم: شاید نہیں، لازماً۔

طفیل: اگر اشعار کے بارے میں اشتباہ ہے تو غالب کی نثر کو سامنے رکھ لیجئے۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس کی نثر بھی تو ادب کا حصہ ہے۔ اس کی سوچوں کا اظہار ہے۔

ادیب: ڈاکٹر صاحب بات یہ نہیں ہے۔ یہ بات نہ بھولیے کہ غزل کے بھی اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ غالب کا ذریعہ اظہار غزل تھا غزل کے اپنے تقاضے پورے کر کے انہوں نے جو معیار قائم کیا ہے اس کی وجہ سے ان کی عظمت مسلّم ہے۔

اعجاز: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء پر غالب نے کیا لکھا۔ آپ یہ کہیں گے اس نے ایک طرزِ احساس دیا ہمیں۔

ادیب: اصل بات تو طرزِ احساس ہی سے بنتی ہے۔

اعجاز: تو سن لیجئے کہ اس کا طرزِ احساس یہ ہے اور اس کا طرزِ اظہار یہ ہے کہ اک شمع جل رہی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔ آپ کہیں گے یہ بہادر شاہ کا المیہ ہے۔ تو جناب! یہ اپنی طرف سے کہنے والی بات ہے۔

خدیجہ: نہیں یہ غلط بات ہے۔

اعجاز: تو پھر آپ غالب سے پوچھیے کہ تم نے ۱۸۵۷ء پر کیا کہا ہے میرا خیال ہے اس نے کچھ نہیں کہا۔

خدیجہ: انھوں نے غزل کی زبان میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو اس زمانے میں پیش آیا تھا۔

انتظار: تو آپ آج کل کی شاعری کے بارے میں یہ کیوں نہیں سمجھتیں؟

خدیجہ: آپ نے ادبی زبان میں اِس زمانے کے لحاظ سے کیا کہا؟

انتظار: آج آپ افسانہ نگار اور شاعر سے یہ پوچھتی ہیں کہ ہماری جو زبان ہے اس میں آپ نے اپنے عہد کے متعلق کیا کہا ہے۔ غالب کے متعلق آپ یہ کہتی ہیں کہ غالب کی اپنی زبان تھی۔

خدیجہ: وہ غزل کی زبان تھی۔

انتظار: ہاں تو افسانے کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ میں افسانہ اس زبان میں نہیں لکھوں گا جس زبان میں اخبار کی خبر لکھی جاتی ہے۔

ندیم: انتظار صاحب! ہم اخبار تک تو پہنچے ہی نہیں۔

وقار: لیکن ندیم صاحب! انھیں پہنچنے دیجئے (قہقہہ)

میمونہ: اگر اسی بات کو معیار قرار دیا جائے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ ۶۵ء کی جنگ سے ہمارے افسانہ نگار کس طرح عہدہ برآ ہوئے۔

ندیم: وہ تو ہوتے رہیں گے۔ ابھی تو دو سال کی بات ہے۔

میمونہ: پہلے یہ دیکھیں کہ ڈیڑھ سو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں جن میں افسانے بھی شامل ہیں لیکن صرف سترہ اور تیئیس دن کے بعد ایک بھی قلم اس راہ پر نہیں بھٹکا۔ مواد اور موضوع تو ہیں مگر لکھے گھساتے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اعلان تاشقند ہو گیا تھا۔

احسان: نہیں تاشقند کا سلسلہ نہیں ہے۔ آپ نے یہ سوال کرتے وقت پوری گفتگو جو اعجاز صاحب نے کی ہے وہ نظر انداز کر دی ہے آپ وہ مطالبہ کر رہی ہیں افسانہ نگار اور شاعر سے کہ آپ نے براہ راست جنگ ستمبر پر کیا لکھا۔

میمونہ: نہیں یہ بات نہیں ہے۔

انتظار: پڑھ لیا۔ دیکھا کیسا پکڑا! (قہقہہ)

طفیل: آپ جو کہتے ہیں کہ روح عصر کو افسانوں میں ضرور ڈھونڈھنا چاہیئے تو پھر آپ یہاں کیوں بدک رہے ہیں۔

اعجاز: وہ روح عصر اسی طرح ہوگی جس طرح آج ۱۸۵۷ء کی روح عصر غالب میں تلاش کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ بس۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو افسانہ نگار اس دور کے ہیں ان سے یہ کہیں کہ دکھاؤ اپنی کاپی کہیں کہ تم نے جنگ کے بارے میں کیا لکھا، ور تقسیم کے بارے میں کیا لکھا؟ امیری غریبی کے بارے میں کیا لکھا؟ اس ملک میں جو انقلاب ہوا اس کے بارے میں کیا لکھا؟

ندیم: ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے بارے میں جو چیزیں لکھی گئیں ان کا ذکر ابھی بہت قبل از وقت ہے۔

ادیب: ابھی آئندہ جا کے لکھی جائیں گی۔

ندیم: جی ہاں — آج کی غزلوں میں یہ رنگ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں اس کا اظہار آ جاتا ہے۔ بلکہ جو تازہ غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں رمزیہ انداز میں تاشقند تک کے حوالے موجود ہیں۔

وقار: ہاں۔ غزل میں ایسے واقعات کا ذکر جیسے آنا چاہیے اسی طرح اور اس سے قطع نظر جیسے شاعروں نے نظمیں، غزلیں لکھیں

اور ان میں اس واقعے کے حوالے دیئے اسی طرح افسانہ نگاروں نے افسانے بھی لکھے ۔ وہ افسانے فنی لحاظ سے بہت اعلیٰ درجے کے نہ سہی، لیکن ان سب افسانوں کو پڑھ کر بلا استثنا یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار موضوع کی تلاش میں تھا اور وہ اسے مل گیا ہے۔ ہم اپنی زندگی میں ایک مدت سے کسی ایسی چیز کا کھوج لگا رہے تھے جسے ہم اپنا نصب العین کہہ سکیں۔ یہ سوال بار بار ہمارے دل میں اٹھتا تھا کہ ہماری آئیڈیالوجی کیا ہے ۔ پاکستان میں رہ کر افسانہ نگار کو کن موضوعات پر لکھنا چاہیے ۔ افسانہ نگار اس سوال کے جواب کی جستجو میں نہ جانے کدھر کدھر بھٹکتے رہے، لیکن اب سب افسانہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے واقعہ کا مشاہدہ کیا ہے اور اس کی بدولت وہ جس تجربے سے گزرے ہیں وہ افسانے کا بڑا بامعنی موضوع ہے۔ اس نے اس واقعے کا ردعمل دیکھا ہے اور اس نے بڑی سہولت سے اس ردعمل کو ایک واضح شکل دے لی ہے ۔ اسے پتہ چلا ہے کہ ہم زندگی کو دین کے پیمانے سے اور اعتقاد کے پیمانے سے ناپتے ہیں ۔ ہم لڑ رہے ہیں اور اس لڑائی میں بہت سی قربانیاں دے رہے ہیں۔ لیکن قربانیاں دینے اور غم اٹھانے میں غم سے زیادہ خوشی اور ابدی تسکین کا پہلو ہے ۔ غم کو ہمیشہ مایوسی کی علامت، مایوسی کی نشانی سمجھ کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس تجربے کی نوعیت مختلف ہے ۔ شہید ہونے والا اپنے انجام پر خوش ہے ۔ غازی کو یہ قلق ہے کہ وہ شہادت کی دولت سے محروم رہا ۔ یوں گویا اس خاص واقعے نے ہمارے فکر کو ایک نہج دی ہے اور اس نہج پر چل کر ہمارے افسانہ نگار نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں سے بعض میں زندگی کی قدریں ابھرتی ہیں ۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جس دور کو ہم جمود کا دور کہہ رہے ہیں اسے اس لحاظ سے ——— جمود کا دور کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والے کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ لکھیں کس چیز پر۔ لیکن ابتدائی چند برسوں کا جمود بعد میں ٹوٹا۔ اگر آپ غور کریں تو آسانی سے اس کی مثالیں مل جائیں گی ۔ مثلاً ہماری معاشی زندگی کا یہ بہت بڑا واقعہ ہے کہ منگلا بند بنا اور حال ہی میں اس کا افتتاح ہوا۔ لیکن اس بند کے بننے سے ایک خاص علاقے کی آبادی پر یہ اثر پڑا کہ اسے اپنے گھر، آبائی گھر چھوڑ کر ایسی جگہوں پر جا کے آباد ہونا پڑا جن کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ ہم وہاں جا کر رہیں گے ۔ لیکن ایک افسانہ نگار نے اس سارے واقعے کو اس طرح افسانے کا موضوع بنایا ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دس ہزار آدمیوں کو اپنا وطن چھوڑ کر کسی اور جگہ جا کر بسنا پڑا تو ان دس ہزار آدمیوں کی بے گھری اور بے وطنی میں دس کروڑ پاکستانیوں کا فائدہ ہے ۔ قومی زندگی کے اس واقعے سے بعض ایسے نتیجے نکالے جو پوری قومی زندگی کے طرزِ احساس کی نمائندگی کرتے ہیں ۔

خدیجہ: میں نے بھی وہ افسانہ پڑھا تھا ۔ واقعی بڑا اچھا افسانہ تھا ۔ مجھے افسانہ نگار کا نام یاد نہیں آ رہا ۔

وقار: جی وہ صادق حسین کا افسانہ ہے ۔ اس افسانے کا موضوع منگلا بند کی تعمیر سے پیدا ہونے والا ایک پہلو ہے۔ اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا افسانہ نگار اس بات کی طرف سے غافل نہیں ہے کہ ہماری بالکل قریب کی زندگی نے ہم سے کس چیز کا مطالبہ کیا ہے ۔ زندگی میں سے کیا اچھی قدریں ابھر رہی ہیں جن کا افسانے میں ذکر ہو تو یہ ادب کی خدمت بھی ہو گی اور ملک اور قوم کی بھی ۔

اعجاز: ۔ میں ایک بات آشکار کرنا چاہتا تھا ۔ آپ گفتگو کو اس مقام پر لے آئے ہیں کہ میرے لئے اس بات کا کہنا یقیناً برمحل ہو گا ۔ مجھے لگتا یوں ہے کہ افسانہ نگار نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ تخلیقی ادب کو اس کے پیش رو نے جا کر رکھا تھا ۔ میرا ہمیشہ سے

یہ خیال رہا ہے۔ اور میرے اپنے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ افسانہ نگار جن کا ذکر طفیل صاحب نے کیا اور وہ افسانہ نگار جو اس کے فوراً بعد آئے، ان کا تجربہ اپنے پیش رو افسانہ نگاروں سے مختلف نہ تھا۔ اس اعتبار سے مختلف نہ تھا کہ وہ اس کلاس سے آئے تھے جس کلاس سے یہ لوگ آئے ۔ ان کی زندگی کی STRUGGLE بھی کم وبیش ویسی ہی تھی ۔ وہ بھی اسی طرح قصبوں سے دیہات سے پڑھ لکھ کر شہروں میں آنے والے لوگ تھے ۔ یہ مڈل کلاس کے لوگ تھے خاص طور پہ ۔ جنس کے بارے میں ، ان کی زندگی کے بارے میں ، معاشرتی اور سماجی زندگی کے بارے میں ، ان کا تجربہ بھی کم وبیش ویسا ہی تھا ۔ لہٰذا وہ اگر اپنی ہی زندگی سے مشاہدہ اور تجربہ مستعار لے کر افسانہ لکھتے تو ان کا افسانہ ان کے پیش رو سے مختلف ہوتا ۔ چونکہ اسی موضوع پر ان کے پیش رو بہت اچھے افسانے لکھ چکے تھے لہٰذا لازم تھا کہ اگر ان کو اپنے پیش روؤں سے بڑھ کر افسانہ لکھنا تھا تو ان کا تجربہ بھی اس سے بڑا یا کم از کم اتنا ہی ہونا چاہیے تھا ۔ ہوا یہ ہے کہ گذشتہ بیس برس میں ہماری سماجی زندگی میں بہت ترقی ہوئی ہے ۔ اگر میں ترقی کا لفظ استعمال نہ کروں تو یہ کہوں گا کہ بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تبدیلیاں یہ ہوئی ہیں کہ ہمارے دیہات کا مزاج کسی حد تک بدل گیا ہے ۔ ہمارے قصبات کا مزاج بھی تبدیل ہوا ہے ۔ شہروں کا مزاج بھی بدلا ہے اور جو تبدیلیاں ہماری سماجی زندگی میں ہوئیں ہمارا افسانہ نگار نہ اس کا مشاہدہ کر سکا نہ اس کا تجربہ کر سکا ۔ آپ کو صادق حسین کے افسانے میں یہ انوکھا پن اس لئے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کا مشاہدہ اور تجربہ ہے ، جس کی گرفت میں خوش قسمتی سے یہ تجربہ آ گیا ، اس کے افسانے میں ایک ایسی دنیا آ گئی جو باقیوں کے پاس نہیں ہے ۔ اگر وہ اسی طرح طوائفوں پر افسانے لکھتا چلا جائے ، لڑکی کے برقع چھوڑنے پر افسانے لکھتا چلا جائے ، یا جنس پر افسانے لکھتا چلا جائے تو وہ کوئی خاص بات نہ ہوگی ۔ موجودہ افسانہ نگار کی مشکل یہ ہے کہ جو مشاہدہ کرشن چندر کا تھا ، جو بیدی کا تھا ، اس سے وہ بڑا افسانہ پیدا کر سکتا تھا ۔ ہمارا افسانہ نگار زندگی کو گرفت میں نہیں لا سکا ۔ لہٰذا وہ افسانہ کیا لکھے گا ۔ کبھی اس نے علامتی افسانہ نگاری کا سہارا لینے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسانے میں سے کہانی پن نکل گیا اور فلسفہ باقی رہ گیا ۔

وقار: اعجاز صاحب ! آپ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے لیکن میں یہ گزارش کروں گا کہ یہ حکم آپ سب افسانہ نگاروں پہ نہیں لگا سکتے ۔

طفیل: اعجاز صاحب کا جو یہ خیال ہے کہ کرشن چندر اور منٹو اور بیدی اسی انداز کے افسانے لکھتے رہے ہیں ۔ جیسا کہ ان کے پیشرو لکھتے رہے تو یہ ٹھیک نہیں ۔ اس لئے کہ ان سے پہلے جو افسانہ نگار تھے ۔ وہ سجاد حیدر یلدرم ، نیاز فتحپوری ، ل ۔ احمد اور سلطان حیدر جوش تھے ۔ ان کے انداز میں اور ان کے انداز میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ مسائل میں بھی ، اسلوب میں بھی ! اور خاص طور پہ تکنیک میں ۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان سے پہلے اردو افسانہ ایک سپاٹ چہرے کی مانند تھا ۔ ناک نقشہ انہوں نے ہی اسے عطا کیا ۔ جب میں کرشن چندر ، منٹو اور بیدی کا نام لیتا ہوں تو میری مراد ، اس دور کے تمام اہم افسانہ نگاروں سے ہوتی ہے ۔ جن میں اوپندر ناتھ اشک ، عصمت چغتائی ، ممتاز مفتی ، احمد ندیم قاسمی ، غلام عباس ، انور ، اختر اورینوی ، خواجہ احمد عباس ، اختر انصاری اور دیوندر ستیارتھی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ پھر اس قافلے کے ساتھ آن ملنے والوں کی فہرست خاصی لمبی ہے ۔ جن میں بہت سے لکھنے والے آج بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔

اعجاز: جناب! میں جنرل مشاہدے کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھیے کہ چین کا افسانہ نگار تجربے کی تلاش میں شہر سے نکل کر جہاں پندرہ رہے ہیں، جہاں بجلی نکالی جا رہی ہے، جہاں مزدور کارخانوں میں کام کرتے ہیں، وہیں جا کر رہتا ہے، انھیں کا کھانا کھاتا ہے، انھیں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ انہی کا طرزِ احساس لیتا ہے۔ مغرب والے کی پرابلم کیا ہے۔ مغرب والا بھنگ پیتا ہے، افیون کھاتا ہے، گانجہ پیتا ہے، اور دیگر منشیات استعمال کرتا ہے اور اپنے جسم کو ایک واردات بناتا ہے اور اس کے ذریعے ایک حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے میں کہوں کہ صاحب یہ جسم لے لیجیے، اس نے میری حقیقت کے ادراک کا راستہ روک رکھا ہے۔ میں ڈاکٹر سے کہتا ہوں کہ صاحب میری آنکھ میرے جسم سے نکال دیجیے کہ اس سے حقیقت کا ادراک کرنا چاہتا ہوں۔ مغرب والے کا تجربہ محدود ہوا تو اس نے گانجا اور افیون اور خدا جانے کن کن چیزوں کے ذریعے اپنے جسم کے بند کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس وقت بہت سی آوازیں مجھے سنائی نہیں دے رہی ہیں، بہت سی چیزیں میں دیکھ نہیں رہا، حالانکہ میری آنکھ میں دیکھ لینے کی قدرت ہے۔ لیکن اگر میں کوئی ایسی دوا کھا لوں جس سے مجھ کو اور طرح کے رنگ نظر آنے شروع ہو جائیں گے اور اور آوازیں آنی شروع ہو جائیں گی۔ جسمانی تجربہ تو آج کا مغرب کا افسانہ نگار یا مغرب کا شاعر کر رہا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ایک نئی دنیا پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا افسانہ نگار یا ناول نگار ایک نئے تجربے کی تلاش میں ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جاتا ہے جہاں اس کے لئے نئی دنیا آباد ہے۔

ندیم: بھابی اگر ہمیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے چائے ملتی رہے تو ہم بے ہوش ہونے سے بچ جائیں گے۔

بیگم طفیل: ضرور ملتی رہے گی یہ نوبت نہیں آئے گی۔ (قہقہہ)

انتظار: اب جناب میں کچھ عرض کروں گا۔ اصل میں جسے انہوں نے پچھلے عہد کے افسانہ نگاروں کا مشاہدہ کہا ہے، اردو افسانے کا المیہ وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ جسے مشاہدہ کہتے تھے اور اپنی بنیاد جس مشاہدے پر رکھتے تھے، اس کی تہہ میں ایک مخصوص فلسفۂ حیات کارفرما تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے اردگرد خارجی سطح پر جو کچھ گزر رہا ہے یہ پوری دنیا ہے۔ یہ وہ فلسفہ تھا جس کی بنیاد پر انھوں نے اپنے مشاہدے کو افسانہ نگاری کا موضوع بنایا۔ اب تقسیم کے بعد صورت حال یہ ہوئی کہ جن افسانہ نگاروں نے اس فلسفے کو قبول کر لیا، ان کے لئے مسئلہ یہ رہا کہ اردگرد کی زندگی کا مشاہدہ کرو، تب آپ کا افسانہ بنے گا۔ اس فلسفۂ حیات کے تحت جو بھی برا بھلا افسانہ پیدا ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اس لئے جو افسانہ نگار اس میں اعتقاد رکھتے تھے انہوں نے روایتی افسانہ پیدا کیا۔ وہ عصمت کی کاپی کرتے رہے یا منٹو کی نقالی کرتے رہے یا کرشن چندر کی لیکن پاکستان بننے کے بعد سے صورت حال بالکل مختلف ہو گئی۔ وہ یہ کہ ایک ساتھ ہمیں یہ احساس ہوا جب تقسیم ہو گئی، ملک بن گیا تو ہم میں سے بہت سے جو انٹیلیجوئل تھے ان کا INVOLVEMENT انہیں تھا تحریکوں کے ساتھ۔ اس کے لئے یکایک یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ آخر ملک کیسے بن گیا؟ ہم ایک الگ قوم ہیں کیا؟ کیا ہماری تہذیب الگ ہے؟ کیا ہماری تاریخ پورے برصغیر کی تاریخ سے الگ ہے؟ یہ سوالات تشویش کے سوالات تھے۔ انہوں نے بے اطمینانی اور اضطراب پیدا کیا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ بھائی خارجی سطح پر جو کچھ گزر رہا ہے وہ تو جو کچھ ہے وہ ہے، لیکن مجھے تاریخ کے اوراق کو بھی اُلٹ کر دیکھنا چاہیے۔ اس نے تاریخ میں پیچھے لوٹنے

کی کوشش کی۔ کچھ اس نے اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے ایک تفتیش کا میلان پیدا ہوا اس کی نمائندہ مثال قرۃ العین حیدر ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول لکھنے کا اور سوچنے کا انداز عصمت اور کرشن چندر سے بالکل مختلف نظر آئے گا۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے قرۃ العین حیدر اس انداز میں نہ سوچ سکتی تھیں نہ لکھ سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کے لئے یہ مسئلہ بالکل اذیت ناک تھا کہ یہ جو الگ ملک بن گیا ہے یہ کیا چیز ہے۔ یہ کیوں ہے؟ کیوں اور کیا کا جو سوال تھا وہ انھیں تاریخ کے مختلف ادوار میں لئے پھرتا ہے اور اسی تفتیش کا عمل ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اب تفتیش کا عمل اور مختلف افسانہ نگاروں کے ہاں بھی دکھائی دے رہا ہے اور وہ مختلف سمتوں میں جا رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر ایک سمت میں نکل گئیں تو کوئی دوسرا افسانہ نگار کسی اور سمت میں نکل گیا۔ کوئی دیو مالائی حوالوں سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے، کوئی اسلامی تاریخ کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سارے عمل میں یہ اسلامی طرزِ احساس وجود میں آیا جو اس عہد کا مخصوص طرۂ امتیاز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی سوچ کے حوالے سے آپ کے عہد کی سینسبلٹی (SENSIBILITY) بنتی ہے؛ طرزِ احساس مرتب ہوتا ہے۔ اسی سوچ کے حوالے سے، اس پورے دور کے اضطراب اور تفتیش کے حوالے سے آپ اس کا نقشہ بنا سکتے ہیں۔ جس افسانہ نگار نے اور لکھنے والے نے اس صورتِ حال کو گرفت میں نہیں لیا اور محض خارجی سطح پر زندگی کا مشاہدہ کئے جا رہا ہے، لکھے چلا جا رہا ہے وہ کبھی اس طرف ہاتھ مارتا ہے کبھی اُس طرف۔ جو افسانہ نگار کبھی صنعتی زندگی کا ایک نقشہ سا پیش کر دیتا ہے میرے خیال میں وہ آج کا افسانہ نگار نہیں ہے اور وہ اس پاکستان کی جو ذہنی صورت حال ہے اور جو اس کا پورا نقشہ ہے، وہ اسے کیا سمجھے۔

ادیب: صاحب صدر! یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ انتظار صاحب نے کہا کہ پہلے افسانہ نگار صرف خارجی کوائف کو لیتے تھے ان کا مشاہدہ جو تھا وہ اظہار پاتا تھا ان کے افسانوں میں۔ یعنی وہ داخلی طور پر کچھ نہیں سوچتے تھے مسائل کو اور جو کچھ دیکھتے تھے جو کچھ مشاہدہ کرتے تھے وہ افسانے میں پیش کر دیتے تھے۔ داخلی طور پر نہیں سوچتے تھے۔ آج کا افسانہ نگار داخلی طور پر سوچ رہا ہے۔ تو کیا یہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جو پہلے کے لوگ تھے انہوں نے جتنی تخلیقات کی تھیں، کیا وہ صرف خارجی مشاہدے ہی کی بنا پر اتنی وسعت اور اتنی عظمت حاصل کر سکے؟

فلدیسم: میرے خیال میں انتظار حسین صاحب نے اس دور کے افسانہ نگاروں کی بے اطمینانی کا بڑا اچھا جائزہ دیا ہے۔ وہ افسانہ نگار جن کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ وہ اردو افسانے میں روشن ترین مثالیں ہیں لیکن جن کو اس طرح کہہ کے ٹال دیا جاتا ہے کہ وہ صرف خارجی مسائل پہ لکھ دیتے تھے اور اپنے اندرون اور قالب کے ساتھ ان کا رشتہ نہ تھا شاید صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں خارج اور داخل وغیرہ کا جو معاملہ ہے اس کو الگ الگ کرنا غلط ہے۔ خارج میں جو کچھ ہو رہا ہے داخل پہ اس کا اثر پڑتا ہے ہم جب سوچتے ہیں تو خارجی حالات ہمارے سوچ کے پس پردہ کارفرما ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں کرشن چندر اور منٹو اور پریم چند وغیرہ وغیرہ کو محض یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خارجی زندگی کے عکاس تھے اب رہے وہ افسانہ نگار جو تقسیم کے بعد آئے۔ وہ بیچارے پریشان ہو گئے کہ انھیں کیا لکھنا چاہیے۔ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ ان کی تاریخ کیا ہے؟ کیا ان کی تاریخ کوئی الگ تاریخ ہے۔ یہ گویا ان کی بے بسی کی علامت ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ کوئی خاص نقطۂ نظر اختیار کرتے اور اس نقطۂ نظر سے

ہر چیز کو وابستہ کرتے وہ دوسری الجھنوں میں پڑ گئے۔ نقطۂ نظر کی یہی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ انتشار کا شکار ہو گئے۔ اور بعض ایسی باتیں جو وہ کہنی چاہتے تھے وہ براہ راست کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انھیں علامت کا سہارا لینا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنے افسانے لکھے گئے وہ کامیاب افسانے ہیں اور وہ علامت کے بغیر براہ راست بھی لکھے جا سکتے تھے۔ اس سے بات بھی گرفت میں رہتی اور افسانہ بھی نہایت کامیاب رہتا۔ بجائے اس کے کہ قاری کو اس امتحان میں ڈال دیا جائے کہ جس رمز کے تحت یہ افسانہ لکھا جا رہا ہے پہلے اس کو CATCH کرو یا گرفت میں لو پھر افسانہ لکھو، انھوں نے صرف علامت کو اہمیت دی۔ ایک اور بات یہ کہ افسانہ نگار میں مسائل کو سمجھنے کی جرأت کی کمی تھی اور نقطۂ نظر کو آزمانے کا خوف تھا اس لیے وہ انتشار کا شکار ہو گئے علامت کے علاوہ انہوں نے ABSTRACTION کا سہارا لیا اور افسانہ انسان کے پیچھے کے بارے میں لکھنا تھا تو پیچھے کو اس کی علامت بنا کر لکھ دیا۔

ادیب: صاحب صدر! میں اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ ندیم صاحب نے کہا ہے کہ اس وقت لکھنے والوں میں چونکہ جرأت نہیں تھی اس لئے علامت کا سہارا لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے اس بات میں ندیم صاحب سے اختلاف ہے۔ اگر غزل میں علائم و رموز آ سکتے ہیں اور غزل کی زبان میں وہ مروج ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ایک افسانہ نگار بھی ایسا تجربہ کر سکتا ہے جسے وہ علامت کے ذریعے زیادہ واضح طور پر ظاہر کر سکے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ یہ جرأت اظہار کی کمی کی وجہ سے ایسا ہوا۔ حقیقت میں اس تجربے کی نوعیت پر بھی اس کا انحصار ہے کہ وہ اسے علامت کے ذریعے پیش کرتا ہے یا کسی اور طرح۔

خدیجہ: میرا خیال ہے کہ میرزا ادیب صاحب نے علامت کو تشبیہ اور استعارے کے ساتھ ملا دیا ہے۔ شاعری میں تشبیہ و استعارہ علامت سے مختلف ہے۔

طفیل: میرے خیال میں ہم نے پہلے سوال کو چھوڑ دیا ہے اور دوسرے سوال پر آ گئے ہیں۔

وقار: ندیم صاحب نے جو بات فرمائی اس میں حقیقت میں دونوں چیزیں مل گئیں۔ ایک بات یہ کہ علامت بنیادی طور پر اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ وہ کہنے والے کے درمیان ایک طرح کا رشتہ قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ البتہ ایسی علامتیں کہ جنھیں کوئی شاعر یا افسانہ نگار پہلی مرتبہ استعمال کرتا ہے مثلاً وہ پیڑ کہہ کر جانور مراد لیتا ہے تو یہ علامت اس وقت تک مؤثر نہیں ہو گی یا اپنا مقصد پورا نہیں کرے گی جب تک سننے والا اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس طرح کی علامتوں میں معنی اس وقت پیدا ہوں گے جب بات کہنے والا اسی تجربے کو اپنا تجربہ بنائے جو اس کے قاری کا تجربہ ہے اس لئے آپ کی پہلی بات تو یقیناً درست ہے کہ اس عہد کے لکھنے والے نے کہانی میں جا کر یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ آپ کے اس پورے عہد کا تجربہ کیا تھا، اور عہد کے تجربے کے معنی یہ ہیں کہ پورے عہد کا احساس یا طرز احساس کیا ہے۔ افسانہ نگار نے علامتیں استعمال کیں تو ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے اس عمل کے پس پردہ خوف تھا یا محض تن آسانی تھی۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں افسانہ نگار کے اس رویے میں خوف سے زیادہ تن آسانی کو دخل تھا۔ اس سے شاید آپ بھی انکار نہیں کریں گے یہ تن آسانی ہمارے عہد کے ادیب کی عام روش ہے۔ ہم گہرائی میں نہیں جاتے، جو کچھ ہم ظاہر میں دیکھ رہے ہیں اس کے باطن تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے اس

لئے میرے نزدیک علامتوں کے بے سوچے سمجھے استعمال کی سب سے بڑی وجہ سہل انگاری ہے۔ اب رہا دوسرا پہلو تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ موجودہ دور کے افسانہ نگار نے اپنی قومی زندگی کو ماضی کی زندگی سے مختلف پایا اور اس سے مختلف پا کر اختلاف کے ان پہلوؤں کو افسانے کا موضوع بنایا اور اس اعتبار سے افسانہ یقیناً آگے بڑھا ہے۔

طفیل: میں پھر وہی بات دہراؤں گا، افسانہ موضوع کے اعتبار سے آگے بڑھا ہے یا فن کے اعتبار سے، پھر میں اسے بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ پرانے لکھنے والوں کو نئے موضوعات سے دلچسپی نہیں، پچھلے دنوں میں نے کرشن چندر کا ایک افسانہ پڑھا تھا جس میں کچھ یوں تھا کہ ہندوستان کی ایک لڑکی لندن کے قحبہ خانے میں پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دلی یا بمبئی یا کلکتہ جانے کی بجائے لندن جانا چاہتی تھی۔ پھر اس افسانے کا آخری فقرہ یوں تھا کہ ہمیں تیرے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں کیونکہ ہم چاند پر جا رہے ہیں۔

احمد ایاز: اب بحث بڑی دلچسپ منزل پر آ گئی ہے۔ دراصل افسانے کی جو ٹیکنیک ہے اور جو نقطۂ نظر ہے وہ افسانے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے ہمارے پاس ایک نقطۂ نظر تھا اور وہ نقطۂ نظر جو تھا پورے فن پر اور مشاہدے پر اور زندگی کے جو مسائل تھے ان پر حاوی تھا۔

وقار: ڈاکٹر صاحب ازراہ کرم یہ بھی بتاتے چلیے کہ وہ نقطۂ نظر کیا تھا۔

احمد ایاز: مثلاً اجتماعی تصور، زندگی کا اجتماعی تصور آزادی حاصل کرنا تھا، غلامی سے نجات حاصل کرنا تھا، طبقاتی ناہمواری کو ختم کرنا تھا، انگریز کے خلاف احتجاج کرنا تھا، سرمایہ داروں کے خلاف احتجاج تھا۔ تو یہ باقاعدہ ایک منشور تھا افسانہ نگاروں کا جس کو سامنے رکھ کر اور اس نقطۂ نظر کے تقدس کو سامنے رکھ کر وہ افسانہ لکھتا تھا اور وہ افسانہ اسی بنا پر کامیاب ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل کی کہانی معلوم ہوتا تھا، وہ زندگی کی عکاسی معلوم ہوتا تھا۔ تقسیم کے بعد نقطۂ نظر کی ڈور ٹوٹ گئی اور اس ڈور کے ٹوٹ جانے سے تمام چیزیں منتشر ہو گئیں۔ اب کسی افسانہ نگار کے پاس کوئی نقطۂ نظر نہیں ہے، اور ہر شخص جو ہے وہ فرد کے تصور میں منتقل ہو گیا ہے۔ اب ہر شخص اپنے آپ کو تنہا سمجھ رہا ہے۔ اجتماعی معنویت جو ہے وہ اس کی گرفت میں نہیں ہے۔ اسے سماج سے کوئی غرض نہیں۔ وہ دراصل اپنی بہبودی چاہتا ہے، اپنی فلاح چاہتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ افسانے میں نقطۂ نظر کے نہ ہونے کی بنا پر مختلف قسم کے کھوکھلے تجربے ہو رہے ہیں اور وہ تجربے نہ ہونے کے برابر ہیں۔

انتظار: ایک سوال کا جواب دے دیجیے کہ کیا نقطۂ نظر ہمیشہ معاشی اور معاشرتی حوالوں ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ معاشرتی زندگی ہو یا معاشی زندگی ہو، اس کے حوالے سے نقطۂ نظر مرتب ہوتا ہے یا کسی اور حوالے سے۔

احمد ایاز: یہی ایک سوچنے کی بات ہے کہ معاشی زندگی جو ہے اور معاشی نقطۂ نظر جو ہے اس سے کیا زندگی الگ کوئی چیز ہے۔ اگر الگ نہیں تو ہر زمانے میں معاشی مسئلہ جنم لے سکتا ہے۔

انتظار: معاشی زندگی ہر زمانے میں، ہر عہد میں، ہر آدمی کے لئے مقدم ہوتی ہے۔ کیا یہ کوئی لازم بات ہے اور کیا آپ نے طے کر لیا ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔

احمد ایاز: یہ چیزیں طے نہیں ہیں۔

انتظار: ملے کیوں نہیں ملے ہیں!

احمد: بات یہ ہے کہ معاشی حالات اور معاشی فلسفے جو ہیں اس سے زندگی الگ نہیں۔

وقار: میرے خیال میں جو بات آپ نے کی وہ بڑی اہم ہے یعنی یہ کہ اور آپ نے بالکل واضح طور پر دیکھا کہ کچھ عرصہ پہلے مارکسیت ہمارے افسانے میں داخل ہوئی اور مارکسیت اپنے ساتھ معاشی نقطۂ نظر یعنی معاش کا اور روزی کا مسئلہ اپنے سامنے لائی۔ یہ بات زندگی میں پہلے بھی تھی لیکن یہ مسئلہ آزادی کے بعد یا اس سے پہلے اتنا شدید نہیں تھا۔ افسانے میں زیادہ دن تک نہیں چلا، نہ صرف یہ کہ زیادہ دن تک نہیں چلا، بلکہ ایک ہی افسانہ نگار مثلاً عصمت ہیں یا کرشن چندر ہیں لیجیے۔ دونوں ایک ہی وقت میں دو طرح کے افسانے لکھتے رہے۔ اور دونوں میں سے ایک واضح طور پر ان مارکسی تصورات کا حامل ہے جو اکثر اوقات پروپیگنڈے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور دوسرے میں ان کا وہی مخصوص رنگ ہے جس نے انھیں عوام اور خواص میں مقبول بنایا اور انھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک امتیازی جگہ دی۔ پہلی طرح کے افسانوں میں نقطۂ نظر تو موجود ہے لیکن افسانہ اچھا نہیں ہے۔ کرشن چندر کے جتنے بھی افسانے فن کے نقطۂ نظر سے کمتر درجے کے سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں دانستہ یہ نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر ان کی ذات کی گہرائیوں میں سے نہیں نکلا۔ فیشن کے طور پر یا جسے ہم fad کہتے ہیں اس کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ فن کار کے پاس زندگی کے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر یا نظریاتی تفکر ہونا چاہیے، لیکن یہ نقطۂ نظر یا نظریاتی تفکر محض معاش سے یا محض پیٹ کے تقاضوں سے یا مادی زندگی کی آسائشوں کی آرزو سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیق جذبے اور احساس کے خلوص اور فکر کے تعمق سے ہوتی ہے۔

ندیم: میں معافی چاہتا ہوں لیکن عصمت جیسی افسانہ نگار کو یہ الزام دینا کہ وہ محض فیشن یا fad کے تحت لکھتی ہیں یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔

وقار: میں فیشن کا لفظ اور fad کا لفظ واپس لیتا ہوں۔ میری مراد یہ ہے کہ عصمت ایک ہی وقت میں دو طرح کے افسانے لکھ رہی ہیں ایک میں زندگی کے تجربات کی گہرائی ہے اور دوسرے میں مارکسی نقطۂ نظر کی نظریاتی تبلیغ۔ آپ بھی یہ تسلیم کریں گے کہ ان دونوں طرح کے افسانوں میں فن کی سطح ایک سی نہیں۔

انتظار: لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمارے لئے جو ان افسانہ نگاروں نے مجموعی طور پر کہہ دیا ہے وہی ہمارے لئے سند ہو۔

ندیم: بالکل نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کرشن چندر نے جس طرح لکھ دیا اسی طرح انتظار صاحب بھی لکھیں۔

احمد: میں یہ کہتا ہوں کہ جو ان کے اب مشاہدات ہیں، جو ان کے تجربات ہیں، یا فکر یا نقطۂ نظر ہے اس میں بھی وقت کے ساتھ تبدیلی ہونی چاہیے تھی۔ کیونکہ ہمارا اپنا ملک بن چکا ہے۔ اس کے تقاضے قومی اعتبار سے اور سماجی اعتبار سے مختلف ہیں اور اس لئے ہمارے ہاں یقینی طور پر کوئی واضح نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اس وقت تک مختلف نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنے افکار کا سرچشمہ اپنی مخصوص زندگی کو نہ بنائیں۔

انتظار: یعنی واضح نقطۂ نظر سے مراد ایسا نقطۂ نظر ہے جو آپ کے لئے واضح ہو۔ یوں گویا نقطۂ نظر کی کسوٹی آپ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

احسان: جی نہیں کسوٹی ہم تو نہیں ہو سکتے، کسوٹی تو آپ لوگ ہوئے۔

وقار: لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کسوٹی بناتا کس چیز کو ہے۔ افسانہ نگار اگر کہتا ہے کہ یہ میرا نقطۂ نظر ہے تو وہ یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہوتا کہ یہ نقطۂ نظر اس نے یوں ہی فضا میں سے اچکا ہے۔ اس کی جڑیں کہیں نہ کہیں ہوتی ہیں اور عموماً یہ جڑیں بہت گہری میں ہوتی ہیں۔

احسان: اسی طرف تو میں نے اشارہ کیا ہے کہ ہمارا ملک نئی تشکیل میں آچکا ہے۔ اب اس کے تقاضے اور اس کا انداز مختلف ہونا چاہیے اور یہ کہ دس کروڑ انسان جو پاکستان کے ہیں کیا آپ اپنے افسانوں میں ان کی صورتیں دیکھتے ہیں یا ان کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

وقار: مجھے تو ان افسانوں میں ان کی صورتیں بھی نظر آتی ہیں اور ان کے مجسم پیکر بھی۔ معلوم نہیں آپ کو کیوں نظر نہیں آتے۔

اعجاز: پورے دس کروڑ کا مشاہدہ تو ایک افسانے میں مشکل ہے (قہقہہ) اگر ایک افسانے میں ایک فرد کا پورا چہرہ بھی نظر آ جائے تو بڑی کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ایک فرد اب دس کروڑ کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ اگر ایک فرد کا چہرہ پوری طرح فوٹوگراف سے قابو کر لیجیے تو۔

وقار: دخل اندازی معاف، یوں گویا ہم افسانہ نگار کو فوٹوگرافر کی سطح پر لا رہے ہیں۔

اعجاز: لیکن صاحب محض عقیدہ یا محض نظریہ ادب کے لئے شاید ضروری ہو۔ کیونکہ بہت سی مثالیں اس وقت ایسی دی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار LOYALTIES کا اظہار کئے بغیر ادب پیدا کر رہے تھے۔ میرے خیال میں تو غالب کا بھی کوئی ایسا اجتماعی نقطۂ نظر نہیں تھا حالانکہ ہر بڑے ادیب کا زندگی کے بارے میں ایک رویہ ہوتا ہے۔

ادیب: اگر غالب کے یہاں کوئی رویہ نہیں تو داغ اور غالب میں کیوں فرق ہے؟

اعجاز: وہ فرق رویے کا تھا۔

وقار: اسے آپ نقطۂ نظر کہیے یا رویہ کہیے، ادیب اور شاعر بہرحال دونوں کا اثر قبول کرتا ہے۔

انتظار: نقطۂ نظر یہ مولانا ظفر علی خاں کے پاس تھا، یا حالی کے پاس، اور رویہ غالب کے پاس تھا۔

وقار: غالب کے پاس بھی رویہ کہاں تھا اور رویئے نہ ہونے ہی نے یا اس کے نہ ہونے کے احساس نے اسے ایک مخصوص نقطۂ نظر دیا تھا۔

اعجاز: میرے نزدیک تو نقطۂ نظر وہ اجتماعی شعور ہے زندگی کا جسے منشور کے طور پر سامنے رکھ کر لکھا جائے۔

ندیم: اعجاز صاحب نے فرمایا تھا کہ نقطۂ نظر کا تعلق معاشی مسائل کے سلسلے سے ہوتا ہے۔ میں اس میں ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک ہمیں معاشی نہیں معاشرتی کہنا چاہیے۔ سماج سے ادیب کا رشتہ ہی اصل چیز ہے۔ جس ادیب کو ان رشتوں کا ادراک نہیں میرے خیال میں اس کا ادب اور فن بے معنی ہے۔

انتظار: جب آپ نے طے کر دیا کہ لکھنے والے کا تعلق معاشرتی رشتوں سے تو بہرحال ہوتا ہے اس لئے ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ جس افسانہ نگار کے یہاں آپ کو معاشرتی رشتے یوں نظر نہیں آتے جیسے کہ مثلاً عصمت چغتائی کے یہاں نظر آتے ہیں

تو آپ اپنے آپ سے یہ سوال پوچھئے کہ کہیں آپ کی نظر تو غلطی نہیں کر رہی۔ کہیں ان رشتوں کو سمجھنے کے لئے آپ کو کسی الگ اندازِ نظر کی تو ضرورت نہیں ہے، اس افسانے کو کسی دوسرے طریقے سے پڑھنے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہم اس طرح سوچیں تو شاید اس نتیجے پر پہنچیں کہ ممکن ہے کہ افسانے کے قاری کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو وہ ماسی طریقے سے رشتے تلاش کر رہا ہو جیسے اس نے عصمت چغتائی کے یہاں تلاش کر لئے ہیں۔

ندیم: ہو سکتا ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر غلط ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ لکھنے والے نے بغیر کسی نقطۂ نظر کے لکھا ہو۔

وقار: سوچنے کی بات اصل میں یہ ہے کہ جب ہم نقطۂ نظر کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کس کے نقطۂ نظر سے ہوتی ہے، افسانہ نگار یا ادیب کا یا اس کے قاری کا۔ اگر ہم ادیب یا افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کو بنیاد بنائیں تو دیکھنا چاہیئے کہ اس میں روحِ عصر کارفرما ہے یا نہیں؟ کہیں اس کا نقطۂ نظر بالکل اسی کا ذاتی رویہ تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ رویہ دوسرے کو متاثر کرتا ہے کہ نہیں۔

اعجاز: انسان کا ذاتی رویہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان جس کی ضرورتیں معاشرتی ہیں، اس کے رویے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کا ذاتی رویہ ہے؟

وقار: ہاں بالکل! میرے نزدیک تو یہ بات عین ممکن ہے۔

اعجاز: میرے خیال میں تو اس طرح کا یہ تجربہ ناممکن ہے۔ پیدائش سے آخری دم تک انسان کو کسی ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ کبھی انسان کی شکل نہ دیکھے تو میرا خیال ہے کہ وہ کبھی ادب کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے یہ کہنا کہ کوئی انسانی تجربہ ذاتی تجربہ ہوتا ہے میرے نزدیک صحیح نہیں۔

وقار: جس رویے اور نقطۂ نظر کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس میں زندگی سے جتنا زیادہ تعلق ہو گا اور فن کار اور زندگی کے باہمی ربط میں جتنی گہرائی اور گیرائی ہوگی اس کا نقطۂ نظر اسی حد تک دوسروں کے لئے قابلِ قبول اور مؤثر ہوگا۔ اس لئے فنکار کو زندگی کی رفتار کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہیے۔ جتنا بھی وہ پیچھے رہتا جائے گا اس کا رویہ اور نقطۂ نظر محدود ہوتا جائے گا اور اس کے اور اس کے مخاطب کے باہمی رشتے کمزور ہو جائیں گے۔

اعجاز: زندگی میں گہرائی ہے، ربط ہے، یا زندگی سے فن کار کا رشتہ کیا ہے ہم یہ بات کبھی ادیب کے حالات سے نہیں جانتے اس کے ادب سے جانتے ہیں۔ غالب کا زندگی سے کیا رابطہ تھا اور اس کی صورتِ حال کیا تھی اس کی شعر و شاعری سے ہم اس بات تک پہنچتے ہیں۔ غور کی بات یہ ہے کہ یہ رشتہ ادب میں کس طرح ڈھل جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ بات غیر ادیب کو معلوم نہیں ہوتی بلکہ خود ادیب کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کیا ہے۔ اس لئے ہم کرتے یہ ہیں کہ ادب کے مطالعے سے واپسی کا سفر کرتے ہیں۔ پہلے اس کا شعر یا افسانہ دیکھتے ہیں اور پھر پیچھے کی طرف نظر ڈالتے ہیں اور اس طرح ہم دریافت کرتے ہیں کہ اس کا زندگی سے کیا رشتہ ہے۔ کیا یہ PROCESS آپ کے نزدیک صحیح PROCESS ہے۔ کیا یہ درست پراسیس ہے کہ ہم ایک چیز کو لے کر کہیں کہ ہم اس سے یہ تلاش کر رہے ہیں کہ غالب کا زندگی سے کیا رشتہ تھا۔ ہوتا اصل میں یہ ہے کہ ایک ادب پارے کو لے کر ہم کہتے ہیں کہ صاحب صورتِ حال یہی ہے غالب کا یہ شعر کامیاب ہے کیونکہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا وہ کہہ گیا ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا وہ کہہ گیا ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا، ہم کو اس نے الگ تو بتایا نہیں اس کی شاعری ہی سے ہم نے نتیجہ نکالا ہے کہ ہمارے خیال میں وہ کہنا کیا چاہتا تھا۔

یہ جس چکر میں ہم پھنسے ہوئے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو کوئی بات پسند آجاتی ہے وہ نقطۂ نظر جس کی ہم تلاش کر رہے ہوتے ہیں ہمیں مل جاتا ہے اس لیے ہم اس پر یہ لیبل چسپاں کر دیتے ہیں کہ صاحب اس سے ہم کو یہ معلوم ہوا کہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا۔

ادیب: اعجاز صاحب اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاعر کی طرح ہم اس عہد سے خود بھی مربوط ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس عہد کے مسائل کیا تھے۔ ہم غالب کی شاعری میں جن مسائل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں ان سے ہم آگاہ ہیں۔

انتظار: معلوم نہیں اس زمانے کے قاری نے اس کی شاعری کو کس طریقے سے سمجھا ہے اور اس سے کیا معنی نکالے۔ یہ ایک الگ داستان ہے لیکن جو قاری آج ہے اس کے اپنے تجربات ہیں۔ ان تجربات کے حوالے سے وہ ایک شعر کو پڑھتا ہے، اور پھر اس میں وہ ایسے معنی نکالنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے آج کے تجربات سے مربوط ہیں۔ چنانچہ عہد بہ عہد شاعری کی تعبیریں بدلتی رہتی ہیں۔

احسان: انتظار صاحب ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ اِس زمانے اور اُس زمانے، دونوں کے حالات مختلف ہو جائیں اور اس سے شعر کے معنی میں فرق آجائے۔

اعجاز: اگر ادیب اپنے عہد کے مسائل کے بارے میں لکھتا ہے اور ہر ادیب اُس صورت حال کے بارے میں لکھتا ہے جو اس کے اردگرد ہوتی ہے تو پھر میری گستاخی معاف فرمائیے اس کا ادب اس کے عہد کے ساتھ مر جاتا ہے۔ میں کوئی حرف آخر نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کے سامنے ایک مسئلہ پیش کر رہا ہوں۔ آپ اس کو رد کر دیجیے لیکن اس پر ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی ادیب صرف اپنے عہد کے مسائل کے بارے میں لکھتا ہے اور انہی سے عہدہ برآ ہونے کا نام عظیم ادب ہے تو پھر اس ادب کو بے معنی ہو جانا چاہیے ان نسلوں کے لئے جن کے سامنے وہ مسائل نہیں رہے۔ اگر کسی ادیب کا ادب اس کے بعد بھی زندہ رہتا ہے جب اس عہد کے مسائل مر چکے ہوتے ہیں تو پھر آپ کو یہ بات تلاش کرنی پڑے گی کہ وہ عظیم ادب اگر وہ اپنے عہد کے مسائل کے بارے میں لکھ رہا تھا تو اس کا ادب مسائل کے ساتھ کیوں نہیں مر گیا۔

ندیم: اس لئے کہ وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔

وقار: اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ ادب کو اگر عظیم بننا ہے اور ادب کو اگر زندہ رہنا ہے تو اس میں کوئی ایسی بات ہونی چاہیے کہ جب وہ مسائل ختم بھی ہو جائیں جن کے بارے میں وہ لکھ رہا تھا تو وہ اس کے بعد بھی زندہ رہے اور اس سے دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف مسائل کے بارے میں لکھ دینے سے بڑا ادب پیدا نہیں ہو جاتا۔

خدیجہ: دور کا دور ختم ہو جاتا ہے لیکن ادب زندہ رہتا ہے۔

اعجاز: دور کا دور ختم ہو جاتا ہے، مسائل ختم ہو جاتے ہیں، لیکن ادیب اور اس کا ادب زندہ رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف مسائل کے بارے میں لکھنے سے بڑا ادب نہیں پیدا ہوتا اس کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے جو اسے زندہ رکھتی ہے۔ ہمیں وہ چیز ڈھونڈنی پڑے گی۔ اس لئے اس بات کو TEST نہ بنایئے کہ ادب اپنے عہد سے کہاں تک ہم آہنگ ہے، اپنی زندگی سے کس قدر قریب ہے۔ اسے FINAL TEST نہ سمجھئے ورنہ اس عہد کے ادب کے کوئی معنی دوسرے عہد میں باقی نہیں رہیں گے۔

ندیم: لیکن ادیب اپنے مسائل کو، اپنے دور کے مسائل کو اس طرح اپناتا ہے کہ اس کی ادبی حیثیت آفاقی ہو جاتی ہے اور وہ ادب آئندہ

بھی زندہ رہتا ہے۔

اعجاز: سوال اب بھی وہیں کا وہیں ہے۔ آخر وہ چیز کیا ہے جس سے ادب آفاقی بنتا ہے۔ مثلاً غالب نے ۱۸۵۷ء کا ذکر کیا ہے۔ اگر واقعی اس نے ذکر کیا ہے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ ہم نے دیکھی بھی نہیں ہے اور ہم ہوائی جہاز اور ایٹم کے عہد میں رہ رہے ہیں اور ہمارا طرزِ احساس بدل گیا ہے۔ اس کے باوجود غالب میں وہ کیا چیز ہے جو اسے اپنے عہد سے آگے لے گئی۔ لہٰذا کوئی بات ایسی ہونی چاہیے کہ اپنے عہد کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے باوجود اس میں ایک چیز PLUS ہو جو اس ادیب کو اپنی طبعی زندگی سے آگے لے جائے۔ وہ کیا چیز ہے؟

وقار: ساری تاریخ کو فرض کر لیجئے کہ ہم سو عہدوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ان سو عہدوں کے جذباتی اور ذہنی تقاضے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ روح ہے۔ اور یوں سو روحیں ہیں، لیکن ایک انسان ہے جو ان سب عہدوں میں مشترک ہے۔ ادب اپنے عہد کے حالات کے پس منظر میں ہی اس مشترک انسان کے ذہن کو، اس کے جذبے کو اور اس کے احساس کو اور ان قدروں کو جو اس مشترک انسان کے لیے ہر زمانے میں یکساں ہیں اپنے عہد کی کسوٹی پر کستا ہے اور اپنے تجربے کو ہمہ وقتی تجربے کی یا دوامی تجربے کی صورت دیتا ہے۔ ہمیں ادب کو اسی ہمہ وقتی اور دوامی کسوٹی پر کسنا چاہیے۔

اعجاز: میں ایک مثال پیش کرتا ہوں، مثلاً داغ ہے۔ وہ اپنے زمانے میں جو غزلیں لکھتا تھا وہ بے حد مقبول ہوتی تھیں اور میرے خیال میں وہ اب بھی مقبول ہیں۔ کوئی روح عصر ایسی تھی جس کو داغ نے اپنی غزلوں میں گرفتار کیا لیکن اس کے باوجود کہ وہ اپنے عہد کے مسائل سے پوری طرح عہدہ برآ ہوا کوئی بات ایسی تھی کہ آگے چل کے اک دم غالب کا گھوڑا آگے نکل آیا۔ اور داغ پیچھے رہ گیا۔ اس جگہ یہ بات بھی نہ بھولئے کہ اپنے عہد میں غالب کو شاید اتنی داد نہ ملی جتنی کہ داغ کو اپنے عہد میں اور اسی لئے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا چیز ہوتی ہے ادب میں کہ اپنے عہد کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ جو اسے بڑا ادب بناتی ہے۔ بڑے ادب کا TEST یہ ہوتا ہے کہ جب عہد گزر جاتا ہے تو اس کے بعد بھی اس میں سے ایک چیز ابھرتی ہے یا نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار آیا ہے اس کی اتنی اچھی قسمت نہ تھی، اس کا نصیبہ اتنا اچھا نہ تھا، جتنا منٹو کا تھا اور کرشن چندر کا تھا۔ بیدی کا تھا۔ نصیبے کا بھی فرق ہوتا ہے ان سب کو ایسا ماحول ملا کہ انھیں اپنے پیش رووں سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن اس اتفاقی خوش نصیبی سے الگ ایک چیز ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایک عہد کا ادیب دوسرے عہد میں بھی پڑھا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرا ادیب محض اپنے عہد کے مسائل سے عہدہ برآ ہوتا رہتا ہے اور آگے جا کے ایک دم ختم ہو جاتا ہے۔

وقار: وہی چیز ہے جسے ابھی ندیم صاحب نے آفاقیت کہا تھا اور جسے میں نے انسان کی وہ خصوصیت کہا تھا جو ہر زمانے میں یکساں رہتی ہے۔ انسان کا یہ مشترک انسانی مزاج زمان و مکاں کی قیدوں سے آزاد ہے۔ یہ مزاج کسی خاص زمانے میں رہنے سے یا کسی خاص ملک میں رہنے سے نہیں بدل جاتا۔ جو چیز یا ہر زمانے اور ہر عہد میں مشترک ہیں وہ بعض بنیادی جبلتیں، بنیادی احساسات میں بعض بنیادی تاثرات اور مخصوص رد عمل ہیں جن کی نوعیت ہمیشہ اور ہر جگہ یکساں ہے۔ تجربے صرف اپنے زمانے

کے ہیں وہ ان تجربوں کو دوسرے عہد کے تجربوں سے پیوست کر کے نہیں دیکھتا۔ اس لیے ایسا لکھنے والے کا ادب اس عہد کے تجربوں سے پیوست کر کے نہیں دیکھتا۔ اس لئے ایسا لکھنے والے کا ادب اس عہد کے ساتھ ختم ہو جانا چاہیے، کیونکہ اس نے اپنے عہد کے تجربوں کو پوری انسانی تاریخ یا اس کی تہذیبی تاریخ سے پیوست کر کے نہیں دیکھا۔ اس نے حاضر کو محض حاضر سمجھا اس کے مقابلے میں ایک لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ لمحہ جو گزر رہا ہے وہ بہت اہم ہے، لیکن اس لمحے کا رشتہ ان بہت سے لمحوں سے ہے جو گذر چکے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اس وقت میں جو تجربہ کر رہا ہوں، جس انسانی تجربے سے، بلکہ جو تجربے بیت چکے ہیں اور جو گذرنے والے ہیں ان سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔ جو کوئی اس انداز نظر کے ساتھ اپنے حال کے تجربے کو اپنی گرفت میں لانے کی سعی کرتا ہے اس کی تحریر محض عصر حاضر کے ساتھ نہیں مر جاتی۔ بلکہ اس میں ایسے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، ایسی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے عہد کو SURPASS کر جاتی ہے۔

ندیم: چلئے کہیں تو اتفاق ہوا۔

طفیل: کہیں یہ اتفاق پہلی اور آخری بار نہ ہو۔ (قہقہہ)

وقار: اتفاق اگر ہو جائے تو وہ جاری رہتا ہے۔ ہم سب اس وقت اس خیال سے متفق ہیں کہ ہمارا حال کا تجربہ ماضی کے تجربے سے اور آئندہ آنے والے تجربے سے مربوط ہے اور اس ربط کے بغیر کوئی ایسا نقطۂ نظر پیدا نہیں ہوتا جو قائم اور باقی رہنے والے ادب کی تخلیق کر سکے۔ اس اتفاق رائے کے بعد ہمارا فوری اور منطقی سوال یہ ہے اور ہونا چاہیے کہ کیا ہمارا افسانہ نگار واقعی اس عمل سے عہدہ برآ ہوا ہے، کیا اس نے جس چیز کو موضوع بنایا ہے اپنے افسانے کا اسے محض اپنی قریبی زندگی تک محدود رکھا ہے یا اسے ماضی کے تجربے سے بھی مربوط کیا ہے اور اس میں مستقبل کا عکس بھی دیکھا ہے یا دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

انتظار: آپ کی اس گفتگو کے جواب میں میں یہ عرض کروں گا کہ جب ہم نے یہ طے کر لیا کہ ایک عہد میں جو انسانی تجربہ گزر رہا ہے وہ خود مختار نہیں ہوتا، تو ہمیں تقسیم کے بعد بالکل دوسرے انداز سے دیکھنا پڑے گا۔ مثلاً قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" اور عصمت چغتائی کا ناول ہے "ٹیڑھی لکیر"۔ "ٹیڑھی لکیر" میں اپنے عہد کے تجربے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" میں اس بات پر قناعت نہیں کی گئی کہ محض اپنے عہد کے ایک تجربے کو گرفت میں لایا جائے۔ یہاں اپنے عہد کے تجربے کو تاریخ کے مختلف تجربوں کے پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی، اور تخلیق کرنے کی، اور گرفت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ عمل عصمت چغتائی کے ناول کے عمل سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ آپ کو اس ناول کو یا اس قسم کے ادب کو سمجھنے کے لئے اس انداز کو، اور ان پیمانوں کو جو آپ نے عصمت چغتائی کو یا منٹو کو سمجھنے کے لئے وضع کئے تھے، الگ رکھنا پڑے گا اور اس قسم کے ادب کو بالکل دوسرے طریقے سے دیکھنا پڑے گا۔

ندیم: میرے نزدیک تو یہ قرۃ العین حیدر کا ذاتی اسلوب تھا جس کے مطابق انھوں نے یہ ناول لکھا۔

اعجاز: یہی بات منٹو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، عصمت کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے، اور کرشن چندر کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے اور بیدی کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ہر مصنف کے بارے میں، جو ادب میں کوئی مقام پیدا کرتا ہے، کہا جا

سکتا ہے کہ بڑی حد تک اس کا اسلوب ذاتی اسلوب ہے۔ یہاں تک کہ غالب کی شاعری کے بارے میں بھی۔ شاید ایک مضمون کو اوروں نے بھی باندھا ہو لیکن غالب کے ذاتی اسلوب نے اس کو آگے کر دیا۔ دوسرے عہد کی کڑیاں آپس میں جڑتی جائیں اور ان سے ایک زنجیر بنتی جائے۔ یوں گویا یہ محض اسلوب کی بات نہیں بلکہ فکر کی اور سوچ کی بات ہے جو آج کے افسانہ نگار کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ندیم : اس سے کہیں یہ مراد تو نہیں کہ اب افسانہ نگار اسی نہج پہ لکھنا شروع کر دیں۔

انتظار : جی نہیں! آگ کا دریا لکھنے والے کے ذہن میں خاکہ یا یہ بات نہیں۔ یہ بات اور ہے کہ دوسرا اس نہج سے متاثر ہو کر اسے اختیار کرے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ "ٹیڑھی لکیر" چھوٹا ناول ہے۔ قرۃ العین حیدر یا ہر وہ شخص جو اس طریقے سے افسانہ لکھتا ہے وہ بڑا ہے اور منٹو یا کرشن چندر چھوٹے افسانہ نگار ہیں۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اندازِ نظر یہاں مختلف ہے۔ اس لئے اس اندازِ نظر کے تحت جو کچھ لکھا جا رہا ہے اسے سمجھنے کے لئے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے آپ کو اپنا اندازِ نظر یا اپنا پیمانہ ذرا مختلف استعمال کرنا پڑے گا۔

وقار : ٹیڑھی لکیر میں بھی یہی بات ہے کہ اس زمانے کا انسان جس الجھن میں مبتلا ہے اسے آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سچ پوچھئے جس حقیقت کو آشکارا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ صرف آج کے انسان کا تجربہ نہیں۔ اسی تجربے میں سے ماضی کا انسان بھی گزرا ہے، لیکن کسی نے اس کے اس تجربے کا تجزیہ نہیں کیا اور اس کی تحلیل نہیں کی۔

طفیل : ناولوں یا افسانوں میں جو تاریخی پس منظر بیان کیا جاتا ہے کیا وہ بہت ضروری ہے؟

انتظار : وہ پس منظر نہیں ہے، اصل میں وہ تو افسانہ ہے۔

طفیل : خواہ وہ دو ڈھائی سو صفحوں میں کیوں نہ لکھا گیا ہو؟ میرا خیال ہے کہ اگر وہ تاریخی واقعات نکال بھی دیئے جائیں تو بھی افسانہ یا ناول مکمل ہی رہتا ہے اور اگر اس نوع کی تفصیل ضروری ہو تو وہ بھی اس حد تک کہ کھلے نہیں۔

انتظار : جی نہیں، یہ پس منظر ناول کے لئے ضروری ہے۔

خدیجہ : سوچنے کا یہ انداز شاید صحیح نہیں کہ یہ ٹکڑا نکال دیں تو کیا ہوگا اور کیا نہیں۔ بلکہ ہمیں تو چاہیے کہ جس طرح افسانہ نگار یا ناول نگار نے دیکھا ہے ہم اسے اسی طرح دیکھیں۔

طفیل : ایسی صورت میں ہوگا یہ کہ جسے تاریخ سے دلچسپی ہوگی وہ تو خوب لطف اندوز ہوگا اور جو صرف افسانہ یا ناول پڑھنا چاہتا ہے اسے ضرور الجھن ہوگی۔

وقار : کوئی حصہ نکال لینے اور کوئی حصہ باقی رکھنے کے سلسلے میں بھی سوچنے کی اصل بات یہ ہے کہ جن ناولوں یا افسانوں میں تاریخی واقعات کو ایک مربوط تسلسل کے ساتھ پس منظر بنایا گیا ہے وہاں کوئی حصہ نکال دینے سے کہانی پہ ضرور فرق پڑے گا۔ گو بعض صورتوں میں ایسا ہے کہ کسی حصے کے نکال دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مثلاً نذیر احمد کے بعض ناولوں میں یا سرشار کے فسانۂ آزاد میں جہاں واقعات میں کوئی باہمی ربط نہیں۔ ہر واقعہ ایک مکمل اکائی ہے اور اس کا اگلے اور پچھلے واقعات سے کوئی باقاعدہ ربط نہیں۔

طفیل : اردو میں اس روش کی علمبردار قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ اپنے علم و فضل سے ہمیں چکرا دینا چاہتی

تھیں سو وہ اس میں صدفی صد کامیاب ہیں۔ (قہقہہ) چونکہ ان کے ہاں تاریخ پہ گرفت کے ساتھ خوب صورت اسلوب بھی ہے۔ اس لئے ان کی ایسی تحریروں میں بھی حسن پیدا ہو گیا اور یہ انداز شاید کسی اور کے بس کی بات بھی نہیں۔

وقار: حنیف صاحب! عام رجحان اس زمانے کے افسانہ نگار یا ناول نگار کا یہ ہے کہ وہ علمیت کے بجائے عالمیت کا اظہار کرتا ہے۔ علمیت کے حسن تعبیر اور نمائش کے سفر پہ وہ کسی فلسفی کو ساتھ لئے بغیر چل پڑتا ہے۔ کبھی کبھی وہ کسی فلسفے کی ترجمانی بھی کرنے لگتا ہے۔ مگر افسانہ نگار یا ناول نگار یہ نہیں سمجھتا کہ میرا ناول یا افسانہ اس فلسفے کو پوری طرح گرفت میں لئے بغیر، اس کا صحیح ادراک کئے بغیر اور اسے اپنے فکر میں رچائے بغیر، اگر محض فلسفے کی نمود کی خاطر کوئی افسانہ لکھے گا تو پھر اس میں یقیناً خرابی ہو گی۔ یعنی کہانی کہانی باقی نہیں رہے گی اور پڑھنے والا کسی الجھن میں مبتلا ہو کر رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے ناول میں یہی بات ہو۔ میں قرۃ العین کا ذکر چھوڑ کر ممتاز شیریں کے حوالے سے اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ممتاز شیریں نے دو طرح کے افسانے لکھے۔ ایک گھریلو زندگی کے جیتے جاگتے، مؤثر افسانے۔ دوسرے "میگھ ملہار" والے افسانے۔ ان افسانوں میں میرے نزدیک وہی علمی تصنع ہے جس کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا۔

انتظار: ایک بات عرض کروں۔ میگھ ملہار اس قسم کا افسانہ ہے جس میں ممتاز شیریں ایک انسانی تجربے کو محض اس علمی انداز میں اور اس چوکھٹے میں رکھ کر جو حال کا چوکھٹا ہے، ماضی کے جو مختلف چوکھٹے ہیں وہ سب ان کی نظر میں ہیں اور وہ اس شے کے تجربے کو ان چوکھٹوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک چوکھٹا دیومالائی ہے، پوری انسانی دیومالا کا چوکھٹا، تاریخ اور مختلف تہذیبوں کے حوالے سے یا مختلف تاریخ کے تجربوں کے حوالے سے وہ اس تجربے کو گرفت میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہاں نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک انسانی تجربہ اگر محض حال کے چوکھٹے میں ہے تو بظاہر تو ہم نے اسے گرفت میں لے لیا لیکن اصل میں ہم نے اسے گرفت میں نہیں لیا۔ کیونکہ وہ تجربہ محض حاضر میں قید نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں اور اس کے رشتے دور دور تاریخ میں اور دیومالاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جب یہ تصور سامنے آئے گا اور اس تصور کے تحت افسانہ نگار لکھے گا تو میگھ ملہار قسم کا افسانہ یا آگ کا دریا قسم کا ناول پیدا ہو گا، اور پھر وہ قاری جس نے محض وہ افسانہ پڑھا ہے جو سیدھے سادے حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھا گیا ہے وہ کہے گا کہ صاحب اس میں علمیت ہے، کیونکہ یہاں قاری کے وقت کے تقاضے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں قاری سے یہ تقاضا ہوتا ہے کہ آپ کا VISION اور آپ کی بصیرت بھی میرے اس حوالے سے ذرا زیادہ وسیع ہو۔

ندیم: میرے خیال میں قاری کو یہ حق تو پہنچتا ہے کہ وہ افسانہ نگار سے کہے کہ آپ کا علم تو بہت بڑا ہے لیکن آپ افسانہ نگار یا ناول نگار ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ یہ چیز اقتصادیات سے متعلق ہے یا تاریخ سے یا اپنی ذات سے، بلکہ وہ افسانے اور ناول کا ایک حصہ معلوم ہو جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے بہت سی جگہوں پہ آگ کا دریا میں کامیابی سے کیا ہے۔ کئی افسانہ نگاروں کے بہت سے افسانے ایسے ہیں جن میں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افسانہ نگار کامیاب نہیں ہوا۔ نیت اس کی نیک تھی لیکن اس کا علم اور اس کا افسانہ ناکام رہا۔

انجم: قاری کا ایک تقاضا یہ بھی تو ہے کہ وہ کہے کہ صاحب کہانی سنائیے۔

انتظار: کہانی تو صاحب داستان گو سناتا تھا۔ کہانی تو منٹو اور عصمت کے دور میں بھی نہیں سنائی گئی۔ بات یہ ہے کہ جیسے میرامن نے کہانی سنائی، ایسی تو کسی نے نہیں سنائی۔

اعجاز: منٹو اور عصمت نے کہانی تو ضرور سنائی ہے لیکن میرامن کی طرح سناتے تو شاید پاس ہی فیل ہو جاتے۔

طفیل: آج کا افسانہ نگار تو محض زور بیان کی بنا پر ہیئر کو موضوع بنا کر کہانی لکھنا پسند کرتا ہے۔ اس طرح بھلا کہانی کیسے پنپے گی۔ نئے لکھنے والے تو جدیدیت کی دھن میں کہانی پن کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری اردو افسانے سے شکایتیں لئے بیٹھا ہے۔

وقار: طفیل صاحب! معاف کیجیے گا، کہانی تو میرے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ افسانہ نگار کہانی پیدا کرنا چاہے اور کہانی پیدا کر سکے۔ لیکن لوگوں نے فلسفیانہ مقالے لکھنے شروع کر دیئے ہیں بجائے افسانوں کے یہاں تک کہ اس کے خلاف احتجاج ہوا ہے۔ ایک گروہ تو اسے احتجاج کہتا ہے لیکن ایک گروہ کو اس بات پر اصرار ہے کہ نہیں اصل حقیقت یہی ہے۔ اینٹی تھیٹر ایک چیز ہے۔ اینٹی ناول ایک چیز ہے اور اینٹی ہیرو بھی ایک چیز ہے لیکن یہ بھی اصلیت اور حقیقت کے رُخ ہیں۔ پھر بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہیرو کوئی چیز نہیں۔ اصل میں اینٹی ہیرو ہی آج کا انسان ہے لیکن یہ چیزیں ہمارے ہاں کم ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ ہم پھر کہانی کی طرف لوٹ رہے ہیں اس لئے کہ قاری تو کہانی لکھنے والے سے کہانی چاہتا ہے۔

(انور سجاد آتے ہیں)

انتظار: جب ہم ساری لڑائی لڑ چکے تب سجاد صاحب کی صورت نظر آئی۔

ندیم: اب آپ آئے جب میرا دم نکل چکا۔

انتظار: یہ تو بڑی زیادتی کی آپ نے۔

طفیل: دیکھ لیجئے۔ انتظار صاحب نے خود ہی اقرار کر لیا کہ وہ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے نئی نسل کی اس حد تک نمائندگی کی ہے کہ اپنے سے پہلے لکھنے والوں کا حق بھی ادا نہیں کیا۔ پھر بھی اس ساری بحث کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ کیا ہم واقعی آگے جا رہے ہیں؟ یا آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں؟

انتظار: وہ تو طے ہو چکا۔ اب ہم اس اقلیم میں داخل ہو چکے ہیں جہاں ہم علامتی افسانے پر گفتگو کر سکتے ہیں۔

اعجاز: طفیل صاحب اگر آپ یہ کہیں کہ جب ہم یہاں سے اٹھیں گے تو ہر بات پر اتفاق رائے ہو چکا ہوگا تو یہ تو بڑی مشکل بات ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم اپنے تعصبات کا اظہار کر چکے ہوں گے اس وقت تک۔

انتظار: انور صاحب میں اب تک یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ اعجاز صاحب کبھی میری ہم نوائی کرتے تھے اور کبھی مخالفت۔

اعجاز: ہاں کبھی میں آپ کی ہم نوائی کرتا ہوں اور کبھی نہیں کرتا۔

انتظار: تقسیم کے بعد کے جو افسانہ نگار ہیں وہ اس انداز میں لکھ رہے ہیں جو حقیقت نگاری کا اسلوب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کا تجربہ طفیل صاحب کے نزدیک تقسیم سے پہلے کے افسانہ نگاروں کے تجربے سے مختلف ہے اور ان کا انداز بیان اس لئے مختلف ہو گیا اور ان کی تکنیک بھی اسی لئے مختلف ہو گئی ہے۔ یہ باتیں اس لئے ہیں کہ ان کا چیزوں کو دیکھنے کا انداز مختلف ہو گیا ہے۔

تھیں سو وہ اس میں صد فی صد کامیاب ہیں۔ (قہقہہ) چونکہ ان کے ہاں تاریخ پر گرفت کے ساتھ خوب صورت اسلوب بھی ہے۔ اس لئے ان کی ایسی تحریروں میں بھی حسن پیدا ہو گیا اور یہ انداز شاید کسی اور کے بس کی بات بھی نہیں۔

وقار: طفیل صاحب! عام رجحان اس زمانے کے افسانہ نگار یا ناول نگار کا یہ ہے کہ وہ علمیت کے بجائے مافیت کا اظہار کرتا ہے۔ مافیت کے اس [illegible] اور نمائش کے سفر پر وہ کسی فلسفی کو ساتھ لئے بغیر چل پڑا ہے۔ کبھی کبھی وہ کسی فلسفے کی ترجمانی بھی کر لیتا ہے مگر افسانہ نگار یا ناول نگار یہ نہیں سمجھتا کہ میرا ناول یا افسانہ اس فلسفے کو پوری طرح گرفت میں لئے بغیر، اس کا صحیح ادراک کئے بغیر اور اسے اپنے فکر میں رچائے بغیر، اگر محض فلسفے کی نمود کی خاطر کوئی افسانہ لکھے گا تو پھر اس میں یقیناً خرابی ہوگی۔ یعنی کہانی کہانی باقی نہیں رہے گی اور پڑھنے والا کسی الجھن میں مبتلا ہو کر رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے ناول میں یہی بات ہو۔ میں قرۃ العین کا ذکر چھوڑ کر ممتاز شیریں کے حوالے سے اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ممتاز شیریں نے دو طرح کے افسانے لکھے۔ ایک گھریلو زندگی کے بڑے بھرے بھرے، موثر افسانے۔ دوسرے "میگھ ملہار" والے افسانے۔ ان افسانوں میں میرے نزدیک وہی علمی تصنع ہے جس کا میں بھی تذکرہ کر رہا تھا۔

انتظار: ایک بات عرض کروں۔ میگھ ملہار اس قسم کا افسانہ ہے جس میں ممتاز شیریں ایک انسانی تجربہ کو محض اس علمی انداز میں اور اس چوکھٹے میں رکھ کر جو حال کا چوکھٹا ہے، ماضی کے جو مختلف چوکھٹے ہیں وہ سب ان کی نظر میں ہیں اور وہ اس سے کے تجربے کو ان چوکھٹوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک چوکھٹا دیومالائی ہے، پوری انسانی دیومالا کا چوکھٹا۔ تاریخ اور مختلف تہذیبوں کے حوالے سے یا مختلف تاریخ کے تجربوں کے حوالے سے وہ اس تجربے کو گرفت میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہاں نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک انسانی تجربہ اگر محض حال کے چوکھٹے میں ہے تو بظاہر تو ہم نے اسے گرفت میں لے لیا لیکن اصل میں ہم نے اسے گرفت میں نہیں لیا۔ کیونکہ وہ تجربہ محض حاضر میں مقید نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں اور اس کے رشتے دور دور تاریخ میں اور دیومالاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جب یہ تصور سامنے آئے گا اور اس تصور کے تحت افسانہ نگار لکھے گا تو میگھ ملہار قسم کا افسانہ یا آگ کا دریا قسم کا ناول پیدا ہوگا، اور پھر وہ قاری جس نے محض وہ افسانہ پڑھا ہے جو سیدھے سادے حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھا گیا ہے وہ کہے گا کہ صاحب اس میں علمیت ہے، کیونکہ یہاں قاری کے وقت کے تقاضے زیادہ ہو جاتے ہیں، یہاں قاری سے یہ تقاضا ہوتا ہے کہ آپ کا VISION اور آپ کی بصیرت بھی میرے اس حوالے سے ذرا زیادہ وسیع ہو۔

ندیم: میرے خیال میں تو قاری کا یہ تقاضا مناقد قدرتی ہے کہ وہ افسانہ نگار سے کہے کہ آپ کا علم تو بہت بڑا ہے لیکن آپ افسانہ نگار یا ناول نگار ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ یہ چیز اقتصادیات سے تعلق ہے یا تاریخ سے یا اپنی ذات سے، بلکہ وہ افسانے اور ناول کا ایک حصہ معلوم ہو جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے بہت سی جگہوں پہ آگ کا دریا میں کامیابی سے کیا ہے۔ کئی افسانہ نگاروں کے بہت سے افسانے ایسے ہیں جن میں صاف طور پہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افسانہ نگار کامیاب نہیں ہوا نیت اس کی نیک تھی لیکن اس کا علم اور اس کا افسانہ ناکام رہا۔

انجم: مانا قاری کا ایک تقاضا یہ بھی تو ہے کہ وہ کہے کہ صاحب کہانی سنائیے۔

انتظار: کہانی تو صاحب داستان گو سناتا تھا۔ کہانی تو منٹو اور عصمت کے دور میں بھی نہیں سنائی گئی۔ بات یہ ہے کہ جیسے میر امن نے کہانی سنائی، ایسی تو کسی نے نہیں سنائی۔

اعجاز: منٹو اور عصمت نے کہانی تو ضرور سنائی ہے لیکن میر امن کی طرح سناتے تو شاید بالکل ہی فیل ہو جاتے۔

طفیل: آج کا افسانہ نگار تو محض زور بازو کی بنا پر میز کو موضوع بنا کر کہانی لکھنا پسند کرتا ہے۔ اس طرح بھلا کہانی کیسے پنپے گی۔ نئے لکھنے والے تو جدیدیت کی دھن میں کہانی پن کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری اردو افسانے سے شکایتیں لئے بیٹھا ہے۔

وقار: طفیل صاحب! معاف کیجیے گا، کہانی تو میز سے بھی پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ افسانہ نگار کہانی پیدا کرنا چاہے اور کہانی پیدا کر سکے۔ لیکن لوگوں نے فلسفیانہ مقالے لکھنے شروع کر دیئے ہیں بجائے افسانوں کے۔ یہاں تک کہ اس کے خلاف احتجاج ہوا ہے۔ ایک گروہ تو اسے احتجاج کہتا ہے لیکن ایک گروہ کو اس بات پر اصرار ہے کہ نہیں اصل حقیقت یہی ہے۔ اینٹی تھیٹر ایک چیز ہے۔ اینٹی ناول ایک چیز ہے اور اینٹی ہیرو بھی ایک چیز ہے لیکن یہ بھی اصلیت اور حقیقت کے رُخ ہیں۔ پھر بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہیرو کوئی چیز نہیں۔ اصل میں اینٹی ہیرو ہی آج کا انسان ہے لیکن یہ چیزیں ہمارے ہاں کم ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ ہم پھر کہانی کی طرف لوٹ رہے ہیں اس لئے کہ قاری تو کہانی لکھنے والے سے کہانی چاہتا ہے۔

(انور سجاد آتے ہیں)

انتظار: جب ہم ساری لڑائی لڑ چکے تب سجاد صاحب کی صورت نظر آئی۔

ندیم: اب آپ آئے جب میرا دم نکل چکا۔

انتظار: یہ تو بڑی زیادتی کی آپ نے۔

طفیل: دیکھ لیجئے۔ انتظار صاحب نے خود ہی اقرار کر لیا کہ وہ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے نئی نسل کی اس حد تک نمائندگی کی ہے کہ اپنے سے پہلے لکھنے والوں کا حق بھی ادا نہیں کیا۔ پھر بھی اس ساری بحث کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ کیا ہم واقعی آگے جا رہے ہیں؟ یا آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں؟

انتظار: وہ تو طے ہو چکا۔ اب ہم اس اقلیم میں داخل ہو چکے ہیں جہاں ہم علامتی افسانے پر گفتگو کر سکتے ہیں۔

اعجاز: طفیل صاحب اگر آپ یہ کہیں کہ جب ہم یہاں سے اٹھیں گے تو ہر بات پر اتفاق رائے ہو چکا ہوگا تو یہ تو بڑی مشکل بات ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم اپنے تعصبات کا اظہار کر چکے ہوں گے اس وقت تک۔

انتظار: انور صاحب میں اب تک یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ اعجاز صاحب کبھی میری ہم نوائی کرتے تھے اور کبھی مخالفت۔

اعجاز: ہاں کبھی میں آپ کی ہم نوائی کرتا ہوں اور کبھی نہیں کرتا۔

انتظار: تقسیم کے بعد کے جو افسانہ نگار ہیں وہ اس انداز میں لکھ رہے ہیں جو حقیقت نگاری کا اسلوب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کا تجربہ تنیل صاحب کے نزدیک تقسیم سے پہلے کے افسانہ نگاروں کے تجربے سے مختلف ہے اور ان کا انداز بیان اس لئے مختلف ہو گیا اور ان کی ٹیکنیک بھی اسی لئے مختلف ہو گئی ہے۔ یہ باتیں اس لئے ہیں کہ ان کا چیزوں کو دیکھنے کا انداز مختلف ہو گیا ہے۔

انور: بنیادی طور پر میں ایک بات پوائنٹ آؤٹ (POINTOUT) کرنا چاہتا ہوں جسے آپ نے حقیقت نگاری کہا ہے۔ میرا بیسک پوائنٹ آف کنٹریکشن (BASIC POINT OF CONTRACTION) ہی حقیقت نگاری ہے۔ ایک قسم کی حقیقت نگاری جو اس وقت پریویلینٹ (PVEALENT) تھی۔ ان کا ایک وژن (VISION) تھا چیزوں کو دیکھنے کا۔ وہ اس لحاظ سے حقیقت نگاری کر رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو حقیقت نگار کہتا ہوں کیونکہ جو ریئلیٹیز (REALITIES) اس وقت ایگزسٹ (EXIST) کر رہی ہیں میرے لئے وہ بھی حقیقت ہیں۔ اس لئے آپ یہ نہ کہیے کہ حقیقت نگاری کا ایک ہی اسٹائل (STYLE) تھا میرے لئے حقیقت نگاری کا ایک (STYLE) ہے جو میرا اپنا ہے۔

وقار: بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حقیقت نگاری کا ایک اسٹائل یا اسلوب وہ تھا اور ایک یہ ہے۔

انور: جی ہاں بالکل ٹھیک ہے۔

انتظار: اب دیکھیے کہ حقیقت کا تصور مختلف ہو گیا۔ اختلاف جو ظاہر ہوتا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ منٹو، عصمت اور کرشن چندر کے لئے حقیقت وہ تھی جو انھیں نظر آتی تھی اور جو اس وقت یا اس لمحے گزر رہی تھی۔ ان کے لئے وہی حقیقت تھی۔

ندیم: یہی مسئلہ ہے کہ وہ صرف دیکھتے نہیں تھے بلکہ محسوس بھی کرتے تھے۔

انور: میں سمجھتا ہوں یقیناً محسوس کرتے تھے اور پھر لکھتے تھے۔

انتظار: انھیں جو نظر آتا تھا اسے محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میرے ارد گرد جو کچھ گزر رہا ہے۔ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے، خارجی سطح پر معاشرتی سطح پر وہ حقیقت ہے اور اس سلسلے میں ان کا تصور یہی تھا لیکن وہ لکھنے والے جو آج لکھ رہے ہیں، مثلاً ممتاز شیریں یا قرۃ العین حیدر۔ اس قسم کے جو لکھنے والے ہیں ان کا حقیقت کا تصور اس سے بالکل مختلف ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ کیا حقیقت صرف وہ ہے جو صرف خارجی سطح پر میری آنکھوں کے سامنے گزر رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ حقیقت کا ایک حصہ ہے اور حاضر سے پہلے جو کچھ گزر چکا ہے اور جس کا کہیں دیومالاؤں کے ذریعے اظہار ہوا ہے اور کہیں وہ کسی تاریخ کے باب میں بند ہے، اور جو تجربے گزر چکے ہیں وہ سب حقیقت کا حصہ ہیں۔ اس طریقے سے آج کی جو حقیقت ہے آج کے لکھنے والے کے لئے زیادہ پیچیدہ اور زیادہ تہ دار ہو گئی ہے۔

انور: میں یہ عرض کروں گا کہ حقیقت اب فوٹوگرافک نہیں رہی۔ اس کے ڈیپ انالسز (DEEP ANALYSIS) کے جذبات میں انسان کے طور پر جھنکار ہے، تو جھنکار کا نعرہ ہمارے لئے سفی شنٹ (SAFFICIENT) نہیں ہے۔ پہلے لئے وہ تمام عوامل جس وجہ سے یہ آدمی جھنکا ہوا ہے اس کے اثرات اور اس کی اندرونی حقیقتیں زیادہ اہم ہیں۔

ادیب: یہ تو ان کے لئے بھی اہم تھیں۔

انور: لیکن ان کا ویو (VIEW) انتہائی فوٹوگرافک تھا۔ وہ چیزیں ان کے لئے اہم تھیں۔ میں کب کہتا ہوں کہ اہم نہیں تھیں۔

ندیم: وہ بھی جانتے تھے کہ جھنکار کیوں پیدا ہو رہی ہے اور اس کے پیدا کرنے والے کون ہیں۔

انور: نہیں جی نہیں، اس زمانے کے حقیقت پسندوں کا صرف ایک OBJECTIVE VIEW تھا۔

ندیم : آئیے آبجیکٹو (OBJECTIVE) پر ہی کچھ گفتگو کریں۔

انور : بالکل جی ضرور کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت آپ ٹوٹ PURELY SUBJECTIVE ہو کر لکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ظاہر اور باطن کو الگ خانوں میں تو تقسیم نہیں کر سکتے، لیکن مجھے ایسا کرنا پڑتا ہے۔

طفیل : میرے خیال میں اعجاز صاحب نے جو کہا تھا کہ یہ دور تفتیش اور تجسس کا دور ہے اور تجرباتی بھی ہے۔ وہ بات ٹھیک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد کے افسانہ نگار بھی اپنے تجرباتی دور ہی سے گزر رہے ہیں۔

انور : بلکہ میں تو کہوں گا کہ تشکیل کا بھی دور ہے، جہاں تک تجرباتی دور سے گزرنے کا سوال ہے وہ تو سب گزرتے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

اعجاز : یعنی ان کے سامنے زیادہ واضح راستے نہیں ؟

انور : واضح راستے کیا ہوتے ہیں ؟

وقار : واضح راستے کی تلاش اور جستجو بجائے خود ایک راستہ ہے اور بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ جب یہ رک جائے تو چھر ادب رک جاتا ہے۔ فکر رک جاتی ہے اور اس کا اظہار رک جاتا ہے۔ آج کا افسانہ نگار تلاش میں ہے کہ جو کچھ ظاہر میں وہ دیکھ رہا ہے اس کے پس پردہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس باطن کا سراغ لگا کر، پھر اس کی بنیاد پر افسانہ لکھتا ہے خواہ وہ کسی فرد سے متعلق ہو یا جماعت سے۔

طفیل : یہ تو پرانے افسانہ نگاروں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح سوچتے تھے۔ پھر نئے افسانہ نگاروں نے کیا کمال کر دکھایا ؟

انور : نئی کہانی یا نیا افسانہ، یہ نئی اور نیا کا لفظ میری سمجھ میں کبھی نہیں آتا۔ میں تو اس بات میں بلیو (BELIEVE) کرتا ہوں کہ آپ کی سوچ کنٹیمپریری (CONTEMPORARY) ہے یا نہیں۔ اگر آپ کی سوچ CONTEMPORARY ہے تو آپ زمانے کا ساتھ دیتے ہیں ورنہ یہ نیا کیا ہوتا ہے۔

وقار : نیا تو لغت کا لفظ ہے۔ ہر وہ چیز جو پہلے گزر چکی ہے وہ اب نئی نہیں ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہر وہ چیز جو نئی ہے وہ پچھلی سے بہتر بھی ہے۔

انور : بہتر کا معیار بھی تو قائم کیجیے وقار صاحب !

وقار : کہنے کا مطلب یہ ہے اگر آج کا افسانہ نگار جیسا کہ آپ کہتے ہیں ایک نئے انداز سے سوچتا ہے تو آج سے پچاس برس پہلے کا افسانہ نگار بھی کہتا تھا کہ میں پچھلے لکھنے والوں سے مختلف ہوں۔ میں اپنے زمانے کی زندگی کے ظاہر کو دیکھ کر اس کے باطن میں جاتا ہوں اور ظاہر کے اسباب یا محرکات تلاش کرتا ہوں۔ اسی طرح آج کا افسانہ نگار بھی اپنے زمانے کے واقعات کے محرکات تلاش کرتا ہے، عوامل تلاش کرتا ہے اور فرد میں اور اجتماعی زندگی میں ایک رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے، اس کی بے چینی اور اس کا تذبذب دکھانا چاہتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ صرف میری ذات میں ہی یہ بے چینی اور تذبذب نہیں ہے بلکہ پورے معاشرے میں ہے۔ میں تو اس کل کا ایک ٹکڑا اور اس کا نمونہ ہوں۔

ادیب: گویا رویہ تو وہی ہوا جو پہلے افسانہ نگار کا تھا۔

طفیل: آج کے افسانہ نگاروں نے تو پڑھنے والوں کو کنفیوز کر دیا ہے۔ وہ پریشان ہیں کہ یہ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں اور یہ کہانی ادھر جا رہی ہے اور یہ کیا ہے سب کچھ۔ یہ مضمون ہے افسانہ ہے، یا کیا ہے۔

انور: مجھے یہ احساس ہے کہ انسان کی جو TUNING ہوتی ہے وہ بڑا اہم پارٹ پلے (PART PLAY) کرتی ہے۔ آج ہماری جو ٹیون (TUNE) ہے۔ وہ اگلے زمانے کی ٹیون نہ ہوگی۔

ندیم: تبدیلی تو ہر دور میں آتی ہے اور اس کا ہمیں پچیس سال کے بعد احساس ہوتا ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ اب کے جو تبدیلی آئی اس نے لکھنے والے کو پریشان کر دیا۔ طفیل صاحب نے پریشان کا لفظ بڑا اچھا استعمال کیا ہے۔

انور: پریشان اس لئے کو دیا کہ ہمارے یا کم از کم میرے وجود کی جتنی حقیقتیں تھیں میرے لئے، میں ان سے سخت مایوس ہوں۔ انتہائی ذاتی قسم کی بات ہے کہ ۴۹ کی ترقی پسند تحریک میں میں نے اپنے آپ کو والنٹیر کی حیثیت سے پیش کیا۔ میں پمفلٹ بانٹتا پھرتا تھا۔ میرے لئے تشکیک کا دور اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے میں ڈس الوژن (DISILLUSION) ہوتا ہوں۔

احراز: ڈس الوژن منٹ کی ایک وجہ بھی تو ہوتی ہے نا!

انور: مجھے پتا نہیں کہ آپ کے ڈس الوژن منٹ (DISILLUSION MENT) کی نوعیت کیا ہے؟

ندیم: اس حد تک نہیں جانا چاہیے تھا ادیبوں کو جس حد تک ۴۹ میں وہ گئے۔

انتظار: قاسمی صاحب ایک بات ہے، جب آپ نے لکھنا شروع کیا تھا آپ نے بھی بہت پریشان کیا تھا قاری کو۔

ندیم: لیکن اس وقت ہم یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم حقیقت کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ تشکیل کے دور سے گزر رہے ہیں۔

اعجاز: آپ اس وقت کہتے تھے کہ ہم حقیقت کو پا چکے ہیں اور اس کا اظہار کر رہے ہیں اور یہی حقیقت ہے۔

انتظار: اُس وقت کا جو روایتی آدمی تھا وہ یہ کہتا تھا کہ یہ منٹو بکواس کرتا ہے اور یہ کہہ کر اس پر مقدمے چلاتا تھا کہ وہ حقیقت کو نہیں سمجھتا تھا۔

طفیل: میں یہ کہتا ہوں کہ جتنے بھی افسانہ نگار علامتوں کا سہارا لے کر افسانہ لکھتے ہیں وہ بلاوجہ قاری کو امتحان میں ڈالتے ہیں۔ یہ بھی تو ہے کہ اگر ایسا کوئی افسانہ پڑھے لکھوں کی مجلس میں پڑھا جائے تو اس کے معنی ہر ایک کے نزدیک مختلف ہوں گے اور ان مختلف آرا کی موجودگی میں جب افسانے کے معنی افسانہ نگار سے پوچھے جائیں گے تو اس کے بتائے ہوئے معنی سب سے مختلف ہوں گے۔

اعجاز: یہ بات تو وہی ہوئی کہ جیسے میراجی سے کہا گیا تھا کہ آپ کی شاعری ہماری سمجھ میں نہیں آتی، آپ ہمیں اس کے معنی سمجھائیے۔

طفیل: جی ہاں! بالکل ویسی ہی بات ہے، اس لئے کہ میراجی نے بھی اپنی بعض نظموں کے معنی مختلف اوقات میں مختلف بتائے۔ بلکہ لطیفہ تو یہاں تک ہے کہ ایک موقع پر میراجی نے اپنی ہی ایک نظم کے بارے میں کہا تھا کہ یہ نظم تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔

اعجاز: آج کل کے افسانہ نگار کا تقاضا قاری سے وہی ہے جو میراجی کا اپنے قاری سے تھا۔

وقار: اصل میں یہ بات تذبذب اور تشکیک اور حقیقت کو پوری طرح سے گرفت میں نہ لانے کی کیفیت کا نتیجہ ہے۔

ندیم: تذبذب اور تشکیک میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک مبارک چیز ہے۔ اور اسی سے جستجو کے راستے کھلتے ہیں۔

وقار: جی ہاں! اور اسی سے آدمی آگے بڑھتا ہے۔

اعجاز: میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ بیان کہ وہ سارے کا سارا دور جس کا ہم ذکر رہے ہیں اسی تشکیک میں مبتلا تھا اور اُس دور کے لکھنے والوں کے ہاتھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ تشکیک اچھی چیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تشکیک میں مبتلا ہونے کا نتیجہ فکری انتشار تھا اور اسی وجہ سے ان کے ہاتھ کوئی تجربہ نہ آیا۔ تو کیا ہم اس پر یہ فیصلہ صادر کر دیں کہ تشکیک اچھی چیز ہے۔

ندیم: اگر علامتوں کے استعمال سے انتشار ختم ہو جاتا ہے اور فکری تسلسل کا کوئی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے تو یقیناً اچھی چیز ہے۔

وقار: میرے نزدیک یہ کہنا کہ پورا دور کا دور اور اس دور کے سب افسانہ نگار تشکیک میں مبتلا ہیں، درست نہیں ہے۔

ندیم: میرا یہ احساس ہے کہ جو سوال اٹھایا تھا طفیل صاحب نے کہ کیا افسانے نے ترقی کی ہے۔ اس کا جواب اب تک نہیں دیا گیا۔

اعجاز: گفتگو اور بحث میں آپ نے ترقی کے لفظ سے ہی انکار کر دیا یہ اچھا کیا۔

انتظار: نہیں، یہ نہ کہیے کہ ترقی کے لفظ سے بلکہ جس مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کیا جا رہا ہے اس سے۔

ندیم: میرے خیال میں اب تک جو گفتگو ہوئی ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو افسانہ ترقی کر رہا ہے۔

انتظار: دیکھ لیجئے طفیل صاحب کو اعتراض نہ ہو۔

وقار: یہ اعتراض تو انہیں نہیں ہونا چاہیے اگر رسالہ نکالنا ہے تو۔ (قہقہہ)

اعجاز: قصہ یہ ہے کہ جو کنفیوژن (CONFUSION) ۱۹۴۷ء میں پیدا ہو گیا تھا اور جس کی طرف ہم فرداً فرداً سب ہی اشارہ کر چکے ہیں تو اس میں کانٹے ہم اپنے پاؤں کے ساتھ لے کر چلے ہیں۔ اس تقریباً بیس برس کے دور میں جن لوگوں نے اجتہاد کیا ہے، اور حقیقت کو جس طرح سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ راستے کے کانٹے اپنے پاؤں کے ساتھ لے کر چل گئے ہیں اب شاید جو لوگ آئیں گے انھیں اس بات سے فائدہ پہنچے گا۔

طفیل: ہم اصولی طور پر مان رہے ہیں کہ افسانہ ترقی کر رہا ہے لیکن اُس کی کوئی واضح مثالیں نہیں پیش کر رہے۔

انتظار: ترقی تو ہم کہہ ہی نہیں رہے۔ صاحب ہم نے جو گفتگو کی ہے اس سے میں نے یہ بالکل ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس وقت جو افسانہ نگار لکھ رہا ہے یعنی وہ افسانہ نگار جسے نمائندہ افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے وہ عصمت کے افسانے سے بہتر ہے یا منٹو کے افسانے سے بہتر ہے۔

طفیل: چلو جھگڑا ختم ہوا۔

ندیم: یہ آخر ہم عصمت کا ذکر کیوں خاص طور پر کر رہے ہیں۔

انتظار: محض نمائندہ کے طور پہ، یعنی عصمت، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔
ندیم: احمد ندیم قاسمی تو ہو ہی نہیں سکتے وہ تو بعد میں آئیں گے . . . . .
انتظار: میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ لوگ افسانہ نگاری کے بعض خاص رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔
ندیم: لیکن عصمت کے علاوہ منٹو ہیں، کرشن ہیں۔ بیدی ہیں اور بہت سے اچھے اچھے افسانہ نگار ہیں۔
وقار: عصمت کا نام تو یوں بار بار لیا جا رہا ہے کہ وہ ایک نام زبان پہ آ گیا جو بعض رجحانات کا نمائندہ ہے۔
انتظار: یہ نام زبان پہ بار بار آ رہا ہے اور قرۃ العین کا نام بار بار آ رہا ہے۔ کچھ خواتین کا نام زیادہ رواں ہے۔ (قہقہہ)
وقار: لیکن میرے خیال میں اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، یہ محض اتفاق ہے۔
انتظار: یہاں سوال برتری اور کم تری کا بالکل نہیں ہے۔ ہم یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارا تجربہ ان کے تجربے سے مختلف ہے۔
ہمارے افسانے کو ہمارے طریقے سے پڑھنا پڑے گا اور اسی طرح ایکسیپٹ (ACCEPT) کرنا پڑے گا۔
طفیل: یہ مان لیا کہ مختلف ہے اس دور کے افسانے سے اس دور کا افسانہ۔ لیکن سوال معیار کا ہے۔
اعجاز: آپ کا خیال ہے کہ معیار کوئی ایسی شے ہے جسے ہم جنرل (GENERAL) کہہ سکیں اور یوں گویا افسانہ تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن معیار وہی رہتا ہے۔
طفیل: مسائل کے ساتھ ساتھ تبدیل تو وہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ مسئلہ فنی بلندیوں کا ہے۔ میں یہ بالکل ماننے کے لئے تیار نہیں کہ پچیس تیس برس پہلے کے افسانہ نگاروں کے سامنے آج کے مسائل نہیں۔ یا وہ ان کا ادراک نہیں رکھتے۔
اعجاز: اگر آپ کے خیال میں یہ بات درست ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ معیار ہر حال میں ایک ہی رہتا ہے۔
وقار: کہانی کا ایک معیار تو یہی ہے کہ وہ کہانی ہے۔ باقی ساری چیزیں ہر زمانے میں بدلتی رہیں گی لیکن کہانی کو کہانی ضرور رہنا ہے۔
انتظار: اگر معیار یہ ہے تو اس معیار پر صرف داستانیں پوری اترتی ہیں۔ بعد کا افسانہ اس معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔
وقار: میری گزارش میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ کس زمانے میں ہم کس چیز کو کہانی سمجھتے ہیں۔
اعجاز: کہانی کا معیار خواہ کچھ بھی ہو، یہ بات بہر حال صحیح ہے کہ آج کی کہانیاں بور کرتی ہیں۔
خدیجہ: بہت زیادہ بور کرتی ہیں۔
انتظار: آپ چونکہ انٹیلکچوئل (INTELLECTUAL) ہیں اس لئے آپ کو بور کرتی ہیں۔ ذرا عام آدمی کو اور عام قاری کو سنئیے وہ کہانیاں۔
خدیجہ: صاحب! انتظار صاحب تو ایسی کہانیوں سے بہت متاثر ہیں، آپ نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ (ہنسی)
انتظار: ہم تو یہ جانتے ہیں کہ میرامن آج بھی نئے افسانہ نگاروں سے زیادہ بکتا ہے۔ یہاں تک کہ روس میں بھی بکتا ہے۔
ندیم: روس والوں کو چھوڑئیے۔
ادیب: اور یہاں اس لیے زیادہ بکتا ہے کہ نصاب میں شامل ہے۔ (ہنسی)

اعجاز: صاحب یہ رجحان آیا ہے کہ ادب تو تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن معیار وہی رہتے ہیں، ادب کو جانچنے کی بنیاد وہی رہتی ہے۔

خدیجہ: سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ معیار سے آپ کی کیا مراد ہے۔

انتظار: ادب کو جانچنے کے پیمانے وہی رہتے ہیں۔ ادب تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کیا یہ معیار واقعی ویلڈ (VALID) ہے وقار صاحب کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔

ندیم: معیار کو جانچنے کے لیے جانچنے والے کو بھی لکھنے والے ہی کے انداز میں سوچنا چاہیے۔

خدیجہ: اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جانچنے کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔

اعجاز: اگر جانچنے کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے تو پھر یہ عمل کیسے ہوتا ہے ادب کی دنیا میں کہ افسانہ نگار یا شاعر کو مرے ہوئے دس برس سو برس، دو سو برس، ہو جاتے ہیں لیکن اس کا ادب زندہ رہتا ہے اور بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بیچ میں مر جاتا ہے، پھر زندہ ہوتا ہے، پھر مر جاتا ہے۔ اس کا کیا راز ہے؟

طفیل: صاحب! اس ساری بحث کے باوجود بھی میں تو موجودہ افسانہ نویسی کو زیادہ تر مضمون نگاری سمجھتا ہوں۔ لیاقت کا اظہار زیادہ سے زیادہ افسانہ کم سے کم! پھر ابھی میری تائید میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نئی پود کا افسانہ بور کرتا ہے۔

خدیجہ: چند ایک مثالیں بھی دے ڈالیے۔

طفیل: ایک دو مثالیں نہیں۔ میرے خیال میں تو چند ایک کو چھوڑ کر باقی نئے افسانہ نگار سب کے سب ایسا ہی کر رہے ہیں۔

انتظار: آپ چونکہ ایسا سمجھتے ہیں اسی لئے تو آج ہم حاضر ہوتے ہیں بلکہ وارد ہوئے ہیں (ہنسی)

طفیل: میرا سوال یہ بھی ہے کہ اور کیا یہ ضروری ہے کہ کہانی پن نکال دیا جائے افسانے میں سے؟

انور: کہانی پن! کیوں؟ یہ کون کہتا ہے؟

طفیل: آپ (قہقہہ)

انور: نہیں یہ بات ضروری نہیں ہے لیکن یہ بتائیے کہ آپ کے نزدیک کہانی پن کیا ہے؟

ادیب: واقعات کی ایک مربوط شکل۔

انور: واقعات کی ایک شکل؟

ادیب: مربوط شکل۔

وقار: یہ کہانی کے فن کا بنیادی فلسفہ ہے کہ واقعات کی مربوط شکل، فسانہ نہیں۔ منطقی ربط کہانی میں ہو تو کہانی کہانی نہیں رہتی۔ البتہ وہاں ایک تخیئلی ربط ضروری ہے اور یہی تخیئلی ربط اس کی منطق ہے۔

انور: تو مربوط والی بات کا مطلب یہاں وہ نہیں جو عام زندگی میں ہے۔

ادیب: لیکن صاحب! ایک واقعے کا دوسرے سے تعلق تو ضرور ہوگا۔

انور: یہی تو مشکل ہے کہ ہم نے چیزوں کو بہت سمپلی فائیڈ (SIMPLIFIED) صورت میں دیکھا ہے۔ ہر کہانی کو سمپلفائیڈ دیکھا

ہے اور بڑی سادگی سے اس کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔

طفیل: آپ اپنے ذہن کے مطابق اُردو افسانے کو جانچ رہے ہیں۔ یوں تو نہ کہیئے اور بھی تو بے شمار لکھنے والے ہیں۔ اور بھی بیشمار لوگ سوچتے رہتے ہیں۔

اعجاز: پوچھا یہ جارہا ہے کہ جانچنے کا معیار کہاں جاتا ہے۔ کہاں تبدیل ہوتا ہے۔ کب تبدیل ہوتا ہے۔ تبدیل ہوتا بھی ہے یا نہیں ہوتا!

انور: میں صرف اپنی ذات کو نہیں لے رہا ہوں کیوں کہ میری ذات اس میں انوالوڈ (INVOLVED) ہے۔

طفیل: تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کہانی میں پلاٹ ضروری نہیں۔

وقار: جی نہیں ایہہ گرنہ ہے نہیں ہوا۔

انور: جی ہاں! میں نے یہ کب کہا؟

اعجاز: پلاٹ کے معنی تبدیل ہو گئے ہیں یا ہم اس طرف دیر سے آتے ہیں۔

انتظار: بہت دیر کے بعد آئے ہیں۔

اعجاز: صاحب آپ پلاٹ کس کو کہتے ہیں۔ کہانی کا پلاٹ کچھ باہر ہوتا ہے کچھ اندر۔ وہ اندر جاتا ہے، کچھ باہر آتا ہے اور واردات کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔

ادیب: کوئی ایسا شخص ہے جس کی تقلید نہیں ہو سکی۔

انتظار: مثلاً جیمز جوائس ہے جس کی تقلید نہیں ہو سکی۔

اعجاز: نہیں ہو سکی؟ اس کی گونج پیدا ہو رہی ہے چاروں طرف۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں دیر کے بعد گونج سنائی دی ہے لیکن کہتا وہ بھی یہی تھا کہ صاحب آپ پلاٹ کس کو کہتے ہیں؟ اس کو کہ ایک لڑکا تھا اس کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ پھر وہ اس کے ساتھ بڑا عشق کرتا رہا، پھر وہ لڑکی مر گئی۔ یا پھر ان دونوں کا بیاہ ہو گیا اور وہ بڑی اچھی زندگی گزارنے لگے۔ یہ پلاٹ نہیں ہے۔ پلاٹ آدھا اندر ہوتا ہے آدھا باہر ہوتا ہے۔ کبھی پلاٹ اندر چلا جاتا ہے کبھی پلاٹ باہر آجاتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ آپ میری کہانی کو پڑھنے کے لئے ایک نیا نقطۂ نظر لائیں۔

احمر از: یہ تو خود کہانی لکھنے والے پر ہے کہ وہ جس انداز سے چاہے لکھ سکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس میں پلاٹ ہے یا نہیں ہے یا کردار ہے یا نہیں ہے۔ یہ تو اس کا اپنا فعل ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو چیز صفحۂ قرطاس پہ منتقل ہوئی ہے، وہ کیا ہے۔

اعجاز: یہ بیان آپ کے پہلے بیان کی پوری طرح تردید کرتا ہے کہ جب تک کوئی نقطہ نظر نہ ہو کوئی اچھا اور بڑا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔

انور: یہ تو وکیلوں کی طرح جرح کرتے ہیں (قہقہہ)

ندیم: وکیلوں کو نہیں بلانا چاہیے ادیبوں کی محفل میں۔

اعجاز: ایک میتھاڈولوجی (METHODOLOGY) ہوتی ہے جس کو منطق کہتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہ کہنا کہ جو بات مجھے جہاں سوٹ کرے وہاں کہہ دوں ٹھیک نہیں۔ اس لئے میرا کہنا ہے کہ تھوڑی سی میتھاڈولوجی تو ہونی چاہیے تاکہ بات

کو آگے لے جائیں، نہ یہ کہ ایک جنرل کنفیوژن (CONFUSION) پیدا کر دیا جائے۔

خدیجہ: صاحب آپ بیان کریں گے کہ ایسا کرنا جرم کیوں ہے؟

اعجاز: نہیں جرم نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خود گفتگو میں بھی کوئی نہ کوئی تو کنسٹینسی (CONSISTANCY) تو ہونی چاہیئے۔ میرے خیال میں تو یہ لازم ہے۔

وقار: لیکن یہ دونوں چیزیں تو ساتھ ساتھ بھی ہو سکتی ہیں۔

ادیب: طفیل صاحب! میں ایک سوال آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ بار بار یہ اصرار کرتے ہیں کہ آج کے افسانے مضامین بن گئے ہیں۔ آپ کے پیشِ نظر وہ کون سے لوگ ہیں۔

طفیل: اس مجلس میں بھی ایسے دو افسانہ نگار بیٹھے ہیں۔ مثلاً انتظار حسین اور انور سجاد۔

ادیب: ایک انتظار صاحب ہو گئے اور دوسرے انور سجاد۔ ان کے علاوہ غلام الثقلین نقوی ہیں۔ صادق حسین ہیں، خلیل احمد ہیں اور نہ جانے کتنے ہیں جن کے ہاں باقاعدہ پلاٹ ہے۔

طفیل: نہیں وہ تو ٹھیک ہے۔ یہاں چونکہ انتظار حسین اور انور سجاد اپنے آپ کو جدید افسانہ نگار منوانے پر تلے ہوتے ہیں اس لئے میں نے یہ خوبی یا خرابی بھی انہی میں زیادہ پائی اور اسی لئے میں نے ان کا نام لیا ہے۔

ندیم: افسانوں کے بارے میں بحث ہو سکتی ہے لیکن میں یہ بالکل نہیں مانتا کہ ان کے افسانے مضمون بن گئے ہیں۔

اعجاز: تو یہ تو میں بھی کہوں گا اگر کوئی مردم شماری ہوتی ہے تو افسانہ لکھنے والوں کی تعداد زیادہ نکلے گی مضمون نگاروں کی کم!

وقار: بلکہ بعض لوگوں کو تو یہ شکایت ہے کہ افسانہ داستان کی طرف چلا گیا ہے۔

انتظار: طفیل صاحب ذرا اپنی بات کی وضاحت کیجیے کہ میری کن کہانیوں میں آپ کو کہانی پن کی کمی نظر آتی ہے؟

وقار: مضمون والی بات تو ان کی کہانیوں میں ہرگز نہیں......

ادیب: ان کے یہاں تو باقاعدہ پلاٹ ہے۔

احراز: کئی افسانوں میں ان کے پلاٹ ہے۔

طفیل: آپ نے تو چند افسانوں کی بات کی ہے کہ ان میں پلاٹ ہے۔ میں تو جنرل (GENERAL) بات کر رہا ہوں۔ ابھی اعجاز صاحب نے بھی کہا ہے کہ کچھ لکھنے والے، افسانے کی بجائے مضمون لکھ دیتے ہیں اور ابھی احراز صاحب نے کہا کہ ان کے ہاں کئی افسانوں میں پلاٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا شبہ غلط نہیں۔ چلیئے اس بات کو یوں کہتے ہیں۔ کچھ مضمون کچھ افسانے۔

وقار: پلاٹ بھی جیسا کہ اعجاز صاحب نے کہا واقعات کو ایک خاص ترتیب سے ظاہر کر دینے کا نام نہیں۔ پلاٹ میں بعض چیزیں خارجی واقعات کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں اور بعض کرداروں کے اس اندرونی عمل کی صورت میں جو خارجی واقعات کی صورت تو اختیار نہیں کرتا، لیکن کہانی کو آگے بڑھانے میں اس کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے۔

انتظار: دیکھئے، میرزا ادیب صاحب نے ابھی افسانہ نگاروں کی جو فہرست گنائی اس میں ایک خلیل احمد کا نام بھی آ گیا تو خلیل احمد کے

ہے اور بڑی سادگی سے اس کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔

طفیل: آپ اپنے ذہن کے مطابق، اُردو افسانے کو جانچ رہے ہیں۔ یوں تو نہ کیجئے اور بھی تو بے شمار لکھنے والے ہیں۔ اور بھی بیشمار لوگ سوچتے رہتے ہیں۔

اعجاز: پوچھا یہ جا رہا ہے کہ جانچنے کا معیار کہاں جاتا ہے۔ کہاں تبدیل ہوتا ہے۔ کب تبدیل ہوتا ہے۔ تبدیل ہوتا بھی ہے یا نہیں ہوتا!

انور: میں صرف اپنی ذات کو نہیں لے رہا ہوں کیوں کہ میری ذات اس میں انوالوڈ (INVOLVED) ہے۔

طفیل: تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کہانی میں پلاٹ ضروری نہیں۔

وقار: جی نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوا۔

انور: جی ہاں! میں نے یہ کب کہا؟

اعجاز: پلاٹ کے معنی تبدیل ہو گئے ہیں یا ہم اس طرف دیر سے آتے ہیں۔

انتظار: بہت دیر کے بعد آئے ہیں۔

اعجاز: صاحب آپ پلاٹ کس کو کہتے ہیں۔ کہانی کا پلاٹ کچھ باہر ہوتا ہے کچھ اندر۔ وہ اندر جاتا ہے، پھر باہر آتا ہے اور واردات کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔

ادیب: کوئی ایسا شخص ہے جس کی تقلید نہیں ہو سکی۔

انتظار: مثلاً جیمز جوائس ہے جس کی تقلید نہیں ہو سکی۔

اعجاز: نہیں ہو سکی! اس کی گونج پیدا ہو رہی ہے چاروں طرف۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں دیر کے بعد گونج سنائی دی ہے لیکن کہتا وہ بھی یہی تھا کہ صاحب آپ پلاٹ کس کو کہتے ہیں؟ اس کو کہ ایک لڑکا تھا اس کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ پھر وہ اس کے ساتھ بڑا عشق کرتا رہا، پھر وہ لڑکی مر گئی۔ یا پھر ان دونوں کا بیاہ ہو گیا اور وہ بڑی اچھی زندگی گزارنے لگے۔ یہ پلاٹ نہیں ہے۔ پلاٹ آدھا اندر ہوتا ہے آدھا باہر ہوتا ہے۔ کبھی پلاٹ اندر چلا جاتا ہے کبھی پلاٹ باہر آ جاتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ آپ میری کہانی کو پڑھنے کے لئے ایک نیا نقطۂ نظر لائیں۔

احسن: یہ تو خود کہانی لکھنے والے پر ہے کہ وہ جس انداز سے چاہے لکھ سکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس میں پلاٹ ہے یا نہیں ہے یا کردار ہے یا نہیں ہے۔ یہ تو اس کا اپنا فعل ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو چیز صفحۂ قرطاس پہ منتقل ہوئی ہے۔ وہ کیا ہے۔

اعجاز: یہ آپ کے پہلے بیان کی پوری طرح تردید کرتا ہے کہ جب تک کوئی نقطۂ نظر نہ ہو کوئی اچھا اور بڑا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔

انور: یہ تو وکیلوں کی طرح جرح کرتے ہیں (قہقہہ)

ندیم: وکیلوں کو نہیں بلانا چاہیے ادیبوں کی محفل میں۔

اعجاز: ایک میتھاڈولوجی (METHODOLOGY) ہوتی ہے جس کو منطق کہتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہ کہنا کہ جو بات مجھے جہاں سوٹ کرے وہاں کہہ دوں ٹھیک نہیں۔ اس لئے میرا کہنا ہے کہ تھوڑی سی میتھاڈولوجی تو ہونی چاہیے تاکہ بات

کو آگے لے جائیں، نہ یہ کہ ایک جنرل کنفیوژن (CONFUSION) پیدا کر دیا جائے۔

خدیجہ: صاحب آپ بیان کریں گے کہ ایسا کرنا جرم کیوں ہے؟

اعجاز: نہیں جرم نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خود گفتگو میں بھی کوئی نہ کوئی تو کنسسٹینسی (CONSISTANCY) تو ہونی چاہیئے۔ میرے خیال میں تو یہ لازم ہے۔

وقار: لیکن یہ دونوں چیزیں تو ساتھ ساتھ بھی ہو سکتی ہیں۔

ادیب: طفیل صاحب! میں ایک سوال آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ بار بار یہ اصرار کرتے ہیں کہ آج کے افسانے مضامین بن گئے ہیں۔ آپ کے پیشِ نظر وہ کون سے لوگ ہیں۔

طفیل: اس مجلس میں بھی ایسے دو افسانہ نگار بیٹھے ہیں۔ مثلاً انتظار حسین اور انور سجاد۔

ادیب: ایک انتظار صاحب ہو گئے اور دوسرے انور سجاد۔ ان کے علاوہ غلام الثقلین نقوی ہیں، صادق حسین ہیں، خلیل احمد ہیں اور نہ جانے کتنے ہیں جن کے ہاں باقاعدہ پلاٹ ہے۔

طفیل: نہیں وہ تو ٹھیک ہے۔ یہاں چونکہ انتظار حسین اور انور سجاد اپنے آپ کو جدید افسانہ نگار منوانے پر تلے ہوئے ہیں اس لئے میں نے ہر خوبی یا خرابی بھی انہی میں زیادہ پائی اور اسی لئے میں نے ان کا نام لیا ہے۔

ندیم: افسانوں کے بارے میں بحث ہو سکتی ہے لیکن میں یہ بالکل نہیں مانتا کہ ان کے افسانے مضمون بن گئے ہیں۔

اعجاز: تو یہ تو میں بھی کہوں گا اگر کوئی مردم شماری ہوتی ہے تو افسانہ لکھنے والوں کی تعداد زیادہ نکلے گی مضمون نگاروں کی کم!

وقار: بلکہ بعض لوگوں کو تو یہ شکایت ہے کہ افسانہ داستان کی طرف چلا گیا ہے۔

انتظار: طفیل صاحب ذرا اپنی بات کی وضاحت کیجیئے کہ میری کن کہانیوں میں آپ کو کہانی پن کی کمی نظر آتی ہے؟

وقار: مضمون والی بات تو ان کی کہانیوں میں ہرگز نہیں . . . . .

ادیب: ان کے یہاں تو باقاعدہ پلاٹ ہے۔

احراز: کئی افسانوں میں ان کے پلاٹ ہے۔

طفیل: آپ نے تو چند افسانوں کی بات کی ہے کہ ان میں پلاٹ ہے۔ میں تو جنرل (GENERAL) بات کر رہا ہوں۔ ابھی اعجاز صاحب نے بھی کہا ہے کہ کچھ لکھنے والے، افسانے کی بجائے مضمون لکھ دیتے ہیں اور ابھی احراز صاحب نے کہا کہ ان کے ہاں کئی افسانوں میں پلاٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا شبہ غلط نہیں۔ چلیئے اس بات کو یوں کہتے ہیں۔ کچھ مضمون کچھ افسانے۔

وقار: پلاٹ بھی جیسا کہ اعجاز صاحب نے کہا واقعات کو ایک خاص ترتیب سے ظاہر کر دینے کا نام نہیں۔ پلاٹ میں بعض چیزیں خارجی واقعات کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں اور بعض کرداروں کے اس اندرونی عمل کی صورت میں جو خارجی واقعات کی صورت تو اختیار نہیں کرتا، لیکن کہانی کو آگے بڑھانے میں اس کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے۔

انتظار: دیکھئے، میرزا ادیب صاحب نے ابھی افسانہ نگاروں کی جو فہرست گنوائی اس میں ایک خلیل احمد کا نام بھی آ گیا یا تو خلیل احمد کے

یہاں پلاٹ اس طریقے سے نہیں ہوتا جیسے مرزا صاحب چاہتے ہیں، اس لئے آپ کیسے کہتے ہیں کہ اس میں واقعات ایک مربوط طریقے سے بیان ہو رہے ہیں اور بڑا سا نچے میں ڈھلا ہوا پلاٹ موجود ہے۔ ان کی کہانیوں میں تو وہ نہیں ہے۔ وہاں بھی آپ کو واقعات بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔

ادیب: لیکن کہانی اندرونی طور پر ان میں ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے تعلق والی بات تو ہوتی ہے۔

انتظار: اس لئے آپ کا جو بیان ہے آپ اس پر نظر ثانی کر لیں۔ آپ نے کہا تھا کہ افسانے میں واقعات مربوط نظر آنے چاہئیں

ادیب: میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔

انتظار: لیکن واقعات وہاں مربوط نظر نہیں آتے۔

ادیب: میں اب بھی یہ کہتا ہوں مربوط نظر آتے ہیں۔ خارجی طور پر ہوں یا داخلی طور پر۔

وقار: میرے خیال میں تو مربوط نظر آتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ دیکھنے کا انداز بدل لیں۔

طفیل: صاحب! یہ دیکھنے کے انداز نے بڑی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اب اس کا کوئی کیا جواب دے۔

انتظار: اگر آپ نے نقطۂ نظر بدل لیا ہے تو پھر تو آپ خلیل احمد کا افسانہ پڑھیں یا انور سجاد کا افسانہ پڑھیں یا میگھ ملہار پڑھیں۔ اگر آپ نے اندازِ نظر میں اس طریقے سے تبدیلی کر لی ہے تو ممکن ہے ان سب یہاں آپ کو ایک مربوط پلاٹ نظر آجائے ایک آہنگ نظر آجائے جس میں آپ کے نزدیک مضمون والی بات نہ ہو۔

ندیم: تو اس کا مطلب ہے کہ آپ قائل ہو گئے کہ واقعات کو اس طرح مربوط ہونا چاہیے۔

اعجاز: بات یہ ہے کہ آپ اپنا پوائنٹ سکور (POINT SCORE) کر رہے ہیں۔ اب مربوط کے معنی وہ ہیں جو ہم آپ سے کہتے ہیں۔ آپ اس بات کی بھی تردید کر رہے ہیں کہ نقطۂ نظر ہونا ضروری ہے۔

ندیم: انتظار صاحب نے کہا ہے کہ وہ نقطۂ نظر نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ نقطۂ نظر کے معنی یہ ہوں کہ اس میں ایک اجتماعی زندگی کا کوئی شعور ہو۔

اعجاز: اگر وہ اپنی ہی داخلی واردات سے حقیقت کا مشاہدہ یا اظہار کر رہا ہے اور اس میں ایک رویہ موجود ہے اور اس کا کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں ہے تو اس سے بھی اچھا اور بڑا ادب پیدا ہوتا ہے۔

وقار: لیکن اس میں وہی بات جو ندیم صاحب نے کہی تھی کہ داخلی واردات بھی کہانی کا پلاٹ بن سکتی ہے۔

اعجاز: یہ تو ہوتا ہی ہے، اس لئے کہ انسان جس طرح خارجی زندگی سے بے تعلق نہیں رہ سکتا اسی طرح داخلی زندگی سے بھی ہر لمحے اس کا تعلق قائم رہتا ہے اور اسی داخلی زندگی سے پلاٹ ترتیب پاتا ہے۔

احسن: اب طفیل صاحب کے تیسرے سوال علامتی افسانہ نگاری کی طرف آنا چاہیئے۔

وقار: اب تک ہم نے جو باتیں کی ہیں ان سے کیا نتیجہ نکلا ہے؟

ندیم: پہلے سوال کا تو نتیجہ نکل آیا ہے۔

انتظار: علامتی افسانے کے بارے میں قاسمی صاحب نے ایک بیان دیا تھا اگر میں اس کے بارے میں کچھ کہوں تو شاید اختلافات کے پہلو پیدا ہوں۔

احراز: شاید نہ ہوں۔

انتظار: کوشش کروں گا کہ اختلاف کا کوئی پہلو پیدا نہ ہو۔ تو قاسمی صاحب نے کہا تھا کہ آج کے لکھنے والے میں جرأت اظہار کی کمی ہے اس لئے وہ کوئی علامت لے آتا ہے۔ اس سے دو نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ قاسمی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ افسانہ نگار کے پاس موضوع ایک چیز ہوتی ہے اور علامت کہیں سے مستعار لے کر اس کے ذریعے اس کا اظہار کر دیتا ہے اور دوسرے یہ کہ افسانہ نگار کے لئے اگر وہ جرأت مند ہے تو اس کے لئے یہ لازم ہے کہ علامتی طریق کار سے پیچھا چھڑائے۔ دوسری بات کے بارے میں میں یہ کہوں کہ اگر ایسا ہے تو پھر سارے ایسے لکھنے والے اپنے اور اگلے، جنھوں نے علامتی طریقے پر سوچا، ان کے متعلق ہم یہ کہیں گے کہ صاحب ان میں جرأت اظہار کی کمی تھی۔ مثلاً شیخ سعدی ہیں ایک علامتی طریقے سے انہوں نے کہانیاں لکھی تھیں۔

ندیم: یہاں میں ذرا وضاحت کر دوں اپنی بات کی کہ میں نے پاکستان کے آج کے علامتی افسانے کو سمجھا ہے۔ علامت کا پہلو یقیناً ہوتا ہے لیکن علامتوں سے وہ مبہم نہیں ہو جاتے۔ علامتی افسانوں میں سے چند میں نے پڑھے ہیں، وہ بہت اچھے افسانے ہیں اور سمجھ میں آتے ہیں ان میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ علامت کامیاب رہی۔ اس تجربے کو آگے بڑھایا جائے تو ترقی کر سکتا ہے۔ میں صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ آج کے افسانہ نگاروں نے علامت کو اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ وہ اگر بات براہ راست انداز میں بھی کہہ دیتے تو افسانے کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچتا اور اظہار بھی بالکل واضح ہو جاتا اور قاری کو بھی پریشانی نہ ہوتی۔

انور: صاحب آپ ذرا مثالیں کوٹ (QUOTE) کیجئے۔

ندیم: میرا صرف یہ سوال ہے آپ سے کہ کیا گائے کی جگہ ماں اور بچھڑے کی جگہ بچے کا کردار کامیابی سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جو رکاوٹ بنی آپ کے لئے اصل کردار کو پیش کرنے میں؟

طفیل: محض جدت!

انور: میں عرض کرتا ہوں مجھے ایک سچوایشن (SITUATION) نے ڈسٹرب (DISTURB) کیا۔ میرے ذہن میں پتا نہیں اس کے پولیٹیکل سگنیفکنس (SIGNIFICUNCE) کیا تھے۔ اگر اس سچوایشن کو کوئی مینگ (MEANING) بنتا ہے تو وہ الگ بات ہے۔ لیکن میں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ صرف ایک سٹیٹ آف ٹینشن (STATE OF TENSION) ہے چاہے میں کسی طرح سے اسے بیان کر دیتا۔

ندیم: میں یہ پوچھتا ہوں کہ میں تو اس افسانے کی تہ تک پہنچ گیا تھا، لیکن آخر کیا بات تھی کہ آپ نے اس سٹیٹ آف ڈسٹربنس (STATE OF DISTUBANCE) کو براہ راست نہیں پیش کیا۔ گائے یا بچھڑے کا سہارا لینے کی کیا ضرورت تھی؟

انور: میں نے سہارا نہیں لیا کسی بات کا سہارا نہیں لیا۔ میں نے سٹیٹ آف ٹینشن (STATE OF TENSION) اگر ہمیں کنڈیشن

(ANIMAL CONDITION) میں دیکھا ہے اور انیمل کی طرح ایکسپلوڈ (EXPLODE) میں دیکھا ہے اور انیمل کی طرح ایکسپلوڈ (EXPLODE) کیا ہے اس میں میں نے کسی کی ہوٹنگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ندیم: اس افسانے میں کوئی پولیٹیکل انوالومنٹ (POLITICAL INVOLVEMENT) تھی کہ نہیں؟

انور: ہاں ہاں ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے الیکشن پر میں نے حلقے میں پریزیڈنٹ سے پہلی والی اتوار کو) ایک کہانی پڑھی تھی "صدا بصحرا"۔ اس میں میں نے جس طرح پرسیو (PURSUE) کیا تھا ساری پولیٹیکل سچوایشن (POLITICAL SITUATION) کو وہ میرا اپنا دیکھنے کا ایک انداز ہے۔

ندیم: ٹھیک ہے۔ لیکن آپ یہ کہتے ہیں کہ وہ میرا اپنا انداز نظر ہے۔

انور: ہاں بالکل!

انتظار: اس سے یہ ثابت ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر یا افسانہ نگار کے پاس موضوع ایسا نہیں ہوتا کہ وہ علامت اپنے ساتھ لائے۔ ایسا افسانہ میرے نزدیک اسے فوراً رجیکٹ (REJECT) کر دینا چاہیے۔ اصل میں بعض لکھنے والوں کا سوچنے کا انداز ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ انڈوی جوئلز (INDIVIDUALS) پر سوچتے ہیں یا سمبلز پر سوچتے ہیں۔ وہاں موضوع اور علامت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں حقیقت کے ادراک کا طریقہ ہی یہ ہے۔ جب شیخ سعدی جانوروں کی کہانی سناتے تھے اور اس سے انسانی کہانی مراد لیتے تھے تو ایسا نہیں تھا کہ شیخ سعدی ایک موضوع چن لیتے تھے اور پھر جا کے کوئی کہانی بنتی تھی بلکہ انہوں نے اس اپنے عہد میں بیٹھ کر انسانی صورت حال کا ادراک اسی طریقے سے کیا تھا یعنی اس علامتی طریقے سے کیا تھا۔ چنانچہ آج کے لکھنے والے بھی خواہ شاعر ہوں یا افسانہ نگار، اس کا اپنے عہد کی صورت حال کو گرفت میں لانے کا طریقہ یہ ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ حقیقت کو ادراک کرنے کا۔ وہ انڈویجول کی صورت میں ہو سکتا ہے یا سمبلز (SYMLALS) کی صورت میں۔ فرض کیجیے کہ افسانہ نگار کہتا ہے کہ میں نے آج کی انسانی صورت حال کو اسی علامت کے ذریعے سے اور علامت کی شکل میں دیکھا ہے، میں اسے کسی دوسرے طریقے سے بیان کر ہی نہیں سکتا۔

طفیل: ایسی حالت میں آج کی کہی ہوئی بات آج تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن دس سال بعد یا بیس سال بعد وہ کیسے سمجھ میں آئے گی، جب لوگوں کو سمبل یا علامت کی تہ میں جو بات ہے۔ اس کا کچھ اتا پتا ہی معلوم نہیں ہو گا۔

انور: اگر وہ کنڈیشنز پریویل (CONDITIONS PREVAIL) کرتی ہے تو ہر دور میں افسانہ پڑھا جائے گا اور سمجھا جائے گا یہی وجہ ہے کہ بعض افسانہ نویس وقتی طور پر مر جاتے ہیں لیکن پھر زندہ ہوتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ دوبارہ زندہ ہونے والی بات اس سے ہوتی ہے کہ وہ SITUATION کے لئے الائیو (ALIVE) ہوتے ہیں اور مردہ اس لئے ہو جاتے ہیں کہ سچوایشن انھیں قبول نہیں کرتی۔

طفیل: میں عرض کرتا ہوں کہ جب لوگ سمجھنے میں ہی اتنا وقت لگا دیتے ہیں یا یہ کہ کچھ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ یہ کن علامتوں کو سامنے رکھ کر یا کن حالات کو سامنے رکھ کر یہ افسانہ لکھا گیا ہے تو پھر علامت کے استعمال کے کیا معنی؟

ندیم: یہ بات تو علامت علامت پہ موقوف ہے۔

وقار: مثلاً صدر ایوب علامت ہیں ایک خاص طرح کے صاحب اقتدار حکمران کی۔ یہاں ایوب تو محض نام ہے نا اور اس اقتدار کی نوعیت کا اثر مختلف لوگوں پر پڑ رہا ہے۔ جن پہ یہ اثر پڑ رہا ہے انھیں کسی اور علامت کے ذریعے ظاہر کیا جاتا اور ایوب کو کسی اور علامت کے ذریعے۔ لیکن بات وہی ہے حقیقت میں جو انتظار صاحب تے یا انور سجاد صاحب نے کہی کہ اگر یہی صورتِ حال اب سے پچاس برس بعد بھی پیش آتی ہے تو آدمی ایوب کا نام لئے بغیر اس ساری چیز کا ادراک کر سکتا ہے اور اسے سمجھ سکتا ہے اس علامت کے ذریعے جو افسانہ نگار نے استعمال کی ہے۔

طفیل: اور اگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تو پھر افسانہ گم ہو گیا نا!

وقار: آپ کی بات ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اس بات کا جواب وہ ہے جو عجاز صاحب نے دیا کہ اگر آدمی وقتی مسائل کو لے کر لکھے اور وہ مسائل اس نوعیت کے ہوں کہ اس زمانے کے بعد وہ پھر پیدا ہی نہیں ہوتے انسانی زندگی میں، تو وہ چیز یقیناً عارضی اور ہنگامی ہے اور وقت کے ساتھ مر جائے گی۔ لیکن اگر اس میں کوئی ایک ایسی کیفیت ہے جو انسانی زندگی میں بار بار لوٹ کر آتی ہے اور انسان اس کا تجربہ کرتا ہے مختلف زمانوں میں تو پھر ہر عہد کے انسان کے لئے وہ علامت قابلِ فہم بن جاتی ہے اور اس کی مدد سے وہ حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے۔

انور: یہ بات تو ہر لکھنے والے کے معاملے میں درست ہے خواہ وہ سمبلسٹ ہو خواہ نہ ہو۔

اعجاز: لیکن براہِ کرم یہ بات بھی یاد رکھئے کہ لازم نہیں ہے کہ افسانہ نگار یا ادیب جب لکھنے بیٹھے تو اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہو کہ کچھ عرصے کے بعد اس کے افسانے کو پڑھا جائے گا یا نہیں۔

طفیل: اگر وہ اس طرح سوچتا ہے تو پھر اس کا لکھنا ہی بے کار ہے۔

اعجاز: صاحب میں نے تو یہ کہا ہے کہ بحیثیت افسانہ نگار میں اپنے عہد کی رئیلٹی (REALITY) کو اس طرح پیش کرتا ہوں کہ زندہ رہوں۔

وقار: لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا بقول آپ کے اس REALITY یا حقیقت کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ وہ پچھ زندہ ہوتی ہے یا نہیں، پچاس برس کے بعد، سو سال کے بعد یا اس سے بھی زیادہ مدت کے بعد۔

ندیم: میرے خیال میں ہر بامعنی حقیقت اپنے عہد کے بعد بھی شعوری طور پہ زندہ رہتی ہے۔

وقار: تو پھر اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ سمبل والی بات کہ جس طرح ندیم صاحب سمجھ گئے یعنی انہوں نے گائے کے SYMBOL یا علامت کے ذریعے ایک واضح معنی کا ادراک کر لیا، اسی طرح اور بھی بہت سے آدمی ہوں گے جو علامت اور معنی کے درمیان رشتہ قائم کر کے اس کے معنی سمجھ لیں گے اور سمجھ لینے کی وجہ وہ ہے جو ہم نے شیخ سعدی کا ذکر کرتے ہوئے کہی تھی۔ سعدی کے یہاں بھیڑیا۔ خاص تصور کو سامنے لاتا ہے وہ تصور صرف شیخ سعدی کا نہیں بلکہ ان کے عہد کے ہر انسان کا۔ بلکہ آنے والے عہدوں میں ہر انسان کا مشترک تصور ہے۔ "بھیڑیے" کا لفظ جب ایک علامت کے طور پر ہمارے سامنے آئے گا تو اس کے ساتھ

وہ سارے تصورات بھی آئیں گے جو اس لفظ کے ساتھ وابستہ ہیں، اور اس لئے بھیڑیے کی علامت شیخ سعدی کے اور اس کے قاری کے درمیان، خواہ وہ ان کے عہد کا ہو یا پانچ سو سال بعد والے عہد کا، معنی کے ادراک کا ایک رشتہ قائم کر دے گی، اور یوں وہ علامت جو بظاہر ایک آدمی کی استحصال کی ہوئی علامت ہے، بے شمار آدمیوں کے لئے معنی کی علامت بن جائے گی اور یوں گویا ایک علامت کے ذریعے ان سارے مطالب کا ابلاغ ہوگا جو کہنے والے کے ذہن میں پوشیدہ ہیں۔ اور یہ صورت حال صرف ایک خاص زمانے یا عہد تک محدود نہیں رہے گی۔

انور : ایک اور واقعہ میں بیان کروں۔ حلقے میں میں نے ایک اور کہانی پڑھی تھی "سنڈریلا"۔ میں کہانی پڑھ کے چپ بیٹھ گیا اور وہاں پہ یہ بحث چل نکلی کہ سنڈریلا کون تھا۔ میں کیا جواب دیتا۔ (ہنسی)

ندیم : ٹھیک ہے، اس کا جواب اور کیا ہوتا؟

انور : میں نے صرف کہانی کا نام سنڈریلا رکھا ہوا ہے باقی حساب کتاب صاف ہے۔ لڑکی کا کوئی ذکر نہیں۔ کرداروں میں بھی وہ نام نہیں ہے۔ ایک سچوایشن تھی ٹریٹ کی گئی۔ میں نے ہر ایک میں سنڈریلا کو INVOLVE کیا اور اس پہ خوب نکتہ چینی کی۔

انتظار : اس سلسلے میں ایک بات عرض کروں گا۔ اصل میں علامتی طریقے بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والا یہ کوشش کرتا ہے کہ اجتماعی تجربے میں سے وہ کچھ کشید کرتا ہے، علامتیں اس میں سے اور اس کے نتیجے سے اس پہ وارد ہوتی ہیں اور اس کے ذریعے سے وہ اپنے عہد کی حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔ ایسی جگہ مفہوم آسانی سے کنوے (CONVEY) ہو جاتا ہے اور قاری سے رشتہ بڑی جلدی قائم ہو جاتا ہے۔ بعض لکھنے والے یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے طور پہ کرئیٹ (تخلیق) کرتے ہیں علامتیں۔ اس میں قاری سے رشتہ آسانی سے قائم نہیں ہوتا۔ ایک اور طریقہ وہ ہے، سنڈریلا جس کی مثال ہے کہ اپنی تہذیب کے دائرے سے نکل کر کسی دوسری تہذیب سے کوئی علامت تلاش کرنا اور اس کے ذریعے سے مفہوم ادا کرنا۔ پہلے جو دو طریقے ہیں ان کا جواز تو میری سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ طریقہ جو تیسرا ہے کہ اپنی تہذیب کے دائرے سے نکل کر، اپنی ذات کے دائرے سے نکل کر کسی اجنبی تہذیب سے آپ ایک استعارہ لیتے ہیں اور اس کے ذریعے سے مفہوم ادا کرتے ہیں تو یہاں اگر قاری سوال کرتا ہے اور اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے۔

ندیم : سنڈریلا کی مثال تو نہ دیجئے۔ اس لئے کہ سنڈریلا کی کہانی تو سب لوگوں نے پڑھی ہے۔ اگرچہ وہ غیر ملکی ہے لیکن پھر بھی سب اس سے واقف ہیں۔

وقار : گویا جتنے لوگ بھی وہاں بیٹھے تھے ان سب نے پڑھی تھی۔

انور : ان سب نے کہا کہ سنڈریلا ایک کہانی ہے۔

طفیل : بہتر تو یہ ہے کہ قاری کو امتحان میں نہ ڈالا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ فن کار ہی نہیں جو فنکارانہ طریقے سے اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا۔

وقار : امتحان میں ڈالے بغیر تو پیچ پوچھئے کوئی لطافت اور نزاکت نہیں پیدا ہوتی۔

طفیل : جی ہاں! یہ لوگ لطافت اور نزاکت کو اپنے آخری نقطہ تک پہنچائے ہی دم لیں گے (قہقہہ)

انور : اس صورت میں تو بس مضمون کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ آدمی ٹھیک ٹھاک قسم کی سچوایشن پر مفلٹ لکھ دے اور بس!

طفیل : علامتی کہانی اسی پانچ دس برس کی چیز ہے کہ....

انور : جی نہیں وہ تو بہت پہلے کی چیز ہے۔

ادیب : ملا وجہی کی سب رس بھی تو علامتی ہے۔

وقار : اور یہ علامتی کہانی اب سے تین سو برس پہلے کی تخلیق ہے۔

طفیل : اکا دکا مثالیں ہوں گی۔ ان دنوں تو یہ انداز چھوٹی سی تحریک کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

ندیم : وہ لوگ جو اس طرح کے سمبل استعمال نہیں کرتے وہ بھی تو افسانہ لکھتے ہیں۔

انور : اس میں پکاسو کا کیا قصور تھا کہ وہ ایک خاص عہد میں پیدا ہو گئے۔ اس کے پاس ایک دن ڈنکن شارپ آیا کہ صاحب میں یہ PAINTING لے کر آیا ہوں اسے آپ دیکھئے کہ کیا یہ بھی FAKE تو نہیں، کہنے لگا یہ بالکل فیک ہے۔ یہ میری نہیں ہے۔ کہا گیا کہ دیکھیے یہ آپ کے دستخط ہیں، آپ نے خود ہی مجھے دی ہے یہ تصویر۔ پکاسو نے ہنس کر کہا "میں خود بھی فیک پینٹ کرتا ہوں" (قہقہہ)

طفیل : ہاں تو یہ مذاق ہی ہوا نا!

انور : اگر قاری اپنے آپ کو اتنا سنجیدگی سے لیتا ہے تو اسے تھوڑی سی ایفرٹ (EFFORT) کرنی چاہیے طفیل صاحب لکھنے والے کو ریچ (REACH) کرنے کے لئے۔

ادیب : تو علامت آج ہی کا مسئلہ نہیں ہے، یہ پہلے دن سے ہے۔ ملا وجہی کی سب رس میں شروع سے آخر تک علامتیں ہیں۔

طفیل : اچھا کیا آپ لوگوں نے کہ ہمیں ملا وجہی کے زمانے میں پہنچا دیا۔

انتظار : آپ یوں تو کہیں کے نامرزا صاحب کہ اس عہد میں علامت نگاری کا ایک اسلوب اس طریقے سے پیدا ہوا کہ وہ ایک نمائندہ اظہار بن گیا اس عہد کا۔ اور وہ اس طریقے سے بنا کہ ملا وجہی کے زمانے کی علامت نگاری، یا سعدی کے زمانے کی علامت نگاری سے مختلف ہے۔

وقار : ٹھیک ہے ایسا بھی ہی چاہیے۔ علامتیں ہر زمانے میں خیال کے اظہار کا ذریعہ رہی ہیں۔ البتہ زمانے کے ساتھ ان کا انداز بدلتا رہا ہے۔

انتظار : اور اس کے رشتے اس زمانے کی صورت حال اور اس زمانے کے طرز احساس سے ملتے ہیں اور اس لئے ہمیں امتیاز کرنا پڑے گا۔ پچھلی علامت نگاری میں اور آج کی علامت نگاری میں۔

طفیل : یعنی انداز بھی نیا نہ ہوا ایسے جیسے کبھی نئی نہ ہوئیں۔ ہم جو سمجھتے تھے کہ افسانے میں جدت پیدا ہوئی ہے وہ نہ ہوئی، پھر کیا فائدہ صاحب!

انور : موضوع تو نیا ہونا ہی نہیں، بلکہ میرے نزدیک تو SITUATION بھی وہی رہتی ہے مختلف زمانوں میں، اگر نوعیت تھوڑی سی بدل جاتی ہے۔

وقار: اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی سچوایشن یا صورتِ حال جو ہر زمانے میں لوٹ لوٹ کر آتی رہتی ہے وہ ایک لحاظ سے ہر زمانے میں قائم بھی رہتی ہے، اور اس کا اظہار ادب میں ہوتا رہتا ہے۔ اور یوں گویا میرامن کا طرزِ احساس بھیس بدل بدل کر ہم تک پہنچا ہے۔

انتظار: ایک سوال اور ہے قاسمی صاحب کہ ایک لکھنے والا یہ کہتا ہے میں تو اپنی ہی ذات سے پیدا کرونگا، جو کچھ کرونگا۔ استعارہ بھی اگر پیدا کروں گا تو اپنی ذات سے اور علامت بھی پیدا کروں گا تو اپنی ذات سے، یا وہ طے کر لیتا ہے کہ میری جو تحریر آئے گی اس کا کمیونیکیشن (COMMUNICATION) میں اپنے گرد و پیش کی دنیا کے تجربوں اور ان تجربوں کے حوالوں سے کروں گا، جس تاریخ کے اندر میں نے سانس لیا ہے میں اس سے رشتہ قائم نہیں کرتا۔ میں تو صرف اپنی ذات پر بھروسا کرتا ہوں اور اس ذات سے علامت کشید کروں گا تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ادب کی کیا قدر و قیمت ہوگی۔

اعجاز: خالص داخلی . . .

انور: لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آدمی ایسا کر سکتا ہے کہ سب سے کٹ کر اور جس سچوایشن میں وہ رہتا ہے اس سے الگ ہو کر کچھ کہہ سکے؟ میرا خیال یہ ہے کہ جو انسان سکرزوفرنزک ہے وہ بھی اپنے آپ کو آئیسولیٹیڈ (ISOLATED) نہیں کر پاتے۔

اعجاز: آپ نے اسکروفنزک کا لفظ استعمال کر کے بڑا اچھا کیا۔

ندیم: لیکن ذرا ہم کو بھی بتائیے کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

اعجاز: سکریزوفرنزک جو لفظ ہے اس کے سیدھے سادے معنے تو پاگل کے ہیں یہ ایک ایسے ذہنی مرض کا نام ہے، جس میں کسی شخص کا ادراک مریضانہ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کو کہے کہ صاحب یہ میرا سر رکھا ہے اور اس کے دل میں یہ یقین ہو کہ صاحب یہ چیز میرا سر ہی ہے تو اس کو وہ چیز اپنا سر ہی نظر آئے گی۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی سکروفنزک آدمی ادب پیدا کر رہا ہے، بلکہ تحریر کر رہا ہے تو کیا اس کو ادب تسلیم کر لیا جائے؟ یہاں میں انتظار صاحب کے ایک مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، جو میرے خیال میں اس چیز کی بہت اچھی مثال ہے۔ اگر وہ یاد میں لائیں تو اس کا اظہار کریں۔ انتظار صاحب آپ نے ایک زمانے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ میرے خیال میں ایک آدمی کے متعلق جو چرچل کے خط لیے پھرتا تھا۔ اس میں ایک تقسیم آتی ہے آدمی کی۔ وہ تقسیم پھر بتائیں۔ ورنہ مجھے فرائیڈ کی مثال دینی پڑے گی، فرائیڈ نے پاگل میں اور ادب تخلیق کرنے والے میں ایک جگہ امتیاز کیا ہے۔ اس نے کہا کہ دونوں جنگل میں چلے جاتے ہیں، وہ پاگل آدمی بھی اور ادیب بھی، یہ دونوں جنگل میں کھو جاتے ہیں، لیکن پاگل آدمی میں اور ادیب میں فرق یہ ہوتا ہے کہ ادیب جنگل میں کھو جانے کے بعد اپنا واپسی کا راستہ تلاش کر لیتا ہے اور پاگل آدمی کو راستہ نہیں ملتا۔

ندیم: آپ نے جو کہا تھا کہ ایک آدمی چرچل کے خط لیے پھرتا ہے، وہ کیا تھا انتظار صاحب؟

انتظار: مجھے یاد نہیں آ رہا۔

ندیم: آپ کو نہ مضمون یاد رہتے ہیں نہ کالم یاد رہتے ہیں (ہنسی)

اعجاز: سکروفنزک میں اور تخلیقی ادب پیدا کرنے والے میں کیا امتیاز ہے۔ چونکہ یہ لفظ انور سجاد صاحب نے استعمال کیا ہے اس لیے میں ان سے

پوچھنا چاہتا ہوں کہ بے شمار مثالیں ایسی ہیں کہ پاگلوں نے جو تحریریں پاگل خانوں میں لکھی ہیں وہ ان تحریروں سے ملتی جلتی ہیں جو ادیبوں نے لکھی ہیں۔ شاعری کی بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں، جنہوں نے صرف اپنی ذات سے ادب یا شاعری کی تعبیر کی ہے تو کیا سکرو فرنیزیا کے مریضوں کی تحریریں ادب تسلیم کی جاسکتی ہیں؟

طفیل : لاہور میں ایک صاحب ہیں، جسے سب جانتے ہوں گے وہ حاضر دماغ آدمی نہیں ہیں، لیکن غزل بڑی اچھی کہتے ہیں۔ ادب پر بڑی جچی تُلی رائے رکھتے ہیں۔

اعجاز : وہ تو پھر دوسری بات ہوئی کہ وہ اپنا راستہ واپسی کا تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن کیا سکرو فرنیزک تحریروں کو ادب کہا جا سکتا ہے؟

انور : میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے، میں پھر باہر سے مثال لاؤں گا، مثلاً مولانا محمد حسین آزاد کی آخری تحریر جو ہے۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا، جس میں وہ پاگل آدمی کے طور پر لکھتے ہیں، اس کے بعد ایک فرانسیسی ڈرامہ نویس ہے، ایڈ ملک اس کا نام ہے۔ وہ صحیح قسم کا سکرو فرنیزک تھا۔ اس کو تھراپی (THERAPY) کے طور پر کہا گیا تھا کہ آپ کچھ لکھا کیجیے۔ اور اس نے بڑے ماسٹر پیس ڈرامے لکھے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا وہ ڈرامے لکھنے کے بعد جس وقت اس کے ڈراموں میں سے زندگی کے بارے میں جو ایک نقطۂ نظر اُبھرا اس سے اپنی نجات کا کوئی راستہ ملا۔ اس وقت وہ پاگل تھا یا نہیں۔ لیکن جب وہ اس جنگل میں گیا اور اس نے سکرو فرنیزیا کی حالت میں بیٹھ کر ڈرامے لکھے، اس وقت وہ یقیناً سکرو فرنیزک ہی تھا، لیکن جب وہ حقیقت میں واپس آتا ہے، یعنی ڈرامے لکھنے کے بعد بھی تو وہ سکرو فرنیزک ہی رہتا ہے۔ اگر ہم اس کو اس کے ڈراموں کے حوالے سے جاننے کی کوشش کریں تو وہ ہمیں پاگل دیوانہ نظر نہیں آتا۔ میں اس معاملے میں بڑا کنفیوزڈ (CONFUSED) ہوں کیونکہ میرے نزدیک یہ ڈیلی نی ایشن (DELINEATION) ہو ہی نہیں سکتا۔

نسیم : میرا خیال ہے کہ یہ مرض اس پر مسلسل حاوی نہیں ہوتا ہوگا۔ دورے پڑتے ہوں گے۔

وقار : بعض چیزیں ایسی لکھی ہوئی ہیں جو اسی ذہنی کیفیت میں لکھی گئی ہیں۔ اعجاز صاحب آپ پوچھ رہے تھے کہ اردو والے اس مرض کو کیا کہتے ہیں، اسے انشقاق ذہنی کہتے ہیں، جسے یہ مرض ہے وہ منشق الذہن ہے۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ایسے آدمی میں کبھی کبھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ذہن کا یہ شگاف جڑ جاتا ہے۔ وہ شگاف باقی نہیں رہتا اور اس کیفیت میں وہ جو کچھ کہتا ہے، وہ ایسا معلوم ہوتا ہے، الہام ہے جس ڈرامہ نگار کا انور سجاد صاحب نے ذکر کیا وہ جس وقت ڈرامہ لکھ رہا ہوتا تھا۔ اس وقت تک غالباً اس پر الہام کی کیفیت طاری ہوتی تھی، چنانچہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ منشق الذہن آدمی بھی کبھی کبھی بالکل نارمل ہو جاتا ہے اور وہ حالت وہ ہوتی ہے جب اس کے ذہن میں انشقاق باقی نہیں رہتا۔

اعجاز : منشق الذہن آدمی ادب کو، تخلیقی ادب کو، اپنے لیے، اپنی ذات کے طور پر استعمال کرتا ہے، اور منشق الذہن آدمی کا ادب کے تخلیق کرنے کا عمل سراسر اس کے انشقاق ذہنی کی صحت کی علامت ہے اور اس کی یہ صحت اسے ادب کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ انور سجاد نے کہا کہ ادب کی تخلیق کو بطور تھراپی کے یا علاج کے استعمال کیا جاتا ہے۔ وقار صاحب! یہ منشق الذہن اور انشقاق ذہنی

کے بہت اچھے لفظ بتائے آپ نے ہمیں۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بقول انور سجاد انشقاق ذہنی کا علاج ادب کے ذریعے سے کیا جاتا ہے اور جب منشقق الذہن آدمی ادب تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو منشقق الذہن نہیں ہوتا۔

وقار: گویا تخلیقی عمل کے وقت اس کا انشقاق باقی نہیں رہتا یا یوں کہیئے کہ اس کے ذہن کے بکھرے ہوئے رشتے آپس میں جڑ جاتے ہیں ذہن کے شیشے میں پڑے ہوئے بال اس طرح دور ہو جاتے ہیں کہ ان میں جو خفیف سی جدائی ہے وہ پیوستگی میں بدل جاتی ہے۔

اعجاز: لیکن جب وہ ادب تخلیق کر رہا ہو، اس وقت بھی وہ منشقق الذہن ہو تو . . . .

انور: میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں باتوں کا یکجا ہونا ممکن نہیں بلکہ میں تو یہ سوال کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں وہ جو کچھ تخلیق کرتا ہے کیا اس کو ہم ادب کہہ سکتے ہیں۔

اعجاز: یہی تو میں نے عرض کیا تھا کہ بے شمار منشقق الذہن آدمیوں نے پاگل خانوں میں رہ کر جو تحریریں لکھی ہیں وہ ان تحریروں سے ملتی جلتی ہیں جنہیں ہم اچھا ادب کہہ سکتے ہیں۔

انور: لیکن اگر اس کا پتہ نہ چلایا جائے کہ یہ ان پاگل لوگوں نے لکھیں، مثال کے طور پر میرے پاس چند ایک تصویریں آئیں جو ایک کتاب کے سلسلے میں ایڈورٹائز (ADVERTISE) کی گئی تھیں، اتنا بلند تھا اور آپ یقین کیجیے کہ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ یہ فرانس کے کسی پاگل خانے میں بیٹھ کے لوگوں نے تھراپی کے طور پر بنائی ہیں تو میں انہیں دنیا کے مختلف پینٹرز کے ساتھ آئڈنٹی فائی (IDENTIFY) کر سکتا ہوں۔

اعجاز: تو جن لوگوں نے گدھے کی دم کے ساتھ برش باندھ کر تصویریں بنائیں اور لوگوں سے کہا کہ دیکھیئے کتنی اچھی تصویریں ہیں، اور بہت سے نقاد مان گئے کہ یہ بہت اچھی تصویریں ہیں تو پھر یہ جو ادب کو جانچنے کے معیار ہیں، ان کے بارے میں ہمیں تحقیق کرنی پڑے گی۔ یہ نہیں کہ ادب کو جانچنے کے جو معیار ہیں، انہیں ہم نہ سمجھ سکیں اور ہمیں یہ پتہ نہ چلے کہ اس تصویر کے بنانے میں گدھے کی دم کے ساتھ برش باندھا گیا ہے، یا ایسی تحریریں ہمارے سامنے رکھی جائیں جو بالکل منشقق الذہن آدمیوں نے پاگل خانوں میں تحریر کی ہیں، اور وہ اچھی شاعری یا اچھا افسانہ یا اچھا ڈرامہ معلوم ہونے لگیں تو پھر یہ سوچنا پڑے گا کہ کیا ہم نے ادب کو جانچنے کے جو معیار بنا رکھے ہیں کیا واقعی وہ ویلڈ (VALID) ہیں، اگر اتنا کنفیوز (CONFUSE) کیا جا سکتا ہے کہ گدھے کی دم کے ساتھ برش باندھ دیا جائے اور اس سے جو پینٹنگز بنیں، کینوس پر اسے ہم بڑا فن قرار دے دیں یا ایک پاگل کی تحریریں جو اس نے پاگل خانے میں بیٹھ کر لکھی ہیں ان کو ایک بڑا ادب قرار دے دیا جائے تو پھر وہی سوال اٹھے گا، جس کی طرف میں نے بحث کے شروع میں اشارہ کر رہا تھا کہ ادب کو جانچنے کے معیار جو ہیں ان کی ویلڈٹی (VALIDITY) پر بھی نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہو گی۔ حلقہ ارباب ذوق میں ابھی ایک مجلس پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک غزل پڑھی گئی، جس کے ایک شعر پر بڑا واضح اختلاف رائے تھا دو ایسے بحث کرنے والوں میں، جن کے صحیح النظر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ اس کو بہت بے معنی شعر کہہ رہے تھے اور دوسرے اس کو نہایت اچھا بامعنی شعر قرار دے رہے تھے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ادب کے معیار کیا ناقص بالکل ذاتی ہیں یا ان میں کوئی اجتماعی چیز بھی موجود ہے، کیونکہ جو مثال میں نے آپ کے سامنے پیش کی اس میں ایک صاحب اسے نہایت ہی گھٹیا شعر قرار دے رہے ہیں اور دوسرے اتنا ہی اچھا۔ یوں گویا ادب کو جانچنے اور پرکھنے والے کے معیار بالکل ذاتی اور شخصی ہو گئے۔

ندیم: میرا خیال ہے کہ ادب کو جانچنے کے کسی ایک معیار پر سب متفق نہیں ہو سکتے۔

اعجاز: اور میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہم متفق نہیں ہوں گے ادب کو جانچنے کا عمل متعین نہیں ہو سکے گا۔

ندیم: ہر شخص ادب کی تخلیقات کو اپنے نقطۂ نظر سے جانچتا اور پرکھتا ہے۔

اعجاز: اگر یہ صورت ہے تو پھر وہ آفاقیت کہاں سے آئے گی، جس کا ذکر ادب کے مُبصّر بار بار کرتے رہتے ہیں۔

ندیم: آفاقیت تو اچھے ادب کا لازمی حصہ ہے۔

اعجاز: تو وہ آئے گی کہاں سے؟

وقار: جی ہاں، جب جانچ پرکھ کے معاملے میں دو آدمیوں کا نقطۂ نظر بھی یکساں نہ ہو۔

اعجاز: اور وہ دو آدمی یا چار آدمی جو ہیں انہیں حق پہنچتا ہے کہ ادب کے متعلق اپنی اپنی رائے قائم کریں۔ وہ ادب پڑھتے ہیں یا ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور ادب کی دنیا میں ان کی آواز موجود ہے۔ ان آوازوں میں چاروں کا اختلاف رائے موجود ہے، تو اس بارے میں سوچنا پڑے گا کہ کیا ادب کو جانچنے کا کوئی آفاقی نقطۂ نظر موجود ہے؟

وقار: اس اختلاف میں سے جب تک ہم اتفاق کا کوئی پہلو نہ نکالیں تخلیقی فن پاروں کی جانچ پرکھ اور ان کے تعین مرتبہ کا سارا عمل بے معنی ہوگا۔

طفیل: اعجاز صاحب نے تو بحث کو بڑا دلچسپ رنگ دے دیا کہ گدھے کی دم کے ساتھ برش باندھ کر تو پینٹنگ بنائی ہی ہے ہم اس میں بھی بلاوجہ معنی ڈھونڈتے ہیں، ستم کی بات یہ کہ نقادوں نے بھی اسے فن کا درجہ دے دیا۔ ایسے ہی موقعوں پر سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے اور میں یہ بات شروع ہی سے کہہ رہا ہوں کہ اُردو افسانہ کو گدھے کی دُم کے ساتھ نہ باندھیں۔ (قہقہہ)

وقار: لیکن معنی تلاش کرتے وقت پتہ چل جاتا ہے کہ یہ تصویر گدھے کی دُم کے ساتھ برش باندھ کے بنائی گئی ہے یا کسی شعوری فنی عمل کا نتیجہ ہے۔ کوئی باطنی قوت ہمیں اس بات کا احساس دلا دیتی ہے۔

اعجاز: جن لوگوں کا ذکر آپ کر رہے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ ... ...

طفیل: ہم نے آپ کو بے وقوف بنایا تھا (قہقہہ)

وقار: تو شاید آپ اسی لیے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے کہ کہیں کل کو یہ ادب آپ کو بے وقوف نہ بنا دے (قہقہہ)

طفیل: میں تو بعض سوال صرف اسلیے پوچھ رہا ہوں کہ باتیں واضح ہوں۔ اعتراض مقصود نہیں ہے۔ یا یہ کہ جب آپ کہیں چپ ہو جاتے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ یہاں اب چٹکی لینے کی ضرورت ہے تاکہ بات زوروں سے چلے۔ بعض باتوں کے سلسلے میں میرا ذہن بالکل صاف تھا، گو میں نے محض بات کو چلانے کے لیے اعتراضات کیے۔ یہ سب کچھ اپنے استفادہ کے لیے اور بعض باتوں کو صاف کرنے کے لیے ہے۔

ندیم: اور رسالے کے لیے بھی (قہقہہ)

اعجاز: انتظار صاحب میں نے آپ سے اتنے سوال کر دیئے ہیں کہ اگر آپ دس بجے تک بھی بیٹھیں ان کے جواب ختم نہ ہوں گے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔

انتظار: تو گویا آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں (اعجاز صاحب چلے جاتے ہیں)

وقار : وہ آپ کے تین سوال ختم ہو گئے طفیل صاحب یا نہیں ؟

طفیل : جی نہیں! ان سوالوں سے جو سوال بالآخر پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ کیا ایسے کچھ لوگ موجود ہیں جن کے مستقبل کے بارے میں یہ یقین ہو کہ یہ بعد میں بھی زندہ رہیں گے ۔

وقار : اگر آپ ان دو باتوں پر متفق ہیں کہ اول تو ہمارے عہد کا ادیب موضوع کی تلاش اور جستجو کر رہا ہے اور وہ زندگی کے معنی سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہے، اور دوسرے جو کچھ ہمارا ماضی تھا اور ماضی کی وہ قدریں، جو معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں سے ابھرتی ہیں ہمارا افسانہ نگار ان میں اور موجودہ زندگی کی قدروں میں ربط تلاش کرنے اور ربط پیدا کرنے کی اہمیت کا احساس رکھتا ہے تو ہمیں مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ پہلی چیز آج کی زندگی سے قریبی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے، اور پھر ماضی کے رشتے سے اس کے معنی سمجھ کر اسے مستقبل میں لانے کی کوشش ہے۔ اگر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارے افسانہ نگار میں ان دونوں باتوں نے عمل کی صورت اختیار کی ہے تو پھر یہ سمجھنا کہ افسانہ ختم ہو رہا ہے یا افسانے میں آئندہ آگے بڑھنے کے امکان نہیں ہیں، میرے نزدیک قطعی طور پر درست نہیں ہوگا۔

طفیل : تو گویا یہ تجرباتی دور ہوا پھر۔ ویسے میں مستقبل کے افسانے سے قطعی مایوس نہیں ہوں ——— سوال موجودہ افسانے کا ہے۔ بہر حال جب اتنے پڑھے لکھے دوست یہ کہہ رہے ہیں کہ موجودہ افسانہ آگے بڑھ رہا ہے تو میں بھی ملنے لیتا ہوں۔ ویسے میرا کہنا یہ تھا کہ اس دور میں بھی نئے افسانہ نگاروں سے پرانے افسانہ نگار ہی بہتر لکھ رہے ہیں، مگر آپ لوگ نہیں مان رہے کیا کیا جائے ۔

انتظار : تجرباتی دور تو ہم ہر دور کو کہہ سکتے ۔

طفیل : مطلب ہے کہ نئے لکھنے والوں نے کوئی واضح سمتیں نہیں بنائیں۔

ندیم : آپ یہ کس طرح کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے واضح سمتیں نہیں بنائیں ۔

انور : واضح سمت سے کیا مراد ہے آپ کی ؟ سچ پوچھئے تو یہ بڑا بنیادی سوال ہے ۔

طفیل : آپ کبھی خالص علامتی افسانہ لکھتے ہیں، کبھی نہیں لکھتے اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ آپ کے لکھنے کی کوئی سمت تو مقرر نہیں ہے پھر میں یوں بھی سوچتا ہوں کہ جو افسانہ نگار علامتی سہارے ڈھونڈتا ہے اسے اپنے فن پر قابو نہیں۔ دوسری یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ وہ حالات کا سامنا نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا۔ اگر اسے کوئی سمت کہا جا سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔

وقار : نہیں یہ بات نہیں۔ آپ یوں سوچیں کہ تجربے کی نوعیت پر ہے۔ بعض اوقات ایک تجربہ افسانہ نگار کے ذہن میں آتا ہی علامت کی صورت ہے اور پھر بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا اس لیے اپنی بات کو علامت کے ذریعے پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس میں نہ کوئی فنی عجز کی بات ہے اور نہ حالات سے ڈرنے کی !

خدیجہ : آپ ادیب سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج تم نے کہانی جس طرح لکھی ہے، اسی انداز سے ہمیشہ لکھتے رہو۔

طفیل : لکھنے میں تو انفرادیت ہونی چاہیے کہ نہیں ؟ کوئی جان دار فنی چابک دستی ہونی چاہیے کہ نہیں ؟ کوئی بڑی بات کہنے کا سلیقہ ہونا چاہیے کہ نہیں ؟ محض تجربہ، محض سوچیں بڑا افسانہ نہیں دے سکیں گی۔

وقار : ابھی جیسا کہ انور سجاد کہہ رہے تھے اور میں نے بھی عرض کیا کہ ایک مخصوص تجربہ، فکری، تخلیقی، اپنے اظہار کا اسلوب بھی ساتھ لے کر

آتا ہے۔ بات کہنے والا یہ نہیں سوچتا کہ اس بات کو کہنا کس طرح ہے۔ بلکہ دونوں چیزیں ایک ساتھ وارد ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ اگر کسی افسانے میں فنی خوبیاں نہ ہوں گی تو بلاشبہ وہ ایک ناکام افسانہ ہوگا۔

انتظار : معلوم ہوتا ہے طفیل صاحب ہم جیسے افسانہ نگاروں سے بہت ہی زیادہ مایوس ہیں۔

طفیل : نہیں یہ بات نہیں۔ مایوس نہیں ہوں۔ یہ جو آپ لوگ بڑے بڑے فن کاروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، اور ہمیں جو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم نے افسانے کو زیادہ وسعت دی ہے۔ زیادہ سنوارا ہے۔ اسے میرا ذہن قبول نہیں کر رہا۔ ویسے یہ بات ہے کہ میں آپ کے کسی افسانے کو پڑھوں تو فوراً جان جاتا ہوں کہ یہ انتظار صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح انور سجاد کا کوئی افسانہ بھی ہو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ انور سجاد کا افسانہ ہے۔ یہ بات خوبی کی ہے اسی طرح اور بھی کئی افسانہ نگار ہیں جو اپنی سوچوں میں اتنے پختہ ہو گئے ہیں کہ وہ جس راستے پر بھی چلیں پہچانے جاتے ہیں۔

انور : میرے خیال سے تو اس بات کا پتہ چلانا ممکن نہیں اس لیے کہ کل کو معلوم نہیں تجربے کی نوعیت کیا ہو۔

وقار : ہر دفعہ انتظار صاحب ایک سا افسانہ نہیں لکھتے اور ہر دفعہ انور سجاد بھی ایک سا نہیں لکھتے۔

طفیل : جی ہاں! ہر افسانے کا اظہار مختلف ہوگا، لیکن ان کی تحریر کا رنگ ایسا ہے کہ وہ اس سے پہچانے جاتے ہیں۔

وقار : یہ بات خالصتاً لکھنے کے اسلوب سے تعلق رکھتی ہے۔ بعض خاص لفظ، خاص فقرے، خاص محاورے ایسے ہیں جو ہمارے افسانہ نگاروں میں سے کوئی نہیں استعمال کرتا یا کر سکتا، سوائے انتظار صاحب کے وہ ان کی تہذیبی شخصیت کے رچاؤ کی نشانیاں ہیں۔

طفیل : لیکن وہ اسلوب کی ان علامتوں سے کوئی ایسی بات پیدا کر دیتے ہیں کہ صاف پہچانے جاتے ہیں۔ یہی صورت مثال کے طور پر جیلانی بانو اور عصمت چغتائی کی ہے۔ ان دونوں کو کبھی ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جائے گا۔

وقار : لیکن سوال یہ ہے کہ ہم یہ کیوں سمجھ لیں کہ پرکھ کا اعلیٰ ترین معیار عصمت ہیں۔

طفیل : بہرحال آپ اسے افسانے کی تاریخ سے باہر نہیں نکال سکتے۔ جب اردو افسانے کی تاریخ لکھی جائے گی عصمت چغتائی کا ذکر ہر حال میں آئے گا، بلکہ یہ کہ یہ ایک خاص انداز کی افسانہ نگاری کی نمائندہ ہیں۔

وقار : بالکل ٹھیک ہے، لیکن اس سے نتیجہ کیا نکلا؟ ذکر تو عصمت کی طرح اور بھی بہت سوں کا آئے گا۔

طفیل : میں نے تو صرف چند لوگوں کے نام مثال کے طور پر لیے ہیں، جن کے متعلق ہمارا ذہن کہتا ہے کہ یہ لوگ باقی رہیں گے۔ کیونکہ ان کے فن میں جان ہے، دوسری گزارش یہ ہے کہ ہم لوگوں نے یا تو پرانے افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے یا اب بالکل نئے لکھنے والوں پر آ گئے ہیں۔ اس سے کنفیوژن پیدا ہوگا۔ کیونکہ بیچ کے لکھنے والوں کا ہم نے ذکر ہی نہیں کیا۔

وقار : پہلے تو بات ہو رہی تھی فن کی، رجحانات کی اب بات ہو رہی ہے نئے لکھنے والوں کی۔ اس لیے درمیانی عرصے کے لکھنے والے تو زیر بحث ہی نہیں آئے۔ ورنہ ان کا بھی حق ادا کرنے کی کوشش کرتے۔

ندیم : ایک نئی افسانہ نگار ہیں نکہت حسن ان کے افسانے اعلیٰ درجے کے معیاری افسانہ نگار کے افسانوں سے ٹکر کھاتے ہیں۔

خدیجہ : نکہت حسن ہیں رضیہ ہیں اسی طرح اور بھی بہت سے ہیں ... .

ندیم : اور بعض لکھنے والے خاموش ہو گئے ہیں بالکل نہیں لکھ رہے۔

وقار : ہم ان لوگوں کا نام نہ بھی لیں تو بہت سے نئے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً خواتین کے جو دو نام لیے گئے ان کے علاوہ ایک عفرا
بخاری ہیں۔ وہ بہت اچھے افسانے لکھ رہی ہیں۔ اسی طرح غلام احمد اور فرخندہ لودھی، اور خالدہ اصغر کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔
ندیم : بات یہ ہے کہ ہمیں اتنی سختی سے کام نہیں لینا چاہیے اگر کسی افسانہ نگار نے کم افسانے لکھے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے
اچھے افسانہ نگاروں میں شمار نہ کریں۔
وقار : آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔ جو نام ابھی ہم نے لیے ان میں سے بعض نے صرف دو تین افسانے لکھے اور انہیں دیکھ کر ہم نے یہ
نتیجہ نکال لیا کہ انہیں مستقبل میں اچھا اور بڑا افسانہ نگار بننا ہے
ندیم : تو گویا جانچتے وقت ہمیں محض لکھنے والوں کے افسانہ کی تعداد نہیں دیکھنی چاہیے۔
وقار : بالکل بجا۔ اسی طرح کے افسانہ نگاروں میں میرے نزدیک خود انور سجاد ہیں جنہوں نے افسانوں کے انبار نہیں لگا دیے پھر بھی اپنے
لیے ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔
انور : اگر ادب کی تاریخ کا ذکر ہوا تو یقینی بات ہے کہ یہ جتنا بھی کام آج ہو رہا ہے اس کا ضرور ذکر ہوگا۔ کم از کم اسے ہسٹاریکل۔
HISTORICAL نقطۂ نظر سے ضرور دیکھا جائے گا۔
خدیجہ : وہ کتنے نام ہیں جو مستقبل میں زندہ رہیں گے ؟
وقار : تعداد کا تعین تو ناممکن ہے لیکن جن لکھنے والوں میں آگے بڑھتے رہنے کے آثار ہیں آدمی اگر محض اندازے کی بناء پر کہے تو دس بارہ
تو ضرور ایسے ہیں جنہیں ہم مستقبل کے افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ ان کا صحیح رتبہ اور مقام کیا ہوگا ؟ — اس کا اندازہ بھی آسان نہیں۔
انور : چونکہ ہم معیار ہی ڈٹرمن DETERMINE نہیں کر سکے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا تو ہم مستقبل کے بارے میں کس طرح ڈسکس
DISCUS کر سکتے ہیں۔
وقار : لیکن اس بات کا اندازہ تو ہوتا ہے کہ جس افسانے کا ماضی اتنا شاندار اور اتنا روشن ہے کہ ہم اپنے خاصے افسانوں کو مغرب کے
اچھے افسانوں کے ساتھ رکھ سکتے ہیں اور جس کے لکھنے والے اب بھی برابر نئے تجربے کرنے میں مصروف ہیں اس کے مستقبل کی
طرف سے ہم مایوس نہیں ہو سکتے۔
طفیل : میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ نئے لوگوں کو پچھلے افسانہ نگاروں کے مقابلے کوئی گھاس نہیں ڈالتا ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ ان
کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے تاکہ ان کو بھی اندازہ ہو کہ لوگ ہمارے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں۔ نئے لکھنے والے بیچارے بڑے
پریشان ہیں کہ ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے کوئی نقاد ان کا ذکر ہی نہیں کرتا۔
وقار : طفیل صاحب! یہ کہنا بڑی زیادتی کی بات ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔ دوسرے پہلے تو آپ نئے لکھنے والوں
کو گھاس نہیں ڈال رہے تھے (قہقہہ) اب ان کی طرف داری پر اتر آئے ہیں۔
طفیل : صرف مجبوری کے عالم میں ان کے نام گنوا دیئے جاتے ہیں۔ فن پر کھل کر بات نہیں کی جاتی، دوسرے جب میں پرانے لکھنے والوں کی
طرف داری کر رہا تھا تو اس وقت بھی سوچ سمجھ کر کر رہا تھا اور اب بھی سوچ سمجھ کر ہی کر رہا ہوں، میرا فرض وہ بھی تھا یہ بھی ہے۔

خدیجہ: کرتے کیوں نہیں۔ ان کے نام برابر لیے جاتے ہیں۔

وقار: پچھلے چند برسوں میں افسانے پر جو مضامین لکھے گئے ہیں مثلاً فنون میں بعض مضمون چھپے ہیں اور اسی طرح اوراق میں، سیپ میں، نیا دور میں، نقادوں نے بعض ایسے مضامین لکھے ہیں جن میں نئے لکھنے والوں کے نام بڑے اچھے الفاظ میں آتے ہیں پرانے لکھنے والوں کا نام محض تبرک کے طور پر لیا جاتا ہے۔ بعض مضامین تو ایسے ہیں جن میں کسی ایک افسانہ نگار کے افسانوں کو ہدف زیر بحث لایا گیا ہے۔ اگر یہ حوصلہ افزائی نہیں تو اور کیا ہے؟

ندیم: پاکستان کے معیاری ادبی رسالوں میں نئے افسانہ نگار بھی ہوتے ہیں۔ اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

وقار: میں نے پچھلے آٹھ دس دن میں کوئی دو سو رسالے الٹ پلٹ کر دیکھے ہیں اور افسانہ لکھنے والوں کی ایک لمبی سی فہرست بنائی ہے، ان میں لکھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد سے زیادہ ایسے ہیں جنہوں نے پچھلے چند برسوں میں سات سات آٹھ آٹھ افسانے لکھے ہیں، اور ان میں سے چند ایک تو ایسے ضرور ہیں جو میرے نزدیک قابلِ توجہ ہیں بعض لکھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے پہلا ہی افسانہ لکھ کر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ہمارے مستقبل کے افسانہ نگار ہیں۔ ان لکھنے والوں میں صادق حسین ہیں، غلام الثقلین نقوی ہیں، عذرا بخاری ہیں، انور سجاد، غیاث احمد اور اختر جمال ہیں۔

ادیب: بہت پرانی ہیں اختر جمال تو۔

وقار: بہت پرانی تو نہیں ہیں۔ ان کا نام پچھلے سات آٹھ سال میں سامنے آیا ہے۔

طفیل: اختر جمال تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ان کے افسانے اچھے سے اچھے افسانہ نویسوں کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں۔ آج فن کے بل بوتے پر نقادوں کو متوجہ کر لینا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ برائے نام ہی ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بانو قدسیہ بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ لکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس صنفِ ادب کو کچھ آگے ہی بڑھایا ہے۔

ندیم: ذکر تو آتا ہے البتہ ایسی بات نہیں کہ بطورِ خاص ان کا ذکر کیا جائے۔

وقار: ابھی میں نے جو چند نام لیے تھے۔ ان کے علاوہ احمد سعید ہیں، قاضی عبدالستار ہیں اور ہندوستان کے لکھنے والوں میں بھی بعض لکھنے والے ہیں۔

طفیل: قاضی عبدالستار بھی ایک زندہ رہنے والا افسانہ نگار ہے۔

وقار: ہم ان لکھنے والوں کا آج کی مجلس میں ذکر کر رہے ہیں تو کسی وجہ سے ہی کر رہے ہیں نا!

طفیل: کئی لوگوں نے نقادوں کی زبان سے ان کا نام ابھی نہیں سنا۔

وقار: لوگوں کو پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ اگر آپ کا یہ مذاکرہ نہ ہوتا تو سچی بات ہے میں وہ رسالے الٹ پلٹ کر نہ دیکھتا جو اس لیے اٹھا کر رکھ دیئے تھے کہ فرصت ملے گی تو پڑھوں گا۔ اب سارے کام چھوڑ کر یہی کام کیا اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کئی نئے لکھنے والوں کے نام سامنے آئے۔

سیمونڈ: ہم بھی رسالے پڑھتے ہیں اور بہت سے نئے لکھنے والوں کے نام نہیں سنے۔

انتظار: نام کیسے سنیں آپ؟ آپ تو کلاسیکی پسندوں کے ساتھ ہیں اور طفیل صاحب جو رسالہ نکالتے ہیں وہ بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے۔

طفیل: شکریہ!

انتظار: نیا لکھنے والا نظر کے سامنے کیسے آ سکتا ہے۔

احراز: میں نے جن افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے ان میں سے تقریباً ۵، ایسے ہیں جو نئے بھی ہیں پرانے بھی ہیں، وہ برابر لکھ رہے ہیں، جس میں قاسمی صاحب اور انتظار صاحب جیسے لوگ ہیں جو سال میں دو یا تین افسانے لکھتے ہیں اور رام لعل اور کرشن چندر جیسے بھی افسانہ نگار ہیں جو تیئس چوبیس اور بعض اوقات ایک سال میں ۲۵ تک لکھ جاتے ہیں۔

ندیم: ایک سال میں ۲۳، ۲۴، ۲۵

احراز: جی ہاں ایک سال میں ۲۳، ۲۴، ۲۵

ندیم: اچھا!

احراز: کرشن چندر بیس لکھ جاتا ہے۔ رام لعل کا سکور اس سے زیادہ ہے۔

ندیم: پھر تو وہ تھوک بیوپاری ہوئے نا! (قہقہہ)

انور: ہم تو اس نکتے کو پہلے ہی پا چکے ہیں (قہقہہ)

احراز: اگر تمام افسانہ نگاروں کے افسانوں کو یکجا کیا جائے تو تقریباً ایک سال کے اندر کئی ہزار افسانے ہو جائیں گے۔ افسانے کی ترقی کے لیے یہ رفتار واقعی اچھی ہے اور اسے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

وقار: بہت سے افسانہ نگاروں نے درمیان میں لکھنا بند کر دیا تھا۔ مثلاً خدیجہ ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصے تک لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب پھر لکھنا شروع کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اتنے دن اس لیے شاید خاموش تھیں کہ اچھا لکھنے کا ارادہ تھا اور ایسے بھی کچھ نام ہیں پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی۔ مثلاً امر سنگھ ہیں یا جوگندر پال ہیں۔

طفیل: جوگندر پال کے بارے میں بھی خوش فہمی رکھی جا سکتی ہے۔

وقار: خوش فہمی نہ کہیے، وہ مُضر ثابت ہوگی (قہقہہ) طفیل صاحب کے سوالوں کے جواب تو ہو چکے اب کچھ اور باتیں بھی ہیں، اِدھر اُدھر کی، جو آج کل کے افسانوں کے متعلق کہی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے مزاح نگاری اور طنز نگاری کے ذریعے ادب میں اپنا مقام بنایا ہے انہوں نے افسانوی مضامین کے ذریعے اپنے مزاح اور طنز کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً مشتاق احمد یوسفی ہیں، انہوں نے جتنے مضامین لکھے ہیں، ان میں سے بعض میں افسانے کا مزا ہے اور لطف یہ کہ ان میں وہ کہانی پن بھی ہے۔ جس کے فقدان کا گلہ ہم نے آج کیا ہے۔ پھر احمد جمال پاشا ہیں، رشید احمد صدیقی ہیں، انہوں نے مضمون کی طرح جو چیزیں لکھی ہیں وہ افسانے کے لطیف فن پر پوری اترتی ہیں۔ ایسے ہی ایک لکھنے والے مسعود مفتی ہیں۔ ان کے ہاں مزاح بھی ہے اور کہانی پن بھی۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مزاح نگار نے بھی یہ محسوس کیا ہے کہ وہ اپنے مزاح کو افسانے کے ذریعے زیادہ مؤثر انداز میں پیش کر سکتا ہے اور اپنے پیغام کو زیادہ لوگوں تک پہنچا سکتا ہے۔

انتظار: میں آپ سے ایک استفسار کرتا ہوں کہ جو افسانہ اس دور میں لکھا جا رہا ہے، اسے دیکھ کر ہم کس طرح تمیز کرسکتے ہیں کہ فلاں فلاں مکاتیبِ فکر اس وقت اردو افسانے میں موجود ہیں، ایک مکتبِ فکر جس کا ذکر آیا ہے علامت پسندوں کا ہے۔ نئے لوگوں میں، میں انور سجاد کا نام لوں گا۔ ہندوستان میں بلراج مینرا ہیں، دوسرے افسانہ نگاروں میں، اور نئے لکھنے والوں میں مسعود مفتی ہیں یا صادق حسین ہیں یا الطاف فاطمہ ہیں یا نکہت حسن ہیں۔ یہ جو لکھنے والے ہیں ان میں آپ کیسے تمیز کرسکتے ہیں کہ یہ کس قسم کے رجحانات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ یہ رجحان تو بالکل الگ نظر آتا ہے۔

ندیم: خالدہ اصغر خاموش ہیں۔

انتظار: وہ بھی اب نہیں لکھتیں۔ یعنی میدان میں تو اب یہی چند لوگ رہ گئے نا! سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے رجحان کے مظہر ہیں۔

انور: یوں لگتا ہے کہ اس قسم کے جو رجحانات ہیں ان میں بہت سے افسانے آج لکھے جاسکتے ہیں۔

وقار: کچھ لکھنے والوں کا انداز اور اسلوب علامتی ہے۔ انہوں نے اسے جان بوجھ کر اختیار کیا اور کامیابی سے برتا ہے، لیکن بعض لکھنے والے محض تقلید میں لکھ رہے ہیں، ان کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ خود ان کی اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ وہ دوسروں سے پوچھتے جاتے ہیں کہ بتاؤ ہم نے کیا لکھا ہے۔ اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ افسانے میں علامت کا استعمال بڑی نازک اور دشوار چیز ہے۔ علامت حقیقت میں صرف اسی صورت میں قابلِ قبول بنتی ہے کہ وہ کہنے والے اور سننے والے کے درمیان رابطہ قائم کرسکے۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب علامت ہماری تہذیبی زندگی ہی سے نکلی ہو، ہماری تاریخ میں سے نکلی ہو اور ہمارے مخصوص طرزِ احساس میں سے نکلی ہو۔

انور: بعض اوقات تو میں اس حد تک بھی جسٹی فائی JUSTIFY کرتا ہوں، لیکن بعض افسانے تو بالکل بے معنی ہوتے ہیں مثال کے طور پر سریندر پرکاش کا ایک افسانہ ہے "شب خون" اس میں بالکل ریلیشن شپ RELATIONSHIP کا احساس نہیں۔ جملہ شروع ہوتا ہے اور اس میں کوئی پنکچویشن PUNCTUATION نہیں ہوتی۔ ایک عجیب قسم کی ٹیکنیک استعمال کی گئی ہے۔ کہیں تیل والی آجاتی ہے۔ کہیں آٹا مہنگا ہو جاتا ہے، کہیں کوئی فاقوں سے مر جاتا ہے۔ اور مختلف چیزوں میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ ہر چیز بالکل بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے، لیکن اس میں جو ایک احساس ہے خاص قسم کی ٹینشن کا، اور ایک خاص قسم کی جو سچوایشن آف کرائسس SITUATION OF CRISIS ہے اس سے ایک ایٹماسفیر ATMOSPHERE پیدا ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کہانی کامیاب ہی اس وقت ہوتی ہے، جب وہ انسان پر ایک تاثر چھوڑ جائے اور اس کا کیتھارسس KETHERSIS کرسکے۔

وقار: فنی نقطۂ نظر سے کہانی کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر ایک مجموعی تاثر قائم کرے۔ موپساں اور چیخوف ان دونوں کی کہانیوں کی خوبی یہی ہے۔ بعض اوقات معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہانی کچھ پہلے ختم کر دی اور پڑھنے والے کو ایک خاص طرح کی کش مکش میں مبتلا کر دیا۔

انور: میرے خیال میں چیخوف اور موپساں کی صورت مختلف ہے۔ قاری کو وہ جس طرح کی کش مکش میں چھوڑتے ہیں، اس سے کیتھارسز

پورا نہیں کر پاتے وہ کہانی میں ایک ایٹماسفیر آف ٹینشن ATMOSPHERE OF TENSION چھوڑتے ہیں۔

ندیم: اگر وہ ایٹماسفیر آف ٹینشن قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کامیابی ہو گئی۔

انور: جی ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میں یہی عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ کہانیاں جن میں علامتوں کے ذریعے اظہارِ خیال کرتے ہیں ہم خیال کو کمیونی کیٹ COMMUNICATE نہیں کر پاتے۔ سننے والا یا پڑھنے والا سوچتا ہے کہ یہ شخص فلاں بات کیوں کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے اور فلاں چیز کیوں ہوئی تھی۔ قاری کی سمجھ میں علامت تو نہیں آتی۔ لیکن وہ ایک مجموعی تاثر پیدا کرتی ہے اس پر اور ایک خاص قسم کا ٹینشن TENSION یا کوئی ری ایکشن RE-ACTION چھوڑ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس طرح کی کہانی کو ناکام نہیں کر سکتے۔

ندیم: لیکن اگر علامت سمجھ میں نہ آئے تو تاثر کیسے پیدا ہوگا۔

انور: خاص اسلوب ہے جس سے افسانہ نگار نے امیجز IMAGES کو کلیکٹ COLLECT کیا ہے۔ اس صورت میں پڑھنے کے بعد مینٹل کیتھارسس MENTAL KETHARSIS تو نہیں ہوتا لیکن کہانی اور اس کی علامت ایک ڈسٹربینس DISTURBANCE اور ایک کرائسس CRISIS ضرور چھوڑ جاتی ہے۔

وقار: جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اگر اسے قبول کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خیال یا تاثر کا ابلاغ ہوا ہے، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

انور: جی ہاں! یقیناً ابلاغ اس صورت میں ہوا کہ علامتوں سے سہارا نہیں ملا لیکن ایک خاص طرح کا ایٹماسفیر ATMOSPHERE پیدا ہوا اور اس نے ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے میں مدد دی۔

وقار: دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایک علامت یا بعض علامتوں سے افسانہ نگار نے براہِ راست اظہار یا ابلاغ کا کام نہیں لیا، بلکہ بالواسطہ ایک خاص ماحول پیدا کیا یا ایک خاص فضا پیدا کی ہے۔

انتظار: یوں کہیے کہ وہ افسانہ معنی کو تو کنوے CONVEY نہیں کر سکا لیکن احساس منتقل ہو گیا۔

انور: میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی کہانی میں افسانہ نگار نے اگرچہ تاریخ کے درمیان کمیونی کیٹ COMMUNICATE اس مقصد سے نہیں کیا کہ وہ اس کی علامتوں کو کوٹ QUOTE کرتا اور حساب کتاب کر کے درج کر کے کہتا کہ فلاں چیز نفسیاتی اقدار کے ساتھ مل گئی ہے۔ پڑھنے والے کو اس قسم کا کوئی تاثر نہیں ہوتا، لیکن لکھنے والا خاص قسم کا (میں پھر ٹینشن TENSION ہی کا لفظ استعمال کروں گا) تاثر چھوڑتا ہے۔

انتظار: لیکن ایسے افسانے کی جس میں صرف ایک فلسفہ کمیونی کیٹ COMMUNICATE کیا گیا ہے، اس کی کیا قدر و قیمت ہوگی اس افسانے کے مقابلے میں جو معانی کو پورے طریقے سے کنوے CONVEY کرتا ہے۔

انور: شیلا صاحب نے یہ پوچھا تھا کہ وہ رجحان مفید ہے یا غیر مفید۔

انتظار: سوال مفید اور غیر مفید کا نہیں بلکہ جنرل ججمنٹ GENERAL JUDGEMENT کا ہے۔

خدیجہ: لیکن ایک بات ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک الجھن سی پیدا ہو گئی ہے اور وہ کبھی ختم نہیں ہو گی۔ بانیدگی جو مطالعے سے ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہوئی۔

انور: میں اس کا ریزن REASON بیان کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والا کسی اور طریقے سے لکھ رہا ہے اور پڑھنے والا کسی اور طریقے سے پڑھ رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دونوں پانی پت کے میدان میں اکٹھے نہیں ہوتے، جنگ شروع نہیں ہوتی۔

وقار: اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ جو ٹینشن TENSION تناؤ یا کھنچاؤ آپ نے بحیثیت افسانہ نگار پیدا کرنا چاہا ہے، بعض لوگوں میں پیدا ہو گا اور بعض میں نہیں پیدا ہو گا۔

ندیم: ہمیں یہ شبہ ہے کہ ہم بحیثیت قاری سچ مچ پانی پت کے میدان میں کھڑے ہیں۔

انور: یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ پانی پت کے میدان میں کھڑے ہوں اور ہم (یعنی افسانہ نگار) سمجھ رہے ہوں کہ آپ پانی پت کے میدان میں اترے ہی نہیں (قہقہہ)

خدیجہ: بیچارہ پڑھنے والا پانی پت کے میدان میں جا کر بھی ختم ہو چکا ہے اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ وہ میدان میں ابھی اترا ہی نہیں۔

انور: جی نہیں! بات یہ ہے کہ وہ بھی اسی احساس کے تحت سوچ رہا ہے کہ میں پانی پت کے میدان میں کھڑا ہوں اور یہ اس کا اپنا ایک میتھڈ METHOD ہے سوچنے کا۔

ندیم: پریمسز PREMISES کا فرق ہو گیا!

انور: جی ہاں، بالکل پریمسز کا فرق ہے۔

وقار: انور صاحب، جو کچھ آپ اور ندیم صاحب فرما رہے ہیں اور خدیجہ صاحبہ فرما رہی ہیں، اس سے الگ ہٹ کر ایک اور بات بھی توجہ طلب ہے۔ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، آٹھ دس برس کے افسانہ نگاروں میں کہ جس طرح مارکسی نظریوں نے آدمی کو غلام بنایا تھا یا پھر نفسیاتی حیثیت سے اور مادی حیثیت سے انسان کی شخصیت، انفرادیت اور اس کے اپنے ذاتی وجود کو بالکل بے معنی بنا دیا تھا اور وہ اجتماعی زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ نئے افسانہ نگار نے اس کا شدت سے احساس کیا ہے اور موجودہ دور کے افسانہ نگار پھر اس جگہ لوٹ رہے ہیں، جہاں انسان کو بحیثیت انسان کے اور فرد کو بحیثیت فرد کے اس کی جگہ ملنی چاہیے۔ خاص کر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد جو افسانے لکھے گئے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہیں۔

طفیل: ۱۹۴۷ء کے فسادات پر بڑے پایہ کے افسانے لکھے گئے۔ وہ ہماری زندگی کا بہت بڑا المیہ تھا۔ یہ جنگ بھی بہت بڑا المیہ تھی لیکن میرے خیال میں اس پر تو کوئی قابل ذکر افسانہ نہیں لکھا گیا۔

خدیجہ: جی نہیں! ایسا تو نہیں۔ ویسے جنگ کے فوراً بعد جو افسانے لکھے جائیں وہ ضروری نہیں کہ واقعی قابل ذکر بھی ہوں۔

انور: ۱۹۴۷ء کے فسادات کے واقعے کو حالیہ جنگ کے ساتھ ملانا مجھے کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دونوں میں میرے نزدیک بڑا فرق ہے۔ مثلاً جواب جنگ ہوئی، اس میں مجھے سب سے بڑی مشکل پیش آئی جس وقت پتا چلا کہ جنگ شروع ہو گئی ہے

اور لاہور کے لوگوں کو چنا گیا ہے۔ اس کے لیے تو اٹ واز اے سڈن شاک IT WAS A SUDDEN
SHOCK میرے لیے آدمی کوئی بھی نفسیاتی طور پر یا جسمانی طور پر تیار نہیں تھا۔ اس چیز کو ایکسپیکٹ EXPECT
کرنے کے لیے جب فسادات گریجوال GRADUALLY شروع ہوئے۔ ان کے پیچھے ایک بہت بڑی تاریخ اور
اس کا اپنا ایک سگنی فکنس SIGNIFICANCE بنتا ہے اور اس کا تجربہ لوگوں نے اپنے اندر سمو لیا تھا۔ جس جس
نظریئے سے بھی کہانیاں لکھی گئی تھیں ان میں مختلف پوائنٹس آف ویو POINTS OF VIEW موجود ہیں۔ لیکن
۱۹۶۵ء کی جنگ کا نظریہ ایک ایمرجنسی EMERGENCY میں فارم FORM ہوا۔ جس وقت قوم یونائٹ
UNITE ہوتی ہے تو اس کے ممکن ہے کہ کئی نفسیاتی عوامل ہوں۔

وقار: بات یہ ہے انور صاحب کہ جس چیز کو آپ UNITY کہتے ہیں وہ یونٹی اندر موجود تھی۔ کسی ایک چیز نے اسے ابھارا۔
اور وہ تجربہ پوری قوم کا تجربہ بن گیا۔

انور: اسی تجربے کی بنا پر وہ ادب لکھا گیا۔ یہ ادب ایک ایمرجنسی کا ادب تھا۔ ہم نے ڈرامے لکھے، بہت سے لوگوں نے نظمیں لکھیں۔

وقار: لیکن ہندوستان والوں نے یہ کہا کہ دیکھئے پاکستان برسوں سے جنگ کی تیاری کر رہا تھا، اور وہاں کے ادیب اور افسانہ نگار
اور شاعر بھی اس جنگ کی تیاری کر رہے تھے، جبھی تو جنگ شروع ہوتے ہی انہوں نے نظموں کی بھرمار کر دی۔

انور: ایک اور بات ہے وقار صاحب! میرا خیال یہ ہے کہ ہم سب لوگوں نے لاہور میں بیٹھ کر اس جنگ کو ایکسپیرینس
EXPERIENCE کیا ہے۔ جنگ کے دوران ہم نے اس میں ایکچوئلی فرنٹس FRONTS ACTUALLY پر
جا کر پارٹی سی پیٹ PARTICIPATE نہیں کیا۔ بات شاید ذرا الجھ جائے ہم نے فرنٹس FRONTS
پر جا کر اس جنگ کو اس طرح ایکسپیرینس EXPERIENCE نہیں کیا جس طرح کہ یوروپینز EUROPEANS
نے کیا ہے۔ ہم شہر میں تھے۔ ہمیں ایک پوٹینشل ڈینجر POTENCIAL DANGER تھا، لیکن اندر سے ہمیں معلوم
تھا کہ ہمیں ہونا کچھ نہیں۔ کم از کم مجھے یقین تھا۔

وقار: ہمیں پورا اعتماد تھا اپنی فوجوں پر۔

انور: اعتماد تھا فوجوں پر، اور یہ کہ ہمارے شہر پر ہوائی حملے نہیں ہوں گے۔ اس لیے وہ جو ایک خاص قسم کی انوالومنٹ سچوایشن
SITUATION INVOLVEMENT ہوتی ہے، وہ میرا خیال ہے کہ نہیں تھی، جس وقت بھارتی حملہ آور
ہوئے اس وقت کوئی شخص دیہاتوں میں ہوتا اور وہاں پر کھڑا ہو کر اس ساری واردات کو ایکسپیرینس EXPERIENCE
کرتا پھر میرا خیال ہے کہ سچوایشن SITUATION ذرا مختلف ہوتی۔

انتظار: آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فزیکل PHYSICAL تجربے سے لوگ نہیں گزرے۔ جو لوگ شہر میں بیٹھے ہوئے تھے۔
انہیں جذباتی انوالومنٹ INVOLVEMENT تو تھا۔

انور: جذباتی انوالومنٹ تو یہ بھی ہے کہ میں یہاں بیٹھ کر ویت نام کے بارے میں بہت سوچتا ہوں۔

خدیجہ: آپ سوچ سکتے ہیں لیکن محض جذباتی طور پر۔

انور : میں عرض کرتا ہوں کہ جذباتی طور پر میں ویت نام کے بارے میں بہت سوچتا ہوں، لیکن میں وہاں جا کر فزیکل پریزنیس PHYSICAL PRESENCE کی صورت کری ایٹ CREATE نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہاں میں موجود نہیں ہوں۔ میں اس اسٹرگل STRUGLE کی ریلیٹی REALTY کو ریلیٹ RELATE نہیں کر سکتا۔

ندیم: میرا خیال ہے یہ بات اس لیے بھی ہے کہ اپنے وجود کے خاتمے کا ہمیں احساس نہیں تھا۔

انور: جی نہیں میں اس کے ایکسپیرینس EXPERIENCE کی بات کر رہا ہوں۔ میں یہاں بیٹھ کے ویت نامیوں کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔ شمالی ویت نام کے ساتھ بیٹھ کے میں ایکسپیرینس EXPERIENCE کر سکتا ہوں۔ اس قسم کی اسٹرگل STRUGLE میں، لیکن اس طرح فزیکل پریزنس PHYSICAL PRESENCE والا ایکسپیرینس EXPERIENCE نہیں ہوتا۔ میں جذباتی طور پر تو اس جنگ میں شریک ہوں، لیکن اگر جذباتی احساس کے ساتھ ساتھ میری موجودگی بھی وہاں ہوتی، میں اس کے پریکٹیکل ایکسپیرینس PRACTICAL EXPERIENCE میں اس طور پر انوالو INVOLVE ہوتا جس طرح کہ ایک فوجی ہوا یا جس طرح کہ وہ آدمی ہوئے جو کہ جہاد میں سے گزرے اگر ایسا ہوتا تو میرا خیال ہے کہ میرے لیے سچوایشن SITUATION اور زیادہ ٹینس TENSE ہوتی۔

طفیل: یہ ضروری نہیں کہ پہلے افسانہ نگار ان حالات میں سے گزرے اور پھر افسانہ لکھے۔

خدیجہ: اگر آپ جذباتی طور پر بھی ان حالات کے ساتھ ہیں تو آپ لکھ سکتے ہیں۔

دلشاد: کیا آپ کے خیال میں جتنے افسانہ نگاروں یا ناول نگاروں نے کسی خاص واقعاتی صورت حال کیفیت یا کیفیتوں کے ایک سلسلے کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا ہے وہ سب عملی طور پر اس صورتِ حال یا کیفیت میں سے ہو کر گزرے ہیں؟ کیا ادبی تجربہ اور حقیقی علمی یا واقعاتی تجربہ آپ کے خیال میں ایک ہی چیز کا نام ہے۔؟

انور : بڑی کہانی تو لکھی جا سکتی ہے۔ اس طرح، لیکن فزیکل پریزنس PHYSICAL PRESENCE میں جو سچوایشن SITUATION ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس میں آپ فزیکل ڈیٹیل PHYSICAL DETAIL نہیں دے سکتے۔ مثلاً انتظار حسین جس وقت عرب اسرائیل جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں پاکستان میں بیٹھ کر تو ان کی جو کیفیت ہے انہوں نے یہاں کے حوالے سے لکھی ہے کیا اس وقت سچوایشن SITUATION مختلف نہ ہوتی۔ اگر یہ عربوں کے دوش بدوش لڑ رہے ہوتے اور اس سچوایشن کا ایکسپیرینس EXPERIENCE کرتے۔ میں اس سے ایک اور نکتہ ڈرائیو DRIVE کر رہا ہوں۔ میں اس سے ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جذباتی واردات کو ایسی می لیٹ ASSIMILATE کرنے میں آدمی وقت لیتا ہے، اس کے بعد انالسس ANALYSIS میں پڑ جاتا، جسٹی فی کیشن JUSTIFICATION میں پڑ جاتا ہے اور اس کے فائنل پوائنٹس FINAL POINTS میں گھس جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان فزیکلی PHYSICALLY وہاں پر انوالو INVOLVE ہو تو وہ میرا خیال ہے زیادہ جلدی اس

ایکسپیرینس EXPERIENCE کو واضح کرسکتا ہے۔

وقار: اس طرح لکھی ہوئی چیز میرے خیال میں رپورتاژ سے زیادہ قریب ہوگی۔

انور: اچھا، رپورتاژ بھی افسانہ ہی ہے۔

میمونہ: بعض لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے ۱۹۴۷ء کے واقعات کی کہانیاں بڑی دیر سے لکھیں۔

انور: دوسری جنگِ عظیم کے بارے میں تو کہانیاں اب بھی لکھی جا رہی ہیں اور بہت اچھی لکھی جا رہی ہیں۔ میں تو صرف ایمرجنسی کی بات کر رہا تھا۔ وہ ایمرجنسی سچوایشن EMERGENCY SITUATION کہانی کے لیے نہیں تھا۔

طفیل: آپ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ ہنگامی صورتِ حال تھی۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ تو شروع سے معلوم تھا کہ ہندوستان جنگ کرے گا آئندہ کے بارے میں بھی لوگ کہہ رہے ہیں کہ جنگ ہوگی۔ آدمی ذہنی طور پر تو سوچتا رہتا ہے۔ واقعات یوں ہیں کہ پٹیل نے کہا کہ دو مہینوں کے لیے پاکستان کو مان لو۔ آچاریہ کرپلانی نے حیدر آباد سندھ میں کھڑے ہو کر یہ کہا کہ دو مہینوں کے لیے تم ہندوستان چلے جاؤ پھر واپس آ جانا۔ یعنی اس معاملے میں کہ کیا ہونے والا ہے، اس کے متعلق ہندوستان کی سوچیں اور ہماری سوچیں بالکل مختلف تھیں۔ اس کا اثر ہمارے ادب پر پڑا۔

انور: طفیل صاحب، اب ہم ذہنی طور پر زیادہ تیار ہیں، لیکن ممکن ہے میرا اتنا زیادہ براڈ ویژن BROAD VISION نہ ہو، لیکن میں یہ کبھی ایکسپیٹ ACCEPT نہیں کرتا تھا کہ ہندوستان اس طرح ہماری سرحدوں پر حملہ آور ہوگا۔ کم از کم میں تو یہ ایکسپیٹ ACCEPT نہیں کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا پولیٹیکل وژن POLITICAL VISION اتنا نہ ہو کہ میں اس سچوایشن SITUATION کو ایکسپریس EXPRESS کر سکتا ہوں۔

وقار: اس معاملے میں مختلف لوگوں کا اندازِ فکر مختلف تھا۔ سیاسی صورتِ حال سب کی نظر میں ایک سی نہیں تھی۔

انور: جی ہاں! مثلاً میں اموشنلی EMATIONALLY اس سچوایشن کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن اب میں اموشنلی تیار ہوں، کیونکہ میں نے تجربہ کر لیا ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اب میں اس بات کا آسانی سے تصور اور یقین رکھتا ہوں۔

وقار: یہی بات اکثر لوگوں کے ساتھ تھی، جو کچھ پیش آیا کوئی ذہن اس کے لیے تیار نہیں تھا حتیٰ کہ خود قائداعظم نے بھی واقعات کی اس بھیانک صورت کا تصور نہیں کیا تھا، جو پیش آئی۔ اس لیے وہ تجربہ جو تھا اس نے ٹینشن زیادہ پیدا کی

طفیل: میرے خیال میں اس موضوع پر کافی باتیں ہو چکیں۔

وقار: اور ان باتوں سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ پچھلے پچاس برس میں زندگی میں سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے جو تغیرات ہوتے رہے۔ افسانہ انہیں موضوع بناتا رہا اور خارجی ماحول کے علاوہ داخلی ردِ عمل کی ترجمانی کرتا رہا۔

انور: ایگزیکٹلی EXACTLY میں یہی عرض کرنا چاہ رہا تھا جو ہر قسم کے پولیٹیکل پوائنٹس آف ویو POLITICAL POINTS OF VIEW کو ایکسپریس EXPRESS کرتا ہے۔

ندیم: اور میری ناچیز رائے یہ ہے کہ وہ واقعہ جو میرے ذہن میں ہے اسے جب تک ملکی بین الاقوامی حالات کے حوالے سے نہ لکھا

جائے، وہ زندہ نہیں رہے گا۔

طفیل : اس کا مطلب یہ ہے کہ پرانی شاعری سب ختم ہوگئی، اگر اس میں یہ شعور نہیں ہے تو۔

وقار : سیاسی کا لفظ اصل میں ہم بڑے وسیع مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں زندگی کا ہر رُخ اور ہر گوشہ شامل ہے۔

ندیم : اور اب جو چیز لکھی جائے گی وہ سیاسی حالات سے قطع نظر کر کے نہیں لکھی جائے گی۔

طفیل : اس کا مطلب یہ ہے کہ ظفر علی خان کی شاعری آفاقی ہوگئی، حالانکہ اب تو کوئی جانتا بھی نہیں انہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اپنے حالات میں رہ کر اور ان حالات کی رُو سے بڑی اچھی شاعری کی ہے۔ لیکن وہ سب کی سب وقتی تقاضوں کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ بحیثیت شاعر ان کا آئندہ مقام کیا ہوگا۔

ندیم : لیکن علامہ اقبال کی مثال بھی تو آپ کے سامنے ہے

طفیل : وہ تو ایک قومی نائب کے مصلح تھے۔ ان کا قوم کے لیے ایک پیغام ہے۔ وہ محض شاعر نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ ایک غیر مسلم کے لیے ان کی شاعری میں اتنی زیادہ کشش نہیں، جتنی کہ ایک مسلمان کے لیے ہے۔

وقار : میرے خیال میں اقبال کی اصلاح پسندی ایک وسیع انداز میں بین الاقوامی پس منظر میں، حالات اور ردِ عمل، ان کے عواقب اور عوامل کا جائزہ لے کر پوری انسانیت کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً فکری اور شعری سطح پر ایک طرزِ حیات معین کرنے کی کوشش کی ہے

انور : لیکن وہ بہت سیاسی ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔"

وقار : اس مثال سے تو میرے نقطۂ نظر کو اور ندیم صاحب کے نقطۂ نظر کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی وہ سیاسی اور معاشرتی، بلکہ سیاسی اور اخلاقی اور روحانی زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ وہ سیاسی طرزِ عمل کو اخلاقی اور روحانی اور اخلاقی قدروں کا تابع بنانے کے خواہش مند ہیں اس لیے کہ اس کے بغیر سیاست انسان کے لیے تخریب اور تباہی کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔

انور : اس حد تک تو ہم اور آپ متفق ہیں کہ ہر بار سچوایشن کو سیاسی حوالے سے جاننا اور پرکھنا ضروری ہے۔

ادیب : بشرطیکہ یہ بات صاف ہو جائے کہ سیاسی سے آپ کی کیا مُراد ہے۔

وقار : مرزا صاحب! جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ لفظ سیاسی، بڑے وسیع معانی اور مفہوم کا احاطہ کرتا ہے۔

انور : میرا مطلب یہ ہے کہ آپ چیزوں کو ایک خاص پوائنٹ آف ویو سے دیکھیں۔ چاہے سوشلسٹ پوائنٹ آف ویو سے چاہے مارکسی پوائنٹ آف ویو سے گویا سوچنے کے ان سب اسالیب کو آپ سیاست کہتے ہیں۔

ندیم : جی ہاں! یہ سب سیاسی ہیں بلکہ واقعات کا سگنی فکنس SIGNIFICANCE اس کا اس وقت رہے گا کہ ایک خاص قسم کا پولیٹیکل وژن POLITICAL VISION بھی اس کے پیچھے ہو۔

ادیب : اسی کا نام زندگی کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔

انور: بالکل۔ احساس کے بغیر ادیب یا افسانہ نگار حالات کو ایسی می لیٹ ASSIMILATE نہیں کر سکتا۔

وقار: اس اعتبار سے سیاسی کو ہم تہذیبی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تہذیب جس شکل میں ہم آج اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس پر ہماری تکمیل سیاسی زندگی کا اثر بھی نمایاں ہے۔ ہماری موجودہ تہذیبی زندگی سیاسی حالات موجودہ تہذیبی زندگی کی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے اس لیے جب ہم سیاست کا ذکر کرتے ہیں تو ان اثرات کا تصور بھی ہمارے ذہن میں آتا ہے جو ہمارے تہذیبی سانچے کی تشکیل کا باعث ہے۔

انور: اسی لیے تو میں وائڈر کنٹیکسٹ WIDER CONTEXT میں بات کر رہا تھا۔

وقار: سیاست سے صرف ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی ہی مراد نہیں ہے۔

طفیل: بلکہ حالات کی تبدیلی۔ اس اعتبار سے یہ بتلائیے کہ پھر ظفر علی خان کی شاعری کے متعلق ہم کیا کہیں گے؟

سلیم: ظفر علی خاں کے پاس وہ ساری بات تھی جسے اس وقت ہم زیر بحث لاتے ہیں لیکن ایک شخص ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت اگر کوئی چیز لکھتا ہے تو اس میں اتنا قیمت ہونی چاہیے کہ وہ ہر زمانے میں زندہ رہے۔ یہ چیز ظفر علی خاں کے یہاں نہیں ہے۔

طفیل: شاعری کی جملہ خصوصیات تو ان میں تھیں۔ بڑا مطالعہ تھا۔ بے حد قادر الکلام تھے۔ سیاسی اعتبار سے بھی بیدار تھے۔

سلیم: شعر و شاعری کی خصوصیات کے علاوہ ایک خاص ایٹی ٹیوڈ ATTITUDE بھی ضروری ہے۔ ورنہ کیا فرق ہے علامہ اقبال میں اور مولانا ظفر علی خاں میں۔

طفیل: قسمت کی بات ہوتی ہے۔ حالانکہ قومی درد اور سیاسی شعور اتنا کم نہ تھا، جتنا آج دونوں کے مرتبے میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔

وقار: ایک بات اور بھی ہے ندیم صاحب۔ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے بارے میں کہی جاتی ہے اور وہ یہ کہ شاعری ایک خاص صورت حال کے تحت لکھی گئی، اور اس صورت حال کا اظہار انہوں نے بڑے جوش سے کیا۔ بغیر علامتوں کے استعمال کے بالکل سیدھے سادے لفظوں میں بات کی۔ اس طرح کی صورت حال اگر پچاس برس بعد پیش آئے تو مولانا ظفر علی خاں کی شاعری وہاں کام نہیں دے گی۔ اس لیے کہ یہاں بات اتنی کھل کر کہی گئی ہے کہ اس کا پچاس سال بعد والی صورت حال پر نہیں ہو گا اور یہی بات ہے جس کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ عظیم ادب کے زمرے میں نہیں آتی۔

انور: پھر یا تو وہ سچوایشن ری کری ایٹ ہو۔۔۔

طفیل: میرے نزدیک سیاسی صورت حال پر کہنا زندہ رہنے کے لیے ضروری بھی نہیں ہے۔

وقار: جی ہاں اصل بات یہ ہے کہ سیاسی صورت حال پر ادیب کو ادیب کی طرح اظہار کرنا چاہیے اور ادب کے جملہ تقاضوں کی پابندی کر کے اپنی بات کہنی چاہیے۔

طفیل: اگر یہ کہا جائے کہ ظفر علی خاں ادب کے تقاضوں سے آشنا نہیں تھے تو یہ بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔ وہ تو ادیبوں کو ادب پڑھا سکتے تھے۔

وقار: وہ یقیناً آشنا تھے ادب کے تقاضوں سے۔

ندیم: میرا خیال ہے کہ وہ تقریر کرتے تھے اور اسی کو لکھ دیتے تھے۔

وقار: وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز کے متعلق جب تک اس تلخ اور تند لہجے میں بات نہیں کروں گا وہ مؤثر نہیں ہوگی۔

انتظار: ایک لکھنے والا سیاسی واقعے کو سیاسی واقعے کے طور پر قبول کرتا ہے۔ اسی طرح لکھ دیتا ہے۔ دوسرا لکھنے والا وہ اس سیاسی واقعے کے حوالے سے اس عہد کی سیاسی حقیقت کا یا پوری حقیقت کا ادراک کرتا ہے اور پھر لکھتا ہے۔ تو ان دونوں صورتوں میں فرق ہے اور نور سجاد صاحب کے کہنے کا شاید یہ مطلب ہے کہ اس عہد میں حقیقت کے ادراک کے جو حوالے ہیں وہ سیاسی اظہار کی صورت میں ہیں۔ یعنی غالب کے زمانے کے ساتھ شاید یہ مسئلہ نہ ہو۔ بلکہ وہاں بات دوسرے حوالوں سے کہی جاتی تھی۔ اب ہم اس منزل میں ہیں کہ ہمارے پورے عہد کا مزاج ہی سیاسی بن گیا ہے۔ ہم انسانی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں خواہ مخواہ سیاسی مضمرات آجاتے ہیں۔ پھر ہمارا آج کی حقیقت کے ادراک کا طریقہ بھی سیاسی بن گیا ہے۔ اسی لیے اب ہم جب کسی صورت حال پر غور کرتے ہیں تو سیاسی حوالے سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے اور اگر پیچھا چھڑائیں گے تو جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس کی قیمت کم ہو جائے گی۔

طفیل: ایک دور تھا کہ جب آپ ایسی ہی سوچوں کے خلاف جد و جہد کرتے تھے۔ یعنی ترقی پسندوں کے خلاف کہ وہ سیاست کو خواہ مخواہ ادب میں لاتے ہیں جس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب خود ہی آپ اس بات کی تائید کر رہے ہیں۔

انتظار: میں نے تو آپ سے شروع میں کہا ہے کہ سیاسی واقعے کو سیاسی واقعے کے طور پر قبول کرنا اور اس پر لکھنا، اس کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ادیب کا رویہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی کارکن یا مفکر کا رویہ ہو سکتا ہے۔ مولانا محمد علی بے شک اس رویے کے تحت لکھیں، مولانا ظفر علی خاں بھی بے شک لکھیں۔ لیکن جب احمد ندیم قاسمی لکھیں تو ان کا یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیے۔

طفیل: آپ لوگ تو کرشن چندر پر یہی اعتراض کرتے تھے۔ محض فیشن کے طور پر اپنی اہمیت جتانے کے پیش نظر۔ حقائق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ پھر یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ موقع محل کے اعتبار سے کبھی کچھ کہہ دیا کبھی کچھ:

انتظار: اعتراض اس لیے کرتے تھے کہ کرشن چندر کے جو سیاسی قسم کے افسانے ہیں ان پر بنیادی اعتراض یہ ہوتا ہے کہ کرشن چندر نے یہاں سیاسی واقعے کو محض سیاسی واقعہ سمجھا ہے اور اس پر ایک افسانہ لکھ دیا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ کوئی ادب نہیں ہے۔ میں ان افسانوں پر ادب کے نقطۂ نظر سے اعتراض کروں گا، لیکن میں یہ اعتراض نہیں کروں گا کہ یہ سیاست میں انوالومنٹ INVOLVEMENT کیوں ہے کرشن چندر کا۔

طفیل: بہرحال ان دنوں میں تو یہی ہوا۔ اب ترمیم کر لی ہے۔ آپ لوگوں نے اپنے خیالات میں۔ پھر آپ کا یہ کہنا کہ کرشن چندر سیاسی واقعہ کو محض سیاسی واقعہ کے طور پر لکھ دیتے تھے اور وہ سیاسی واقعے کے حوالے سے اس عہد کی سیاسی حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں رکھتے تھے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہے جو مناسب نہیں۔

وقار: ان دونوں زمانوں کی تخلیقات کا مقابلہ کر لیجیے۔ آپ کو ان میں بین فرق نظر آئے گا۔

انتظار: میں تو خود اس کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہوں، بلکہ صاف صاف یہ کہتا ہوں کہ میرے تو سیاسی انوالومنٹ INVOLVEMENT

ہیں اور میں ان کے تحت لکھتا ہوں۔

وقار: میرے نزدیک اس دور کے لکھنے والوں میں سے بعض کے متعلق تو یہ کہنا درست ہے کہ ان کی سیاسی وابستگی ہیں براہِ راست سیاست کا رنگ ہے اور بعض اس وابستگی کو گو براہِ راست انداز میں پیش نہیں کرتے، لیکن ان کا اسلوب ان کی ذہنی اور جذباتی وابستگی INVOLVEMENT کی غمازی کرتا ہے۔

خدیجہ: میرا خیال ہے کہ اس بات کا کئی دفعہ ذکر آیا ہے کہ لکھنے کا یہ انداز ان کا مخصوص انداز بن گیا ہے، اور اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ اس موضوع پر ایک دو دفعہ نہیں بلکہ بار بار لکھا گیا ہے اس پر ابھی دس بار اور بھی لکھا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ موضوع ابھی ہماری زندگیوں میں اب تک باقی ہے۔

وقار: بالکل بجا ہے۔ اس بات کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ تقسیم سے پہلے جو لکھنے والے افسانے لکھ رہے تھے اور انہوں نے اپنے لیے ایک مخصوص انداز اپنا لیا تھا۔ وہ تقسیم کے بعد بھی لکھتے رہے، لیکن انہوں نے تقسیم کے بعد دو طرح کے افسانے لکھے۔ مثال کے طور پر عصمت کو لے لیجئے۔ ان کا ایک افسانہ تو "چوتھی کا جوڑا" ہے جو ان کے مخصوص انداز کا تھا اور اسی تہذیبی معاشرے سے تعلق رکھتا تھا جو ان کے اکثر افسانوں کا پس منظر ہے اور دوسرا "دھانی بانکپن" ہیں، جو پوری طرح سیاسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور ایک خاص سیاسی نقطۂ نظر کا پراپیگنڈہ بن گیا ہے۔ اب دیکھئے کہ یہاں لکھنے والا تو ایک ہی ہے لیکن سوچنے کے انداز نے اس کی دو تحریروں کو بالکل مختلف بنا دیا ہے۔

انور: یہ تو موومنٹ MOVEMENT کا اثر ہوا نا جی! ایکٹو انوالومنٹ ان دی مومنٹ ACTIVE INVOLVEMENT IN THE MOVEMENT

وقار: ACTIVE INVOLVEMENT تو کوئی گناہ نہیں، لیکن فرق اور اس لیے شکایت یہ ہے کہ انہوں نے اس INVOLVEMENT کے تحت جو کچھ لکھا وہ ادیب کی طرح نہیں لکھا۔

انور: اس میں جذبہ زیادہ ہے اور سگنی فیکنس SIGNIFICANCE نہیں ہے۔ حالانکہ بات ساری سگنی فیکنس کی ہے

انتظار: یعنی اس زمانے کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ سب لکھنے والے جو تھے، ان سب کے سیاسی انوالومنٹ تھے۔ میرے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ افسانہ نگاروں میں ہم چند افسانہ نگاروں کو اس حیثیت سے جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس سیاست سے ملوث نہیں کیا۔ مثلاً عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری اور راجندر سنگھ بیدی کے بھی بہت سے افسانے اس انوالومنٹ کے تحت نہیں آتے۔ منٹو کے افسانوں کے متعلق بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں۔ یہی بات قاسمی صاحب کے افسانوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں، اور کرشن چندر کے متعلق کہہ سکتے ہیں، لیکن اور بھی بعض نمائندہ افسانہ نگار ہیں، جن کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

طفیل: مثلاً نیا قانون، ٹوبہ ٹیک سنگھ وغیرہ تو لکھے ہیں منٹو نے بھی۔

وقار: لیکن سب نے نہیں لکھے۔ اور جس افسانے کا حوالہ آپ نے دیا، یعنی "نیا قانون" اس کا سیاسی خیال افسانے کی فنی حدود کا پابند رہا ہے۔

انور : ان میں ایکسٹرا پولیٹیکل انوالومنٹ نہیں ہے ۔
وقار : لیکن اس کے باوجود آپ کو منٹو کے یہاں فکری اور جذباتی اعتبار سے سیاسی انوالومنٹ نظر آتا ہے ۔
انور : اور ایک ایسی چیوڈ ATTITUDE نظر آتا ہے ۔
انتظار : اصل بات اسی ATTITUDE یا رویے کی ہے، لیکن عصمت چغتائی کے متعلق ہم شاید یہ بات اتنی آسانی سے نہ کہہ سکیں، مثلاً اس زمانے کی عصمت چغتائی، جس نے چوٹیں اور کلیاں کے افسانے لکھے، اس میں آپ کو کہیں کوئی سیاسی انوالومنٹ نظر نہیں آئے گا ۔
انور : اس زمانے میں میرے خیال میں اس کی سگ نی فیکیشن SIGNIFICANCE اتنی آئسولیٹڈ ISOLATED نہیں تھی ۔
وقار : عصمت کے خیال اور رویے میں یہ تبدیلی بمبئی جانے کے بعد اور ترقی پسند تحریک سے قریبی وابستگی کے بعد پیدا ہوئی ۔
انور : عصمت اپنی بات بڑی بیباکی کے ساتھ کرتی ہیں ۔ انداز بھی خوبصورت ہے ۔
انتظار : اس کی طرز یا بیباک طرز ایک خاص طرح کے معاشرے پر ہے ۔
طفیل : ایک خاص طرح کے معاشرے پر ہے یا فلاں چیز کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنا ہوگا ۔ یہ باتیں بڑی کھیلے کی ہیں ۔ ادب کا مسئلہ تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ ادب ہو ۔ خواہ وہ کسی شعوری رَو کے تحت لکھا گیا ہو ۔
وقار : بالکل ٹھیک ہے ۔ ادبی قدریں بنیادی چیز ہیں ۔ بات عصمت کی ہو رہی تھی ۔ میرا خیال ہے کہ جس جرأت کے ساتھ باتیں انہوں نے کہی ہیں، وہ کسی اور نے نہیں کہیں ۔
انور : "کسی اور نے" کے بجائے شاید کسی اور خاتون نے نہیں کہیں زیادہ مناسب ہوگا ۔
وقار : بالکل درست فرمایا آپ نے، اس لیے کہ اس طرح ہم منٹو کے لیے الگ ایک مقام بنا لیتے ہیں ۔ لیکن جناب میرے خیال میں اب کافی باتیں ہو چکیں ۔ مقرر کیے ہوئے موضوعات یا مسائل پر اور جہاں تک میرا احساس ہے گفتگو بڑی حد تک مفید اور نتیجہ خیز رہی ۔ اس لیے کہ طفیل صاحب کے سوالات پر ہر پہلو سے باتیں ہوئیں ۔
ندیم : میرے خیال میں طفیل صاحب کی تسلی بھی ہو گئی ہوگی (قہقہہ)
طفیل : بڑی حد تک مگر ہمارا یہ انداز : میں یوں سوچتا ہوں ۔ میں یہ کہتا ہوں ۔ اس لیے دوسروں کو بھی یوں سوچنا چاہیے ۔ یوں لکھنا چاہیے ۔ یہ بات ذرا ـــــ
انور : آخر میں مَیں طفیل صاحب سے یہ عرض کروں گا کہ یہ ہم عصر افسانہ نگاروں کا بھی ایک نمبر نکالیں تاکہ زیادہ صحیح طریقے سے ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے ۔
خدیجہ : تاکہ پرانے لکھنے والوں کا حق مار سکیں ۔ (قہقہہ)
وقار : خواتین و حضرات ۔ باتیں بہت ہوئیں ۔ بڑی دلچسپ ہوئیں ۔ بڑی نتیجہ خیز ہوئیں ۔ آج کے مذاکرے میں ہم نے جن تین سوالوں

کو اپنی گفتگو کا مرکز و محور بنایا ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) کیا قیامِ پاکستان کے بعد اُردو افسانے نے ترقی کی ہے ؟

(۲) علامتی افسانہ نگاری مفید ہے یا غیر مفید ؟

(۳) کیا کچھ نئے افسانہ نگار ایسے بھی اُبھرے ، جنہیں مستقبل کا افسانہ نگار کہا جا سکے ؟

پہلے سوال پر گفتگو شروع کرتے ہی ہمیں اس دقت کا سامنا کرنا پڑا کہ اس سوال میں ترقی کے لفظ کا کیا مفہوم لیا جائے ترقی ایسا لفظ ہے ، مفہوم کے اعتبار سے اس کی حیثیت اضافی ہے اور ہم میں سے ہر ایک اس لفظ کو سن کر افسانے کے متعلق ذہن میں جو تصور قائم کرتا ہے وہ اس مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا جو کسی دوسرے کے ذہن میں ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی نہ کوئی ایسا معیار قائم کرنا چاہیے جس کی بنا پر ہم ترقی یا تنزل کا فیصلہ کر سکیں۔ خاصی رد و قدح کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ترقی یا تنزل کے الفاظ کو کسوٹی بنانے کے بجائے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں ، ہمارے موجودہ افسانہ نگار جن سے ہماری مراد قیام پاکستان کے بعد اُبھرنے اور نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں سے ہے۔ اپنے افسانے کس اساس پر لکھ رہے ہیں ؟ کیا انہوں نے نئے دور میں پیدا ہونے والی زندگی اور اس کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور کیا انھوں نے اس زندگی سے براہِ راست اپنا وہ تعلق قائم رکھا ہے جسے ہم بحث کے دوران میں برابر INVOLVEMENT کہتے رہے۔

اس موضوع پر جو رائیں ظاہر کی گئیں وہ باہم ایک دوسرے کی ضد تھیں لیکن جوں جوں گفتگو آگے بڑھی رائے کے اس اختلاف کا دائرہ گھٹتا گیا ، یہاں تک کہ بحث کے آخر میں یہ بات سامنے آئی کہ ہمارے افسانہ نگار نے برابر نئی زندگی اور اس کے مسائل کی طرف نظر رکھی ہے اور جوں جوں حالات بدلتے رہے ہیں وہ ان کا مشاہدہ بھی کرتا رہا ہے اور ان سے فکری اور جذباتی مطابقت ، ہم آہنگی اور وابستگی بھی پیدا کی ہے اور یوں زندگی کے ساتھ اس کا INVOLVEMENT گو صحیح معنوں میں براہِ راست نہ سہی لیکن بالواسطہ ضرور قائم رہا ہے ، یہاں تک ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متاثر ہو کر لکھے جانے والے افسانوں میں INVOLVEMENT شدید بھی ہے اور مخلصانہ بھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس INVOLVEMENT نے ایک اجتماعی صورت اختیار کر لی ہے اور اس بات کو افسانے کے آگے بڑھنے کی علامت سمجھنا چاہیے۔ اس نے بحیثیت مجموعی قومی تفکر ، قومی طرزِ احساس اور قومی آرزوؤں کی جو ترجمانی کی ہے وہ اس کی زندگی اور زندہ رہنے کی علامت ہے۔

دوسرے سوال پر جو بحث ہوئی وہ بہت زیادہ طویل بھی تھی اور پیچ در پیچ بھی۔ ادب میں علامتوں کا استعمال کوئی نئی چیز نہیں ، لیکن آج کی بحث میں حصہ لینے والوں میں سے بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہمارے افسانہ نگار علامتوں سے جس طرح کام لے رہے ہیں ، اس سے ہمارے دور کے افسانوی ادب میں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی ہے ، علامتیں ذاتی بن کے رہ گئی ہیں اور ان کے ساتھ کوئی ایسا تصور وابستہ نہیں جو لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان اشتراک کا رشتہ قائم کر سکے۔ علامت آجکل ابلاغ کا ذریعہ بننے کے بجائے معنی میں اُلجھن اور پیچیدگی پیدا کرنے کا سبب بن گئی ہے۔ افسانہ نگار علامتوں سے ان موقعوں

پر بھی کام لے رہے ہیں جہاں ان کے استعمال کے بغیر معنی زیادہ وضاحت اور صراحت سے پڑھنے والے کے سامنے آ سکتے تھے۔ افسانے میں علامت پسندی کا موجودہ رجحان بغیر سوچے سمجھے تقلید یا ادبی رواج کی اندھا دھند پابندی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے خلاف بعض شرکائے مجلس کی رائے یہ تھی کہ افسانوں میں علامتیں سوچ سمجھ کر استعمال کی جا رہی ہیں اور ان کے استعمال سے بیان کے اسالیب میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک صاحب نے یہ بھی کہا کہ بعض اوقات ایک مخصوص افسانوی صورت حال SITUATION علامت اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور اس صورت میں اس مخصوص صورتِ حال کے اظہار اور ابلاغ کا بہترین وسیلہ وہی علامت ہے۔

گفتگو میں علامت کی اہمیت، اس کی معنویت اور اس کے طریقِ استعمال کے متعلق جو دو مختلف بلکہ متضاد پہلو سامنے آئے ان پر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اعتراض کرنے والوں کی رائے اس حد تک تو درست ہے کہ بعض افسانہ نگاروں نے نئی علامتوں کو محض ادبی رسم کی پابندی اور مغرب کی تقلید کے شوق کے طور پر استعمال کیا ہے اور یہ رجحان بلاشبہ افسانوں کے لیے مُضر ہے۔ لیکن ہمارے بعض افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جن کی استعمال کی ہوئی علامتوں میں گہری معنویت ہے اور اس طرح گویا جائے افسانے میں اظہار کے اسلوب کے نقطۂ نظر ان علامتوں کا استعمال ایک خوشگوار رجحان ہے۔ اس سے فکر کی نئی راہیں بھی کھلتی ہیں اور اس فکر کے ابلاغ کے موثر وسیلے بھی میسر آتے ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نئی علامت بجائے خود کوئی بُری چیز نہیں، بلکہ خوش سلیقگی کے ساتھ اس کا استعمال افسانوں کی فنی ترقی میں ممد ہوگا۔ البتہ ہمیں چاہیے کہ اسے ایسا رجحان نہ بننے دیں جس کے پیچھے کسی طرح کی منطق موجود نہ ہو۔ ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے علامت کے استعمال کو اس منطق کا پابند بنایا ہے اور اس لیے بلا تامل یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے کو فنی اعتبار سے اپنے پیشروؤں کے افسانوں سے آگے بڑھایا ہے۔ اب رہا تیسرا سوال کہ جس دَور کے افسانوں کا ہم جائزہ لے رہے ہیں کیا اس میں کچھ ایسے افسانہ نگار ابھرے جنہیں ہم مستقبل کا افسانہ نگار کہہ سکیں۔ اس سوال کے جواب میں بہت سے نئے افسانہ نگاروں کے نام لیے گئے۔ جن کی فنی کارکردگی کو سب اہلِ مجلس نے قابلِ تحسین سمجھا وہ ابھی عرض کرتا ہوں۔

پچھلے بیس برس میں افسانے کی صنف نے اپنے لیے جو نئے نئے راستے بنائے ان پر شمعیں روشن کرنے کا کام، ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت انجام دیا۔ اور اس اعتبار سے ہم اس دور کے افسانہ نگاروں کو تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا گروہ ان لکھنے والوں کا ہے جو تقسیم کے فوراً بعد کے چند برسوں میں افسانے لکھتے رہے، فسادات کے خارجی پہلوؤں کو اور ان کے ذہنی ردِ عمل کو ان افسانوں کا موضوع بنایا۔ ایسا کرتے وقت انہوں نے فن کے ان اسالیب سے بھی کام لیا جو تقسیم سے فوراً پہلے کے افسانوں کے ذریعے ایک فنی روایت کے طور پر ہم تک پہنچا تھا اور ان نئے اسالیب سے بھی جنہیں ہم مغربی افسانوں کا براہِ راست یا بالواسطہ اثر کہہ سکتے ہیں۔ ان نئے اسالیب پر جدید نفسیاتی تحریکوں کے علاوہ علامت پسندی کی تحریک کا گہرا

اثر ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں احمد علی، عزیز احمد، حسن عسکری، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، اے حمید، ابن الحسن، غلام علی چودھری، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی کے نام نمایاں ہیں۔ ان لکھنے والوں نے جتنے افسانے لکھے ان کی خاصی تعداد ایسی ہے، جسے منتخب افسانوں کے ذخیرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جن افسانہ نگاروں کے نام ابھی لیے گئے ان میں سے بہت سوں نے مختلف اسباب کی بنا پر لکھنا کم کر دیا اور آہستہ آہستہ ان کا شمار نہ لکھنے والوں میں ہونے لگا۔ جن لوگوں نے لکھنا جاری رکھا اور ان میں جو نئے لکھنے والے آ کر شامل ہو گئے۔ ان کے اجتماع سے افسانہ نگاروں کے ایک گروہ کی تشکیل ہوئی۔ اس گروہ میں قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ابوالفضل صدیقی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور وغیرہ کے علاوہ جیلانی بانو، صادق حسین، جوگندر پال، باقر علیم، رام لعل، احمد شریف، اختر جمال، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ اور قاضی عبدالستار، واجدہ تبسم، غیاث احمد گدی —— جیسے لوگ شامل ہیں، جنہوں نے زندگی کو زیادہ قریب جا کر دیکھا اور انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کے بعض نمایاں اور واضح پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

سال بہ سال، آہستہ آہستہ، دھیمے لیکن جچے تلے قدموں سے چلتے ہوئے کچھ اور افسانہ نگار اپنے پیشروؤں کی صف میں شامل ہوتے اور پڑھنے والوں کے دل میں اپنی جگہ بناتے رہے۔ ان ناموں میں غلام الثقلین نقوی، سلمیٰ حسن، انور سجاد، خالدہ اصغر (اب خالدہ شفیع)، رضیہ فصیح احمد اور مسعود مفتی جیسے لکھنے والے شامل ہیں۔ معاشرتی ماحول کا مخلصانہ اور دیانت دارانہ مشاہدہ، فرد اور جماعت کے باہمی رشتے کا احساس، فرد کے مسائل اور اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا تجزیہ ان لکھنے والوں کے انداز کی مشترک خصوصیتیں ہیں۔ لکھنے میں البتہ ہر ایک نے غور و فکر کے بعد اپنے لیے اظہار کا ایک انداز مخصوص کر لیا ہے اور یوں لکھنے والوں کی اس پود کے افسانے اجتماعی طرزِ احساس اور انفرادی اسلوبِ اظہار، ابلاغ کا امتزاج بن گئے۔

ان لکھنے والوں کے افسانے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی محبت اور فن کی لگن ان سے جو کچھ لکھوا رہی ہے اسے اگر ہم اپنی پرانی کسوٹیوں پر کسیں یا ان کی فنی حیثیت کے تعین کے لیے فن کے وہی روایتی پیمانے استعمال کریں جو اب تک کرتے رہے ہیں تو ان میں سے بہت سوں کی سطح بہت اونچی نہیں ہو گی۔ لیکن اگر ان کا جائزہ اس اعتبار سے لیا جائے کہ ان میں زندگی کا تازہ خون ہے یا نہیں، اور ان میں بات کو کسی نئے انداز سے کہنے کی خواہش کا سراغ ملتا ہے یا نہیں تو ہمارا تاثر یہی ہو گا کہ ان نئے لکھنے والوں میں بہت ایسے ہیں جنہیں مستقبل کے معمار کہنا درست ہو گا۔ ان کی کارکردگی ابھی سے ہمیں اُمید دلا رہی ہے کہ ہمارے افسانے کو آئندہ بھی زندگی کی ترجمانی اور فن کی خدمت کا وہی فریضہ انجام دینا ہے جو وہ اب تک کبھی بڑے ٹھہرے ہوئے پُر یقین انداز میں اور کبھی حالات کی ناسازگاری کی بنا پر نا دیدہ غیر یقینی اور تذبذب کے طریقے پر انجام دیتا رہا ہے۔

نئی کتابیں

پسِ پردہ

تصنیف: میرزا ادیب۔ صفحات: ۲۵۵۔ عمدہ ٹائپ۔ قیمت: ۹ روپے۔ مکتبہ ادب جدید، ۵ اپٹیالہ گراؤنڈ، نسبت روڈ۔ لاہور

تقریباً تیس سال کے اردو ڈراموں پر نگاہ رکھ کر بے تکلف اور بے خوفِ تردید کہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس وقت کوئی بھی میرزا ادیب سے بہتر یک بابی ڈرامے لکھنے والا اردو میں نہیں ہے۔ غالب کا جو شعر ان کی نئی کتاب 'پسِ پردہ' کا زینتِ عنوان ہے 'وہ محض خانہ پری کے لیے نہیں'، واقعی انہوں نے قلم کی نوک 'دل کے خون' میں ڈبو کر زندگی کے نقش بنائے ہیں اور اپنے فن میں رنگ بھرا ہے۔ میرزا ادیب کو دونوں سے عشق ہے، زندگی سے بھی اور اپنے فن سے بھی — فن کار کی سب سے بڑی قوت زندگی سے اس کا لگاؤ اور اس کی فنی اظہار کی لگن ہے۔ ان کا عشق محض عشق کے لیے نہیں، دونوں کا حق ادا کرنے کے لیے، دونوں کے ذریعے زندگی کی سوجھ بوجھ میں اضافہ کرنے کے لیے، دونوں سے اپنے تخلیقی عمل کا رشتہ قائم کرنے کے لیے۔ میں اس کو سچی فنکاری سمجھتا ہوں۔ جہاں لکھنے والا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ محض اپنے دل کی واردات بیان کر رہا ہے، وہاں یہ شک ہوتا ہے کہ وہ فنکاری کی توہین کر رہا ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اچھا ڈرامانگار زندگی کے مسائل کو سمجھے بغیر محض اپنے تجربات کی ترجمانی کرے، کیوں کہ وہاں اپنے تجربات سے ماورا زندگی کی دنیا میں بھی داخل ہونا پڑتا ہے۔ اسے اس شیشے کی طرح ہونا چاہیے جس کے اندر سے روشنیاں اور ان کے اندر چھپے ہوئے رنگ گزر کر حسین اور جاذبِ توجہ منظر پیش کرتے ہیں۔ مجھے یہ کیفیت میرزا ادیب کے ڈراموں میں ملتی ہے۔

ڈرامے کا دائرہ عمل آہنی فنی پابندیوں کی وجہ سے محدود ہونے کے باوجود وسیع ہے۔ یہ فن کار کے شعور پر مبنی ہے کہ وہ کن باتوں کو پیش کرنے کے قابل سمجھتا ہے۔ یہ انتخاب صرف اس کی آزادی اور انفرادیت کا مظہر نہیں، اس کے شعورِ فن کا بھی آئینہ بن جاتا ہے۔ میرزا ادیب نے زندگی کے آئینہ خانہ سے عجیب و غریب مناظر، انوکھے اور نادر الوقوع واقعات، لاشعوری انفرادی کیفیات کا انتخاب کرنے کی بجائے اہم نفسیاتی گتھیوں، ذہنی کیفیتوں اور سماجی الجھنوں کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے کبھی اس مریض ڈاکٹر کو اپنا موضوع بنایا ہے جس کے ضمیر میں ایک دستک کانٹا بن کر کھٹک رہی ہے، اس خدمت گار نرس کو پیش کیا ہے جو محبت سے سرشار اور نرم دل ہو کر محبت ہی کے انتظار میں وقت کاٹ رہی ہے۔ لیکن اپنے دل کی دھڑکن پر قابو رکھتی ہے، اس درخت کو علامت بنا کر سامنے لا کھڑا کیا ہے، جو ماں بیٹی کی محبت اور جدائی کا گواہ ہے۔ علم اور جہل، روشنی اور اندھیرے کی اس کش مکش کو زندہ کیا ہے جو مورخ کی نگاہ میں ابدی ہے۔ ان ڈراموں کے چھوٹے چھوٹے سانچوں میں زندگی کے نقش اس طرح نمایاں ہو کر ابھرے ہیں کہ ڈرامائی مواقع پوری شدت سے وجود میں آگئے ہیں۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے، جب ڈرامانگار کو صرف زندگی سے واقفیت نہ ہو، اس سے محبت بھی ہو۔ اس کی نگاہ میں انسان صرف مشین نہ ہو زندہ سماج کا ایک حصہ ہو، اسے صرف اصولِ فن سے آگاہی نہ ہو تخلیقی قوت بھی رکھتا ہو۔ میرزا ادیب کے ڈرامے پڑھ کر فن کاری کے ان تمام پہلوؤں پر نگاہ جاتی ہے۔ 'پسِ پردہ' اردو کے ڈرامائی ادب میں یقیناً ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین

پھول اور بارود

اردو کی معروف افسانہ نگار اختر جمال کی تخلیق ہے۔ ۲۲۵ صفحات پر مشتمل اس ناول میں کیپٹن ملاحت کی ۱۹۴۲ سے ۱۹۴۵ تک کی رُومانی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ آپ بیتی کے انداز میں پیش کی گئی اس کہانی کا پس منظر مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کا وہ علاقہ ہے جو ان تین سالوں کے دَوران دوسری جنگِ عظیم کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔

کہانی کا مرکزی کردار کیپٹن ملاحت کرائے کے سپاہی کی حیثیت میں اتحادی فوجوں کے ہمراہ دادِ عیش دے رہا ہے۔ ان تین سالوں میں وہ چھ مختلف النسل حسیناؤں سے باری باری عشق کرتا ہے۔ کہانی کا بیشتر حصہ اسی جذباتی واردات کا عکاس ہے۔ اس ناول میں بوئے گل اور آتشِ گل کا تذکرہ زیادہ ہے اور بارود کی بدبو اور شعلوں کی لپک نسبتاً بہت کم ہے۔ اسی وجہ سے ہیرو کی تہذیب و تربیتِ نفس کے لیے بیشتر عشق ہی کا سہارا لیا گیا ہے۔ کیپٹن ملاحت کی سرشت میں خود فریبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس لیے وہ اپنی بے مقصد غلامانہ زندگی کی ذلت کو باوقار نام دے کر خود فریبی اور دنیا فریبی میں مبتلا ہے۔

فوجی زندگی کی مجبوریوں کے پیشِ نظر جب بھی کسی مقام کو چھوڑنے کا مرحلہ آتا ہے تو ہیرو جذباتی اور انسانی رشتوں سے یہ سوچ کر قطع نظر کرتا ہے! "میں ایک بڑی جنگ میں شریک ہونے گھر سے نکلا تھا نہ کہ عشق بازی کرنے!"

ہیرو کے نزدیک اس جنگ میں شرکت بندگی بیچارگی نہیں بلکہ ایک مقدس مشن ہے!

"ہم کس مقصد کے سہارے جی رہے ہیں؟ جرمنوں پر فتح پانا ہمارا مقصد ہے پھر اس سے بڑا مقصد ہے۔ فتح کے بعد آزادیٔ وطن کا پیغام لے کر گھر لوٹنا۔"

ہیرو کی سب سے بڑی خود فریبی یہی ہے کہ وہ اس جنگ میں شرکت کو آزادیٔ وطن کی جد و جہد قرار دیتا ہے۔ استدلال یہ ہے کہ برطانیہ نے اس جنگ میں کامیابی کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دینے کا وعدہ کیا ہے اس لیے برطانیہ کو یہ جنگ جیت کر دینا گویا ہندوستان کو آزادی لے دینے کے مترادف ہے۔ اس استدلال کی روشنی میں تو ہٹلر اور مسولینی بھی ہماری آزادی کے ہیرو ٹھہریں گے کیونکہ اگر وہ مغربی استعمار کو نہ للکارتے اور دو عالمی جنگیں نہ ہوتیں تو برطانیہ اتنا کمزور نہ ہوتا کہ اسے ہندوستان آزاد کرنا پڑتا۔ اسی طرح ایک اور خود فریبی یہ ہے کہ فوج میں محض خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے بھرتی ہوا تھا۔ ذہنی فریب کا یہ طلسم پے در پے جذباتی صدموں سے دوچار ہونے پر ٹوٹتا ہے اور بالآخر پاروؔ کی محبت میں مبتلا ہو کر جدائی کے غم کے زیرِ اثر وہ کہہ اٹھتا ہے۔

"سب جھوٹ اور دھوکا ہے۔ نہ محبت کوئی چیز ہے نہ ایمانداری نہ فرض۔ سب چیزیں بیکار ہیں۔ مجھے پیسے ملتے ہیں اس لیے میں فرض ادا کرتا ہوں۔ میں بہادری کی وجہ سے نہیں لڑ رہا اور نہ ہی اپنے وطن کی محبت کے جذبے سے یہاں آیا ہوں۔ میں نے صرف اس لیے ہتھیار اٹھائے

ہیں کہ مجھے اس کے پیسے ملتے ہیں "

اس کردار کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ یہ محض پیسے کی خاطر ایک ایسی جنگ لڑنے پر مجبور ہے، جو اس کے وطن سے دور، اجنبی مفادات کے تحفظ کی خاطر لڑی جارہی ہے۔ مصنف نے اس کردار کی نشوونما اور اس کے علاوہ ذیلی اور ضمنی کرداروں کی تعمیر اور پیش کش میں فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے خاص طور پر مفتوحہ اور مقبوضہ شہروں کی ان بدقسمت بیٹیوں کی کردار نگاری قابل تحسین ہے، جنہیں مختلف مادی اور جذباتی مصائب ہیرو کے قریب لاتے ہیں اور پھر ہیرو کو ان سے دور لے جاتے ہیں۔ ان کے مسائل و مشکلات میں کافی یکسانیت موجود ہے۔

یہ سب فکرِ معاش، بھائیوں سے جدائی اور جذباتی شکست خوردگی کی شکار ہیں، یادِ ماضی سے غمگین، دہشت زدہ سے نڈھال بے چین ردعمیں چھوٹی چھوٹی عارضی خوشیوں کی تلاش میں۔ طوفان میں گھری ناؤ کی طرح ڈول رہی ہیں۔ دلوں کے علاوہ شہروں کے اجڑنے کے نقشے بھی جاذب توجہ ہیں۔

کردار نگاری اور منظر نگاری و زندگی سے متعلق مصنف کے جس اندازِ نظر کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ گہری انسانی دوستی کا ہے۔ اختر جمال انسانوں کی ایک عالمی برادری کا خواب دیکھتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ :۔

" کاش ایسی تہذیب ایسا تمدن اور ایسا ادب پیدا ہو جس میں نئی لوریاں تخلیق کی جائیں۔ انسانی مساوات اور اخوت کے گیت بچے کو پنگھوڑے میں ہی سکھائے جائیں "

مجموعی اعتبار سے 'پھول اور بارود' امن پسندی کے جذبے کو خوبصورتی اور تاثیر سے پیش کرتا ہے۔ مصنف کو زبان و بیان پر کامل عبور ہے اور وہ ناول نگاری کے فنی اسرار و رموز سے بھی واقف ہیں۔ کتاب ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے سلیقے سے چھاپی ہے، اور اس کی قیمت چار روپے پچاس پیسے ہے۔

(فتح محمد ملک)

بلوچی نامہ

از عطا محمد شاد۔ شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ لاہور

اردو اور علاقائی زبانوں کو قریب تر لانے کے لیے مرکزی اردو بورڈ نے ایک منصوبہ بنایا جس کے تحت علاقائی زبانوں کے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جارہا ہے جو اپنے مطالب اور معانی کے اعتبار سے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کی توجہ کا مرکز بن سکتے ہیں۔ بلوچی نامہ اسی منصوبے کی پہلی کڑی ہے، جس میں عطا شاد بلوچ نے بلوچی زبان کے کچھ الفاظ جمع کرکے اردو زبان میں ان کی تشریح کردی ہے۔ کتاب کی چند خصوصیات یہ ہیں :۔

(۱) مؤلف نے بلوچی زندگی کے ان گوشوں سے الفاظ حاصل کیے ہیں جو جغرافیائی اور تاریخی حدبندیوں کی وجہ سے انفرادیت کے حامل ہیں،

اور انہیں سماجیات ۔ خانگی زندگی ۔ اشیائے ساختگی ۔ زمینداری سے متعلقات ۔ گلہ بانی ۔ قدرتیات ۔ تفریحات اور متفرقات کے عنوانوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔

(۲) فرہنگ نویسی میں مؤلف نے بلوچی الفاظ کے مترادفات دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ زیادہ سے زیادہ الفاظ کی مفصل تشریح پیش کرنے کی کوشش کی ہے

(۳) جگہ جگہ بلوچی الفاظ سے اردو مصادر بنا کر بھی نمونے کے طور پر لکھ دیئے ہیں تاکہ انہیں اردو میں اپناتے وقت کوئی دقت نہ ہو ۔

(۴) الفاظ کا صحیح تلفظ ظاہر کرنے کے لیے کچھ اعراب بھی وضع کر کے جگہ جگہ لگا دیئے ہیں ۔

مؤلف کا یہ کام اس لیے بھی سراہنے کے لائق ہے کہ بلوچی زبان میں کوئی قابل قدر تحریری سرمایہ نہیں ہے، جس کی وجہ سے انہیں بلوچی الفاظ کی تلاش و تحقیق اور تصدیق و انتخاب میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ اس کتاب کی تالیف پر مرکزی اردو بورڈ بھی مبارکباد کے لائق ہے ۔ اُمید ہے کہ بورڈ اپنے منصوبوں کو جن کا ہلکا سا خاکہ کتاب کے گرد پوش پر دیا گیا ہے جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچائیگا ۔ ہمارے نزدیک اردو میں علاقائی زبانوں کی گرامریں مرتب کرنے کا منصوبہ بھی بورڈ کو اپنے موجودہ منصوبوں میں شامل کر لینا چاہیئے ۔

کتاب مجلّد ہے اور مع گرد پوش ٹائپ میں اچھی چھپی ہے ۔ اس کی قیمت بھی تین روپے ہے جو مناسب ہے ۔

(سہیل بخاری)

